قوت القلوب
پوری اسلامی تاریخ میں تصوف پر ایک مستند اور لازوال اولین کتاب
تالیف:
شیخ ابو طالب محمد بن عطیہ حارثی المکی
ترجمہ:
محمد منظور الوجیدی
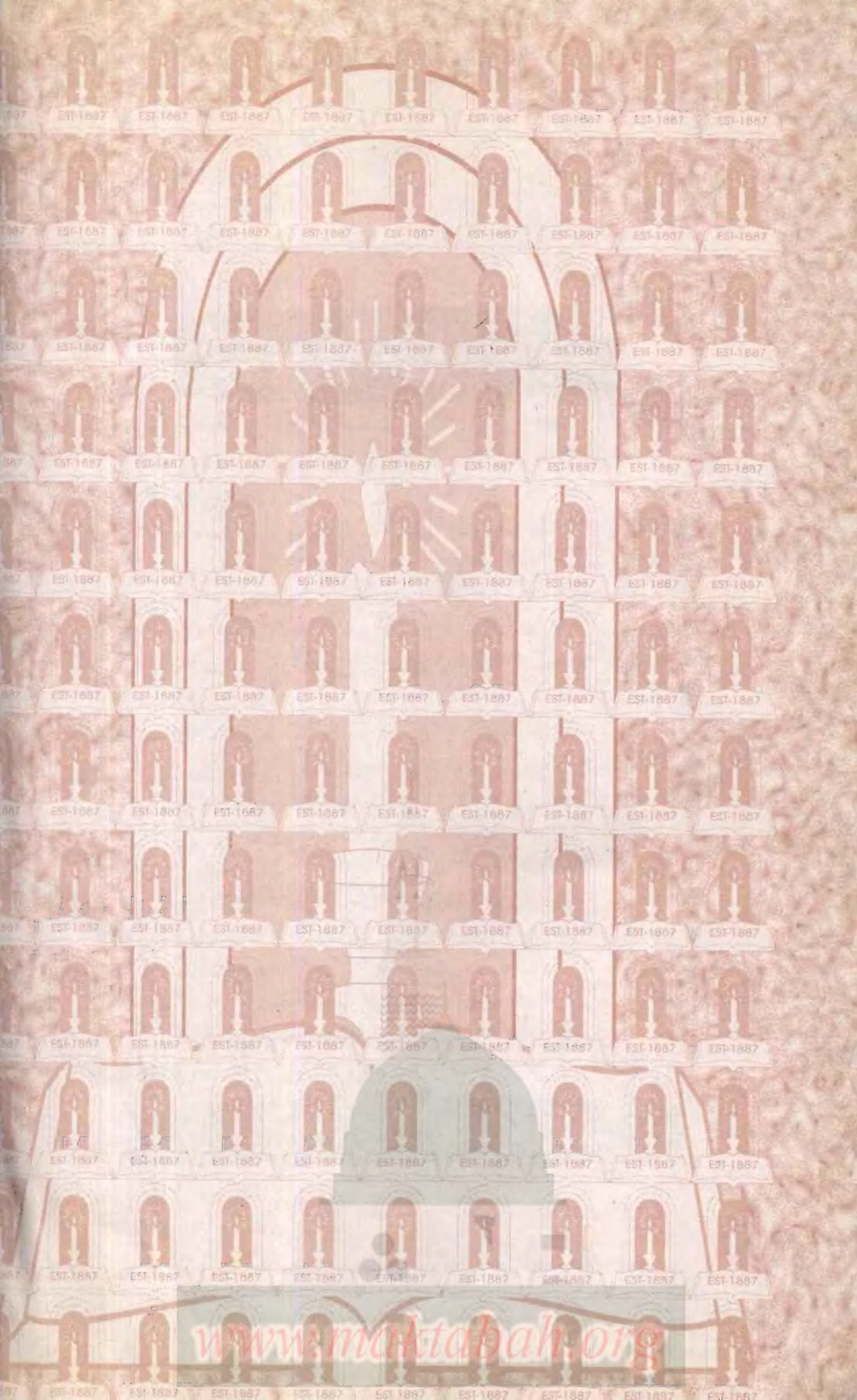
قوت القلوب

ایک سالک کے لیے تعلق باللہ و
مقامِ توحید کی صراطِ مستقیم

قوت القلوب
جلد اوّل

پوری اسلامی تاریخ میں تصوّف پر ایک مستند اور لازوال اوّلین کتاب
آج تک تصوّف پر جتنی تصانیف لکھی گئیں سب کی سب اس عظیم کتاب سے ماخوذ ہیں۔
امام غزالیؒ شاہ ولی اللہ اور تمام جیّد علماء کرام نے اس جامع کتاب سے استفادہ کیا۔

تالیف
شیخ ابوطالب محمد بن عطیہ حارثی المکی

ترجمہ
محمد منظور الوجیدی

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، پبلشرز،
لاہور ○ حیدرآباد ○ کراچی

Code No. ISBN – 969 – 31 – 0081 – 6

طابع : شیخ نیاز احمد

مطبع : غلام علی پرنٹرز،
اشرفیہ پارک۔فیروزپور روڈ لاہور

مقامِ اشاعت :

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ پبلشرز

ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی، لاہور

فہرست مضامین

احوالِ مصنّف رح

نام و پیدائش ان کا نام محمد بن علی بن عطیہ ابو طالب مکی رحمۃ اللہ علیہ ہے۔ کما فی المنتظم لابن جوزی اور امام ذہبیؒ نے العبر فی خبر من غبر جلد سوم میں لکھا ہے۔ محمد بن علی بن عطیہ حارثی العجمی ثم المکی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اہل جبل سے تھے اور پھر مکہ آئے، یہیں تربیت حاصل کی اور جوان ہوئے۔ اس شہر کو اپنا مسکن بنا لیا اور مرکزِ اسلام و ام القریٰ کی زبان اور بود و باش کو پسند کیا اور یہیں کے ہو کر رہ گئے اب ان کی مکہ کی طرف نسبت کی جاتی ہے اور المکی مشہور ہیں۔ ابن خلکانؒ نے لکھا ہے کہ یہ مکہ کے رہنے والے نہیں تھے بلکہ اہل جبل سے تھے اور پھر مکہ میں رہائش اختیار کر لی اور اس مقدس شہر کی طرف منسوب ہو گئے۔

صاحب شذرات الذہب فی اخبار من ذہب نے بھی یہی لکھا ہے کہ صاحب قوت (القلوب) محمد بن عطیہ حارثی العجمی ثم المکی۔ انھوں نے مکہ میں تربیت حاصل کی۔ ابن خلکانؒ نے لکھا ہے کہ حارثی کی حاء پر فتحہ اور راء پر کسرہ ہے اور پھر ثاء مثلثہ ہے۔ یہ کئی قبائل کی طرف نسبت ہے۔ مثلاً حرث، حارثہ۔ اب یہ معلوم نہیں کہ کس کی طرف منسوب ہو کر حارثی کہلائے۔

زہد و تقویٰ یہ اپنے دور میں زہد و تقویٰ میں بلند مقام کے مالک تھے۔ ہر وقت عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے۔ عتیقی فرماتے ہیں کہ یہ ایک نیک اور صالح بزرگؒ تھے اور بغداد کی جامع مسجد میں وعظ و ارشاد کی مجلس منعقد کیا کرتے۔ کما فی المنتظم لابن جوزی۔

حافظ ذہبیؒ نے العبر فی خبر جلد سوم میں لکھا ہے کہ یہ بہت ہی زاہد اور عابد بزرگ تھے۔ کئی صوفیاء سے ان کی ملاقات ہوئی، صاحبِ تصنیف ہیں اور وعظ و ارشاد بھی فرمایا کرتے تھے۔ ریاضت و مجاہدہ میں بہت ہی بڑھے ہوئے تھے اور ابو الحسن بن سالم بصری شیخ سالمیہ کے طریق پر تھے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے لسان المیزان میں حرف میم کے تحت لکھا ہے، محمد بن علی بن عطیہ ابو طالب مکی رحمۃ اللہ علیہ، یہ زاہد اور واعظ تھے۔ قوت القلوب کے مصنف ہیں۔ انھوں نے علی بن احمد مصیصیؒ اور المفیدؒ سے روایت کیا۔ یہ بہت ہی عبادت گزار بزرگ تھے

ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں لکھا ہے کہ یہ بہت ہی صالح بزرگ تھے۔ عبادت میں خوب انہماک رکھتے (بغداد) کی جامع مسجد میں وعظ فرمایا کرتے۔ علم توحید میں ان کی کئی ایک تصانیف ہیں یہ اہل مکہ سے نہ تھے۔ البتہ مکہ کی طرف ان کی نسبت ہے۔

یہ اس قدر ریاضت اور (پرہیز گاری) سے کام لیتے کہ ایک مدت تک کھانا چھوڑ دیا اور خود رو مباح گھانس پھونس کھاکر گزارا کرتے رہے (اور حرام اور مشتبہ خوراک سے پرہیز کرتے) گھانس اس کثرت سے کھایا اور (اس قدر طویل مدت تک کھایا) کہ جلد کا رنگ سبز پڑگیا۔

قوت القلوب کے ابواب زہد وتقویٰ پڑھنے سے مصنف کے زہد وتقویٰ کی ایک حیرت انگیز تصویر سامنے آتی ہے۔ حلال کا شدت سے اہتمام کرتے، چنانچہ اسی کتاب کے آخری ابواب میں کمائی کی چار اقسام بتاتے ہیں؛

۱۔ حلال

۲۔ ایسا مشتبہ کہ جس پر حلال کا شبہ غالب ہے۔

۳۔ ایسا مشتبہ کہ جس پر حرام کا شبہ غالب ہے۔

۴۔ حرام: یہ تقسیم کرکے فرماتے ہیں۔

کھانے اور لباس پر صرف حلال مال ہی خرچ کرو اور یہ احتیاط واقعی قابل غور بھی ہے اس لیے کہ تمام عبادات ہم بدن کے ساتھ ہی کرتے ہیں اور اگر بدن ہی حرام مال یا مشتبہ مال سے بنا ہے تو کسی قسم کی کوئی عبادت قبول نہ ہوگی اور زندگی بھر کی محنت شاقہ قیامت کے روز رائیگاں جاتی نظر آئے گی۔ اس وقت صوفیاء کی اسی قسم کی احتیاط کی قدر وقیمت محسوس ہوگی اور اسی طرح اگر بدن کا لباس حرام کا ہے تو بھی عبادت قبول نہیں۔ اس سلسلہ میں بکثرت روایات آتی ہیں۔

اور پھر فرماتے ہیں۔ اگر حلال کم ہو اور ضرورت کے مطابق لباس اور خوراک سے زاید حلال میسر نہ ہو تو ان دو کے علاوہ باقی امور پر ایسا مشتبہ مال خرچ کیا جائے کہ جس کے حلال ہونے کا شبہ ہے اور باقی اموال سے پرہیز کیا جائے اور اگر حلال کسی صورت نہ ملے تو اس قدر انتظار کیا جائے کہ حلال مل جائے یا اضطرار کی سی صورت ہو جائے۔ اب حالت اضطرار میں اس کے لیے یہ مشتبہ مال بھی حلال ہے بشرطیکہ زہد اور تقلل کا خیال رکھے۔

بادشاہوں اور لشکریوں کے عطیات سے سخت پرہیز کرتے (دائرہ معارف ...)

عام دکانداروں کے اموال کو مشتبہ قرار دیتے تھے اور اس سے پرہیز کرنے کی نصیحت کرتے اور فرمایا کرتے کہ جو مال کسی پرہیزگار آدمی کا ہدیہ ہو یا مباح زمین کی پیداوار ہو یا جائز ورثہ حاصل ہو یہ ٹھیک حلال مال ہے مگر حلال مال میں بھی زہد اور تقلل سے کام لینے کا حکم کرتے۔

الغرض ان کے تقویٰ و زہد، فنا فی التوحید، اطاعتِ رسالت، محبتِ صحابہ و تابعین و بزرگانِ اسلاف کے لیے قوت القلوب کا ایک ایک صفحہ گواہ اور بعد والوں کے لیے باعثِ نصیحت و اتباع ہے۔

علمی مقام

یہ ایک بلند پایہ عالم، ایک عظیم مفکر اور آثار و روایات اور اقوال سلف سے خوب آگاہ تھے۔ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ابو طالبؒ حدیث کے زبردست عالم تھے، روایات سے خوب آگاہ تھے اور اہلِ قلوب صوفیاء کے کلام کے بھی خوب جاننے والے تھے اور فرمایا کہ تحقیق میں ان کا کلام بہت پختہ اور صائب ہے اور بدعت سے سخت پرہیز کرنے والے ہیں۔ کما فی فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ جلد دوم آپ کی شہرۂ آفاق کتاب قوت القلوب ان کی علمی عظمت کا شاہکار ہے، جس کو ہر زمانہ میں علمائے اسلام میں قبولیت و اعتماد حاصل ر

شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ نے اپنی مشہور تصنیف حجۃ اللہ البالغہ میں بعض مسائل میں قوت القلوب کا ذکر کیا ہے اور ان کی بعض علمی آرائے سے استفادہ و استدلال کیا ہے۔

امام غزالیؒ کو حجۃ الاسلام بنانے اور انھیں طریق صوفیاء پر چلنے پر مجبور کر دینے میں شیخ ابو طالب مکی رحمۃ اللہ علیہ کے اس علمی شہ پارے قوت القلوب کا سب سے زیادہ حصہ ہے، جس کا اعتراف خود امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایک تصنیف المنقذ من الضلال میں صراحت کے ساتھ کیا ہے۔ امام غزالیؒ ان کی تعلیمات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے اسلوبِ تحریر، طرزِ فکر اور طریقِ استدلال میں زیادہ تر ان کا اتباع یا مماثلت اختیار کی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بھی ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ شیخ ابو طالب مکیؒ اصل ہیں اور ان کی شرح امام غزالیؒ ہیں۔ قوت القلوب اور احیاء علوم الدین کا موازنہ کرتے ہی یہ بات حقیقت بن کر سامنے آجاتی ہے قوت القلوب اور کتبِ امام غزالیؒ میں حیرت انگیز مشابہت ہے۔ طرزِ بحث اور اسلوبِ نگارش میں قرب ہے۔ کیمیائے سعادت اور قوت القلوب کے مباحث میں بھی واضح اور صاف مماثلت پائی جاتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام غزالیؒ نے فکری لحاظ سے قوت القلوب

سے گہرا اثر لیا اور آخر کار ان کے انقلابی شاہکار معرضِ وجود میں آئے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ واعظ اور نصیحت کرنے والے بزرگ تھے۔ زاہد اور عبادت گزار تھے اور بہت سے شیوخ سے ان کو حدیث کا سماع حاصل ہوا۔

امام ذہبیؒ نے العبر فی خبر من غبر جلد سوم میں لکھا ہے کہ (شیخ ابو طالب مکیؒ)، ابو الحسن بن سالم بصری شیخ سالمیہ کے طریقہ پر تھے اور انھوں نے شیخ علی بن احمد المصیصی وغیرہ سے روایت کیا۔

ابن جوزیؒ نے المنتظم فی تاریخ الملوک والامم کی ساتویں جلد میں لکھا ہے کہ محمد بن علی بن عطیہ ابو طالب مکیؒ نے علی بن احمد المصیصی اور ابو بکر المفید سے روایت کیا۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے لسان المیزان میں حرفِ میم کے تحت لکھا ہے کہ (شیخ ابو طالب مکیؒ) نے علی بن احمد المصیصی اور المفید سے روایت کیا۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ انھوں نے اجازت کے ساتھ عبد اللہ بن جعفر بن فارس سے روایت کیا اور انھوں نے ابن زید المروزی سے صحیح بخاری کا سماع حاصل ہے اور انھوں نے چہل حدیث لکھیں۔ اور یہ ابو الحسن بن سالم کے مذہب پر تھے۔

قاضی ابن خلکان نے وفیات الاعیان میں لکھا ہے کہ (شیخ ابو طالب مکیؒ) کی علمِ توحید میں کئی تصانیف ہیں؛

ابن جوزی نے المنتظم میں بتایا ہے کہ عبد العزیز بن علی ازجی وغیرہ نے شیخ ابُو طالب مکیؒ سے روایت کیا اور یہ بہت ہی عبادت گزار بزرگ تھے۔

قاضی ابن خلکان نے بتایا ہے کہ مقدسی نے کتاب الانساب میں لکھا کہ (قوت القلوب کے علاوہ) ان کی علمِ توحید میں کئی کتابیں ہیں۔

ابن جوزیؒ نے ذکر کیا ہے کہ علی بن عبید اللہ نے ابو محمد تمیمی سے نقل کیا۔ وُہ بتاتے ہیں کہ شیخ عبد الصمدؒ شیخ ابو طالب مکیؒ کے پاس گئے اور انھیں اباحتِ سماع پر عتاب کرنے لگے تو ابو طالبؒ نے یہ شعر پڑھ دیا ؎

فَیَا لَیْلُ فِیْکَ مِنْ مُتْعَۃٍ   وَیَا صُبْحُ لَیْتَکَ لَمْ تَقْتَرِبْ

(اے شب! تیرے اندر کس قدر فوائد ہیں اور اے صبح، کاش تو قریب بھی نہ آتی)

عبد الصمد نے یہ سنا اور ناراض ہو کر واپس چلے آئے۔

عبد الرحمٰن بن محمد نے بحوالہ احمد بن علی بن ثابت کے بتایا، انھیں ابو طاہر محمد بن علافؒ نے

بتایا کہ ابوطالب اہل جبل سے تھے، مکّہ میں تربیت حاصل کی اور ابوالحسن بن سالمؒ کی وفات کے بعد بصرہ میں آئے (ان سے علمی استفادے کے بعد) پھر بغداد آئے تو ان کے گرد لوگ جمع ہو گئے اور انھوں نے وعظ کہنا شروع کیا۔

(یہ بغداد کی جامع مسجد میں وعظ فرمایا کرتے تھے)

وفات حلال کے اہتمام اور خوف و محبت کا ان پر شدید غلبہ تھا۔ ابن کثیر دمشقیؒ نے البدایہ والنہایہ کی جلد یازدہم میں لکھا ہے کہ ابوالقاسم بن سراث بتاتے ہیں کہ ابوطالبؒ کی وفات کے وقت میں ان کے پاس حاضر ہوا اور کہا کہ مجھے وصیت کریں:

فرمایا: اگر میرا خاتمہ بالخیر ہو جائے تو میرے جنازہ پر بادام اور شکر لٹانا۔

میں نے پوچھا: میں یہ بات کیسے جان سکوں گا؟

فرمایا: میرے پاس بیٹھو، اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ اگر میں نے پوری قوت سے تیرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبا لیا تو جان لینا کہ میرا خاتمہ بالخیر ہُوا (ابوالقاسم بن سراثؒ) بتاتے ہیں کہ میں نے ایسے ہی کیا۔ جب ان کی وفات کا ٹھیک وقت آیا اور رُوح جُدا ہونے لگی تو انھوں نے میرے ہاتھ کو زور سے دبا لیا۔ چنانچہ جب ان کا جنازہ اٹھایا گیا تو ان کی نعش پر بادام اور شکر لٹوائے گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

ابن جوزیؒ کہتے ہیں کہ ان کی وفات جمادی الآخر میں ہُوئی اور ان کی قبر جامع الرصافہ میں ہے۔

ابن جوزیؒ نے بھی المنتظم فی تاریخ الملوک والامم کی جلد ہفتم میں وفات کے قریب کا ایسا ہی واقعہ نقل کیا ہے جیسے کہ صاحب البدایہ والنہایہ نے نقل کیا اور ابوالقاسم بن بشران نام بتایا جو ان کے پاس بوقتِ وفات بیٹھے ہُوئے تھے۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے لسان المیزان میں بتایا کہ ان کی وفات ۳۸۶ھ میں ہُوئی۔

قاضی ابن خلکانؒ نے وفیات الاعیان میں مزید وضاحت کی اور بتایا کہ ان کی وفات ۶ر جمادی الآخرہ ۳۸۶ھ کو بغداد میں ہُوئی اور مقبرہ مالکیہ میں مدفون ہُوئے۔ ان کی قبر مشرقی جانب ہے اور ان کا مزار مشہور اور زیارت گاہِ خواص و عوام ہے۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

دیباچہ

از

جانشین شیخ التفسیر حضرت مولانا عبید اللہ انور دام برکاتہم خلف الرشید

قدوۃ السالکین زبدۃ الصالحین قطب الاقطاب حضرت مولانا

احمد علی صاحب قدس اللہ سرہ العزیز

الحمد للہ الذی تفرد بجلال ملکوتہ والصلوۃ والسلام علی سید الرسل وعلی اصحابھم

واتباعھم وعلینا معھم۔

امابعد: جب سے دنیا میں انسان آباد ہوا تب سے اس کی اصلاح و ہدایت کے لیے دو طرح کے قوانین جاری ہیں۔ ظاہری قوانین نے اعمال ظاہر کو متوازن اور معتدل بنانے کا کام کیا اور باطنی ہدایات نے انسان کی ایسی تربیت کی کہ وہ رشد و ہدایت کی راہ پر گامزن رہنا اپنا فرض سمجھنے لگا اور بڑھتے بڑھتے پیکرِ رشد و ہدایت بن گیا۔

تمام رشد و ہدایت کا مرکز اللہ احد الصمد تبارک و تعالیٰ ہے اس لیے باطنی ہدایات یعنی تصوف کا آغاز و انجام ہمیشہ توحید ہی رہا کہ انسان کی ایسی تربیت کی کہ وہ سب موجودات سے کٹ کر اللہ والا بن جائے اسی کے ساتھ باقی اور اسی کے ساتھ موجود و قائم ہو۔ یہی زندگی باعث رشک و نجات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کتاب و سنت سے ان ہدایات کی نشان دہی فرمائی اور امت میں سے ایک گروہ کو اسی منصب سے سرفراز فرمایا۔

شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ

"برادرانِ اسلام، جن لوگوں کے ہاتھ میں قوم کی باگ ڈور ہوتی ہے ان میں سے ایک گروہ صوفیائے کرام کا ہے اور یہ گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی پہلے سے چلا آرہا ہے (یعنی اس گروہ کا وجود ابتدائے آفرینش سے اور ہر زمانہ میں پایا جاتا ہے) اس گروہ میں جو کھرے اللہ کے بندے ہوتے ہیں وہ بارگاہِ الٰہی میں مقبول، محبوب، مغفور اور مرحوم ہوتے ہیں۔ ان کی دامنگیری باعثِ برکت، ان کا اتباع موجبِ نجات اور ان کی صحبت اکسیر کا حکم رکھتی ہے۔ ان کی تربیت انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتی ہے۔ ان بزرگانِ دین کی تربیت سے ہی انسان روحانی مہلک بیماریوں (مثلاً حسد، کبر، عجب وغیرہ) سے شفا پاتا ہے اور جنت کا مستحق بن جاتا ہے۔ اگر ان اللہ والوں کی صحبت نصیب نہ ہو اور ان سے اپنی تربیت نہ کرائے تو اغلب یہی ہے کہ انسان روحانی مہلک بیماریوں میں مبتلا ہو کر دنیا سے رخصت ہو گا اور جہنم میں جائے گا۔" (ملفوظات طیبات صفحہ ۲۱)

اعلیٰحضرت رحمۃ اللہ علیہ نے ایک جگہ فرمایا:

"ہم مطلق تصوف کے قائل نہیں۔ ہم تو اسی تصوف کے حامی ہیں جس کا ماخذ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہو۔ جو صوفی یا عالم، اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے راستہ کی طرف دوڑتا نظر آئے گا ہم تو اس کے پیچھے دوڑیں گے۔" (ملفوظات طیبات صفحہ ۷۸)

اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہی تصوف قابل قبول ہے جو کتاب وسنت سے اخذ کیا گیا ہو۔ اسی انداز پر علم تصوف میں سب سے پہلے رسالہ قشیریہ لکھا گیا مگر وہ مختصر کتاب تھی۔ اس کے بعد شیخ ابو طالب مکیؒ نے قوت القلوب فی معاملۃ المحبوب، تحریر کی جو کہ علوم باطن میں ایک کامل رہنما ہے۔

جامعیت اور کاملیت میں یہ کتاب ہر دور میں زبردست خراج تحسین حاصل کر چکی ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ سالک کو زندگی کے ہر مرحلہ پر کتاب وسنت سے وابستگی، کتاب اللہ وسنت رسول اللہؐ کی پیروی، صحابہ وتابعین کے طرق ومسالک پر چلنے کی تاکید کرتی ہے اور قارئین کے سامنے کتاب وسنت اور سلف صالحین سے ثابت شدہ طرق تزکیۂ نفس پیش کرتی ہے۔ ایک دیانت دار اور علم وتقویٰ کا حامل انسان یہ کتاب پڑھ کر دو امور پر یقین رکھنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے۔

۱۔ تصوف زمانۂ رسالت سے اور کتاب وسنت کے ساتھ ثابت ہے یہ دخیل چیز نہیں اور اسلام کا پیش کردہ تصوف کسی زمانہ کے دوسرے دین کے پاس نہ تھا اور نہ ہے۔

۲۔ کتاب وسنت سے جو تصوف ثابت ہے اس میں شرک وبدعت اور تکبر وتصنع کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ اور جو تصوف سنتِ رسول اور سنت صحابہ وتابعین اور متداول علوم اسلام کو مٹانے والا ہے وہ تصوف نہیں بلکہ بے دینی وفسق وتحریف کا دوسرا نام ہے۔

عہدِ رسالت میں تصوف کے علوم موجودہ صورت پر مدون ومرتب نہ تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے اس موضوع پر امام قشیریؒ نے رسالہ قشیریہ تحریر کیا جو اسلوبِ تحریر اور جامعیتِ مضامین کے اعتبار سے قابل ستائش تصنیف ہے مگر یہ کتاب ایک ابتدائی کام تھا اس لیے اس میں بعض خلا رہ گئے۔ ان کے بعد کتب تصنیف ہوتی ہیں اور تصوف کے موضوع پر اس امت میں سب سے پہلا جامعیت وکاملیت سے بھرپور کام شیخ ابو طالب مکیؒ نے ہی کیا اور اس موضوع پر ایک ایسی تصنیف پیش کی جس کی نظیر نہ پہلے دور میں تھی اور نہ ہی ایسی جامع وکامل کتاب بعد کے زمانہ میں لکھی جا سکی۔ امام غزالیؒ نے احیاء علوم الدین میں قوت القلوب سے خوب خوب استفادہ کیا ہے۔ اور انہیں تصوف کی راہ پر چلانے میں سب سے زیادہ اسی کتاب کا دخل ہے جیسے کہ انہوں نے المنقذ من الضلال میں صاف طور پر اس کا اعتراف کیا ہے۔ ابن تیمیہ اور دوسرے بلند پایہ علمائے ظاہر وباطن نے ہر زمانہ میں

قوت القلوب کی اہمیت کو تسلیم کیا اور آج کے دورِ فتن کے لیے اس کتاب کے ترجمہ کی شدید ضرورت تھی جس کو بحمد اللہ عزیزم مولانا محمد منظور الوجیدی سلمہ تعالیٰ نے بتوفیقِ الٰہی پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔ کتاب کا ترجمہ سلیس اور عمدہ ہے۔ ترجمہ کو دیکھ کر مترجم کے علمی ذوق اور ترجمہ کی صلاحیتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی یہ محنت قبول فرمائے۔ اہل اسلام کو دنیا و آخرت میں اس سے مستفید ہونے کی توفیق بخشے اور مترجم کے لیے یہ دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضا اور فلاح و کامرانی کا باعث ہو۔ والحمد اولاً و آخراً والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا محمد المصطفیٰ وعلیٰ آلہ وصحبہ وبارک وسلم تسلیما۔

احقر

عبید اللہ انور

قاسم العلوم انجمن خدام الدین لاہور

تعارف کتاب

تصوف کی تعریف مختلف بزرگوں نے اپنے اپنے مذاق پر کی ہے اور خلاصہ کلام یہ ہے کہ تصوف سے مراد وہ ضابطہ حیات ہے جو انسان کو اللہ سے ملا دے اور غیر اللہ سے امید و خوف کا ہر تعلق کاٹ دے۔ انسان کے ظاہر و باطن کو ہر طرح کی گندگیوں سے پاک و صاف کر دے۔ اللہ پر توکل قائم ہو جائے۔ اللہ سے ڈرنے لگے۔ اللہ کی محبت غالب آ جائے اور اللہ کے سوا ہر چیز کو فانی سمجھے اور پھر اسی عقیدہ میں ایسی پختگی پیدا ہو جائے کہ اللہ کے سوا ہر چیز کو اس شدت کے ساتھ فانی اور بے وقعت سمجھے کہ گویا وہ معدوم ہیں اور اور اللہ ہی موجود ہے۔ معدوم چیز کی طرف ادنیٰ سی توجہ بھی وقت ضائع کرنا ہے اس لیے معدوم پر توکل یا معدوم سے ڈر یا معدوم کی محبت تو سراسر حماقت ہے۔ اس قسم کا باطنی تغیر پیدا ہونے کے بعد انسان میں جرم و گناہ کا جذبہ ہی ختم ہو جاتا ہے اور اس کو تزکیۂ نفس کہا جاتا ہے۔ اسلام نے باطنی تصفیہ و تزکیہ پر پورا زور دیا۔

بلکہ حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیٰ نبینا و علیہما الصلوٰۃ والسلام کی دعا پر غور کیجیے تو صاف طور پر نظر آتا ہے کہ تزکیۂ نفس اور تصفیۂ باطن کے احکام ابتدائے آفرینش سے چل رہے ہیں اور انبیاء علیہم السلام نے اس میں شدید محنت اٹھائی اور بعد والوں کے لیے دعائیں تک کی ہیں۔

شیخ ابو محمد عبدالحق حقانی دہلوی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر حقانی میں فرماتے ہیں۔

"جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے تین دعائیں کعبہ بنانے وقت کی تھیں۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا الخ واجعلنا مُسلمین لَکَ الخ رَبَّنَا وابعث فیھم رسُولاً الخ

اسی طرح تیسری دعا میں رسول کے لیے تین اوصاف کی بھی استدعا کی۔ یَتْلُوْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُھُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ اس کا ستر یہ ہے کہ رسول کی امت میں مختلف استعداد کے لوگ ہوتے ہیں کہ جن کے چار مرتبہ ہیں؛

۱۔ عام لوگ جن کو اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کا کلام مقدس پڑھ کر سنایا جاتا ہے۔ اس لیے یَتْلُوْ عَلَیْھِمْ اٰیٰتِكَ کہا۔

۲۔ [illegible] هو ابهم کہ ان کو وہ کتاب سکھائی جاتی ہے یہ عام علماء کا مرتبہ ہے۔

۳۔ اور بعض کو حکمت یعنی شریعت کے اسرار بتائے جاتے ہیں۔ یہ مرتبہ علمائے مجتہدین کا ہے۔ ان دونوں گروہوں کے لیے یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ فرمایا اور یہ اس لیے کہ نبی کی اُمت میں یہ دو گروہ نہ ہوں تو اس کی ہدایت کا سلسلہ بعد اس کے منقطع ہو جائے اور چونکہ جس رسول کے لیے حضرت ابراہیمؑ دعا کرتے ہیں۔ وُہ خاتم النبیین ہے۔ اس کے بعد اور نبی کے آنے کی حاجت نہیں اس لیے اس کے علوم کے وارث علماء اور ائمہ مجتہدین ہونے چاہئیں کہ آپ کے بعد اسی سلسلۂ ہدایت کو قائم رکھیں اور اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے۔ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل۔

ف یہاں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ظاہر الفاظ قرآن کے معانی کے علاوہ اور بھی کچھ اسرار قرآن میں ہیں کہ جو خاص لوگوں کا حصہ ہے اور یہ امر بدیہی ہے۔ اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لوگوں کے اس دین کے حاصل کرنے میں مختلف حالات ہیں الخ رواہ البخاری۔ پس وُہ جو بعض جہلاء صرف ظاہری مطالب پر انحصار کر کے ان لوگوں کی فضیلت کا انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن کے سمجھنے کے لیے کیا چاہیے؟ الخ وہ بے خبر ہیں۔

۴۔ مرتبہ اخص الخواص لوگوں کا ہے کہ جن کا جوہر رُوح آئینہ کی طرح برکت نبی علیہ السلام سے پاک اور صاف ہے۔ اور ان میں پورا پورا انوارِ نبوت کا انعکاس ہوتا ہے جس طرح کہ آئینہ میں ہُوبہو باہر کی چیز دکھائی دیتی ہے۔ یہ لوگ نبی کے قایم مقام ہوتے ہیں ان کو اولیاء اللہ کہتے ہیں۔ سو ان کے لیے یُزَكِّيْهِمْ کہا۔ الخ

اس آیت اور اس کی تفسیر سے صاف واضح ہے کہ تزکیۂ نفس، توکل، زہد اور دُوسرے بے شمار امور ایسے ہیں جن کا باطنی صفائی و طہارت کے ساتھ تعلق ہے اور جن کا ذکر انبیاء علیہم السلام کی زبان مبارک سے ہُوا اور آیاتِ قرآنی نے ان کی اہمیت اور ماموریت واضح کر دی۔ اور یہ طہارت و صفائی انسان کو ظاہری طہارت و صفائی پر مجبور کر دیتی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ظاہری عبادات سے غافل رہ کر ہی باطنی صفائی کے پیچھے پڑ جائیں بلکہ ظاہری عبادات کے ساتھ قلبی انابت و طہارت ایک ایسا ضروری عمل ہے کہ جس کے بغیر ظاہری اعمال نرا چھلکا بن کر رہ جاتے ہیں اور ان کے فوائد کاں لم تکن ہوتے ہیں۔ انہی امور کا ایک مشترک سا نام تصوف ہے۔

اہل یورپ کے بعض بددیانت یا جاہل مستشرقین جہاں اسلام پر طرح طرح کے اتہامات لگاتے ہیں اور علمی میدان میں اپنے خیال خام کے مطابق شکست دینے کی کوشش کرتے ہیں وہاں یہ الزام بھی لگاتے ہیں کہ تصوف در اصل اسلام میں دخیل کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ آوردہ ہے۔ حالاں کہ یہ بات بالکل غلط ہے۔ قرآن مجید کی بکثرت آیات اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے شمار احادیث اور اقوال وافعال صحابہؓ اس نظریہ کی صاف تردید کرتے ہیں۔ تصوف کے تمام اجزا کتاب وسنت سے ثابت ہیں۔ البتہ اسے ایک فنی حیثیت کی سعادت بعد والوں کے لیے مقدر تھی مگر اس کی تمام اساسی باتیں قرن اوّل میں صراحت کے ساتھ ملتی ہیں اور قوت القلوب کے تمام مباحث اس نظریہ کا دندان شکن جواب ہیں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب، تمام پہلی اور بعد کی کتب تصوّف پر فائق واعلیٰ درجہ رکھتی ہے کہ شیخ ابوطالب مکی رحمۃ اللہ علیہ نے ہر عنوان پر آیات واحادیث، اقوالِ صحابہ وتابعین اور اقوال سلف اس کثرت سے بیان کیے اور انھیں ایسی ترتیب دی کہ ایسی جامعیت کی حامل کتاب نہ پہلے دور میں ملتی ہے اور نہ ہی ان کے بعد کسی زمانہ میں پائی گئی۔

یہی وُہ کتاب ہے کہ جس نے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کو مدرسہ نظامیہ بغداد کی صدارت سے استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا۔ یہ مدرسہ اس عہد میں دنیا کی سب سے بڑی دینی درس گاہ تھی۔ مدرسہ نظامیہ کی صدارت اس زمانہ میں سب سے بڑا عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ امام صاحب، نے اس زمانہ میں شیخ ابوطالب مکی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ شہرہ آفاق کتاب قوت القلوب کا مطالعہ کیا۔ اس کتاب کا ہر صفحہ ایک انقلاب کا پیغام ثابت ہُوا اور مدرسہ نظامیہ کی صدارت سے استعفیٰ دے کر دمشق چلے گئے۔ وہاں سے شام کا رُخ کیا۔ دو سال شام میں گزارنے کے بعد بیت المقدس آئے اور پھر مکہ مکرمہ تشریف لائے۔ غرض دس برس سیر وسیاحت، ریاضت اور صوفیائے سے استفادہ کرنے میں صرف کر دیے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خود نوشت سوانح حیات المنقذ من الضلال میں صراحت کی ہے کہ انھوں نے شیخ ابوطالب مکی رحمۃ اللہ علیہ کی قوت القلوب اور حارث المحاسبی وغیرہ کی کتب تصوف پڑھنے کے بعد بغداد کے مدرسہ نظامیہ کی صدارت سے استعفیٰ دینے اور صوفیائے کے سامنے زانوئے تلمذ طے کرنے اور ان کے پاس رہ کر تزکیہ وتصفیہ نفس کا فیصلہ کیا۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ نے فرمایا:

"کتابِ قوت القلوب اور اس کی تبع میں کتابِ احیاء (للغزالیؒ) میں اعمالِ قلب کا ذکر ہے۔ مثلاً صبر، شکر، حب، توکل اور توحید و نحو ذلک۔ پھر فرمایا: ابوطالبؒ حدیث و آثار اور صوفیائے اہل قلوب کے اقوال کے خوب ماہر اور جاننے والے ہیں۔ ان کا کلام صائب تر اور ان کی تحقیق پختہ ہے۔ بدعت سے بہت ہی دور ہیں۔" الخ

کما فی فتاویٰ ابن تیمیہؒ المجلد الثانی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے اور ان کی آراء کا تذکرہ کیا۔ ان کے علاوہ بکثرت علمائے اسلام نے قوت القلوب کو خراجِ تحسین پیش کیا اور اس کتاب کی افادیت و جامعیت کو تسلیم کیا ہے۔

قوت القلوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ تصوف کے تمام عنوانات پر محدثانہ رنگ میں بحث کی ہے۔ ہر موضوع پر آیاتِ قرآن مجید، پھر احادیث، پھر اقوال صحابہ و تابعین کا ذکر کیا ہے اور بعض صوفیائے کے اقوال کو تائید کے انداز پر پیش کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے یہ دعویٰ حقیقت بن کر آپ کے سامنے آجائے گی۔

پہلا ترجمہ

اردو زبان میں قوت القلوب کا یہ پہلا ترجمہ ہے اور اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و احسان ہے کہ مجھ جیسے ناکارہ، گناہ گار اور ناقص العلم کو اس خدمت کی توفیق عطا فرمائی۔ اس پر جس قدر شکر ادا کروں کم ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی امداد و نصرت ہے کہ اس بارگراں کو اٹھانے کی ہمت دی ورنہ من آنم کہ من دانم۔ میری قلبی خواہش تھی کہ علم تصوف میں کوئی اہم اور بنیادی خدمت کا شرف حاصل ہو جائے۔ میں اپنی علمی کم مائیگی، ناقص فہمی اور ناتجربہ کاری کا اعتراف کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ اس کام میں میری اہلیت کا کچھ دخل نہیں بلکہ یہ صرف اللہ تبارک و تعالیٰ کا ہی احسان ہے۔ وہ وہاب ہے جب چاہے اور جس پر چاہے احسان فرما دے۔

ایک گزارش

یہ بھی ہے کہ بہت ممکن ہے۔ احقر بعض مقامات پر مصنف علیہ الرحمۃ کے خیالات کی صحیح ترجمانی سے قاصر رہا ہو۔ کہیں سہو یا لغزش ہو گئی ہو۔ وما اُبرّی نفسی اس لیے ان امور کے سلسلہ میں سب سے پہلے اپنے اللہ تبارک و تعالیٰ سے ستاری و رہنمائی کی دعا کرتا ہوں۔ پھر قارئین کرام سے درگزر کی درخواست کرتا ہوں اور مفید مشوروں کی استدعا بھی کرتا ہوں۔

خصوصیاتِ ترجمہ

اس کتاب کے ترجمہ میں احقر نے ان امور کا خاص طور پر خیال رکھا ہے۔

سلیس اور عام فہم زبان میں ترجمہ کیا ہے تاکہ عوام و خواص کتاب کے مندرجات سے یکساں مستفید ہو سکیں۔ البتہ اصطلاحاتِ فن کو بدلنے سے بے شمار پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں مضمون فہمی دشوار بلکہ ناممکن ہو جاتی ہے اور اردو زبان میں عربی اور تصوف کی اصطلاحات کا کامل مفہوم تلاش کرنا ایک معدوم کی تلاش کے مترادف ہے۔ اہلِ علم اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں۔

قوت القلوب کے بیشتر عنوانات طویل اور کئی کئی سطروں میں ہیں جن کو قدرے مختصر کر دیا گیا ہے اور کوشش کی ہے کہ کئی سطروں میں پھیلا ہوا عنوان مختصر ترین الفاظ میں سما جائے۔

عام عنوانات پر کئی کئی صفحات کی طویل ابحاث ہیں اور مصنف علیہ الرحمۃ نے قدیم دور کے اسلوب پر کوئی ذیلی عنوان نہیں دیا۔ آج کی طبائع تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد نئے عنوان کی طلب گار ہیں تاکہ پڑھتے وقت طبیعت میں آمادگی قایم رہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر احقر نے دخل دے کر بکثرت ذیلی عنوانات دیے ہیں۔ احقر نے یہ کام محض کتاب کی افادیت و کشش بڑھانے کے لیے کیا ہے لیکن اصلاحی ہونے کے باوجود مصنف علیہ الرحمۃ سے معافی چاہتا ہے۔

قرآن مجید کی آیات پر ہندسے لگا کر اس صفحہ کے نیچے اس آیت کا نمبر اور سورت کا نام دے دیا ہے تاکہ قارئین کرام کو قرآن مجید میں آیت تلاش کرنے میں آسانی رہے۔ اس اسلوب کی محنت اِن شاءاللہ آپ کو کسی بھی کتاب میں نہیں ملے گی۔

قوت القلوب کا یہ پہلا ترجمہ پیشِ خدمت ہے اور پہلے ترجمہ میں بعض ضروری امور عموماً رہ جاتے ہیں مگر احقر نے محض اللہ کی مدد و توفیق سے پہلے ترجمہ کو ہر طرح کی قابلِ تحسین اور ضروری خصوصیات سے مزین کر دیا ہے کہ اب یہ ترجمہ اِن شاءاللہ العزیز ہر لحاظ سے جامع و کامل ہے۔ یہ اللہ کے احسانات ہیں اور اللہ تعالیٰ ہی اسے قبولیت عطا کرنے والا ہے اور اسی سے استجابت کی درخواست ہے۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل نعم المولیٰ ونعم النصیر۔

ترتیب موضوعات کتاب

مصنف نے اس کتاب کو دو ضخیم جلدوں میں مکمل کیا اور اس میں کل اڑتالیس فصول رکھیں۔

سب سے پہلے مصنف علیہ الرحمۃ نے حرفِ آغاز سے کتاب کا مختصر سا تعارف کرایا اور نظامِ فصول اور مضامین کی جھلک پیش کی ہے۔ اس کے بعد پہلی فصل میں معاملات کے بارے میں آنے والی آیاتِ قرآن کا ذکر کیا ہے۔ دوسری فصل میں دن رات کے اوراد کی اہمیت جتانے والی آیاتِ قرآنِ مقدس بیان کیں۔

اس کے بعد فصل ۳ سے لے کر فصل ۸ تک مصنف علیہ الرحمۃ نے صبح و شام، دن رات، مختلف ایام اور مختلف حالات کی دعاؤں اور اوراد کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے بیشتر دعائیں اور اذکار عام کتب میں نہیں ملتے اور انسانی زندگی میں دُعا ایک زبردست ہتھیار ہے حدیث میں دُعا کو مومن کا ہتھیار قرار دیا گیا۔ دعا کو عبادت کا مغز بتایا گیا اور یہ بتایا گیا کہ جو آدمی دعا نہیں کرتا اللہ اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔

مصنف علیہ الرحمۃ نے دعاؤں اور اذکار کے ساتھ کتاب کا آغاز کر کے صراحت کر دی کہ اصلاح و سلوک میں سب سے پہلا درجہ اذکار اور دعاؤں کا ہے۔ جب تک ایک انسان اذکار اور دعاؤں کی پابندی نہ کرے۔ اسے تزکیہ نفس، صفائی باطن اور ایمان بالغیب کی کچھ نعمت حاصل نہیں ہو سکتی اور نہ ہی اسے وُہ فہم و فراست عطا ہوتی ہے کہ جس کا تعلق اللہ سے ہو اور جو ساری کائنات سے زیادہ صائب اور درست ہو۔

فصل ۹ سے لے کر فصل ۱۲ تک تین امور پر بحث کی ہے۔ نماز، تلاوتِ قرآن اور جمعہ۔ یہ تینوں باتیں اسلام میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا فرمان ایک قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے کہ "جو نماز نہ پڑھے اس کا اسلام میں کچھ حصہ نہیں"۔

ان فصول میں پہلے سایہ کی توضیح، نمازوں کے اوقات، وضو کا طریقہ اور نماز کے آداب بتائے۔ پھر پانچوں نمازوں پر ایک جامع بحث کی اور اس کے بعد دن رات کی نمازوں، قیامِ شب اور تہجد کی تفصیلات بتائیں۔ نماز کی بحث صلوٰۃ التسبیح پر ختم کی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا حضرت عباس کو خاص اہتمام اور ایک خاص لہجہ میں بتائی تھی۔ اس کے بعد قرآن مجید کی تلاوت کی اہمیت، فضائل اور آداب بتائے اور قرآن کے مفہوم پر غور کرنے اور قرآن مجید کو درست طریقہ پر پڑھنے اور تلاوت قرآن میں رکاوٹیں آ جانے کا ذکر پوری وضاحت کے ساتھ کیا۔ ان باتوں کے علاوہ قرآن مجید کے مختلف اجزاء پر بحث کی۔ نمازوں میں تلاوت کا مسنون طریقہ بیان کیا۔

اس کے بعد افضل ایام، افضل راتوں، افضل عشروں اور افضل مہینوں کی ایک ضمنی مگر مفصل و جامع بحث کے بعد جمعہ کے بارے میں بیان آتا ہے۔ جس میں جمعہ کی اہمیت، ترکِ جمعہ پر سزا اور جمعہ کے دن اور نمازِ جمعہ کے بارے میں بکثرت معلومات و مسائل بیان کیے۔ جمعہ کو اسلام کے ایک شعار کی حیثیت حاصل ہے اور تلاوتِ قرآن کی اہمیت اس سے واضح ہے کہ یہ رب تعالیٰ کے ساتھ ہم کلامی کا ایک طریقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اہل اسلام کو دنیا میں عطا فرما دیا اور آخرت کے انعامات اس سے کئی گنا بڑھ کر ہیں۔

فصل ۲۲ میں روزہ کی اہمیت اور اس کے دوسرے مسائل بیان کیے۔ اسلام کے اس رکن کی اہمیت کے لیے ایک حدیث کے عجیب الفاظ ہیں کہ "روزہ میرے لیے ہے اور میں خود اس کی جزا دوں گا، علماء نے لکھا ہے کہ ہر عمل کی جزا ملائکہ کے ذریعہ ملے گی مگر روزہ کی جزا بقدرت الٰہی رب تعالیٰ کے دستِ قدرت سے حاصل ہوگی جس کی کیفیت اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

یہاں تک اسلام کے بنیادی ارکان پر بحث تھی اس کے بعد تصوف کے عام مضامین پر بحث شروع ہوتی ہے، چنانچہ شیخ ابو طالب مکیؒ نے سب سے پہلے اخلاق حسنہ کی توضیح کی۔ ایک سالک اور طریقِ تصوف پر چلنے کے خواہشمند انسان کو اخلاقِ حسنہ کی اہمیت بتائی اس لیے کہ اس کے بغیر کسی نظامِ ظاہر و باطن کا قیام و استواری ناممکنات میں سے ہے اور اس فصل میں یہ واضح کیا کہ روزہ کا مفہوم تزکیہ باطن ہے اور یہ توبہ کی ایک صورت ہے۔

فصل ۲۳ میں اخلاق حسنہ کی توضیح و تعیین کیا۔ نفس کا احتساب کرنے اور قبولیتِ عمل کی بعض شرائط کا ذکر کیا۔ ایک سالک کے لیے سب سے پہلا اور اہم ترین عمل یہی ہے کہ نفس کا محاسبہ کرے اور اسے ہر صورت میں پابندِ اسلام کر دے۔ اس کے بعد ہی اس پر رنگ چڑھ سکتا ہے۔ جب نفس رذائل سے پاک اور احتساب کی کڑی نگرانی میں رہے گا تو یہی اوراد و وظائف سالک کے لیے ترقی و وصول کا باعث ہوں گے۔ ابن قیمؒ نے الوابل الصیب میں اسی مسئلہ کو ایک مثال کے ذریعہ خوب واضح کیا ہے۔ گناہ گندگی اور ناپاکی کی طرح ہوتے ہیں اور اذکار و اعمالِ صالحہ خوشبو کی طرح ہیں، اگر کپڑے پر گندگی سے صاف کیے بغیر خوشبو لگا دی جائے تو خوشبو کے تغیر کا خطرہ ہے لیکن اگر کپڑا دھو کر اور صاف کر کے خوشبو لگائی جائے تو ہی خوشبو اپنا اثر دکھائے گی۔ اسی طرح گناہوں سے توبہ کر کے

نفس کا محاسبہ رکھ کر اگر اذکار و اوراد کیے جائیں تو ان کا خوب اثر ہوتا ہے۔

اس کے بعد فصل ۳۱ تک اوراد، مراقبہ اور اس کی اقسام، علم کی اہمیت بیان کی۔ علم ظاہر اور علم باطن کی حدود کا تعین کیا اور یہ بتایا کہ علم ظاہر کے بغیر علم باطن حاصل نہیں ہو سکتا یعنی جس کی جہالت کو دوام حاصل ہے اس کی علوم باطن سے محرومی کو بھی دوام حاصل ہے ان کے بعد توبہ، گناہ سے پرہیز، تقویٰ کی زندگی پر صبر کرنے، نیکی پر شکر کرنے، ہر وقت خوف و رجاء کی حالت میں رہنے اور دنیا سے زہد و بے رغبتی کا ذکر کیا۔ اس مقام پر کتاب کی پہلی جلد ختم ہو گئی یعنی پہلے حصہ میں سالک کے لیے تقریباً ابتدائی مراحل کا ذکر کر دیا گیا۔ کتاب کے دوسرے حصہ میں تصوف کے اہم تر موضوعات پر بحث فرمائی۔

اس حصہ میں سب سے پہلے توکل کا ذکر کیا اور اس کی اہمیت بیان کی۔ بتایا کہ اللہ پر توکل رکھو۔ غیر اللہ سے نہ ڈرو اور نہ امید رکھو۔ اگر ملے تو اللہ ہی کا شکر کرو اور اگر رک جائے تو غیر اللہ کو روکنے والا سمجھو۔ تزکیہ باطن میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی وابستگی انسان کے تمام امراض کا مداوا ہے۔ اس کے بعد محبت، اہل محبت اور ان کی علامات پر سیر حاصل بحث کی۔ ان اہم ابحاث کے بعد اسلام کے ارکان خمسہ کا ذکر کیا اور فقہی طریقہ کے ساتھ ساتھ حقیقی اور متصوفانہ نماز کے اسالیب اجاگر کیے۔ اس کے بعد ایمان و اسلام کی توضیح و فرق، اتباع سنت کی اہمیت، کبائر کی تشریح، نیت، فاقہ، سفر، امامت، مواخات اور نکاح کے احکام کو واضح کر دیا اور موجودہ دور کی بیشتر گمراہوں میں راہ نبوی کی طرف دعوت دی۔ سب سے آخر میں تجارت اور حلال روزی کی اہمیت پر زور دیا۔ اس حصہ میں حلال روزی کی اہمیت بتائی، اور حلال کھانے پر اصرار کیا جو کہ قبولیت اعمال کی پہلی شرط ہے۔

اگرچہ یہ کتاب چوتھی صدی ہجری میں احاطۂ تحریر میں آئی مگر محسوس ہوتا ہے کہ یہ کتاب آج کے دور کے لیے ایک زبردست اہمیت رکھتی ہے۔ ہو سکتا ہے یہی وجہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلۂ سابق نے آج کے دور کی رشد و ہدایت کے لیے اس کتاب کی دوبارہ اشاعت کا انتظام فرمایا ہو۔ ایک عجیب اتفاق ہے کہ عرب ممالک میں بھی آجکل اس کتاب کا چرچا ہے اور اس دور میں اہل مشرق کی رہنمائی کے لیے بھی اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرما دیا۔

میں اپنی علمی بے بضاعتی، باطنی بے بصیرتی اور اس کتاب کی اہمیت سب کا اعتراف

کرتا ہوں اور اپنے اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اس کتاب کو قبولِ عام عطا فرمائے۔ اسے لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنا دے اور احقر کے لیے اسے صدقہ جاریہ فرما دے اور احقر کی جملہ خطاؤں اور لغزشوں سے درگزر کرتے ہوئے ستاری سے کام لے۔

احقر الانام محمّد منظور الوجیدی
یوم الجمعۃ ۲۲۔ ربیع الثّانی ۱۳۸۸ھ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

حرفِ آغاز

ساری حمد و ثنا ذاتِ اوّل و ازلی تعالیٰ کے لیے ہے جو بغیر ابتداء اور پہلا پن کے کون و مکان سے بھی پہلے سے ہے۔ تمام زمانوں اور عالمِ کون کے فنا پذیر ہونے کے بعد وہی ذاتِ تبارک و تعالیٰ بغیر غایت کے آخر ہے۔ کسی بُعد کے بغیر وُہ اپنے غلبہ کے اعتبار سے بلند و بالا اور ظاہر ہے بغیر کسی مس کے اپنے قُرب کے لحاظ سے باطن بھی ہے۔ اس نے اپنے لُطف و کرم سے ہر مخلوق کو حسن بخشا اور ہر مخلوق کو قوت سے نوازا۔ اپنی حکمت سے احکام نافذ کیے اور تمام چیزیں اسی کے حکم کے تابع ہوئیں۔ اس نے دیکھی بن دیکھی سب جگہوں میں اپنی قدرت کے کرشمے دکھائے۔ اپنی مخلوق پر دنیا و آخرت میں اپنے انعامات فرمائے۔ جس کو چاہا اپنے فضل و کرم سے نوازا اور تمام لوگوں سے عدل فرمایا اور ان سب پر اپنے انعامات جاری رکھے۔ وہ ذات تبارک و تعالیٰ پاک و بلند ہے عزّت و جلال کی مالک ہے بعض کو چن لیا اور ان پر احسان فرمایا۔ ان پر اپنے کلام کا فضل و کرم کیا اور سب انسانوں پر یوں فضل فرمایا کہ انہی میں سے ایک انسان کو رسول بنا کر ان کی طرف مبعوث فرمایا۔ ہم اللّٰہ سے دُعا کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم اور آپ کی آل پر رحمت ہو۔ ہمیں اس کے انعامات کے شکر کی توفیق حاصل ہو اور ہمیں اس کی پوشیدہ قدرت کا مشاہدہ حاصل ہو۔

وصلی اللّٰہ تبارک و تعالیٰ علیٰ سیّد الاوّلین و الآخرین رسولہ المفضّل بالشفاعۃ والحوض المورود المخصوص بالوسیلۃ والمقام المحمود و علیٰ اخوانہ السابقین فی الازمان والنصارہ والتابعین باحسانٍ۔

وبعد: اس کتاب کا نام قُوت القلوب فی معاملۃ المحبوب ووصف طریق المرید الیٰ مقام التوحید ہے۔ اس کے مصنّف شیخ ابوطالب محمّد بن علی بن عطیہ حارثی مکی رضی اللّٰہ عنہ ہیں اس میں حسب ذیل اڑتالیس فصول ہیں:۔

فصل ۱ : آیاتِ مبارکہ جن میں معاملات کا ذکر ہے۔

فصل ۲ : جن آیات میں دن رات کے اوراد مذکور ہیں۔

فصل ۳ : دن رات میں مرید کے اشتغال۔

فصل ۲۸ : مقربین کا مراقبہ۔
فصل ۲۹ : صاحبِ مقامات مقربین ، ان کا امتیاز ، عابدین کا بیان اور غافلین کا امتیاز۔

فصل ۳۰ : اہلِ دل کے وساوسِ قلب۔
فصل ۳۱ : علم ، اس کی فضیلت ، علما کا بیان ، سب علوم کے مقابلہ میں علمِ معرفت کی فضیلت۔ سلف صالحین کا طریقہ ، علم ظاہر کے مقابلہ میں علمِ باطن کی فضیلت ، علمائے دنیا و علمائے آخرت میں فرق ، علمائے سوء کا بیان جو علم کے ذریعہ دنیا کماتے ہیں ، علم کی تعریف ، سلف کا طریقہ ، متاخرین کے قصے اور کلام ، سلف کے برعکس عوام کے نئے نئے افکار ، تمام علوم کے مقابلہ میں علمِ ایمان و یقین کی فضیلت۔ پرہیز ، آثار اور طرق آثار کا بیان۔
فصل ۳۲ : مقاماتِ یقین کی وضاحت ، اہلِ یقین کے احکام ، مقاماتِ یقین کی وہ اصل کہ جس کی طرف اہلِ یقین کے احوال راجع ہوتے ہیں۔ یہ نو ہیں ۔ (۱) توبہ (۲) صبر (۳) شکر (۴) امید (۵) خوف (۶) زہد (۷) توکل (۸) رضا (۹) محبت (اور ان میں یہی ترتیب ہے)۔
فصل ۳۳ : پانچ ارکانِ اسلام کی توضیح ۔ تمام مومنین کی توحید کی گواہی ، اس کے فضائل ، مقربین کی گواہی ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی اور اہلِ یقین کی فضیلت ، نماز کی تشریح ، اس میں پہلے استنجاء فرض ہے ، اس کی سنن ، وضو کے فرائض ، اس کی سنن اور فضائل ، نماز کے فرائض و سنن ، نماز پانے یا نماز رہ جانے کے احکام ، طریقہ نماز اور آدابِ نماز ؛ زکوٰۃ کی تشریح ، ادائیگی کا وقت ، صدقہ کے آداب و فضائل ، فقراء کا بیان ، ماہِ رمضان کا بیان ، حج کا بیان ، اس میں شریعت و ملت کی تکمیل ہے۔
فصل ۳۴ : اسلام و ایمان کی وضاحت ، عقودِ سنت ، عقیدۂ قلوب ، قلب و عمل کا اتصال ، ایمان و اسلام میں فرق ، ایمان میں استثناء ، نفاق کا ڈر ، اس میں سلف کا طریقِ کار ، علمِ ظاہر کے ساتھ عوام کا معاملہ ، ارکانِ اسلام ، ارکانِ ایمان۔
فصل ۳۵ : سنت ۔ فضائل ، مختصر آدابِ شریعت ، دل کے سولہ عقود مسلم ظاہر کی روشنی میں ؛ (۱) یہ عقیدہ رکھنا کہ ایمان قول و (۲) عمل کا نام ہے ۔ (۳) قرآن غیر مخلوق اور (۴) اللہ تبارک و تعالیٰ کا کلام ہے (۵) احادیثِ صفات کو تسلیم کرنا (۶) رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلّم کے صحابہ کی فضیلت کا اعتراف (۷) جس کو اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلّم مقدم رکھے اسے مقدم رکھنا۔ (۸) قیامت تک امامت قریش میں رہے گی (۹) اہل قبلہ میں سے کسی کی تکفیر نہ کرنا (۱۰) اللہ تعالیٰ کی طرف سے خیر و شر کی سب تقدیر پر ایمان لانا۔ (۱۱) پلِ صراط حق ہے (۱۲) حوضِ کوثر جس پر مومنین آئیں گے (۱۳) وہ حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم کا حوض ہے۔(۱۴) اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے دیدار پر ایمان لانا (۱۵) اہلِ توحید کا آخر کار دوزخ سے نکل آنا۔ (۱۶) حساب کتاب ہونے پر ایمان رکھنا، اس میں اہل بدعت کے مفہوم اور ان کے جماعت سے خارج ہونے کا بھی ذکر ہے نیز سنت کے فضائل، سلف صالحین اور تابعین کرام کے طریقہ کا بیان بھی ہے۔

فصل ۳۶ : شریعت و ایمان، مسلمان ہونے کی شرط، اللہ تعالیٰ سے محبت بہترین اسلام کی علامت ہے، مسلمان کے مسلمان پر حق یعنی حُرمتِ اسلام کا خیال رکھنا، بدن کی سنن، محبّت کے نام پر معاصی و بدعات کا بیان، محبّت کی فضیلت و استحسان، رکوع کا بیان۔

فصل ۳۷ : کبائر کا بیان اور محاسبۂ کفار۔

فصل ۳۸ : اخلاص، تصرفِ احوال میں اس کے محمود ہونے اور افعال میں اس کی آفات سے بچنے کا بیان۔

فصل ۳۹ : غذا میں ترتیب اور غذا کی کمی و بیشی کا بیان۔

فصل ۴۰ : غذاؤں کا بیان، غذاؤں کے آداب و سنن، مستحبات اور مکروہات

فصل ۴۱ : فقر کے فرائض و فضائل، عام اور خواص فقراء کا بیان، عطیات قبول کرنے اور مسترد کرنے کا بیان اور سلف کا طریق۔

فصل ۴۲ : مسافر کا حکم اور مقاصدِ سفر۔

فصل ۴۳ : امام، امامت اور مقتدی کے احکام۔

فصل ۴۴ : اللہ تعالیٰ کے لیے محبّت و رفاقت کا بیان اور محبّین کے اوصاف۔

فصل ۴۵ : نکاح کرنے اور ترکِ نکاح کا بیان، کون سا افضل ہے اور عورتوں کے بارے میں چند باتیں۔

فصل ۴۶ : حمام میں جانے کا بیان۔

فصل ۴۷ : صنعت، معیشت اور تجارت کا بیان : تاجر اور صنعت کار کی ذمہ داریاں۔
فصل ۴۸ : حلال وحرام کا بیان، شبہات، حلال کی فضیلت، مشتبہ کی مذمت اور ان کی امثال۔

فصل ا

معاملات

آیات قرآن کی روشنی میں

اس فصل میں ان آیات کا ذکر کیا جاتا ہے کہ جن میں معاملات کا بیان ہُوا۔

۱۔ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا (۱)

(اور جس نے چاہا پچھلا گھر اور دوڑ کی اس کے واسطے جو اس کی دوڑ ہے اور وہ یقین پر ہے۔ سو ایسوں کی دوڑ ٹھکانے لگی ہے۔)

۲۔ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۙ وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ؀ (۲)

(جو کوئی چاہتا ہو آخرت کی کھیتی، بڑھا دیں ہم اس کو اس کی کھیتی۔ اور جو کوئی چاہتا ہو دنیا کی کھیتی، اس کو دیں ہم کچھ اس میں سے اور اس کو کچھ نہیں آخرت میں حصہ)

۳۔ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ۙ؀ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ؀ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ۙ؀ (۳)

(اور یہ کہ آدمی کو وہی ملتا ہے جو کمایا اور یہ اس کی کمائی اس کو دکھانی ضرور ہے۔ پھر اس کو بدلا ملنا ہے اس کا پورا)

۴۔ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓئًا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ؀ (۴)

(کھاؤ اور پیو رچ سے بدلا اس کا جو آگے بھیجا تم نے پہلے دنوں میں)

۵۔ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ (۵)

(اور ہر کسی کو درجے ہیں اپنے عمل کے)

۶۔ وَمَآ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ بِالَّتِيْ تُقَرِّبُكُمْ عِنْدَنَا زُلْفٰٓى اِلَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۡ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَزَآءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا (۶)

(اور نہ تمہارے مال اور نہ تمہاری اولاد وہ نہیں کہ نزدیک کر دیں ہمارے پاس تمہارا درجہ پر جو کوئی یقین لایا اور بھلا کام کیا سو ان کو ہے بدلا دونا ان کے کیے پر)

---

(۱) سورت اسراء آیت ۹ (۲) سورۃ الشوریٰ آیت ۲۰ (۳) سورۃ النجم آیت ۳۹-۴۱

(۴) سورۃ الحاقۃ آیت ۲۴ (۵) سورۃ احقاف آیت ۱۹ (۶) سورۃ سبا آیت ۳۷

۷۔ وَنُوْدُوْٓا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۱)

(اور آواز آئے گی کہ یہ جنت ہے، وارث ہوئے تم اس کے بدلے میں اپنے اعمال کے)

۸۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ (۲)

(سو کسی جی کو معلوم نہیں جو چھپا دھری ہے ان کے واسطے آنکھوں کی ٹھنڈک بدلا اس کا جو کرتے تھے)

۹۔ نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ٥ (۳)

(خوب اجر ہے کام کرنے والوں کا جنہوں نے صبر کیا اور اپنے پروردگار پر وہ توکل کرتے ہیں)

۱۰۔ لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ٥ (۴)

(انہی کے لیے ہے سلامتی کا گھر اپنے رب کے ہاں اور وہ ان کا مددگار ہے بسبب ان کے اعمال کے)

---

(۱) سورۃ الاعراف آیت ۴۳ (۲) سورۃ السجدہ آیت ۱۷ (۳) سورۃ العنکبوت آیت ۵۸، ۵۹
(۴) سورۃ الانعام آیت ۱۲۷

فصل ۲

دِن رات اللہ کا ذکر کرو

اللہ تعالیٰ نے کئی جگہ دن رات اللہ کی یاد کرنے کا حکم دیا، فرمایا:

۱۔ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَن يَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا ۝ (۱)

(اور وہی ہے جس نے بنائے رات اور دن بدلتے سدلتے اس شخص کے واسطے کہ چاہے دھیان رکھنا یا چاہے شکر کرنا)

۲۔ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا ۝ (۲)

(البتہ دن میں شغل رہتا ہے لمبا) (اور پڑھے جا نام اپنے رب کا اور چھوٹ کر چلا آ اس کی طرف سب سے الگ ہو کر)

۳۔ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ۝ (۳)

(اور اپنے رب کا نام پڑھ صبح اور شام اور رات کو، سو اس کو سجدہ کر اور طویل رات اس کی تسبیح بیان کر)

۴۔ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوبِ ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ وَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ۔ (۴)

(اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کر آفتاب نکلنے سے پہلے اور غروب سے پہلے اور رات کو اس کی تسبیح بیان کر اور پیچھے سجدہ کے)

۵۔ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ ۝ (۵)

(اور پاکی بیان کر اپنے رب کی خوبیاں جس وقت تو اٹھتا ہے اور کچھ رات میں بول اس کی پاکی اور پیٹھ پھیرتے وقت تاروں کے)

۶۔ إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا ۝ (۶)

(البتہ اٹھنا رات کو سخت روندتا ہے اور سیدھی نکلتی ہے بات)

---

(۱) سورۃ الفرقان آیت ۶۲ (۲) سورۃ المزمل آیت ۷، ۸ (۳) سورۃ الدہر آیت ۲۵، ۲۶۔
(۴) سورۃ ق آیت ۳۹، ۴۰ (۵) سورۃ الطور آیت ۴۸، ۴۹ (۶) سورۃ المزمل آیت ۶۔

۷۔ وَمِنْ اٰنَاۗئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ۝ (۱)

(اور کچھ گھڑیوں میں رات کی پڑھا کر اور ان کی حدوں پر شاید کہ تو راضی ہو)

۸۔ اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَاۗىِٕمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (۲)

(بھلا ایک جو بندگی میں لگا ہے رات کی گھڑیوں میں سجدے کرتا ہوا اور کھڑا ہوا خطرہ رکھتا ہے آخرت کا اور امید رکھتا ہے اپنے رب کی رحمت کی تو کہہ ، کوئی برابر ہوتے ہیں سمجھ والے اور بے سمجھ)

۹۔ تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا (۳)

(جدا رہتی ہیں ان کی کروٹیں اپنے سونے کی جگہ سے پکارتے ہیں اپنے رب کو ڈر سے اور لالچ سے)

۱۰۔ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ۝ (۴)

(اور جو رات گزارتے اپنے پروردگار کو سجدہ کرتے اور قیام کرتے)

۱۱۔ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ۝ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ۝ (۵)

(وہ تھے رات کو تھوڑا سوتے اور صبح کے وقتوں میں معافی مانگتے)

۱۲۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۭ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۝ (۶)

(قائم رکھ نماز کو سورج ڈھلنے سے رات کے اندھیرے تک اور قرآن پڑھنا فجر کا - بیشک قرآن پڑھنا فجر کا ہوتا ہے روبرو اور کچھ رات جاگتا رہ قرآن کے ساتھ یہ بڑھتی ہے تیرے لیے)

۱۳۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۭ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّـيِّاٰتِ ۭ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ۝ (۷)

(اور قائم کر نماز کو دونوں طرف دن کے اور کچھ ٹکڑوں میں رات کے البتہ نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو۔ یہ یادگاری ہے یاد رکھنے والوں کے لیے)

---

(۱) سورۃ طٰہٰ آیت ۱۳۰ (۲) سورۃ الزمر آیت ۹ (۳) سورۃ السجدہ آیت ۱۶ (۴) سورۃ الفرقان آیت ۶۴
(۵) سورۃ الذاریات آیت ۱۷-۱۸ (۶) سورۃ الاسراء آیت ۷۸، ۷۹ (۷) سورۃ ہود آیت ۱۱۴ ۔

۱۴۔ فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ٥ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ٥ (۱)

(سو پاک اللہ کی یاد کرو۔ جب شام کرو اور جب صبح کرو ۔ اور اس کی خوبی ہے آسمان میں اور زمین میں اور پچھلے وقت اور جب دوپہر ہو)

---

(۱) سورۃ الروم آیت ۱۷، ۱۸ ۔

فصل ۳

سالک کے معمولات

اس باب میں دن رات میں مرید کے معمولات ذکر کیے جاتے ہیں کہ اس کے فرائض کیا کیا ہیں اور کون سے کام مندوب و مستحق ہیں۔ جب طلوعِ فجر ہو جائے۔ فجر سے مراد یہ ہے کہ رات جانے کے بعد ستارے ڈوبنے کے وقت مشرق کی طرف افق پر پھیلی ہوئی سیاہی ہٹنے لگے اور وہاں اُفق کے ساتھ ساتھ سفیدی کی لکیر نمودار ہونے لگے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے بندوں کو حکم دیا اور فرمایا؛

وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ۔

(اور کچھ رات میں بول اس کی پاکی اور پیٹھ پھیرتے وقت تاروں کے)

بندے کو چاہیے کہ وہ اس وقت فجر کی دو رکعتیں ادا کرے اور ان میں قُل یاایھا الکافرون اور قل ھو اللہ احد پڑھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اوقات یہی دونوں سورتیں پڑھا کرتے چاہے تو آہستہ پڑھے اور چاہے تو جہر کرے۔ اس مسئلہ میں دونوں حدیثیں ہیں۔ ایک سے آہستہ پڑھنے کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی دو سنتیں اس قدر ہلکی پڑھتے کہ میں سوچتی کہ آپؐ نے سورۂ فاتحہ بھی پڑھی یا نہیں اور دوسری حدیث میں جہر کا پتہ چلتا ہے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ میں نے بیس۲۰ روز تک حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نظر رکھی۔ میں نے سُنا۔ آپؐ فجر کی دو (سنتوں) میں قل یاایھا الکافرون اور قل ھو اللہ احد پڑھتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم کی حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنتوں کی پہلی رکعت میں سورۃ بقرہ کی یہ آیت پڑھی؛ قولوا امنا باللہ وما انزل الینا وما انزل الی ابراھیم و اسمٰعیل الخ اور دوسری رکعت میں یہ آیت پڑھی؛ ربنا آمنا بما انزلت واتبعنا الرسول فاکتبنا مع الشٰھدین۔ چنانچہ گاہے گاہے ان دو آیات کو بھی پڑھ لینا چاہیے دو سنت ادا کرنے کے بعد ستر بار اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگے۔ یوں کہے؛ اَسْتَغْفِرُ اللہَ الْعَظِیْمَ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَ اَسْاَلُهُ التَّوْبَةَ۔

ترجمہ؛ (میں عظیم اللہ سے بخشش مانگتا ہوں۔ اس کے بغیر کوئی معبود نہیں وہ زندہ اور

قائم رکھنے والا ہے اور اس سے توبہ کا سوال کرتا ہوں)

اس کے بعد قرآن مجید میں ذکر کردہ ان چار جامع کلمات کو ایک سو بار پڑھے مگر یہ قرآن نہیں ۔ یہ دراصل تسبیح تہلیل تکبیر اور حمد کا مجموعہ ہے ۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ

ترجمہ : (اللہ پاک ہے اور ساری حمد اللہ کے لیے ہے اور اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے پھر ایک بار استغفراللہ وتبارک اللہ کہے ۔ (میں اللہ سے بخشش مانگتا ہوں اور اللہ برکت والا ہے) اور اس دعا پر ختم کر دے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فجر کی دو سنتوں کے بعد یہی دعا کیا کرتے ۔

فجر کی سنتوں کے بعد یہ دُعا پڑھے

فجر کی سنتیں ادا کرنے کے بعد یہ دعا پڑھے ۔ یہ دعا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے ۔ فرماتے ہیں کہ مجھے عباس رضی اللہ عنہ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھیجا ۔ میں شام کو آپؐ کے پاس حاضر ہوا ۔ آپؐ میری خالہ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں تشریف فرما تھے ۔ آپؐ نے رات کو نماز پڑھی اور خوب قیام فرمایا ۔ جب آپؐ نے فجر سے پہلے دو رکعت (سنن) ادا کیں تو آپؐ نے یہ دُعا پڑھی :

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِكَ تَهْدِیْ بِهَا قَلْبِیْ وَ تَجْمَعُ بِهَا شَمْلِیْ وَ تَلُمُّ بِهَا شَعْثِیْ وَ تَرُدُّ بِهَا اُلْفَتِیْ وَ تُصْلِحُ بِهَا عَلَانِیَتِیْ وَ تَقْضِیْ بِهَا دَیْنِیْ وَ تَحْفَظُ بِهَا غَائِبِیْ وَ تَرْفَعُ بِهَا شَاهِدِیْ وَ تُزَكِّیْ بِهَا عَمَلِیْ وَ تُبَیِّضُ بِهَا وَجْهِیْ وَ تُلْهِمُنِیْ بِهَا رُشْدِیْ وَ تَعْصِمُنِیْ بِهَا مِنْ كُلِّ سُوْٓءٍ ۔

اے اللہ میں تجھ سے ایسی رحمت کا سوال کرتا ہوں کہ اس سے تو میرے دل کو ہدایت دے اور میرا خاندان جمع کر دے اور میری پراگندگی کی اس سے اصلاح فرمائے اور اس سے میری الفت واپس لائے اور اس سے میرے ظاہر کو درست کر دے اور اس سے میرا قرض چکا دے اور اس سے میرے غائب کی حفاظت کرے اور اس سے میرے شاہد کو اٹھائے اور اس سے میرے عمل کو پاک کر دے اور اس سے میرا چہرہ سفید (نورانی) کر دے اور اس سے مجھے ہدایت کی بات الہام فرمادے اور اس سے مجھے ہر برائی سے بچائے ۔

اَللّٰهُمَّ اَعْطِنِيْ اِيْمَانًا صَادِقًا وَ يَقِيْنًا
لَيْسَ بَعْدَهٗ كُفْرٌ وَ رَحْمَةً
اَنَالُ بِهَا شَرَفَ كَرَامَتِكَ فِي الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ الْفَوْزَ
عِنْدَ الْقَضَآءِ وَ مَنَازِلَ الشُّهَدَآءِ وَ عَيْشَ
السُّعَدَآءِ وَ مُرَافَقَةَ الْاَنْبِيَآءِ وَالنَّصْرَ
عَلَى الْاَعْدَآءِ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اُنْزِلُ بِكَ
حَاجَتِيْ وَ اِنْ قَصُرَ رَاْيِيْ وَ ضَعُفَ
عَمَلِيْ وَ افْتَقَرْتُ اِلٰى رَحْمَتِكَ فَاَسْئَلُكَ
يَا قَاضِيَ الْاُمُوْرِ وَ يَا
شَافِيَ الصُّدُوْرِ كَمَا تُجِيْرُ
بَيْنَ الْبُحُوْرِ اَنْ تُجِيْرَنِيْ مِنْ عَذَابِ
السَّعِيْرِ وَ مِنْ دَعْوَةِ الثُّبُوْرِ وَ
مِنْ فِتْنَةِ الْقُبُوْرِ۔ اَللّٰهُمَّ مَا قَصُرَ عَنْهُ
رَاْيِيْ وَ ضَعُفَ عَنْهُ عَمَلِيْ وَ لَمْ تَبْلُغْهُ نِيَّتِيْ
وَ اُمْنِيَّتِيْ مِنْ خَيْرٍ وَ عَدْتَهٗ اَحَدًا مِنْ
خَلْقِكَ اَوْ خَيْرٍ اَنْتَ مُعْطِيْهِ اَحَدًا
مِنْ عِبَادِكَ فَاِنِّيْ اَرْغَبُ
اِلَيْكَ فِيْهِ وَ اَسْئَلُكَهٗ يَا
رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ۔ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا
هَادِيْنَ مَهْدِيِّيْنَ غَيْرَ ضَآلِّيْنَ
وَ لَا مُضِلِّيْنَ حَرْبًا لِاَعْدَآئِكَ
وَ سِلْمًا لِاَوْلِيَآئِكَ نُحِبُّ
بِحُبِّكَ النَّاسَ وَ نُعَادِيْ
بِعَدَاوَتِكَ مَنْ خَالَفَكَ مِنْ

اے اللہ مجھے سچا ایمان عطا کر اور ایسا یقین عطا کر کہ
اس کے بعد کوئی کفر نہ ہو اور ایسی رحمت عطا کر کہ
جس سے میں دنیا و آخرت میں تیرے فضل کا شرف حاصل
کروں۔ اے اللہ میں قضا کے وقت کامیابی کا سوال
کرتا ہوں اور شہیدوں کے درجات اور خوش بختوں
کی زندگی اور انبیاء کی مصاحبت اور دشمنوں پر مدد کا
سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ! میں تیرے سامنے
اپنی حاجت رکھتا ہوں اگرچہ میری رائے ناقص ہے
اور میرا عمل کم ہے اور میں تیری رحمت کا محتاج
ہوں میں سوال کرتا ہوں اے تمام امور کے فیصلے
کرنے والے اور اے سینوں کے شافی جیسے کہ
تو سمندروں میں پناہ دیتا ہے مجھے دوزخ کے عذاب
سے اور بری پکار سے اور قبروں کے فتنہ سے
پناہ عطا فرما۔ اے اللہ! جس سے میری رائے ناقص
ہوئی اور عمل کم ہوا اور میری نیت اور میری خواہش
پس بھلائی نہ پہنچی جس کا تو نے اپنی مخلوق میں
سے کسی کے ساتھ وعدہ کیا ہے یا جو بھلائی تو اپنے
بندوں میں سے کسی کو عطا کرے گا بیشک میں بھی
تیرے سامنے اس کا خواہشمند اور سوالی ہوں۔
اے سارے جہانوں کے پروردگار! اے اللہ!
ہمیں ہدایت دینے والے اور ہدایت یافتہ بنائے
نہ گمراہ ہوں اور نہ گمراہ کریں۔ تیرے دشمنوں سے
لڑنے والے اور تیرے اولیاء سے صلح
کرنے والے ہوں۔ تیری محبت پہ لوگوں سے
محبت کریں اور تیری عداوت پر تیرے مخالف سے۔

خَلْقِكَ - اَللّٰهُمَّ هٰذَا الدُّعَآءُ وَ عَلَيْكَ
الْاِجَابَةُ وَ هٰذَا الْجُهْدُ وَ عَلَيْكَ
التُّكْلَانُ فَاِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا
اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ لَا حَوْلَ وَلَا
قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ذِى الْحَبْلِ الشَّدِيْدِ وَ
الْاَمْرِ الرَّشِيْدِ اَسْاَلُكَ الْاَمْنَ يَوْمَ الْوَعِيْدِ
وَالْجَنَّةَ يَوْمَ الْخُلُوْدِ مَعَ الْمُقَرَّبِيْنَ
الشُّهُوْدِ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ وَالْمُوْفِيْنَ
بِالْعُهُوْدِ اِنَّكَ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ وَ اَنْتَ
تَفْعَلُ مَا تُرِيْدُ سُبْحَانَ الَّذِىْ تَعَطَّفَ
بِالْعِزِّ وَ قَالَ بِهٖ سُبْحَانَ الَّذِىْ لَبِسَ
الْمَجْدَ وَ تَكَرَّمَ بِهٖ سُبْحَانَ الَّذِىْ
لَا يَنْبَغِى التَّسْبِيْحُ اِلَّا لَهٗ سُبْحَانَ
ذِى الْفَضْلِ وَ النِّعَمِ سُبْحَانَ ذِى
الْقُدْرَةِ وَالْكَرَمِ سُبْحَانَ الَّذِىْ اَحْصٰى
كُلَّ شَىْءٍ بِعِلْمِهٖ اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ لِّىْ نُوْرًا
فِىْ قَلْبِىْ وَ نُوْرًا فِىْ قَبْرِىْ وَ نُوْرًا فِىْ
سَمْعِىْ وَ نُوْرًا فِىْ بَصَرِىْ وَ نُوْرًا فِىْ شَعْرِىْ
وَ نُوْرًا فِىْ بَشَرِىْ وَ نُوْرًا فِىْ لَحْمِىْ وَ
نُوْرًا فِىْ دَمِىْ وَ نُوْرًا فِىْ عِظَامِىْ وَ نُوْرًا
مِنْ بَيْنِ يَدَىَّ وَ نُوْرًا مِنْ خَلْفِىْ وَ
نُوْرًا عَنْ يَمِيْنِىْ وَ نُوْرًا عَنْ شِمَالِىْ
وَ نُوْرًا مِنْ فَوْقِىْ وَ نُوْرًا مِنْ
تَحْتِىْ - اَللّٰهُمَّ زِدْنِىْ نُوْرًا وَ اجْعَلْ
لِّىْ نُوْرًا -

ہم دشمنی کریں جو کہ تیری مخلوق میں سے (تیرا دشمن ہو)۔
اے اللہ! یہ دعا ہے اور تجھ پر اس کا قبول کرنا ہے
اور یہ کوشش ہے اور مجھ پر بھروسا ہے۔ سو ہم اللہ کے
ہیں اور ہمیں اس کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اللہ کے بغیر
کوئی قوت نہیں اور نہ ہی ڈر ہے جو کہ طاقت اور امر رشید
کا مالک ہے۔ میں روزِ جزاء کو تجھ سے امن مانگتا ہوں
اور خلد کے روز جنت کا دعا گو ہوں۔ شاید مقربین اور
رکوع و سجود کرنے والے اور ایفائے عہد کرنے والوں کے
ہمراہ بے شک تو بڑا رحم کرنے والا دوست دار اور تو جو
چاہے کرتا ہے۔ پاک ہے وہ ذات جو کہ عزت والا ہو
اور یہ فرمایا پاک ہے وہ جس نے بزرگی کا لباس پہنا اور
اس سے مکرم ہوا۔ پاک ہے وہ ذات کہ تسبیح صرف اسی کے لیے
مناسب ہے۔ پاک ہے فضل و انعامات کا مالک، پاک
ہے قدرت و کرم کا مالک، پاک ہے جس نے اپنے علم میں
ہر چیز شمار کی۔ اے اللہ میرے دل میں نور ڈال دے اور
میری شنوائی میں نور ڈال دے اور میری آنکھوں میں نور
اور میرے بالوں میں نور اور میری جلد میں نور اور میرے
گوشت میں نور اور میرے خون میں نور اور میری
ہڈیوں میں نور اور میرے سامنے نور اور میرے پیچھے
نور اور میرے دائیں نور اور میرے بائیں نور اور
میرے اوپر نور اور میرے نیچے نور کر دے۔ اے اللہ
میرے نور میں زیادتی فرما اور مجھے نور عطا فرما اور مجھے
نور ہی بنا دے۔

یہ وُہ انوارات ہیں کہ جن کا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انوار کی طرف ہی دائمی طور پر نظر رہے تاکہ ہر حرکت و سکون میں مشاہدہ الٰہی ہوتا رہے۔ اور اس پر توکل نگاہ رہے اور اس طرح انسان سیدھی راہ پر گامزن رہے۔ اس کی نگاہ میں کجی نہ آئے اور وُہ سرکشی و گناہ میں ملوّث نہ ہونے پائے اور نہ ہی نفسانی خواہشات کا تابع بن کر رہ جائے۔

بندے کو چاہیے کہ وُہ فجر کی دو سنتوں کے بعد یہ دعا مانگے مگر دُعا کرنے سے پہلے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھ لے۔ اس کے بعد اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اس کی دُعا قبول کرے گا اور اس کی دعا ردّ نہ ہو گی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جب تم اللہ تعالیٰ سے کسی حاجت کی دعا کرو تو ابتداء میں مجھ پر درود بھیجو۔ اس لیے اللہ کریم سے یہ بات دور ہے کہ اس سے دو حاجتیں مانگی جائیں اور وہ ایک دے دے اور دُوسری کو رد کر دے۔ پھر بندے کو چاہیے کہ فجر کی نماز باجماعت ادا کرے تاکہ وُہ اللہ کی پناہ و حفاظت میں آجائے۔ حدیث میں آتا ہے کہ صبح کی نماز باجماعت ادا کرنا رات بھر کے قیام سے بہتر ہے اور عشاء کی نماز باجماعت نصف رات تک کے قیام سے بہتر ہے اور جب نماز میں کھڑا ہو تو کان لگائے، دل حاضر کرے، عقل کو بیدار رکھے، ہمّت سے کام لے خوب چوکنا رہے اور قرآن مجید میں غور و فکر کرے اور ترتیل کا لحاظ رکھے نیز عجائباتِ کلام پر نظر رکھتا جائے۔ جب سلام پھیرے تو مستحب ذکر کرے (جو کہ اگلی فصل میں بیان ہوگا)۔

فصل ۴

نمازِ فجر کے بعد کے اذکار

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازِ فجر کا سلام پھیرنے کے بعد حسب ذیل اذکار پڑھنا مستحب ہے۔ سلام پھیر کر یوں کہے :۔

۱۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّآلِہٖ (اے اللہ محمدؐ اور آپؐ کی آل پر رحم فرما)۔

۲۔ اَللّٰھُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَ مِنْکَ السَّلَامُ وَ اِلَیْکَ یَعُوْدُ السَّلَامُ فَحَیِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ وَ اَدْخِلْنَا دَارَ السَّلَامِ تَبَارَکْتَ یَا ذَا الْجَلَالِ وَ الْاِکْرَامِ۔

(اے اللہ تو ہی سلام ہے اور تجھ سے ہی سلامتی ہے اور تیری طرف سلامتی لوٹتی ہے۔ اے ہمارے پروردگار ہمیں سلامتی سے زندہ رکھ اور ہمیں سلامتی کے گھر میں داخل فرما تو برکت والا ہے اے جلال و اکرام والے)

۳۔ تین بار یہ کلمات کہے :

سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ وَ بِحَمْدِہٖ (اللہ بزرگ پاک ہے اور اپنی حمد کے ساتھ)

۴۔ تین بار استغفار پڑھے اور یوں کہے :

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ ، اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ ، اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ (اے اللہ میں تجھ سے بخشش چاہتا ہوں)

۵۔ پھر یہ کلمات کہے :

اَللّٰھُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ وَلَا یَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْکَ الْجَدُّ ۔

(اے اللہ جسے تو عطا کرے کوئی روکنے والا نہیں اور جس سے تو روکے اسے دینے والا کوئی نہیں اور (تیری مرضی کے بغیر) تجھ سے کوشش والے کو کوشش نفع نہ ملے ۔)

۶۔ پھر دس بار یہ کلمات کہے،

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ وَ ھُوَ حَیٌّ لَّا یَمُوْتُ بِیَدِہِ الْخَیْرُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○

ترجمہ : تنہا اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں اس کا کوئی شریک نہیں ، اس کی ملکیت ہے اور

اس کی حمد ہے وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور وہ زندہ ہے کبھی نہ مرے گا، اسی کے قبضہ میں بھلائی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔)

۷۔ پھر اسی طرح بیٹھا رہے اور دس بار قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (سورہ اخلاص) پڑھے اور پھر دس بار یہ کلمات پڑھے:

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ رَبِّ اَعُوْذُبِکَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنَ

ترجمہ: میں سننے جاننے والے اللہ کی پناہ لیتا ہوں مردود شیطان سے۔ میرے پروردگار میں شیطانوں کے وساوس سے تیری پناہ لیتا ہوں اور اے پروردگار میں اس بات سے بھی تیری پناہ چاہتا ہوں کہ وہ (شیاطین) میرے پاس آئیں)

۸۔ اور تین بار یہ کلمات کہے:

سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَی الْمُرْسَلِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

ترجمہ: اے پروردگار تو پاک ہے تو ربّ العزّت (کافروں کی غلط) توصیف سے پاک ہے اور تمام رسولوں پر سلامتی ہو اور اللہ تمام جہانوں کے پروردگار کے لیے ہی ساری حمد ہے)

۹۔ تین بار یہ کلمات کہے:

فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِیْنَ تُمْسُوْنَ وَحِیْنَ تُصْبِحُوْنَ۔

ترجمہ: پس پاک ہے اللہ جب تم شام کرتے ہو اور جب تم صبح کرتے ہو۔

۱۰۔ اس کے بعد ۳۳ بار سُبْحَانَ اللّٰهِ، ۳۳ بار اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ اور ۳۴ بار اَللّٰهُ اَکْبَرُ ہے۔ یہ ایک سو بار بن گیا۔ چاہے تو اسے پچیس بار پڑھے اور لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ زیادہ کر لے اور اگر حسب ذیل کلمات ۲۵ بار پڑھے تو سب ورد اسی میں آجائے، کلمات یہ ہیں۔ ان پر دوام کرنا بھی آسان ہے۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَکْبَرُ۔

ترجمہ: اللہ پاک ہے اور اللہ ہی کی ساری حمد ہے اور اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔

۱۱۔ اس کے بعد سورۃ فاتحہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ پڑھے۔ آیت الکرسی پڑھے اور سورۃ بقرہ کی آخری آیات اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْہِ سے لے کر آخر سورت تک پڑھے اور یہ آیت پڑھے شَہِدَ اللّٰہُ آخر آیت تک اور یہ آیت پڑھے۔ قُلِ اللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ یہ دونوں آیات پڑھے۔ اس کے بعد لَقَدْ جَآءَ کُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ آخر آیت تک پڑھے۔ پھر قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا آخر آیت تک پڑھے۔ پھر لَقَدْ صَدَقَ اللّٰہُ رَسُوْلَہُ الرُّؤْیَا سے لے کر آخر سورت تک پڑھے۔ اس کے بعد سورۃ الحدید کی پہلی پانچ آیات، سورۃ الحشر کی آخری تین آیات کی تلاوت کرے۔ ان آیات کے بعد سات بار یوں دعا کرے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِکَرَمِ وَجْھِکَ الصَّلٰوۃَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَسْئَلُکَ الْجَنَّۃَ وَ اَعُوْذُبِکَ مِنَ النَّارِ۔

دُنیا و آخرت کے لیے ایک مختصر ورد

حضرت قبیصہ بن مخارق رضی اللہ عنہ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ مجھے ایسے کلمات بتا دیجیے کہ جن کی برکت سے اللہ مجھے فائدہ دے اور اختصار کا خیال رکھیے۔ میری عمر زیادہ ہو گئی اور اب میں زیادہ اوراد سے عاجز ہو گیا جو کیا کرتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا: تیری دنیا کے لیے یہ ہے کہ جب صبح کی نماز پڑھ لے تو تین بار یہ کلمات پڑھ لیا کر۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَبِحَمْدِہٖ سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ وَبِحَمْدِہٖ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ

ترجمہ: اللہ پاک ہے اور اس کی حمد ہے، اللہ بزرگ پاک ہے۔ اللہ کے بغیر نہ ہی ڈر ہے اور نہ طاقت ہے۔ جب تم نے یہ کلمات کہہ لیے تو اب تُو اندھاپن، جذام، برص اور فالج سے محفوظ ہو گیا اور تیری آخرت کے لیے یہ (وظیفہ) ہے کہ:

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ وَّاھْدِنِیْ مِنْ عِنْدِکَ وَاَفِضْ عَلَیَّ مِنْ فَضْلِکَ وَانْشُرْ عَلَیَّ مِنْ رَّحْمَتِکَ وَاَنْزِلْ عَلَیَّ مِنْ بَرَکَاتِکَ۔

ترجمہ: اے اللہ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آلِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم (یعنی تمام امتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر رحم فرما اور مجھے اپنے ہاں سے رہنمائی فرما اور مجھ پر اپنا فضل فرما۔ اور مجھ پر اپنی رحمت پھیلا اور مجھ پر اپنی برکات نازل فرما۔

اس کے بعد جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جب قیامت کو ان کا اجر ملے گا تو کچھ باقی نہ رہے گا (ہر طرح کی نعمتیں ملیں گی) اس کی خاطر جنّت کے چار دروازے کھول دیے جائیں گے۔ جس سے چاہے اندر چلا جائے۔

ایک خاص وظیفہ

حضرت خضرؑ نے انھیں بتایا کہ انھیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایک ایسا وظیفہ بتایا کہ جس کی فضیلت بیان سے باہر ہے۔ یہ ورد کرنا سعادت مندی اور اللہ عزوجل کے خاص احسان کی دلیل ہے۔ حقیقت ہے کہ یہ ایک ورد دنیا بھر کے اوراد پر حاوی ہے۔

سعید بن سعید نے ابو طیبہ سے، انھوں نے کرز بن وبرہ سے نقل کیا۔ یہ ابدال میں سے تھے۔ کرزؒ بتاتے ہیں۔ میرے ایک شامی بھائی نے مجھے یہ تحفہ دیا۔ وہ کہنے لگے : اے کرز! مجھ سے یہ تحفہ لو۔ یہ بہترین تحفہ ہے۔ میں نے پوچھا : بھائی، تجھے یہ تحفہ کس نے دیا؟ کہنے لگے مجھے ابراہیم تیمیؒ نے یہ تحفہ دیا۔ میں نے کہا : کیا آپ نے ابراہیمؒ سے پوچھا کہ انھیں کس نے دیا؟ کہنے لگے ہاں! ابراہیمؒ نے مجھے بتایا کہ میں کعبہ کے صحن میں بیٹھا تھا۔ تسبیح وتحمید اور لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں مشغول تھا۔ ایک آدمی میرے پاس آیا سلام کہا اور میری دائیں جانب بیٹھ گیا۔ میں نے اپنے دور میں اس جیسا حسین، سفید اُجلے لباس والا، گورا، چٹّا اور دمکتا ہُوا آدمی کبھی نہیں دیکھا۔ میں نے پُوچھا : اے اللہ کے بندے! تُو کون ہے، کہاں سے آیا ہے؟ اس نے جواب دیا : میں خضر ہُوں۔ میں نے پوچھا : میرے پاس کس مقصد سے آئے؟۔ کہنے لگے : میں تجھے سلام کہنے آیا ہُوں، مجھے اللہ تعالیٰ کی خاطر تجھ سے محبّت ہے۔ میرے پاس ایک تحفہ ہے وہ میں تمھیں دینا چاہتا ہُوں۔ میں نے پوچھا : وہ تحفہ کیا چیز ہے؟۔ کہنے لگے : وہ تحفہ یہ ہے :

۱۔ طلوعِ آفتاب اور غروبِ آفتاب سے پہلے سات بار سورۃ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ آخر تک پڑھو۔

۲۔ سات بار قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ آخر تک پڑھو۔

۳۔ سات بار قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ آخر تک پڑھو۔

۴۔ سات بار قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ آخر تک پڑھو۔

۵۔ سات بار قُلْ يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ آخر تک پڑھو۔

۶۔ سات بار آیت الکرسی پڑھو۔

۷۔ سات بار سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ پڑھو۔

۸۔ سات بار حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم پر درود شریف پڑھو۔

۹۔ پھر اپنے والدین واولاد، اہل وعیال، تمام مومن مردوں، مومن عورتوں، زندہ اور فوت شدہ مسلمانوں کے لیے استغفار کرو (یعنی یوں کلمات کہو، اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِاَھْلِیْ وَلِاَوْلَادِیْ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ الْاَحْیَاءِ مِنْھُمْ وَالْاَمْوَاتِ (مترجم)

۱۰۔ اور سات باریوں دُعا کرو:

اَللّٰھُمَّ یَا رَبِّ افْعَلْ بِیْ وَ بِھِمْ عَاجِلًا وَّ آجِلًا فِی الدِّیْنِ وَ الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ مَا اَنْتَ لَہٗ اَھْلٌ وَ لَا تَفْعَلْ بِنَا یَا مَوْلَانَا مَا نَحْنُ لَہٗ اَھْلٌ اِنَّکَ غَفُوْرٌ حَلِیْمٌ جَوَادٌ کَرِیْمٌ رَؤُفٌ رَّحِیْمٌ۔

(اے اللہ میرے ساتھ اور ان کے ساتھ دین و دنیا و آخرت میں زود و بدیر ایسا برتاؤ کر جو تیرے (کرم) کے لائق ہے اور اے ہمارے مولا ہمارے ساتھ وُہ برتاؤ نہ کرنا جس کے ہم لائق ہیں، بیشک تو ہی بخشنے والا، بُردبار سخی، کرم کرنے والا، مہربان، رحم کرنے والا ہے۔

اور دیکھنا ان اوراد کو کسی صبح یا شام ناغہ نہ کرنا۔ میں نے اُن سے عرض کیا: میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ تو بتادیں کہ یہ عطیہ آپ کو کس نے دیا؟ انھوں نے بتایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہ عطا فرمایا۔ میں نے عرض کیا: مجھے اس کا اجر ثواب تو بتادیں۔ کہنے لگے جب تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلّم سے ملاقات کروگے تو اس کا ثواب معلوم کر لینا، وُہ تمھیں بتادیں گے۔

ابراہیم تیمیؒ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں نے خواب دیکھا کہ فرشتے آئے اُسے اُٹھایا اور جنت میں داخل کر دیا۔ جنت میں عجیب عجیب انعامات دیکھے اور ان انعامات کا ذکر کر کے کہنے لگے کہ میں نے فرشتوں سے پُوچھا۔ یہ انعامات کس کے لیے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا یہ اس کے لیے ہیں جو وہی عمل کرے جو تم کرتے ہو۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے جنت کا پھل بھی کھایا اور پانی بھی پیا۔ پھر میرے پاس حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم تشریف لائے۔ آپؐ کے ہمراہ ستر انبیاء علیہم السلام تھے اور فرشتوں کی ستر قطاریں تھیں۔ ہر قطار مشرق سے مغرب تک طویل تھی۔ آپؐ نے مجھے السلام علیکم کہا اور میرا ہاتھ پکڑلیا۔ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! خضر نے مجھے بتایا ہے کہ میں نے یہ حدیث آپؐ سے سُنی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: خضر نے سچ کہا اور اس نے جو کچھ بیان کیا وُہ حق ہے۔ وہ اہل زمین میں بڑا عالم ہے، وُہ ابدال کا سردار ہے۔ وُہ زمین میں اللہ کے لشکروں میں سے ہے۔ میں نے عرض کیا۔ اے اللہ

کے رسول! جو آدمی یہ عمل کرے مگر میری طرح خواب میں اس پر ملنے والے انعامات نہ دیکھے تو کیا اسے بھی یہ انعامات عطا ہوں گے؟ آپؐ نے فرمایا: قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے حق دے کر مبعوث فرمایا! جو آدمی مجھے نہ دیکھے اور نہ ہی جنت دیکھ سکے اسے بھی اس عمل پر یہ اجر ملے گا اور اس کے تمام کبائر گناہ بھی معاف کر دیے جائیں گے۔ اللہ عزوجل اس پر سے اپنا غضب و غصہ اٹھا لے گا اور بائیں کاندھے والے فرشتے کو حکم دے گا کہ ایک سال تک اس کی بُرائیاں مت لکھو اور قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے حق دے کر مبعوث فرمایا، اسے وہی آدمی کرے گا جس کو اللہ نے خوش بخت پیدا فرمایا اور اسے وُہی چھوڑے گا جسے اللہ نے بد بخت کیا۔

حضرت ابراہیم تیمیؒ نے چار ماہ تک نہ کچھ کھایا اور نہ ہی پیا، شاید یہ بات اس رویہ کے بعد ہوئی جیسے کہ اُمتیؒ نے ذکر کیا۔ واللہ اعلم

ان کے فضائل احادیث میں بکثرت ملتے ہیں۔ ہم نے اختصار کی وجہ سے انھیں ذکر نہیں کیا۔

فصل ۵

فجر کے بعد کی جامع دعائیں

اس فصل میں ان جامع دعاؤں کا ذکر کیا جاتا ہے جو کہ احادیث مبارکہ کی رو سے نمازِ فجر کے بعد پڑھنی چاہئیں۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب بھی کوئی دُعا شروع کرتے تو ان کلمات سے شروع کرتے:
سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَلِیِّ الْاَعْلَی الْوَهَّابُ (پاک ہے میرا بزرگ بلند بے انتہا سخاوت والا پروردگار)
نیز آپؐ یہ کلمات بھی دعا کے شروع میں پڑھا کرتے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَ لَهُ الْحَمْدُ یُحْیِیْ وَ یُمِیْتُ وَهُوَ حَیٌّ لَّا یَمُوْتُ بِیَدِهِ الْخَیْرُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اَهْلُ النِّعْمَةِ وَالْفَضْلِ وَالثَّنَاءِ الْحَسَنِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ لَا نَعْبُدُ اِلَّا اِیَّاهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ وَ لَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ۔

(تنہا اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کی ملکیت ہے اور اس کی حمد ہے، وہ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور وہ زندہ ہے مرے گا نہیں۔ اس کے قبضہ میں بھلائی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت والا ہے۔ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں۔ وہ نعمت و فضل اور اچھی ثناء کا مالک ہے۔ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں اور ہم خالص کر کے صرف اس ہی کی عبادت کرتے ہیں چاہے کافروں کو بُرا لگے)

ایک جامع و کامل دُعا

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا کہ جامع اور کامل دعائیں مانگا کرو اور یوں دُعا کیا کرو۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ الصَّلٰوةَ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ آلِهٖ وَ اَسْئَلُكَ الْخَیْرَ كُلَّهٗ عَاجِلَهٗ وَ آجِلَهٗ مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَ مَا لَمْ اَعْلَمْ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الشَّرِّ كُلِّهٖ عَاجِلِهٖ وَ آجِلِهٖ مَا عَلِمْتُ مِنْهُ وَ مَا لَمْ اَعْلَمْ وَ اَسْئَلُكَ الْجَنَّةَ وَ مَا قَرَّبَ اِلَیْهَا مِنْ قَوْلٍ وَّ عَمَلٍ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ النَّارِ وَ مَا قَرَّبَ اِلَیْهَا مِنْ قَوْلٍ وَّ عَمَلٍ وَ اَسْئَلُكَ مَا سَاَلَكَ بِهٖ

(اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ محمدؐ اور ان کی آل پر رحم فرما اور میں تجھ سے ہر زود اور دیر بھلائی کا سوال کرتا ہوں۔ جو میں جانتا ہوں اور جو نہیں جانتا، اور میں زود اور بدیر آنے والے ہر شر سے تیری پناہ چاہتا ہوں جسے میں جانتا ہوں اور جسے نہیں جانتا اور میں تجھ سے جنت کا اور ایسے قول و عمل کا سوال کرتا ہوں جو کہ جنت کے قریب کر دے اور میں تجھ سے آگ سے اور ہر ایسے قول و عمل سے پناہ چاہتا ہوں جو آگ کے قریب کرنے والا ہو اور میں

عَبْدُكَ وَ رَسُوْلُكَ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ اَسْاَلُكَ مَا قَضَيْتَ لِيْ مِنْ اَمْرٍ اَنْ تَجْعَلَ عَاقِبَتَهٗ رُشْدًا بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ۔

تجھ سے ہر وہ مانگتا ہوں جو تیرے بندے اور تیرے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تیری پناہ چاہی اور میں سوال کرتا ہوں کہ جو تُو نے میرے متعلق کرنے کا فیصلہ فرمایا ہے اس کا انجام بخیر اور اچھا ہو تیری رحمت کے صدقے، اے سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے۔)

ہر غم کی دُعا

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے فاطمہ! یہ وصیت خوب کان لگا کر سنو یوں دُعا کیا کرو:۔

يَا حَيُّ يَا قَيُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِيْثُ فَاَغِثْنِيْ وَ لَا تَكِلْنِيْ اِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ وَ اَصْلِحْ لِيْ شَاْنِيْ كُلَّهٗ۔

(اے زندہ اے زندہ رکھنے والے تیری رحمت کے آسرے ہی مدد چاہتا ہوں سو میری مدد فرما اور پلک جھپکنے تک کے لیے مجھے مجھ پر نہ چھوڑ دے اور میرا سب حال درست فرما دے)

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ دُعا سکھائی۔ فرمایا: یوں دُعا کیا کرو:۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ بِمُحَمَّدٍ نَبِيِّكَ وَ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلِكَ وَ مُوْسٰى نَجِيِّكَ وَكَلِيْمِكَ وَ عِيْسٰى رُوْحِكَ وَ كَلِمَتِكَ وَ بِكَلَامِ مُوْسٰى وَ اِنْجِيْلِ عِيْسٰى وَ زَبُوْرِ دَاوٗدَ وَ فُرْقَانِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ وَ كُلِّ وَحْيٍ اَوْحَيْتَهٗ اَوْ قَضَاءٍ قَضَيْتَهٗ اَوْ سَائِلٍ اَعْطَيْتَهٗ اَوْ غَنِيٍّ اَفْقَرْتَهٗ اَوْ فَقِيْرٍ اَغْنَيْتَهٗ اَوْ ضَالٍّ هَدَيْتَهٗ وَ اَسْاَلُكَ بِاسْمِكَ الَّذِيْ اَنْزَلْتَهٗ عَلٰى مُوْسٰى وَ اَسْاَلُكَ بِاسْمِكَ الَّذِيْ اَنْزَلْتَهٗ عَلٰى مُوْسٰى وَ اَسْئَلُكَ بِاسْمِكَ الَّذِيْ ثَبَتَتْ بِهٖ اَرْزَاقُ الْعِبَادِ وَ اَسْئَلُكَ

(اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں تیرے نبی محمدؐ کے واسطہ سے اور تیرے خلیل ابراہیم اور تیرے اور تیرے کلیم موسٰی اور تیرے روح اور تیرے کلیم عیسٰی کے واسطہ سے اور موسٰی کی کلام اور عیسٰی کی انجیل اور داؤد کی زبور اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے فرقان (قرآن) کے واسطہ سے اور ہر وحی کے واسطہ سے جو تُو نے کی یا جو فیصلہ تو نے فرمایا یا سوالی کو تُو نے عطا فرمایا یا کسی غنی کو تو نے محتاج کر دیا یا فقیر کو تو نے غنی کر دیا یا گمراہ کو تو نے ہدایت دی اور میں تیرے اس نام کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں کہ جو تُو نے موسٰی پر نازل فرمایا اور تیرے اس نام کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں جس کے ساتھ تو نے بندوں کی روزی ثابت

بِاسْمِكَ الَّذِيْ وَضَعْتَهٗ عَلَى الْاَرْضِ
فَاسْتَقَرَّتْ وَ اَسْاَلُكَ بِاسْمِكَ الَّذِيْ
وَضَعْتَهٗ عَلَى السَّمٰوٰتِ فَاسْتَقَلَّتْ وَ
اَسْاَلُكَ بِاسْمِكَ الَّذِيْ وَضَعْتَهٗ عَلَى
الْجِبَالِ فَاَرْسَتْ وَ اَسْاَلُكَ بِاسْمِكَ
الَّذِيْ اِسْتَقَلَّ بِهٖ عَرْشُكَ وَ اَسْاَلُكَ
بِاسْمِكَ الطُّهْرِ الطَّاهِرِ الْاَحَدِ الصَّمَدِ
الْوِتْرِ الْمُنْزَلِ فِيْ كِتَابِكَ مِنْ لَّدُنْكَ
مِنَ النُّوْرِ الْمُبِيْنِ وَ اَسْاَلُكَ بِاسْمِكَ
الَّذِيْ وَضَعْتَهٗ عَلَى النَّهَارِ فَاسْتَنَارَ
وَ عَلَى اللَّيْلِ فَاَظْلَمَ وَ بِعَظَمَتِكَ وَ
كِبْرِيَائِكَ وَ بِنُوْرِ وَجْهِكَ اَنْ تُصَلِّيَ
عَلٰى مُحَمَّدٍ نَّبِيِّكَ وَ عَلٰى اٰلِهٖ وَ اَنْ
تَرْزُقَنِيَ الْقُرْاٰنَ وَ الْعِلْمَ وَ تَخْلِطَهٗ
بِلَحْمِيْ وَ دَمِيْ وَ سَمْعِيْ وَ بَصَرِيْ
وَ تَسْتَعْمِلَ بِهٖ جَسَدِيْ بِحَوْلِكَ وَ
قُوَّتِكَ فَاِنَّهٗ لَا حَوْلَ لِيْ وَ لَا قُوَّةَ
اِلَّا بِكَ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ ۔

فرمائی اور میں تیرے اس نام کے واسطہ سے سوال کرتا
ہوں جسے تو نے زمین پر رکھا تو وہ قرار پکڑ گئی اور تیرے
اس نام کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں جسے تُو نے
آسمانوں پر رکھا تو وہ جم گئے اور تیرے اس نام کے واسطہ
سے سوال کرتا ہوں جسے تو نے پہاڑوں پر رکھا تو وہ تھم گئے
اور میں تیرے اس نام کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں جس کے
ساتھ تیرا عرش جم گیا اور تیرے طہر، طاہر، ایک، بے نیاز،
وتر۔ تجھ سے تیری کتاب میں نازل شدہ نام کے واسطہ سے
سوال کرتا ہوں (جو) نورِ مبین سے ہے اور میں تیرے
اس نام کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں جسے تُو نے
دن پر رکھا تو وہ روشن ہو گیا اور رات پر (رکھا) تو وہ
اندھیری ہو گئی اور تیری عظمت اور تیری کبریائی اور تیرے چہرے
کے نور کا واسطہ کر تو اپنے نبی محمدؐ اور آپؐ کی آل پر رحم فرما
اور یہ کہ مجھے قرآن اور علم عطا فرما اور اسے میرے گوشت
اور میرے خون اور میری سماعت اور میری بصارت میں
آمیز کر دے اور اپنی قوت و توفیق سے میرے بدن کو
اس کے مطابق استعمال فرما۔ اس لیے کہ مجھے تیرے بغیر
کوئی قوت ہے اور نہ ڈر۔ اے سب رحم کرنے والوں سے
زیادہ رحم کرنے والے)

دعائے جبرئیل

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام
حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپؐ کو یہ دعا سکھائی:

يَا نُوْرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَا جَمَالَ
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ يَا عِمَادَ السَّمٰوٰتِ
وَ الْاَرْضِ يَا بَدِيْعَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ
يَا ذَا الْجَلَالِ وَ الْاِكْرَامِ يَا صَرِيْخَ

اے آسمانوں اور زمین کے نور، اے آسمانوں اور
زمین کے جمال، اے آسمانوں اور زمین کے سہارے،
اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے، اے
جلال و اکرام کے مالک۔ اے پکارنے والوں کی

الْمُسْتَصْرِخِيْنَ يَا غَوْثَ الْمُسْتَغِيْثِيْنَ يَا مُنْتَهٰى رَغْبَةَ الرَّاغِبِيْنَ وَ الْمُفَرِّجَ عَنِ الْمَكْرُوْبِيْنَ وَالْمُرَوِّحَ عَنِ الْمَغْمُوْمِيْنَ وَمُجِيْبَ دَعْوَةَ الْمُضْطَرِّيْنَ وَ كَاشِفَ السُّوْٓءِ وَ اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ وَ اِلٰهَ الْعٰلَمِيْنَ مَنْزُوْلٌ بِكَ كُلُّ حَاجَةٍ يَا اَكْرَمَ الْاَكْرَمِيْنَ وَيَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ۔

پکار سننے والے، اور اے فریادیوں کے مددگار، اے سوال کرنے والوں کے آخری سہارے اور اے مصیبت زدگان کی مصیبت کھولنے والے اور غمگین کو آرام دینے والے اور پریشان کی دعا قبول کرنے والے اور دکھ دُور کرنے والے اور سب سے بڑے رحم فرمانے والے اور تمام جہانوں کے معبود، ہر حاجت تیرے سامنے پیش ہے۔ اے سب سے بڑے کرم والے اور سب سے بڑے رحم کرنے والے)

صبح وشام کی مخصوص دُعائیں

۱۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ صبح وشام اس دعا کو پڑھتے اور ناغہ نہ کرتے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ الْعَافِيَةَ فِی الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِیْ دِيْنِیْ وَدُنْيَایَ وَفِیْ اَهْلِیْ وَمَالِیْ اَللّٰهُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِیْ وَآمِنْ عَوْرَاتِیْ وَاَقِلْنِیْ عَثَرَاتِیْ اَللّٰهُمَّ احْفَظْنِیْ مِنْ بَيْنِ يَدَیَّ وَمِنْ خَلْفِیْ وَعَنْ يَمِيْنِیْ وَعَنْ شِمَالِیْ وَمِنْ فَوْقِیْ وَاَعُوْذُبِكَ اَنْ اُغْتَالَ مِنْ تَحْتِیْ۔

ترجمہ: اے اللہ میں تجھ سے دنیا و آخرت میں عافیت کا سوال کرتا ہوں اور میں تجھ سے میرے دین و دنیا اور میرے اہل و مال میں معافی اور عافیت کا سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ! میری پردہ پوشی فرما اور میری گھبراہٹوں کو (دور کرکے) مامون کر دے اور میری لغزشوں کو معاف کر دے۔ اے اللہ! میرے سامنے سے اور میرے پیچھے سے اور میرے دائیں اور میرے بائیں سے اور میرے اوپر سے (میری) حفاظت فرما اور میں اس بات سے تیری پناہ چاہتا ہوں کہ مجھے نیچے سے ہلاک کیا جائے۔

۲۔ حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ مجھے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اے بریدہ! میں تجھے کلمات نہ بتاؤں کہ جس پر اللہ عزوجل بھلائی کرنا چاہتا ہے اسے وہ کلمات سکھاتا ہے پھر وہ اسے ابد تک نہیں بھولتا۔ میں نے عرض کیا۔ ضرور بتایئے اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیک، آپؐ نے فرمایا:

یوں دُعا کیا کرو :

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ ضَعِیْفٌ فَقَوِّ فِیْ رِضَاكَ ضُعْفِیْ وَخُذْ اِلَی الْخَیْرِ بِنَاصِیَتِیْ وَاجْعَلِ الْاِسْلَامَ مُنْتَهٰی رِضَائِیْ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ ضَعِیْفٌ فَقَوِّنِیْ وَاِنِّیْ ذَلِیْلٌ فَاَعِزَّنِیْ وَاِنِّیْ فَقِیْرٌ فَاَغْنِنِیْ بِرَحْمَتِكَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ۔

ترجمہ : اے اللہ میں کمزور ہوں۔ میرے ضعف کو اپنی رضا میں قوی کر دے اور میری پیشانی بھلائی کی طرف لے جا اور اسلام کو ہی میری انتہائے رضا بنا دے۔ اے اللہ! میں کمزور ہُوں مجھے طاقت ور کر دے اور میں ذلیل ہُوں مجھے عزّت دے اور میں محتاج ہوں مجھے دولت مند بنا دے اپنی رحمت سے اے سب سے بڑے رحم فرمانے والے۔

۳۔ ابو مالک اشجعیؓ اپنے والدؓ سے روایت کرتے ہیں۔ فرمایا کہ ہم صبح حضور نبی اکرم صلعم کی خدمت میں حاضر ہُوئے ایک مرد یا ایک عورت آتی اور عرض کیا : اے اللہ کے رسول ! جب صبح ہو تو میں کیا دعا کروں ؟

آپؐ نے فرمایا : یُوں دعا کر تو تمام دنیا و آخرت کے فائدے (تیرے لیے) جمع ہوں گے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ آلِهٖ وَاغْفِرْلِیْ وَارْحَمْنِیْ وَاهْدِنِیْ وَارْزُقْنِیْ وَعَافِنِیْ وَاجْبُرْنِیْ۔

ترجمہ : اے اللہ ! محمدؐ اور آپؐ کی اولاد پر رحم فرما اور مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم فرما اور مجھے ہدایت دے اور مجھے رزق عطا کر اور مجھے عافیت عطا فرما اور مجھے جوڑ دے (اصلاح فرما)

شیاطین سے بچنے کی دُعا

ابو زرعہؓ سے مروی ہے۔ فرمایا کہ حضرت ابُوہریرہؓ نے مکتوب میں بھی اور ملاقات میں بھی مجھے بتایا کہ جو آدمی صبح و شام تین تین بار اس دُعا کو پڑھ لے تو شیطان اس آدمی کے قریب بھی نہیں جاتا۔

صبح کے وقت یوں دُعا پڑھے :

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِاسْمِكَ وَكَلِمٰتِكَ التَّآمَّةِ مِنْ شَرِّ السَّآمَّةِ وَالْهَآمَّةِ وَاَعُوْذُ بِاسْمِكَ وَكَلِمٰتِكَ التَّآمَّةِ مِنْ شَرِّ عَذَابِكَ وَ شَرِّ عِبَادِكَ وَ اَعُوْذُ بِاسْمِكَ وَكَلِمٰتِكَ التَّآمَّةِ مِنْ شَرِّ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ بِاَسْمَائِكَ وَكَلِمٰتِكَ التَّآمَّةِ اَنْ تُصَلِّیَ عَلٰی نَبِیِّكَ مُحَمَّدٍ

وَآلِهٖ وَاَسْاَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا تُعْطِيْ وَمَا تُسْاَلُ وَمِنْ خَيْرِ مَا تُخْفِيْ وَ خَيْرِ مَا تُبْدِيْ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِاِسْمِكَ وَ كَلِمٰتِكَ التَّامَّةِ مِنْ شَرِّ مَا يَجْرِيْ بِهِ النَّهَارُ اِنَّ رَبِّيَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۔

اورشام کے وقت بکبرزدہ کلمات کی بجائے یہ کلمات کہے:

مِنْ شَرِّ مَا جَآءَ بِهِ اللَّيْلُ۔

ترجمہ: اُس کی بُرائی سے جو رات لائی (یعنی رات کے خطرہ سے)

ہر آفت سے بچنے کی دُعا

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے محمد بن عبیداللہ سے روایت کیا کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ انہیں بتایا گیا کہ آپ کا گھر جل گیا۔ وہ کہنے لگے اللہ عزّوجل ایسا نہیں ہونے دے گا۔ پھر ایک آدمی آیا اس نے بتایا: اے ابوالدرداء آگ آپ کے گھر کے قریب پہنچتے ہی بجھ گئی۔ فرمانے لگے۔ مجھے معلوم ہے۔ ان سے پوچھا گیا آپ بڑے تعجب کی بات کرتے ہیں۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ فرمایا کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ جو دن یا رات میں یہ کلمات پڑھ لے اسے کچھ بھی ضرر نہیں ہوتا اور میں نے پڑھ لیے تھے۔ وہ کلمات یہ ہیں:-

اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ عَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَ اَنْتَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ لَاحَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ مَا شَآءَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ رَبِّيْ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا اَللّٰهُمَّ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ نَفْسِيْ وَمِنْ شَرِّ كُلِّ دَآبَّةٍ اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔

ترجمہ: اے اللہ! تو میرا پروردگار ہے تیرے بغیر کوئی معبود نہیں۔ تجھ پر بھروسہ ہے اور تو عرشِ عظیم کا رب ہے۔ اللہ بزرگ و برتر کے سوا نہ قوت ہے اور نہ ڈر۔ میرا پروردگار اللہ عزّوجل جو چاہے وہ ہو اور جو نہ چاہے نہ ہو۔ میں جانتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قدرت والا ہے اور بے شک اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔ اے اللہ میں اپنے نفس کی

بُرائی سے اور ہر جاندار کی برائی سے جس کی پیشانی تیرے قبضہ میں ہے۔ تیری پناہ مانگتا ہُوں۔ بلا شبہ میرا پروردگار سیدھی راہ پر ہے۔

آخرت کی مہمّات کے لیے دُعا

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جو ہر روز سات یہ کلمات پڑھے اس کے لیے آخرت کی تمام مہمات میں کافی ہوں گے۔ چاہے وُہ سچا ہو یا جھوٹا۔ کلمات یہ ہیں:۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ۔

ترجمہ: اب اگر وہ پھر جائیں تو کہیے، مجھے اللہ کافی (مددگار) ہے۔ اس کے بغیر کوئی معبود نہیں۔ میں نے اسی پر توکّل کیا اور وہ عرشِ عظیم کا رب ہے۔

غم دُور کرنے کی دُعا

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جس کو کوئی غم و پریشانی لاحق ہو اور وہ یہ کلمات پڑھے۔ اللہ عز وجل اس کے تمام غموں اور پریشانیوں کو دُور کر دے گا اور اسے خوشی عطا فرمائے گا۔ دعا یہ ہے:۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ عَبْدُكَ ابْنُ عَبْدِكَ اِبْنُ اَمَتِكَ نَاصِیَتِیْ بِیَدِكَ مَاضٍ فِیَّ حُكْمُكَ عَدْلٌ فِیَّ قَضَآؤُكَ اَسْاَلُكَ اَللّٰهُمَّ بِكُلِّ اِسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّیْتَ بِهٖ نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِیْ كِتَابِكَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِهٖ فِیْ عِلْمِ الْغَیْبِ عِنْدَكَ اَنْ تُصَلِّیَ عَلٰی نَبِیِّكَ وَ حَبِیْبِكَ مُحَمَّدٍ وَّ اٰلِهٖ وَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ وَ نُوْرَ صَدْرِیْ وَ جِلَآءَ حُزْنِیْ وَ ذِهَابَ هَمِّیْ وَ غَمِّیْ۔

(اے اللہ! بیشک میں تیرا بندہ ہوں۔ تیرے بندے کا بیٹا، تیری بندی کا بیٹا، میری پیشانی تیرے قبضہ میں ہے مجھ میں تیرا حکم جاری ہے اور مجھ میں تیری قضا نافذ ہے اے اللہ! میں تجھ سے تیرے ہر اس نام کے واسطہ سے سوال کرتا ہوں جو تونے اپنا نام رکھا یا تُونے اسے اپنی کتاب میں نازل فرمایا یا تونے اپنی مخلوق میں سے کسی کو سکھایا یا تونے اسے اپنے علم غیب میں اپنے پاس مخصوص رکھا کہ تو اپنے نبی اور اپنے حبیب حضرت محمد پر اور آپ کی آل پر رحم فرمائے اور تو قرآن کو میرے دل کی بہار، میرے سینے کا نور اور میرے غم کا مداوا اور میرے غم و الم کا علاج بنا دے)

عرض کیا گیا، اے اللہ کے رسولؐ! ہم ان (کلمات) کو سیکھ نہ لیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں جو سنے اسے چاہیے کہ سیکھ لے۔

دن رات کا شکر کیسے ادا ہو؟

روایات میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام صبح کے وقت یہ دعا پڑھتے:

اَللّٰھُمَّ ھٰذَا خَلْقٌ جَدِیْدٌ فَافْتَحْہُ عَلَیَّ بِطَاعَتِکَ وَاخْتِمْہُ لِیْ بِمَغْفِرَتِکَ وَرِضْوَانِکَ وَارْزُقْنِیْ فِیْہِ حَسَنَۃً تَقَبَّلْھَا مِنِّیْ وَزَکِّھَا وَضَعِّفْھَا لِیْ وَمَا عَمِلْتُ فِیْہِ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَاغْفِرْھَا لِیْ اِنَّکَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ وَّدُوْدٌ کَرِیْمٌ۔

(اے اللہ! یہ نئی پیدائش ہے اسے مجھ پر اپنی اطاعت کے ساتھ لا اور اسے اپنی بخشش اور رضا پر ختم فرما اور مجھے اس میں نیکی عطا فرما۔ اسے مجھ سے قبول فرما اور پاک کر اور میرے لیے دُگنی کر دے اور اس میں مَیں نے جو برائی کی اسے بخش دے بیشک تو بخشنے والا رحم کرنے والا دوست دار کریم ہے)

چنانچہ جو اس دُعا کو صبح کے وقت پڑھ لے اس نے اس دن کا شکر ادا کر دیا اور جو شام کو پڑھ لے۔ (اس نے رات کا شکر ادا کر دیا)

اللہ اسے راضی کرے گا

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو صبح و شام (دونوں وقت) یہ دعا تین تین بار پڑھ لے اللہ پر حق ہے کہ وہ اسے قیامت کے دن راضی کر دے۔ دُعا یہ ہے:

رَضِیْتُ بِاللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ رَبًّا وَّ بِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَبِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَبِیًّا۔

ترجمہ: میں اللہ عزّ وجلّ کے رب ہونے پر اور اسلام کے دین پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر راضی ہو گیا۔

عیسٰی علیہ السلام کی دُعا

معمرؒ نے جعفرؒ بن برقان سے نقل کیا۔ حضرت عیسٰی بن مریم علیہ السلام یہ دعا پڑھا کرتے تھے:۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَصْبَحْتُ لَا اَسْتَطِیْعُ دَفْعَ مَا اَکْرَہُ وَلَا اَمْلِکُ نَفْعَ مَا اَرْجُوْ وَاَصْبَحَ الْاَمْرُ بِیَدِکَ لَا بِیَدِ غَیْرِکَ وَاَصْبَحْتُ مُرْتَھِنًا بِعَمَلِیْ فَلَا فَقِیْرَ اَفْقَرُ مِنِّیْ۔ اَللّٰھُمَّ لَا تُشْمِتْ بِیْ عَدُوِّیْ وَلَا تَسُؤْ بِیْ صَدِیْقِیْ وَلَا تَجْعَلْ مُصِیْبَتِیْ

(اے اللہ میری صبح یوں ہوئی کہ میں ناپسندیدہ کو ہٹا نہیں سکتا اور جس نفع کا امید وار ہوں اس کا مالک نہیں اور تیرے قبضہ میں معاملہ ہوا۔ تیرے سوا کسی کے قبضہ میں نہیں اور میں اپنے عمل میں پکڑا ہوں۔ کوئی ایسا فقیر نہیں جو مجھ سے زیادہ محتاج ہو۔ اے اللہ! مجھ پر میرے دشمن کو خوش نہ کر اور نہ ہی میرے دوست

فِیْ دِیْنِیْ وَ لَا تَجْعَلِ الدُّنْیَا اَکْبَرَ هَمِّیْ وَ لَا مَبْلَغَ عِلْمِیْ وَ لَا غَایَةَ اَمَلِیْ وَ لَا تُسَلِّطْ عَلَیَّ مَنْ لَّا یَرْحَمُنِیْ۔

کو مجھ سے تکلیف یاب کر اور میرے دین میں مصیبت نہ پڑے اور دنیا کو میرا سب سے بڑا غم نہ بنانا اور نہ انتہائے علم اور نہ انتہائے امید بنانا اور مجھ پر اسے مسلط نہ کرنا جو مجھ پر رحم نہ کرے)

جلنے اور غرق ہونے سے حفاظت کی دُعا

حضرت عطاؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ ہر موسم میں حضرت خضر اور حضرت الیاس علیہما السلام ملاقات کر کے یہ کلمات پڑھ کر جدا ہوتے ہیں۔ یہ کلمات ایسے بابرکت ہیں کہ جو بھی انھیں صبح کو تین بار پڑھے تو جلنے، غرق ہونے اور چوری سے محفوظ رہے۔ دعا یہ ہے:۔

بِسْمِ اللّٰهِ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ مَا شَآءَ اللّٰهُ کُلُّ نِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ مَا شَآءَ اللّٰهُ اَلْخَیْرُ کُلُّهٗ بِیَدِ اللّٰهِ عَزَّ وَ جَلَّ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا یَصْرِفُ السُّوْٓءَ اِلَّا اللّٰهُ مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

(اللہ کے نام سے، جو اللہ چاہے، اللہ کے بغیر کچھ قوت نہیں جو اللہ چاہے، ہر نعمت اللہ ہی سے ہے جو اللہ چاہے۔ ساری بھلائی اللہ عزوجل کے قبضہ میں ہے جو اللہ چاہے، اللہ کے بغیر کوئی برائی نہیں ہٹاتا۔ جو اللہ چاہے، اللہ کے بغیر نہ قوت ہے نہ ڈر۔)

استغفارِ خضر علیہ السّلام

بتاتے ہیں کہ حضرت خضر علیہ السّلام ان الفاظ کے ساتھ استغفار کرتے ہیں:۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُكَ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ تُبْتُ اِلَیْكَ مِنْهُ ثُمَّ عُدْتُّ فِیْهِ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُكَ مِنْ کُلِّ عَقْدٍ عَقَدْتُّهٗ لَكَ ثُمَّ لَمْ اُوْفِ لَكَ بِهٖ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُكَ مِنْ کُلِّ نِعْمَةٍ اَنْعَمْتَ بِهَا عَلَیَّ فَتَقَوَّیْتُ بِهَا عَلٰی مَعْصِیَتِكَ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُكَ مِنْ کُلِّ عَمَلٍ عَمِلْتُهٗ لِوَجْهِكَ فَخَالَطَهٗ

(اے اللہ میں تجھ سے ہر اس گناہ کی بخشش مانگتا ہوں کہ میں نے اس سے توبہ کی پھر دوبارہ گناہ کیا، اے اللہ میں ہر اس عہد کی تجھ سے معافی مانگتا ہوں کہ تیرے لیے کیا پھر تیری خاطر پورا نہ کر سکا۔ اے اللہ! میں ہر اس نعمت کی تجھ سے معافی چاہتا ہوں کہ تُو نے مجھ پر نعمت فرمائی تو میں تیری نافرمانی پر دلیر ہو گیا۔ اے اللہ! میں ہر اس عمل کی تجھ سے معافی چاہتا ہوں جو تیرے لیے کیا، پھر اس میں تیرے غیر کا اختلاط

مَا يَنْبَغِیْ لَكَ۔ — کر دیا)

خوف کی دُعا

حضرت سعید بن ابی الروحا، بڑے صالحین میں سے تھے۔ ایک رات ایک ویران جگہ میں تنہا رہ گئے۔ انھیں سخت گھبراہٹ اور خوف محسوس ہوئی۔ اچانک انھیں ایک آدمی ملا تو مزید ڈرے اور کانپنے لگے۔ فرماتے ہیں۔ میں نے اس کی آواز پر دھیان دیا تو وُہ قرآن پڑھ رہا تھا۔ پھر مجھے کہنے لگا۔ کیا میں تمھیں وُہ دعا بتا دُوں کہ کہ اگر تو خوف محسوس کرے تو خوف جاتا رہے اور اگر راستہ بھول جائے تو راستہ مل جائے اور جب نیند جاتی رہے تو وُہ دعا پڑھنے سے نیند آ جائے۔ میں نے کہا، اللہ تجھ پر رحم کرے مجھے ضرور وہ دعا سکھا دو۔ اس نے بتایا یوں دعا کرو۔

بِسْمِ اللّٰهِ ذِی الشَّانِ عَظِیْمِ الْبُرْهَانِ شَدِیْدِ السُّلْطَانِ كُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَأْنٍ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

(اللہ صاحبِ شان، عظیم البرہان اور شدید السلطان کے نام سے ہر روز وہ ایک نئی شان میں ہوتا ہے، اللہ بزرگ و برتر کے سوا نہ قوت ہے اور نہ ڈر ہے۔)

دنیا و آخرت کے لیے دس کلمات

یعقوب بن عبد الرحمٰن بتاتے ہیں کہ میں نے محمد بن حسان سے سنا انھیں معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: کیا میں تمھیں دس کلمات بتاؤں۔ پانچ دنیا کے لیے اور پانچ آخرت کے لیے ہوں۔ وُہ کلمات پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرو۔ میں نے عرض کیا: آپ وہ کلمات لکھ دیں۔ فرمانے لگے۔ نہیں جس طرح بکر بن جنیش نے مجھے پڑھ کر سنائے ایسے ہی میں بھی سناتا ہوں کلمات یہ ہیں:۔

حَسْبِیَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَ تَعَالٰی لِدِیْنِیْ حَسْبِیَ اللّٰهُ عَزَّ وَ جَلَّ لِدُنْیَایَ

(مجھے میرا اللہ کافی ہے میرے دین کے معاملہ میں اور مجھے میرا اللہ کافی ہے میری دنیا کے معاملہ میں۔)

حَسْبِیَ اللّٰهُ الْكَرِیْمُ لِمَا اَهَمَّنِیْ حَسْبِیَ اللّٰهُ الْحَكِیْمُ الْقَوِیُّ لِمَنْ بَغٰی عَلَیَّ حَسْبِیَ اللّٰهُ الشَّدِیْدُ لِمَنْ كَادَنِیْ بِسُوْءٍ حَسْبِیَ اللّٰهُ الرَّحِیْمُ عِنْدَ

(جس نے مجھے غمگین کیا اس میں مجھے اللہ کریم ہی کافی مددگار ہے، جس نے مجھ پر سرکشی کی، اس کے مقابلہ اللہ قوی حکیم ہی کافی ہے، جو مجھے دکھ لاحق ہو اس کے ہٹانے کے لیے مجھے اللہ شدید ہی کافی ہے، موت کے

الْمَوْتِ حَسْبِیَ اللّٰہُ الرَّؤُفُ عِنْدَ
الْمَسْأَلَۃِ فِی الْقَبْرِ حَسْبِیَ اللّٰہُ الْکَرِیْمُ
عِنْدَ الْحِسَابِ حَسْبِیَ اللّٰہُ اللَّطِیْفُ
عِنْدَ الْمِیْزَانِ حَسْبِیَ اللّٰہُ الْقَدِیْرُ
عِنْدَ الصِّرَاطِ حَسْبِیَ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ
اِلَّا ھُوَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَ ھُوَ
رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ۔

وقت مجھے اللہ رحیم ہی کافی مددگار ہے، قبر میں سوال
جواب کے وقت مجھے اللہ مہربان ہی کافی مددگار ہے
حساب کے وقت مجھے اللہ کریم ہی مددگار کافی ہے۔
میزان (حساب و کتاب) کے وقت مجھے اللہ لطیف
ہی کافی مددگار رہے، پل صراط پار کرنے کے موقع پر
مجھے اللہ قدرت والا ہی مددگار کافی ہے، بس مجھے
اللہ ہی مددگار کافی ہے۔ اس کے بغیر کوئی معبود نہیں
میں نے اس پر توکل کیا اور وہ عرش عظیم کا رب ہے)

اس کے بعد یوں دعا کرے:

اَللّٰھُمَّ یَا ھَادِیَ الْمُضِلِّیْنَ وَ رَاحِمَ
الْمُذْنِبِیْنَ وَ مُقِیْلَ الْعَاثِرِیْنَ
اِرْحَمْ عَبْدَکَ ذَا الْخَطَرِ الْعَظِیْمِ وَ
الْمُسْلِمِیْنَ کُلَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ وَ اجْعَلْنَا
مِنَ الْاَحْیَاءِ الْمَرْزُوْقِیْنَ الَّذِیْنَ
اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ
وَ الشُّھَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ آمِیْنَ،
یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ۔

(اے اللہ! اے گمراہوں کو ہدایت دینے والے اور
گناہگاروں پر رحم کرنے والے اور خطاکاروں کو معاف
کرنے والے اپنے بندے پر رحم فرما جو سخت ہی
ہلاکت میں گرنے کا ہے اور تمام ہی مسلمانوں پر رحم
فرما اور ایسے رزق دیے گئے زندوں میں سے کردے
کہ جن پر تو نے انعام فرمایا یعنی انبیاء، صدیقین،
شہداء اور صالحین (میں سے بنادے) آمین۔
اے تمام جہانوں کے پروردگار)

کہتے ہیں کہ ایک لڑکے عتبہ کو کسی نے خواب میں دیکھا کہ وہ جنت میں پھر رہا ہے تو اس نے
بتایا کہ میں ان دعاؤں کی برکت سے جنت میں داخل ہوگیا۔

اس دعا کے بعد یہ دعا مانگے:

اَللّٰھُمَّ عَالِمَ الْخَفِیَّاتِ رَفِیْعَ الدَّرَجَاتِ
ذَا الْعَرْشِ تُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِکَ عَلٰی
مَنْ تَشَآءُ مِنْ عِبَادِکَ غَافِرَ الذَّنْبِ
وَ قَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ذِی
الطَّوْلِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ اِلَیْکَ الْمَصِیْرُ۔

(اے اللہ مخفیات کے جاننے والے، درجات بلند
کرنے والے، عرش والے، تو ہی اپنے جس بندے پر
چاہتا ہے روح ڈالتا ہے۔ گناہ بخشنے والے، توبہ قبول
کرنیوالے، سخت عذاب کے مالک، تیرے بغیر کوئی معبود
نہیں، تیری طرف ہی لوٹنا ہے)

ابراہیم صائغ کو کسی نے خواب میں جنت کے اندر دیکھا، پوچھا: تمھاری نجات کیسے ہوئی؟ اس نے کہا: ان دعاؤں کی برکت سے۔

اس کے بعد یوں دُعا کرے۔

يَا مَنْ لَا يَشْغَلُهُ سَمْعٌ عَنْ سَمْعٍ وَلَا تَشْتَبِهُ عَلَيْهِ الْاَصْوَاتُ يَا مَنْ لَا تُغَلِّطُهُ الْمَسَائِلُ وَلَا تَخْتَلِفُ عَلَيْهِ اللُّغَاتُ يَا مَنْ لَا يَتَبَرَّمُ بِاِلْحَاحِ الْمُلِحِّيْنَ اَذِقْنِيْ بَرْدَ عَفْوِكَ وَحَلَاوَةَ رَحْمَتِكَ۔

(اے وہ ذات کہ جسے کوئی شنوائی سننے سے باز نہیں رکھتی اور نہ ہی آوازیں اس پر مشتبہ ہوتی ہیں۔ اے جسے سوالات سے گڑبڑ نہیں ہوتی اور نہ ہی اس پر زبانوں کا اختلاف اثر کرتا ہے اور نہ ہی وہ زاری کرنے والوں کی زاری، مجھے معافی عطا فرما اور اپنی رحمت کی حلاوت چکھا)

کہتے ہیں حضرت خضر علیہ السلام نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو یہ دعا سکھائی۔

تسبیحاتِ ابی المعتمر

یہ تسبیحات ابوالمعتمر سلیمان تیمی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کی ہیں۔ فرمایا کہ یونس بن عبید نے ایک آدمی کو خواب میں دیکھا، یہ روم کے علاقے میں شہید ہو چکا تھا۔ میں نے پوچھا،

تم نے کون سا عمل افضل دیکھا:۔ اس نے کہا کہ تسبیحاتِ ابوالمعتمر کا اللہ کے ہاں بلند درجہ ہے۔

معتمر بن سلیمان بتاتے ہیں کہ میں نے عبدالملک بن خالد کو موت کے بعد دیکھا، میں نے پوچھا، تمھارا کیا بنا؟ انھوں نے جواب دیا۔ بہت اچھا ہُوا۔ میں نے کہا: گناہگار کو خطرہ تو ہُوا ہو گا۔ کہنے لگے: بھائی وُہ تسبیحاتِ ابوالمعتمر دیکھ رہا ہے۔ وُہ بہترین چیز ہے۔ یہ تسبیحات یُوں ہیں:

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ عَدَدَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ وَعَدَدَ مَا هُوَ خَالِقٌ وَزِنَةَ مَا خَلَقَ وَزِنَةَ مَا هُوَ خَالِقٌ وَمِلْءَ مَا خَلَقَ وَمِلْءَ مَا هُوَ خَالِقٌ وَمِلْءَ سَمٰوٰتِهٖ وَمِلْءَ اَرْضِهٖ وَمِثْلَ

(اللہ پاک ہے اور اللہ ہی کی حمد ہے اور اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ کے بغیر نہ قوت ہے اور نہ ہی ڈر ہے جس قدر اللہ نے مخلوق بنائی اور جس قدر وہ پیدا کرنیوالا ہے اور اس کی مخلوق کے وزن بھر، اور جو پیدا کرنے والا ہے اس کے وزن بھر اور جو پیدا کیا اسے بھرنے کے برابر، اور جو پیدا کرنے والا ہے اسے بھرنے کے برابر، اور آسمانوں اور

ذٰلِكَ وَ اَضْعَافَ ذٰلِكَ وَ عَدَدَ خَلْقِهٖ وَزِنَةَ
عَرْشِهٖ وَ مُنْتَهٰى رَحْمَتِهٖ وَ مِدَادَ كَلِمَاتِهٖ
وَ مَبْلَغَ عِلْمِهٖ وَ رِضَاهُ وَ حَتّٰى يَرْضٰى وَ اِذَا
رَضِيَ وَعَدَدَ مَا ذَكَرَهٗ بِهٖ خَلْقُهٗ فِيْ
جَمِيْعِ مَا مَضٰى وَ عَدَدَ مَا هُمْ فِيْمَا بَقِيَ
فِيْ كُلِّ سَنَةٍ وَ شَهْرٍ وَ جُمُعَةٍ وَ يَوْمٍ
وَ لَيْلَةٍ وَ سَاعَةٍ مِّنَ السَّاعَاتِ وَنَسَمَةٍ
وَ شَمٍّ وَ نَفَسٍ وَ لَمْحَةٍ وَ طَرْفَةٍ
مِنَ الْاَبَدِ اِلَى الْاَبَدِ اَبَدَ الدُّنْيَا وَ
اَبَدَ الْاٰخِرَةِ وَ اَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ
لَا يَنْقَطِعُ اَوَّلُهٗ وَ لَا يَنْفَدُ اٰخِرُهٗ۔

زمین کے بھرنے کے برابر، اور اس قدر مزید، اور اس سے
کئی گنا، اور اس کی مخلوق کی گنتی کے برابر، اور اس کے عرش
کے وزن بھر اور اس کی رحمت کی انتہا تک، اور اس کے
کلمات کی سیاہی بھر، اور اس کے علم تک، اور اس کی
رضا تک، اور حتیٰ کہ وہ راضی ہو جائے اور جب وہ راضی ہو جائے
اور تمام گزشتہ میں اس کی مخلوق جس قدر اسے یاد کرے اتنی
تعداد میں، اور اتنی تعداد میں کہ وہ باقی ... ہر سال،
مہینہ، جمعہ اور دن اور رات اور گھڑیوں میں ہر گھڑی، نسمہ
اور شم، نفس اور ہر لمحہ اور پلک جھپکنے میں اسے یاد کریں، ابد سے
ابد تک، دنیا کے انجام اور آخرت کے ابد تک اور اس سے
بھی زیادہ۔ نہ آغاز ٹوٹے اور نہ انجام ختم ہو۔)

توبہ و حاجات کی ایک خاص دُعا

ہشام بن عروہ اپنے والد سے اور وہ اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ جب اللہ عز و جل نے حضرت آدم علیٰ نبیّنا و علیہ الصلوٰۃ و السلام کی توبہ قبول کرنے کا ارادہ فرمایا تو حضرت آدم علیٰ نبیّنا و علیہ الصلوٰۃ و السلام نے خانہ کعبہ کا سات بار طواف کیا۔ اُس وقت یہاں عمارت نہ تھی بلکہ سُرخ ٹیلہ تھا پھر کھڑے ہُوئے اور دو رکعت نماز ادا کی اور اس کے بعد یوں دُعا کی:۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّكَ تَعْلَمُ سِرِّيْ وَ عَلَانِيَتِيْ فَاقْبَلْ
مَعْذِرَتِيْ وَ تَعْلَمُ حَاجَتِيْ فَاَعْطِنِيْ سُؤْلِيْ
وَ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ ذُنُوْبِيْ۔
اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ اِيْمَانًا يُّبَاشِرُ قَلْبِيْ وَ
يَقِيْنًا صَادِقًا حَتّٰى اَعْلَمَ اَنَّهٗ لَا يُصِيْبُنِيْ
اِلَّا مَا كَتَبْتَ لِيْ وَ الرِّضٰى بِمَا قَسَمْتَ لِيْ
يَا ذَا الْجَلَالِ وَ الْاِكْرَامِ۔

(اے اللہ بیشک تُو میرے پوشیدہ اور ظاہر کو جانتا ہے
سو میرا عذر قبول فرما لے اور تو میری ضرورت جانتا ہے سو
مجھے مانگا عطا فرما اور جو میرے جی میں ہے تو جانتا ہے سو
میرے گناہوں کو بخش دے۔ اے اللہ! بیشک میں تجھ سے
ایسا ایمان مانگتا ہوں کہ جو میرے دل پر جا لگے اور ایسا سچا یقین
کہ میں خوب جان جاؤں کہ جو تو نے میرے لیے لکھا ہے وہی
مجھے پہنچے گا اور جو تو نے میری قسمت میں لکھ دیا اس پر راضی
ہو جاؤں اے جلال و اکرام والے)

اللہ تعالیٰ نے اُن کی طرف وحی فرمائی کہ میں نے تمھیں بخش دیا اور تیری اولاد میں سے جو بھی یہی دُعا کرے گا جو تو نے کی، تو میں اُسے بخش دوں گا اور اس کے غم و پریشانیاں کھول دوں گا اور اس کی نظروں سے محتاجی کو ہٹا دوں گا۔ اور دنیا ناک کے بل گھسٹتی اس کے پاس آئے گی۔ چاہے وہ اُسے نہ چاہے۔

اسم اعظم مناسب یہ ہے کہ صبح کو یہ دُعا بھی کر لیا کرے اس لیے کہ اس دعا میں اسم اعظم ہے اور اس کی برکت سے دُعا قبول ہوتی ہے اس کے بارے میں احادیث آئی ہیں۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ بِاَنَّ الْحَمْدَ لَكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْحَنَّانُ الْمَنَّانُ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ذُوالْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ اَنْتَ الْاَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ یَا حَیُّ حِیْنَ لَا حَیَّ فِیْ دَیْمُوْمَةِ مُلْكِهٖ وَبَقَائِهٖ یَا حَیُّ مُحْیِ الْمَوْتٰی یَا حَیُّ مُمِیْتُ الْاَحْیَآءِ وَ وَارِثُ اَهْلِ الْاَرْضِ وَالسَّمَآءِ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِاِسْمِكَ، بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَبِاِسْمِكَ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ بِاِسْمِكَ الْاَعْظَمِ الْاَجَلِّ الْاَعَزِّ الْاَكْرَمِ الَّذِیْ اِذَا دُعِیْتَ بِهٖ وَاِذَا سُئِلْتَ بِهٖ اَعْطَیْتَ یَا نُوْرَ النُّوْرِ یَا مُدَبِّرَ الْاُمُوْرِ یَا عَالِمَ مَا فِی الصُّدُوْرِ یَا سَمِیْعُ یَا قَرِیْبُ یَا مُجِیْبَ الدُّعَاءِ یَا لَطِیْفًا لِّمَا یَشَآءُ یَا رَءُوْفُ یَا رَحِیْمُ یَا كَبِیْرُ یَا عَظِیْمُ یَا اَللّٰهُ یَا رَحْمٰنُ یَا ذَا الْجَلَالِ

(اے اللہ میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ بیشک ساری حمد تیرے لیے ہے، تیرے بغیر کوئی معبود نہیں، بہت مہربان احسان فرمانے والا، آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا، صاحبِ جلال واکرام۔ تو ہی ایک بے نیاز ہے جس نے نہ جنا اور نہ وہ جنا گیا اور نہ ہی اس کا کوئی برابری کرنے والا ہے اے زندہ اے قائم رکھنے والے، اے زندہ جبکہ کوئی زندہ نہ تھا۔ اپنے ملک کے دوام و بقاء میں اے زندہ، مُردوں کو زندہ کرنے والے، اے زندہ زندوں کو مارنے والے اور زمین و آسمان والوں کے وارث، اے اللہ! میں تجھ سے تیرے نام سے سوال کرتا ہوں، اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے اور تیرے اس نام کر اس کے بغیر کوئی معبود نہیں زندہ قائم رکھنے والا ہے اسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ اے اللہ! بیشک میں تیرے سب سے بڑے، جلال والے، عزت والے، اکرم نام سے سوال کرتا ہوں جس سے دعا کی جائے تو تو قبول کرتا ہے اور جب اس کے توسل سے مانگا جائے تو عطا فرماتا ہے اے نورِ نور! اے تدبیر کنندہ امور! اے سینوں کے اندر کی باتیں جاننے والے! اے سننے والے! اے قریب،

وَالْاِكْرَامِ اَلٓمّٓ اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ
الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ وَ عَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَیِّ الْقَیُّوْمِ
یَا اِلٰهِیْ وَ اِلٰهَ کُلِّ شَیْءٍ اِلٰهًا وَّاحِدًا
لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ
بِاِسْمِكَ اَنْتَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ الظَّاهِرُ
الْبَاطِنُ وَسِعْتَ کُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً
وَّ عِلْمًا کٓهٰیٰعٓصٓ حٰمٓعٓسٓقٓ اَلرَّحْمٰنَ
یَا وَاحِدُ یَا قَهَّارُ یَا عَزِیْزُ یَا جَبَّارُ
یَا اَحَدُ یَا صَمَدُ یَا وَدُوْدُ یَا غَفُوْرُ
هُوَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَیْبِ
وَ الشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ لَا اِلٰهَ
اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ کُنْتُ مِنَ الظَّالِمِیْنَ
اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَدْعُوْكَ بِاِسْمِكَ الْمَکْنُوْنِ
الْمَخْزُوْنِ الْمُنَزَّلِ السَّلَامِ الطُّهْرِ الطَّاهِرِ
الْمُقَدَّسِ یَا دَهْرُ یَا دَیْهُوْرُ یَا دَیْهَارُ
یَا اَبَدُ یَا اَزَلُ یَا مَنْ لَمْ یَزَلْ
وَ لَا یَزُوْلُ هُوَ یَا هُوَ لَا اِلٰهَ اِلَّا
هُوَ یَا مَنْ لَا هُوَ اِلَّا هُوَ یَا مَنْ
لَا یَعْلَمُ مَا هُوَ اِلَّا هُوَ، یَا کَانُ
یَا کَیْنَانُ یَا رُوْحُ یَا کَائِنُ قَبْلَ
کُلِّ کَوْنٍ یَا کَائِنُ بَعْدَ کُلِّ کَوْنٍ یَا
مُکَوِّنَ لِکُلِّ کَوْنٍ اٰهِیَا شَرَاهِیَا اَدُوْنَایَ
اَصْبَاءُوْتَ یَا مُجَلِّیْ عَظَائِمَ الْاُمُوْرِ
فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ
اِلَّا هُوَ عَلَیْهِ تَوَکَّلْتُ وَ هُوَ رَبُّ

اے دعا قبول کرنیوالے، اے لطیف جسے چاہے، اے مہربان
اے رحم کرنے والے، اے بڑے، اے عظمت والے، اے
اللہ اے رحم فرمانے والے، اے صاحبِ جلال واکرام، الم
اللہ، اس کے بغیر کوئی معبود نہیں زندہ قائم رکھنے والا ہے۔
جھک گئے تمام چہرے زندہ قائم رکھنے والے کے لیے۔ اے
میرے الہ اور ہر چیز کے الہ، جو ایک الہ ہے تیرے بغیر کوئی
الہ (معبود) نہیں۔ اے اللہ! میں تجھ سے تیرے نام سے
سوال کرتا ہوں۔ تو ایک ہے اور آخر، ظاہر، باطن ہے
ہر چیز پر (تیری) رحمت حاوی ہوگئی اور علم (حاوی) ہے کہیعص
حمعسق الرحمٰن، اے ایک، اے غالب، اے غالب، اے جبار،
اے ایک اے بے نیاز، اے دوستدار، اے بخشنے والے،
وہ اللہ ہے اس کے بغیر کوئی معبود نہیں، غیب و ظاہر کا جاننے والا۔
وہ بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے۔ تیرے بغیر کوئی معبود نہیں
تو پاک ہے بیشک میں ظالموں میں سے ہوں۔ اے اللہ میں
تجھے پکارتا ہوں تیرے مخفی مخزون نازل شدہ سلام پاک اور
پاک مقدس پاک نام کے توسل سے، اے زمانہ، اے دیہور
اے دیہار (طویل زمانہ) اے ابد، اے ازل، اے جو
فنا نہ ہوا اور نہ وہ فنا ہوگا۔ اے وہ کہ اس کے بغیر کوئی معبود
نہیں، اے وہ کہ اس کے بغیر کوئی وہ نہیں، اے وہ جو
ایسا ہے کہ وہ اپنے آپ کو صرف خود ہی جانے کہ وہ کیا ہے
اے کانَ (ہستی) اے ہستی اے رُوح! اے ہر کون سے
پہلے کی ہستی، اے ہر کون کے بعد بھی رہنے والے، اے
ہر کائنات کو چھپانے والے، اے متکبر، اے قریب،
اے شوکت (کے مالک)، اے بڑے بڑے امور کے
ظاہر کرنے والے، اب اگر وہ پھر جائیں تو کہو میرا اللہ

الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ وَ
هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ
عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَ
عَلٰى آلِ اِبْرَاهِيْمَ وَ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى
آلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى اِبْرَاهِيْمَ وَعَلٰى
آلِ اِبْرَاهِيْمَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ۔

ہی کافی ہے اس کے بغیر کوئی معبود نہیں۔ اس پر میں نے
توکل کیا اور وہ عرشِ عظیم کا رب ہے کوئی چیز اس کی طرح
نہیں اور وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ اے اللہ رحم فرما
محمد اور آلِ محمد پر جیسے کہ تو نے رحم فرمایا ابراہیم اور آلِ ابراہیم
پر اور برکت نازل فرما محمد اور آلِ محمد پر جیسے کہ تو نے برکت
نازل فرمائی ابراہیم اور آلِ ابراہیم پر، بیشک تو حمد والا اور
بزرگی والا ہے)

صبح کی جامع برکات دعا

اب چند ایسی دُعائیں لکھی جاتی ہیں جو ہر خیر پر حاوی اور تمام برکات پر مشتمل ہیں ان میں ہر بھلائی کا سوال ہے اور ہر برائی سے پناہ ہے نیز ان میں جگہ جگہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود اور استغفار ہے۔ غرض دین و دنیا کی تمام برکات کی یہ جامع دعا ہے اسے ہر روز صبح کو ایک بار پڑھ لینا چاہیے۔ (مترجم)

یہ دعائیں احادیث میں منقول ہیں اور یہاں انھیں سہولت کی خاطر یکجا کر دیا گیا ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ الثَّبَاتَ فِي الْاَمْرِ وَالْعَزِيْمَةَ
عَلَى الرُّشْدِ وَ اَسْاَلُكَ شُكْرَ نِعْمَتِكَ وَحُسْنَ
عِبَادَتِكَ وَ اَسْاَلُكَ اَللّٰهُمَّ يَا رَبِّ قَلْبًا
سَلِيْمًا وَ لِسَانًا صَادِقًا وَ عَمَلًا مُّتَقَبَّلًا وَ
اَسْاَلُكَ مِنْ خَيْرِ مَا تَعْلَمُ وَ اَعُوْذُ بِكَ
مِنْ شَرِّ مَا تَعْلَمُ وَ اَسْتَغْفِرُكَ لِمَا تَعْلَمُ
فَاِنَّكَ تَعْلَمُ وَ لَا اَعْلَمُ وَ اَنْتَ عَلَّامُ
الْغُيُوْبِ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى
آلِ مُحَمَّدٍ وَاغْفِرْ لِيْ مَا قَدَّمْتُ وَ مَا
اَخَّرْتُ وَ مَا اَعْلَنْتُ وَ مَا اَسْرَرْتُ فَاِنَّكَ
اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَ اَنْتَ الْمُؤَخِّرُ وَ اَنْتَ عَلٰى
كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَعَلٰى كُلِّ غَيْبٍ شَهِيْدٌ

(اے اللہ میں تجھ سے ہر امر میں ثابت قدمی اور بھلائی پر
پختگی کا سوال کرتا ہوں اور میں تجھ سے تیری نعمت کا شکر
ادا کرنے اور تیری اچھی عبادت کرنے کا سوال کرتا ہوں اور
میں تجھ سے اے اللہ! اے پروردگار سلیم دل اور سچی زبان
اور مقبول عمل کا سوال کرتا ہوں اور میں اس بھلائی کا سوال
کرتا ہوں جو تو جانتا ہے اور جو برائی تو جانتا ہے اس سے
تیری پناہ چاہتا ہوں اور جو تو جانتا ہے اس کی بخشش چاہتا ہوں
اس لیے کہ تو جانتا ہے اور میں نہیں جانتا اور تو ہی تمام غیبوں کا
جاننے والا ہے۔ اے اللہ محمد اور آل محمد پر رحم فرما اور مجھے بخش دے
جو میں نے پہلے کیا اور جو بعد میں کیا اور جو میں نے برملا کیا اور جو
چھپا کر کیا بیشک تو ہی اول اور تو ہی آخر ہے اور تو ہر چیز پر
قدرت والا ہے اور ہر غیب کی بات پر گواہ موجود ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ اِيْمَانًا لَا يَرْتَدُّ وَ
نَعِيْمًا لَا يَنْفَدُ وَ قُرَّةَ عَيْنِ الْاَبَدِ وَ
مُرَافَقَةَ نَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ
وَ سَلَّمَ فِیْ اَعْلٰی جَنَّةِ الْخُلْدِ ، اَللّٰهُمَّ
اِنِّیْ اَسْاَلُكَ الطَّيِّبَاتِ وَ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ
وَ تَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ وَ حُبَّ الْمَسَاكِيْنِ
اَسْئَلُكَ اَللّٰهُمَّ يَا رَبَّ الصَّلٰوةِ عَلٰی
مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی اٰلِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَ اَسْاَلُكَ
حُبَّكَ وَ حُبَّ مَنْ يُحِبُّكَ وَ حُبَّ
عَمَلٍ يُقَرِّبُ اِلٰی حُبِّكَ وَ اَنْ تَتُوْبَ
عَلَیَّ وَ تَغْفِرَلِیْ وَ تَرْحَمَنِیْ وَ اِذَا اَرَدْتَ
بِقَوْمٍ فِتْنَةً فَاقْبِضْنِیْ اِلَيْكَ غَيْرَ
مَفْتُوْنٍ يَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ اَللّٰهُمَّ
بِعِلْمِكَ الْغَيْبِ وَ قُدْرَتِكَ عَلَى الْخَلْقِ
اَحْيِنِیْ مَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِّیْ وَ
تَوَفَّنِیْ اِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّیْ
اَسْاَلُكَ اَللّٰهُمَّ يَا رَبِّ خَشْيَتَكَ فِی
الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ وَ كَلِمَةَ الْعَدْلِ
فِی الرِّضَا وَ الْغَضَبِ وَ الْقَصْدِ فِی الْغِنٰی
وَ الْفَقْرِ وَ لَذَّةَ النَّظْرِ اِلٰی وَجْهِكَ
الشَّوْقَ اِلٰی لِقَائِكَ وَ اَعُوْذُبِكَ مِنْ
ضَرَّآءٍ مُضِرَّةٍ وَ فِتْنَةٍ مُضِلَّةٍ اَللّٰهُمَّ
يَارَبِّ زَيِّنَّا بِزِيْنَةِ الْاِيْمَانِ وَ اجْعَلْنَا
هُدَاةً مُهْتَدِيْنَ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ
وَ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَ اَقْسِمْ لَنَا مِنْ

اے اللہ! میں ایسے ایمان کا سوال کرتا ہوں کہ ارتداد نہ ہو
اور ایسی نعمت کا سوال کرتا ہوں کہ ختم نہ ہو اور دائمی آنکھوں
کی ٹھنڈک اور تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت کا
سوال کرتا ہوں ابدی اعلیٰ جنت میں ، اے اللہ! میں
تجھ سے پاک چیزوں اور نیک کاموں اور برائیاں چھوڑنے
اور مساکین سے محبت رکھنے کا سوال کرتا ہوں اور میں تجھ سے
اے اللہ اے پروردگار محمد اور آلِ محمد سب پر رحمت کرنیکا
سوال کرتا ہوں اور میں تجھ سے تیری محبت اور اس کی
محبت جو تجھ سے محبت کرے اور ایسے عمل کی محبت کا سوال
کرتا ہوں جو تیری محبت کے قریب کر دے اور یہ کہ تو میری
توبہ قبول کر لے اور میری بخشش فرما دے اور مجھ پر رحم کر دے
اور جب تو ارادہ کرے کسی قوم پر مصیبت لانے کا تو مجھے
فتنہ میں ڈالے بغیر ہی اپنے پاس بلا لے ، اے سب رحم
کرنے والوں سے زیادہ رحم کرنے والے اے اللہ تیرے
علمِ غیب اور مخلوق پر تیری قدرت کا واسطہ مجھے زندہ رکھ ،
جب تک کہ میری زندگی میرے لیے بہتر ہو اور جب میری
وفات میرے لیے بہتر ہو تو مجھے وفات دے دے ۔اے
اللہ! اے رب میں غیب وحاضر میں تجھ سے تیرا ڈر مانگتا
ہوں (نیز) رضا و غیب میں عدول ہونا اور فقیری و
غنا میں اعتدال کی راہ چلنا اور تیرے چہرے کی طرف کی
لذتِ نظر اور تیری ملاقات کا اشتیاق مانگتا ہوں اور میں
تکلیف دہ دکھ سے اور گمراہ کن فتنہ سے تیری پناہ چاہتا
ہوں۔ اے اللہ! اے پروردگار ہمیں ایمان سے مزین
فرما اور ہمیں ہدایت یافتہ ہدایت دینے والے بنا۔ اے اللہ
محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر رحم فرما اور ہمیں ایسا ڈر نصیب فرما کہ جو

خَشْيَتِكَ مَا يَحُوْلُ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ مَعَاصِيْكَ
وَ مِنْ طَاعَتِكَ مَا تُدْخِلُنَا بِهٖ جَنَّتَكَ
وَ مِنَ الْيَقِيْنِ مَا تُهَوِّنُ بِهٖ عَلَيْنَا
مَصَائِبَ الدُّنْيَا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ
وَ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ وَارْزُقْنَا حُزْنَ خَوْفِ
الْوَعِيْدِ وَ سُرُوْرَ رَجَاءِ الْمَوْعُوْدِ حَتّٰى
نَجِدَ لَذَّةَ مَا نَطْلُبُ وَ غَمَّ مَا مِنْهُ
نَهْرُبُ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِ
مُحَمَّدٍ سَيِّدِ الْاَوَّلِيْنَ وَ الْاٰخِرِيْنَ وَ صَلِّ
عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِهٖ اَجْمَعِيْنَ وَ اَلْبِسْ
وُجُوْهَنَا مِنْكَ الْحَيَاءَ وَ امْلَاْ قُلُوْبَنَا
بِكَ فَرَحًا وَ اَسْكِنْ فِيْ نُفُوْسِنَا مِنْ
عَظَمَتِكَ وَ ذَلِّلْ جَوَارِحَنَا لِخِدْمَتِكَ
وَاجْعَلْكَ اَحَبَّ اِلَيْنَا مِمَّا سِوَاكَ وَاجْعَلْنَا
اَخْشٰى لَكَ مِمَّا سِوَاكَ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى
مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ۔ وَ اَعِنِّيْ
عَلٰى ذِكْرِكَ وَ شُكْرِكَ وَ حُسْنِ عِبَادَتِكَ
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ
وَ اَسْاَلُكَ تَمَامَ النِّعْمَةِ بِتَمَامِ التَّوْبَةِ
وَ دَوَامَ الْعَافِيَةِ بِدَوَامِ الْعِصْمَةِ
وَ اَدَاءَ الشُّكْرِ بِحُسْنِ الْعِبَادَةِ اَللّٰهُمَّ
صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ
وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ فِتْنَةِ الْغِنٰى وَ فِتْنَةِ
الْفَقْرِ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ ضِيْقِ الصَّدْرِ
وَ شَتَاتِ الْاَمْرِ وَ عَذَابِ الْقَبْرِ وَ

ہمارے اور تیری نافرمانیوں کے درمیان آڑ ہو جائے اور
ایسی طاعت عطا کر جو ہمیں تیری جنت میں لے جائے اور
ایسا یقین عطا کر کہ اس کی وجہ سے ہم پر دنیا کی تکالیف
آسان ہو جائیں۔ اے اللہ! محمد اور آلِ محمد پر رحم فرما اور
ہمیں خطرۂ سزا کا غم عطا فرما اور ہمیں وعدہ کے انعامات کی
امید کی خوشی عطا کر۔ حتیٰ کہ ہم چاہت کی لذت پائیں اور
جس سے بھاگتے ہیں اس کا غم، اے اللہ! محمد اور آلِ محمد پر
رحم فرما جو اولین و آخرین کے سردار ہیں اور محمد اور آل
(محمد) سب پر رحم فرما اور ہمارے چہروں کو حیا بخش
اور ہمارے دلوں کو فرحت سے پُر کر دے اور ہمارے
دلوں میں اپنی عظمت ڈال اور ہمارے اعضا کو اپنا خادم
بنا دے اور اپنے سوا کو اپنے آپ کی سب سے زیادہ
محبت عطا فرما اور ہمیں ایسا بنا کہ ہم سب سے زیادہ تجھ
سے ڈریں۔ اے اللہ! محمد اور آلِ محمد پر رحم فرما۔ اور
اپنے ذکر، اپنے شکر اور اپنی خوب عبادت پر میری مدد
فرما۔ اے اللہ محمد اور آل محمد پر رحم فرما اور میں کامل
توبہ کے ذریعہ کامل نعمت کا سوال کرتا ہوں اور دائمی
عافیت کا دائمی عصمت کے ذریعہ اور حسنِ عبادت کے
ذریعہ ادائیگی شکر کا سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ محمد اور
آل محمد پر رحم فرما اور میں غنا کے ابتلأ اور محتاجی کے
ابتلأ سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور میں تنگی دل سے
تیری پناہ چاہتا ہوں۔ حالات کی پریشانی سے
اور عذابِ قبر سے اور میں پناہ چاہتا ہوں اور
کبلا دینے والے فقرے اور بری خواہش
سے اور گمراہ کی ساتھی سے اے اللہ!

أَعُوذُ بِكَ مِنْ غِنًى مُطْغٍ وَ مِنْ فَقْرٍ
مُنْسٍ وَ مِنْ هَوًى مُرْدٍ وَ قَرِينٍ
مُغْوٍ اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الصَّلٰوةَ
عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِهِ وَ أَسْأَلُكَ
الْهُدٰى وَ التُّقٰى وَ الْعَفَافَ وَالْغِنٰى
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ نَبِيِّكَ وَصَفِيِّكَ
وَ لَا تُقَدِّمْنِي لِعَذَابٍ وَ لَا تُؤَخِّرْنِي
لِسَيِّءِ الْفِتَنِ أَعُوذُ بِكَ يَا اَللّٰهُ مِنَ
الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَ أَعُوذُ بِكَ
مِنَ الْمِحَنِ مَا خَفِيَ مِنْهَا وَ مَا عَلَنَ اَللّٰهُمَّ
إِنِّي أَسْأَلُكَ الصَّلٰوةَ عَلٰى نَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ
وَعَلٰى آلِهِ وَ أَسْأَلُكَ خَيْرَ هٰذَا الْيَوْمِ
وَ خَيْرَ مَا فِيهِ وَ أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّهِ وَ شَرِّ
مَا فِيهِ أَعُوذُ بِكَ ، اَللّٰهُمَّ يَا رَبِّ مِنْ شَرِّ
طَوَارِقِ اللَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ مِنْ بَغَتَاتِ الْأُمُورِ
وَ فُجَاءَةِ الْأَقْدَارِ وَ مِنْ شَرِّ كُلِّ طَارِقٍ
يَطْرُقُ إِلَّا طَارِقًا يَطْرُقُ مِنْكَ بِخَيْرٍ يَا رَحْمٰنَ
الدُّنْيَا وَ الْآخِرَةِ وَ رَحِيمَهُمَا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى
مُحَمَّدٍ وَعَلٰى آلِهِ وَ اجْعَلْ يَوْمَنَا هٰذَا
أَوَّلَهُ صَلَاحًا وَ أَوْسَطَهُ فَلَاحًا وَ آخِرَهُ
نَجَاحًا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ
وَاجْعَلْ أَوَّلَهُ رَحْمَةً وَ أَوْسَطَهُ نِعْمَةً وَ
وَ آخِرَهُ تَكْرِمَةً اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ نَبِيِّكَ
وَ عَلٰى آلِهِ وَ أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَزِلَّ أَوْ أُزَلَّ
أَوْ أَضِلَّ أَوْ أُضَلَّ أَوْ أَظْلِمَ أَوْ أُظْلَمَ أَوْ

میں تجھ سے محمد اور آلِ محمد پر رحم کا سوال کرتا ہوں ،
اور تجھ سے ہدایت ، پرہیزگاری ، پاکدامنی اور غنا کا
سوال کرتا ہوں اے اللہ ! محمد اپنے نبی اور صفی پر
رحم فرما اور مجھے عذاب کی طرف نہ بڑھا اور مجھے بُرے
فتنوں کے لیے پیچھے نہ چھوڑ۔ اے اللہ۔ میں
ان فتنوں سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو ظاہر
ہُوئے اور جو مخفی ہیں اور میں ان تکالیف
سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو مخفی ہیں اور جو
ظاہر ہیں ۔ اے اللہ ! میں تجھ سے سوال
کرتا ہوں کہ اپنے نبی محمد اور اس کی آل پر
رحم فرما اور میں تجھ سے اس دن کی بھلائی
اور اس میں بھلائی کا سوال کرتا ہوں اور میں
اس کی برائی اور اس کے اندر کی برائی سے پناہ چاہتا ہُوں
اے اللہ اے رب میں رات کے آنے والوں اور دن کے
آنیوالوں کی برائی سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور اچانک امور سے
اور اچانک تقدیر سے اور ہر رات آنے والے کی برائی سے
تیری پناہ چاہتا ہوں جو رات کو آتا ہے ہاں کوئی تجھ سے بھلائی
لے کر آئے اے دنیا اور آخرت کے رحمٰن اور دونوں جہانوں
کے رحیم۔ اے اللہ محمدؐ اور آپؐ کی آل پر رحم فرما اور ہمارے
آج کے دن کی ابتداء ، اصلاح اور وسط کامرانی اور آخر
کامیابی بنا دے ۔ اے اللہ ! محمدؐ اور آپؐ کی آل پر رحم فرما
اور اس کی ابتداء کو رحمت اور درمیان کو نعمت اور انجام کو
عزت بنا دے ۔ اے اللہ ! اپنے نبی محمد اور آپ کی آل پر رحم
فرما اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ میں پھسلاؤں یا پھسلایا جاؤں
یا گمراہ کروں یا گمراہ کیا جاؤں یا ظلم کروں یا ظلم کیا جاؤں یا

أَجْهَلَ أَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ عَزَّ جَارُكَ وَ جَلَّ ثَنَاؤُكَ
وَ تَبَارَكَ أَسْمَاؤُكَ وَ لَا إِلٰهَ غَيْرُكَ اَللّٰهُمَّ
صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِهٖ وَ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ
عَذَابِ جَهَنَّمَ وَ عَذَابِ الْقَبْرِ وَ مِنْ فِتْنَةِ
الْمَحْيَا وَ الْمَمَاتِ وَ مِنْ فِتْنَةِ الْمَسِيْحِ
الدَّجَّالِ وَ إِذَا أَرَدْتَ بِقَوْمٍ سُوْٓءًا أَوْ
فَاقْبِضْنِيْ إِلَيْكَ غَيْرَ مُبْتَلٍ وَ لَا مَفْتُوْنٍ
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِهٖ اَللّٰهُمَّ
أَحْيِنِيْ مَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِيْ وَ تَوَفَّنِيْ
إِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِيْ وَ أَسْأَلُكَ خَيْرَ
الْحَيَاةِ وَ أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ الْوَفَاةِ وَ
أَسْأَلُكَ خَيْرَ مَا بَيْنَهُمَا وَ خَيْرَ مَا بَعْدَ
ذٰلِكَ أَحْيِنِيْ حَيَاةَ السُّعَدَاءِ حَيَاةَ مَنْ
تُحِبُّ بَقَاءَهٗ وَ تَوَفَّنِيْ وَفَاةَ الشُّهَدَاءِ
وَفَاةَ مَنْ تُحِبُّ لِقَاءَهٗ يَا خَيْرَ الرَّازِقِيْنَ
وَ يَا أَحْسَنَ التَّوَّابِيْنَ وَ يَا أَحْكَمَ الْحَاكِمِيْنَ
وَ يَا أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ وَ يَا رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ
أَعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ
وَ مَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَ مِنْ شَرِّ مَا يَنْزِلُ
مِنَ السَّمَاءِ وَ مَا يَعْرُجُ فِيْهَا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ
تَوَاضَعَ كُلُّ شَيْءٍ لِعِزَّتِهٖ وَ خَضَعَ كُلُّ
شَيْءٍ لِمُلْكِهٖ وَ اسْتَسْلَمَ كُلُّ شَيْءٍ
لِقُدْرَتِهٖ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ
الَّذِيْ سَكَنَ كُلُّ شَيْءٍ
لِهَيْبَتِهٖ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ

جہالت کروں یا مجھ سے جہالت ہو۔ تیری پڑوسی عزت والا ہے
اور تیری ثنا بڑی ہے اور تیرے اسماء برکت والے ہیں
اور تیرے بغیر کوئی معبود نہیں۔ اے اللہ! محمدؐ اور آپؐ کی
آل پر رحم فرما اور میں دوزخ کے عذاب اور قبر کے عذاب سے
اور زندگی اور موت کے فتنہ سے اور دجال کے فتنہ سے
تیری پناہ چاہتا ہوں اور جب تو کسی قوم کے بارے سزا یا
فتنہ کا ارادہ کرے تو مجھے بغیر لتھڑے ہوئے اور بغیر فتنہ
میں پڑے اپنی طرف بلا لے۔ اے اللہ! محمد اور آپؐ کی
آل پر رحم فرما۔ اے اللہ! جب تک میری زندگی بہتر ہو مجھے
زندہ رکھ اور جب میری وفات بہتر ہو تو مجھے موت دے دے
اور میں تجھ سے زندگی کی بھلائی اور زندگی کی برکت کا
سوال کرتا ہوں اور میں بری موت سے تیری پناہ چاہتا
ہوں اور میں ان کے مابین کی بھلائی کا اور اس کے بعد
کی بھلائی کا تجھ سے سوال کرتا ہوں۔ مجھے نیک بختوں کی
زندگی عطا کر۔ اس کی زندگی کہ جس کا باقی رہنا تو پسند کرتا
ہے اور شہداء کی موت عطا کر۔ اس کی موت کہ جس کی ملاقات
تو پسند کرتا ہے۔ اے بہترین رزاق اور اے بہترین توبہ
قبول کرنے والے اور سب سے بڑے حاکم اور سب سے
بڑے مہربان اور تمام جہانوں کے رب میں ہر اس کی
برائی سے تیری پناہ چاہتا ہوں کہ جو زمین میں داخل ہو
اور جو اس سے نکلے اور اس کی برائی سے کہ جو آسمان سے
اترے اور جو اس میں چڑھے۔ سب حمد اللہ ہی کے لیے ہے
ہر چیز اس کی عظمت کے سامنے جھکی اور ہر چیز اس کی
عزت کے سامنے گری اور ہر چیز اس کی سلطانی کے سامنے
جھک گئی اور ہر چیز نے اس کی قدرت کے سامنے ہتھیار

اَظْهَرَ كُلَّ شَيْءٍ بِحِكْمَتِهٖ وَ تَصَاغَرَ كُلُّ شَيْءٍ لِكِبْرِيَائِهٖ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى نَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ وَ اَزْوَاجِهٖ وَ ذُرِّيَّتِهٖ فِي الْعٰلَمِيْنَ اِنَّكَ حَمِيْدٌ مَّجِيْدٌ كَرِيْمٌ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَ نَبِيِّكَ وَ رَسُوْلِكَ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الرَّسُوْلِ الْاَمِيْنِ وَ اَعْطِهِ الْمَقَامَ الْمَحْمُوْدَ يَوْمَ الدِّيْنِ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنْ حِدَّةِ الْحِرْصِ وَ شِدَّةِ الطَّمَعِ وَ سَوْرَةِ الْغَضَبِ وَ سِنَةِ الْغَفْلَةِ وَ تَعَاطِي الذِّلَّةِ اَعُوْذُبِكَ مِنْ مُبَاهَاةِ الْمُكْثِرِيْنَ وَ الْاِزْرَاءِ عَلَى الْمُقِلِّيْنَ وَ اَنْ اَنْصُرَ ظَالِمًا اَوْ اَخْذُلَ مَظْلُوْمًا وَ اَنْ اَقُوْلَ فِي الْعِلْمِ بِغَيْرِ الْعِلْمِ وَ اَعْمَلَ فِي الدِّيْنِ بِغَيْرِ يَقِيْنٍ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ اَنْ اُشْرِكَ بِكَ وَ اَنَا اَعْلَمُ وَ اَسْتَغْفِرُكَ لِمَا اَعْلَمُ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ مِنِ اتِّبَاعِ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ وَ شِرْكِهٖ فِي الْمَالِ وَ الْاَهْلِ وَ قَبُوْلِ اَمْرِهٖ فِي السُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ الصَّلٰوةَ عَلٰى نَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِهٖ وَ اَسْاَلُكَ حُسْنَ الْاِخْتِيَارِ وَ صِحَّةَ الْاِعْتِبَارِ وَ صِدْقَ الْاِفْتِقَارِ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ وَ افْتَحْ بِخَيْرٍ وَ اخْتِمْ بِخَيْرٍ وَ اَنْتَ الْفَتَّاحُ الْعَلِيْمُ ۔ اَللّٰهُمَّ

ڈال دیے اور سب حمد اس اللہ کے لیے ہے کہ ہر چیز اس کی ہیبت کے باعث تھم گئی اور سب حمد اس کے لیے ہے کہ جس نے اپنی حکمت سے ہر چیز کو ظاہر کیا اور ہر چیز اس کی کبریائی کے سامنے چھوٹی ہو کر رہ گئی۔ اے اللہ! اپنے نبی محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر اور اس کی ازدواج پر اور اولادؐ پر رحم فرما۔ سب جہانوں میں بیشک تو حمد والا بزرگ اور کریم ہے۔ اے اللہ! اپنے بندے اور اپنے نبی اور اپنے رسول نبی امی' رسول امین پر رحم فرما اور اسے قیامت کے روز مقامِ محمود عطا فرما۔ اے اللہ! میں لالچ کی تیزی اور طمع کی شدت سے تیری پناہ مانگتا ہوں، اور غصہ کی شدت اور غفلت کی اُونگھ اور ذلت کے غلبہ سے میں تیری پناہ چاہتا ہوں۔ دولتمندوں کی مباہات اور غریبوں پر عیب لگانے سے اور یہ کہ میں کسی ظالم کی مدد کروں یا کسی مظلوم کو ذلیل کروں اور علم میں بغیر علم کے بات کروں اور بلا یقین ہی دین پر عمل کروں۔ اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ میں تیرے ساتھ شرک کروں اور اسے جانتا ہوں اور تیری بخشش چاہتا ہوں اس سے کہ جسے نہیں جانتا۔ اے اللہ میں شیطان کے قدموں کی پیروی سے تیری پناہ چاہتا ہوں اور اس کے مال، اہل و عیال میں شریک ہو جانے سے اور برائی اور بے حیائی کے کاموں میں اس کی بات ماننے سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اے اللہ تیرے نبی محمدؐ اور آپؐ کی آل پر رحمت کا سوال کرتا ہوں اور میں تجھ سے حسنِ امتحان اور صحتِ اعتبار اور صدقِ احتیاج کا سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ! محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر رحم فرما اور بھلائی کے ساتھ آغاز ہو اور بھلائی پر انجام ہو اللہ تو ہی کھولنے والا جاننے والا ہے

صَلِّ عَلٰی نَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ وَ
اَرْحَمْ مَا خَلَقْتَ وَاغْفِرْ مَا قَدَّرْتَ وَطَیِّبْ
مَا رَزَقْتَ وَ تَمِّمْ مَا اَنْعَمْتَ وَ تَقَبَّلْ مَا
اسْتَعْمَلْتَ وَاحْفَظْ مَا اسْتَحْفَظْتَ وَ لَا
تَهْتِكْ مَا سَتَرْتَ فَاِنَّهٗ لَا اِلٰهَ لَنَا اِلَّا
اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ مِنْ کُلِّ لَذَّةٍ بِغَیْرِ
ذِکْرِکَ وَ مِنْ کُلِّ رَاحَةٍ بِغَیْرِ خِدْمَتِکَ
وَ مِنْ کُلِّ سُرُوْرٍ بِغَیْرِ قُرْبِکَ
وَ مِنْ کُلِّ فَرَحٍ بِغَیْرِ مُجَالَسَتِکَ وَ مِنْ
کُلِّ شُغْلٍ بِغَیْرِ مُعَامَلَتِکَ اَللّٰهُمَّ
صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ وَاجْعَلْنَا
مِنْ اَوْلِیَآئِکَ الْمُتَّقِیْنَ وَ حِزْبِکَ الْمُفْلِحِیْنَ
وَ عِبَادِکَ الصَّالِحِیْنَ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ
وَ عَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ وَ اسْتَعْمِلْنَا بِمَرْضَاتِکَ
عَنَّا وَ وَفِّقْنَا لِمَحَآبِّکَ مِنَّا وَ صَرِّفْنَا بِحُسْنِ
اِخْتِیَارِکَ لَنَا اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی نَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ
وَ عَلٰی آلِهٖ وَ نَسْاَلُکَ جَوَامِعَ الْخَیْرِ وَ
فَوَاتِحَهٗ وَ خَوَاتِمَهٗ وَ نَعُوْذُبِکَ مِنْ
جَوَامِعِ الشَّرِّ وَ فَوَاتِحِهٖ وَخَوَاتِمِهٖ ، اَللّٰهُمَّ
صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَ عَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ وَاحْفَظْنَا
فِیْمَا اَمَرْتَنَا وَ احْفَظْنَا عَمَّا نَهَیْتَنَا وَ احْفَظْ
لَنَا مَا اَعْطَیْتَنَا یَا حَافِظَ الْحَافِظِیْنَ وَ یَا
ذَاکِرَ الذَّاکِرِیْنَ وَ یَا شَاکِرَ الشَّاکِرِیْنَ
بِحِفْظِکَ حَفِظُوْا وَ بِذِکْرِکَ ذَکَرُوْا وَ
بِفَضْلِکَ شَکَرُوْا یَا غَوْثُ یَا مُغِیْثُ یَا

اے اللہ! اپنے نبی محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر رحم فرما اور اپنی مخلوق
پر رحم فرما اور جو تو نے مقدر کیا اسے بخش دے اور جو تُو نے
روزی دی اسے عمدہ بنا دے اور اپنے انعام کو کامل کر دے
اور جو تو عمل کروائے اسے قبول فرما اور جس کی حفاظت
کر رہا ہے اس کی حفاظت فرما اور جس کا تُو نے پردہ رکھا
اسے نہ پھاڑ، اس لیے کہ ہمارے لیے تیرے بغیر کوئی معبود
نہیں! میں تیرے ذکر کے بغیر کی ہر لذت سے بخشش چاہتا ہوں
اور تیری عبادت کے بغیر کی ہر راحت سے اور تیرے قرب کے
بغیر کے ہر سرور سے اور تیری ہم نشینی کے بغیر کی ہر فرحت سے
اور تیرے معاملہ کے بغیر کے ہر کام سے تیری پناہ مانگتا ہوں
اے اللہ! محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر رحم فرما اور ہمیں اپنے پرہیزگار
اولیاء میں سے بنا دے اور اپنے فلاح یافتہ گروہ سے اور
اپنے نیک بندوں سے بنا دے۔ اے اللہ! محمدؐ اور آلِ محمدؐ
پر رحم فرما اور ہمیں اپنی مرضی پر چلا اور ہمیں اپنی محبت کی توفیق
عطا کر اور ہمیں اپنے حُسنِ اختیار سے چلا۔ اے اللہ! اپنے
نبی محمدؐ اور آپ کی آل پر رحم فرما اور ہم تمام بھلائی اور اس کے
آغاز و انجام سے تیری پناہ چاہتے ہیں۔ اے اللہ!
محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر رحم فرما اور اپنے اوامر میں ہماری
حفاظت فرما اور اپنے ممنوعات میں ہماری حفاظت فرما
اور اپنے عطیات میں ہماری حفاظت فرما۔
اے محافظوں کے محافظ اور یاد کرنے والوں کے
یاد رکھنے والے اور شکر گزاروں کو انعام دینے والے
تیری حفاظت سے وہ محفوظ رہے اور تیرے ذکر سے
اُن کا ذکر ہوا اور تیرے فضل سے انہوں نے شکر کیا
اے مددگار! اے مدد کرنے والے، اے

مُسْتَغَاثٌ يَا غِيَاثَ الْمُسْتَغِيْثِيْنَ لَا تَكِلْنِيْ
اِلٰى نَفْسِيْ يَا رَبِّ طَرْفَةَ عَيْنٍ فَاَهْلِكُ وَلَا
تَكِلْنِيْ اِلَى الْخَلْقِ فَاَضِيْعُ اَكْلَاْنِيْ كِلَاءَةَ
الْوَلِيْدِ وَ لَا تَخْلُ عَنِّيْ وَ لَا تَوَلَّنِيْ
بِمَا تَتَوَلّٰى بِهٖ عِبَادَكَ الصَّالِحِيْنَ اَللّٰهُمَّ
صَلِّ عَلٰى نَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِهٖ وَ
بِقُدْرَتِكَ عَلَيَّ تُبْ عَلَيَّ ، اِنَّكَ اَنْتَ
التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ، وَ بِحِلْمِكَ عَنِّيْ اُعْفُ
عَنِّيْ اِنَّكَ اَنْتَ الْغَفَّارُ وَ بِعِلْمِكَ ارْفُقْ
بِيْ اِنَّكَ اَنْتَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ وَبِمِلْكِكَ
لِيْ مَلِّكْنِيْ نَفْسِيْ وَ لَا تُسَلِّطْهَا عَلَيَّ
اِنَّكَ اَنْتَ الْمَلِكُ الْجَبَّارُ سُبْحَانَكَ وَ
بِحَمْدِكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ عَمِلْتُ سُوْءً
وَ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْلِيْ ذَنْبِيْ اِنَّكَ اَنْتَ
رَبِّيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ . اِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ
اِلَّا اَنْتَ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى
آلِ مُحَمَّدٍ وَ اَلْهِمْنِيْ رُشْدِيْ وَ قِنِيْ شَرَّ
نَفْسِيْ ، اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِ
مُحَمَّدٍ وَ ارْزُقْنِيْ حَلَالًا لَا تُعَاقِبُنِيْ عَلَيْهِ
وَ قَنِّعْنِيْ بِمَا رَزَقْتَنِيْ وَ اسْتَعْمِلْنِيْ بِهٖ
صَالِحًا تَقْبَلُهُ مِنِّيْ اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ
اَنْ تُصَلِّيَ عَلٰى نَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِ
مُحَمَّدٍ وَ اَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَ الْعَافِيَةَ وَحُسْنَ
الْيَقِيْنِ وَ الْمُعَافَاةَ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى نَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ وَ عَلٰى آلِ مُحَمَّدٍ

جس سے مدد چاہی جاتی ہے۔ اے فریادیوں کے مددگار!
اے میرے پروردگار! پلک بھر بھی مجھے میرے نفس کے
سپرد نہ کرنا نہیں تو میں تباہ ہو جاؤں گا اور مخلوق کے سپرد نہ
کرنا نہیں تو میں ہلاک ہو جاؤں گا۔ بچے کی طرح میری
حفاظت کرنا اور مجھ سے علیحدہ نہ ہو اور جسے تو اپنے
صالح بندوں کا کارساز ہے۔ اسی طرح میری کارسازی
فرما۔ اے اللہ! اپنے نبی محمدؐ اور آپؐ کی آل پر رحم فرما
اور مجھ پر اپنی قدرت سے مجھ پر رحم کے ساتھ پلٹ آ۔ بیشک
تُو ہی توبہ کرنے والا، رحم کرنے والا ہے اور اپنے حلم کے
طفیل مجھے معاف فرما دے۔ بے شک تو بخشنے والا ہے
اور اپنے علم کے صدقے مجھ سے نرمی فرما۔ بیشک تو ہی
مہربان رحم کرنے والا ہے اور میرے نفس کی ملکیت کے صدقے
مجھے میرے نفس کا مالک بنا دے اور مجھ پر اسے تسلط نہ دے
بیشک تُو ہی بادشاہ جبار ہے۔ تُو پاک ہے اور تیری ہی حمد ہے
تیرے بغیر کوئی معبود نہیں۔ میں نے بُرا کیا اور اپنے آپ پر
ظلم کیا۔ سو میرے گناہ بخش دے ۔ بے شک تو ہی میرا
رب ہے۔ تیرے بغیر کوئی معبود نہیں، بیشک تیرے بغیر
کوئی گناہ نہیں بخشتا۔ اے اللہ محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر رحم فرما اور
مجھے اپنی بھلائی القاء فرما اور مجھے میرے نفس کی برائی سے
بچا۔ اے اللہ! محمد اور آل محمد پر رحم فرما اور مجھے حلال روزی
عطا کر اس پر سزا نہ دے اور تو جو روزی دے اس پر قانع
بنا دے اور مجھ سے نیک کام لے اور اسے قبول کرے۔ اے اللہ
بیشک میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تُو اپنے نبی محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر رحم
فرما اللہ تجھ سے معافی، عافیت اور حسنِ یقین کا سوال کرتا
ہوں اور دنیا و آخرت میں معافی کا سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ!

وَ اَعُوْذُ بِعَفْوِكَ مِنْ عِقَابِكَ وَ اَعُوْذُ
بِرِضَاكَ مِنْ سُخْطِكَ وَ اَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ
لَا اُحْصِىْ ثَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ
عَلٰى نَفْسِكَ اَبُوْءُ بِنِعْمَتِكَ اِلَيْكَ وَ
اَبُوْءُ بِذُنُوْبِىْ اِلَيْكَ هٰذَا يَدَاىَ بِمَا
كَسَبْتُ اَنَا عَبْدُكَ اِبْنُ عَبْدِكَ نَاصِيَتِىْ
بِيَدِكَ جَارٍ فِىَّ حُكْمُكَ نَافِذٌ فِىَّ قَضَاءُكَ
عَدْلٌ فِىَّ مَشِيَّتُكَ اِنْ تُعَذِّبْ فَاَهْلٌ
ذٰلِكَ اَنَا وَ اِنْ تَرْحَمْ فَاَهْلٌ ذٰلِكَ اَنْتَ
فَافْعَلْ اَللّٰهُمَّ يَا مَوْلَاىَ يَا اللّٰهُ يَا رَبِّ
اِفْعَلْ بِىْ مَا اَنْتَ لَهٗ اَهْلٌ وَ لَا تَفْعَلْ
اَللّٰهُمَّ يَارَبِّ يَا اَللّٰهُ بِىْ مَا اَنَا لَهٗ اَهْلٌ
فَاِنَّكَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَ اَهْلُ الْمَغْفِرَةِ،
يَا مَنْ لَا تَضُرُّهُ الذُّنُوْبُ وَ لَا تَنْقُصُهُ
الْمَغْفِرَةُ هَبْ لِىْ ، اَللّٰهُمَّ يَا رَبِّ مَا
لَا يَضُرُّكَ وَ اَعْطِنِىْ مَا لَا يَنْقُصُكَ اَفْرِغْ
اَللّٰهُمَّ عَلَيْنَا يَا رَبِّ صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا
مُسْلِمِيْنَ وَ اَلْحِقْنَا بِالصّٰلِحِيْنَ اَنْتَ
وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ
الْغَافِرِيْنَ وَاكْتُبْ لَنَا فِىْ هٰذِهِ الدُّنْيَا
حَسَنَةً وَّ فِى الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً اِنَّا هُدْنَا
اِلَيْكَ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَ اِلَيْكَ
اَنَبْنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ رَبَّنَا لَا
تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ اغْفِرْ لَنَا
رَبَّنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ؎

اپنے نبی محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر رحم فرما اور میں تیرے عذاب سے
تیری معافی کی پناہ چاہتا ہوں اور میں تیری ناراضگی سے
تیری رضا کی پناہ چاہتا ہوں اور میں تجھ سے تیری پناہ چاہتا
ہُوں میں تیری ثنا پوری نہیں کر سکتا تُو ایسا بلند ہے جیسے کہ
تُو نے خود اپنی ثنا کی۔ میں تیرے انعامات کا اقرار کرتا ہُوں
اور اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہوں۔ یہ میرے دونوں ہاتھ
ہیں ان سے میں نے کیا۔ میں تیرا بندہ تیرے بندے کا
بیٹا ہُوں۔ میری پیشانی تیرے قبضہ میں ہے مجھ پر تیرا حکم
جاری ہے مجھ پر تیری قضا نافذ ہے، مجھ پر تیری مشیت جاری
ہے۔ اگر تُو سزا دے تو میں اس کے لائق ہُوں اور اگر تو
رحم فرمائے تو میں اس کے لائق ہوں۔ اے اللہ! اے
میرے آقا! اے اللہ! اے پروردگار! کیجیے میرے
ساتھ وُہ سلوک کہ جس کا تُو اہل ہے اور ایسا نہ کیجیے اے اللہ!
اے پروردگار! اے اللہ! میرے رب جس کا میں اہل
ہُوں اس لیے کہ تُو تقویٰ، مغفرت والا ہے۔ اسے
جسے گناہ نہیں نقصان دیتے اور بخشش اسے نقصان نہیں
دیتے۔ اے اللہ! اے پروردگار مجھے وہ عطا فرما جو کہ
تجھے مضر نہیں اور مجھے وُہ عطا فرما جو کہ تجھے نقصان نہیں دیتا،
اے اللہ! ہم پر اے پروردگار صبر عطا فرما اور ہمیں مُسلمان
بنا کر موت دے اور ہمیں نیکو کاروں سے ملا دے تُو ہی
ہمارا کارساز ہے سو ہمیں بخشش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو بہترین
بخشنے والا ہے اور ہمیں اس دنیا میں اور آخرت میں اچھی
زندگی عطا فرما، بیشک ہم نے تیری طرف رجوع کیا۔ اے
ہمارے پروردگار ہم نے تجھ پر توکل کیا اور تیری طرف توجہ
کی اور تیری طرف ہی لوٹنا ہے اے ہمارے پروردگار!

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ اِسْرَافَنَا فِیْ اَمْرِنَا
وَ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ
الْکَافِرِیْنَ رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَةً
وَّ هَیِّئْ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا رَبَّنَا
اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ
حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ - اَللّٰهُمَّ
اِنِّیْ اَسْاَلُکَ اَنْ تُصَلِّیَ عَلٰی نَبِیِّکَ
مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَ
اَسْاَلُکَ الصِّیَانَةَ وَ الْعَوْنَ عَلَی
الطَّاعَةِ وَ الْعِصْمَةَ مِنَ
الْمَعْصِیَةِ وَ اِفْرَاغَ الصَّبْرِ فِی
الْخِدْمَتِ وَ اِیْزَاعَ الشُّکْرِ عَلَی
النِّعْمَةِ وَ اَسْاَلُکَ یَا مَوْلَایَ یَا اَللّٰهُ
یَا رَبِّ الصَّلٰوةَ عَلٰی نَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ وَّ
عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ وَ حُسْنَ الْخَاتِمَةِ -
اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ اَنْ تُصَلِّیَ عَلٰی
نَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ
وَ اَسْاَلُکَ الْیَقِیْنَ وَ حُسْنَ الْمَعْرِفَةِ
بِکَ وَ اَسْاَلُکَ الْمَحَبَّةَ وَ حُسْنَ التَّوَکُّلِ
عَلَیْکَ وَ اَسْاَلُکَ الرِّضَا وَ حُسْنَ الْمُنْقَلَبِ
اِلَیْکَ رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ
لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا رَبَّنَا
فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَ کَفِّرْ عَنَّا سَیِّاٰتِنَا وَ
تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ رَبَّنَا وَ اٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا
عَلٰی رُسُلِکَ وَ لَا تُخْزِنَا یَوْمَ الْقِیَامَةِ

ہمیں ان کے لیے فتنہ نہ بنا دیجئے جنھوں نے کفر کیا اور
اے ہمارے رب ہمیں بخش دے بیشک تو ہی غالب
حکمت والا ہے۔ اے ہمارے رب ہمارے گناہوں کو
بخش دیجیے اور ہمارے کام اسراف کو بخش دیجئے اور ہمارے
قدم پختہ کیجئے اور ہماری کافروں کی قوم کے مقابلہ میں مدد فرمائیے
اے ہمارے پروردگار! ہمیں اپنے ہاں سے رحمت عطا فرما
اور پوری کر دے ہمارے کام کی درستی۔ اے ہمارے پروردگار!
ہمیں دنیا میں اچھی اور آخرت میں اچھی زندگی عطا فرما۔ اور
ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے۔ اے اللہ میں تجھ سے
سوال کرتا ہوں کہ اپنے نبی محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر رحم فرما اور میں
تجھ سے تحفظ اور طاعت پر مدد کا سوال کرتا ہوں اور گناہوں
سے بچنے کی مدد مانگتا ہوں اور عبادت میں خوب صبر اور
نعمت پر شکر کا سوال کرتا ہوں اور اے میرے آقا!
اے اللہ! اے رب! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ اپنے
نبی محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر رحم فرما اور میں حسنِ انجام کا سوال کرتا ہوں
اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ تو اپنے نبی
محمدؐ اور آلِ محمدؐ پر رحم فرما، اور میں تجھ سے
یقین اور تیری حسنِ معرفت کا سوال کرتا ہوں اور میں تجھ سے
محبت اور تجھ پر حسنِ توکل کا سوال کرتا ہوں اور میں تجھ سے
رضا اور تیری طرف حسنِ رجوع کا سوال کرتا ہوں۔ اے
ہمارے پروردگار! بیشک ہم نے منادی کو سنا جو ایمان کی
ندا کرتا ہے کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ۔ چنانچہ اے ہمارے
رب! ہم ایمان لائے سو ہمارے گناہوں کو بخش دے
اور ہم سے ہماری برائیوں کا کفارہ کر دے اور ہمیں نیکوں کے
ہمراہ موت دے۔ اے ہمارے پروردگار ہمیں وہ عطا فرما جو

إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا
إِنْ نَّسِيْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا ، رَبَّنَا لَا تَحْمِلْ
عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ
قَبْلِنَا رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ
لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَ اغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا
أَنْتَ مَوْلَانَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ اٰمِيْنَ
اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ
وَ طَهِّرْ قُلُوْبَنَا فِيْ قُلُوْبِ الْأَبْرَارِ وَ زَكِّ
أَعْمَالَنَا فِيْ عَمَلِ الْأَخْيَارِ وَ صَلِّ عَلٰى
أَرْوَاحِنَا فِيْ أَرْوَاحِ الشُّهَدَآءِ يَا أَكْرَمَ
الْأَكْرَمِيْنَ وَ يَا أَجْوَدَ الْأَجْوَدِيْنَ وَ يَا
أَرْحَمَ الرَّاحِمِيْنَ - رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا
حَسَنَةً وَّ عِلْمًا وَ زُهْدًا وَ عِبَادَةً وَ أَمْنًا
وَ رِزْقًا مِّنْ حَلَالٍ وَ فِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً
رِضْوَانَكَ وَ الْجَنَّةَ وَ قِنَا بِرَحْمَتِكَ
عَذَابَ النَّارِ وَ عَذَابَ الْقَبْرِ وَ قِنَا
سُخْطَكَ وَ غَضَبَكَ وَ عَذَابَكَ وَ
أَهْوَالَهٗ عَاجِلًا وَّ اٰجِلًا فِي الدِّيْنِ
وَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ بِرَحْمَتِكَ يَا أَرْحَمَ
الرَّاحِمِيْنَ ۔

(تُو نے اپنے رسولوں کی زبانی وعدہ کیا اور ہمیں قیامت کے
روز ذلیل نہ کرنا بیشک تُو وعدہ خلاف نہیں کرتا۔ اے ہمارے
پروردگار! اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر بیٹھیں تو ہمیں نہ پکڑنا،
اے ہمارے پروردگار اور ہم پر بوجھ نہ ڈالنا جیسے کہ تُو نے
ان پر بوجھ ڈالا جو ہم سے پہلے تھے۔ اے ہمارے پروردگار!
اور ہم پر وہ ڈالنا جسکی ہم میں طاقت نہیں اور ہمیں معاف کردینا اور
ہمیں بخش دینا اور ہم پر رحم کرنا تو ہی ہمارا آقا ہے اور کافر قوم کے
مقابلہ میں ہماری مدد کرنا آمین۔ اے اللہ! محمدؐ اور آل محمدؐ پر
رحم فرما اور ہمارے دلوں کو صالحین کے دلوں میں پاک فرما
اور نیکوں کے عمل میں ہمارے اعمال پاک فرما اور شہداء کی
ارواح میں ہماری ارواح میں ہماری ارواح پر رحم فرما۔
اے سب سے زیادہ کریم، اور اے سب سے بڑے
سخی اور اے سب سے بڑے رحم کرنے والے۔
اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں اچھی زندگی اور
علم اور زہد اور عبادت اور امن عطا فرما۔ اور حلال روزی
عطا فرما اور آخرت میں اچھی زندگی، اپنی رضا اور جنت
عطا فرما اور اپنی رحمت سے ہمیں آگ کے عذاب سے
اور قبر کے عذاب سے بچالے اور ہمیں اپنی ناراضگی
اور اپنے غصہ اور اپنے عذاب اور اس کی ہولناکیوں سے
بچالے۔ زُود ہوں یا بدیر، دین اور دنیا اور آخرت
میں اپنی رحمت کے طفیل، اے سب رحم کرنے والوں
سے بڑے رحم کرنے والے)

صبح و شام کی تسبیح و تمجید

انسان کو چاہیے کہ صبح و شام ان الفاظ کے ساتھ اللہ تعالےٰ کی حمد و ثنا کرے جن کے ساتھ

خود اللہ تعالیٰ اپنی حمد و ثنا بیان فرمائی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا کہ اللہ تعالیٰ ہر روز ان کلمات کے ساتھ اپنی شان و عظمت بیان کرتا ہے۔ ہمیں بھی چاہیے کہ ہم انہی کلمات کے ساتھ روزانہ صبح کو ان مبارک کلمات کے ساتھ اللہ جل شانہٗ کی حمد و ثنا کریں۔ وہ کلمات حسب ذیل ہیں:۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ

اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا الْعَفُوُّ الْغَفُوْرُ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا مُبْدِئُ کُلِّ شَیْئٍ وَاِلَیَّ یَعُوْدُ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا لَمْ اَلِدْ وَلَمْ اُوْلَدْ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا مَالِكُ یَوْمِ الدِّیْنِ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا خَالِقُ الْخَیْرِ وَالشَّرِّ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا خَالِقُ الْجَنَّۃِ وَالنَّارِ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ الَّذِیْ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا الْوَاحِدُ الْاَحَدُ الْفَرْدُ الصَّمَدُ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ صَاحِبَۃً وَّلَا وَلَدًا، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا الْفَرْدُ الْوِتْرُ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّھَادَۃِ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُھَیْمِنُ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا الْخَالِقُ الْبَارِئُ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا الْاَحَدُ الْمُصَوِّرُ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا الْکَبِیْرُ الْمُتَعَالُ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا الْمُقْتَدِرُ الْقَھَّارُ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا الْحَکِیْمُ الْکَبِیْرُ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا الْقَادِرُ الرَّزَّاقُ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا اَھْلُ الثَّنَاءِ وَالْمَجْدِ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا اَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰی، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا فَوْقَ الْخَلْقِ وَالْخَلِیْقَۃِ، اِنِّیْ اَنَا اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا الْجَبَّارُ الْمُتَکَبِّرُ۔

ترجمہ: بے شک میں اللہ ہوں تمام جہانوں کا رب، بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں زندہ قائم رکھنے والا ہوں، بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں بزرگ و برتر ہوں، بے شک میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں معاف کرنیوالا

اور بخشنے والا ہوں، بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں ہر چیز کا آغاز کرنے والا ہوں اور میری طرف سب واپس ہوں گے، بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں نہ میں نے جنا اور نہ میں جنا گیا، بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں۔ میں غالب حکمت والا ہوں، بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں میں روزِ جزا کا مالک ہوں بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں میں نہایت مہربان رحم کرنے والا ہوں، بیشک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں میں خیر و شر کا پیدا کرنے والا ہوں۔ بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں میں جنت و دوزخ کا پیدا کرنے والا ہوں، بے شک میں اللہ ہوں کہ میرے بغیر کوئی معبود نہیں ایک ہوں ایک، ایک بے نیاز ہوں جس نے نہ بیوی بنائی اور نہ لڑکا۔ بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں ایک اور وتر ہوں، بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں غیب و حاضر کو جاننے والا ہوں، بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں بادشاہ قدوس ہوں، بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں سلام، مومن اور نگہبان ہوں۔ بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں غالب و جبار اور متکبر ہوں، بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں بڑا اور بلند ہوں بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں، میں ہی قدرت والا اور قہار ہوں، بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں، حکمت والا بڑا ہوں، بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں قدرت والا روزی دینے والا ہوں۔ بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں، ثنا و بزرگی کے لائق ہوں، بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں۔ میں مخفی اور مخفی ترین کو جانتا ہوں بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں، مخلوق اور پیدائش سے بالا ہوں۔ بے شک میں اللہ ہوں میرے بغیر کوئی معبود نہیں جبار متکبر ہوں۔

اب جو آدمی بھی یہ مذکورہ کلماتِ مبارکہ پڑھنا چاہے اُسے چاہیے کہ جہاں جہاں اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰہ آیا ہے اسے اِنَّکَ اَنْتَ اللّٰہُ پڑھے اور جہاں اِلَّآ اَنَا آیا ہے اسے اِلَّآ اَنْتَ پڑھے۔ مثلاً اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰہُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ کو اِنَّکَ اَنْتَ اللّٰہُ رَبُّ الْعَالَمِیْنَ پڑھے۔ اور اِنِّیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ کو اِنَّکَ اَنْتَ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ پڑھے

(ہم سہولت کی خاطر اس دعا کو اس طرح بدل کر لکھ دیتے ہیں تاکہ پڑھنے والوں کے لیے آسانی رہے۔ مترجم)

اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ رَبُّ الْعَالَمِيْنَ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْعَفُوُّ الْغَفُوْرُ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ مُبْدِئُ كُلِّ شَيْءٍ وَ اِلَيْكَ يَعُوْدُ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ لَمْ تَلِدْ وَلَمْ تُوْلَدْ اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ مَالِكُ يَوْمِ الدِّيْنِ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا خَالِقُ الْخَيْرِ وَالشَّرِّ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ خَالِقُ الْجَنَّةِ وَالنَّارِ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْوَاحِدُ الْاَحَدُ الْفَرْدُ الصَّمَدُ الَّذِيْ لَمْ تَتَّخِذْ صَاحِبَةً وَّ لَا وَلَدًا ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْفَرْدُ الْوِتْرُ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْخَالِقُ الْبَارِئُ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْاَحَدُ الْمُصَوِّرُ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْكَبِيْرُ الْمُتَعَالُ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْمُقْتَدِرُ الْقَهَّارُ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْحَلِيْمُ الْكَبِيْرُ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْقَادِرُ الرَّزَّاقُ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَهْلُ الثَّنَاءِ وَالْمَجْدِ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ تَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ فَوْقَ الْخَلْقِ وَالْخَلِيْقَةِ ، اِنَّكَ اَنْتَ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ،

اس کے بعد یہ کلمات پڑھ کر دُعا ختم کرے۔ فَسُبْحَانَ اللّٰهِ رَبِّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ۔

ترجمہ: سو اللہ پاک ہے، عرش عظیم کا رب۔

جو مذکورہ اسماء کے ساتھ دعا کرے اسے ایسے شکرگزاروں، ساجدین اور صالحین میں لکھا جائے گا۔ جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم، موسٰی، عیسٰی اور تمام انبیاء علیہم صلوات اللہ علیہم اجمعین کے اللہ کے ہاں پڑوسی ہے اسے زمین و آسمان کے عابدین کا ثواب ملے گا۔

اختتام

ان سب دعاؤں کے آخر میں یوں دعا کرے۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ صَلٰوةً تَكُوْنُ
لَكَ رِضَآءً وَّلِحَقِّهٖ اَدَآءً وَّ اَعْطِهِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ الْمَقَامَ الْمَحْمُوْدَ
الَّذِيْ وَعَدْتَّهٗ وَ اَجْزِهٖ عَنَّا مَا هُوَ اَهْلُهٗ وَاجْزِهٖ اَفْضَلَ مَا جَازَيْتَ نَبِيًّا عَنْ اُمَّتِهٖ
وَ اَعْطِهِ الشَّرَفَ وَالشَّفَاعَةَ يَوْمَ الدِّيْنِ، اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ نَّبِيِّ الرَّحْمَةِ
وَ سَيِّدِ الْاُمَّةِ وَعَلٰى جَمِيْعِ اِخْوَانِهِ النَّبِيّٖنَ وَصَلِّ عَلٰى اَبِيْنَا اٰدَمَ وَ اُمِّنَا حَوَّآءَ
وَمَنْ وَّلَدَا بَيْنَهُمَا مِنَ الصّٰلِحِيْنَ وَ الْمُسْلِمِيْنَ وَصَلِّ عَلٰى مَلٰٓئِكَتِكَ اَجْمَعِيْنَ
مِنْ اَهْلِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرَضِيْنَ وَصَلِّ عَلَيْنَا مَعَهُمْ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ
وَاغْفِرْ لِيْ وَلِوَالِدَيَّ وَمَا تَوَالَدَ وَارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِيْ صَغِيْرًا وَاغْفِرْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ
وَالْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمَاتِ الْاَحْيَآءِ مِنْهُمْ وَالْاَمْوَاتِ رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ
وَتَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ وَ اَنْتَ الْاَعَزُّ الْاَكْرَمُ وَ اَنْتَ خَيْرُ الرّٰحِمِيْنَ وَخَيْرُ الْغَافِرِيْنَ
وَاِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ وَحَسْبُنَا اللّٰهُ
وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ وَحَسْبُنَا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ۔

ترجمہ:- اے اللہ محمد اور آل محمد پر اس طرح رحم فرما کہ جو تیری رضا ہو اور اس کا حق ادا ہو جائے
اور [illegible] اسے وسیلہ و فضیلت عطا فرما اور اُسے اس مقام محمود تک لے جا جس کا تو نے اس
سے وعدہ فرمایا اور ہماری طرف سے اسے اس کے لائق جزا دے اور کسی نبی کو جو تو نے
اس کی امت کی طرف سے جزا دی اسے اس سے افضل جزا دے اور اسے بزرگی اور
شفاعت عطا فرما، روز جزا کو۔ اے اللہ محمد نبی رحمت و سردار اُمت پر اور اس کے تمام
انبیا بھائیوں پر رحم فرما اور ہمارے باپ آدم اور ہماری ماں حوا پر رحم فرما اور جو ان سے
نیک اور مسلمان پیدا ہوئے ان پر رحم فرما اور اپنے تمام فرشتوں زمین آسمان والوں پر
رحم فرما اور ان کے ساتھ ساتھ ہم پر بھی رحم فرما۔ اپنی رحمت کے صدقے، اے سب سے
زیادہ رحم کرنے والے اور مجھے اور میرے والدین اور ان کی اولاد کو بخش دے اور ان پر رحم
فرما جیسے کہ انھوں نے مجھے بچپن میں پالا اور تمام مردوں اور مومن عورتوں کو اور تمام
مسلمان مردوں اور تمام مسلمان عورتوں زندوں اور مردوں کو بخش دے۔ اے پروردگار!
بخش دے اور رحم فرما اور جو تو جانتا ہے اس سے درگزر فرما اور تو ہی سب سے زیادہ

عزت والا واکرم ہے اور تو ہی سب سے بہتر رحم کرنے والا اور سب سے بہتر بخشنے والا ہے اور ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں اسی کی طرف لوٹنا ہے اور اللہ بزرگ و برتر کے سوا نہ کوئی قوت ہے اور نہ ڈر اور ہمیں (مدد کے لیے) اللہ ہی کافی ہے اور وُہ بہترین کارساز ہے اور ہمیں اکیلا اللہ ہی کافی (مددگار) ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔

صبح و شام کی یہ مذکورہ دُعائیں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام اور آئمہ دین سے مروی ہیں اور ان سب کی دعاؤں پر مشتمل یہ مجموعہ ہے۔ ہم نے اختصار کی غرض سے ان کے فضائل حذف کر دیے۔ اگر صبح و شام اس مجموعہ کو پڑھ لیا جائے تو بہت ہی بابرکت ہوگا اور اگر اللہ کے فضل سے ہر نماز کے بعد پڑھ لے تو کامل فضلِ ربِ تعالیٰ ہوگیا۔

اللہ ہی مددگار و توفیق دینے والا ہے

فصل ۶

نمازِ فجر کے بعد کا لائحہ عمل

نمازِ فجر پڑھنے کے بعد مرید کو چاہیے کہ حسبِ ذیل لائحہ عمل اختیار کرے۔

سب سے پہلے قرآن مجید کی تلاوت کرے، پھر تسبیح اور حمد و ثنا میں معروف ہو یا اللہ تعالیٰ کے انعامات، اس کی عظمت، اس کے متواتر احسانات پر غور کرے کہ بندہ کو امید نہیں ہوتی مگر وہ دیتا ہے اور بندہ راہ نہیں جانتا مگر وہ رہنمائی کرتا ہے یا انعامات کا تصور کر کے اپنی طرف نظر کرے کہ میں نے اللہ کے ظاہری و باطنی انعامات کے مقابلہ میں کچھ بھی شکر ادا نہیں کیا بلکہ میں تو اس کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے اور اس کی عبادت کرنے کا حق ادا کرنے سے بالکل ہی قاصر ہوں پھر مستقبل میں اللہ تعالیٰ کے ہر ہر حکم کی پابندی کا عہد کرے، اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت پر آمادہ کرے یا اللہ تعالیٰ کے انعامات اور اپنی لغزشوں کو سامنے رکھے اور اس پر نادم ہو اور توبہ و استغفار کرے یا اللہ تعالیٰ کی یاد سے خالی گزشتہ اوقات کا تصور کر کے افسوس کرے اور آئندہ ہر گھڑی کو اللہ کی یاد سے معمور رکھنے کا عزم کرے یا ساری کائنات میں اللہ تعالیٰ کی شہنشاہی اور مالکیت اور ہر ہر چیز پر اس کے انعامات کی بارش کا تصور کرے یا ایام اللہ کو یاد کرے کہ ماضی میں اقوامِ عالم پر کیسے کیسے عذاب نازل ہوئے انھیں یاد کر کے اللہ تعالیٰ سے استغفار کرے یا آلاء اللہ یاد کرے یعنی انعامات کا تصور کرے یا دونوں پر غور کرے۔

قرآن مجید میں اس طرف توجہ دلائی گئی، فرمایا:

وَذَكِّرْهُم بِأَيَّامِ اللَّهِ[1] (انہیں ایام اللہ (سنا کر) نصیحت کر)

ایک جگہ اللہ عزوجل نے فرمایا:

فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ[2] (آلاء اللہ کو یاد کرو شاید کہ تم فلاح پاؤ)

ایسے ہی فرمایا:

فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ (تم دونوں اپنے رب کی کس نعمت کی تکذیب کرتے ہو؟)

---

[1] سورۂ ابراہیم آیت ۵ [2] سورۃ الاعراف آیت ۶۹

پھر فرمایا:

یَامَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ [1]

ترجمہ: اے جن و انسان کے گروہ اگر تم ہمت کر سکتے ہو

یہ جن و انسان ثقلین کہلاتے ہیں یعنی دونوں مکلف ہیں اور ان پر جزا و سزا کا سلسلہ چلے گا۔

ان مذکورہ امور میں سے کسی میں مصروف ہو جائے یہ سب ذکر اللہ میں داخل ہوں۔

ذکر اللہ اور اس کی اقسام

ذکر اللہ ایک عبادت ہے یہ فکر کی طرف لے جاتا ہے اور فکر سے خوف و امید پیدا ہوتا ہے اور جب ذکر قوی ہو جائے تو یہی مشاہدہ بن جاتا ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا (کھڑے اللہ کا ذکر کرتے ہیں)

پھر فرمایا:

وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ [2] (اور آسمانوں اور زمین کی پیدائش پر فکر کرتے ہیں)

پھر اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے فرمایا:

سُبْحَانَکَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ [3]

(تو پاک ہے سو ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لے)

یہ بھی یاد رکھیے کہ یقین کے بغیر مشاہدہ نہیں ہوتا اور ایمان کی رُوح یقین ہے بلکہ اسے بڑھاتا ہے۔

بعض علماء نے اس حدیث "تَفَکُّرُ سَاعَۃٍ خَیْرٌ مِّنْ عِبَادَۃِ سَنَۃٍ (ایک گھڑی کا فکر سال بھر کی عبادت سے بہتر ہے) کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

اس سے مراد وہ فکر ہے جو نفرت کو محبت سے بدل دے اور لالچ و طمع کو قناعت و زہد سے بدل دے۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد وہ فکر ہے کہ جو مشاہدہ تک

---

[1] سورۃ الرحمٰن آیت ۳۳

[2] سورۃ آل عمران آیت ۱۹۱

[3] سورۃ آل عمران آیت ۱۹۰

لے جائے۔ تقویٰ اور مزید ذکر پر آمادہ کرے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ [۱]

(اور جو اس میں ہے اس کا ذکر کرو۔ شاید کہ تم پرہیزگار بن جاؤ)

ایک جگہ فرمایا:

لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ [۲]

(تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ)

اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيَاتِ

لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ [۳]

(اللہ تمہارے لیے آیات کو کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت میں غور کرو)

یعنی ممکن ہے کہ تم باقی اذکار بھی کرو اور ہمیشہ اس راہ پر گامزن رہنے کی خواہش پیدا ہو جائے اور فانی اشیا کے بارے میں زاہد بن جاؤ۔ اللہ تعالیٰ یہ چیزیں بیان فرما کر ہمیں شکر کی ضرورت سمجھاتا ہے۔ فرمایا:

يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ آيَاتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ

(وہ تمہارے لیے اپنی آیات بیان کرتا ہے تاکہ تم شکر ادا کرو)

ایسے ہی فرمایا:

وَاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ

(اور جو اس میں ہے اس کا ذکر کرو تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ)

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کا ذکر کیا اور فرمایا کہ:

اَلَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَاءٍ عَنْ ذِكْرِيْ [۴]

(جن کی آنکھوں پر پردہ پڑا تھا میری یاد سے)

---

[۱] سورۃ البقر آیت ۶۳

[۲] سورۃ طٰہٰ آیت ۱۱۳

[۳] سورۃ البقر آیت ۲۲۰ [۴] سورۃ طٰہٰ آیت ۱۰۱

یہی وجہ ہے کہ اُمِ درداء رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ:
حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی زیادہ عبادت تفکّر تھی اور وُہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں ہر روز تین سو دینار نفع حاصل کر کے اللہ کی راہ میں خرچ کروں تو مجھے اس کام میں کوئی زیادہ خوشی نہیں ہوتی۔ پوچھا گیا:
وہ کیوں؟:
فرمایا:
اس لیے کہ اس میں لگ جانا تفکر میں رکاوٹ ہے یا اپنے اور اللہ کے درمیان اور ایسے ہی اپنے اور مخلوق کے درمیان یا اپنے اور اللہ کے درمیان اور ایسے ہی اپنے اور مخلوق کے درمیان ہر کام میں نیت درُست رکھنے کا عزم کرے اور اس کا عقیدہ رکھ لے یا اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی بخشش چاہے۔ گزشتہ عمر کے گناہوں کے متعلق استغفار و توبہ کرے اور آئندہ نیک رہنے کا پختہ عزم کرے یا خوب زاری و عاجزی کے ساتھ دعا کرے۔ خوب گڑگڑائے، روئے اور اس قدر ڈرے کہ تمام گناہوں سے بچ جائے اور نیک اعمال کرنے لگے۔ دعا کرتے وقت دل کو اللہ کے سوا ساری کائنات سے خالی کر دے قبولیت دعا کا یقین رکھے۔ اللہ کی تقسیم پر راضی ہو جائے یا نیکی اور بھلائی کی باتیں کرے۔ اور لوگوں کو اللہ کی طرف دعوت دے اپنے بھائیوں کو (دین کا) نفع پہنچائے اور کم علم والے کو علم دین سکھائے۔ متقدمین اور سلف صالحین کے یہی اذکار تھے اور یہ یاد رکھیں کہ تمام عبادتوں میں سے سب سے افضل عبادت ذکر اور فکر ہے۔ رب العالمین کی طرف وصول کا یہ مختصر راستہ ہے۔ ان مندرجہ بالا کسی بھی کام میں لگ جائے تو وہ اللہ عزوجل کے ذکر کرنے والوں میں داخل ہے۔ ان تمام حالتوں میں اسے چاہیے کہ اپنی جائے نماز میں قبلہ رُخ ہو کر بیٹھے اور ذکر کرے۔ مذکورہ بالا اقسامِ ذکر سے ہٹ کر دنیا کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ سلف صالحین طلوعِ فجر سے لے کر طلوعِ آفتاب تک وعظ و نصیحت کے سوا دنیا کی عام باتوں کو سخت ناپسند فرماتے۔ بعض حضرات نے نمازِ فجر کے بعد ہر قسم کے دنیاوی کلام سے سختی سے منع فرمایا: یہ سلف صالحین کی راہ ہے جو اس پر چلا وہ کامیاب ہوا۔

فصل ۷

دن میں سات اوراد ہیں

اس فصل میں دن کے سات اوراد کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں پہلا ورد سابقہ فصل میں گزر چکا ہے۔

پہلا ورد یہ ورد سابقہ فصل میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔ یہ طلوع فجر سے لے کر طلوع آفتاب تک کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی۔ فرمایا:

وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ

اس آیت میں تنفس سے مراد طلوع فجر سے طلوع آفتاب ہے۔ یہی وہ سایہ ہے جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے دراز کیا، پھر سکیڑ لیا اور سورج طلوع فرمایا اور اپنے نشانات واضح فرمائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاکِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَیْهِ دَلِیْلًا ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَیْنَا قَبْضًا یَّسِیْرًا[1]

ترجمہ: کیا تو نے اپنے رب کی طرف نہیں دیکھا کہ کس طرح سایہ کو دراز کیا (یعنی اسے پھیلایا) اور اگر وہ چاہتا تو اسے ساکن بنا دیتا ہے (یعنی اپنے حال پر ٹھہرے رہتا اور وہاں سے نہ ہٹتا)، پھر ہم نے اس کو طلوع کر کے دن کو ظاہر کیا (چنانچہ اس میں دلیل ہے کہ وہی ذات تعالیٰ ہے جو مشکلات کو دور کرتی اور اشتباہ اٹھاتی ہے) پھر ہم نے آہستہ آہستہ اسے سکیڑ لیا۔ (یعنی سورج کا سایہ آہستہ آہستہ سکڑ جاتا ہے اور پتہ نہیں چلتا۔ آخر اللہ کی قدرت سے یہ سایہ ایسے ہی ختم ہو جاتا ہے جیسے کہ اندھیرا روشنی میں فنا پذیر ہو جاتا ہے اور جب اس کی حکمت سے صبح ہوتی ہے تو اللہ عزوجل کی حمد کی جاتی ہے۔ ہمیں بھی اس وقت اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور مخلوق کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

خَالِقُ الْاِصْبَاحِ (صبح کرنے والا)

نیز فرمایا:

---

[1] سورۃ الفرقان آیت ۴۵۔

فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ؁۱

(پس اللہ پاک ہے جب تم شام کرتے ہو اور جب تم صبح کرتے ہو)

یعنی صبح و شام نماز پڑھ کر اس کی تسبیح بیان کرو۔

نیز فرمایا:

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ ؁۲

(کہہ دو میں صبح کے رب کی مخلوق کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔)

اب اس کے سامنے دو صورتیں ہیں:

۱۔ مسجد میں ٹھہر کر اللہ کا ذکر کرے۔

۲۔ گھر جا کر اللہ کا ذکر کرے۔ اگر اسے اطمینان ہو تو مسجد میں ذکر کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو گی۔ بے کار باتیں کرنے والوں کا خطرہ نہیں، لغو کلام سننے یا لغویات دیکھنے کا ڈر نہیں، لوگوں کی زیب و زینت اور دوسرے کام ذکر اللہ میں حائل نہیں ہوں گے اور وہ تمام غیر اللہ سے ہٹ کر پورے اخلاص کے ساتھ ذکر کر سکے گا تو اسے چاہیے کہ مسجد میں ہی اپنی جائے نماز میں بیٹھ کر اللہ کا ذکر کرے، یہی افضل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ؁۳

(گھروں (مسجدوں) میں اللہ نے اذن دیا کہ اس کا نام بلند اور یاد کیا جائے)

اور اگر اسے خطرہ ہو کہ مسجد میں ذکر اللہ کرنے میں رکاوٹ کا خطرہ ہے اسے میل ملاقات کی خاطر ذکر رکنا پڑے گا یا بے کار باتوں یا لغو حرکات دیکھنے یا سننے کا ڈر ہو تو نماز فجر کے بعد اپنے گھر واپس جائے۔ اور وہاں باقی ماندہ اوراد کو اطمینان و تنہائی میں مکمل کرے۔ البتہ حسب ذیل اوراد مسجد میں ہی کر جائے۔

۱۔ دس بار یہ دعا پڑھے:

؁۱ سورۃ الروم آیت ۱۷

؁۲ سورۃ الفلق آیت ۱

؁۳ سورۃ النور آیت ۳۶

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ یُحْیِیْ وَیُمِیْتُ وَ هُوَحَیٌّ لَا یَمُوْتُ بِیَدِہِ الْخَیْرُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

(تنہا اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس کی سلطنت اور اس کی حمد ہے۔ زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور وہ زندہ ہے مرے گا نہیں۔ اسی کے ہاتھ میں تمام بھلائی ہے اور وُہ ہر چیز پر قدرت والا ہے۔)

۲۔ اور کلام کرنے سے پہلے سورۃ اخلاص قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ بھی دس بار پڑھے۔ ان دونوں اوراد کے سلسلہ میں حدیث میں کلام کرنے سے پہلے پڑھنے کی پابندی آئی ہے باقی اوراد گھر میں قبلہ رُخ بیٹھ کر تنہائی میں پُورے کرے۔

اس کے لیے طریقہ افضل ترین ہے اور اسے اس طرح دلجمعی بھی حاصل رہے گی۔ صبح کی نماز سے بعد لے کر طلوع آفتاب تک دو ہی طریق کا ذکر کرے۔

ا۔ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرنا جو اس پر فرض ہوں یا مندوب اُمور ہوں خود اس کی ذات سے مخصوص ہوں یا دوسروں کو فائدہ حاصل ہوتا ہو۔ یہ امور اس قسم میں سے ہیں کہ وقت جانے کے بعد ان کا تعلق بھی نہیں ہوتا۔

ب۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ علم سیکھے یا علم دین کی باتیں سنے تاکہ اس کے ذریعہ دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرے۔ یہ بات اسے دنیا میں زاہد بنا دے گی اور ثقہ علماءُ سے محبت پیدا کرے گی۔ ایسے علماءُ سے محبت ہو گی جو کہ صاحبِ یقین، زاہد اور آخرت کے علیم علمار کرام ہیں اس راہ میں بھی وُہ اللہ عزّ وجل کا ذاکر ہو گا۔ یا علمائے ربانیین کے افکار میں غور و فکر کرے۔ اگر اسے یہ بات حاصل ہو جائے تو یہ اس کے جائے نماز میں بیٹھ کر ذکر سے افضل ہے اس لیے کہ یہ اللہ کا ذکر بھی ہے اور عمل بھی ہے اور مندوب و مخصوص طریقہ پر اس کی طرف راستہ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدَاۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ [له]

ترجمہ: اور مت دُور کر ان لوگوں کو جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح اور شام چاہتے ہیں اسی کی رضا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو آدمی صبح کو علم (دین) کی طلب میں گھر سے نکلے۔ وُہ واپس آنے تک اللہ تعالےٰ کی

له. سورۃ الانعام آیت ۵۲۔

راہ میں ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

صبح علم (سکھانے والا) یا علم سیکھنے والا یا علم کی باتیں سننے والا بن اور چوتھا (ان کے علاوہ صورت میں) نہ بن۔ ورنہ تو ہلاک ہو جائے گا۔

حدیث میں آتا ہے کہ جو علم طلب کرنے کے لیے گھر سے نکلا وہ واپس آنے تک اللہ عزوجل کی راہ میں ہے اور علم کی تلاش کرتے گھر سے نکلا۔ فرشتے اس کے کام پر راضی ہونے کی وجہ سے اس کے لیے اپنے پر بچھاتے ہیں۔ زمین کے جاندار اور آسمان کے فرشتے اور ہوا کے پرندے اور پانی کی مچھلیاں اس کی بخشش کے لیے دعا کرتی ہیں۔

حضرت ابُوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ

علم کی مجلس میں حاضر ہونا ہزار رکعت نماز پڑھنے سے افضل ہے اور ہزار جنازے میں شرکت سے افضل ہے اور ہزار مریض کی عیادت سے افضل ہے۔ ان سے پوچھا گیا، کیا تلاوت قرآن سے بھی افضل ہے؟

اُنھوں نے جواب دیا: کیا علم کے بغیر تلاوتِ قرآن سے کچھ فائدہ ہوتا ہے؟

اب اگر ان دو مذکورہ کاموں میں سے کوئی حاصل ہو تو ٹھیک ورنہ اسے اپنی جائے نماز یا مسجد یا گھر یا خلوت میں بیٹھنا ہی بہتر ہے۔ یہیں بیٹھا اللہ کا ذکر کرتا رہے یا ان اذکار کی برکت سے جو اسے مشاہدہ حاصل ہوا ان میں تفکر کرے۔ یہ کام دوسرے امور سے افضل ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ مسجد میں بیٹھا نمازِ فجر سے لے کر طلوعِ آفتاب تک اللہ عزوجل کا ذکر کرتا ہوں۔ یہ بات مجھے چار غلام آزاد کرنے سے زیادہ محبوب ہے

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ جب آپؐ نے نمازِ فجر پڑھی تو آپؐ طلوعِ آفتاب تک جائے نماز میں بیٹھے رہے اور ایک روایت میں ہے کہ آپؐ دو رکعت نماز (اشراق) پڑھتے تھے۔ یہ حدیث کے علاوہ سے مندوب (نفلی) نماز ہے۔

الغرض نمازِ فجر کے بعد سے لے کر طلوعِ آفتاب تک بیٹھنے اور پھر دو نفل کی بہت ہی فضیلت ہے۔ مگر ہم نے اختصار سے اسے بیان کیا ہے۔

حضرت حسن بصریؒ نے روایت کیا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پروردگار کی رحمت کا ذکر کرکے فرماتے کہ (اللہ تعالیٰ) فرماتا ہے:

اے ابن آدم! نمازِ فجر کے بعد ایک گھڑی اور نمازِ عصر کے بعد ایک گھڑی مجھے یاد کر لے میں ان دونوں کے درمیان کا تیرا کفیل ہوں گا۔

دوسرا ورد جب سورج بلند ہو جائے اور دھوپ میں خوب سفیدی آجائے تو نمازِ ضحیٰ کی آٹھ رکعت ادا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:-

يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ[1]

(شام و صبح اس کی تسبیح بیان کرتی ہیں)

اس کے بعد کوئی بھائی بیمار ہو تو اس کی عیادت کو جائے اور اگر کوئی جنازہ ہو تو اس کی ہمراہی کرے اور اگر کوئی اور نیکی کا کام ہو تو اس میں مشغول ہو جائے اور اگر کسی بھائی کی ضرورت ہو تو اس میں لگ جائے اور اگر کوئی فریضہ ہو تو اس میں مشغول ہو جائے اور اگر کوئی مستحب کام سامنے آئے تو اسے اختیار کرے۔ طلوعِ آفتاب کے بعد تفکر اور ذکر کے بعد یہ سب سے افضل کام ہے۔ آخر جب اسے تمام مذکورہ کاموں سے فراغت حاصل ہو جائے تو سورج کھلنے اور حرارت تیز ہونے اور دن خوب نکلنے تک نماز (نوافل) تلاوتِ قرآن یا مامور یا مندوب اذکار یا حسبِ گذشتہ محاسبۂ نفس، یا مستقبل پر غور و فکر شروع کر دے یا ہر حال میں مراقبہ میں لگا رہے۔ یہ دن کا دوسرا ورد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس وقت کی قسم کھائی فرمایا:

وَالضُّحٰى (ضحیٰ کی قسم)

ضحیٰ کا مطلب یہ ہے کہ جب دھوپ کی تیزی سے پاؤں جلنے لگیں جب بندہ اس راہ پر چل پڑا تو اس نے اللہ عزّ وجل کے نازل کردہ احکام کی تابعداری کی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ[2]

(تم پر تمہارے ربّ کی طرف سے جو نازل ہوا اس کی تابعداری کرو)

نیز فرمایا:

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِيْ حَرَّمَهَا۔[3]

(بے شک مجھے حکم دیا گیا کہ میں اس بلدہ حرام کے ربّ کی عبادت کروں)

---

[1] سورۃ صٓ آیت ۱۸۔ [2] سورۃ الاعراف آیت ۳ [3] سورۃ النمل آیت ۹۱۔

پھر فرمایا:
وَاَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ[1]
(اور میں قرآن کی تلاوت کروں)

اور فرمایا:
اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْکَ مِنَ الْکِتَابِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ[2]
(جو کتاب تیری طرف وحی کی گئی اس کی تلاوت کرو اور نماز قایم کرو۔ بے شک نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سب سے بڑا کام ہے)

اس وقت میں ضحیٰ کا مفہوم پایا جاتا ہے اس لیے یہی وقت اس نماز کے لیے افضل ترین وقت ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جب اُونٹنی کے بچے کے پاؤں جلنے لگیں تو یہ نمازِ ضحیٰ کا وقت ہے۔

ایک بار آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کی تشریف لائے۔ اس وقت صحابہ نماز پڑھ رہے تھے (اور سورج نکلا ہی تھا یعنی) اشراق کا وقت تھا۔ آپؐ نے بلند آواز سے فرمایا: یاد رکھو اوابین کی نماز اس وقت ہے کہ جب اُونٹنی کے بچے کے پاؤں جلنے لگیں۔

اوابین کا مطلب یہ ہے کہ ہر وقت اللہ عزّوجل کے سامنے توبہ واستغفار کرنے والے۔

تیسرا ورد اس سے فارغ ہو کر کسی مناسب اور جائز کاروبار میں مصروف ہو۔ تجارت و صنعت میں دیانت اور صداقت کا خاص خیال رکھے اور بقدر کفایت پر اکتفاء کرے یا کم از کم خاموش رہے اور سو ہی جائے اس لیے کہ ان میں گناہوں اور اختلاطِ عوام سے حفاظت رہتی ہے۔ روایت ہے کہ ایسا زمانہ آنے والا ہے جب کہ سب سے افضل علم خاموشی اور سب سے افضل عمل نیند ہو گا۔ بعض لوگ نیند میں افضل ترین حالت میں ہوتے ہیں۔ بیداری میں ایک انسان نیند کی حالت کی طرح نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ نیند میں سلامتی ہے اور بیداری کی حالت میں سلامتی مشکل ہے۔ اور فضائل ان لوگوں کیلیے

---

[1] سورۃ النمل آیت ۹۲

[2] سورۃ العنکبوت آیت ۴۵

ہوتے ہیں جو سلامتی وعدل کے درجہ سے بڑھتے جائیں کیونکہ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ کلام اور اعمال میں عام طور پر اخلاص کی کمی یا کسی خاص سبب سے لغزشیں آ جاتی ہیں۔

حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جب لوگ فارغ ہو کر سو جائیں تو یہ خوب ہے اس لیے کہ بعض لوگوں پر بہترین وقت نیند کا ہوتا ہے اور اس وقت اس کا بہترین عمل سلامتی ہے۔ فضائل تو ان لوگوں کے لیے ہوتے ہیں جو سلامتی و عدل کے درجہ سے آگے بڑھے۔ ضحیٰ سے لے کر زوال تک اگر سوئے تو اس سے سابقہ کاروبار وغیرہ کی تھکن دُور ہو جائے گی۔ یہ دن کا تیسرا ورد ہے۔

چوتھا ورد پھر وقتِ نماز سے پہلے ہی وضو کرے۔ اقامتِ نماز کے سلسلہ میں یہی طریقہ مستحب ہے۔ اگر اسے دِن بھر کی خوراک وغیرہ حاصل ہو جائے تو بازار سے چلا آئے اور گھر میں یا اپنے آقا کے مکان میں جا کر آخرت کی فکر کرے۔ سلف صالحین کا یہی طریقہ تھا۔ کہا جاتا تھا کہ:

مومن آدمی تین جگہوں میں ہوتا ہے:

۱۔ مسجد کو آباد کر رہا ہو۔

۲۔ مکان میں ہو کر اس کا پردہ کرے۔

۳۔ کسی ضروری کام میں مصروف ہو۔

سورج ڈھلنے کے بعد نماز پڑھنے والوں اور ذکر کرنے والوں کے لیے آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں اور اہلِ ایمان کی دعائیں قبول ہوتی ہیں، یہاں سے دن کا چوتھا ورد شروع ہُوا۔ زوال کے بعد چار رکعت نماز ادا کرے اور ان میں سورۃ البقرہ یا دو صد آیات والی سورتیں یا چار بڑی سورتیں پڑھے انھیں خُوب طویل کر کے اچھے انداز میں ادا کرے اور ایک ہی سلام کے ساتھ چار رکعت پڑھے۔ ان کے درمیان سلام نہ پھیرے یہ ورد اظہار ہے اس میں اللہ تعالیٰ نے حمد کا ذکر کیا فرمایا:

وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِينَ تُظْهِرُونَ[1]

(اور آسمانوں زمین میں اسی کی حمد ہے اور شام اور جب تم اٹھائے جاتے ہو)

جب سورج ٹھیک سر پر ہو اس وقت نماز نہیں پڑھنی چاہیے یعنی زوال سے پہلے

---

[1] سورۃ الروم آیت ۱۸۔

اور جس وقت ہر چیز کا سایہ ایک مقدار میں رُک جاتا ہے اس کے بعد جب سایہ ڈھل جائے تو زوال ہو گیا۔ جاڑے کے موسم میں دن چھوٹا ہوتا ہے اور سورج ایک طرف ہو کر گزرتا ہے اس لیے اس موسم میں زوال کا بخوبی احساس نہیں ہوتا۔ اس موسم میں زوال سے پہلے چار رکعت نماز پڑھنے کے وقت کے برابر رک جائے۔ ہاں البتہ اس وقت تلاوتِ قرآن، تسبیح و فکر کر سکتا ہے۔ دراصل پانچ اوقات میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی۔

۱۔ ٹھیک دوپہر کے وقت۔
۲۔ طلوعِ آفتاب سے لے کر عام ناظر کی نگاہ میں دو نیزہ سورج بلند ہونے تک۔
۳۔ غروبِ آفتاب کے وقت یہاں تک کہ سورج ڈوب جائے۔
۴۔ نمازِ فجر کے بعد۔
۵۔ نمازِ عصر کے بعد۔

بہتر یہ ہے کہ اذان اور اقامت کے درمیان نماز پڑھے اس وقت دعا قبول ہوتی ہے آسمان کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور اس میں اعمال بڑھتے ہیں۔ دن بھر کے اوقات میں سے سب سے بہترین وقت ادائیگی فرض کا وقت ہے۔ اگر اذان و اقامت کے درمیان نہ پڑھ سکے تو نوافل میں ہی سورۃ البقرۃ کی آخری آیات پڑھ لے جن میں دعا ہے یا سورۃ آلِ عمران کی آخری آیات یا مثلاً ان آیات کو نوافل میں پڑھے:۔

اَنۡتَ وَلِیُّنَا فَاغۡفِرۡ لَنَا وَارۡحَمۡنَا [1]

ایسے ہی یہ آیت پڑھے:

رَبَّنَا لَا تُزِغۡ قُلُوۡبَنَا بَعۡدَ اِذۡ ھَدَیۡتَنَا [2]

نیز یہ آیت پڑھے:

رَبَّنَا عَلَیۡكَ تَوَكَّلۡنَا وَ اِلَیۡكَ اَنَبۡنَا وَ اِلَیۡكَ الۡمَصِیۡرُ [3]

---

[1] سورۃ الاعراف آیت ۱۸
[2] سورۃ آل عمران آیت ۸
[3] سورۃ ممتحنہ آیت ۴

ایسے ہی آیت الکرسی ، قل ہو اللہ احد پڑھے تاکہ تلاوت اور دعا، نماز اور اسمائے کے ساتھ مدح وتعظیم دونوں جمع ہو جائیں پھر نمازِ ظہر ادا کرے اور نمازِ ظہر سے پہلے چار رکعت اور بعد میں دو رکعت پھر چار رکعت ہمیشہ ادا کرے۔

یہ دن کا چوتھا ورد ہے اگرچہ یہ مختصر ورد ہے مگر یہ سب سے افضل وظیفہ ہے۔ اب اگر وہ زوال سے قبل نیند کر چکا ہے تو اس وقت نہ سوئے اس لیے کہ جس طرح رات کو بیداری کیے بغیر دن کو سونا مکروہ ہے اسی طرح دن کو دوبارہ سونا بھی مکروہ ہے۔ بعض علماء سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ تین باتوں پر غضبناک ہو جاتا ہے۔

۱۔ بلا وجہ ہنسنا

۲۔ بغیر بھوک کے کھانا

۳۔ رات کو بیداری کیے بغیر دن کو سونا۔

پانچواں ورد اور اگر زوال سے قبل نہیں سویا تو ظہر اور عصر کے درمیان سو جائے تاکہ رات کی عبادت (قیام اللیل) کی قوت حاصل ہو۔ ظہر کے بعد کی نیند آئندہ شب عبادت کی قوت حاصل کرنے کے لیے ہے اور زوال سے پہلے کی نیند گزشتہ رات کی تھکن دور کرنے کے لیے ہے اور اگر وہ مسلسل شب بیدار آدمی ہے تو گزشتہ رات کی تھکن دور کرنے کے لیے زوال سے پہلے سو جائے اور آئندہ رات کی قوت حاصل کرنے کے لیے ظہر کے بعد سو جائے مگر دن رات میں آٹھ گھنٹے سے زیادہ نہ سوئے۔ بعض صوفیا کا فرمان ہے کہ اگر سالک دن رات میں اس مقدار سے کم سویا تو نقاہت کا ڈر ہے اس لیے کہ:

نیند بھی بدن کی قوت و راحت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا[1]

(اور ہم نے تمہاری نیند راحت فرمائی۔)

جیسے کہ دن کے بارے میں فرمایا۔

وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا[2] (اور ہم نے دن کو معاش (کے لیے) بنایا)

---

[1] سورۃ نبا آیت ۸ ۔ [2] سورۃ نبا آیت ۱۰۔

البتہ (شب) بیداری ایک عادت ہے اور گاہے عادت ہی طبیعت بن جاتی ہے اور عرف سے ہٹ جاتی ہے۔ اب اسے عرف پر قیاس نہیں کیا جاتا۔

ظہر اور عصر کے بیدار رہنا بھی قیام اللیل کے مشابہ ہے۔ یہ غفلت کے وقت کی نماز ہے مستحب یہ ہے کہ اس وقت نماز اور ذکر کی نیت سے مسجد میں بیٹھے تاکہ اعتکاف اور انتظارِ نماز دونوں کا ثواب حاصل ہو۔ یہ بھی اسلاف کی سنت ہے بتاتے ہیں کہ ظہر اور عصر کے درمیان مسجد میں آنے والا دیکھتا تھا کہ مسجد میں نمازی بیٹھے تلاوتِ قرآن میں مشغول ہیں اور ان سے ہلکی ہلکی آواز پیدا ہو رہی ہے۔

اور اگر وہ محسوس کرے کہ دین اور جمعیت خاطر گھر میں ہی حاصل ہو گا تو گھر میں رہنا ہی افضل ہے۔ اس طرح تیسرے ورد کے وقت یعنی ضحیٰ کے وقت سے لے کر زوال تک بیدار رہنے کا مسئلہ ہے۔ اس میں بیدار رہنا اس سے بھی افضل ہے۔ اس میں بیدار رہ کر سالک کے لیے موقع ہے کہ وہ شب بیداری کی قضا کر سکے۔ ان دونوں اوقات میں عوام طلبِ دنیا اور خواہشِ نفس میں لگے ہوتے ہیں اور ایک بیدار دل ان اوقات میں اللہ عزوجل کی عبادت کر کے سکون اور لذت و حلاوت حاصل کر سکتا ہے۔ اس وقت مخلوق سے علیحدگی اور خالق سے لو لگانے میں برکت حاصل ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ أَرَادَ أَن يَذَّكَّرَ أَوْ أَرَادَ شُكُورًا۔[1]

ترجمہ: اور وہی ہے جس نے بنائے رات اور دن بدلتے سدلتے اس شخص کے واسطے کہ چاہے دھیان رکھنا یا چاہے شکر کرنا۔

یعنی دونوں کو خلف بنایا۔ حصولِ ثواب کے موقع کے لیے یہ خلف آ رہے ہیں اب جس کی رات کی عبادت رہ گئی وہ ان دونوں ضحیٰ سے زوال تک یا ظہر سے عصر تک کے اوقات میں تلافی کر لے۔ یہ شب بیداری کا بدل بن جائے گا اور جس کی دن کی عبادت رہ گئی وہ رات میں اس کی تلافی کر لے۔ یہ اس کا بدل ہو گا۔ اب دن رات ایک دوسرے کا خلف ہوا اور دن میں رات کی عبادات اور رات میں دن کی عبادات کی تلافی کا موقع ہے۔

اور ذکر ایک ایسا نام ہے جو کہ تمام اعمالِ قلب کا جامع ہے یعنی غیب کے علمی

---

[1] سورۃ الفرقان آیت ۶۲۔

مشاہدہ اور مقامِ یقین کا جامع نام ہے اور شکر بھی ظاہری اعضا کے تمام اعمال پر حاوی ہے جو کہ شریعت اسلام کے مطابق ہوں اور یہ دونوں بندے کا سارا عمل اور اس کی کارکردگی کی حقیقت ہے۔

حضرت کلیم اللہ علیہ السلام نے ان ہی دو کا ذکر کیا:

كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيرًا وَنَذْكُرَكَ كَثِيرًا ۔[۱]

الغرض تصرفِ جسم اور تصرفِ دل کا سارا خلاصہ دو باتیں ہیں:

۱۔ تسبیح

۲۔ ذکر

یہ پانچواں ورد ہے جو کہ ظہر اور عصر کے درمیان ہے۔ یہ ورد طویل مگر سب سے زیادہ نفع بخش ہے۔ یہ طوالت میں تیسرے ذکر سے مشابہ ہے۔ یہ دن کا آخری حصہ (یعنی عصر و مغرب کا درمیانی وقت ہے) اللہ تعالیٰ نے ان اوقات میں ہر چیز کے سجدہ ریز ہونے کا ذکر کیا، فرمایا:

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ[۲]

(اور اللہ کو سجدہ کرتا ہے جو کوئی ہے آسمان اور زمین میں خوشی سے اور زور سے اور ان کی پرچھائیاں صبح اور شام)

اب یہ کس قدر قباحت کی بات ہے کہ مُردہ اشیاء اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز ہوں ذکر کر رہی ہوں اور زندہ مومن اپنے پروردگار سے منہ پھیرے، غفلت میں غرق ہو۔

چھٹا ورد نماز عصر سے پہلے چار رکعت پڑھے۔ اذان اور اقامت کے درمیان موقع غنیمت جانے۔ اس میں دعا کے قبول ہونے کا وقت ہے جیسے کہ ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں۔ اب جب عصر کا وقت شروع ہوا تو چھٹے ورد کا وقت بھی داخل ہو چکا۔ اللہ عزوجل نے اس وقت کی قسم کھائی؛ فرمایا:

---

[۱] سورۃ طٰہٰ آیت ۳۳

[۲] سورۃ الرعد آیت ۱۵

وَالْعَصْرِ (عصر یعنی زمانہ کی قسم)
یہ بھی آیت کا ایک مفہوم ہے اور آصال میں مراد ایک وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
وَعَشِيًّا وَحِينَ تُظْهِرُونَ۔
نیز فرمایا:
بِالْعَشِيِّ وَالْإِشْرَاقِ۔
اللہ تعالیٰ نے ان اوقات میں تسبیح اور حمد و ثنا کرنے کا ذکر فرمایا:
اس ورد میں اذان و اقامت کے درمیان کی چار رکعتوں کے سوا کوئی اور نماز مروی نہیں۔ نماز سے فارغ ہو کر قلب کا تفکر یا جوارح کا ذکر جو چاہے کرے۔ البتہ افضل یہ ہے کہ خوب تدبر، ترتیل اور معنی و مطالب سمجھ سمجھ کر قرآن مجید کی تلاوت کرے۔

ساتواں ورد

جب دھوپ کی تیزی ختم ہو جائے اور اس کا رنگ زرد پڑ جائے صرف دیوار اور درختوں پر ہی دھوپ رہ جائے تو اب ساتویں ورد کا وقت آ گیا۔ اس وقت سب سے افضل کام وہی ہے جو کہ دن کی ابتدا میں تھا یعنی کثرت سے استغفار کرے اور یوں کہے:
أَسْتَغْفِرُ اللهَ لِذَنْبِي وَسُبْحَانَ اللهِ بِحَمْدِ رَبِّي۔
(میں اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی چاہتا ہوں اور اللہ پاک ہے میرے رب کی حمد کے ساتھ)
تاکہ استغفار و تسبیح دونوں کا ورد ہو جائے۔ قرآن مجید میں ان دونوں کا یک جا حکم بھی آیا۔ فرمایا:
وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ۔
اور یوں کہے:
أَسْتَغْفِرُ اللهَ الْحَيَّ الْقَيُّوْمَ وَأَسْأَلُهُ التَّوْبَةَ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِيْمِ وَبِحَمْدِهٖ
(میں زندہ قیوم اللہ سے بخشش چاہتا ہوں اور توبہ کا سوال کرتا ہوں۔ پاک ہے اللہ اور اس کی حمد ہے)
حدیث میں اس کی بہت فضیلت آتی ہے۔ اور سب سے افضل وہ استغفار ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کے اسماء بھی ذکر ہوں جیسے کہ قرآن مجید میں آتا ہے، یوں کہے:

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا	اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا
میں اللہ کی بخشش چاہتا ہوں بیشک وہ بخشنے والا ہے	میں اللہ کی بخشش چاہتا ہوں بیشک وہ توبہ قبول کرنیوالا ہے
اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ	اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ التَّوَّابَ الرَّحِيْمَ
میں اللہ کی بخشش چاہتا ہوں بیشک اللہ بخشنے والا رحم کرنیوالا ہے	میں اللہ توبہ قبول کرنے والے رحم کرنیوالے سے بخشش مانگتا ہوں

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَ اَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ - فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَ اَنْتَ خَيْرُ الْغَافِرِيْنَ -

اے پروردگار! بخش دے اور رحم فرما اور تو ہی بہترین رحم کرنے والا ہے سو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما اور تو ہی بہترین بخشنے والا ہے۔

یہ ورد طلوعِ فجر سے طلوعِ آفتاب تک کے ورد سے مشابہ ہے اور اس کی فضیلت بھی اسی طرح ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرمایا:

فَسُبْحَانَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ [1]

(سو اللہ پاک ہے جبکہ تم شام کرتے ہو اور جبکہ تم صبح کرتے ہو)

اس سے صبح و شام اللہ کی تسبیح بیان کرنے کا حکم معلوم ہوا۔ یہاں مصدر (سبحان) بیان کیا اور مراد فعل ہے یعنی سَبِّحُوْا (تسبیح بیان کرو)

صبح و شام دراصل دن کے دونوں اطراف کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى [2]

(چنانچہ تسبیح بیان کرو اور دن کے دونوں اطراف ہیں (یعنی صبح و شام) تاکہ تو راضی ہو۔

اور بہتر یہ ہے کہ غروبِ آفتاب سے پہلے حسب ذیل سورتیں پڑھے؛

۱۔ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا۔

۲۔ وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى ۔

۳۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ۔

۴۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۔

اور اس بات کا خیال رکھے کہ غروبِ آفتاب کے وقت وہ استغفار میں مصروف ہو۔

---

[1] سورۃ الروم آیت ۱۷۔ [2] سورۃ طٰہٰ آیت ۱۳۰۔

اس وقت کے یہ اذکار ہیں ۔ الغرض طلوعِ آفتاب سے پہلے تسبیح وحمد ودعا وذکر وغیرہ جو جو اوراد مستحب ہیں ٹھیک وہی اوراد غروب آفتاب کے وقت بھی مستحب ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کا یکجا ذکر فرمایا :

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ [1] ۔ (اور طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب سے پہلے اپنے رب کی حمد وتسبیح)

نیز فرمایا :

وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى [2] ۔ (اور دن کے دونوں اطراف ہیں)

ایک جگہ فرمایا :

بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۔ (شام وصبح)

نیز فرمایا :

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ وَ مِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ [3] (کہہ دو میں صبح کے رب کی پناہ مانگتا ہوں ، اس کی بُرائی سے جو اس نے پیدا کیا اور اندھیرے کی برائی سے جب وُہ چھا جائے یعنی رات کی برائی سے پناہ چاہتا ہوں)

چنانچہ بندے کو صبح کے تمام اوراد اس وقت بھی پڑھنے چاہئیں اور جب نمازِ مغرب کی اذان ہو تو اس طرح دعا کرے :

اَللّٰهُمَّ هٰذَا اِقْبَالُ لَيْلِكَ وَ اِدْبَارُ نَهَارِكَ وَ اَصْوَاتُ دُعَاتِكَ وَحُضُوْرُ صَلَاتِكَ وَشُهُوْدُ مَلَآئِكَتِكَ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى اٰلِهٖ وَ اَعْطِهِ الْوَسِيْلَةَ وَالْفَضِيْلَةَ وَابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا الَّذِيْ وَعَدْتَّهٗ ۔

اے اللہ ! یہ تیری رات کی آمد ہے اور تیرے دن کی رخصت ہے اور تیرے پکارنے والوں کی آوازیں ہیں اور تیری نماز (و رحمت) کی آمد ہے اور تیرے فرشتوں کی حاضری (کا وقت) ہے محمدؐ اور اس کی آل پر رحم فرما اور آپؐ کو وسیلہ اور فضیلت عطا فرما اور آپ کو مقامِ محمود

---

[1] سورۃ قٓ ۔ ۳۹

[2] سورہ طٰہٰ آیت ۱۳۰

[3] سورۃ الفلق آیت ۱ ، ۲ ۔

عطا فرما جس کا تُو نے آپ سے وعدہ فرمایا)

اس کے بعد تین بار یہ کلمات کہے :

رَضِیْتُ بِاللّٰہِ وَبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّبِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَبِیًّا۔ (میں اللہ کے رب ہونے اور اسلام کے دین ہونے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر راضی ہُوا)

اس کی فضیلت کے متعلق حدیث آتی ہے۔ فجر کی اذان سنے تو بھی یہی کلمات کہے۔ البتہ صبح کی اذان کے موقع پر

اِقْبَالُ لَیْلِکَ وَاِدْبَارُ نَھَارِکَ کی بجائے یُوں پڑھے :

اِقْبَالُ نَھَارِکَ وَاِدْبَارُ لَیْلِکَ (یعنی تیرے دن کی آمد اور رات کی رخصت ہے)

مگر یہ یاد رکھیں کہ حدیث میں مغرب کی اذان کا ذکر آیا ہے (اور یہ قیاس سمجھیے)

حضرت حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے کہ سلف صالحین شام کو خوب تسبیح بیان کرتے۔ بعض شروع دن میں ایسا کرتے۔ بعض سلف سے مروی ہے کہ وُہ دن کی ابتدا میں دنیا کا کام کرتے اور آخری حصہ میں آخرت کا کام کرتے تھے۔ اب جب دن ڈوب جائے تو دن کے سات اوراد ختم ہو گئے۔

اے بندۂ خدا ! اب دیکھو کہ تم نے دن بھر میں کیا کمایا اور کیا گنوایا۔ تیری عمر کا ایک حصہ ختم ہو گیا۔ تیری عمر میں سے ایک دن کم ہو گیا۔ اب ذرا حساب لگا کہ تو نے اس دن کتنا سفر طے کیا اور کل کیلیے کیا جمع کیا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

لوگ صبح کرنے والے ہیں چنانچہ آدمی اپنی جان کے (فائدے کے لیے نیک بن کر) صبح کر رہا ہے وُہ اپنے کو آزاد کرانے والا ہے یا اپنی جان کو رہن میں ڈال رہا ہے چنانچہ وُہ اُسے ہلاک کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے ہُوئے فرمایا :

اِنَّ سَعْیَکُمْ لَشَتّٰی [1] (تمہاری کمائی بھانت بھانت ہے)

---

[1] سورۃ اللیل۔ آیت ۴۔

اس مفہوم کو ایک جگہ یوں ادا فرمایا :

كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۙ اِلَّاۤ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ ۞

(ہر ایک جی اپنے کئے کاموں میں پھنسا ہوا ہے مگر داہنی طرف والے)

حدیث میں آیا، وہ دن بے برکت ہوا کہ جس میں نیکی میں زیادتی نہ ہوئی۔

ایک روایت میں ہے کہ جس کے دونوں دن برابر رہیں وہ خسارے میں ہے اور جس کا آج، کل گزشتہ سے بُرا ہے وُہ محروم ہے۔

اس کے بعد رات کے پانچ اوراد ذکر کیے جائیں گے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ہر ایسے آدمی سے بغض رکھتا ہے جو موٹا، بہت کھانے والا، بازاروں میں شور کرنے والا، رات کو مردار کی طرح پڑا رہنے والا۔ دن کو گدھے کی (دنیا میں) لگا رہنے والا، دنیا کا خوب واقف مگر آخرت سے جاہل ہو۔

فصل ۸

رات کے پانچ اوراد

پہلا ورد

رات کے اندر پانچ اوراد ہیں۔ پہلا ورد یہ ہے کہ نمازِ مغرب کے بعد کسی سے کلام کیے بغیر چھ رکعت (نوافل) ادا کرے۔ پہلی دو رکعتیں اس طرح ادا کرے کہ پہلی رکعت میں سورۃ قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰافِرُوْنَ اور دوسری رکعت میں قُلْ ھُوَ اللہُ اَحَدٌ پڑھے۔ نمازِ مغرب کے فرائض کے جلدی ہی بعد یہ دو رکعت ادا کرلے کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ نمازِ مغرب کے بعد جلدی سے دو رکعت ادا کرلو کیونکہ یہ دونوں رکعتیں (فرائض) کے ساتھ ہی اٹھائی جاتی ہیں اگر گھر قریب ہو تو یہ دونوں رکعتیں گھر میں پڑھے اور آخری چار رکعتیں خوب طویل کرکے ادا کرے حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ وسلم کے نزدیک مستحب یہ ہے کہ انسان یہ دو رکعتیں گھر میں ادا کرے۔ وہ خود اس کے پابند تھے اور فرمایا کرتے کہ یہ سنت ہے اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ دو رکعتیں گھر میں پڑھنا مروی ہے مگر یاد رہے کہ آپ کا مکان مسجد کے ساتھ ہی تھا اس کے باوجود آپ نے انھیں مسجد میں بھی ادا کیا ہے۔ پھر شفقِ ثانی غروب ہونے تک ذکر اللہ میں مصروف رہے۔ شفقِ ثانی سے مراد سرخی زائل ہونے کے بعد کی سپیدی ہے۔

جب مغرب میں سورج کی آخری کرن بھی ختم ہوجائے اور رات چھا جائے تو عشار کا وقت شروع ہوگیا۔ اب رات کا پہلا ورد ختم ہوگیا۔ اس وقت کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمِنْ اٰنَآئِ الَّیْلِ فَسَبِّحْ (اور کچھ گھڑیوں میں رات کی پڑھا کر)

یعنی قیامِ لیل سے پہلے کا وقت اور قَبْلَ نَاشِئَۃَ الَّیْلِ کا معنی بھی یہی ہے۔ نشاء کا معنی ہے قائم۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی۔ فرمایا:

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ (سو قسم کھاتا ہوں شام کی سرخی کی)

شفق کا وقت مغرب و عشاء کے درمیان کا ہے اسے نمازِ اوّابین اور نمازِ فضیلت بھی کہا جاتا ہے۔

یونس بن عبید نے حضرت حسن سے روایت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا:

تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ[1] (ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں)

---

[1] سورۃ السجدہ آیت ۱۵۔

فرمایا کہ اس سے مراد مغرب وعشاء کے درمیان کی نماز ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے پُوچھا گیا کہ جو آدمی مغرب وعشائ کے درمیان سو جائے اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟

فرمایا: ایسا مت کرو۔ یہ وہ وقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت میں اہلِ ایمان کو قیام کرنے کا حکم دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ - (ان کے پہلو بستروں سے الگ رہتے ہیں)

یعنی نمازِ مغرب وعشائ کے درمیان کی نماز۔

ابن ابی الدنیا نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کی وضاحت نقل کی ہے۔

آپؐ نے فرمایا: (اس سے مراد) نمازِ مغرب وعشائ کے درمیان کی نماز ہے۔

پھر آپؐ نے فرمایا، تم پر مغرب وعشائ کے درمیان کی نماز ضروری ہے۔ اس لیے کہ یہ نماز ابتدائے دن کی لغویات ختم کرتی اور آخری حصّے کو سنوارتی ہے۔

بہتر یہ ہے کہ مغرب وعشاء کے درمیان مسجد میں اعتکاف کرے اور تلاوتِ قرآن میں مشغول رہے اس کی فضیلت مروی ہے۔ ہاں اگر اس کا مکان زیادہ اطمینان کی جگہ ہو تو وہی جگہ افضل ہوگی۔

دوسرا ورد

پھر عشاء کی نماز سے پہلے چار رکعت ادا کرے اور نماز کے بعد دو رکعت پھر چار رکعت ادا کرے۔ منقول ہے کہ عشائ کے بعد گھر میں چار رکعت پڑھنے کا اجر شبِ قدر کی رات (چار رکعت) پڑھنے کی طرح ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں داخل ہو کر بیٹھنے سے پہلے چار رکعت ادا فرماتے۔ حضرت ابن مسعودؓ کے نزدیک ہر نماز کے بعد اس طرح دوام کرنا مکروہ ہے (صحابہؓ) کے نزدیک مستحب یہ تھا کہ فرض نماز کے بعد دو رکعت اور پھر چار رکعت پڑھے۔

ان چار رکعتوں میں بہتر یہ ہے کہ پہلی رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد آیت الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیات، دُوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد اٰمَنَ الرَّسُوْلُ سے لے کر آخر تک اور اس سے پہلی ایک آیت، تیسری رکعت میں سورۃ الحدید شروع کرے اور وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ تک پڑھے اور چوتھی رکعت میں سورۃ الحشر کی آخری آیات هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَا اِلٰهَ هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ سے لے کر آخر تک پڑھے۔ (یہ چار رکعت فرائضِ عشاء کے بعد کی ہیں)۔

ان چار رکعتوں کے بعد اگر تیرہ رکعت ادا کرے اور آخر میں وتر ادا کرے تو بہت ہی مستحسن ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی تعداد مروی ہے۔ البتہ ایک منقطع روایت میں سترہ رکعتیں پڑھنا بھی مروی ہے۔ مگر گیارہ رکعت اور تیرہ رکعت (دو تعداد) مشہور ہیں)۔ گاہے اس میں فجر کی دو سنتیں شمار کر لی جاتی ہیں۔ (اب گیارہ ہی رہیں) اور بہتر یہ ہے کہ ان میں تین سو یا اس سے زیادہ آیات کی تلاوت کرے۔ اگر ایسا کر لیا تو وہ عابدین میں شمار ہو گا اور غافلین میں شمار نہ ہو گا۔ کمزور آدمیوں کو اجازت ہے کہ رات کی ابتداء میں ہی (یہ گیارہ رکعات) ادا کر لیں اور اگر ہمت ہو تو رات کے آخری حصہ میں (نمازِ تہجد) ادا کرے۔

اور اگر ان رکعات میں سورۃ الفرقان اور سورۃ الشعراء پڑھے تو ان دونوں میں تین سو آیات بن جائیں گی اور اگر یہ یاد نہ ہوں تو مفصلات میں سے یہ پانچ سورتیں پڑھ لے۔ (۱) سورۃ الواقعہ (۲) سورۃ نون (۳) سورۃ الحاقہ (۴) سورۃ المدثر اور (۵) سورۃ سأل سائل اور اگر یہ سورتیں بھی یاد نہ ہوں تو سورۃ الطارق سے لے کر ختمِ قرآن تک پڑھ لے۔ تب بھی تین سو آیات بن جائیں گی۔ نماز عشاء کے بعد قرآن پاک کی یہ مقدار پڑھے بغیر سو جانا نہایت ہی نامناسب ہے اور اگر نمازِ عشاء کے بعد اس مقدار میں قرآن پاک پڑھے تو بہت ہی افضل ہے اور اس کے لیے ایک قنطار کی مقدار میں ثواب لکھا گیا اسے قانتین میں سے شمار کیا گیا۔ بہتر یہ ہے کہ طویل آیات پڑھے اس لیے کہ ان میں زیادہ حروف بنتے ہیں اور اگر تھکاوٹ وغیرہ کی وجہ سے چھوٹی آیات پڑھے تو بھی تعداد پوری ہونے کے باعث اجر کا ضرور مستحق ہے۔

یہ یاد رہے کہ سورۃ الملک سے لے کر ختمِ قرآن تک ایک ہزار آیات بنتی ہیں۔ اب اگر ایسا نہ کر سکے تو ان تیرہ رکعات میں سورۃ اخلاص قل ہو اللہ احد ہی اڑھائی سو (۲۵۰) بار پڑھ لے۔ اس طرح بھی ایک ہزار آیتیں بن جائیں گی۔ اس کا بھی بہت ثواب ہے۔

حدیث میں ہے کہ جو آدمی سورۃ اخلاص دس بار پڑھے۔ اللہ عزوجل اس کے لیے جنت میں ایک محل بنا دے گا۔ مشہور احادیث میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ ہر رات کو سونے سے پہلے تین سورتیں ضرور پڑھا کرتے تھے؛

(۱) سورۃ السجدہ (۲) سورۃ الملک اور اس کے بعد ہے کہ آپؐ ہر رات کو سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ الزمر پڑھا کرتے اور ان کے قریب یہ ہے کہ آپ ہر رات کو مسبحات کی تلاوت فرماتے اور فرمایا کرتے، کہ یہ ہزار آیات سے بھی افضل ہیں۔ علماء ان کی تعداد چھ بتاتے ہیں یعنی

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى کا اضافہ کرتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى سے خاص محبت رکھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ اس سورت کی کثرت سے تلاوت فرماتے۔ آپؐ ہر شب کو ان چار سورتوں کی تلاوت کا ناغہ نہ فرماتے۔

(۱) سورۃ یٰسٓ (۲) سورۃ لقمان (۳) سورۃ الدخان (۴) سورۃ الملک۔ اور اگر ان کے ساتھ ساتھ سورۃ الواقعہ، سورۃ الصف، سورۃ الحاقۃ اور سورۃ الزمر بھی پڑھ لے تو بہت ہی خوب رہے۔ اور اگر رات کو نمازِ تہجد کے لیے نہ اٹھ سکے تو اس حدیث کو سامنے رکھ کر وتر مقدم کر کے پڑھ لے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وصیت فرمائی کہ میں وتر پڑھے بغیر نہ سوؤں۔

اور اگر رات کو نماز تہجد پڑھنے کا عادی ہو تو افضل یہ ہے کہ نمازِ تہجد کے آخر میں یا سحری کے وقت وتر ادا کرے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے حدیث منقول ہے کہ رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔ سو جب صبح کا ڈر ہو تو ایک رکعت ملا کر وتر پڑھ لے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کی ابتداء میں اور رات کے درمیانی حصہ میں اور رات کے آخری حصہ میں وتر پڑھے (یعنی رات کے ہر حصہ میں وتر پڑھنا جائز ہوا۔)

یعنی آپؐ نے سحری کے اختتام تک وتر پڑھے۔

اب اگر وتر ادا کر کے سو جائے۔ پھر اللہ تعالیٰ رات کو نماز پڑھنے کی توفیق بخشے تو وتر نہ پڑھے۔ اس کے وہی ادا شدہ وتر کافی ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک رات میں دو وتر نہیں ہیں۔ بعض علماء کا فرمان ہے کہ سونے سے پہلے ایک وتر پڑھ لے اور پھر رات کو نمازِ تہجد کی آخری رکعتوں کے ساتھ ایک رکعت ملا کر وتر ادا کر لے۔ اس طرح ادا کرنے پر تین اعمال حاصل ہو گئے۔

۱۔ امید کم رکھنا (۲) تحصیلِ وتر (۳) آخرِ شب میں وتر پڑھنا۔

جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسے ہی وتر ادا کرنے کے بعد بیٹھ کر دو رکعت ادا فرماتے چنانچہ ان دو رکعتوں میں سورۃ الزلزال اور سورۃ الھٰکم التکاثر پڑھے۔ اس کے بارے میں دو احادیث ہیں۔ ایک روایت میں ہے سورۃ الزلزال اور سورۃ التکاثر کا ذکر ہے کہ ان میں نصیحت اور ترہیب ہے اور دوسری روایت میں قل یاایہا الکافرون آتا ہے اس لیے کہ سورۃ کافرون میں غیر اللہ کی عبادت سے بیزاری اور تنہا اللہ ہی کی عبادت کا اعلان ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

رات کو سونے وقت یہ سورت پڑھتے تھے۔ آپؐ نے ایک صحابیؓ کو بھی سوتے وقت یہ سورت پڑھنے کی وصیت فرمائی۔

جو رات کو اٹھنے کا عادی نہ ہو اس کے لیے بہتر یہ ہے کہ سونے سے پہلے ہی وتر پڑھ لے البتہ رات کے آخری حصہ میں وتر پڑھنا افضل ہے۔ وتروں کا سلام پھیرنے کے بعد یہ دعا تین بار پڑھے:۔

سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ رَبُّ الْمَلَائِكَةِ وَ الرُّوْحِ جَلَّلْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْعَظَمَةِ وَالْجَبَرُوْتِ وَتَعَزَّزْتَ بِالْقُدْرَةِ وَ قَهَرْتَ الْعِبَادَ بِالْمَوْتِ۔

(پاک ہے بادشاہ پاک فرشتوں اور روح کا پروردگار تو نے عظمت و جبروت سے آسمانوں اور زمین کو ڈھانپ لیا اور تو اپنی قدرت سے غالب ہوا اور تُو نے موت سے بندوں کو مغلوب کر دیا)

نمازِ عشاء سے لے کر سونے تک یہ دُوسرا ورد ہے اللہ تعالیٰ نے اس وقت کی قسم کھائی فرمایا:

وَاللَّيْلِ وَمَا وَسَقَ (اور رات کی اور جو اس میں سمیٹتا ہے)

آرام بھی ضروری ہے

یعنی جو اس کا اندھیرا جمع ہوگیا اور اللہ تعالیٰ نے اِلیٰ غَسَقِ اللَّیْلِ میں بھی اس کا ذکر فرمایا۔ اس وقت رات خوب تاریک ہوجاتی ہے اس کے بعد باوضو ذکر کرتا ہوا سو جائے۔ سلف صالحین کا طریقہ یہ تھا کہ وُہ قصداً نہ سوتے بلکہ جب نیند کا غلبہ ہوتا تب سوتے تاکہ آخر شب میں تہجد کے لیے اٹھ سکیں اور بعض اس وقت سوتے کہ جب نیند کے غلبہ کی وجہ سے نماز اور ذکر نہ کر سکتے۔ سنّت یہ ہے کہ سوکر دوبارہ نشاط حاصل کرلے تاکہ جو کچھ پڑھ رہا ہے اُسے سمجھ تو سکے۔ حضرت ابن عباسؓ بیٹھے بیٹھے سونے کو مکروہ سمجھتے۔ حدیث میں آتا ہے کہ

رات کو مشقت میں نہ پڑ جاؤ۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے پُوچھا گیا کہ فلاں عورت رات کو نماز پڑھتے پڑھتے تھک جاتی ہے تو رسّی کا سہارا لے لیتی ہے۔ آپؐ نے اس سے منع فرمایا۔ اور حکم دیا کہ رات کو جس قدر ہمّت ہو اس قدر نماز پڑھو اور جب نیند غالب آجائے تو سو جاؤ نیز فرمایا کہ جس قدر طاقت ہو اسی قدر کام کرو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نہیں اکتاتا، جب تک کہ تم نہ اکتا جاؤ۔ عرض کیا گیا کہ فلاں آدمی رات کو نہیں سوتا بلکہ نماز پڑھتا رہتا ہے اور دائمی روزہ رکھتا ہے افطار ہی نہیں کرتا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اس دین کی بھلائی آسان ترین ہے۔ پھر فرمایا:
"مگر میں نماز پڑھتا ہوں اور سوتا ہوں، روزہ رکھتا ہوں اور افطار کرتا ہوں۔ یہ میرا طریقہ ہے جو میرے طریقے سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں۔"
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
اس دین میں سختی مت کرو اس لیے کہ یہ قوی ہے چنانچہ جو اس میں سختی کرے گا اس پر یہ غالب آجائے گا (وہ مشکل بن جائے گا) اور (خواہ مخواہ سختی کر کے) اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی عبادت سے متنفر نہ کرو۔

تیسرا ورد یہ ورد سو جانے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ اس کا نام تہجد کا ورد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر کیا:

وَمِنَ اللَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ [1]

اور نماز تہجد کا وقت سونے کے بعد کا ہے۔ اس نیند کو ہجوع کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ [2]

چنانچہ ہجوع کا معنی سونا اور تہجد کا معنی قیام اللیل ہے۔ گاہے ہجود بھی کہا جاتا ہے۔ یہ نصف شب میں ہے۔ یہ متوسط ورد اور دن کے افضل ترین درمیان والے ورد کے مشابہ ہے۔ اس کا اجر بھی بہت زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی۔ فرمایا:

وَاللَّيْلِ إِذَا سَجٰى ۔

ایک قول میں اس کی وضاحت ہے کہ جب ٹھہر جائے اور اللہ تعالیٰ کے سوا ہر آنکھ نیند میں ڈوبنے لگے۔ اللہ زندہ اور قایم رہنے والا ہے اُسے نہ اونگھ آئے نہ نیند آئے۔ اور ایک قول کے مطابق اس کا مفہوم یہ ہے کہ جب رات طویل ہو جائے۔ ایک قول میں مراد ہے جب رات چھا جائے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ رات میں کس وقت دعا زیادہ سنی جاتی ہے۔ آپؐ نے فرمایا، رات کے آخری نصف حصہ میں۔
حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق منقول ہے کہ انھوں نے عرض کیا:

---

[1] بنی اسرائیل۔ آیت ۷۹ [2] سورۃ الذاریات ۔ آیت ۱۷

"اے میرے اللہ! میں چاہتا ہوں کہ تیری عبادت کروں۔ تو کس وقت قبول کرتا ہے؟"
اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی:
"اے داؤد! نہ ابتدائے شب میں اٹھ اور نہ ہی آخر شب میں اٹھ۔ اس لیے کہ جو ابتدائے شب میں سو گیا وہ آخر شب میں سو گیا۔ اور جس نے آخر شب میں قیام نہ کیا اس نے ابتدائے شب میں بھی قیام نہ کیا۔ البتہ تو رات کے درمیانی حصہ میں اٹھ کر تو میرے ساتھ خلوت کرے اور میں تیرے ساتھ خلوت کروں۔ پھر میرے سامنے اپنی حاجت پیش کر۔"

چوتھا ورد

یہ ورد دو فجروں کے درمیان کا ہے۔ فجر اول وہ ہے کہ جب ارض پنجم کے پیچھے سے سورج کی شعاع ظاہر ہو اور فجر اول کی مقدار میں آسمان کے وسط تک اس کی روشنی جا پہنچے۔ پھر فلک اسفل میں ڈوب جائے اور ارض ششم حائل ہو جائے۔ اس کی روشنی چلی جائے اور رات کی سیاہی پلٹ آئے۔ یہ رات کا آخری تہائی حصہ ہے۔ احادیث میں اس وقت کے بارے میں آیا کہ اس وقت عرش ہلتا ہے اور جنات عدن سے ہوائیں آتی ہیں اور اللہ تعالیٰ آسمان دنیا پر نزول فرماتا ہے۔ اس وقت کے متعلق حدیث ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ رات کا کون سا حصہ افضل ہے؟ آپ نے فرمایا، رات کا آخری نصف حصہ۔ نصف رات سے لے کر سحر اول تک چوتھے ورد کا وقت ہے۔

پانچواں ورد

اس کا وقت سحری کا آخری حصہ ہے۔ اسی وقت میں سحری کھانا مستحب ہے۔ اس کے بعد صبح صادق طلوع ہو جاتی ہے۔ اس پانچویں ورد میں استغفار کی کثرت کرے، قرآن مجید کی تلاوت کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

وَقُرْآنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۔[1]

روایت ہے کہ اس وقت رات کے فرشتے بدلتے اور دن کے فرشتے آتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ وقت، وسط کا وقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل حجاز اس وقت کی عظمت و شان کے پیش نظر کہتے ہیں کہ صلاۃ الوسطیٰ سے مراد نماز فجر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس کی حفاظت کا خاص

---

[1] سورۃ الاسراء آیت ۷۸۔

طور پر حکم دیا ہے نیز رات کے آخری اور دن کے ابتدائی حصہ میں یہی وقت پڑتا ہے۔ یہ مختصر ترین
اور افضل ترین ورد ہے۔ اس کا وقت سحر اوّل سے لے کر طلوعِ فجر ثانی تک ہوتا ہے۔ البتہ رات بھر
میں نصف شب کی نماز سب سے افضل ہے۔ پانچویں ورد میں سحری کے آخری حصہ میں اگر
بیدار ہو سکے تو سب سے افضل عبادت نماز پڑھنا ہے۔ یہ عبادت اس طرح ہے جیسے کہ
مغرب و عشاء کے درمیان کی نماز ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض مفسرین کے نزدیک وَبِالْاَسْحَارِهُمْ
يَسْتَغْفِرُوْنَ (اور سحری کے وقت وہ استغفار کرتے ہیں) کا مطلب نماز پڑھتے ہیں۔ ایسے
ہی وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ سے مراد بھی نماز ہے۔ اس لیے کہ نماز میں قرآن و استغفار ہوتا ہے،
جیسے کہ نماز کو تسبیح کہا گیا۔ اس لیے کہ اس میں تسبیح ہوتی ہے۔ ایسے ہی نماز کو استغفار کہا گیا۔
کیونکہ اس میں بخشش کا سوال کیا جاتا ہے۔ طلوعِ فجر ثانی تک کی یہ نماز سحور کا بدل) ہوگی۔
ایک طویل حدیث میں حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کا واقعہ آتا ہے کہ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ جب
اپنے بھائی حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کے ہاں گئے۔ جب رات آئی تو حضرت ابو الدرداء
نماز پڑھنے لگے۔ حضرت سلمانؓ نے فرمایا: سو جاؤ۔ وہ سو گئے۔ جب صبح (رات کا آخری وقت)
ہوا تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اب اٹھو، چنانچہ دونوں اٹھے اور دونوں نے نماز پڑھی۔ پھر فرمایا: تیرے نفس کا تجھ پر حق
ہے اور تیرے رب کا تجھ پر حق ہے اور تیرے اہل و عیال کا تجھ پر حق ہے اور تیرے مہمان کا
تجھ پر حق ہے۔ ہر صاحبِ حق کو اس کا حق دو۔

یہ واقعہ اس طرح ہوا کہ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کی بیوی نے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ
کو بتایا کہ یہ رات بھر نہیں سوتے۔ راوی بتاتے ہیں کہ پھر دونوں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم
کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ واقعہ عرض کیا۔ آپؐ نے فرمایا: سلمانؓ نے سچ کہا۔

اجر و ثواب کے لحاظ سے یہ پانچواں ورد غروبِ آفتاب سے پہلے دن کے ورد کے مشابہ
ہے۔ البتہ یہ ورد فجر ثانی (صبح صادق) سے پہلے پہلے مکمل ہونا چاہیے۔

فجر ثانی (صبح صادق) سے مراد وہ سفیدی ہے کہ جس کے بعد سُرخی آتی ہے جیسے کہ
غروبِ آفتاب کے بعد سُرخی اور پھر سفیدی آتی ہے۔ سُرخی زائل ہونے کے بعد کی سپیدی کو
شفقِ ثانی کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد رات کا اندھیرا چھا جاتا ہے اور صبح کو اس کا الٹ ہوتا
ہے۔ پہلے سپیدی آتی ہے اور پھر سُرخی آتی ہے۔ سپیدی آنے پر رات کا آخری حصہ ختم ہو گیا

اور سرخی کے بعد سورج نکلتا ہے اور فجر کا معنی ہے فلکِ اسفل سے سورج کی شعاع کا پھٹنا اس وقت اس کی روشنی اونچی جگہوں، پہاڑوں اور سمندروں میں پھیلی ہوئی نمودار ہوتی ہے۔ یہ پانچویں ورد کا آخری وقت ہے۔ اب وتر ادا کرنے کا وقت آیا۔ جب صبح صادق ہو چکی تو رات کے پانچوں اوراد ختم ہو گئے۔ اب دن کے اوراد کا وقت آ چکا۔

اب محاسبہ کرو

اب محاسبہ کر کے دیکھو کہ تم عابدین کی فہرست میں درج ہو سکے یا ان سے نکال دیے گئے۔ اور غافلین کی فہرست میں درج کر دیے گئے۔ رات بھر پہ نگاہ کر کے دیکھو کہ تمہیں نور کا لباس پہنایا گیا اور تمہاری تجارت فائدہ میں رہی یا لباسِ ظلمت پہنایا گیا اور ان لوگوں میں سے ہو گیا کہ غفلت کے باعث جن کے دل مر گئے اور وہ خود بھی مردار ہیں۔ اس محاسبہ کے بعد اٹھو۔ طلوعِ فجر ہو جائے تو صبح کی دو رکعت نماز ادا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ [1]

(اور کچھ رات میں بول اس کی پاکی اور پیٹھ پھیرتے وقت تاروں کے)

اس کے بعد یوں دعا کرو:

نَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنْ سَخَطِهٖ

(ہم اللہ کی ناراضگی سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں)

اس کے بعد یہ آیات آخر تک پڑھو۔

شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ [2] آخر تک۔

اس کے بعد اس طرح دعا کرو:

أَنَا شَهِيدٌ بِمَا شَهِدَ اللّٰهُ بِهٖ لِنَفْسِهٖ وَشَهِدَتْ بِهٖ مَلَائِكَتُهٗ وَأُولُو الْعِلْمِ مِنْ خَلْقِهٖ وَأَسْتَوْدِعُ اللّٰهَ الْعَظِيمَ هٰذِهِ الشَّهَادَةَ وَهِيَ لِي عِنْدَ اللّٰهِ وَدِيعَةٌ حَتّٰى يُؤَدِّيَهَا وَأَسْأَلُهٗ حِفْظَهَا

(میں گواہ ہوں اس پر کہ اللہ نے اپنے نفس کے لیے اس پر گواہی دی اور اس کی مخلوق سے فرشتوں نے اور اہلِ علم نے گواہی دی اور میں یہ گواہی بزرگ اللہ کے پاس امانت رکھتا ہوں اور یہ اللہ کے پاس میری امانت ہے۔ حتیٰ کہ وہ اسے ادا کرے اور میں اس سے

---

[1] سورۃ الطور آیت ۴۹ [2] سورۃ آل عمران آیت ۱۸

حَتّٰی یَتَوَفَّانِیَ اللّٰہُ عَلَیۡہَا اَللّٰھُمَّ احۡطُطۡ بِہَا عَنِّیۡ وِزۡرًا وَاجۡعَلۡ لِیۡ بِہَا عِنۡدَکَ ذُخۡرًا وَاحۡفَظۡنِیۡ بِہَا وَاحۡفَظۡہَا عَلَیَّ وَ تَوَفَّنِیۡ عَلَیۡہَا حَتّٰی اَلۡقَاکَ بِہَا غَیۡرَ مُبَدِّلٍ تَبۡدِیۡلًا ۔

اس کی حفاظت مانگتا ہوں حتیٰ کہ مجھے موت دے اللہ تعالیٰ اس پر اے اللہ اس کے باعث مجھ سے گناہ دُور کر دے اور اس کے باعث میرے لیے اپنے پاس ذخیرہ فرما اور اس کے باعث میری حفاظت فرما اور مجھ پر اسے محفوظ رکھ اور مجھے اس پر مار حتیٰ کہ میں اس کے ساتھ بغیر کسی تبدیلی کے تجھ سے ملوں)

دن رات کے اوراد میں فرائض کی بجاآوری کے بعد افضل ترین اعمال اپنی ذمّہ داریاں پُوری کرنا اور مومن بھائیوں کے کام آنا ہے۔ نماز میں خطاب کے اثرات اور مخاطب کے مشاہدہ کا یہ لازمی نتیجہ ہے۔ یہ تمام امور عبادت میں داخل ہیں۔ اس کے بعد خوب سمجھ بُوجھ کر اور توجہ کے ساتھ قرآن مجید کی تلاوت کرے۔ تلاوت میں غور و فکر کو بیدار رکھے۔ دل زندہ ہو، توجہ مکمل ہو اور تمام اعضا ہمہ تن گوش ہوں۔ الغرض غیب کا مشاہدہ ہوتا دکھائی دے۔ یہ تمام اعمال سے زیادہ افضل عمل ہے۔

فصل ۹

وتر اور فجر کی سنن کے احکام

اس فصل میں وتر ادا کرنے اور رہ جانے کی صورت میں قضا کرنے اور صبح کی دو سنتیں ادا کرنے اور قضا کرنے کے احکامات ذکر کیے جاتے ہیں۔

یاد رہے کہ ہر مہینے میں دو راتیں ایسی ہیں کہ جن سے فجر کے اوقات کا پتہ چلایا جاتا ہے۔

(۱) ۲۶ تاریخ کی رات۔ اس رات میں طلوعِ فجر کے قریب ہی چاند نکلتا ہے۔

(۲) ۱۲ تاریخ کی رات۔ اس رات کو طلوعِ فجر کے بعد چاند غروب ہوتا ہے۔ پہلی رات میں رات کے ساتویں حصے کا دو ثلث گزرنے کے بعد طلوعِ آفتاب ہوتا ہے اور دوسری میں رات کے چھٹے حصے کا نصف گزرنے پر سورج نکل آتا ہے۔

طلوعِ فجرِ ثانی (صبح صادق) ہونے تک وتر کی نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ جب صبح صادق طلوع ہوئی تو اب ادا کا وقت چلا گیا۔ اب وتروں کی قضا کا وقت ہے۔ اگر کوئی آدمی وقت پر وتر نہ پڑھ سکے تو نمازِ فجر سے پہلے پہلے اس وقت وتروں کی قضا کر لے اور اگر صبح کی نماز پڑھ لی تو اب وتروں کی ادا اور قضا دونوں کا وقت بھی چلا گیا۔

صبح کی دو سنتوں کا وقت یہ ہے کہ جب صبح صادق ہو جائے تو گھر میں دو سنتیں ادا کرے یہ دونوں رکعتیں مختصر پڑھنا مسنون ہیں۔ اگر صبح کی سنتیں ادا کیے بغیر ہی فرائض ادا کر لیے تو سنتوں کی ادائیگی کا وقت چلا گیا۔ اب قضا کا وقت باقی ہے۔ اسے چاہیے کہ انتظار کرے۔ جب سورج نکل آئے اور نماز کا وقت ہو جائے تو نمازِ ضحیٰ سے پہلے پہلے یہ سنتیں قضا کر کے پڑھے صبح کی سنتوں کی قضا کا وقت نمازِ ظہر تک رہتا ہے۔ جب نمازِ ظہر پڑھ لی تو قضا کا وقت بھی ختم ہو گیا۔

جس کا کوئی ورد اپنے وقت سے رہ جائے بہتر ہے کہ وہ اس کے وقت میں ہی یا اس سے پہلے مکمل کر لے مگر قضا کی نیت نہ کرے۔ اس لیے کہ فرائض کے علاوہ کسی چیز کی قضا نہیں ہوتی۔ البتہ سابقہ وقت ضائع کرنے کی تلافی کا خیال رکھ کر ایسا کرے تاکہ نفس کو محنت کی عادت رہے اور وہ کاہلی اور رخصت کا عادی نہ بنے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ عزوجل کو دائمی عمل زیادہ پسند ہے چاہے تھوڑا سا ہو (اب اس تلافی سے دوام کی صورت بن جائے گی جو کہ

باعثِ رضائے الٰہی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں عبادت کی عادت ترک کرنے
پر وعید بھی آتی ہے۔ انھوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کاہلی کی وجہ سے عبادت
ترک کرنے پر اللہ کا غضبناک ہونا نقل کیا۔ وہ فرماتی ہیں کہ جس روز جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
پر نیند کا غلبہ ہوتا یا کوئی تکلیف ہوتی اور آپ اُس رات نہ اٹھ سکتے تو دن کو بارہ رکعت ادا
فرماتے۔

جو صبح کی دو سنتیں گھر میں ادا کیے بغیر مسجد میں آئے۔ اسے چاہیے کہ وہ تحیۃ المسجد پڑھ
لے تو بھی ان سے کافی ہوں گی۔ اور جو گھر میں سنتیں پڑھ کر آئے۔ اب اگر پھٹنے کے وقت میں
مسجد میں داخل ہو تو تحیۃ المسجد کی دو رکعت پڑھ لے اور اگر روشنی ہو جائے تو صرف تحیۃ المسجد نہ
پڑھے بلکہ فرض ہی ادا کرے۔

اور جو صبح کی دو سنتیں ادا کیے بغیر مسجد میں آئے۔ اگر اقامت سے پہلے آیا تو سنتیں
ادا کرلے اور اگر ٹھیک اقامت کے وقت آیا اور امام نے جماعت شروع کر دی تو جماعت میں
شریک ہو جائے۔ اس لیے یہ افضل ہے۔ نیز جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت
ہے کہ جب جماعت کھڑی ہو جائے تو فرض نماز کے سوا کوئی اور نماز نہیں۔ اور اگر تحیۃ المسجد پڑھے
بغیر مسجد میں بیٹھے تو یہ کلمات چار بار پڑھ لے۔ ان کا اجر دو رکعتوں کا سا ہے

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ۔ (اللہ پاک ہے اور اللہ ہی کی ساری حمد ہے اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے)

اسی طرح جو آدمی بغیر وضو کے مسجد میں آئے یا مسجد سے گزرے تو وہ بھی یہ کلمات پڑھ لے اور جو
مسجد میں آکر بیٹھے تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت نماز ادا کرلے۔ یہ بھی یاد رہے کہ مسجد میں وضو کے
بغیر آنا اور بیٹھنا مکروہ ہے۔

فصل ۱۰

سایہ کی کمی و بیشی

اس فصل میں زوال معلوم کرنے اور سایہ کی کمی و بیشی وغیرہ کا ذکر ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلٰی رَبِّکَ کَیْفَ مَدَّ الظِّلَّ ۚ وَلَوْ شَاۗءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ۚ ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيْلًا ۙ[1]

(تو نے نہیں دیکھا اپنے رب کی طرف؟ کیسے دراز کیا سایہ کو اور اگر چاہتا تو اس کو ٹھہرا رکھتا، پھر ہم نے مقرر کیا سورج کو اس کو راہ بتانے والا)

دوسری جگہ فرمایا:

وَجعلنا اللیل والنهار آیتین۔ (ہم نے دن رات کو نشانیاں بنایا)

سے لے کر عَدَدَ السِّنِيْنَ وَالْحِسَابِ تک۔

نیز فرمایا:

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ (سورج اور چاند کے لیے ایک حساب ہے)

حضرت ابوالدرداءؓ اور حضرت کعب احبار رضی اللہ عنہما کی حدیث میں اس امت کا وصف بیان کرتے ہوئے ذکر ہوا کہ یہ لوگ نمازیں قائم کرنے کی خاطر سایہ کا خیال رکھیں گے اور اللہ تعالےٰ کو بھی وہ لوگ سب سے زیادہ محبوب ہیں جو ذکر اللہ کی خاطر سورج چاند اور سایہ کا حساب رکھتے ہیں۔ بعض محدثین اور حساب دانوں کا کہنا ہے کہ دن رات میں چوبیس ساعتیں ہوتی ہیں اور ہر ساعت میں تیس شعیرہ ہوتے ہیں (اور ہر شعیرہ دو منٹ کا سمجھئے) ایسے ہی ایک ماہ میں سورج کے تیس درجے ہوتے ہیں اور ہر دن میں ایک درجہ ہوتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت اس طرح ہوگی کہ:

ایلول (ستمبر) کے سترہ روز گذرنے کے بعد دن رات برابر ہوجاتے ہیں۔ اس دن کے بعد رات ہر روز ایک شعیرہ بڑھنے لگتی ہے۔ حتیٰ کہ تیس روز میں ایک ساعت بڑھ جاتی ہے۔ آخر کانون الاول (دسمبر) کی سترہ تاریخ آتی ہے تو رات کی طوالت اور دن کا گھٹاؤ مکمل ہوجاتا ہے۔ یہ رات سارے سال میں سب سے زیادہ طویل یعنی پندرہ ساعتوں کی رات ہوتی ہے اور اس

---

[1] سورۃ الفرقان آیت ۴۵۔

تاریخ کا دن بھی سارے سال میں چھوٹا یعنی نو ساعتوں کا دن ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہر روز ایک شعیرہ کی مقدار میں دن بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ آخر سترہ آذار (مارچ) کو رات دن برابر ہو جاتے ہیں، اور اس روز دن رات بارہ بارہ ساعتوں کے ہوتے ہیں۔ پھر دن ہر روز ایک شعیرہ بڑھتا ہے اور سترہ حزیران (جون) کو طویل ترین دن اور سب سے چھوٹی رات ہوتی ہے یعنی دن پندرہ ساعتوں کے اور رات نو ساعتوں کے برابر ہوتی ہے۔ پھر دن گھٹنے لگتا ہے اور سترہ ایلول (ستمبر) کو دن رات برابر ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ دن رات کا چکر اسی حساب سے چلتا رہتا ہے۔

اسی حساب پر نمازوں کے اوقات حسب ذیل ہوں گے۔

جب سورج ٹھیک دوپہر میں وقفہ کر کے ذرا سا ڈھل جائے تو یہ ظہر کا ابتدائی وقت ہے اور جب زوال کے بعد سات قدم بڑھ گیا تو اب عصر کا وقت آگیا۔ یہ ظہر کا آخری اور عصر کا ابتدائی وقت ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب سورج تسمہ بھر ڈھل گیا تو ظہر کا وقت شروع ہو گیا ہر چیز کا سایہ ایک مثل ہونے تک (ظہر) کا وقت ہے اور جب ایک مثل سایہ ہوا تو یہ ظہر کا آخری وقت ہے اور عصر کا ابتدائی وقت ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے روز ظہر کی نماز ابتدائی وقت میں اور دوسرے روز ہر چیز کا سایہ ایک مثل ہونے کے وقت پر پڑھی پھر جب ہر چیز کا سایہ دو مثل ہوا تو عصر کی نماز پڑھی اور فرمایا کہ ان کے درمیان (نماز کا) وقت ہے۔

سایہ کی پیمائش

سایہ ناپنے کا طریقہ یہ ہے کہ ہموار جگہ پر ایک سیدھی لکڑی گاڑ دو۔ پھر سایہ پر نگاہ رکھو۔ جب سایہ دوپہر کو پہنچے تو سایہ کی جگہ لکیر کھینچ دو اور غور سے دیکھتے رہو کہ سایہ گھٹتا ہے یا نہیں۔ اگر گھٹ جائے تو سمجھو کہ ابھی زوال نہیں ہوا اور جب سایہ گھٹتے گھٹتے ایک جگہ ٹھہر جائے تو یہ نصف النہار ہے۔ اس وقت نماز پڑھنا جائز نہیں۔ جب سایہ بڑھنے لگے تو یہ زوالِ آفتاب کی علامت ہے۔ یہیں سے ہر چیز کا سایہ ایک مثل کے برابر ناپا جائے گا۔ جب یہاں سے ہر چیز کا سایہ ایک مثل ہو جائے تو یہ ظہر کا آخری وقت ہو گا اور جب ایک مثل سے ایک قدم سایہ آگے بڑھا تو عصر کا وقت شروع ہو گیا۔ تا آنکہ ہر چیز کا سایہ بڑھ کر دو مثل ہو جائے۔ اگر اس وقت کو اپنے قد سے ناپنا ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ مثلاً تمہارا قد سات قدم ہے۔ اب تم کھڑے ہو جاؤ اور کسی آدمی کو کہو کہ تمہارے سایہ کے آخری حصّہ پر نشان لگا دے۔ اب اپنی ایڑی سے لے کر سایہ کے آخر تک پیمائش کرو۔ اگر سایۂ زوال نکالنے کے بعد سایہ کی طوالت سات قدم سے کم ہے تو ابھی ظہر کا وقت باقی ہے۔ اور اگر سایۂ زوال

نکال کر سایہ کی طوالت سات قدم سے بڑھ گئی تو عصر کا وقت داخل ہوگیا۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ سردی اور گرمی کے ایام میں قدم بھی کم زیادہ ہوجاتے ہیں۔ اس کو جاننے کا طریقہ یہ ہے کہ سترہ آذار (مارچ) کو دن رات برابر ہوجاتے ہیں۔ اس روز زوال کے وقت انسان کا سایہ تین قدم ہوتا ہے ایسے ہی ہر نصب شدہ چیز کے سایہ کا حال ہے۔ اس روز ہر چیز کا سایہ زوال کے وقت ۳/۷ ہوتا ہے۔ اس کے بعد سایہ گھٹنے لگتا ہے اور چھتیس روز کے بعد ایک قدم کے برابر سایہ کم ہوجاتا ہے تاآنکہ دن کی طوالت اور رات کا چھوٹا ہونا مکمل ہوجاتا ہے۔ یہ بات سترہ حزیران (جون) کو ہوتی ہے۔ اس روز زوالِ آفتاب کے وقت انسان کا سایہ ½ قدم ہوتا ہے (بشرطیکہ اس کا قد سات قدم ہو) سایۂ زوال کی یہ کم سے کم طوالت ہے۔ اس کے بعد پھر سایہ بڑھتا ہے اور چھتیس روز کے بعد ایک قدم تک جا پہنچتا ہے۔ آخر ستر ایلول (ستمبر) کو دن رات برابر ہوجاتے ہیں اور اس روز زوال کے وقت تین قدم کا سایہ ہوتا ہے پھر سایہ بڑھتا ہے اور چودہ روز گزرنے کے بعد ایک قدم مزید بڑھ جاتا ہے۔ آخرکار سترہ کانون الاول (دسمبر) کو رات کی طوالت اور دن کا چھوٹا مکمل ہوجاتا ہے۔ اس روز زوالِ آفتاب کے وقت سایہ کی طوالت ½۹ قدم ہوتی ہے۔ یہ طویل ترین سایہ ہے۔ اس کے بعد سایہ بڑھتا ہے اور چودہ روز کے بعد ایک قدم مزید بڑھ جاتا ہے۔ آخر ۱۷۔ آذار (مارچ) دن رات برابر ہوجاتے ہیں اور سایۂ زوال تین قدم ہوتا ہے۔ ا۔ گرما کا موسم شروع ہوا۔

فائدہ یہ یاد رہے کہ گرما اور خزاں کے موسم میں ہر چھتیس روز کے بعد سایہ ایک قدم کم یا زیادہ ہوجاتا ہے اور سرما اور بہار کے موسم میں سایہ کی یہی مقدار چودہ روز میں بڑھ جاتی ہے۔ یہ بات بعض متاخرین علمائے نجوم کی ہے اور بعض متقدمین کا بھی یہی خیال ہے۔ البتہ انہوں نے ماہِ تشرین (اکتوبر) میں اقدام کے ساتھ سایۂ زوال کا ذکر کرتے ہوئے ان سے یہ اختلاف کیا ہے کہ ماہِ حزیران (جون) میں سایہ دو قدم سے نہیں گھٹتا اور کانون الاول (دسمبر) میں آٹھ قدموں سے سایہ نہیں بڑھتا۔ سائے کو ٹھیک ٹھاک ناپ لینا بہت مشکل ہے نیز ان کا کہنا ہے کہ ایلول (ستمبر) میں چھ قدم اور تشرین الآخر (نومبر) میں سات قدم اور کانون الاول (دسمبر) میں آٹھ قدم ہوتا ہے۔ اس وقت دن سب سے چھوٹا اور رات طویل ہوتی ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ سایۂ زوال ہے۔ پھر سایہ گھٹنے لگتا ہے اور دن بڑھتا ہے اور کانون الثانی (جنوری) میں زوال کا سایہ سات قدم رہ جاتا ہے۔ شباط (فروری) میں چھ قدم اور آذار (مارچ) میں پانچ قدم رہ جاتا ہے۔ اب دن رات

برابر ہو جاتے ہیں اور نیسان (اپریل) میں سایہ گھٹ کر چار قدم رہ جاتا ہے اور ایار (مئی) میں تین قدم پر آجاتا ہے اور حزیران (جون) میں سایہ کی مقدار دو قدم رہ جاتی ہے۔ اب دن طویل ترین اور رات کم ترین ہوتی ہے۔ یہ کم سے کم سایۂ زوال ہے۔ اس وقت دن پندرہ ساعتوں کا اور رات نو ساعتوں کی ہوتی ہے اور تموز (جولائی) میں زوال کا سایہ تین قدم اور آب (اگست) میں چار قدم اور ایلول (ستمبر) میں پانچ قدم ہوتا ہے۔ اب دن رات برابر ہو جاتے ہیں۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ زوال کا طویل ترین سایہ نو قدم اور کم ترین سایہ ایک قدم ہوتا ہے۔ یہ قول پہلے کے قریب تر ہے۔ حدیث میں اوقاتِ نماز کے سلسلہ میں اقدام کا ذکر آیا اس لیے ہم نے بھی اس حساب کو اقدام سے ہی واضح کیا ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ گرما کے موسم میں ظہر کی نماز تین قدم سے لے کر پانچ قدموں کے سایہ کے درمیان ہوتی اور سرما کے موسم میں پانچ سے لے کر چھ قدم تک ہوتی۔ قصہ کوتاہ سایۂ زوال کی شناخت اس طریق پر فرض نہیں بلکہ جب بھی نہ ہے یقین اور دل و نظر کے مطابق زوال آفتاب ہو جائے تو نمازِ ظہر کا وقت آگیا۔ گرمی کے موسم میں قبلہ رُخ کھڑے ہونے کے بعد اگر سُورج بائیں جانب ہو تو سمجھو کہ زوال ہو گیا اب ہر چیز کا سایہ ایک مثل ہونے تک نمازِ ظہر پڑھ سکتے ہو۔ جب سایہ بڑھ کر ایک مثل ہو گیا تو یہ عصر کا ابتدائی وقت ہے۔ اب دو مثل سایہ ہو جانے تک عصر کی نماز پڑھ سکتے ہو۔ دو مثل سایہ تک عصر کا مستحب آخری وقت ہے اور جب دھوپ زرد ہونے لگے اور سُورج ڈوبنے کے قریب جا پہنچے تو اب مکروہ وقت آگیا۔ ہاں کوئی مریض یا شرعی معذور ہو (تو اس کے لیے کراہت نہ ہوگی) حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جو غروبِ آفتاب سے پہلے پہلے عصر کی ایک رکعت بھی ادا کر لے تو اس نے عصر پا لی اور جو طلوعِ آفتاب سے پہلے پہلے صبح کی ایک رکعت بھی پا لے تو اس نے نمازِ صبح پا لی۔

سایۂ زوال کی پہچان گرمی کے موسم میں جب تم قبلہ رُخ ہو کر کھڑے ہو اور سُورج تمہارے بائیں پپوٹے پر ہوتا نظر آئے تو سمجھو کہ ابھی زوال آفتاب نہیں ہُوا بلکہ ابھی دوپہر ہے اور سورج سر پر ہے۔ اس وقت زوال ہونے دو۔ اور سردی کی ابتداء میں جبکہ دن ابھی طویل ہو تو زوال نہیں ہوتا۔ ایسے ہی وسطِ گرما کا حال ہے۔ اس موسم میں جب تیرے دائیں پپوٹے پر نظر آئے تو سمجھ لو کہ زوال ہو گیا۔ ابتدائے سرما میں اگر بائیں پپوٹے پر نظر آئے تو زوال ہی سمجھو۔

بشرطیکہ دن چھوٹا ہو اور اگر دن طویل ہو یا گرما کا آغاز ہو تو گاہے اس صورت میں بھی زوال نہیں ہوتا اور سرما کے موسم میں اگر سورج آنکھوں کے سامنے نظر آئے تو سمجھ لو کہ زوال ہو چکا۔ اب ظہر کی نماز پڑھ سکتے ہو۔ اگر سورج دائیں بھوئے پر دکھائی دے تو سرما میں یہ ظہر کا آخری وقت ہے اور گرما کے موسم میں ابتدائی وقت ہے۔ عراق اور خراسان میں بھی اندازہ ہے اس لیے کہ وہ حجر اسود اور باب کعبہ کی طرف پڑتے ہیں۔ حجاز اور یمن والوں کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ان کا قبلہ رکن یمانی اور کعبہ کا آخری حصہ ہے۔ اس لیے یہ اندازہ بدل گیا۔ دراصل کعبہ کے اردگرد کے مختلف مقامات میں اس قسم کا اختلاف ایک لازمی امر ہے۔ یہ متقدمین کا اندازہ ہے۔ ان سے اختلاف غلط ہے۔

اوقاتِ نماز میں شبہ ہو جائے تو؟

اگر جہالت کی وجہ سے یا کسی عذر مثلاً ابر چھا جانے کے باعث اوقاتِ نماز کا ٹھیک اندازہ نہ ہو سکے تو پھر غور و فکر سے کام لے اور اجتہاد کرے اور جب اس کے علم و یقین کے مطابق نماز کا وقت آ جائے تو نماز ادا کرے۔ ایسی صورت میں تاخیر سے نماز پڑھنا افضل ہے۔ البتہ حدیث میں مروی ہے کہ تین باتیں مناقبِ ایمان سے ہیں۔

۱۔ گرمی میں روزہ رکھنا۔

۲۔ سردی کے موسم میں مکمل وضو کرنا۔

۳۔ اور ابر کے دن نماز میں عجلت کرنا۔

عربوں کی مثال ہے کہ يَوْمُ الدَّجْنِ يُضْرَبُ فِيهِ عَبْدُ السُّوءِ (ابر کے دن برے غلام کو مار پڑتی ہے۔) اس کی وجہ یہ ہے کہ سورج چھپ جانے کے باعث ابر کا دن مختصر معلوم ہوتا ہے اور انسان کاہلی یا غفلت کے باعث وقت کا خیال نہیں کرتا اور کام رہ جاتا ہے (مگر پھر بھی تاخیر سے اس لیے پڑھے) کہ فرائض یقینی (وقت و شرائط کے ساتھ) ہی قبول کیے جاتے ہیں۔ شبہ کے وقت میں ادا کرنے کی بجائے یقینی وقت میں ادا کرنا افضل ہے۔ دیکھیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا ہے کہ اگر ابر ہو جائے تو شعبان کے تیس دن پورے کرو۔ اب یقین کی خاطر احتیاط متروک ہو گی اور اگر کوئی آدمی یہ سمجھے کہ نماز کا وقت ہے اور نماز پڑھ لے۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وقت سے پہلے نماز پڑھی یا قبلہ رخ سمجھ کر نماز ادا کی۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ غیر قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی گئی۔ اب اگر وقت ہے تو احتیاطاً دوبارہ نماز پڑھ لے اور اگر وقت چلا گیا تو کچھ حرج نہیں نماز ہو گئی۔ اور بہتر بات یہ ہے کہ جب یاد آئے یہ نماز لوٹا لے۔

سُورج کے سات زوال

بعض علماء کا فرمان ہے کہ سُورج کے سات زوال ہوتے ہیں۔ ان میں سے تین کو کوئی آدمی نہیں جانتا۔

۱۔ فلک اعلیٰ کے قطب سے سورج کا نزول۔ اس کو اللہ تعالیٰ کے سوا نہ کوئی جانتا ہے اور نہ کوئی مشاہدہ کرتا ہے۔

۲۔ وسطِ فلک سے سورج کا زوال۔ اس کو مخلوقات میں سے کوئی نہیں جانتا۔ اس کی خبر سُورج کے صرف ان موکلوں کو ہوتی ہے جو اسے برفانی جبال پر ڈالتے ہیں تاکہ اس کی گرمی میں سکون آئے۔ اور یہ دنیا سے اس کی شعاعوں کو ہٹاتے رہتے ہیں اور فلک میں ایک گاڑی سی میں اسے چلاتے ہیں۔

۳۔ تیسرے زوال کو زمین کے فرشتے جانتے ہیں۔

۴۔ چوتھا زوال تین دقائق ہوتا ہے۔ یہ چوتھائی شعیرہ کی مقدار میں ہوتا ہے اور شعیرہ دراصل ساعت کے بارہ اجزاء میں سے ایک جزو کا نام ہے۔ یہی وُہ زوال ہے کہ جس کو اہلِ نجوم فلاسفہ فلکی پیمائش اور ترکیبِ افلاک نیز سردی و گرمی کے موسموں میں افلاک میں سورج کی چال کے اندازے سے جانتے ہیں۔

چنانچہ وُہ زائچے پر اُبھرنے والے نقوش کو دیکھ اس کی تقویم کرتے ہیں۔

۵۔ چنانچہ جب سورج کا پانچواں زوال ہو جائے جو کہ چھ دقائق کے برابر ہوتا ہے۔ حساب دانوں اور تقویم کے ماہرین کو اس زوال کا علم ہو سکتا ہے۔

۶۔ اور جب ایک شعیرہ یعنی ساعت کے بارہ اجزاء میں سے ایک جزو کے برابر زوال ہو جائے تو یہ چھٹا زوال ہو گا۔ اس زوال کا علم موذنین اور اوقات کا خیال رکھنے والوں کو بھی ہو جاتا ہے۔

۷۔ اور جب تین شعیرہ کے برابر زوال ہو جائے تو یہ ساتواں زوال کہلائے گا۔ یہ ایک ساعت کی چوتھائی حصّہ کے برابر کا زوال ہوتا ہے۔ اسے عوام الناس بھی بخوبی سمجھتے ہیں۔ یہ سب کی نماز کا وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے باعث یہ متوسط اور وسیع وقت ہے۔ اس لیے کہ آسمان بہت دُور ہے اور اُفقِ اعلیٰ میں وُہ بہت ہی سیدھی طرح بنا ہُوا ہے اور بلند و رفیع فضا میں حیرت انگیز اور پختہ ترین طور پر بنا ہے اور اس گول فضا میں عجیب مناسبت اور موزونیت لیے ہُوئے ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السّلام سے پُوچھا:

کیا زوالِ آفتاب ہو گیا؟ انھوں نے عرض کیا: نہیں! ہاں!

آپؐ نے فرمایا: یہ کیسے؟

انھوں نے عرض کیا، میرے آپؐ کے سامنے "نہیں! ہاں!" کہنے کے دوران فلک میں پچاس ہزار فرسخ کا سفر طے کر لیا۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ عزوجل کے علم کے مطابق زوال کے ٹھیک وقت کے بارے میں پوچھا۔

آسمان گھوم رہا ہے!

بعض فلاسفہ کا کہنا ہے کہ آسمان چکی کی طرح گھوم رہا ہے۔ اس کے گھومنے کے باعث قطب پر افلاک بھی گھوم رہے ہیں مگر دور اور بہت ہی بلندی پر ہونے کی وجہ سے ان کے گھومنے کا پتہ نہیں چلتا۔ نیز ان کا گھماؤ بھی برابر ہے۔ بعض علمائے سلف نے بھی یہی فرمایا:

فتبارک اللہ احسن الخالقین۔

بعض عارفین نے اس سے بھی عجیب تر بات بتائی ہے جس سے اللہ عزوجل کی قدرت کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ

دن رات میں چوبیس ساعتیں ہوتی ہیں اور ہر ساعت میں بارہ دقایق ہوتے ہیں اور ہر دقیقہ میں بارہ شعیرہ ہیں اور ہر شعیرہ میں چوبیس انفاس ہیں۔ یہ انفاس خزانہ جسم سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان سے شعائر پیدا ہوتے ہیں۔ شعائر کی پیدائش کے بعد دقایق وجود پذیر ہوتے ہیں۔ آخر ساعات بنتی ہیں۔ ساعتیں متحرک ہو کر افلاک کو گھماتی ہیں اور افلاک گھومنے لگتے ہیں تو فضا میں دن رات پیدا ہوتے ہیں اور جب دن رات آتے ہیں تو آفاق میں آسمان گھومتا ہے اور (مہینوں، سالوں، صدیوں) کا سارا حساب بنتا ہے اور جب احساس چھپا تو انفاس ختم ہوئے اور افلاک ہٹ گئے اور ستارے پھیل گئے۔ آسمان پھٹے اور آباد ویران ہوئیں اور سکون و آرام کی (رات) آئی۔ اللہ پاک ہے۔ اس کی صنعت لطیف اور وہ سب پر قاہر و غالب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ وَ اِذَا النُّجُوْمُ انْکَدَرَتْ [1]

نیز فرمایا:

---

[1] سورۃ الشمس آیت ۱

يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ۔ ؎۱

اللہ پاک لطیف و حکیم ہے۔ اس نے یہ موٹے موٹے افلاک ان نازک انفاس کے ذریعہ گھما دیے۔ جیسے کہ ان موٹے اور دبیز آسمانوں پر لطیف فضا کی چادر ڈالی۔ چنانچہ یہ بڑا فلک بھی آسمان کے سامنے پردہ نہیں بنتا تاکہ ہم آسمان کو دیکھ سکیں۔ البتہ اس نے فلک کو چھپا دیا۔ اب ہم صرف آسمان ہی دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ بندہ ہی دوران افلاک کا باعث ہے کہ اس کے انفاس نے اسے گھما دیا۔ اس کی انفاس ہی ساعتیں ہیں اور اس کی ساعتیں اس کی عمر ہیں اور اس کی عمر اس کی اجل ہے اور اس کی اجل اس کی آخرت ہے مگر وہ خود دنیا میں غفلت اور کھیل کود میں مصروف ہے اگر تو آسمان کی طرف دیکھے تو اسے انفاس پیدا کرتا دیکھے اور اگر تو انفاس کی طرف دیکھے تو انھیں افلاک گھماتا دیکھے گا اور اگر فوق الفوق (بلند و بالاتر) کی طرف دیکھے تو باقی سے نابینا ہو جائے الغرض اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ عرش عظیم کا رب ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ میرے رب نے ہر چیز خوب خوب بنائی۔ وہ مہربان ہے۔ جو چاہے ہو۔ ہم انھیں آفاق میں اپنے نشانات دکھائیں گے اور ان کی اپنی جانوں اور زمین میں نشانات ہیں یقین کرنے والوں کے لیے۔ تمھاری اپنی جانوں میں بھی نشانات ہیں۔ کیا پس دیکھتے نہیں ہو۔

جو تم دیکھتے ہو اور جو نہیں دیکھتے۔ جو ڈرتا ہے وہ عنقریب ذکر کرے گا اور بدبخت (ذکر سے) الگ رہے گا۔

اوّل وقت میں نماز پڑھو

نمازِ مغرب کا افضل وقت یہ ہے کہ جونہی سورج کی ٹکیہ غائب ہو جائے۔ اس کے جلدی ہی بعد نماز ادا کی جائے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے متعلق منقول ہے کہ ایک بار انھیں نمازِ مغرب میں دیر ہو گئی اور ایک ستارا نکل آیا۔ انھوں نے ایک غلام آزاد کیا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے متعلق منقول ہے کہ انھیں نمازِ مغرب میں دیر ہو گئی اور دو ستارے نکل آئے تو انھوں نے دو غلام آزاد کیے۔ افضل یہ ہے کہ جب شفقِ ثانی یعنی سپیدی غائب ہو جائے اور اندھیرا چھا جائے اس وقت عشا کی نماز پڑھے اور رات کے چوتھائی حصہ تک تاخیر کر کے نمازِ عشا پڑھنا زیادہ افضل ہے۔ بشرطیکہ نہ سوئے اور نمازِ عشا سے پہلے سونا مکروہ ہے اور بہتر یہ ہے کہ مہینے کی تیسری

؎۱ سورۃ الطور آیت ۹

تاریخ کے چاند کے غروب ہونے کی مقدار پر جا کر یعنی رات کا ۲/۱۱ حصہ گزرنے کے بعد نمازِ عشا پڑھے۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا مہینے کی تیسری تاریخ کے چاند کے غروب ہونے کی مقدار کے برابر رات گزرنے کے وقت نماز پڑھنا مروی ہے۔

اور افضل یہ ہے کہ صبح صادق طلوع ہونے کے بعد ہی نمازِ فجر ادا کرے۔ یہ نمازِ وسطیٰ ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا حکم فرمایا اس میں تین معنی کر کے توسط پایا جاتا ہے:

۱۔ یہ دن اور رات کے درمیان واقع ہے۔

۲۔ یہ رات کی دو نمازوں مغرب و عشاء اور دن کی دو نمازوں ظہر اور عصر کے درمیان واقع ہے۔

۳۔ یہ جہری نماز یعنی نمازِ عشاء اور ستری نماز یعنی نمازِ ظہر کے درمیان واقع ہے۔

مزید برآں یہ تعدادِ رکعات کے اعتبار سے مختصر ترین نماز ہے۔ ان مفہومات کے لحاظ سے یہ متوسط ہے اس لیے یہی صلوٰۃ الوسطیٰ ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا:

وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا [1]

نیز اس نماز میں رات دن کے بدلنے والے فرشتے بھی آتے ہیں۔ اس وجہ سے اس کی حفاظت زیادہ ضروری ہوئی۔

البتہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ان لوگوں نے ہمیں نمازِ وسطیٰ یعنی نمازِ عصر سے روک دیا۔ اب اگر یہ حدیث ثابت ہو تو ہماری تمام تقریر باطل ہو گی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہی حق ہے اور ہم بھی اسی کو تسلیم کرتے ہیں اور میرے خیال میں بھی یہ حدیث ثابت ہے اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: یہی وہ نماز ہے کہ میرے بھائی سلیمان کی یہ نماز رہ گئی حتیٰ کہ پردوں میں چھپ گیا۔

نمازِ فجر میں طوالِ مفصل یا مثانی میں سے کوئی سورت پڑھنا مسنون ہے اس لیے کہ یہ چھوٹی بھی ہیں اور طوالتِ قیام کا عوض بھی ہیں۔ اب اگر درمیانہ وقت آنے سے نمازیوں کی تعداد بڑھ جاتی ہو تو بہتر ہے۔ البتہ سب ستارے ڈوبنے نہ پائیں اور ایسا نہ کرے کہ نمازیوں کی تعداد

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل آیت ۷۸۔

زیادہ کرنے کی نیت سے خوب سفیدی میں نماز پڑھائے کہ سورج کی آمد بھی قریب ہو جائے البتہ جھٹپٹے میں تھوڑے نمازیوں کے ہمراہ بھی یہ نماز افضل ہے کیونکہ نمازِ عشاء کے علاوہ تمام نمازوں کو ابتدائے وقت میں پڑھنا افضل ترین بات ہے اور عشاء کی نماز میں تاخیر بہتر ہے جیسے کہ ہم بتا چکے ہیں رجناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ ابتدائے وقت میں نماز پڑھنا آخری وقت کے مقابلے میں ایسا افضل ہے جیسے کہ آخرت کو دنیا پر فضیلت حاصل ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ بندہ آخری وقت پر نماز پڑھتا رہے گا اور جو پہلے وقت میں اس سے رہ گیا۔ وہ دنیا اور اس کی تمام چیزوں سے بہتر تھا۔"

اور یہ روایت مشہور ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا۔ کون سا عمل افضل ہے؟ آپ نے فرمایا: وقت پر نماز پڑھنا۔

نیز روایت میں یہ بھی آتا ہے کہ پہلا وقت اللہ تعالیٰ کا رضوان (راضی ہونا) ہے اور آخری وقت میں اللہ تعالیٰ کا عفو (معافی) ہے۔ محسنین کو رضوان الٰہی حاصل ہوتا ہے اور کوتاہی کرنے والوں کیلئے عفوِ الٰہی ہوتا ہے۔ مزید برآں ہر نماز ابتدائے وقت میں پڑھنا عزیمتِ دین ہے اور نماز کی حفاظت کرنے والوں اور اقامتِ نماز والوں کا طریقہ ہے اور آخر وقت کی نماز دراصل دین میں رخصت، اللہ تعالیٰ کی طرف سے رعایت کی صورت اور غافلین پر رحمت ہے۔

فصل ۱۱

دن رات کی نمازیں

اس فصل میں دن رات میں مختلف نمازوں کے فضائل ذکر کیے جائیں گے۔

دِن کے نوافل

حضرت ابوسلمہؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جب تو گھر سے نکلے تو دو رکعت ادا کر لے (نوافل) تجھے بُرے مخرج (باہر) سے بچائیگی۔ اور جب تو گھر میں داخل ہو تو دو رکعت ادا کر لے یہ تجھے بُرے مدخل (اندر) سے بچائے گی۔

حضرت سعید بن ابی سعید طویل نے حضرت انس بن مالک سے سُنا انھوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا۔ آپؐ نے نمازِ فجر کے بارے میں فرمایا:

جو آدمی وضو کرے پھر مسجد کی طرف جائے جس میں نماز پڑھی جاتی ہے اسے ہر قدم پر ایک نیکی ملے گی اور ایک گناہ معاف ہوگا اور ایک نیکی دس گنا ہوتی ہے۔ جب اس نے نماز پڑھی اور طلوعِ آفتاب کے وقت واپس گیا تو اسے اس کے بدن کے ہر بال کے برابر نیکیاں ملیں گی اور وُہ ایک مقبول حج کا اجر لے کر واپس ہُوا۔ اور اگر وہیں بیٹھا اور نفل پڑھے تو ہر جلسہ میں اس کے لیے دس نیکیاں ہیں اور جس نے عشاء کی نماز پڑھی تو اس کے لیے بھی اتنا ہی اجر ہے اور وہ ایک مقبول حج و عمرہ (کا اجر) لے کر واپس آیا۔

حضرت عطاءؒ بن یسار نے حضرت ابوہریرہؓ سے انھوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا۔ آپؐ نے فرمایا:

"جو زوالِ آفتاب کے بعد چار رکعتیں حُسنِ قرأت سے پڑھے اور رکوع و سجود بھی ٹھیک ٹھیک ادا کرے تو اس کے ہمراہ ستر ہزار فرشتے نمازیں پڑھیں گے جو رات تک اس کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہیں گے"۔ خود بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم زوال کے بعد بلاناغہ چار رکعت ادا فرماتے اور خُوب طویل طویل رکعتیں پڑھتے اور فرماتے کہ:

"اس وقت آسمان کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہُوں کہ اس وقت بھی میرا کوئی عمل اٹھایا جائے۔"

عرض کیا گیا اے اللہ کے رسول!

"ان میں فصل کا سلام بھی ہے؟"

آپؐ نے فرمایا:

"نہیں"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے جو عصر سے پہلے چار رکعت ادا کرے۔

دن کی مخصوص نمازوں کے فضائل

اتوار کی نمازیں

حضرت سعید بن جبیر نے بروایت حضرت ابوہریرہؓ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نقل کیا کہ

جو اتوار کے روز چار رکعت پڑھے اور ہر رکعت میں ایک بار سورۃ فاتحہ اور ایک بار آمن الرسول سے لے کر آخر تک پڑھے۔ اللہ تعالیٰ اسے ہر نصرانی مرد اور ہر نصرانی عورت کی تعداد کے برابر نیکیاں دے گا۔ اور اسے ایک نبی کا ثواب دے گا اور اس کے لیے ایک حج اور ایک عمرہ کا ثواب لکھے گا۔ اور ہر رکعت کے عوض ہزار رکعت لکھے گا اور اللہ تعالیٰ اسے جنّت میں ہر حرف کے عوض میں مسک اذفر کا ایک شہر عطا کرے گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا۔

آپؐ نے فرمایا:

یوم الاحد (اتوار کے روز) خوب نماز پڑھ کر اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ واحد، احد ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں جس نے ظہر کے فرض و سنت پڑھنے کے بعد اتوار کے روز چار رکعت ادا کرے۔ پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ اور تنزیل السجدہ پڑھے۔ دوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ اور سورۃ الملک پڑھے۔ پھر تشہد پڑھ کر سلام پھیر دے۔ اس کے بعد کھڑا ہو کر دو رکعت مزید ادا کرے اور ان دونوں رکعتوں میں سورۃ فاتحہ اور سورۃ الجمعۃ پڑھے اور اللہ تعالیٰ سے اپنی حاجت کا سوال کرے اب اللہ تعالیٰ پر اس کا حق ہے کہ وہ اس کی حاجت پوری کرے اور جس (کفر) پر نصاریٰ ہیں ان سے اُسے بری کرے۔

سوموار کی نمازیں

حضرت ابوالزبیرؓ نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو سوموار کے دن خوب دن نکل آنے کے بعد دو رکعت نماز ادا کی۔ ہر رکعت میں ایک بار

سورۃ فاتحہ، ایک بار آیت الکرسی، ایک بار قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد اور ایک ایک بار قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھے۔ پھر سلام پھیر کر دس بار استغفار پڑھے اور دس بار حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھے۔ اللہ تعالیٰ اس کے تمام گناہوں کو بخش دے گا۔

حضرت ثابت بنانی نے حضرت انسؓ ابن مالک سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو سوموار کے دن بارہ رکعتیں پڑھے۔ ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ اور آیت الکرسی ایک ایک بار پڑھے سلام پھیرنے کے بعد بارہ بار قُلْ هو اللّٰہ احد پڑھے اور بارہ بار استغفار کرے۔ قیامت کے روز اسے بلایا جائے گا کہ اے فلاں ابن فلاں آؤ۔ اللہ عزوجل سے ثواب لے لو اور سب سے پہلے اسے ایک ہزار حُلّے اور اسے تاج پہنایا جائے گا۔ اور اسے کہا جائے گا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ اور ایک لاکھ فرشتے اس کا استقبال کریں گے۔ ہر ایک کے پاس ہدیہ ہو گا جو اسے پیش کرے گا۔ آخر وہ نور کے چمکدار ایک ہزار محلات میں گھومے گا۔ (کہ جہاں چاہے رہے)

منگل کی نماز

حضرت یزید رقاشی نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت۔ کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو منگل کے روز دوپہر کے قریب دس رکعتیں پڑھے اور ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ اور آیت الکرسی ایک ایک بار اور قل ھو اللہ احد تین بار پڑھے تو ستّر روز تک اس کا کوئی گناہ نہ لکھا جائے گا (یعنی اسے گناہوں سے بچنے کی توفیق حاصل ہو جائے گی) اور اگر ان ستّر دنوں کے اندر اندر فوت ہوا تو شہید شمار ہو گا اور اس کے ستّر سال کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

بدھ کی نماز

حضرت ابو ادریس خولانیؒ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو بدھ کے روز خوب دن نکل آنے کے بعد بارہ رکعت ادا کرے۔ ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ ایک بار اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَد، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ تین تین بار پڑھے تو عرش کے پاس ایک فرشتہ آواز دیتا ہے کہ اے اللہ کے بندے! تیرے سابقہ تمام گناہ معاف کر دیے گئے اب تو نئے سرے سے عمل شروع کر دے (مزید برآں) اللہ تعالیٰ اس سے قبر کا عذاب اور اس کی ظلمت و تنگی ہٹا دے گا اور اس سے قیامت کی سختیاں دُور کر دے گا اور اس روز اس کا ایک نبی کے عمل کی طرح اُٹھے گا۔

جمعرات کی نماز

حضرت عکرمہؓ نے حضرت ابن عباسؓ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو آدمی جمعرات کے روز ظہر اور عصر کے درمیان دو رکعت نفل ادا کرے۔ پہلی رکعت میں سورۂ فاتحہ ایک بار اور آیت الکرسی ایک سو بار پڑھے اور دوسری رکعت میں سورۂ فاتحہ ایک بار اور قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ..... ایک سو بار پڑھے۔ سلام پھیرنے کے بعد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک سو بار درود شریف پڑھے تو اللہ تعالیٰ اسے اس قدر ثواب دے گا کہ جیسے کوئی رجب، شعبان اور رمضان کے روزے رکھے اور اسے خانہ کعبہ کے حج کرنے والے کی طرح ثواب ملے گا اور ہر اللہ پر ایمان لانیوالے اور اس پر توکل کرنے والے کی تعداد کے برابر اُسے (نیکیاں) ملیں گی۔

جمعہ کی نمازیں

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا:

جمعہ کا سارا دن ہی نماز ہے۔ جب جمعہ کے روز سورج نکل کر ایک نیزہ یا اس سے زیادہ بلند ہو جائے اسی وقت جو ایمان دار بندہ اٹھ کر وضو کرے اور مکمل وضو کرے پھر نمازِ ضحیٰ کی دو رکعتیں ایمان و احتساب کے ساتھ پڑھے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے دو سو نیکیاں لکھے گا اور اس کی دو سو برائیاں مٹا دے گا اور جو چار رکعت پڑھے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں چار سو درجے بلند کر دے گا اور جو آٹھ رکعت ادا کرے اللہ تعالیٰ جنت میں اس کے آٹھ سو درجے بلند کرے گا اور اس کے تمام گناہ معاف کر دے گا اور جو بارہ رکعت ادا کرے اللہ تعالیٰ اس کے لیے بارہ سو نیکیاں لکھے گا اور اس کی بارہ سو برائیاں مٹا دے گا اور جنت میں اس کے بارہ سو درجے بلند کر دے گا۔

حضرت ابو صالح نے حضرت ابوہریرہؓ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو آدمی جمعہ کے روز صبح کی نماز با جماعت ادا کرے۔ پھر مسجد میں بیٹھنا طلوعِ آفتاب تک اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے ذکر میں مشغول رہے۔

اس کے لیے جنت الفردوس الاعلیٰ میں ستّر درجے ہوں گے۔ ہر درجے میں ایک تیز رو گھوڑے کی ستر سال کی مسافت کے برابر فرق ہو گا اور جو اس روز نمازِ جمعہ با جماعت ادا کرے، اس کے لیے فردوس میں پچاس درجے ہوں گے اور ہر درجہ کے درمیان ایک تیز رو گھوڑے کے پچاس سال کے سفر کے برابر فاصلہ ہو گا۔ اور جو اس روز عصر کی نماز با جماعت ادا کرے۔

گویا اس نے بنی اسمٰعیل سے آٹھ غلام آزاد کیے۔ ان میں سے ہر ایک صاحب مبینہ ہے اور جو نمازِ مغرب باجماعت ادا کرے تو گویا اس نے ایک مقبول حج وعمرہ ادا کیا۔

حضرت نافعؒ نے حضرت ابن عمرؓ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو آدمی جمعہ کے روز مسجد میں جائے اور نمازِ جمعہ سے پہلے چار رکعت ادا کرے۔ ہر رکعت میں ایک بار سورۃ فاتحہ اور پچاس بار قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ پڑھے تو وہ مرنے سے پہلے جنت میں اپنا مقام دیکھ لے گا۔ یا اسے دکھا دیا جائے گا۔

ہفتہ کی نماز

حضرت سعید نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو آدمی ہفتے کے روز چار رکعت ادا کرے اور ہر رکعت میں ایک بار سورۃ فاتحہ اور تین بار قُلْ یٰاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ پڑھے۔ پھر سلام پھیر کر آیۃ الکرسی ایک بار پڑھے۔ اللہ تعالیٰ ہر حرف کے عوض اس کے لیے ایک حج اور ایک عمرہ لکھے گا اور ہر حرف کے بدلے میں اس قدر لکھے گا کہ ایک برس دن کو روزے رکھے ہوں اور رات کو قیام کیا ہو۔ اللہ تعالیٰ اسے ہر حرف کے عوض میں ایک شہید کا ثواب دے گا اور وہ (قیامت کے روز) انبیاء علیہم السلام اور شہداء کے ہمراہ اللہ کے عرش کے سایہ میں ہو گا۔

نماز باجماعت کی فضیلت

ابو کاہلؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے انھوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ

جو چالیس روز تک تمام نمازیں اس طرح باجماعت ادا کرے کہ اس کی امام کے ساتھ تکبیر اولیٰ فوت نہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے دو براءتیں لکھے گا۔

۱۔ آگ سے براءت (آزادی)

۲۔ نفاق سے براءت (آزادی)

رات کی نمازوں کے فضائل

اس فصل میں رات کی نمازوں کے فضائل ذکر کیے جائیں گے (یاد رہے کہ شبِ اتوار سے مراد ہفتہ اور اتوار کی درمیانی رات ہے اور شبِ سوموار سے مراد اتوار اور سوموار کی درمیانی رات ہے۔ اسی پر باقی ایام کو قیاس کر لیا جائے۔)

شبِ اتوار کی نمازیں

مختار بن فلفل نے حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کیا کہ میں نے

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں فرماتے سنا:

جو آدمی اتوار کی رات کو بیس رکعات نفل پڑھے اور ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ ایک بار اور سورۃ اخلاص یعنی قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ پچاس بار پڑھے اور ایک ایک بار قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھے۔ پھر ایک سو بار استغفار کرے۔ اور ایک سو بار یوں پڑھے؛

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ۔ (اے اللہ مجھے اور میرے والدین کو بخش دے)

پھر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک سو بار درود شریف پڑھے۔ پھر لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ کہے اور پھر یہ دعا کرے۔

اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَشْھَدُ اَنَّ اٰدَمَ صِفْوَۃُ اللّٰہِ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی وَ فِطْرَتُہٗ وَ اِبْرَاھِیْمَ خَلِیْلُ اللّٰہِ وَ مُوْسٰی کَلِیْمُ اللّٰہِ وَعِیْسٰی رُوْحُ اللّٰہِ وَ مُحَمَّدً صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ حَبِیْبُ اللّٰہِ تَبَارَکَ وَ تَعَالٰی۔

میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں حضرت آدم اللہ تبارک وتعالیٰ کے صفی وفطرت ہیں اور ابراہیم اللہ کے خلیل اور حضرت موسیٰ اللہ کے کلیم اور حضرت عیسیٰ، اللہ کے روح اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تبارک وتعالیٰ کے حبیب ہیں۔

تو اس کے لیے اس قدر ثواب ہے جس قدر اللہ کے پکارنے والے اور اللہ کو نہ پکارنے والوں کی گنتی ہے اور اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے روز مامون لوگوں کے ہمراہ اٹھائے گا اور قیامت کے روز اللہ پر حق ہے کہ وہ اسے انبیاء علیہم السلام کے ساتھ جنت میں داخل کرے۔

شبِ پیر کی نماز

(۱) حضرت اعمش رح نے حضرت انس رضؓ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو آدمی سوموار کی رات کو چار رکعت نماز ادا کرے۔ پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ ایک بار اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ دس بار پڑھے۔ دوسری رکعت میں سورۃ فاتحہ ایک بار اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ بیس بار، تیسری رکعت میں سورۃ فاتحہ ایک بار اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ تیس بار اور چوتھی رکعت میں سورۃ فاتحہ ایک بار اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ چالیس بار پڑھے۔ پھر تشہد پڑھ کر سلام پھیر دے اور اس کے بعد ۷۵ بار قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ پڑھے۔ پھر ۷۵ بار اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ پڑھے۔ پھر ۷۵ بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھے۔ پھر اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے اپنی حاجت مانگے تو اللہ عزّ وجل پر حق ہے کہ وہ جو مانگے اسے عطا فرمائے۔ اس نماز کا نام نمازِ حاجت ہے۔

(۲) قاسم بن عبدالرحمٰن نے حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو آدمی سوموار کی رات کو دو رکعت نماز ادا کرے۔ ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ پڑھ کر پندرہ پندرہ بار حسب ذیل سورتیں پڑھے،

(ا) قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ

(ب) قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ

(ج) قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ۔

پھر سلام پھیر کر پندرہ بار آیت الکرسی پڑھے۔ پھر پندرہ بار استغفار کرے تو اللہ تعالیٰ اس کا نام اہل جنت (کی فہرست) میں لکھ دے گا چاہے وہ دوزخیوں میں سے ہو اور اس کے تمام پوشیدہ و علانیہ گناہ معاف کر دے گا اور ہر آیت کے عوض جو اس نے پڑھی۔ ایک حج اور ایک عمرہ کا ثواب لکھے گا۔ اور اگر اس سوموار سے آئندہ سوموار کے درمیان فوت ہو گیا تو شہادت کی موت ہو گی۔

شبِ منگل کی نماز

روایت میں ہے کہ جو منگل کی رات کو بارہ رکعت نماز پڑھے اور ہر رکعت میں ایک بار سورۃ فاتحہ اور پندرہ بار اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ایسا مکان بنا دے گا جس کی لمبائی چوڑائی سات بار کی دنیا کے برابر ہو۔

شبِ بدھ کی نماز

روایت میں ہے کہ جو آدمی بدھ کی رات کو دو رکعت نماز ادا کرے۔ پہلی رکعت میں ایک بار سورۃ فاتحہ اور دس بار قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ پڑھے اور دوسری رکعت میں ایک بار سورۃ فاتحہ اور دس بار قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھے تو ہر آسمان سے ستر ہزار فرشتے نازل ہوں گے جو کہ قیامت تک اس کا ثواب لکھتے رہیں گے۔

شبِ جمعرات کی نماز

حضرت ابو صالح رحؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو آدمی جمعرات کی رات کو مغرب و عشائ کے درمیان دو رکعت ادا کرے اور ہر رکعت میں ایک بار سورۃ فاتحہ اور آیۃ الکرسی پانچ بار اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ پانچ بار، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ

پانچ بار اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پانچ بار پڑھے۔ جب نماز سے فارغ ہو جائے تو پندرہ بار استغفار کرے اور اس کا ثواب والدین کو بخش دے تو اس نے ان دونوں کا حق ادا کر دیا۔ چاہے وہ نافرمان ہو اور اللہ تعالیٰ اسے صدیقین و شہدا کے انعامات عطا فرمائے گا۔

شبِ جمعہ کی نمازیں

(۱) ابو جعفر محمد بن علیؒ حضرت جابرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو آدمی جمعہ کی رات کو مغرب و عشا کے درمیان بارہ رکعت، نماز پڑھے۔ ہر رکعت میں ایک بار سورۃ فاتحہ اور دس بار قُلْ ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ پڑھے۔ گویا اس نے بارہ برس تک دن کو روزہ رکھ کر اور رات کو قیام کر کے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی۔

(۲) کثیر بن سلیم نے حضرت انس بن مالکؓ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو آدمی جمعہ کی رات کو عشا کی نماز باجماعت ادا کرے۔ پھر دو رکعت سنت ادا کر کے دس رکعات نوافل پڑھے اور نوافل میں ہر رکعت میں ایک بار سورۃ فاتحہ، ایک بار قل ھو اللہ احد، ایک بار قل اعوذ برب الفلق اور ایکبار قل اعوذ برب الناس پڑھے۔ پھر تین رکعات وتر ادا کرے اور دائیں جانب قبلہ رُخ ہو کر سو جائے۔ گویا اس نے شبِ قدر میں شب بیداری کی۔

(۳) حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

شبِ غرّا اور روزِ ازہر کو مجھ پر کثرت سے درود شریف بھیجو۔ یعنی جمعہ کی رات اور جمعہ کے دن میں درود شریف کی کثرت کرو۔

شبِ ہفتہ کی نماز

حضرت کثیر شنظیر نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا:

جو آدمی ہفتے کی رات کو مغرب و عشا کے درمیان بارہ رکعات نوافل ادا کرے۔ اللہ تعالےٰ اس کے لیے جنت میں ایک محل بنا دے گا اور گویا اس نے ہر مومن مرد اور مومنہ عورت پہ صدقہ کیا اور وہ یہودیت سے بری ہو گیا اور اللہ عزوجل پر حق ہے کہ اسے بخش دے۔

مغرب و عشا کی درمیانی نماز کے فضائل

اس باب میں مغرب و عشا کے درمیان کی نماز کے فضائل کا ذکر ہو گا۔

حضرت سلیمان تیمیؒ نے ایک آدمی سے نقل کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے آزاد کردہ

غلام سے پُوچھا گیا کہ مغرب و عشائ کے درمیان حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کیا کرتے تھے، جب آپؐ گھر تشریف لے جاتے۔ اُنھوں نے بتایا کہ آپؐ نماز پڑھا کرتے۔

(۲) حضرت ثابت بنانیؒ نے بتایا کہ حضرت انسؓ بن مالک مغرب و عشائ کے درمیان نماز پڑھتے تھے اور فرماتے کہ یہ نماز ناشئۃ اللیل ہے۔

(۳) حضرت فضل بن عیاض نے حضرت ابان بن ابی عیاش سے روایت کیا کہ
میں نے حضرت انسؓ بن مالک کی زوجہ محترمہؓ سے پُوچھا تو انھوں نے بتایا کہ میں عشا کی نماز سے پہلے سو جاتی تھی تو انھوں نے مجھے اس سے منع فرمایا۔ اور یہ آیت اس کے بارے میں نازل ہُوئی۔
تَتَجَافٰى جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ[1]۔ (ان کے پہلو بستروں سے جُدا رہتے ہیں)

(۴) حضرت احمد بن ابی حواری نے بتایا کہ
میں نے ابو سلیمان دارانیؒ سے کہا کہ میں دن کو روزہ رکھوں اور مغرب و عشائ کے درمیان بیٹھ رہوں۔ آپؒ کے نزدیک یہ بہتر ہے یا یہ بہتر ہے کہ دن کو افطار کروں اور مغرب و عشائ کے درمیان نماز پڑھوں۔ انھوں نے فرمایا: اگر دونوں کام کرے (یعنی دن کو روزہ رکھے اور مغرب و عشائ کے درمیان نماز پڑھے) تو افضل ہے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو دن کو افطار کر لے اور مغرب و عشائ کے درمیان نماز پڑھے۔

(۵) ہشام بن عروۃ نے اپنے والد بزرگوار سے انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
اللہ عزّ وجل کے نزدیک نمازِ مغرب تمام نمازوں سے افضل ہے۔ مسافر پر سے اس میں کمی نہیں فرمائی اور نہ مقیم پر کمی فرمائی۔ اس نماز سے رات کی نماز کا افتتاح فرمایا اور اس پر دن کی نماز کا اختتام فرمایا۔ جو آدمی نمازِ مغرب پڑھ کر دو رکعت ادا کرے۔ اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں ایک محل بنا دے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ وُہ سونے کا محل ہوگا یا چاندی کا۔ اور جو آدمی نمازِ مغرب کے بعد چار رکعت ادا کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے بیس برس کے گناہ معاف کر دے گا یا فرمایا چالیس برس کے گناہ معاف کر دے گا۔

(۶) حضرت ابو سلمۃ نے حضرت ابو ہریرۃؓ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] سورۃ السجدہ آیت ۱۶۔

فرمایا:

جو آدمی مغرب کے بعد چھ رکعت پڑھے اسے ایک سال کی عبادت کا اجر ملے گا یا گویا اس نے شبِ قدر کو شب بیداری کی۔

(۷) حضرت سعید بن جبیرؒ نے حضرت ثوبانؓ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو آدمی مغرب و عشاء کے درمیان ایسی مسجد میں اعتکاف کرے جہاں جماعت ہوتی ہو اور اس وقت نماز پڑھنے یا قرآن کی تلاوت کے سوا کچھ نہ کرے تو اللہ پر حق ہے کہ وہ اس کے لیے جنت میں ایسے دو محل بنا دے کہ ہر محل کی (لمبائی چوڑائی) ایک سو برس کی ہو اور ان دونوں میں اس قدر (پودے وغیرہ) اگائے کہ ساری دنیا والے ہی اسے (بمشکل) دیکھ سکیں۔ (یا اس کے برابر ہوں)

(۸) محمد بن حجاج نے عبدالکریم بن حرث کو بیان کرتے سُنا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو آدمی مغرب و عشاء کے درمیان دس رکعات پڑھے۔ اس کے لیے جنت میں ایک گھر بنا دیا جائے گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! پھر تو ہمارے لیے محلات بہت ہو جائیں گے۔ آپؐ نے فرمایا: اللہ سب سے بڑا اور افضل ہے یا فرمایا: اطیب ہے (یعنی خوب دینے والا ہے)

(۹) ابو عائشہ سعدی اور ابو حفص عوفی نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

جو آدمی نمازِ مغرب با جماعت ادا کرے۔ پھر اس کے بعد دو رکعتیں پڑھے اور اس وقت تک دنیا کی کسی قسم کی بات نہ کرے اور پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ ایک بار اور سورۃ البقرۃ کی پہلی دس آیات اور درمیان کی دو آیات یعنی وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ سے لے کر دو آیات تک۔ اور پندرہ بار قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھے۔ پھر رکوع و سجدہ کرے اور جب دوسری رکعت میں کھڑا ہو تو سورۃ فاتحہ اور آیت الکرسی پڑھے اور آیت الکرسی کے بعد کی دو آیات اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ تک پڑھے اور سورۃ البقرۃ کی آخری تین آیات لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ سے لے کر آخر تک اور پندرہ بار قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جناتِ عدن میں موتی اور یاقوت کے ایک ہزار شہر تعمیر کر دے گا۔ ہر شہر میں ایک ہزار محل ہو گا اور ہر محل

میں ایک ہزار گھر ہوگا اور ہر گھر میں ایک ہزار کمرہ ہوگا اور ہر کمرے میں ایک ہزار صُفّہ ہوگا اور ہر صُفّہ میں ایک ہزار خیمہ ہوگا اور ہر خیمہ میں طرح طرح کے جواہرات کی ایک ہزار چار پائیاں ہوں گی اور ہر چارپائی پر ایک ہزار بستر ہوگا۔ ان کا باطن استبرق کا اور ان کا ظاہر نور کا ہوگا۔ اس چارپائی کے اس طرف ایک ہزار تکیے ہوں گے اور دوسری طرف بھی ایک ہزار تکیے ہوں گے۔ اور اس بستر پر ایک حُورِعین ہوگی جس کا وصف ناممکن ہوگا۔ اس کے حسن وجمال میں اضافہ ہوتا رہے اسے کوئی مقرب اور نبی مرسل بھی دیکھے۔ تو اس کے حسن پر فریفتہ ہوجائے۔ اس کے سرین ساری چارپائی پر نظر آئیں گے۔ ہر بیوی پر ایک ہزار لباس ہوگا۔ کوئی لباس دُوسرے لباس پر پردہ نہ بنے گا اور یہ تمام لباس بدن کو بھی نہ چھپائیں گے بلکہ سلک سے یاقوت نظر آتا ہے، اس طرح بدن نظر آئے گا اور جس طرح سفید شیشے سے سُرخ شراب نظر آتا ہے۔ ایسے ہی بدن صاف دکھائی دے گا۔ ہر بیوی کے ایک لاکھ خادم اور ایک لاکھ لونڈیاں اور ایک لاکھ دربان ہوں گے جو ان کے محلات وسامان وغیرہ پر ہوں گے۔ یہ صرف بیوی کے خدام وغیرہ ہوں گے اور خاوند کے خدام ان کے علاوہ ہوں گے۔ اور ان کے ہر خیمہ میں تسنیم کی ایک نہر اور کوثر کی ایک نہر اور کافور کا ایک چشمہ، زنجبیل (سونٹھ) کا ایک چشمہ، سلسبیل کا ایک چشمہ، طوبیٰ کے پیڑ کی ایک شاخ اور سدرۃ المنتہیٰ کی ایک شاخ ہوگی۔ ہر خیمہ میں یاقوت اور موتی کا ایک ہزار دسترخوان ہوگا اور چھوٹے سے چھوٹا دسترخوان بھی دوبار کی دُنیا کے برابر ہوگا۔ ہر دسترخوان پر ایک ہزار سونے کی اور جواہرات سے مرصّع پلیٹیں ہوں گی۔ ہر پلیٹ میں ایک ہزار مختلف ذائقوں، رنگوں اور خوشبوؤں والے کھانے ہوں گے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ اپنے محب مومنین کو اس قدر قوت دے گا کہ وہ ان تمام کھانے پینے کی اشیاء کو کھا کر ہضم کر جائے اور ان تمام بیویوں سے دنیا کے دن دن کے برابر مقاربت کرسکے۔ اللہ عطا کرنے والا ہر چیز پر قادر پاک ہے۔ جو چاہے کرے سب جہانوں کا رب ہے۔

(۱۰) عبدالرحمٰن بن منصور نے حضرت سعد بن سعید سے انھوں نے حضرت کرز بن وبرۃ سے نقل کیا حضرت وبرۃ ابدال میں سے تھے کہ

میں نے حضرت خضر علیہ السلام سے عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسا عمل بتائیے کہ رات کو کیا کروں!

انھوں نے فرمایا:

جب تم مغرب کی نماز پڑھ لو تو عشاء کی نماز پڑھ کر کوئی کلام کیے بغیر اٹھو تو دو رکعت نماز اس طرح پڑھو کہ پہلی رکعت میں سورۃ فاتحہ ایک بار اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ سات بار پڑھو۔ اس کے بعد کسی سے

بات کیے بغیر گھر واپس چلے جاؤ اور دو رکعت گھر میں ادا کرو اور ہر رکعت میں ایک بار سورۃ فاتحہ اور سات بار قل ھُوَ اللہُ اَحَدٌ پڑھو۔ پھر سلام پھیر کر سجدہ کرو اور سات بار استغفار کرو۔ پھر سات بار حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھو اور سات بار یہ کلمات کہو۔

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ وَلَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَرُ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ۔

(اللہ پاک ہے اور ساری حمد اللہ کے لیے ہے اور اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ بزرگ و برتر کے سوا نہ کہیں مڑ سے اور نہ ہی کسی کا ڈر ہے)

پھر سجدہ سے سر اٹھائے اور سیدھا بیٹھ کر دونوں ہاتھ (دعا کی طرح) بلند کرے اور یوں دعا کرے:

یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ یَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِکْرَامِ یَا اِلٰہَ الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ یَا رَحْمٰنَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَرَحِیْمَھُمَا یَا رَبِّ یَا رَبِّ یَا رَبِّ یَا اَللّٰہُ یَا اَللّٰہُ یَا اَللّٰہُ۔

(اے زندہ، اے ہر چیز کو قائم رکھنے والے، اے صاحب جلال و اکرام، اے اوّلین و آخرین کے معبود۔ اے دنیا و آخرت پر رحم کرنے والے اور ان پر مہربان۔ اے پروردگار اے اللہ، اے اللہ، اے اللہ)

پھر اسی طرح ہاتھ اٹھائے اٹھائے کھڑا ہو کر یہ دعا کرے:

پھر جہاں چاہے قبلہ رُخ ہو کر دائیں پہلو پر سو جائے اور سو جانے تک حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھتا رہے۔

میں نے عرض کیا:

آپ مجھے یہ تو بتا دیں کہ آپ نے یہ دعا کس سے سُنی تھی؟

انھوں نے جواب دیا:

میں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جبکہ آپؐ کو یہ دعا دی گئی اور سکھائی گئی۔ میں اس وقت آپ کے پاس حاضر تھا۔ یہ سب میری موجودگی میں ہوا جس سے آپؐ نے سیکھی میں نے بھی اسی سے سیکھی اور جو آدمی بھی حسن نیت اور یقین کے ساتھ اس نماز و دعا پر مداومت کرے گا وہ دنیا سے جانے سے پہلے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ضرور کرے گا۔ بعض لوگوں نے یہ ورد کیا تو انھوں نے دیکھا کہ وہ جنت میں داخل ہوئے اور جنت میں انبیاء علیہم السلام کی زیارت کی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بھی کی اور آپؐ سے ہم کلام ہوئے اور تعلیم حاصل کی۔ اس کے فضائل بہت زیادہ ہیں مگر ہم نے اختصار کی وجہ سے اسی قدر پر اکتفا کیا۔

فصل ۱۲

وتر اور نمازِ تہجّد

حضرت مبارک بن عوف احمسی نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ اکیاسں وہ ہیں جو کہ رات کے شروع میں وتر ادا کرتے ہیں اور اقویاء لوگ رات کے آخری حصّہ میں وتر ادا کرتے ہیں اور یہی افضل ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ تم کس وقت وتر ادا کرتے ہو؟

انھوں نے عرض کیا کہ سونے سے پہلے رات کے شروع کے حصّہ میں۔

پھر آپؐ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے دریافت فرمایا کہ تم کس وقت ادا کرتے ہو؟

تو آپ رضؓ نے فرمایا: رات کے آخری حصہ میں۔

آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو فرمایا: یہ تمھاری احتیاط ہے اور حضرت عمرؓ کے بارے میں فرمایا: یہ قوی ہے اور بعض احادیث میں آتا ہے کہ آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ سے فرمایا: تیری مثال اس شخص کی طرح ہے جو کہے کہ میں نے اپنا سامان جمع کیا اور زاید کا طلب گار ہے اور حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ تُو توانا و قوی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انھوں نے فرمایا کہ میں تو شروع رات میں وتر پڑھ لیتا ہوں، اور اگر رات کو بیدار ہو جاؤں تو ایک رکعت ادا کر کے ساتھ ملا لیتا ہوں۔ میں اس کی مثال یوں دیا کرتا ہوں کہ جیسے بچھڑے ہوئے اونٹوں سے اُن کے دوسرے بھائیوں کو ملاؤں۔ پھر میں نماز کے آخر میں وتر پڑھتا ہوں۔ اور ان کا مشہور فعل یہ ہے کہ وہ ایک ایک رکعت میں ساری رات گزار دیتے اور اس میں قرآن مجید ختم کر ڈالتے۔ اور یہی ان کا وتر ہوتا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ فرمایا کہ

وتر کی تین قسمیں ہیں:۔

۱۔ اگر چاہو تو شروع رات میں وتر پڑھ لو پھر اس کے بعد دو نفل پڑھتے رہو۔

۲۔ اور اگر چاہو تو ایک رکعت وتر پڑھو اور جب بیدار ہو جاؤ تو ایک رکعت ملا کر شفع بنا لو۔ پھر نوافل پڑھتے پڑھتے آخر شب میں وتر پڑھو۔

۳۔ اور اگر چاہو تو رات کے آخری حصہ میں نوافل پڑھ کر وتر ادا کرو۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ رات کی نماز دو دو رکعت ہے۔ جب تجھے صبح ہونے کا ڈر ہو تو ایک رکعت ملا کر وتر ادا کر لے۔ میرے نزدیک یہ بہترین توجیہ ہے۔

مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

جو آدمی عشاء کے بعد چار رکعت ادا کرے اسے شب قدر میں (چار رکعت) ادا کرنے کے برابر اجر ملے گا۔

حضرت حصین فرماتے ہیں کہ

میں نے حضرت ابراہیمؒ کے سامنے اس کا ذکر کیا تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ ہر نماز کے بعد اس طرح (چار رکعتیں) پڑھنے کا التزام کرنا مکروہ ہے۔ سلف صالحین عشاء کی نماز پڑھ کر دو رکعت ادا کرتے۔ پھر چار رکعت پڑھتے۔ اب جو چاہے وتر پڑھ لے اور جو سونا چاہے وہ سو جائے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اے اہل قرآن! ہر رات کو وتر پڑھو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (رات) کی ابتداء، وسطی حصہ میں اور سحر تک وتر ادا فرمائے۔ حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (فجر کی) اذان کے وقت وتر ادا کرتے اور اقامت کے وقت دو رکعتیں ادا کرتے۔

ایک آدمی نے حضرت علیؓ سے وتروں کے وقت کے بارے میں دریافت کیا تو آپ خاموش رہے۔ پھر نماز فجر کے لیے اذان کے وقت باہر آئے اور فرمایا:

وتروں کے متعلق معلوم کرنے والا کہاں ہے؟ یہ وتروں کا بہتر وقت ہے۔

حضرت ابو امامہؓ نے عمروؓ بن عبسہ سے روایت کیا کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یوں فرماتے سُنا:

رات کے آخری حصہ میں اللہ عزوجل بندے کے قریب ترین ہوتا ہے۔ اگر تو اس گھڑی میں اللہ کی یاد کرنے والوں میں سے ہو سکے۔ تو ہو جا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ میں نے کہا:

اے اللہ کے رسول! رات کے کس حصہ میں نماز پڑھنا افضل ہے؟

آپؐ نے فرمایا: رات کے آخری نصف حصہ میں (نماز پڑھنا افضل ہے)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ رات کے کس

حصہ میں (بندہ کی پکار) زیادہ سنی جاتی ہے؟

انھوں نے جواب دیا کہ سحری کے وقت عرش ہلنے لگتا ہے اور حدیث میں آتا ہے کہ رات میں ایک ایسی بھی گھڑی آتی ہے کہ ایک مسلمان بندہ اس وقت اللہ تعالیٰ سے جو بھلائی مانگے اسے عطا کی جاتی ہے۔

دوسری حدیث میں ہے کہ نماز پڑھ رہا ہو یا دعا کر رہا ہو۔ اس کی (نماز و دعا) قبول کی جاتی ہے اور یہ گھڑی ہر شب میں آتی ہے اور کہتے ہیں۔ رات میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ اللہ کے سوا ہر ایک اس وقت لازمی طور پر سو جاتا ہے یا غنودگی میں چلا جاتا ہے۔ شاید یہی وہ ساعت ہو۔
حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ یہ نصف رات گزرتے ہی گھڑی آتی ہے۔ دوسری روایت میں ہے کہ جب رات کا آخری تیسرا حصہ باقی رہ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ آسمانِ دنیا پر نزول فرماتا ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ میرے بندوں سے میرے سوا کوئی پرسش نہیں کرے گا۔ ہے کوئی توبہ کرنیوالا کہ میں اس کی توبہ قبول کروں؟ ہے کوئی بخشش مانگنے والا کہ میں اسے بخش دوں؟ ہے کوئی دعا کرنے والا کہ میں اس کی دعا قبول کروں! ہے کوئی مانگنے والا کہ میں اسے عطا کروں؟ طلوع فجر اسی طرح (اللہ تعالیٰ آواز) دیتا ہے۔ حضرت عمروؓ بن عنبسہ کی حدیث میں ہے کہ تم پر رات کے آخری حصہ میں نماز پڑھنا لازم ہے۔ یہی نماز مشہودہ محضورہ ہے۔ یعنی اس نماز میں رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔

فصل ۱۴۳

مختلف اوقات کی مخصوص دعائیں

اس باب میں مختلف اوقات کی مخصوص دعاؤں کا ذکر کیا جائے گا۔

بیداری کی دعا نماز تہجد کے لیے اٹھے یا صبح کو نیند سے بیدار ہو تو یہ دعا پڑھے:

أَصْبَحْنَا وَ أَصْبَحَ الْمُلْكُ لِلّٰهِ وَالْعَظَمَةُ لِلّٰهِ
وَالسُّلْطَانُ لِلّٰهِ وَالْبَهَاءُ لِلّٰهِ وَالْقُدْرَةُ
لِلّٰهِ وَالْعِزَّةُ لِلّٰهِ وَالتَّسْبِيحُ لِلّٰهِ أَصْبَحْنَا عَلٰى
فِطْرَةِ الْإِسْلَامِ وَكَلِمَةِ الْإِخْلَاصِ وَعَلٰى
دِيْنِ نَبِيِّنَا مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ
وَ عَلٰى مِلَّةِ أَبِيْنَا إِبْرَاهِيْمَ
حَنِيْفًا وَ مَا كَانَ مِنَ
الْمُشْرِكِيْنَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ
الَّذِيْ أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَ
إِلَيْهِ النُّشُوْرُ اَللّٰهُمَّ إِنَّا نَسْأَلُكَ
أَنْ تَبْعَثَنَا فِيْ يَوْمِنَا هٰذَا
إِلٰى كُلِّ خَيْرٍ وَ نَعُوْذُ بِكَ أَنْ
نَجْتَرِحَ فِيْهِ سُوْءًا أَوْ نَجُرَّهُ إِلٰى مُسْلِمٍ
فَإِنَّكَ قُلْتَ وَ هُوَ الَّذِيْ
يَتَوَفّٰكُمْ بِاللَّيْلِ وَ يَعْلَمُ مَا
جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ
لِيُقْضٰى أَجَلٌ مُّسَمًّى اَللّٰهُمَّ فَالِقَ
الْإِصْبَاحِ وَجَاعِلَ اللَّيْلِ سَكَنًا
وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا أَسْأَلُكَ
خَيْرَ هٰذَا الْيَوْمِ وَ خَيْرَ

ہم نے صبح کی اور تمام ملک نے اللہ کے لیے صبح کی
اور ساری عظمت اللہ کے لیے ہے اور حکمرانی اللہ کیلیے
ہے اور رونق اللہ کے لیے ہے اور ساری قدرت
اللہ کے لیے اور ساری عزت اللہ کے لیے اور ساری
تسبیح اللہ کے لیے ہے۔ ہم نے فطرت اسلام اور کلمۂ
اخلاص پر صبح کی اور اپنے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کے دین پر اور حضرت ابراہیم حنیف علیہ السلام کی
ملت پر صبح کی۔ وہ مشرکین میں سے نہیں تھے۔ سب حمد اللہ
کے لیے ہے جس نے ہمیں مارنے کے بعد زندہ کیا اور
اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ اے اللہ! ہم تجھ سے
سوال کرتے ہیں کہ ہمارے اس (بعثت کے) دن
ہر بھلائی کی طرف ہمیں اٹھا اور ہم اس بات سے تیری پناہ
مانگتے ہیں کہ اس میں کوئی برائی چکھیں یا کسی مسلمان کی طرف
اسے لے جائیں۔ بے شک تو نے ہی فرمایا اور وہ ذات
ہے کہ جو تمہیں رات کو وفات دیتی ہے اور جانتی ہے جو
تم نے دن کو کیا، پھر تمہیں اس میں زندہ کرتی ہے تاکہ
مقررہ میعاد (زندگی) پوری ہو جائے۔ اے اللہ!
صبح نکالنے والے اور رات کو سکون بنانے والے،
اور سورج اور چاند کو حساب کا (ذریعہ) بنانے والے،
میں تجھ سے اس دن کی بھلائی اور اس کے اندر کی

مَا فِيْهِ وَ اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهٖ وَ مِنْ
شَرِّ مَا فِيْهِ بِسْمِ اللهِ مَا شَآءَ اللهُ
لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللهِ مَا شَآءَ اللهُ
كُلُّ نِعْمَةٍ مِّنَ اللهِ مَا شَآءَ اللهُ اَلْخَيْرُ
كُلُّهٗ بِيَدِ اللهِ بِسْمِ اللهِ لَا يَصْرِفُ
السُّوْٓءَ اِلَّا اللهُ رَضِيْتُ بِاللهِ عَزَّ وَ جَلَّ
رَبًّا وَّ بِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ
نَبِيًّا ۔ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا
وَ اِلَيْكَ اَنَبْنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۔

بھلائی مانگتا ہوں اور میں تجھ سے اس کی برائی اور اس کے
اندر کی برائی سے پناہ مانگتا ہوں۔ اللہ کے نام سے جو
اللہ چاہے۔ اللہ کے بغیر کوئی قوت نہیں جو اللہ چاہے
ہر نعمت اللہ کی جانب سے ہے، جو اللہ چاہے۔ تمام
بھلائی اللہ کے قبضہ میں ہے اللہ کے نام سے۔ اللہ کے
بغیر کوئی دکھ کو نہیں ہٹا سکتا۔ میں اللہ عز و جل کے رب
ہونے پر راضی ہوا اور اسلام کے دین ہونے اور
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر راضی ہوا۔
اے ہمارے رب ہم نے تجھ پر توکل کیا اور تیری طرف
رجوع کیا اور تیری طرف لوٹ کر جانا ہے۔

شام کی دعائیں

اس کے بعد ایک ایک بار قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس پڑھے۔ اور جب شام ہو تو مذکورہ بالا دعا اس طرح پڑھے۔ اصبحنا اصبح الملک کی بجائے اَمْسَيْنَا وَ اَمْسَى الْمُلْكُ لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ پڑھے اور اسالك خیر هذا الیوم کی بجائے یوں پڑھے۔ اَسْئَلُكَ خَيْرَ هٰذِهِ اللَّيْلَةِ اور ہر شام کو یہ دعا بھی ضرور پڑھے۔

بِسْمِ اللهِ الَّذِيْ لَا يَضُرُّ مَعَ اسْمِهٖ شَيْءٌ فِي
الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ
اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللهِ التَّآمَّاتِ وَ اَسْمَآئِهٖ
كُلِّهَا مِنْ شَرِّ مَا ذَرَاَ وَ مِنْ شَرِّ كُلِّ
دَآبَّةٍ اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا
اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔

اللہ کے نام سے جو کہ اس کے نام کے ساتھ زمین میں اور
آسمان میں کوئی چیز بھی ضرر نہیں دے سکتی اور وہ سننے والا
جاننے والا ہے۔ میں اللہ کے کل ناموں کے واسطہ سے
اور اس کے تمام ناموں کے واسطہ سے ہر اس چیز کی
برائی سے پناہ مانگتا ہوں۔ اور ہر مضر چیز کے ضرر سے
اور ہر چوپائے کے ضرر سے کہ تو اس کی پیشانی اپنے قبضہ
میں رکھے ہے۔ بے شک میرا پروردگار سیدھی راہ پر ہے۔

اگر مذکورہ دعا سحری کے وقت بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت پڑھے تو زیادہ افضل ہے تاکہ ذکر سے غفلت نہ آنے پائے۔ یہ دعا دن کے آخری حصہ میں یا رات کے شروع میں پڑھے۔ اکثر صالحین کا یہی عمل مروی ہے۔ البتہ صبح کے وقت بیت الخلاء میں جانا طب کے لحاظ سے صحت کیلئے بہت مفید ہے۔ خصوصاً دن کو کھانا کھائے تو صبح بیت الخلاء میں جانا بہتر ہے۔

سوتے وقت کی دعائیں

جب سونے کے لیے بستر پر لیٹے تو یہ دعا کرے:

بِاسْمِكَ رَبِّيْ وَضَعْتُ جَنْبِيْ وَبِاسْمِكَ اَرْفَعُهٗ، اَللّٰهُمَّ اِنْ اَمْسَكْتَ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لَهَا وَارْحَمْهَا وَاِنْ اَرْسَلْتَهَا فَاعْصِمْهَا وَاحْفَظْهَا بِمَا تَحْفَظُ بِهٖ عِبَادَكَ الصَّالِحِيْنَ۔

(اے میرے پروردگار! تیرے نام سے میں نے اپنا پہلو رکھا اور تیرے نام سے اٹھاتا ہوں۔ اے اللہ! اگر تو میری جان لے لے تو اس کو بخش دے اور اس پر رحم فرما اور اگر تو اسے چھوڑ دے تو اسے بچا اور اسکی اس طرح حفاظت فرما کہ جس سے تو اپنے نیک بندوں کی حفاظت فرماتا ہے)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ کو یہ دعا سکھائی کہ جب بستر پر جاؤ تو اسے پڑھ لو۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيْ اِلَيْكَ وَفَوَّضْتُ اَمْرِيْ اِلَيْكَ وَاَلْجَاْتُ ظَهْرِيْ اِلَيْكَ رَهْبَةً وَّرَغْبَةً اِلَيْكَ لَا مَلْجَاءَ مِنْكَ اِلَّا اِلَيْكَ اٰمَنْتُ بِكِتَابِكَ الَّذِيْ اَنْزَلْتَ وَبِرَسُوْلِكَ الَّذِيْ اَرْسَلْتَ۔

اے اللہ میں نے اپنا چہرہ تیری طرف متوجہ کیا اور میں نے اپنا معاملہ تیرے سپرد کیا اور میں نے ڈر کر اور امید رکھ کر تیری طرف۔ تیرے بغیر نہ پناہ گاہ ہے اور نہ ہی جائے نجات ہے۔ میں تیری کتاب پر ایمان لایا جو تو نے نازل فرمائی اور ہر رسول پر جو تم نے بھیجا۔

جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ سوتے وقت یہ دعا پڑھتے۔

اَللّٰهُمَّ قِنِيْ عَذَابَكَ يَوْمَ تَبْعَثُ عِبَادَكَ۔

اے اللہ! جس روز تو اپنے بندوں کو اٹھائے گا مجھے اپنے عذاب سے بچا۔

نیز آپ نے یہ دعا پڑھنے کا حکم بھی فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ عَلَا فَقَهَرَ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ بَطَنَ فَخَبَرَ۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

سب حمد اللہ کے لیے ہے جو بلند ہوا سو غالب ہوا۔ سب حمد اللہ کے لیے جو باطن ہوا، پھر جابر ہوا۔ سب حمد اللہ کے لیے جو مالک ہوا اور قادر ہوا۔ سب حمد اللہ کے لیے ہے جو مُردوں کو پیدا کرتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اور اس کے بعد یہ دعا کرے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْاَلُكَ الرَّاحَةَ

اے اللہ! بے شک میں موت کے بعد تجھ سے

بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَفْوَ عِنْدَ الْحِسَابِ — راحت اور حساب کے وقت معافی کا سوال کرتا ہوں

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ غَضَبِکَ وَسُوْءِ عِقَابِکَ وَ شَرِّ عِبَادِکَ وَ شَرِّ الشَّیَاطِیْنِ وَ شِرْکِھِمْ۔

اے اللہ! میں تیرے غضب سے اور تیرے سخت عذاب سے اور تیرے بندوں کی بُرائی سے اور شیطانوں کی بُرائی سے اور ان کے حصہ دار ہونے سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

اس دعا کے بعد سورۃ البقرۃ کی پہلی پانچ آیات اور آخری تین آیات پڑھے۔ آیت الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیات پڑھے۔ پھر والھکم الہ واحد لا الہ الا ھوالرحمٰن الرحیم سے لے کر لقوم یعقلون تک پڑھے (یعنی دو آیات) منقول ہے کہ جو آدمی سوتے وقت یہ آیت پڑھ لے۔ اسے قرآن یاد رہے اور اسے نہ بھولے۔ مزید برآں سورۃ بنی اسرائیل کی آخری دو آیات کا ناغہ نہ کرے۔ یعنی قل ادعوا اللہ او ادعوا الرحمٰن سے لے کر آخر تک اور سورہ اعراف کی یہ آیت بھی پڑھے۔

اِنَّ رَبَّکُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ الآیۃ

اس کے لیے ایک فرشتہ مقرر کر دیا جائے گا جو اس کی حفاظت کرے اور اس کے لیے دعائے بخشش کرے گا۔

ان آیات کے علاوہ سورۃ الحدید کی پہلی پانچ آیات، سورۃ الحشر کی آخری تین آیات پڑھے۔ پھر قل ھواللہ احد، قل اعوذ برب الفلق، قل اعوذ برب الناس کی تلاوت کرے۔ انہیں دونوں ہاتھوں پر پھونک کر چہرہ اور سارے بدن پر پھیر لے (تین بار اسی طرح سارے بدن پر ہاتھ پھیرے)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے کہ میں نہیں سمجھتا کہ ایک آدمی کی عقل مکمل ہو اور پھر وہ سونے سے پہلے سورۃ البقرہ کی آخری یہ دو آیات اٰمَنَ الرَّسُوْلُ سے لے کر آخر تک پڑھے بغیر سو جائے۔

مذکورہ بالا دعاؤں کے علاوہ یہ دعا بھی سوتے وقت پڑھ لینی چاہیے۔

اَللّٰھُمَّ اَیْقِظْنِیْ فِیْ اَحَبِّ السَّاعَاتِ اِلَیْکَ وَاسْتَعْمِلْنِیْ بِاَحَبِّ الْاَعْمَالِ لَدَیْکَ الَّتِیْ تُقَرِّبُنِیْ اِلَیْکَ زُلْفٰی وَتُبَعِّدُنِیْ مِنْ سَخَطِکَ بُعْدًا اَسْاَلُکَ

اے اللہ! مجھے اپنی محبوب ترین ساعت میں اٹھا اور محبوب ترین عمل میں لگا جو تیرے نزدیک (محبوب ترین ہو) جو مجھے تیرے بہت قریب کر دے اور مجھے تیری ناراضگی سے بہت دور کر دے۔ میں سوال کرتا ہوں

نُعْطِيَنِيْ وَ اَسْتَغْفِرُكَ فَتَغْفِرَلِیْ وَ اَدْعُوْكَ فَتَسْتَجِيْبَ لِیْ ۔ اَللّٰهُمَّ لَا تُؤْمِنِّیْ مَكْرَكَ وَ لَا تُوَلِّنِیْ غَيْرَكَ وَلَا تَرْفَعْ عَنِّیْ سِتْرَكَ وَلَا تُنْسِنِیْ ذِكْرَكَ وَ لَا تَجْعَلْنِیْ مِنَ الْغَافِلِيْنَ ۔

کہ تُو مجھے عطا فرمائے اور میں تجھ سے بخشش مانگتا ہوں کہ تو مجھے بخش دے اور میں تجھ سے دعا کرتا ہوں کہ تُو میری دُعا قبول کرلے۔ اے اللہ! مجھے اپنی تدبیر سے بے خوف نہ کر اور اپنے سوا مجھ پر کسی کو والی نہ بنا اور مجھ سے اپنا پردہ نہ اٹھا۔ اور مجھے اپنا ذکر نہ بھلا اور مجھے غافلین میں سے نہ بنا۔

منقول ہے کہ جو آدمی یہ کلمات پڑھ کر سوئے۔ اللہ تعالیٰ تین فرشتے اس پر مقرر فرمادے گا جو اسے نماز کے لیے جگادیں گے اور جب یہ دعا کرے گا تو یہ فرشتے اس کی دعا پر آمین کہیں گے اور اگر نماز کے لیے نہ بھی اٹھ سکا تو یہ فرشتے ہوا میں عبادت کریں گے اور ان کی عبادت کا ثواب اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا۔ ان اوراد کے بعد ۳۳ بار سبحان اللہ، ۳۳ بار الحمدللہ اور ۳۴ بار اللہ اکبر کہے۔ اور چاہے تو پچیس بار یہ کلمات پڑھ لے۔ یہ سب مل کر ایک سو کلمات بن جائیں گے۔

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اللّٰهُ اَكْبَرُ۔

اللہ پاک ہے اور اللہ ہی کے لیے ساری حمد ہے اور اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے۔

اور دوامی طور پر عمل کرنے کے لیے یہ آسان ہیں۔

حضرت معطوف نے حضرت شعبی سے اور انھوں نے حضرت عائشہ رضؓ سے روایت کیا کہ سوتے وقت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آخر میں یہ دُعا پڑھتے اور آپؐ کا رخسار اپنے دائیں ہاتھ پر رکھا ہوتا اور ایسے دکھائی دیتے کہ آج رات ان کی رحلت ہو جائے گی۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۔ رَبَّنَا وَ رَبَّ كُلِّ شَيْءٍ مُنْزِلَ التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالزَّبُوْرِ وَالْفُرْقَانِ فَالِقَ الْحَبِّ وَالنَّوٰى اَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّ كُلِّ دَآبَّةٍ اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِيَتِهَا اَللّٰهُمَّ اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الْاٰخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ

اے اللہ! ساتوں آسمانوں کے رب اور عرش عظیم کے رب۔ اے ہمارے رب اور ہر چیز کے رب تورات اور انجیل اور زبور اور فرقان کے نازل کرنے والے، دانے اور گٹھلی پھاڑنے والے، میں ہر چوپائے کی برائی سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ تو اس کی پیشانی اپنے قبضہ میں رکھے ہے۔ اے اللہ! تو اوّل ہے سو تیرے پہلے کچھ چیز نہیں اور تو آخر ہے۔ سو تیرے بعد

شَیْءٌ وَ اَنْتَ الظَّاھِرُ فَلَیْسَ فَوْقَكَ شَیْءٌ وَ اَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَیْسَ دُوْنَكَ شَیْءٌ اِقْضِ عَنِّیَ الدَّیْنَ وَ اَغْنِنِیْ مِنَ الْفَقْرِ۔

کچھ نہیں اور تو ظاہر ہے۔ سو تیرے اُوپر کچھ چیز نہیں، اور تو باطن ہے۔ سو تیرے ورے کچھ نہیں۔ میرا قرض چکا دے اور مجھے احتیاج سے ہٹا کر غنی کر دے۔

اس کے بعد ۳۳ بار سُبْحَانَ اللّٰہِ اور ۳۳ بار اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ اور ۳۴ بار اَللّٰہُ اَکْبَرُ کہے اور اگر چاہے تو پچیس پچیس بار کہے اور لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کا اضافہ کر لے۔ اب بھی یہ ایک سو کلمات بن جائیں گے۔ اور ان پر دوام کرنا بھی سہل تر ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ورد کا حکم دیا اور یہ ورد پانچوں نمازوں کے بعد اور سوتے وقت کر لینا مستحب ہے۔ سوتے وقت اکثر دعائیں ذکر ہو چکیں۔

سونے کا اسلامی طریقہ

بہتر یہ ہے کہ انسان باوضو حالت میں سوئے ورنہ اعضا پر کچھ پانی ہی مل لے۔ سلف صالحین سوتے وقت مسواک کرنا پسند کرتے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ہی کیا کرتے۔ بعض اسلاف کے متعلق مروی ہے کہ وہ مسواک اور پانی کا برتن سرہانے کے پاس رکھتے۔ جب رات کو بیدار ہوتے تو مسواک کرتے اور اعضا پر پانی ہی مل لیتے اور لیٹے لیٹے تلاوت قرآن مجید کرتے اور تسبیح پڑھتے۔ اور اسے ہی قیام اللیل کے برابر سمجھتے۔ حضرت عمر بن خطاب رض سے بھی یہ روایت ملتی ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی یہ مروی ہے کہ آپؐ ہر رات میں کئی بار مسواک فرماتے۔ جب نیند سے بیدار ہو کر اٹھتے تو مسواک فرماتے۔ اس لیے بندے کو چاہیے کہ مسواک اور پانی کا برتن سرہانے رکھ کر اور رات کو نمازِ تہجد پڑھنے کی نیت کر کے سوئے۔ اب جس وقت بھی آنکھ کھلے اٹھ کر وضو کر کے نماز پڑھے یا بیٹھ کر ہی تلاوت کرے۔ یا دعا کرے یا اللہ عزّ و جلّ کا ذکر کرے۔ استغفار کرے۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت، عظمت پر غور و فکر کرے۔ غرض ان میں سے جس کام میں بھی مشغول ہُوا وہ ذکر اللہ ہی ہے اور اس سے اللہ کا تقرب حاصل ہو گا اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے۔

بندے کو چاہیے کہ سونے سے پہلے وصیّت کر رکھی ہو۔ اس لیے کچھ خبر نہیں کہ وہ رات کو کوچ کر جائے گا یا دوبارہ اُٹھے گا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مستحب فرمایا۔ فرمایا کہ بندے کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ دو راتیں اس طرح سوئے کہ اس کے پاس تحریر شدہ وصیت لکھی ہُوئی نہ ہو۔ منقول ہے کہ جو آدمی وصیت کیے بغیر فوت ہو جائے وہ قیامت تک برزخ میں کلام نہ کر سکے گا۔ بس وہ دوسرے مُردوں کو باہم کلام کرتے دیکھے گا اور خود خاموش کھڑا تکتا رہے گا۔ چنانچہ بعض مُردے کہیں گے کہ یہ بے چارا وصیت کیے بغیر ہی مر گیا اس پر اسے مزید افسوس ہو گا۔

اور اگر مرنے والا فقیر مسلمان ہو اس کے پاس مال نہ ہو اور نہ ہی اس پر قرض ہو تو ایسے آدمی کے لیے اچانک موت تخفیف ہے اور اگر مقروض ہو یا اس کے پاس مال ہو یا گناہوں میں مبتلا ہو تو ایسے آدمی کے لیے اچانک موت سزا اور بری ہے۔

بندے کو چاہیے کہ سونے سے پہلے تمام گناہوں سے توبہ کر کے سوئے۔ تمام مسلمانوں کی طرف سے دل کو صاف کر لے اور اس میں کسی پر ظلم کرنے اور کسی گناہ کا ارادہ نہ باندھے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جو آدمی بستر پر اس طرح لیٹے کہ وہ کسی پر ظلم کرنے کا ارادہ نہ رکھتا ہو اور نہ کسی سے کینہ پرور رہا ہو تو اس کی غلطیاں معاف کر دی جائیں گی۔

سوتے وقت قبلہ رخ ہو کر لیٹے۔ استقبال قبلہ کے دو طریقے ہیں:

۱۔ چت لیٹا ہو اور چہرہ اور پاؤں کا رخ قبلہ کی طرف کر لے جیسے کہ سیدھی قبر میں مردہ لیٹا ہوتا ہے،

۲۔ اور اگر پہلو پر لیٹے تو دائیں رخ پر قبلہ کی طرف منہ کر کے لیٹ جائے جیسے کہ لحد والی قبر میں مردہ لیٹتا ہے اور سوتے وقت قبر میں لیٹنے کے اس منظر کو یاد کر لے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا ۝ أَحْيَاءً وَأَمْوَاتًا (کیا ہم نے نہیں بنائی زمین سمیٹنے والی زندوں کو اور مردوں کو)

یعنی ایک طرح پر رہوں گے کہ پشت کے بل زندہ کرے گا اور پیٹ کے بل مارے گا۔ اللہ تعالیٰ نے گوشِ ہوش رکھنے والوں کے لیے موت کو ایک دلیل بنا دیا اور اس کے ساتھ ابتغاءِ فضل کا ذکر کیا۔ فرمایا:

وَمِنْ آيَاتِهِ مَنَامُكُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَاؤُكُم مِّن فَضْلِهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَسْمَعُونَ۔ (اور اس کی نشانیوں میں سے ہے تمہارا سونا رات اور دن میں اور تلاش کرنا اس کے فضل سے۔ اس میں بہت پتے ہیں ان کو جو سنتے ہیں)

اور اہل صفہ کے فقرا اور بعض تابعی زاہدین کا طریقہ تھا کہ جب وہ سونے لگتے تو آڑ کے بغیر ننگی زمین پر لیٹتے اپنا بدن زمین کے ساتھ ملا کر اپنے اوپر کپڑا ڈال لیتے اور یہ آیت پڑھتے۔

مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ۔ (اس سے ہم نے تمہیں پیدا کیا اور اسی میں لوٹا دیں گے)

گویا انہیں زمین پر چوکڑی بھرنا اور اس سے ہٹے رہنا مکروہ تھا۔ مزید برآں اس طرح دل میں زیادہ رقت و عاجزی آتی ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جس طرح دنیا و آخرت میں برزخ کا جہان ہے۔ نیند بھی

زندگی اور موت کے درمیان ہے اور برزخ سے مشابہ ہے۔ جب نیند کا پردہ اٹھا تو زندگی نمودار ہوگئی اور اسی طرح جب دوسرا پردہ اٹھا تو آخرت سامنے آگئی۔ گویا دنیا ایک خواب تھا جو گزر گیا۔
اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَهُوَ الَّذِیْ یَتَوَفّٰكُمْ بِالَّیْلِ وَ یَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ یَبْعَثُكُمْ فِیْهِ ۔
(اور وہی ہے کہ قبضہ میں لے لیتا ہے تم کو رات میں اور جانتا ہے جو کچھ تم کر چکے ہو دن میں۔ پھر تم کو اٹھا دیتا ہے اس میں)

بعض سلف صالحین کو اس آدمی پر بڑا تعجب ہوتا کہ جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے اور پھر بے فکر ہو کر سو جائے۔ بعض علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس کلام کو نقل فرمایا:

اگر تم میری نافرمانی کرتے ہو تو میری حکومت سے نکل جاؤ اور میرے قبضہ میں نہ سوؤ۔ حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی اور فرمایا۔

اے بیٹے! اگر تجھے موت میں شبہ ہے تو مت سو۔ جیسے تو سوتا ہے اسی طرح ایک روز مر بھی جائے گا اور تجھے دوبارہ جی اٹھنے کے بارے میں شبہ ہے تو جب سوتا ہے مت جاگ۔ جیسے تو نیند سے جاگ اٹھتا ہے۔ اسی طرح ایک روز موت کے بعد جی اُٹھے گا۔ اس لیے بندے کو چاہیے کہ سوتے وقت موت کو یاد کرلے اور یہ خوب سمجھ لے کہ مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ ہی اس کا مددگار ہوگا۔ جیسے کہ نیند سے پہلے اللہ تعالیٰ ہی مددگار ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھے کہ وہ کس حال میں سویا؟ اور کس فکر میں اللہ نے اُسے سلایا؟ پھر دوبارہ جی اُٹھنے کو یاد کرے۔ اس لیے کہ بندہ دنیا میں جس حال پر مرتا ہے اسی حالت پر اٹھایا جائے گا۔ اب اسے اٹھا کر اسی فکر وغم کے پاس لے جایا جائے گا جس پر وہ مرا تھا جیسے کہ کوئی آدمی سونے سے پہلے جس کی محبت میں سویا اسی کی محبت میں بیدار ہوا۔ حدیث میں آتا ہے کہ

انسان اسی کے ساتھ ہوگا کہ جس کے ساتھ محبت کرے۔ ولہ ما احتسب (اس کیلئے وہی ہے جو اس نے گمان کیا)

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ

جو آدمی کسی مرتبہ پر مرا وہ قیامت کے روز اس پر اٹھایا جائے گا اور حضرت کعب احبارؓ سے منقول ہے کہ جب سونے کے لیے لیٹو تو داہنی جانب قبلہ رُخ ہو کر لیٹو۔ اس لیے کہ دنیا بھی اصل میں وفات کی ایک صورت ہے۔

سوتے وقت یہ سوچ لیں

سوتے وقت بندے کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح نیند کے بعد اللہ ہی اس کا کارساز ہے اسی طرح مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے پر بھی اس کا کارساز و مالک اللہ عز وجل ہی ہے۔ اب خوب سوچ لے کہ وہ کس حال میں اٹھے گا؟

اب اگر بندہ اپنے آقا کے انعامات کی قدر کرتا اس کی تعظیم کرتا اور اپنے محبوب کی رضا و مسرت ہی کا متلاشی رہتا ہے تو آخرت میں اللہ تعالیٰ بھی اس کو عزت کی جگہ عطا فرمائے گا۔ اور اگر بندہ اپنے آقا کا نافرمان، تساہل کرنے والا اور اللہ تعالیٰ کے احکام کو معمولی گرداننے والا تھا تو قیامت کے روز اللہ تعالیٰ بھی اسے ذلیل و رسوا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا يَسْتَوِى الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ ۔ (اور برابر نہیں اندھا اور آنکھوں والا اور نہ ایمان دار جو بھلے کام کرتے ہیں اور نہ بدکار)

پھر فرمایا:

قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ۔ (تم بہت کم سوچ کرتے ہو)

نیز فرمایا:

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ ۔ (کیا پس ہم مسلمانوں کو مجرموں کی طرح کر دیں)

اور فرمایا:

مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ۔ (تمہیں کیا ہے کیسے حکم کرتے ہو)

پھر حکمت بتائی کہ

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ۭ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۔ (کیا خیال رکھتے ہیں جنھوں نے کمائی ہیں برائیاں کہ ہم کر دیں گے ان کو برابر ان لوگوں کے جو کہ یقین لائے اور کیے بھلے کام۔ ایک سا ہے ان کا جینا اور مرنا۔ برے دعوے ہیں جو وہ کرتے ہیں)

اس میں یہ کلام مقدر ہو گا۔ چنانچہ ان کی نیکیاں ختم کر دی جائیں گی اور انھیں برے انجام کا فیصلہ سنا دیا جائے گا۔ پھر زندگی اور موت میں بھی ان کے حکم کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ

سواء محیاھم ومماتھم یعنی جس طرح زندگی میں تھے ایسے ہی موت کے بعد معاملہ ہو گا۔

اس کے بعد فرمایا:

وَخَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَ لِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ وَ ھُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ۝ ؎۱ (اور بنائے اللہ نے آسمان اور زمین جیسے چاہئیں اور تا کہ بدلہ پاوے ہر کوئی اپنی کمائی کا اور ان پر ظلم نہ ہوگا)

یہ کلام دراصل خاتمۂ کلام اور اہلِ دانش کے لیے عبرت ہے۔ اس مفہوم کے مطابق فرمایا:

کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰہُ اِلَیْکَ مُبٰرَکٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِہٖ وَلِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ ؎۲ (ایک کتاب ہے جو اتاری ہم نے برکت کی تا کہ دھیان کریں لوگ اس کی باتیں اور تا سمجھیں عقل والے)

اب کیا انھوں نے غور و فکر سے یہ دیکھا کہ ہم فسادیوں کو مصلحین کی طرح بنا دیتے اور اہل تقویٰ کو فاسقین کی طرح بناتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ کَالْمُفْسِدِیْنَ فِی الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ کَالْفُجَّارِ ۝ ؎۳ (کیا ہم کر دیں گے ایمان والوں کو جو کرتے ہیں نیکیاں برابر ان کے جو خرابی ڈالیں ملک میں۔ کیا ہم کر دیں گے ڈرنے والوں کو ڈھیٹ لوگوں کے)

چنانچہ تدبّر کا مطلب سمجھنا اور تذکّر کا مطلب تقویٰ و عمل ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ

جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنا درجہ معلوم کرنا چاہتا ہے اسے چاہیے کہ وہ اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کا درجہ دیکھے کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو اسی قدر قریب سمجھتا ہے جس قدر بندہ اللہ تعالیٰ کو اپنے ہاں قریب سمجھتا (یا درجہ دیتا ہے) اب اگر بندہ باوضو ہو کر ذکر اللہ کرتا ہوا سوئے گا تو اس کا سونا بھی عبادت بن جائے گا اور بیدار ہونے تک اسے نماز پڑھنے والا ہی لکھا جائے گا۔

ویدخل فی شعارہ ملکٌ (اور اس کی جگہ میں ایک فرشتہ آئے گا)

اب اگر اس نے رات کو حرکت کی، اور اللہ تعالیٰ کو یاد کیا تو فرشتہ اس کے لیے دعا کرے گا۔ اور اس کے لیے بخشش مانگے گا۔

حدیث میں آتا ہے کہ اگر بندہ باوضو ہو کر سوئے تو اس کی رُوح عرش پر عروج حاصل کرتی ہے اور اس کا خواب سچا ہوتا ہے۔ اور اگر باوضو نہ سوئے تو اس کی رُوح عروج کرنے سے قاصر رہتی ہے

؎۱ سورۂ جاثیہ آیت ۲۲۔ ؎۲ سورۂ صٓ آیت ۲۹۔

؎۳ سورۂ صٓ آیت ۲۸۔

تو پھر یہ خواب جھوٹے ہوتے ہیں اور اگر باوضو سوئے اور صبح تک سوتا رہے تو صبح تک اس کا قیام شب لکھا جائے گا اور نیند کر لینا ایک زائد انعام ہوگا۔ اب جس بندے کی نیند کی یہ حالت ہو وہ غافل اور کاہل بندوں سے بہت بڑھ جائے گا۔

قیام تہجد کے وقت کے اذکار | جب رات کو نمازِ تہجد کے لیے اُٹھے تو یہ دُعا پڑھے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَحْیَانِیْ بَعْدَ اِذْ تَوَفَّانِیْ وَاِلَیْہِ النُّشُوْرُ۔

(سب حمد اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے وفات دینے کے بعد زندہ کیا اور اسی کی طرف پھر اٹھ کر جانا ہے)

پھر سورۃ آل عمران کی آخری دس آیات پڑھے اور مسواک کر کے وضو کرے۔ اس کے بعد یہ دُعا کرے:

سُبْحَانَکَ وَبِحَمْدِکَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُکَ وَاَسْأَلُکَ التَّوْبَۃَ فَاغْفِرْلِیْ وَتُبْ عَلَیَّ اِنَّکَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ التَّوَّابِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ مِنَ الْمُتَطَھِّرِیْنَ وَاجْعَلْنِیْ صَبُوْرًا شَکُوْرًا وَّاجْعَلْنِیْ اَذْکُرُکَ کَثِیْرًا وَّاُسَبِّحُکَ بُکْرَۃً وَّاَصِیْلًا۔

(تو پاک ہے اور تیری حمد ہے تیرے بغیر کوئی معبود نہیں میں تجھ سے بخشش چاہتا ہوں اور تجھ سے توبہ کا سوال کرتا ہوں۔ سو مجھے بخش دے اور میری توبہ قبول فرما لے بے شک تو ہی توبہ قبول کرنے رحم کرنے والا ہے۔ اے اللہ! مجھے توبہ کرنے والوں میں سے بنا اور مجھے ازحد پاک لوگوں میں سے بنا دے اور مجھے صبر کرنے والوں شکر کرنے والوں میں سے بنا دے اور مجھے ایسا بنا دے کہ نہایت کثرت سے ذکر کروں اور صبح و شام تیری تسبیح بیان کروں)

پھر آسمان کی طرف منہ کر کے یہ دُعا پڑھے:

اَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَاَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَاَعُوْذُ بِعَفْوِکَ مِنْ عِقَابِکَ وَاَعُوْذُ بِرِضَاکَ مِنْ سَخَطِکَ وَاَعُوْذُ بِکَ مِنْکَ لَآ اُحْصِیْ ثَنَآءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَآ اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ اَنَا عَبْدُکَ ابْنُ عَبْدِکَ

(میں گواہی دیتا ہوں کہ تنہا اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور میں تیرے عذاب سے تیرے عفو کی پناہ چاہتا ہوں اور میں تیری ناراضگی سے تیری رضا کی پناہ چاہتا ہوں اور میں تجھ سے تیری پناہ چاہتا ہوں میں تیری ثنا نہیں کر سکتا تو بس ایسے ہے کہ جیسے تو نے اپنی خود ثنا فرمائی میں تیرا بندہ تیرے بندے کا بیٹا

نَاصِیَتِیْ بِیَدِكَ جَارٍ فِیَّ حُكْمُكَ عَدْلٌ فِیَّ قَضَاؤُكَ هٰذِهٖ یَدِیْ بِمَا كَسَبَتْ وَ هٰذِهٖ نَفْسِیْ بِمَا اجْتَرَحَتْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ عَمِلْتُ سُوْٓءً وَ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ فَاغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ اِنَّكَ اَنْتَ رَبِّیْ اِنَّهٗ لَا یَغْفِرُالذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ فَلَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ۔

ہوں میری پیشانی تیرے قبضہ میں ہے۔ مجھ میں تیرا حکم جاری ہے۔ مجھ میں تیری قضا نافذ ہے۔ یہ میرے ہاتھ ہیں جن کے ساتھ میں کمایا اور یہ میرا نفس ہے کہ جس سے میں نے ارتکاب کیا۔ تیرے بغیر کوئی معبود نہیں۔ تو پاک ہے بے شک میں ہی ظالموں میں سے ہوں۔ میں نے بُرا کیا اور میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا سو میرا گناہ بخش دے بے شک تو ہی میرا رب ہے۔ بے شک تیرے بغیر کوئی گناہوں کو نہیں بخشتا (الغرض) تیرے بغیر کوئی معبود نہیں، تیرے بغیر کوئی معبود نہیں)

اور جب اٹھ کر نماز شروع کرے تو یہ دعا کرے:۔

اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِیْرًا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ كَثِیْرًا وَ سُبْحَانَ اللّٰهِ بُكْرَةً وَّ اَصِیْلًا۔

اللہ سب سے بڑا، بڑا ہے اور ساری حمد اللہ کے لیے ہے بہت بہت، اور شام شام اللہ ہی کی تسبیح ہے

اس کے بعد دس بار سُبْحَانَ اللّٰهِ، دس بار اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ، دس بار لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، دس بار اَللّٰهُ اَكْبَرُ ذُوالْمَلَكُوْتِ وَ الْجَبَرُوْتِ وَالْكِبْرِیَاۗءِ وَالْجَلَالِ وَ الْعَظَمَةِ وَالْقُدْرَةِ پڑھے۔ اس کے بعد یہ دُعا پڑھے۔ یہ دعا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ بَهَآءُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ زَیْنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ لَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ قَیَّامُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِیْهِنَّ وَمَنْ عَلَیْهِنَّ اَنْتَ الْحَقُّ وَمِنْكَ الْحَقُّ وَلِقَاؤُكَ حَقٌّ وَالْجَنَّةُ حَقٌّ وَّ النَّارُ حَقٌّ وَّ النَّبِیُّوْنَ حَقٌّ وَّ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَقٌّ اَللّٰهُمَّ لَكَ اَسْلَمْتُ

اے اللہ تیری ہی حمد ہے تو ہی آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اور تیری حمد ہے۔ تو ہی آسمانوں اور زمین کی رونق ہے اور تیری ہی حمد ہے۔ تو ہی آسمانوں اور زمین کا نور ہے اور تیری ہی حمد ہے تو ہی آسمانوں اور زمین کی زینت ہے اور تیری ہی حمد ہے تو ہی آسمانوں اور زمین کو قایم رکھنے والا ہے اور جو ان میں ہیں اور جو ان پر ہیں۔ تو حق ہے اور تجھ سے حق ہے اور تیری ملاقات حق ہے اور جنت حق ہے اور آگ (دوزخ) حق ہے اور تمام انبیاء حق ہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم حق ہیں۔ اے اللہ! میں تیرا فرمانبردار ہوا،

وَبِكَ آمَنْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَبِكَ
خَاصَمْتُ وَاِلَيْكَ حَاكَمْتُ فَاغْفِرْ
اَللّٰهُمَّ يَا رَبِّ لِيْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا
اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ
اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا
اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَللّٰهُمَّ آتِ نَفْسِيْ
تَقْوَاهَا اَللّٰهُمَّ زَكِّهَا اَنْتَ خَيْرُ
مَنْ زَكَّاهَا اَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا
اَللّٰهُمَّ اهْدِنِيْ لِاَحْسَنِ الْاَعْمَالِ لَا يَهْدِيْ
لِاَحْسَنِهَا اِلَّا اَنْتَ وَاصْرِفْ عَنِّيْ سَيِّئَهَا لَا
يَصْرِفُ عَنِّيْ سَيِّئَهَا اِلَّا اَنْتَ
اَلْبَائِسِ الْمِسْكِيْنِ وَاَدْعُوْكَ دُعَاءَ
الْمُفْتَقِرِ الذَّلِيْلِ فَلَا تَجْعَلْنِيْ بِدُعَائِكَ
رَبِّ شَقِيًّا وَكُنْ لِيْ رَؤُفًا رَحِيْمًا
يَا خَيْرَ الْمَسْئُوْلِيْنَ وَيَا اَكْرَمَ
الْمُعْطِيْنَ ۔

اور تجھ پر ایمان لایا اور تجھ پر توکل کیا اور تیری مدد سے
جھگڑا۔ اور تیری طرف (معاملہ) پیش کیا۔ سو اے
اللہ! اے رب جو میں نے ماضی میں کیا یا آئندہ کیا (اسے
بخش دے اور جو پوشیدہ طور پر کیا اور جو برملا کیا (اسے
بخش دے) تو ہی اوّل ہے اور تو ہی آخر ہے ۔
تیرے بغیر کوئی معبود نہیں۔ اے اللہ میرے نفس کو
پرہیزگاری عطا کر، اے اللہ اسے پاک کر دے، تو
بہترین پاک کرنے والا ہے۔ تو ہی اس کا آقا و مولا
ہے۔ اے اللہ مجھے بہترین اعمال کی ہدایت دے
تیرے سوا کوئی بھی اچھے (اعمال کی) طرف ہدایت نہیں
دے سکتا۔ اور مجھے اس کی برائیوں سے بچا لے
تیرے سوا کوئی بھی اس کی برائی سے نہیں بچا سکتا۔
میں مسکین تنگ حال کی طرح تجھ سے سوال کرتا ہوں اور
ذلیل محتاج کی طرح تجھ سے دعا کرتا ہوں۔ چنانچہ مجھے
اے پروردگار اپنی دعا میں بدبخت نہ بنا اور میرے
لیے مہرباں رحم کرنے والا ہو جا۔ اے بہترین سوال
کیا گیا اور اے سب سے زیادہ عطا کرنے والے۔

اور مستحب یہ ہے کہ نمازِ تہجد کی پہلی دو رکعتیں ہلکی پڑھے اور بہتر یہ ہے کہ نمازِ تہجد سے پہلے کچھ نہ کھائے پیئے۔ تاکہ پوری دلجمعی کے ساتھ نماز ادا کرے کیونکہ جب انسان نیند سے بیدار ہوتا ہے تو دل تمام وساوس وغیرہ سے صاف ہوتا ہے اور کھانے یا پینے کے بعد دل کی حالت میں تغیر آجاتا ہے۔ ہاں اگر یہ خطرہ ہو کہ نماز پڑھتے پڑھتے سحری کھانے کا وقت ختم ہو جائیگا تو پہلے سحری کھالے اور پھر نماز ادا کرے اور اللہ بزرگ و برتر کے سوا نہ کسی سے قوت ہے اور نہ ہی ڈر ہے۔

فصل ۱۴

قیامِ شب اور عابدین کے فضائل

رات کی تقسیم اس فصل میں رات کو عبادت اور آرام کے لیے تقسیم کا طریقہ بتایا گیا نیز شب بیداروں اور نمازِ تہجّد کی پابندی کرنے والوں کے لیے فضائل بتائے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف کرتے ہوئے خوب قیام لیل کرنے والا بتایا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَ نِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ۔[1]

(بے شک تیرا رب جانتا ہے کہ تو اٹھتا ہے نزدیک دو تہائی رات کے اور آدھی رات کے اور تہائی رات کے اور کتنے لوگ تیرے ساتھ ہیں)

ایک جگہ بتایا کہ رات کی قرأت دل پر خوب اثر کرتی ہے اور دل و زبان کو خوب ذاکر و شاغل بناتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شب بیدار لوگوں کو علماء کا نام دیا اور انہیں اہلِ خوف و رجاء میں سے شمار کیا اور ان کے لیے اعلیٰ ترین انعامات مخفی رکھے۔ چنانچہ فرمایا:

اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَ يَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ۔

(بھلا ایک جو بندگی میں لگا ہوتا ہے رات کی گھڑیوں میں سجدے کرتا ہوا اور کھڑا ہوا، خطرہ رکھتا ہے آخرت کا اور امید رکھتا ہے اپنے رب کی مہربانی کی)

پھر فرمایا:

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔

(تو کہہ کوئی برابر ہوتے ہیں سمجھ والے اور بے سمجھ)

اس کلام میں عالم محذوف ہے اس پر کلام دلالت کر رہا ہے۔ معنی یوں ہُوا کہ اس طرح (قیام لیل کر کے) جو عالم ہوا وہ رات بھر سونے والے غافل کے برابر نہیں ہو سکتا یعنی (شب بیداری نہ کرنے والا) عالم نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں

---

[1] سورۂ مزمل آیت ۲۰۔

ان کی تعریف بیان کی اور ان پر آخرت کے انعامات کا ذکر کیا۔ فرمایا :

وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّھِمْ سُجَّدًا وَّ قِیَامًا۔[۱] تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا۔[۲]

اور جو رات گزارتے ہیں اپنے رب کے لیے سجدہ کرتے اور قیام کرتے ہوئے جدا رہتی ہیں ان کی کروٹیں اپنے سونے کی جگہ سے پکارتے ہیں رب اپنے کو ڈر سے اور لالچ سے۔

یعنی بستروں سے اٹھ جاتے ہیں۔ ڈر اور انعامات کی امید کے باعث انہیں کسی کروٹ چین نہیں آتا۔ (آخر اٹھ کر عبادت کرتے ہیں)

پھر فرمایا :

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَھُمْ مِّنْ قُرَّۃِ اَعْیُنٍ جَزَآءً بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔[۳]

(سو کسی جی کو معلوم نہیں جو چھپا دھری ہے واسطے ان کے آنکھوں کی ٹھنڈک، بدلا اس کا جو کرتے تھے)

ایک قول کے مطابق (بعلمون) سے مراد شب بیداری کا عمل ہے اور ایک قول کے مطابق اس سے مراد اہلِ خوف و رجاء (ڈرنے والے اور انعامات کی امید رکھنے والے) ہیں۔ خوف و رجاء دونوں ہی دل کے مشاہدۂ غیب کے اعمال ہیں۔ ان لوگوں نے سِرّی اعمال ہیں اخلاص اختیار کیا تو ان کے لیے عمدہ ترین اجر و ثواب ہے۔ ان حضرات نے اللہ تعالیٰ کی خاطر عمل کیا۔ اس لیے یہ دیدارِ الٰہی سے ہی خوش ہوں گے۔ بعض علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوۃِ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ اس سے نمازِ تہجد مراد ہے کہ اس سے مجاہدۂ نفس اور دشمن کے مقابلہ میں صبر کی قوت حاصل ہوتی ہے فرمایا :۔

وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ

(اور بے شک یہ بات خشوع کرنے والوں پر بھاری ہے)

یعنی ان میں خشوع و خضوع ہوتا ہے اور ان کے لیے نماز بوجھ نہیں ہوتی بلکہ یہ ان کیلیے

---

[۱] سورۃ الفرقان آیت ۶۴ ۔ [۲] سورۃ السجدہ آیت ۱۶ ۔

[۳] سورۃ السجدہ آیت ۱۷ ۔

باعثِ فرحت ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ اے اللہ کے رسول! فلاں آدمی رات کو نماز بھی پڑھتا ہے اور جب صبح ہوتی ہے تو چوری بھی کرتا ہے۔

آپؐ نے فرمایا:

"جلدی ہی یہ اسے (چوری سے) روک دے گی جو تو کہہ رہا ہے"۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"عبداللہ بن عمر بہترین آدمی ہے۔ کاش کہ وہ رات کو نماز بھی پڑھے"۔

قیامِ شب کے فضائل

راوی بتاتے ہیں کہ اس کے بعد وہ ہر رات نماز پڑھتے اور کبھی ناغہ نہ کرتے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ:

"تم پر لازم ہے کہ رات کو نمازِ (تہجد) پڑھو۔ یہ تمہارے رب کو راضی کرنے والی، تمہارے گناہوں کا کفارہ بننے والی ہے اور تم سے پہلے کے نیک لوگوں کا طریقہ ہے اور گناہوں سے روکنے والی، بوجھ ہٹانے والی، شیطان کے مکر کو دُور کرنے والی اور بدن سے بیماری دُور کرنے والی ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے اس فرمان کے ساتھ قیام لیل کو صالحین کا وصف قرار دیا۔ فرمایا:

يَتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ سے لے کر وَاُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ[1] تک (اس آیت میں آخری جملہ یہ ہے کہ یہ لوگ صالحین میں سے ہیں) اور مستحب یہ ہے کہ رات کا دو تہائی حصہ قیام کرے اور قلیل ترین مستحب عبادت یہ ہے کہ رات کے چھٹا حصہ تک قیام کرے۔

حدیث میں آتا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صبح تک قیام کبھی نہیں کیا بلکہ کچھ دیر سو جاتے تھے اور نہ کبھی صبح تک ساری رات سوئے بلکہ رات کے ایک حصہ میں اُٹھ کر (اللہ کی عبادت) کرتے۔ (صوفیاء) کا یہ مشہور قول ہے کہ شروع رات میں قیام تہجد گزاروں کا ہے اور وسط شب میں قیام کرنا قانتین کا درجہ ہے اور آخر شب میں قیام کرنا مصلین (نمازیوں) کا درجہ ہے اور فجر میں ہی قیام کرنا غافلین کا درجہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمیں یوسف بن مہران نے بتایا کہ ہمیں معلوم ہوا کہ

---

[1] سورۃ آل عمران آیت ۱۱۳۔

عرش کے نیچے مرغ کی شکل کا ایک فرشتہ ہے۔ اس کے پنجے موتیوں کے ہیں اور اس کے خار سبز زبرجد کے ہیں۔ جب نصف رات ہو جاتی ہے تو وُہ پروں کو ہلاتا ہے اور آواز دیتا ہے کہ "قیام شب کرنے والے اٹھ جائیں۔"

پھر جب نصف رات گزر جاتی ہے تو اس کے بعد پروں کو ہلاتا ہے اور آواز دیتا ہے کہ "نماز پڑھنے والے اٹھ جائیں۔"

جب فجر طلوع ہو جاتی ہے تو پروں کو ہلاتا ہے اور کہتا ہے کہ "غافلین بھی اٹھ جائیں اور ان پہ ان کا بوجھ ہے۔"

بعض علماء نے فرمایا کہ:

قیام لیل کرنے والوں کی تین اقسام ہیں:

۱۔ ایک گروہ وُہ ہے کہ انھیں رات نے قطع کر دیا۔ یہ اوراد و اجزا والے مریدین ہیں انھوں نے رات کو تھکا دیا۔ آخر رات ان پر غالب آگئی۔

۲۔ انھوں نے رات کو قطع کیا۔ یہ لوگ عالم ہیں انہوں نے صبر و استقلال سے کام لیا آخر کار رات پر غالب آگئے۔

۳۔ ان سے رات قطع ہُوئی۔ یہ لوگ محبّین و علمائے اہل فکر ہیں۔ یہ اہل انس و اہل مجلس ہیں۔ ذکر و مناجات اور دیدار و تملّق (گڑگڑانے) والے لوگ ہیں۔ نغص علیھم اللیل حالھم ان کی رات پریشان حالی کی ہو گی اور نعمتِ شب گھٹ کر رہ گئی (کہ آئی اور گزر گئی) محبُوب تعالیٰ نے ان سے نیند اٹھا دی۔ ان پر قیام شب آسان ہو گیا۔ وصل نے ان سے ملال کو دُور کر دیا۔ اور خدا کے عتاب نے انھیں بیدار رکھا۔

شب بیداروں کے اقوال

ایک شب بیدار سے پوچھا گیا کہ

"رات کو تم کیسے ہوتے ہو؟"

کہنے لگے۔

"کبھی خیال نہیں کیا۔ رات نے چہرہ دکھایا، چل دی اور مجھے خبر بھی نہ ہُوئی۔"

ایک شب بیدار نے کہا کہ

"میں اور رات فرسا دھان دونوں رہن شدہ گھوڑے ہیں۔ گاہے یہ مجھے فجر تک لے جاتی ہے

اور گاہے یہ مجھے فکر سے باز رکھتی ہے "۔

ایک شب بیدار سے پوچھا گیا :

" تم پر رات کیسی رہتی ہے ؟ "

فرمایا کہ :

یہ ایسی گھڑی ہے کہ جس میں میں دو حالتوں میں رہتا ہوں۔ جب اندھیرا چھا جائے تو خوش ہوتا ہوں اور طلوعِ فجر کو غنیمت سمجھتا ہوں۔ اس سے کبھی میری فرحت مکمل نہیں ہوئی اور نہ کبھی میں اس سے مکمل شفایاب ہوا ہوں (یعنی جی چاہتا ہے کہ رات ہی رہے اور عبادت ہی کرتے رہیں)

ایک محب سے دریافت کیا گیا کہ آپ پر رات کیسی رہتی ہے ؟

فرمایا :

اللہ کی قسم۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کے اندر مجھے کیا ہوتا ہے۔ ایک نظر اور ایک وقفہ ہوتا ہے اندھیرا آیا، چھا گیا اور ابھی کچھ کرنے نہ پائے کہ سپیدہ ہو گیا۔ پھر یہ شعر پڑھا :

لم استتم عناقة لقدومه　　حتى بدا تسليمه لوداع

(اس کی آمد پر ابھی معانقہ مکمل نہ ہوا تھا کہ سلام وداع بھی آ گیا)

ایک صاحب نے جواب میں یہ اشعار پڑھ دیے :

و زارني طيفك حتى اذا　　اراد ان يمضي تعلقت به

فليت ليلى لم يزل سرمدا　　والصبح لم انظر الى كوكبه

(تیرا خیال آیا۔ آخر میں نے اس سے بغلگیر ہونے کا ارادہ کیا۔ کاش کہ یہ رات دائمی بن جاتی۔ اور صبح کا ستارا نظر نہ آتا)

ایک مرید نے اپنے شیخ سے شکایت کی کہ "مجھے رات کو نیند نہیں آتی۔ کوئی دوا بتائیے کہ نیند آ جائے "۔

شیخ نے فرمایا :

" اے بیٹا ! رات اور دن میں اللہ تعالیٰ کے نفحات آتے ہیں جو بیدار دلوں کو حاصل ہوتے ہیں اور سوتے دل محروم رہتے ہیں۔ ان نفحات کا سامنا کرو۔ ان میں بھلائی ہے "۔

مرید نے عرض کیا :

" اے شیخ آپ نے تو مجھے رات دن میں کسی وقت بھی سونے سے روک دیا "۔

صوفیاء کی ایک جماعت بیٹھی رات چھوٹی ہونے کی بات چیت کر رہی تھی ان میں سے ایک صاحب نے کہا:

"میں کھڑا ہوتا ہوں۔ رات آتی ہے اور ابھی بیٹھتا بھی نہیں کہ چلی جاتی ہے۔"

علیؒ بن بکار نے فرمایا:

"پچھلے چالیس برس سے مجھے صرف طلوعِ فجر سے غم ہوتا ہے۔"

(کہ یہ ہوئی اور شب بیداری کا مزہ جاتا رہا)

فضل بن عیاض فرماتے ہیں کہ

"جب آفتاب غروب ہوا تو میں اندھیرا چھانے پر خوش ہوا کہ اب اپنے پروردگار کے ساتھ خلوت ہوگی اور جب فجر آئی تو افسوس ہوا کہ اب لوگ آئیں گے۔"

ابوسلیمانؒ نے فرمایا:

"کھیل کود میں مشغول لوگوں سے زیادہ لذت شب بیداروں کو رات کی عبادت میں حاصل ہوتی ہے۔"

نیز فرمایا کہ:

"اگر شب بیداروں کو ان کے اعمال کا ثواب شب بیداری کی صرف لذت ہی دی جائے تو بھی یہ اعمال سے زیادہ اجر ہے۔"

بعض علماءؒ نے فرمایا:

"دنیا میں جنت سے مشابہ صرف ایک وقت ہے کہ جب شب بیدار لوگ رات کو مناجات کی حلاوت پاتے ہیں۔"

بعض صوفیاء نے فرمایا:

"یاد رکھو۔ شب بیداری، محبوب کے ساتھ چپک جانا اور اللہ کی مناجات دنیا میں واقع ضرور ہے مگر یہ دنیا نہیں یہ تو جنت کا ایک حصہ ہے۔ اللہ نے اس حصہ کو صرف ان لوگوں پر ظاہر فرما دیا جو کہ شب بیدار ہیں تاکہ انھیں سکون حاصل ہو اور ان کے سوا دوسروں کو اس کا علم نہیں۔"

عتبہ غلامؒ فرماتے ہیں کہ

"میں نے بیس برس رات میں مشقت پائی اور بیس برس تک اس سے محفوظ ہوا۔"

یوسفؒ بن اسباطؒ فرماتے ہیں کہ

میرے لیے ایک ٹوکرا کام میں عمل سے زیادہ آسان کام قیامِ شب ہے۔ یاد رہے وہ ہر روز (کلن یعمل کل یوم عشر قفاف)" وہ ہر روز دس قفاف (ٹوکرے) کام کرتے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ

"میں نے رات سے زیادہ تعجب انگیز نہیں دیکھی۔ جب تو اس میں اضطراب محسوس کرے تو یہ تجھ پر غالب آجائے گی اور اگر تو اس کے سامنے ڈٹ جائے تو یہ نہیں ٹھہرتی۔"

عامرؒ بن عبداللہ سے انتقال کے وقت اس کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا:

"اللہ کی قسم! میں باقی رہنے کی محبت میں نہیں رونا بلکہ مجھے تو گرمیوں کے روزے کی پیاس اور سردیوں کی شب بیداری یاد آرہی ہے۔"

ابن منکدرؒ فرماتے ہیں کہ:

دنیا میں تین مزے ہی باقی رہ گئے ہیں:

۱۔ رات کی عبادت

۲۔ بھائیوں کی ملاقات

۳۔ باجماعت نماز ادا کرنا

ایک عارفؒ فرماتے ہیں کہ

"اللہ تعالیٰ سحری کے وقت بیدار دلوں کی طرف نظر فرماتا ہے تو انھیں انوارات سے بھر دیتا ہے ان کے دلوں پر اس کا اثر ہوتا ہے تو وہ منوّر ہو جاتے ہیں۔ پھر ان منوّر دلوں کا نور غافل دلوں پر پڑتا ہے (اور انھیں جگانے کی کوشش کرتا ہے)"

بعض علمائے متصوفینؒ کا فرمان ہے کہ

اللہ تعالیٰ سحری کے وقت جنت پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو وہ روشن ہو جاتی ہے اور اس میں فرحت کا تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ اس کے حسن و جمال اور خوشبو میں تمام لحاظ سے دس لاکھ گنا اضافہ ہو جاتا ہے۔ پھر جنت کہتی ہے کہ

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ (ایمان والے بشیک کامیاب ہوئے)

پھر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

تجھے مبارک ہو (تو) بادشاہوں کی جگہ ہے۔ میری عزت و جلال اور میرے رفعت مکانی کی قسم، میں تیرے اندر کسی ظالم، کنجوس، متکبر اور فخر کرنے والے کو رہنے کی جگہ نہیں دوں گا۔ پھر عرش پر

ایک نظر ڈالتا ہے چنانچہ اس میں دس لاکھ گنا فراخی آجاتی ہے۔ اور ہر فراخی دس لاکھ دنیاؤں سے بھی بڑی ہوتی ہے اور ہر دنیا ایسی ہے کہ اللہ عزّ و جل کے سوا کسی کو اس کا علم نہیں۔ پھر وہ خوش ہلنے لگتا ہے۔ تو حاملینِ عرش پر بھاری ہو جاتا ہے حتیٰ کہ باہم تموّج آنے لگتا ہے اور ایک دوسرے پر گرنے لگتے ہیں۔ ان کی تعداد تمام مخلوقات کے برابر اور تمام مخلوق سے کئی گنا زیادہ ہے۔ اور عرش پکار اٹھتا ہے۔

سُبْحَانَكَ اَیْنَمَا كُنْتَ وَ اَیْنَمَا تَكُوْنُ۔ (تو پاک ہے جہاں بھی ہے اور جہاں بھی ہوگا)

اس کے بعد حاملینِ عرش (فرشتے) یہ تسبیح پڑھتے ہیں۔

سُبْحَانَ مَنْ لَا یَعْلَمُ اَیْنَ هُوَ اِلَّا هُوَ
سُبْحَانَ مَنْ لَا یَعْلَمُ مَا هُوَ اِلَّا هُوَ

(پاک ہے۔ جو نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے سوائے اس کے، پاک ہے کہ اس کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا ہے!)

علمائے متقدمین سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک صدیق کو وحی فرمائی کہ:

"میرے بعض بندے ایسے ہیں جو مجھ سے محبّت کرتے ہیں اور میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ وہ مجھے چاہتے ہیں اور میں انھیں چاہتا ہوں، وُہ مجھے یاد کرتے ہیں اور میں انہیں یاد کرتا ہُوں۔ وُہ میری طرف دیکھتے ہیں اور میں ان کی طرف نظر کرتا ہُوں۔ اب اگر تو بھی ان کی راہ پر چلے تو میں تجھ سے محبت کروں گا اور اگر تو ان سے (الگ ہو کر) دوسری (راہ) پر چلا تو میں تجھ پر غضبناک ہُوں گا۔"

انھوں نے عرض کیا:

"اے پروردگار! ان کی علامت کیا ہے؟"

فرمایا:

"وہ دن میں اندھیرے کے خیال میں ہوتے ہیں جیسے کہ ایک مہربان چرواہا بکریوں کا خیال رکھتا ہے اور وہ غروبِ آفتاب کے لیے بے چین ہوتے ہیں جیسے کہ غروب کے وقت پرندے اپنے گھونسلوں کی طرف لپک کر جاتے ہیں۔ اب جب رات آئی اندھیرا چھا گیا بستر سے لگ گئے اور ہر دوست اپنے دوست کے ساتھ خلوت کرنے لگا تو وہ میرے لیے کھڑے ہو گئے اور میرے سامنے چہرے رکھ دیے۔ میرے سامنے مناجات کرنے لگے۔ اور میرے انعامات کے لیے چپک گئے۔ اب وہ رو پکار رہے ہیں، آہیں بھرتے اور فریاد کناں ہیں۔ کبھی کھڑے ہو کر، کبھی بیٹھ کر اور کبھی رکوع و سجود کر کے عبادت میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ وُہ جو مشقت اٹھا رہے ہیں۔ میری نگاہوں میں ہے اور جو میری محبت کی فریاد کر رہے ہیں وہ میں سُن رہا ہُوں۔ سب سے پہلے میں اُن کے

دلوں میں اپنا نور ڈالوں گا۔ جیسے میں ان کی خبر دے رہا ہوں وہ میری خبر دیں گے۔ دوسرے سات، آسمانوں اور زمین کے درمیان کی اشیاء کا وزن بھی ان کے لیے کم کر دوں گا۔ تیسرے میں ان کی طرف اپنا رُخ کروں گا کہ جس کی طرف میں رُخ کر رہا ہوں، کوئی جانتا ہے کہ میں اسے کیا دینے کا ارادہ رکھتا ہوں۔

رات اور تلاوت قرآن

مالک بن دینارؒ فرماتے ہیں:
"جب بندہ نمازِ تہجد کے لیے اٹھ کر ترتیل کے ساتھ قرآن مجید پڑھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے قریب ہو جاتا ہے۔"

اس کے بعد فرمایا:
"انھیں دلوں میں رقت، حلاوت اور انوارات (علوم کی) آمد ہوتی ہے۔ یہ سب قربِ الٰہی کی دلیل ہے۔"

احادیث قدسی میں آتا ہے کہ
"اے میرے بندے! میں اللہ ہوں جو تیرے دل کے قریب ہوا اور غیب کے ساتھ تُو نے میرا نور دیکھا۔"

حدیث میں آتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا:
"اللہ تعالیٰ نے اس طرح کسی چیز کا حکم (اہتمام سے) نہیں دیا جیسے کہ اچھی آواز سے قرآن پڑھنے کا حکم دیا۔" یعنی تلاوتِ قرآن سے زیادہ کسی چیز کو اس قدر اہتمام سے نہیں سُنتا۔

ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ
اور کھیل کود میں مصروف لوگ ان اتفاقات سے غافل ہیں کہ جو اہل آخرت کو حاصل ہیں اور ان مقامات سے بے خبر ہیں کہ جو انھیں ملے۔

یہ لوگ آسمانوں اور زمین میں جس نشانی پر سے گزرے اس سے اعراض کر کے ہی گزرے بلکہ ان کے دل مستی میں پڑے ہیں ان کے دلوں پر مہر لگا دی گئی۔ اب وہ سنتے ہی نہیں۔

کہتے ہیں کہ وہبؒ بن یمانی نے تیس برس تک زمین پر پہلو نہیں لگایا ان کے پاس چمڑے کا تکیہ تھا جب نیند کا غلبہ ہوتا تو اس پر سینہ رکھتے اور چند سانس لیتے۔ پھر گھبرا کر کھڑے ہو جاتے اور فرماتے:
"میں گھر میں شیطان دیکھنا پسند کر لوں مگر تکیہ پسند نہ کروں یہ تو نیند کی دعوت دیتا ہے۔"

رقبۃ بن مسقلہؒ فرماتے ہیں کہ
میں نے خواب میں اللہ تعالیٰ کو دیکھا۔ میں نے حق تعالیٰ کو فرماتے سُنا:

"میری عزت و جلال کی قسم! ابن سلیمان تیمی کی جائے رہائش بہترین کر دوں گا اس نے چالیس سال تک عشاء کے وضو کے ساتھ صبح کی نماز ادا کی۔"

کہتے ہیں کہ ان کا مذہب ہی یہ تھا۔ اگر دل پر نیند طاری ہو (خمار آ جائے) تو وضو ٹوٹ جاتا ہے کئی بزرگانِ دین ایسے ہیں کہ جن کے بارے میں مشہور ہے اور صحت کے ساتھ مروی ہے کہ وہ تیس تیس سال اور چالیس چالیس برس تک رات رات بھر اللہ کی عبادت میں بیدار رہے۔ چالیس کے قریب ایسے تابعیؒ ہیں جو تیس سے لے کر چالیس سال تک رات رات بھر جاگتے رہے اور عشاء کے وضو کے ساتھ صبح کی نماز پڑھتے رہے ان میں سے بعض کے اسماء حسب ذیل ہیں:

حضرت سعیدؒ بن مسیب، حضرت صفوانؒ بن سلیم مدنی، حضرت فضیلؒ بن عیاض، ابو سلیمانؒ دارانی، علیؒ بن بکار شامی، وہیبؒ بن ورد مکی، طاؤسؒ، وہبؒ بن منبہ یمانی، ربیعؒ بن خیثم، حکمؒ بن جیبنہ کوفی، ابو عبداللہ خواصؒ، ابو عاصم عبادیؒ، حبیب ابو محمدؒ، ابو جابرؒ سلمانی فارسی، مالکؒ بن دینار، سلیمان تیمیؒ، یزید رقاشیؒ، حبیب بن ابی ثابتؒ بصری، یحییٰ البکار بصریؒ، کہمسؒ بن منہال۔

موخر الذکر ایک ماہ میں نوے بار قرآن مجید ختم کرتے۔ اور اگر آیت نہ سمجھتے تو اسے دوبارہ پڑھتے۔ اہل مدینہ میں سے اکثر ایسے لوگ ملتے ہیں۔ ابو حاتمؒ اور محمد بن منکدرؒ جیسے مدنی تابعین اس میں مشہور رہیں۔

تقسیمِ شب

اگر مرید پسند کرے تو رات کا پہلا تیسرا حصہ سو جائے اور نصف رات قیام کرے۔ پھر آخری چھٹا حصہ سو جائے اور اگر چاہے تو نصف رات تک سوتا رہے پھر تیسرا حصہ تک قیام کرے اور آخری چھٹا سو جائے منقول ہے کہ یہ افضل ترین قیام ہے۔ حضرت داؤد نبی اللہ علیہ السلام کا یہی طریقۂ قیام تھا۔ یہ دو روایات میں مذکور ہے اور اگر چاہے تو دونوں میں قیام پہلے کر لے اور سحری کے وقت وتروں کو آخر میں ادا کر لے اگر نصف رات قیام کیا تو رات کی ابتداء اور آخر شب میں سو جائے اور اگر ابتداء رات میں غلبۂ نیند تک قیام کرے، پھر سو جائے۔ پھر جب بیدار ہو تو قیام کرے اور جب نیند غالب آنے لگے تو رات کے آخری حصہ میں سو جائے۔ اب رات میں دو بار قیام کیا اور دو بار سویا۔ یہ رات کی سخت کوشی ہے اور سخت ترین عمل ہے۔ اہل حضور اور اہلِ تذکار کا یہی عمل ہے۔ اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ کا بھی یہی عمل رہا ہے۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

اگر تم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیام کرتا دیکھنا چاہتے تو دیکھ لیتے اور اگر تم جناب رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کو سوتا دیکھنا چاہتے تو دیکھ لیتے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے اصحاب عزیمت صحابہؓ کا قیام شب کے بارے میں یہی طریقہ ہے اور تابعین میں سے ایک جماعت اس پر کاربند رہی ہے۔

قیامِ شب کی توفیق

قیام شب اور نیند دونوں کا انتہائی متوازن ہونا نبی ورسول کو ہی حاصل ہوتا ہے جس کا قلب اللہ تعالیٰ کی وحی کی برکت سے ہمیشہ بیدار رہتا ہے اور اس طریق پر چلنے کی توفیق چند خاص امور سے ہی حاصل ہوتی ہے۔ اس راہ کا یہی زادِ راہ ہے اور آپ جانتے ہیں کہ زادِ راہ کے بغیر سفر طے نہیں ہوسکتا۔ اب جو اس راہ پر چلنا چاہے تو اس کی تدابیر اختیار کرے اور اس کا زادِ راہ حاصل کرے۔ قیامِ شب کی توفیق حسب ذیل امور سے حاصل ہوتی ہے۔

۱۔ دل میں ایک دائمی غم داخل ہوجائے (جو اسے بے چین کیے رکھے)۔

۲۔ ایک دائمی بیداری قلب میں آجائے جو اسے بیدار رکھے۔

۳۔ ساتھ ہی ملکوت میں فکر کرتا رہے۔

۴۔ کھانے سے معدہ خالی ہو اور پینے میں بھی کمی رہے۔

۵۔ دن میں قیلولہ کرلیا کرے۔

۶۔ امورِ دنیا میں بدن کو نہ تھکائے۔

۷۔ مزید پوری محنت سے قیامِ شب کی عادت ڈالے۔ حتیٰ کہ وہ شب بیداری سے مانوس ہوجائے بلکہ دل کے خوف و رجاء کے باعث یہ (عزم) اس کے دل میں پختہ ہوجائے۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے روایت ہے کہ

"میرا وہ بندہ جو میرا صحیح ترین بندہ ہے۔ وہ ہے کہ جو قیام (شب) کے لیے مرغ کی آواز کا انتظار نہ کرے۔" اس میں سحری سے پہلے ہی قیام لیل پر آمادگی پائی جاتی ہے اور آخری رات میں سونے کو دو وجوہ سے مستحب سمجھتے ہیں۔

۱۔ اس سے صبح کی نماز میں اونگھ سے نجات مل جاتی ہے (صحابہؓ کرام صبح کی نماز میں اونگھنے کو برا سمجھتے اور جو اونگھ رہا ہوتا اسے نمازِ فجر کے بعد سونے کا حکم دیتے۔

۲۔ اس سے چہرے کی زردی بھی کم ہوجاتی ہے۔ اب اگر بندہ رات کا بیشتر حصہ عبادت کرتا رہے اور سحری کے وقت نیند کرلے تو صبح کے وقت اونگھ ختم ہوجائے گی اور چہرے کی زردی بھی غائب

ہو جائے گی اور اگر رات کا اکثر حصہ سوتا رہے۔ مگر سحری کو بیدار رہے تو صبح کی نماز میں اُونگھ ہو گی۔ انسان کو اس سے بچنا چاہیے اس لیے کہ یہ بھی شہرت اور مخفی خواہش (ریا) ہے اور رات کو پانی کم پیئے گا ہے اس سے آخر شب میں یا بیدار ہونے کے بعد چہرہ پر زردی آجاتی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے آخری حصہ میں وتر ادا فرماتے۔ پھر اگر آپؐ کو حاجت ہوتی تو زوجہ کے پاس آتے ورنہ حضرت بلالؓ کے آنے تک جائے نماز پر ہی لیٹ جاتے (جب بلالؓ آتے) تو وہ نماز کی اطلاع دیتے۔ نیز فرماتی ہیں کہ میں نے آپؐ کو یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سحری کے وقت سوتے ہی دیکھا (یعنی آپؐ کا یہ زیادہ تر معمول تھا)

دوسری حدیث میں آتا ہے کہ جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رات کے آخری حصہ میں وتر ادا کر لیتے تو دائیں پہلو پر لیٹ جاتے۔ آخر حضرت بلالؓ آتے اور پھر آپؐ ان کے ہمراہ نماز کے لیے باہر تشریف لاتے چنانچہ نمازِ صبح سے پہلے اور وتر پڑھنے کے بعد اسلافؒ لیٹ جانے کو پسند کرتے۔ بلکہ بعض اسے سنت بتاتے ہیں مثلاً حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت مروان کے نزدیک یہ سنت ہے۔

اہل حضور اور اہل مشاہدہ حضرات کے لیے آخری شب خصوصاً آخری تہائی شب میں سو لینا (مشاہدہ) میں زیادتی کا باعث ہوتی ہے۔ اس وقت ان پر ملکوتی باتیں کھلتی ہیں اور جبروتی علوم سننے کا موقع حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح مجاہدہ کرنے والوں اور کام کرنے والوں کے لیے یہ چیز سامانِ راحت و سکون ہوتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ نمازِ فجر اور نمازِ عصر کے بعد نماز پڑھنے کی ممانعت ہوئی تاکہ اللہ تعالیٰ کے تابعدار بندوں اور دن رات ذکر اللہ میں مشغول رہنے والوں کو آرام کا موقع مل جائے۔ رات کے آخری حصہ میں نیند کرنا دراصل شب بیداری کرنے والوں کی تھکن دُور کرنے کے لیے ہے اور جو لوگ رات کو سوتے رہتے ہیں ان کے لیے یہ سراسر نقصان ہے۔

قیامِ شب کا طریقہ

مزید برآں انسان کو چاہیے کہ رات کو نوافل ادا کرتے ہوئے درمیان میں بیٹھ کر ایک سو بار تسبیح پڑھ لی جائے۔ اس سے آرام کا موقع بھی مل جائیگا اور مزید عبادت کی توفیق حاصل ہو گی۔ دُوسرے یہ طریقہ اللہ تعالیٰ کی اس کلام کے مفہوم میں بھی داخل ہے۔ فرمایا:

وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُودِ [1]

---

[1] سورۃ ق آیت ۴۰۔

(اور رات میں اس کی تسبیح بیان کر اور سجدے کے بعد)

یعنی اگر نصب پڑھیں جو دو میں سے ایک قرأت ہے تو مطلب ہوگا کہ سجدوں کے بعد تسبیح پڑھا کرو۔ اور اگر زیادہ اوراد کرنا چاہے تو مغرب و عشاء کے اوراد اور سونے سے پہلے کے اوراد کر لیا کرے۔ بعض صوفیاء کا فرمان ہے کہ ان دونوں اوراد کا کرنا دن کے روزہ رکھنے سے بھی افضل ہے۔ اس کے بعد چوتھا ورد شروع کر دے یعنی فجرین کے درمیان کا ورد جو کہ رات کے آخری تہائی حصہ میں کیا جاتا ہے۔ اسے کر لے اور پانچواں ورد سحری کے آخری حصہ سے لے کر صبح صادق کے طلوع ہونے کے درمیان میں کیا جاتا ہے۔ اس وقت تلاوتِ قرآن اور استغفار زیادہ بہتر ہے بشرطیکہ رات کو زیادہ طویل قیام کا عادی نہ ہو۔

حضرت ابو موسیٰؓ اور حضرت معاذؓ کی حدیث میں ہے کہ

جب حضرت معاذؓ کی حضرت ابو موسیٰؓ سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے پوچھا:

"قیامِ شب کے متعلق تمہارا کیا عمل ہے؟"

انھوں نے جواب دیا کہ

"میں ساری رات قیام کرتا ہوں اور بالکل نہیں سوتا اور میں ٹھہر ٹھہر کر قرآن کی تلاوت کرتا ہوں"۔

حضرت معاذؓ نے جواب دیا کہ

"مگر میں تو سوتا ہوں۔ پھر اٹھ کر (نماز پڑھتا ہوں) اور میں جس طرح قیام شب میں سے حصہ لیتا ہوں اسی طرح نیند میں سے بھی حصہ لیتا ہوں"۔

آخر دونوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس بات کا ذکر کیا تو آپؐ نے حضرت ابو موسیٰؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

"معاذؓ تجھ سے زیادہ فقیہ ہے"۔

بعض اسلاف کا طریقہ یہ تھا کہ جب تک نیند کا غلبہ نہ ہو جاتا وہ نہیں سوتے تھے۔ بعض سلفؒ تو یوں فرمایا کرتے کہ:

"یہ پہلی نیند ہے۔ اگر میں بیدار ہو گیا۔ پھر دوسری بار سونے لگا تو اللہ میری آنکھ کو نہ سُلائے"۔

حضرت فزارہ سازؒ سے ابدال کی تعریف پوچھی گئی ان کے پاس اکثر یہ حضرات تشریف لایا کرتے تھے۔ فرمانے لگے:

"ان کی خوراک فاقہ ہے۔ ان کی نیند غلبہ ہے اور ان کا کلام ضرورت کی بناء پر ہے اور ان کی

خاموشی حکمت ہے اور ان کا علم قدرت ہے۔"

ایک اور بزرگ سے خائفین (ڈرنے والوں) کی تعریف پوچھی گئی تو فرمایا:

"ان کا کھانا بیماروں کا کھانا ہے۔ اُن کی نیند ڈوب جانے والی نیند ہے۔"

انسان کو چاہیے کہ وہ ہر رات میں پانچواں یا چھٹا حصہ ضرور قیام کرے اس میں ناغہ نہ ہونے پائے ہر رات کے اوراد میں سے ایک یا دو ورد ہیں۔ طوالتِ عبادت کے اختلاف کے اعتبار سے یہ دو اوراد بنتے ہیں، چاہے مسلسل قیام شب کرے یا تفریق سے قیام کرے۔ الغرض رات میں کوئی سا بھی ورد کرے اسے شب بیداری کا فائدہ حاصل ہُوا اور جو نصف یا زیادہ رات تک عبادت کرتا رہا گویا اس نے ساری رات اللہ کی عبادت کی اور رات کا باقی حصہ اس پر صدقہ ہُوا اور جو آدمی رات کو بیس رکعات پڑھے اور ان کے بعد تین وتر پڑھے۔ اللہ کے فضل و کرم سے اس کے متعلق یہ لکھا جائے گا کہ اس نے ساری رات عبادت کی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کبھی نصف رات اور کبھی ایک تہائی اور دو تہائی تک قیام فرماتے۔ آپؐ کا یہ قیامِ شب سورہ مزمل کی پہلی دو آیات میں مذکور ہے اور گاہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نصف رات تک اور گاہے مزید چھٹا حصہ تک قیام کرتے اور گاہے صرف چھٹا حصہ قیام کرتے۔ قیام شب کی یہ صورتیں آخری دو آیات میں مذکور ہیں۔ یہ مفہوم تب ہوگا کہ ہم نصفہٗ و ثلثہٗ میں کسرہ پڑھیں اور اگر نصب سے قرأت ہو تو مطلب اس طرح ہوگا کہ آپؐ نصف رات مع چھٹے حصہ کے نصف تک اور صرف نصف رات اور صرف تہائی رات تک قیام فرماتے جیسے کہ ہم پہلی آیت میں بیان کر چکے ہیں۔ تفاسیر میں اس طرح مذکور ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ (قیامِ شب یعنی نماز تہجد) فرض تھی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو قیامِ شب کا حکم دیا اور دوسری آیت میں آپؐ کے قیام کی کیفیت کی خبر دی کہ وہ کس انداز کا تھا۔ اب اللہ نے جس کی خبر دی اس پر دوام کا مفہوم ہی بلند پایہ وصف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو یہ حکم دیا کہ:

قُمِ الَّیْلَ (قیامِ شب کرو)

پھر اِلَّا قَلِیْلًا کہہ کر قلیل کا استثناء کر دیا پھر اپنے حکم کی وضاحت فرمائی کہ نِصْفَہٗ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا یعنی کم کر کے بارھواں حصہ کرے یا چھٹا حصہ کر دے (نصف سدس یا نصف ثلث کر دے) عربوں کے ہاں یہ دونوں اقل اسماء النقصان ہیں۔

پھر فرمایا:

اَوْ زِدْ عَلَيْهِ یعنی نصف شب سے زیادہ دیر تک عبادت کر۔ گویا سدس رات کا نصف اس کر دیا۔ اس لیے کہ دُوسری آیت میں دو ثلث سے اقل کی خبر دی تھی۔ فرمایا

اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ۔ (بے شک تیرا رب جانتا ہے کہ تو اٹھتا ہے نزدیک دو تہائی رات کے)

اب یہ ایک نصف اور سدس کا نصف ہوگا اور عربوں کے ہاں یہ اقل تسمیہ ہے۔ پھر فرمایا:

وَنِصْفَهٗ یعنی وُہ جانتا ہے کہ تو نصف شب بھی قیام کرتا ہے۔ وَثُلُثَهٗ اور تہائی شب بھی قیام کرتا ہے۔

یہ اخبار دراصل امر کے صیغہ سے، یعنی کسرہ کی قرأت سے مشابہ ہیں۔

پھر فرمایا:

وَنِصْفَهٗ وَ ثُلُثَهٗ

مراد یہ ہے کہ آپؐ نصف شب سے کم یعنی چوتھائی یا تہائی رات قیام کرتے ہیں اور تہائی سے کم سے مراد یہ ہے کہ چھٹا حصہ یا بارھواں حصہ قیام کرتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بتایا کہ

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کو اس وقت اٹھتے جبکہ صارخ یعنی مرغ کی آواز سنتے۔"

اور یہ صرف سحری کی بات ہے۔ اب یہ رات کا چھٹا حصہ یا بارھواں حصہ ہوتا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے قیامِ شب کرنے والوں کو رخصت عطا فرمائی۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ تحدید نہیں بلکہ تقریب کا مفہوم ہے واللہ اعلم۔ اور ہمارا اختیار نصب ہے اس سے کثرتِ عبادت اور زیادتی بھلائی کا مفہوم نکلتا ہے اس لیے کہ یہ امر کا صیغہ ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ:

"رات کو نماز پڑھا کرو۔ چاہے بکری کا دُودھ دوہنے کی مدت بھر پڑھو۔"

گاہے یہ چار رکعت کی مقدار ہوتی ہے اور گاہے دو رکعت کی مقدار ہوتی ہے۔

حضرت ابُو سلیمان فرماتے ہیں کہ جو دن میں نیکی کرے اسے اس رات میں اجر ملے گا اور جو رات میں نیکی کرے اسے اسی دن میں اجر ملے گا۔"

نیز فرمایا کرتے تھے کہ:

"شب بیداروں کے تین گروہ ہیں:۔

۱۔ جب تفکر کے ساتھ پڑھے تو روئے۔
۲۔ جب تفکر کرے تو چلائے اور چلانے ہی میں اس کی راحت ہے۔
۳۔ جب پڑھے اور تفکر کرے تو مبہوت رہ جائے۔ نہ روئے اور چلائے۔"
میں نے پوچھا کہ یہ کس درجہ سے پہنچا؟ اور وہ کس وجہ سے مبہوت ہوا؟
انھوں نے فرمایا کہ میں اس کی وضاحت نہیں کرسکتا۔
ایک آدمی نے حضرت حسنؒ کو کہا:
اے ابوسعید! میں ٹھیک ٹھاک رات گزارتا ہوں اور رات کو عبادت کرنا چاہتا ہوں۔
وضو کا سامان بھی کرلیتا ہوں۔ اب کیا وجہ ہے کہ اٹھ نہیں سکتا؟
فرمایا:
"اے برادرزادے! تیرے گناہوں نے تجھے جکڑ رکھا ہے۔"
حضرت حسنؒ جب بازار میں داخل ہوئے اور لوگوں کی غلط سلط اور فضولیات سنتے تو فرماتے:
میں دیکھ رہا ہوں کہ ان کی رات بری رات ہے جو یہ گزارتے ہیں۔
بعض سلفؒ کا فرمان ہے کہ
ایسا تاجر حساب کی سختی سے کس طرح بچ سکتا ہے کہ جو دن کو فضولیات میں لگا رہے
اور رات کو پڑا سوتا رہے؟
حضرت ثوریؒ بتاتے ہیں کہ ایک گناہ کے باعث میں پانچ ماہ تک قیام شب تک،
محروم رہا۔
پوچھا گیا کہ وہ کون سا گناہ تھا؟
فرمایا:
میں نے ایک آدمی کو روتے دیکھا تو اپنے دل میں کہا: یہ ریاکاری ہے۔
بعض کا فرمان ہے کہ:
میں کرز بن وبرۃ کے پاس گیا۔ وہ رو رہے تھے۔ میں نے پوچھا:
کیا بات ہے؟ کیا کسی قریبی کی وفات ہوگئی؟
فرمایا:
اس سے بھی سخت بات ہے۔

میں نے پُوچھا کہ کوئی تکلیف اور درد ہے؟

فرمایا:

اس سے بھی سخت تر بات ہے۔

میں نے پُوچھا کہ آخر کیا بات ہے؟

فرمایا کہ میرا دروازہ بند ہے، پردہ لٹک رہا ہے اور گزشتہ رات کو میں اپنا وِرد نہیں کر سکا۔ یہ صرف ایک گناہ کے باعث ہُوا۔

محمد بن شبانہ فرماتے ہیں کہ میں نے بعض ثقہ شیوخ سے سنا جو بغداد میں پوشیدہ رہ رہے تھے، وُہ فرماتے تھے:

میں نے ابن صافی بقال یدینور کو یہ فرماتے سنا:

بدینور دراصل جیل کے داروغہ تھے۔ اُنھوں نے بتایا کہ میں قید خانے کے دروازے پر تیس سے کچھ زاید سالوں تک داروغہ رہا۔ رات کو آوارہ گردی کے جُرم میں جو بھی گرفتار ہو کر قید خانے میں آیا۔ میں نے اس سے پُوچھا کہ تُو نے عشاء کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی۔ وُہ جواب دیتا کہ نہیں۔

حضرت ابوسلیمانؒ فرماتے ہیں:

نماز کی جماعت صرف گناہ کی وجہ سے ہی رہتی ہے۔ فرمایا کرتے تھے کہ رات کو احتلام بھی سزا کی ایک صورت ہے اور جنابت دراصل بُعد ہے۔ گویا یہ نماز اور تلاوت سے بُعد ہے کہ ان دونوں سے قرب حاصل ہو سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اسی قبیل سے ہے کہ

فَبَصُرَتْ بِهٖ عَنْ جُنُبٍ [1]

حضرت حسنؒ فرماتے ہیں کہ

"بندہ ایک گناہ کرتا ہے اور اس کی وجہ سے شب بیداری اور دن کے روزے سے محروم ہو جاتا ہے۔"

بعض علماء کا فرمان ہے کہ

اے مسکین آدمی، جب روزہ رکھو تو دیکھو کہ کس کے پاس افطار کر رہے ہو؟ اور کس کھانے پر

---

[1] سورۃ القصص آیت ۱۱۔

افطار کر رہے ہو؟ اس لیے کہ گاہے بندہ ایسا کھانا کھا لیتا ہے کہ اس کی نحوست سے اس کی پہلی حالت بگڑ جاتی ہے اور پہلی اچھی حالت لوٹ کر نہیں آتی۔

ایک اور شیخ فرماتے ہیں:

کئی ایسے کھانے ہوتے ہیں کہ جو قیامِ شب میں رکاوٹ ہوتے ہیں۔ کئی نظریں ایسی ہیں کہ جن کی وجہ سے تلاوت سے محرومی ہو جاتی ہے۔ بندہ ایک کھانا کھاتا یا ایک کام کرتا ہے تو اس کی نحوست کے باعث ایک سال تک شب بیداری سے محروم ہو جاتا ہے۔ اب اگر مزید تلاش کرو گے تو مزید نقصان معلوم ہو جائے گا اور گناہوں کی کمی سے تلاش کی راہ ملے گی۔

حضرت فضل فرماتے ہیں کہ

اگر شروع میں مجھے قرآن کا فہم اور قیامِ لیل کا معاملہ حاصل ہو جاتا تو جس قدر میں نے حدیث لکھی ہے۔ وہ نہ لکھ سکتا اور مجھے قرآن کے بغیر کوئی انہماک نہ ہوتا۔

صوفیاء کہتے ہیں کہ رات کی طویل عبادت قیامت کی راحتیں ہیں اور رات کی نماز کبیرہ گناہوں کا کفارہ ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ فرائض میں جو نقصان ہو گا وہ رات کی نماز سے پورا ہو جائے گا۔

صحابہ کرامؓ دن کی نماز رکوع و سجود کی کثرت پسند فرماتے اور رات کی نماز طویلِ قیام پسند فرماتے۔

یاد رہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رات کی نماز نافلہ تھی اور ان کے فرائض کی متمم تھی اور ہمارے لیے رات کی نماز ہمارے فرائض کی تکمیل کرتی ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب بندہ سوتا ہے تو شیطان اس کے سر پر تین گرہیں لگا دیتا ہے اب اگر وہ اٹھ کر بیٹھا اور اللہ کو یاد کیا تو ایک گرہ کھل گئی اور اگر وضو کیا تو دوسری گرہ بھی کھل گئی۔ اور اگر نماز پڑھ لی تو تمام گرہیں کھل گئیں۔ اب اس نے فرحت کے ساتھ اور پاکیزہ نفس ہو کر صبح کی ورنہ وہ سست اور ناپاک نفس ہو کر صبح کرے گا۔

اور حدیث میں ہے کہ جب آدمی صبح تک سوتا رہے (اور نماز نہ پڑھے) تو شیطان اس کے کانوں میں پیشاب کر دیتا ہے۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ:

شیطان کا ایک سعوط (ناک میں نسوار کی طرح چڑھانے والی چیز) ہوتا ہے اور ایک

لعوق (چٹنی سی) اور ایک ذرور (سفوف چھڑکنے کی چیز) ہوتا ہے جب وُہ بندے کو ناک میں چڑھائے تو وُہ بداخلاق ہوجاتا ہے اور جب وُہ چٹوا دے تو وہ بدزبان ہوجاتا ہے اور جب اس پر چھڑک دے تو رات بھر سوتا ہے حتّٰی کہ صبح ہوجاتی ہے۔

قیامِ شب پر تین باتوں سے مدد حاصل کی جا سکتی ہے۔

۱۔ حلال کھانا۔

۲۔ توبہ پر ثابت قدمی۔

۳۔ عذاب کے خطرہ کا غم یا ثواب کی اُمید کا شوق۔

جن چیزوں کی وجہ سے بندہ قیامِ شب سے محروم ہوجاتا ہے یا اس کے ساتھ ساتھ اسے طولِ غفلت کی سزا ملتی ہے۔ وُہ یہ ہیں:

۱۔ مشتبہ چیزوں کا کھانا۔

۲۔ گناہوں پر اصرار کرنا۔

۳۔ دل پر دُنیا کے غم کا غلبہ ہوجانا۔

شب و روز کے اذکار

افضل ترین عمل بندے کو چاہیے کہ دن رات میں کچھ تسبیح کا ورد بھی رکھے۔ احادیث میں جو اذکار آتے ہیں ان کی انواع میں سے یہ کم ازکم نو صد بار ہوتے ہیں۔ چنانچہ روزانہ ایک سو بار یہ کلمہ پڑھنا چاہیے۔

(۱) لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَ لَهُ الْحَمْدُ يُحْيِيْ وَ يُمِيْتُ وَ هُوَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ بِيَدِهِ الْخَيْرُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

(تنہا اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ اسی کی سلطنت اور اسی کے لیے حمد ہے۔ وہ زندہ کرتا اور مارتا ہے اور وہ زندہ ہے اور نہیں مرے گا۔ اسی کے ہاتھ میں بھلائی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت والا ہے)

اگر کوئی آدمی مذکورہ کلمات دو سو بار پڑھے تو اس دن اس سے بڑھ کر افضل عمل کسی کا نہ ہوگا۔ اس لیے کہ حدیث میں یہی فضیلت آتی ہے۔

(۲) مزید برآں ایک سو بار یہ دعا بھی پڑھنی چاہیے:

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَ اللّٰهُ أَكْبَرُ وَ تَبَارَكَ اللّٰهُ۔

اللہ پاک ہے اور ساری حمد اللہ کے لیے ہی ہے اور اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ برکت والا ہے۔

(۳) ایک سو بار یہ درود شریف پڑھے:

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَ نَبِيِّكَ وَ رَسُوْلِكَ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ۔

اے اللہ! اپنے بندے اور اپنے نبی اور اپنے رسول، نبی امی پر رحمت فرما۔

(۴) ایک سو بار یہ استغفار پڑھے:

أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ الْحَيَّ الْقَيُّوْمَ وَ أَسْأَلُهُ التَّوْبَةَ۔

میں زندہ قایم رکھنے والے اللہ سے بخشش مانگتا ہوں اور توبہ کا سوال کرتا ہوں۔

(۵) ایک سو بار یہ کلمات کہے:

سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَظِيْمِ وَ بِحَمْدِہٖ۔ (اللہ بزرگ پاک ہے اور اپنی حمد کے ساتھ)

(۶) ایک سو بار یہ دعا پڑھے:

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ الْمُبِيْنُ۔ (اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں۔ شہنشاہ حق اور ظاہر کرنے والا ہے)

(۷) ایک سو بار یہ کلمات پڑھے:

مَا شَاءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ (جو اللہ چاہے اللہ کے بغیر کوئی قوت نہیں)

یہ مندرجہ سات کلمات روزانہ دن میں اور رات میں پڑھے۔ اگر اس سے زاید کی توفیق ہو تو یہ ایک فضیلت ہے ورنہ یہ تعداد ضرور پڑھ لے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم میں ہر روز ان میں بارہ ہزار تسبیحات کے ورد کا معمول تھا تابعین رحمہم اللہ میں تیس ہزار تک روزانہ کا معمول تھا۔

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ سے ہمیں روایت پہنچی کہ اُنھوں نے بعض ابدال سے نقل کیا کہ:

ایک روز وہ ساحلِ سمندر پر کھڑے اللہ کی عبادت کر رہے تھے کہ اُنھوں نے کسی کو بلند آواز سے تسبیح پڑھتے ہوئے سُنا، مگر کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ پُوچھا:

"بھائی تُو کون ہے؟ میں تیری آواز سُنتا ہُوں مگر تیرے وجود کو نہیں دیکھتا۔"

اس نے جواب دیا کہ:

"میں اس سمندر پر موکل (متعین) فرشتہ ہُوں اور جب سے پیدا ہُوا ہُوں تب سے اللہ تعالےٰ کی یہ تسبیح پڑھ رہا ہُوں (وہ فرماتے ہیں کہ)

میں نے پوچھا: "تیرا نام کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا: "(میرا نام) مہیہائیل ہے۔"

میں نے پُوچھا: "جو یہ کلمات کہے اس کو کس قدر ثواب ملے گا۔"

اس نے جواب دیا: "جو یہ کلمات روزانہ سو بار پڑھے وُہ جنّت میں اپنی جگہ دیکھے بغیر نہیں مرے گا۔ یا اسے یہ جگہ (مرنے سے پہلے) دکھائی جائے گی۔ وُہ تسبیح یہ ہے:

سُبْحَانَ اللّٰهِ الْعَلِيِّ الدَّيَّانِ، سُبْحَانَ اللّٰهِ شَدِيْدِ الْاَرْكَانِ، سُبْحَانَ مَنْ يَّذْهَبُ بِاللَّيْلِ وَ يَاْتِيْ بِالنَّهَارِ (پاک ہے اللہ بزرگ غالب، پاک ہے اللہ بہت قوت والا۔ پاک ہے وہ جو رات لے جاتا ہے، اور دن لاتا ہے۔ پاک ہے وہ جس کو کوئی شان

سُبْحَانَ مَنْ لَا يُشْغِلُهٗ شَأْنٌ عَنْ شَانٍ ، سُبْحَانَ اللّٰهِ الْحَنَّانِ وَالْمَنَّانِ ، سُبْحَانَ اللّٰهِ الْمُسَبَّحِ فِیْ كُلِّ مَكَانٍ ۔

دُوسری شان سے مشغول نہیں کرتی ۔ پاک ہے اللہ مہربان احسان کرنے والا ۔ پاک ہے اللہ ہر جگہ میں اس کی تسبیح بیان کی جاتی ہے)

نوافل کی کثرت

اور اگر کسی کے نوافل وغیرہ کے اوراد مقرر ہوں تو بہتر ہے انہیں کرلے تابعین میں رواج تھا کہ ہر روز تین سو یا چار سو نوافل ادا کرتے ۔ بعض شیوخ سے چھ سو سے لے کر ایک ہزار تک نوافل پڑھنا منقول ہے اور کم سے کم روزانہ ایک سو نوافل پڑھنا مروی ہے ۔

حضرت کرز بن وبرۃ مکہ میں اقامت گزیں تھے ۔ ہر دن میں ستّر طواف کرتے اور ہر رات میں ستّر طواف کرتے ۔ فرماتے ہیں ہم نے حساب کیا تو یہ دس فرسخ کی مسافت بن جاتی اور ان میں دو سو اسّی (۲۸۰) رکعتیں ہو جاتیں ۔

تلاوتِ قرآن مجید

نیز بتایا کہ اس کے ساتھ ساتھ وُہ دن رات میں دو بار قرآن مجید ختم کرتے ۔

حضرت ہشام بن عروۃ فرماتے ہیں کہ

میرے والد جس طرح مداومت سے تلاوتِ قرآن کرتے اسی طرح تسبیح پر بھی مداومت کرتے ۔ ان سے یہ بھی مروی ہے کہ جس طرح تلاوتِ قرآن پر مداومت کرتے اسی طرح روزانہ بلاناغہ دعاؤں کا ایک حصّہ بھی پڑھا کرتے ۔

بندے کو چاہیے کہ پانچ نمازوں کے بعد تسبیحات پابندی سے پڑھے اور ہر نماز کے بعد ایک سو تسبیح ضرور پڑھے ۔ اسی طرح سوتے وقت بھی یہ تسبیحات پڑھے (ان سے مراد تسبیحاتِ فاطمہؓ ہیں) بندے کو صبح و شام اللہ تعالیٰ کے اس فرمان (لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) کی تفسیر میں جو آیا ہے وُہ بھی پڑھنا چاہیے ۔ اس لیے کہ اس میں بہت ہی ثواب ہے ۔

ایک عجیب ورد

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے اس آیت (لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) کی تفسیر دریافت کی تو آپؐ نے فرمایا کہ :

تو نے مجھ سے ایسی چیز دریافت کی کہ تجھ سے پہلے کسی نے یہ نہیں پوچھی ۔ اس کی تفسیر یہ (کلمات) ہیں :۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اللّٰہُ اَکْبَرُ وَ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ بِحَمْدِہٖ وَ لَا حَوْلَ وَ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ وَ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاہِرُ وَ الْبَاطِنُ وَ لَہُ الْمُلْکُ وَ لَہُ الْحَمْدُ بِیَدِہِ الْخَیْرُ وَ ھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

(اللہ تنہا کے بغیر کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے اور اللہ پاک ہے اور اپنی حمد کے ساتھ اور اللہ کے بغیر نہ ہی ڈر ہے اور قوت ہے اور میں اللہ سے بخشش مانگتا ہوں۔ وہ اول و آخر ہے اور وہ ظاہر و باطن ہے۔ اس کی ملکیت ہے اور اس کی حمد ہے۔ اس کے ہاتھ میں بھلائی ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت والا ہے۔)

جو آدمی یہ کلمات (مندرجہ بالا) صبح اور شام کو دس دس بار کہے گا۔ اسے چھ خصائل عطا کی جائیں گی۔

۱۔ پہلی خصلت یہ ہے کہ ابلیس اور اس کے لشکر سے اس کی حفاظت کی جائے گی۔

۲۔ اس کو ایک قنطار ثواب ملے گا۔

۳۔ جنت میں اس کے لیے درجہ بلند کیا جائے گا۔

۴۔ اللہ تعالیٰ حورعین کے ساتھ اس کا نکاح فرمادے گا۔

۵۔ اس کے پاس (اکرام وتسلی کی خاطر) بارہ فرشتے آئیں گے۔

۶۔ اس کو اس قدر اجر ملے گا کہ جیسے کوئی حج اور عمرہ کرے۔

ایک اور روایت سے اس آیت کی تفسیر منقول ہے کہ اس کے ساتھ ہی اہل جنت کے خزانہ کا ذکر ہوا کہ وہ کیا ہے؟ اگر اسے بھی ملا لیا جائے تو دو روایتیں جمع ہوگئیں۔ اور اس کے اندر دو فضیلتیں آگئیں۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے نقل کیا۔ اُنھوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مسائل دریافت کیے تو آپؐ نے ان کا جواب دیا (حضرت عثمانؓ) نے دریافت کیا کہ آسمانوں اور زمین کے مقالید کیا ہیں؟

آپؐ نے فرمایا: وہ یہ ہیں کہ بندہ یہ کلمات کہے:

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ط

اور اہل جنت کا خزانہ یہ ہے کہ یوں کہے:

سُبْحَانَ مَنْ فِی السَّمَآءِ عَرْشُہٗ، سُبْحَانَ مَنْ فِی السَّمَآءِ مَوْضِعُ اَثَرِہٖ، سُبْحَانَ مَنْ سَبَقَتْ رَحْمَتُہٗ غَضَبَہٗ، سُبْحَانَ

(پاک ہے وہ کہ آسمان میں جس کا عرش ہے، پاک ہے وہ کہ آسمان میں جس کی جائے علامت ہے۔ پاک ہے وہ کہ جس کا غضب اپنی رحمت پر بڑھ گیا۔ پاک ہے وہ

مَنۡ لَا مَلۡجَأَ وَلَا مَهۡرَبَ اِلَّا اِلَيۡهِ۔ کہ جس کے بغیر کوئی جائے پناہ اور جائے فرار نہیں)

اے عثمان! جو آدمی ہر روز ان کلمات کو دس بار پڑھے گا اس کے لیے چھ خصائل لکھی جائیں گی۔ اللہ تعالیٰ اسے ابلیس اور اس کے لشکر سے نجات دے گا۔ اگر وہ اس دن مرا تو شہید ہوگا۔ اس کے لیے جنت میں ایک محل بنایا جائے گا۔ گویا اس نے تورات، انجیل، زبور اور قرآن کی تلاوت کی اور گویا اس نے بنی اسمٰعیل سے آٹھ غلام خرید کر آزاد کیے اور یہ چھ آیات ہر نفل اور فرض نماز کے موقع پر پڑھتا رہے۔ اس میں بہت ہی اجر ہے آیات یہ ہیں:

ابدال جیسا اجر

سُبۡحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الۡعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوۡنَ سے لے کر آخر سورت تک اور فَسُبۡحَانَ اللّٰهِ حِيۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَحِيۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ سے لے کر وَ كَذٰلِكَ تُخۡرَجُوۡنَ تک۔

تمام مومن مردوں اور مومن عورتوں کے لیے روزانہ پچیس بار بخشش مانگے اور یہ بخشش صبح و شام روزانہ مانگے۔ اس کی برکت سے اس کا نام ابدال لکھا جائے گا۔

حدیث میں استغفار کے یہ الفاظ مروی ہیں کہ یوں کہے:

اَللّٰهُمَّ اغۡفِرۡ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَ الۡمُؤۡمِنَاتِ وَالۡمُسۡلِمِيۡنَ وَ الۡمُسۡلِمَاتِ حَيِّهِمۡ وَ مَيِّتِهِمۡ شَاهِدِهِمۡ وَ غَائِبِهِمۡ قَرِيۡبِهِمۡ وَ بَعِيۡدِهِمۡ اِنَّكَ تَعۡلَمُ مُنۡقَلَبَهُمۡ وَ مَثۡوَاهُمۡ۔

(اے اللہ اہل ایمان مردوں اور عورتوں کو اور مسلمان مردوں اور عورتوں کو، ان کے زندوں اور مردوں کو، ان کے موجود اور غائب کو، ان کے قریب و دور والوں کو بخش دے۔ بیشک تو ان کے لوٹنے کی جگہ اور ٹھکانا جانتا ہے)

اور ہر روز دس بار یہ کلمات پڑھے:

اَللّٰهُمَّ اَصۡلِحۡ اُمَّةَ مُحَمَّدٍ اَللّٰهُمَّ ارۡحَمۡ اُمَّةَ مُحَمَّدٍ اَللّٰهُمَّ فَرِّجۡ عَنۡ اُمَّةِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَ سَلَّمَ۔

(اے اللہ! اُمتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اصلاح فرما دے۔ اے اللہ! امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم فرما دے۔ اے اللہ! امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے تکالیف ہٹا دے)

منقول ہے کہ جو آدمی یہ کلمات روزانہ پڑھے گا۔ اسے ابدال میں سے ایک بدل کا ثواب ملے گا۔

شکرِ نعمت

صبح اور شام تین تین بار یہ دعا بھی پڑھے:

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ خَلَقْتَنِیْ ، وَ اَنْتَ ھَدَیْتَنِیْ ، وَ اَنْتَ تُطْعِمُنِیْ ، وَ اَنْتَ تَسْقِیْنِیْ ، وَ اَنْتَ تُمِیْتُنِیْ ، وَ اَنْتَ تُحْیِیْنِیْ ، اَنْتَ رَبِّیْ ، لَا رَبَّ لِیْ سِوَاکَ ، وَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ وَحْدَکَ لَا شَرِیْکَ لَکَ۔

(اے اللہ! تو نے مجھے پیدا فرمایا اور تو نے مجھے ہدایت دی اور تو ہی مجھے کھلاتا ہے اور تو ہی مجھے پلاتا ہے اور تو ہی مجھے مارتا ہے اور تو ہی مجھے زندہ کرتا ہے۔ تو ہی میرا رب ہے۔ تیرے سوا میرا اور کوئی رب نہیں اور تنہا تیرے سوا میرا کوئی معبود نہیں۔ تیرا کوئی شریک نہیں)

جس نے یہ کلمات کہے اُس نے اِس دن کا شکرِ نعمت ادا کر دیا۔

صبح و شام کے دُوسرے اوراد

نیند سے بیدار ہونے پر اور سوتے وقت ہمیشہ یہ دعا پڑھا کرے :

بِسْمِ اللّٰہِ مَا شَآءَ اللّٰہُ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ ، مَا شَآءَ اللّٰہُ کُلُّ نِعْمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ ، مَا شَآءَ اللّٰہُ اَلْخَیْرُ کُلُّہٗ بِیَدِ اللّٰہِ ، مَا شَآءَ اللّٰہُ لَا یَصْرِفُ السُّوْٓءَ اِلَّا اللّٰہُ۔

(اللہ کے نام سے جو اللہ چاہے اللہ کے بغیر کوئی قوت نہیں، جو اللہ چاہے ہر نعمت اللہ کی جانب سے ہے، جو اللہ چاہے تمام بھلائی اللہ کے قبضے میں ہے، جو اللہ چاہے اللہ کے بغیر کوئی تکلیف دُور نہیں کر سکتا)

مذکورہ دعا پڑھنے والا اللہ عزوجل کی حفاظت میں ہوگا۔ شیطان سے محفوظ رہے گا۔ حدیث میں آتا ہے کہ جو آدمی عرفہ کے روز غروبِ آفتاب سے پہلے ایک سو بار یہ کلمات کہے گا۔ اللہ عزوجل اپنے عرش کے اُوپر سے آواز دے گا۔

"تو نے مجھے راضی کر دیا اور مجھ پر تجھے راضی کرنا لازم ہے۔ مانگ جو چاہیے، میں تجھے عطا کروں گا۔"

صبح اور شام یہ دعائیں بھی ہمیشہ پڑھتا رہے اور کبھی ناغہ نہ کرے۔

فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِیَ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَ ھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِیْمِ۔

(اب اگر وُہ پھر جائیں تو کہہ دو مجھے اللہ کافی ہے، اس کے بغیر کوئی معبود نہیں۔ میں نے اسی پر بھروسہ کیا اور وہ عرش عظیم کا پروردگار ہے۔)

مندرجہ بالا کلمات سات بار صبح و شام پڑھے اور سات سات بار حسب ذیل دعا بھی پڑھا کرے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ الْجَنَّۃَ وَ اَعُوْذُبِکَ مِنَ النَّارِ۔

(اے اللہ! میں تجھ سے جنّت مانگتا ہوں اور دوزخ سے پناہ چاہتا ہوں)

اور جب اذان سُنے تو مؤذن کے کہے ہُوئے کلمات دُہرائے اور اس کے بعد یہ دعا کرے :

رَضِيْتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَ بِالْاِسْلَامِ دِيْنًا، وَ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ نَبِيًّا اَللّٰهُمَّ بِهٰذِهِ الدَّعْوَةِ التَّامَّةِ وَ الْكَلِمَةِ الصَّادِقَةِ ، وَ الصَّلٰوةِ الْقَائِمَةِ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ آلِهٖ ، وَ اَعْطِهِ الْوَسِيْلَةَ وَ الْفَضِيْلَةَ ، وَ ابْعَثْهُ الْمَقَامَ الْمَحْمُوْدَ الَّذِيْ وَ عَدْتَّهٗ -

(میں اللہ کے رب ہونے پر، اور اسلام کے دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے پر راضی ہو گیا اے اللہ! اس کامل پکار اور سچے کلام اور کھڑے ہونے والی نماز کے وسیلہ سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل پر رحمت فرما اور آپ کو وسیلہ اور فضیلت عطا فرما اور آپ کو قیامِ محمود عطا فرما جس کا تو نے وعدہ فرمایا۔)

اب اگر مغرب کی اذان ہو تو ان کلمات کا اضافہ کر لے :

اَللّٰهُمَّ هٰذَا اِقْبَالُ لَيْلِكَ وَ اِدْبَارُ نَهَارِكَ وَ اَصْوَاتُ دُعَاتِكَ وَحُضُوْرُ صَلَاتِكَ وَ شُهُوْدُ مَلَائِكَتِكَ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ آلِهٖ -

(اے اللہ! یہ تیری رات کی آمد اور تیرے دن کی واپسی اور تجھے پکارنے والوں کی آوازیں ہیں اور تیری نماز کا وقت اور تیرے فرشتوں کی آمد کا وقت ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل پر رحم فرما)

اور فجر کی اذان کے وقت مذکورہ کے ان الفاظ اِقْبَالُ لَيْلِكَ وَ اِدْبَارُ نَهَارِكَ کو بدل کر اس طرح پڑھے۔

هٰذَا اِقْبَالُ نَهَارِكَ وَ اِدْبَارُ لَيْلِكَ۔

(کہ یہ تیرے دن کی آمد اور تیری رات کی واپسی ہے)

اس کے بعد جو چاہے دُعا کرے۔ اذان اور اقامت کے درمیان نماز اور دعا جس قدر ہو سکے پڑھے۔ اس لیے کہ اس وقت قبول کی جائے گی۔

ابدال کی خاص دُعا بندے کو چاہیے کہ حسب ذیل دعا ہر وقت کرتا رہے۔ یہ دعا ابدال کی ہے اور ان کے اوقات اس سے معمور رہتے ہیں۔

مَا شَآءَ اللّٰهُ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَفُوُّ الْغَفُوْرُ، يَا سَلَامُ سَلِّمْ ، يَا رَبِّ يَا رَبِّ ، يَا ذَا الْجَلَالِ وَ الْاِكْرَامِ ، اِفْتَتِمْ بِخَيْرٍ وَ اخْتِمْ بِخَيْرٍ ، فَلَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ،

(جو اللہ چاہے۔ اللہ کے بغیر کوئی قوت نہیں، معاف کرنے والا بخشنے والا ہے۔ اے سلام اے پروردگار اے پروردگار۔ اے جلال و اکرام والے، بھلائی کے ساتھ آغاز فرماؤ اور بھلائی کے ساتھ اختتام فرماؤ۔ چنانچہ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں۔ زندہ قایم رکھنے والا ہے

سُبْحَانَ رَبِّنَا اَنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ۔ يَا رَبِّ يَا رَبِّ، يَا اَللّٰهُ يَا اَللّٰهُ ، يَا عَزِيْزُ يَا عَزِيْزُ ، يَا قَرِيْبُ يَا قَرِيْبُ ، يَا حَلِيْمُ يَا سَتَّارُ ، سُبْحَانَ رَبِّنَا اَنْ كَانَ وَعْدُ رَبِّنَا لَمَفْعُوْلًا ، يَا اَللّٰهُ يَا اَللّٰهُ ، يَا عَزِيْزُ يَا عَزِيْزُ ، يَا قَرِيْبُ يَا قَرِيْبُ ، يَا كَرِيْمُ ، يَا غَفَّارُ ، يَا وَاسِعَ الْمَغْفِرَةِ اِغْفِرْلِیْ ، عَافِنَا وَاعْفُ عَنَّا ، نَسْاَلُكَ الْعَفْوَ وَ الْعَافِيَةَ يَا غِيَاثَ الْمُسْتَغِيْثِيْنَ ۔

پاک ہے ہمارا رب ، ہمارے رب کا وعدہ ہو کر رہے گا ۔ اے پروردگار ، اے پروردگار ، اے اللہ ، اے اللہ ، اے غالب اے غالب ، اے قریب اے قریب ، اے بردبار ، اے پردہ پوشی کرنیوالے ، پاک ہے ہمارا رب ، ہمارا رب کا وعدہ البتہ پورا ہو کر رہے گا اے اللہ اے اللہ ، اے غالب ، اے غالب ، اے قریب اے قریب ، اے کریم ، اے بخشنے والے ، اے وسیع بخشش والے مجھے بخش دے ، ہمیں بچالے اور ہمیں فرمادے ۔ ہم تجھ سے معافی اور عافیت چاہتے ہیں ۔ اے فریادیوں کی فریاد سننے والے)

ہم نے جس قدر فضائل ذکر کیے ہیں یہ سب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ، صحابہؓ اور تابعینؒ سے منقول ہے ۔ ہم نے اختصار کے باعث فضائل اعمال کی تفصیلات ترک کر دیں اور ہماری غرض بھی اوراد کی شرح ہی تھی ۔

مسواک سے رب راضی ہوتا ہے

بیدار ہو کر اور رات کو ہمیشہ مسواک کرتا رہے اس لیے کہ روزہ دار کی یہ بہترین خصلت ہے ۔ البتہ عصر کی نماز کے بعد مسواک (بعض کے نزدیک) مکروہ ہے ۔

حدیث میں آتا ہے " منہ میں مسواک کر کے قرآن کے انداز عمدہ کرو "

حدیث میں آتا ہے " مسواک منہ کو پاک کرنے والی ہے ، رب عزّ وجل کو راضی کرنے والی ہے "

نیز یہ بھی منقول ہے کہ مسواک والی نماز بغیر مسواک کی نماز سے ستر گنا افضل ہے ۔

چار اوقات میں مسواک کی بہت زیادہ تاکید ہے ۔

۱۔ روزہ دار کے لیے زوال سے پہلے

۲۔ جمعہ کے روز غسل کے ساتھ ساتھ مسواک کرنے کی بھی تاکید ہوئی

۳۔ رات کے قیام کے موقع پر ۔

۴۔ نیند سے بیدار ہونے پر ۔

روزانہ صدقہ کرو

بندے کو چاہیے ہر دن اور رات میں کچھ نہ کچھ صدقہ کرتا رہے ۔ چاہے

ایک لقمہ یا ایک کھجور کے برابر ہی صدقہ کرے ۔ حتیٰ کہ بعض اسلاف لسن اور دھاگے تک خیرات کرتے

حدیث میں آتا ہے :

" ہر آدمی قیامت کے روز اپنے صدقہ کے سایہ میں ہو گا "

اور اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ مسلسل خیرات پر انعام دیتا اور قبول کرتا ہے ، چاہے کم ہو اور یہ (مسلسل صدقہ) کثیر مگر منقطع صدقہ سے زیادہ پسندیدہ ہے ۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ نے کس طرح صدقہ کر کے انقطاع کرنے والے کی مذمت کی ۔ فرمایا :

وَ اَعۡطٰی قَلِیۡلًا وَّ اَکۡدٰی ۔ (اور لایا تھوڑا سا اور سخت نکلا)

اور جنت کے پھلوں کی تعریف کی اور خطاب میں تدبر سے دُنیا کے پھلوں کا عیب بھی ظاہر ہو گیا ۔ فرمایا :

وَ فَاکِہَۃٍ کَثِیۡرَۃٍ لَّا مَقۡطُوۡعَۃٍ وَّ لَا مَمۡنُوۡعَۃٍ [1]

یعنی دنیا کے پھلوں سے زہد اختیار کرو ۔ اس لیے کہ یہ منقطع ہونے والے ہیں اور دائمی پھلوں میں ہی رغبت ہونی چاہیے ۔

اسلاف کا طریقہ تھا کہ وہ کسی سائل کو واپس نہ کرتے چاہے تھوڑا سا صدقہ ہی ہوتا اس لیے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" (دوزخ) کی آگ سے بچو چاہے کھجور کا ایک ٹکڑا ہو "

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" سائل کا حق ہے چاہے گھوڑے پر آئے اور چاندی کی لگام ہو "

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" سائل کو واپس نہ کرو چاہے جلا ہوا کھُر دو "

ایک بار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے ایک سائل کو انگور کا ایک دانہ دیا ۔ راوی بتاتے ہیں کہ ہم ایک دُوسرے کو دیکھنے لگے (کہ اس قدر قلیل صدقہ !) تو انہوں نے فرمایا :

" تمہیں کیوں حیرت ہے ۔ اس (دانے) میں کئی مثقال ذرات ہیں "

صحابہ کرامؓ کی حالت یہ تھی کہ کسی سے کچھ مانگا جاتا یا کسی امر مباح کا مطالبہ کیا جاتا تو " نہ "

---

[1] سورۃ واقعہ آیت ۳۳ ۔

نہیں کرتے تھے تاکہ خلافِ سنت نہ ہو جائے۔

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق یہ تھا کہ کسی نے آپؐ سے کچھ مانگا تو "نہیں" میں جواب نہ دیتے۔ اگر کچھ پاس نہ ہوتا تو آپؐ خاموش رہتے۔ صحابہ کرامؓ یک جان ہو کر ایک بات پر اجماع کر لیتے اور ان میں سے کوئی بھی اپنے بھائی سے اختلاف نہ کرتا اور نہ ہی ایک دوسرے سے بغض و عناد رکھتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔

یعنی ان کے تمام امور باہم مشورہ سے طے ہوتے ہیں اور ہم نے جو انہیں روزی دی ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں یعنی ان کے امور جُدا جُدا نہیں بلکہ وُہ تمام معاملات میں بھائیوں کی طرح مساوات کا خیال رکھتے ہیں۔

چار کام کرتے رہو

بندے کو چاہیے کہ حسب ذیل چار کام ضرور کرتا رہے:

۱۔ روزہ رکھنا

۲۔ صدقہ کرنا۔

۳۔ مریض کی بیمار پرسی کرنا۔

۴۔ جنازہ میں شرکت کرنا۔

سالکین کا یہ طریقہ رہا ہے اور ان میں انہوں نے خوب انہماک رکھا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ "جس نے یہ چاروں کام ایک روز میں کیے اس کو بخش دیا گیا"۔

بعض روایات میں دخل الجنۃ (جنت میں داخل ہو گیا) کے الفاظ آتے ہیں۔ اب اگر ان میں تین یا دو ہی مل سکیں تو بھی اس کی نیک نیتی کے باعث سب کا اجر مل جائے گا۔

نماز باجماعت ادا کرو

اگر اذان کی آواز سنے یا مسجد قریب ہو تو ہرگز جماعت ترک نہ کرے۔ اور مسجد کے پڑوس پن کی آخری حد یہ ہے کہ اس کے مکان اور مسجد کے درمیان تین گھر واقع ہوں۔ بہتر یہ ہے کہ قریب ترین مسجد میں نماز ادا کرے۔ ہاں اگر اس نیت سے دور کی مسجد میں جائے کہ زیادہ قدموں پر زیادہ اجر ملے گا۔ دور والی مسجد کا امام (علم و تقویٰ میں) افضل ہے تو اجازت ہے اس لیے کہ عالم و متقی آدمی کی اقتداء میں نماز افضل ہوتی ہے یا یہ نیت ہو کہ اللہ تعالیٰ کے فلاں گھر کو اذان و نماز کے ذریعہ آباد کرے تو بھی اجازت ہے۔

حضرت سعید بن مسیبؓ فرماتے ہیں۔

" جس نے پانچوں نمازیں باجماعت ادا کیں اس نے دو خشکیاں اور دو سمندر عبادت سے بھر دیئے۔
انسان کو چاہیئے کہ نماز کے وقت سے پہلے ہی ہر نماز کے لیے وضو کرے۔ اس میں اس کی حفاظت اور حُسنِ معاملہ ہے۔"

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے اللہ کی قسم کھاتے ہوئے فرمایا؛
اور میں نے انھیں کبھی حلف اٹھاتے ہوئے کبھی نہیں سُنا۔ فرمایا؛
اللہ تعالیٰ کو تین اعمال سب سے زیادہ محبوب ہیں؛

۱۔ صدقہ کا حکم دینا۔
۲۔ باجماعت نماز کی جانب قدم اٹھانا۔
۳۔ لوگوں میں اصلاح کرنا۔

گھر سے نکلنے کا طریقہ

مستحب یہ ہے کہ جب مسجد یا اپنے گھر میں داخل ہو تو دو رکعت ادا کرے۔ یہ صالحین کا عمل ہے اور جب گھر یا مسجد سے باہر آنے لگے تو بھی دو رکعت ادا کرے۔ اسلافؒ کا طریقہ تھا کہ گھر سے نکلنے سے پہلے وضو فرمالیتے اور جب وضو ٹوٹے تو نیا وضو بنالے اور جب بھی وضو کرے تو دو رکعت ادا کرے۔ یہ صالحین کا طریقہ ہے جو اس طریق پر مرے گا وہ شہید ہوگا اور جب گھر سے باہر آئے تو یہ دُعا پڑھے:

بِاسْمِ اللّٰهِ مَا شَآءَ اللّٰهُ حَسْبِیَ اللّٰهُ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ، اَللّٰهُمَّ اِلَيْكَ خَرَجْتُ وَ اَنْتَ اَخْرَجْتَنِیْ اَللّٰهُمَّ سَلِّمْنِیْ وَ سَلِّمْ مِنِّیْ فِیْ دِیْنِیْ كَمَا اَخْرَجْتَنِیْ اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ اَنْ اَزِلَّ اَوْ اَضِلَّ اَوْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ اَوْ اَجْهَلَ اَوْ يُجْهَلَ عَلَیَّ عَزَّ جَارُكَ وَ جَلَّ ثَنَاءُكَ وَ لَا اِلٰهَ غَيْرُكَ۔

(اللہ کے نام سے جو اللہ چاہے۔ مجھے اللہ ہی کافی ہے میں نے اللہ پر بھروسہ کیا۔ اللہ کے بغیر کوئی قوت نہیں۔ اے اللہ! میں تیری طرف نکلا اور تو ہی نے مجھے نکالا۔ اے اللہ مجھے سلامت رکھ اور مجھ سے میرے دین میں سلامتی رہے۔ جیسے کہ تو نے مجھے نکالا۔ اے اللہ! میں تیری پناہ میں آتا ہوں اس بات سے کہ میں لغزش کروں یا مجھے گمراہ کیا جائے، یا میں ظلم کروں یا مجھ پر ظلم کیا جائے یا میں جہالت کروں یا مجھ پر جہالت کی جائے تیرا پناہ چاہنے والا عزت مند ہوا اور تیری ثنا بلند ہوئی اور تیرے بغیر کوئی معبود نہیں)

پھر سورۃ الحمد (فاتحہ) اور سورۃ الفلق اور سورۃ الناس پڑھ لے۔

صلوٰۃ الضحیٰ

نماز چاشت (صلوٰۃ الضحیٰ) کا کبھی ناغہ نہ کرے۔ چار رکعت نماز ضحےٰ پر دوام رکھے اور چاہے تو آٹھ یا بارہ رکعت پڑھے، بارہ رکعتوں سے زیادہ نہ پڑھے۔ چاہے تو قیام طویل کرلے اور چاہے تو چھوٹا کرلے۔ بہتر یہ ہے کہ ان رکعات میں سورۃ الشمس، ضحیٰ یا اور سورۃ والضحےٰ پڑھے۔ اور سورۂ بقر کی آخری آیات اور سورۂ حشر کی آخری آیات پڑھے۔ صلوٰۃ الضحیٰ کے بعد جس قدر نوافل چاہے پڑھے مگر وہ اس نماز کے اندر داخل نہ سمجھے۔ اس نماز پر دوام کیے رکھے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں آتا ہے کہ "حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نماز چاشت کی چار رکعتیں ادا کرتے اور جس قدر اللہ چاہتا زیادہ بھی پڑھ لیتے۔"

اللہ عزوجل سے مروی ہے (یعنی حدیث قدسی میں آتا ہے) کہ

"اے ابن آدم! دن کے آغاز میں میرے لیے چار رکعت پڑھ لے۔ میں دن کے آخر تک تیرے لیے کافی (مددگار) ہوں گا۔"

حضرت ام ہانی رضی اللہ عنہا بنت ابی طالب کی حدیث میں ہے کہ

"حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم صلوٰۃ الضحےٰ کی آٹھ رکعتیں پڑھتے۔"

حدیث میں آتا ہے کہ

"ابن آدم صبح کرتا ہے اور اس کے بدن کے ہر جوڑ پر صدقہ لازم ہوتا ہے۔" اور اس کے بدن میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں۔ اب نیکی کا حکم کرنا صدقہ ہے برائی سے منع کرنا صدقہ ہے۔ کمزور کی مدد کرنا صدقہ ہے۔ سیدھی راہ دکھانا صدقہ ہے۔ راستہ سے اذیت کی بات دور کرنا صدقہ ہے حتیٰ کہ تسبیح و تہلیل کا ذکر فرمایا۔

پھر فرمایا:

"اور نمازِ چاشت کی دو رکعتیں ان سب پر کافی ہیں یا فرمایا کہ تیرے لیے یہ سب کو جمع کر دیگی"

نماز فجر کے لیے سحری وقت آئیے

متقدمین کا طریقہ یہ تھا کہ طلوعِ فجر سے پہلے سحری میں مسجد میں آجاتے اور نمازِ فجر تک وہیں بیٹھتے اور اس فعل کو بہت افضل جانتے۔

ایک تابعی کا واقعہ ہے کہ فرمایا:

"میں طلوعِ فجر سے پہلے مسجد میں داخل ہوا تو میں نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو دیکھا کہ وہ مجھ سے پہلے تشریف لا چکے تھے۔"

انہوں نے دریافت کیا:
"بھائی اس وقت تم گھر سے کیوں نکلے؟"
میں نے عرض کیا:
"نمازِ فجر کے لیے۔"
اُنھوں نے فرمایا:
"خوشخبری سُن لے کہ ہم اس وقت نماز کے لیے گھر سے نکلنے اور نماز کی انتظار میں مسجد میں بیٹھے رہنے کو اللہ عزوجل کی راہ میں غزوہ کے درجہ میں سمجھتے تھے یا فرمایا:
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ہمراہ غزوہ کے درجہ میں سمجھتے۔"
چار افضل ترین اوقات ایسے ہیں کہ جن میں دُعا کے قبول ہونے کی غالب اُمید ہوتی ہے۔
۱۔ سحری کے وقت۔
۲۔ طلوعِ آفتاب کے وقت۔
۳۔ غروبِ آفتاب کے وقت۔
۴۔ اذان اور اقامت کے درمیان۔

اسمآ الٰہی کے ذریعہ دُعا

دن رات کے افضل ترین اوقات، فرض نمازوں کے اوقات ہیں اور جب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے دُعا کرے تو اس کے اسمأ کے مفہومات کے ساتھ دعا کرے۔ یہ اس کی صفات ہیں اور اس بات کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اللہ تعالیٰ نے انھیں ظاہر فرمادیا تاکہ دعا کرنے والا انھیں جان لے اور اس طرح دعا کرے:

يَا جَبَّارُ اُجْبُرْ قَلْبِيْ ۔ يَا غَفَّارُ اِغْفِرْ ذَنْبِيْ يَا رَحْمٰنُ اَصْلِحْنِيْ يَا رَحِيْمُ اِرْحَمْنِيْ يَا تَوَّابُ تُبْ عَلَيَّ يَا سَلَامُ سَلِّمْنِيْ ۔

(اے جبار میرے دل کو تھام دے، اے بخشنے والے میرے گناہ بخش دے۔ اے رحمٰن میری اصلاح فرمادے اے رحیم مجھ پر رحم فرما۔ اے توبہ قبول کرنے والے میری توبہ قبول فرما۔ اے سلام مجھے سلامت رکھ)

اور مستحب یہ ہے کہ دن میں اور رات میں روزانہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام ایک بار پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرے اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے مروی ہے کہ فرمایا:
"جو انھیں یاد کرے وُہ جنت میں داخل ہوگا۔"
یہ اسماء مبارکہ قرآن مجید میں مختلف جگہوں میں آتے ہیں چنانچہ جو اللہ تعالیٰ سے ان کے وسیلہ سے

یقین کے ساتھ دعا کرے۔ گویا اس نے اس کا ختم کیا۔ چونکہ یہ متفرق انداز میں تحریر ہیں اس لیے اگر یاد کرنا مشکل ہو تو حروف معجم کے لحاظ سے دیکھ لے۔ مثلاً پہلے الف سے شروع ہونے والے پھر بأ سے پھر تأ سے شروع ہونے والے یاد کرلے۔ مثلاً یا اللہ، یا اول، یا آخر، یا باری، یا باطن، یا تواب، اور گاہے دوسرے حروف کی طرح بعض کا بعض حروف میں پایا جانا مشکل ہوتا ہے البتہ اسماء ظاہرہ کے ساتھ تمام حروف میسرہ میں یہ نکلتے ہیں اور جب ننانوے نام شمار کرلے تو بھی کافی ہیں اس لیے کہ ایک حرف میں دس یا اس سے زیادہ پائے جاتے ہیں اور اگر بعض حروف کا اسم نہ جانے تو کچھ حرج نہیں۔ البتہ تعداد پوری کرلے۔ اس لیے کہ اس تعداد کی حدیث میں فضیلت آئی ہے۔

نمازِ تسبیح

بندے کو چاہیے کہ ہفتہ میں دو بار نمازِ تسبیح پڑھتا رہے۔ ایک بار دن میں پڑھے اور ایک بار رات کے وقت پڑھے۔ نمازِ تسبیح کی چار رکعتیں ہوتی ہیں اور تین سو بار تسبیح (تیسرا کلمہ) پڑھا جاتا ہے۔ اگر دن میں پڑھے تو چاروں رکعتیں ایک سلام کے ساتھ پڑھے اور اگر رات کو پڑھے تو دو رکعت پر سلام پھیر دے۔ سلف صالحین یہ نماز پڑھتے تھے، اس کی برکات سے آگاہ تھے اور اس کی فضیلت کا تذکرہ فرمایا کرتے تھے،

ہمیں اس کے بارے میں دو روایات پہنچی ہیں۔

حدیث (۱) الحکم بن ابان نے حضرت عکرمہؓ سے اور انھوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے حدیث بیان کی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو فرمایا:

"کیا میں تجھے عطا نہ کروں؟ کیا میں تجھے عطیہ نہ دوں؟ کیا تو ایک ایسی چیز کو پسند نہیں کرتا؟ کہ اگر تو اسے کرے تو اللہ تعالیٰ تیرے پہلے کے، بعد کے، پرانے نئے، قصداً اور بغیر ارادہ کے اور مخفی و ظاہر سب گناہ بخش دے؟ (وہ کام یہ ہے) کہ تو چار رکعت نماز ادا کرے۔ ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ اور کوئی ایک سورۃ پڑھے۔ جب پہلی رکعت کی قرأت سے فارغ ہو تو کھڑے کھڑے پندرہ بار یہ پڑھے:

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اللّٰهُ اَكْبَرُ۔

پھر رکوع میں جائے اور (تسبیحاتِ رکوع کے بعد) رکوع کی حالت میں دس بار (مندرجہ بالا کلمہ) پڑھے پھر رکوع سے سر اٹھائے اور (سمع اللہ کے بعد) دس بار اس (کلمہ مذکورہ) کو پڑھے، پھر سجدہ کرے اور سجدہ میں دس بار اس کو پڑھے پھر سجدہ سے سر اٹھائے اور (قعدہ) میں دس بار اسے

پڑھے۔ پھر دوسرا سجدہ کرے اور دس بار اسے پڑھے۔ پھر سجدہ سے سر اٹھائے اور بیٹھ کر دس بار
اسے پڑھے۔ پھر کھڑا ہو کر (دوسری رکعت شروع کرے) اس طرح ہر رکعت میں پچھتّر بار یہ کلمہ بن جائیگا
چاروں رکعتوں میں اسی طرح پڑھو۔

اگر تجھے ہمت ہو تو ہر روز ایک بار پڑھو۔ اور اگر ایسا نہ کرسکو تو ہر جمعہ میں ایک بار پڑھ لو۔ اگر ایسا بھی نہ کرسکو
تو ہر ماہ میں ایک بار پڑھو۔ اور اگر یہ بھی نہ کرسکو تو ہر سال میں ایک بار پڑھ لو اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو ساری عمر میں
ہی ایک بار (تو ضرور) پڑھ لو!

حضرت ابوداؤد سجستانی ؒ فرماتے ہیں کہ نمازِ تسبیح میں اس سے بڑھ کر صحیح حدیث نہیں۔ چنانچہ اس
روایت میں یوں ذکر کیا؛

"حالتِ قیام میں پندرہ بار قرأت کے بعد پڑھے اور پہلی رکعت میں دوسرے سجدہ کے بعد بیٹھ کر
دس بار پڑھے گویا (دوسری رکعت کے لیے) اٹھنے سے پہلے یہ جلسہ (استراحت) ہوا اور دوسری
رکعت میں اسی طرح (دوسرے سجدہ کے بعد) تشہد پڑھنے سے پہلے (دس بار پڑھے)"۔

حدیث (۲) ایک اور حدیث میں اس طرح مروی ہے کہ
نماز شروع کرکے یہ کلمات پڑھے:

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَ بِحَمْدِكَ تَبَارَكَ اسْمُكَ وَ تَعَالٰى جَدُّكَ وَ لَا اِلٰهَ غَيْرُكَ ۔

اس کے بعد پندرہ بار تسبیح (تیسرا کلمہ) پڑھے یعنی قرأت سے پہلے۔ پھر الحمد اور سورت پڑھے۔ پھر دس بار
تسبیح پڑھے۔ پھر رکوع کرے۔ اب حالتِ قیام میں پچیس بار تسبیح بن گئی (اس لیے دوسرے سجدہ کے بعد
دو رکعتوں میں پہلے جلسہ میں اور دوسری رکعت کے بعد تشہد سے پہلے کے جلسہ میں تسبیح نہ پڑھے۔

حضرت عبداللہ بن زیاد بن سمعان نے حضرت معاویہ بن عبداللہ بن جعفر سے انھوں نے اپنے
والد سے اس طرح روایت کیا کہ

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں نمازِ تسبیح سکھائی اور فرمایا کہ
تکبیر کہہ کر نماز شروع کرو۔ پھر انہی کلمات کا ذکر کیا البتہ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ
الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ کا اضافہ کر دیا اور بتایا کہ "یہ پندرہ بار کہے" اور دُوسرے سجدہ کے بعد قیام کرتے
وقت انھیں پڑھنا نہیں بتایا۔ میرے نزدیک یہ روایت دونوں وجوہ سے زیادہ پسند ہے اور
حضرت عبداللہ بن مبارک کی مختار یہی روایت ہے۔

ہمیں حضرت سہل بن عاصم سے انھیں ابن وہب سے روایت پہنچی۔ فرمایا:

میں نے حضرت ابن مبارکؒ سے اس نماز کے بارے میں دریافت کیا کہ جس میں تسبیح پڑھی جاتی ہے تو فرمایا:

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ (آخر تک) پندرہ بار۔ پھر تعوذ پڑھے۔ سورۃ فاتحہ اور کوئی ایک سورت پڑھے۔ پھر دس بار تسبیح کہے۔ پھر رکوع کرے اور باقی کا حصہ ذکر کیا:

پھر فرمایا: یہ پچھتر بار ہوئی۔ اس طریق پر چار رکعتیں ادا کرے۔ اگر تم رات کو پڑھو تو بہتر یہ ہے کہ دو رکعت پر سلام پھیر دو۔ اگر دن کو پڑھو تو چار رکعت پڑھو۔ اور چاہو تو سلام پھیر دو اور جب رکوع میں شمار کرو تو گھٹنوں پر (مثلاً دبا کر) اپنی انگلیوں سے شمار کر لو اور سجدہ میں زمین پر (مثلاً انگلیاں دبا دبا کر) شمار کر لو۔

محمد بن جابرؒ سے روایت ہے۔ فرمایا:

میں نے حضرت ابن مبارکؒ سے دریافت کیا کہ نمازِ تسبیح میں جب میں دونوں سجدوں کے بعد قیام کے لیے سر اٹھاؤں تو کھڑے ہونے سے پہلے کیا سجدہ کروں؟

فرمایا:

"نہیں! یہ قعدہ، سنت نماز سے نہیں" (بلکہ استراحت کا ہے)

ابن ابی رزمہ نے حضرت ابن مبارکؒ سے روایت کیا کہ میں نے اُن سے پُوچھا:

"کیا سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ تین بار اور سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی تین بار پڑھے؟"

اُنھوں نے فرمایا:

"ہاں"

میں نے پُوچھا:

"اگر بھول جائے تو کیا سجدۂ سہو میں دس بار پڑھے؟"

فرمایا:

"نہیں! اس نماز میں تین سو تسبیحات ہیں" اور میں پسند کرتا ہوں کہ نمازِ تسبیح میں الحمد کے بعد بیس سے زیادہ آیات تلاوت کرے۔ اس لیے کہ حضرت عبداللہ بن جعفر کی حدیث میں آتا ہے اسے اسماعیل بن رافع سے روایت کیا کہ

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اُمّ القرآن (الحمد) کے بعد کی سورت میں بیس یا اس سے زاید آیات ہوں۔"

اسی طرح لَاحَوْلَ وَ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ کا اضافہ بھی بہتر ہے۔ اس لیے کہ دوسری حدیث میں اس کا ذکر بھی آتا ہے اور اگر سورۃ فاتحہ کے بعد ہر رکعت دس دس بار قل ھو اللہ احد پڑھے تو کئی گنا ثواب بڑھ جائے اور اکمل ترین اجر عطا ہو۔

فصل ۱۶

تلاوتِ قرآن کے آداب

مرید کو چاہیے کہ ہفتے میں دو بار قرآن مجید کرے۔ دن کو ایک بار ختم کرے اور ایک بار رات کو ختم کرے۔ دن کا ختم پیر کے روز فجر کی نماز میں یا اس کے بعد مکمل کرے اور رات کا ختم جمعہ کی شب کو نمازِ مغرب میں یا اس کے بعد مکمل کرے۔ اس طرح دن کی ابتداء اور رات کی ابتداء میں ختم بن جائے گا کیونکہ اگر اس نے شب کو ختم کیا تو صبح تک فرشتے اس کے لیے دعائے رحمت کریں گے اور اگر دن میں ختم کیا تو شام تک اس کے لیے فرشتے دعائے رحمت کریں گے۔ یہ دونوں اوقات، تمام شب و روز پہ حاوی ہو جائیں گے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جس نے تین روز سے کم میں قرآن مجید ختم کیا اس نے اسے سمجھا نہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ

ہر سات روز کے اندر ایک بار قرآن ختم کرے۔

صحابہ رضوان اللہ علیہم سے یہی مروی ہے اور وہ ہر جمعہ (ہفتہ) میں ایک بار قرآن مجید ختم کرتے تھے۔

یحییٰ بن حارث دیناری نے قاسم بن عبدالرحمٰن سے نقل کیا کہ

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ شبِ جمعہ کو تلاوتِ قرآن کا آغاز کرتے اور اس رات کو سورۃ البقرۃ سے لے کر سورۃ المائدہ تک تلاوت کرتے۔ ہفتہ کی رات کو سورۃ انعام سے لے کر سورۃ ہُود تک، اتوار کی رات کو سورۃ یوسف سے لے کر سورۃ مریم تک، پیر کی رات کو سورۃ طٰہٰ سے لے کر طسم موسیٰ و فرعون تک۔ منگل کی رات کو سورۃ عنکبوت سے لے کر سورۃ صاد تک اور بدھ کی رات کو تنزیل سے لے کر سورۃ الرحمٰن تک پڑھتے اور پھر جمعرات کی رات کو قرآن مجید ختم کرتے۔

حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابی رضی اللہ عنہما بھی ہر ہفتہ میں ایک بار قرآن مجید ختم کیا کرتے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے سات راتوں میں قرآن مجید کو سات حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا چنانچہ وہ ہر رات کو ساتویں حصہ کی تلاوت کرتے البتہ ان کی ترتیب ہمارے اس مصحف سے جدا تھی اس لیے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اس لیے کہ اس کا ذریعہ اعتبار واضح نہیں ہوتا۔

ایک جماعت ایسی بھی ہے کہ جو ایک رات اور ایک دن میں بھی قرآن ختم کیا کرتے اور ایک جماعت نے تین روز سے کم عرصہ میں قرآن مجید ختم کرنا مکروہ سمجھا ہے اور اعتدال وہی ہے کہ جس کا ہم ذکر کر چکے یعنی ہر تین روز میں ایک بار قرآن مجید ختم کرنا۔

احزابِ قرآن اور طریقِ صحابہؓ

اگر ہر دن رات میں قرآن مجید کا ایک حزب پڑھے تو بہتر ہے اور یہ سنت ہے اس سے دل کو قوت حاصل ہوتی ہے؛ ترتیب کے مناسب ہے اور فہم کے قریب تر بھی ہے۔ اگر چاہے تو ہر رکعت میں قرآن مجید کا تیرھواں حصہ یا چھبیسواں حصہ پڑھے۔ تیس پاروں میں سے ہر پارہ ایک یا دو رکعتوں میں ہو جائے گا۔ اب اگر ہر ورد میں ایک یا دو حزب یا اس سے زیادہ پڑھے تو بہتر ہے قرآن مجید کے سات احزاب ہیں پہلے حزب میں تین سورتیں، دُوسرے حزب میں پانچ سورتیں، تیسرے حزب میں سات سورتیں، چوتھے حزب میں نو سورتیں، پانچویں حزب میں گیارہ سورتیں، چھٹے حزب میں تیرہ سورتیں ہیں اور ساتواں حزب سورۃ قٓ سے لے کر ختم قرآن تک ہے۔ یہ قرآن مجید کے احزاب ہیں اس لیے صحابہ رضوان اللہ علیہم نے اس طریق پر تقسیم کر کے تلاوت کیا کرتے تھے۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت بھی منقول ہے۔

گویا یہ خبر بھی ہے کہ آپؐ نے ان آیات پر تقسیم کر کے احزاب مقرر فرمائے۔ اس لیے کہ ان کی تعداد چھ ہزار دو سو اور چھتیس آیات ہیں۔ میں نے ہر حزب میں غور کر کے تقریباً یہی مقدار پائی اور یہ اخماس، عواشر اور اجزاء بنانے سے پہلے کی بات ہے اور اس کے علاوہ بعد کی باتیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ حجاج نے بصرہ اور کوفہ کے قراء کو جمع کیا ان میں عاصم جحدری، مطروراق اور شہاب بن شریفہ بھی تھے۔ انہیں اس بات کا حکم دیا۔ چنانچہ حضرت حسن اور ابن سیرین رضی اللہ عنہما ان اخماس (یا پانچوں حصوں) اور عواشر (دسویں حصوں) اور اجزاء کا انکار کرتے ہیں۔

حضرت شعبیؒ اور ابراہیمؒ سے سرخ سیاہی کے ساتھ نقطے لگانے اور اس پر اُجرت لینے کی کراہت منقول ہے۔ وُہ فرمایا کرتے کہ قرآن کو خالی رہنے دو۔ (یعنی تکلفات نہ کرو)

اوزاعیؒ نے یحییٰ بن ابن کثیرؒ سے نقل کیا کہ قرآن مجید مصاحف میں خالی تھا۔ سب سے پہلے بار تاء پر نقاط لگائے گئے اور (علماء) نے فرمایا:

"خیر اس میں کچھ حرج نہیں۔ یہ اس کا نور ہے"۔

پھر اس کے بعد آیت کے اختتام پر گول دائرے لگائے گئے تو علماء نے فرمایا کہ

اس میں کچھ حرج نہیں ان سے آیات کا اختتام معلوم ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد خواتیم و فواتیح کا اضافہ کیا گیا تو علماء نے فرمایا:

اس میں کچھ حرج نہیں، یہ ان کے پہچان کی ایک علامت ہے۔

فہم قرآن میں رکاوٹیں

یاد رکھیے کہ جس بندے میں ان خصلتوں میں سے کوئی ایک خصلت بھی پائی جائے اسے قرآن کی وہ سمجھ نہیں آسکتی کہ جس کے ذریعہ مشاہدہ کی دولت حاصل ہو جائے اور ملکوت کا کشف حاصل ہو سکے۔ وہ خصائل یہ ہیں:

۱۔ معمولی سی بھی بدعت ہو۔

۲۔ گناہ پر اصرار کرنا۔

۳۔ جس میں ذرا بھی تکبر پایا جائے۔

۴۔ دل میں پوشیدہ خواہش میں مبتلا ہونا۔

۵۔ دنیا کی محبت کرنے والا۔

۶۔ جس بندے میں ایمان پیدا نہ ہوا ہو۔

۷۔ یا اس کا یقین کمزور ہو۔

۸۔ نہ وُہ جو صرف ذاتی علم تک محدود رہے۔

۹۔ اور نہ ایسا بندہ جو کہ ظاہر حروف کا اتباع کرے اور انہیں دیکھتا رہے۔

۱۰۔ اور نہ ہی وہ بندہ جو کہ ایسے مفسّر کے قول کو ہی دیکھے کہ جو اپنے علم ظاہر پر ہی جما رہے۔

۱۱۔ جو اپنی عقل کے گھوڑے دوڑانے والا ہو۔

۱۲۔ الم (اور دوسرے حروفِ مقطعات یعنی آیاتِ متشابہات) کے باطن و راز کو اہل زبان کے مختلف نحوی مذاہب کے ذریعہ حل کرنے والا ہو۔ ان سب پر عقلوں کے حجاب پڑ چکے ہیں۔ یہ اپنے علوم میں مگن مگر مردود ہیں۔ ان کی عقلوں میں جو آچکا اسی پر یہ خوش ہو گئے۔ اہل توحید کے نزدیک یہ لوگ اپنی دانش و علم کے شرک میں مبتلا ہو چکے۔ یہ شرک خفی ہے جو اندھیری سیاہ رات میں چلنے والی چیونٹی سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے۔

محمد بن علی بن سنانہؒ فرماتے ہیں کہ جب اس کا علم و عقل، غیر کامل کی عقل سے ہُوا (تو یہی کچھ ہو گا) اس لیے کہ کامل عقل وُہ ہوتی ہے جو اللہ عزّ وجل سے حاصل کی جائے۔ اس کے حکم و کلام کو سمجھا جائے اور اس کے کلام سے عقل و دانش ملے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کمالِ عقل کی تعریف کرتے ہُوئے فرمایا کہ

"عاقل وہ ہے جو اللہ سبحانہ' و تعالیٰ سے اس کا امر و نہی سمجھے۔"

تلاوتِ قرآن کا اعلیٰ ترین انداز

حدیث میں آتا ہے کہ

"میری امت کے بیشتر منافق قراء ہیں۔"

دراصل یہ نفاقِ شرک و انکار نہیں بلکہ یہ غیر اللہ پر بھروسہ کر لینے کا نفاق ہے۔ یہ توحید سے علیحدہ نہیں ہوتا مگر یہ ارتقاء حاصل کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ اب جب بندہ ذاتِ سمیع تعالیٰ کی طرف کان دھرے۔ اس کے کلام کے راز پر توجہ لگالے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ کی صفات کے مفاہیم پر دل کو حاضر کر لے۔ اس کی قدرت پر نظر رکھے۔ اپنی مبلغ عقل و علم کو دُور ہٹا دے۔ اسی ذاتِ تعالیٰ سے مدد قوت حاصل کر لے۔ متکلم کی عظمت کا دھیان رکھے۔ اس کے حضور کھڑا ہو، صاف دل، صاف ایمان اور صحتِ حال و علم کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرے تو واضح خطاب سنے گا اور مخفی علم کا مشاہدہ حاصل کر لے گا۔

افضل ترین قرأت، ترتیل سے پڑھنا ہے اس لیے کہ اس وجوب و استحباب سب آجاتے ہیں اور یہ اندازِ تدبّر و تذکر سب پر حاوی ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جس عبادت میں سمجھ نہ ہو اس عبادت میں کچھ بھلائی نہیں اور نہ ہی اس قرأت میں کچھ بھلائی ہے کہ جس میں تدبّر (غور و فکر) نہ ہو[1]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

"میرے نزدیک سارے قرآن کو ھذر (رواں اور تیز تیز پڑھنے) سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ میں سورۃ البقرۃ اور سورۃ آل عمران کو ترتیل سے پڑھوں اور ان میں غور و فکر کرتا جاؤں۔"

انہیؓ سے مروی ہے کہ

میرے نزدیک سورۃ البقرۃ اور سورۃ آل عمران کے ھذر میں پڑھنے سے یہ زیادہ بہتر ہے کہ تدبر کے ساتھ سورۃ اذا زلزلت اور القارعۃ ہی پڑھ لوں۔

---

[1] یہ مطلب نہیں کہ اس کا قطعاً کوئی اجر نہ ملے گا البتہ سمجھ کر اور تدبر کے ساتھ جو تلاوت و عبادت ہو گی اس کے مقابلہ میں بے تدبر و بے غور کیے عبادت کا اجر اس قدر کم ہے کہ گویا ہے ہی نہیں (مترجم)

حضرت مجاہدؒ سے کسی نے پوچھا کہ دو آدمیوں نے قیام کیا دونوں کا قیام ایک ہی مدت رہا اور ایک نے اس مدت میں صرف سورۃ البقرۃ پڑھی تو دوسرے نے سارا قرآن مجید ختم کر دیا (تو دونوں کے ثواب کا فرق کیا ہے؟)

انہوں نے فرمایا: "دونوں کا ثواب برابر ہے اس لیے کہ دونوں کی مدتِ قیام ایک ہی ہے۔"

نماز کی حالت میں قرآن پاک کو ترتیل و تدبر سے پڑھنا سب سے زیادہ افضل ہے۔ کہا کرتے ہیں کہ:

"حالتِ نماز میں غور و فکر کرنا، غیر نماز کی حالت کے تفکر سے زیادہ بہتر ہے اس لیے کہ دونوں عمل ہیں اور تفکر کا مطلب یہ ہے کہ وعدہ و وعید اور زجر و امر کے خطاب کو سمجھنا اور وعدہ کرنے والے کی عظمت اور حاکمِ تعالیٰ کے جلال و برتری کا دھیان رکھنا۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ

"کون سی نماز سب سے افضل ہے؟"

آپؐ نے فرمایا:

"طویل قیام والی۔"

دوسری حدیث میں آتا ہے کہ

"جو اللہ تعالیٰ کے لیے ایک سجدہ کرے گا اللہ تعالیٰ اس کا درجہ بلند کر دے گا۔"

آپؐ کے خادم حضرت ابو فاطمہؓ نے جنت میں آپؐ کے ساتھ رفاقت کی درخواست کی تو آپؐ نے فرمایا:

"کثرتِ سجود کے ذریعہ میری مدد کر۔"

(یعنی کثرت سے نمازیں پڑھو سعادت حاصل ہو جائے گی)

نماز میں راحت ہے

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، فرمایا:

"اس سے مراد دن کو (مختصر قیام کی نمازوں سے) کثرتِ سجود ہے اور رات کا طویل قیام ہے (علماء) فرماتے ہیں کہ بندہ جس قدر نماز کو سکون و اطمینان سے پڑھتا ہے مرنے پر قبر میں اسے اسی طرح کا سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے اور نماز میں وہ جس قدر راحت و فرحت محسوس کرتا ہے وہاں بھی اسے اسی طرح راحت حاصل ہوتی ہے۔"

حضرت ابوہریرہؓ سے اس مفہوم کا کلام مروی ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

اس فرمان کا مطلب یہیں سے سمجھ آجاتا ہے کہ جب آپؐ حضرت بلالؓ کو فرماتے و

"ہمیں نماز کے ذریعہ راحت دو۔"

یعنی ہمیں نماز کے ذریعہ آرام و راحت کا تنعم و فرحت دو۔ کہا کرتے ہیں کہ ارحنا بالشیٔ یعنی اس کے ذریعہ ہمیں راحت دو اور یہ نہیں کہ ارحنا منھا۔ کہ ہمیں اس سے چھٹی دو۔ اس لیے کہ نماز تو آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔ آپؐ یہ کیونکر فرما سکتے ہیں؟

تلاوت میں مشاہدات بعض صالحین کا قول ہے کہ میں ایک سورت شروع کرتا ہوں تو بعض ایسے مشاہدات ہوتے ہیں کہ ان میں کھو کر رہ جاتا ہے اور اسی حال میں صبح ہو جاتی ہے اور میں ابھی سیر نہیں ہوتا۔

حضرت سلیمان بن ابی سلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ ابن ثوبانؒ کے بھائی نے ان کے ہاں کھانا کھانے کا وعدہ کیا مگر انہوں نے دیر کر دی اور صبح ہوئی تو دوسرے روز ان کے بھائی ملے۔ پوچھا: کہ آپ نے میرے پاس کھانا کھانے کا وعدہ کیا تھا مگر آپ نے وعدہ پورا نہیں کیا۔ فرمایا کہ اگر وعدہ نہ ہوتا تو میں تمہیں اصل رکاوٹ نہ بتاتا۔ واقعہ یہ ہوا کہ جب میں نے نماز عشاء پڑھی تو آپ کے پاس آنے سے پہلے ہی نماز پڑھنے کا ارادہ کر لیا۔ اس لیے کہ کیا خبر ہے کہ موت آجائے۔ اس سے اطمینان تو ہے نہیں۔ اب جب میں وتر کی دعا کرنے لگا تو میرے سامنے ایک سبز باغ آگیا۔ اس میں طرح طرح کے پھول پھلواریاں تھیں۔ میں انہیں دیکھتا رہا۔ آخر صبح ہو گئی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ[1]

علماء بتاتے ہیں کہ قرآن نے ان کے ایمان کو علم قرآن کے ذریعہ قوی کر دیا۔ اب قرآن، ایمان کی رُوح ہے اور اس پر عمل کرنا قوت حاصل کرنا ہے۔

اور یا یحییٰ خذ الکتاب بقوۃ کی تفسیر میں ہے کہ خوب کوشش و اجتہاد سے پکڑ اور اس طرح خذوا ما اٰتینٰکم بقوۃ کی تفسیر میں ایک قول ہے کہ اس پر سختی سے عمل کرو۔

ایک بزرگ سے پُوچھا گیا کہ جب آپ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں تو کیا آپ کے دل میں کسی چیز کا خیال آتا ہے؟

---

[1] سورۂ مجادلۃ آیت ۲۲۔

انھوں نے فرمایا : کیا مجھے قرآن سے بھی زیادہ محبوب چیز ہو سکتی ہے کہ جس کا میرے دل میں خیال آئے جبکہ قرآن ایک قوی اور متمکن ہونے والی صفت ہے۔

منقول ہے کہ قرآن میں میدان ، باغات ، مقاصیر ، دلہنیں ، دیباج ، باغیچے اور سرائیں ہیں چنانچہ قرآن کے میدان میمات ہیں اور قرآن کے باغات راٰات ہیں اور قرآن کے مقاصیر حاآت ہیں اور قرآن کی دُلہنیں مسبحات ہیں اور قرآن کے دیباج حوامیم ہیں اور اس کے باغیچے مفصل (سورتیں) ہیں اور اس کے علاوہ کا حصّہ سرائیں ہیں۔ جب ایک سالک میدانوں میں آتا ہے ، باغات سے چنتا ہے۔ مقاصیر (مجرو) میں داخل ہوتا ہے۔ دلہنوں کو دیکھتا ہے دیباج پہنتا ہے ، باغات میں سیر کرتا ہے ، سراؤں میں ٹھہرتا ہے تو انھیں دیکھ کر سب سے کٹ کر رہ جاتا ہے اور غیر سے جدا ہو کر انہی میں ڈوب جاتا ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھی اور بیس بار دُہرائی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر بار پڑھنے میں ایک نیا معنیٰ معلوم ہُوا اور ہر کلمہ سے نیا علم حاصل ہُوا۔" اس لیے بندے کو چاہیے کہ ہر ہر کلمہ پڑھتے وقت بندے کا دل اس کے معانی کا مشاہدہ کرے تاکہ اللہ عزّ وجل اس پر مزید انعامات فرمائے اور مفہومات و مشاہدات کے ساتھ ساتھ تلاوت ہو۔ چنانچہ بعض صالحین کا فرمان ہے کہ جب تک ایک آیت کو نہیں سمجھتا اور میرا دل اس میں کھو نہیں جاتا۔ تب تک میں اس میں اپنے لیے کچھ ثواب شمار نہیں کرتا۔

بعض سلف کی عادت تھی کہ جب تلاوت کرتے اور دل حاضر نہ ہوتا تو اس حصّہ کو دوبارہ پڑھتے اور جب تسبیح کا ذکر پڑھتے یا تکبیر کا ذکر پڑھتے تو سبحان اللہ اور اللہ اکبر کہتے اور اگر دُعا اور استغفار کا ذکر پڑھتے تو دعا کرتے اور استغفار کرتے اور اگر کسی خوفناک یا امید کا ذکر پڑھتے تو خوف سے پناہ مانگتے اور نعمت کا سوال کرتے۔

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مطلب ہے کہ

يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ[1] (اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہوئے) تلاوت کرتے ہیں)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس شان کے ساتھ تلاوت فرماتے۔ حدیث میں اس مفہوم کی روایت ہے کہ :

---

[1] سورۃ البقرۃ آیت ۱۲۱۔

"قرآن پاک کو اس طرح تر و تازہ پڑھنا چاہیے جیسے کہ نازل کیا گیا تو اسے چاہیے کہ ابن ام عبد کی قرأت کے مطابق پڑھے۔ یعنی اس کی تلاوت کے مفہوم پر پڑھے۔ اس لیے کہ وہ حاضر دل، بیدار سماعت اور متوجہ نظر کے ساتھ پڑھتے۔ وہ کلام کے مفہوم پر قرآن کی تلاوت کرتے اور متکلم کے وصف کی شہادت پر تلاوت کرتے۔

وعید پر غمگین ہوتے، وعدہ پر شوق پیدا ہوتا، تخویف سے نصیحت ہوتی، شدت پر ڈرتے، نرمی پر کھلتے اور توفیق پر خوش ہوتے۔

تلاوت و غم

اسی لیے فرمایا کہ قرآن پڑھتے ہوئے رونا چاہیے۔ اگر رونا نہ آئے تو رونے کی صورت ہی بنالو اور کوشش کرو۔

"بے شک قرآن غم کے ساتھ نازل ہوا" کا قول بھی یہی مفہوم رکھتا ہے اور "جب تم اسے پڑھو تو غمگین ہو جاؤ"۔ یعنی قرآن مجید میں زجر و وعید ہے اور اس قسم کی سزاؤں کا ذکر آتا ہے کہ ان کے پڑھنے سے آہ و بکا کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اب اگر حقیقی طور پر غم اور رونا نہ آسکے تو اقرار و تصدیق واضح کرنے کے لیے رونے اور غم کی کیفیت ہی بنالو۔ رونے اور غم کے باعث تلاوت کی حالت میں بندے کا دھیان سب سے کٹ کر تلاوت میں ہی رہے گا اس طرح وہ کلام اللہ میں غور و فکر کرے گا۔ پھر ممکن ہے کہ اس کے دل پر معانی کا گذر ہو اور یہ رونا اور غم اس کے دل کو غیر اللہ سے پاک و صاف کر دے گا۔ اس لیے کہ رونے والے کا دل غم سے بھرپور ہوتا ہے جس کے باعث وہ آہ و بکا میں ڈوب گیا اور ایک غمزدہ کا دل رُلانے والے کے سوا سب سے غافل ہو چکا ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

"جب تم سجدہ سبحان پڑھو تو سجدے میں جلدی نہ کرو۔ بلکہ پہلے رو لو۔ اگر کسی کی آنکھ نہ روئے تو اس کا دل ہی رو لے"۔

دل کا رونا، اس کا خوف و حزن ہے یعنی اگر علماء کی طرح مطالب وغیرہ سمجھ کر رونا نہیں آتا تو رونا نہ آنے پر دل ہی غمگین ہو جائے اور دل میں ڈرے کہ آخر اہل علم کا وصف کیوں پیدا نہیں ہو رہا؟

اللہ تعالیٰ کا اس فرمان کی تفسیر میں یہ معنی مروی ہے کہ

وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ[1]

---

[1] سورۃ البقرہ آیت ۷۴۔

بتایا کہ اس سے مراد کثرت سے رونے والی آنکھ ہے اور

اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ۔[۱]

کا مطلب کم رونے والی آنکھ بتایا اور

وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ کے بارے یہ بتایا کہ اس سے مراد آنکھوں کے آنسوؤں کے بغیر صرف دل کا رونا ہے۔

حضرت ثابت بنانیؒ نے فرمایا کہ

میں نے خواب میں دیکھا کہ گویا میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قرآن مجید پڑھ رہا ہوں۔ جب میں فارغ ہوا۔ تو آپؐ نے فرمایا:

"یہ تلاوت تھی اور گریہ کہاں ہے؟"

حضرت حسنؒ فرماتے ہیں کہ

"اللہ کی قسم جو آدمی بھی قرآن پر ایمان رکھتا ہے۔ جب وہ صبح کو اس کی تلاوت کرتا ہے تو اس کا غم بڑھ جاتا ہے اور فرحت کم ہو جاتی ہے۔ زیادہ روتا ہے اور کم ہنستا ہے۔ اس کی مشقت اور مصروفیت بڑھ جاتی ہے اور اس کا آرام اور بے کاری کم ہو جاتی ہے۔"

تلاوت کرنے والوں کے درجات

تلاوت کے سلسلہ میں لوگوں کے تین درجے ہیں:

(۱) سب سے اعلیٰ درجہ اس کا ہے جو کلام اللہ میں متکلم کے اوصاف کا مشاہدہ کرے اور معانیِ خطاب کے ذریعہ اس کے اخلاق کی آگاہی حاصل کر لے۔ یہ عارفین مقربین کا مقام ہے۔

(۲) بعض اپنے رب کا مشاہدہ کرتے ہیں اس کے لطف و کرم کے باعث اس سے مناجات کرتے ہیں اور اس کے انعام و احسان کے باعث اس سے مخاطبت کرتے ہیں۔ یہ حیاء و تعظیم کا مقام ہے اور توجہ و فہم کی حالت ہے۔ یہ مقام اصحاب یمین کے ابرار کو حاصل ہے۔

(۳) بعض یوں محسوس کرتے ہیں کہ ہم اپنے رب عزّ و جل سے مناجات کر رہے ہیں اس کا مقام سوال اور بے قراری کا ہے۔ اور یہ طلب و تعلق کے حال میں ہے۔ یہ اصحاب یمین کے مخصوص افراد یعنی معترفین و مریدین کا مقام ہے۔

---

[۱] سورۃ البقرۃ آیت ۷۴

تلاوتِ قرآن اور فہمِ قرآن

بندے کو چاہیے کہ تلاوت میں یہ مشاہدہ کرے کہ وُہ کلام اللہ کی تلاوت کے ذریعہ اپنے آقا سے مخاطب ہے۔ اس لیے کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ اپنے کلام کا متکلم ہے اور اس کے کلام میں بندے کو کلام کا حق نہیں اور اللہ تعالےٰ نے بندے کی زبان پر اپنا ذکر و وصف ایک حد تک جاری کیا تاکہ اسے بھی کچھ مل جائے۔ جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے درخت تھا مگر کلام کرنے والا اللہ عزّ و جل تھا۔

منقول ہے کہ لوحِ محفوظ میں کلام اللہ کا ہر حرف کوہِ قاف سے زیادہ بڑا ہے اور اگر ملائکہ جمع ہو کر ایک حرف کو پڑھنا چاہیں تو یہ نہیں کر سکتے حتیٰ کہ لوحِ محفوظ کا فرشتہ اسرافیل آتا ہے۔ وُہ اسے اٹھاتا ہے تو اللہ عزّ و جل کے اذن و رحمت سے اسے اٹھا لیتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے اس کی قوت بخشی ہے کہ اس پر اسے مامور فرمایا۔

جعفر بن محمد صادقؓ فرماتے ہیں کہ

"اللہ کی قسم اللہ عزّ و جل نے اپنی کلام میں مخلوق کے لیے جلوہ افروزی فرمائی مگر لوگ دیکھتے ہی نہیں۔"
ایک بار حالتِ نماز میں ان پر غشی طاری ہو گئی اور گر گئے۔ جب انہیں ہوش آیا تو اس کا سبب پُوچھا گیا تو فرمایا:

میں اپنے دل پر ایک آیت بار بار پڑھتا رہا۔ آخر میں نے متکلم سے یہی آیت سنی اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کو دیکھ کر میں اپنے جسم کو قائم نہ رکھ سکا۔ خواص کی یہی حالت ہوتی ہے کہ وہ قلوب پر آیات کو بار بار دُہراتے ہیں اور ان کی مدد سے مشاہدہ حاصل کرتے ہیں حتیٰ کہ اس کے مفہوم میں غرق ہو کر بحرِ علم میں مستغرق ہو جاتے ہیں۔ اگر تلاوت کرنے والوں کا مشاہدہ اس مقام سے قاصر رہے تو اس بات کا مشاہدہ کرے کہ وہ کلام اللہ کے ذریعہ اس سے مناجات کر رہا ہے اور مناجات کے ذریعہ تملق میں مصروف ہے۔ اس لیے کہ اللہ عزّ و جل نے اس کی زبان سے اسے خطاب فرمایا اور اس کی حرکت و آواز کے ذریعہ اس سے کلام فرمایا تاکہ وُہ اس علم کے ذریعہ سمجھے جو اسے عطا کیا اور اس فہم کے ذریعہ شعور حاصل کرے جو اس نے اپنی حکمت و رحمت کے باعث اسے عطا کیا اس لیے کہ اگر جبار تعالیٰ اپنے وسعت کے ساتھ کلام فرمائے تو اس کے کلام کے سامنے عرش و ثریٰ کچھ نہیں ٹھہر سکتا اور اس کی عظمت و شوکت و انوارات کے سامنے زمین و آسمان کی ہر چیز فنا کے گھاٹ اتر جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے علمِ غیب میں عقلوں سے محجوب رکھا اور ذہنوں سے اپنی صنعتِ قدرت کے باعث مستور کر دیا اور قلوب کی خاطر اس کی عقول کے علوم ظاہر فرما دیے اور اپنے لطف و

احسان اور شفقت و رحمت کے صدقہ عقلوں کو اس کی سمجھ عطا فرما دی۔

ایک عجیب مثال گزشتہ واقعات میں ذکر آتا ہے کہ اللہ عزوجل کا ایک ولی جو کہ صدیقین میں سے تھا اس کو ایک جابر بادشاہ کی طرف بھیجا گیا تاکہ وُہ اسے توحید باری تعالیٰ اور شریعتِ انبیاء کی دعوت دے۔ بادشاہ نے اس سے توحید کی وضاحت پوچھی۔ اللہ کے یہ ولی زود فہم انداز پہ جواب دینے لگے اور ایسی مثالیں دیں جو کہ عام متعارف ہیں اور انسانی اذہان کے قریب تر ہیں۔ آخر کار بادشاہ نے پوچھا:۔

جیسے کہ تم دعویٰ کرتے ہو کہ انبیاء علیہم السلام جو کلام پیش کر رہے ہیں یہ نہ انسانوں کا کلام ہے اور نہ ہی ان کی رائے ہے تو کیا یہ اللہ کا کلام ہے؟

اس دانا آدمی نے فرمایا:

"ہاں! (یہ اللہ کا کلام ہے)"

بادشاہ نے کہا: تو لوگ اس کو کیونکر اٹھا سکتے ہیں؟

صدیق نے جواب دیا، ہم دیکھتے ہیں کہ جب ایک انسان پرندوں اور چوپاؤں کو کوئی بات سمجھانا چاہتا ہے کہ چلو یا ٹھہرو یا اِدھر یا اُدھر جاؤ تو چوپایہ یا پرندہ ان کے کلام کی سکت نہیں رکھتا اس لیے انسانی زجر و توبیخ کرتا ہے یا ایسے کسی طریق سے اسے آگاہ کرتا ہے کہ وُہ سمجھ جاتا ہے۔ اسی طرح انسان کلامِ الٰہی کو اس کی کامل کنہ و صفت کے ساتھ اٹھانے کی قدرت نہیں رکھتا اب چند اصوات مقرر کر دی گئیں کہ جن سے وہ حکمت کی بات سُن اور سمجھ لے اور ان اصوات میں پوشیدہ مطالب وُہ سمجھ جاتا ہے ان سے کلام کی عظمت و شرف واضح ہو گئی۔ اب حکمت کے لیے آواز کی حیثیت بدن و مسکن کی ہے اور آواز کیلئے حکمت کی حیثیت نفس و روح ہے اور جس طرح بشری ابدان کی عزت و تکریم اس وجہ سے ہے کہ ان میں رُوح ہوتی ہے۔ اسی طرح اصوات کلام کی عظمت و شرف اس حکمت کے باعث ہے کہ جو ان اصوات میں پائی جاتی ہے۔

اور کلام کی حیثیت ایک قاہر سلطان اور حق و باطل میں حکم نافذ کرنے والے کی ہے یعنی یہ قاضی اور مشاہدہ ہے۔ حکم کرتا اور منع کرتا ہے اور باطن کی مجال نہیں کہ کلام حکمت کے سامنے کھڑا ہو سکے جیسے کہ سورج کی شعاع کے سامنے سایہ نہیں ٹھہر سکتا اور انسان کے بس میں ہی نہیں ہے کہ وُہ حکمت کی گہرائی تک رسائی حاصل کر سکے جیسے کہ سُورج کی اصل اور گرم ترین شعاع کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ البتہ شعاعوں سے آنکھوں کی زندگی ضرور حاصل کرتے ہیں اور اپنی دوسری حاجات پُوری کرتے ہیں۔ اب

اصل کلام اس بادشاہ کی طرح ہے کہ جو پردے میں ہے اور اس کا چہرہ پوشیدہ ہے اور اس کا امر سامنے آتا ہے جیسے کہ سورج کا اصل عنصر مخفی ہے مگر اسکی حرارت ظاہر ہے۔ جیسے کہ ستاروں کے ذریعہ راستہ تلاش کرتے ہیں مگر ان کی حقیقت مخفی ہے۔ چنانچہ کلام اس سے زیادہ بلند اور اشرف ترین ہے۔ یہ خزائنِ نفیسہ کی کنجی ہے۔ درجاتِ عالیہ کا دروازہ، بلند مقامات کی سیڑھی اور ایسی شرابِ زندگی ہے کہ جس نے پیا اس پر موت نہیں۔ یہ بیماریوں کی ایسی دوا ہے کہ جس نے اس کی خوراک کھائی تو بیمار نہ ہُوا۔ جس نے اُسے پہن لیا وُہ ابد تک برہنہ نہ ہوگا اور جب غیر مسلح اسے پہنے گا تو اپنا عیب ظاہر کرے گا اور جب غیر اہل اس سے مسلح ہوگا تو اس سے نہیں نکلے گا۔

صدیق نے بادشاہ کو اس طرح مخاطب کیا اور اس نے اللّٰہ عزوجل کے اذن سے اس کی دعوت قبول کر لی چنانچہ اللّٰہ تعالیٰ کے کلام کا یہ وصف ہے جس کو اللّٰہ تعالیٰ نے ہمارے لیے ایک نشان، عبرت، نصیحت اور رحمت بنا کر بھیجا۔

دیکھیے! اس حکیم نے کس طرح کلام اللّٰہ تعالیٰ سمجھنے میں انسانی عقلوں کو کس طرح بہائم وطیور کے سیٹی اور زجر و توبیخ کی آوازوں کے درجہ میں رکھا اور جس طرح چوپائے اور پرندے ان آوازوں کے ذریعہ مطلب سمجھ لیتے ہیں۔ اس کو مثال بنا کر پیش کیا۔

اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ [1]	(میرا رب لطیف ہے جو وُہ چاہے۔ بے شک وُہ جاننے والا حکمت والا ہے)

یہ اس کی لطیف قدرت ہے۔ اس کی قدرتیں بے شمار ہیں اور یہ اس کی محکم حکمت ہے جو کہ احاطے سے باہر ہیں۔ وہ حکمت والا جاننے والا ہے۔

بندے کو چاہیے کہ اس بات کا دھیان رکھے کہ قرآن کے آغاز سے انجام تک کا یہی مطلب ہے اس کے لیے امثلہ پیش کی گئیں۔ اس میں اس کے تمام اوصاف پائے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ جب اللّٰہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے اس کلام کے ذریعہ کلام فرمایا اور اہل ایمان کو اس کے ذریعہ خطاب فرمایا تو وُہ انہیں پانے والا اور اس کے پاس موجود ہے۔

قرآن بصیرت و بیان اور ہدایت و رحمت ہے

اللّٰہ تعالیٰ نے ان پر تنزیلِ قرآن میں اہل ایمان اور نبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم کو ایک معنی کے لحاظ سے

---

[1] سورۃ یوسف آیت ۱۰۰۔

برابر خطاب فرمایا کہ:

(۱) وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللهِ عَلَيْكُمْ وَ مَا أُنْزِلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَ الْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ [1]

(اور تم پر اللہ کی جو نعمتیں ہیں انہیں یاد کرو اور جو تم پر کتاب و حکمت نازل کی کہ اس سے نصیحت حاصل کرو)

(۲) لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ كِتَابًا فِيهِ ذِكْرُكُمْ [2]

(بے شک ہم نے تمہاری طرف کتاب نازل کی اس میں تمہارا ذکر ہے)

(۳) وَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ [3]

(اور ہم نے تیری طرف ذکر نازل کیا تاکہ تو لوگوں کے لیے بیان کرے جو ان کی طرف نازل کیا گیا اور تاکہ وہ غور و فکر کریں)

(۴) كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللهُ لِلنَّاسِ أَمْثَالَهُمْ [4]

(اس طرح اللہ لوگوں کے لیے ان کی مثالیں دیتا ہے) یعنی ان کی صفات

(۵) وَ لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ مُبَيِّنَاتٍ [5]

(اور بیشک ہم نے تمہاری طرف وضاحت کرنیوالی آیات نازل کیں)

(۶) وَ لَقَدْ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ [6]

(اور بے شک ہم نے تیری طرف واضح آیات نازل کیں)

(۷) وَاتَّبِعْ مَا يُوحَىٰ إِلَيْكَ وَاصْبِرْ [7]

(اور جو تیری طرف وحی ہوتی ہے اس کی تابعداری کر اور صبر کر)

(۸) اِتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ [8]

(جو تمہاری طرف رب کی جانب سے نازل ہوتا ہے اس کی تابعداری کر)

(۹) فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ وَ مَنْ تَابَ مَعَكَ [9]

(پس سیدھا ہو جیسے کہ تجھے حکم ہوا اور جو تیری ساتھ توبہ کی)

البتہ اللہ تعالیٰ نے عوام کے لیے بصائر و بیان عام ذکر کیے اور اہل تقویٰ اور اہل ایمان کو ہدایت و

---

[1] سورۃ البقرۃ آیت ۲۳۱ [2] سورۃ الانبیاء آیت ۱۰ [3] سورۃ النحل آیت ۴۴
[4] سورۃ محمد آیت ۳ [5] سورۃ النور آیت ۳۴ [6] سورۃ البقرۃ آیت ۹۹
[7] سورۃ یونس آیت ۱۰۹ [8] سورۃ اعراف آیت ۲ [9] سورۃ ہود آیت ۱۱۲

رحمت کے ساتھ مخصوص فرمایا اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

هٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ؁ (یہ عام لوگوں کے لیے بصیرت کی بات ہے (کہ ان کی آنکھیں کھل جائیں) اور یقین کرنے والی قوم (اہل ایمان) کے لیے ہدایت و رحمت ہے)

پھر فرمایا:

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ؁ (یہ لوگوں کے لیے بیان ہے اور پرہیزگاروں کے لیے ہدایت و نصیحت ہے)

چنانچہ موقنین سے مراد متقی لوگ ہیں اور مھدیین سے مراد وہ ہیں کہ جن پر رحمت ہوئی اور جس طرح ہیں تلاوتِ قرآن کا حکم دیا گیا اسی طرح ہمیں فہمِ قرآن حاصل کرنے کا بھی حکم دیا گیا ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ

"قرآن پڑھو اور اس کے غرائب کی تلاش کرو۔"

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا:

جو اوّلین و آخرین کا علم حاصل کرنا چاہے وہ

قرآن سے وابستہ رہو

حضرت علیؓ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ قسم ہے اس ذات کی جس نے مجھے حق کے ساتھ نبی مبعوث فرمایا۔

ضرور میری امت اصل دین و جماعت پر بہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ ہر فرقہ گمراہ، گمراہ کن ہوگا اور آگ کی طرف بلائے گا۔ جب یہ حالت ہو تو تم پر کتاب اللہ عزوجل پر قایم رہنا لازم ہے اس میں تم سے پہلوں کی اور تم سے بعد میں آنے والی خبریں ہیں۔ تمھارے درمیان یہ فیصلہ کرنے والی کتاب ہے جو ظالم اس کے خلاف کرے گا اللہ اسے ہلاک کر دے گا اور جس نے اس کے علاوہ سے علم تلاش کیا اللہ نے اسے گمراہ کر دیا اور یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے۔ اس کا نور مبین ہے۔ اس کی نفع دینے والی شافی (دوا) ہے جو اس کو پکڑلے۔ اس کے لیے یہ حفاظت ہے جو اس کا اتباع کرے۔ اس کے لیے نجات ہے۔

اس کے عجائبات ختم نہ ہوں گے اور بار بار پڑھنا اسے پرانا نہیں کر سکے گا۔ اس کو جنات نے

؁ سورۃ جاثیہ آیت ۲۰ ؁ سورۃ آل عمران آیت ۱۳۸

سُنا اور جب (تلاوت) ختم ہُوئی تو قوم کی طرف ڈراتے ہُوئے واپس گئے اور (قوم) سے کہا: اے ہماری قوم! ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو کہ رشد (و ہدایت) کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور جس نے اس کے ساتھ بات کی۔ اس نے سچ کہا۔ جس نے اس پر عمل کیا اسے اجر ملا اور جس نے اس کو پکڑ لیا اسے سیدھی راہ دکھا دی گئی۔

حضرت حذیفہؓ کی حدیث میں یہی مفہوم مروی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اختلافاتِ امت کا ذکر کیا تو راوی بتاتے ہیں کہ میں نے پوچھا:

اے اللہ کے رسولؐ! اگر میں وہ زمانہ پاؤں تو آپؐ مجھے کیا حکم فرماتے ہیں؟

آپؐ نے فرمایا:

اللہ عزوجل کی کتاب (قرآن) سیکھو اور اس پر عمل کرو۔ اس میں اس (آفت) سے نکالنے والی بات ہے۔ راوی بتاتے ہیں کہ میں نے دوبارہ سوال کیا۔ آپؐ نے فرمایا:

کتاب اللہ عزوجل پر سیکھو اور اس کی (تعلیمات) پر عمل کرو۔ اس سے یہی نکالنے والا ہے۔ راوی بتاتے ہیں کہ

میں نے سوال پھر دُہرایا تو آپؐ نے فرمایا:

کتاب اللہ سیکھو اور جو اس میں ہے اس پر عمل کرو۔ اسی میں نجات ہے۔ آپؐ نے تین بار یہ فرمایا:

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے مخفی طور پر ایسی کوئی چیز نہیں بتائی کہ لوگوں سے مخفی رکھی ہو ہاں البتہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو فہم کتاب عطا کر دیا کرتا ہے۔"

انہیؓ سے یہ بھی روایت آتی ہے کہ فرمایا:

"جو سمجھے گا تو وہ مجمل علم کی وضاحت کر سکتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان (و من یؤت الحِکْمَۃَ فقد اوتی خیرا کثیرا) کے بارے میں حضرت ابن عباس وغیرہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ کتاب اللہ عزوجل میں فہم اور فرمایا:

احسن القائلین نے فرمایا:

فَفَھَّمْنَاھَا سُلَیْمَانَ وَ کُلًّا آتَیْنَا حُکْمًا وَّ عِلْمًا [1]

---

[1] سورۃ الانبیاء آیت ۷۹۔

اس میں حکم وعلم سے زیادہ فہم کو بلند مقام دیا اور تخصیص کے باعث اس کی طرف اضافت کی اور ان دونوں میں اسے عام مقام بنایا۔ جب بندہ کلام کا فہم حاصل کر لے اور مولائے کریم اس پر کام لازم کر دے تو جو کہتا ہے وہ واقع ہو جاتا ہے جبکہ وہ اس کے اولیاء سے ہو اور اس کے قائل کے لیے حکایت کرنے والا نہ ہو۔ مثلاً اس سے یوں پڑھے:

(۱) إِنِّيٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ[۱] (بے شک میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو بڑے دن کے عذاب (کا ڈر ہے)

(۲) عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَ إِلَيْكَ أَنَبْنَا[۲] (ہم نے تجھ پر توکل کیا اور تیری طرف جھکے)

(۳) وَ لَنَصْبِرَنَّ عَلَىٰ مَآ آذَيْتُمُونَا[۳] (اور البتہ ہم ضرور صبر کریں گے اس پر جو تم نے ہمیں ایذا دی)

اب وُہ یوم عظیم سے ڈرنے والا ہو گا اور یہ صاحب انابت اور متوکل ہو گا: تکالیف پر صبر کرنے والا اور آقا پر بھروسہ کرنے والا ہو گا اور قائل سے خبر دینے والا نہ ہو گا اور نہ اس کی حلاوت نہ پائے گا اور نہ اس کی میراث پائے۔ اور جب اس حال پر ہو گا تو تلاوت کی حلاوت بھی پائے اور ولایت کا حصہ بھی واقع ہو۔ اس طرح جب ایک قابل نفرت آدمی مذمت کی آیت پڑھے مثلاً

وَ هُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ۔ (اور وہ غفلت میں اعراض کرنے والے ہیں)

فَأَعْرِضْ عَن مَّن تَوَلَّىٰ عَن ذِكْرِنَا وَ لَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا۔ (سو جو ہمارے ذکر سے مُنہ موڑے اور دنیا کی زندگی کے سوا کچھ نہ چاہے اس سے اعراض کرے)

وَ مَن لَّمْ يَتُبْ فَأُولَٰٓئِكَ هُمُ الظَّٰلِمُونَ۔ (اور جو توبہ نہ کرے تو وہی ظالم ہیں)

اب جس میں یہ عیوب ہیں وُہ بہت ہی برا آدمی ہے اور سخت قابلِ مذمت وصف رکھتا ہے۔ یہ آیات اس کے خلاف قرآن کی حجتیں ہیں اس لیے وُہ ان کے ساتھ حلاوتِ مناجات حاصل نہیں کر سکتا اور نہ ہی خطابِ مناجی سُن سکتا ہے اس لیے کہ اس کی قساوتِ قلبی نے اسے فہم سے ہٹا دیا، اور اس کے غلط حال نے اسے بیان سے دُور اور گونگا بنا دیا اور اس کے قابلِ مذمت اوصاف اس کے سامنے حجاب بن گئے اور اس کی ہلاکت انگیز خواہش نے اسے فہم سے محروم کر دیا اور جب وُہ بیدار دل اور تابعدار ہو گا تو توبہ کرنے والا اور سچا ہو گا۔ واضح خطاب سُنے گا۔ داعی کو دیکھے گا۔ اور اس کی دُعا

---

[۱] سورۃ انعام آیت ۱۵ [۲] سورۃ ممتحنہ آیت ۴ [۳] سورۃ الرعد آیت ۱۲

قبول ہوگی انابت کے لیے اللہ تعالیٰ نے بصارت اور حضورِ قلبی کی شرط لگا دی ہے۔

فرمایا:

تَبْصِرَةً وَ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ؕ وَمَا يَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ يُّنِيْبُ ۔ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ۔

چنانچہ توبہ پر پختہ رہنا ایفائے عہد ہے اور حدود کی پروانہ کرنا عہد شکنی ہے اور صداقت کی کمی کی دلیل ہے۔ انابت اختیار کرنا ہی توبہ اور اللہ عزوجل کی جانب رجوع کرنا ہے اور الباب سے مراد پاکیزہ عقلیں اور طاہر قلوب ہیں۔

تلاوت کرنے والے کو چاہیے کہ ڈرتا رہے، اپنے آپ کو نصیحت کرتا رہے دل کو صاف رکھے جب وعدہ، مدح اور اعلیٰ صفات کی ترتیب پڑھے اور مقربین کے حالات پڑھے تو اپنے آپ کو ان میں نہ دیکھے بلکہ دوسرے اہل ایمان کو وہاں سمجھے اور صدیقین کو سلامتی وصفائی کے مقام پر سمجھے اور جب آیت غضب پڑھے جن میں بُرے لوگوں کی مذمت ہُوئی اور غافلین کے حالات اور گنہ گاروں کے واقعات پڑھے تو اپنے آپ کو ان میں سمجھے اور اپنے آپ کو نصیحت کرے اور ڈرائے۔ اس طرح مخلوق کیلیے امید رکھے اور اپنے آپ کے لیے خطرہ محسوس کرے۔ ایسا کرنے سے اس کا دل بندوں کے لیے صاف رہے گا اور اپنے آپ پر ناراض ہوگا (اور اپنی اصلاح کی فکر پیدا ہوگی)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وُہ کہا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْتَغْفِرُكَ لِظُلْمِیْ وَ كُفْرِیْ۔ (اے اللہ! میں اپنے ظلم وکفر کی بخشش مانگتا ہوں)

راوی بتاتے ہیں کہ میں نے عرض کیا:

یہ ظلم تو خیر ہُوا اور کفر کون سا ہے!

انہوں نے یہ آیت پڑھی:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ[1] (بے شک انسان البتہ بہت ظلم کرنے اور کفران (ناشکری) کرنے والا ہے)

اس لیے کہ اگر بندے پر یہ دو معنی بدل جائیں اور بندہ اپنے آپ کو مدح و وصف میں سمجھے اور دوسروں کو مذموم اور غلط سمجھے تو وُہ صادقین سے پھر گیا اور ڈرنے والوں کی راہ سے ہٹ گیا۔ خود برباد

---

[1] سورۃ ابراہیم آیت ۳۴۔

ہوا۔ دوسروں کو برباد کرے گا۔ اس لیے کہ قرب میں بُعد کا مشاہدہ کیا وُہ خوف میں مامون رہا اور جس نے بُعد میں قرب سمجھا اس نے امن میں مکر کیا۔

تلاوتِ قرآن کی لذّت

بعض علماء کا فرمان ہے کہ

"میں قرآن مجید کی تلاوت کرتا تھا اور تب تک تلاوت کی حلاوت نہ پاتا جب تک کہ یُوں نہ سُن لیتا کہ گویا حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے تلاوت فرما رہے ہیں پھر مجھے اس سے بلند مقام حاصل ہُوا تو اس طرح تلاوت کرنے لگا گویا میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کو جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تلاوت کرتے سُن رہا ہُوں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام عطا فرمایا: اب میں متکلم عزّ وجل سے گویا سن رہا ہوتا ہُوں اس وقت میں نے اس کی ایسی لذت و نعمت محسوس کی کہ میں اس سے جدائی کا صبر نہیں رکھتا"

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ یا حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اگر قلوب پاکیزہ ہو جائیں تو تلاوتِ قرآن سے کبھی سیری نہ ہو"

حضرت ثابت بنانیؒ نے فرمایا:

"میں نے بیس برس تک قرآن میں مشقت اٹھائی اور بیس برس تک اس سے متنعم ہُوا۔"

بعض علماء کا فرمان ہے کہ

"ہر آیت کے ساٹھ ہزار فہم ہیں اور جو باقی فہم ہیں وہ اس سے زیادہ ہیں"

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

"اگر تو چاہے تو سورۃ فاتحہ کی تفسیر سے سو اُونٹ لاد لے"

حضرت سلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ

"اگر میں ایک آیت پڑھوں اور چار رات اس میں رہوں اور پانچ رات ذکر کرتا رہوں اور جب تک میں فکر کو منقطع نہ کر دوں اس سے آگے نہ بڑھ سکوں"

بعض سلفؒ سے منقول ہے کہ "وہ چھ ماہ تک سورۃ ہُود کو پڑھتے رہے۔ بار بار پڑھتے اور اس سے فارغ نہ ہوتے"

ایک عارفؒ نے مجھے بتایا کہ

ہر جمعہ میں ایک ختم (قرآن) ہے اور ہر ماہ میں ایک ختم (قرآن) ہے اور ہر سال میں ایک ختم (قرآن) ہے اور تیس برس سے ایک ختم (قرآن) میں لگا ہُوا ہُوں ابھی تک فارغ نہیں ہُوا۔

یعنی یہ مشاہدہ و فہم کے ساتھ ہو رہا ہے" اور یہ فرمایا کرتے تھے کہ

میں نے اپنے نفس کو عبادت میں یُوں رکھا کر یومیہ عمل کرتا ہوں۔ جمعہ کے حساب سے، مہینہ کے حساب سے اور سالانہ حساب سے عمل کرتا ہُوں۔ لوگوں کو کلام اللہ کی حقیقت اور رازِ مراد کی معرفت سے حجاب ہُوا۔ اس لیے کہ انھیں کُنہِ معرفت کی حقیقت سے حجاب ہے اور انہیں اس قدر معرفتِ کلام حاصل ہے۔ جس قدر انھیں متکلم کی معرفت حاصل ہے اس لیے کہ مفہومِ کلام سے ہی معانیٔ صفات و افعال و احکام کی معرفت حاصل ہوتی ہے کیونکہ مفہوم کلام دراصل اس کے اوصاف و اخلاق کے معانی سے ہے اس لیے اس میں آسان و لطیف بھی ہے اور سخت و زبردست بھی ہے اور امید و خوف کا بھی ذکر ہے کیونکہ رحمت، لطف، انتقام اور گرفت کرنا اس کے اوصاف میں سے ہیں۔ جب اس کی معرفت کے قابل نہ ہو تو اس کی کُنہٗ کلام جاننے کے قابل بھی نہ ہُوا۔

مفہومِ کلام کا عارف

اب مفہومِ کلام کا سب سے زیادہ عالم ہی معانی صفات کا زیادہ عارف ہوتا ہے اور اوصاف و اخلاق و غوامضِ احکام کا سب بندوں سے زیادہ عارف ہی اسرار، وجوہِ حروف اور باطنِ کلام کے معانی کا زیادہ عارف ہوتا ہے اس کا سب سے زیادہ مستحق وُہ ہے جو سب سے زیادہ ڈرنے والا ہو۔ اور سب سے زیادہ ڈرنے والا وُہ ہے جو سب سے زیادہ قُرب رکھتا ہو اور سب سے زیادہ قرب وُہ رکھتا ہے جس کو وُہ اپنی عنایت و فضل سے مخصوص کر لے۔ حدیث میں آتا ہے:

" قرآن کو سب سے زیادہ احسن آواز سے وہی پڑھنے والا ہے جو پڑھے تو تُو دیکھے کہ وُہ اللہ تعالےٰ سے ڈرتا ہے۔" اور اس سے ڈرنے والا عارف ہی ہو سکتا ہے اور عارف وہی ہو سکتا ہے جو اس سے معاملہ کرے اور معاملہ وہی کرتا ہے جو اس کا قرب حاصل کرے اور قُرب وُہی حاصل کرتا ہے جو اس کا دھیان رکھے اور اس کی جانب نگاہ رکھے۔ اس صورت میں وُہ رازِ خطاب کی معرفت حاصل کرتا ہے اور باطنِ کتاب پر آگاہی حاصل کرتا ہے۔

سجدۂ تلاوت کا طریقہ

جب بندہ سجدۂ تلاوت کرے تو اسے چاہیے کہ سجدہ کی حالت میں آیت کے مفہوم کے مطابق دعا کرے اور اس کے مفہوم کے مطابق پناہ مانگے یہ قرآن کے جاننے والے علماء کا طریق ہے اور اللہ تعالیٰ اسے پسند فرماتا ہے اس طرح وُہ زیادہ ساجد شمار ہوگا۔

مثلاً اس نے یہ آیت پڑھی:

خَرُّوْا سُجَّدًا وَّ سَبَّحُوْا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ هُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ[1]

(اگر پڑیں سجدہ کرکے اور پاک ذات کو یاد کریں اپنے رب کی خوبیوں سے اور وہ بڑائی نہیں کرتے)

تو سجدۂ تلاوت میں یہ دعا کرے:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ السَّاجِدِيْنَ لِوَجْهِكَ الْمُسَبِّحِيْنَ بِحَمْدِكَ وَ اَعُوْذُبِكَ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْتَكْبِرِيْنَ عَنْ اَمْرِكَ اَوْ عَلٰى اَوْلِيَائِكَ۔

(اے اللہ مجھے اپنے لیے سجدہ کرنے والوں میں سے بنا دے۔ تیری حمد کے ساتھ تسبیح پڑھنے والوں سے اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں کہ میں تیرے حکم سے یا تیرے اولیاء پر تکبر کرنے والوں سے ہو جاؤں)

اسی طرح جب یہ آیات پڑھے۔

وَ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَ يَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا[2]

(اور گرتے ہیں ٹھوڑیوں پر روتے ہوئے اور زیادہ ہوتی ہے ان کو عاجزی)

تو یہ دعا پڑھے:

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِيْ مِنَ الْبَاكِيْنَ اِلَيْكَ الْخَاشِعِيْنَ لَكَ۔

(اے اللہ مجھے اپنے سامنے رونے والا اور تجھ سے ڈرنے والا بنا دے)

اسی طرح باقی آیات کو قیاس کر لیا جائے قرآن مجید ہی اس کا علم و عمل، دعا اور فکر و شغل ہو۔ اس سے مانگے اس پر ثواب ہو۔ اس سے درجہ ہو۔ اس کا ذکر رکھے۔ اس میں اس کے سب حال ہوں۔ سب کا مجموعہ اس میں ہو۔ اسی کی کلام سے عارفین کو معرفت حاصل ہوئی۔ اسی کی مخاطبت سے اہل یقین کو مشاہدہ اوصاف حاصل ہوا۔ اسی کی کلام سے ان کے علوم ہیں۔ اس کے اوصاف کے معانی کے مشاہدہ و علوم سے انھیں وجدان حاصل ہوا۔

اس لیے کہ کلام کی تمام اقسام اللہ ہی سے ہیں اور یہ معانی صفات ہیں، چنانچہ کلامِ رضا، کلامِ غضب اسی سے ہے۔ منعم و منتقم کا کلام اسی سے ہے۔ جبار و متکبر اور رحم دل مہربان کا کلام اسی سے ہے۔ جب بندہ عالم باللہ ہو اسی سے فہم و سمع حاصل ہو۔ اس کا مشاہدہ حاصل ہو تو جو غیر سے مخفی ہے اس کا وہ مشاہدہ کرے گا اور دوسرے جس سے نابینا ہوں انہیں وہ دیکھے گا۔

اللہ سبحانہ' و تعالیٰ نے فرمایا:

---

[1] سورۃ الم تنزیل السجدہ ۔ ۱۵۔ [2] سورۃ بنی اسرائیل ۱۰۹۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ وَ مَا لَا تُبْصِرُوْنَ[1] (سو قسم کھاتا ہُوں ان چیزوں کی جو دیکھتے ہو اور جو چیزیں تم نہیں دیکھتے)

نیز فرمایا:

فَاعْتَبِرُوْا یٰٓا اُولِی الْاَبْصَارِ۔ (اے بصارت والو عبرت حاصل کرو)

مطلب یہ ہے کہ فہم میں عبرت حاصل کرو۔ اس لیے کہ تم نے دیکھ لیا اب گاہے تاء بمعنی تاء تفعّل کے ہوتی ہے اور فصل میں تحقیق و مبالغہ اور وصول با وصف کے لیے آتی ہے۔ چنانچہ جب انھیں ہاتھ اور آنکھیں دیں اور ان فرقوں کے ساتھ انہوں نے دیکھا تو اب مخلوق سے ہٹ کر اللہ عزوجل کی جانب بھاگو۔ اب وُہ حسنِ ابتلاء کے معیار پر نکلے اور ابتلاء نے ان کا کچھ کم نہیں کیا ان کی مثال یہ ہُوئی کہ اللہ تعالےٰ نے فرمایا:

وَ مِنْ كُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ[2] (اور ہم نے ہر چیز سے جوڑ پیدا کیا تاکہ تم نصیحت پکڑو چنانچہ اللہ کی طرف بھاگو)

پھر فرمایا:

وَ لَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ[3] (اور اللہ کے ساتھ ساتھ دوسرا خدا نہ بناؤ)

یہی لوگ موحدین اور مخلصین ہیں اور یہی آدمی صاحبِ خلوص اور منفرد ہے پھر اشیاء کے ذکر سے بڑھ کر اس کی جانب گئے اور اس کے پاس اس کے ساتھ اس کا ذکر کیا۔ مصحفِ عبداللہ میں اس طرح دیکھا کہ:

فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ اِنِّیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ۔ (سو اللہ کی جانب بھاگو۔ بیشک میں تمہیں اس سے واضح ڈرانے والا ہُوں)

حدیث میں حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے اور بعض روایات نے اسے مرفوع بیان کیا ہے اور ہمیں محبین عارفین اور مخلصین کے طریق پر روایت پہنچی جو کہ مطلع راز ہیں اور واقفین خبر ہیں۔ یہ لوگ مقربین و مشاہدین ہیں کہ

"بے شک قرآن کا ایک ظہر اور ایک بطن ہے۔ ایک حد اور ایک مطلع ہے۔"

ہم کہتے ہیں کہ اہل عربیت (زبان دانوں) کے لیے اس کا ظہر ہے اور اہل یقین کے لیے

---

[1] سورۃ الحاقہ آیت ۳۸ [2] سورۃ الذاریات آیت ۴۹، ۵۰ [3] سورۃ الذاریات ۵۱۔

اس کا بطن ہے۔ اہلِ ظاہر کے لیے اس کی حد ہے اور اہلِ اشراف یعنی عارفین محبین کے لیے اس کا مطلع ہے۔ چنانچہ مقامِ امین کے پاس اس کا راز ودیعت رکھا اور حالتِ تمکین میں خبر پر آگاہ ہوئے۔

چنانچہ اللہ کے ہاں وہ مقربین میں ہوئے اس لیے کہ وہ اس کے ذریعہ دیکھنے والے ہیں (شاہدین ہیں)۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"شاہد دیکھتا ہے جو کہ غائب نہیں دیکھتا۔ اب جو حاضر ہوگا وہ شاہد ہوگا اور جو شاہد ہوگا وہ پالے گا اور جس نے پالیا وہ ایک ہوا اور جو ایک ہوا وہ معزز ہوا اور جو غائب رہا وہ اندھا ہوا اور جو اندھا ہوا وہ کھو بیٹھا اور جو کھو بیٹھا تو وہ بھول گیا اور جو بھول گیا تو وہ بھول ہی گیا۔"

اللہ عزوجل نے فرمایا:

قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى [1] (فرمایا یونہی پہنچی تھیں تم کو ہماری آیتیں۔ پھر تو نے ان کو بھلا دیا اور اسی طرح آج تجھ کو بھلا دیں گے)

یعنی تُو نے انہیں ترک کر دیا اور ان کی پرواہ نہ کی اور ان کی جانب دیکھا تک نہیں۔ اسی طرح ہم بھی آج تمہیں چھوڑ دیں گے اور تیری طرف نظرِ رحمت نہیں کریں گے اور نہ ہی لطف و کرم کا کلام کریں گے اور نہ ہی قرب نصیب ہوگا۔

---

[1] سورۃ طٰہٰ آیت ۱۲۶۔

فصل ۱۷

مفصّل و موصل کلام

ظاہر کلام دو عجیب معنی پر ہے،

۱۔ مجمل مختصر

۲۔ موصل مکرر

چنانچہ اس کا اجمال و اختصار، بلاغت و ایجاز کے لیے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ ۔ (بے شک اس میں عبادت کرنے والوں کے لیے پہنچانا ہے)

اور مکرر و تفصیل افہام و نصیحت کے لیے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ لَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ [1] (اور ہم پے در پے بھیجتے رہے ہیں ان کو اپنے کلام تاکہ وہ دھیان میں لائیں)

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے مبہم، مجمل اور توحید مفصل میں الرٰ فرمایا۔ یہ تین اسماء ہیں،

(۱) اللہ (۲) لطیف (۳) رحیم

اور ایک قول کے مطابق یہ ایک اسم یعنی رحمٰن کے حروف ہیں۔ پھر سبب ظاہر فرمایا اور کہا:

كِتَابٌ اُحْكِمَتْ آيَاتُهٗ یعنی توحید کے ساتھ (اس کی آیات محکم فرمائیں) ثُمَّ فُصِّلَتْ (پھر وضاحت کی) وعد اور وعید کے ذریعہ۔

پھر فرمایا:

مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ (حکیم کی جانب سے) یعنی احکام کے لیے۔ خَبِيْرٍ ۝ یعنی احکام کا (خبر رکھنے والا) حلال و حرام کی تفصیل سے آگاہ۔ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ [2] (کہ اللہ کے بغیر کسی کی عبادت نہ کرو) یہی وہ توحید ہے جس کو محکم فرمایا۔

اِنَّنِیْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّ بَشِيْرٌ ۔ (میں تمہیں اس سے ڈرانے والا اور خوشخبری دینے والا ہوں)

---

[1] سورۃ قصص آیت ۵۱ [2] سورۃ ہود آیت ۲۔

اس سے مراد وعدہ اور وعید ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بتایا:

چنانچہ مختصر ایجاز کے لیے ہے۔ فرمایا:

وَ آتَيْنَا ثَمُودَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوا بِهَا[1]

چنانچہ اس میں ایک مضمر اور دو محذوف ہیں۔ مُبْصِرَةً مضمر ہے معنی ہے آیۃ مبصرۃ۔ چنانچہ اسے مضمر کر دیا اور محذوف یہ ہیں۔ فرمایا: فَظَلَمُوا بِهَا[2] معنی یہ ہے کہ ظلموا انفسھم بالتکذیب بہا (انہوں نے ان کی تکذیب کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا) چنانچہ ایجاز کی خاطر دونوں کلموں کی جگہ دو مختصر کلمات لائے گئے۔ اسی طرح وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا۔ خواء کا معنی ہے خالی ہونا اور عروش کا معنی چھتیں ہیں۔ یہ عرش کی جمع ہے۔ اب یہ مکانات چھتوں سے خالی کس طرح ہو سکتے ہیں۔ چھتیں تو موجود ہوتی ہیں۔ یہ مختصر محذوف کی قسم ہے اور معنی یہ ہے کہ یہ پھلوں یا رہنے والوں سے خالی چھتوں کے بل گرے ہوئے ہیں۔ اسی طرح یہ آیت ہے کہ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ۔ اس میں فعل حذف کر کے اسم کو اس کی جگہ رکھ دیا گیا اور معنی یہ ہوا کہ ولکن البر، بر من آمن باللہ اور گاہے مبدل سے ہوتا ہے۔ اب اسم محذوف ہو گا اور اس کی جگہ فعل لایا جائے گا۔ یعنی لکن البر، من آمن باللہ اسی طرح جب اس کا وصف بر ہے تو اسے اس کی جگہ رکھا اور پہلے مفہوم کی مثال یہ ہے کہ وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ یعنی بچھڑے کی محبت پلا دی گئی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ[3] اور یہاں اس کے قتل کا ذکر نہیں کیا۔ معنی یہ ہوا کہ بِغَيْرِ نَفْسٍ قَتَلَهَا چنانچہ فعل حذف کر دیا۔ اس طرح فرمایا، أَنَّهُ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ۔ اس میں بِغَيْرِ نَفْسٍ قَتَلَهَا أَوْ بِغَيْرِ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ کو مضمر کیا اب اس کے ذکر پر اکتفاء کیا۔ اس طرح فرمایا، مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ۔ اس کا معنی ہے مَنْ فِي الْأَرْضِ۔ ایسے ہی فرمایا، فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّينِ۔ یہ اس قول سے متصل ہے فرمایا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ[4]۔

ان دونوں کے درمیان نعت و استثناء کا فعل کیا۔ معنی یہ ہوا کہ اے انسان اس بیان کے بعد

---

[1] سورہ ہود آیت ۲ [2] سورہ بنی اسرائیل آیت ۵۹ [3] سورہ الکہف آیت ۲ [4] سورۃ التین آیت ۴۔

کیا چیز تجھے دیانت وایمان سے تکذیب کرانے والی ہے۔ اور وَهُوَ اَحْكَمُ الْحَاكِمِيْنَ (اور وہ احکم الحاکمین ہے)

مبدل مضمر کی مزید اقسام

فرمایا: اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ[1] معنی یہ ہوا کہ ضِعْفَ عَذَابِ الْاَحْيَاءِ وَضِعْفَ عَذَابِ الْمَوْتٰى۔

چنانچہ "عذاب" کے لفظ کو مضمر کر دیا اور احیاً اور موتیٰ کے بدلہ میں حیاۃ کا ذکر کر دیا۔ یعنی اسم کی جگہ وصف ذکر کر دیا۔ یہ بھی مناسب ہے کہ وصف، اس کے لفظ پر چھوڑ دیا جائے اور اھل مضمر کر دیا جائے چنانچہ یوں عبارت بن جائے کہ ضعف عذاب اھل الحیاۃ وضعف عذاب اھل المممات جیسے کہ قریۃ اور العیر میں اھل مضمر کیا۔ فرمایا:

وَاسْاَلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا[2]

اس سے مراد یہ ہے کہ وَاسْاَلْ اَهْلَ الْقَرْيَةِ اور اِسْاَلْ اَهْلَ الْعِيْرِ۔ اسی طرح یہ آیت آتی ہے کہ

ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۔ یہ مبدل مضمر ہے۔ ثقلت اس کا مبدل ہے اور معنی ہے خفیت، یہ دلالتِ معنی کے باعث بدل ہوا۔ اس لیے کہ جب ایک چیز مخفی ہوتی ہے تو وہ ثقیل بن جاتی ہے۔

اسی طرح فرمایا:

فِي السَّمٰوٰتِ اس کا معنی ہے عَلَى السَّمٰوٰتِ (آسمانوں پر) ۔ اور اھل مضمر ہے۔ معنی یوں ہوا۔ اہل آسمان اور اہل زمین پر مخفی رہا۔ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً (یعنی اچانک آن پڑے گا)

اسی طرح فرمایا:

تَفْتَؤُا تَذْكُرُ يُوْسُفَ ۔ اس میں مضمر اور محذوف دونوں ہیں۔ تزال محذوف ہے اور لا مضمر ہے۔ جو کہ جواب قسم ہے۔ معنی یہ ہوا کہ قالوا تاللہ لا تزال تفتؤ تذکر یوسف (اللہ کی قسم تم ہر وقت یوسف کا ذکر کرتے رہتے ہو) چنانچہ لا کو مضمر کر دیا اور تفتأ کے ساتھ اس کے بدل میں تزال لے آئے۔ یہ مختصر کلام ہے اور فصاحت و بلاغت میں بے مثال ہے۔ یہ بعض اہلِ عرب کی لغت ہے اور یہ بھی یاد رہے کہ قرآن میں ہر لغتِ (عرب) ملتی ہے۔

---

[1] سورہ بنی اسرائیل آیت ۷۵، [2] سورہ یوسف آیت ۸۲۔

اسی طرح اللہ عزوجل کا فرمان ہے کہ

۱۔ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اِنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ [۱]

۲۔ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا۔

اس کا معنی ہے کہ تم روزی کا شکر یہی کرتے ہو کہ تکذیب کرتے ہو۔ اسی طرح انہوں نے شکر نعمت کو بدل کر کفر سے بدل لیا۔ اسی طرح فرمایا:

۱۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا۔

۲۔ وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا۔

اس کا معنی ہے کہ اَهْلَ الْقَرْيَةِ۔ اسی طرح فرمایا:

وَاسْئَلِ الْعِيْرَ۔ یعنی اَهْلَ الْعِيْرِ۔ اور عِيْرَ سے مراد غیر معروف اونٹ ہے۔ اہل نحو اس کو مجاز کا نام دیتے ہیں۔ اسی طرح فرمایا:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ۔

اس کا معنی یہ ہے کہ لِلطَّرِيْقَةِ الَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ (یعنی یہ قرآن اس طریق کی طرف رہنمائی کرتا ہے جو کہ پختہ ترین ہے)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ۔ یعنی وہ کلمہ کہیں کہ جو احسن اور بہترین ہو۔

نیز فرمایا:

اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ۔

یعنی ایسے فعل یا کلام کے ساتھ جواب دو جو کہ بہترین ہو۔

ایک جگہ فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰى یعنی كَلِمَةُ الْحُسْنٰى۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ حُسْنٰى نعت ہے اسم نہیں۔ اس کا معنی "جنت" ہے۔

نیز فرمایا،

عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ یعنی عَلٰى عَهْدِ مُلْكِ سُلَيْمٰنَ۔ چنانچہ اس میں عہد کو مضمر کر دیا۔

---

[۱] سورہ واقعہ آیت ۸۲۔

اسی طرح فرمایا:

وَ آتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلٰى رُسُلِكَ۔

یعنی رسولوں کی زبانوں پر، (عَلٰى اَلْسِنَةِ رُسُلِكَ) السنة کو مضمر کیا۔

مکنّٰی مضمر

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) وَ مَا اَنْسَانِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ۔ اس میں حُوْت کو مضمر کر دیا اور موسیٰ علیہ السلام کا نام بھی اختصار کے باعث محذوف کر دیا۔ معنی یہ ہُوا کہ

وَ مَا اَنْسَانِيْ ذِكْرَ الْحُوْتَ لَكَ اِلَّا الشَّيْطٰنُ۔

(تیرے سامنے مچھلی کا ذکر کرنا صرف شیطان نے مجھے بھلا دیا۔)

(۲) اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ یعنی انزلنا القرآن یعنی ہم نے قرآن کو نازل کیا۔ چنانچہ ہٗ سے اس کا کنایہ ہے اور اس کا ذکر پہلے نہیں کیا۔

(۳) حَتّٰى تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ۔ یعنی توارت الشمس (حتّٰی کہ سورج پردہ میں چھپ گیا) اس کا ذکر نہیں تھا۔ چنانچہ اس سے یہ کنایہ ہے۔

(۴) وَ مَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ۔ یعنی دنیا میں زہد کا کلمہ اور آخرت میں ترغیب و رغبت کی بات۔ یہ اس طرح جا رہا ہے کہ

وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ۔ یعنی تمہارا ناس ہو۔ یہ بات تمہارے لیے بہتر ہے۔

مبدل مختصر

۱۔ فرمایا:

وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ۔ یعنی جب اس سے کہا جائے کہ اللہ سے ڈرو تو گناہ پر اسے عزت کا خیال آ جاتا ہے۔ (اخذته العزة على الاثم) یعنی نصیحت کی پروا نہیں کرتا اور اپنی جھوٹی عزت پر اکڑنے لگتا ہے۔ اب اخذته کا معنی ہے حَمَلَتْهُ اور بِالْاِثْمِ کا معنی ہے عَلَى الْاِثْمِ۔

۲۔ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا نَوْمٌ (اسے نہ نیند آتی ہے اور نہ اُونگھ) یعنی لاتحمله سِنَة و لا نوم۔ اس لیے کہ اونگھ بندے پر سوار ہوتی ہے۔ یعنی اس سے بیداری کو دور کرتی ہے۔

منقول منقلب

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

۱۔ يَدْعُوْا لَمَنْ ضَرُّهٗ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ۔ اب لِمَنْ میں جملہ منقولہ

ہے اور معنی یہ ہے کہ

یَدْعُوا من ضرہ اقرب من نفعہٖ (اس کو پکارتا ہے کہ جس کا ضرر اس کے نفع سے زیادہ قریب ہے)۔

۲۔ لَتَنُوْءُ بِالْعُصْبَةِ یعنی لتنوء العصبة بھا۔ یعنی اس کو اٹھانا مشکل ہے اس لیے کہ وُہ بہت وزنی ہے۔

۳۔ وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ۔ سَلَامٌ عَلٰی اِلْ یَاسِیْنَ۔ ان دونوں میں کلام کے جوڑا ہونے کے باعث اسم کو منقلب کر دیا گیا۔ معنی یوں ہُوا۔ طور سینا وسلام علی الیاسین۔

اور ایک قول کے مطابق "ادریس" آتا ہے اس لیے کہ حضرت ابن مسعودؓ کے حرف میں "سَلَامٌ عَلٰی اِدْرِیْسَ" آتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ عِضِیْنَ۔ (جنھوں نے قرآن کو کیا ہے ٹکڑے ٹکڑے) یعنی اعضاء۔ چنانچہ بعض پر ایمان لائے اور بعض سے کفر کیا۔ اس معنی میں یہ آیت بھی ہے کہ

(۵) وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِیْرَ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتِ۔ معنی یہ ہے کہ جعل منھم عبدة الطاغوت یعنی ان میں سے بعض کو ایسا بنایا کہ انھوں نے طاغوت کی عبادت کی۔ اسکو مَنْ لَعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَیْهِ پر معطوف بھی کیا جا سکتا ہے۔

اور جس نے الطاغوت کو مکسور پڑھا اس نے "عبد" کو اسم بنایا اور طاغوت کی طرف اس کی اضافت کی یعنی عبدة اور عبادات الطاغوت۔ اس میں دُوسری پانچ لغات بھی ہیں:

۱۔ عباد الطاغوت

۲۔ عبد الطاغوت

۳۔ عبدة الطاغوت

۴۔ عباد الطاغوت

۵۔ عبد الطاغوت

البتہ منصوب حالت میں عبد الطاغوت عبادت سے ہے اور فعل کے مفہوم میں ہے۔

مضمر مختصر کی مزید امثال

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

۱۔ اَلَا اِنَّ عَادًا كَفَرُوْا رَبَّهُمْ (یاد رکھو قومِ عاد نے اپنے ربّ کا کفر کیا۔) اس کی ضمیر دو کلموں میں سے ایک ہے۔

۱۔ کفروا نعمۃ ربّھم

۲۔ کفروا توحید ربّھم

اب اختصار کے باعث اسے مضمر کر دیا اور خافض ساقط ہونے کے باعث اسم منصوب ہے۔
اس میں ایک عجیب سی معنی پر محمول توجیہ ہے۔ اس لیے کہ انھوں نے اپنے رب کو چھپانے کی کوشش کی۔ یعنی اس کی آیات کو چھپایا۔ اور حق کو مخفی رکھا اور کفرھم کا معنی یہ ہے کہ غطی علیھم بما غطوا ربھم۔ توحید میں اسی طرح ہے اس لیے کہ ہر فعل اس سے ہے۔
اب اس قول وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَا يَلْبِسُوْنَ کا معنی یہی ہُوا اور لبس کا معنی ہے تغطیۃ (چھپانا)

۲۔ اسی طرح فرمایا:
وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖ اَوْلِيَآءَ مَا نَعْبُدُهُمْ۔ اس میں مضمر یہ ہے کہ یَقُوْلُوْنَ مَا نَعْبُدُهُمْ (اور جنھوں نے اس کے ماسوا کو کارساز بنالیا۔ (وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کی عبادت نہیں کرتے)

۳۔ اسی طرح فرمایا:
فَظَلْتُمْ تَفَكَّهُوْنَ اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ ہم مقروض ہیں۔ اس معنی پر فرمایا:
فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ[1]
(جو تجھے اچھائی پہنچی تو وہ اللہ سے ہے اور جو تجھے برائی پہنچی تو وہ تیرے نفس سے ہے)
اب معنی یہ ہے کہ جو وہ کہتے ہیں کہ ما اصابک۔ یہ ان سے خبر دینے اور ان کی مذمت کے مفہوم میں ہے۔ اس سے قدریہ لوگ ہلاک ہُوئے انھیں عربی زبان کا علم نہیں۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ اللہ عزّوجلّ سے ابتداءِ شرع و بیان ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ابتداءِ شرع و بیان پختہ طور پر پہلی آیت میں فرمایا: یعنی قَالَ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ میں فرما دیا۔
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے کہ اگر تم پر قرآن کی کوئی عبارت مشتبہ ہو جائے تو کلامِ عرب میں اسے تلاش کرو۔ اس لیے کہ گاہے ایک آدمی آیت کی تلاوت کرتا ہے اور اس کی

---

[1] سورہ نساء آیت ۷۸۔

توجیہ سے عاجز آ کر وہ کفر کر بیٹھتا ہے اور مصحف عبداللہ بن مسعودؓ میں اس کی قرأت اس طرح ہے کہ

فما لھولاء القوم لا یکادون یفقھون حدیثا۔

اور انہوں نے کہا:

ما اصابكَ من حسنة۔

اب یہ جیسے میں نے تجھے خبر دی ویسے ہی ہے اور میں نے مصحف عبداللہ میں دیکھا کہ

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَاۗءَ مَا نَعْبُدُهُمْ [1] یہ وہیں سے ہے اور جنہوں نے پکڑ رکھے ہیں اس سے ورے حمایتی کہ ہم تو ان کو پوجتے تھے اس واسطے)

اور اللہ کا یہ فرمان بھی مضمر میں سے ہے کہ

۴۔ وَلَوْ نَشَاۗءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰۗىِٕكَةً فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ [2]

اب اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ انسانوں کو ہی فرشتے بنا دیتا بلکہ معنی یہ ہے کہ لجعلنا بدلا منکم ملائكة۔ (تمہارے بدلا میں فرشتے لا بساتا) اور لجعلنا بدلکم دراصل منکم کے معنی میں ہے۔

مبدل کی مثالیں

(۱) مبدل کی ایک مثال یہ ہے کہ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ۔ لام دراصل باء کے بدل میں ہے۔ یعنی وھم بھا سابقون۔ اس لیے کہ اگر وہ ان سے بڑھیں گے تو وہ انہیں کھو دیں گے۔

۲۔ بعض نے اس معنی پر یہ فرمان بھی بتایا ہے کہ

فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ یعنی بِالْجَبَلِ

گویا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پہاڑ حجاب تھا۔ حجاب ہٹا دیا اور تجلی پڑی۔

۳۔ جیسے کہ فرمایا:

مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓي اِنِّىْٓ اَنَا اللّٰهُ۔

اب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے درخت تھا۔ اس سے اللہ تعالیٰ نے کلام فرمایا۔

۴۔ اسی طرح یہ آیت ہے کہ

وَلَاُصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ۔ معنی یہ ہے کہ علی جذوع النخل۔

---

[1] سورۃ الزمر۔ آیت ۳

[2] سورۃ زخرف۔ آیت ۶۳۔

(اور مول دوں گا تم کو کھجور کے تنوں پر)

۵۔ ایسے ہی فرمایا،

فَلَا تَجْعَلْنِیْ فِی الْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۔ (مجھے ظالم قوم میں نہ بنانا) مراد ہے مع القوم (ظالم قوم کے ساتھ نہ بنانا)

۶۔ اسی معنی میں یہ آیت بھی ہے کہ

اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ یَّسْتَمِعُوْنَ فِیْهِ یعنی یستمعون علیہ (اس پر چڑھ کے سنتے ہیں)

۷۔ اسی طرح مُسْتَكْبِرِيْنَ بِهٖ یعنی مستکبرین عنہ یعنی قرآن سے تکبر کرنے والے مراد ہیں۔ اسی طریق پر یہ مجاز ہے۔ فرمایا:

فَاسْاَلْ بِهٖ خَبِيْرًا یعنی سَلْ عَنْهُ (اس کے بارے میں کسی خبر والے کو پوچھو) چنانچہ حروفِ عوامل ایک دوسرے کی جگہ آ جاتے ہیں۔

۸۔ فرمایا:

اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌ بِهٖ یعنی منفطر فیہ یعنی دن میں۔

اور اسی طرح یہ فرمان ہے،

۹۔ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا۔ اس کا معنی یوں ہوگا کہ وَلَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا۔ یعنی الا کو ولا سے بدل دیا۔ اور یہ ممکن ہے کہ اِلَّا مستانفہ ہو یعنی لٰكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا۔ اور یہ فَلَا تَخْشَوْهُمْ۔ یعنی خبر سے متصل ہو۔ اب اس طرح اس کا مطلب ہوا کہ میرے پاس مرسلین کو کوئی خوف نہیں سوائے ان کے کہ جنہوں نے ظلم کیا۔ یعنی لکن من ظلم۔

پھر برائی کے بعد اچھائی سے بدل دیا۔ اب خبر مابعد کا یہ مبتدا ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اسی مفہوم میں ہے کہ

۱۰۔ وَلَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَهُمْ اِلٰى اَمْوَالِكُمْ۔ (اور ان کے مالوں کو اپنے مالوں کے ساتھ نہ کھاؤ) یعنی مَعَ اَمْوَالِكُمْ۔

۱۱۔ اسی طرح فرمایا:

وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ (اور کہنیوں سمیت) یعنی مَعَ الْمَرَافِقِ۔ اس لیے کہ یہ غسل میں داخل ہیں۔ اور حروفِ عاملہ ایک دوسرے کی جگہ آتے رہتے ہیں اور اگر اسی قسم کا مضمر، ظاہر کر دیا جائے

اور اس قسم کا محذوف، موصول کر دیا جائے تو قرأت ضعیف ہو جائے گی۔

موصول مکرر موکد بیان و تاکید کے لیے موصول مکرر کی مثالیں اللہ عزوجل کے فرمان میں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ۔

(اور یہ جو پیچھے پڑے ہیں اللہ کے سوا شریکوں کو پکارنے والے۔ سو یہ کچھ نہیں مگر پیچھے پڑے ہیں اپنے خیال کے)

ان یتبعون کو تاکید و افہام کے باعث رد کیا گیا۔ گویا جب کلام طویل ہُوا تو سمجھنے کے قریب کرنے کے لیے اس کا اعادہ کیا اور معنی یہ ہُوا کہ جو لوگ اللہ کے سوا دوسرے شرکاء کو پکارتے ہیں۔ وہ صرف گمان ہی کی تابعداری یقین کی بجائے صرف ظن سے ہی ہے۔ اسی طرح مکرر موکد کی مثال آتی ہے۔ فرمایا کہ:

(۲) قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لِلَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا لِمَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ۔

(اس گروہ نے کہ جس نے اپنی قوم میں سے تکبر کیا۔ ان کو کہا کہ جو ان میں سے ایمان لائے اور وُہ کمزور تھے)

اس کا اختصار یہ ہے کہ الذین استکبروا لمن آمن من الذین استضعفوا۔ اب جب الذین استضعفو کو مقدم کیا اور ان میں سے بعض مراد تھے۔ تو بیان کی خاطر مراد کو من آمن منھم کے اعادہ سے مکرر کر دیا۔ اسی طرح ایک جگہ فرمایا:

(۳) اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ اِنَّا لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا امْرَاَتَهٗ۔

(سوائے آلِ لوط کے کہ ہم ان سب کو نجات دیں گے سوائے اس کی بیوی کے)

یہاں استثناء پر استثناء داخل کیا۔ یُوں کلام طویل ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ بعض کی آل کی نجات مراد ہے۔ اب جب سب کا ذکر کیا تو مستثنیٰ سے مستثنیٰ نکالا۔

اس میں ایک اس بات کی دلیل بھی موجود ہے کہ بیویاں بھی آل میں داخل ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی بیوی کو آل سے مستثنیٰ کرنا پڑا۔ (اگر داخل نہ ہوتی تو استثناء کی ضرورت نہ تھی)

(۴) چوتھی مثال یہ ہے کہ فرمایا:

فَلَمَّآ اَنْ اَرَادَ اَنْ يَّبْطِشَ (سو جب اُنھوں نے ارادہ کیا کہ پکڑیں) اس کا مختصر کلام یہ ہے کہ فَلَمَّا اَرَادَ يَبْطِشَ۔ اور کہا ہے یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مختصر مضمر میں سے ہے جس کا اسم مضمر ہے۔

اور فعل محذوف ہے۔ مگر یہ غریب توجیہ ہے۔ اب اس کی تقدیر یوں ہو گی کہ فَلَمَّا اَرَادَ الْاِسْرَائِیْلِی اَنْ یَّبْطِشَ مُوْسٰی۔ (سو جب اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کو پکڑنے کا ارادہ کیا)
بِالَّذِیْنَ ھُوَ عَدُوٌّ لَّھُمَا۔ (اس کے باعث جو کہ ان دونوں کا دشمن تھا) فَلَمْ یَفْعَلْ (سو گیا)
قَالَ یَا مُوْسٰی اَتُرِیْدُ اَنْ تَقْتُلَنِیْ۔ (کہا اے موسیٰ کیا تیرا ارادہ یہ ہے کہ تو مجھے قتل کر دے)
اس صورت میں یہ مختصر تریں اور موجز کلام ہے۔

(۵) اسی طرح فرمایا:
فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ عَاقِبَۃُ الَّذِیْنَ کَانُوْا مِنْ قَبْلِھِمْ کَانُوْا ھُمْ اَشَدَّ مِنْھُمْ قُوَّۃً۔
(سو دیکھیں کہ ان کا کیسا انجام ہوا کہ جو ان سے پہلے تھے اور وہ ان سے زیادہ قوت والے تھے)
اس کا مفہوم یہ ہوا کہ فینظروا کیف کان عاقبۃ الذین من قبلھم کانوا اشد منھم قوۃ۔ اب من کے ساتھ وصل کیا اور حضرت ابن مسعود کے مصحف میں یہ قرأت آتی ہے کہ عاقبۃ الذین من قبلھم کانوا اشد قوۃ۔ اس میں کانوا اور ھم نہیں۔
اس مفہوم میں یہ فرمان ہے کہ
لَجَعَلْنَا لِمَنْ یَّکْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ لِبُیُوْتِھِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّۃٍ۔
اور معنی یہ ہوا کہ جو رحمٰن کا کفر کرتے ہیں ہم ان کے مکانات کی چھتوں کو چاندی کا بنا دیتے۔ لجعلنا لبیوت من یکفر بالرحمٰن یعنی جب "من" کو مقدم کیا اور یہ کفر کرنے والوں کا نام ہے تو موخر کر کے بیوت کا ذکر دہرایا۔

مکنی مبہم

مکنی مبہم مشتبہ کی مثالیں حسب ذیل آتی ہیں۔
(۱) ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْکًا لَّا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ۔
اس جگہ میں شَیْءٍ سے مراد جو اللہ نے روزی دی اس میں سے خرچ کرنا ہے اور اس کے بعد فرمایا:
(۲) وَضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا رَّجُلَیْنِ اَحَدُھُمَا اَبْکَمُ لَا یَقْدِرُ عَلٰی شَیْءٍ۔
اس مقام پر شَیْءٍ سے مراد وصفِ ربوبیت میں سے ایک مخصوص وصف ہے اور یہ ایسا علم ہے جو لدنی طور پر حضرت خضر علیہ السلام نے انھیں سکھایا۔ خود بتائے بغیر اس کے بارے میں سوال کرنا درست نہیں ہے اس لیے اس سے کنایہ کیا۔ اس طرح علم کی دو قسمیں ہیں:
۱۔ یہ مناسب نہیں کہ خود بتانا شروع کرے۔ جب تک کہ وہ پوچھتے نہیں۔ یہ اس سے ہے کہ

اس کا علم تنگ نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے اس کی جہالت وسیع ہوئی اور اس کا اخفاء بہتر رہا۔

۲۔ ایک علم ایسا ہے کہ اس کا سوال کرنا درست نہیں یعنی توحید کی صفات اور وحدانیت کی صفتیں۔ یہ عقلوں کے سپرد نہیں کیا جاتا بلکہ اس کی مراد محمول مخصوص ہوتی ہے۔ چنانچہ حضرت خضر علیہ السلام کا علم ایسا ہے کہ انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر شرط لگائی کہ اس کے بارے میں سوال نہ کرنا۔ جب تک کہ میں خود نہ بتا دوں اور اللہ تعالیٰ اپنے امر پہ غالب ہے۔

۳۔ ایک جگہ فرمایا:

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے۔ مطلب یہ ہے کہ خالق کے بغیر ان کی پیدائش کیونکر ہو سکتی ہے۔ اب ان کے وجود میں ہی خالق کا ثبوت موجود ہے اور یہ خود اس پر دلالت کرتے ہیں کہ (اللہ) نے انہیں پیدا کیا۔

حضرت ابن عباس اور ابن زید رضی اللہ عنہم سے مروی ہے۔ ان دونوں صحابہؓ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

من غیر رب کیف یکون خلق من غیر خالق؟ (یعنی بغیر رب کے۔ کہ خالق کے بغیر کوئی مخلوق کس طرح پیدا ہو سکتی ہے؟)

۴۔ ایک جگہ فرمایا،

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ۔

چنانچہ پہلے بعض کہ جنھیں رزق میں فضیلت ملی، وہ احرار اور آزاد لوگ ہیں۔ اور بعض دوسرے مفضول لوگوں سے مراد ممالیک ہیں۔

۵۔ اس طرح فرمایا،

وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ۔

۶۔ اور فرمایا،

وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ۔ ہاء اور میم دونوں اخوان اسماء شیاطین سے متصل ہیں اور ہاء اور میم یمدون اسماء المشرکین سے متصل ہیں۔ اور ہاء اور میم کے بھائی ہیں۔ وہ سرکشی میں مشرکوں کی مدد کرتے ہیں اور ان کی امداد میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے۔

۷۔ اس معنی میں فرمایا:

اِنَّمَا سُلْطَانُہٗ عَلَی الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَہٗ وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِہٖ مُشْرِکُوْنَ۔

پہلی ھا (نہ کی) دراصل یتولونہ سے متصل ہے اور ابلیس سے کنایہ ہے اور ھم بہٖ سے متصل ھاء دراصل اللہ عزوجل کا اسم ہے۔ ایک قول کے مطابق یہ بھی ابلیس کی طرف جاتی ہے۔ اب معنی یہ ہُوا کہ انھوں نے اس کے ساتھ توحید میں شرک کیا۔ یعنی اللہ عزوجل کی عبادت میں اس کو شریک کیا۔

۸۔ اس معنی میں فرمایا:

فَاَنْزَلْنَا بِہِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِہٖ مِنْ کُلِّ الثَّمَرَاتِ۔

پہلی ھا سحاب کی طرف جاتی ہے یعنی ہم نے بادلوں کے ذریعہ پانی اتارا اور "بہٖ" کے قول میں مبدل اور مکنی ہے۔ مکنی مذکورہ اسماء سحاب میں سے ہے اور مبدل یہ ہے کہ بہٖ کا معنی ہے مِنْہُ۔

اس طرح فرمایا:

یَشْرَبُ بِھَا عِبَادُ اللہِ۔ یعنی یشرب منہا۔ اور مفسر میں یہ قول صریح ہے اور اَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ مَآءً ثَجَّاجًا۔ یعنی بادل اتارے۔

اس طرح فرمایا:

سُقْنَاہُ لِبَلَدٍ مَّیِّتٍ۔ اور دوسری ھاء میں یہ قول ہے کہ:

اَخْرَجْنَا بِہٖ مِنْ کُلِّ الثَّمَرَاتِ۔ (اس کے ذریعہ ہم نے سب پھل نکالے) یعنی پانی کے ذریعہ اب ھاء کے ساتھ پانی اور بادل کے نام جمع کر دیے۔ اس لیے اشکال ہو گیا۔

خطابِ مجمل کا دوسرا اور تیسرا بیان

خطابِ مجمل کے لیے دوسرے اور تیسرے بیان پر مشتمل آیات حسب ذیل ہیں:

۱۔ شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ۔

اس سے یہی معلوم ہُوا کہ قرآن کا نزول صرف رمضان کے مہینہ میں ہُوا اور یہ واضح نہ ہو سکا کہ دن میں نازل کیا گیا یا رات میں نازل ہوا۔ اور دوسرے بیان میں فرمایا:

اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ فِیْ لَیْلَۃٍ مُّبٰرَکَۃٍ۔

اس آیت سے بہی معلوم ہُوا کہ کسی ایک مبارک رات کے اندر نازل ہُوا اور یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کس رات میں نازل ہُوا؟ پھر تیسرا بیان آیا کہ:

اِنَّا اَنۡزَلۡنٰهُ فِىۡ لَيۡلَةِ الۡقَدۡرِ۔ (بے شک ہم نے اسے شب قدر میں نازل کیا)
اب یہ غایت بیان ہوا۔
۲۔ اسی طرح ایک جگہ فرمایا:
وَلَمَّا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَاسۡتَوٰى اٰتَيۡنٰهُ۔
یہ پہلا بیان ہے اور یہ اشد پر زیادتی ہے۔ یہ وصف ہے مگر غیر واضح ہے۔ پھر دوسرے بیان میں فرمایا:
حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرۡبَعِيۡنَ سَنَةً۔
اس بیان میں اشد کی وضاحت اربعین (چالیس برس) کے ساتھ کر دی۔ بُلہ و آذٰ مدح اور وصف کی ہو۔ دو میں سے ایک صورت میں۔ اور موحد سے ہو۔ اور اس کا معنی جمع کا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ:
وَالۡعَصۡرِ اِنَّ الۡاِنۡسَانَ لَفِىۡ خُسۡرٍ۔ معنی یہ ہے کہ تمام انسان خسارے میں ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ:
اِلَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (سوائے ان کے کہ جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے) اور واحد سے ایک جماعت مستثنیٰ نہیں ہوتی بلکہ زیادہ جماعت سے ایک (چھوٹی) جماعت کو مستثنیٰ کیا جاتا ہے اور جنس کے باعث اسم کو واحد رکھا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
يٰۤاَيُّهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ كَدۡحًا۔
اس کا معنی یہ ہے کہ اے انسان تجھ کو بچنا ہے اپنے رب تک بچ بچ کر۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان دلالت کرتا ہے کہ:
فَاَمَّا مَنۡ اُوۡتِىَ كِتٰبَهٗ بِيَمِيۡنِهٖ الخ وَاَمَّا مَنۡ اُوۡتِىَ كِتٰبَهٗ وَرَآءَ ظَهۡرِهٖ۔
اس میں توحید اسم کے باعث نعت کو بھی واحد رکھا گیا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
وَحَمَلَهَا الۡاِنۡسَانُ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوۡمًا جَهُوۡلًا۔
اس کا معنی یہ ہے کہ سب لوگوں نے اسے اٹھا لیا (اور وہ بہت اندھیر مچانے والے اور جاہل ہیں۔) میرے نزدیک یہ دونوں وجوہ میں سے پسندیدہ توجیہ ہے۔ اس لیے کہ ان کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا:
لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الۡمُنٰفِقِيۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتِ وَالۡمُشۡرِكِيۡنَ وَالۡمُشۡرِكٰتِ۔

(تاکہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ منافق مردوں اور منافق عورتوں، مشرک مردوں اور مشرک عورتوں کو سزا دے۔)

اس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

وَاِنَّا اِذَا اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انا اذقنا الناس منا رحمة فرحوا بها۔

(جب ہم لوگوں کو اپنی طرف رحمت چکھاتے ہیں۔ وہ اس پر خوش ہوتے ہیں۔)

چنانچہ جب اسم واحد رکھا تو اس کی نعت بھی واحد رکھی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی اس پر دلالت کرتا ہے:

وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ۔

چنانچہ اس میں جمع کو ظاہر کر دیا۔

جمع سے واحد مراد لینا

جس جمع سے واحد مراد لی گئی اُن کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ الْمُرْسَلِيْنَ۔ یعنی تنہا نوح علیہ السلام کی تکذیب کی۔ اس لیے کہ قوم نوحؑ کی طرف حضرت نوح علیہ السلام کے علاوہ دُوسرا کوئی نبی مبعوث نہیں ہوا۔ اس پر یہ کلام دلالت کرتا ہے کہ:

۲۔ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ۔ اس میں جمع کو واحد بنا دیا۔

۳۔ اور اس طرح فرمایا:

فَمَا اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَلَا رِكَابٍ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَاۤءُ۔ یعنی خیبر کے دن (کئی رسول نہیں) بلکہ تنہا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مسلط فرما کر کافروں کو شکست دی۔

جمع مکنی

جمع مکنی کی مثالیں حسب ذیل ہیں:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

۱۔ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ۔

یعنی اس دجال کے موقع پر۔ اور یہ آیت دجال کے ذکر میں اور اس کے معاملہ کے استعظام کے سلسلہ میں نازل ہوئی۔

۲۔ اسی طرح فرمایا:

اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ ۔

(جن کو لوگوں نے کہا کہ لوگ تمہارے لیے جمع ہوتے ہیں) یعنی ایک آدمی نے انہیں کہا اور اس کا نام حضرت عروۃ بن مسعود ثقفی تھا۔ جنس کے باعث اس لفظ کو جمع بنا کر بیان کیا اور عرب لوگ جنس کے لیے واحد کو جمع بنا لیا کرتے ہیں۔ اس طرح ایک وجہ میں فرمایا،

ثُمَّ اَفِیْضُوْا مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ النَّاسُ ۔ (جہاں سے لوگ چلیں پھر تم بھی چلو) اور مراد (ناس) سے اکیلے حضرت آدم علیہ السلام ہیں کہ سب سے پہلے کعبۃ اللہ کا طواف انھوں نے کیا۔ ان کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور انہیں مناسکِ حج کی تعلیم دی۔ میں نے بعض سلف کی تحریرات میں یہ پڑھا کہ:

مِنْ حَیْثُ اَفَاضَ آدَمُ (جہاں سے کہ آدمؑ چلے)۔ اب یہ عبارت اس کی شاہد بن گئی۔

حُسنِ کلام وغیرہ کے لیے تقدیم وتاخیر کرنا

ترکیبِ کلام کے حسن اور مزید بیان و اظہار کی خاطر تقدیم وتاخیر کرنے کی مثالیں حسبِ ذیل ہیں:۔

۱۔ مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِیْمَانِهٖ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا ۔[1]

اس کا اختصار اور تاخیر اس طرح ہوگا کہ:

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ بَعْدَ اِیْمَانِهٖ وَ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَیْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِیْمَانِ ۔

(جس نے ایمان کے بعد کفر کیا اور کفر پر اس کا سینہ کھل گیا تو ان پر اللہ کا غضب ہے۔ ہاں البتہ جس پر جبر کیا گیا اور اس کا دل ایمان پر مطمئن ہے۔ وہ اس سے مستثنیٰ ہے) اور کلام کے آخری حصہ میں اُكْرِهَ نہیں آیا۔ تاکہ اس قول سے اتصال نہ ہو جائے کہ فَعَلَیْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ (تو ان پر اللہ کا غضب ہے) اور یہ شبہ نہ پڑ جائے کہ شاید یہی اس کی خبر ہے اور فَعَلَیْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ کو کلام کا آخری حصہ بنایا۔ حالانکہ معنی میں یہ خبر مقدم ہے اور پہلے

---

[1] سورۃ النحل آیت ۱۰۶۔

یعنی مَنْ کَفَرَ بِاللّٰہِ مِنْ بَعْدِ اِیْمَانِہٖ کی خبرِ مقدم ہے۔ اس کو اس لیے موخر کیا تاکہ اس کے ساتھ یہ الفاظ آجائیں۔ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا عَلَی الْاٰخِرَۃِ۔ (اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے آخرت پر دنیا کی زندگی کو پسند کیا) کیونکہ یہ اُن کا وصف ہے۔ اب ترکیبِ کلام اور سیاقِ مفہوم میں یہ بہتر انداز ہے۔ اسی طرح فرمایا:

وَقِیْلِہٖ یٰرَبِّ اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ قَوْم ۔ یہ معطوفِ مضمر میں سے ہے۔ مقدم و موخر سے ایک اس کا عاطف ہے۔ یعنی وعندہ علم الساعۃ۔

اس کی ضمیر اس کا قول ہے۔ یعنی وعلم قیلہ۔ معنی یہ ہُوا کہ عندہٗ علم الساعۃ وعلم قیلہ یاربِّ (یعنی اس کے پاس قیامت کا علم اور یارب کے قول کا علم ہے) یہ اس تحریر میں ہے کہ جب لام پر کسرہ آئے۔ اگر لام پر نصب ہو تو یہ مقدم بھی ہے اور اس کا یہ معنی ہو گا کہ اس کے پاس قیامت کا علم ہے۔ وہ اس کے یارب کہنے کو جانتا ہے۔ اور جس نے لام کو مرفوع پڑھا اس نے یوں وقیلہٗ پڑھا۔ اب یہ خبر بر استیناف ہوگا اور اس کا جواب فاء کے ساتھ یہ ہوگا کہ فَاصْفَحْ عَنْھُمْ۔ یعنی اس کا قول یہ تھا کہ اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا یُؤْمِنُوْنَ۔ ایسی قوم ہے کہ ایمان نہیں لائے گی۔ تو فرمایا:

فَاصْفَحْ عَنْھُمْ اور وَقِیْلِہٖ کے لفظ میں واوٗ جمع کی ہوتی ہے اور علم الساعۃ کی طرف منضم ہوتی ہے اور معنی یہ ہُوا کہ وعندہٗ علم الساعۃ وعندہٗ قیلہٖ یاربِّ (اس کے پاس قیامت کا علم ہے اور اس کے پاس یارب کا اس کا قول ہے) عند کے ساتھ دونوں کو جمع کر دیا۔ یہ مجاز ہے۔ عربی میں یہ قرأت ہیں۔

معنی پر محمولات

معنی پر محمولات کی مثالیں حسب ذیل ہیں۔
اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

(۱) فَالِقُ الْاِصْبَاحِ وَجَاعِلَ الَّیْلِ سَکَنًا۔

(۲) پھر فرمایا:

وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا۔ اب اگر معنی پر محمول نہ کیا جائے تو والشمس والقمر مکسور ہوں گے۔ لفظ "فالق" اور "جاعل" کی تبع میں یعنی (فالق الاصباح والشمس الخ) مگر اس کا معنی حقیقت میں یہ ہے کہ جعل الشمس والقمر حسبانا۔ اور یہ اس کی قرأت ہے جس نے وَجَعَلَ الَّیْلَ سَکَنًا پڑھا۔ جَعَلَ کی ظاہری اتباع بھی کیا اور اس معنی میں

اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے۔

(۳) وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَ اَرْجُلَکُمْ۔ (اور اپنے سروں پر مسح کرو اور اپنے پاؤں (دھوؤ) اگر لام منصوب کیا جائے تو یہ فاغسلوا وجوھکم و ارجلکم کے معنی پر محمول ہے اور جس نے ارجلِکم پڑھا یعنی لام پر زیر پڑھی۔ اس نے بروسِکم و ارجلِکم کے اعراب کا اتباع کیا۔ مگر یہ صرف اعراب کا اعراب کے اعتبار اتباع ہے ورنہ اس کا مذہب دھونا ہی ہے۔ مسح کا مذہب نہیں ہے۔ ہم نے قرآن میں لام منصوب کو غسل (دھونے) کے باعث اختیار کیا اور وجہ اور یدین کے اتباع کے باعث کیا۔ اس لیے کہ حضرت ابن عباس اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہم سے مروی ہے کہ قرآن دو غسل اور دو مسح کے ساتھ نازل ہوا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پاؤں دھونے کو سنت بتایا۔ اب جیسے آپؐ نے کیا ویسے ہم بھی کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

وَلَوْلَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّکَ لَکَانَ لِزَامًا وَّ اَجَلٌ مُّسَمًّی یہ مقدم و موخر سے ہے۔ چنانچہ اس کا معنی یوں بنے گا۔

وَلَوْلَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّکَ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّی لَکَانَ لِزَامًا وَبِہٖ اِرْتِفَاعُ الْاَجَلِ اب اگر یہ نہ ہو تو لزامًا کی طرح نصب ہو گی۔

اب لفظی حسن کی خاطر باعث اسے موخر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی اس مفہوم میں آتا ہے۔

۴۔ یَسْأَلُوْنَکَ کَاَنَّکَ حَفِیٌّ عَنْھَا۔ اس کا معنی یہ ہو گا کہ یسالونك كانك حفی بھا۔ یعنی تجھ سے پوچھتے ہیں جیسے کہ تو اس کے علم پر بخل کرتا ہو۔ اس طرح ایک جگہ فرمایا،

۵۔ اَوْ نُنْسِھَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْھَا اَوْ مِثْلِھَا۔ یعنی نَاْتِ مِنْھَا بِخَیْرٍ (یعنی ہم اس میں سے بہتر لائیں گے) چنانچہ بِخَیْرٍ کو مقدم اور مِنْھَا کو موخر کر دیا۔ اس لیے اشکال ہو گیا۔

وسطِ کلام کے بعد کے مؤخر

اور وسط کلام کے بعد موخر کی مثالیں حسب ذیل ہیں:
اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ۔ جس نے فعل کو واحد رکھا۔ یہ اس کی قرأت پر ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے متصل ہے کہ:

یَا اَیُّھَا الْاِنْسَانُ اِنَّکَ کَادِحٌ اِلٰی رَبِّکَ کَدْحًا۔ لَتَرْکَبُنَّ طَبَقًا عن طَبَقٍ۔ یعنی برزخ کے حال کے بعد یہ ایک حال ہے۔ چنانچہ دارِ (آخرت) میں قرار پذیر ہونے کے باعث ان احوال کو موخر کر دیا اور جنھوں نے اسے جمع کر کے پڑھا ان کی قرآن میں یہ توجیہ ہے۔ چنانچہ فرمایا:

لَتَرْكَبُنَّ اَيُّهَا النَّاسُ - اب یہاں پر انسان ناس کے مفہوم میں ہوگا۔ جیسے کہ ہم آغاز میں بتا چکے ہیں اور جمع کا معنی پر عطف ہُوا اور جنس کے باعث اسے واحد رکھا۔ گویا یہ فرمایا کہ:
یاایہا الناس لترکبن طبقا عن طبق - اب اس خبر کو موخر کر دیا۔ اس لیے کہ درمیان میں ایسی کلام آئی جو کہ قصہ سے متصل ہے اور اس کا معنی تقدیم ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ

۲- وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ اور اِلَّا قَلِيْلًا کا قول اس سے متصل ہے کہ

لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ (اِلَّا قَلِيْلًا)۔
اور کلام کا آخری حصہ یہ ہے کہ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ -
یہ بتایا جا چکا ہے کہ اِلَّا قَلِيْلًا دراصل وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ کے پہلے قول میں مستثنیٰ ہے۔ یعنی اس کے بعد اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ہے اور اس قول بعد ہے۔ میرے نزدیک پہلا بہتر ہے اور اس معنی میں حضرت ابن عباسؓ کی قرأت کی ایک روایت ہے کہ
لَا يُحِبُّ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ -
اس عبارت کو حسب ذیل کے ساتھ متصل کیا کہ
مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ - اِلَّا مَنْ ظُلِمَ - اور کلام کا آخری حصہ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ ، قول سے فاصل ہو گیا۔

(۳) اس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِى الْاَرْضِ - یہ دراصل اس قول کا صلہ ہے۔ فرمایا کہ
وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ - اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِى الْاَرْضِ -
اس طرح سورت کے آغاز میں فرمایا:
لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَمَغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ - كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ - (ان کے لیے ان کے رب کے ہاں درجات اور بخشش اور اعلیٰ رزق ہے، جیسے کہ تیرے رب نے تجھے حق کے ساتھ تیرے گھر سے نکالا) یہ کلام کے صلہ کے قبیل سے نہیں بلکہ یہ مقدم ہے اور اس قول کے باعث معنی میں متصل ہے۔ فرمایا:
قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ - كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ -

اب مالِ غنائم تیرے لیے ہے۔ اس لیے کہ تو اپنے اخراج پر راضی تھا اور وہ ناپسند کر رہے ہیں۔ اب دونوں کے درمیان تقویٰ و اصلاح کرنے کا اور ایمان و صلاح کی حقیقت کا وصف ذکر ہوا۔ اس لیے اس کا سمجھنا مشکل ہو گیا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

حَتّٰی تُؤْمِنُوْا بِاللّٰہِ وَحْدَہٗ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰاھِیْمَ لِاَبِیْہِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَکَ۔

یہ عبارت حسب ذیل آیت کے ساتھ موصول ہے۔ فرمایا:

قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْ اِبْرٰاھِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ۔ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰاھِیْمَ لِاَبِیْہِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَکَ۔ اس لیے کہ یہ آیت ان کے اس قول کے بارے میں نازل ہوئی کہ جب لوگوں نے کہا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے بخشش کی دعا کی۔ حالانکہ وہ مشرک تھا۔ جس وقت کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَکَ رَبِّیْ کہا تھا تو کہنے لگے۔ پھر ہم اپنے مشرک آباء کے لیے دعا کیوں نہ کریں؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ اس مسئلہ میں انہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طرزِ عمل کو مستثنیٰ سمجھنا چاہیے۔ پھر دوسری آیت میں ان کا عذر بیان ہوا۔ انھوں نے وعدہ کیا تھا۔ آخر انہیں اس کے کفر پر موت کا علم ہو گیا۔ (پھر اعراض کر لیا)۔ چنانچہ فرمایا:

وَمَا کَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰاھِیْمَ لِاَبِیْہِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَۃٍ وَّعَدَھَا اِیَّاہُ۔ الآیۃ

(حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ کے بخشش مانگنا ایک وعدہ تھا جو اس سے کر رکھا تھا)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَۃٍ غَیْرَ مُتَجَانِفٍ لِاِثْمٍ۔

یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ساتھ متصل ہے کہ

حُرِّمَتْ عَلَیْکُمُ الْمَیْتَۃُ وَالدَّمُ (تم پر حرام کیا گیا مردار اور خون الخ)

پھر فرمایا:

فَمَنِ اضْطُرَّ فِیْ مَخْمَصَۃٍ (جو مجبور و مضطر ہو جائے الخ)

ہم نے جو مثالیں ذکر کی ہیں۔ اس قسم کی امثلہ قرآن مجید میں کثرت سے آئی ہیں۔ ہم سے ان میں بطورِ نمونہ چند ایک کا ذکر کر دیا ہے۔ اور کثیر کی جانب اشارہ کر دیا ہے تاکہ مذکورہ امثلہ کے ذریعہ استدلال کی راہ نکل آئے۔

قرآن کی فصاحت و بلاغت کے مختلف انداز

یہ سب آیات، کلامِ عرب کی مختلف اقسام، مختلف معانی کے استعمالات اور وجوہ استحسان کی نشان دہی کرتی ہیں۔ اور بتاتی ہیں کہ عربوں کی کلام میں وضاحت کے لیے طویل اور حفظ کے لیے مختصر کلام پایا جاتا ہے۔ حسنِ کلام کے لیے مقدم و موخر کیا جاتا ہے اور یہ تمام فصاحت و بلاغت کے امور ہیں۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک بلاغت یہ ہے کہ منتشر اور کثیر کو مجمل قلیل بنا دیا جائے اور قلیل مجمل کو پھیلا کر واضح منتشر کر دیا جائے۔ چنانچہ ان کے نزدیک متفرق مطالب کی ضرورت کے ساتھ ساتھ چھوٹا کلام ایک عجز ہے اور جامع مفہوم کافی ہونے کے باوجود طویل کلامی لغو ہے۔ چنانچہ انہی کے کلام سے انہیں خطاب فرمایا تو انہی کی عقول و استعمالات کے ذریعہ انہیں سمجھایا تاکہ ان کے نزدیک یہ انداز خوب معلوم ہو اور سمجھ میں آنے کے باعث یہ کلام ان پر حجت بن جائے۔ اس لیے کہ ان کی معلومات کے مطابق انہیں حکم دیا گیا اور تمام احکام ایسے دیے کہ وہ اس کی حکمت و لطافت کی تحسین کرتے ہیں۔ اب چونکہ وہ لوگ فہم و شہود میں مختلف درجات کے مالک ہیں۔ اس لیے ان کے علوم و عقول کے اختلاف کے لحاظ سے ایسا کیا کہ بلند اور مخصوص مقامات اور مشاہدات کے مالک لوگوں کے لیے وہی مخصوص انداز رکھا۔ اُن کے لیے وہی علمی اسالیب ظاہر کر دیے۔

اس لیے کہ قرآن مجید میں عموم و خصوص، محکم و متشابہ اور ظاہر و باطن سب ملتے ہیں۔ چنانچہ عام لوگوں کے لیے عموم ہے اور خاص لوگوں کے لیے خصوص موجود ہے۔ اہلِ ظاہر کے لیے ظاہر پایا جاتا ہے اور اہل باطن کے لیے باطن بھی موجود ہے اور اللہ تعالیٰ وسعت والا اور جاننے والا ہے سو اللہ تعالیٰ نے ان کو جو ایمان لائے، ہدایت دی۔ جبکہ لوگوں نے حق میں اختلاف کیا اپنے اذن کے ساتھ۔

اب جب نورِ یقین کے باعث دل صاف ہُوا۔ توفیق و تمکین کی برکت سے عقل کو تائید ملی۔ مخلوق سے تعلق کٹ کر (غیر اللہ سے) انخلاء و تجرد حاصل ہُوا۔ خالق تعالیٰ کی طرف انابت کی برکت سے باطن میں اللہ تعالیٰ کا (تعلق) پختہ ہو گیا۔ خواہشات سے نفس خالی ہو گیا۔ رُوح چلی اور ملکوتِ اعلیٰ میں سیر کناں ہُوئی۔ نورِ یقین و ایمان سے ملکوتِ عرش تک دلِ رسا کو صفاتِ موصوف، احکامِ خلاقِ مالوف، باطن اسماءِ معروف اور رحیم و مہربان کے غرائبِ علم کا مکاشفہ حاصل ہُوا تو اس نے کشف کی برکت سے اوصاف کا مشاہدہ کیا اور اس وقت جو معرفت حاصل ہُوئی اس کی شہادت کے ساتھ کھڑا ہُوا۔ گویا وہ ان میں سے ہُوا کہ جن کے بارے میں فرمایا:

يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۔

(وہ اس کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں ۔ وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں)

چنانچہ تلاوت کا حق مومنین کے لیے ہی ہے ۔ اس لیے کہ جب اسے حقیقت ایمان عطا ہُوا تو اس کی طرح اس کا معنیٰ بھی دیا گیا ۔ اور پھر حقیقتِ مشاہدہ دیا گیا ۔ چنانچہ اس کی تلاوت مشاہدہ سے ہُوئی اور مزید اس کا مفہومِ تلاوت اور اس کی حقیقتِ ایمان کے معیار پر ہے ۔ جیسے کہ فرمایا :

وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا ۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ۔

اب بندہ حضور و انذار کے وصف سے متصف ہُوا اور مزید (انعام) و بشارت سے اس کی تخصیص ہُوئی جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ۔

(پھر جب وہاں پہنچ گئے ۔ بولے چپ رہو ، پھر جب ختم ہُوا الٹے پھر اپنی قوم کو ڈر سناتے ہُوئے)

نیز فرمایا :

فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا وَّهُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۔

(ان کا زیادہ کر دیا اس سورت نے ایمان اور وہ خوش وقت ہوتے ہیں)

اور ان لوگوں میں سے ہُوا کہ جن کی علم کے ساتھ مدح ہُوئی ۔ رجاء کے ساتھ اس کی تعریف ہوئی اور خوف کے ساتھ اس کا وصف بیان کیا گیا ۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

يَحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔

(آخر سے ڈرتا ہے اور اپنے رب کی رحمت کی اُمید رکھتا ہے ۔ کہہ دے ۔ کیا وُہ جو جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے کیا یہ برابر ہیں)

اور ایک جگہ اللہ عزوجل نے فرمایا :

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۔

(بلاتے ہیں اپنے رب کو خوف و لالچ سے)

اہل اللہ قرآن پڑھنے والے ہیں

اب یہ آدمی اہل اللہ کے محب و خواص میں سے ہوا اور اہل اللہ میں شمار ہوا جیسے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ :

"اہلِ قرآن اہل اللہ ہیں، یہ اس کی مخلوق میں اس کے خواص ہیں"۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا:

"کسی کے لیے قرآن کے سوا اس کی شخصیت کے بارے میں سوال کرنے کی اجازت نہیں"۔ اگر وُہ قرآن سے محبت رکھتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتا ہے اور اگر قرآن سے محبت نہیں رکھتا تو وُہ اللہ سے محبت نہیں رکھتا" اور واقعہ بھی اسی طرح ہے کہ جیسے انھوں نے فرمایا، اس لیے کہ جب تو ایک متکلم سے محبت رکھتا ہے تو اس کی کلام سے محبت کرے گا اور جب تو متکلم سے متنفر ہے تو اس کی کلام سے بھی متنفر ہو گا۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کی علامت

حضرت ابُو محمد سہلؒ فرماتے ہیں:

"اللہ عزوجل سے محبت رکھنا ایمان کی علامت ہے اور قرآن سے محبت رکھنا اللہ سے محبت کی علامت ہے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھنا قرآن سے محبت کی علامت ہے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کی علامت آپؐ کی تابعداری ہے اور آپؐ کی تابعداری کی علامت زہد اختیار کرنا ہے"۔

ایک سالک نے ہمیں بتایا کہ میں جدّہ تھا اور تلاوتِ قرآن کا عاشق تھا مگر ایسی جہالت آئی کہ چند دن تک میں نے تلاوت نہ کی تو اللہ عزوجل کی جانب سے غیبی آواز آئی کہ

"اگر تو مجھ سے محبت رکھتا ہے تو تُو نے میری کتاب کو کیوں ترک کر دیا؟ کیا تجھے خبر نہیں کہ اس میں میرا کس قدر لطیف عتاب ہے؟"

ایک عارف بتاتے ہیں کہ:

"مرید اس وقت تک مرید نہیں ہو سکتا جب تک کہ جو چاہتا ہے وُہ اسے قرآن مجید میں نہ پالے۔ اس سے اپنا نقصان و فائدہ دیکھے اور بندوں سے بے نیاز ہو کر اللہ کا ہی ہو کر رہ جائے"۔

قرآن کریم جن علوم پر حاوی ہے ظواہر معانی مجموعہ سے اقل یہ منقول ہے کہ اس میں چوبیس ہزار آٹھ سو علوم ہیں۔ اس لیے کہ ہر آیت کے چار علوم ہیں:

ظاہر، باطن، حد اور مطلع

ایک قول یہ بھی ہے کہ

ستتر ہزار اور دو سو علوم پر حاوی ہے۔ اس لیے کہ ہر کلمہ کا ایک علم ہے اور ہر علم کا ایک وصف ہے۔ چنانچہ ہر کلمہ ایک صفت کا متقاضی ہے اور ہر صفت کئی افعال حسنہ اور معانی کا موجب ہے۔ فَسُبْحَانَ الْفَتَّاحِ الْعَلِیْمِ ٭٭٭٭

فصل ۱۸

غافلین کے مذموم حالات

جب تلاوت کرنے والا سابقہ صفحات پر مذکورہ صفحات کے برعکس کام کرتا ہے یا اس کے بالکل ہی برعکس صورت میں ہوتا ہے یعنی غفلت، اندھاپن اور حیرت میں ہی رہتا ہے۔ اپنی خواہشات میں مستغرق، دشمنوں کی باتوں میں ظنیات میں انہماک رکھتا ہو۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ سے اس فرمان کا مفہوم صادق آتا ہو کہ:

وَ مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ [1]

(اور ان میں سے بعض ان پڑھ ہیں۔ کتاب کو نہیں جانتے سوائے چند خواہشات کے)

یعنی سوائے تلاوت قرآن کے اور کچھ نہیں۔

وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ۔

(اور وہ صرف ظن ہی رکھتے ہیں)

چنانچہ ظن کے ساتھ انہیں متصف بنایا جو کہ یقین کی ضد ہے جیسے کہ ظن کرنے والوں کے بارے میں خبر دی کہ

اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ [2]۔ (ہم صرف ظن ہی کرتے ہیں اور ہم یقین کرنے والے نہیں ہیں) اور اس مفہوم پر فرمایا:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ [3]۔

(اور بہتیری نشانی ہیں آسمان اور زمین میں، پر گزر ہوتا رہتا ہے اُن کا اور وہ ان پر دھیان نہیں کرتے)

قرآن سب سے بڑی دلیل ہے

زمینوں اور آسمانوں میں سب سے بڑی دلیل قرآن مجید ہے جو کہ ان کے پیدا کرنے والے اور قرآن مجید نازل کرنیوالے پر دلالت کرتی ہے۔

اور جو آدمی اللہ تعالیٰ کا کلامِ عزیز سنتے وقت اپنی باتوں میں منہمک رہتا ہے اور کلام اللہ کو

۱۔ سورۃ بقرہ آیت ۷۸۔ ۲۔ سورۃ جاثیہ آیت ۳۲ ۳۔ سورۃ یوسف آیت ۱۰۵۔

معمولی سمجھ کر دُوسروں کی مناجات میں لگا رہتا ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا:

نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَسْتَمِعُوْنَ بِہٖۤ اِذْ یَسْتَمِعُوْنَ اِلَیْکَ وَ اِذْ ھُمْ نَجْوٰۤی۔

(ہم خوب جانتے ہیں جس واسطے وُہ سنتے ہیں جس وقت کان رکھتے ہیں تیری طرف اور جب وُہ مشورہ کرتے ہیں)

اور جو آدمی سنتا ہے مگر اس کا دل کلام اللہ سے ہٹ کر غیر نافع اور نقصان دہ امور میں مصروف ہے۔ چنانچہ جب کلام ختم ہوتا ہے تو اس سے پوچھا جائے کہ بتاؤ تم نے خطاب میں سے کیا سمجھا تو معلوم ہو جائے گا کہ وُہ غفلت میں ڈوب کر یہاں سے غائب تھا۔ اس کا بدن مجلس میں موجود تھا مگر خود غائب تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمِنْھُمْ مَّنْ یَّسْتَمِعُ اِلَیْکَ حَتّٰۤی اِذَا خَرَجُوْا مِنْ عِنْدِکَ قَالُوْا لِلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا۔

(اور بعضے ان میں کہ کان رکھتے ہیں تیری طرف۔ یہاں تک کہ جب نکلیں تیرے پاس سے کہتے ہیں ان کو جن کو علم ملا ہے کیا کہا تھا اس شخص نے ابھی)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ طَبَعَ اللّٰہُ عَلٰی قُلُوْبِھِمْ۔

(وہی ہیں کہ جن کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مُہر لگا دی)

یعنی خطاب کھو کر بیٹھے اور اُن کے دلوں نے کچھ نہیں سنا اور نہ ہی اس کی پروا کی۔

فرمایا:

وَاتَّبَعُوْۤا اَھْوَآءَھُمْ۔

(اور انہوں نے اپنی خواہشات کی تابعداری کی) یعنی اپنے باطل اور غلط گمانوں کا اتباع کیا۔

اور منقول ہے کہ

"جب بندہ قرآن مجید تلاوت کرتا ہے اور پختہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف رحمت کی نظر فرماتا ہے اور جب وُہ قرآن پڑھتا ہے اور خلط ملط کرتا ہے تو اللہ عزوجل اسے آواز دیتا ہے:

"تیرا اور میرے کلام کا کیا تعلق؟ تو مجھ سے مُنہ موڑنے والا ہے۔ اگر تو میری جانب توبہ کرتے ہُوئے نہیں آتا تو میرے کلام سے ہٹ جا!"

اسرائیلیات میں مروی ہے کہ:

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت موسیٰ و داؤد علیہما السلام کی طرف وحی فرمائی کہ بنی اسرائیل کے نافرمانوں کو حکم کرو کہ مجھے یاد نہ کریں اس لیے کہ میں اپنی قسم کھالی کہ جو مجھے یاد کرے گا میں اسے یاد کروں گا اور ان (نافرمانوں) کو میں لعنت کے ساتھ یاد کروں گا۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرمائی کہ:

فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ وَرِثُوا الۡكِتٰبَ يَاۡخُذُوۡنَ عَرَضَ هٰذَا الۡاَدۡنٰى وَيَقُوۡلُوۡنَ سَيُغۡفَرُ لَنَا۔ الآیۃ

(پھر ان کے پیچھے آئے ناخلف جو وارث بنے کتاب کے، لیتے ہیں اسباب اس ادنیٰ زندگانی کا اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف ہو جائے گا)

یہ ان کا غلط گمان اور بے کار امیدیں ہیں۔ چنانچہ ان میں خوف و ڈر نہیں رہا اور خالق کی نافرمانی کر رہے ہیں اور اس کے باوجود جہالت کے باعث بخشش کی امیدیں رکھتے ہیں اور اس کے حکم سے اعراض کیے ہوئے ہیں۔ اللہ عزوجل نے فرمایا:

اَلَمۡ يُؤۡخَذۡ عَلَيۡهِمۡ مِّيۡثَاقُ الۡكِتٰبِ اَنۡ لَّا يَقُوۡلُوۡا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الۡحَـقَّ وَدَرَسُوۡا مَا فِيۡهِ۔

(کیا ان پر کتاب میں وعدہ نہیں لیا گیا کہ اللہ پر حق کے بغیر کوئی بات نہ کرو اور انھوں نے پڑھا ہے جو کچھ اس میں لکھا ہے۔)

پھر ان کے علم کے بارے میں بتایا کہ ان کا علم "قول و خبر کا علم" ہے، "یقین و معاینہ کا علم" نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَدَرَسُوۡا مَا فِيۡهِ۔

یعنی اس کو پڑھا اور سیکھا مگر اس پر عمل نہیں کیا اور نہ ہی اس سے کچھ فائدہ حاصل کیا۔ یہ بات ان کے لیے ایک توبیخ و انتباہ ہے جیسے کہ فرمایا:

قُلۡ بِئۡسَمَا يَاۡمُرُكُمۡ بِهٖۤ اِيۡمَانُكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِيۡنَ۔

(کہہ دو تمہارا ایمان جس کا حکم کرتا ہے وہ بہت بڑا ہے۔ اگر تم ایماندار ہو)

علم ہے اور عمل نہیں

اس میں ایک غریب توجیہ بھی ہے کہ وَدَرَسُوۡا مَا فِيۡهِ۔ یعنی انہوں نے اس پر عمل چھوڑ کر اس کا علم مٹا دیا اور بھلا دیا جیسے کہ کہا کرتے ہیں کہ دَرَسَتِ الرِّيۡحُ الۡاٰثَارَ۔ (آندھی نے نشانات مٹا دیے) اور خَطٌّ دَارِسٌ (مٹا ہوا نشان) اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں یہی مفہوم ثابت ہوتا ہے۔ فرمایا کہ:

نَبَذَ فَرِیْقٌ مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَرَآءَ ظُھُوْرِھِمْ کَاَنَّھُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ۔

(جن کو کتاب دی گئی ان میں سے ایک جماعت نے کتاب اللہ کو اپنی پشتوں کے پیچھے پھینک دیا۔ گویا وہ اسے جانتے ہی نہیں اور اس کی تابعداری کی کہ جس کو شیاطین پڑھتے ہیں) یعنی غلط باتوں کا اتباع کرتے ہیں اور خواہشات کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَنَبَذُوْہُ وَرَآءَ ظُھُوْرِھِمْ وَاشْتَرَوْا بِہٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا فَبِئْسَ مَا یَشْتَرُوْنَ۔

(پھر پھینک دیا وہ اقرار اپنی پیٹھ کے پیچھے اور خرید کیا اس کے بدلے مول تھوڑا۔ سو کیا بُری خرید کرتے ہیں)

چنانچہ ترک عمل کو ہر حال میں کتاب اللہ پھینک دینے کی طرح سمجھا اور اس کام کو اس کی نفی اور دنیا کے عوض اسے فروخت کر دینا قرار دیا۔ وعید و زجر کی ہر آیت میں ڈرنے والوں کے لیے ایک نصیحت اور تخویف ہے اور غافلین کے لیے وصف و تعریف ہے۔ اس کا علم اس کے علم سے ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے دوزخ کے ذکر میں فرمایا:

ذٰلِکَ یُخَوِّفُ اللّٰہُ بِہٖ عِبَادَہٗ یٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ۔

(اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ اپنے بندوں کو خوف دلاتا ہے۔ اے بندے سو ڈرتے رہو)

اور خبر کے طور پر یُوں فرمایا:

اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ۔ (کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے)

بعض سلفؒ سے مروی ہے کہ "جب بندہ کوئی سورت شروع کرتا ہے تو فارغ ہونے تک فرشتے اس پر رحمت کرتے ہیں اور ایک بندہ ایسا ہے کہ جب وُہ سورت شروع کرتا ہے تو فارغ ہونے تک اس پر لعنت کرتا ہے۔"

اُن سے پوچھا گیا کہ "یہ کیونکر ہوتا ہے"؟

فرمایا، "جب اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام سمجھے تو اس پر رحمت کرتا ہے ورنہ اس پر لعنت کرتا ہے۔"

بعض علمائ سے منقول ہے کہ بندہ گاہے قرآن پڑھتا ہے تو اپنے آپ پر لعنت کرتا ہے اور وُہ نہیں جانتا۔ چنانچہ وہ یہ پڑھتا ہے کہ

اَلَا لَعْنَۃُ اللّٰہِ عَلَی الظّٰلِمِیْنَ۔ (خبردار، ظالموں پر اللہ کی لعنت ہے) اور وُہ خود ظالم ہوتا

ہے۔ اسی طرح وہ پڑھتا ہے۔
اَلَا لَعْنَةُ اللّٰہِ عَلَی الْکَاذِبِیْنَ (خبردار جھوٹوں پر اللہ کی لعنت ہے) اور وہ خود ان میں سے ہوتا ہے۔

حضرت سفیانؒ نے اللہ تعالیٰ کے فرمان میں فرمایا:
سَاَصْرِفُ عَنْ آیَاتِیَ الَّذِیْنَ یَتَکَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ۔
(عنقریب میں انہیں اپنی آیات سے پھیر دوں گا جو کہ زمین میں ناحق تکبر کرتے ہیں)، یعنی انہیں فہمِ قرآن سے محروم کر دوں گا۔

حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ:
"جب میری اُمت پر دینا اور درہم کا درجہ بڑا ہو جائے گا تو ان سے اسلام کی ہیبت چھن جائیگی اور جب وُہ نیکی کا حکم کرنا اور بُرائی سے روکنا چھوڑ بیٹھیں گے تو وہ وحی کی برکت سے محروم کر دیے جائیں گے۔"

حضرت فضیلؒ فرماتے ہیں کہ وُہ فہم قرآن سے محروم کر دیے جائیں گے۔ اہل باطل اور غافلین کی مذمت کے سلسلہ میں بے شمار احادیث و روایات ملتی ہیں۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ فرمایا کہ:
"میری امت کے اکثر منافق قراء ہیں۔"
اور حضرت حسنؓ فرمایا کہتے کہ "تم نے قرأت قرآن کو مراحل (کجاوے) بنالیا اور رات کو تم نے اونٹ بنا لیا۔ اب تم اس پر سوار ہوتے ہو اور اس کے ذریعہ اس کے مراحل قطع کرتے ہو اور تم میں سے پہلے لوگ اپنے رب کی جانب سے آئے ہُوئے صحائف دیکھتے۔ رات کو ان میں غور فکر کرتے اور دن کو انہیں نافذ کرتے۔"

اس سے پہلے حضرت ابن مسعود فرمایا کرتے کہ، قرآن مجید نازل کیا گیا تاکہ اس کو سیکھیں۔ چنانچہ انہوں نے اس کو پڑھنا ہی عمل بنا لیا۔ اگر ان میں سے کوئی قرآن کی تلاوت آغاز سے اختتام تک کرے تو ایک حرف بھی نہ چھوٹتے مگر اس پر عمل کرنا چھوڑ دیا۔"

حضرت ابن عمر اور حضرت جندب رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ ہم اپنے زمانہ کے کچھ حصّہ زندہ رہے اور قرآن (سیکھنے) سے پہلے ہم سے ایک آدمی کو ایمان ملتا تھا چنانچہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر سورت نازل ہوتی تو ہم اس کے حلال وحرام اور اس کے امر و نہی سیکھتے اور جو جو بھی

معلوم کرنا ضروری ہوتا وہ حاصل کرتے جیسے کہ تم قرآن سیکھتے ہو پھر میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا کہ جیسے ایمان سے پہلے قرآن کا علم ملتا ہے اور وہ شروع سے آخر تک پڑھتا ہے مگر اس کا امر و نہی نہیں سمجھتا اور جو جو سمجھنا اس کے لیے ضروری ہے اسے بھی نہیں سمجھتا۔ آخر کار وہ ردی کھجوروں کو ادھر ادھر پھینکنے کا سا عمل کرتا ہے اور آج واقعات اسی طرح ہیں۔ اس لیے کہ قرآن سے اصل غرض و مقصود اس کے اوامر پر عمل کرنا اور ممانعات سے بچنا ہے۔ اس کی حدود کی حفاظت کرنا فرض ہے۔ بندے سے اس کی پرسش ہوگی اور اس پر سزا و جزا مرتب ہوگی۔ محض اس کے حروف فرض نہیں ہیں اور جب بندہ اپنی وسعت بھر اسے یاد نہ کر سکے تو اس پر سزا بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّا سَنُلْقِیْ عَلَیْکَ قَوْلًا ثَقِیْلًا۔ یعنی اس پر عمل کرنا ثقیل ہے ورنہ یاد کرنے کے لیے تو اسے آسان اور سہل کر دیا گیا ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے کہ

"قرآن پڑھو۔ جس قدر تمہارے دل اس سے مالوف ہوں اور تمہارے ابدان اس کے لیے نرم ہوں اور جب حالت بدلنے لگے تو تم پڑھنے والے نہیں ہو گے۔" اور بعض روایات میں یہ آتا ہے کہ:

"جب تمہاری حالت بدلنے لگے تو اس سے اٹھ جاؤ۔"

ایک شیخ بزرگ نے بتایا: ان کے سامنے میں نے قرآن کی تلاوت کی۔

انہوں نے فرمایا: میں نے اپنے ایک شیخ کے سامنے قرآن پڑھا۔ جب میں نے ختم کیا تو میں ان کی طرف آیا تاکہ پڑھوں۔ انہوں نے مجھے جھڑک دیا اور فرمایا: تو نے مجھ پر قرآن کو عمل بنایا۔ جاؤ اسے اللہ عزوجل کی خاطر (اس کے سامنے) پڑھو۔ پھر دیکھو کہ وہ اس میں سے تجھے کیا سناتا ہے اور اس سے کیا کچھ سمجھاتا ہے؟"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے بعض ایک حصہ یا دو حصوں کو اور چند سورتوں یا دو سورتوں کو یاد کرتے اور بعض اس میں سے ایک حزب یعنی ساتواں حصہ یاد کرتے اور یا سورۃ البقرۃ اور سورۃ انعام یاد کرتے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو بیس ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم ایسے تھے کہ جنہوں نے دیکھے بغیر قرآن نہیں پڑھا۔ چنانچہ چھ کے سوا سب نے قرآن حفظ نہ کیا ان میں دو کے بارے میں اختلاف ہے اور بعض کا قول یہ ہے کہ خلفاءِ اربعہ میں سے کسی نے بھی سارے کو جمع

نہیں کیا۔ حضرت ابن عباسؓ نے حضرت اُبیؓ بن کعبؓ پر اور عبدالرحمٰن بن عوف نے حضرت ابن عباسؓ پر پڑھا اور حضرت عثمانؓ بن عفان نے حضرت زیدؓ بن ثابت پر پڑھا اور اہل صفہؓ نے حضرت ابوہریرہؓ پر پڑھا (یعنی ان کے سامنے پڑھا) اور ان سب کی حالت یہ تھی کہ وہ اوامر کا اتباع کرنے والے اور نواہی سے رکنے والے تھے۔ اس کے عالم اور فقیہہ تھے۔

حضرت یوسف بن اسباط سے پوچھا گیا کہ جب آپ قرآن مجید ختم کرتے ہیں تو کیا دعا کرتے ہیں؟

انہوں نے فرمایا:

"میں کس چیز کی دعا کرتا ہوں؛ بھائی میں اللہ عزوجل سے اپنی تلاوت دگنی کرتا ہوں، سے ایک سو بار بخشش مانگتا ہوں۔"

وُہ فرمایا کرتے کہ میں قرآن مجید کی قرأت کا اہتمام کرتا ہوں۔ جب میں اس میں ایسا کلام دیکھوں کہ اس کی ناراضگی کا ڈر ہو تو تسبیح و استغفار شروع کر دیتا ہوں۔ یاد رکھو بندے کو قرآن کا جس قدر فہم و مشاہدہ حاصل ہے اس کے دل میں جس قدر اس کی عظمت ہے اور اس کے ساتھ جیسا اس کا معاملہ ہے اس کا قرآن کی تلاوت میں حصّہ ہے۔ اس لیے کہ تمام مخلوق شعائر اللہ میں سے سب سے بڑا درجہ اسے حاصل ہے اور ساری زمین میں اللہ تعالیٰ پر دلالت کرنے والا سب سے بڑا نشان یہی ہے۔ ہم پر اکمل ترین نعمت یہی ہے۔ جس قدر بندہ پرہیزگار ہو گا اس قدر اس کی تعظیم کرے گا جس قدر اسے متکلم کی معرفت، ہیبت اور اجلال حاصل ہو گا۔ اسی قدر وہ فہم خطاب اور تعظیم کلام سے سرفراز ہو گا۔ جب اس کے دل میں متکلم کی عظمت اور اس کے ذہن میں اس کی بڑائی آئی تو اس پر تدبّر کلام اور طویل فکر خطاب کا انعام ہو گا۔ اس کے قلب پر یہ کثرت سے آئے گا اور پختہ ہو جائے گا۔ کوئی دکھ ہو گا تو اس کی زبان پر فوراً یہی کلام جاری ہو گا چنانچہ وہ پرہیزگار اور متقی بن جائے گا۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے فرمایا:

وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔

(جو اس میں ہے اسے یاد کرو تاکہ تم بچ جاؤ)

ایک جگہ فرمایا:

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ آيَاتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ۔ وَلَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ۔

(اسی طرح اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے اپنی آیات بیان کرتا ہے تاکہ وہ پرہیزگار بن جائیں اور تاکہ وُہ نصیحت پکڑیں)

اس لیے کہ ہر کلام قائل پر موقوف ہوتا ہے۔ اس کی عظمت کے باعث اسے عظیم سمجھا جاتا ہے اور اس کی برتری کے باعث دل پر اثر ہوتا ہے اور اگر قائل کا درجہ کم ہو تو کلام بھی بے وقعت ہو جاتا ہے۔

اللہ عزوجل نے فرمایا:

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ۔

عظمت و شان میں (کوئی چیز اس کی مثل نہیں) اور احکام و بیان میں اس کے کلام جیسا کوئی کلام نہیں۔

تورات کی ایک عجیب مثال

میں نے تورات میں سورہ حنین میں پڑھا۔ لکھا تھا کہ "اے میرے بندے! کیا تجھے مجھ سے حیا نہیں آتی؟ تیرے پاس تیرے کسی بھائی کا خط آتا ہے اور تو راستہ میں ہوتا ہے تو فوراً راہ سے الگ ہو کر اور بیٹھ کر اس کو پڑھتا ہے اور ایک ایک حرف سمجھتا ہے اور کسی حصہ کو بے سمجھے نہیں چھوڑتا مگر میں نے تیری طرف یہ کتاب (خط) بھیجی۔ اب دیکھ میں نے اس میں کیسے کیسے فرمان جاری کیے۔ اس میں کس طرح بار بار (حکم دیا) تو نے اس کے طول و عرض پر دھیان دیا اور پھر اس سے منہ موڑ رہا ہے۔ کیا میں نے تیرے نزدیک تیرے ایک بھائی سے بھی زیادہ معمولی ہوں؟ اے میرے بندے! اگر تیرا کوئی بھائی تیرے پاس بیٹھے تو تو اس کی طرف پوری طرح توجہ کرتا ہے اور پوری توجہ اور دلجمعی کے ساتھ اس کی بات کی طرف دھیان ہے۔ اگر کوئی دوسرا درمیان میں بول اٹھے یا اس سے تجھے ہٹانا چاہے تو تو اس کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ٹھہر جا! اور ادھر میں تیرے سامنے ہوں۔ تجھ سے کلام کرتا ہوں اور تو دل سے مجھ سے اعراض کر رہا ہے تو نے مجھے اپنے ایک بھائی سے بھی کم درجہ کا سمجھ لیا؟ او کما قال۔

فہم کتاب کی برکت سے شب بیداروں پر قیام شب آسان ہو گیا۔ شدتِ حجاب اور فہم سے محرومی کے باعث رات کو سونے والوں پر شبِ بیداری اور قیامِ شب بوجھ بن گیا۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آسمانوں اور زمین میں بوجھل بن گیا) یعنی قیامت کا علم مخفی ہوا تو ان پر ثقیل ہو گیا۔ چنانچہ ہر پوشیدہ چیز کو ثقیل کہا جانے لگا۔ واللہ اعلم

فصل ۱۹

جہری اور سرّی تلاوتِ قرآن

ذکرِ خفی بہتر ہے

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے مروی ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ " علانیہ قرأت پر مخفی قرأت کو اس قدر افضلیت حاصل ہے جیسے کہ علانیہ صدقہ پر مخفی صدقہ کو فضیلت ہے۔"

دوسرے الفاظ یہ مروی ہیں ۔

جہر سے قرآن پڑھنے والا، علانیہ صدقہ کرنے والے کی طرح ہے اور پوشیدہ (آہستہ) (قرآن پڑھنے والا) پوشیدہ طور پر صدقہ دینے والے کی طرح ہے۔"

خبرِ عام میں ہے کہ " پوشیدہ طور پر عمل کرنا، علانیہ عمل سے ستّر گنا زیادہ افضل ہے۔"

اسی طرح عموم میں یہ مروی ہے کہ " بہترین روزی وہ ہے جو کفایت کرے اور بہترین ذکر، ذکرِ خفی ہے۔"

حدیث میں آتا ہے کہ " مغرب و عشاء کے درمیان تم میں کوئی دوسرے پر بلند آواز سے قرأت نہ کرے۔"

حضرت سعید بن مسیّب رضی اللہ عنہ نے ایک رات کو مسجد النبی صلی اللہ علیہ وسلّم میں دیکھا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نماز کی حالت میں جہر کے ساتھ قرآن کی تلاوت کر رہے ہیں ۔ ان کی آواز بہت اچھی تھی ۔ انھوں نے اپنے لڑکے بردہ سے کہا کہ اس نمازی کے پاس جاؤ اور اسے آواز پست کرنے کا حکم دو ۔ لڑکے نے کہا ۔ مسجد ہماری نہیں اور جو آدمی مسجد میں ہے ۔ اس کا بھی حصہ ہے ۔

حضرت سعیدؒ نے آواز بلند کر کے فرمایا :

" اے نماز پڑھنے والے اگر نماز سے تیرا مقصود اللہ تعالیٰ ہے تو آواز پست کرے اور اگر تیرا مقصود لوگ ہیں تو وہ تجھے کچھ بھی اللہ تعالیٰ سے کام نہیں آسکتے ۔ راوی بتاتے ہیں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز خاموش رہے ۔ رکعت چھوٹی کر دی ۔ جب سلام پھیرا تو جوتے اٹھائے اور چل دیے ۔ اس وقت وہ مدینہ کے حاکم تھے ۔

اس کے برعکس لگا ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اپنے صحابہ میں سے بعض کو رات کی

نماز میں جہری قرأت سے قرآن مجید پڑھتے سنتے تو اسے ہی درست سمجھتے اور اُن کی قرأت سنتے۔ ایک بار آپؐ نے جہر سے پڑھنے کا بھی حکم دیا۔ فرمایا کہ

"جب تم میں سے کو نماز پڑھنے کھڑا ہو تو چاہیے کہ قرأت جہر سے پڑھے۔ اس لیے کہ فرشتے اور گھر کے رہنے والے اس کی قرأت سنتے ہیں اور اس کی دعا کے ساتھ دعا کرتے ہیں۔"

قرأت کے مختلف انداز ہیں

ایک بار جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت اپنے تین صحابہؓ کے پاس سے گزرے جن کے احوال مختلف تھے۔

بعض خفا کے ساتھ قرأت کرتے۔ یعنی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اُن سے سبب پوچھا تو کہا کہ جس سے میں مناجات کر رہا ہوں، وُہ میری قرأت سُن رہا ہے۔ بعض جہر کے ساتھ قرأت کرتے۔ یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ ان سے اس کا سبب پُوچھا تو کہا کہ میں سوتے کو جگاتا ہوں اور شیطان کو دھمکاتا ہوں۔ بعض ایسے تھے کہ کبھی ایک سورت کی آیت پڑھتے اور کبھی دوسری سورت کی آیت پڑھتے۔ ان سے اس کا سبب پوچھا تو کہا کہ میں طیّب کو طیّب میں ملاتا ہوں۔

آپؐ نے فرمایا: "تم سب بہتر اور صائب ہو!"

ہم کہتے ہیں۔ واللہ اعلم کہ جب جہر میں بندے کی نیت خراب ہونے کا ڈر ہو یا جہر سے اس کے ارادے اور رب کے ساتھ معاملہ ٹھیک نہ رہتا ہو تو اس صورت میں قرأتِ خفی بہتر ہے۔ اس لیے کہ یہ سلامتی کے قریب اور خطرہ سے دُور ہے۔ اور اگر اس کا جہر میں اپنے رب سے معاملہ درست رہے اور نیت بھی ٹھیک رہے تو جہر افضل ہے۔ اس لیے کہ قرأتِ شب میں سنّت پر قایم ہُوا۔ دوسرے مخفی قرأت کرنے والا فرد اپنے آپ کو نفع دے رہا ہے اور جہری قرأت والا اپنے آپ کو اور دوسروں کو بھی نفع دے رہا ہے۔ اور بہترین آدمی وہ ہے کہ جو لوگوں کو نفع دے اور اللہ عزّ وجل کے کلام کے ذریعہ نفع سب سے افضل نفع ہے۔ مزید برآں اس نے دوسرا عمل بھی داخل کر دیا۔ اس سے وُہ دوسرے قرب کا امیدوار ہے۔ اس طرح یہ افضل کام ہُوا۔

تلاوتِ قرآن کا طریقہ

بندے کو چاہیے کہ تلاوت شروع کرتے وقت یہ پڑھے:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ السَّمِیْعِ الْعَلِیْمِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ۔

پھر یہ پڑھے: رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّیَاطِیْنِ وَ اَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ یَّحْضُرُوْنَ۔

اس کے بعد قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ الخ پڑھے اور اس سے پہلے سورۂ فاتحہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الخ پڑھ لے۔ اختتام پر یہ الفاظ کہے: صَدَقَ اللّٰہُ وَبَلَّغَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (اللہ نے سچ فرمایا اور رسول اللہ نے تبلیغ کر دی) اور پھر یہ دعا کرے:

اَللّٰھُمَّ انْفَعْنَا بِہٖ وَ بَارِكْ لَنَا فِیْہِ۔ (اے اللہ! ہمیں اس سے نفع عطا کر اور اس میں برکت فرما)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (سب حمد اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے)

اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْحَیَّ الْقَیُّوْمَ۔ (میں اللہ سے بخشش مانگتا ہوں جو کہ زندہ و قائم رکھنے والا ہے)

اور جو آدمی اپنے اعضاء اور دل کو ممنوعات سے بچائے رکھے اس نے آخر تک قرآن پاک پر عمل کیا اس لیے کہ

جہری قرأت

جہری قرأت میں سات فوائد ہیں:

۱۔ ترتیل سے پڑھنا۔ اس کا حکم دیا گیا ہے۔

۲۔ حسنِ آواز کے ساتھ قرآن پڑھنا جو کہ مستحب ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اپنی آوازوں کے ساتھ قرآن کو زینت دو۔"

نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جو تغنّی سے قرآن نہ پڑھے وہ ہم سے نہیں۔ یعنی حسنِ آواز کے ساتھ پڑھے۔ اہل عربیت کے ہاں یہ زیادہ پسندیدہ ہے۔ اور یہ ایک وجہ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ من لم یستغن بہ سے ہو۔ یعنی غنیۃ و اکتفاء سے ہے۔

۳۔ اپنے کانوں کو سنائے اور دل کو جگائے تاکہ کلام اللہ میں تدبر کرے اور معانی سمجھے اور یہ تمام کام صرف جہری صورت میں ہوتے ہیں۔

۴۔ آواز بلند کر کے نیند دور کرے اور شیطان کو ہٹائے۔

۵۔ اس نیت سے جہری طور پر پڑھے تاکہ ایک بدعمل اور غافل دیکھے تو اسے بھی قیامِ شب کا شوق پیدا ہو۔ اس طرح یہ تقویٰ و نیکی میں اس کا معاون ہو گا۔

۶۔ جہری تلاوت میں زیادہ مقدار میں پڑھ سکے اور اس عادت کے باعث قیامِ شب پر دوام کر سکے۔ اس طرح اس کا عمل بڑھ جائے۔ جب بندے کا عقیدہ درست ہو اور ان صورتوں میں اللہ کا تقرب و رضا ہی کا طلب گار ہو، اپنے آپ سے آگاہ ہو اور نیت درست رکھے تمام اعمال میں اللہ تعالیٰ ہی کی رضا کا طالب ہو تو اب اس کا جہر سے پڑھنا افضل ہے۔ اس لیے کہ اس صورت میں کئی اعمال بن جاتے ہیں اور ایک عمل نیتوں کی کثرت کے باعث افضل بن جاتا ہے۔ علماء کو

بلند مرتبہ حاصل ہُوا۔ ان کے اعمال نیت و اعتقاد کی خوبیوں سے آگاہی کے باعث افضل بن گئے۔
علماء کرام کا ہے ایک ہی عمل میں دس دس نیتیں کر لیتے ہیں۔ چنانچہ انھیں دس دس اجر مل جاتے ہیں اور
افضل تریں عمل وُہ ہے کہ جس میں نیتیں کثرت سے ہوں اور غرض و ادب احسن تریں ہو۔
بعض تفاسیر میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ کی تفسیر میں بتایا کہ
قرآن پڑھا کرے۔

قرآن پڑھنے و سننے والا

حدیث میں آتا ہے کہ "جس نے اللہ عزوجل کی کتاب کی ایک آیت سُنی تو قیامت کے دن اس کے لیے ایک نور ہوگا"۔ ایک
حدیث میں آتا ہے کہ "اس کے لیے دس نیکیاں لکھی گئیں"۔ اور ثواب میں پڑھنے والا سننے والے کا
شریک ہے اس لیے کہ اس نے اسے ثواب کمانے کا موقع دیا۔
بزرگوں کا فرمان ہے کہ "پڑھنے والے کو ایک اجر اور سننے والے کو دو اجر ملیں گے۔ ایک اور
بزرگ فرماتے ہیں کہ "سننے والے کے لیے نو اجر ہیں"۔
اور یہ دونوں کلام درست ہیں۔ اس لیے کہ دونوں کو خاموشی اور نیت کے مطابق اجر ملتا ہے
جب تلاوت کرنے والا دوسرے کو یہ اجور کمانے کا موقع دینے والا ہے تو اسے بھی سننے والے کے
ہر اجر کے ساتھ ایک ایک اجر ملے گا۔ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ
"نیکی پر رہنمائی کرنے والا اس کے کرنے والے کی طرح ہے"۔ خصوصاً جب کہ وُہ قرآن کا عالم
اور فقیہ ہو۔ اب اس کی تلاوت و وقوف سامع کے لیے علم اور حجت بن جائے گی۔

حضورؐ کا سماعِ قرآن

حدیث میں آتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں دیر ہوگئی۔ آپؐ نے دریافت
فرمایا: "تجھے کس چیز نے روکے رکھا؟"
عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! میں ایک آدمی کی قرأت سن رہی تھی۔ اس سے احسن آواز سے
قرأت میں نے کبھی نہیں سنی"۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اٹھے اور اس کی قرأت سنتے رہے۔
پھر واپس آکر فرمایا: "یہ ابوحذیفہؓ کے آزاد کردہ غلام سالمؓ ہیں۔ سب حمد اللہ تعالیٰ کی ہے کہ جس نے
میری امت میں ایسے (قراء) پیدا فرمائے۔
ایک بار آپؐ نے حضرت عبداللہ بن مسعود کی قرأت سنی۔ آپؐ کے ہمراہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر
رضی اللہ عنہما بھی تھے۔ یہ سب دیر تک ٹھہرے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ

"جو یہ چاہے کہ قرآن کو اس طرح تر و تازہ پڑھے جیسے نازل ہُوا تو وُہ ابن ام عبدؓ کی قرأت کے مطابق پڑھے"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن مسعودؓ کو فرمایا:

"پڑھو"

انہوں نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! میں آپؐ کے سامنے پڑھوں۔ حالاں کہ آپؐ پر نازل کیا گیا۔"

آپؐ نے فرمایا:

"میں دوسرے سے سننا چاہتا ہُوں"

چنانچہ وہ پڑھنے لگے۔ جب وہ اس آیت پر پہنچے کہ

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا [1] (پس کیونکر ہوگا جس وقت ہم لائیں گے ہر امت سے ایک گواہی دینے والا اور لائیں ہم تجھ کو ان پر گواہ)

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو جاری ہو گئے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو موسیٰؓ کی قرأت سنی تو فرمایا:

"کہ اس کو آلِ داؤدؑ کے مزامیر میں سے ایک مزمار دیا گیا"

جب حضرت ابوموسیٰ کو یہ اطلاع ملی تو انھوں نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپؐ سُن رہے ہیں تو میں آپؐ کے لیے خوب آراستہ کر کے پڑھتا۔"

حضرت ابن مسعودؓ، حضرت علقمہؒ بن قیس کو فرمایا کرتے کہ "میرے سامنے پڑھو" اور ساتھ ہی کہتے، "میرے ماں باپ تجھ پر قربان، ترتیل سے پڑھو" اور وُہ بہت ہی اچھی آواز سے قرآن پڑھتے۔

صحابہؓ کی مجالسِ تلاوت

حدیث میں آتا ہے، کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ جب جمع ہوتے تو اپنے میں سے ایک کو حکم دیتے کہ وُہ قرآن کی کوئی سُورت پڑھے۔ حضرت عمرؓ، حضرت ابن مسعودؓ کو فرمایا کرتے: "ہمیں ہمارے رب کی یاد کراؤ!" چنانچہ وہ قرآن کی تلاوت شروع کرتے۔ حتیٰ کہ نماز کا وقت آجاتا تو عرض کیا جاتا: اے امیرالمومنین! نماز، نماز (کا وقت ہو گیا) تو وُہ فرمایا کرتے، کیا ہم نماز میں نہیں؟ گویا اللہ عزوجل کے اس

---

[1] سورۃ نساء۔ آیت ۴۱۔

فرمان کو سامنے رکھ کر یہ فرماتے، کہ

وَلَذِكْرُ اللهِ اَكْبَرُ۔ (اور اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے)

تلاوت میں ریا سے بچو

بعض عبادِ بصری کا فرمان ہے کہ "جب ایک بغدادی عالم نے ریاکاری اور دقیق آفاتِ نفس کے بارے میں کتاب لکھی تو اس وقت میں رات کو گھومتا تو تہجد گزاروں کی آواز سنتا۔ گویا پرنالوں کی آوازیں ہوتیں اور نماز و تلاوت کا شوق پیدا ہوتا۔ اور جب ریاکار اور مخفی آفات والے لوگ آئے، اور (یہ کتاب بھی سامنے آئی) تو تہجد گزار خاموش ہوگئے اور اس میں کمی آتی رہی۔ آخر ختم ہوگئی۔ اور آج یہ بات منقطع اور متروک ہو چکی۔ اگر تلاوت کرنے والے میں مذکورہ امور میں سے کچھ نہ ہو اور وہ ان باتوں سے بے خبر ہو مگر کچھ آفات سے آگاہ ہو یا اس کے دل میں کسی شخص کا پرتو آ جائے یا خواہش آ جائے تو اب اسے پھر ترک کر دینا چاہیے۔ اور اگر اس نے اب بھی دل پر بوجھ بن کر پھر کیا تو اس کا عمل خراب ہو جائے گا۔ اس لیے کہ دل میں مرض آن بیٹھا، اب نقصان کا ڈر ہے۔ اخلاص سے بعد ہو چکا۔ اس صورت میں اخلاص پر رہے۔ یہی اس کی دوا ہے۔ اسی سے اس کے حال کا علاج ہوگا اور اس کے دل کے لیے یہی بہتر بات ہے۔ اس کا عمل محفوظ رہے گا اور انجام خیر و خوبی ہوگا۔

گاہے بندے کو نماز و تلاوت میں خواہش کی حلاوت ملتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ یہ اخلاص کی حلاوت ہے۔ یہ بات باریک اور مخفی خواہش اور لطیف نفس ہے۔ گاہے یہ خرابی، ضعفاء پر مخفی رہتی ہے اور صرف علماء ہی اسے سمجھ سکتے ہیں۔ حقیقت میں اخلاص کی حلاوت دنیا میں زاہد لوگ ہی پاتے ہیں اور جب لوگ زہد کے باعث ان کی تعریف کرتے ہیں تو وہ ڈرتے ہیں اور صحیح خدمت کرنے والے اور اللہ سے محبت کرنے والے ہوتے ہیں، اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں۔

اور دو میں سے ایک چیز سے اس کے فقدان کا اعتبار ہوتا ہے:

۱۔ مدح و مذمت نفس کے لیے برابر رہے۔ مقامِ زہد میں یہ حال ہوتا ہے۔

۲۔ شہادتِ یقین کے باعث دل سے ان کا خلاء ہو جائے اور یہ بات مقامِ معرفت میں حاصل ہوتی ہے۔ ان دونوں مقامات میں خفی اور علانیہ اعمال برابر ہوتے ہیں اور گاہے متقی و عادل بزرگوں کے لیے علانیہ اعمال زیادہ افضل ہوتے ہیں۔

اہلِ خیر میں سے ایک بزرگ کا واقعہ ہے۔ انہوں نے بتایا کہ میں اپنے بالاخانہ میں بیٹھا سورۂ طٰہٰ پڑھ رہا تھا۔ جب میں نے اسے ختم کر دیا تو مجھے ہلکی سی نیند آ گئی۔ پھر دیکھا کہ ایک آدمی آسمان سے

اترا۔ اس کے ہاتھ میں سفید صحیفہ تھا۔ اس نے میرے سامنے اسے کھولا تو اس میں سورۃ طٰہٰ تھی اور ہر کلمہ کے نیچے دس دس نیکیاں لکھی ہوئی تھیں اور ایک کلمہ خالی تھا۔ میں نے دیکھا کہ اسے مٹا دیا گیا اور اس کے نیچے کچھ لکھا ہوا نہیں تھا۔ مجھے اس کا بڑا غم ہوا۔ میں نے کہا: اللہ کی قسم! میں نے اس کو بھی پڑھا ہے مگر اس کا ثواب نہیں دیکھ رہا اور اسے بھی لکھا نہیں دیکھ رہا۔ اس آدمی نے کہا: تو نے سچ کہا۔ بیشک تو نے پڑھا اور ہم نے لکھا مگر میں نے ایک آواز دینے والے کو سنا کہ اس کو مٹا دو۔ اور اس کا ثواب ختم کر دو۔ ہم نے اسے مٹا دیا۔ اس پر میں خواب میں رونے لگا۔ میں نے پوچھا: تم نے یہ کام کیوں کیا؟

انہوں نے کہا: ایک آدمی گذر رہا تھا تو تُو نے اس کی خاطر اپنی آواز بلند کر لی چنانچہ ہم نے اس وجہ سے اسے مٹا دیا۔

مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو سنا کہ وہ قرأت میں بلند آواز سے پڑھ رہا ہے۔ آپ نے اسے آواز دی اور فرمایا:

"اے فلاں! اللہ کو سناؤ اور مجھے نہ سناؤ۔"

ریاء کار کا عمل قبول نہیں ہوتا

یاد رہے کہ سنا سنا کر پڑھنا ریاکاری کے قریب تر ہے اور اس میں عمل فاسد ہونے اور کام کرنے والے کے نقصان کا فیصلہ دیا جاتا ہے۔ یہ سمع سے ماخوذ ہے۔ گویا آدمی اپنا عمل، غیر اللہ کو سناتا ہے اور چاہتا ہے کہ مخلوق اس کے عمل کو سن کر اس کی تعریف کرے۔ اس لیے کہ اس پر خواہش غالب آ چکی اور اس کا نفس کمزور ہو چکا۔ اس طرح اس نے اپنے عمل میں غیر اللہ کو شریک بنا لیا۔ چنانچہ توحید سے جہالت کے باعث اس کا عمل باطل ہو گیا۔ اگر اس کو یقین ہوتا کہ اللہ کے بغیر کوئی نفع و نقصان نہیں دے سکتا۔ اللہ کے بغیر کوئی عطا کرنے والا اور روکنے والا نہیں تو اس کی توحید شرک سے پاک اور خالص ہو جاتی۔ پھر اس کا عمل بھی ریاء سے خالی اور خالص ہو جاتا۔ اس طرح ریاء کا لفظ رای العین سے ماخوذ ہے اور سمعۃ بھی اسی کے مفہوم میں ہوتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ:

"سنانے والے اور دکھانے والے کا عمل اللہ تعالیٰ قبول نہیں فرماتا۔"

ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ:

"جس نے سنایا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے سنا دیا اور جس نے دکھایا، اللہ تعالیٰ نے اسے دکھا دیا اور اسے کم اور حقیر قرار دیا۔" اور جس کی نیت درست ہو اور یہ خیال ہو کہ وہ اپنے بھائی کو اللہ تعالیٰ کا کلام سنائے تاکہ اسے نصیحت ہو یا اس سے نفع حاصل کرے۔ اور وہ بھی تلاوت کیا کرے تو اب یہ ریا میں داخل نہ ہوگا کیوں کہ حُسنِ نیت اور صحتِ مقصود پا یا گیا اور دنیاوی غرض یا تعریف کی نیت جیسی کوئی آفت نہیں پائی گئی جیسے کہ حضرت ابوموسیٰؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا:

"اگر میں جانتا کہ آپؐ سن رہے ہیں تو میں آپ کے لیے خوب آراستہ کر کے پڑھتا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر انکار نہیں فرمایا کیوں کہ ان کی نیت درست تھی اور غرض صحیح تھی اور آپؐ نے بلند آواز سے پڑھنے والے دُوسرے آدمی کو فرمایا: کہ" اللہ عزوجل کو سناؤ اور مجھے نہ سناؤ۔" آپؐ نے جب سناوا اور ریاء دیکھی تو اس پر انکار فرمایا۔

مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک آدمی کے پاس سے گزرے۔ وُہ آہیں بھر رہا تھا، اور خوف کی صورت ظاہر کر رہا تھا۔ آپؐ کے ایک ہمراہی نے عرض کیا:

" اے اللہ کے رسول! کیا آپؐ اس کو ریاکار سمجھتے ہیں؟"

آپؐ نے فرمایا:" نہیں، بلکہ آہیں بھرنے والا اور متوجہ (الی اللہ) آدمی ہے۔

(اواہ منیب)

یاد رہے کہ مخلوق کی خاطر معمولی سے تصنع و زینت کے مقابلہ میں عافیت و سلامتی پر سونا اور کھانا زیادہ افضل ہے۔ مقام میں زیادہ رفعت اور انجام میں زیادہ محمود بات ہے اور یہ معرفت حاصل کرنا اور اس پر قایم رہنا ایسا مقام ہے کہ اللہ عزوجل کے علماءُ اسے سمجھتے اور جانتے ہیں۔

تلاوت میں حلاوت ہے

حضرت حسن بصریؒ سے مروی ہے۔ فرمایا:

تین کاموں میں حلاوت مفقود بھی ہو جاتی ہے۔ اگر تو حلاوت پالے تو خوش ہو اور کام کیے جا۔ اور اگر نہ پائے تو سمجھ لے کہ تیرا دروازہ بند ہے۔

۱۔ تلاوتِ قرآن کے موقع پر۔

۲۔ ذکر اللہ کے موقع پر اور

۳۔ سجدہ کی حالت میں۔

اور بعض بزرگوں نے اس میں اضافہ کیا۔ فرمایا:

۴۔ صدقہ کرتے وقت۔

۵۔ سحری کے وقت میں۔

اور مصحف میں دیکھ کر قرآن کی تلاوت کرنا زبانی تلاوت کرنے سے زیادہ افضل ہے۔ کہا کرتے ہیں کہ ساتویں حصے کا ختم کرنا ایک ختم ہے۔ اس لیے کہ مصحف میں دیکھنا بھی ایک عبادت ہے۔

قرآن میں دیکھ کر پڑھنا افضل ہے

صحابہؓ و تابعینؒ کی کثیر تعداد مصحف میں دیکھ کر پڑھتے تھے اور اس بات کو پسند کرتے کہ جب تک مصحف میں نہ دیکھ لیں تب تک اس دن باہر نہ آتے۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دیکھ کر اس کثرت سے پڑھا کہ دو قرآن مجید پھٹ گئے۔

فصل ۲۰

افضل ترین راتیں پندرہ ہیں

سال بھر میں پندرہ راتیں ایسی ہیں کہ جن میں بیدار رہ کر عبادت کرنا مستحب ہے۔ رمضان المبارک میں پانچ راتیں، یعنی آخری دس راتوں میں سے وتر راتیں (۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷ اور ۲۹ رات) اور رمضان المبارک کی ۱۷ (سترھویں) رات۔ اس رات کے بعد ۱۷ رمضان المبارک کے دن میں جنگِ بدر کا واقعہ پیش آیا اور دو لشکروں کی جنگ ہوئی اور حق و باطل جدا جدا ہوگیا۔ حضرت ابن زبیرؓ کا خیال ہے کہ لیلۃ القدر یہی ۱۷ رمضان المبارک کی رات ہے اور دوسری نو ۹ راتیں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ محرم کی پہلی رات۔

۲۔ عاشوراء کی رات۔

۳۔ رجب کی پہلی رات۔

۴۔ رجب کی پندرھویں رات۔

۵۔ رجب کی ستائیسویں رات۔ اور اسی رات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کرایا گیا۔

۶۔ عرفہ کی رات۔

۷۔ عید الفطر کی رات۔

۸۔ عید الاضحیٰ کی رات۔ اور

۹۔ شعبان کی پندرھویں رات۔

سلف صالحین کا طریقہ تھا کہ وہ اس رات کو ایک سو رکعت پڑھتے اور اس میں ایک ہزار بار قل ھو اللہ احد اس طرح پڑھتے کہ ایک رکعت میں دس بار قل ھو اللہ احد پڑھتے اور اس نماز کو صلوٰۃ الخیر کا نام دیتے ہیں۔ وہ اس کی برکت سے آگاہ تھے اور جمع ہو کر گاہے باجماعت بھی پڑھ لیا کرتے تھے۔

حضرت حسنؓ سے مروی ہے۔ فرمایا کہ:

مجھے تیس اصحابِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ:

"جو اس رات (شب برات) میں یہ نماز (صلوٰۃ الخیر) پڑھے۔ اللہ تعالیٰ اس کی طرف

ستر بار نظر فرماتا ہے اور ہر نظر میں اس کی ستر حاجات پوری فرماتا ہے اور سب سے کم درجہ کی حاجت بخشش ہے۔

ایک قول کے مطابق یہی وہ رات ہے۔ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کہ

فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيمٍ ۔ (اسی میں جدا ہوتا ہے ہر کام جانچا ہوا)

اور اس رات میں سال بھر کا کام لکھا جاتا ہے اور آئندہ سال تک کے تمام احکام صادر ہوتے ہیں۔ واللہ اعلم

میرے خیال میں صحیح یہ ہے کہ یہ باتیں لیلۃ القدر میں ہوتی ہیں۔ اس لیے اس کا نام یہ پڑ گیا۔ قرآن مجید اسی کا شاہد ہے۔ اس لیے کہ پہلی آیت میں یہ الفاظ آتے ہیں:

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ۔ (بے شک ہم نے اسے مبارک رات میں نازل کیا)

پھر فرمایا کہ:

فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيمٍ ۔ (اس میں جدا ہوتا ہے ہر کام جانچا ہوا)

اب قرآن تو لیلۃ القدر میں نازل ہوا۔ اب اس وصف کے ساتھ اس رات کے بارے میں یہ آیت اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ہوئی کہ،

اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ ۔ (بے شک ہم نے اسے شبِ قدر میں نازل کیا)

افضل تریں دن انیس ہیں

انیس دن افضل تریں ہیں۔ ان میں خوب خوب عبادت و اوراد کرنے چاہئیں۔ یہ ایام حسب ذیل ہیں: عاشورا کا دن، عرفہ کا دن، ۲۷ رجب کا دن، ۱۷ رمضان المبارک کا دن، ۱۵ شعبان کا دن، جمعہ کا دن، عیدالفطر کا دن، عیدالاضحیٰ کا دن، ایامِ معلومات یعنی ذی الحجہ کے دس دن، (یہ سب اٹھارہ ہوئے) اور ایامِ معدودات یعنی ایامِ تشریق (عید کے بعد کے قربانی کے دن)۔

حدیث میں آتا ہے:

"عرفہ کے دن روزہ رکھنا دو سالوں کا کفارہ بنتا ہے۔ ایک گذشتہ سال کا اور ایک آئندہ سال کا۔ اور عاشورا کے دن کا روزہ رکھنا ایک سال کا کفارہ ہے۔"

حضرت انس بن مالکؓ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ:

"جب جمعہ کا دن (گناہوں سے) سلامت رہا تو تمام (باقی ہفتہ کے ایام کے) سلامت ہے

اور اگر رمضان کا مہینہ (نافرمانیوں سے) سلامت رہا تو سارا سال ہی سلامت رہا۔"

ہمارے بعض علمائے سے مروی ہے کہ "جس نے دنیا میں ان ایام کے اندر (دنیاوی) خوشیاں منائیں وہ آخرت میں خوشی حاصل نہ کرے گا۔"

اور فرمایا: کہ جن ایام میں اللہ تعالیٰ کے فضل و مزید (انعامات) کی امید کی جاتی ہے۔ اگر ایام میں بھی تو دنیاوی باتوں اور نفسانی خواہشات میں منہمک رہا تو فضل و مزید کی امید کیونکر رکھے گا؟ یعنی پانچ ایام اور وہ یہ ہیں، دونوں عیدوں کے دن، جمعہ کا دن، عرفہ کا دن اور عاشوراء کا دن۔ (یعنی ان میں خوب خوب عبادت کرو۔)

ان ایام کے بعد حسب ذیل ایام کی فضیلت ہے:

پیر کا دن، جمعرات کا دن، ان دونوں میں اللہ عزوجل کے سامنے اعمال لے جائے جاتے ہیں۔

افضل مہینے

افضل ترین مہینے چار ہیں: جو کہ اربعۂ حُرُم کے نام سے مشہور ہیں۔ یعنی حُرمت والے مہینے۔ (۱) ذوالحجۃ، (۲) ذی القعدہ (۳) محرم اور (۴) رجب۔

اللہ تعالیٰ نے مخصوص طور پر ان مہینوں میں ظلم و تعدی کرنے سے منع فرمایا۔ اس لیے کہ یہ احترام کے مہینے ہیں۔ اس طرح ان میں کیے جانے والے اعمال بھی افضل ہیں اور ان سب مہینوں سے افضل تر ذی الحجۃ کا مہینہ ہے اس لیے کہ اس میں حج ہوتا ہے۔ اس میں ایامِ معدودات اور ایامِ معلومات بھی آتے ہیں۔ پھر ذی القعدہ کا درجہ ہے۔ اس لیے کہ یہ دونوں اوصاف کا جامع ہے۔ یہ اشہرحرم اور اشہرحج دونوں سے ہے اور محرم و رجب کے مہینے اشہرحج میں سے نہیں۔ اور شوال اگرچہ اشہرِحرم میں سے نہیں ہے مگر اشہرِ حج میں سے تو ضرور ہے۔

افضل عشرے

مہینے میں افضل ترین ایام دو عشرے ہیں۔

ذی الحجۃ کا پہلا عشرہ اور آخری عشرہ سب سے افضل ہے۔ ان کے بعد محرم کا پہلا عشرہ افضل ہے۔ ان ایام میں اعمال کی فضیلت باقی تمام مہینوں پر زیادہ ہوتی ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ

"جس نے حرام کے مہینہ میں تین روزے رکھے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے آگ سے سات سو سال دُور کر دیا۔ یعنی جمعرات کے دن، جمعہ کے دن اور ہفتہ کے دن۔"

ایک دُوسری حدیث میں آتا ہے:

"ماہِ حرام کا ایک روزہ رکھنا دُوسرے ایام کے تیس روزوں کے برابر ہے اور ماہِ رمضان کا

ایک روزہ رکھنا ماہِ حرام کے تیس روزوں کے برابر ہے۔"

تمام اوقات میں سے افضل ترین پانچوں نمازوں کے اوقات ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ

"جب ماہِ رمضان کا آخری عشرہ آتا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بستر لپیٹ دیتے اور پائنچہ کس لیتے" (یعنی عبادت میں بہت زیادہ انہماک اختیار کر لیتے)

ایک دُوسری حدیث میں ہے کہ جب آخری عشرہ آتا تو خود محنت کرتے اور گھر والوں کو محنت میں لگاتے یعنی خود بھی عبادت میں خوب خوب لگ جاتے اور گھر والوں کو بھی لگا دیتے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث آتی ہے کہ

"ذی الحجہ کے عشرہ (اوّل) کے دنوں کے علاوہ کوئی ایسا دن نہیں ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی عمل سب سے زیادہ افضل و پسندیدہ ہو۔ اس کے ایک دن کا روزہ ایک سال کے روزوں کے برابر ہے اور اس کی ایک رات کا قیام، لیلۃ القدر کے قیام کے برابر ہے۔"

پھر دریافت کیا گیا کہ، کیا اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد بھی؟ (اس کے برابر نہیں)۔ آپؐ نے فرمایا: اور اللہ کی راہ جہاد بھی (اس کے برابر) نہیں۔ سوائے اس صورت کے، کہ ایک آدمی اپنی جان و مال لے کر نکلے اور کچھ بھی واپس نہ لائے۔"

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ "سوائے اس کے کہ جس کا گھوڑا زخمی ہو جائے اور اس کا خون بہا دیا جائے۔" اور جب اللہ عزّ وجلّ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اس کے افضل اوقات کو افضل ترین اعمال سے معمور کر دیتا ہے تاکہ اسے زیادہ سے زیادہ ثواب عطا فرمائے۔ اور جب اللہ کسی بندے سے ناراض ہوتا ہے تو افضل ترین اوقات میں اسے بدترین اعمال میں ڈال دیتا ہے (یعنی اس پر سے سایۂ رحمت ہٹا دیتا ہے۔ آخر شیطان اس سے بُرائیاں کراتا ہے) پھر وہ اللہ تعالیٰ کی محرمات کو توڑ کر اور اللہ تعالیٰ کے شعائر کا احترام ختم کر کے کئی کئی گنا بُرائیاں لاد لیتا ہے۔

منقول ہے کہ توفیق کی تین علامات ہیں:

۱۔ تیری نیت کیے بغیر ہی تجھے نیک اعمال کی توفیق ہو جائے۔

۲۔ تو گناہ کرنا چاہیے مگر گناہوں کو تجھ سے ہٹا لیا جائے۔

۳۔ تنگی اور آسانی ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کی طرف امید و احتیاج کا دروازہ کھل جائے۔

ذلّت کی تین علامات ہیں:

۱۔ تیری چاہت کے باوجود نیکیاں کرنا مشکل بن جائیں۔

۲۔ ڈر اور خوف کے باوجود تجھ سے گناہ سرزد ہونے لگیں۔
۳۔ ہر حالت میں اللہ تعالیٰ کی جانب امید و احتیاج کا دروازہ بند ہو جائے۔
ہم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حسنِ توفیق اور اسی کی طرف احتیاج کا سوال کرتے ہیں اور بری قضاو قدر سے اس کی پناہ مانگتے ہیں۔

فصل ۲۱

جمعہ اور اُس کے آداب و اوراد

جمعہ کی اہمیت

بعض حالات میں جمعہ واجب ہے اور بعض حالات میں ساقط ہو جاتا ہے۔ اقامت کی حالت میں استطاعت ہونے پر اور ظہر کا وقت آنے پر جمعہ واجب ہوتا ہے۔ جب کہ چالیس آزاد مرد جمع ہو جائیں اور اگر سفر در پیش آئے یا عصر کا وقت آجائے یا تعداد کم ہو جائے یا کوئی مانع عذر پیش آئے۔ یعنی حکام ایسے غلط ہو جائیں کہ ان میں کوئی مانع شرعی عذر پایا جائے۔ اس لیے کہ انہی کے ذریعہ قایم کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں جمعہ ساقط ہو جاتا ہے۔
مگر میرے نزدیک بہتر ہے کہ اگر کسی بدعتی کے پیچھے جمعہ پڑھ لے تو پھر نماز ظہر بھی پڑھ لے اور اگر کسی شہر میں دو بڑی جامع مسجدیں ہوں تو دونوں میں سے بہتر امام کی اقتداء میں نمازِ جمعہ ادا کرے، اور دونوں فضیلت میں یکساں ہوں تو قدیم ترین جامع مسجد میں جمعہ ادا کرے۔ اور اگر دونوں برابر ہوں تو قریب ترین میں پڑھے۔ ہاں اگر دور والی مسجد میں علمی مسائل سننے یا سنانے وغیرہ کی نیت ہو تو الگ بات ہے۔ الغرض سب سے بڑی جامع مسجد میں نمازِ جمعہ ادا کرے۔ جہاں کہ مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو اور ان دونوں میں سے جس میں بھی نماز پڑھی اس کی نماز بہت محبوب ہو گی۔

ابن جریجؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عطاءؒ سے پوچھا:
"اگر شہر میں دو جامع یا تین جامع مسجدیں ہوں تو پھر کس میں جمعہ پڑھے؟"
انہوں نے فرمایا:
"جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو۔ وہاں پڑھو۔ یہی جمعہ ہے۔"
اور یہ ایسا دن ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کو عظمت و زینت بخشی۔ اور مسلمانوں کو شرف و فضیلت عطا فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اذانِ جمعہ کے بعد کاروبار حرام ہے

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَ ذَرُوا الْبَیْعَ۔ الآیۃ۔
(اے ایمان والو، جب نماز کی ندا دی جائے جمعہ کے روز، تو اللہ کے ذکر کی طرف جلدی

کرو اور خرید و فروخت چھوڑ دو)

چنانچہ عام ممانعت کے باعث علماء کے ایک گروہ کے نزدیک جمعہ کی اذان کے بعد خرید و فروخت حرام ہے اور بعض کا فرمان ہے کہ بیع واپس کردی جائے گی۔ اس لیے کہ یہ فاسد ہے۔ البتہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ حرمت دُوسری اذان کے وقت شروع ہوتی ہے۔ یعنی جب امام باہر آتا ہے اور منبر پر بیٹھ جاتا ہے۔ اس لیے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اور حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے عہد میں یہی پہلی اذان تھی۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہد میں لوگوں کی کثرت ہوگئی تو انھوں نے پہلی اذان ایجاد کی۔ اور اللہ عزوجل نے فرمایا:

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔

(سو جب نماز پُوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل مانگو)

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو جمعہ کے دن ذکر اللہ کرنے کا حکم دیا۔ خرید و فروخت سے منع کیا۔ اس دن اس سے فضل مانگنے کا حکم دیا اور ان سے خیر و فلاح کا وعدہ فرمایا۔ یہ دونوں نام دنیا و آخرت کی غنیمت کو جامع ہیں۔

ترکِ جمعہ ترکِ اسلام ہے؟

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ:
"اللہ عزوجل نے تم پر میرے اس دن میں اور میرے اس مقام میں جمعہ فرض کیا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:
"جس نے بغیر عذر کے تین جمعے چھوڑ دیے اللہ تعالیٰ نے اس کے دل پر مُہر لگا دی۔"

دوسری حدیث میں یہ الفاظ ہیں:
"تو اس نے اسلام کو اپنی پُشت کے بل پھینک دیا۔"

ایک آدمی نے حضرت ابن عباسؓ سے پوچھا کہ:
"ایک آدمی مرگیا۔ اس نے جمعہ نہیں پڑھا اور نہ ہی کبھی جماعت میں حاضر ہوا۔"

انھوں نے فرمایا:
"وہ آگ میں ہے۔"

وہ ایک ماہ تک اُن سے پُوچھتا رہا۔ مگر وہ یہی فرماتے رہے کہ "وہ آگ میں ہے۔"
دو یا تین فرسخ تک جا کر بھی جمعہ پڑھنا چاہیے اور گاؤں والے اگر سویرے چل پڑیں اور

جمعہ پا سکیں۔ پھر جمعہ ادا کر کے رات ہونے تک گھر واپس پہنچ سکیں تو ان کے لیے جمعہ میں حاضر ہونا مستحب ہے۔

البتہ پانچ آدمیوں سے جمعہ ساقط ہے :

۱۔ بچے سے

۲۔ غلام سے

۳۔ عورت سے

۴۔ مسافر سے اور

۵۔ مریض سے۔

ان میں سے اگر کوئی جمعہ میں حاضر ہو اور پڑھ لے تو جائز ہے۔ اور فرض (ظہر) ادا ہو گیا۔

حدیث میں آتا ہے کہ :

" اہل کتاب دونوں (یہود و نصاریٰ) کو جمعہ کا دن عطا ہوا مگر انھوں نے اس میں اختلاف کیا اور اس سے ہٹ گئے۔ اللہ عزوجل نے اپنی رحمت سے ہمیں اس کی ہدایت فرمائی اور اس امت کے لیے اسے عید کا دن بنا دیا۔

اب یہ تمام لوگوں میں سبقت کر کے آگے بڑھ گئے اور اہل کتاب دونوں (گروہ) ان کے پیچھے ہیں۔"

روزِ جمعہ کی فضیلت

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی حدیث میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا :

" میرے پاس جبرئیل علیہ السلام آئے ان کی ہتھیلی میں ایک سفید آئینہ ہے۔ فرمایا : یہ جمعہ ہے (تیرے رب نے تجھ پر یہ فرض کیا تاکہ تیرے لیے اور تیرے بعد تیری امت کے لیے یہ عید ہو۔"

میں نے کہا : " ہمارے لیے اس میں کیا ہے ؟"

انھوں نے بتایا : " آپؐ کے لیے اس میں ایسی گھڑی ہے کہ جو بھی اس گھڑی میں کوئی بھلائی مانگے گا اسے ملے گا۔ یا تو اللہ تعالیٰ اسے وہی مطلوب عطا کرے گا یا اس سے بڑا اجر اس کیلئے جمع کر دے گا۔ اور یا وہ کسی ایسی آفت سے پناہ مانگتا ہے کہ جو اس پر لکھا ہوا ہے تو اللہ تعالےٰ اس سے بڑی آفت سے اسے بچا لے گا۔ ہمارے نزدیک یہ تمام دنوں کا سردار ہے اور ہم

آخرت میں اسے یوم المزید کا نام دیں گے۔

میں نے پوچھا: "کیوں؟"

حضرت جبرئیل علیہ السّلام نے جواب دیا: "تیرے رب نے جنت میں ایک ایسی وادی بنائی ہے کہ جس کی خوشبو سفید مشک سے زیادہ تیز ہے اور جب جمعہ کا دن آتا ہے تو وہ علیین سے اپنی کرسی پر نزولِ اجلال فرماتا ہے"۔ اور حدیث ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

"وہ ان کے لیے جلوہ افروز ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہیں"۔ ہم نے اسے مکمل طور پر سند الف میں بیان کیا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ:

"بہترین دن جس پر آفتاب طلوع ہوا، جمعہ کا دن ہے۔ اس میں آدم کی پیدائش ہوئی، اسی میں جنت میں داخل گئے اور اسی میں زمین پر اتارے گئے اور اسی روز قیامت آئے گی، اور اللہ کے ہاں یہ یوم المزید کے نام سے مشہور ہے۔ آسمان میں فرشتے اس کا یہی نام لیتے ہیں اور جنت میں اسی دن اللہ تعالیٰ کا دیدار نصیب ہو گا"۔ اس میں کثرت سے احادیث آتی ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ

"جمعہ کے روز ہر جاندار پنڈلی (پاؤں) پر کھڑا کان لگائے رہتا ہے اور قیامت قائم ہونے سے ڈرتا ہے۔ سوائے شیاطین اور بدبخت انسانوں کے"۔

منقول ہے کہ پرندے اور حشراتِ ارض جمعہ کے روز ایک دوسرے کو ملتے ہیں اور ایکدوسرے کو سلام سلام یوم صالح کہتے ہیں۔ (کہ سلام علیکم، اچھا دن ہے)

ایک حدیث میں ہے کہ

"جمعہ کے دن میں اللہ تعالیٰ چھ لاکھ آدمیوں کو دوزخ سے آزاد فرماتا ہے"۔ اور حضرت انسؓ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا:

"جب جمعہ کا دن (نافرمانیوں) سے سلامت رہا تو سارے دن سلامت رہے"۔

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ حدیث میں آتا ہے:

"اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں ہر چیز کو فضیلت بخشی ہے۔ چنانچہ شہروں میں مکہ کو، مہینوں میں رمضان کو اور دنوں میں جمعہ کو فضیلت عطا کی"۔

ایک حدیث میں آتا ہے: "روزانہ زوال سے پہلے سورج کے آسمان میں سر پر ہونے کے

وقت دوزخ جھونکا دیا جاتا ہے (گرم کیا جاتا ہے) اس لیے اس وقت نماز نہ پڑھو سوائے جمعہ کے دن کے، کہ یہ سارا دن ہی نماز ہے۔ اور اس روز دوزخ نہیں جھونکا جاتا۔"

نمازِ جمعہ کے لیے سویرے جائے

چنانچہ جمعہ کے روز افضل ترین کام یہ ہے کہ انسان سویرے سویرے پہلی ساعت میں جامع مسجد میں جائے۔ اگر ایسا نہ کر سکے تو دوسری ساعت میں جائے۔ اور اگر ایسا بھی نہ کر سکے تو تیسری ساعت میں چلا جائے۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو آدمی پہلی ساعت میں نمازِ جمعہ کی طرف جائے۔ گویا اس نے ایک اُونٹ (اللہ کی راہ میں) دیا اور جو دوسری ساعت میں جائے گویا اس نے ایک گائے دی اور جو تیسری ساعت میں جائے گویا اس نے سینگوں والا ایک مینڈھا دیا اور جو چوتھی ساعت میں جائے گویا اس نے ایک مُرغی دی اور جو پانچویں ساعت میں جائے گویا اس نے ایک انڈا (اللہ کی راہ میں) دیا اور جب امام باہر آ گیا تو صحائف لپیٹ دیے گئے اور قلمیں اٹھا لی گئیں اور فرشتے منبر کے پاس جمع ہو کر ذکر اللہ سننے لگتے ہیں۔ اس کے بعد جو آیا وہ صرف نماز کے حق کے لیے آیا اور اس کے لیے کچھ فضیلت نہیں۔"

چنانچہ صبح کی نماز کے بعد پہلی ساعت ہے اور سورج بلند ہونے کے موقع پر دوسری ساعت ہے اور جب سورج کی گرمی کے باعث پاؤں جلنے لگیں اور چاشتِ اعلیٰ کا وقت آ جائے تو تیسری ساعت ہے اور چوتھی ساعت زوال سے پہلے پہلے کا وقت ہے اور جب سورج ڈھل جائے یا سورج ابھی سر پر تک ہو تو پانچویں ساعت ہے۔ چوتھی اور پانچویں ساعت میں استحباب بکور نہیں ہے، اور پانچویں ساعت کے بعد فضیلت کی کچھ بات نہیں رہتی۔ اس لیے کہ اس کے آخر میں امام باہر آتا ہے۔ اب صرف جمعہ کا فریضہ باقی رہ گیا۔

منقول ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ کے دیدار کے موقع پر لوگ صرف اس قدر قریب ہوں گے جس قدر وہ جمعہ کی نماز میں سویرے جانے والے ہیں۔"

حضرت ابن مسعودؓ جمعہ کے روز سویرے ہی مسجد میں تشریف لائے تو تین آدمیوں کو دیکھا کہ وہ پہلے ہی آ چکے ہیں۔ انہیں اس کا خیال ہُوا اور اپنے آپ کو کہنے لگے تو چوتھا ہے، چوتھا! اور چوتھا آدمی بھی اللہ سے زیادہ دُور نہیں۔ یہ در اصل مشاہدہ و یقین کا معاملہ ہے۔

حدیث میں آتا ہے:

"اگر کوئی بندہ جمعہ کے روز تاخیر سے آئے اور فرشتے اسے نہ دیکھیں تو ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ اس آدمی نے کیا کیا؟ آج اس نے وقت سے تاخیر کیوں کر دی"؟ پھر دعا کرتے ہیں،

"اے اللہ! اگر اسے محتاجی نے موخر کیا ہے تو اسے غنی کر دے، اگر بیماری نے اسے موخر کر دیا تو اسے شفا دے، اور اگر کسی اور بات نے اسے موخر کر دیا تو اسے اپنی عبادت کے لیے فارغ فرما اور اگر لہو و لعب نے اسے موخر کر دیا تو اس کے دل کو اپنی طاعت کی طرف موڑ دے"۔ اور جمعہ کے روز قصہ گوئی کے لیے نہ بیٹھے۔ یہ مکروہ ہے اور نہ ہی نماز سے پہلے کسی مجلس میں بیٹھے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک منقطوع روایت میں ہے:

"تین ایسے کام ہیں اگر لوگوں کو ان میں (واقع ثواب) کا علم ہو جائے تو اونٹ لے کر اس طرف دوڑیں۔

۱۔ اذان دینا۔

۲۔ پہلی صف۔

۳۔ جمعہ کی طرف صبح سویرے آنا"۔

احمد بن حنبلؒ نے یہ حدیث ذکر کر کے فرمایا کہ

"ان سب میں جمعہ کی طرف سویرے جانا زیادہ افضل ہے"۔

ایک دوسری حدیث میں آتا ہے:

"جب جمعہ کا دن آتا ہے تو مسجد کے دروازوں پر فرشتے بیٹھ جاتے ہیں ان کے ہاتھوں میں چاندی کے دفتر ہوتے ہیں اور سونے کی قلمیں ہوتی ہیں۔ درجہ بدرجہ پہلے آنے والوں کا (نام) لکھ لیتے ہیں"۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث مروی ہے:

"آپؐ نے نماز سے پہلے جمعہ کے روز مجالس قائم کرنے سے منع فرمایا سوائے اس کے کہ کوئی عالم ایام اللہ کا ذکر کرے اور اللہ عزوجل کا دین سکھائے تو اس کی اجازت ہے اور اگر صبح کے وقت جامع مسجد میں بیٹھ جائیں، اور لوگ بھی بیٹھ جائیں، پھر جمعہ تک بیٹھے علم کی باتیں سنتے رہیں تو جمعہ اور جمعہ کی طرف سویرے جانا دونوں ہی اس میں آ گئے۔ عذر نہ ہو تو جمعہ کے دن غسل کا ناغہ نہ کرے۔ اس لیے کہ بعض علماء کے نزدیک جمعہ کا غسل فرض ہے اور گھر میں غسل کرنا زیادہ افضل ہے۔

غسلِ جمعہ واجب ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"ہر محتلم (بالغ) پر جمعہ کا غسل واجب ہے"۔
حضرت نافع رحؒ کی حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے، کہ
"جو جمعہ کے لیے آئے اسے غسل کر لینا چاہیے"۔
اور اہل مدینہ باہم گالی دیتے تو کہا کرتے:
"تو اس سے بھی زیادہ بُرا ہے کہ جو جمعہ کے روز غسل نہیں کرتا"۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ خطبہ دے رہے تھے اس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسجد میں داخل ہوئے
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:
"اس وقت؟"
انہوں نے جواب دیا: "اذان سننے کے بعد میں نے صرف وضو کیا اور نکل آیا"۔
حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "صرف وضو ہی؟ حالانکہ تم جانتے ہو کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
غسل کرنے کا بھی حکم فرمایا کرتے تھے"۔
مگر حضرت عثمان کے جاننے کے باوجود صرف وضو کرنے اور غسل ترک کرنے میں رخصت معلوم ہوئی۔
یہ فعل اس حدیث کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے کہ:
"جو آدمی جمعہ کے روز وضو کرے تو اچھا ہے اور جس نے غسل کیا تو غسل کرنا افضل ہے"۔
صحابہ سے مروی ہے:
"گرمی کے موسم میں ہمیں جمعہ کے روز غسل کرنے کا حکم دیا گیا اور جب سردی کا موسم آیا تو جو چاہتا وہ غسل
کر لیتا اور جو نہ چاہتا غسل چھوڑ دیتا"۔
جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:
"مردوں اور عورتوں میں سے جو جمعہ میں حاضر ہو اسے غسل کر لینا چاہیے"۔
اس لیے حضرت انس بن مالک رضؓ نے فرمایا:
"جب عورتیں جمعہ کے لیے حاضر ہوں تو وہ غسل کریں اور جو آدمی جنابت کے باعث غسل کرے
اس غسل میں اگر جمعہ کی نیت بھی کر لے تو وہ جمعہ کے لیے کافی ہوگا اور جنابت کے غسل کے موقعہ پر جمعہ کی
نیت کرنا ضروری ہے اور یہ افضل ہے۔ اب جمعہ کا غسل اس میں داخل ہوگا۔ چنانچہ جب غسل جنابت
کے بعد دوبارہ بدن پر پانی بہائے تو جمعہ کی نیت کر لے۔ یہ افضل ہے۔
ایک صحابی جمعہ کے روز اپنے بیٹے کے پاس آئے۔ وہ غسل کر رہے تھے، پوچھا: کہ "یہ جمعہ کیلیے

غسل ہے؟"

انھوں نے جواب دیا، "یہ جنابت کا غسل ہے۔"

فرمایا، "دوبارہ غسل کر لو۔ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا۔ فرماتے تھے:

"ہر مسلمان پر جمعہ کا غسل کرنا واجب ہے۔"

اور جو طلوعِ فجر کے بعد ہی جمعہ کا غسل کر لے تو بھی جائز ہے مگر افضل یہ ہے کہ جامع مسجد میں جاتے وقت غسل کرے۔ اور بہتر یہ ہے کہ غسل کر لینے کے بعد نمازِ جمعہ سے فراغت تک دوبارہ وضو نہ کرے (بلکہ اس وضو کے ساتھ جمعہ ادا کرے) اس لیے کہ بعض علمأ نے اسے مکروہ فرمایا لیکن اگر جامع مسجد میں بہت سویرے چلا جائے اور وقت طویل ہونے کے باعث اس کا وضو ٹوٹ جائے تو کچھ ہرج نہیں اس کا غسلِ جمعہ برقرار ہے۔

جمعہ میں لباس و خوشبو عمدہ ہو

مستحب یہ ہے کہ مسواک کرے اور عمدہ لباس پہنے۔ لباس میں شہرت سے پرہیز کرے اور افضل لباس، سفید لباس یا دو یمنی چادریں ہیں۔ اور جمعہ کے روز سیاہ کپڑے ہرگز مسنون نہیں ہیں اور نہ ہی ان میں کچھ فضیلت ہے کہ پہننے والے کو لوگ دیکھیں۔ ناخون کٹوا لے اور مونچھیں صاف کرا لے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل و قول سے اس کی فضیلت منقول ہے۔

حضرت ابن مسعود وغیرہ سے مروی ہے کہ

"جو آدمی جمعہ کے روز ناخون کٹوائے گا اللہ تعالیٰ ان سے بیماری نکال دے گا اور شفا ڈال دے گا۔"

اس کے علاوہ عمدہ ترین خوشبو لگائے۔ جس کی خوشبو ظاہر رہے اور رنگ پوشیدہ رہے۔ یہ مردوں کی خوشبو ہے اور عورتوں کی خوشبو وہ ہے جس کا رنگ نمایاں ہو اور خوشبو پوشیدہ رہے۔ یہ حدیث میں آتا ہے۔

عمامہ مستحب ہے

جمعہ کے روز عمامہ استعمال کرنا مستحب ہے۔ اس میں حضرت وائلہ بن اسقع سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی شاذ روایت ہے:

"بے شک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے جمعہ کے روز عمامہ والوں پر رحمت بھیجتے ہیں (اللہ تعالیٰ رحمت فرماتا ہے اور فرشتے رحمت کی دعا کرتے ہیں) اور اگر گرمی پریشان کرے تو نماز سے پہلے اور بعد میں عمامہ اتار لے۔ مگر جامع مسجد میں جانے کے لیے گھر سے نکلتے وقت عمامہ رکھے ہوئے ہو اور عمامہ باندھے ہی نماز ادا کرے تاکہ عمامہ کی فضیلت حاصل ہو جائے۔ اور اگر عمامہ اتار رکھا ہو تو جب

امام منبر پر چڑھے تو سر پر رکھ لے۔ پھر اسی حالت میں نماز پڑھے۔ اس کے بعد چاہے تو اتار دے۔

مسجد میں جانے کا طریقہ

خشوع وخضوع، سکینت ووقار کے ساتھ اور انابت واحتیاج کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہو۔ کثرت سے دعا واستغفار کرے۔ گھر سے نکلتے وقت اپنے آقا ومولیٰ کی زیارت کی نیت کرے۔ اور یہ نیت رکھے۔ میں فریضہ ادا کرنے کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کروں۔ مسجد میں معتکف حالت میں رہے۔ تمام اعضاء کو لغو وفضولیات سے بچائے رکھے۔ جب اپنے مولیٰ کے حضور رہے ہر دنیاوی شغل سے الگ رہے جمعہ کا ابتدائی حصہ، نمازِ جمعہ ختم ہونے تک حالتِ نماز میں گزارے۔ درمیانی حصہ نمازِ عصر تک علم سننے اور مجالسِ ذکر میں حصہ لے کر گزار دے اور غروبِ آفتاب جمعہ کا آخری حصہ تسبیح واستغفار میں گزار دے۔ متقدمین نے جمعہ کے دن کو اسی طرح تین حصوں میں تقسیم کر رکھا تھا اور اگر اس دن روزہ رکھ سکے تو بہتر ہے مگر ساتھ ہی جمعرات یا ہفتہ کا روزہ بھی ملالے اور صرف جمعہ کا روزہ رکھنا مکروہ ہے اور اگر روزہ رکھ سکتا ہو مگر روزہ نہ رکھے تو اس روز جماع کر لے۔ اس کی بھی فضیلت آتی ہے۔ بعض سلف کا یہ طریق تھا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"جس نے غسل کرایا اور غسل کیا اور صبح کی اور جلدی جا کر امام کے قریب بیٹھا اور کوئی لغو حرکت نہ کی اسے ہر قدم کے عوض ایک سال کے روزے اور قیام کا ثواب ملے گا۔"

ایک دوسری حدیث میں آتا ہے:

"اور امام سے قریب ہو کر سنا تو اس کے لیے دو جمعوں کے درمیان کے لیے کفارہ ہو گا اور تین دن زاید کا (کفارہ ہو گا)۔"

لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگو

ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

"دوسرے جمعہ تک اس کی بخشش ہو گئی"۔ اور بعض روایات میں یہ شرط آئی ہے، "اور لوگوں کی گردنیں نہ پھلانگے"۔ اور غسّل میں شد کے ساتھ معنی یہ ہے کہ اپنے اہل کو غسل کرائے۔ یہ جماع سے کنایہ ہے۔ بعض روایات میں تخفیف سے آتا ہے۔ یعنی من غسل و اغتسل۔ اب اس کا معنی یہ ہو گا کہ جو اپنا سر دھوئے اور تمام بدن کا غسل کرے اور لوگوں کی گردنیں پھلانگنے سے بچے۔ اس لیے کہ گردنیں پھلانگنا بہت ہی ناپسندیدہ حرکت ہے۔

اس کے بارے میں سخت وعید آئی ہے کہ:

"جو یہ کام کرے گا قیامت کے روز اسے جہنم کا پل بنایا جائے گا۔ اور لوگ اس پر چلیں گے"۔
ابن جریجؒ نے ایک مرسل حدیث بیان کی:
"جمعہ کے روز حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے تو ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوا بڑھا اور بیٹھ گیا۔ نماز پڑھنے کے بعد حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس آدمی سے ملے اور فرمایا:
"اے فلاں! آج تمہیں ہمارے ساتھ جمعہ پڑھنے میں کیا رکاوٹ ہوئی؟"
اس نے کہا:
"اے اللہ کے نبیؐ! میں نے جمعہ پڑھا ہے"۔
آپؐ نے فرمایا:
"کیا میں نے نہیں دیکھا کہ تو لوگوں کی گردنیں پھلانگ رہا تھا؟" اور حدیث مسند میں ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے فرمایا:
"تجھے کیا رکاوٹ ہوئی تو ہمارے ساتھ جمعہ پڑھتا؟" اس نے کہا:
"کیا آپؐ نے مجھے نہیں دیکھا؟"
آپؐ نے فرمایا:
"میں نے تجھے دیکھا۔ تو نے دیر کی اور تکلیف دی"۔ یعنی تو نے سویرے آنے سے تاخیر کی اور آ کر لوگوں کو ایذا دی۔ نیز جمعہ کے دن قصہ گوئی کے لیے نہ بیٹھے۔ یہ مکروہ ہے اسی طرح نماز سے پہلے کسی حلقۂ ذکر میں نہ بیٹھے۔
حضرت عمرو بن شعیب نے اپنے دادا سے، انھوں نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہم سے روایت کیا کہ:
"حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز سے پہلے جمعہ کے روز مجالس قایم کرنے کی ممانعت فرمائی۔" ہاں اگر کوئی عالم دین ہو اور وہ ایام اللہ کا ذکر کرے، دین کی باتیں بیان کرے اور صبح کے وقت جامع مسجد میں بیٹھے اور لوگ بھی اس کے پاس بیٹھ جائیں تو جمعہ میں جلدی کرنے اور علم کی باتیں سننے دونوں نیکیوں کو حاصل کر لیا۔

جمعہ کے روز قبولیت کی ساعت

بعض علمائے سلف سے منقول ہے کہ
"عام بندوں کی روزی کے علاوہ اللہ تعالیٰ ایک

خاص رزق عطا فرماتا ہے۔ اور یہ فضل اس پر ہوتا ہے جو کہ جمعرات کی رات اور جمعہ کے دن کو اس سے مانگے۔"

مشہور حدیث میں ہے:

"جمعہ میں ایک گھڑی ایسی آتی ہے کہ جو مسلمان بندہ اس گھڑی میں اللہ عزوجل سے جو کچھ مانگتا ہے اللہ اسے عطا فرماتا ہے۔"

دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"جو بندہ بھی نماز پڑھتے مانگتا ہے۔"

اس ساعت کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ایک قول کے مطابق طلوعِ آفتاب کے وقت یہ گھڑی آتی ہے۔ ایک قول میں جب نماز کے لیے کھڑے ہوں تب یہ ساعت آتی ہے۔ ایک قول میں زوال کے وقت، ایک قول میں اذان کے وقت، ایک قول میں اس وقت آتی ہے کہ جب امام منبر پر چڑھے اور خطبہ شروع کرے، ایک قول میں عصر کے بعد سے لے کر آخری وقت تک اور ایک قول میں غروبِ آفتاب کے وقت یہ گھڑی آتی ہے جبکہ سورج ڈوبنے کے قریب ہو۔ حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت کا خاص خیال رکھتیں اور اپنے خادم کو حکم دیتیں کہ سورج کو دیکھتے رہو جب سورج ڈوبنے لگتا تو خادم آکر اطلاع دیتا وہ اسی وقت غروبِ آفتاب تک دعا و استغفار میں مصروف ہو جاتیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہی وہ انتظار کی ساعت ہے اور انہیں اپنے والد صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی خبر ملی ہے۔ اس ساعت کے بارے میں جو احادیث و مرویات منقول ہیں ان کا یہ خلاصہ ہے۔ ہم نے اختصار کی غرض سے ان احادیث کی تفصیل حذف کر دی۔ ان اوقات کا خیال رکھو اور ان اوقات میں نماز و دعا کا خاص طور پر اہتمام کرو۔

بعض علماء کا فرمان ہے:

"روزانہ ایک گھڑی ایسی آتی ہے کہ جو مخفی ہے اور اللہ عزوجل کے سوا اسے کوئی نہیں جانتا۔ گویا وہ رمضان کی مخفی لیلۃ القدر کی طرح ہے۔ گویا وہ پانچوں نمازوں میں نمازِ وسطیٰ کی طرح ہے۔"

ایک قول کے مطابق یہ ساعتِ اجابت جمعہ کے روز کی ساعتوں میں بدلتی رہتی ہے جیسے کہ بعض کے نزدیک مہینے کی مختلف راتوں میں لیلۃ القدر بدل بدل کر آتی ہے تاکہ بندہ سارا دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سوال کرنے والا اور عجز و احتیاج ظاہر کرنے والا بنا رہے۔ چنانچہ جو آدمی سارا دن مختلف اوراد کرتا رہے اور ہر گھڑی کو ذکرِ الٰہی سے معمور رکھے۔ وہ اللہ عزوجل کے اذن سے یہ ساعت پالے گا اور اگر ایک دن کی تمام ساعات میں ذکر جاری نہ رکھ سکے تو مختلف جمعوں میں اس

ترتیب سے ذکر کرے کہ ہر ہر ساعت میں ذکر اللہ ہو جائے۔ اس طرح بھی وہ اس ساعتِ مبارکہ سے حصّہ حاصل کر ہی لے گا۔

البتہ دو اوقات میں پوری شدت سے دعا و استغفار کرے:

۱۔ جب امام منبر پر چڑھے "تا آنکہ نماز کھڑی ہو اور نماز میں داخل ہو جائے۔

۲۔ دن کے آخری وقت میں جبکہ آفتاب غروب ہونے لگے۔

یہ دونوں اوقات جمعہ کے افضل ترین اوقات ہیں۔ اور مجھے قوی اُمید ہے کہ ان دونوں اوقات میں سے ایک وقت وہی ساعت قبولیت ہے۔

حضرت کعب احبارؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے اتفاق کیا ہے اور حضرت کعب کی رائے یہ ہے کہ یہ گھڑی جمعہ کے روز آخری وقت میں آتی ہے۔

حضرت اَبو ہریرہؓ نے فرمایا:

"یہ ساعت، دن کے آخری حصّہ میں کیونکر ہو سکتی ہے؛ حالاں کہ میں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا"؛

"جو بندہ بھی اس وقت نماز پڑھے، اسے پائے۔"

اب یہ نماز کے وقت میں ہی ہو سکتی ہے۔

حضرت کعبؓ نے جواب دیا: "کیا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا؛" جو آدمی نماز کے انتظار میں بیٹھے، وہ بھی نماز میں ہے۔"

انھوںؓ نے جواب دیا: "ہاں"۔

حضرت کعبؓ نے فرمایا: "تو یہ نماز ہے"۔

اب حضرت ابو ہریرہؓ خاموش ہو گئے۔ گویا انہوںؓ نے انؓ سے اتفاق کر لیا۔

جمعہ کے روز درود کی کثرت

جمعہ کے دن اور جمعہ کی شب میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کثرت سے درود شریف پڑھنا چاہیے۔ کم از کم تین سو بار ضرور درود شریف پڑھے۔ حدیث میں آتا ہے؛

"جس نے جمعہ کے روز مجھ پر اسّی بار درود پڑھا اللہ تعالیٰ نے اس کے اسّی برس کے گناہ بخش دیے"۔

پوچھا گیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ پر درود کس طرح پڑھیں؟"

آپؐ نے فرمایا: "یوں کہا کرو"

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَ نَبِیِّكَ وَ رَسُوْلِكَ النَّبِیِّ الْاُمِّیِّ ۔

(اے اللہ! اپنے بندے اور اپنے نبی اور اپنے رسول حضرت محمد نبی امی پر رحمت فرما)

اور ایک گرہ لگا دو (یعنی انگلیوں پر ایک شمار کرو) الغرض جس میں بھی صلوٰۃ آئے اس کو صلوٰۃ (درود) کے طور پر پڑھ سکتا ہے۔ اور چاہے تو تشہد میں مروی درود (ابراہیمی) پڑھ لے یا یہ درود شریف پڑھے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ صَلٰوۃً تَكُوْنُ لَكَ رِضَآءً وَ لِحَقِّهٖ اَدَآءً وَ اَعْطِهِ الْوَسِیْلَةَ وَ ابْعَثْهُ الْمَقَامَ الْمَحْمُوْدَ الَّذِیْ وَعَدْتَّهٗ وَ اَجْزِهٖ عَنَّا مَا هُوَ اَهْلُهٗ وَ اَجْزِهٖ اَفْضَلَ مَا جَزَیْتَ نَبِیًّا عَنْ اُمَّتِهٖ وَ صَلِّ عَلٰی جَمِیْعِ اِخْوَانِهٖ مِنَ النَّبِیِّیْنَ وَ الصَّالِحِیْنَ یَا اَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ ۔

(اے اللہ! محمدؐ اور آل محمدؐ پر رحم فرما۔ ایسا رحم کہ ان کے لیے رضامندی اور ان کے حق کی ادائیگی ہو جائے اور آپؐ کو وسیلہ عطا فرما، آپؐ کو مقام محمود عطا فرما کہ جس کا تو نے وعدہ فرمایا اور ہماری طرف سے آپؐ کو ایسی جزا عطا فرما کہ جس کے آپؐ اہل ہیں اور کسی نبی کو بھی جو تو نے اس کی امت کی طرف سے جزا عطا فرمائی ان سے افضل آپؐ کو عطا فرما اور آپؐ کے تمام بھائیوں انبیاء علیہم السلام اور صالحین پر رحم فرما۔ اے سب سے زیادہ رحم کرنے والے)

یہ درود سات بار پڑھے۔ اس کی بہت ہی فضیلت ہے۔ منقول ہے کہ جو ہر جمعہ کے روز اس کو سات بار پڑھے گا اس کے لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت واجب ہو گی۔

اگر یہ طویل درود پڑھے تو یہ ماثورہ (اور زیادہ افضل) درود شریف ہے۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ فَضَائِلَ صَلَوٰتِكَ وَ شَرَائِفَ زَكَوٰتِكَ وَ نَوَامِیَ بَرَكَاتِكَ وَ رَاْفَتِكَ وَ رَحْمَتِكَ وَ تَحِیَّتِكَ عَلٰی مُحَمَّدٍ سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ وَ اِمَامِ الْمُتَّقِیْنَ وَ خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ وَ رَسُوْلِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ قَائِدِ الْخَیْرِ وَ فَاتِحِ الْبِرِّ وَ نَبِیِّ الرَّحْمَةِ وَ سَیِّدِ الْاَئِمَّةِ اَللّٰھُمَّ ابْعَثْهُ مَقَامًا

(اے اللہ! اپنی عظیم رحمتیں، پرعظمت پاکیزگی، برکات، رحمت و کرم اور احسان فرما۔ سید المرسلین، امام متقین، خاتم النبیین اور رب العلمین کے رسول، بھلائی کے قائد، نیکی کے فاتح، نبی رحمت سید الامت پر، اے اللہ! آپ کو مقام محمود پر پہنچا۔ اس کے ذریعہ تو اس کا قرب بڑھائیے۔ اس سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔ پہلے اور بعد والے

مَحْمُوْدًا تُزْلِفُ بِهٖ قُرْبَهٗ وَتَقَرُّ بِهٖ عَيْنَهٗ يَغْبِطُهٗ بِهِ الْاَوَّلُوْنَ وَالْاٰخِرُوْنَ ۔ اَللّٰهُمَّ اَعْطِهِ الْفَضْلَ وَالْفَضِيْلَةَ وَالشَّرَفَ وَالْوَسِيْلَةَ وَالدَّرَجَةَ الرَّفِيْعَةَ وَالْمَنْزِلَةَ الشَّامِخَةَ الْمُنِيْفَةَ اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُحَمَّدَنِ السُّؤْلَهٗ وَبَلِّغْهُ مَأْمُوْلَهٗ وَاجْعَلْهُ اَوَّلَ شَافِعٍ وَّاَوَّلَ مُشَفَّعٍ ۔ اَللّٰهُمَّ عَظِّمْ بُرْهَانَهٗ وَ ثَقِّلْ مِيْزَانَهٗ وَ اَبْلِجْ حُجَّتَهٗ وَارْفَعْ فِيْ اَعْلَى الْمُقَرَّبِيْنَ دَرَجَتَهٗ اَللّٰهُمَّ احْشُرْنَا فِيْ زُمْرَتِهٖ وَ اجْعَلْنَا مِنْ اَهْلِ شَفَاعَتِهٖ وَ اَحْيِنَا عَلٰى سُنَّتِهٖ وَ تَوَفَّنَا عَلٰى مِلَّتِهٖ وَاَوْرِدْنَا حَوْضَهٗ وَاسْقِنَا بِكَاْسِهٖ غَيْرَ خَزَايَا وَ لَا نَادِمِيْنَ وَ لَا شَاكِّيْنَ وَ لَا مُبَدِّلِيْنَ وَ لَا فَتَّانِيْنَ وَ لَا مَفْتُوْنِيْنَ آمِيْنَ ۔ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۔

اس پر رشک کریں - اے اللہ! آپ کو فضیلت و شرف، بزرگی اور وسیلہ، بلند درجہ، اعلیٰ مقام عطا فرما - اے اللہ! محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی طلب عطا فرما - آپ کو اپنے مقصد تک پہنچا - آپ کو پہلا شفاعت کرنے والا اور پہلا شفاعت قبول کیا جانے والا بنا دے - اے اللہ! آپ کی دلیل پر عظمت فرما اور آپ کا میزان وزنی بنا دے، اور آپ کی دلیل کو روشن فرما اور مقربین میں آپ کا درجہ بلند فرما - اے اللہ! ہمیں آپ کی جماعت میں اٹھا اور ہمیں آپ کے اہلِ شفاعت میں سے بنا اور ہمیں آپ کی سنّت پر زندہ رکھ اور آپ کی ملّت پر ہمیں وفات دے - ہمیں آپ کے حوض پر لا، ان کے پیالہ سے پلا - بغیر رسوائی کے - نہ ندامت ہو، نہ شکایت ہو، نہ بدلنے والے ہوں اور نہ فتنہ ڈالنے والے ہوں اور نہ فتنہ میں پڑنے والے ہوں - آمین، اے تمام جہانوں کے پروردگار)

جمعہ کے دن استغفار

جمعہ کے روز اور جمعہ کی شب کو کثرت سے استغفار کرے اور جس جملے میں استغفار کا لفظ آئے - وہ کہنے والا استغفار کرنیوالا ہی ہوگا - البتہ حسب ذیل استغفار افضل ہے -

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ وَ تُبْ عَلَيَّ اِنَّكَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ -

(اے اللہ! مجھے بخش دے اور مجھ پر رحمت کے ساتھ لوٹ آ - بے شک تو توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنیوالا ہے)

اور اگر حسب ذیل استغفار پڑھے تو بھی بہتر ہے -

رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ وَ تَجَاوَزْ عَمَّا تَعْلَمُ وَ اَنْتَ خَيْرُ الرَّاحِمِيْنَ -

(اے رب بخش دے اور رحم فرما اور جو تو جانتا ہے اس سے درگزر فرما اور تو بہترین رحم کرنے والا ہے)

؎ مستحب یہ ہے کہ ختمِ قرآن جمعہ کے روز رکھے اور اگر وقت تنگ ہو جائے تو جمعہ کی رات کو ختم کرے

تاکہ جمعہ کی رات سے نیکی کا آغاز ہو جائے۔ اور اگر جمعہ کے روز صبح کی دو رکعتوں میں ختم رکھے یا جمعہ کی رات مغرب کی دو رکعتوں میں ختم قرآن رکھے تو بھی بہتر ہے تاکہ سارا دن اور رات اس بھلائی میں آجائے اور اگر نمازِ جمعہ کی اذان و اقامت کے درمیان ختم قرآن رکھا کرے تو اس کی بہت ہی فضیلت ہے۔

ایک عجیب نماز

نمازِ جمعہ سے پہلے دس رکعتیں پڑھنا مستحب ہے (چھ نوافل اور چار سنت) اور نمازِ جمعہ کے بعد چھ رکعتیں (سنت) پڑھنا چاہئیں۔ چنانچہ جب جامع مسجد میں داخل ہو تو چار رکعت (نوافل)، اس طریقہ پر پڑھے کہ ہر رکعت میں سورۃ فاتحہ کے بعد پچاس بار سورۃ اخلاص پڑھے۔ چار رکعتوں میں دو صد بار سورۃ اخلاص ہوئی۔ اس نماز کی فضیلت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ، جو آدمی یہ نماز پڑھے گا مرنے سے پہلے وہ جنت میں اپنا مقام دیکھ لے گا یا اسے یہ مقام دکھایا جائے گا اور جب مسجد میں داخل ہو تو بیٹھنے سے پہلے دو رکعت (نوافل) ادا کرے اور اسی طرح اگر مسجد میں آئے اور امام خطبہ دے رہا ہو تو مختصر رکعتیں پڑھے۔ ایک غریب حدیث میں آتا ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس (دو رکعت پڑھنے والے) کے لیے خاموش ہو گئے، آخر اس نے دو رکعتیں پڑھ لیں۔ اہل کوفہ فرماتے ہیں کہ اگر امام خاموش ہو جائے تو پڑھ لے، اور شاید جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سکوت آپؐ سے مخصوص تھا۔ اس لیے کہ آپؐ کا قول سننا واجب ہے۔

ہر جمعہ کو سورۃ کہف پڑھے

حضرت ابن جریحؒ نے عطاءؒ سے انہوں نے حضرت ابن عباس اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے روایت کیا:

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو آدمی جمعہ کی رات یا جمعہ کے دن کو سورۃ کہف پڑھے اسے ایسا نور عطا ہو گا کہ جس (کی روشنی) میں وہ مکہ تک پہنچ سکے گا اور دوسرے جمعہ تک اور تین دن زائد تک اس کی مغفرت ہو جائے گی اور صبح ہونے تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے دعائے رحمت کریں گے۔ اور بیماری، پھوڑے، ذات الجنب، برص، جذام اور دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا۔"

مستحب یہ ہے کہ جمعہ کے روز چار رکعت (نوافل) اس طریق پر پڑھے کہ پہلی رکعت میں سورۃ انعام، دوسری میں سورۃ کہف، تیسری میں سورۃ طٰہٰ اور چوتھی رکعت میں سورۃ یٰسٓ پڑھے، اگر یہ سورتیں یاد نہ ہوں تو پہلی رکعت میں سورۃ یٰسٓ، دوسری میں لقمان، تیسری میں الدخان اور چوتھی رکعت میں سورۃ الملک پڑھ لے۔ ہر جمعہ کی رات کو یہ نماز پڑھتا رہے اور کبھی ناغہ نہ کرے

اس کے بارے میں حدیث آتی ہے اور بہت ہی فضیلت ہے اور اگر سارا قرآن مجید نہ پڑھ سکے تو جس قدر پڑھنا جانتا ہو۔ وہی پڑھے۔ یہی اس کا ختم ہوگا۔ ایک قول کے مطابق اس کے علم کے مطابق یہ ختم ہوگا۔

جمعہ کے دیگر اوراد

عابد حضرات کے نزدیک یہ بہتر ہے کہ:
جمعہ کے روز ایک ہزار بار قل ھو اللہ احد پڑھے۔ اگر یہ تعداد دس رکعتوں یا بیس رکعتوں میں پوری کرے تو ختم سے بھی افضل ہے۔

اسی طرح جمعہ کے روز ایک ہزار بار حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف پڑھنے کا بھی دستور ہے۔ مزید برآں تسبیح، تہلیل چاروں کلمات کے ساتھ بھی ایک ہزار بار پڑھے۔ (یعنی سُبْحَانَ اللهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاللهُ اَكْبَرُ ایک ہزار بار پڑھے)

جمعہ کے روز یہ تین اوراد بہت ہی فضیلت رکھتے ہیں:

۱۔ ایک ہزار بار قل ھو اللہ احد پڑھنا۔

۲۔ ایک ہزار بار تیسرا کلمہ پڑھنا۔ (یعنی سبحان اللہ والحمد ولا الٰہ الا اللہ و اللہ اکبر)

۳۔ اور ایک ہزار بار درود شریف پڑھنا۔

ہر جمعہ کو نمازِ تسبیح پڑھے

اس روز یہ اعمال سب سے افضل اعمال ہیں اور اگر جمعہ کے روز زوال سے پہلے نمازِ تسبیح پڑھے۔ اس میں تین صد بار تسبیحات و تہلیلات آجاتی ہیں۔ تو یہ بہت ہی خوب اور عمدہ ورد ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

"اس (نمازِ تسبیح) کو ہر جمعہ میں ایک بار پڑھو۔"

اور ابو جوزاؒ نے حضرت ابن عباسؓ کے بارے میں نقل کیا کہ وہ زوال کے بعد روزانہ بلاناغہ اس نماز کو پڑھتے۔ اور اس نماز کی بہت ہی فضیلت بیان کی اور اگر جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات میں تسبیحاتِ ستہ پڑھے تو بہتر ہے اور جمعہ کے دن اور جمعہ کی رات کے سوا یہ مروی نہیں کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین سورتیں پڑھی ہوں اس لیے کہ ہم بتا چکے ہیں کہ شبِ جمعہ کی نمازِ مغرب میں آپؐ قل یا ایھا الکافرون اور قل ھو اللہ احد پڑھتے اور جمعہ کی رات عشاء کی نماز میں آپؐ سورۃ جمعہ اور سورۃ المنافقین پڑھا کرتے۔

ایک روایت یہ ہے کہ آپؐ نمازِ جمعہ میں یہ دونوں سورتیں پڑھتے اور جمعہ کے روز صبح کی نماز میں سورۃ سجدہ، لقمان اور سورۃ ھل اتی علی الانسان کی تلاوت کرتے۔ یہ بھی یاد رہے کہ نوافل پڑھنے سے زیادہ افضل یہ ہے کہ یقین و معرفت اور ذکر اللہ کی مجالس میں حاضری دے اور قصّہ گو لوگوں کی مجالس میں حاضر ہونے کی بجائے نماز میں مشغول ہونا زیادہ بہتر ہے۔

ذکر اللہ کی مجالس

حضرت ابوذرؓ سے حدیث مروی ہے:
"کسی علمی مجلس میں حاضر ہونا ایک ہزار رکعت (نفل) سے بہتر ہے۔"
ایک دوسری حدیث میں آتا ہے،
"تم میں سے کوئی آدمی علم کی بات سیکھے یا کسی کو سکھائے۔ اس کے لیے یہ بات ایک ہزار رکعت پڑھنے سے بہتر ہے۔" اور ایک حدیث میں آتا ہے کہ
عرض کیا گیا: "اے اللہ کے رسولؐ! کیا قرآن کی تلاوت سے بھی؟"
آپؐ نے فرمایا:
" اور کیا قرآن، علم کے بغیر نفع دیتا ہے؟"
اور جب اللہ کے دین کی علمی مجالس ختم ہو جائیں اور اللہ کے دین کی فقاہت کی مجالس مفقود ہو جائیں تو اس صورت میں قصّہ گو لوگوں کی مجالس میں شرکت سے نماز پڑھنا بہتر ہے۔ اس لیے کہ صحابہؓ کے نزدیک قصہ گوئی بدعت تھی۔ اور وہ قصّہ گو لوگوں کو مسجد سے نکال باہر کیا کرتے۔

مسجد میں قصّہ گوئی حرام ہے

منقول ہے کہ
ایک روز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ مسجد میں اپنے جائے نشست میں آئے تو وہاں ایک قصّہ گو بیٹھا قصّے بیان کر رہا تھا۔ انہوں نے فرمایا:
"میری جگہ سے اٹھو۔"
اس نے کہا:
"میں نہیں اٹھوں گا۔ میں یہاں بیٹھا ہوں یا (یہ کہا) کہ میں یہاں پہلے آکر بیٹھا ہوں۔"
راوی بتاتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ نے پولیس والے کو بلا کر اسے اٹھا دیا۔ اب اگر (مسجد میں قصّہ گوئی) مسنون ہوتی تو حضرت ابن عمر اسے اس جگہ سے نہ اٹھاتے۔ حالاں کہ وہ سبقت کر کے اس جگہ بیٹھا ہوا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت بھی ہے کہ:

"تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو اس کی جگہ سے اٹھا کر اس کی جگہ پر نہ بیٹھے بلکہ وسعت اور کشادگی اختیار کرو۔"

راوی بتاتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ کی بھی عادت تھی کہ جب کوئی آدمی ایک جگہ سے اٹھتا تو وہاں پر نہ بیٹھتے۔ آخر وہ خود واپس آکر اس جگہ بیٹھ جاتا۔

ایک روایت میں ہے کہ:

"پھر وہ وہاں آکر بیٹھ جاتا۔"

منقول ہے کہ:

ایک قصہ گو حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے پاس آکر بیٹھ جاتا۔ حضرت عائشہؓ نے حضرت ابن عمرؓ کی طرف پیغام بھیجا کہ اس قصہ گو نے مجھے بہت ایذا دی اور تسبیحات میں رکاوٹ بن رہا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے آکر اسے اس قدر مارا کہ اس پر لاٹھی توڑ دی۔ پھر اسے وہاں سے بھگا دیا۔

اس کے علاوہ نمازی کے سامنے سے نہ گزرے اگرچہ اس کے گزرنے سے اس کی نماز منقطع نہ ہوتی ہو۔ اس لیے کہ حدیث میں آتا ہے:

"چالیس برس ٹھہرے رہنا، نمازی کے سامنے سے گزرنے سے بہتر ہے۔" اور اس کے بارے میں سخت وعید آئی ہے۔ فرمایا:

"آدمی کے لیے یہ بہتر ہے کہ وہ راکھ ہو جائے اور ہوائیں اسے اڑا دیں (یہ بات) نمازی کے سامنے سے گزرنے سے (بہتر ہے)۔"

اور وعید میں گزرنے والے اور نمازی دونوں کو برابر بتایا۔ چنانچہ حضرت زید بن خالد جہنیؓ کی حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اگر نمازی کے سامنے سے گزرنے والا اور نمازی یہ جانتے کہ دونوں پر کس قدر (بوجھ) ہے تو اس کے سامنے سے گزرنے سے اس کے لیے چالیس برس کھڑے رہنا بہتر تھا۔"

نمازی کو چاہیے کہ وہ ستون یا دیوار کے قریب ہو کر نماز پڑھے اور اس صورت میں کسی کو سامنے سے گزرنے نہ دے اور استطاعت کے مطابق اس کو ہٹائے رکھے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی سعید خدریؓ نے اپنے والد ماجدؓ سے روایت کیا کہ "اگر (سامنے سے گزرنے والا) انکار کرے (اور گزرنے پر اصرار کرے) تو اس سے جنگ کرے۔ اس لیے

کہ وہ شیطان ہے"۔

حضرت ابوسعیدؓ سامنے سے گزرنے والے کو ہٹاتے۔ حتیٰ کہ اسے گرا دیتے تھے۔ گاہے ایک آدمی سے چمٹ جاتے تو وہ مروان سے مدد چاہتا۔ تو اسے بتاتے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اس بات کا حکم دیا ہے اور اگر کوئی ستون وغیرہ نہ ملے تو سامنے کوئی ایسی چیز رکھ لے کہ جس کی لمبائی ایک گز ہو۔ ایک قول کے مطابق رسّی ہو تو بھی وہ نمازی اور گذرنے والے کے درمیان آڑ بن جاتی ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ چار باتیں جفاء کی ہیں:

۱۔ کھڑے ہو کر انسان کا پیشاب کرنا۔

۲۔ دوسری صف میں نماز پڑھنا اور پہلی صف کو خالی چھوڑ دینا۔

۳۔ نماز کے اندر پیشانی کو رگڑنا۔

۴۔ اور ایسے راستہ پر نماز پڑھنا جو عام گذرگاہ ہو۔

خطبہ میں کلام نہ کرے

حضرت حسنؓ فرمایا کرتے:

"جو لوگ جمعہ کے روز جامع مسجد کے دروازہ کے پاس بیٹھتے ہیں ان کی گردنیں پھلانگو۔ ان کا کوئی احترام نہیں"۔ مسجد میں جا کر امام کے پاس بیٹھنا چاہیے اور خاموش بیٹھ کر خطبہ سُنے اور قبلہ رُخ ہو کر بیٹھے۔ یہی سنّت ہے۔ البتہ اگر حکمران سے کسی غلط بات سننے کا ڈر ہو یا کوئی غلط بات دیکھنے کا خطرہ ہو اور اس میں تغیّر پیدا کرنے کی ہمت بھی نہ ہو مثلاً حکمران ریشمی لباس پہنے ہو یا بھاری اسلحہ پہن کر نماز پڑھے تو اس صورت میں امام سے دُور رہے۔ اس میں سلامتی ہے اور کوئی لغو حرکت نہ کرے۔ امام کے خطبہ کے دوران چاہے دُور ہو کوئی کلام نہ کرے اور باتیں کرنے والوں کی مجلس میں نہ بیٹھے جبکہ امام خطبہ دے رہا ہو اور دُوسرے آدمی کو یہ بھی نہ کہے کہ:

"خاموش ہو جا"۔

البتہ اسے خاموش رہنے کے لیے اشارہ کر دے یا ایک کنکر مار دے۔ اور اگر اس نے خطبہ کی حالت میں کوئی لغو حرکت کی تو اس کا جمعہ باطل ہو گیا اور خطبہ کے دوران کوئی علمی بات بھی نہ کرے اور جو آدمی امام کے قریب نہ ہو اور نہ ہی خطبہ کی آواز اس تک پہنچتی ہو تو وہ چاہے دُور رہے مگر خاموش رہے۔ یہی مستحب ہے۔

حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ

"جو آدمی سُنے اور خاموش رہے۔ اس کے لیے دو اجر ہیں اور جو نہ سُنے اور خاموش رہے اس کے لیے ایک اجر ہے اور جو سنے مگر لغو حرکت کرے۔ اس پر دو وزر (گناہ) ہیں اور جو نہ سُنے اور لغو حرکت کرے۔ اس پر ایک گناہ ہے"۔

حضرت ابو ذرؓ کی حدیث میں ہے :

"جب انہوں نے حضرت ابیؓ سے دریافت کیا کہ یہ سورت کب نازل ہوئی۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے تو (حضرت ابیؓ) نے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم منبر سے اترے تو حضرت ابیؓ نے (حضرت ابو ذرؓ) سے کہا، "جاؤ تمہارا کوئی جمعہ نہیں"۔

حضرت ابو ذرؓ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی۔ آپؐ نے فرمایا :

"ابیؓ نے سچ کہا"۔

اور حدیث میں اس طرح آتا ہے کہ :

"جو آدمی اپنے ساتھی سے کہے۔ خاموش ہو یا چپ، اور امام خطبہ دے رہا ہو۔ اس نے بھی لغو حرکت کی۔ اور جس نے لغو حرکت کی اور امام خطبہ دے رہا تھا، اس کا کوئی جمعہ نہیں"۔ اور جب امام کے سامنے اذان دینے کے لیے مؤذن کھڑا ہو تو اس وقت ہر نماز ختم کر دے۔

نماز کے مکروہ اوقات

حضرت ابو اسحاقؓ نے حضرت حارثؓ سے اور انہوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہم سے روایت کیا :

"چار اوقات میں نماز (نفل) مکروہ ہے :

۱۔ فجر کے بعد۔

۲۔ عصر کے بعد۔

۳۔ دوپہر کے وقت (ہر نماز مکروہ ہے)

۴۔ اور جب امام خطبہ دے رہا ہو اس وقت بھی (ہر) نماز مکروہ ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ

"امام کا نکلنا نماز کو منقطع کرتا ہے اور اس کا کلام (خطبہ) ہر کلام کو منقطع کرتا ہے"۔

اور خطبہ سے پہلے اذان کے لیے جب مؤذن کھڑا ہوتا ہے اس وقت عوام میں جو سجدہ کا رواج ہے

یہ سنت نہیں ہے اور اگر اس وقت وہ نماز میں تھا اور نماز کا سجدہ اس وقت میں آگیا یا سجدہ تلاوت اس وقت میں آگیا تو اس میں کوئی حرج نہیں ۔ اس وقت وہ دعا کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ یہ فضیلت کا وقت ہے مگر اس کے بارے میں کوئی حدیث منقول نہیں۔ البتہ اسے مباح کہا جا سکتا ہے۔

امام کے قریب یا دور رہے؟

بعض علماء کے نزدیک مقصورہ (سجدہ کے الگ حجرہ) میں نماز مکروہ ہے۔ اس لیے کہ یہ صرف بادشاہ اور اس کے حواریوں کے لیے مقرر ہوتا ہے اور اہل تقویٰ کے نزدیک مساجد میں یہ بدعت کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس لیے کہ یہ کمرے سب لوگوں کے لیے کھلے نہیں ہوتے۔ مروی ہے کہ:

"حضرت حسنؓ اور حضرت بکر مزنیؒ ان مقصورات میں نماز نہ پڑھتے۔"

انہوں نے یہ بھی نقل کیا کہ

"میں نے انسؓ بن مالک اور عمران بن حصینؓ کو مقصورہ میں نماز پڑھتے دیکھا۔" اور بعض کے نزدیک یہ مکروہ نہیں ہے۔ البتہ مقصورہ بیٹھ کر انسان امام کے قریب ہوتا ہے اور خطبہ خوب سن سکتا ہے، تو سنت کے باعث اس میں فضیلت پائی جاتی ہے اور اگر یہ مقصورہ عوام کے لیے کھل جائے تو کراہت بھی ختم ہو جائے گی۔ اور اگر سلطان کے حواریوں کے لیے مخصوص ہو تو انہیں کے لیے رہنے دیا جائے۔ اس لیے کہ بعض علمائے منبر کے اردگرد کی جگہ میں نماز پڑھنا مکروہ بتایا قبل اس کے کہ منبر صفوں کو قطع کرے اور ان کے نزدیک صفوں کا فنائے منبر تک بڑھانا بدعت تھا۔

حضرت ثوریؒ فرماتے تھے:

"منبر کے سامنے کی پہلی صف خارج ہے۔ اور جو آدمی امام کے قرب کے باعث کوئی فتنہ محسوس کرے اسے ڈر ہو کہ حاکم ایسی بات کرے گا جس کا انکار لازم ہوگا یا وزنی اسلحہ پہن کر نماز پڑھے گا اور قریب کی صفوں میں اسے زیادہ اطمینان خاطر ہو، لوگوں کی کثرت سے دُور رہنے پر اسے زیادہ سکون ملے اور لوگوں کو نہ دیکھنے پر اسے زیادہ سکون و جمعیتِ خاطر نصیب ہو تو یہ صورت زیادہ افضل ہے۔

علماء کرام اور عبّاد عظام کی ایک جماعت سلامتی کی خاطر آخری صفوں میں نماز پڑھا کرتے تھے۔

حضرت بشرؒ بن حارث سے پوچھا گیا،

"ہم دیکھتے ہیں کہ آپ جمعہ کے روز سویرے سویرے آتے ہیں مگر آخری صفوں میں نماز پڑھتے ہیں؟" انہوں نے فرمایا:

"اے بھائی! ہم دلوں کا قُرب چاہتے ہیں اجسام کا قرب نہیں مانگتے۔"

حضرت سفیان ثوریؒ نے حضرت شعیب بن حرب کو منبر کے پاس بیٹھے ابو جعفر کا خطبہ سنتے دیکھا۔ نماز کے بعد جب ملاقات ہوئی تو فرمایا:

" اس آدمی کے تیرے قریب ہونے سے میرا دل اس میں مشغول رہا۔ کیا تجھے اطمینان ہے کہ تو اس کا کوئی ایسا کلام سنے جس پر انکار لازم ہو، اور یہ کام کر سکے؟ پھر بتایا کہ دیکھو اس نے سیاہ لباس کی (بدعت) جاری کی۔ میں نے عرض کیا:

" اے ابو عبداللہ! کیا حدیث میں یہ نہیں آتا؟ کہ

" قریب ہو جاؤ اور سنو!"

انھوں نے فرمایا:

" یہ حکم خلفائے راشدین مہدیین کے بارے میں ہے اور یہ لوگ ایسے ہیں کہ تم ان سے جس قدر دور رہو گے اور ان کی طرف نہیں دیکھو گے اس قدر تم اللہ عزوجل کے قریب ہو گے۔"

حضرت ابو الدرداؓ سے بھی آخری صف کی فضیلت منقول ہے۔

حضرت سعید بن عامرؓ فرماتے ہیں: " میں نے ان کے پہلو میں نماز پڑھی وہ پچھلی صفوں کی طرف ہٹنے لگے۔ آخر کار ہم آخری صف میں پہنچ گئے۔ جب ہم نماز پڑھ چکے تو میں نے عرض کیا: کیا یہ مسئلہ نہیں ہے کہ بہترین صف، پہلی صف ہے؟"

فرمایا:

" ہاں! مگر یہ امت تمام امتوں میں مرحوم و منظور ہے (اس پر رحمت ہوتی ہے اور اس پر نظر کرم ہوتی ہے) اور جب اللہ عزوجل اپنے بندوں کو حالتِ نماز میں دیکھتا ہے تو آخری صف تک سب کو بخشش دیتا ہے چنانچہ میں اس امید میں پیچھے ہٹا کہ جن کی طرف اللہ کی نظر ہو گی۔ ان میں سے کسی ایک کے صدقہ میری بخشش بھی ہو جائے گی۔"

بعض روایت نے اسے مرفوع بیان کیا کہ حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔

جمعہ کے روز صدقہ افضل ہے

اور جمعہ کے روز صدقہ کرنا مستحب اور فضیلت کی بات ہے۔ اس کا کئی گنا اجر ملتا ہے۔ البتہ اگر امام خطبہ دے رہا ہو اس کا وقت کوئی سوال کرے تو نہ دے اس لیے کہ خطبہ کے دوران کلام کرنا مکروہ ہے۔ حضرت صالحؒ بن احمد فرماتے ہیں:

"ایک روز امام کے خطبہ کے دوران مسجد میں ایک آدمی نے سوال کیا۔ وہ میرے والد کے پہلو میں تھا۔ ایک آدمی نے (میرے والد) کو ایک ٹکڑا دیا کہ اس فقیر کو دے دے۔ اس لیے وہ فقیر کو پہچانتا نہیں تھا (کہ کہاں ہے؟) مگر میرے والد نے نہیں پکڑا۔

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا:

"جو آدمی مسجد میں مانگے وہ اس کا مستحق ہے کہ اُسے نہ دیا جائے اور اگر قرآن (پڑھ کر) مانگے تو اسے مت دو۔"

بعض علماء کے نزدیک جامع مسجد میں اس طرح سوال کرنا مکروہ ہے کہ لوگوں کی گردنیں پھلانگتا پھرے۔ ہاں اگر کھڑے ہو کر مسلمانوں پر سے پھلانگے بغیر مانگے یا کسی ایک جگہ بیٹھ کر مانگے تو کراہت نہیں۔

ایک بابرکت نماز صدقہ

حضرت کعبؓ احبار سے منقول ہے:

"جو آدمی جمعہ میں حاضر ہو پھر واپس جا کر دو مختلف چیزوں کا صدقہ کرے۔ پھر دوبارہ واپس آ کر دو نفل پڑھے۔ ان کے رکوع، خشوع اور سجود مکمل ہوں۔ پھر یہ دعا کرے:۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ بِاسْمِكَ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وَ بِاسْمِكَ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ۔

(اے اللہ! میں تیرے نام سے، اللہ رحمٰن رحیم کے نام سے اور تیرے اس نام سے سوال کرتا ہوں کہ جو، اس کے بغیر کوئی معبود نہیں۔ وہی زندہ قایم رکھنے والا ہے اُسے نہ اُونگھ آتی ہے نہ نیند)

یہ دعا پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے جو مانگے گا اللہ تعالیٰ اسے عطا فرمائے گا۔

بعض سلفؒ سے اس کا دُوسرا طریقہ منقول ہے، فرمایا:

"جو آدمی جمعہ کے روز کسی مسکین کو کھانا کھلائے، پھر صبح سویرے جامع مسجد میں جائے اور کسی کو ایذاء نہ دے۔ پھر جب امام سلام پھیرے تو یہ دعا کرے:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ بِبِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ اَنْ تَغْفِرَلِیْ وَ تَرْحَمَنِیْ وَ اَنْ تُعَافِیَنِیْ مِنَ النَّارِ۔

(اے اللہ! میں تجھ سے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، حی قیوم کے وسیلہ سے مانگتا ہوں کہ مجھے بخش دے اور مجھ پر رحم فرما اور مجھے آگ سے عافیت فرما)

اس کے بعد جو دعا کرے قبول ہو گی۔

اور اگر امام کی قرأت سن رہا ہو تو سورۃ الحمد کے بغیر کچھ نہ پڑھے۔ اور اگر امام کی قرأت کی آواز نہ سُنے

تو الحمد کے ساتھ چاہے تو سورت پڑھ لے۔ اور جو آدمی امام کی قرأت سن رہا ہو۔ پھر بھی وہ (الحمد کے) ساتھ ساتھ سورۃ الجمعہ یا کوئی اور سورت پڑھے تو اس نے امت کی مخالفت کی اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کی اور مسلمانوں میں سے کوئی اس کی اجازت دینے والا مذہب میں نہیں جانتا۔

نماز کے بعد کے اوراد

جب امام نمازِ جمعہ کا سلام پھیرے تو اس طرح پاؤں بچھائے بیٹھا رہے اور اس حالت میں کلام کرنے سے پہلے سات بار سورۃ الحمد، سات بار قل ہو اللہ احد اور سات سات بار معوذتین (یعنی سورۃ الفلق اور سورۃ الناس) پڑھے۔

بعض اسلاف ؒ سے منقول ہے کہ جو آدمی یہ ورد رکھے گا وہ اس جمعہ سے دوسرے جمعہ تک حفاظت میں رہے گا اور اسے شیطان سے تحفظ حاصل رہے گا۔ مستحب یہ ہے کہ نمازِ جمعہ کے بعد یہ دعا کرے:

اَللّٰھُمَّ یَا غَنِیُّ یَا حَمِیْدُ یَا مُبْدِئُ یَا مُعِیْدُ یَا رَحِیْمُ یَا وَدُوْدُ اَغْنِنِیْ بِحَلَالِکَ مِنْ حَرَامِکَ وَ بِفَضْلِکَ عَمَّنْ سِوَاکَ۔

(اے غنی، اے حمید، اے پیدا کرنے والے (ابتدا سے)، اے دوبارہ لانے والے، اے رحم کرنے والے، اے بہت محبت کرنے والے، مجھے اپنے حلال کے ذریعے حرام سے اور اپنے فضل کے ذریعہ اپنے سے علاوہ سے بے پرواہ کر دے)

مروی ہے کہ جو آدمی اس پر دوام کرے گا اللہ تعالیٰ اسے مخلوق سے مستغنی فرما دے گا اور وہاں سے روزی دے گا کہ جہاں سے اس کا گمان بھی نہیں ہو گا۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے روایت کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم (نمازِ جمعہ) کے بعد چار رکعتیں پڑھتے۔

اس طرح اگر انسان چھ رکعتیں پڑھے تو تمام روایات اس میں آ گئیں اور مسجد میں پینے یا دوسرے مقصد کے لیے پانی فروخت کرنا مکروہ ہے تا کہ مسجد میں دکانداری شروع نہ ہو جائے اس لیے کہ مسجد میں خرید و فروخت مکروہ ہے اور اگر مسجد سے باہر بیع ہوئی یا مسجد سے باہر ٹکڑا دیا اور پھر مسجد میں آ کر پیا یا بہایا تو کچھ حرج نہیں۔ بعض اسلاف ؒ سے جامع مسجد کے ملحقہ میدان میں نماز کی کراہت آتی ہے۔ (جو کہ دنیاوی باتیں کرنے کے لیے بنایا گیا ہوتا ہے)

ایک صحابی لوگوں کو مار کر اس ملحقہ میدان سے ہٹاتے اور فرماتے کہ اس میدان (رحاب) میں نماز جائز ہے۔ میرے نزدیک اس کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ اگر جامع مسجد کے زاید حصّوں میں یہ ملحقہ میدان ہو جو جامع مسجد کی بڑی دیوار کے متصل صفوں سے ملحق ہو تو وہاں نماز جائز ہے جیسے کہ اس کے وسط میں کوئی کراہت نہیں۔

۲۔ اور اگر جامع مسجد کی بڑی دیوار سے جُدا میدانوں میں یہ واقع ہو تو مکروہ ہے۔

اسی طرح جامع مسجد کے قریب واقع راستوں پر نماز مکروہ ہے۔ اس لیے کہ وہ جامع مسجد کی صفوف سے متصل نہیں ہیں بلکہ ان کے اور صفوں کے درمیان راستہ یا بُعد کی آڑ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ وہاں نماز جائز نہیں۔ اب جس نے رحاب (ملحقہ میدان) میں نماز کی کراہت بتائی۔ اس کی یہی مراد ہے۔

نمازِ جمعہ کے بعد

جب نمازِ جمعہ سے فارغ ہو جائیں تو اللہ کی زمین اللہ تعالیٰ کے فضل کی تلاش میں پھیل جائیں۔ علم پڑھنا اور علمِ دین کے مسائل سننا اللہ تعالیٰ کا فضل ہے عالم اور طالبِ علم کے لیے اس دن کو یوم المزید کا نام دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ وَكَانَ فَضْلُ اللهِ عَلَيْكَ عَظِيماً۔

(اور تجھے سکھایا جو تو نہیں جانتا تھا اور تجھ پر اللہ کا بڑا فضل ہے)

ایک جگہ فرمایا:

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ مِنَّا فَضْلاً۔

(اور بے شک ہم نے داؤد کو اپنی جانب سے فضل عطا فرمایا)

اس سے مراد علمِ دین ہے۔ چنانچہ دوسری آیت میں اس کی وضاحت کر دی۔

وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْماً وَقَالَا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي فَضَّلَنَا۔

(اور البتہ بے شک ہم نے داؤد اور سلیمان کو علم عطا کیا اور دونوں نے کہا سب حمد اللہ کی ہے جس نے ہم پر فضل فرمایا)

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللهِ۔

(سو جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو)

تو فرمایا کہ اس سے مراد دنیا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ مریض کی عیادت کرو۔ جنازہ میں شریک ہو جاؤ، علم حاصل کرو۔ اللہ عزوجل کی خاطر اپنے کسی بھائی سے ملاقات کرو۔ اس لیے کہ جمعہ کے روز علم حاصل کرنا، لوگوں کو علم سکھانا، انہیں نصیحت کرنا اور اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینا

سب سے افضل کام ہے اور تمام ایام کے مقابلہ میں اس دن کی زیادہ فضیلت ہے۔ اس لیے کہ یہ یوم المزید ہے۔ اس دن دلوں میں زیادہ توجہ، انابت اور اشتیاق ہوتا ہے۔ اور جمعہ کے روز مجالس ذکر میں حاضر ہونا قصہ گوئی کی مجالس میں جانے سے زیادہ افضل ہے اور اجر و ثواب میں سننے والا بھی قائل کے ساتھ شریک ہوتا ہے۔ ایک قول کے مطابق وہ رحمت سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

جمعہ کے دن خاص طور پر علماء کے نزدیک قصہ گو لوگوں کے پاس بیٹھنا مکروہ ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ پہلی اور دوسری ساعت میں جامع مسجد میں حاضری سے رکاوٹ ہوتے ہیں۔ حالانکہ ان ساعتوں کے بارے میں بہت فضیلت آتی ہے اور اگر جمعہ کے روز صبح کے وقت یا جمعہ کے بعد کوئی ایسا عالمِ دین مل جائے کہ جس کی مجلس میں جا کر ذکر اللہ اور زہد کی باتیں سن سکے تو وہاں حاضر ہو۔ اس لیے کہ بندہ ہر وقت علمِ دین حاصل کرنے کا محتاج رہتا ہے اور ایسی مجالس میں شرکت افضل عمل ہے۔ جمعہ کے روز مساجد میں علماء کی مجالس علم و ذکر مسجدوں کی زینت ہیں۔

حضرت حسنؒ فرماتے ہیں۔

"مجالسِ علم کے سوا باقی دنیا اندھیرا ہے"۔

اور اگر ایسی مجلس نہ مل سکے تو عصر تک خود ہی ذکر اللہ کرے۔ یہ دن کا پانچواں ورد ہے۔

عصر کی نماز جامع مسجد میں پڑھنا مستحب ہے۔ ہاں اگر کوئی ضروری رکاوٹ ہو جائے تو الگ بات ہے اور اگر نمازِ عصر کے بعد غروبِ آفتاب تک وہیں بیٹھا ذکر اللہ میں مصروف رہے تو زیادہ ثواب ہے۔ ممکن ہے کہ آخری دن کی وہ ساعتِ اجابت اس وقت ہاتھ آجائے جب کہ وہ فتنہ، تصنع اور فضول کلامی سے محفوظ رہے۔

منقول ہے کہ

"جو جامع مسجد میں عصر کی نماز پڑھے اس کے لیے ایک حج کا ثواب ہے اور جو مغرب کی نماز باجماعت وہاں پڑھے اس کے لیے عمرہ کا ثواب ہے۔ اور یہاں کسی خطرے کا ڈر ہو یا تصنع یا فضول کلامی میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتے ہوئے گھر جاتے اور اللہ تعالیٰ کے انعامات و اکرامات پر غور کرے۔ چنانچہ اپنے گھر میں اذکار، تسبیح و استغفار میں مشغول رہے یا محلے کی مسجد میں ذکر کرتا رہے۔ یہ افضل عمل ہے۔

سلفؒ سے منقول ہے کہ

"جمعہ کے روز سب سے زیادہ ثواب وہی کماتا ہے کہ جو ایک روز پہلے سے ہی اس کا اہتمام کرے۔

اور سب سے کم نصیب وُہ ہے جو جمعہ کے روز صبح کے وقت یہ کہے ۔ آج کیا دن ہے ! بعض بزرگوں کا دستور تھا کہ جمعہ کی رات کو نمازِ جمعہ کے اہتمام کی خاطر جامع مسجد میں رہتے اور جمعہ کے یوم المزید کا اجر لینے کے لیے ہفتہ کی رات کو مسجد میں ٹھہرتے ۔ سلف صالحین میں یہ کثرت سے رواج تھا کہ جامع مسجد میں صبح کی نماز پڑھ کر وہیں بیٹھے اور ساعت اوّل میں مسجد میں آنے کا ثواب لینے کی خاطر نمازِ جمعہ تک نماز کا انتظار کرتے اور ختمِ قرآن کے باعث بھی ایسا کرتے اور عام لوگ صبح کی نماز محلے کی مساجد میں پڑھ کر جامع مسجد کا رُخ کرتے ۔

منقول ہے کہ عہدِ اسلام میں پہلی بدعت یہ جاری ہُوئی کہ لوگوں نے جامع مساجد میں اول ساعت میں جانا ترک کر دیا ۔ راوی بتاتے ہیں کہ تم دیکھتے تھے ۔ جمعہ کے روز سحری کے وقت اور نمازِ فجر کے بعد اس کثرت سے جامع مسجد کی طرف جاتے کہ راستے لوگوں سے بھر جاتے اور راستوں پر جانے والوں کا ازدحام ہو جاتا ۔ جیسے کہ آجکل تم عید کے مواقع پر دیکھتے ہو ۔ آخر یہ بات ختم ہُوئی ، کم ہُوئی ، پھر جہالت آئی اور یہ کارِ خیر متروک ہو کر رہ گیا ۔ کیا اہلِ ایمان کو اس بات سے شرم نہیں آتی کہ ان کے جامع مساجد میں آنے سے پہلے ذمی کفار گرجاؤں میں جاتے ہیں یا اس سے عبرت حاصل نہیں کرتے کہ بیچنے والے رحاب (ملحقہ میدان) میں اپنے مولیٰ اور آخرت کی طرف جانے سے پہلے دُنیا اور لوگوں کی طرف جاتے ہیں ۔ مناسب تو یہ تھا کہ وہ اپنے آقا کی طرف تیزی سے جاتا اور اس کا قرب حاصل کرنے میں جلدی کرتا ۔

جمعہ کو ذکر اللہ سے معمور رکھو

مومن کے لیے جمعہ کا روز اور اد و اعمال کے اعتبار سے یوم المزید ہونا چاہیے ۔ اسے چاہیے کہ اس روز دنیا کے کاموں سے فراغت حاصل کرے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے اور اسے آخری دن تصور کرے ۔ گویا ہفتہ آئے گا ہی نہیں ۔ اب جمعہ کے دن کو ہفتہ کے دن کی طرح دنیا کی تجارت اور کاروبار کا دن قرار نہ دے ۔ جمعرات سے ہی جمعہ کے دن کے لیے دنیاوی امور کا اہتمام کرنا بہت ہی بُری اور کمینہ حرکت ہے ۔ یعنی اچھے اچھے کھانوں اور سیر و تفریح کا اہتمام کرنا بہت لغو بات ہے ۔ اہلِ بیت کے طریق سے ایک حدیث آتی ہے جو محلِ نظر ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

۔ " میری اُمت پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ وُہ جمعہ کی خاطر جمعرات کے روز ہی دنیاوی امور کا اہتمام کریں گے ۔ جیسے کہ یہودی جمعہ کے روز ہفتہ کے لیے اہتمام کرتے ہیں " ۔

اور مومن وہ ہیں جو کہ جمعہ کے روز اورادِ حسنہ کے ذریعہ آخرت کی تیاری کرتے ہیں اور اورادِ متصلہ کے ذریعہ اسے زیادہ (اوراد) کا اہتمام کرتے ہیں ۔ (یوم المزید بنا لیتے ہیں)

حضرت ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:
"جو دنیا میں ان ایام میں فرحت حاصل کرے، وہ آخرت میں فرحت حاصل نہ کرے گا۔ ان میں سے جمعہ کا روز بھی ہے۔" نیز فرمایا:
"جمعہ کا دن آخرت میں سے ہے۔ یہ دنیا سے نہیں ہے۔" نیز فرمایا:
"جمعہ کا دن آخرت کا دن ہے یہ دنیا کے (ایام) میں سے نہیں"۔
بعض بزرگوں کا فرمان ہے:
"اگر جمعہ کا دن نہ ہوتا تو مجھے دنیا میں رہنا پسند نہ ہوتا"۔
خواص کے ہاں یہ علوم و انوار اور خدمت و اذکار کا دن ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کے پیش نظر یہ دن یوم المزید ہے۔
حضرت مجاہدؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے غریب (سند) کے ساتھ روایت کیا، کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جمعہ کے روز اپنے کام چھوڑ دو، اس لیے کہ یہ نماز و تہجد کا دن ہے"۔
حضرت جعفر صادقؓ سے مروی ہے:
"جمعہ کے روز کوئی سفر نہیں (کرنا چاہیے)"۔
اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ۔
(اور اللہ کا فضل (یعنی علم و ذکر) تلاش کرو)
جمعہ کے روز ہم نے جو سورتیں، نمازیں، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف اور دیگر اذکار بتائے ہیں۔ یہ جمعہ کی رات سے شروع کر دینے چاہئیں۔ اس لیے کہ یہ تمام راتوں سے افضل ہوتی ہے۔ اب جس سے ہو سکے وہ ضرور یہ کام کرے۔ ایک طالب صادق ہر وقت اللہ تعالیٰ کے فضل و مزید احسان کا متلاشی رہتا ہے اور اگر اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرے تو اس کے افضل اوقات کو افضل عبادات سے معمور بنا دیتا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے نفرت کرے تو اس کے افضل اوقات کو بدترین اعمال میں لگا دیتا ہے تاکہ اس کی سزا زیادہ ہو اور اس کا غضب تیز ہو جائے اس لیے کہ اس نے وقت کی قدر نہ کی اور اسے برباد کر دیا۔

جمعہ کے دن چار کام کرے

جمعہ کے روز جو اذکار و اوراد مخصوص ہیں ان کی چار اقسام ہیں:

ا۔ چالیس اسماءِ الٰہی پڑھے۔ ان کے وسیلہ سے حضرت ادریس علیٰ نبینا و علیہ الصّلوٰۃ والسلام نے دُعا کی اللہ تعالیٰ نے اسے تخصیص سے یہ اسمائے عطا فرمائے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیٰ نبیّنا و علیہ الصلوٰۃ والسّلام نے ان کے ذریعہ دعا کی اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان اسماء کے ذریعہ دعا کی۔

۲۔ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ بہت زاہد بزرگ تھے۔ وہ ہر جمعہ کے روز صبح و شام دس دس بار ان اسماء کو پڑھ کر دعا کیا کرتے۔ یہ اُن کا ہر جمعہ کو معمول تھا۔

۳۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ انھوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا:

"بے شک اللہ تعالیٰ ہر دن اور رات میں اپنے آپ کی تمجید بیان فرماتا ہے"۔

۴۔ تسبیحات ابی المعتمر پڑھے ان کا نام سلیمان تیمی تھا۔ انہوں نے ایک شہید کو قتل ہونے کے بعد خواب میں دیکھا تو پوچھا:

"تو نے وہاں پر تمام اعمال سے افضل ترین عمل کونسا دیکھا؟"

نمبر ۳ اور نمبر ۴ - یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے آپ کی تمجید بیان کرنا اور تسبیحات ابی المعتمر ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں۔ وہاں سے دیکھ لیا جائے۔ ہم نے انہیں شروع کتاب میں بیان کر دیا ہے کہ جہاں نمازِ فجر کے بعد اور غروبِ آفتاب سے پہلے کی دعائیں لکھی ہیں۔ اب ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ اور نمبر ا اور نمبر ۲ کو ہم یہاں پر تفصیل سے ذکر کر دیتے ہیں۔

حضرت ادریس علیہ السّلام کی دُعا

حسن بن یحییٰ شاہد نے بتایا، انھیں قاسم بن داؤد قراطیسی نے، انھیں عبداللہ بن محمد قرشی نے، انھیں محمد بن سعید موذن نے، انھیں سلام طویل نے بتایا اور انھوں نے حضرت حسن بصریؒ سے روایت کیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ادریس علیٰ نبیّنا و علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کو اپنی قوم کی طرف مبعوث کیا تو یہ اسماء سکھائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی اور (فرمایا) انہیں مخفی طور پر پڑھنا اور قوم کے لیے ظاہر نہ کرنا۔ وہ مجھ سے ان کے وسیلہ سے دعا کرنے لگیں گے۔ راوی بتاتے ہیں کہ پھر (حضرت ادریس علیہ السلام) نے ان کے وسیلہ سے دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا درجہ بلند فرما دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ اسماء حضرت موسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصّلوٰۃ والسلام کو سکھائے۔ اس کے بعد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ

اسمار سکھائے اور آپؐ نے غزوۂ احزاب میں ان کے وسیلہ سے دعا کی۔

حضرت حسنؓ نے فرمایا:

"میں حجاج سے چھپا ہوا تھا۔ چنانچہ میں نے اُن کے ذریعہ دعا کی اور اللہ تعالیٰ نے اسے مجھ سے ہٹا دیا۔ چھ بار میرے پکڑنے کے لیے آئے اور میں نے اللہ عزوجل سے اُن کے ذریعہ دُعا کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بینائی ہی کو کام نہیں کرنے دیا۔ چنانچہ تمام گناہوں کی بخشش کے لیے ان اسمار کے ذریعہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرو۔ پھر آخرت اور دنیا کی حاجات مانگو۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ تمام حاجات پُوری ہونگی۔

ان اسمار کی تعداد ایامِ توبہ کے مطابق چالیس ہے۔

دعائے ادریس علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام حسب ذیل ہے:

سُبْحَانَكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ يَا رَبَّ كُلِّ شَيْءٍ وَ وَارِثَهٗ وَ رَاحِمَهٗ يَا اِلٰهَ الْاٰلِهَةِ الرَّفِيْعِ جَلَالُهٗ ، يَا اَللّٰهُ الْمَحْمُوْدُ فِيْ كُلِّ فَعَالِهٖ ، يَا رَحْمٰنَ كُلِّ شَيْءٍ وَ رَاحِمَهٗ يَا حَيُّ حِيْنَ لَا حَيَّ فِيْ دَيْمُوْمَةِ مُلْكِهٖ وَ بَقَائِهٖ ، يَا قَيُّوْمُ فَلَا يَفُوْتُ شَيْءٌ مِنْ عِلْمِهٖ وَ لَا يَئُوْدُهٗ يَا وَاحِدُ الْبَاقِيْ فِيْ اَوَّلِ كُلِّ شَيْءٍ وَ آخِرِهٖ ، يَا دَائِمُ فَلَا فَنَاءَ وَ لَا زَوَالَ لِمُلْكِهٖ يَا صَمَدُ مِنْ غَيْرِ شَبِيْهٍ وَ لَا شَيْءَ كَمِثْلِهٖ ، يَا بَارِئُ فَلَا شَيْءَ كُفُوُهٗ وَ لَا مَكَانَ لِوَصْفِهٖ ، يَا كَبِيْرُ اَنْتَ الَّذِيْ لَا تَهْتَدِي الْقُلُوْبُ لِوَصْفِ عَظَمَتِهٖ يَا بَارِئَ النُّفُوْسِ بِلَا مِثَالٍ خَلَا مِنْ غَيْرِهٖ ، يَا زَاكِيُ الطَّاهِرُ مِنْ كُلِّ آفَةٍ تَقَدَّسَهٗ ، يَا كَافِي الْمُوَسِّعُ لِمَا

پاک ہے تو تیرے بغیر کوئی معبود نہیں، اے ہر چیز کے رب اور وارث اور رحم کرنے والے، اے بڑے خدا جس کا جلال بلند ہے، اے اللہ ہر کام میں حمد والا ہے۔ اے ہر چیز پر انتہائی رحم کرنے والے اور کرم کرنے والے، اے زندہ جبکہ کوئی زندہ نہیں اس کی سلطنت وبقا کے دوام میں، اے قائم رکھنے والے سو کوئی چیز اس کے علم سے نہیں چھوٹتی اور نہ ہی اسے اکتاتی ہے۔ اے ایک! باقی ہر چیز کی ابتدار و انتہار میں، اے دائم رہنے والے، سو اس کے ملک کے لیے فنا وزوال نہیں، اے بغیر مثال کے بے نیاز اور کوئی چیز اس کی مثل نہیں۔ اے پیدا کرنے والے! کوئی چیز اس کے برابر نہیں۔ اور (وصف میں لامقام ہے) اے بڑے تو وہ ذات ہے کہ اس کی عظمت کی توصیف کے لیے دلوں کو راہ نہیں، اے بغیر مثال کے نفوس پیدا کرنے والے۔ اپنے غیر سے خالی ہے، اے پاک کرنے والے، پاک ہر آفت سے اس کا تقدس دیا ہے، اے کفایت کرنے والے اور وسعت عطا کرنے والے

خَلَقَ مِنْ عَطَايَا فَضْلِهٖ ، يَا نَقِيًّا مِنْ
كُلِّ جَوْرٍ لَمْ يَرْضَهُ وَ لَمْ
يُخَالِطْهُ فَعَالُهُ ، يَا حَنَّانُ اَنْتَ
الَّذِيْ وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَحْمَةً وَّعِلْمًا ،
يَا مَنَّانُ ذَا الْاِحْسَانِ قَدْ كُلَّ عَمَّ
الْخَلَائِقَ مِنْهُ ، يَا دَيَّانَ الْعِبَادِ كُلٌّ
يَقُوْمُ خَاضِعًا لِرَهْبَتِهٖ ، يَا خَالِقَ مَنْ فِي
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ اِلَيْهِ مَعَادُهُ ، يَا
رَحِيْمَ كُلِّ صَرِيْخٍ وَ مَكْرُوْبٍ وَغِيَاثَهٗ
وَ مَعَاذَهٗ ، يَا تَامُّ فَلَا تَصِفُ الْاَلْسُنُ
كُلَّ جَلَالِ مُلْكِهٖ وَعِزِّهٖ ، يَا مُبْدِعَ
الْبَدَائِعِ لَمْ يَبْغِ فِيْ اِنْشَائِهَا
عَوْنًا مِنْ خَلْقِهٖ ، يَا عَلَّامَ الْغُيُوْبِ
فَلَا يَفُوْتُهُ شَيْءٌ مِنْ خَلْقِهٖ
وَ لَا يَؤُدُهُ ، يَا حَلِيْمُ ذَا الْاَنَاةِ
فَلَا يُعَادِلُهُ شَيْءٌ مِنْ خَلْقِهٖ ،
يَا مُعِيْدُ مَا اَفْنَاهُ اِذَا بَرَزَ
الْخَلَائِقُ لِدَعْوَتِهٖ مِنْ مَخَافَتِهٖ ،
يَا حَمِيْدُ الْفَعَّالُ ذَا الْمَنِّ عَلٰى جَمِيْعِ
خَلْقِهٖ بِلُطْفِهٖ ، يَا عَزِيْزُ الْمَنِيْعُ
الْغَالِبُ عَلٰى اَمْرِهٖ فَلَا شَيْءَ
يُعَادِلُهُ ، يَا قَاهِرُ ذَا الْبَطْشِ
الشَّدِيْدِ اَنْتَ الَّذِيْ لَا يُطَاقُ
اِنْتِقَامُهُ ، يَا قَرِيْبُ الْمُتَعَالِيْ فَوْقَ
كُلِّ شَيْءٍ عُلُوَّ ارْتِفَاعِهٖ ، يَا مُذِلَّ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيْدٍ

اپنی مخلوق کو اپنے فضل کے عطیات سے ، اے ہر ظلم
سے پاک ، اس سے راضی نہیں ہوا اور نہ ہی اس کے
کاموں میں اس کا اختلاط ہوا ، اے مہربان تو ہی وہ ہے
جو ہر چیز پر اپنی رحمت و علم سے وسیع ہوا ، اے احسان
کرنے والے ، احسان والے عام مخلوق اس کے بیان سے
گونگی ہو گئی ، اے بندوں پر غالب ہر ایک اس کے ڈر
سے عاجز کھڑا ہے ۔ اے زمین اور آسمان میں جو ہے
سب کے پیدا کرنے والے ، اور ہر ایک اس کی طرف
لوٹنے والا ہے ۔ اے ہر چلانے والے ، مصیبت زدہ
پر رحم کرنے والے ، اور اس کی فریاد اور جائے رجوع ،
اے کامل ، اس کے ملک و عزت کے جلال کے بیان سے
زبانیں قاصر رہ گئیں ۔ اے عجائبات کے خالق ، اس نے
اپنی مخلوق میں سے کسی سے ان کی پیدائش میں مدد نہیں
چاہی ، اے تمام غیبوں کے جاننے والے مخلوق کی
کوئی چیز اس سے نہیں چھوٹتی اور نہ ہی اسے اکتاتی ہے ،
اے بردبار   کوئی چیز مخلوق کی
اس کی برابری نہیں کر سکتی ، اے دوبارہ لانے والے ،
جس کو اس نے فنا نہیں جبکہ اس کے خوف سے اس کے
بلاوے پر مخلوق ظاہر ہوئی ۔ اے اچھے کاموں والے
اے تمام مخلوق پر اپنے لطف و کرم سے احسان کرنیوالے ،
اے غالب عزیز اور سب سے زیادہ قوت والے اپنے
حکم پر ، کوئی چیز اس کے برابر نہیں ، اے غالب سخت
گرفت والے ، تو وہ ہے کہ اس کے انتقام کی کسی کو
اہمیت نہیں ، اے قریب و بلند ہر چیز پہ اس کی
بلندی رفعت ہے ، اے ہر ظالم سرکش کو اپنے غالب

يَقْهَرِ عَزِيْزِ سُلْطَانِهٖ ، يَا نُوْرَ كُلِّ شَيْءٍ
وَهُدَاهُ ، اَنْتَ الَّذِيْ فَلَقَ الظُّلُمَاتِ بِنُوْرِهٖ ،
يَا عَالِيَ الشَّامِخِ فَوْقَ كُلِّ شَيْءٍ عُلُوَّ
ارْتِفَاعِهٖ ، يَا قُدُّوْسُ الطَّاهِرُ
مِنْ كُلِّ سُوْءٍ فَلَا شَيْءَ يُعَادِلُهٗ مِنْ
خَلْقِهٖ ، يَا مُبْدِئَ الْبَرَايَا وَ مُعِيْدَهَا
بَعْدَ فَنَائِهَا بِقُدْرَتِهٖ ، يَا جَلِيْلُ الْمُتَكَبِّرُ
عَنْ كُلِّ شَيْءٍ فَالْعَدْلُ اَمْرُهٗ وَالصِّدْقُ
وَعْدُهٗ ، يَا مَحْمُوْدُ فَلَا تَبْلُغُ الْاَوْهَامُ
كُنْهَ ثَنَائِهٖ وَمَجْدِهٖ ، يَا كَرِيْمَ الْعَفْوِ
وَالْعَدْلِ اَنْتَ الَّذِيْ مَلَأَ كُلَّ
شَيْءٍ عَدْلُهٗ ، يَا عَظِيْمُ ذَا الثَّنَاءِ الْفَاخِرِ
وَذَا الْعِزِّ وَالْمَجْدِ وَالْكِبْرِيَاءِ فَلَا يَذِلُّ
عِزُّهٗ ، يَا عَجِيْبُ فَلَا تَنْطِقُ الْاَلْسُنُ
بِكُنْهِ آلَائِهٖ وَثَنَائِهٖ ، يَا غِيَاثِيْ عِنْدَ
كُلِّ كُرْبَةٍ ، وَيَا مُجِيْبِيْ عِنْدَ كُلِّ دَعْوَةٍ
اَسْأَلُكَ اَللّٰهُمَّ يَا رَبِّ الصَّلٰوةَ عَلٰى
نَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ، وَاَمَانًا
مِنْ عُقُوْبَاتِ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ وَ اَنْ
تَحْبِسَ عَنِّيْ اَبْصَارَ الظَّالِمِيْنَ الْمُرِيْدِيْنَ
بِيَ السُّوْءَ ، وَاَنْ تَصْرِفَ قُلُوْبَهُمْ مِنْ شَرِّ
مَا يُضْمِرُوْنَ فِيْ اِلٰى خَيْرِ مَا لَا يَمْلِكُهٗ
غَيْرُكَ - اَللّٰهُمَّ هٰذَا الدُّعَاءُ وَ مِنْكَ الْاِجَابَةُ
وَهٰذَا الْجُهْدُ وَعَلَيْكَ التُّكْلَانُ وَلَا حَوْلَ
وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا

قہر سلطانی سے ذلیل کرنے والے ، اے ہر چیز کے نور
وہدایت ، تو وہ ہے جس نے اپنے نور سے اندھیروں
کو چھانٹ دیا ، اے بلند و رفعت شان والے ، اس کی
بلندی و رفعت ہر چیز پر بالا ہے ، اے پاک و طاہر ہر
برائی سے ، کوئی مخلوق اس کے برابر نہیں ، اے مخلوق
کو آغاز میں پیدا کرنے والے اور دوبارہ فنا کے بعد
لانے والے اپنی قدرت کے ساتھ ، اے صاحبِ
جلال اور ہر چیز سے بڑے ، عدل اس کا امر ہے ،
صدق اس کا وعدہ ہے۔ اے قابل حمد اوہام کی
تیری ثنا و بزرگی کی کنہ تک رسائی نہیں۔ اے کریم!
معاف کرنے والے عدل والے تو نے ہر چیز کو عدل
سے بھر دیا۔ اے عظمت والے ثناءِ فاخر والے اور
عزت و بزرگی و کبریائی کے مالک ، اس کی عزت کم
نہیں ہوتی ، اے عجیب زبانیں اس کے انعامات و
ثنا کی کنہ سے قاصر رہ گئیں۔ اے میری فریاد سننے والے
ہر دکھ کے وقت ، اور ہر پکار پر میری دعا قبول کرنیوالے ،
اے اللہ ، اے پروردگار میں تجھ سے سوال کرتا ہوں کہ
اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم و صلوٰۃ فرما اور دنیاوی
و اخروی تمام تکالیف سے امان عطا کر دے اور جو
ظالم تکلیف کے درپے ہیں۔ ان کی آنکھیں مجھ سے
بند کر دے اور جو شرارت چھپائے ہیں ان کے دلوں کو
پھیر کر بھلائی کی طرف لے جا۔ جس کا تیرے سوا کوئی مالک
نہیں۔ اے اللہ یہ دعا ہے اور تیری طرف سے قبولیت
ہے اور یہ کوشش ہے اور تجھ پر بھروسہ ہے اور اللہ
کے بغیر کوئی ڈر و قوت ہے اور ہمارے سردار حضرت

مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ وَسَلَّمَ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی آل پر صلوٰۃ و سلام ہو۔

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کی دعا

ہمیں احمد بن موصلی وکیل بن موکل نے بتایا، انہیں جعفر بن نصیر خواص خراسانیؒ نے، اور انہیں ابراہیم بن بشار نے بتایا جو کہ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کے خادم تھے، فرمایا کہ حضرت ابراہیم بن ادھمؒ جمعہ کے روز صبح اور شام اس دعا کو پڑھتے اور ساتھ ہی یہ دعا بھی کرتے کہ،

مَرْحَبًا بِیَوْمِ الْمَزِیْدِ وَالصُّبْحِ الْجَدِیْدِ وَ الْکَاتِبِ الشَّھِیْدِ یَوْمُنَا ھٰذَا یَوْمُ عِیْدٍ اُکْتُبْ لَنَا مَا نَقُوْلُ بِسْمِ اللّٰہِ الْحَمِیْدِ الْمَجِیْدِ الرَّفِیْعِ الْوَدُوْدِ الْفَعَّالِ فِیْ خَلْقِہٖ مَا یُرِیْدُ، اَصْبَحْتُ بِاللّٰہِ مُؤْمِنًا، وَبِلِقَائِہٖ مُصَدِّقًا وَبِحُجَّتِہٖ مُعْتَرِفًا، وَمِنْ ذَنْبِیْ مُسْتَغْفِرًا، وَلِرُبُوْبِیَّۃِ اللّٰہِ خَاضِعًا، وَلِسِوَی اللّٰہِ عَزَّوَجَلَّ فِی الْاِلٰھِیَّۃِ جَاحِدًا، وَاِلَی اللّٰہِ فَقِیْرًا، وَعَلَی اللّٰہِ مُتَوَکِّلًا، وَ اِلَی اللّٰہِ مُنِیْبًا، اُشْھِدُ اللّٰہَ وَ اُشْھِدُ مَلٰئِکَتَہٗ وَ اَنْبِیَاءَہٗ وَ رُسُلَہٗ وَ حَمَلَۃَ عَرْشِہٖ وَ مَنْ خَلَقَ وَ مَنْ ھُوَ خَالِقُہٗ بِاَنَّہٗ ھُوَ اللّٰہُ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ، وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ سَلَّمَ وَ اَنَّ الْجَنَّۃَ حَقٌّ وَّ النَّارَ حَقٌّ، وَالْحَوْضَ حَقٌّ، وَالشَّفَاعَۃَ حَقٌّ، وَمُنْکَرًا وَنَکِیْرًا حَقٌّ، وَ لِقَاءَکَ حَقٌّ وَ وَعْدَکَ حَقٌّ وَ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ لَا رَیْبَ فِیْھَا، وَ

(خوش آمدید یوم مزید اور صبح جدید اور کاتب گواہ کیلئے، ہمارا یہ دن عید کا ہے۔ ہمارے لیے لکھیے جو ہم دعا کرتے ہیں۔ اللہ قابل حمد اور بزرگی رفعت اور وددود اور اپنی مخلوق میں جو چاہے کرنے والے کے نام سے میں نے ایمان کی حالت میں صبح کی، اس کی ملاقات کی تصدیق کرنے والا اور اس کی حجت کو ماننے والا اور اپنے گناہ سے بخشش مانگنے والا اور اللہ کی ربوبیت کے سامنے عاجز اور اللہ عزوجل کے ماسوا کا خدا ہونے میں منکر ہوں اور اللہ کا محتاج اور اللہ پر بھروسہ کرنے والا اور اللہ ہی کی جانب رجوع کرنے والا ہوں میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں اور اس کے فرشتوں، انبیاء، رسولوں، حاملین عرش کو گواہ بناتا ہوں اور جو مخلوق ہے اسے اور جو اس کا خالق ہے اسے کہ وہی اللہ ہے اس کے بغیر کوئی معبود نہیں۔ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اور بے شک جنت حق ہے، اور دوزخ حق ہے اور حوض (کوثر) حق ہے اور شفاعت حق ہے اور منکر و نکیر حق ہیں اور تیری ملاقات حق ہے اور تیرا وعدہ حق ہے، اور قیامت آنے والی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں، اور

اَنَّ اللّٰهَ يَبْعَثُ مَنْ فِي الْقُبُوْرِ عَلٰى ذٰلِكَ اَحْيَاءُ وَ اَلَيْهِ اَمُوْتُ، وَعَلَيْهِ اُبْعَثُ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ - اَللّٰهُمَّ اَنْتَ رَبِّيْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ خَلَقْتَنِيْ وَ اَنَا عَبْدُكَ وَ اَنَا عَهْدِكَ وَ وَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ اَعُوْذُ بِكَ اَللّٰهُمَّ مِنْ شَرِّ كُلِّ ذِيْ شَرٍّ - اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ فَاغْفِرْ لِيْ ذُنُوْبِيْ فَاِنَّهٗ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ وَاهْدِنِيْ لِاَحْسَنِ الْاَخْلَاقِ، فَاِنَّهٗ لَا يَهْدِيْ لِاَحْسَنِهَا اِلَّا اَنْتَ وَاصْرِفْ اَللّٰهُمَّ يَا رَبِّ عَنِّيْ سَيِّئَهَا اِنَّهٗ لَا يَصْرِفُ سَيِّئَهَا اِلَّا اَنْتَ لَبَّيْكَ وَ سَعْدَيْكَ وَ الْخَيْرُ كُلُّهٗ بِيَدَيْكَ. اَنَا لَكَ وَ اِلَيْكَ، اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ، آمَنْتُ اللّٰهُمَّ بِمَا اَرْسَلْتَ مِنْ رَّسُوْلٍ، وَ آمَنْتُ اللّٰهُمَّ بِمَا اَنْزَلْتَ مِنْ كِتَابٍ وَ صَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدِ النَّبِيِّ وَ عَلٰى آلِهٖ وَ سَلَّمَ كَثِيْرًا خَاتِمَ كَلَامِيْ وَ مِفْتَاحِهٖ وَ عَلٰى اَنْبِيَآئِهٖ وَ رُسُلِهٖ اَجْمَعِيْنَ اٰمِيْنَ يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ۔

بے شک اللہ تعالیٰ انھیں اٹھائے گا جو قبروں میں ہیں۔ اسی پر میں زندہ ہوتا ہوں اور اسی پر میں مرتا ہوں اور اسی (عقیدہ) پر اِن شاء اللہ میں اٹھایا جاؤں گا۔ اے اللہ! تو میرا رب ہے۔ تیرے بغیر کوئی معبود نہیں۔ تُو نے مجھے پیدا فرمایا اور میں تیرا بندہ ہوں اور میں تیرے عہد اور وعدہ پر ہوں جہاں تک میری سکت ہے۔ میں اے اللہ ہر صاحب شر کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ اے اللہ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا سو میرے گناہ بخش دے اس لیے کہ تیرے بغیر کوئی گناہ نہیں بخشتا اور مجھے اخلاقِ حسنہ کی راہ دکھا۔ اس لیے کہ احسن اخلاق کی راہ تیرے بغیر کوئی نہیں دکھاتا۔ اور اے اللہ اے پروردگار مجھ سے اُن کی برائی ہٹا دے۔ اس لیے کہ ان کی برائی سے تیرے بغیر کوئی نہیں ہٹاتا۔ میں تیری خدمت کے لیے بار بار حاضر ہوں اور تمام بھلائی تیرے قبضہ میں ہے میں تیرا اور تیری جانب ہوں۔ میں بخشش مانگتا ہوں اور تیری طرف لوٹتا ہوں۔ اے اللہ جو رسول تو نے بھیجا میں اس پر ایمان لایا اور اے اللہ جو کتاب تو نے نازل کی۔ میں اس پر ایمان لایا اور اللہ تعالیٰ ہمارے سردار محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کی آل پر رحم وسلامتی کثیر کثیر فرمائے۔ میری کلام کے آغاز و اختتام میں درود ہو اور تمام انبیاء اور رسولوں پر صلاۃ وسلام ہو آمین۔ اے تمام جہانوں کے پروردگار۔)

اَللّٰهُمَّ اَوْرِدْنَا حَوْضَهٗ وَاسْقِنَا

اے اللہ ہمیں آپ کے حوض پر لانا اور آپ کے

بِكَأْسِهٖ مَشْرَبًا رَوِيًّا سَائِغًا هَنِيْئًا لَا نَظْمَأُ بَعْدَهٗ اَبَدًا ، وَاحْشُرْنَا فِيْ زُمْرَتِهٖ غَيْرَ خَزَايَا وَ لَا نَادِمِيْنَ ، وَ لَا نَاكِثِيْنَ وَ لَا مُرْتَابِيْنَ وَ لَا مَفْتُوْنِيْنَ وَ لَا مَغْضُوْبًا عَلَيْنَا وَ لَا ضَالِّيْنَ ۔ اَللّٰهُمَّ اعْصِمْنِيْ مِنْ فِتَنِ الدُّنْيَا ، وَ وَفِّقْنِيْ لِمَا تُحِبُّ وَ تَرْضٰى مِنَ الْعَمَلِ ، وَ اَصْلِحْ لِيْ شَاْنِيْ كُلَّهٗ ، وَ ثَبِّتْنِيْ بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ ، وَ لَا تُضِلَّنِيْ وَ اِنْ كُنْتُ ظَالِمًا ، سُبْحَانَكَ ، سُبْحَانَكَ يَا عَلِيُّ ، يَا عَظِيْمُ ، يَا بَارُّ ، يَا رَحِيْمُ ، يَا عَزِيْزُ ، يَا جَبَّارُ ، سُبْحَانَ مَنْ سَبَّحَتْ لَهُ السَّمٰوٰتُ بِاَكْنَافِهَا ، وَ سُبْحَانَ مَنْ سَبَّحَتْ لَهُ الْجِبَالُ بِاَصْوَاتِهَا وَ سُبْحَانَ مَنْ سَبَّحَتْ لَهُ الْبِحَارُ بِاَمْوَاجِهَا ، وَ سُبْحَانَ مَنْ سَبَّحَتْ لَهُ النُّجُوْمُ فِي السَّمَآءِ بِاَبْرَاقِهَا ، وَ سُبْحَانَ مَنْ سَبَّحَتْ لَهُ الشَّجَرُ بِاُصُوْلِهَا وَ نَضَارَتِهَا ، وَ سُبْحَانَ مَنْ سَبَّحَتْ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَ الْاَرْضُوْنَ السَّبْعُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ وَ مَنْ عَلَيْهِنَّ ، سُبْحَانَكَ سُبْحَانَكَ يَا حَيُّ يَا حَلِيْمُ ، سُبْحَانَكَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وَحْدَكَ

پیالہ سے پلانا۔ ایسا پلانا کہ سیراب کرے خوب اور عمدہ ہو۔ اس کے بعد ہم کبھی بھی پیاسے نہ ہوں، اور ہمیں بغیر ذلت اور ندامت کے آپؐ کی جماعت میں اٹھانا اور نہ ہی (وعدہ) توڑنے والے اور نہ شک کرنے والے اور نہ فتنہ میں پڑنے والے اور نہ ہی مغضوب ہوں اور نہ ہی گمراہ ہوں۔ اے اللہ! مجھے دُنیا کی آزمائشوں سے بچا لو۔ اور مجھے اس کی توفیق عطا فرما جو تو پسند کرے اور جس عمل سے تو راضی ہو اور میرے تمام حالات درست کر دے اور مجھے دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں قولِ ثابت کے ساتھ ثابت قدم فرما اور اگرچہ میں ظالم ہوں مگر مجھے گمراہ نہ کر۔ پاک ہے تو، پاک ہے تو، اے بزرگ یا عظمت والے، اے رحم کرنے والے، اے غالب اور اے جبّار۔ پاک ہے جس کی آسمانوں نے تسبیح پڑھی، اعراف کے ساتھ اور پاک ہے جس کی پہاڑوں نے آوازوں کے ساتھ تسبیح بیان کی اور پاک ہے جس کی سمندروں نے لہروں کے ذریعہ تسبیح کی اور پاک ہے جس مچھلیوں نے اپنی زبانوں میں تسبیح بیان کی اور پاک ہے جس کی ستاروں نے آسمانوں میں اپنی چمک کے ذریعہ تسبیح کی اور پاک ہے جس کی درختوں نے اپنی جڑوں اور تراوت کے ذریعہ تسبیح بیان کی اور پاک ہے جس کی ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں نے اور جو ان کے اندر ہیں اور جو ان پر ہیں ان سب نے تسبیح کی۔ پاک ہے تو، پاک ہے تو، اے زندہ! اے بُردبار، پاک ہے تو، تیرے بغیر کوئی معبود نہیں

لَا شَرِيْكَ لَكَ تُحْيِيْ وَ تُمِيْتُ ، وَ اَنْتَ حَيٌّ لَّا تَمُوْتُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ وَ اَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۔

(تو تنہا ہے تیرے بغیر کوئی شریک نہیں ۔ تو زندہ کرتا اور مارتا ہے اور تو زندہ ہے نہیں مرے گا تیرے قبضہ میں بھلائی ہے اور تو ہر چیز پر قدرت والا ہے ۔)

جس نے جمعہ کے روز یہ چاروں ادعیہ مبارکہ پڑھ لیں ۔ اس نے اللہ عزوجل کا خوب خوب ذکر کیا ۔ اور کامل فضل حاصل کر لیا ۔ اگر کسی نے یہ مذکورہ اعمالِ خیر اور اذکارِ حسنہ پُورے کر لیے اور بُرے افعال و اقوال سے پرہیز کیا تو وہ اہل جمعہ سے ہے اور ان میں سے ہُوا کہ اس کے لیے مزید انعامات و فضائل کی توقع ہے ۔ اس کا عمل خالص ہُوا اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا ذکر درست اور قابلِ ستائش ٹھہرا ۔ جمعہ اور اس کے آداب و اذکار کے بارے میں یہ آخری کلام تھا ۔

فصل ۲۲

روزہ اور اُس کے آداب و احکام

روزہ کی اہمیت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ۔

(اور اللہ سے نماز و صبر کے ساتھ مدد مانگو)

تفسیر میں آتا ہے کہ صبر سے مراد روزہ ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کے مہینہ کو صبر کا مہینہ فرمایا کرتے تھے۔ اس لیے کہ صبر میں نفس کو خواہشات سے روکنا اور اپنے آقا کی اطاعت پر جمانا ہوتا ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ:

"صبر نصف ایمان ہے اور روزہ نصف صبر ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ (اور صبر کے ذریعہ مدد چاہو) اس کے مفہوم میں بتایا کہ اس سے مراد مجاہدۂ نفس ہے اور ایک قول کے مطابق دشمن کے مقابلہ میں جم کر رہنا ہے۔

بعض علماء کا فرمان ہے کہ

اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ یعنی دنیا میں روزہ رکھ کر زہد اختیار کر کے مدد چاہو۔ اس لیے کہ روزہ دار ایک عابد زاہد آدمی کی طرح ہوتا ہے چنانچہ روزہ دنیا میں زہد کی کنجی اور آقا کی عبادت کا دروازہ ہے۔ کیونکہ یہ نفس کو کھانے پینے کی لذتوں اور شہوات سے مانع ہوتا ہے جیسے کہ زاہد عابد آدمی زہد میں آکر اور عبادت کر کے ان باتوں سے اپنے آپ کو روکتا ہے۔ اس لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مفہوم میں دونوں کو جمع کر دیا۔ فرمایا:

"بے شک اللہ عابد نوجوان پر اپنے فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے کہ اے نوجوان! میری وجہ سے شہوت چھوڑنے والے، میری (عبادت) میں اپنی جوانی خرچ کرنے والے، تو میرے نزدیک میرے بعض ملائکہ کی طرح ہے۔"

اور روزہ دار کے بارے میں فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اے میرے فرشتو! میرے بندے کی طرف دیکھو۔ اس نے میری خاطر اپنی شہوت، اپنی لذت، اپنا کھانا اور پینا چھوڑ دیا۔"

چنانچہ روزہ میں مجاہدۂ نفس اور لذات ختم کرنے سے مدد ملتی ہے اور اس میں نفس کی خوب پاکیزگی حاصل ہوتی ہے اور خواہشات کی کمی ہو جاتی ہے۔

روزہ کی جزاء

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"روزہ کے سوا بنی آدم کا ہر عمل اس کے لیے ہے اور یہ (روزہ) بے شک میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔"

اللہ تعالیٰ نے روزہ کی جزاء کی نسبت اپنی طرف کر کے اس کی فضیلت بیان فرمادی، جیسے کہ فرمایا:

وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا۔ (اور بے شک مسجدیں اللہ کے لیے ہیں، چنانچہ اللہ کے ساتھ کسی دُوسرے کو نہ پکارو) اور اسی طرح فرمایا:

اِنَّمَآ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ رَبَّ هٰذِهِ الْبَلْدَةِ الَّذِیْ حَرَّمَهَا۔ (بے شک مجھے حکم دیا گیا کہ میں اس شہر کے رب کی عبادت کروں جس کو اس نے محترم بنایا)

چنانچہ تمام مکانات سے زیادہ اللہ کو مساجد محبوب ہیں اور تمام شہروں سے زیادہ مکہ محبوب ہے یہ اشرف البلاد ہے تو ان کی اپنی جانب نسبت فرمائی جیسے کہ فرمایا:

وَلَهٗ كُلُّ شَیْءٍ (اور ہر چیز اسی کی ہے)، اس طرح روزہ بھی اللہ تعالیٰ کو تمام اعمال سے زیادہ محبوب ہے کیونکہ اس میں اخلاقِ صمدیت (کھانے پینے کا سلسلہ مفقود ہو جانا) ہوتے ہیں اور یہ ایسا مخفی عمل ہے کہ دوسروں کو خبر نہیں ہوتی۔ صرف اللہ ہی اس سے آگاہ ہوتا ہے۔ منقول ہے کہ بنی آدم کے ہر عمل میں قصاص چل سکتا ہے اور مظالم پورے کرنے کے لیے وہ اعمال دیے جا سکتے ہیں۔ سوائے روزہ کے۔ روزہ میں قصاص نہیں چل سکتا۔ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

"یہ میرے لیے ہے اس لیے اس سے کسی قسم کا قصاص نہیں لیا جائے گا۔"

مروی ہے کہ روزہ کے سوا ہر عمل کی جزاء معلوم ہے اور روزہ کی جزا کسی کو معلوم نہیں کہ کیا ہے۔ اس کا اجر بغیر حساب کے ملے گا۔ اس کا اجر تو بے حساب کے اور خوب دیا جائے گا۔

چنانچہ اس آیت کی تشریح میں دو اقوال میں سے ایک قول یہی ہے۔ آیت یہ ہے:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔ (سو کوئی جان نہیں جانتی کہ اُن کے لیے کیا کیا آنکھوں کی ٹھنڈک مخفی ہے جو وہ عمل کرتے تھے اسکی یہ جزا ہے)۔

ایک قول کے مطابق ان کا عمل روزے رکھنا ہے اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سَآئِحُوْنَ

کی تاویل میں اس سے مراد روزے دار ہیں۔ گویا وہ بھوک پیاس لے کر اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوئے اور دنیا کی باتیں یعنی خورد و نوش جیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھوڑ دی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے عمل کے صلہ میں انہیں ایسی آنکھوں کی ٹھنڈک اور انعام دیا جو کہ مخفی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ (بے شک صبر کرنے والوں کو بغیر حساب سے اجر پورا پورا دیا جائے گا) اور اس سے مراد روزہ دار ہیں اور روزہ کے اسماء میں سے ایک اسم صبر ہے۔ جب بندہ نے روزہ کا عمل مخفی رکھا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اس کی جزا اس سے مخفی رکھی۔

روزہ ذکرِ خفی ہے

حدیث میں آتا ہے کہ:
"جس نے مجھے اپنے جی میں یاد کیا میں اسے جی میں یاد کروں گا۔"
چنانچہ روزہ بھی اللہ تعالیٰ کا ذکرِ خفی ہے اور یہ بہتر نہیں ہے کہ انسان چار دن سے زیادہ افطار رکھے۔ اس لیے کہ اس طرح قساوتِ قلبی پیدا ہوتی ہے اور حال ہی بدلنے لگتا ہے، غلط عادات پیدا ہو جاتی ہیں اور شہوات نمودار ہو جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایام نحر اور ایام تشریق کے علاوہ مسلسل چار روز سے زیادہ افطار کرنا مستحب نہیں بتایا گیا۔

روزہ کا بہترین طریق

سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھے اور ایک دن افطار کرے یا دو دن روزہ رکھے اور دو دن افطار کرے۔ یہ نصف زندگی کا روزہ ہوا۔ اور چاہے تو دو دن روزہ رکھے اور ایک دن افطار کرے۔ یہ زندگی کے دو تہائی حصہ کا روزہ ہوا۔ اور اگر چاہے تو ایک دن روزہ رکھے اور دو دن افطار کرے۔ یہ ایک تہائی زندگی کا روزہ ہوا۔ روزے داروں کے یہ طریقے مروی ہیں اور ان کے بارے میں کثرت سے روایات آتی ہیں جنہیں ہم نے اختصار کی غرض سے حذف کر دیا ہے اور اگر مہینے کے آغاز میں تین روزے رکھے اور درمیان میں تین روزے رکھے اور آخری حصہ میں تین روزے رکھے تو بھی بہتر ہے، اور اگر ہر پیر، جمعرات اور جمعہ کا روزہ رکھ لے تو بھی بہت بہتر ہے اور کم از کم ایام بیض کے اور مہینے کی پہلی اور آخری تاریخ کے روزے ضرور رکھے۔
اشہرِ حرم کے روزے سب سے افضل ہیں اور ان میں سے دو ایسے عشرے زیادہ افضل ہیں کہ جو محرم اور ذی الحجۃ میں واقع ہیں۔ اس کے بعد شعبان کا درجہ ہے۔ اس لیے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس ماہ میں اس کثرت سے روزے رکھتے کہ ماہِ رمضان ساتھ ہی ملا لیتے اور ہر ماہ میں تین روزوں کا ناغہ نہ کرے۔ اس کے علاوہ ہر پیر اور جمعرات کے روزہ پر بھی دوام رکھے۔

حدیث میں آتا ہے کہ:

"جب شعبان کا نصف ہو جائے تو رمضان کے آنے تک کوئی روزہ نہیں"

اس لیے رمضان المبارک آنے سے چند روز پہلے ہی افطار کر لینا چاہیے اور اگر شعبان کے روزے رکھتے ہوئے رمضان بھی ملا لے تو جائز ہے۔ اور رمضان کے لیے دو یا تین استقبالی روزے رکھنا جائز نہیں۔ البتہ اگر اتفاق سے پہلے پیر یا جمعرات کا دن آن پڑے اور وہ ان ایام کے روزے رکھنے کا عادی ہو تو پھر کچھ حرج نہیں اور بعض صحابہؓ سارے رجب کے روزے رکھنے کو ناپسند کرتے۔ تاکہ ماہِ رمضان کی مماثلت نہ ہو جائے۔ وہ اس ماہ کے چند ایام میں افطار کرنا زیادہ پسند فرماتے۔

صیام الدھر کا حکم

اور علماء کی ایک جماعت صوم الدہر (دائمی روزہ) کو مکروہ بتایا۔ روایات میں اس کی کراہت آتی ہے۔ اس کی تاویل یوں کی کہ یہ لوگ عید اور ایام تشریق کے بھی روزے رکھتے اور سارا سال افطار نہ کرتے۔ اس وجہ سے اس کی کراہت آئی ہے اور اگر اس سے اصلاحِ قلب، انکسارِ نفس اور درستگیٔ حال مقصود ہو کہ روزے کی حالت میں اصلاح ہو جاتی ہے تو اسے چاہیے کہ روزہ رکھے۔ اس صورت میں اس پر یہ واجب ہے۔ جبکہ روزہ میں اس کی اصلاح و تقویٰ کا سامان ہوتا۔

حضرت سعیدؓ نے قتادہؓ سے، انہوں نے ابو تمیمہ ہجیمیؒ سے، انہوں نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے صیامِ دہر (دائمی روزہ) رکھا۔ اس پر دوزخ تنگ ہو گیا اور نوّے کی گانٹھ لگائی گئی۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ دوزخ میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ صومِ دہر کی فضیلت بزرگوں سے ثابت ہے اور صحابہؓ و تابعینؒ کی ایک بڑی جماعت نے صوم الدہر رکھے۔ ہاں البتہ ایک آدمی سنت سے اعراض کرے اور افطار کی رخصت قبول نہ کرے تو اس کے لیے عناد کے باعث صیامِ دہر مکروہ ہیں۔ اس لیے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین میں آسانی کا حکم دیا ہے اور اللہ عزوجل نے فرمایا ہے کہ (اللہ تعالیٰ) پسند کرتا ہے کہ اس کی رخصتوں کو قبول کیا جائے جیسے کہ وہ عزیمت پر چلنے کو پسند فرماتا ہے۔ دوسری حدیث میں آتا ہے کہ "وہ پسند کرتا ہے کہ اس کی رخصت قبول کی جائے جیسے کہ وہ اس کو ناپسند کرتا ہے کہ اس کی نافرمانی کی جائے"۔ اور نصف الدہر یعنی ایک دن روزہ رکھنے اور ایک دن افطار کرنے کی فضیلت میں کثرت سے احادیث آتی ہیں۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ اس صورت میں دو حال پر رہتا ہے۔ (روزہ رکھ کر) صبر کرتا ہے، اور (افطار کر کے) شکر کرتا ہے۔

صومِ داؤدؑ افضل ہے

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ "مجھ پر دنیا کے خزانے اور زمین کے خزانے پیش کیے گئے مگر میں نے انہیں رد کر دیا اور میں نے کہا: کہ ایک روز بھوکا رہوں اور ایک روز سیر ہو جاؤں، جب سیر ہو جاؤں تو تیری حمد بیان کروں اور جب بھوکا رہوں تو تیری طرف زاری کروں۔"

اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"میرے بھائی داؤد علیہ السلام کے روزے افضل ترین روزے ہیں، وہ ایک روزہ رکھتے اور ایک روز افطار کرتے۔"

اس لیے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبد اللہ بن عمرو کو روزے کے عمل میں (صیام الدہر) سے ہٹایا تو انہوں نے عرض کیا:

"میں اس سے افضل چاہتا ہوں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ایک دن روزہ رکھ اور ایک دن افطار کر۔"

انہوں نے فرمایا:

"میں اس سے افضل چاہتا ہوں۔"

آپؐ نے فرمایا:

"اس سے افضل کوئی نہیں۔"

حدیث میں آتا ہے کہ

"جس نے ماہِ حرام کے تین روزے یعنی جمعرات، جمعہ اور ہفتہ کا روزہ رکھا، اللہ تعالیٰ اس کے لیے سات سو برس کی عبادت لکھے گا۔"

مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے علاوہ کسی مہینے میں سارا مہینہ روزے نہیں رکھے بلکہ کچھ دنوں آپؐ افطار بھی فرمایا کرتے۔ ایک بار آپؐ نے شعبان کو رمضان سے ملایا اور بارہا شعبان کے (آخر میں افطار کر کے) رمضان سے جُدا کر دیا۔ اور ہم نے سلف صالحین کی ایک جماعت کے روزوں کا ذکر کر دیا ہے۔ ان میں سے ہر طریق کے بارے میں فضائل منقول ہیں۔

اس طرح ہم نے قلوب و اعضائے ظاہری کی جو جو عبادات دن رات میں بتائی ہیں اور جن اوصاف یقین اور اخلاقِ ایمان کا ذکر کیا ہے۔ یہ سب منقول ہیں بلکہ ان کے اجر و ثواب اس سے زیادہ مروی ہیں۔ البتہ کامل احاطہ ہمارا مقصود نہ تھا اور صرف فضائل کی باتیں کر کے رہ جانا ہماری غرض نہیں، اس لیے سب کو ذکر نہیں کیا، کیوں کہ ہمارا طریق قلوب عاملین کی تہذیب ہے۔ اس لیے کہ قلوب کی طہارت اور حقیقی ایمان سے ہی تزکیۂ اعمال حاصل ہوتا ہے اور سالک اپنے آقا ذوالجلال کا قرب حاصل کرتا ہے اور اللہ بزرگ و برتر کے بغیر کوئی ڈر نہیں اور نہ ہی کوئی قوت ہے۔

خواصِ اہلِ یقین کا روزہ

روزہ کا مفہوم اللہ تعالیٰ تجھے توفیق بخشے۔ یہ یاد رکھو کہ روزہ داروں کے ہاں روزہ، قالب کا روزہ ہوتا ہے مگر خواص اہلِ یقین کے ہاں روزے کا مطلب یہ ہے کہ غلط ارادوں اور دنیاوی افکار سے دل کا روزہ رکھے۔ پھر کان، آنکھ اور زبان کا روزہ رکھے۔ یعنی حدود الٰہی نہ توڑے، ہاتھوں اور پاؤں کا روزہ رکھے اور ممنوعہ اشیاء کی طرف نہ بڑھے۔ جس نے ان اوصاف کے ساتھ روزہ رکھا اسے اس دن کا وقت ہاتھ آگیا اور دن کی ہر گھڑی اس کے لیے وقتِ (خیر) بن گئی۔ اس نے دن بھر کو ذکر اللہ سے معمور کر لیا۔ اس آدمی کے بارے میںؐ فرمایا:

"روزہ دار کی نیند، عبادت اور اس کا سانس تسبیح ہے"۔

اللہ تعالیٰ نے سماع بالباطل اور قول بالاثم کو اکل حرام کے ساتھ ملا کر ذکر کیا۔ اس لیے کہ اگر مسموعات اور مقولات میں ایسے نہ پائے جاتے کہ جن کی طرف میلان حرام ہے اور ان کا حکم حرام ہے تو انہیں اکلِ حرام جیسے کبیرہ گناہ کے ساتھ ملا کر ذکر نہ کرتا۔ فرمایا:

سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ لِلسُّحْتِ۔

(جھوٹ بہت سننے والے، حرام بہت کھانے والے)

اور ایک جگہ فرمایا:

لَوْ لَا يَنْهٰهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ [۵]

(اگر ربانی علماء اور احبار انہیں گناہ کے قول اور حرام کھانے سے منع نہ کرتے)

---

[۵] سورۂ مائدہ۔ آیت ۶۳

چنانچہ حدود اللہ کی حفاظت کرنے والا بندہ اگرچہ کھانے اور جماع کی صورت میں حالتِ افطار میں ہو مگر فضیلتِ اتباع کے باعث وُہ اللہ کے ہاں روزہ دار ہی ہے۔

اور جو آدمی کھانے اور جماع سے روزہ رکھے مگر حدود اللہ کو توڑتا رہے تو وہ اپنے خیال میں روزہ دار ہے مگر اللہ کے ہاں اس کا کچھ روزہ نہیں اس لیے کہ جو چیز اس نے ضایع کر دی وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ محبوب تھی اور جس کی حفاظت کی وُہ اسی درجہ کی مطلوب نہ تھی۔

جو آدمی کھانے کا روزہ رکھے اور شرع کی مخالفت کر کے افطار رکھے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی آدمی وضو کے وقت تمام اعضاء پر تین تین بار مسح کرے اور پھر نماز پڑھے۔ اس نے تعداد (تین بار) ضرور پوری کر لی۔ مگر اعضاء کا دھونا فرض تھا اسے چھوڑ دیا۔ اب اس کی جہالت کے باعث اس کی نماز مردود ہو گئی اور وہ اس دھوکہ میں مبتلا ہے کہ میں نے نماز پڑھ لی۔

جو آدمی کھانے اور جماع سے روزہ رکھے تمام اعضاء کو گناہوں سے بچالے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کہ اس نے ہر عضو کو تین تین بار دھویا اور فرائض پُورے کیے اور خوب طرح وضو بنایا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

تَمَامًا عَلَى الَّذِيْ اَحْسَنَ (مکمل اس پر جس نے نیکی کی)

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کے وضو کے بارے میں فرمایا:

"یہ میرا وضو ہے اور مجھ سے پہلے تمام انبیاءؑ کا وضو ہے اور میرے باپ ابراہیم علیہ السلام کا وضو ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ (تمہارے باپ ابراہیمؑ کی ملت پر) یعنی تم پر لازم ہے کہ ان کا اتباع اور اقتداء کرو۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"شکر گزاری کرتے ہُوئے کھانے والا، صبر کرنے والے روزے دار کی طرح ہے۔"

حدیث میں آتا ہے:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں دو عورتوں نے روزہ رکھا۔ دن کے آخری حصّہ میں دونوں کو بھوک، پیاس نے نڈھال کر دیا اور مرنے لگیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف پیغام بھیجا گیا کہ افطار کی اجازت عطا فرما دیں۔ آپ نے اُن کی طرف ایک پیالہ ارسال کیا اور فرمایا:

"دونوں اس میں قے کر دو جو تم نے کھایا ہے"۔

راوی بتاتے ہیں کہ ایک عورت نے نصف تازہ خون اور نصف تازہ گوشت کی قے کی اور دوسری نے بھی اسی طرح قے کی، حتیٰ کہ پیالہ بھر گیا۔ لوگوں کو اس پر بڑا تعجب ہُوا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان دو نوں عورتوں نے اس (کھانے) سے روزہ رکھا جو کہ اللہ عزوجل نے ان کے لیے حلال فرمایا اور اس سے افطار کیا جو اللہ عزوجل نے ان پر حرام فرمایا۔ دونوں میں سے ایک عورت دوسری کے پاس بیٹھ گئی اور دونوں مل کر لوگوں کی غیبتیں کرنے لگیں۔ یہ ان کا گوشت ہے جو انہوں نے کھایا"۔

روزہ توبہ ہے

حضرت ابو الدرداؑ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے:

کیا خوب ہے اکیاس کی نیند اور ان کا افطار۔ احمق لوگ روزہ اور بیداری سے ان پر عیب دھرتے ہیں۔ حالانکہ صاحب یقین اور اہل تقویٰ کا ایک ذرہ عمل بھی خود فریب لوگوں کے پہاڑوں کے برابر کے اعمال سے افضل ہے۔ جو بات کرنا منع ہے اس بات کا سننا بھی منع ہے۔ جو کام کرنا حرام ہے اس کی طرف دیکھنے بلکہ دل میں اس کا خیال لانے کی بھی اجازت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سننے اور کلام کرنے والے دونوں کو برابر بتایا۔ فرمایا:

اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ۔ (بے شک تم اس وقت ان کی طرح ہو)

اور روزہ دار کی مثال توبہ کی طرح ہے اس لیے یہ روزہ کے اوصاف میں سے ہے اور توبہ گناہوں کا کفارہ ہے اس لیے کہ اس نے سابق بُری عادات سے صبر کیا۔ پھر یہ طے کیا کہ اپنے اعضا کو غلط کاموں سے بچائے رکھوں گا۔ اسی طرح روزہ بھی آگ سے سامنے ڈھال ہے اور جب روزہ دار اس پر صبر کرے تو یہ ابرار کے درجات تک لے جاتا ہے۔ چنانچہ وُہ اپنے اعضاء کو گناہوں سے بچاتا اور اگر دوبارہ گناہوں میں ڈوب ڈوب جائے تو یہ ایسا تائب ہے کہ جو بار بار وعدہ شکنی کرتا ہے اور اس کی توبہ توبۃ النصوح نہیں ہوتی۔ اس کا روزہ بھی درست نہیں ہے۔ دیکھیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"روزہ آگ کے سامنے ڈھال ہے جب تک اسے جھوٹ یا غیبت سے نہ توڑے"۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"جب کسی روز تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو نہ بد کلامی کرے اور نہ جہالت کا کام کرے۔ اگر کوئی آدمی اسے گالی دے تو کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں"۔

دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ:

"وہ اپنے روزہ کے دن کو اور افطار کے دن کو برابر نہ کر ڈالے"۔ یعنی روزہ کا احترام رکھے اور لغویات سے اس کی حفاظت کرے۔

ایک حدیث میں آتا ہے:

"روزہ امانت ہے، تمہیں امانت کی حفاظت کرنی چاہیے"۔

اور امانت کی حفاظت اس طرح ہے کہ اعضاء کو (گناہوں) سے بچائے۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ آیت پڑھی۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰی اَھْلِھَا۔ (بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں اہل لوگوں کو دو) تو آپ نے اپنے کان اور آنکھ پر ہاتھ رکھا اور فرمایا:

"کان امانت ہے، آنکھ امانت ہے"۔ اس لیے یہ کہنا جائز ہوا کہ "اُسے چاہیے کہ کہہ دے کہ میں روزہ سے ہوں"۔

یعنی جو امانت اٹھا رکھی ہے اس کا ذکر کرے اور اس کے اہل تک پہنچا دے اور امانت یہ بھی ہے کہ اسے مخفی رکھے۔ اور جس نے بغیر ضرورت کے ظاہر کیا اس نے خیانت کی۔ اس لیے کہ گاہے امانت رکھنے والا اس کے اظہار کو ناپسند کرتا ہے اور اصل اخفائیہ ہے کہ اسے بھلا دے اور راز کا ضیاع یہ ہے کہ اسے جمع رکھے۔ چنانچہ روزہ کی حقیقت یہ ہے کہ وہ روزہ کو بھلا دے بلکہ کسی خاص وقت کے انتظار میں نہ رہے (بلکہ افطار کو ہی ذہن سے اتار دے) چاہے شام کو افطار کیا ہی جاتا ہے مگر سارا دن اس کے دھیان میں نہ رہے۔

فصل ۲۳

نفس اور وقت کا محاسبہ

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ سے لے کر اَتَيْنَا بِهَا وَكَفٰى بِنَا حَاسِبِيْنَ تک۔ اس میں آتَیْنَا بِہَا بھی پڑھا جاتا ہے یعنی ہم نے اس کے ساتھ جزا دی۔ چنانچہ اس حرف کے ساتھ تخویف زیادہ شدید و بلیغ ترین ہے۔

ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ۔ الآیۃ

(اس دن ہو پڑیں گے لوگ بھانت بھانت کہ ان کو دکھائے ان کے کیے)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو وصیت فرمائی کہ:

"حق ثقیل ہے اور وہ ثقل کے ساتھ ساتھ خوشگوار ہے اور باطل ہلکا ہے اور وہ اپنے ہلکاپن کے ساتھ ساتھ آفت ہے اور دن میں اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ اسے رات میں قبول نہیں کرتا اور رات کے اندر اس کا حق ہے جسے وہ دن میں قبول نہیں کرتا۔ اگر تو نے سب لوگوں پر عدل کیا اور ایک پر ظلم کیا تو تیرا ظلم تیرے عدل سے بڑھ جائے گا۔ اگر تو نے میری وصیت یاد رکھی تو تجھے موت سے زیادہ کوئی چیز محبوب نہ ہوگی اور وہ تجھ پر آنے والی ہی ہے۔ اور اگر تو نے میری وصیت ضایع کر دی تو موت سے زیادہ تجھے کوئی چیز مبغوض نہ ہوگی اور تو اسے ہٹا نہیں سکتا۔"

حضرت ابن عمر خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"حساب ہونے سے پہلے اپنی جانوں کا محاسبہ کرو۔ وزن کیے جانے سے پہلے ان کا وزن کر لو۔ جس دن تم پیش کیے جاؤ گے تم سے کوئی چھپنے والی چیز مخفی نہ رہے گی، جس قوم نے دنیا میں اپنی جانوں کا محاسبہ کر لیا۔ آخرت میں ان کا حساب آسان ہوگا۔ جنہوں نے دنیا میں اپنی جانوں کا وزن کر لیا۔ اس قوم کے اوزان آخرت میں وزنی ہوں گے۔ میزان کا حق ہے اس میں حق اسی لیے رکھا جاتا ہے تاکہ وہ ثقیل ہو جائے۔ چنانچہ نفس کا محاسبہ تقویٰ سے ہوتا ہے اور مشاہدۂ یقین کے ساتھ وزن کیا جاتا ہے اور بڑی پیشی کے لیے تیاری، بادشاہ اکبر کے ڈر سے ہوتی ہے اور یہی حقیقی زہد ہے۔

اخلاق حسنہ | جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو وصیت فرمائی کہ:

"تو جہاں بھی رہے، اللہ سے ڈر، اور برائی ہو جانے کے بعد نیکی کر لے وُہ اسے مٹا دے گی ، اور لوگوں سے اچھے اخلاق سے پیش آنا"۔

کتاب اللہ میں بھی یہ وصیت بندوں کے نام موجود ہے ۔ فرمایا،

وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ اِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ۔

(اور بے شک ہم نے ان کو وصیت کی جو تم سے پہلے تھے ۔ جنھیں کتاب دی گئی اور خاص کر کے تمہیں کہ اللہ سے ڈرو)

اللہ تعالیٰ کے فرمان میں دُوسرا کلمہ یہ ہے کہ

وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ یعنی نیکی کر کے اسے ہٹاتے ہیں اور گزشتہ برائی کے بعد نیکی کر کے اسے ہٹاتے ہیں اور گزشتہ برائی کے بعد نیکی کر کے اس کا کفارہ کر دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے فرمان میں تیسرا کلمہ یہ ہے کہ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا (اور لوگوں کو نیکی کی بات کہو)

اللہ تعالیٰ کی تین وصیتیں

اللہ تعالیٰ نے اپنے صالح اور نیک بندوں کو تین وصیتیں فرمائیں ؛

۱۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ (بے شک انسان بیں خسارے میں ہے) یعنی اس کے اوقات برباد ہو رہے ہیں اور اس کے منافع جا رہے ہیں ۔ پھر

۲۔ دوسری وصیت فرمائی اور استثنار کیا کہ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَ تَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَ تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (سوائے ان کے کہ جو ایمان لائے اور اچھے اعمال کیے اور ایک دوسرے کو حق کی وصیت کرتے رہے اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے رہے)

۳۔ اور تیسرے وصف کے بارے میں فرمایا ؛

وَ تَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ (اور رحم کرنے کی وصیت کرتے رہے)

خواہشات کے برعکس اتباعِ حق میں ہی اصلاح ہے اور خواہش کے اتباع میں فساد ہے ۔ صبر ہی بات کا ستون ہے اور اس کے برابر ہی نفع ہوتا ہے ۔ مخلوق پر رحمت کرنا خالق کی رحمت کا دروازہ ہے اور اچھے اخلاق کی کنجی ہے ۔ اسی کے ساتھ حسن ظن اور سلامتی قلب ہے اور اس کے ہوتے ہُوئے حسد و خیانت ختم ہو جاتی ہے ۔ تواضع و نرمی آجاتی ہے ۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے یہ اوصاف تھے ۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ان کو اصحاب منتخب کیا اور ان پر سکینت نازل کی اور رُوح سے اُن کی تائید کی ۔ فرمایا ؛

رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (آپس میں وُہ رحم دل ہیں)

اللہ تعالیٰ نے رحمت کی حقیقت بیان کی۔ فرمایا:
وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ (اور جھکا ان کے آگے کندھے عاجزی کر کے پیار سے)
اس طرح آپؐ کے احباب کی وصف بیان کی اور فرمایا:
اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (مومنوں پر نرم ہیں) چنانچہ یہ تین صفات رقتِ قلب کی کنجیاں اور قساوت کی بندشیں ہیں اور رقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف انابت اور دارِ آخرت پر دھیان رہے گا۔ اس کے حکم پر چوکس اور اس کے وعدہ و وعید کا خیال رکھے گا اور قساوتِ قلبی میں اعراض اور غفلت ہوتی۔ چنانچہ محاسبۂ نفس سے پرہیزگاری حاصل ہوتی ہے اور مشاہدۂ عین الیقین سے موازنہ اور مالک اکبر کے خوف سے بڑی پیشی کی تیاری حاصل ہوتی ہے اور یہی حقیقی زہد ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ اما بعد انسان کو اس چیز کا پانا خوش لگتا ہے کہ جو کھو نہ سکتا ہو اور جو پا نہ سکے۔ اس کا کھونا اسے تکلیف بنتا ہے۔ اس لیے جو دنیا مل جائے۔ اس پر زیادہ خوشی نہ مناؤ اور جو نہ ملے اس پر افسوس کر کے اپنے آپ کو ہلکان نہ کرو۔ جو تو نے آگے بھیجا، اس پر خوش ہونا چاہیے اور جو پیچھے چھوڑا اور جس نے تجھے آخرت سے ہٹایا اور مرنے کے بعد غم لگایا۔ اس پر تجھے افسوس کرنا چاہیے۔

نیز فرمایا:
"خواہش اندھاپن کی شریک ہے، حیرت کے وقت پچھتا رہنا، توفیق ہے، غم کو دور کرنے والی چیز یقین ہے، جھوٹ کا انجام ندامت ہے، سچائی میں سلامتی ہے، کئی دور لوگ قریب سے قریب تر ہیں۔ غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہیں۔ دوست وہ ہے جو پشت پر بھی دوست ہو، دوست سے بدظنی تجھے مٹا نہ دے، بہترین خلق عزت کرنا ہے، ہر اچھائی کا باعث حیا ہے، مضبوط ترین راہ تقویٰ ہے۔ وہ مضبوط سبب کہ جس سے تو اپنے نفس کو قابو رکھے۔ وہ تیرے اور اللہ عزوجل کے درمیان (تعلق) کا سبب ہے، دنیا میں تیرا حصہ اس قدر ہو کہ جس سے تیری (بنیادی) ضرورت پوری ہو جائے۔ روزی دو قسم کی ہے:

۱۔ جس روزی کی تو تلاش کرتا ہے۔
۲۔ اور جو روزی تجھے تلاش کرتی ہے۔ اگر تو اس کے پاس نہ آئے گا تو تیرے پاس یہ خود آئے گی۔ اگر تو اس پر جزع فزع کرتا ہے جو تو نے اپنے سامنے برباد کیا۔ تو جو تجھے حاصل نہیں اس پر جزع فزع مت کرو۔ معدوم پر موجود سے دلیل پکڑ اس لیے کہ امور باہم مشابہ ہیں۔"

ہر چیز کے لیے ایک آفت ہے

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"ہر چیز کے لیے ایک آفت ہوتی ہے۔ علم کے لیے بھول جانا ایک آفت ہے، سستی کرنا عبادت کے لیے آفت ہے۔ غرور کرنا عقل کیلئے آفت ہے، اور برتن کے لیے بھاری پن آفت ہے۔ جھوٹ بولنا تجارت کے لیے آفت ہے، فضول خرچی کرنا سخاوت کے لیے آفت ہے، دکھاوا اور اکڑنا جمال کے لیے آفت ہے، ریاکاری دین کے لیے آفت ہے اور خواہش نفسانی اسلام کے لیے آفت ہے"۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میری امت کے لیے دینار اور درہم آفت ہیں"۔

حضرت ابن عباس کی نصیحت

حضرت وبرۃ سلمیؒ نے حضرت مجاہدؒ سے نقل کیا، کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے مجھے باتوں کی نصیحت فرمائی جو کہ درہم موقوف اور ذہب موصوف (سونے چاندی) سے زیادہ بہترین ہیں۔ فرمایا:

"لایعنی معاملہ میں کلام نہ کر، تیرے لیے اس میں سلامتی ہے اور گناہ سے بے خوف نہ ہو جانا۔ ضرورت کے معاملہ میں بے موقع کلام کر دیا کرتے ہیں۔ اور اس سے تکلیف ہوتی ہے، بردبار اور بے وقوف کا سامنا نہ کرنا۔ بردبار آدمی تجھے پریشان کرے گا اور بے وقوف تجھے ایذا دے گا"۔ تیرا بھائی جب موجود نہ ہو تو اس کے پیچھے ایسی نیابت کرنا جیسے کہ تو اپنے غیر موجود ہونے پر اس کی نیابت چاہتا ہے، جس پر تو اپنے لیے معافی پسند کرتا ہے اسے بھی معاف کر دینا، ایسے آدمی کی طرح عمل کرنا جو جانتا ہے کہ اسے نیکی کا اجر ملے گا اور برائی پر مواخذہ ہوگا"۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے حضرت عبداللہؓ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا:

"میں اس آدمی کو دیکھتا ہوں۔ یہ تجھے بڑوں سے زیادہ مقدم رکھتا ہے اور تیرا اکرام کرتا ہے۔ مجھ سے یہ باتیں یاد رکھنا۔ اس کو اپنا راز نہ دینا، کسی کام میں اس کی نافرمانی نہ کرنا، اس کے پاس بیٹھ کر کسی کی غیبت نہ کرنا اور وہ تیری طرف سے کسی خیانت پر آگاہ نہ ہو اور تجھ پر کسی جھوٹ کا تجربہ نہ کرنے پائے۔ (یعنی کبھی جھوٹ نہ بولنا) یہ دو میں سے ایک روایت ہے اور دونوں کا باہم تداخل ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ میں نے شعبیؒ سے کہا: ان میں سے ہر ایک ایک ہزار سے زیادہ بہتر ہے۔ انہوں نے فرمایا: ان میں سے ہر ایک دس ہزار سے زیادہ بہتر ہے۔

جن سے ایمان مکمل ہوتا ہے

یوسف بن اسباطؒ نے فرمایا:

"یہ کہا جاتا کہ جس میں یہ تین باتیں ہوں۔ اس کا ایمان مکمل ہے:

۱۔ جب وہ راضی ہو تو باطل کی طرف اس کی رضا نہ لے جائے۔

۲۔ جب اسے غصہ آئے تو اس کا غصہ اسے حق سے نہ ہٹائے۔

۳۔ جب اسے قوت حاصل ہو تو اس پر قبضہ نہ کر بیٹھے جو اس کی ملکیت کی چیز نہیں۔ یہ ایک طریق سے سند ہے۔"

حضرت سریؒ بن مغلس نے فرمایا:

"تین باتوں سے یقین کا پتہ چلتا ہے:

۱۔ ہلاکت کے مواقع میں حق پر قایم رہنا۔

۲۔ مصیبت آنے پر اللہ تعالیٰ کے حکم کو تسلیم کرلینا۔

۳۔ نعمت زایل ہونے پر قضائے الٰہی پر راضی رہنا۔"

اللہ تعالیٰ ہمیں زوال نعمت سے اپنی پناہ عطا فرمائے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"تین باتیں ایسی ہیں کہ جس میں ہوں گی اس کا ایمان مکمل ہوگیا۔

۱۔ اللہ کے بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرے۔

۲۔ اپنا کچھ عمل نہ دکھاتا پھرے۔

۳۔ جب اس کے سامنے دو باتیں پیش کی جائیں ایک دنیا اور دوسری آخرت، تو دنیا پر آخرت کو ترجیح دے۔"

نجات و ہلاکت کے کام

ایک مشہور حدیث میں ہے:

"تین نجات دینے والی اور تین ہلاک کرنے والی ہیں۔ نجات دینے والی حسب ذیل ہیں:

۱۔ پوشیدہ اور ظاہر حال میں اللہ سے ڈرنا۔

۲۔ رضا و غضب میں حق بات کرنا۔

۳۔ غنا اور فقر ہر حال میں اعتدال پر رہنا۔

اور ہلاک کرنے والی (تین باتیں) حسب ذیل ہیں:

۱۔ بخل جس کا اتباع کیا جائے۔

۲۔ خواہش (نفسانی) جس کی تابعداری کی جائے۔

۳۔ اور انسان کا اپنے آپ پر غرور و گھمنڈ کرنا۔"

حدیث میں آتا ہے:

"احترام کرنا تقویٰ ہے اور شرف تواضع ہے اور غنا یقین ہے۔"

ایک دُوسری حدیث میں آتا ہے:

"ایمان برہنہ ہے، اس کا لباس تقویٰ ہے، اس کی زینت حیا ہے اور اس کا پھل علم ہے۔"

حضرت عمارؓ کی حدیث میں ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کی:

"موت کی نصیحت کافی ہے، خوف کا علم کافی ہے، یقین کا غنا کافی ہے اور عبادت کا شغل کافی ہے۔"

سید الخطبا، خطیب الخطبا، حکیم الحکما، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ایسے جامع اور معجز الفاظ کے ساتھ وعظ و نصیحت فرمائی اور زہد و تقویٰ پر خطبہ دیا کہ تمام مفہومات کو اپنے خطبہ مبارکہ میں سمو کر رکھ دیا۔ ابان بن عیاشؒ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُونٹنی پر سوار ہو کر خطبہ دیا اور فرمایا:

"گویا ہم سے علاوہ پر اس میں موت لکھی گئی اور گویا اس میں ہم سے علاوہ پر حق لازم ہُوا۔ گویا (ہم یہ سمجھے بیٹھے ہیں) کہ جن مردوں کو ہم سفرِ (آخرت) پر بھیجتے ہیں۔ وُہ ایسا ہے کہ جلدی ہی ہماری طرف واپس آجائیں گے۔ چنانچہ ہم ان کی قبریں تیار کرتے ہیں اور ان کی وراثت ہم کھاتے ہیں۔ گویا ان کے بعد ہم ہمیشہ یہاں رہیں گے۔ ہم نے ہر نصیحت بھلا دی اور ہم ہر ہلاکت سے بے خوف ہو کر بیٹھ گئے۔ خوشی ہے اس کیلئے کہ جو لوگوں کے عیوب سے (غافل ہو کر) اپنے عیوب میں ڈوب گیا اس نے نافرمانی کے بغیر مال کمایا، مساکین اور غربا پر رحم کیا۔ اہل فقہ اور اہل حکمت سے اختلاط رکھا اس کے لیے خوشی ہے کہ جس نے اپنے آپ کو ہموار کیا۔ اس کا اخلاق اچھا ہُوا، اس کا باطن درُست ہُوا لوگوں سے اس کی برائی دُور ہوگئی۔ اس کے لیے خوشی ہے جس نے اپنے علم پر عمل کیا۔ اپنا فالتو مال (اللہ کی راہ میں) خرچ کیا۔ فالتو کلام محفوظ رکھا۔ سنت پر چلا، اور

بدعت کی طرف نہیں آیا۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان معانی کی ایک جامع اور مختصر الفاظ کی حدیث مروی ہے اسے نصف علم تک کہا جاتا ہے، فرمایا:

"انسان کا بہترین اسلام یہ ہے کہ وُہ لایعنی چھوڑ دے۔"

اور بندے پر جو بات فرض کی گئی، نہ ہی فضیلت کے باعث وہ مستحب کام ہے اور نہ ہی مباح کا درجہ اسے حاصل ہے۔ وُہ لایعنی ہے۔

ایک دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ جو کہ نصف تقویٰ ہے، فرمایا:

"جو شبہ کی بات ہے اسے چھوڑ کر (اسے اختیار کر) جو کہ شبہ کی نہیں ہے۔ اس لیے کہ گناہ دلوں کے پڑوس میں ہوتے ہیں۔" یعنی جس قول و فعل میں تجھے شبہ ہے اسے چھوڑ دے۔ اس لیے کہ اس طریق میں غنیمت یا سلامتی ہے۔ اب تو یا تو فضیلت والے یقین پر ہے یا سلامتی والے یقین پر ہے اور جس سے تیرے دل میں شبہ پیدا ہوا اور شرح صدر نہ ہو سکے، اسے چھوڑ دے، یہ گناہ ہے چاہے چھوٹا اور باریک گناہ ہو۔

اہل ایمان کے اوصاف بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بسط و شرح کے ساتھ مروی ہیں جس طرح کہ اللہ تعالیٰ اپنی واضح کلام میں اپنے اولیائ کے اوصاف بتائے۔

ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے صحابہ میں تشریف فرما تھے۔ اچانک آپؐ نے طویل سجدہ کیا۔ پھر سر اٹھایا اور دونوں ہاتھ بڑھائے ہوئے تھے۔ اور دُعا کی:

اَللّٰھُمَّ اَکْرِمْنَا وَلَا تُھِنَّا وَ زِدْنَا وَلَا تَنْقُصْنَا وَ اَعِزَّنَا وَلَا تُذِلَّنَا۔ (اے اللہ! ہمیں عزت عطا کر اور ہمیں رسوا نہ کر اور ہمیں زیادہ کر اور ہمیں کم نہ کر، اور ہمیں عزت دے اور ہمیں ذلیل نہ کر)

(صحابہ) فرماتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسول! وہ کیا ہے؟"

آپؐ نے فرمایا:

"یہ آیات پر اتارا گیا کہ جو انہیں قائم کرے وُہ جنت میں داخل ہُوا۔"

پھر آپؐ نے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ سے لے کر آخر تک دس آیات (پ۱۸ کا آغاز)

اہل جنّت کے اوصاف

ایک مجمل حدیث میں روایت ہے کہ ایک آدمی نے آپؐ سے پوچھا، "اے اللہ کے رسولؐ! مجھے کب معلوم ہوگا کہ میں اہل جنت سے ہوں؟"

دُوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں : کہ

• کیا میں حقیقی مومن ہُوں ؟

آپؐ نے فرمایا :

"جب تم میں یہ اوصاف ہوں گے"۔ (تو حقیقی مومن ہوگا)

پھر آپؐ نے اس کے سامنے قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ آخر تک پڑھی۔ چنانچہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے توحید وعمل میں صاحبِ اخلاص بندوں کے اوصاف بیان کیے آپؐ نے بتائے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" اگر صرف یہی ایک آیت نازل ہوتی تو کافی تھی۔ پھر آپؐ نے سورۃ الکھف کی آخری آیت تلاوت کی۔ (یعنی) فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا سے آخر تک۔ اور اہل خرد کے لیے آپؐ کا یہ بیان بہت ہی واضح ہے۔ چنانچہ عبارت میں خالص عمل صالح اور شرک کی نفی کرنا ہی توحیدِ خالق پہ یقین کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خائف اولیاء کے بارے میں فرمایا :

اِنَّ الَّذِیْنَ هُمْ مِنْ خَشْيَةِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ يُؤْمِنُوْنَ [۱] (بے شک وُہ جو اپنے رب کے خوف سے ڈرتے ہیں اور جو اپنے رب کی آیات پہ ایمان لاتے ہیں) اس سے لے کر وَهُمْ لَهَا سَابِقُوْنَ تک۔ سات مقامات میں جامع صفات بیان فرمائیں۔ ان میں اہل محاسبہ کے مقامات اور اہل مراقبہ کے احوال کی ترتیب ملتی ہے۔ خشیۃ و اشفاق (خوف و ڈر) سے آغاز کیا اور یقین کو ان کا موجب بنایا اور اس سے اہل تقویٰ (کی نیکیوں کے) اوزان بھاری ہو رہے ہیں۔ اسے آخری وصف بنایا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی یہی ہے کہ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ (بے شک وہ اپنے رب کی طرف لوٹنے والے ہیں) یعنی انہیں اللہ کے سامنے جانے کا یقین ہے اس لیے وہ اس سے ڈرے اور اس پر ایمان لائے، اور اخلاص اختیار کیا۔ اپنی جانوں اور مالوں کو پیش کر دیا۔ چنانچہ کلام اللہ میں آتا ہے کہ :

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ [۲] (اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بیشک تم اس سے ملنے والے ہو اور مومنوں کو خوشخبری دو)

چنانچہ ڈرنے والوں کو ملاقات کے وقت خوف سے امان حاصل ہوگا۔ ان کی دُوسری زندگی بہتر ہوگی۔

---

[۱] سورۃ مومنون آیت ۵۷
[۲] سورۃ بقرۃ آیت ۲۲۳

اور انہیں قرب و زیارت کا شرف حاصل ہوگا۔

محاسبہ کا طریق

محاسبہ کا طریق یہ ہے کہ جب کوئی کام کرنے لگے تو بندہ اپنے آپ کا جائزہ لے۔ پھر خیال کا امتیاز کرے جو کہ حرکتِ قلب کا نام ہے اور اضطراب یعنی بدنی تصرف پر دھیان کرے۔ اگر اس خیال سے جو نیت یا ارادہ یا عزم کر رہا ہے یا کسی فعل یا کام کا ارادہ ہے۔ یہ سب اللہ عزوجل کے لیے ہے۔ اللہ عزوجل کی مراد یہی اور اسی میں ہے یعنی خالص اسی کی خاطر ہے۔ اسی کے مشاہدہ قرب کے ساتھ ہے۔ نفسانی قرب کے باعث نہیں کر رہا اور اس کی راہ میں اور اس کی رضا کی خاطر کر رہا ہے اور اس کے ہاں یہ مندوب و مستحب ہے۔ تو اس کام کو کر ڈالے اور جلدی سے اس پر عمل کرے اور اگر کسی دنیاوی فائدہ کی خاطر کر رہا ہے یا کسی خواہش یا لہو و لعب کی خاطر کر رہا ہے، یا طبیعتِ بشری کا مخفی راز ہے اور جبلی فائدے کی خاطر کر رہا ہے تو اس کی نفی کرے اور تیزی سے اس کا انکار کر ڈالے۔ دل میں اس کی طرف دھیان نہ لگائے اور اس کا ذکر تک نہ کرے۔ یہ کام اس میں خراب ارادے پیدا کرے گا اور انہیں دور کرنا مشکل بن جائے گا اور اس سے ایسا غلط فکر پیدا ہوگا کہ نفی کرنے کے بعد اس کو ہٹانا دشوار ہوگا اور دل پر ایسا اثر ڈالے گا کہ اس کے کرنے کے بعد اس کا اثر نمایاں ہو جائے گا۔ (اس لیے دنیاوی یا نفسانی باتوں سے سختی سے پرہیز کرے)

مشتبہ کا حکم

اب اگر یہ خیال مشتبہ ہو جائے اور یہ پتہ نہ چل سکے کہ یہ بات محمود ہے اور اس میں اللہ کی رضا ہے یا نہیں۔ یہ کام کرنا چاہیے یا یہ ناپسند فعل ہے اور اس میں اللہ کی کوئی محبت نہیں ہے۔ اس کی نفی سے قرب و مزید (نیکی) حاصل ہوگی یا نہیں۔ اب یہ اشکال تین وجوہ میں سے ایک طرح سے ہوتا ہے:

۱۔ معرفت کی کمی کے باعث یقین کمزور ہو۔

۲۔ باطل کی دقیق غلطیوں سے جہالت اور علم کی کمی ہو۔

۳۔ طبائع حس سے پیدا ہونے والی نفس میں پوشیدہ خواہش کا غلبہ ہو۔

یاد رکھو اللہ تعالیٰ نے مشتبہ امور سے رک جانے کا حکم دیا ہے کہ بندہ عزم و ارادہ سے اس طرف ہی نہ جائے۔ یہ دل کا عمل ہے اور فعل و سعی بھی نہ کرے کہ یہ اعضاءِ ظاہر کا عمل ہے بلکہ حقیقت حال واضح ہو جانے تک متوقف رہے اور یہی ورع (تقویٰ) کی صورت ہے۔ ورع کا معنی ہے۔ بزدلی اور اشکالات و شبہات میں پڑنے سے رک جانا۔ قول، فعل اور عزم کسی طرح سے بھی حصہ نہ لے جب تک کہ مسئلہ کھل نہ جائے اور چونکہ مشتبہ مسائل غامض ہوتے ہیں اس لیے دقیق اور غامض علوم سے ہی حل ہوتے

ہیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ:

"سب لوگوں سے زیادہ عالم وہ ہے کہ جب لوگوں کا اختلاف ہو جائے تو وہ حق کا سب سے زیادہ شناسا ہو۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"بے شک اللہ عزوجل ایسے آدمی سے محبت کرتا ہے کہ جو شبہات کے موقع پر صاحبِ بصارت ہو اور نقد و جرح کر سکے اور شہوات کے ہجوم پر عقل کامل رکھتا ہو۔"

حضرت ابن مسعودؓ سے کثرتِ شبہات کے بارے میں آتا ہے:

"آج تم ایسے زمانہ میں ہو کہ تم میں سے تیز چلنے والا بہترین ہے اور تم پر ایسا زمانہ بھی آنے والا ہے کہ توقف کرنے والا تم میں بہترین ہو گا۔"

جیسے کہ صحابہ کی ایک جماعت نے اہل عراق اور اہل شام کے ساتھ مقابلہ سے توقف فرمایا اس لئے کہ حقیقتِ حال مشتبہ ہو گئی تھی مثلاً حضرت سعدؓ، ابن عمرؓ، اسامہؓ اور محمد بن مسلمہؓ وغیرہم۔ اور جو آدمی شبہات کے موقع پر توقف نہ کرے بلکہ بڑھ کر حصہ لے۔ وہ اپنی خواہش نفس کا تابعدار اور اپنی رائے پر غرور کرنے والا ہے۔ جس حدیث میں اس کی مذمت آئی ہے اس کا یہی مفہوم ہے، فرمایا:

جب تم بخل دیکھو (جس کا) اتباع کیا گیا اور خواہشات (دیکھو) جن کی پیروی کی گئی اور ہر آدمی کا اپنی رائے پر گھمنڈ کرنا (دیکھو) تو اپنے آپ کی حفاظت کرتے رہو۔

چنانچہ آپؐ نے بخل کے وجود کی مذمت نہیں کی اس لیے کہ وہ نفس کی ایک صفت ہے بلکہ بخل کے باعث اللہ کی رضا کی خاطر خرچ نہ کرنے اور مال روک رکھنے کی مذمت فرمائی، اسی طرح وجودِ خواہش کی مذمت نہیں کی۔ اس لیے کہ یہ روحِ نفس ہے اور اس میں جاگزین ہے بلکہ خواہش کے اتباع کی مذمت کی اور ایسے ہی رائے کے موجود ہونے کی مذمت نہیں فرمائی، اس لیے کہ ہر کام میں بندے کی ایک رائے ہوتی ہے اور یہ عقل و فہم کا نتیجہ اور پھل ہے البتہ اپنی رائے کو حرفِ آخر سمجھنا اور خالق ارض و سماء کی طرف سے اور اس کے نورِ ہدایت سے آنکھیں بند کر کے اپنی رائے پر نازاں ہو جانا قابلِ مذمت ہے کہ میری رائے سے بڑھ کر کسی کی رائے وقیع نہیں یا اپنی رائے ہونے کے باعث دوسروں کی آراء کو مسترد کرنا ایک غلط طریق ہے۔ اللہ عزوجل نے فرمایا:

فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ (سو اپنے آپ کی پاکیزگی بیان نہ کرو)

اور اللہ تعالیٰ نے اہل رائے اولیا کرام کی تعریف فرمائی:

اِنَّ فِیْ ذٰالِکَ لَاٰیٰاتٍ لِلْمُتَوَسِّمِیْنَ (اس میں نشانیاں ہیں تلاش کرنے والوں کے لیے)

ایک جگہ فرمایا:

عَلٰی بَصِیْرَۃٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِیْ (میں اور میرے تابعدار بصیرت پر ہیں)

حدیث میں آتا ہے:

"جس بات کو اہلِ ایمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک اچھی ہے اور جس کو اہل ایمان بُرا سمجھیں، وہ اللہ کے نزدیک بری ہے۔"

ایک جگہ فرمایا:

"تم زمین میں اللہ کے گواہ ہو۔"

بعض سلف سے منقول ہے:

"افضل عبادت، اچھی رائے ہے اور اگر امثال کے باہم مشاکلت کے باعث کسی بات میں اشتباہ ہو جائے اور مسئلہ واضح ہو کر سامنے نہ آئے تو پرہیزگاری یہی ہے کہ وضاحت ہو جانے تک توقف کرے اور اس کام کو نہ کرے اور اگر علم استدلال کی کمی کے باعث کوئی بات مشتبہ ہو تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ حلال و حرام کی دو اصلوں کو پہچانے۔ پھر ان دونوں کے مشابہ سے اس کو ملا کر دیکھے مثلاً ایک گروہ نے خوبصورت لڑکے کی طرف نظر کرنے کو حلال بتایا اس لیے یہ مذکر ہے۔ اب دو اصلوں میں سے کسی ایک سے ملا کر ہی حقیقتِ حال کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

۱۔ اُنْظُرُوْا اِلٰی ثَمَرِہٖ اِذَا اَثْمَرَ (اس کے پھل کو دیکھو جب وہ پھل لایا)

اور ایک جگہ فرمایا:

۲۔ قُلْ لِلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ۔ (مومنوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی آنکھیں نیچی کر لیں)

اب یہ اصل وجودِ جنس کے باعث زیادہ مشابہ ہے اور اس طرح نظمیں یعنی خالی اشعار سننا مباح ہے اور قرآن پاک کا سننا حلال ہے اور گانا سننا حرام ہے اور جو نظمیں گانے سے مشابہ ہوں، وہ نااہل کے لیے مکروہ ہیں۔ اسی طرح قرآن کو لحن سے پڑھے اور مقصورہ اور ممدودہ مدوں میں کمی بیشی کر ڈالے تو گانے سے مشابہت کے باعث اس طرح قرأت کرنا مکروہ ہے۔ ایسے ہی کپاس اور ریشم پہننے کا حکم ہے۔

بدظنی سے پرہیز کرو

جو دقیق باتیں سماع پر واضح نہیں وہ دیکھنے میں بھی غیر واضح ہیں۔ ان میں پڑنا درست نہیں۔ اس لیے کہ دلوں سے بدظنی کرنے کے بارے میں پوچھا جائیگا اور اس پر قطعیت کا حکم لگانا قابلِ پرسش ہے۔ اللہ تعالیٰ کا اس حکم میں یہی مطلب ہے کہ جب تک ایک مسئلہ واضح نہ ہو جائے۔ اس میں توقف اختیار کرو، چنانچہ فرمایا:

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ یعنی جس بات کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ اور نہ ہی اس کا اتباع کر اور سماعت، رویت یا عزمِ قلبی کے ذریعہ اس کی گواہی نہ دے اس لیے کہ علم کی حقیقت سمع و مشاہدہ سے ہے۔ فرمایا:

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا۔[۱]

(بے شک کان، آنکھ اور دل سب سے پرسش ہوگی)

اس طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ظن سے بچتے رہو اس لیے کہ (بد) ظنی سب باتوں سے بڑا جھوٹ ہے۔"

اب اگر ایک آدمی پر کوئی بات مشتبہ ہو مگر وہ اس کو پختہ کر ڈالے تو اس نے خواہش نفس کا اتباع کیا اور جس نے کسی پوشیدہ فعل وامر میں گمان لگا کر ہی اسے خبر بنا دیا اور اپنے ساتھی پر واضح کر دیا تو اس نے گناہ کیا اور یہ کیونکر نہ ہو جبکہ ایک حدیث میں آتا ہے:

"جس نے اپنی آنکھوں دیکھا واقعہ بیان کرنا شروع کر دیا۔ کانوں سنی بات بتانی شروع کر دی۔ اللہ عزوجل نے اس کو ان میں لکھ دیا۔ جو کہ مومنوں کے درمیان فحاشی کا پھیلاؤ پسند کرتے ہیں۔"

یہ اس وجہ سے گناہ ہے کہ اللہ کے بندوں کی پوشیدہ باتوں کو پھیلانا اور مسلمانوں کی پردہ دری کرنا گناہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دعا کیا کرتے۔

اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا فَنَتَّبِعَهٗ وَالْبَاطِلَ بَاطِلًا فَنَجْتَنِبَهٗ وَلَا تَجْعَلْ ذٰلِكَ عَلَيْنَا مُتَشَابِهًا فَنَتَّبِعَ الْهَوٰى۔

(اے اللہ! ہمیں حق کو حق دکھا تاکہ ہم اس کی تابعداری کریں اور باطل کو باطل دکھا تاکہ ہم اس سے پرہیز کریں اور ہم پر اسے متشابہ نہ بنا کہ ہم اس کی پیروی کرنے لگ جائیں)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منقول ہے:

---

[۱] سورۃ بنی اسرائیل آیت ۳۶۔

تمام امور تین قسم کے ہیں:

۱۔ جس بات کی بھلائی تیرے سامنے واضح ہوگئی تو اس کا اتباع کرو۔

۲۔ جس کی بات کی برائی تیرے سامنے واضح ہوگئی تو اس سے پرہیز کرو۔

۳۔ جو بات تجھ پر مشتبہ ہو اسے کسی جاننے والے کے سپرد کر دے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ دعا کیا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِكَ اَنْ اَقُوْلَ فِی الْعِلْمِ بِغَیْرِ عِلْمٍ۔

(اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ علم میں بغیر علم کے کلام کروں)

چنانچہ جس طرح اظہار حق اور بیان صدق میں اللہ کا انعام ہے اس طرح باطل کے باطل معلوم ہونے اور گمراہی کے گمراہی معلوم ہونے میں اللہ کی نعمت ہے اس لیے کہ یہ یقین کی راہ سے ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ احسان فرمایا اور اسے تفصیل آیات بنایا، فرمایا:

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ [1]

(اور اسی طرح ہم آیات کی تفصیل کرتے ہیں اور تاکہ ہم مجرموں کی راہ واضح کرتے ہیں)

چنانچہ اسم مضمر کرکے سبیل کو منصوب کیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے متقی لوگوں کے ساتھ وعدہ فرمایا اور اسے برائیوں کے کفارہ اور بخشش پر مقدم کرکے ذکر کیا اور اسے ایک عظیم فضل قرار دیا۔ چنانچہ فرمایا:

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ [2]

(اے وہ جو ایمان لائے۔ اگر تم اللہ سے ڈروگے تو تمہارے لیے اسے (حق و باطل کے درمیان) امتیاز کر دے گا اور تمہاری برائیوں کو تم سے دور کر دے گا۔)

یعنی تمہارے دلوں میں ایسا نور پیدا فرما دے گا جس کی برکت سے تم شبہات کے درمیان تفریق کروگے۔ اسی طرح فرمایا:

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا [3]

(اور جو اللہ سے ڈرے گا اس کے لیے نکلنے کی راہ بنا دے گا)

یعنی جو بات لوگوں پر مشتبہ ہوگی اسے واضح کر دے گا۔ اور فرمایا:

وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔

(اور اسے وہاں سے روزی دے گا کہ جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہوگا)

---

[1] سورۃ انعام۔ آیت ۵۵ [2] سورۃ انفال آیت ۲۹ [3] سورۃ الطلاق آیت ۲۔

یعنی بغیر سیکھے علم سیکھے گا بلکہ اللہ خبیر و علیم سے اسے الہام و توفیق حاصل ہوگی۔

سرکشی کی بنا پر یعنی حسد و کبر کی وجہ سے علماء کے اختلاف کے وقت اللہ تعالیٰ نے مومنوں سے اس بات کا وعدہ فرمایا اور منافقین کو محروم رکھا جو کہ آیات اور غائب قدروں کی تصدیق نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سلسلہ میں فرمایا:

وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ[۱]

(اور نہیں اختلاف کیا اس میں مگر ان لوگوں نے کہ جنہیں دیا گیا بعد اس کے کہ ان کے واضح دلائل آئے)

اب حق کی صنعتِ ہدایت یہ ہے کہ حق واضح ہو جائے جب متقی کے لیے حق واضح ہو جائے تو اس کے لیے ظہور باطل ابتلاء ہو اور بندے پر احکام کا اعادہ نہ ہو اور گاہے دشمن کو بھی باطل کا نام دیا جاتا ہے اور نفس کا ایک وصف بھی (باطل) کہلاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(قُلْ) جَاءَ الْحَقُّ وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيدُ[۲]

(کہہ کہ آیا حق اور پہلی بار پیدا کرتا معبود باطل اور نہ دوبارہ کرتا ہے)

یعنی جب حق آیا تو اس نے باطل کا آغاز و انجام سب واضح کر دیا۔

ایک قول کے مطابق یہاں پر باطل سے مراد ابلیس ہے۔ خوب غور کرلو۔ اور فرمایا:

إِنَّ الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ لَا يَهْدِيهِمُ اللَّهُ[۳]

(بے شک جو لوگ اللہ کی آیات پر ایمان نہیں لاتے اللہ انہیں سیدھی راہ نہیں دکھائے گا)

اور جس طرح اظہار و بیان میں اللہ کی نعمت ہے کہ قدرت کے بغیر یہ نہیں ہوتی۔ فرمایا:

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔

(سو جب اس کے لیے واضح ہوگیا تو کہا میں جانتا ہوں کہ بے شک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے)

اس طرح بندے پر اس میں شکر لازم ہے اور گاہے یہ انعام بیان کا سبب ہوتا ہے اور شکر پر اللہ تعالیٰ مزید انعام فرماتا ہے۔ فرمایا:

كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ

(اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی آیات کھول کر بیان

---

[۱] سورۃ البقرۃ آیت ۲۱۳ [۲] سورۃ سبا آیت ۵۰ [۳] سورۃ النحل آیت ۱۰۴۔

لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (کرتا ہے تاکہ تم شکر ادا کرو)

اور شکر پر مزید انعامات کے بارے میں فرمایا:

كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ۔ (اسی طرح ہم شکر کرنے والی قوم کے لیے نشانیاں بیان کرتے ہیں)

جب بندہ مشتبہ امور میں توقف کرتا ہے اور ان کا خیال بھی نہیں لاتا۔ آخر کار اللہ تعالیٰ اسے مزید علم یا قوتِ یقین کے باعث حقیقتِ حال بتا دیتا ہے یا خواہشِ نفس کا پردہ اٹھ جاتا ہے تو وہ صحیح راہ پا لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مطلب ہے کہ

وَ اٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَ فَصْلَ الْخِطَابِ۔ (اور ہم نے اسے حکمت اور واضح خطاب عطا کیا)

یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں داخل ہے کہ

وَ مَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا۔[1] (اور جسے حکمت دی گئی اسے بہت ہی بھلائی عطا کی گئی)

یہ تب ہے کہ جب طلب کرنے سے رہ جاتا ہے اور دوسرے عالم کا اس میں ایسا مقام نہ ہو کہ اس کا وصف بندے پر کھل جائے اور جب اس نے اپنے اولیاء کے لیے اسے طلب کے ساتھ چاہا اور علماء کا اس کی طرف رہنمائی کرنے میں ایک مقام ہو تو کسی عالمِ ربانی سے معلوم کرنا لازم ہے جو کہ باطن سے آگاہ لطیف حجاب اور مخفی کشف کا شناسا ہو۔ چنانچہ اس کی زبان پر یہ (مشتبہ) واضح ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:-

فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔[2] (چنانچہ اہل ذکر سے پوچھو اگر تم نہیں جانتے)

اور فرمایا:

اَلرَّحْمٰنُ فَاسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا۔ (رحمٰن، چنانچہ کسی آگاہ سے پوچھو)

سیر اوّل اور مبین آخر اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ البتہ بندے پر سیر و سوال لازم ہے اور ہادی مبین پر ہدایت دینا اور واضح کرنا ضروری ہے۔ جیسے کہ فرمایا:

سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا۔ (زمین چلو سو دیکھو)

---

[1] سورۃ بقرۃ آیت ۲۶۹ [2] سورۃ النحل آیت ۴۳۔

اور فرمایا:

فَاِنۡ کُنۡتَ فِیۡ شَکٍّ مِّمَّاۤ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ فَسۡئَلِ الَّذِیۡنَ یَقۡرَءُوۡنَ الۡکِتٰبَ ۔ (سو اگر تم اس میں شک میں ہو کہ جو ہم نے تیری طرف نازل کیا، تو جو کتاب پڑھتے ہیں اُن سے پوچھ لو)

پھر فرمایا:

اِنَّ عَلَیۡنَا بَیَانَہٗ ۔ (بیشک ہمارے ذمہ اس کا کھول کر بیان کرنا ہے)

اِنَّ عَلَیۡنَا لَلۡھُدٰی ۔ (بیشک ہمارے ذمہ راہ دکھانا ہے)

وَعَلَی اللّٰہِ قَصۡدُ السَّبِیۡلِ ۔ (اور اللہ پر)

اس سے پہلے دور میں اللہ کا یہی طریقہ تھا اور اس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں آتا۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ کُلَّھَا ۔ (اور آدم کو تمام نام سکھا دیے)

چنانچہ ان کو تعلیم کے لیے منتخب کیا گیا اور یہ اللہ عزّ وجل سے مخصوص تفہیم کے ذریعہ تعلیم حاصل کرتے رہے۔ چنانچہ فرمایا:

یٰۤاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡھُمۡ بِاَسۡمَآئِھِمۡ فَلَمَّاۤ اَنۡۢبَاَھُمۡ بِاَسۡمَآئِھِمۡ [1] (اے آدم، انہیں ان کے نام بتاؤ۔ سو جب انہوں نے ان کے نام بتائے)

پھر آدم کا ذکر ترک کر کے اپنا ذکر کیا اور علم کے ساتھ ذکر فرمایا۔ فرمایا:

اَلَمۡ اَقُلۡ لَّکُمۡ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ ۔ (کیا میں نے تمہیں کہا نہیں کہ میں علم رکھتا ہوں)

اور یہ نہیں فرمایا کہ آدم علم رکھتا ہے۔ سو آدم علیہ السلام نے اپنے مقام و درجہ کے مطابق اپنے رازق سے (علم) حاصل کیا اور فرشتوں نے اللہ عزّ وجل سے اپنے اپنے جیسے نصیبہ آدم سے اسکے واسطے سے حاصل کیے۔ اور اللہ تعالیٰ روزی دینے والا قوتِ غالب والا ہے۔ جیسے کہ وہ پیدا کرنے والا ہے۔ فرمایا:

ھَلۡ مِنۡ خَالِقٍ غَیۡرُ اللّٰہِ یَرۡزُقُکُمۡ [2] (کیا اللہ کے سوا کوئی خالق ہے جو تمہیں روزی دیتا ہو)

اور عام بندے اپنے اپنے نصیب کے مطابق اپنا اپنا حصہ حاصل کرتے ہیں۔

---

[1] سورۂ بقرۃ آیت ۳۳۔ [2] سورۃ فاطر آیت ۳۔

مقامِ مقربین

اور محاسبہ کے ساتھ تحقیق یہ ہے کہ یہ دیدارِ رقیب کا پہلا مراقبہ ہے اور مراقبہ کا مقام دراصل اہلِ یقین کے احوال میں سے ایک حال ہے اور علمِ ایمان کا آخری درجہ علم یقین کہلاتا ہے۔ یعنی شہادتِ معرفت، اور اس تعریف پر مشاہدہ کی ابتداء شہادت ہے اور مقربین کا یہی مقام ہے یعنی وصفِ قریب کا مشاہدہ کرنا اور بُعدِ نفس کے ساتھ اس کا احاطہ کر لیتا ہے۔ چنانچہ اس پر غالب آ جاتا ہے۔ آخر اس کا بُعد اس کے قرب میں غائب ہو جاتا ہے اور اس کی عقل اس کے ظن کے تحت بیدار ہوتی ہے۔ اور اس کی حکمت اس کی قدرت میں لپٹ جاتی ہے۔ جیسے کہ سورج کی روشنی میں چاند کی روشنی غائب ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے امر پر غالب ہے۔ اسماء و صفات کے معانی، اخلاق کی تعریف اور احکامِ ذات کے بواطن، مقاماتِ قرب میں نورِ چہرہ کے آئینہ کے ساتھ ہوتے ہیں۔ چنانچہ حکمِ مکان کا نور پلٹتا ہے اور گواہی دیتا ہے۔ گویا یہ آئینہ ہونے کا رفع ہے اور چہرہ اس کے نور کی گواہی دیتا ہے۔ اور آئینہ اس کے سکون سے غائب ہو جاتا ہے۔ اب بندہ اس کے غلبۂ قبولیت کے ذریعہ کھڑا ہے۔ اس طرح بندہ ایک مردے کی طرح ہو جاتا ہے جو کہ کون سے نہیں بلکہ حیطۂ قرب میں مشاہدہ کر رہا ہے جیسے کہ چہرہ آئینے کے نور کا شاہد تو ہے مگر اسے گرفت میں نہیں لا سکتا اور یہ بات اس وقت حاصل ہو سکتی ہے کہ جب وصف کا معاینہ حاصل ہو جائے۔ تمام معاملہ میں حُسنِ مراقبہ اور حضوریٔ پروردگار میں حسن ادب حاصل ہو جائے اور یہ بات بھلائی کے ارادوں کو نافذ کرکے اور پوشیدہ خیالات کی تیزی سے نفی کر کے ملتی ہے۔ حتیٰ کہ ان (خیالات) میں سے کچھ باقی نہ رہے اور یہ مشاہدہ قرب کا حال ہے اور یہی چیز بندے کو علمِ یقین کے ذریعہ صفائیِ قلب تک لے جاتی ہے اور دل کی صفائی اسے مشاہدۂ یقین کے بلند مقامات تک پہنچا دیتی ہے۔ آخر کار اس کے دل میں صرف حق کا خیال ہی آتا ہے۔ اس کی نافرمانی، حق کی نافرمانی ہو گی اور اسے متروک کرنے اور اس سے اعراض کرنے میں دل کی کدورت ہو گی اور اس کی کدورت میں ظلمت ہو گی۔ قساوت میں یہ مقامات ہیں اور یہ پہلا بُعد ہے۔

قبولیتِ عمل کی تین شرطیں

ہر فعل پر تین سوالات ہوں گے چاہے وہ کس قدر حقیر کام ہو۔

۱۔ کیوں؟

۲۔ کس لیے؟

۳۔ کس کے لیے؟

اب "کیوں؟" کا مطلب یہ ہے کہ تم نے یہ کام کیوں کیا؟ اس پر پروردگار تعالیٰ کی طرف سے بندگی کے حکم کے باعث مقامِ ابتلاء ہے کہ تجھ پر لازم کیا گیا تھا کہ تو اپنے آقا کے فرمان پر یہ عمل کرے

یا تونے یہ فعل اپنی خواہش کی بنا پر کیا؟ اگر یہ تسلیم کر لیا گیا کہ اس پر لازم تھا کہ اپنے آقا کے حکم کے باعث یہ عمل کرے تو دوسرا سوال ہوگا کہ یہ کام کس طرح کیا؟ یہ مطالبہ بالعلم کی جگہ ہے۔ یہ دوسرا ابتلاء ہے، یعنی مان لیا کہ تجھ پر یہ لازم تھا۔ اب تونے علم کی روشنی میں یہ کام کیا یا جہالت کے ساتھ یہ فعل کیا؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص طریق کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں کرتا اور اس کا طریق علم (اسلام) کہلاتا ہے۔ اگر اس کا جواب بھی معقول ہُوا تو تیسرا سوال ہوگا کہ کس کے لیے کام کیا؟ اس میں پروردگار تعالیٰ کی طرف اخلاصِ عمل کا مطالبہ ہے۔ یہ تیسرا ابتلاء ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی بندوں کے حق میں فرمایا:

اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ [1] (سوائے تیرے ان بندوں کے جو اخلاص والے ہیں)

غیر اللہ کی نفی کے کلمہ اخلاص یعنی لا الٰہ الا اللہ سے یہی مراد ہے اور اس کے بعد وقتِ ملاقات کے لیے خوف و ڈر کے سوا کچھ چیز نہیں۔ یعنی بے شک تونے علم کے ساتھ عمل کیا۔ خالص اللہ کے لیے عمل کیا، پھر تو تمھارا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور اگر اپنے جیسے کسی آدمی کے لیے عمل کیا تو اپنا اجر اس سے وصول کرتے پھرو۔ اور اگر دنیا کی خاطر عمل کیا تو ہم نے یہیں اس کا اجر دے دیا اور اگر غفلت و سہو کے باعث اپنے نفس کی خاطر کیا تو اجر برباد ہو گیا اور عمل باطل ہو گیا اس لیے کہ عمل میں درست نیت باقی نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ کے سوا جو بھی مطلوب لیا تو یاد رکھو تم نے غضب مول لیا۔ اپنے آقا کے حقوق ترک کر کے سزا کے مستحق بن گئے۔

اس لیے کہ (اللہ فرماتا ہے) کہ تو میرا بندہ ہو کر میرے سوا کو کارساز بناتا ہے۔ تو میرا رزق کھاتا ہے اور میرے سوا کے لیے عمل کرتا ہے، جب میں نے دین اپنے لیے بنایا تو تو نے میرے سوا کو مطلوب بنا لیا۔ تیرا ناس ہو تونے میرا فرمان نہیں سنا:

اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ۔ (خبردار دین خالص اللہ ہی کے لیے ہے)

تیرا ناس ہو تونے میرا حکم قبول نہیں کیا حالانکہ میں نے صاف کہا:

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ [2] (اور انہیں صرف یہی حکم دیا گیا کہ وہ اللہ کی عبادت کریں خالص کر کے اسی کے دین حنیف پر (چلیں)

اس کے علاوہ یہ فرماتا ہے:

کہ تیرا ناس تُو نے میرا فرمان نہیں سُنا؛

---

[1] سورۂ حجر آیت ۴۰۔ [2] سورۂ بینہ آیت ۵۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَمْلِکُوْنَ لَکُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْہُ [1] (بے شک اللہ کے سوا تم جن کی عبادت کرتے ہو وہ تمھارے رزق کے بھی مالک نہیں۔ اس لیے اللہ ہی کے ہاں سے رزق مانگو اور اس کی عبادت کرو)

قرآن پاک کی ان مثالوں سے علماء کرام مثالیں دیتے ہیں اور یہ ایسا خطاب ہے کہ عارفین ان کے ذریعہ اپنے اذکار معلوم کرتے ہیں چنانچہ شدت خطاب اور عزائم کلام سے غافلین کو زجر و توبیخ ہوتی ہے اور یہ ان پر سخت مار سے زیادہ شدید اور دردناک ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین خالص اپنے لیے رکھا اور کسی کو مخلوق میں سے شریک نہیں بنایا۔ فرمایا:

اَلَا لِلّٰہِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ ۔ (یاد رکھو دین خالص اللہ ہی کے لیے ہے)

یعنی توحید کا دین ہے اس میں شرک کی کوئی بات نہیں، کدورت سے بالکل صاف ہے۔ اس لیے کہ اخلاص کا مطلب خواہش و شہوت کی کدورتوں کی صفائی ہے۔ اور اس کی ضد شرک ہے جو کہ غیر اللہ یعنی نفس و ناس کے اختلاط کا نام ہے جیسے کہ اللہ نے ہم پر فضل فرمایا اور ہمیں گوبر اور خون کے درمیان سے صاف و پاک دودھ عنایت فرمایا اور اپنی نعمت مکمل فرمائی، فرمایا:

نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِہٖ مِنْ بَیْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا [2] (ہم تمھیں اس کے پیٹوں سے گوبر اور خون کے درمیان سے خالص دودھ پلاتے ہیں)

اور اگر دودھ میں ان میں سے کوئی ایک بھی مل جاتا تو سارا دودھ خراب ہو جاتا۔ اسی طرح ہمیں چاہیئے کہ ہمارا عمل خواہش و شہوت سے پاک و صاف ہو تاکہ ہم لازم حقوق ادا کر کے اجر کے حقدار ہو سکیں۔

اور اگر ہم دودھ میں خون یا گوبر دیکھ لیں تو ہماری طبائع اسی سے گھن کرنے لگتی ہیں۔ ایسا دودھ استعمال کرنے پر ہم آمادہ نہیں ہوتے۔ اسی طرح حکیم و خبیر تعالیٰ جب ہمارے عمل میں ریاکاری یا شہوت کا اختلاط دیکھتا ہے تو ہمارا عمل ہمارے منہ پر دے مارتا ہے اور کچھ بھی قبول نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ ہم پر یہ فضل فرمایا، کہ ان چوپاؤں کو مسخر کر دیا اور ہم ان سے سواری کا کام بھی لیتے ہیں۔ ہمارا بھی فرض ہے کہ اس انعام کا شکر ادا کریں اور اللہ کے عطا کردہ انعامات کھا کر اعمالِ صالح کریں۔ چنانچہ فرمایا:

---

[1] سورۃ عنکبوت آیت ۱۷ [2] سورۃ النحل آیت ۶۶

كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا۔ (پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور صالح اعمال کرو)

چنانچہ جو ان سے جاہل رہا جو اللہ نے اس کے لیے حلال کر دیا اور جس کا حکم دیا گیا تھا کہ اس کے دین پر اخلاص سے چلو، اسے ترک کر دیا تو جہالت و نافرمانی کے باعث غضب و سزا کا مستحق ہُوا۔ اور مخلوق سے فرار اور اللہ کے خوف سے زاری کرنے میں غور و فکر کے بارے میں جو ہم نے ذکر کیا ہے۔ یہ اس کے لیے ہے کہ جس کو مشاہدہ اور اطلاع حاصل ہُوا اور اسے حضوری ملی اور گمراہ نہیں ہُوا۔

فصل ۲۴

سالک کا ورد اور عارف کا حال

سالک کا ورد

یہ یاد رہے کہ دن یا رات کے ایک مقررہ وقت کا نام ورد ہے اس لیے کہ یہ بندہ پر بار بار وارد ہوتا اور اسے اللہ کا قرب حاصل کرنے میں تعاون کرتا ہے اور اس وقت میں اس پر محبوب آتا ہے جو آخرت میں اس کے پاس آئے گا اور قربۃ" دراصل دو میں سے ایک معنی کا نام ہے۔

۱۔ فرض امر

۲۔ مندوب کام کی فضیلت۔

جب رات یا دن کے کسی وقت میں کچھ عمل کیا اور اس پر دوام رکھا تو یہ ورد ہے۔

اور سب سے آسان ورد یہ ہے کہ چار رکعت نماز ادا کرلے یا مثانی میں سے کوئی ایک سورت پڑھ لے یا کسی نیکی، یا تقویٰ کام میں مدد کرے۔

حضرت انس بن سیرینؒ نے فرمایا:

"محمد بن سیرینؒ ہر رات کو سات ورد کرتے۔ اگر رات کا کوئی ورد رہ جاتا تو دن کو قضا کر لیتے۔ چنانچہ ایک موقت وظیفہ کا نام ورد رکھا گیا ہے"۔

معتمر بن سلیمانؒ نے فرمایا:

"میں اپنے والد کو تلقین کرنے لگا تو انھوں نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ مجھے چھوڑ دو، اس وقت میں چوتھے ورد میں ہوں"۔

قرآن مجید کے ایک حزب کو ورد کہا جاتا ہے۔ بعض سالکؒ روزانہ قرآن کا ایک حصہ ورد میں رکھتے تھے۔ بعض نے رکوع کی تعداد ورد میں مقرر کر رکھی تھی اور علماء کا درجہ ان سے بڑھ کر ہے کہ انہوں نے دن اور رات میں اوراد مقرر کر رکھے ہوتے ہیں اس لیے کہ ایک آیت بڑھ کر یا رکوع کر کے یا تدبّر یا شہادت کے ذریعہ ایک وقت طے کرنا، ورد کہلاتا ہے۔

عارف کا حال

البتہ عارفین کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے اوراد اوقات میں بند نہیں کرتے اور نہ ہی انہوں نے اوقات کو مختلف اوراد پر تقسیم کیا ہوتا ہے بلکہ ان کا ایک ہی ورد ہوتا ہے کہ ہر وقت اپنے آقا کی یاد میں رہیں۔ وہ بقدرِ حاجت دنیا میں سے حصہ لیتے ہیں

اور باقی سارا وقت ان کے ہاں آقا کی یاد ہیں۔ برابر ہے وُہ لوگ عبادت میں مستغرق اور ریاضت میں قدم ڈال چکے۔

چنانچہ وہ ہر وقت میں کسی نہ کسی حکم پر عمل پیرا اور کسی نہ کسی ورد میں مصروف ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اللہ عزوجل کے خاص محبوب ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا بہترین کارساز ہے۔ وُہ انہیں نفوس کے سپرد نہیں کرتا اور نہ ہی انہیں کسی دوسرے کے حوالہ کرتا ہے اور وہی صالحین کا کارساز ہے۔ ان کا مشاہدہ الفاظ کا ذکر ہے اور قرب حبیب ان کی محبت ہے۔ محبوب کے سوا وہ کہیں فضیلت نہیں رکھتے۔ بغیر نیکی کے وُہ کسی قرب کے امیدوار نہیں، اسی کی طرف قرب چاہتے ہیں، اسی کی تسبیح پڑھتے ہیں، اسی پر توکل کرتے ہیں، اسی سے ڈرتے ہیں اور اسی سے محبت کرتے ہیں۔ اگر توحید سے متعلق کے سوا سب اعمال ساقط کر دیں تو ان کی توحید میں ذرہ بھر کمی نہیں آتی اور اگر تمام اوراد چھوڑ دیں تو ان کے قلوب پر قساوت وخلا کا کچھ اثر نہیں آتا۔ اس لیے کہ وہ اعمال کے ذریعہ سے آگے نہیں بڑھتے کہ اس سے کمی آجاتی اور ان کے قلوب واحوال اپنے اوراد کے ذریعہ نہیں پلٹتے کہ ان سے کمی وزیادتی کا پتہ چلے۔ ان کے رنوں میں کسی سبب سے جمعیت نہیں ہوتی اور ان کے نفوس کو طلب سے قوت حاصل نہیں ہوتی کہ سبب کے فقدان سے انتشار ہو جاتا اور طلب کی خاطر ان کا یقین کمزور ہوتا۔ یہی مفاہیم ہی مریدوں کے احوال ہیں اور ان کا سارا تغیر دو چیزوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تنگی خالق سے ہے۔ چنانچہ اس سے فرار ہوئے۔ ان کی وسعت مخلوق سے ہے۔ اس لیے اس کے پاس آرام حاصل کیا۔ اگر ان کا قرب دائمی ہو تو ان کی راحت دائمی ہوئی اور اگر انہیں مشاہدہ حاصل ہوا تو غیر اللہ کی طرف نظر تک نہیں کی۔ عارفین نے اس کی یاد میں اپنے دل فارغ کر لیے، تمام متفرقات ان کے لیے مجتمع ہو چکے۔

چنانچہ ہر چیز میں انہیں مزید انعام حاصل ہے، ہر چیز سے انہیں توحید ملتی ہے، ہر خیال انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف لے جاتا ہے اور ہر چیز اسی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ ہر نظر و حرکت ان کے لیے اللہ کی طرف راہ ہے۔ کسی تغیر اور وقت و تجدید کے بغیر ان کی توحید افزوں ہے اور یقین تازہ ہے۔ بسا اوقات ایک عارف اسباب چاہتا ہے تو رب تعالیٰ انہیں فوراً جمع کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ اجتماع سے یہی مراد ہے اور اس کے دل میں جو آنے والا ہے اس کے باعث وہ تفرقات سے آرام پذیر ہوا۔ اسے اپنے حبیب پر بھروسہ ہے۔ اسے اپنے محبوب کے پاس ایک مقام حاصل ہے۔ اس لیے کہ وُہ جانتا ہے کہ یہ طالب صادق ہے۔ اس نے ہر مشقت کے لیے اپنی جان پیش کر دی۔ چنانچہ جو ذمہ پڑا اسے اٹھا لیا اور اپنے نفس و خواہش میں نہیں پڑا۔ یہ مقامات ان کے اہل لوگوں کے لیے ہیں۔ انہیں صرف وہی جانتے ہیں۔

انہی کے یہ مناسب ہیں اور انہی کے قابل ہیں، اس پر لیس نہیں ہو سکتی۔اس کا دعویٰ ناممکن ہے۔ اس کی انتظار نہ کرنا کہ اس کی خاطر اور راہ ہی چھوڑ بیٹھے اور اس کی توقع میں نہ رہنا کہ محنت میں کمی کر دے، جو ان مقامات کے یلیے ہیں۔ انہیں خود لے جایا جاتا ہے۔ وہ (اللہ) کے انتخابات سے اس راہ پر چلتے ہیں اور اس راہ کا زادِ راہ لیے ہوئے ہیں۔ یہ مقامات انہی پر بند ہیں اور وہی لوگ اس طرف بڑھنے والے ہیں۔

چنانچہ اس کے عبادت گزار اور اس کی عبادت میں منہمک ہی اولیاء اللہ ہیں۔ ان کی نگاہیں اپنے معبود کی طرف ہی رہتی ہیں۔ اس سے انھوں نے واضح خطاب سمجھا کہ انہوں نے کتاب اللہ کی حکمتوں کا مشاہدہ کیا، جبکہ اہل غفلت کے بارے میں یہ فرمایا،

نعبد اصناما فنظل لہا عاکفین۔

اور اس کے بعد یہ فرمایا:

وَانْظُرْ اِلٰی اِلٰهِكَ الَّذِیْ ظَلْتَ عَلَیْهِ عَاكِفًا۔ (اور اپنے اس معبود کو دیکھ جس کی تو عبادت کرتا رہا ہے)

نیز فرمایا،

اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓی اٰلِهَتِكُمْ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ سے لے کر فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْیُنِنَا۔[1] تک۔

چنانچہ یہ واضح ہو گیا کہ جس اخلاص کا حکم دیا گیا تھا اس سے مراد اخلاص ہے اور خواہش سے پرہیز کیے بغیر کوئی عبادت نہیں ہوتی۔ اس کے بعد آقا کی طرف انابت ضروری ہے۔ دیکھیے اللہ عزوجل نے فرمایا،

وَالَّذِیْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ اَنْ یَّعْبُدُوْهَا وَاَنَابُوْٓا اِلَی اللّٰهِ لَهُمُ الْبُشْرٰی[2] (اور جو طاغوت کی عبادت سے پرہیز کرتے رہے اور اللہ کی طرف رجوع کیا۔ ان کے لیے خوش خبری ہے)

اور یہ یقین کیا۔ نماز دین کا ستون ہے اور پرہیزگاروں کے سوا کوئی نماز نہیں۔ اور انابت کے بغیر کوئی تقویٰ نہیں۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

مُنِیْبِیْنَ اِلَیْهِ وَاتَّقُوْهُ۔ (اس کی طرف رجوع کرنے والے اور اس سے ڈرو)

پھر فرمایا:

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۔ (اور نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ)

---

[1] سورۃ صٓ آیت ۶۔ [2] سورۃ الزمر آیت ۱۷۔

چنانچہ عارفین کی یہی عبادت ہے جو کہ انبیاء علیہم السلام کے طریق پر ہے۔ ان کی انابت ان کے مذکور کا مشاہدہ ہے اور ان کے برعکس کے بارے میں فرمایا:

كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَاءٍ عَنْ ذِكْرِيْ۔ (ان کی آنکھیں میرے ذکر سے حجاب میں ہیں)

اب اس کی ضد یہ ہو کہ عارفین کو ذکر اللہ کا کشف حاصل ہوتا ہے۔ اور ان کے ذکر کی حقیقت یہ ہے کہ وہ غیر اللہ کو فراموش کر دیتے ہیں۔ فرمایا۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ ۔ (جب تو بھولے تو اپنے رب کو یاد کر)

چنانچہ ذکر اللہ نے انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف فرار کی راہ دکھائی۔

فرمایا:

لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ ۔ (تاکہ تم یاد کرو۔ چنانچہ اللہ کی طرف فرار اختیار کرو)

چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف بھاگ کر آئے تو اس نے انہیں اپنے قرب میں پناہ دی اور انہیں اپنی محبت کی طرف راہ دکھایا۔ ان پر اپنی رحمت برسا دی۔ انہیں اپنے کرم میں جگہ دے دی۔ چنانچہ ان کے سوا کسی نے نہ دیکھا اور ان کے سوا کسی نے نہ پہچانا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ [1] (اور جب تم نے کنارا پکڑا ان سے اور جن کو وہ پوجتے ہیں اللہ کے سوا۔ اب جا بیٹھو اس کھوہ میں، پھیلائے تم پر رب تمہارا کچھ اپنی مہر)

اور نیز فرمایا:

اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۔ (بے شک میں اپنے پروردگار کی طرف جا رہا ہوں۔ وہ جلد ہی مجھے راہ دکھائے گا)

اوراد اور اُن کے فضائل

مقررہ اوراد اور موقت اعمال صالحہ کے ذریعہ سالک کو کمی و بیشی کا واضح علم حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ عزم و ارادہ کی قوت سے اور عادت و تساہل کے ضعف سے آگاہ ہو جاتا ہے۔ اوراد میں ایک خاص فضیلت یہ ہے کہ اگر کسی وقت سالک بیمار پڑ جائے یا کسی مجبوری کا سفر درپیش ہو (اور وہ مقررہ ورد نہ کہہ سکے) تو فرشتہ صحت کے زمانہ کا ثواب اس کے نامۂ اعمال میں درج کر دیتا ہے۔ عارف کی نیند بھی جاہل کی نماز

---

[1] سورہ کہف آیت ۱۶۔

سے افضل ہے۔ اس لیے یہ سونے والا مامون ہے، یہ زاہد اور عالم ہے۔ جب بیدار ہوگا تو پا لے گا۔ اور (یہ جاہل) روزہ دار قیام کرنے والا آفات سے مامون نہیں، عبادات میں اعداء کی طرف سے مداخلت جاری ہے۔ اس لیے کہ یہ جاہل ہے اور خود فریبی میں مبتلا ہے۔ جب کچھ حاصل کرے گا تو کھو بیٹھے گا۔

حدیث میں آتا ہے:

"عالم کی نیند عبادت ہے اور اس کا سانس لینا تسبیح ہے۔"

دوسری حدیث میں آتا ہے:

"شیطان پر ایک عالم ہزار عابد سے زیادہ سخت ہے۔"

ایک مقطوع خبر میں آتا ہے:

"اگر اس پر یعنی آسمان زمین پر گر جائے تو بھی عالم کسی چیز کے لیے اپنا علم نہ چھوڑے گا اور اگر عابد پر دنیا فراخ ہو جائے تو وہ اپنے رب کی عبادت چھوڑ بیٹھے گا۔"

اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ گاہے عالم کو آیات و عبر کے ذریعہ خواب میں مکاشفہ حاصل ہوتا ہے اور اسے ملکوتِ اعلیٰ و اسفل کا مکاشفہ بھی ہو جاتا ہے۔ علم کا القا رہتا ہے اور جس طرح انبیاءٔ علیہم السلام بیداری میں بعض باتوں کا مشاہدہ فرماتے ہیں۔ علمائے کرام خواب میں قدرتِ الٰہی کا مشاہدہ کرتے ہیں اس لیے عارف کی نیند بھی بیداری ہے، اس لیے اس کا دل زندہ ہے اور غافل کی بیداری بھی نیند ہے اس لیے اس کا دل مُردہ ہے۔ چنانچہ عالم کی نیند جاہل کی بیداری کے برابر ہوئی۔ اور غافل جاہل کی بیداری عالم کی نیند سے قریب ہے۔ حضرت ابو موسیٰؓ سے مروی ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے احد کی طرف دیکھا اور فرمایا:

"یہ احد کا پہاڑ ہے۔ مخلوق اس کا وزن نہیں جانتی اور میری امت میں سے بعض ایسے ہیں کہ جن کی تسبیح و تہلیل کا وزن اللہ عزوجل کے نزدیک اس سے زیادہ ہے۔"

حضرت ابن مسعودؓ کی حدیث میں ہے کہ انہوں نے حضرت عمرؓ کو فرمایا:

"میں اس بات سے انکار نہیں کرتا کہ ایک بندے کا عمل ایک روز میں ہر (اس چیز) سے بھاری ہے جو کہ آسمانوں اور زمین ہے، پھر اس کی تعریف کرتے ہوئے بتایا کہ وہ آدمی اللہ تعالیٰ سے سمجھنے والا یقین کرنے والا اور اس کا عالم (عارف) ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رمضان المبارک میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کے

بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا،

" آپؐ رمضان کو دُوسرے (ایام) کے مقابلہ میں کسی چیز میں مخصوص نہ فرماتے اور نہ ہی آپؐ سارے سال سے رمضان میں کسی چیز کا اضافہ فرماتے "۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے فرمایا،

"اگر تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کو سوتا دیکھنا چاہے تو دیکھ لے گا اور اگر رات کو قیام کی حالت میں دیکھنا چاہے تو بھی دیکھ لے گا"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوتے پھر سونے کی مقدار بھر قیام فرماتے، پھر قیام کی مقدار بھر سوتے، پھر سونے کی مقدار بھر قیام فرماتے، پھر سوتے، پھر نماز کی طرف تشریف لے جاتے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا،

"رمضان کے مہینے کے علاوہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورا مہینہ کبھی روزے نہیں رکھے اور رات بھر کبھی قیام نہیں کیا بلکہ کچھ حصہ سوئے بھی"۔

آپؓ فرماتی ہیں کہ،

" آپؐ مہینے کا کچھ حصہ روزہ رکھتے اور (کچھ حصہ) افطار فرماتے اور رات میں کچھ حصہ قیام کرتے اور (کچھ حصہ) نیند فرماتے"۔

ایک دُوسری حدیث میں آتا ہے،

" آپؐ روزے رکھتے تو سمجھا جاتا کہ آپؐ افطار نہیں کریں گے۔ اور افطار فرماتے تو سمجھتے کہ روزہ نہیں رکھیں گے۔ گاہے آپؐ روزے کی حالت صبح کرتے پھر افطار فرمالیتے اور گاہے افطار کی حالت میں صبح کرتے، پھر روزہ رکھ لیتے"۔ (یعنی صبح تک کچھ نہ کھاتے اور افطار والوں کی طرح روزہ کی نیت نہ ہوتی پھر روزہ کی نیت فرمالیتے۔)

ایک دُوسری حدیث (میں اس کی شرح) آتی ہے کہ:

" آپؐ چاشت کے وقت (گھر) میں تشریف لاتے اور دریافت فرماتے کہ تمہارے پاس (کھانے کی) کچھ چیز ہے؟ اگر کوئی چیز پیش کر دی جاتی تو تناول فرمالیتے ورنہ یہ فرماتے کہ میں روزے سے ہوں"۔

ایک روز آپؐ باہر تشریف لائے تو فرمایا،

"بے شک میں روزہ سے ہوں"۔

پھر ہم اندر تشریف لے گئے تو (ازواجِ مطہرات فرماتی ہیں کہ) ہم نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! ہماری طرف حَیس (گھی اور ستو سے بنا ہُوا کھانا) کا ہدیہ آیا ہے"۔

آپؐ نے فرمایا:

"اگرچہ میں نے روزہ کی نیت کی تھی مگر خیر لے آؤ۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ورد آپؐ پر نازل کردہ حکم کے مطابق تھا۔ اس مخزن سے عارفین کو احوال حاصل ہیں اور اہل یقین کا مشاہدہ اسی مفہوم سے ہے۔ جیسے کہ بعض سے پوچھا گیا:

"تم نے اللہ عزّوجل کو کس طرح پہچانا؟"

اُنھوں نے جواب دیا:

"عزائم ٹوٹ جانے اور طے شدہ ارادے ختم ہو جانے سے"۔

البتہ اوراد، عاملین کا طریق ہے اور وظیفہ، عابدین کا حال ہے۔ اس ذریعہ وہ (سلوک) میں داخل ہُوئے اور اسی ذریعہ سے ان کا درجہ بلند ہُوا کہ آخر انہیں واحد تعالیٰ کا مشاہدہ حاصل ہُوا۔ چنانچہ اُن کے تمام اوراد اصل میں ایک ہی ورد ہوتا ہے اور مشاہدہ سے ہی قایم ہوتے ہیں۔

علمائے سلفؒ سے منقول ہے:

"ایمان کے انبیاء مرسلین علیہم السّلام کی تعداد کے مطابق تین سو تیرہ خُلق ہیں۔ ہر ایمان دار ان میں سے ایک خلق پر ہے اور وُہ اس کا اللہ عزّوجل کی طرف طریق ہے۔ اللہ عزّوجل کی طرف اس کا نصیب و توجہ ہے اور مومنوں کے ہر طریق میں ایک طبقہ ہے اور بعض کا مقام بعض کے مقابلہ میں زیادہ بلند و اعلیٰ ہے"۔

ایک دُوسرے عالمؒ فرماتے ہیں:

"اللہ عزّوجل کی طرف جانے والے طرق کی تعداد اہل ایمان کے برابر ہے"۔

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"مخلوق کی گنتی کے برابر اللہ کی طرف جانے والے طُرق ہیں"۔

یعنی ہر شہید کا ہر خلق کے ساتھ ایک طریق ہے۔ تمام مکوّنات مکوّن تعالیٰ کی طرف طریقے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے:

"ایمان کے تین سو تینتیس طریقے ہیں۔ جو آدمی کسی طریق پر شہادت دیتے ہُوئے اللہ عزّوجل سے مِلا وُہ جنّت میں داخل ہُوا۔"

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مفہوم ہے کہ

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا ۔[1]

(کہہ دو، ہر ایک اپنے طریق پر عمل کر رہا ہے۔ سو تمہارا رب زیادہ جانتا ہے کہ کون زیادہ ہدایت پر ہے)

اس سے پتہ چلا کہ یہ سب ہدایت پر ہیں۔ البتہ بعض دُوسروں کے مقابلہ میں زیادہ افضل اور اللہ عزوجل کے زیادہ اقرب ہیں اور زیادہ افضل ہیں اور طلب کے ذریعہ قرب حاصل کرنے پر اکسایا اور مقربین کے بارے میں خبر دی کہ وُہ طلبِ قرب میں باہم مقابلہ کرتے ہیں۔ (بڑھ چڑھ کر کوشش کرتی ہیں)

چنانچہ فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْۤا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ ۔[2]

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی طرف وسیلہ (یعنی قرب) تلاش کرو)

اور خبر دیتے ہُوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ ۔[3]

(وہ لوگ جن کو یہ پکارتے ہیں ڈھونڈتے ہیں اپنے رب تک وسیلہ کہ کون بندہ بہت نزدیک ہے)

چنانچہ اللہ عزوجل کے قریب تریں بندہ ہی اللہ عزوجل کے ہاں اعلیٰ درجہ رکھتا ہے اور سب سے اعلیٰ بندہ ہی سب سے زیادہ عارف و افضل ہے۔

تفسیر میں آتا ہے کہ:

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ یعنی اس کی وحدانیت پر عمل پیرا ہے یعنی اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی توحید کا قائل ہے اور اس کی معرفت حاصل کرتا ہے اور شاکلتہ کا معنی ہے طریقہ۔ اور مخلوق کا ہے اس کے موافق ہُوئی اور کا ہے اس میں مشتبہ ہُوئی۔ اس لیے حضرت علیؓ کا قول ہے کہ:

"ہر ایماندار کا ایک سردار عمل ہوتا ہے۔"

چنانچہ اس کا سردار عمل یہ ہے کہ جس کے ذریعہ مومن نجات کا امیدوار ہو اور اس کے باعث اللہ عزوجل کے ہاں اس کو فضیلت حاصل ہو۔

بعض علمائ کا فرمان ہے:

"عباد کو فرچار ہیں۔"

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل آیت ۸۴

[2] سورۃ مائدہ آیت ۳۵

[3] سورۃ بنی اسرائیل ۵۷۔

۱۔ صاحبِ شب ہو اور صاحبِ روز نہ ہو۔

۲۔ صاحبِ روز ہو اور صاحبِ شب نہ ہو۔

۳۔ صاحبِ راز ہو اور صاحبِ ظاہر نہ ہو۔

۴۔ صاحبِ ظاہر ہو اور صاحبِ راز نہ ہو۔

بعض ایسے ہوتے ہیں کہ جنہیں شب کی عبادت کے مقابلہ میں دن کی عبادت کے باعث فضل و شرف حاصل ہوتا ہے اس لیے کہ اس میں اعضاء کو (گناہوں سے) روکنا اور مجاہدۂ نفس پایا جاتا ہے کیونکہ دن، غافلین کی جائے حرکت اور جاہلوں کی جائے ظہور رہے۔ جب ایک بندہ غافلوں کی حرکت کے موقع پر پُرسکون رہے اور جاہلوں کی جہالت کے وقت پرہیزگار مجاہد اور عابد رہے (تو اسے یقیناً شرف و بزرگی حاصل ہوگی)

افضل ترین عبادت

ایک قول کے مطابق صرف نماز روزہ کا نام ہی عبادت نہیں بلکہ افضل ترین عبادت یہ ہے کہ انسان فرائض ادا کرے، محرمات سے پرہیز رکھے اور دراہم (دنیا) کمانے کے وقت اللہ عزوجل سے ڈرتا رہے۔ یہ دن کے اعمال ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا:

وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ[1]

(اور وہ ایسا ہے جو رات کے وقت تمہاری رُوح کو قبض کر لیتا ہے اور جو تم دن میں کرتے ہو وہ اس کو جانتا ہے)

یعنی تمہارے اعضاء جو کمائیں، چنانچہ جرحتم کو نہار سے معلق کیا۔ ثم یبعثکم فیہ۔ اب جب بندہ دن میں نہ کمائے اور اس میں مخالفت میں نہ بھیجے تو اس سے افضل کون ہوگا!

حضرت حسنؓ فرمایا کرتے تھے:

"قیامِ شب پر مداومت سخت ترین عمل ہے اور مداومتِ اوراد، اہلِ ایمان کے اخلاق میں سے اور عابدین کے طرق میں سے ہے۔ یہی مزید ایمان اور علامتِ یقین ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا:

"آپؐ کا عمل مداومت تھا اور جب آپؐ کوئی عمل کرتے تو خوب پختہ کرتے۔"

---

[1] سورۃ انعام - آیت ۶۰ -

یہی وجہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نمازِ عصر کے بعد دو رکعت پڑھنے کی روایت ہے ، اس کی وجہ یہ تھی کہ آپؐ ایک بار ایک وفد سے ملاقات میں مشغول رہے اور نمازِ ظہر کے بعد دو رکعت نوافل نہ پڑھ سکے تو آپؐ نے نمازِ عصر کے بعد (قضا کی صورت میں دو رکعت) ادا فرمائیں ۔ اس کے بعد آپؐ کا معمول بن گیا کہ عصر کے بعد گھر میں تشریف لاتے تو دو رکعت پڑھتے ۔ یہ حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ نے روایت کیا اور یہ دو رکعتیں آپؐ مسجد میں ادا نہ فرماتے تاکہ لوگ اسے سنّت قرار نہ دے دیں ۔

ایک خبرِ مشہور میں ہے ؛

" جس قدر اعمال کرنے کی طاقت رکھتے ہو اسی قدر (اپنے پر) لازم کرو اس لیے اللہ تعالیٰ نہیں اکتاتا حتیٰ کہ تم اکتا نہ جاؤ ۔"

ایک دُوسری حدیث میں آتا ہے ؛

" اللہ تعالیٰ کے ہاں محبوب ترین عمل وُہ ہے کہ جس پر دوام کیا جائے چاہے وُہ تھوڑا ہو ۔"

ایک حدیث میں مروی ہے ؛

" اللہ تعالیٰ نے کسی کو جس عبادت کی عادت ڈال دی پھر اس نے اکتا کر اسے چھوڑ دیا ۔ اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہُوا ۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے اور بعض روایات نے اسے ایک طریق سے مسند بتایا ؛

" جس دن میں میرے علم میں زیادتی نہ ہو اس دن کی صبح میں میرے لیے برکت نہیں ہُوئی ۔"

حدیث میں ایک کلام آتا ہے ، گاہے وُہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا جاتا ہے اور گاہے حضرت حسن بصریؒ سے روایت کیا جاتا ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے بھی روایت کیا گیا ۔ (راوی) نے آپؐ کو فرماتے سنا ؛

" جس کے دو دن برابر ہیں وہ خسارے میں ہے اور جس کا آج ، کل گزشتہ سے بُرا ہے وُہ محروم ہے اور جو مزید (اعلیٰ درجات) میں نہیں بڑھا وہ نقصان میں ہے ۔"

(حدیث) کے دُوسرے الفاظ میں اس طرح مروی ہے ؛

" جس نے اپنے نفس سے نقصان تلاش نہ کیا تو وُہ نقصان میں ہے اور جو نقصان میں ہے اس کیلئے موت بہتر ہے ۔ مجھے اپنی زندگی کی قسم مومن شکر گزار ہے اور شکر گزار مزید (درجات) حاصل کر رہا ہے ۔"

فصل ۲۵

نفس کی تعریف اور عارفین کی کیفیات کے تغیرات

یاد رہے کہ غفلت سے نقصان واضح ہوتا ہے اور آفاتِ نفس سے غفلت پیدا ہوتی ہے اور نفس کی جبلت ہی حرکت پر ہے مگر اسے سکون کا حکم دیا گیا اور اس میں اس کا امتحان ہے تاکہ یہ اپنے آقا کی طرف توجہ رکھے اور اپنی قوتوں سے اور اپنے ماحول سے اعراض کرے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔ (اور ہرگز نہ مرنا مگر یہ کہ تم مسلمان ہو۔)

یہ اس لیے فرمایا تاکہ اللہ کی طرف زاری کرے اور یہ دعا کرے:

رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ۔ (اے ہمارے رب ہمیں صبر عطا کر اور ہمیں مسلمان حالت میں موت عطا کر)

اسی طرح اور مقامات پر بھی اس کو واضح کیا۔ فرمایا:

وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا۔ (اور انسان بہت جلد باز ہے)

خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ۔ (انسان پیدائشی طور پر جلد باز ہے)

سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنَ۔ (میں عنقریب تمہیں اپنی نشانیاں دکھاؤں گا اس لیے جلدی نہ کرو)

اَتٰى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ۔ (اللہ کا امر آگیا اس لیے اس کی جلدی نہ کرو)

چنانچہ لفظ "عجلت" سے اس کی وضاحت فرمائی اور امتحان کے طور پر اسے ترک کرنے کا حکم دیا۔ پھر اگر "سکینت" نازل ہو تو یہ مزید ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اذن سے خواہشِ نفس کو سکون ہو جائے گا اور دل پر غفلت کا حجاب ہو جائے تو یہ انابت و زاری کی علامت ہے۔ نفس میں طبعی طور پر حرکت آئے۔ اور اگر حرکت سے سکون ہوا تو فضل و احسان سے ہوگا۔ اور اگر وصف سے متحرک ہوا تو ابتلاء و عدل سے ہوگا۔ ابتلاء کی ابتداء اختلاف سے ہوتی ہے اور اختلاف کا آغاز، اس کا خلاف ہے۔ اس کا مقدمہ ہمت ہے۔ اس کا دروازہ کان ہے اور کلام و نظر کی طرف یہی راہ ہے اور شہوت کی طرف قول کی راہ ہے۔ اور شہوت دراصل گناہ کی کنجی ہے اور گناہ اصل میں دوزخ کا ایک مقام ہے، حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں توبہ قبول کر کے اور آخرت میں معافی دے کر اس سے ہٹا نہ دے۔

اللہ تعالیٰ کی رضا ہر چیز پر مقدم ہے

گاہے ایک عارف محب پر مخالفت، آگ سے بھی زیادہ

شدید ہوتی ہے جیسے کہ بعض مشائخ سے مروی ہے کہ:

"میرے نزدیک آگ میں پڑنے کا ابتلاء، گناہ میں پڑنے کے ابتلاء سے زیادہ پسندیدہ ہے (یعنی گناہ کا ابتلاء زیادہ شدید ہے)۔ پوچھا گیا: "یہ کیوں؟"

فرمایا:

"اس لیے کہ گناہ میں میرے رب تعالیٰ کی مخالفت و ناراضگی ہے اور آگ میں اس کی اظہارِ قدرت اور انتقام ہے۔"

فرمایا:

"چنانچہ میرے نفس کے عذاب کے مقابلہ میں مجھ پر اس کی ناراضگی زیادہ شدید اور سخت ہے۔"

بعض اہل یقین سالکین سے اس طرح مروی ہے۔ فرمایا:

"مجھے جنت میں داخلے کے مقابلے میں دو مقبول رکعتیں زیادہ محبوب ہیں۔"

پوچھا گیا: "یہ کیوں کر؟"

فرمایا: "اس لیے کہ دو رکعتوں میں میرے رب عزوجل کی رضا و محبت ہے اور جنت میں میری رضا و شہوت ہے۔ چنانچہ مجھے میری محبت سے زیادہ اپنے رب عزوجل کی رضا زیادہ محبوب ہے۔"

حضرت وہیب بن وردؒ کی سے دُودھ پینے کو کہا گیا تو انہوں نے پینے سے انکار کر دیا۔ اس لیے کہ جب انہوں نے (دودھ کہاں سے آیا) معلوم کیا تو اس کو درست نہ پایا۔ ان کی والدہ کہنے لگی:

"اسے پی لو۔ مجھے اُمید ہے کہ اگر تم اسے پی لوگے تو اللہ تعالیٰ تمہاری بخشش فرما دے گا۔"

انہوں نے جواب دیا:

"میں یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کو پیوں اور اللہ تعالیٰ مجھے بخش دے۔"

والدہ نے پوچھا:

"یہ کیوں؟"

فرمایا: "میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اس کی مغفرت حاصل کرنا پسند نہیں کرتا۔

چنانچہ نفس کے اوصاف دو طرح کے ہیں:

۱۔ طیش

۲۔ حرص

جہالت سے طیش آتا ہے اور حرص کی وجہ سے شرہ آتا ہے اور یہ دونوں نفس کی فطرت ہیں۔ چنانچہ

طیش میں اُن کی مثال ایسے ہے کہ جیسے ملایم اور ہموار زمین پر گیند یا اخروٹ پڑا ہو، اس کا سکون محنت سے ہی ہو گا۔ اس لیے کہ اگر اسے ذرا ہاتھ لگا یا معمولی سی حرکت دی تو حرکت کرنے لگا اور لڑھک پڑے گا اور حرص سے پیدا ہونے والے لالچ کی صورت یہ ہے کہ یہ پروانے کی طرح ہے کہ وُہ جہالت سے آگ میں گر پڑتا ہے اور روشنی کی تلاش کرتا پھرتا ہے۔ حالاں کہ اس میں ہلاکت ہے۔ جب تم وہاں پہنچو گے تو اسکی ہلاکت آفرینی کے باعث اس سے کچھ بھی فائدہ نہ اٹھا سکو گے۔ تم اس کی غایت اور روشنی تلاش کرتے ہو جو کہ ذاتِ چراغ ہے مگر تم جل جاؤ گے۔ اگر تم ذرا سی قناعت کرتے اور دور رہ کر روشنی حاصل کرتے تو سلامت رہتے۔ عجلت میں پیدا ہونے والے طیش میں نفس کا یہی حال ہوتا ہے اور حرص و طمع سے جو لالچ پیدا ہوتا ہے اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔ حرص و طمع کی دو باتوں کے باعث حضرت آدم علیہ السّلام کو جنت سے نکلنا پڑا۔ اس لیے کہ انہیں ابدیت کا طمع ہوا اور (ممنوعہ پھل) کھانے کی حرص کی۔ یہ بات جہل و حرص کی وجہ سے ہوئی۔ اسی لیے کہا کرتے ہیں،

"دنیا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے"۔

اور زہد ہی ہر نیکی کی اصل قرار پائی"۔

دیکھیے جنت میں جانے کے بعد وُہ صرف ایک غلطی کی وجہ سے کس طرح نکالے گئے اور تیری حالت یہ ہے کہ تو جنت میں جانا چاہتا ہے مگر بے شمار گناہ لاد رکھے ہیں اور ان کی طرف دھیان نہیں دیتا۔

دوسری حدیث میں آتا ہے:

"ایمان برہنہ ہے، اس کا لباس تقویٰ ہے، اس کی زینت حیا ہے اور علم اس کا پھل ہے"۔

اسی لیے فرمایا گیا:

"جنت پاکیزہ ہے اس میں پاک کے سوا کوئی نہیں رہے گا"۔

اب جب تم اس کے مطابق ہُوئے تو داخل ہو جاؤ گے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ [1] (جن کی جان لیتے ہیں فرشتے اور وُہ ستھرے ہیں اور تم کو کہتے ہیں سلامتی ہے تم پر)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ (اور کہنے لگے ان کو داروغے اس کے۔ سلام پہنچے تم پر،

---

[1] سورۃ النحل آیت ۳۲۔

طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ ۔ (تم لوگ پاکیزہ ہو۔ سو بیٹھو اس میں سدا رہنے کو)

اس لیے فرمایا:

وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ۔ (اور باغاتِ عدن میں عمدہ رہنے کی جگہیں)

اور گناہ ہی خبائث ہیں۔ جیسے کہ فرمایا:

وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ ۔ (اور ان پر خبائث (گناہ) حرام کرتا ہے)

اب جب یہ لوگ جنت کے لیے عمدہ ہوئے تو یہ بھی ان کے لیے خوب ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو اجمالی طور پر یوں فرمایا:

اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ اور فرمایا وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ

بعض علماء نے حالتِ حرص میں نفس کی مثال یہ دی کہ جیسے کہ ایک مکھی ایسی روٹی پر آن پڑے جس پر شہد رکھا ہوا ہے وہ فوراً شہد میں گھس جائے تاکہ سارا شہد اٹھائے مگر اس سے چپک کر مر جائے اور ایک دوسری مکھی اس کے قریب آکر اپنی ضرورت کے مطابق لے اور چل دے۔ وہ سلامتی سے واپس جائے گی۔

بعض حکماء نے ابن آدم کی مثال ریشم کے کیڑے سے دی کہ وہ اپنی جہالت کے باعث ہر وقت اپنے نفس کے گرد جال تنتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ نجات کی تمام راہیں مسدود کر بیٹھتا ہے اور اپنے آپ کو ہلاک کر دیتا ہے اور ریشم دوسرے کی ملکیت میں چلا جاتا ہے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ریشم مکمل ہونے کے بعد لوگ اسے مار ڈالتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ ریشم اپنے گرد لپیٹ کر جونہی باہر جانے کا ارادہ کرتا ہے اسے دھوپ میں ڈال دیا جاتا ہے اور آخر کار مر جاتا ہے اور گاہے دوسرے طریقوں سے اسے موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے تاکہ وہ ریشم نہ کاٹ سکے اور ریشم درست حالت میں حاصل ہو۔ ایک جاہل کمانے والے کی یہ مثال ہے کہ وہ اپنی جان و مال کس طرح تلف کرتا ہے۔ وہ محروم رہا اور اس کے وارثوں نے عیش کی۔ اگر اس دولت سے انھوں نے نیکی کی تو اس کا پھل انہیں ملا مگر یہ محروم رہا۔ اور اس کا بوجھ اس کے اپنے سر رہا اور اگر انہوں نے اس کے ذریعہ نافرمانی کی تو یہ نافرمانی میں ان کا شریک بن گیا۔ اس لیے کہ اسی نے انہیں نافرمانی کی توانائی دی (مالِ وراثت دے کر) اب یہ خبر نہیں کہ کون سی حسرت زیادہ سخت ہوگی؟ غیر کے مال میں عمر برباد کرنے کی یا اپنا مال دوسرے کے ترازو میں دیکھنے کی۔ ایک بھائی نے صالحین کی اس جماعت کے ایک بزرگ کا واقعہ بتایا، کہ کچھ فقراء ہمارے مہمان ہوئے۔ ہم نے اپنے پڑوس سے بھنا ہوا اونٹ خریدا اور ان فقراء اور اپنے دیگر احباب کی دعوت کی۔ جب کھانے بیٹھے تو اس بزرگ نے کھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ایک نوالہ منہ میں ڈال کر منہ میں ہی الٹ پلٹ کرنے لگے، پھر تھوک دیا۔

اور الگ ہو کر کہنے لگے،

" بس تم کھاؤ، میرے لیے ایک رکاوٹ ہو گئی جس کی وجہ سے میں کھا نہیں سکتا۔"

ہم نے کہا: " اگر آپ ہمارے ہمراہ نہیں کھائیں گے تو ہم بھی نہیں کھائیں گے۔"

انھوں نے کہا: " اصل بات تم خوب جانتے ہو گے مگر میں نہیں کھا سکتا۔" اور واپس چلے گئے۔

راوی بتاتے ہیں کہ اُن کے بغیر ہمیں یہ کھانا بُرا محسوس ہُوا۔ ہم نے سوچا کر پکانے والے کو بلا کر اس گوشت کی حقیقت معلوم کریں۔ شاید اس میں کوئی خرابی ہو۔ ہم نے اسے بلایا اور اس سے سختی سے پُوچھ گچھ کی۔ آخر اس نے اقرار کیا کہ یہ مردار تھا اور میرے نفس نے چاہا کہ بیچ کر اس کے دام کھرے کرلوں۔ چنانچہ اسے بھون لیا تو اتفاق سے آپ لوگوں نے خرید لیا۔ (راوی) بتاتے ہیں کہ ہم نے اسے کتّوں کے سامنے ڈال دیا۔ پھر کچھ مدّت کے بعد انہیں بزرگ سے ملاقات ہوئی تو میں نے دریافت کیا " آپ نے کس وجہ سے وُہ گوشت نہیں کھایا؛ آخر کیا رکاوٹ پیش آئی تھی؟"

انہوں نے جواب دیا: " میں تمھیں اصل بات بتاتا ہُوں۔ میں نے مختلف عبادات کی برکت سے یہ بات حاصل کرلی ہے کہ پچھلے بیس برس سے جب بھی میرے سامنے کوئی (حرام) چیز رکھی گئی تو میرے نفس نے اس طرف ایسا میلان کیا کہ جو میں نے اس سے پہلے عہد کر رکھا تھا۔"

چنانچہ میں نے جان لیا کہ اس میں کچھ خرابی ہے۔ چنانچہ میں اس کی طرف نفس کی حرص کرنے کے باعث اسے چھوڑ دیا۔

اللہ تجھ پر رحم فرمائے۔ دیکھو ایک ہی قصہ میں کس طرح نفسانی حرص میں اتفاق ہُوا۔ پھر توفیق و محرومی میں دونوں کا اختلاف ہُوا۔ ایک عالمِ دین، تقوٰی اور محاسبۂ نفس کے باعث بچ گیا اور جاہل نے حرص اور ترکِ محاسبہ کے باعث اسے چھوڑ دیا یعنی اونٹ فروخت کرنے والے نے چھوڑ دیا اور دُوسرے بزرگان حسنِ ادب کے باعث محفوظ رہے، یہ بات انہیں نفسانی حرص ختم کرنے سے حاصل ہُوئی۔ اور خریدار کی حسنِ نیت اور صداقت کے باعث سب لوگ گناہ سے بچ گئے۔

نفس کی چار جبلتیں ہیں اور اس کی خواہشات کی اصل جڑ یہی ہیں۔ اس کی فطرت کا یہی مقتضا ہے۔

۱۔ ضعف: یہ خشک مٹی کی فطرت کا تقاضا ہے۔

۲۔ بخل: یہ طین (نرمٹی) کی فطرت کا تقاضا ہے۔

۳۔ شہوت: اس کا باعث کیچڑ ہے۔

۴۔ جہالت: یہ خشک اور سُوکھی مٹی کے باعث کا تقاضا ہے۔

اور ان جبلتوں کے اختلاط کے مفاہیم پر یہ صفات امتحان کے لیے ہیں۔ چنانچہ اس میں ضعف و کجی کی ابتدا ہے اور غالب جاننے والے کی تقدیر ہے۔

نفسں کے اِبتلاء

پھر نفس پر چار اوصاف کا ابتلا ہے،

۱۔ صفاتِ ربوبیت کے مفاہیم مثلاً کبر و جبریت اور مدح و عزت و غنا کی محبت۔ اس کے علاوہ یہ اخلاقِ شیاطین میں بھی مبتلا ہے مثلاً دھوکہ، مکر، حسد اور بدگمانی اور چوپاؤں کی طبائع کا ابتلا بھی اس پر ہے۔ یعنی کھانے پینے اور نکاح (جماع) کی محبت ہے۔ ان تمام مذکورہ ابتلاؤں کے باوجود اس سے اوصافِ عبودیت کا مطالبہ بھی کیا گیا ہے۔ مثلاً اس میں خوف، تواضع رہے، جو حکم دیا جائے اس کے سامنے سرنگوں ہو جائے۔ ایک قول کے مطابق اس کی تخلیق متحرک طور پر کی گئی اور سکون کا حکم دیا گیا۔ اور جب تک اس کا مالک اسے نہ آن لے یہ کیوں کر ایسا ہو؟ اور جب تک اس کو حرکت دینے والا سکون خیر نہ بخشے یہ کیونکر پُرسکون ہو؟ چنانچہ جب تک بندہ ان تینوں معانی کے لحاظ سے پُرخلوص نہ ہو وہ مخلص بندہ نہ ہوگا اور جب اس میں اوصافِ عبدیت آ جائیں تو مفاہیم صفاتِ ربوبیت کے لحاظ سے جو ابتلا رہا تھا اس میں یہ خالص بندہ ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ عاملین کے پاس معاملہ میں اخلاص کے مقابلہ میں علمائے موحدین کے نزدیک وحدانیت کے لیے اخلاصِ عبودیت زیادہ شدید اور مشکل ہے اور اسی کی برکت سے مقاماتِ قرب تک انہیں رفعت حاصل ہوئی اور اس کی صورت یہ ہے کہ ان کا بندہ نہ ہو جائے تاکہ غیر اللہ سے کامل آزادی ہو سکتا ہے؟ اس لیے کہ جس نے اپنے اتباع میں اسے اپنی جانب بلایا وہ اس کا رب ہے۔ اور جو اس پر مرتب ہوا وہ اس کا رب ہے۔ اور اہل اللہ بزرگوں کے نزدیک یہ شرک ہے۔ علماء ربانیین کے نزدیک یہ شرک در ربوبیت ہے۔ اس لیے یہ بربادی و ہلاکت میں جا گرا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دینار کا بندہ ہلاک ہُوا، درہم کا بندہ ہلاک ہُوا، بیوی کا بندہ ہلاک ہُوا، لباس کا بندہ ہلاک ہُوا۔"

یہ تمام بندے ہیں۔ ان کے آقا اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ؕ لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَ عَدَّهُمْ عَدًّا ؕ	(کوئی نہیں آسمان میں اور زمین میں جو نہ آوے رحمٰن کا بندہ ہو کر۔ اس پاس ان کا شمار ہے اور گن رکھی ہے ان کی گنتی)

برائی پر نفس امارہ والے خواہش نفس کا اتباع کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتے ہیں

اور عِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا ۔ (اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں جو زمین پر آہستہ چلتے ہیں (یعنی عاجزی سے چلتے ہیں) آخر تک الآیۃ ۔ یہ لوگ نفسِ مطمئنہ والے ہیں ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمت و رضا ہے ۔ یہ رحمٰن کے بندے ہیں ۔ یہ اہل علم و حکمت ہیں ۔ انہیں علم لدنی حاصل ہے اور یہ ممتاز لوگ ہیں ۔

بدل مقرب اور سالک اس وقت بدل ہو سکتا ہے جب کہ وُہ اذکار و علوم کی برکت سے صفاتِ عبودیت کو صفاتِ ربوبیت کے معانی سے بدل لے اور شیطانی اخلاق کی بجائے اہل ایمان کے اوصاف پیدا کرلے اور اوصاف بہیمیت کو مٹا کر روحانی لوگوں کے اوصاف پیدا کرلے ، اس وقت یہ بدل مقرب ہو گا ۔

اس کا طریق یہ ہے کہ اپنے نفس کو قابو کرے اور تابع بنا کر رکھے ۔ اگر تم نفس پر قابو پانا چاہو تو اس کو آقا نہ بناؤ بلکہ اس پر تنگی کرو اور وسعت مت دو ۔ اگر تم اسے آقا بناؤ گے تو یہ تمہارا مالک بن جائے گا اور اگر اس پر تنگی نہ کرو گے تو یہ تجھ پر پھیل جائے گا ۔ اگر اس پر فتح حاصل کرنا چاہو تو اس کی خواہش کا اتباع نہ کرو بلکہ عام طریقوں سے اس کو دبا کر رکھو ۔ اگر اسے دبا کر نہیں رکھو گے تو یہ کھل جائیگا اور اس پر قوت حاصل کرنا چاہو اس کے اسبابِ خواہش کو کاٹ کر اسے کمزور کر دو ۔ اس کی شہوات کے مادوں کو بند رکھو ۔ ورنہ یہ قوت حاصل کر کے تجھے پچھاڑ دے گا ۔ اس کا طریق یہ ہے کہ ہر ساعت میں اس کا محاسبہ کرتے رہو ۔ ہر وقت اس پر نگاہ رکھو ۔ اس کے خیالات کو عزیمت سے کاٹ دو ۔ اگر اللہ عز و جل کی خاطر تو نے عزیمت اختیار کی تو تو موت کی طرف بڑھے گا اور گزشتہ کا تدارک کرے گا اور اگر تیری عزیمت غیر اللہ کے لیے ہُوئی تو تو اسے تیزی سے ختم کر دے گا تاکہ یہ ثابت نہ رہے اور اسے بدلنے کی کوشش کرے گا ۔ تاکہ یہ تجھے ہی نہ بدل دے ۔

حدیث میں آتا ہے کہ :

"نیکی عمر میں اضافہ کرتی ہے ۔"

یہی تاویل ہے اور " اللہ تیری عمر میں برکت کرے ۔"

لوگوں کی مشہور دعا ہے ۔ اس کا بھی یہی مطلب ہے اور " اس کی عمر میں برکت ہُوئی " کا بھی یہی مفہوم ہے ۔ اس لیے کہ عمر میں برکت کا مطلب یہ ہے کہ اس آدمی نے مختصر مدت میں بیداری کے باعث اس قدر نیکیاں جمع کرلیں کہ دوسرا آدمی طویل غفلت کی عمر میں اس قدر کام نہیں کر سکتا ۔ چنانچہ بعض صالحین ایک سال میں اس قدر بھلائیاں حاصل کر لیتے ہیں کہ دُوسرے لوگ بیس بیس سالوں میں

اس قدر نیکیاں نہیں کما سکتے۔

صفات رب تعالیٰ کی تجلی کے وقت مقاماتِ قرب میں خاص مقربین کو بلند درجات حاصل ہوتے ہیں اور اعمال واذکار کے ذریعہ وہ تھوڑے سے وقت میں سابقہ عمر کا تدارک کر لیتے ہیں اور بلند ترین درجات حاصل کر لیتے ہیں۔ مشاہدہ قرب اور پروردگار کے وجدان ونظر کی حالت میں ان کی تسبیح و تہلیل، حمد و تدبر اور تفکر و تذکرہ کا ایک ذرہ بھی غافلین کے پہاڑ جیسے اعمال سے زیادہ افضل ہوتا ہے۔ غافل لوگ مخلوق کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اپنے نفوس سے پانے والے ہیں اور اہل قرب اپنے رب کے مشاہدہ و وجدان سے سب کچھ حاصل کرتے ہیں۔

عارفین مذکورہ کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی لیلۃ القدر میں عمل کرنے والا ہو جو کہ ہزار رات سے بہتر ہے۔ ان کا قیام، مشاہدہ سے، ان کا عہد، قرب و حضوری کی حالت میں ہے۔

محاسبۂ نفس کرتے رہو

بعض علماء فرماتے ہیں:

"عارف کی ہر شب لیلۃ القدر کا مرتبہ رکھتی ہے"۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرمایا:

"جس دن اللہ عزوجل کی نافرمانی نہ کی جائے ہمارے لیے وہ عید کا دن ہے"۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ جب یہ آیت پڑھتے:

كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِى الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ۔ تو فرماتے:

"اے بھائیو! (ایام الخالیہ) سے مراد تمہارے یہی ایام ہیں۔ ان میں خوب محنت و کوشش کر لو۔ اور انہیں برباد نہ کرو۔ اگر ان ایام میں حسنِ معاملہ نہ کیا اور آخرت کے کاموں سے ان ایام کو خالی رکھا تو بڑی محرومی ہوگی۔ جیسے کہ گمراہ لوگ کہیں گے:

يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا۔ (ہائے افسوس اس پر کہ جو ہم نے ان (ایام) میں زیادتی کی)

یعنی ایام الخالیۃ میں ہم نے غلطیاں کیں اور آخرت کے اعمال نہیں کیے جیسے کہ نفس امارہ بالسوء والے کہیں گے:

يٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِىْ جَنْۢبِ اللّٰهِ۔

یعنی دنیا کی زندگی میں ہم نے عمریں برباد کر دیں، چنانچہ ہم ثواب و جزا سے محروم رہے۔ ایام الخالیۃ کی تفسیر میں دو اقوال ہیں سے ایک قول یہ ہے۔

اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ الخالیۃ سے مراد گزشتہ ایام ہیں۔ اس کے دنیا کے ایام محرومی میں گزرے

اور ان کی (سزا) کے احکام ہمیشہ رہے۔ ان کی شہوتیں ختم ہوگئیں اور ان کی سزائیں باقی رہ گئیں۔ اگر اس محاسبہ میں کمی رہ جائے اور تجھے مقامِ مراقبہ حاصل نہ ہو سکے تو اہلِ تقویٰ کے مقام سے محروم نہ رہنا اور تائبین کے حال سے بھی نہ گر جانا۔ تمھیں چاہیے کہ دن رات میں محاسبۂ نفس کے دو ورد مقرر کر لو۔

۱۔ نمازِ چاشت کے بعد گزشتہ رات کا محاسبہ کرو کہ کیا حالت رہی۔ اگر نعمت دیکھو تو شکر ادا کرو اور اگر کوئی آفت دیکھو تو استغفار کرو۔ اگر اپنے اندر اہلِ ایمان کے اوصاف پاؤ، جن کی اللہ تعالیٰ نے مدح و توصیف فرمائی۔ تو اللہ کی رحمت کے امیدوار رہو اور فرحت محسوس کرو۔ اور اپنے دل و حال میں منافقین کے اوصاف دیکھو یا جہلائے کے اخلاق پاؤ جن کی اللہ عزّ وجل نے مذمت فرمائی ہے اور ان پر اس کی ناراضگی ہے تو غمگین ہو جاؤ، اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اس سے توبہ کرو اور معافی چاہو۔

۲۔ سونے سے پہلے اور وتر کے بعد دُوسرا محاسبہ کرو۔ اور دیکھو کہ تمھارا دن کس قدر غفلت اور برائی میں گزرا۔ اس میں تم نے کیا کیا اور کس کے لیے اعمال کیے، تم نے جو خاموشی اختیار کی یا سکون ترک کیا، وُہ کس کے لیے کیا، تمھاری حرکت و سکون سے تمھارے اخلاص و تکلف کا پتہ چل جاتا ہے۔ اگر تم نے اللہ عزّ وجل کی خاطر حرکت و سکون اختیار کیا تو یہ اخلاص ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کے موقع پر اس کا ثواب اللہ تعالیٰ کے ہاں سے ملے گا۔ اب نیکی کی توفیق اور ہلاکت سے بچاؤ پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اور جس قدر تم نے دنیا یا خواہشِ نفس کی خاطر حرکت و سکون اختیار کیا۔ یہ تکلف ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں خبر دی کہ:

"آپؐ کی امت کے اتقیا تکلف سے بیزار ہیں"

حشر کے دن حساب کے موقع پر اگر مولائے کریم وہاب نے ان تکلفات کو نظرِ عفو سے نہ بخشا تو ان پر سزا لازم ہوگی۔ اس لیے خوب طرح توبہ و معذرت کر کے استغفار کرے اور اس بات سے ڈرتا رہے کہ تجھے تیرے نفس کے سپرد کر دیا گیا تو تُو ہلاک ہو جائے گا۔ ممکن ہے کہ سابقہ ایّام پر اس طرح ڈرنے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے طمع سے تیری نیند اڑ جائے اور غفلت دُور ہو جائے اور تو شب بیداری کرنے لگے اور قیامِ شب کی برکت ان لوگوں میں سے ہو جائے جن کی اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں توصیف فرمائی کہ:

تَتَجَافٰی جُنُوْبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا۔[1]

(بستروں سے اپنے پہلوؤں کو دُور رکھتے ہیں اور اپنے رب کو خوف و طمع سے پکارتے ہیں)

---

[1] سورۃ تنزیل سجدہ آیت ۱۶۔

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"اسلاف کے ہاں اپنے نفس کا محاسبہ ایک شریک کے اپنے شریک کے محاسبہ سے بھی زیادہ سخت ہوتا تھا"

بعض علماء کا فرمان ہے:

"(اللہ کی) ناراضگی کی علامت یہ ہے کہ بندہ غیر کے عیوب کا ذکر کرتا پھرے اور اپنے نفس کے عیوب کو فراموش کر دے۔ صرف ظن کی وجہ سے لوگوں پر ناراض رہے اور یقین کے باوجود اپنے نفس سے محبت رکھے"

غفلت کا انجام اللہ تعالیٰ سے طویل غفلت کا انجام یہ ہے کہ انسان نفس کا محاسبہ و مراقبہ چھوڑ بیٹھتا ہے۔ دنیا میں غافل لوگ ہی آخرت میں خسارہ میں ہیں اس لیے کہ اچھا انجام متقین کے لیے ہے۔

وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ (اور وہی غافل ہیں۔ یقیناً وہی آخرت میں خسارہ پانے والوں میں ہیں)

بندے کی طویل غفلت کا مطلب یہ ہے کہ معبود کی طرف سے اس کے دل پر مہر لگ گئی اور ظاہر میں غفلت، باطن کے غلافِ قلب (حجاب) کی علامت ہے۔ عرب لوگ غفلہ اور غلفہ کا ایک ہی مطلب لیتے ہیں جیسے کہ جذب اور جبذ، خشاف اور خفاش کا ایک ہی مطلب لیا کرتے ہیں اور دلوں پر مہر اس لیے لگتی ہے کہ گناہ در گناہ کر کے بندہ دل پر گناہوں کی تہیں ڈال لیتا ہے۔ گناہوں کے انجام میں ران کی سزا یہی ہے۔ فرمایا:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔

ایک قول میں اس سے مراد گناہ اور حرام کمانے والا ہے اور تفسیر میں ہے کہ پے در پے گناہ کرے آخر اس کا دل سیاہ ہو جائے اور رَین کی اصل نیل و غلبۃ اور تغطیہ بھی یہی ہے۔ کہا کرتے ہیں:

رَانَ عَلَيْهِ النُّعَاسُ۔ (اس پر نیند غالب آگئی)

رَانَتِ الْخَمْرُ عَلٰى عَقْلِهٖ۔ (اس کی عقل کو شراب نے مستور کر دیا)

فرمان ہے کہ اس نے اعراض کرتے ہوئے لیا صبح ہوئی تو اس پر غلبہ ہو چکا تھا۔ یعنی اس پر دین غالب آکر اسے چھپا چکا۔

اور پے در پے گناہ کی اصل وجہ یہ ہے کہ انسان محاسبہ سے غافل رہے۔ توبہ میں تاخیر کر دے، استقامت اختیار نہ کرے اور استغفار و ندامت چھوڑ بیٹھے اور ان سب باتوں کی جڑ "دنیا کی محبت، اسے اللہ تعالیٰ کے حکم سے بڑھ کر جاننا اور دل پر غلبۂ خواہش" ہے۔ اللہ عزوجل نے فرمایا:

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اسْتَحَبُّوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا عَلَى الْاٰخِرَةِ۔ (اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے آخرت پر دنیا کی زندگی کو پسند کیا)

اس آیت سے لے کر

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ۔ (یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی)

تک۔ اور دلیلِ خطاب میں فرمایا:

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۔ (اور نفس کو خواہش سے روکا)

یعنی دنیا پرستی سے باز رکھا۔ اس لیے کہ کلام اللہ میں ان کی دنیاوی زندگی کی محبت اور سرکشی کا صراحت سے ذکر ہے۔ پھر فرمایا:

طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْا اَهْوَآءَهُمْ۔ (اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی اور انہوں نے خواہشات کی پیروی کی)

اس طرح اتباعِ ہویٰ بھی دل پر مہر کی ایک قسم ہے اور دل پر مہر دراصل گناہ کی سزا ہے اور خطاب کے مفہوم سے اس کا انجام سزا کی صورت میں واضح ہے۔ فرمایا:

اَنْ لَّوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَنَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ۔ (کہ ہم چاہیں تو ان کو پکڑ لیں ان کے گناہوں پر اور ہم مہر کرتے ہیں اُن کے دلوں پر، سو وہ نہیں سنتے)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے غفلت کو بھی مقاماتِ کفر میں سے ایک مقام قرار دیا ہے۔ ایک طویل حدیث میں فرمایا، سلیمانؓ اٹھے اور عرض کیا:

"ہمیں بتائیے کہ کفر کی بنیادیں کیا کیا ہیں؟"

انہوں نے فرمایا:

"چار مقامات پر۔ شک پر، جفا پر، غفلت پر اور عمی (اندھاپن) پر۔"

چنانچہ جب دل کی غفلت زیادہ ہو جاتی ہے تو بندہ کے لیے الہام شاہی میں کمی آجاتی ہے۔ یعنی دل کی سماعت کم ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ طویل غفلت اسے سماعت سے بہرہ کر دیتی ہے اور کلامِ شاہی کی سماعت سے محروم رہنا گناہوں کی سزا ہے اور بندے کو نیکی اور اطاعت پر قائم رکھنا دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندے کی طرف وحی (القا) کی صورت ہے اور بندے پر فضل و کرم ہے۔ دیکھیے اللہ عزوجل فرماتا ہے:

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ (جب تیرا رب فرشتوں کی طرف وحی کرتا ہے کہ میں

مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ آمَنُوْا [1] ... تمہارے ساتھ ہوں۔ سو ثابت قدم رکھ ان کو جو ایمان لائے)

حدیث میں آتا ہے:

حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے فرشتوں کی کلام سننے میں حجاب آگیا۔ انھیں اس پر بڑی پریشانی ہوئی تو عرض کیا:

"اے پروردگار! مجھے کیا ہوا کہ میں فرشتوں کا کلام نہیں سنتا؟"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اے آدم! تیری خطائیں" (حجاب بن گئیں)۔

چنانچہ جب بندہ ملائکہ کا کلام نہیں سنتا تو اس کی پکار بھی قبول نہیں ہوتی۔

اِنَّمَا یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ یَسْمَعُوْنَ۔ (بے شک وہ انہی کی قبول کرتا ہے جو سنتے ہیں)

حضرت حسنؓ فرماتے ہیں:

"بندے اور اللہ عزوجل کے درمیان گناہوں کی ایک محدود حد ہوتی ہے۔ جب بندہ اس حد تک جا پہنچتا ہے تو اس کے دل پر مہر لگا دی جاتی ہے۔ اب اسے کبھی بھی نیکی کی توفیق نہیں ہوتی۔"

اس لیے کہ اے حد کو پہنچنے والے! توبہ و رجوع میں جلدی کر۔ ایسا نہ ہو کہ تو حد تک جا پہنچے اور سخت مشقت و شقاوت کا سامنا کرے۔

حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں ہے:

"طابع (مہر لگانے والا) رحمٰن کے عرش کے پایہ سے معلق ہے۔ جب محارم توڑی جاتی ہیں تو اللہ عزوجل طابع کو دلوں پر بھیجتا ہے۔ چنانچہ وہ انہیں اندھا کر دیتا ہے۔"

اور یہی قفل ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے کیا:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْآنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا۔ (کیا پس وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا ان کے دلوں پر قفل پڑے ہیں)

یہ بھی یاد رہے کہ طویل غفلت سے قساوت پیدا ہوتی ہے۔ جس سے اللہ تعالیٰ نے ڈرایا۔ فرمایا:

فَوَیْلٌ لِّلْقَاسِیَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ (چنانچہ جن کے دل اللہ کے ذکر سے قساوت میں ہیں، ان کے لیے ہلاکت ہے)

---

[1] سورۃ انفال آیت ۱۲۔

اللہ تعالیٰ نے اس کو نفاق کا مقارن بنایا۔ اہل نفاق و قساوت کے لیے شیطانی القاء کو فتنہ بنا دیا۔ اس لئے کہ الہام خدا تعالیٰ کے فقدان سے ہی شیطانی القاء ہوا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا؛

لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّ الْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ ؕ[1] (اسی واسطے کہ اس شیطان کے ملائے سے جانچے ان کو جن کے دل میں روگ ہیں اور جن کے دل سخت ہیں)

یعنی قساوتِ قلبی والوں کے لیے یہی معاملہ ہے اور بُعد کا انجام قساوت ہے اور خیانت کی سزا بُعد ہے اور اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔ یہ بات اس فرمان پر غور کرنے سے معلوم ہوئی کہ؛

۔ فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ ۔ یعنی ان کے وعدہ توڑنے کی وجہ سے، اور کلام میں مَا صلہ ہے اور یہی خیانت ہے اور لَعَنّٰهُمْ یعنی انہیں ہم نے دُور کیا۔ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً" یعنی ان کی قساوتِ قلبی کے بعد جھوٹ، نسیان، کثرتِ خیانت و بہتان کے گناہ پے در پے ہونے لگے۔ آخر گناہوں میں ڈوب کر رہ گئے اور ان کے دلوں پر مُہر لگ گئی اور کلام اللہ کی سماعت سے محروم ہو گئے۔ جیسے کہ فرمایا؛

اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ۔ (ان کو پکڑیں ہم ان کے گناہوں پر اور ہم مہر کرتے ہیں ان کے دلوں پر)

اب اس مہر کو تقویٰ سے ہی صاف کیا جا سکتا ہے اور یہی سماعت کی کنجی ہے جیسے کہ فرمایا؛

اِتَّقُوا اللّٰهَ وَ اسْمَعُوْا ۔ (اللہ سے ڈرو اور سنو)

اور اللہ تعالیٰ ہی توفیق بخشنے والا ہے۔

---

[1] سورۃ حج آیت ۵۲ ۔

فصل ۲۶

اہلِ مراقبہ کا مشاہدہ

یاد رہے کہ مشاہدۂ مراقبین دراصل مراقبہ مشاہدین کی ابتدا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس کو مقام مراقبہ حاصل ہو۔ وہ حالِ محاسبہ میں ہوتا ہے اور جس کو مقامِ مشاہدہ حاصل ہوتا ہے۔ وُہ وصفِ مراقبہ سے سرفراز ہوتا ہے۔

کوئی وقت عبادت سے خالی نہیں

شہادتِ مراقب کی ابتدا یہ ہوتی ہے کہ وُہ یقینی طور پر جانتا ہے کہ اس کا ہر وقت چاہے کس قدر مختصر اور قلیل ہو، حسبِ ذیل تین معانی میں سے ایک سے خالی نہیں ہے،

۱۔ اس وقت میں اس پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی فرض عاید ہے اور فرض کی دو قسمیں ہیں،

(ا) جس کا حکم دیا گیا ہو۔

(ب) جس سے منع کیا گیا ہو۔ یعنی ممنوع سے پرہیز کرنے کا حکم۔

۲۔ کوئی مستحب کام ہو اور اس کی ترغیب دی گئی ہو۔ یعنی بھلائی کے کلام میں مسابقت کرنا۔ جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور ایسا عمل صالح جس کو تیزی سے کرنا چاہیئے تاکہ وُہ رہ نہ جائے۔

۳۔ ایک مباح کام جس میں جسم و دل کی اصلاح ہوتی ہے۔ مومن کے لیے چوتھا وقت ہی نہیں ہوتا۔ اور اگر چوتھا وقت بنا لیا تو اس نے اللہ کے حدود توڑ دیے اور جو اللہ کے حدود سے بڑھتا ہے اس نے اپنے پر ظلم کیا اور اللہ عزوجل کے دین میں ترمیم کی اور جو اللہ تعالیٰ کے دین میں ترمیم کرتا ہے، وُہ پرہیزگاروں کی بجائے (غلط لوگوں کی) راہ پر چلا۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا۔ (اور وہی ہے جس نے بنائی رات دن بدلتے اس کے واسطے جو چاہے دھیان رکھنا یا چاہے شکر کرنا)

اب کیا ان دو وقتوں کے درمیان کوئی جہالت یا خواہشِ نفس کا وقت بھی کہیں نظر آتا ہے؛ جیسے کہ رات اور دن کے درمیان تیسرا وقت نہیں پایا جاتا۔ اس طرح یہاں بھی تیسرا وقت نہیں۔ چنانچہ ایمان اور علم ہی اعمال قلوب و شکر کا انتظام کرتے ہیں اور اخلاقِ ایمان اور احکامِ علوم پر عمل کا انتظام بھی یہی کرتے ہیں اور یہی دونوں تمام اعضائے کے اعمال پر مشتمل ہیں۔ اللہ عزوجل نے فرمایا:

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا۔ (اے آلِ داؤد شکر (کا عمل) کرو)

وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ)

اور ایک جگہ فرمایا:

كَمَا اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ سے لے کر فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنَ تک (جیسے کہ ہم نے تم میں تم سے ایک رسول بھیجا۔ سو مجھے یاد کرو۔ میں تمہیں یاد کروں گا اور میرا شکر کرو اور کفر نہ کرو)

اور ایک جگہ فرمایا:

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ۔ (اللہ تمہیں عذاب دے کر کیا کرے گا اگر تم شکر کرو اور ایمان لے آؤ)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدر طویل قیام کیا کہ آپ کے پاؤں متورم ہو گئے۔ آپ سے اس کے بارے میں عرض کیا گیا۔ تو آپ نے فرمایا:

"کیا میں شکر کرنے والا بندہ نہ بنوں!"

چنانچہ آپ نے شکر کی تفسیر "عمل" کے ساتھ فرمائی جیسے کہ اللہ عزوجل نے عمل کی وضاحت فرمائی کہ اس سے مراد شکر ہے اور تیسرا مباح وقت ہے جو کہ ان دونوں (پہلے اوقات) میں داخل ہے۔ اس لیے کہ یہ انہی کا مددگار ہے اور اس کے ذریعہ بندے کو ان اوقات میں استقامت حاصل ہوتی ہے۔

ایک عالمؒ یہیں فرمایا کرتے:

"عبادت (میں کوتاہی) کے گناہوں میں غم ہے اور نافرمانی کے گناہوں سے یہ رکاوٹ بن جاتا ہے۔"

چنانچہ مراقب بندہ معمولی سے معمولی وقت پر بھی گہری نظر رکھتا ہے اور خیال رکھتا ہے کہ اس وقت میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی امر یا نہی کا فرض ہے؟ اگر ایسا ہو تو اس میں لگ جاتا ہے اور اسے مکمل کرتا ہے اور اگر فرض نہ ہو تو یہ وقت فضائل (مستحبات) سے خالی تو نہیں ہوتا۔ اب وہ افضل ترین عمل میں منہمک ہو جاتا ہے اور اگر ان میں سے کوئی کام بھی اس میں نہ ہو تو بندے کو چاہیے کہ وہ اپنے نفس سے اپنے نفس کے لیے لے۔ آج سے کل گزشتہ کی تلافی کرے اور دنیا سے آخرت کا حصہ وصول کرے۔ جیسے کہ مولائے کریم نے فرمایا:

وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا۔ (اور دنیا سے اپنا حصہ نہ بھلا)

یعنی دنیا میں سے اپنا حصہ لینا ترک نہ کر اور دنیا سے اپنی آخرت کے لیے ذخیرہ کرنا نہ چھوڑ۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان فرمایا۔ تم بھی احسان و نیکی کرو اور دنیا میں فساد نہ کرو، ورنہ

تو آخرت کے لیے ذخیرہ کرنے کو فراموش کرنے والا ہو گا اور اللہ تعالیٰ بھی تمہیں اس عظیم ثواب سے محروم کرے گا جو اس نے اپنے اولیاء کرام کے لیے تیار کر رکھا ہے۔ جیسے کہ فرمایا:
نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ۔ (وہ اللہ کو بھول گئے چنانچہ وہ انہیں بھول گیا)

یعنی انہوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں چھوڑ دیا اور ان کا دنیا سے حصہ بھی چھوڑ دیا اور آخر اللہ تعالیٰ نے دنیا سے آخرت کا ان کا حصہ بھی متروک دیا۔ الغرض ایک صاحبِ فراست بندہ اپنی عمر اور وقت کو غنیمت سمجھتا ہے اور اسے آخرت کے کام میں خرچ کرتا ہے اور اس کی آخری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے اوقات میں افضل ترین اعمال کرے اور گزشتہ اوقات کی خوب خوب تلافی کرتا ہے اور یہ کام ہی افضل ہے کہ جس کی طرف اس کے علم نے رہنمائی فرمائی۔ آخر وہ (اپنے ہر وقت) کو اپنے مالک کی یاد میں لگا دیتا ہے۔

ہر وقت میں نصیحت یا اِبتلاء ہے

بندے پر ہر وقت میں دو میں سے ایک حالت رہتی ہے۔ یا اس پر نعمت ہو رہی ہے اور یا وہ کسی ابتلاء میں ہے۔ نعمت کے موقع پر اس کو شکر کرنا چاہیے اور ابتلاء کے موقع پر صبر کرنا لازم ہے۔ پھر ہر ایک دو میں سے ایک مشاہدہ ضرور کرتا ہے۔ یا تو نعمت کا مشاہدہ کر رہا ہے اور یا منعم کا مشاہدہ کر رہا ہے اور یہ اس طرح کہ وجود مالک اور حضورِ مملوک سے خالی نہیں ہوتا۔ اب اس پر لازم ہے کہ موجود کی خدمت کرے اور خدمتِ معبود میں حاضر رہے اور مراقبہ، حضور کی علامت ہے اور محاسبہ، مراقبہ کی دلیل ہے۔ مزید برآں اسے قلیل ترین اور ادنیٰ ترین وقت یعنی مباح کے وقت میں بھی مشاہدۂ منعم یا مشاہدۂ نعمت حاصل ہوتا ہے، تاکہ اس کا یہ وقت بھی فارغ نہ گزر جائے اور اس میں بھی وہ اپنے مولا کی یاد کرنے والا ہو یا منعم تعالیٰ کی کسی نعمت کا شکر کرنے والا ہو تاکہ اسے آخرت میں یہ وقت بھی نفع دے۔ اس لیے کہ اچھا انجام پرہیزگاروں کا ہے۔ اگر صاحبِ نعمت کا مشاہدہ کرے تو سکینت کے باعث حیاء اور ہیبت کے باعث ذفار اسے کاٹ دے اور یہ خواص کے ساتھ مخصوص ہے۔

اور اگر نعمت کا مشاہدہ کرے تو شکر سے معمور کرے۔ اب یہ تبصرہ و تذکرہ بن جائے گا اور یہ عوام خواص کے لیے ہے۔ اللہ عزوجل نے پہلے طبقہ کی توصیف کرتے ہوئے فرمایا:

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ۝ فَفِرُّوا إِلَى اللّٰهِ ۔ (اور ہم نے ہر چیز سے دو قسمیں پیدا فرمائیں تاکہ تم نصیحت پکڑو۔ چنانچہ اللہ کی طرف بھاگو)

اور دوسرے مقام پر فرمایا،

وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ۔ (اور اللہ کے ساتھ ساتھ دوسرے کو خدا نہ بناؤ)

اور پہلوں کے بارے میں قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ سے لے کر اَفَلَا تَتَّقُوْنَ[1] تک وضاحت فرمائی اور دوسروں کے بارے میں قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ عَلَيْهَا سے لے کر اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ۔ تک وضاحت فرمائی۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی طویل حدیث میں عاقل کی صفات اور مراقبہ کے احوال اور زاہد اوقات کو جن عبادات سے معمور رکھنا چاہیے ان کے بارے میں وضاحت آتی ہے۔ فرمایا:

" اور بندے کو تین ہی کاموں میں لگے رہنا چاہیے، آخرت کے لیے زادِ راہ تیار کرتا رہے، یا معاشِ (دنیا) کا اہتمام کر رہا ہو یا غیر حرام (حلال) لذت میں ہو"

اسی مفہوم میں آتا ہے کہ:

" عاقل پر لازم ہے کہ اس کی چار ساعتیں ہوں:

۱۔ ایک ساعت میں وہ اپنے پروردگار سے مناجات کرے۔

۲۔ ایک ساعت میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔

۳۔ ایک ساعت میں اللہ تعالیٰ کی صنعت میں غور و فکر کرے۔ اور

۴۔ ایک ساعت میں کھانے پینے میں خلوت کرے۔ اس لیے کہ یہ (آخری) ساعت اس کی تمام ساعات پر تعاون کا کام دے گی" اور اس میں اختصار کے ساتھ تین صفاتِ عاقل بیان کی گئیں۔

" عاقل کی علامت یہ ہے کہ اپنے کام میں لگا رہے۔ زبان کی حفاظت کرے اور اپنے زمانہ کا واقف ہو" اور بعض میں یہ الفاظ آتے ہیں:

" اپنے بھائیوں کا اکرام کرنے والا ہو"

چنانچہ پہلے مباح کے وقت مصائب و ضروریات اس پر ہجوم کریں گی اور اس پر فاقے بھی آئیں گے اس لیے وقت سے پہلے ان تکلفات میں نہ پڑے ورنہ دوسرے وقت سے یہ وقت اسے مشغول رکھے گا۔

اسی لیے مشاہدۂ الٰہی میں بندوں کے چار مقامات ہیں۔ ہر بندہ اپنے حال کی نظر سے مشاہدہ کیا کرے

---

[1] سورۃ المومنون۔ آیت ۸۸

کرتا ہے :

۱۔ بعض بندے اپنے مولائے کریم کی طرف تبصرہ و عبرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ اولی الالباب ہیں۔ ان کے دِلوں سے حجاب اُٹھ گیا۔ یہ اصحاب ایدی والابصار ہیں جنہیں مقامِ اعتبار پر رکھا گیا۔ یہ علمائے اسلام کا مقام ہے اور یہی انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں۔

۲۔ بعض مولائے کریم کی طرف نظر کرتے ہیں اور وُہ نظرِ رحمت و حکمت کے اہل ہوتے ہیں۔ یہ خائفین کا مقام ہے۔

۳۔ اور وُہ بادشاہ تعالیٰ کی طرف نظر کرتے ہیں اور وُہ نفرت و بغض کی نظر کے اہل ہیں (یعنی غیر اللہ سے نفرت کرتے ہیں) یہ زاہدین کا مقام ہے۔

۴۔ اور بعض شہوت و غبطہ کی طرف سے بادشاہ کی طرف نظر کرتے ہیں۔ یہ ہلاک ہونے والوں کا مقام ہے۔ یہ دنیا والے ہیں اور دنیا کی خاطر ہی محنت کرتے اور دنیا پر ہی افسوس کرتے ہیں۔

اگر بندہ کو اپنے ملک (آقائے کریم) کی طرف سے عبرت و حکمت کی نظر عطا ہو تو وُہ اسے سلطنت بخش دیتا ہے اور اب وُہ غیر اللہ سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اور اگر خائف کو مولائے کریم کی طرف نظرِ رحمت مل جائے تو وُہ اپنے مقام میں قابلِ رشک بن جاتا ہے اور اس پر رب تعالیٰ کے انعامات خوب خوب ہو جاتے ہیں اور اگر زاہد کو مولائے کریم کی طرف نظر بغض (برائے دنیا) عطا ہو جائے تو اللہ کریم اسے زہد کی وجہ سے ایک ملک سے نکال کر دُوسرے میں لے آتا ہے۔ چھوٹی سی سلطنت چھین کر اس کے عوض ایک بڑا ملک عطا فرماتا ہے اور جو حسرت و غبطہ کی نظر میں مبتلا ہُوا۔ اللہ تعالیٰ اسے ہلاکت میں ڈال دیتا ہے۔ اب وُہ بربادی کی راہ پر چلا اور جس نے کسی خلقِ ذات یا کسی ایسی صفت کا مشاہدہ کیا جو کہ خلق کی مقتضی ہے یا کسی نعمت یا عذاب کے مشاہدہ کی بات دیکھی تو یہ اس کی تعریف میں ایک مقام ہے جو کہ اسے مقامِ تصرف تک اٹھائے گا اور عارفین نے اخلاق و اوصاف کے مفاہیم پر دلالت کرنے والے جن افعال کا مشاہدہ فرمایا ان میں سے یہ عارفین کی شہادت کی بات ہے اس لیے کہ ان کو اس نے اس سے ظاہر کیا تاکہ ان کے ذریعہ سے اس پر استدلال ہو سکے اور ان سے اسی کی طرف نظر ہو۔

شہواتِ نفس کا مشاہدہ

اور جس نے کسی شہوتِ نفس کا خواہش کی نظر سے مشاہدہ کیا۔ شیاطین نے اسے اچک لیا اور ہواؤں نے اسے کسی گہری جگہ جا پھینکا، اور مولائے کریم کا قرب عطا کرنے والے راستوں سے ہٹ گیا۔ جن راستوں پر چل کر بندہ حبیب کے پاس بیٹھتا ہے۔ یعنی فِیۡ مَقۡعَدِ صِدۡقٍ عِنۡدَ مَلِیۡكٍ مُّقۡتَدِرٍ (صداقت کی جگہ قدرت والے مالک کے پاس) اور جو قربِ الٰہی کھو بیٹھا وُہ حیرانی و بُعد میں جا گرا۔ اب وُہ مایُوسی اور خسارے میں ہے۔ خائن اور فتنہ میں

مبتلا ہے۔ اس کا آج، کل گزشتہ سے ہمیشہ ہی برا ہو گا۔ اس کا آئندہ کل، آج سے ہمیشہ خراب ہو گا۔ اس کی موت زندگی سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ اس کی زندگی اسے خدا سے دُور کرتی ہے اور اس کا بقاء، اسے راستہ سے ہٹاتا ہے اور اس کی خواہشات کا پورا ہونا اسے مزید گمراہ کرتا ہے۔ اس کا نفسانی غلبہ اسے بٹھا دیتا ہے۔ اس لیے کہ وہ ادبار میں تھا اور اس کا ادبار، اقبال میں تھا۔ چنانچہ اس نے ایک ہی چیز کی طرح تمام عمر برباد کر دی جیسے کہ ایک وقت اور ایک چیز ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ عمر ایسی چیز نہیں جو کہ ایک دم ضائع ہو جائے۔ بلکہ یہ ساعت بہ ساعت پیدا ہوتی ہے اور حکمتِ الٰہی کے مطابق اس کا ایک ایک حصّہ ختم ہوتا ہے۔ جیسے کہ ایک ایک دن اور ایک ایک وقت کر کے ختم ہوتا اور ضائع ہوتا ہے۔ وُہ دُوسرے وقت میں اس کا تذکرہ کرتا ہے اور دُوسرا وقت بھی غفلت میں گزار دیتا ہے۔ اسی طرح سابقہ افسوس پر اس کے تمام اوقات برباد ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کبھی وہ افسوس کرتا اور کبھی پہلے وقت کو یاد کرتا ہے۔ اسی طرح ایام گزرتے جاتے ہیں اور اوقات ختم ہو کر موت کا سامنا ہو جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں اس پہ حجاب ڈال دیا جاتا ہے تاکہ وُہ دھوکہ میں مبتلا رہے۔ اس پر انعامات کر دیے جاتے ہیں تاکہ اسے علم حاصل نہ ہو اور اس کے لیے دائمی عافیت کر دی جاتی ہے تاکہ وُہ سمجھ ہی نہ سکے اور اس کے لیے امید و رجاء وسیع کر دی جاتی ہے تاکہ اس کی بدعملی خوب بڑھ جائے اور (وقتی) سزا ہٹالی جاتی ہے تاکہ اس کا ڈر دُور ہو جائے۔ اس کی امید پھیل جاتی ہے۔ اس کا خوف لپیٹ دیا جاتا ہے۔ آخر کار اس پر اچانک گرفت آتی ہے اور بدمستی کی حالت میں اسے پکڑ لیا جاتا ہے۔ جیسے کہ فرمایا:

وَ مَکَرُوْا مَکْرًا وَّ مَکَرْنَا مَکْرًا وَّ ھُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ۔ (انہوں نے مکر کیا اور ہم نے بھی تدبیر کی اور وُہ سمجھتے ہی نہیں)

یعنی جب اُنھوں نے نصیحت اور خوف سے علیحدگی اختیار کر لی تو ہم نے ان پر کامل انعام کیا اور شکر بھلا دیا۔ اب وُہ پے در پے گناہ کرنے لگے اور استغفار بھلا دیا۔ پھر فرمایا:

حَتّٰی اِذَا فَرِحُوْا بِمَا اُوْتُوْا۔ (حتیٰ کہ جب وہ خوش ہُوئے اس پر جو انہیں دیا گیا)

یعنی ان انعامات پر مطمئن ہو کر رہ گئے اور توبہ و انابت ترک کر بیٹھے۔

اَخَذْنٰھُمْ بَغْتَۃً (ہم نے انہیں اچانک پکڑ لیا)

یعنی غفلت کی حالت میں اچانک گرفت آئی۔ ایک قول کے مطابق چالیس سال کے بعد اچانک گرفت کی۔ فَاِذَا ھُمْ مُّبْلِسُوْنَ۔ یعنی اچانک وہ حیران و پریشان اور ہر بھلائی سے نا اُمید ہو گئے۔

یہ یاد رہے کہ اگر بندے کی حالت یہ ہو جائے کہ اس کی ہر گھڑی پہلے سے بدتر، ہر دن پہلے سے

بُرا ہو جائے اور وہ گزشتہ ایام کی تلافی نہ کرے تو بُرائی میں اس کے تمام ایام اور اوقات ایک دن اور ایک وقت ہی کی طرح ہوتے ہیں جیسے کہ بُرائی میں وُہ دائمی طور پر ڈوب کر رہ جائے۔ گویا اس کی ساری عمر ہی برباد ہو کر رہ گئی۔ اس لیے کہ وہ ایسے وصف پر ہے کہ ڈھیل کے باعث اس کی ساری عمر آہستہ آہستہ برباد ہو رہی ہے اور آہستہ آہستہ وہ گمنامی کی وادیوں میں جا رہا ہے اور محاسبہ میں رہنے کے علاوہ بندے کا وقتاً فوقتاً اپنے اوقات کی تربیت اور مجل سب ایک دن کی طرح کی اضاعت ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ لَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ وَ كَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔ (اور تم جس کا دل اپنے ذکر سے غافل کر دیا اور اس نے خواہش کی تابعداری کی اور اس کا معاملہ زیادتی ہے)

اس کی اطاعت نہ کر۔ وہ وعدہ و وعید سے غفلت کی حالت میں ہے۔ جب اس سے حجاب دُور کیا گیا تو اس کی نظر تیز ہُو ئی۔ وُہ پریشان و مبہوت ہوا۔ غفلت و حسرت کے باعث جو اس نے غلطیاں کیں۔ انہیں دیکھنے کے لیے اس کی بینائی تیز ہوگئی۔ فرمایا:

لَقَدْ كُنْتَ فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْیَوْمَ حَدِیْدٌ۔ (بے شک تو اس سے غفلت میں تھا تو ہم نے تجھ سے اس کا پردہ کھول دیا۔ سو آج تیری نگاہ تیز ہے)

ایک قول کے مطابق اس کا مطلب یہ ہے۔ بُرے اعمال کو تیری آنکھیں خوب دیکھ رہی ہیں، یا ترازو کی زبان پر تیری نگاہ خوب دھیان سے ہے کہ کون سا پلڑا وزنی ہوگا۔

اور اس کی مثال یہ ہُوئی۔ جیسے کہ فرمایا:

وَ اَنْذِرْهُمْ یَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِیَ الْاَمْرُ وَ هُمْ فِیْ غَفْلَةٍ۔

یعنی ان کے پاس موت آگئی اور وُہ لوگ دنیا کی باتوں میں مشغول تھے۔ ایک قول میں اس سے مراد یہ ہے کہ وُہ عورتوں کے ساتھ مشغول تھے اور ایسے ہی توصیف کی جاتی ہے کہ:

غَرَّتْكُمُ الْاَمَانِیُّ (خواہشات نے تمہیں فریب میں رکھا)

حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ (حتیٰ کہ اللہ کا حکم آگیا)

یعنی موت آگئی اور تم نے اس کے لیے کچھ نہ کیا۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ جیسے کسی کی افلاس کی حالت بیان فرمائی اور فرمایا:

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْــٴًـا وَّ وَجَدَ اللّٰهَ عِنْدَهٗ فَوَفّٰىهُ حِسَابَهٗ۔ (یہاں تک کہ جب پہنچا اس پر، کچھ نہ پایا اور پایا اللہ کو اپنے پاس، پھر اس کو پورا پہنچا دیا اس کا لکھا)

اور حضرت ابو محمدؒ فرمایا کرتے :

بندہ حقیقی طور پر صدیقین کے درجہ تک اس وقت رسائی حاصل کر سکتا ہے کہ جب اس میں یہ چار باتیں پائی جائیں :

۱۔ سنّت کے ساتھ ادائیگی فرائض ۔

۲۔ تقویٰ کے ساتھ حلال کھانا ۔

۳۔ ظاہر و باطن میں ممنوعات سے پرہیز کرنا ۔

۴۔ موت تک اس حالت پر استقامت اختیار کرنا ۔

حضرت حسنؒ فرماتے تھے :

" اللہ کی قسم ، مومن کا عمل موت سے ورے ختم نہیں ہوتا ۔ اللہ کی قسم ، وُہ مومن نہیں ہے ۔ جو ایک ماہ یا دو ماہ یا سال دو سال عمل کرے بلکہ مومن وہ ہے جو کہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کے حکم پہ چلے اور اللہ کی گرفت سے ہمیشہ ڈرتا رہے ۔ ایمان یہ ہے کہ نرمی میں شدّت ہو ، یقین میں عزم ہو ، صبر میں اجتہاد و محنت ہو اور زہد میں علم ہو "

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب یہ آیت تلاوت کرتے :

اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا ۔ (بے شک جن لوگوں نے کہا ، ہمارا رب اللہ ہے ، پھر پختہ ہو گئے)

تو فرمایا کرتے :

" لوگوں نے یہ کہا اور چل دیے مگر کون ہے جو ظاہر و باطن میں اور تنگی و وسعت میں استقامت رکھے اور اللہ تعالیٰ کے حکم میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرے "

ایک بار فرمایا :

" اللہ کی قسم ، انہوں نے اپنے ربّ کے لیے استقامت اختیار کی اور لُومڑوں کی طرح فریب نہیں کیا "

فرائض کو نوافل پر مقدّم رکھو

بعض علماء کا فرمان ہے :

" جو آدمی ادائیگی فرائض کے مقابلہ میں فضائل (نوافل) کی طلب کو زیادہ اہم سمجھتا ہو ، وُہ دھوکہ میں ہے اور جو ان کی بجائے دُوسرے امور میں منہمک ہو جائے وُہ جال میں پھنس گیا "

حضرت سفیان ثوریؒ اور بعض دوسرے علماء فرماتے ہیں :

" اصول (فرائض) ضائع کر کے وصول حاصل کر لینا بالکل غلط ہے چنانچہ بندے کے لیے افضل ترین بات یہ ہے کہ اپنے نفس کو پہچانے اور جس حد و احکام میں اسے رکھا گیا ہے۔ انہی کے اندر ٹھہرے اس لیے ممنوعات سے پرہیز کرنے کے بعد سب سے پہلے علم کی روشنی میں فرائض پر عمل کرے ، اور اس میں خواہشِ نفس سے بچنا ہے اور فرائض سے عہدہ برآ ہوئے بغیر نوافل میں نہ پڑے۔ اس لیے کہ جس طرح ایک تاجر کو اصل زر حاصل ہو جانے کے بعد ہی منافع ملتا ہے۔ اسی طرح فضیلت بھی سلامتی حاصل ہوتے (اصل احکامِ فرائض ادا کرنے) کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ اب جس پر سلامتی دشوار ہو گئی اس کے لیے فضیلت کا معاملہ ایک دور کی بات ہے اور اس میں محض فریبِ نفس ہی ہے۔

اور گاہے دقیق مفاہیم اور مخفی باتوں کے باعث فرائض و نوافل کا باہم التباس ہو جاتا ہے۔ چنانچہ بندہ نفل کو مقدم کر لیتا ہے اور اسے واجب سمجھ بیٹھتا ہے۔

اس کی مثال یہ ہے کہ ایک بار حضرت ابو سعید رافع بن معلیؓ نماز پڑھ رہے تھے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بلایا اور انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ انہوں نے سمجھا کہ اللہ عزوجل کے سامنے کھڑے رہنا (جواب دینے سے) زیادہ افضل ہے۔ جب اُنہوں نے سلام پھیر لیا اور حاضر ہوئے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" میں نے تمہیں بلایا تو نہیں جواب دیا۔ کیا رکاوٹ ہوئی ؟"

انہوں نے عرض کیا :

" میں نماز پڑھ رہا تھا "

آپؐ نے فرمایا :

کیا تم اللہ عزوجل کا فرمان نہیں سُنا ؟ کہ :

اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۔ (مانو حکم اللہ کا اور رسول کا جس وقت بلائے تم کو ایک کام پر جس میں تمہاری زندگی ہے)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بلایا تا کہ انہیں باطن علم عطا فرمائیں یا دیکھیں کہ ان کا علم کس قدر ہے اور وہ کیسے عمل کر رہے ہیں۔ اس وقت وہ نماز پڑھ رہے تھے۔ اس وقت نماز کے مقابلہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا جواب دینا افضل تھا۔ اس لیے کہ اُن کی

نماز نفلی تھی اور حالت غیب میں اپنے اختیار سے وہ اللہ عزوجل کی تابعداری کر رہے تھے مگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا جواب دینا نماز سے افضل تھا اور آپ کی کلام کا جواب دینا فرض تھا اور یہاں آپ کا جواب دے کر شہودی طور پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنا تھا۔ چنانچہ اپنی نماز پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا جواب دینا، نفل پر فرض کی طرح افضل ہے۔ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرمایا:

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ۔ (جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے بیشک اللہ کی اطاعت کی)

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ۔ (بے شک جو تیری بیعت کرتے ہیں سوائے اس کے نہیں کر وہ اللہ کی بیعت کرتے ہیں)

اور دونوں جگہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تو اللہ یقیناً ہے چنانچہ یہاں پر اللہ تعالیٰ کی عبادت زیادہ باعثِ رضا اور آخرت میں زیادہ باعث اجر و ثواب ہے اور حدیث میں اس بات کی دلیل ہے کہ جب خبر امر کی صورت میں آئے تو عموم پر ہوئی اور تمام متعلق پر ہوتی ہے۔ جب تک سنت یا اجماع اس کا بعض حصہ خاص نہ کر دے۔

اسی طرح اللہ عزّوجل نے فرمایا:

اِسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ۔

اس کا ظاہری مفہوم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان اور قرآن کے اوامر کے سلسلہ میں اطاعت کرنے کی دعوت پر لبیک کہنے میں محصور ہے۔ آپ کے (عام) بلاوے کے جواب دینے خصوصاً حالتِ نماز میں آپ کے بلانے کے جواب پر نہیں آتا۔ ابو سعیدؓ ابن معلی نے اس پر قیاس کیا اور آیت کی تاویل کی تو ان پر اشکال بن گیا۔

حضرت عمارؓ نے بھی آیت تیمم میں یہی کیا کہ سفر کی حالت میں نمازِ فجر کے لیے انہوں نے اس آیت کے باعث تیمم کر لیا۔ اس لیے کہ:

اللہ عزوجل نے فرمایا:

فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَ اَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ۔ (پس پانی نہ پاؤ تو پاک مٹی کا قصد کرو اور اپنے چہرے اور ہاتھوں کو ملو)

اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے انھوں نے بعض الید کی تخصیص نہیں سنی تھی۔ فرماتے ہیں کہ

ہم نے کاندھوں تک سارے بازو کا تیمم کیا۔ اس لیے کہ خطاب (ید) عام تھا۔ آخر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت فرمائی اور کہنیوں تک تیمم کا حکم دیا۔ اور حدیث میں دو روایتوں کے اختلاف سے الفاظ آتے ہیں۔

چنانچہ بعض نے یدٌ کی تخصیص کی۔ اس لیے ید کے بعض حصہ میں مسح کے سلسلہ میں علماء کا اختلاف بھی اسی وجہ سے ہے۔ اسی طرح جو حکم مجمل اور عام آئے اس کی سنت تخصیص کرتی ہے۔ منقول ہے کہ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں دو آدمیوں نے عبادت میں اخوت قایم کی اور لوگوں سے علیحدگی اختیار کرلی۔ ایک نے کہا:

آؤ! آج ہم لوگوں سے علیحدہ ہو کر خاموشی اختیار کریں اور کسی آدمی سے کلام نہ کریں۔ اس طرح عبادت میں خوب مدد ملے گی۔ راوی بتاتے ہیں کہ دونوں نے علیحدہ ہو کر خلوت اور خاموشی اختیار کرلی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر ہوا اور آپؐ نے سلام کیا مگر انھوں نے سلام کا جواب نہ دیا۔ راوی بتاتے ہیں کہ جب ہم آگے بڑھے تو آپؐ کو یہ فرماتے سنا:

"غلو کرنے اور تعمق کرنے والے ہلاک ہو گئے۔"

چنانچہ یہ دونوں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور معذرت چاہی اور اللہ عزوجل کے سامنے توبہ کی۔

اہلِ اسلام کی جاسوسی حرام ہے

اسی طرح مروی ہے کہ:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ایک شب کو گھوم رہے تھے تو ایک دروازے کی دراز میں سے سفید چراغ دیکھا۔ اس میں سے جھانکا تو دیکھا کہ کچھ لوگ شراب پر بیٹھے تھے۔ آپ کچھ نہ سمجھ سکے کہ کیا کریں؟ آخر مسجد میں داخل ہوئے اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر باہر آئے اور دروازے پر لائے۔ انھوں نے بھی دیکھا تو پوچھا:

"کیا خیال ہے، ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

انھوں نے جواب دیا:

"اللہ کی قسم، میں سمجھتا ہوں کہ جس بات سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہم نے وہی کام کیا۔ اس لیے کہ ہم نے پردے کی باتوں کی جاسوسی کی۔ ہم نے اندر جھانکا حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اسے ہم سے چھپا رکھا تھا اور ہمارے لیے جائز نہیں کہ جسے اللہ عزوجل نے پردے میں رکھا۔ ہم نے اسے کھول دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"میری رائے بھی یہی ہے۔ تم نے سچ کہا۔ اب چلو"۔ چنانچہ ہم واپس آ گئے۔

دوسری روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ انہوں نے عرض کیا:

"ہم نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کی۔ حالاں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جاسوسی کرنے سے منع کر رکھا ہے"۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "تم نے سچ کہا"۔

پھر ان کا ہاتھ پکڑا اور واپس چلے آئے۔

اسی طرح ایک روایت یہ آتی ہے کہ

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک شب کو حضرت ابن مسعودؓ کے ہمراہ گھوم رہے تھے۔ ایک دروازے کی دراز میں سے جھانکا تو دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی شراب کا مشکیزہ سامنے رکھے بیٹھا ہے اور ایک لونڈی گا رہی تھی۔ آپؓ دیوار پر چڑھے اور فرمایا:

"تو کیسا برا بڈھا ہے! اس (برے) حال میں ہے"۔

ایک آدمی اٹھا اور کہنے لگا:

"اے امیر المومنین! میں تجھے اللہ کی قسم دیتا ہوں۔ جب تک میں بات نہ کروں آپ انصاف نہیں کر سکتے"۔ انہوں نے فرمایا:

"کہو"۔ اس نے عرض کیا:

"اگر میں نے اللہ عزوجل کی ایک نافرمانی کی تو آپ نے تین باتوں میں نافرمانی کی"۔

انہوںؓ نے فرمایا:

"وہ کیا کیا ہیں؟"

اس نے کہا:

آپؓ نے جاسوسی کی۔ حالانکہ اللہ عزوجل نے اس سے منع فرمایا۔ آپؓ دیوار پر چڑھے، حالانکہ اللہ عزوجل نے فرمایا:

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا۔ (اور یہ نیکی نہیں کہ تم پشت سے گھروں میں آؤ)

اور آپؓ بغیر اجازت اندر آئے حالانکہ اللہ عزوجل نے فرمایا:

لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى (اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں تب تک داخل نہ ہو

تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا[۵] جب تک ان سے مانوس نہ ہو جاؤ اور ان کے رہنے والوں پر سلام نہ کرلو)"

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"تم نے سچ کہا۔ کیا تم مجھے یہ بخشتے ہو؟"

اس نے کہا:

"اللہ آپؐ کو بخش دے"۔

حضرت عمرؓ وہاں سے روتے ہوئے نکل آئے۔ حتیٰ کہ ان کی آواز بلند ہوئی اور وہ کہہ رہے تھے:

"عمر کا ناس ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے نہ بخشا تو ایک آدمی کو دیکھتا ہے کہ وُہ اپنے پڑوسی اور بچوں سے چھپتا پھرتا ہے اور اب کہتا ہے کہ مجھے امیرالمومنین نے دیکھا۔ اور اس طرح کی باتیں کرتا ہے۔

اعمال کا اظہار و اخفاء

حدیث میں آتا ہے:

"جب تم میں سے کسی کو کھانے کی دعوت دی جائے۔ اگر وہ حالتِ افطار میں ہو تو قبول کرلے اور اگر روزے سے ہو تو کہہ دے کہ میں روزے سے ہوں"۔

چنانچہ آپؐ نے اسے اپنا عمل ظاہر کر دینے کا حکم دیا۔ حالانکہ یہ معلوم ہے کہ عمل پوشیدہ رکھنا زیادہ افضل ہے۔ اس لیے کہ اگر عمل ظاہر کر دینے سے مومن کے دل پر بہتر اثر ہوتا ہو تو اسے مخفی رکھنے کے مقابلہ میں ظاہر کر دینا افضل ہے۔ اس لیے کہ اعمال پر مومن کو زیادہ فضیلت و حرمت حاصل ہے کیونکہ اعمال تو عامل پر موقوف ہیں اور اعمال کا اجر عمل کی مقدار کی بجائے عامل کے درجہ کے مطابق دیا جاتا ہے۔ دیکھیے گا ہے ایک ہی عمل میں ایک آدمی کو دُوسرے کے مقابلہ میں دُگنا ثواب ملتا ہے۔ اس سے واضح ہوگیا کہ عمل سے مومن افضل ہوتا ہے۔ چنانچہ اسے کہا، کہ اپنا عمل ظاہر کر کے اپنے بھائی کے دل سے اثر اور کراہت اٹھا دو۔ تمہارا بھائی تم سے بدظنی نہ رکھے اور عمل مخفی رہے۔ اس سے بہتر یہ ہے کہ عمل ظاہر کر دیا جائے کیونکہ اگر تمہارا بھائی دعوت دینے میں پُرخلوص ہے تو اب اگر تم نے اس کی دعوت قبول نہ کی اور واضح عذر پیش نہ کیا جسے وُہ قبول کرے اور مطمئن ہو جائے تو اس پر تمہارا (غیر واضح) انکار شاق گزرے گا۔

اس قسم کے واقعات بکثرت آتے ہیں۔ بتاتے ہیں کہ ایک مردِ صالح اگر جماعت میں بیٹھا ہوتا تو

---

۵ سورۃ النور آیت ۲۷۔

آہستہ تلاوت کرتا تاکہ کسی کو اس کے عمل پر آگاہی حاصل نہ ہو اور جب سجدہ کی آیت سے گزرتا تو سب کے سامنے ہی سجدہ کر لیتا۔ گویا سجدہ کر کے بتا دیتا کہ میں پڑھ رہا ہوں۔ اس پر شاید کوئی کم عقل اور کم علم آدمی یہ اعتراض کر دے کہ اس نے اپنا عمل ظاہر کر دیا اور اگر سجدہ ترک کر کے عمل کو مخفی رکھتا تو افضل تھا۔ یہ اعتراض اس کی جہالت کی دلیل ہے۔ ہم نے بعض علماء کو یہ اعتراض کرتے سُنا ہے حالانکہ یہ طالب کی کم علمی کی علامت ہے۔ اصل معاملہ اس طرح نہیں جیسے کہ اس منکر نے فرض کر رکھا ہے بلکہ اس کے فعل کا منکر در اصل دقائق اخلاص سے واقف نہیں اور عارفین کے طریق سے جاہل ہے۔ جس عامل کے بارے میں یہ طریقہ مروی ہے وُہ صاحب اخلاص اور ذی شعور تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے دو فضیلتیں جمع کر لیں۔ جب اس نے مخفی عمل شروع کیا تو اس کی فضیلت حاصل کی۔ اور جب سجدہ آیا تو یہ ظاہری طور پر ہی ادا ہو سکتا تھا۔ اس نے لوگوں کی خاطر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا نہیں چھوڑا۔ گویا جونہی سجدہ کا حکم دیا گیا اس نے سجدہ کر دیا اور تلاوتِ مندوب بھی (اخفاء) کے ساتھ جاری ہے۔ اب اس نے دوسرے حال کی فضیلت بھی حاصل کر لی۔ اس نے اللہ تعالیٰ کے لیے اخفاء کیا اور اللہ تعالیٰ کے لیے ہی ظاہر کیا۔ لوگوں کی نگرانی کو اس نے نظر انداز کر دیا اور لوگوں کی خاطر اس نے عمل کو ترک نہیں کیا۔ حالانکہ اگر کوئی گھر میں نماز پڑھ رہا ہو اور کوئی مہمان آجائے تو نماز چھوڑ کر مہمان کے ساتھ بیٹھنا افضل ہوتا تاکہ نماز کا اخفاء ہے مگر اس سلسلہ میں روایت ہے کہ اس کے لیے دو اجر ہیں۔ ایک اخفاء کا اور دوسرے ظاہر کا۔ نیز مشائخ عظام یہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کی خاطر عمل چھوڑنا بھی ریاء اور ان کی خاطر عمل کرنا شرک ہے۔

ایک قول یہ بھی ہے کہ

"ریاء کے لیے عمل نہ کر اور نہ ہی حیاء کے لیے عمل چھوڑ دے۔ اس لیے کہ مخلوق سے حیا کرنا شرک ہے اور خالق سے حیا کرنا ایمان ہے۔"

مزید بر آں اس نے لوگوں کی خاطر ترکِ عمل میں دشمن کی اطاعت کی تو ان کی خاطر عمل میں دوبارہ اطاعت کرے گا۔

اس کی مثال ایسے ہے کہ جیسے کوئی آدمی روزہ رکھے اور گھر میں رہ کر نماز پڑھتا رہے۔ پھر یہ چاہے کہ اس عبادت کے ساتھ ساتھ اعتکاف بھی ملا لوں۔ چنانچہ وُہ مسجد میں جائے اور وہاں قیام کر کے نماز پڑھے تو لوگوں پر اس کا عمل ظاہر ہو جائے۔ اس موقع پر لوگوں کی خاطر یہ لازم نہیں کہ مسجد میں اعتکاف ہی چھوڑ دے۔ چونکہ اس کی نیت درست ہے اور اعتکاف کی مزید فضیلت حاصل کرنا چاہتا ہے اس لیے عمل ظاہر ہو جانا اس کے لیے کچھ مضر نہ ہو گا۔ جبکہ وُہ عالم متمکن ہو اور اس کی نیت درست اور

مزید اعتکاف کے لیے ہو۔

مزید بر آں جب وُہ عالمِ متمکن (بلند درجہ کا) ہو تو اس کے لیے عوام کے سامنے اعمال ظاہر کرنا کچھ مضر نہیں۔ جبکہ دکھاوا مقصود نہ ہو اور مدح کی خواہش نہ ہو۔ بسا اوقات اس میں دُہرا اجر ملتا ہے تاکہ غافلین کو ذکر کا خیال پیدا ہو اور نیکی کا اشتیاق پیدا ہو۔ بلکہ بعض علماء کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ سجدہ کی آیت سُنے یا پڑھے۔ اس پر سجدہ فرض ہے۔ اگر اس وقت وضو نہ ہو تو وضو کر کے سجدہ کرے۔

افضل عمل، حال کے مطابق ہے

گاہے بندے کے لیے ایک حال (عمل) دُوسرے عمل سے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔ ابو نصر تمارؒ بتاتے ہیں کہ ایک آدمی حضرت بشرؒ بن حارث کو الوداع کہنے حاضر ہوا اور کہا:

"میں نے حج کا ارادہ کیا ہے کسی چیز کی نصیحت فرمائیے؟"

حضرت بشرؒ نے فرمایا:

"کتنا خرچ ساتھ لیا ہے؟"

اس نے کہا:

"دو ہزار درہم"

انہوںؒ نے فرمایا:

"حج سے کیا چاہتے ہو، سیر یا بیت اللہ کی طرف اشتیاق یا اللہ عزوجل کی رضا؟"

اس نے جواب دیا:

"اللہ عزوجل کی رضا چاہتا ہوں"۔

انہوںؒ نے فرمایا:

"اگر تو اللہ تعالیٰ کی رضا گھر میں ہی حاصل کرے اور دو ہزار درہم خرچ کرے اور اللہ کی رضا بھی یقیناً حاصل کرے تو یہ کام کرے گا؟"

اس نے کہا: "ہاں"۔

فرمایا: "جاؤ، دس آدمیوں کو یہ دو ہزار دے دو۔ مقروض کا قرض ادا کر دو، فقیر کو دے دو جو پریشان حالت سے نجات پائے، تنگ دست کو دے دو جو اپنے اہل و عیال پر خرچ کر سکے اور یتیم کے سرپرست کو دے دو کہ اس سے فرحت پائے اور اگر دل مضبوط ہو تو ایک ہی آدمی کو دے دو۔ اس لیے کہ ایک مسلمان کے دل میں فرحت و خوشی ڈالنا، پریشان کی مدد کرنا، محتاج کی امداد کرنا اور کمزور

یقین والے کی اعانت کرنا سوچ سے بہتر ہے۔ اب اٹھو، جو ہم نے کہا ہے کر ڈالو۔ ورنہ جو بات دل میں ہے، صاف کہہ دو۔"

اس نے کہا:

"اے ابونصرؒ! میرے دل میں سفر کی بات زیادہ آ رہی ہے۔"

حضرت بشرؒ مسکرا دیے اور فرمایا:

"جب تجارتی میل اور شبہات سے مال جمع کیا گیا ہو تو نفس چاہتا ہے کہ قریبی ضرورت پوری کرے۔ چنانچہ اعمالِ صالحہ ظاہر کر دیے اور اللہ تعالیٰ نے بھی عہد کر لیا ہے کہ وہ صرف پرہیزگاروں کا عمل قبول کرے گا۔"

ایک بار حضرت بشرؒ کے سامنے ذکر ہُوا کہ "فلاں امیر آدمی ہے اور نماز روزہ کی بہت کثرت کرتا ہے"۔

فرمایا: "بے چارے نے اپنا حال چھوڑ دیا اور دُوسرے کا حال اپنے پر ڈال لیا۔ اس کا اپنا حال یہ تھا کہ بھوکوں کو کھانا کھلاتا اور مساکین پر خرچ کرتا۔ اپنے آپ کو بھوکا رکھنے اور اپنی ذات کے لیے نماز پڑھنے اور دنیا کی دولت جمع کرنے اور فقر اُسے بند رکھنے کے مقابلہ میں اس کے لیے یہ کام بہتر تھا۔

گاہے زیادہ واجب اور کم واجب کے درمیان اللہ تعالیٰ بندوں پر امتحان کی خاطر التباس پیدا کر دیتا ہے۔ اس میں اس کی کوئی حکمت ہوتی ہے اور بندہ وسعت کی خاطر تاویل کر ڈالتا ہے اور آسانی کے لیے تنگی چھوڑ دیتا ہے تاکہ ان میں علم نافذ کرے اور حکم جاری کرے۔ یہ بات بندوں کو ادب سکھانے اور مزید تسلیم و توفیق عطا کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نصیحت کرتے ہُوئے یہ فرمان نازل کیا:

عَبَسَ وَ تَوَلّٰۤی اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی وَ مَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّهٗ یَزَّكّٰۤی۔ (تیوری چڑھائی اور منہ موڑا اس سے کہ آیا اس کے پاس اندھا اور کس چیز نے معلوم کر دیا تجھ کو کہ شاید وہ پاک ہو جاتا)

منقول ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سورت نازل ہونے پر جس قدر غم ہُوا اس قدر کبھی غم نہ ہُوا تھا۔ اس لیے کہ اس میں شدید عتاب تھا اور آپؐ اللہ کے حبیب رشید ہیں۔ اس لیے براہِ راست خطاب نہیں فرمایا تاکہ عتاب میں آسانی رہے بلکہ مومنوں کے لیے یہ اظہار ہے اور متقی بندوں کو آپؐ کے فعل پر انتباہ کر دیا۔ اس لیے کہ عَبَسَ وَ تَوَلّٰی سے مراد یہ ہے کہ اے مومنو! اس آدمی کی طرف دیکھو یا اس پر تعجب کرو کہ جس نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا۔

اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰی (کہ اس کے پاس اندھا آیا)

اس لیے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ ان کے زمانہ میں ایک جگہ ایک منافق نماز کی امامت کر رہا تھا اور وہ ہمیشہ سورۃ عَبَسَ پڑھتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اُسے بلایا اور اس کی گردن اڑادی اور اس عمل پر اس کے کفر پر استدلال کیا تاکہ اپنے دل میں اور قوم کے سامنے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا درجہ گرائے۔ اسی طرح ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب کرتے ہوئے فرمایا،

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ ۔ (اللہ تجھے معاف کرے تو نے انہیں کیوں اجازت دی)

ایسے ہی فرمایا:

لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاةَ اَزْوَاجِكَ [1] (جو تیرے لیے اللہ نے حلال کیا تو نے اسے حرام کیوں کیا۔ کیا تو اپنی بیویوں کی خوشنودی چاہتا ہے)

ایک جگہ فرمایا،

وَتُخْفِيْ فِيْ نَفْسِكَ مَا اللّٰهُ مُبْدِيْهِ وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشٰهُ (اور تو چھپاتا ہے اپنے جی میں جس کو ظاہر کرنے والا ہے اللہ اور تو لوگوں سے ڈرتا ہے اور اللہ سب سے زیادہ حقدار ہے کہ تو اس سے ڈرے)

حتیٰ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

" اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کا کچھ حصہ چھپاتے تو اس آیت کو چھپا دیتے۔"

ایک مبلّغ کا عجیب واقعہ

اسرائیلیات میں وہب بن منبہ یمانیؒ سے ایک عجیب واقعہ منقول ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کو وفات دی اور ان کے بعد یکے بعد دیگرے اولادِ سلیمانؑ سے بادشاہ بنتے رہے۔ انہوں نے ایک طویل زمانہ تک بیت المقدس کی خدمت کی اور اس کی آبادی و عظمت میں کوشاں رہے۔ آخر کار ایک ناخلف آدمی تخت پر بیٹھا۔ اس نے اپنے آباء کے دین کی مخالفت کی اور ان کی شریعت سے الگ ہوکر زمین میں فتنہ و فساد برپا کر دیا اور کہنے لگا کہ میرے آباء و اجداد داؤدؑ اور سلیمانؑ نے ایک مسجد بنائی۔ میں بھی کیوں نہ ایک مسجد بنا کر ان کا مقابلہ کروں اور لوگوں کو اپنے دین کی طرف دعوت دوں؟ چنانچہ اس نے بیت المقدس کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک مسجد بنائی اور یہ دعویٰ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے

---

[1] سورۃ تحریم آیت ۱۔

بعد لوگوں کو روپیہ اور دھونس ہر طرح سے ساتھ ملانے کی کوشش کی اور بیت المقدس کو ویران کیا۔ لوگ بھی ڈر اور لالچ کے باعث اس کے دین میں داخل ہو گئے۔ راوی بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی کی طرف وحی فرمائی کہ اپنے اس گدھے پر سوار ہو جاؤ اور اس قوم کا جہاں اجتماع دیکھو اُدھر جاؤ۔ ان کی مسجد اور جائے اجتماع میں بلند آواز سے یہ کہو:

" اے مسجدِ ضرار! (شرارت کی مسجد) اللہ عزوجل نے اپنے نام کی قسم کھائی ہے کہ تجھے آباد ہونے سے وحشتناک (محروم) رکھے گا اور تیرے (آباد کرنے) والوں کو تیرے اندر ہی قتل کرے گا۔ تیری لکڑی اور تیری چٹان کے ذریعہ انہیں کچل کر رکھ دے گا۔ تیرے اندر ہی کُتے ان کا خون پئیں گے اور ان کا گوشت کھائیں گے"۔ اسی طرح شہر میں بھی اعلان کردو اور اپنے گدھے سے نہ اُترو، نہ سایہ میں بیٹھو، نہ کھاؤ اور نہ پیو۔ یہاں تک کہ اسی بستی میں واپس آجاؤ جہاں سے تم نکلے تھے۔

چنانچہ انہوں نے اسی طرح کیا۔ اب لوگ لکڑیوں سے انہیں مارنے لگے، پتھروں سے زخمی کر دیا۔ وہ گدھے پر سوار رہے اور نہیں اُترے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے موقع پر انہیں سخت تکلیف پہنچی، اور بہت ضربات آئیں۔ آخر پچھلے پہر واپس ہوئے اور جس بستی سے آئے تھے رسالت کا فریضہ ادا کر کے اسی طرف چل دیئے۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں تمام تکالیف پر خوب صبر کیا۔ واپسی پر ایک جگہ ایک دُوسرے نبیؑ سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے سلام کہا اور فرمایا:

" آپؑ نے رسالت کا حق ادا کر دیا اور اس راہ میں آپ کو اس قوم سے بہت ہی اذیت پہنچی۔ آپ بھوکے پیاسے ہیں خون آپؑ کے بدن و لباس پر بہہ رہا ہے۔ میرے ہاں تشریف لائیے، کھانا کھائیے، آرام کیجئے اور لباس دھولیں اور غسل بھی فرما لیں"۔

انہوںؑ نے فرمایا:

" جب اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کام کی طرف بھیجا تو مجھ سے عہد لیا کہ گھر واپس آنے تک نہ سایہ میں بیٹھوں، نہ ہی کھاؤں اور نہ پیوں"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" میں بھی تیرا اہل (خانہ) ہوں۔ اس لیے کہ میں بھی آپؑ کی طرح نبی اور دینی بھائی ہوں۔ میرے خیال میں اللہ تعالیٰ کا مطلب یہ تھا کہ اس قوم میں نہ ٹھہرنا اس لیے کہ وُہ دشمن قوم ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو ان کے ہاں سے کھانے اور ان کے ہاں سایہ میں ٹھہرنے سے منع فرمایا۔ اور میں نہیں سمجھتا کہ میرے گھر میں داخل بھی حرام ہوا، نہ ہی میرے ہمراہ کھانا بھی حرام ہو گا۔ اس لیے کہ اخوت و نبوّت

ہیں میں آپ کا شریک ہوں۔"

انہوں نے کہا:

"آپ نے سچ کہا" چنانچہ ان کے ہمراہ ان کے گھر میں چلے گئے۔ جب کھانا سامنے رکھا گیا اور کھانے کا ارادہ کیا۔ اس لیے کہ سخت بھوک لگ رہی تھی تو اس (میزبان) نبیؑ کو اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ ان (مہمان نبی) کو کہہ دیں:

تو نے اپنی خواہش اور پیٹ کو میرے حکم پر ترجیح دی؟ کیا میں نے تجھ سے یہ وعدہ نہیں لیا تھا کہ جس بستی سے تو نکلا ہے اس میں واپس آنے تک نہ اترنا اور نہ سایہ میں بیٹھنا اور نہ ہی کھانا۔ اگر تو رائے سے اجتہاد نہ کرتا اور اپنے علم کے مطابق بات نہ کرتا (یعنی محض جہالت سے ایسا کرنا) تو تم دونوں پر عذاب ڈال رہنا۔ اور میرے نزدیک یہ تیرے عذر سے قلیل تر ہے۔ اس لیے کہ میں نے اس سے وعدہ لیا تھا مگر اس نے اپنی خواہش کو ترجیح دے کر میرا عہد چھوڑ دیا۔ اس (میزبان) نبیؑ نے (مہمان نبیؑ) کو اس فرمان سے آگاہ کیا تو وہ ازار بند گھسیٹتے بے قراری میں اٹھے اور گدھی پر سوار ہو کر جلدی سے چل پڑے۔ اس (تنبیہ) پر وہ اس قدر پریشان ہوئے کہ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کریں؟ بھوک پیاس کی شدت تھی، لباس اور بدن خون سے تر تھا۔ اسی حالت میں واپس ہوئے۔ جب گھاٹی سے اتر کر جنگل میں آئے تو ایک درندہ سامنے آیا۔ اس نے انہیں پھاڑ دیا اور اس کے بعد وہی درندہ راستہ میں بیٹھ کر دھاڑنے لگا اور ان کی نعش، گدھی اور سامان کی حفاظت کرنے لگا۔ جب کوئی آدمی آگے بڑھتا تو شیر اس پر حملہ کر دیتا۔ (میزبان) نبیؑ کو اس کی اطلاع ہوئی تو وہ اس طرف گئے۔ جب شیر نے انہیں دیکھا تو خاموشی سے چل دیا۔ اور انہیں ان کے پاس آنے کی اجازت دے دی۔ راوی بتاتے ہیں کہ انہوں نے ان کا کفن دفن کیا اور ان کا سامان اور گدھی ان کے گھر پہنچا دی۔ پھر اللہ کے دربار میں عرض کیا:

"اے پروردگار! تیرے اس بندے نے تیری رسالت کا حق ادا کیا اور تیری حکم برداری کی۔ اس کو بہت تکلیف پہنچی۔ اسے معلوم نہ تھا۔ (بے خبری) میں تیرے ارادہ کے خلاف کر بیٹھا اور تو نے اس پر یہ سزا دی۔"

اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی:

"یہ سزا نہیں، اور نہ ہی میں نے اس لیے یہ کیا کہ میرے نزدیک وہ بے وقعت ہے بلکہ یہ بخشش و رحمت ہے۔ اس نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی اور اس کی وفات قریب تھی۔ میں نے یہ نہ چاہا کہ وہ مخالفت کی حالت میں مجھ سے ملاقات کرے۔ چنانچہ میں نے اس پر اس کا ناپسندیدہ (مال) ڈال دیا۔

یں نے اس پر اپنا ایک کتا مسلط کر دیا۔ اس نے اسے میری ملاقات کی خاطر پاک کر دیا۔ اس کا یہ دکھ میرے نزدیک اس کی نبوت سے بڑھ کر درجہ رکھتا ہے۔ اور شہادت بھی ہے۔" (میزبان) نبیؑ پکار اُٹھے:

"اے اللہ! تو پاک ہے۔ تیری ہی حمد ہے جو احکم الحاکمین اور سب سے زیادہ رحم کرنے والا ہے۔"

چنانچہ علماء کے نزدیک عالم وُہ ہے جو کہ دو بھلائیوں میں سے زیادہ بہتر بھلائی کا علم رکھتا ہو، چنانچہ اسے کھونے سے پہلے اس کی جانب بڑھ جائے اور دو برائیوں میں سے زیادہ سخت برائی سے بھی آگاہ ہو۔ چنانچہ اس سے اعراض کرے تاکہ وہ زیادہ بھلائی والے کام سے محروم نہ رہ جائے۔ اس کے علاوہ وُہ دو برائیوں میں سے بہتر کو بھی جانتا ہو تاکہ اگر ان کے ابتلا میں آجائے تو ہلکی کرلے اور دو برائیوں میں سے زیادہ سخت سے بھی واقف ہو تاکہ اس سے بچنے کی خُوب تدبیر کرے اور اس سے دفاع کو مضبوط کرے۔

ان معانی میں دقائقِ علوم، عجائباتِ مفہوم، سوالات کرنے والے کے لیے دلائل اور تمام جہانوں کے لیے عبرتیں اور نشانیاں ملتی ہیں۔ دو برائیوں میں سے سخت بُرائی اور بھلائی و برائی کا باہم امتیاز تو عقلی دلائل اور ظاہری علوم سے سب کے سامنے واضح ہے۔

فصل ۲۷

سالک کے لئے ضروری خصائل

بعض علماء کا فرمان ہے کہ مخلوق کو تین حجاب لاحق ہیں:

۱۔ درہم

۲۔ طلبِ ریاست

۳۔ زبان خواہی

ایک عارفؒ کا فرمان ہے کہ تین چیزوں نے بندوں کو اللہ تعالیٰ سے جُدا کر رکھا ہے:

۱۔ ارادہ میں صداقت کی کمی۔

۲۔ طریق سے جہالت۔

۳۔ علمائے سوء کا خواہشِ نفس کے مطابق کلام کرنا۔

بعض علماء کا فرمان ہے:

جب مطلوب حجاب میں ہو، دیل مفقود ہو اور اختلاف موجود ہو تو حق کا انکشاف نہیں ہوتا اور جب حق منکشف نہ ہو تو سالک حیران رہ جاتا ہے۔

سات خصائل

یاد رکھیں سالک میں سات خصائل ضروری ہونی چاہئیں:

۱۔ ارادہ میں صداقت، اس کی علامت یہ ہے کہ انسان سامان تیار رکھے۔

۲۔ عبادت و طاعت کے اسباب کرنا۔ اس کی علامت یہ ہے کہ وہ بُرے ساتھیوں کو چھوڑ دے۔

۳۔ اپنے نفس کے حال کی معرفت حاصل کرنا، اس کی علامت یہ ہے کہ اس کے سامنے آفاتِ نفس نمایاں ہو جائیں۔

۴۔ علمائے ربانیین کے ساتھ مجالست کرنا ضروری ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہ علماء کو درس پر ترجیح دے۔

۵۔ اس پر توبۃ النصوح لازم ہے۔ اس سے وہ عبادت کی حلاوت پائے گا اور مداومت پر پختہ رہے گا اور توبہ کی علامت یہ ہے کہ اس کے خواہش نفس کے اسباب ختم ہو جائیں اور خواہشات نفس میں زہد اختیار کرے۔

۶۔ اسے حلال کھانا ضروری ہے جس کی علم مذمت نہ کرے، اور اس حلال کی علامت یہ ہے کہ یہ

(کمائی، کسی مباح کے ذریعہ سے حاصل ہو، جو کہ شرعی حکم کے موافق ہو۔

۷۔ اس کا کوئی نیک ساتھی ہونا لازمی ہے جو کہ بھلائی کے کاموں میں اس سے تعاون کرے اور نیک ساتھی کی علامت یہ ہے کہ وُہ بھلائی اور تقویٰ کے کاموں میں اس سے تعاون کرے اور گناہ وظلم سے اسے منع کرے۔ یہ سات خصائل ارادہ کی غذا ہیں اور انہی کے ذریعہ یہ ارادہ قایم رہتا ہے۔

ان سات پر حسب ذیل چار باتوں سے مدد حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہی اس کی اساس ہیں اور انہی سے مندرجہ بالا کے لیے قوت حاصل ہوتی ہے:

۱۔ بھوک

۲۔ بیداری

۳۔ سکوت

۴۔ خلوت

یہ چاروں، نفس کے لیے قید و بند کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے ذریعہ نفس کو مارنے اور پابند بنانے سے نفس کمزور ہو جائے گا اور انہی پر نفس کا حسنِ معاملہ ہے اور ان میں سے ہر ایک قلب میں ایک بہترین اثر ڈالتا ہے۔ چنانچہ بھوک، دل کا خون کم کر کے اسے سفید کرتی ہے اور اس کی سفیدی میں نور ہے اور یہ دل کی چربی کو پگھلاتی ہے، اسکے پگھلنے میں دل کی رقت ہے اور دل کی رقت ہی ہر بھلائی کی کنجی ہے۔ اس لیے کہ ہر برائی کی کنجی دل کی قساوت ہے۔ اب جب دل میں خون کم ہو گا تو دشمن کو راہ بھی کم ملے گا، کیونکہ دشمن کی جگہ دل کا خون ہے اور جب دل رقیق ہوا تو دشمن کا تسلط بھی کمزور پڑ جائے گا۔ اس لیے کہ دشمن کا تسلط دل کی سختی اور قساوت میں ہے۔

فلاسفہ کہا کرتے ہیں:

"نفس خون کا نام" ہے اور ان کی دلیل یہ ہے کہ جب انسان مرتا ہے تو روح کے ساتھ اس کا خون ناپید ہو جاتا ہے اور علمار فلاسفہ نے فرمایا:

"خون دراصل نفس کی جگہ ہے اور یہی بات صحیح ہے اس لیے کہ یہ تورات کی تعلیم کے موافق ہے"۔

میں نے سنا۔ تورات میں لکھا ہے کہ:

"اے موسیٰ! رگیں مت کھاؤ۔ اس لیے کہ یہ ہر نفس کی جائے سکونت ہے"۔

اور یہ کلام اس حدیث کی تصدیق کرتا ہے:

"شیطان، ابن آدم میں خون کی طرح چلتا ہے۔ اس لیے اس کے چلنے کے راستے بھوک اور

پیاس کے ذریعہ تنگ کردو۔"

بعض علماء کوفہ نے خون کو نفس بتایا اور کہا،

"جب پانی میں ایسا جانور مرجائے جس کا نفسِ سائلہ نہ ہو تو پانی ناپاک نہیں ہوتا (نفسِ سائلہ سے مراد بہنے والا خون ہے) یعنی مکڑیاں وغیرہ مراد لیتے۔

بھوک زہد کی کنجی ہے

چنانچہ بھوک میں خون کم ہوتا ہے اور خون کی کمی سے دشمن کی راہ تنگ ہوتی ہے اور نفس کا مسکن، اس کی جگہ ساقط ہونے سے کمزور ہوتا ہے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام سے مروی ہے،

"اے حواریوں کی جماعت! اپنے پیٹوں کو بھوکا رکھو، اپنے جگر پیاسے رکھو اور اپنے ابدان کو برہنہ کرو تاکہ تمہارے دل اللہ عزوجل کو دیکھیں۔ یعنی حقیقتِ زہد اور دل کی صفائی کے ذریعہ (اللہ تعالٰی کی رویت حاصل کرو)

الغرض بھوک، زہد کی کنجی اور آخرت کا دروازہ ہے۔ اور اس میں نفس کی ذلت اور اس کا ضعف و انکساری ہے اور اس میں دل کی زندگی و اصلاح ہے۔ بھوک میں اوّل بات خاموشی ہے۔ خاموشی میں سلامتی ہے اور یہی عقلاً کا مقصود و غایت ہے۔

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا،

"تمام بھلائی ان چار باتوں میں جمع ہو گئی اور ابدال" انہی کی برکت سے ابدال ہوئے کہ پیٹ سے بھوکے رہیں، خاموشی اختیار کریں، بیدار رہیں اور عوام سے علیحدگی اختیار کریں۔"

نیز فرمایا،

"جو آدمی بھوک و تکلیف پر صبر نہ کرے۔ وہ اس راہ سے کچھ حاصل نہیں کرتا۔"

حضرت عبدالواحد بن زید" قسم کھا کر فرمایا کرتے،

صدیقین" صرف بھوک و بیداری کے ذریعہ ہی صدیقین" کے درجہ تک پہنچے۔ اس لیے کہ اس سے دل کو نورانیت و جلاء حاصل ہوتی ہے اور دل کی نورانیت میں مشاہدہ غیب ہوتا ہے اور اس کے جلاء میں صفاءِ یقین ہوتا ہے۔ چنانچہ نورانیت و جلاء، بیاض و رقت پر آتے ہیں۔ اب دل ایسا ہو جاتا ہے جیسے کہ شفاف آئینے میں چمکتا ہوا ستارہ ہو، اور غیب سے غیب کا مشاہدہ کرتا ہے چنانچہ جب باقی کا مشاہدہ کرتا ہے تو فانی سے زہد اختیار کر لیتا ہے اور جب وہ سزا و عذاب دیکھے گا تو دنیا کی لذتوں کی خواہش کم ہو جائے گی اور اخروی مشاہدات اور اخروی بلند درجات کے باعث

طاعات کی رغبت پیدا ہوگی۔ اب اخروی کا مقدم ہوجائیں گے اور دنیاوی اعمال غائب ہوکر رہ جائیں گے۔ غائب حاضر اور حاضر معدوم بن جائے گا اور (اخروی کاموں) میں ہی انہماک کرے گا۔ فانی کی خواہش ہی ختم ہوجائے گی اور اس طرح میلان ہی جاتا رہے گا۔ اب بندہ صحیح مومن ہوگا جیسے کہ حضرت حارثہ انصاریؓ نے مومن بندے کی تعریف کی کہ وہ بندہ یہ کہا کرتا ہے:

"میں نے دنیا سے اعراض کرلیا۔ گویا میں علانیہ اپنے رب کے عرش کی طرف دیکھ رہا ہوں اور میں اہل جنت کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ ایک دوسرے سے خوش ہو ہوکر مل رہے ہیں اور دوزخیوں کو دیکھ رہا ہوں کہ وہ غم و مصیبت میں ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے فرمان میں مومن کے دل کی یہی تعریف فرمائی کہ "قلوب چار ہوتے ہیں۔ ایک صاف دل ہے اس میں چراغ روشن ہوتا ہے۔"

یہ مومن کا دل ہے" اور دنیا میں زہد اختیار کرنے سے اور خواہشاتِ نفس سے جدا رہنے سے ہی دل صاف رہتا ہے اور اس میں جو چراغ روشن ہوتا ہے وہ نورِ یقین ہے۔ اس کے ذریعہ وہ غیب کا مشاہدہ کرتا ہے۔

شب بیداری

ہمارے بعض علماء کا فرمان ہے کہ،

جو آدمی چالیس رات تک خلوص سے بیدار رہا۔ اسے ملکوتِ سماوی کا مکاشفہ حاصل ہوگا۔" اور فرمایا کرتے،

"چار باتوں میں تمام بھلائی جمع ہوگئی۔ ان میں سے ایک شب بیداری ہے۔"

یاد رہے کہ علماء کی نیند، طویل شب بیداری کے باعث نیند غالب آنے سے ہے۔ (شب بیداری) سے انہیں مکاشفہ و شہود اور قرب و ورود حاصل ہوتا ہے اور ابدال کی صفت یہ ہے کہ ان کی خوراک فاقہ، ان کی نیند غلبہ (نیند) اور ان کا کلام ضرورت کے باعث ہوتا ہے اور جو حبیب کی خاطر شب بیداری کرتا ہے۔ وہ دن میں بھی اس کی نافرمانی نہیں کرتا ہے اس لیے کہ اس نے اسے رات میں اپنی خدمت کے لیے بیدار رکھا تھا۔

ایک روز حضرت حسنؓ بازار میں تشریف لے گئے۔ جب لوگوں کی فضول گوئی سنی تو فرمایا:

میں سمجھتا ہوں۔ ان لوگوں کی رات خراب ہوتی ہے جو یہ جھگڑ رہے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے:

"قیلولہ کرو۔ اس لیے کہ شیطان قیلولہ نہیں کرتا اور دن کے قیلولہ کے ذریعہ قیامِ شب میں مدد

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ کی تفسیر میں بتایا گیا کہ روزہ کے ذریعہ قیام شب میں مدد حاصل کرو۔ ایک قول کے مطابق یہ ہے کہ

"بھوک اور رات کی نماز کے ذریعہ مجاہدۂ نفس پر مدد حاصل کرو۔"

اور ایک قول میں اس کی وضاحت یہ ہے:

"ممنوع کام سے پرہیز کرتے پر صبر و نماز کے ذریعہ مدد حاصل کرو۔"

سکوت کے فوائد

خاموشی عقل کو باوقار بناتی، تقویٰ سکھاتی اور پرہیزگاری عطا کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے باعث صحیح علم و تاویل کے ذریعہ بندے کو راہِ نجات بتاتا ہے اور سکوت کے باعث ہی اسے صائب قول و عمل کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔

سلف؟ سے مروی ہے:

"میں نے کنکری کے ذریعہ خاموشی کی عادت ڈالی۔ میں نے تیس سال تک اسے منہ میں رکھا، جب میں کلام کرنا چاہتا تو اس کے باعث میری زبان میں رکاوٹ آتی۔ آخر خاموش ہو جاتی۔"

سلف میں سے بعض؟ کا فرمان ہے:

میں نے فضول گوئی کے ہر کلمہ پر اپنے آپ کو دو رکعت پڑھنے کا پابند بنایا اور یہ کام مجھ پر آسان رہا پھر میں نے لایعنی کلمہ پر اپنے آپ کو روزہ کا پابند کیا تو یہ بھی مجھ پر آسان رہا۔ آخرکار میں نے ہر لایعنی کلام پر ایک درہم صدقہ کی پابندی لگائی تو یہ کام مجھے مشکل نظر آیا۔ آخر میں (لایعنی کلام سے) رک گیا۔"

حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا،

"اے اللہ کے رسولؐ! نجات کس میں ہے؟"

آپؐ نے فرمایا،

"اپنی زبان قابو میں رکھ، تیرا گھر تیرے لیے وسیع ہو (یعنی باہر کم نکلا کر) اور اپنے گناہ پر رو۔"

جناب رسول اللہ صلی نے ایک مختصر اور جامع حدیث میں فرمایا،

"جسے اس سے فرحت ہو کہ وہ سلامت رہے تو اسے خاموشی اختیار کرنا لازم ہے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو نماز روزے وغیرہ کا حکم دیا۔ پھر وصیت کے آخر میں فرمایا:

"کیا میں وہ نہ بتاؤں جو اس سب سے زیادہ

اور آپؐ نے زبان کی طرف اشارہ کیا۔ (حضرت معاذؓ فرماتے ہیں) میں نے عرض کیا،

"اے اللہ کے رسولؐ! کیا ہماری زبانیں جو کلام کرتی ہیں ان پر بھی مواخذہ ہوگا؟"

آپؐ نے فرمایا:

"اے معاذ! تیری ماں تجھے روئے، لوگوں کو ناک کے بل پر ان کی زبانوں کی کھیتیاں ہی (انجام مد) ہی گرائے گا۔ جب تک تو خاموش ہے سلامت ہے اور جب تو نے کلام کیا۔ پھر یہ یا تیرے لیے (فائدہ) ہے اور یا تجھ پر (وبال) ہے۔"

حضرت عبداللہ بن سفیان نے اپنے والد محترم سے روایت کیا۔ فرماتے ہیں:

میں نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! اسلام میں مجھے ایسی چیز کی وصیت فرمائیے کہ آپؐ کے بعد کسی سے نہ پوچھوں؟"

آپؐ نے فرمایا:

"کہہ دے، میرا رب اللہ ہے پھر پختہ ہو جا۔"

(راوی فرماتے ہیں کہ) میں نے عرض کیا:

"اس کے بعد میں کس چیز سے بچوں؟" اور دوسرے الفاظ میں یہ منقول ہے: کہ

"مجھے سب سے نقصان دہ بات کی اطلاع دے دیں۔"

آپؐ نے فرمایا:

"یہ!" اور زبان کی طرف اشارہ کیا۔

ایک حدیث میں ہے:

"بندہ اس وقت تک اپنے پروردگار تعالیٰ سے ڈرنے کا حق ادا نہیں کرتا جب تک اپنی زبان سے غمگین نہ ہو۔"

اور حدیث میں ہے:

"جب تک بندے کا دل درست نہ ہو، اس کی اصلاح نہیں ہوتی۔ اور جب تک اس کی زبان درست نہ ہو، اس کا دل درست نہیں ہوتا۔"

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا:

"زبان سے زیادہ کوئی چیز طویل قید کی حقدار نہیں۔"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"میں نے پرہیزگاری تلاش کی تو میں نے زبان سے کم تر کہیں نہیں پائی۔"

بعض علماء کا فرمان ہے:

"جب بندے کی زبان درست ہوگی تو اس کے سارے اعمال میں اصلاح نمودار ہوگی اور جس کی زبان میں خرابی ہوئی اس کے سارے اعمال میں خرابی نمودار ہوگی۔"

حضرت احمد بن حنبلؒ نے فرمایا:

"اہل کلام علماء، زندیق ہیں۔" (یعنی ان کی زبانوں پر لایعنی کلام کا خطرہ ہے یا ہوجاتا ہے)

ایک بزرگؒ کا فرمان ہے:

"جس نے کلام کیا اور اچھا کلام کیا تو خوب ہے مگر شان یہ ہے۔ جو حسنِ سکوت اختیار کرے۔"

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں:

"خوف بے چینی پیدا کرتا ہے اور حیا سکوت پیدا کرتا ہے۔"

ایک عارفؒ کا فرمان ہے:

"یہ علم دو حصّوں پر منقسم ہے۔ نصف حصّہ خاموشی ہے اور نصف حصّہ یہ معلوم کرنا ہے کہ اسے کہاں رکھے۔"

حضرت ضحاک بن مزاحمؒ فرماتے ہیں:

"میں نے انہیں (سلفؒ کو) یوں پایا کہ وہ خاموشی اور تقویٰ سیکھتے تھے اور آج لوگ کلام سیکھتے ہیں۔"

حضرت حسنؓ نے حضرت انسؓ بن مالک سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"چار چیزیں عجب کے ساتھ ہی حاصل ہوتی ہیں:

۱۔ خاموشی، اور یہ عبادت کا آغاز ہے۔

۲۔ تواضع

۳۔ اللہ عزوجل کا ذکر کرنا۔ اور

۴۔ چیز کی کمی۔

حضرت حمادؒ بن زید نے فرمایا، کہ میں نے حضرت ایوبؒ سے عرض کیا:

"آج علم کثرت سے ہے یا پہلے زمانہ میں؟"

فرمایا:

"آج کلام کی کثرت ہے اور گزشتہ زمانہ میں علم کثرت سے تھا۔"

ایک قول یہ ہے کہ:

"ماضی میں لوگ علماء کے سکوت سے اس قدر استفادہ حاصل کرتے جس قدر کہ ان کے کلام سے منتفع ہوتے۔"

ایک قول یہ ہے: کہ

"جو آدمی متکلم کے سکوت سے استفادہ حاصل نہیں کرتا وہ اس کی کلام سے بھی نفع حاصل نہیں کرتا۔"

کسی عالمؒ سے پوچھا گیا: کہ

"فلاں زیادہ عالم ہے یا فلاں؟"

فرمایا:

"فلاں زیادہ عالم ہے اور فلاں باتیں بہت کرتا ہے۔"

چنانچہ انہوں نے علم و کلام میں فرق کر دیا۔

ایک خراسانی عالمِ دین کی وفات قریب تھی، کسی نے عرض کیا:

"ہمیں ایسے آدمی کی طرف رہنمائی کر جائیے کہ آپؒ کے بعد ان کے پاس بیٹھا کریں۔"

انہوں نے فرمایا:

"فلاں کے پاس"

چنانچہ انہوں نے ایک خاموش طبع عابد کا ذکر کیا جو کہ کثرتِ علم سے معروف نہ تھا۔ کسی نے عرض کیا کہ:

"ان کے پاس اس قدر علم نہیں کہ ہم جس علم کی بات پوچھیں وہ جواب دے سکے۔"

انہوں نے فرمایا:

"میں جانتا ہوں۔ مگر اس کے پاس اس قدر تقویٰ ہے کہ جسے وہ نہیں جانتا، اس کے بارے میں کلام نہیں کرتا۔"

حضرت اعمشؒ فرماتے ہیں:

"بعض کلام ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا جواب سکوت ہوتا ہے۔"

سلفؒ سے منقول ہے:

"خاموشی، عالم کی زینت اور جاہل کا پردہ ہے۔"

ایک بزرگؒ کا فرمان ہے:

"اس کا جواب خاموشی ہے۔"

حدیث میں ہے:

"خاموشی، علم کی زینت اور جاہل کے لیے عیب ہے۔"

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:۔

"شیطان پر بردبار عالم سے زیادہ کوئی سخت نہیں۔ اگر وہ کلام کرے تو علم سے کلام کرے۔ اور اگر خاموش رہے تو علم کے ساتھ سکوت اختیار کرے۔

شیطان کہتا ہے،

"اس کی طرف دیکھو۔ اس کا سکوت مجھ پر اس کے کلام سے زیادہ سخت ہے۔"

بعض سلفؒ سے مروی ہے:

"جیسے تم کلام سیکھتے ہو اسی طرح خاموشی سیکھو۔ اس لیے کہ اگر کلام تمہیں ہدایت دیتا ہے تو سکوت تمہیں بچائے گا اور خاموشی میں تیرے لیے دو خصلتیں ہیں،

جو تم سے زیادہ جاہل ہے اس کی جہالت ہٹا سکو گے اور جو تجھ سے زیادہ عالم ہے اس سے سیکھو گے۔"

ایک عالمؒ فرماتے ہیں،

"میں نہیں جانتا، سیکھو اور میں جانتا ہوں، مت سیکھو۔ اگر تم کہو گے "میں نہیں جانتا" تو تمہیں سکھایا جائے گا۔ حتیٰ کہ تم سمجھ جاؤ گے اور اگر تم کہو گے "میں جانتا ہوں" تو تم سے سوالات ہوں گے حتیٰ کہ تم نہ جانو گے۔"

علماءؒ کا فرمان ہے:

"جب عالم "میں نہیں جانتا" کا قول چھوڑ بیٹھے تو اسے مقاتلہ کرنے والا مل جائے گا۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

"تمام بھلائی تین چیزوں میں ہے، خاموشی، کلام اور نظر میں۔ جس کا سکوت تفکر نہ ہو وہ سہو میں ہے اور جس کا کلام ذکر نہ ہو وہ لغو (کلام) ہے۔ اور جس کی نظر عبرت کی نہ ہو وہ (نظر) لہو ہے۔"

بعض علماء کا فرمان ہے:

"لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ ان کا افضل ترین عمل نیند ہو گا اور افضل ترین علم خاموشی ہو گا۔"

یعنی اعمال خراب ہونے اور علم مشتبہ ہونے کے باعث ان کا سونا اور خاموشی ہی بہترین عمل ہو گا۔

نیز فرمایا:

"اور ان کا افضل ترین حال بھوک ہو گا، اس لیے کہ اس وقت حرام عام ہو گا اور حلال کی قلت ہو گی۔"

بعض مشائخؒ کا فرمان ہے،

"عقل کی نیند خاموشی ہے اور اس کی بیداری کلام کرنا ہے اور ہر بیداری نیند کی محتاج ہے اور جب کبھی کوئی عاقل خاموش ہوتا ہے تو اس کی عقل مجتمع اور نفس حاضر ہو جاتی ہے۔"

حضرت ابن عباسؓ نے حضرت مجاہدؒ سے یہ فرمایا،

"لایعنی معاملہ میں کلام ہرگز نہ کرنا، اس میں سلامتی ہے اور میں تجھ پر غلطی کے بارہ میں بے خطر نہیں ہوں اور ضرورت کے موقع پر اس وقت کلام کرنا جہاں کلام کا مقام ہو۔ اس لیے کہ بسا اوقات ضروری معاملہ میں بھی بے موقع کلام کر کے مشکل میں پھنس جاتا ہے۔"

ایک عالم فرماتے ہیں،

"کلام میں آدمی کے تقویٰ کا پتہ چل جاتا ہے۔"

حدیث میں آتا ہے:

"جس کا کلام زیادہ ہو، اس کے گناہ زیادہ ہوتے ہیں اور جس کے گناہ زیادہ ہوں اس کا دل مر جاتا ہے۔" اور کہا کرتے ہیں:

"جب کلام کم ہو تو حق زیادہ ہوتا ہے۔"

سلفؒ کی ایک جماعت سے منقول ہے:

"دس میں سے نو حصے سلامتی خاموشی میں ہے۔"

اور کہا کرتے ہیں:

"جو کلمہ بھی مزاح یا ہزل یا لغو طریقہ سے نکلے۔ اس کی وجہ سے بندے کو پانچ طرح زجر ہوتا ہے، اسے کہا جاتا ہے کہ:

۱۔ تو نے یہ کلمہ کیوں کہا؟ کیا یہ بات تیری ضرورت کی تھی؟

۲۔ جب تو نے یہ کلمہ کہا تو کیا تجھے اس سے نفع ہوا؟

۳۔ اگر تو یہ کلمہ نہ کہتا تو کیا تجھے کچھ نقصان ہوتا؟

۴۔ تو خاموش کیوں نہ رہا تاکہ اس کے انجام سے بچ رہتا۔

۵۔ تو نے اس کی جگہ یہ الفاظ کیوں نہ کہے:

سبحان اللہ والحمد للہ ۔ تاکہ خوب ثواب لیتا۔

اور فرماتے ہیں:

ہر کلمہ کے لیے تین دیوان کھولے جاتے ہیں:

۱۔ کیوں ؟
۲۔ کیونکر ؟
۳۔ کس کے لیے ؟
اگر تینوں سے نجات مل گئی تو ٹھیک ورنہ حساب کے لیے طویل قیام موجود ہے۔"
حضرت حسنؓ نے فرمایا:
"مومن کی زبان، اس کے دل کے پیچھے ہے۔ جب کلام کرنا چاہتا ہے تو سوچتا ہے۔ اگر اسے ضرورت ہو تو کلام کرتا ہے ورنہ اس پر خاموش رہنا لازم ہے اور منافق کا دل اس کی زبان میں ہوتا ہے۔ جو جی میں آتا ہے، کہہ ڈالتا ہے۔ اسے کچھ روک ٹوک نہیں ہوتی۔"
حدیث میں آتا ہے:
"عالم کے لیے یہ بات آفت ہے کہ اسے خاموشی سے کلام زیادہ خوب معلوم ہوتی ہو۔"
حالانکہ کلام میں تصنع اور زیادتی ہوتی ہے۔ اور خاموشی سلامتی اور فائدہ ہے۔
حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نصائح ہیں۔ ہے کہ:
"اس کے لیے خوشخبری ہے جس کو اپنے عیب میں (انہماک) نے دوسروں کے عیوب سے علیحدہ کر دیا۔ اس نے اپنا فالتو مال (اللہ کی راہ میں) خرچ کیا اور فضول کلام سے پرہیز رکھا۔"
الغرض خاموش رہنے کے بارے میں بکثرت احادیث آئی ہیں اور یہاں ہمارا مقصود سب کو بیان کرنا نہیں۔

خلوت کی اہمیت

اس کا مطلب ہے دل کو مخلوق سے خالی رکھنا اور خالق کی بندگی میں کمر باندھ لینا اور خوب پختہ قدم ہو جانا۔ اس لیے کہ عوام سے اختلاط کے باعث عزم کمزور ہو جاتا ہے، ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور خلوت کے وقت میں دنیا کی زندگی کے فوائد کم ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کہ آنکھوں سے یہ وقتی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور آنکھ ہی دل کا دروازہ ہے۔ اس سے آفات داخل ہوتی ہیں اور اس سے شہوتوں اور لذتوں کی آمد ہوتی ہے۔
بعض علماء کا فرمان ہے:
"جو (دنیا پر) زیادہ نظر کرے، اس کی حسرتیں دائمی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔" اور خلوت میں آخرت کے افکار کی خوب آمد ہوتی ہے اور آخرت کے مشاہدہ سے خوب ہمت باندھتا ہے اور بندوں کی باتیں فراموش ہو جاتی ہیں اور معبود کا ذکر ہی جاری رہتا ہے۔ حقیقت میں سب سے زیادہ عافیت کی جگہ خلوت

ہے۔ حدیث میں آتا ہے:

"اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو، بندے کو یقین کے بعد عافیت سے افضل تر کوئی چیز نہیں دی گئی۔"

اور حدیث میں یہ بھی آیا:

"لوگوں سے علیحدہ رہنا عافیت ہے۔"

چنانچہ جس مفہوم میں سوال مستحب ہے اس میں اور جس میں یقین کے بعد نفیلت ہوئی سب احوال پر یہ آتی ہے۔

اور طالب صادق کی علامت یہ ہے کہ وہ جماعت سے زیادہ خلوت میں لذت وحلاوت پائے اور ظاہر سے زیادہ پوشیدہ حالت میں زیادہ قوت ونشاط محسوس کرے۔ تنہائی میں اس کا انس ہو، خلوت میں اسے آرام ملے اور اس کا اعلیٰ ترین عمل اخفاء میں ہو۔

لوگوں کے ساتھ احوال اختلاط میں خلوت کی مثال ایسے ہے جیسے کہ مقاماتِ محبت میں خوف ہو۔ خوف تمام عابدین کی اصلاح کرتا ہے اور خواص اور اہل محبت کے لیے محبت مزید انعامات کا باعث ہے اس طرح خلوت وعلیحدگی تمام طالبین کے لیے مفید ہے اور اہل لوگوں خصوصاً علمائے دین کے لیے لوگوں کے ساتھ اختلاط وانس مفید ہے۔ البتہ خلوت میں ایک دوسری دانش اور وحدت وتنہائی میں ایک دوسرا ایمان درکار ہے۔

حضرت سفیان ثوریؒ اور حضرت بشرؒ بن حارث سے مروی ہے:

"جب تو تنہائی سے وحشت اور مخلوق کے ساتھ انس محسوس کرے تو تجھ پہ ریاکاری کا خطرہ ہے۔"

بھوک کے فوائد

حضرت ابو محمدؒ فرمایا کرتے:

"ان چار خصائل میں تمام بھلائی بند ہے اور ابدالؒ انہی کے باعث ابدال ہوئے:

۱۔ پیٹ کو بھوکا رکھنا۔

۲۔ خاموش رہنا۔

۳۔ مخلوق سے علیحدگی۔ اور

۴۔ شب بیداری۔"

حضرت عبدالعزیزؒ نے حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ سے نقل کیا: کہ

"ایک ولی اللہ کا لوگوں سے اختلاط رکھنا ذلت ہے اور اس کی تنہائی عزت ہے۔ میں نے

تقریباً ہر ولی اللہ کو تنہا دیکھا۔"

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"تنہائی سے مانوس ہونا طریق پانے کی دلیل ہے۔ درست توبہ کے بعد صداقت کی علامت یہ ہے کہ مذکورہ چار باتوں کی مخالفت نہ کرنے پر پختہ رہنے کا عزم و ارادہ ہو اور دل بھی حاضر ہو۔ شرحِ صدر حاصل ہو اور ان کے ساتھ ساتھ اخلاقِ حسنہ پر رہے۔ اس لیے کہ ان کی مخالفت دنیا کے دروازے، غفلت کی کنجیاں اور خواہشاتِ نفس کی راہیں ہیں کیونکہ پیٹ بھرنے میں دل کی قساوت و ظلمت ہے اور اس سے نفسانی قوتوں کو توانائی ملتی ہے اور لذتوں کا جال پھیل جاتا ہے اور نفسانی قوتوں کی توانائی سے ایمان کمزور ہوتا اور اس کے انوارات ماند پڑ جاتے ہیں اور نفس کی کمزوری میں ایمان قوی ہوتا اور انوارِ یقین شعاع زن ہوتی ہیں۔ یقین کی قوت میں ہی بندے کو قربِ الٰہی اور مجالستِ حبیب حاصل ہوتی ہے اور پیٹ بھرنا خواہشاتِ دنیا کی کنجی ہے۔"

ایک صحابیؓ فرماتے ہیں:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلی بدعت، پیٹ بھرنے کی پیدا ہوئی۔ جب قوم کے پیٹ بھر جاتے ہیں تو ان کی شہوتیں بھی آن جمع ہوتی ہیں۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بغیر احتیاج کے بھوکے رہتے۔" یعنی اختیاری طور پر پیٹ کو بھوکا رکھتے۔"

حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا:

"حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد میں نے پیٹ بھر کر نہیں کھایا۔" اور یہ حجاج کے عہد میں فرمایا۔

حضرت ابو جحیفہؓ کی حدیث میں ہے کہ جب انھوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ڈکار لیا تو آپ نے فرمایا:

"ڈکار کو روکو، اس لیے کہ دنیا میں (جو) تم میں سے زیادہ طویل (مدت) تک پیٹ بھرا ہوگا۔ وہ آخرت میں سب سے زیادہ بھوکا ہوگا۔"

راوی بتاتے ہیں کہ "میں نے اس روز سے لے کر آج کے دن تک کبھی پیٹ بھر نہیں کھایا اور باقی کے بارے میں مجھے اللہ تعالیٰ سے معافی کی امید ہے۔"

اور مستحب یہ ہے کہ دنیا میں بندہ پیٹ بھرنے سے زیادہ (مدت) تک بھوکا رہے۔ یہی اولیائے کرام کی علامت ہے۔ جو آدمی دو بار کی انتہائی بھوک کے درمیان ایک بار کھانا کھائے اس کی بھوک سیرابی سے زیادہ ہے اور جو انتہائی بھوک کے بعد متوسط درجہ تک کھائے اس کی بھوک اور سیرابی میں اعتدال ہے اور جو آدمی ایک دن میں دو بار کھائے یا بھوک کے بغیر کھاتا رہے اور سیراب ہو کر کھائے تو اس کی سیری، بھوک سے زیادہ ہے اور یہ مکروہ ہے۔ اور جو آدمی بھوک کے بعد کھائے اور سیر ہونے سے پہلے ہی ہاتھ اٹھالے اس کی بھوک سیری سے زیادہ ہے۔ اور یہ متوسط حال ہے۔

حضرت ہشامؒ نے حضرت حسنؓ سے نقل کیا: کہ

"اللہ کی قسم! میں نے ایسے لوگ دیکھے کہ جو سیر نہیں ہوتے تھے۔ ایک آدمی کھانا تو حسب جان دار اس آتی تو درست نیت، دُبلا، ناتواں اور تابعدار حالت میں ہاتھ روک لیتا، وہ ساری عمر اس طرح گزارتا کہ اس کے لیے کپڑا نہیں لپیٹا گیا اور نہ ہی اس نے اپنے اور زمین کے درمیان کچھ رکھا۔"

حضرت جعفرؒ بن حیان نے حضرت حسنؓ سے نقل کیا:

"مومن آدمی ہر بطن میں نہیں کھاتا۔ (یعنی پیٹ بھر کر نہیں کھاتا) اور اس کی وصیت ہمیشہ اس کے پہلو میں رہتی ہے۔"

حضرت ثوریؒ سے منقول ہے:

دو خصلتیں دل میں قساوت پیدا کرتی ہیں:

۱۔ طویل سیرابی

۲۔ کثرتِ کلام

حضرت مکحولؒ سے منقول ہے:

"تین خصائل کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور تین خصائل سے اللہ تعالیٰ کو بغض و نفرت ہے۔ جن کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔ کھانا کم کھانا۔

۲۔ کم سونا۔

۳۔ کلام کرنا۔

اور جن سے اللہ تعالیٰ کو بغض ہے، وہ یہ ہیں:

۱۔ زیادہ کھانا۔

۲۔ زیادہ کلام کرنا۔

۳۔ زیادہ سونا۔

اس لیے کہ نیند کی کثرت میں طویل غفلت، کم عقلی، کم فہمی اور قلبی سہو پایا جاتا ہے اور ان باتوں میں (ہر نیکی) فوت ہو جاتی ہے اور (نیکی) فوت ہونے میں موت کے بعد حسرت ہی حسرت ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ فرمایا:

"حضرت سلیمانؑ بن داؤدؑ کی والدہ نے اپنے بیٹے سے فرمایا:

"اے بیٹے! رات کو نیند زیادہ نہ کرنا، اس لیے کہ نیند کی کثرت، ضیافت کے روز بندے کو محتاج و فقیر کر دے گی۔"

منقول ہے: کہ

"بنی اسرائیل میں کچھ نوجوان خوب عبادت گزار تھے۔ جب ان کے سامنے کھانا رکھا جاتا تو ان میں سے ایک عالم کھڑا ہو کر کہتا:

"اے جماعتِ طالبین! زیادہ مت کھاؤ اس لیے کہ پھر زیادہ پیو گے، پھر زیادہ سوؤ گے، پھر زیادہ خسارہ اٹھاؤ گے۔"

سلفؒ سے مروی ہے:

"مومن کا ادنیٰ حال خورد و نیند ہے اور منافق کا افضل حال خورد و نیند ہے۔"

ایک آدمی نے ایک فلسفی حکیم سے کہا:

"کوئی ایسی دوائی بتائیے کہ میں دن میں بھی سوتا رہوں۔"

حکیم نے جواب دیا:

"اے تو کس قدر کم عقل آدمی ہے، تیری نصف عمر تو نیند ہے اور نیند، موت کی قسم ہے۔ کیا تُو یہ چاہتا ہے کہ تین چوتھائی نیند اور ایک چوتھائی زندگی بنا لے۔

اس نے پوچھا:

"کہ یہ کیوں کر ہوگا؟"

فرمایا: "اگر تو چالیس برس زندہ رہے تو اصل زندگی بیس برس کی ہوئی۔ اب تو کیا اسے دس برس کی زندگی بنانا چاہتا ہے؟"

کثرتِ کلام گناہوں کی جڑ ہے

کثرتِ کلام میں تقویٰ و پرہیزگاری کم ہو جاتی ہے۔

حساب طویل ہوجاتا ہے۔ مطالبات بڑھ جاتے ہیں۔ مظلوموں سے سابقہ پڑتا ہے۔ کراماً کاتبین ملائکہ کی گواہیاں زیادہ ہو جاتی ہیں اور ملکِ کریم تعالیٰ سے اعراض دائمی ہوجاتا ہے۔ اس لیے کہ کبائر کی کنجی زبان ہے۔ اس سے جھوٹ، غیبت، چغلی اور بہتان طرازی کی جاتی ہے۔ جھوٹی گواہی اسی کے ذریعہ دی جاتی ہے۔ پاکباز پر تہمت اور اللہ تعالیٰ پر افتراء لوگ اس کے ذریعہ باندھتے ہیں اور لایعنی کلام اور غیر نافع باتوں میں انہماک اسی کے ذریعہ ہوتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے:

"بنی آدم کی زیادہ خطائیں اس کی زبان میں ہیں اور قیامت کے روز سب سے زیادہ گنہگار وہی ہوگا جو کہ لایعنی امور میں زیادہ انہماک کرنے والا ہوگا۔"

زبان میں مخلوق کی خاطر تصنع اور سنگار کیا جاتا ہے۔ اس میں تحریف اور درست مفاہیم کو تبدیل کرنا ہوتا ہے۔ اسی میں مداہنت اور اخفارِ حق اور اہل ہوٰی کے سامنے تملق بازی کی جاتی ہے۔ بندے پر ان امور کا اجتماع اس کے دل کی تفریق کا باعث ہے اور اس کے دل کی تفریق سے اس کی ہمت میں شکستگی پیدا ہوتی ہے اور ہمت ٹوٹ جاتی ہے سے وہ مقامِ مقربین سے گر جاتا ہے۔

حضرت ابن عباسؓ نے حضرت مجاہدؒ کو وصیت کی کہ

"کسی بردبار اور بیوقوف کے سامنے نخوت نہ کرنا۔ اس لیے کہ بردبار تجھے ہٹا دے گا اور بے وقوف تجھے ایذا دے گا۔"

حدیث میں آتا ہے:

"بندہ گاہے ایسا کلام کرتا ہے جو اس کا دل اس سے کہتا ہے۔ آخر اس کی وجہ سے اسے آسمان و زمین کے درمیان کی مسافت بھر دُور پھینک دیا جاتا ہے۔"

حدیث کے دُوسرے الفاظ یہ ہیں:

"ایسا کلام کرتا ہے کہ دوزخ میں ستر خریف تک گرا دیا جاتا ہے۔"

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے سے فرمایا:

"قوم کی مجلس میں لایعنی کلام کرنے سے تیرے لیے یہ بہتر ہے کہ تو گونگا رہے اور تیری رالیں سینے پہ بہتی رہیں۔"

حدیث میں آتا ہے:

"جو کسی بُرے کلمہ سے آغاز کرے، پھر اسی طرح کے (برے کلمات) میں لوگ پڑ جائیں تو ان سب کے

گناہوں کے برابر اس کو گناہ ہوگا۔"

ایک حدیث میں ہے:

"بُری خبر صرف بُرا آدمی ہی لاتا ہے۔"

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کے بارے میں منقول ہے:

"کوئی آدمی ان کی مصاحبت کرتا اور پھر کوئی بری خبر لاتا تو وہ اس سے علیحدگی اختیار کر لیتے۔"

حدیث میں مروی ہے:

"جو کانوں سنی اور آنکھوں دیکھی بات روایت کر دے۔ اللہ تعالیٰ اسے ان لوگوں میں سے لکھ دیتا ہے کہ جو ایمان والوں میں فحاشی پھیلانا پسند کرتے ہیں۔"[۱]

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ

"لوگوں میں فحاشی پھیلانے والا، (فحاشی کا ارتکاب) کرنے والے کی طرح ہے۔"

حدیث میں ہے:

"اہلِ صفہ کے فقراء میں سے ایک صحابیؓ نے اللہ عزوجل کی راہ میں شہادت پائی۔ ان کی والدہ نے کہا:

"تجھے جنت مبارک ہو، تو نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا، جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی اور شہادت پائی۔ تجھے جنت کی خوشخبری ہو۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تجھے کیا خبر کہ وہ جنت میں ہے؛ شاید اس نے غیر مفید بات میں کلام کیا ہو یا غیر مضر میں بخل روا رکھا ہو۔"

ایک الفاظ یوں آتے ہیں:

"شاید اس نے لایعنی امر میں کلام کیا ہو اور اس (مقدار) میں بخل کیا ہو جو اسے امیر نہیں بنا سکتی۔"

غلیبت جُرم ہے

حدیث میں آتا ہے:

"ایک صحابیؓ نے ایک آدمی کے بارے میں یہ کہا کہ وہ بہت سونے والا ہے۔

---

[۱] یعنی کوئی آدمی گناہ کا کام دیکھے اور باہر آ کر اس کی تمام تفصیلات اور طریقے بتانا شروع کر دے تو یہ خطرہ ہے کہ جن لوگوں کو اس گناہ اور اس گناہ کے کرنے کی پوری تفصیل معلوم نہیں تھی۔ معلوم ہونے پر ان میں سے کچھ لوگ یہی گناہ کرنے لگیں گے۔ اس طرح گناہ کم نہ ہوگا بلکہ گناہ پھیل جائے گا اور تفصیلات بتانے والا گناہ پھیلانے کا باعث بنا۔ (مترجم)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"تم نے اپنے بھائی کی غیبت کی - اس سے درخواست کرو کہ تمھارے لیے بخشش کی دعا کرے"۔

دُوسری حدیث میں ہے کہ صحابہؓ نے کہا :

"فلاں آدمی کس قدر عاجز ہے ؟"

آپؐ نے فرمایا :

"تم نے اسے کھایا"۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے :

"انہوں نے ایک عورت کے بارے میں کہا کہ اس کا دامن کس قدر لمبا ہے ؟"

دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ

"(حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا) نے فرمایا "یہ چھوٹی ہے "۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"تو نے اس کی غیبت کی "۔

ایک حدیث میں آتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " تو نے ایسا کلمہ بولا ہے ، اگر اس میں سمندر کا پانی ملایا جائے تو مل جائے "۔ یہ شدت میں مبالغہ کا وصف ہے۔

غیبت کے مفہوم میں ایک جامع حدیث ہے :

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے :

" جس نے اپنے بھائی کی وہ بات کہی جو اس میں ہے تو اس نے اس کی غیبت کی "۔

حضرت ابانؒ نے حضرت انسؓ سے اور انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سے بھی زیادہ شدید وعید روایت کی - فرمایا :

" اگر تو نے اپنے بھائی کے بارے میں ایسی بات کہی کہ تو نے اس کی طہارت بیانؑ کی تو یہ غیبت ہے "۔

یہ بہت سخت فرمان ہے اور غیبت کے بارے میں ازحد شدید حکم ہے۔ غیبت لغت میں اسم ہے اور اس کا شرعی مطلب غیب (الانسان) سے ماخوذ ہے - جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت یوں فرمائی :

" ایک آدمی اپنے بھائی کی وہ بات بیان کرے جو اس میں ہے (یہ غیبت ہے" اور فرمایا کہ،

"یہ زنا سے زیادہ سخت ہے"۔

چنانچہ جب بندہ اپنے بھائی کی کوئی ایسی برائی بیان کرے جو یقیناً اس میں ہو اور وہ اسے اس کے سامنے نہ کہہ سکے یا کچھ کم کر دے یا اس کا تزکیہ بیان نہ کرے تو اس نے غیبت کی۔ اب اگر خاموشی میں صرف غیبت سے ہی نجات مل جائے تو بھی فائدہ عظیم ہاتھ آیا۔ دیکھیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تین کے سوا بنی آدم کا ہر کلام اس پر بوجھ ہے۔ اس کے لیے فائدہ مند نہیں۔ (تین مستثنیٰ یہ ہیں)۔

۱۔ نیکی کا حکم کرنا۔

۲۔ برائی سے روکنا۔ اور

۳۔ اللہ عزوجل کا ذکر کرنا۔

عوام سے اختلاط موت ہے

لوگوں سے اختلاط رکھنا اس عزم کو کمزور کرتا ہے جو کہ اعمالِ خیر میں قوت کا باعث تھا اور بندے نے خلوت میں جو پختہ یقین حاصل کر لیا تھا اسے برباد کرتا ہے۔ اس لیے اختلاطِ عوام میں بھلائی اور تقویٰ پر کوئی معاون نہیں ہوتا بلکہ زیادہ تر گناہ اور ظلم کے معاون ہوتے ہیں۔

اور عوام سے اختلاط کرنا اس لیے بھی مضر ہے کہ اس طرح دنیا طلبی کی حرص پیدا ہوتی ہے اور اہل دنیا اور غافلین کو دیکھ دیکھ کر وہ بھی عبادت و غفلت و تساہل کرنے لگتا ہے۔ اہلِ باطل کی مجالست اور دنیادار مُردوں کی مصاحبت اور جاہلوں کا سننے کے باعث نورِ علم ختم ہو جاتا ہے۔ عبادت کی شیرینی کم ہو جاتی ہے اور فہم و وجدان سے محرومی ہو جاتی ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منقول ہے:

"مُردوں کے پاس مت بیٹھو، تمہارے دل مر جائیں گے۔"

پوچھا گیا: "مُردے کون ہیں؟"

فرمایا: "دنیا سے محبت رکھنے والے اور دُنیا کے طلب گار۔"

حضرت حسنؓ نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَا یَسْتَوِی الْاَحْیَآءُ وَلَا الْاَمْوَاتُ۔ (اور زندے اور مُردے برابر نہیں ہیں)

(حضرت حسنؓ نے فرمایا) کہ (احیا سے مراد) فقراء اور (اموات سے مراد) اغنیاء ہیں۔ اس لیے کہ فقراء اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کے باعث زندہ ہیں اور اغنیاء دنیا پر مر گئے۔

ضعفِ یقین باعثِ ہلاکت ہے

لوگوں سے اختلاط اور بے کار و غافل لوگوں کی مجلس و مصاحبت میں سب سے زیادہ نقصان یہ ہے کہ

انہیں دیکھنے سے یقین کمزور ہو جاتا ہے۔ اور یقین کی کمزوری بندے کے لیے سب سے زیادہ مضر اور باعثِ ہلاکت بات ہے۔ اس پر بڑی سرزنش آئی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے سب سے زیادہ ڈرایا۔ آپؐ نے فرمایا،

"مجھے اپنی اُمت پر سب سے زیادہ خطرہ یقین کی کمزوری کا ہے"۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ دنیا طلبی اور کثرت کی حرص اور دنیا داروں کی طرف میلان ان سب باتوں کی جڑ یقین کی کمزوری ہے۔

جیسے کہ حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں:

"ایک آدمی گھر سے نکلتا ہے اور اس کا دین اس کے پاس ہے۔ پھر گھر واپس آتا ہے اور کچھ دین بھی اس کے پاس نہیں۔ اس سے ملتا ہے تو کہتا ہے کہ تو ایسا ایسا ہے اور اس سے ملتا ہے تو کہتا ہے کہ تو ایسا ایسا ہے اور اس طرح کر کر کے وہ اس حال میں گھر واپس آتا ہے کہ اللہ عز وجل کو ناراض کر چکا ہوتا ہے۔

ایک تابعیؒ فرماتے ہیں:

"بندہ بھلائی کی خصائل پر تنہائی میں بیٹھا ہوتا ہے۔ آخر لوگوں کے پاس آتا ہے تو ایک ایک خصلت جُدا ہوتی ہے۔ اور واپس آنے تک تمام خصائل حمیدہ سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ اور قوتِ یقین ہی ہر نیک عمل کی جڑ ہے۔ اس لیے کہ قوتِ یقین میں ہی دارِ فانی سے ہٹ کر دارِ باقی کی طرف تیزی سے جا سکتا ہے۔ باقی کو مقدم رکھ سکتا ہے اس کی حرص و طمع کم ہو سکتا ہے اور دنیا کی فانی چیزوں سے اعراض کر کے آخرت کی باتوں میں انہماک کر سکتا ہے۔ اسی سے اس کے اعمال میں اخلاص پیدا ہوتا ہے اور اسے حقیقی زہد حاصل ہوتا ہے۔ کم امیدی اور حسنِ عمل سے وُہ زاہد بن سکتا ہے۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ نے کثرت کی خواہش کی مذمت کی کہ تمہیں کثرت کی خواہش نے غافل کر دیا۔ آخر تم نے قبریں جا دیکھیں اور بتایا کہ آخر کار تمہیں علم یقین ہوگا اور جب آخرت کی زندگی دیکھیں گے تو ڈراتے ہُوئے فرمایا:

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ (تمہیں کثرت نے غافل کر دیا)

حتیٰ کہ تم قبروں میں جا پہنچے۔ پھر فرمایا:

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ۔ یعنی آخرت کے اعمالِ صالحہ میں انہماک اختیار کر کے اور لہو و لعب جو کہ باعثِ شک ہے اس لیے کہ یہ یقین کی ضد ہے۔ اس سے اعراض کر کے۔ چنانچہ اگر ایسا ہو تو تم دنیا کی کثرت کی بجائے آخرت میں مشغول ہو کر رہ جاؤ جیسے کہ عدمِ یقین کے باعث دنیا کی لہو و لعب نے تمہیں مشغول کر رکھا ہے۔ ایسے ہی فرمایا:

اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا (ہم نے دیکھ لیا اور ہم نے سن لیا ہمیں واپس لوٹنا...)

اِنَّا مُوْقِنُوْنَ۔ نیک اعمال کریں گے بیشک یقین کرنے والے ہیں)

اور اس سے پہلے فرمایا:

بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ۔ (بلکہ وہ شک میں کھیل کود کر رہے ہیں)

پھر دوبارہ انہیں دھمکا کر وعدہ کیا کہ دیکھو جن انعامات نے تمہیں آخرت سے روک رکھا تھا، اور دنیا طلبی کی کثرت میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ ان کی پرسش ہوگی۔ ایک قول کے مطابق اس سے مراد "مال جمع کر کر کے رکھنا اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خیرات نہ کرنا" ہے۔

توبہ میں تین رکاوٹیں ہوتی ہیں

یاد رکھیں جو چیزیں توبہ میں حائل ہیں اور توبہ پر استقامت نہیں ہونے پاتی۔ وُہ تین چیزیں ہیں:

۱۔ کمانا۔

۲۔ خرچ کرنا۔

۳۔ جمع کرنا۔

یہ مخلوق سے متعلق اسباب ہیں اور ان کے وجود کے ساتھ ساتھ موجود ہیں اور مخلوق سے علیحدہ ہونے پر یہ تینوں چیزیں ناپید ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ جو آدمی ان تین باتوں میں زہد اختیار کرے گا وہ مخلوق میں زاہد ہوگا اور جو مخلوق میں رغبت رکھے گا وہ ان تین چیزوں میں رغبت کرے گا۔

حضرت ثوریؒ فرماتے ہیں:

"جو لوگوں سے اختلاط کرے گا وہ ان کی مدارات کرے گا اور جو ان کی مدارات کرے گا وہ ان کے سامنے دکھاوا کرے گا۔ آخر وہ اسی میں پڑا، جس میں وہ پڑے۔ چنانچہ جیسے وہ برباد ہوئے یہ بھی برباد ہو گیا۔"

گروہِ صوفیاء میں سے ایک صالح بزرگ فرماتے ہیں:

"میں نے ابدال میں سے ایک صاحب سے عرض کیا جو کہ لوگوں سے جدا رہتے تھے کہ تحقیق کی طرف کیونکر راہ ملے؟ اور ایک بار یوں فرمایا:

"مخلوق کی طرف مت دیکھو، اس لیے کہ ان کی طرف نظر کرنے میں ظلمت ہے۔"

میں نے عرض کیا: "میں اس پر مجبور ہوں۔"

فرمایا: "ان کا کلام نہ سنو، اس لیے کہ ان کا کلام قساوت ہے۔"

میں نے عرض کیا: "مجھے اس میں بھی مجبوری ہے۔"

فرمایا: "ان سے معاملہ نہ کرو، اس لیے کہ ان سے معاملہ کرنے میں وحشت ہے۔"

میں نے عرض کیا: "میں ان کے اندر ہی رہتا ہوں۔ معاملہ بھی ایک ناگزیر بات ہے"۔
فرمایا: "ان کی طرف سکون اختیار نہ کرو۔ اس لیے کہ ان کی طرف سکون اختیار کرنا ہلاکت ہے"۔
میں نے کہا: "یہ تو ایک عذر ہے"۔
فرمانے لگے: "ارے تو غافلین کو دیکھتا ہے، جاہلوں کا کلام سنتا ہے اور بطالین (بے کار) لوگوں سے معاملہ کرتا ہے۔ پھر بھی تو یہ چاہتا ہے کہ تو اپنے دل میں دائمی طور پر اللہ عزوجل کی معیت پائے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا"۔

تنہائی اور علیحدگی، خاموشی، بھوک، بیداری اور رات کی عبادت و ریاضت کی فضیلت میں ہم نے کامل بحث کر دی ہے۔ جو آدمی آخرت کا ارادہ رکھے اور اس کی کوشش کرے اور مومن بھی ہو اس کیلئے ہم نے کافی و شافی مواد جمع کر دیا ہے۔ جو اللہ کے ساتھ معاملہ و تجارت کرنا چاہے اور اللہ تعالیٰ کے بغیر نہ خوف ہے اور نہ ہی قوت ہے۔

فصل ۲۸

مراقبہ مقربین و مقامات اہل یقین

پہلا مقام | جب بندے کا یقین قوی ہو جائے تو اس بات کا کلی یقین کر لیتا ہے کہ اس کے یہ تمام اوقات اس کے پاس امانت ہیں اور یہی اس کی زندگی اور تربیت ونما کا باعث ہیں۔ برزخ اور قیامت کے روز دوبارہ واپس آئیں گے۔ اگر جنت میں داخل ہو گیا تو پھر ان کا سامنا کرے گا اور جس قدر یہاں پر کام کیا تھا اس قدر وہاں پر صلہ پائے گا۔ جس قدر یہاں توفیق میسر آئی اسی قدر وہاں پر اجر ملے گا۔ اوقات کی ہی پرسش ہو گی اور ساعاتِ دنیا کا ہی محاسبہ ہو گا۔ انہی پر جزا ملے گی۔ دوسروں کے اوقات اس پر پیش نہ ہوں گے۔ جیسے کہ خود اسے دوسروں کی صورت میں اٹھایا نہیں جائے گا۔ اور نہ ہی دوسروں کے اعمال کا صلہ اسے ملے گا۔ جیسے کہ یہاں پر دوسروں کا معاملہ اس سے نہیں ہوا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے اور دوبارہ اٹھائے گا۔ اس لیے فرمایا:

كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ۔

اور ایک جگہ فرمایا:

اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِيْنَ كَالْمُجْرِمِيْنَ[1] (کیا پس ہم مسلمانوں کو مجرموں کی طرح کر دیں گے؟)

كِتَابٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْا اٰيٰتِهٖ۔ (کتاب ہے اسے ہم نے تیری طرف اتارا مبارک ہے تاکہ اس کی آیات میں تدبر کرو)

اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِى الْاَرْضِ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ[2] (کیا ہم ان کو جو ایمان لائے اور اچھے اعمال کیے۔ انہیں زمین میں فساد کرنے والوں کی طرح کر دیں گے یا کیا ہم پرہیزگاروں کو فاجروں کی طرح کر دیں گے؟)

یعنی اس کی آیات میں غور کرو۔ کیا تم یہ کہیں دیکھتے ہو کہ ان کی جزا ان کو دے دی ہو۔ یا کیا تم ان کے کاموں پر ان کو جزا ملتی پاتے ہو؟ اسی طرح فرمایا:

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ۔ (نہ تمہاری آرزو پر ہے اور نہ کتاب والوں کی آرزو پر ہے)

---

[1] سورۃ قلم آیت ۳۵ [2] سورۃ ص آیت ۲۸۔

چنانچہ ان کی امانی کی نفی لَیْسَ کے ساتھ کی اور لٰکن کے ساتھ اس کا حکم ثابت کیا اور کلام میں مضمر ہے۔ معنی یوں ہُوا کہ لکن من یعمل سوء یجز بہ (لیکن جو بُرا کام کرے گا اس کی جزا اسے ملے گی)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت یہ فرمائی:

"مومن کو دنیا میں اس کے گناہوں کی جزاء، مصائب، بھوک اور برہنگی کی صورت میں ملتی ہے اور منافق کے گناہ اس پر باقی رکھے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ قیامت کے روز اسے مکمل سزا ملتی ہے۔ گویا وہ ایک گدھا ہے، جسے آخرت میں (گناہوں) پر جزا ملتی ہے۔"

تمناؤں سے بچو

حضرت حسنؒ فرماتے ہیں:

"اللہ کے بندو! ان خواہشات سے بچو، اس لیے کہ یہ ہلاکت کی وادیاں ہیں جن میں اتر رہے ہیں۔ اللہ کی قسم! بندہ نے اپنی آرزوؤں کے بل پر دنیا اور آخرت کی کوئی بھلائی حاصل نہیں کی۔"

بعض علماء کا فرمان ہے:

"جس قدر عقل کم ہوتی جاتی ہے اسی قدر تمنائیں بڑھتی جاتی ہیں۔"

سلفُ صالحین میں سے ایک بزرگ نے اپنے ایک دنیا دار بھائی کو نصیحت کا خط لکھا، فرمایا:

"دنیا کے کام میں جو اس قدر محنت کر رہا ہے اور اس کا لالچ تجھ پر سوار ہے۔ مجھے بتاؤ جس قدر تمہارا ارادہ تھا وُہ مل گیا۔ کیا تم نے اپنی تمنا پوری کر لی!"

اس نے کہا: "خدا کی قسم! ایسا تو نہیں ہُوا۔"

انہوں نے فرمایا:

"اب دیکھ لے جس کا تو اس قدر حریص ہے وُہ تو اپنی تمنا کے مطابق حاصل نہیں کر سکا اور آخرت میں کچھ کیونکر حاصل کر سکے گا۔ جبکہ تو نے اس سے مُنہ پھیر لیا اور رہنے سے ہٹا دیا ہے۔ میں سمجھتا ہُوں تو صرف ٹھنڈی لوہے پر ضربیں لگا رہا ہے۔"

بعض علماءؒ کا فرمان ہے:

"جو یہ گمان کرے کہ میں عمل کے بغیر جنت میں داخل ہو جاؤں گا۔ وُہ (خالی) تمنا کرنے والا ہے۔ اور جس نے کہا کہ میں عمل کے ذریعہ داخل ہو جاؤں گا۔ وُہ مشقت میں پڑ رہا ہے۔" (اس لیے کہ جنت میں داخلہ اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم سے ہوگا)

ایک بزرگؒ فرماتے ہیں:

"تمنائیں عقل کو کم کر دیتی ہیں۔"

حدیث میں آتا ہے:

"ایمان، سنگار کے ذریعہ نہیں ہوتا اور نہ ہی تمناؤں کے ذریعہ ہوتا ہے۔ بلکہ (ایمان یہ ہے) کہ دل میں اس کا وقار ہو اور عمل اس کی تصدیق کرے۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ [1] (احسان کی جزاء احسان ہی ہے)

اور اس کے برعکس صورت میں فرمایا:

مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰى اِلَّا مِثْلَهَا [2] (جو برا کام کرے اسے اس کی طرح کی جزا ملے گی)

اور اس کے مفہوم میں فرمایا:

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ۔ (کیا یہ سمجھتے ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے اور ابھی تم پر اس طرح کے (ابتلا) نہیں آئے جو کہ تم سے پہلے والوں پر آئے)

ایک جگہ فرمایا:

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ [3] (کیا خیال رکھتے ہیں جنھوں نے کمائی ہیں برائیاں کہ ہم کر دیں گے ان کو برابر ان کے کہ جو یقین لائے اور کیے بھلے کام)

پھر فرمایا:

سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ۔ (بُرا ہے جو وہ حکم کرتے ہیں)

چنانچہ ان کے گمان کو غلط اور ان کے فیصلہ کو باطل کر دیا۔ پھر صاف طور پر فرمایا:

سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَ مَمَاتُهُمْ۔ یعنی جیسے وہ زندگی میں نیک اعمال کرنے والے تھے اور احسان کرنے والے تھے۔ موت میں بھی ان کے لیے بھلائی ہو گی اور (دوسرے لوگ)، جیسے زندگی میں فسادی اور بُرے کام کرنے والے تھے ان کی موت میں پریشان کن باتیں اور سزا ہو گی۔ بعض بزرگوں کا فرمان ہے کہ یہ آیت عابدین کو رُلانے والی ہے۔ اس لیے کہ یہ متشابہ نہیں بلکہ محکم آیت ہے۔ اسی طرح ہم نے

---

[1] سورۃ رحمٰن آیت ۶۰ [2] سورۃ مومن آیت ۴۰ [3] سورۃ جاثیہ آیت ۲۱

جو تمام دلائل ذکر کیے وہ سب محکم ہیں جو کہ ام الکتاب ہوتی ہیں اور نہ ہی منسوخ ہیں اور نہ ہی متشابہ ہیں اور یہ آیت عزائم قرآن میں سے ہے۔ یہ پروردگار کی طرف سے احسن ترین آیت نازل ہوئی، جس کے اتباع کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا اور ہدایت والوں اور اہل خرد کو سننے کا حکم دیا۔ چنانچہ فرمایا:

اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَہٗ۔ [1] (جو فرمان سنتے ہیں تو خوب طرح اتباع کرتے ہیں)

ایک قول کے مطابق اس کے عزائم و وعید کو سنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ بَدَا لَھُمْ مِّنَ اللّٰہِ مَا لَمْ یَکُوْنُوْا یَحْتَسِبُوْنَ [2] (اور اللہ کی طرف سے ان کے لیے وہ ظاہر ہوا جس کا وہ گمان نہ رکھتے تھے)

ایک قول کے مطابق مراد ہے کہ دھوکہ کے باعث ناکام امید اور جھوٹا گمان۔ ایک قول کے مطابق یہ مراد ہے کہ انہوں نے اعمال کیے اور یہ گمان کر لیا کہ یہ اچھے اعمال ہیں مگر محاسبہ کے وقت انہوں نے بُرے اعمال پائے صحیح عمل وہی ہے جو کہ حساب کے بعد صحیح ہو۔ اور حق وہ عمل ہے کہ جو ترازو میں وزنی ہو جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَالْوَزْنُ یَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ۔ (اور تول اس دن ٹھیک ہے)

ایک قول کے مطابق اس سے مراد علم و عمل ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ لَقَدْ جِئْنٰھُمْ بِکِتٰبٍ فَصَّلْنٰہُ عَلٰی عِلْمٍ۔ (اور البتہ ہم ان کے پاس کتاب لائے اور ہم نے علم پر اس کی وضاحت کی)

پھر فرمایا:

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَیْھِمْ بِعِلْمٍ۔ (پس البتہ ہم ان پر علم کے ساتھ واقعہ بیان کرتے ہیں)

پھر فرمایا:

وَبَدَا لَھُمْ سَیِّاٰتُ مَا کَسَبُوْا وَحَاقَ بِھِمْ مَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَھْزِءُوْنَ۔ (اور ان کے سامنے وہ برائیاں ظاہر ہو گئیں جو انہوں نے کمائیں اور جس کا وہ استہزا کرتے تھے اس نے انہیں گھیر لیا)

ایک قول کے مطابق یہ مراد ہے کہ وہ گناہ میں پہل کرنے اور توبہ میں تاخیر کرتے اور مغفرت کی امیدیں

---

[1] سورۃ زمر آیت ۱۸ [2] سورۃ زمر آیت ۴۷

باندھتے۔ اس آیت سے خائفین وعارفین کا خوف وحزن بڑھ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے کافروں کے لیے آگ کی خبر دی۔ چنانچہ فرمایا،

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ اُعِدَّتْ لِلْکَافِرِیْنَ۔ (اور اس آگ سے بچو جو کہ کافروں کے لیے تیار کی گئی)

ایک جگہ فرمایا،

لَهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ يَا عِبَادِ فَاتَّقُوْنِ۔ (ان کے لیے اُوپر آگ کے سائے ہیں اور ان کے نیچے سے سائے ہیں۔ یہ وہ عذاب ہے کہ جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔ اے میرے بندو! تم مجھ سے ڈرو)

مشائخ فرماتے ہیں کہ،

"معرفت کے بعد بندہ اپنے آقا کی پہلی نافرمانی سے ہی آگ کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد وُہ مشیتِ الٰہی میں ہوتا ہے اور ہر بندہ میں ایک مکروہ خصلت ہوتی ہے جس سے خطرہ رہتا ہے۔"

عبدالواحدؒ بن زید فرمایا کرتے تھے،

"جس نے یہ گمان کیا وہ دوزخ میں نہیں جائے گا۔ اس کا ڈرنا ہرگز صحیح نہیں ہے اور اس کا خوف بھی سچا نہیں ہے کہ جو یہ گمان کرے کہ وُہ آگ میں جائے گا مگر پھر گمان رکھے کہ وُہ نکل آئے گا۔" یعنی حقیقی خوف آگ میں داخل ہونے اور دائمی طور پر وہیں رہ جانے کا خوف ہے۔

حضرت حسنؓ سے بھی اسی طرح منقول ہے۔ "اُن کے سامنے ایک آدمی کا ذکر کیا گیا جو ایک ہزار سال تک آگ میں رہ کر وہاں سے نکل آئے گا۔" سُن کر فرمایا،

"کاش! میں ایسا آدمی ہوتا۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"جو یہ کہے کہ میں جنت میں ہوں، وہ دوزخ میں ہے اور جو یہ کہے کہ میں عالم ہوں، وُہ جاہل ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے،

"جو آدمی اللہ تعالیٰ کے ہاں اپنا درجہ دیکھنا چاہے وُہ اپنے دل میں اللہ کا درجہ دیکھ لے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو وہی درجہ دیتا ہے جو وہ اپنے اللہ کو اپنے جی میں دیتا ہے۔"

مراقبہ کا دوسرا مقام

پھر بندہ یقینی طور پر یہ جانتا ہے کہ ہر نیک عمل کے عوض جنت میں ایک نعمت اور برزخ میں آرام ملے گا۔ اور ہر عملِ صالح اور معرفتِ خالصہ کے لیے جنت میں ایک مقام ہے اور یہاں پر عطیات کی خاطر بھی کچھ

حصہ یہاں دیا گیا اور ہر بُرے عمل اور جہالتِ قبیحہ کے بدلے میں آخرت میں ایک عذاب اور برزخ میں ایک اذیت اور آگ میں ایک مقام ہے اور یہاں کے اعمال کے باعث بھی کچھ حصہ یہاں دیا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس خیر و شر کو مخفی کر دیا اور ان دونوں حکموں کے اعمال کو ظاہر کر دیا اور دارین کے مطابق دونوں کے جُدا جُدا راستے واضح کر دیے۔ پھر دونوں معنوں سے معاملات کو مقدم کیا اور ثواب کو موخر کر دیا۔ اس لیے کہ انعام اس سے حکم ہے اور بدلے کو اعمال کرنے کی پابندی ہے اور یہ اس سے ایک ابتلاء و امتحان ہے تاکہ ہر نفس کو اس کی محنت کا پھل ملے۔ یہ اس کی رحمت و احسان ہے، اس کی قدرت و حجّت ہے۔ اس سے پوچھ نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہ وہ بادشاہ غالب عزیز و جبار ہے اور بندوں سے پرسش ہوتی ہے اس لیے کہ وہ مغلوب و مجبور بندے ہیں۔ وُہ بے مثال ہے۔ استدلال سے بالاتر ہے۔ کوئی اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ تقدیر و تحدید گزر چکی۔ اب اس کے لیے کامل حجت ہے۔ ہر چیز میں اس کی قدرت کارگر و نافذ ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ۔ (اس کی مثل کوئی چیز نہیں)

یعنی ان سب میں از مشیت و افعال، شرک سے ممانعت اور امثال دینے سے ممانعت میں اللہ تعالیٰ کی توحید پختہ اور محکم ہے۔ اس پر تعجب ہے کہ جو احکام میں مخلوق اور اس کے انعامات کا انکار اور اس کی سلطانیت میں شرک قرار دیا۔ چنانچہ مشرکین اور ان کے گمراہ تابعداروں کے حالات اور احکام میں بندوں اور اس کے درمیان برابری کرنے کی گمراہی کو اس طرح واضح فرما دیا کہ

قَالُوْا وَهُمْ فِيْهَا يَخْتَصِمُوْنَ ۝ تَاللّٰهِ اِنْ كُنَّا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ اِذْ نُسَوِّيْكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَمَا اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ۝[1]

(کہیں گے اور وُہ اس میں جھگڑتے ہوں گے۔ اللہ کی قسم بے شک ہم واضح گمراہی میں تھے جب کہ ہم تمہیں رب العلمین سے برابری دیتے تھے اور ہم کو صرف مجرموں نے ہی گمراہ کیا)

ایک قول کے مطابق یہ آیت قدریہ فرقہ کے متعلق نازل ہُوئی۔ اس لیے کہ انہوں نے مخلوق کی طرف قوت کو منسوب کیا۔ چنانچہ انہوں نے اللہ اور مخلوق کے درمیان مساوات کر ڈالی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ۔ (اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا اور جو تم عمل کرتے ہو)

چنانچہ اعمال کی تخلیق کی نسبت اپنی طرف کی کہ جیسے اس نے تمہیں پیدا کیا ایسے ہی اعمال کی تخلیق کی۔ چنانچہ یہی مجرم ہیں اور جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہُوئی۔ یہ قدریہ فرقہ ہے اور ان کے انکار کے باعث

---

[1] سورۃ الشعراء آیت ۔ ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹

ان کا وصف یہ بیان ہوا کہ :

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِىْ ضَلٰلٍ وَّ سُعُرٍ ۝ يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِى النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ؕ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ۝ اِنَّا كُلَّ شَىْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ [1]

(جو لوگ گناہ گار ہیں غلطی میں ہیں اور سودے ہیں جس دن گھسیٹے جائیں گے آگ میں اوندھے منہ، چکھو مزہ آگ کا، ہم نے ہر چیز بنائی پہلے ٹھہرا کر)

چنانچہ یہی مجرم ہیں انہوں نے اپنے پیروکاروں کو گمراہ کیا اور یہی سرکش ہیں۔ جو اپنے پیروکاروں کے ہمراہ دوزخ میں اوندھے منہ گرے۔

پہلی پانچ محکم آیات میں یہ مفہومات کامل طور پر آ چکے ہیں، جن کا ہم نے ابتداء میں ذکر کیا ہے، اور ہم نے طوالت کے خوف سے اس کی مزید وضاحت و تشریح نہیں کی۔ اس لیے کہ ہمارا مقصود استدلال میں حجت بازی نہیں تھا۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِى الرِّزْقِ ۚ [2]

(اور اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر روزی میں فضیلت بخشی)

یعنی آقاؤں کو غلاموں پر فضیلت بخشی۔ اب

فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا۔

(پس نہیں وہ جن کو فضیلت دی گئی ہو)

یعنی آقا،

بِرَآدِّىْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ ؕ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ [3]

(پھیر دینے والے اپنے رزق کو اوپر اس کے جو مالک ہوئے تھے داہنے ہاتھ ان کے۔ پس وہ بیچ اس کے برابر ہوں، کیا پس اللہ کی نعمت کے ساتھ انکار کرتے ہیں)

اور دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ ؕ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَآءَ فِىْ مَا رَزَقْنٰكُمْ فَاَنْتُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ [4]

(بتائی تم کو ایک کہاوت تمہارے اندر سے، تمہارے ہاتھ کے جو مال ہیں ان میں ہیں کوئی ساجھی تمہارے ہماری دی روزی میں کہ تم سب اس میں برابر ہو)

---

[1] سورۃ القمر ۴۷، ۴۸، ۴۹
[2] سورۃ النحل آیت ۷۱
[3] النحل آیت ۷۱
[4] سورۃ الروم آیت ۲۸

اسی طرح میں بھی اپنے بندوں سے لاشریک ہوں۔ اس لیے کہ جب میں نے ہی اپنے اور بندوں کے درمیان برابری نہیں کی۔ تو یہ کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔ اس لیے میرے حکم میں میرے بندوں کو شریک نہ بناؤ۔

تقدیر پر ایمان لاؤ

تیسرے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَيْنِ اَحَدُهُمَآ اَبْكَمُ لَا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ۔ (اللہ نے دو آدمیوں کی مثال دی۔ ان میں سے ایک گونگا ہے۔ کسی چیز پہ قدرت نہیں رکھتا)

یعنی حکمت و علم سے خالی ہے۔ پھر فرمایا:

هَلْ يَسْتَوِيْ هُوَ وَمَنْ يَّاْمُرُ بِالْعَدْلِ۔ (کیا وہ اور جو عدل کا حکم دیتا ہے برابر ہیں)

چنانچہ دو بندے بنائے۔ ایک بیوقوف، جاہل اور حکمت سے گونگا۔ کسی علم کی بات پر قدرت نہیں رکھتا۔ اسے استقامت بھی میسر نہیں۔ پھر اس کے وصف کے باعث اس کی مذمت کی اور ناراضگی ظاہر فرمائی، اور دُوسرے کو عدل کا حکم دینے والا، سیدھی راہ پر چلنے والا اور درست بتایا، فرمایا:

هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ (یہ راہ ہے مجھ تک سیدھی)

اب اس کے بغیر کوئی اس کی راہ پر چل سکتا ہے اور کیا کوئی بندہ اس کی مدد کے بغیر راہ یاب ہو سکتا ہے؟

پھر اس بندے کی مدح فرمائی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے سمجھایا کہ عقل کے لیے اس میں تشبیہ اور مثال ہے کہ ایک بندے کی مدح فرمائی۔ جس کو عطا ہوا اور وہ سیدھی راہ ہے اور دُوسرے کی مذمت فرمائی۔ جس نے ظلم کیا اور بخل و عجز کی راہ اختیار کی۔ اس طرح پانچویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے مثال دے کر ممانعت کو پختہ کیا اور ہمیں اس کے لیے مثالیں دینے کی ممانعت کی۔

فرمایا:

فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (پس اللہ کے لیے مثالیں نہ دو۔ بے شک اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے)

چنانچہ اپنے علم اور ہماری جہالت سے اسے مؤکد کر دیا۔ پھر اس فرمان سے اس کی تائید کی۔

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ۔ (وہ جو کرتا ہے اس سے پرسش نہیں ہو گی اور ان (مخلوق) سے پرسش ہو گی)

چنانچہ علمائے راسخین خوب سمجھ گئے کہ تمام احکام دینے کا اختیار صرف حاکم تعالیٰ کو ہے اور عذاب سے بچ گئے اور مومن تمام اقدار پر ایمان لے آئے کہ یہ حاکم عادل حکیم کی طرف سے عدل و حکمت کے احکام ہیں۔ اس طرح وہ سزا سے بچ گئے۔ اس لیے وہ متشابہ پر بھی ایمان لے آئے اور اللہ تعالیٰ نے انہیں اس پر

اپنے فضل سے بہت ثواب عطا فرمایا اور سرکش عناصر شبہات میں پڑ کر اور تاویلات کی تلاش کرتے ہوئے فضول کلام میں ڈوب کر برباد ہوئے اور گمراہی میں پڑ کر آخرت میں تباہی سے ہمکنار ہوئے۔

حضرت ضحاکؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے مذکورہ کلام کی تائید روایت کی۔ اس آیت لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُومٌ۔ (اس کے سات دروازے ہیں۔ ہر دروازے کے لیے ایک تقسیم شدہ حصہ ہے) سے پہلے حضرت ابن عباسؓ کا فرمان ہے کہ:

نیچے تہ در تہ سات طبقات ہیں۔ ان کے اعمال کی مقدار پر سات درجات ہیں اور جس طرح اہل جنت فضائل کے لحاظ سے مختلف درجات میں منقسم ہیں۔ اسی طرح مجرم لوگ جرم کی مقدار کے لحاظ سے مختلف درجات میں منقسم ہیں۔ لکل باب منهم جزء مقسوم۔ یعنی ہر طبقہ کے رہنے والوں کا ایک معلوم مقررہ حصہ ہے۔

ایک عالمؒ فرماتے ہیں:

"اللہ کی قسم! جنت میں نہ کوئی محل ہے نہ نہر ہے اور نہ کوئی ایسی نعمت ہے کہ جس پر اہل (محل جنتی) کا نام نہ لکھا ہو۔ مزید برآں اس پر وہ عمل بھی لکھا ہوا ہے جس کی جزا یہ ہے۔ اس طرح جہنم کے ہر طوق، بیڑی، وادی اور عذاب پر اس کو ملنے والے جہنمی کا نام اور اس کا کام لکھا دیا گیا ہے جس کے بدلے میں یہ سزا ملے گی۔"

اور فرمایا:

"میں نے انہیں اطاعت سے پہلے ہی جنت میں داخل کر دیا اور انہیں نافرمانی سے پہلے دوزخ میں داخل کر دیا۔"

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"مخلوق اس سے کمزور ہے کہ وہ اس بات میں اللہ عزوجل کی نافرمانی کرے کہ وہ نہ چاہے اور اللہ اس بات سے بلند و غالب ہے کہ اسے کوئی راضی کر سکے سوائے اس کے کہ جس کو وہ چاہے۔ لیکن وہ عدم میں ایک قوم پر غضبناک ہوا۔ جب انہیں دنیا میں ظاہر کیا تو مغضوب لوگوں کے اعمال میں انہیں لگا دیا تاکہ انہیں دارِ غضب میں ڈالے۔ اور قدم میں ایک قوم پر راضی ہوا اور انہیں اہل رضا کے اعمال میں لگا دیا تاکہ انہیں دارِ رضا میں داخل کرے۔

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

عدم میں اللہ نے مخلوق کو ظاہر کیا اور غلبہ رکھتے ہوئے انہیں خاص طور پر موجود کیا۔ پھر ان کے اعمال

ظاہر کیے اور امتحان کے طور پر انہیں اعمال کا اختیار دیا۔ چنانچہ ہر بندہ نے ٹھیک وہی عمل اختیار کیا۔ پھر ان میں اعمال بیٹ دیے گئے۔ اور انہیں پردۂ غیب میں مستور کر دیا گیا۔ جب دنیا میں انہیں ظاہر کیا گیا تو عقلوں کا پردہ ڈال دیا اور ہر بندہ کو اپنے نفس کے اختیار پر چلا دیا۔ اس طرح جب کل آئندہ، ان سے آج کا پردہ اٹھے گا تو حجت قایم ہو چکی ہو گی۔

صوفیاء کی جماعت میں ایک بزرگؒ سے مروی ہے ؛

" قدر کے بارے میں میرے دل میں کچھ شبہ باقی تھا میں اکثر علماؒ سے پوچھتا رہا مگر یہ مسئلہ حل نہ ہوا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ابدال میں سے ایک بزرگ سے ملاقات کرائی۔ میں نے ان سے دریافت کیا تو فرمایا ؛

" تیرا ناس ہو، تجھے دلیل سے کیا کام ؟ ہمیں سرِ ملکوت کا مکاشفہ ہوتا ہے تو طاعات کو آسمان سے متشکل ہو کر اترتا دیکھتے ہیں کہ ایک قوم کے اعضاء پر اترتی ہیں، چنانچہ ان کے اعضاء نیکیاں کرنے لگتے ہیں، اور معاصی کو آسمان سے صورت گر ہو کر اترتا دیکھتے ہیں اور وہ ایک قوم کے اعضا پر اترتی ہیں تو وہ ان کے ساتھ متحرک ہو جاتے ہیں "

راوی فرماتے ہیں ؛ کہ

" میرے دل سے قدر کا شبہ کھل گیا اور مشاہدہ سے مجھے علمِ قدر حاصل ہو گیا "

ایک بار میں اپنے بھائی کے ساتھ استطاعت مع الفعل کے مسئلہ پر بحث کر رہا تھا کہ یہ نہ اس سے پہلے ہوتی ہے اور نہ بعد میں ہوتی ہے تو میں نے متکلمین کے مذہب کے استدلال دیے۔ اس وقت مجھے مشاہدہ علم الیقین حاصل نہ تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک کہہ رہا ہے ؛

قدر، قدرت سے ہے، اور قدرت قادر کی صفت ہے۔ چنانچہ حرکت پر قدر واقع ہوتی ہے اور ظاہر نہیں ہوتی۔ اب جو ظاہر نہیں ہوتی اس میں تم کیا بحث کرتے ہو ؟

چنانچہ میں نے طے کر لیا کہ آئندہ اس مسئلہ پر کسی سے بحث و مناظرہ نہیں کروں گا۔

ایک عابدؒ سے منقول ہے۔ فرمایا کہ ؛

" میں نے سحری کے وقت دو رکعت نفل ادا کیے، پھر مجھے اونگھ آئی اور میں نے خواب میں ایک عالیشان اور سفید محل دیکھا۔ گویا ستاروں سے بنا ہے۔ مجھے بہت پسند آیا۔ میں نے پوچھا ؛

" یہ کس کا محل ہے ! "

جواب ملا ؛ " تیرا محل ہے۔ اور ان دو رکعتوں کے عوض ملا ہے "

میں بہت خوش ہوا اور اس کے ارد گرد گھومنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ ایک حصہ کنگرا گرا ہوا ہے۔

اس سے عیب دار ہو گیا۔ مجھے اس کا غم لگا اور میں نے کہا:

"اگر یہ کنگرا اس جگہ بلندی پر ہو تو اس محل کی خوب صورتی مکمل ہو جائے۔ اس لیے کہ اس رخنہ سے یہ محل عیب دار ہو گیا ہے۔" ایک لڑکا وہاں تھا اس نے کہا:

"یہ کنگرا محل میں اپنی جگہ پر تھا مگر تو نے نماز کے دوران توجہ ہٹالی۔ اس لیے یہ گر گیا۔"

ایک زاہدؒ فرماتے ہیں،

"انہیں جنت کے ایک حصہ کا کشف حاصل ہوا تو انہوں نے کشادہ آنکھوں والی حوریں دیکھیں۔ وہ کہنے لگیں کہ ہم تیری بیویاں ہیں۔ جب میں وہاں سے نکلا تو حوریں مجھ سے چمٹ گئیں اور کہنے لگیں۔ ہم تجھے اللہ کی قسم دیتی ہیں۔ اچھے اچھے اعمال کرنا۔ اس لیے کہ تو جس قدر اچھے اعمال کرتا ہے ہمارے حسن اور نعمتوں میں اسی قدر اضافہ ہو جاتا ہے۔

حضرت رابعہ عدویہ رحمہا اللہ تعالیٰ سے منقول ہے۔ فرماتی ہیں:

ایک شب کو میں نے سحری کے وقت کچھ تسبیحات پڑھیں۔ پھر سو گئی۔ میں نے خواب میں سرسبز اور پھلوں سے بھرپور درخت دیکھے، جن پر طرح طرح کے پھل تھے۔ موٹے موٹے پھل تھے۔ سفید، سرخ اور زرد ایسے ایسے پھل تھے جو کہ چاند اور سورج کی طرح درختوں کی سبزی میں چمک رہے تھے۔ فرماتی ہیں: مجھے بہت پسند آئے۔ میں نے کہا: "یہ کس کے ہیں؟"

ایک کہنے والے نے کہا: "یہ تیرے لیے ہیں۔ اور یہ ان تسبیحات کی جزا ہے۔"

فرماتی ہیں کہ میں ان کے گرد گھومنے لگی۔ دیکھا تو سنہری رنگ کے پھل زمین پر بکھرے پڑے ہیں۔ میں نے کہا:

"اگر یہ پھل بھی دوسرے پھلوں کے ساتھ درخت پر ہوتے تو کیا ہی اچھا ہوتا۔"

ایک آدمی نے جواب دیا:

"یہ پھل درخت پر ہی تھے مگر جب تو نے تسبیح پڑھتے ہوئے یہ سوچا کہ آٹے میں خمیر ہو گیا ہے یا نہیں؟ تو یہ پھل گر پڑے۔"

یہ واقعہ اہل خرد کے لیے باعث عبرت، متقی اور ذاکرین کے لیے باعث نصیحت ہے۔

مراقبہ کا تیسرا مقام

قیامت کی ہولناکیاں

منقول ہے کہ حضرت کعب احبارؒ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے کہا: "اگر تم ستر انبیاء کا عمل لے کر بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے جاؤ تو بھی خطرہ ہو گا کہ اس دن کے ڈر سے نہ بچ سکو۔"

سلفؒ سے مروی ہے :

" اگر بندہ دنیا کے پہلے دن سے لے کر قیامت قایم ہونے تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت میں منہ کے بل چلتا رہے تو بھی قیامت کے دن سخت خوف محسوس کرے گا۔ جبکہ وہ اس دن کے زلزلے اور ہولناکیاں دیکھے گا۔"

حدیث میں ہے :

ملک الموت کا (روح) قبض کرنا، تلوار کی ایک ہزار ضرب سے زیادہ سخت ہے۔ اور موت کا بال بھر درد اگر تمام مخلوق پر بانٹ دیا جائے تو سب مر جائیں بے شک مخلوق اور موت کے درمیان اور جنت میں داخلے کے درمیان ایک لاکھ ہول ہیں۔ ہر ہول موت کے درد سے ایک لاکھ گنا سخت ہے اور ہر ہول سے بندہ اللہ کی رحمت سے ہی نجات حاصل کرے گا۔ چنانچہ ان ہولناکیوں سے بچنے کے لیے بندہ ایک لاکھ رحمتوں کا محتاج ہے۔ رحمتوں کی یہ تعداد دنیا میں حاصل کردہ ایک لاکھ نیکیوں پر منقسم ہے اور آخرت میں ظہورِ رحمت کا یہ مقام ہوگا۔ یہ حکیم تعالیٰ کی ایک حکمت اور رحیم و کریم پروردگار کی تقسیم و تدبیر ہے۔ اس لیے کہ نیکیاں ہی جزاء کا ذریعہ ہیں اور تمام نیکیاں ایک ہی رحمت سے ہیں، جس کے ذریعہ نجات ملے گی۔ پھر اعمال کے باعث ثواب و اجر کا مقام ہے۔ وہاں اجر عطا ہوگا اور اس کے لطف و عنایت سے یہ پہلی عطا ہوگی اور آخرت میں اس کے فضل و کرم سے جزاء اور کامل نعمت میسر آئے گی۔

ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ۔ (یہ غالب جاننے والے کی تقدیر ہے)

جیسے کہ فرمایا :

هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۔ (احسان کی جزاء احسان ہی ہے)

حدیث میں آتا ہے :

" جس پر توحید کا انعام ہوا اس کی جزاء تو جنت ہی ہے "۔

بعض علماء کا فرمان ہے :

لا الٰہ الا اللہ کہنے کی جزاء دیدارِ خدا تعالیٰ ہے اور جنت دراصل اعمال کی جزاء ہے۔ دیکھیے اگر آج توحید سے محرومی ہو تو جنت حرام ہوگی اور اگر آج اسلام نہ پایا گیا تو کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی مغفرت حاصل نہ ہوگی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ (بے شک جو اللہ کے ساتھ شرک کرے تو تحقیق اللہ نے

عَلَيْهِ الْجَنَّةَ ۔ (اس پر جنت حرام کردی)

اور فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۔ (بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور انھوں نے اللہ کے راہ سے روکا۔ پھر وہ مرگئے اور کافر ہی تھے تو اللہ ہرگز انہیں نہیں بخشے گا)

اب ان کی مغفرت کے لیے کوئی راستہ اور کوئی حیلہ نہیں ہوگا۔ نیز فرمایا:

هُوَ اَهْلُ التَّقْوٰى وَ اَهْلُ الْمَغْفِرَةِ ۔ (وہ ہے لایق ڈرنے کے اور لایق بخشنے کے)

یعنی وہ اس بات کا اہل ہے کہ تقویٰ عطا کرے اور جسے تقویٰ عطا ہوا۔ وہ اس قابل ہے کہ اسے بخش دیا جائے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَ كَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَ اَهْلَهَا ۔ (اور انہیں تقوی کا کلمہ لازم کیا اور وہ اس کے زیادہ مستحق اور اس کے اہل تھے)

فرمایا:

وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۔ (اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے)

اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ۔ (بے شک اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں کے قریب ہے)

تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ ۔ (جو بھلائی کرے اس پر مکمل طور پر)

اسی طرح فرمایا:

سنزید فیھا سے لے کر ما علی المحسنین من سبیل تک۔

نیز فرمایا:

وَ مَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ۔ (جو نیکی کمائے ہم اس کی نیکی میں اضافہ کردیتے ہیں)

چنانچہ اعمال حسنہ کرنے والے محسنین میں سے ہیں اور بُرے اعمال کرنے والے گناہگاروں میں سے ہیں اس لیے کہ حسنۃ دراصل حسن سے مشتق ہے اور اس کی جزا حسنی (نیکی) یعنی جنت ہے اور سیئۃ دراصل سؤ سے مشتق ہے اور اس کی جزا سوی یعنی نار (دوزخ) ہے اور مخلوقات پیدا ہونے سے ہی ان کی تخلیق ہو چکی اور بندے جنت یا دوزخ میں جا چکے۔

پاک و ناپاک

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ "احسان کیا ہے؟"

آپؑ نے فرمایا، کہ
"تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے"۔
یہ مراقبہ کی ابتدا ہے اس لیے کہ اس میں بغیر مشاہدہ کے رقیبؑ کو دیکھنا ہے۔ پھر تو مراقبہ (نگرانی) کرے گا۔
اللہ تعالیٰ نے بعض کو اعمال طیبہ سے سرفراز فرمایا اور بعض کو اعمال خبیثہ میں ڈال دیا اور اپنے علم کے ساتھ اس سے فارغ ہُوا۔ اور اپنے حکم سے اسے مقدر کیا اور اپنے لطف سے اسے مخفی رکھا۔
فرمایا:
اَلْخَبِيْثَاتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ ۔ (پلید، پلیدوں کے لیے ہیں)
یعنی ناپاک اقوال و افعال ناپاک لوگوں کے لیے ہیں اور فرمایا:
اَلطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ ۔ یعنی پاک اعمال و اقوال پاک لوگوں کے لیے ہیں۔ پھر اپنے اولیاء کے حُسنِ انجام اور اپنے اعدا کے بُرے انجام سے خبردار کیا۔ فرمایا:
اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ طَيِّبِيْنَ ۙ يَقُوْلُوْنَ سَلٰمٌ عَلَيْكُمُ ۙ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝[۵۱] (جن کی فرشتے جان لیتے ہیں اور وہ ستھرے ہیں کہتے ہیں، تم پر سلامتی ہو۔ جنت میں داخل ہو جاؤ ان کے باعث جو تم (اچھے) اعمال کرتے تھے)
کہا کرتے ہیں طابت حیاتھم فطابت وفاتھم (ان کی زندگی پاکیزہ ہُوئی چنانچہ ان کی وفات پاکیزہ ہُوئی) ان کے اعمال پاکیزہ اور ان کی موت پاکیزہ۔
اور ظالموں کے بارے میں فرمایا:
اَلَّذِيْنَ تَتَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ ؕ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا ؕ فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ۝[۵۲] (جن کو ہمارے فرشتے وفات دیں گے اور وہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے ہیں۔ انہیں کہیں گے تم کس میں تھے۔ کہیں گے ہم زمین میں کمزور تھے۔ وہ کہیں گے۔ کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے۔ سو ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور برا ہے انجام)
یعنی ان کی زندگی اور اعمال ظلم سے بھرپور رہیں اور اندھیری ہیں ان کی قبریں اور آخرت اندھیری ہو گئی اور جو اس کا مشاہدہ یقین کرے اس کا مراقبہ اور حسنِ معاملہ ہمیشہ رہے گا۔ اور صفاءِ یقین اور دوامِ مزید کے باعث

---

۵۱ سورۃ النحل آیت ۳۲ ۵۲ سورۃ النساء آیت ۹۷

اس کو مشاہدہ حاصل ہوا۔ چنانچہ ایسے لوگوں میں سے ہوگا جیسے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ۔ (اس طرح کے لیے کام کرنے والے کام کرتے ہیں)

وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ۔ (اور اس میں مقابلہ کرنے والے مقابلہ کیا کرتے ہیں)

اور ایک جگہ ایسے ہی لوگوں کا وصف بیان فرمایا:

يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَهُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ۔ (وہ بھلائیوں میں جلدی کرتے ہیں اور وہ ان میں سبقت کرتے ہیں)

یعنی موت کی طرف تیزی سے بڑھتے اور گزشتہ کی تلافی کرتے ہیں۔ غافلوں سے سبقت کر رہے ہیں اور بے کاروں سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ شاید کوئی حکمت سے جاہل اور اہل باطل آدمی یہ الزام دے کہ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایک چیز کے عوض میں ایک چیز عطا کرتا ہے۔ یاد رکھیں ہمارا یہ مطلب نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ لاشئی کے عوض دو چیزیں عطا فرماتا ہے۔ جو چیز عبادت و ایمان کا ظرف ہے اس کا پہلا عطا کنندہ بھی وہی ہے، پھر انعامات و جنت بھی وہی عطا کرتا ہے جو کہ اس کی حکمتِ اعلیٰ کے باعث، اس کی جاری شدہ تقدیر ہے جیسے کہ اس کے علم میں پہلے سے ہے۔ پھر معلوم میں اسے پیدا فرمایا، اس لیے کہ وہ حکیم و علیم ہے۔

مراقبۂ اہل یقین کا چوتھا مقام

پھر بندے کو یقین علم ہے کہ آخرت میں اس کے سال، مہینوں میں، مہینے دنوں میں اور دن ساعتوں میں بکھر کر سامنے آئیں گے اور اس کی ساعتیں انفاس بن کر نظر آئیں گی۔ پھر ہر ہر سانس کے بارے میں پرسش ہوگی۔ ہر فعل کا سامنا ہوگا۔ چاہے کس قدر حقیر اور چھوٹا ہی کیوں نہ ہو اور تین تین دفتر کھلیں گے۔ پہلا سوال یہ ہوگا کہ کیوں کیا؟ یہ احکام کے ذریعہ مقامِ ابتلا ہے۔ اگر یہاں عذر قبول ہوگیا اور افعال درست ہوئے تو دوسرا سوال ہوگا کہ کس طرح کیا؟ یعنی صحتِ علم کے ساتھ ہی کام ہوا یا جہالت سے کر دیا۔ اگر جواب درست ہوا تو تیسرا سوال ہوگا کہ کس کے لیے کیا؟ اس میں اخلاص کی پرسش ہوگی۔ اگر کیوں؟ کیسے؟ اور کس لیے؟ میں سے کسی ایک میں جواب غلط ہوا تو ہلاکت ہی ہلاکت ہے۔ اور اگر جوابات تسلیم کر لیے گئے اور معاملہ درست ہُوا تو پروردگار کریم کی نوازشات اس قدر ہوں گی کہ جن کا گمان بھی نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَيْنَا بِهَا۔ (اور اگر ایک رائی کے دانہ برابر بھی ہُوا تو ہم اسے لائیں گے)

یعنی ہم اسے حاضر کر دیں گے اور آتَیْنَا بِہَا مد کے ساتھ بھی قرأت ہے یعنی ہم اس کی جزا دیں گے۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا:

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝ (اور جو ذرہ بھر بھی نیکی کرے گا اسے دیکھے گا اور جو ذرہ بھر بھی برائی کرے گا اسے دیکھے گا)

کتاب اللہ کی یہ آیت محکم ترین آیت ہے اور یہ مجمل مبہم عام آیت ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب کوئی ایسا سوال کیا جاتا کہ جس کے بارے میں وحی نہ آئی ہوتی تو فرماتے کہ میرے پاس اس ایک جامع آیت کے علاوہ (اس کا جواب) کچھ نہیں۔ یعنی فمن یعمل مثقال ذرۃ۔ الآیۃ اور جب فرزدق (شاعر) کے دادا صعصعہ نے اسفلِ قرآن سے لے کر اس تک سنا تو کہا: میرے لیے کافی ہے میرے لیے کافی ہے۔ میں نے خیر و شر معلوم کر لیے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"آدمی فقیہ بن کر گیا"

اور ایک قول کے مطابق الذرۃ کا معنی یہ ہے:

"سوئی کے ناکوں کی طرح دھوپ میں اڑتے ہوئے ذرات"

حضرت ابن عباس سے مروی ہے، فرمایا:

"جب تو مٹی پہ ہاتھ رکھے پھر اٹھائے تو جو مٹی بھی تیرے ہاتھ کے ساتھ چپکے گی وہ ذرہ ہے۔"

ایک قول کے مطابق چار ذرات ایک رائی کے برابر ہوتے ہیں۔

کرتے رہو اور ڈرتے رہو

بعض علماءؒ کا فرمان ہے:

"جو کے ہزارویں حصے کو ذرہ کہا جاتا ہے"

چنانچہ بعض اعمال اس قدر کم وزن اور اس قدر مخفی ہیں۔ خبیر تعالیٰ نے ان کی بھی خبر دی اور رؤف کریم نے ان سے ڈرایا اور شروع میں ہم نے جو کہا تھا کہ:

"جو یہ سمجھے کہ میں عمل کے ذریعہ جنت میں داخل ہو جاؤں گا۔ وہ مشقت میں پڑا ہے اور جو سمجھے کہ بغیر عمل کے جنت میں داخل ہو جاؤں گا۔ وہ مشقت میں پڑا ہے اور جو سمجھے کہ بغیر عمل کے جنت میں داخل ہو جاؤں گا۔ وہ نری تمناؤں میں ڈوب رہا ہے"

اس معنی میں یہ بحث ہے۔ چنانچہ انسان کو چاہیے کہ عمل کرتا رہے مگر ان کی طرف دھیان نہ دے پھر اللہ عزوجل پر اس مسئلہ میں توکل کرے اور امید رکھے کہ وہ اپنے کرم سے قبول فرمائے گا اور اس کے عدل سے ڈرتا بھی رہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے صابر اور متوکل بندوں کی طرح مدح فرمائی اور ان کو

اجر عطا کیا، فرمایا:

نِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِیْنَ الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَ عَلٰی رَبِّہِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ۔ (خوب ہے اجر کام کرنے والوں کا جنھوں نے صبر کیا اور اپنے رب پروردگار توکل کرتے ہیں)

چنانچہ جنت میں انہیں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے مزید انعامات عطا ہوں گے۔ یعنی یہ انعامات دائمی اور جنت میں رہائش ابدی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(۱) مَنْ یَّقْتَرِفْ حَسَنَۃً نَّزِدْ لَہٗ فِیْھَا حُسْنًا۔ (جو نیکی کمائے ہم اس کے لیے نیکی میں اضافہ کردیں گے)

اور اس کے ساتھ فرمایا:

لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَ زِیَادَۃ۔ (ان کے لیے جو نیکی کریں نیکی ہے) سے لے کر فَاُولٰئِکَ لَھُمْ جَزَاءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوْا تک۔ اور زیادہ (انعام) ہے۔ اس طرح فرمایا:

وَ لِکُلٍّ دَرَجَاتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا۔ (اور ہر ایک کے لیے درجے ہیں جو انہوں نے عمل کیے)

اور فرمایا:

اُولٰئِکَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَھُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ۔ (وہ لوگ پائیں گے اپنا حق دوہرا اس پر کہ ٹھہرے رہے اور بھلائی دیتے ہیں برائی کے جواب میں)

یعنی تازہ نیکی سے پرانی برائی کو دور کرتے ہیں۔ اب جب دنیا میں انہوں نے دو عمل کیے:

۱۔ صبر کیا۔

۲۔ تازہ نیکی سے پرانی برائی کو دور کیا۔

تو آخرت میں بھی انہیں دو اجر ملے۔ یہ محذوف مختصر کلام ہے۔ محذوف یہ تھا کہ د بما یدرؤن یعنی جس کے ساتھ وہ ہٹاتے بھی تھے۔ جب بما حذف ہوا تو کلام میں اشکال آگیا چنانچہ واؤ، واؤ نسق کے مشابہ ہوئی اور آخر میں سَیِّئَۃ لائے۔

الغرض گزشتہ برائیوں کو دور کرنے کے بعد (برائی کے بعد) نیکیاں کرتے ہیں۔ چنانچہ بعد کی نیکیاں ان کی گزشتہ برائیوں کو مٹا دیتی ہیں اور ان کا عذاب اٹھانے کا باعث بنتی ہیں اور مصیبت پر صبر سے بڑھ کر کوئی صبر نہیں اور گناہوں کے بعد سب سے بڑھ کر نیکی یہ ہے کہ توبۃ النصوح کی توفیق مل جائے گویا انہوں نے دو عمل کیے:

۱۔ شہوت سے صبر کیا۔

۲۔ توبہ کر کے گزشتہ گناہوں کو دور کیا۔

اللہ تعالیٰ نے انہیں دو عملوں پر دو اجر عطا فرمائے۔ اس لیے کہ صبر اور توبہ کی توفیق بھی خدا ہی کی جانب سے ہوتی ہے جیسے کہ فرمایا:

وَ مَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ (اور تجھ سے صبر ہو سکے اللہ ہی کی مدد سے)

فرمایا:

تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ۔ (گناہ بخشوانے کو اللہ سے)

اور یہ یاد رہے کہ جو اللہ تعالیٰ سے متعلقہ امور ہیں۔ ان میں بندے کی طرف جانے یا اس سے مدد ملنے کی کوئی بات نہیں ہو سکتی ورنہ وہ اسم اول میں ہی مشرک ہو گا۔ سب سے بہتر نیکی یہ ہے کہ خطرات قلوب کے وقت مراقبۂ رقیب حاصل ہو۔ اور افضل ترین نیکی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاطر محاسبۂ نفس کرتا رہے۔ اور حبیب تعالیٰ کی اطاعت پر آمادہ رہے۔ اسی طرح دوزخی لوگوں کی مزید ذلت دراصل سرکشی و نافرمانی میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہونے کے باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

ظلم و کفر کی سزا

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ۔ (جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کی راہ سے روکا ہم نے ان کے عذاب میں عذاب کا اضافہ کر دیا۔)

یعنی ہم ان کے عذاب میں ان کافروں کے عذاب سے اضافہ کر دیں گے کہ جنہوں نے اللہ کی راہ سے نہیں روکا۔ اس مفہوم کا یہ فرمان آتا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ ظَلَمُوْا لَمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَ لَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيْقًا۔ (بے شک جنہوں نے کفر کیا اور ظلم کیا۔ اللہ ان کی بخشش نہ کرے گا اور نہ ہی انہیں راہ دکھائے گا) الخ

چنانچہ ان کے کفر کے باعث ان کی مغفرت نہ ہو گی اور ان کے ظلم کے باعث ان کے لیے راہِ ہدایت روشن نہ ہو گی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"قیامت کے اندھیروں میں سے ایک (اندھیرا) ظلم ہے۔"

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَ لَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ۔ (بے شک جنہوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو فتنہ میں مبتلا کیا، پھر توبہ نہ کی تو ان کے لیے دوزخ کا عذاب ہے اور ان کے لیے جلانے والا عذاب ہے)

اب ایسے لوگوں پر دو عذاب ہوئے:

۱۔ توبہ نہ کرنے کی وجہ سے دوزخ کا عذاب ۔

۲۔ اور مومنوں کو فتنہ میں مبتلا کرنے کی وجہ سے جلانے والا عذاب ۔

ایسے ہی اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَ لَا اَوْلَادُهُمْ ط اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ تَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَ هُمْ كٰفِرُوْنَ [1]

(سو ان کے مال اور ان کی اولاد تجھے تعجب میں نہ ڈالیں بے شک اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ انہیں دنیا کی زندگی میں ان کے ذریعہ عذاب دے اور ان کی جانیں نکلیں ۔ اس حالت میں کہ وہ کافر ہوں ۔)

یعنی چاہتا ہے کہ دنیا میں انہیں ان کے باعث سزا دے اور کفر پر ان کی ہلاکت ہو، پھر انہیں آخرت میں سزا دے۔ یہ صریح نص ہے کہ اللہ تعالیٰ کافر سے کفر کا ارادہ کرتا ہے اس لیے کہ تزھق میں پہلے یُرِیْدُ پر عطف کے باعث نصب ہے اور اس میں واوٗ جمع کی ہے۔ ایک قول کے مطابق اس آیت میں تقدیم و تاخیر ہے۔ اب معنی یوں ہوگا:

اور دنیا میں ان کے اموال اور ان کی اولاد تجھے تعجب میں نہ ڈالیں۔ اس لیے کہ اس نے ارادہ کیا ہے کہ دوزخ ان پہ دو عذاب جمع کر دے:

۱۔ اموال اور اولاد میں ۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارادہ کہ ان کی جانیں کفر کی حالت میں نکلیں۔

اب جس کا مال اور اولاد نہ ہو گی اس پر دوزخ میں ایک عذاب ہوگا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بِہَا (ان کے سبب سے) فرمایا اور یہ وضاحت اس حدیث کے مطابق ہے کہ فرمایا:

"فقیر کافر دوزخ میں امیر کافروں سے پانچ سو سال بعد میں داخل ہوں گے"

اس لیے کہ دنیا میں وہ محتاج اور فقیر تھے جیسے کہ فقرا مومنین، جنت میں اغنیاء مومنین سے پانچ سو سال پہلے داخل ہوں گے اس لیے کہ وہ اغنیا تھے۔ (حساب دینے میں مصروف رہ گئے)

حدیث میں آتا ہے:

"مریض (مومن) تندرستوں سے چالیس سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ اور اللہ کی راہ میں آگے بڑھنے شہید ہونے والا، پیچھے ہٹتے ہوئے اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے سے چالیس برس

---

[1] سورۃ التوبہ آیت ۵۵ ۔

پہلے داخل ہوگا اور غلام آقاؤں سے چالیس برس پہلے داخل ہوں گے اور حضرت سلیمان بن داؤد اپنی سلطنت کے درجہ کے باعث دُوسرے انبیاءؑ سے چالیس سال بعد جنت میں داخل ہوں گے۔"

سب سے بڑی حسرت اور سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ انسان کو آخرت میں کچھ حصہ نہ ملے اور ابدی طور پر محروم ہو کر رہ جائے۔ اس لیے کہ دنیا میں اس نے اوقات کو برباد کیا اور آج دوسروں کو انعام ملے گا اور یہ محروم رہے گا اور دوسرا بندہ ان اوقات کو دنیا میں عبادت سے معمور کر کے آخرت میں احکام ابدی حاصل کرے گا۔ یہی تغابن ہے۔ اہل باطل اور غلط کار نقصان میں ہوں گے، کام کرنے والے اور بھلائیوں کی طرف بڑھنے والے فائدہ میں ہوں گے اور انہماک سے نیکی کرنے والے نفع میں رہیں گے، پھر دنیا میں اوقات برباد کرنے والا ابدی محرومی میں اور کام کرنے والا ابدی انعامات میں رہے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"ابن آدم جس جس ساعت میں اللہ تعالیٰ کا ذکر نہیں کرتا اس میں اس پر ایک حسرت ہوگی (کہ کیوں نہ ذکراللہ سے اسے معمور کر دیا) چاہے وہ جنت میں داخل ہو جائے۔"

دوسرے الفاظ اس سے بھی شدید تر ہیں:

"اس پر قیامت کے روز اس کے بارے میں مطالبہ ہوگا" اور مواخذہ ہوگا۔ چنانچہ جنت میں داخلہ اور انعامات حاصل کرنے کے بعد ضائع شدہ اوقات پر حسرت ہوگی تو مزید انعامات سے محرومی پر ہے۔ اب جو بندہ ابدی محرومی میں ہوگا اس کے نقصان کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ دائمی خسارے میں رہے گا۔ اس قدر نقصان کے باوجود آج بندہ اس کی پروا نہیں کرتا اور کچھ عقل نہیں کرتا بلکہ بیداری کی حالت میں کوئی دم اور کوئی لمحہ بھی جب ذکراللہ سے خالی ہوگا تو حسرت ہوگی۔ البتہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نص میں ساعت کا لفظ آیا اور اس سے کم مقدار کا ذکر نہیں کیا۔ اس لیے کہ عربوں کے ہاں ساعت کا لفظ اقل ترین وقت پر استعمال ہوتا ہے۔ اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی موافقت ہو جاتی ہے۔ فرمایا:

فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ (پس جب ان کی اجل آئی تو ایک ساعت تاخیر اور تقدیم نہ ہوگی)

اور یہ ظاہر ہے کہ موت ایک لفظ بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتی۔ اب اس کے لیے ساعت کا لفظ استعمال کیا تاکہ عرفِ عرب سے یہ جملہ خارج نہ ہو جائے اور اس بات کی دلیل بھی ہوگئی کہ ساعت کا لفظ اقل زمان یعنی لحظہ تک پر بھی بولا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ آپؐ کی حکمت اپنے مولا کریم کی حکمت سے اور

آپ کا کلام آپ کے مولا کریم کے مفہومِ کلام سے ہے۔ ایام میں بھی ساعت یا اس سے کم آجاتی ہے۔
فرمایا،

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِى الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۔ (کھاؤ اور پیؤ خوشگوار بدلے اس کے کہ تم نے گزشتہ ایام میں آگے بھیجا)

ایک قول یہ ہے:

"اللہ کی قسم یہی وہ ایام ہیں جو گزر جائیں گے۔ اس لیے انہیں گزرنے اور ختم ہونے سے پہلے اعمالِ صالحہ سے معمور کر دو۔"

ہر لمحہ پر حسرت ہو گی

حضرت حسنؓ فرماتے ہیں:

" اے ابن آدم! تیری زندگی کے کچھ مرحلے ہیں۔ جب بھی ایک دن یا ایک رات گزرا تو ایک مرحلہ ختم ہو گیا اور جب مراحل ختم ہوئے تو تُو منزل یعنی جنت یا دوزخ تک جا پہنچا۔ چنانچہ گھڑیاں ہمیں منتقل کر رہی ہیں اور ایام ہمیں لپیٹ رہے ہیں۔" جیسے کہ ایک حکیم فرماتے ہیں:

"عمر میں بندے کی مثال یہ ہے جیسے کہ ایک آدمی رواں کشتی میں ہو اور وہ بیٹھا ہو۔ اسی طرح بندہ آخرت کے قریب ہوتا جا رہا ہے اور وہ غفلت میں ہے۔"

منقول ہے کہ شب و روز بندے کی ساعتیں اس پر پیش کی جاتی ہیں۔ وہ قطار بن چوبیس خزانے کے مقامات دیکھے گا۔ ہر خزانہ کی جگہ میں ایک نعمت اور لذت اور عطاء وجزاء ہے۔ جب اس نے دنیا کی ساعتوں میں اس جگہ نیکی کی تو اس کو نیکیوں وجزاء ونعمت سے بھرپور دیکھ کر خوش ہو گا اور فرحت پائے گا اور اگر دنیا کی یہ گھڑی ذکر اللہ سے خالی گزار دی تو آخرت میں اسے خالی دیکھے گا۔ اس میں کوئی عطیہ اور جزاء نہ ہو گی۔ چنانچہ اسے پر حسرت و دکھ ہو گا کہ اس نے اس وقت میں کیوں پس انداز نہ کیا؟ کہ اس کی جزاء پاتا۔ پھر اپنے جی میں رضا و سکون پائے گا اور اگر فضائل و مستحبات کھونے پر حسرت نہ ہوئی تو نیکیوں میں تیزی اور مسابقت نہ کرنے پر حسرت ہو گی۔ اب جو آدمی برائیاں کر کے ان اوقات کو برباد کرے گا۔ اس کی حسرتیں کس قدر ہوں گی۔ جو آدمی دنیا میں حلال و مباحات میں مشغول رہا اس کے لیے بھی یہ بلند درجات کے حصول میں ضرر رساں ہو گا اور جو ممنوعات میں انہماک کرے اس کا کس قدر بُرا حال ہو گا۔ اللہ پاک ہے کس قدر خطرہ کا مقام ہے۔ بڑا ہی دشوار معاملہ ہے۔ بیدار کم اور غافل زیادہ ہیں۔ ایک عالمؒ فرماتے ہیں:

"فرض کر دو کہ گناہگار کو بخش دیا گیا مگر کیا وہ محسنین کے درجہ و ثواب سے تو محروم رہا۔"

حدیث میں آتا ہے :

بلند درجہ کے جنتی

" بعض جنتی نعمت میں ہوں گے کہ ان کے اوپر سے ان پر ایک نور چمکے گا، جس سے ان کے مکانات روشن ہو جائیں گے جیسے کہ اہل دنیا کے لیے سورج روشنی کرتا ہے وہ اپنے اوپر بلند درجے والے کو دیکھیں گے جیسے کہ موتی کی طرح کا ستارہ آسمان کے افق پر دیکھے۔ انوارات اور نعمت وجمال میں انہیں ان پر ایسی فضیلت دی گئی جیسے کہ چاند کو تمام ستاروں پر فضیلت ہے، وہ دیکھیں گے کہ وہ بلندی پر جہاں چاہتے ہیں سیر کرتے اور ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں اور خدائے ذوالجلال والاکرام کی زیارت کا شرف حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ نچلے درجہ کے ہوں گے، انہیں آواز دیں گے، اے ہمارے بھائیو! تم نے ہم سے انصاف نہیں کیا۔ جیسے تم نمازیں پڑھتے تھے اور جیسے تم روزے رکھتے تھے۔ اسی طرح ہم روزے رکھتے تھے۔ پھر کیا بات ہے کہ جس کی وجہ سے تمہیں ہم پر فضیلت دی گئی؟

فرمایا" کہ اچانک اللہ عزوجل کی طرف سے آواز آئے گی۔ جس وقت تم پیٹ بھر کر کھاتے تھے یہ بھوکے رہتے تھے۔ جس وقت تم سیر ہو کر پیتے تھے، یہ پیاسے رہتے تھے، جس وقت تم ہنستے تھے، یہ روتے تھے، جس وقت تم سوتے تھے یہ قیام کرتے تھے اور جس وقت تم امن وچین محسوس کرتے تھے تو یہ ڈرتے تھے۔ اس لیے انہیں آج تم پر فضیلت ملی "

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءً بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔

(سو تو نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیا کیا آنکھوں کی ٹھنڈک پوشیدہ رکھی ہے جو وہ کرتے تھے اس کی جزا کے طور پر)

اور حدیث میں آتا ہے :

" اکثر اہل جنت کم زور عقل والے ہیں اور بلند مقام پر اہل خرد ہیں "

مقربین اہل یقین کے مراقبہ کا پانچواں مقام

ایمان و انفاق

اللہ تعالیٰ نے سب کو ڈراتے ہوئے فرمایا :

حَتّٰٓی اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ ۝ لَعَلِّیْٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِیْمَا تَرَكْتُ۔ (یہاں تک کہ جب پہنچے ان میں سے کسی کو موت کہے گا۔ اے میرے رب مجھ کو پھر بھیجو شاید کچھ میں بھلا کروں کام)

پھر جواب دیا:

"کَلَّا (ہرگز نہیں)"

اور اس کو پختہ کر کے فرمایا:

اِنَّمَا کَلِمَۃٌ ھُوَ قَائِلُھَا۔ (بے شک یہ ایک کلمہ ہے جس کا وہ قائل ہے)

پھر اہل ایمان کو اس حالت سے صراف کے ساتھ ڈرایا اور ایسا کرنے والے کے نقصان کی اطلاع دی۔ فرمایا:

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تُلْھِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَ لَا اَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ۔ (اے ایمان والو! تمہیں تمہارے اموال اور اولاد اللہ کے ذکر سے غافل نہ کر دیں)

یعنی ان میں مشغول ہو کر خدا کی عبادت نہ چھوڑ دینا۔ پھر فرمایا:

وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔ (اور جو ایسا کرے گا تو وہی خسارہ پانے والے ہیں)

یعنی آخرت میں یہی لوگ نقصان اور خسارہ میں ہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے خالق و رزاق پر دنیا کے مال و اولاد کو ترجیح دی۔ پھر مال میں سے خرچ کرنے کا حکم دیا اور اس کے ساتھ ہی ایمان کا ذکر کیا۔ اور بتایا کہ انہیں امتحان کی خاطر زمین میں خلافت ملی ہے فرمایا:

آمِنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَکُمْ مُّسْتَخْلَفِیْنَ فِیْہِ۔ (اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جو اس نے تمہیں دیا اس میں نائب بنا کر اس سے خرچ کرو)

چنانچہ غافلین نے نصف کلام سنا اور ایمان تو لے آئے مگر خرچ نہیں کیا اور عاملین نے تمام کلام سمجھا۔ چنانچہ وہ ایمان بھی لائے اور خرچ بھی کیا۔

وَمَا یَعْقِلُھَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ۔ (اور اسے صرف علماء ہی سمجھتے ہیں)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْ لَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَ اَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ۔[1] (اور جو ہم نے تمہیں روزی دی اس سے خرچ کرو۔ اس سے پہلے کہ تم میں سے ایک کو موت آئے تو وہ کہے اے پروردگار تو مجھے ایک قریب مدت تک مہلت کیوں نہیں دیتا۔ میں خوب صدقہ کروں گا اور نیکوکاروں میں سے ہو جاؤں گا۔)

---

[1] سورۃ منٰفقون آیت ۱۰۔

یعنی مال خیرات کروں گا اور نیک اعمال کر کے صالحین سے بن جاؤں گا۔

حضرت ابن عباسؓ فرمایا کرتے تھے:

"اہل توحید پر یہ آیت سخت ترین ہے اس لیے کہ ان میں سے کوئی بھی دنیا کی طرف واپس آنے کی خواہش نہیں کرے گا۔ اس کے لیے آخرت میں بھلائی و خیر ہے۔ اسی طرح اللہ سبحانہ' نے فرمایا:

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِىْ جَنْۢبِ اللّٰهِ۔ (کہ کوئی جان کہے کہ ہائے افسوس اس پر جو میں نے اللہ کی طرف سے کمی کی)

اور سب سے بڑی شرمندگی حسرت ہے۔ یہ ایسی چیز کا نام ہے کہ جس کا تدارک نہ ہو سکے۔ فرطت کا معنی ہے میں نے ضایع کر دیا۔ فوطمنی یعنی مجھ سے رہ گیا، ضایع ہو گیا اور جنب اللہ کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں جو نقصان ہو گا اس پر حسرت ہو گی اور ایک قول کے مطابق ایام دنیا میں حصہ کھونے پر ہے اور یہ اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِىْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ تک (یا جب وہ عذاب دیکھے گا تو کہے گا۔ کاش مجھے دوبارہ آنا ہو تو میں نیکوں میں سے ہو جاؤں) یعنی دوبارہ آنا ہو اور اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ یہ مضر معطوف کلام ہے اور مضر یہ ہے کہ من قبل ان تقول۔ یا خشیة ان تقول اور حسب ذیل آیت معطوف ہے کہ وَ اَنِيْبُوْۤا اِلٰى رَبِّكُمْ وَ اَسْلِمُوْا یعنی اس کی طرف رجوع کرو، اور اس کی اطاعت کرو اور اپنی جانیں، مال اور دل اس کی بندگی میں دے دو۔

وَاتَّبِعُوْۤا اَحْسَنَ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ یعنی بہترین اور اعلیٰ اعمال کرو۔ رخصتوں اور مباحات پر چلنے کی بجائے یہ احسن کام ہے مثلاً زہد و تقویٰ، خوف اور یقین اختیار کرو۔ یہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ اور احسن ترین اعمال ہیں۔

پھر فرمایا:

اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِىْ جَنْۢبِ اللّٰهِ۔ (کہیں کہنے لگے کوئی جی اے افسوس جس سے میں نے کمی کی اللہ کی طرف سے)

اب جب کلام طویل ہو گیا اور معطوف مضر ہوا اور اختصار کے باعث اس کا عاطف دُور ہوا تو اس کا سمجھنا مشکل ہو گیا۔ قرآن مجید میں اس سے زیادہ اختصار اور اس سے بعید تر اضمار موجود ہیں۔ فرمایا:

فَمَا يُكَذِّبُكَ بَعْدُ بِالدِّيْنِ۔ اس کا معنی ہے کہ تکذیب پر تجھے کس نے ابھارا؟ اے انسان، جس کو ہم نے بہترین صورت میں پیدا کیا اس وضاحت و دلیل کے بعد (تو نے) دین کی (تکذیب کیوں کی) یعنی غائب امور دین و جزاء و بھلائیوں کی تکذیب پر تجھے کس نے ابھارا؟ پھر سختی سے فرمایا:

اَلَیۡسَ اللّٰہُ بِاَحۡکَمِ الۡحٰکِمِیۡنَ۔ (کیا اللہ تعالیٰ سب سے بڑا حاکم نہیں)

اور اسی طرح فرمایا،

وَ لَا تَنۡسَ نَصِیۡبَکَ مِنَ الدُّنۡیَا۔ (اور دنیا سے اپنا حصّہ نہ بھلا)

یعنی دنیا میں عمل ضرور کرتا رہ تا کہ کل آخرت میں اس کا اجر پائے اس لیے کہ اس کا اجر تو وہاں ہی ملے گا۔

پھر فرمایا،

وَ اَحۡسِنۡ کَمَاۤ اَحۡسَنَ اللّٰہُ اِلَیۡکَ۔ (اور جس طرح اللہ نے تجھ پر احسان کیا ہے تو بھی احسان کر)

یعنی جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے مال و متاع عطا کیا تو بھی اپنے آپ کے ساتھ اور اپنے محتاج بھائیوں کے ساتھ احسان سے پیش آ۔ اس طرح تو دنیا کا حصّہ آخرت میں پائے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بتایا اور ڈرایا کہ:

حَتّٰۤی اِذَا جَآءَتۡہُمُ السَّاعَۃُ بَغۡتَۃً قَالُوۡا یٰحَسۡرَتَنَا عَلٰی مَا فَرَّطۡنَا فِیۡہَا۔ (حتیٰ کہ جب ان کے پاس اچانک وہ گھڑی آئی تو انہوں نے کہا۔ ہائے افسوس اس پر کہ جس میں ہم نے زیادتی کی)

یعنی دنیا میں ہم نے کام نہ کیا اور آخرت میں کھو بیٹھے۔ اس پر افسوس و ندامت ہے۔

حدیث میں آتا ہے:

"ہر ایک حسرت و ندامت کے ساتھ مرتا ہے۔ اگر برا ہو تو اس لیے کہ نیکی کیوں نہ کی؟ اور اگر نیک ہو تو اس لیے کہ زیادہ (نیکی) کیوں نہ کی؟"

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اہل سلامت و نجات کے دو گروہ بنا دیے۔ بعض کا درجہ بلند ہے بعض کا کم درجہ ہے اور ہلاکت زدہ لوگ بھی بعض کم درجہ کے اور بعض زیادہ ہلاکت انگیز درجہ کے ہوتے ہیں۔ اب اصحابِ شمال افسوس کریں گے کہ وہ اصحاب یمین سے کیوں نہ ہوئے؟

فرمایا،

کُلُّ نَفۡسٍۭ بِمَا کَسَبَتۡ رَہِیۡنَۃٌ ۙ﴿۳۸﴾ اِلَّاۤ اَصۡحٰبَ الۡیَمِیۡنِ۔ (ہر جی اپنے کیے میں پھنسا ہے مگر داہنے والے)

اور اصحاب یمین افسوس کریں گے کہ وہ مقربین میں سے کیوں نہ ہوئے؟ اور صالح مقربین تمنا کریں گے کہ کاش ہم شہداء میں سے ہوتے اور شہداء چاہیں گے کہ کاش وہ صدیقین میں سے ہوتے۔ اس لیے کہ یہ روزِ حسرت ہے جس سے غافلین کو ڈرایا گیا اور جو لوگ آج مردے ہیں وہ اس روز کس حال میں ہوں گے؟

کہ آج ان کے پاس ایک نیکی بھی نہیں۔ اب انہیں کیسے نصیحت ہو۔ فرمایا:

۱۔ وَ اَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ وَ هُمْ فِيْ غَفْلَةٍ۔ (اور انہیں حسرت کے دن سے ڈرا۔ جب معاملہ کا فیصلہ ہوگا اور وہ غفلت میں پڑے ہیں)

۲۔ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا۔ (تاکہ اس کو ڈرائے جو کہ زندہ ہے)

ایک جگہ فرمایا:

اِنَّمَا مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا۔ (بیشک اسے ڈرانے والا ہے جو کہ اس سے ڈرے)

۳۔ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ۔ (بے شک تو اسے ڈراتا ہے جو کہ نصیحت کا اتباع کرے اور غیب میں رحمٰن سے ڈرے)

۴۔ فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ۔ (اب ہم نے کھول دی تجھ پر تمہاری اندھیری اب تیری نگاہ آج تیز ہے)

یعنی جو آگے بھیجا تو نے اسے دیکھ رہی ہے اور ایک قول یہ ہے کہ ترازو کی نوک دیکھتا رہتا ہے اس لیے کہ نقصان کا ڈر ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ جَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ۔ (اور موت کی بے ہوشی آئی حق کے ساتھ)

یعنی ان کے لیے یا ان کے خلاف یہ حق ہے۔ فرمایا:

سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰى۔ (ہم سے ان کے لیے نیکیاں آگے آئیں)

حَقَّتْ عَلَيْهِمْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ۔ (ان پر تیرے رب کا کلمہ لازم ہوا، وہ ایمان نہیں لائیں گے)

اور اس سے کم ساقط ہوا۔ ایک قول کے مطابق اعمال کا آخری حصہ تولا جائے گا اور خواتم اعمال، ازل سے ہیں اور ان کے درمیان نابود ہونے والا ہے۔ وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِ الْحَقُّ (اور اس دن وزن حق ہے) کہ عدل و صدق کی بات گزر چکی ہے۔ وَ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا (اور تیرے رب کا کلمہ سچا ہے) اولیائے کرام کے لیے۔ اور عَدْلاً (عدل ہے) دشمنوں کے خلاف۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ (خبردار خلق و امر اسی کا ہے)

مشاہدۂ مقربین کا چھٹا مقام

ایمان کا پھل "خیرات" ہیں، یقین کا مقتضیٰ "صالحات" ہیں۔ شک کا مقتضیٰ "لہو و لعب" ہے۔ اور سمع و بصر، پرہیزگاروں کی دو صفات ہیں اور عمی و صمم (اندھاپن، بہرہ پن)۔ شک کی دو صفات ہیں۔

ان مفاہیم کو قرآن مجید نے اس طرح بیان کیا۔

قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهٖ إِيْمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (کہہ دو، برا ہے جس کا تمہارا ایمان تمہیں حکم دیتا ہے اگر تم ایماندار ہو)

اس سے معلوم ہو گیا کہ ایمانداروں کو ایمان، نیکی و تقویٰ کا حکم دیتا ہے اور یقین کرنے والے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا بتانا ہے کہ اس نے سُنا اور دیکھا۔ اس لیے وہ عمل صالح کرتا ہے۔

رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَ سَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا إِنَّا مُوْقِنُوْنَ۔ (اے ہمارے رب! ہم نے دیکھا اور سنا ہمیں واپس لوٹا ہم اچھے عمل کریں گے۔ بے شک ہم یقین کرنے والے ہیں)

اور لہو و لعب میں مبتلا لوگوں کے بارے میں فرمایا:

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ۔ (کوئی نہیں وہ دھوکہ میں ہی کھیلتے)

پھر عدم یقین کے باعث ان کا حال بیان کیا۔ فرمایا:

مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَ مَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ۔ (وہ سن نہ سکتے تھے اور نہ ہی دیکھتے تھے)

اس لیے کہ وہ یقین ہی نہ کرتے تھے۔ اب جب یقین ہُوا یعنی معاینہ ہوا۔ سُنا اور دیکھا تو کہنے لگے:

وَ كُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ حَتّٰى أَتٰنَا الْيَقِيْنُ ۝ (اور ہم جزا کے دن کی تکذیب کرتے تھے حتیٰ کہ ہمیں پہنچی یقین آنے والی)

جب یقین ہُوا تو ان کی شدتِ سماعت و بصارت کی بات بتائی، فرمایا:

أَسْمِعْ بِهِمْ وَ أَبْصِرْ يَوْمَ يَأْتُوْنَنَا۔ (کیا سنتے دیکھتے ہوں گے جس دن آئیں گے ہمارے پاس)

یقین کے نتائج

یعنی آج جب ہمارے پاس آکر یہاں کی بات دیکھی تو کسی قدر سننے والے اور دیکھنے والے بن گئے۔ یہ مبالغہ برائے وصف ہے جیسے کہ کہا کرتے ہیں۔ أَكْرِمْ وَ أَعْظِمْ بِهٖ یعنی وہ کس قدر عظمت و عزت کا مالک ہے۔ اسی طرح اگر تو یقین کے ساتھ آج کے دن عمل کرے تو جو نہیں سُنا وہ سُنے گا۔ اور جو نہیں دیکھا وُہ دیکھے گا۔ مگر مصیبت یہ آن پڑی کہ تیری بیویوں نے تجھے گھیر لیا۔ تو ظاہری اشیاء پر مر گیا اور انہیں ہی خدا بنا کر انہی کا ہو کر رہ گیا۔ اگر تو ان سے بھاگ کر اللہ تعالیٰ کی جانب گیا تو تُو نے بہترین جائے فرار تلاش کی۔ تجھے اعلیٰ ترین پناہ گاہ حاصل ہوئی۔ اور حقیقت میں تجھے اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء سے فرار کر کے اپنی طرف آنے اور انہیں خدا نہ بنانے کا حکم بھی دیا ہے۔ کاش کہ تُو سُنے اور تسلیم کر لے۔ اگر تجھے عقل و خرد ہو تو اس نے اسے واضح کر دیا اور ان بیویوں

کو نصیحت بنایا اور اگر تو اس کے قرب کا شائق اور نصیحت کا تبع ہو تو انہیں اس کا باعث بنایا۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

وَ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ۔ (اور ہم نے ہر چیز سے جوڑا پیدا کیا تاکہ تم نصیحت پکڑو)

یعنی دو شکلیں اور دو شکلیں پیدا کیں تاکہ ان کے باعث تم اللہ کو یاد کرو اور اس کی طرف ہی انابت ہو۔ پھر فرمایا،

فَفِرُّوا إِلَى اللهِ (سو اللہ کی جانب بھاگو) یعنی ان اشیاء سے زہد اختیار کرکے اللہ تعالیٰ کی طرف آؤ۔ پھر فرمایا،

وَ لَا تَجْعَلُوا مَعَ اللهِ إِلٰهًا آخَرَ۔ (اور اللہ کے ساتھ ساتھ دوسرا خدا نہ بناؤ)

یعنی اس کی خدائی میں کسی کو شریک نہ بناؤ۔ یہ فہم مقربین ہے جو انہیں قلبی بصارت کی شہادت سننے سے حاصل ہوئی۔ اس وقت وہ اسی کو پکارتے ہیں اور وہ قبول فرماتا ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

إِنَّمَا يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ يَسْمَعُونَ۔ (بے شک وہ ان کی (پکار) قبول کرتا ہے جو سنتے ہیں)

ایک جگہ فرمایا،

وَ يَسْتَجِيبُ الَّذِينَ آمَنُوا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ يَزِيدُهُمْ مِنْ فَضْلِهِ۔ (اور ان کی دعا قبول کرتا ہے جو ایمان لائے اور اچھے اعمال کیے اور ان پر اپنا فضل زیادہ فرماتا ہے)

مگر جو دور رہے اسے آواز کیونکر سنائی دے؟ اور جو رکھتے نہیں وہ کیسے مشاہدہ کرے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"تیرا کسی چیز سے محبت کرنا، تجھے اندھا اور بہرہ کر دے گا۔"

چنانچہ خواہش حق سے اندھا بنا دیتی ہے اور شہوت، نصیحت و صداقت سے بہرہ کر دیتی ہے۔

اسی طرح اگر تجھے (پروردگار تعالیٰ سے) محبت ہے تو تو اسی کی جانب نظر رکھے گا۔ اور اگر اسی جانب نظر کرے گا تو غیر اللہ سے اندھا ہو جائے گا۔ اور اگر تو اس کی طرف آئے گا تو اس کا حلہ سنے گا اور اگر تو سنے گا تو غیر سے بہرہ بن جائے گا۔ اور اگر وہ تجھ سے محبت کرے گا تو تیرا سماعت و بصارت تیرا دل ہاتھ اور تیرا حامی و ناصر وہی ہوگا۔ تو اس کو پکارے گا تو وہ تجھے جواب دے گا۔ تو اس سے مانگے گا تو وہ تجھے عطا کرے گا۔ تو اس کے لیے پرخلوص ہوگا تو وہ تیرا ہو جائے گا۔ اسی طرح اس کے بارے میں حدیث آتی ہے۔ پس تو اپنے کو بھلا کر اس میں انہماک کر لے گا۔ اپنے سے فارغ ہو کر اس کا ہو کر رہ جائے گا۔ اب تو اس سے کس

طرح سنے گا، اس کی طرف دیکھے گا، اس کے سامنے حرکت کرسکے گا؛ نہ نفس کے ساتھ اور نہ ہی خواہش کے ساتھ۔ اور نہ ہی اپنی شہوت و دنیا کے ساتھ۔ یہ تقلبِ حبیب سے حبیب کا وصف ہے اور یہ تثبیتِ محبوب سے محبوب کی خبر ہے۔

جب بندہ ظنی یقین سے نہیں بلکہ یقینِ عین کے ساتھ یقین کرے گا اور وقت کے تیزی سے گزرنے اور اسے پانہ سکنے کی مذکورہ باتوں کو سنے گا تو اسے فوت شدہ (اوقات) پر غم و حزن لاحق ہو گا اور سوچے گا کہ ایسا نہ ہوگا کہ آئندہ اس پر ندامت اٹھانی پڑے۔ چنانچہ اب مزید اوقات ضایع نہ کرے گا اور نہ ہی مزید ندامت اٹھائے گا۔ اب یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وُہ حال کو بُرے اعمال سے ضایع کردے اور ایسے کام کرسکے کہ جن کا انجام محمود نہ ہو اور آخرت میں ان پر رشک نہ کیا جا سکے۔

چنانچہ غفلت کے آخر میں بیدار ہونے والے کی مثال یہ ہے۔ جیسے کہ ایک بندے پر لازم تھا کہ وُہ دِن بھر میں یہ کام ختم کردے مگر اسے نیند آگئی یا کسی کھیل میں لگ گیا اور عصر کے بعد ہی وہ کام کرنے کی توفیق ملی تو اب باقی دن وہ کس قدر تیزی اور شدید انہماک دکھاتا ہے تاکہ دن کے پہلے اوقات کی تلافی کر ڈالے۔ وُہ چاہتا ہے کہ شام ہونے تک کا وقت بڑھ کر کئی گنا ہو جائے اور گزشتہ کی تلافی کرسکے۔ بس توبہ کرنے والے کی یہی مثال ہے۔ توبہ کے بعد اسے موت تک چین و قرار نہیں آتا۔ اس لیے کہ وہ اوقات کی بربادی دیکھ بیٹھا ہے۔ گزشتہ اوقات کی عدم تلافی کا یقین ہوتا ہے۔ (اور جانتا ہے) کہ اس وقت سخت ندامت ہوگی اور سب سے بڑی حسرت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

چنانچہ اہل یقین عقلائے کے نزدیک حزم و احتیاط اس میں ہے کہ زندگی کے باقی مختصر حصہ میں خوب جوش و خروش سے محنت کرے۔ اس لیے کہ مستقبل کے وقت میں بھی گزشتہ فضول اعمال میں انہماک کرنا دوسرا ضیاع ہے اور آئندہ اوقات کی بھی بربادی ہے۔

اس طرح یہ بیدار اور محنتی آدمی وقت کے ہر حصّہ میں چوکنا رہے گا۔ ہر گھڑی میں نیکیاں کرے گا اور ہر خزانۂ ساعات میں کچھ کچھ اعمال رکھتا جائے گا تاکہ آخرت میں کوئی خزانہ خالی نہ دیکھے اور اس پر کفِ حسرت نہ ملنا پڑے۔ مزید در مزید اعمال صالحہ کے خواہش مند اہلِ رجا کا یہی طریق ہے جو کہ زندگی بھر اپنے مولائے کریم کی عبادت میں انہماک رکھتے ہیں۔ صحیح تائبین کا یہی مقام ہے تاکہ گزشتہ غفلت کا تدارک کیا جا سکے اور علماءُ کے نزدیک حزم واحتیاط کا یہی مطلب ہے۔

اگرچہ یہ دشوار کام ہے مگر ہمت کی تو اللہ عزوجل کی توفیق سے یہ دشوار کام بھی آسان ہو جائے گا اور اگر اسے آسان اور سہل محسوس کیا تو اعمالِ صالحہ کی برکت سے بلند ترین درجات و مقامات سے سرفراز ہوگا۔

مشاہدۂ اہلِ یقین کا ساتواں مقام

یاد رہے کہ ہم نے جو فوت شدہ اوقات کے تدارک کی بات کی ہے۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ ایک جگہ کی بجائے دوسری جگہ کی تمنا کرنا یا دوسرے وقت کا انتظار کرنا۔ اصل میں یہ تو وقت کے بارے میں فکر ہے اور نہ یہ مراد ہے کہ اس حال کی بجائے دوسرے حال کی توقع رکھے بلکہ اصل تدارک یہ ہے کہ دن کا روزہ رکھے رات کو قیام کرے۔ ساعت میں ذکر اللہ کرے یا دل کو اس پر آمادہ کر کے باندھ لے یا کسی خیال کا نشان مٹائے اور مزید برآں آنکھ کی حفاظت کرے۔ کان کو بچائے۔ ہاتھ روک لے، قدم سنبھالے۔ نامناسب کلام سے خاموش رہے۔ مشتبہ لقمہ چھوڑ دے۔ خوراک میں کمی کر دے۔ اللہ کی خاطر بھوک زیادہ اختیار کرے، بھلائی کا حکم دے اور بُرے کام سے روکے۔ اچھی نیت کرے اور بُری نیت سے ہٹ جائے۔ دوبارہ توبہ کرے۔ دل میں اچھے اعمال کی فکر کرے، بدظنی نکال دے۔ حُسنِ ظن کی جگہ ارادہ میں صحت عزم اختیار کرے اور عزم کو قوت دینے والے ذرائع اختیار کرے۔ نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں تعاون کرے اور یہ تمام کام فوراً اور اسی وقت شروع کر دے۔ ان کا انتظار نہ کرے کہ ابھی کروں گا اور نہ ہی دوسرے وقت کا منتظر ہو بلکہ دوسرے وقت کی توقع ہی نہ رکھے اور ان کو آئندہ پر نہ چھوڑے اور نہ ہی کسی ایک جگہ کے انتظار میں رہے کہ وہاں چل کر کروں گا، اصل میں گزشتہ اوقات کا تدارک یہی ہے۔ یاد رکھو کہ عنقریب، جلدی فلاں جگہ وغیرہ کے الفاظ شیطانی لشکر ہیں۔ ان کو کاٹ کر رکھ دو۔ یہ دھوکہ کی جگہ اور اہلِ باطل کے احوال میں سے ہے جو کہ نفسانیت اور خواہشات میں ڈوب چکے۔ گزشتہ کا تدارک نہ کیا اور کل کے لیے انہوں نے کچھ نہ بھیجا۔

نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ۔ (وہ اللہ کو بھلا بیٹھے اس نے انہیں بھلا دیا)

اور وقت کا حال یہ ہے کہ جب گزرا تو کھو گیا۔ اب قیامت تک نہیں ملے گا۔ جب گیا تو لپیٹا جا چکا۔ اب روزِ حشر تک نہیں کھلے گا۔ البتہ اس کی طرح (وقت) آتا رہے گا اور مخلوق پیدا ہوتی رہے گی۔

مقربین و صدیقین

جب بندہ یقین کرے کہ اس کی ساری عمر ایک دن ہے اور اس کا دن ایک ساعت ہے اور اس کی ساعت اب کا وقت ہے اور اس کا یہ وقت اس کا حال ہے اور اس کا حال، اس کا دل ہے۔ اب وہ اپنے حال سے اپنے دل کے لیے سامان لے کہ اس کے ذریعہ وہ مقلب القلوب کا قرب حاصل کر سکے۔ چنانچہ علم کی روشنی میں ایسا عمل کرے جو کہ اس کے مولائے کریم کو پسند ہو اور ایسا عمل ہو کہ اگر اچانک موت آ جائے تو اس عمل پر اللہ سے ملاقاتِ (حسنہ) ہو۔ پھر وقت سے اپنے حال کے لیے وہ سامان لے کہ اس کا حال دل کے لیے مناسب ہو جائے۔ اس کے دل کو قوت بخشے

اور پروردگار تعالیٰ کے لیے پُرخلوص بنا دے اور اس وقت وہ عمل کرے کہ اس کے پروردگار تعالیٰ کے پاس اس کا حال بہتر ہو جائے۔ دن سے ساعت کی اصلاح وضرورت کا عمل لے۔ مہینے سے دن کے لیے لے۔ چنانچہ اس کا مہینہ دن ہو جائے اور اس کا دن ساعت ہو جائے اور اس کا وقت میں انہماک ساعت سے ہٹا دے۔ اس کا حال میں انہماک، وقت سے ہٹا دے۔ اس صورت میں وہ اپنے وقت کا خیال رکھنے والا، اور اس کی نگرانی کرنے والا ہو جائے گا۔ نفس پر پہرہ دار، ہمت بڑھانے والا، انفاس تک گننے والا اور اللہ تعالیٰ کی خاطر مراقب اپنے حبیب تعالیٰ کا ہم نشین بن جائے گا۔ اس کا ہر لمحہ اور ہر سانس ذکر اللہ سے یا شکر نعمت سے یا اس کی محبت میں صبر سے یا سخت تکلیف کے وقت رضا سے معمور ہوگا۔ ان سب میں اس کی نگاہ قریب تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے، اس کی طرف اس کا دھیان اور حبیب تعالیٰ کی طرف پلکنے والا ہوتا ہے۔ اس کے سوا کسی طرف نظر نہیں کرتا اور اس کے بغیر کسی پر بھروسہ نہیں کرتا۔ اس نے ساری عمر کو ایک دن اور ایک دن کو ایک ساعت اور ساعت کو ایک وقت اور وقت کو ایک حال اور حال کو ایک نفس (سانس) اور نفس کو ایک مراقبہ اور مراقبہ کو ایک مواجہہ بنا رکھا ہے۔ سو اس نے اس سمت میں رُخ کیا، تو رُکا نہیں اور اس کے قرب کی طرف لپکا تو سُست نہیں پڑا۔ اب وُہ مزید ایمان، اور نئے یقین سے سرفراز ہُوا۔ بغیر حساب کے اسے بہترین زندگی عطا ہُوئی دل کے حجابات کھل گئے۔ اب وہ مقامِ معرفت میں ہے۔ اس کے ایام مختصر ہو گئے، اس کا وقت واحد تعالیٰ کے لیے ایک ہُوا۔ اس کا دل واحد تعالیٰ کے لیے ایک ہُوا۔ اس کی ہمت بھی منفرد ہُوئی۔ یہ ان ابدال کا حال ہے کہ جو امثال از رسلؑ ہیں۔ اور اہل یقین ہیں ان کی تعداد قلیل ہی ہے۔ انہیں یقین کا وافر حصہ حاصل ہے اور یہی مقربین وصدیقین ہیں۔

اور جو ان مذکورہ پر یقین کرلے وہ صالحین میں سے ہے اور جو ان پر ایمان لائے اور شبہ نہ کرے اور ایمان تصدیق رکھے تو وہ اہل یقین میں سے ہے۔ اور جو ایسا مشاہدہ کرے کہ اس سے اسے مزید مطالعات حاصل ہوں تو وُہ شاہدین میں سے ہے۔

اور تمام مذکورہ امور یعنی مراقبۂ مومنین اور شہادتِ مقربین دو مقامات میں سے ایک کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے جو کہ ان میں سے ایک جگہ کھڑا ہُوا اور توبہ میں استقامت اختیار کرنے اور علم پر عمل کرنے کی برکت سے اسے یہ حاصل ہُوا۔

اور جو مقامِ توبہ میں ہو، اس کا حال استقامت کا ہو تو اسے شہادتِ محبین تک سربلندی حاصل ہوگی۔

اور جو مقامِ علم میں ہو اور اس کا حال یہ ہو کہ وہ اپنے علم پر عمل کرتا ہو اور وہ خائفین کی روش پر ہو۔ یہ دونوں حال اس عارف کے ہیں جسے قریب تعالیٰ کا قرب حاصل ہو اور وُہ دائمی وجدان میں ہو اور شہید تعالیٰ

کے سامنے قایم با شہادت ہو۔ اس کے سانس اور پلک جھپکنا بھی نیکیاں ہیں۔ اس کے تصرفات و آثار بھی حسنات ہیں۔ اس کے افکار و اذکار مشاہدات ہیں۔ وُہ تصریف و تقلب حاضر و بیدار ہے۔ ایک عارف اور دائمی وجدان والے کی یہی تعریف ہے۔

جماعت صوفیائ میں سے ایک بزرگؒ سے منقول ہے کہ وہ ایک اہلِ مراقبہ اور اللہ تعالیٰ کے لیے دنیا سے منقطع بزرگ کے پاس گئے تو انہوں نے فرمایا:

"میں نے اپنے آپ پر اللہ تعالیٰ کے صرف ایک قسم کے انعامات شمار کیے تو وہ چوبیس ہزار (روزانہ) نکلے۔" (یہ فرماتے ہیں) کہ میں نے پوچھا:

"وہ کس طرح؟"

فرمایا: "میں نے دن رات میں اپنے سانس گنے تو یہ چوبیس ہزار تھے اور ان کے اطراف دو گنے ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ایک سانس کی دو طرفیں ہیں۔"

میں نے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی۔

"تو میری نعمت کا شکر کس طرح ادا کر سکتا ہے؟ جبکہ ہر بال میں میری دو نعمتیں ہیں۔ ایک یہ کہ میں نے اس کی جڑ کو نرم کیا اور دوسرے یہ کہ اس کے سرے کو ساکن کیا۔"

ایک عالمؒ فرماتے ہیں:

"یہ بات حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے بھی مروی ہے کہ بندے کی باقی عمر سرخ یاقوت سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔"

اور فرمایا:

"باقی ماندہ عمر کی قدر صرف ایک نبی یا صدیق ہی پہچانتا ہے۔"

بعض علماؒ کا فرمان ہے:

"باقی ماندہ عمر کی قدر صرف وہی پہچانتا ہے جو کہ کبریت احمر کے چشمہ کو پہچانتا ہو۔ اس لیے کہ یہ ایسے چشمے ہیں جو اندھیروں میں ہیں اور انہیں ابدال کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور کبریت احمر، سونا بنانے کی چیز ہے جس سے خالص سونا بناتے ہیں۔ جب اس میں سے کچھ دو استعمل سونے پر ڈال دی جائے تو وہ اپنے حال پر رہتا ہے ورنہ حل ہو جاتا ہے اور کچھ سالوں کے بعد اس میں تغیر آ جاتا ہے اور میں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں کبریتِ احمر کا مرد... اسی حدیث میں دیکھا جو کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے مروی ہے، جس میں ابدال کا ذکر کیا اور ان کی تعداد اور صفت بیان کی اور ان کے وصف کے آخر میں یہ فرمایا:

"میری امت میں یہ لوگ کبریتِ احمر سے زیادہ قیمتی ہیں۔" اور ذہب ابریز کا بھی حدیثِ ابتلا میں ذکر آیا ہے:

"اللہ تعالیٰ اپنے بندے کا ابتلا سے تجربہ کرتا ہے جیسے کہ تم میں سے ایک آدمی سونے کا آگ کے ذریعہ تجربہ کرتا ہے۔ بعض اس میں سے ذہب ابریز (کھرے سونے) کی طرح نکلتے ہیں اور ان میں سے بعض سیاہ جلے ہوئے نکلتے ہیں اور ان میں سے بعض اس کے درمیان ہو کر نکلتے ہیں۔"

فصل ۲۹
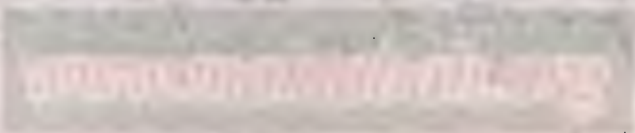
مقاماتِ مقربین و امتیازِ غافلین

امانت و عہد جب بندہ مذکورہ صفات کا مالک ہو جائے تو اس کی حالت یہ ہو جاتی ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ وَ الَّذِیْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ۔ (اور جو اپنی امانتوں اور وعدوں کا خیال رکھتے ہیں۔ اور جو اپنی شہادت پر قایم ہیں)

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"بندے کی عمر اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ موت کے وقت اس کی پرسش ہوتی ہے۔ اگر اس نے اس میں تفریط کی ہو تو اس نے اللہ تعالیٰ کی امانت ضایع کر دی اور وعدہ توڑ دیا۔ اور اگر اپنے اوقات کا خیال رکھا اور ہر ساعت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت و اطاعت میں رہا تو اس نے امانت کی حفاظت کی اور وعدہ پورا کیا۔ اس وفا پر اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے بھی پورا اجر ملے گا جیسے کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَ اِیَّایَ فَارْهَبُوْنَ۔ (اور میرا وعدہ پورا کرو میں تمہارا وعدہ پورا کروں گا اور خاص کر مجھ سے ڈرتے رہو)

یعنی عہد ضایع کرنے اور وفا توڑنے میں مجھ سے ڈرتے رہو۔ ایک جگہ فرمایا:

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَ یَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ۔ (بھلا ایک شخص جو ہے نظر آئے راہ پر اپنے رب کے اور پہنچتی ہے اس کو گواہی اس سے)

بیان کے ذریعہ مقامِ الٰہی کا مشاہدہ کرے، پھر شہادتِ ایقان کے ساتھ قایم رہے۔ اب یہ اس کی طرح نہیں ہے کہ جس کو اس کی بدعملی خوب لگی اور خواہشِ نفس کا پیرو بن گیا۔ چنانچہ اس نے اپنے مولائے کریم کی اطاعت پر اسے ترجیح دی بلکہ یہ قائم بالشہادت ہے اپنے مولا کریم کا تابعدار اور اپنے معبود تعالےٰ کی محبت پر راہِ ہدایت پر ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے تعریف فرمائی:

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ یَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِیْلَةَ اَیُّهُمْ اَقْرَبُ وَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ یَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ۔ (وہی ہیں جو پکارتے ہیں اپنے رب کی طرف وسیلہ چاہتے ہیں وہی قریب تر ہیں اور اس کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے عذاب سے ڈرتے ہیں)

اور حقیقتِ ایمان کے ساتھ ان کی اس طرح مدح فرمائی۔

وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ آیَاتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا۔ (اور جب ان پر اس کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھتا ہے)

یعنی اس کی علامت اور دلائل۔ اور فرمایا:

وَ عَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَکَّلُوْنَ۔ (اور وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں)

یعنی اس پر بھروسہ کرتے ہیں اور اس کی طرف نظر رکھتے ہیں اور ہر حال میں اس پر اعتماد کرتے ہیں اور ہر چیز سے اس کی طرف سکون حاصل کرتے اور ہر چیز سے ہٹ کر اسی کی طرف رہتے ہیں۔

پھر فرمایا:

اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا لَهُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ۔ (وہی صحیح مومن ہیں ان کے لیے ان کے رب کے ہاں درجات ہیں)

اور یہ حقیقی متوکلین جن کی اللہ نے حقاً سے مدح فرمائی اور ان کے لیے اعلیٰ درجات اور عمدہ روزی کا وعدہ کیا۔ یہ ان کی طرح نہیں جن کا ذکر آئندہ آتا ہے کہ،

وَ اِنَّ فَرِیْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِیْنَ لَکٰرِهُوْنَ یُجَادِلُوْنَکَ فِی الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَیَّنَ۔ (اور بے شک مومنوں کی ایک جماعت اللہ سے کراہت کرتی ہے وہ وضاحت ہونے کے بعد حق میں تجھ سے جھگڑتے ہیں)

اور اس کے علاوہ ہی فرمایا:

مَا یُجَادِلُ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا۔ (اللہ کی آیات میں صرف وہی جھگڑتے ہیں کہ جنہوں نے کفر کیا)

چنانچہ ان کی خواہشاتِ نفس کے باقی رہنے کے باعث ان کے حال کو اپنے دشمنوں کے احوال سے مشابہ بتایا اور جن لوگوں نے حقیقی زہد اختیار کیا ان کو مقام صالحین میں بتایا۔ فرمایا:

وَ مَنْ یَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِکَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰی۔ (اور جو حالتِ ایمان میں اس کے پاس آئے کہ اچھے اعمال کیے ہوں تو ان کے لیے بلند درجات ہیں)

چنانچہ اللہ بزرگ و بلند مرتبہ والا ہے اور اس کے اولیاء بھی سر بلند ہیں اور اعلیٰ تعالیٰ ان کے ساتھ ہے اس لیے وہ بھی بلند درجہ کے ہیں اور ہم ادنیٰ درجہ کے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارے پاس دنیا کم درجہ کی چیز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے آدمی کا ذکر کیا کہ جو صرف دنیا چاہتا ہے اور اس نے اللہ کے ذکر سے منہ پھیر رکھا ہے۔

اس نے ادنیٰ چیز کو ابھی مانگ لیا یا اپنی شدید جہالت اور ضعفِ یقین کے باعث آخرت میں مغفرت کا گمان رکھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَأْخُذُونَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا۔

(لے لیتے ہیں اسباب اس ادنیٰ زندگی کا اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف ہو جائے گا)

اور فرمایا:

فَاَعْرِضْ عَمَّنْ تَوَلّٰى عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا۔

(پس اس سے اعراض کر جو ہمارے ذکر سے منہ پھیر لے اور صرف دنیا کی زندگی ہی چاہے)

اور سچے اہلِ ایمان کے بارے میں فرمایا:

رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ۔

(ایسے مرد ہیں کہ انہوں نے سچ کر دکھایا جس پر انہوں نے اللہ سے وعدہ کیا)

اور دوسروں کا وصف یہ فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ۔

(اے وہ جو ایمان لائے کیوں وہ کہتے ہو جو نہیں کرتے اللہ کے نزدیک یہ بڑی نفرت کی بات ہے)

سخاوت زہد کا پہلا زینہ ہے

اب جس کا صدقِ عہد کے ساتھ ذکر ہوا اور جس کا عہد شکنی کی صف میں ذکر ہوا اور وہ باعثِ نفرت ہے۔ ان دونوں کے درمیان بہت ہی فرق اور بُعد ہے۔ ایک گروہ کے بارے میں فرمایا:

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔

(اور البتہ سچا کر دیا ان پر ابلیس نے اپنا ظن، چنانچہ انہوں نے اس کی تابعداری کی سوائے اہلِ ایمان کی ایک جماعت کے)

چنانچہ اولیاء اللہ نے اس کا اتباع چھوڑ دیا اور اس کے گمان کی تصدیق میں مومنوں کا ایک فریق اور اس کے گمان کی تصدیق میں مومنوں کا ایک فریق اور اس کے پیروکار اس میں داخل ہوئے۔ البتہ ایک گروہ مستثنیٰ رہا، وہ صدیقین، شہداء اور صالحین کا گروہ ہے اور ان کی رفاقت بہترین ہے۔ یہی اہلِ توکل اور صحیح مومن ہیں جن کے بارے میں فرمایا:

اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۔

(بے شک ان پر اس کا تسلط نہ ہوگا جو ایمان لائے اور وہ اپنے رب پر توکل کرتے ہیں)

اور ایسا نہیں ہو سکتا کہ جو اپنی جان و مال اپنے مولائے کریم کی محبت پر لگا دے وُہ اسی کی طرح ہو جائے جو اپنے نفس میں لگ جائے اور مولائے کریم سے کوئی سروکار نہ رکھتا ہو تاکہ وہ مخفی نہ رہے اور اس کا کینہ اس پر نکل آئے جیسے کہ اہل ایمان کے ایک گروہ کے لیے فرمایا:

يُؤْتِكُمْ أُجُوْرَكُمْ وَلَا يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ ۝ إِنْ يَسْأَلْكُمُوْهَا فَيُحْفِكُمْ تَبْخَلُوْا وَيُخْرِجْ أَضْغَانَكُمْ[1] (دے گا تم کو تمہارا بدلا اور نہ مانگے گا تم سے مال تمہارے اگر مانگے تم سے وہ مال پھر تم تنگ کرے تو بخل کرنے لگو اور ظاہر کر دے تمہارے دل کی خفگیاں)

احفا رکا مطلب ہے انتہا کو پہنچنا۔ یعنی اگر تم سے مانگے گا تو سب مانگے گا اور اس کے بعد تمہاری جانوں میں زہد پسند کرے گا اور اضغان دراصل ضغن کی جمع ہے یعنی کینہ۔ تم کہتے ہو کہ تم جائے سوال میں نہیں ہو۔ اس لیے کہ بخیل آدمی زاہد نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ سخاوت زہد کا پہلا زینہ ہے اور جو ایسا نہ کرے وہ زاہد نہیں، اور جو دنیا میں زاہد نہ ہو وہ اپنے مولائے کریم کا محب نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ جس سے وُہ بغض رکھتا ہے جس سے وہ محبت نہیں رکھتا اسے یہ چاہتا ہے۔ اب یہ اپنے اخلاق میں اپنے مولا کریم کا تابعدار نہیں، اس کی رضا پر نہیں چلتا۔ آخر اس نے اسے دور کر دیا اور اپنے اوصاف سے مشاہدہ سے اسے محروم کر دیا۔ فرمایا:

تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ۔ (تم دنیا کا سامان چاہتے ہو اور اللہ آخرت چاہتا ہے)

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مال کے بارے میں فرمایا:

"جب تو یہ چاہے کہ اللہ تجھ سے محبت کرے تو دنیا میں زہد اختیار کر۔"

اور مومنوں کے اس گروہ کی تلبی نہیں ... بیان کرنے کی تم میں سکت نہیں جنہیں مومن بتایا گیا۔ اگر ان سے مالوں کے خرچ کا مطالبہ ہوتا تو وہ بخل کرتے۔ اس لیے کہ انہیں ظاہری لباس (ایمان) کے باعث اللہ پر بڑا فریب ہے۔

فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا۔ (سو جب ان کی اجل آئی تو اللہ اپنے بندوں کو دیکھنے والا ہے)

البتہ اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے سے مطالبہ کرتا ہے کہ جس سے وُہ محبت رکھتا ہے اور اس میں اس کی عزت افزائی ہوتی ہے اس لیے کہ وہ جانتا ہے کہ وُہ سب کچھ پیش کر دینے کے لیے فوراً لپکے گا۔ اس لیے کہ

---

[1] سورۂ محمد آیت ۳۶، ۳۷۔

وہ کریم و جواد ہے۔ اللہ کے ہاں کوئی چیز بڑی نہیں۔ جب وہ مطالبہ کرتا ہے تو جان و مال سب چیز کا مطالبہ کرتا ہے البتہ یہ مطالبہ اسی سے کرتا ہے کہ جسے اس نے اپنے اخلاق سے ایک خلق کے ساتھ پیدا فرمایا۔ اب جب بندے پر اس کے سوا کچھ دھیان نہ ہو تو اس کا محبوب سب چیز کا مطالبہ کرتا ہے اور جب بندے کے دل میں فانی چیز کی محبت و عظمت ہو اور وہ بخیل ہو تو اس سے کچھ نہیں مانگتا۔

جب بندے کی جان میں اس کا کوئی سانس نہ رہے اور نہ ہی اس کی کچھ ملکیت رہے تو جواد تعالیٰ اس کے مال سے عوض ہوتا ہے اور جبار تعالیٰ اس کے نفس سے عوض ہوتا ہے۔ البتہ اللہ سبحانہ نے عوض از نفس میں اس کا ذکر نہیں کیا اور مال سے بدلہ میں جنت کا ذکر کر دیا تاکہ وہ حکم کے تحت داخل نہ ہو جائے اور وہ حاکم ہے تاکہ عوض کی طرف جانے لگے۔ اس طرح شفع ہو جائے گا۔ حالانکہ وہ فرد ہے چنانچہ اس نے اپنا آپ پوشیدہ رکھا اور وہ دلیل ہے اور مخلوق کا ذکر کیا اور اس کی طرف وہ راہ ہے۔ یہ اس سے ادبا کی سمجھ و فہم ہے، یہ خالص محبت کی علامت ہے۔ اس میں غیر کا شرک نہیں اور اس پر غیر کو کوئی دخل نہیں، اور یہ نامناسب ہے کہ ان پر محبین کا وصف کھولا جائے۔ اس لیے کہ ان کا حال وصف سے بالاتر ہے۔ اور ان کا مقام علوم عقل و وقت سے بلند تر ہے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان سے اسے محکم فرمایا:

وَ فِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْاَنْفُسُ وَ تَلَذُّ الْاَعْيُنُ۔ (اور وہاں ہے جو دل چاہے اور جس سے آنکھیں آرام پائیں)

فرمایا:

تَحِيَّتُهُمْ يَوْمَ يَلْقَوْنَهٗ سَلٰمٌ۔ (دعا ان کی جس دن ملاقات کریں گے اس سے، سلام ہے)

ایک جگہ فرمایا:

وَ لَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ۔ (اور تمہارے لیے وہاں ہے جو کچھ مانگو مہمانی ہے اس بخشنے والے مہربان کی طرف سے)

فَاَمَّا اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۝ فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ۔ (سو جو اگر وہ مردہ ہوا مقرب لوگوں میں تو راحت ہے اور روزی ہے)

اور اس فرمان کے ساتھ اسے پختہ کیا۔

وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۔ (اور ان کا کارساز ہے بوجہ اس کے کہ وہ عمل کرتے تھے)

اور ایک جگہ فرمایا:

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌ ۝ (ان کے اللہ کے ہاں درجے ہیں اور اللہ دیکھتا ہے

بِمَا یَعْمَلُوْنَ ۔ (جو وُہ کرتے ہیں)

چنانچہ اس میں اولیاء اور محبین الٰہی کے اوصاف اور اہلِ درجات و قرب کی مدح ہے۔

فرمایا،

بَصِیْرٌ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ۔ (دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں)

یعنی اس کی وجہ سے انہیں درجات عطا کیے اور فرمایا،

وَلِیُّهُمْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۔ (ان کا کارساز ہے بوجہ اس کے کہ جو وہ کرتے تھے)

یعنی بوجہ اس کے کہ انہیں اس پر مستعد کیا اور اپنا قرب عطا کیا۔ اور دوسری قرأت پر اس میں منافقین کی مذمت ہے۔

وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۔ (اور اللہ دیکھتا ہے جو وہ کرتے ہیں)

چنانچہ تم نے اپنے اعمال خود دیکھے اور تمہیں ان کی طرح نہیں بنایا اس لیے کہ تمہارے اعمال ان کے اعمال کی طرح نہیں ہیں۔ چنانچہ فرمایا،

فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ عَلَیْهِمْ وَ اَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا ۔ (پس معلوم کیا جو ان کے جی میں تھا پھر اتارا ان پر اطمینان اور انعام دیا ان کو ایک فتح نزدیک)

پھر ہمارے قلوب کا وصف بیان کیا اور فرمایا،

وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَكِیْمًا ۔ (اور اللہ جانتا ہے جو تمہارے دلوں میں ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے)

پھر صاف وضاحت سے فرما دیا کہ،

اِنْ یَّعْلَمِ اللّٰهُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ خَیْرًا یُّؤْتِكُمْ خَیْرًا ۔ (اگر اللہ تمہارے دلوں میں کوئی بھلائی جانے تو تمہیں بھلائی دے گا۔)

پھر اس کے برعکس صاف کلام فرمایا جو کہ مجمل کی وضاحت اور مفصل کی مزید توضیح ہے۔

وَ لَوْ عَلِمَ اللّٰهُ فِیْهِمْ خَیْرًا لَّاَسْمَعَهُمْ وَ لَوْ اَسْمَعَهُمْ ۔ (اور اگر اللہ ان میں بھلائی جانے تو انہیں سنائے گا، اور اگر انہیں سُنائے)

یعنی ان میں بھلائی نہ ہونے کے بعد تو

لَتَوَلَّوْا وَ هُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۔ (البتہ وُہ پھر جائیں گے اور وہ اعراض کرنے والے ہیں)

یعنی اس میں ان کا کچھ حصّہ نہیں۔ اس لیے کہ ان کے ہاں بھلائی کی کوئی جگہ نہیں کہ اس میں بھلائی

پائی جاتی۔ یہ واضح ترین خطاب ہے اور اہلِ دانش کے لیے صاف پیغام ہے۔ اس فرمان سے اس کی شہادت ملتی ہے۔

اَفَلَمْ يَيْأَسِ الَّذِيْنَ آمَنُوْا اَنْ لَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَهَدَى النَّاسَ جَمِيْعًا۔ (کیا پس ایمان والے اس بات سے مایوس نہیں ہوئے کہ اگر اللہ چاہتا تو سب لوگوں کو ہدایت دے دیتا)

چنانچہ اہلِ ایمان ان لوگوں کی ہدایت سے مایوس ہو گئے۔ اب ان سے اس کی امید نہ رکھی اور ایک قول کے مطابق يَيْأَسْ کا معنی ہے يَعْلَمْ۔ یعنی اللہ کے بتانے کے باعث انہیں اس کا علم ہو گیا اور اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ:

افلم يتبين الذين آمنوا۔ (کیا ایمان والوں کو ابھی تک ظاہر نہیں ہوا)

اس لیے کہ وضاحت سے بیان کر دیا گیا۔ چنانچہ اسے مان لو اور اسے تسلیم کرو اور ان سے اعراض کرو، تاکہ ان سے بچ جاؤ۔ اسی طرح ایک جگہ فرمایا:

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا۔ (اور اسی طرح ہم نے بعض ظالموں کو بعض کا دوست بنایا)

اور فرمایا:

تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ۔ (ان کے قلوب مشابہ ہوئے)

فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ۔ (چنانچہ وہ اس کی پیروی کرتے ہیں کہ جو اس سے متشابہ ہے)

چنانچہ ثابت قلب و راسخ فی العلم اور اہلِ زیغ کے درمیان بہت فرق ہے۔ اہلِ زیغ فتنہ میں مبتلا ہیں۔ جس نے اصلاح کی اور ندا کی اس کا کارساز ہوا اس کے اور جس نے اللہ سے منہ موڑ لیا اور اسے اس کے نفس کے سپرد کر دیا گیا۔ دونوں میں بہت فرق ہے۔ جس طرح وہ مقاماتِ مقربین تھے، اس طرح یہ اہلِ بُعد کے مقامات ہیں۔ چنانچہ یہ دو حکموں کے تحت آ گئے اور ان سے نہ نکلے۔ بلند درجہ والا اس کے فضل میں ہے اور ادنیٰ درجہ والا اس کے عدل سے خارج نہیں۔ اللہ سبحانہٗ نے اجمال کے ساتھ ان کا وصف بیان کیا۔ فرمایا:

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْ فَضْلِهٖ۔ (تاکہ جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے اپنے فضل سے ان کو جزا دے)

اور عموم کے ذکر میں فرمایا:

لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (تاکہ جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیے انہیں انصاف سے

اہل قرب اور اہل بُعد

اولیاء کرام میں مخصوص فضل ہُوا اور عام مخلوق سے عدل ہُوا۔ کئی ایسے دل ہیں کہ جو صرف اللہ کی گواہی دیتے ہیں، صرف اسی سے سنتے ہیں اور اسی کی طرف رُخ کیے رہتے ہیں۔ اللہ ہی اس کے دل کے عزم و ہمت پر غالب ہے۔ اس کے دل سے وہی قریب ترین ہے۔ ایسے آدمی اور اس کے درمیان بڑا فرق ہے کہ جس کا دل مخلوق سے بھرپور ہے۔ اس کا عزم و ہمت پر غالب ہے۔ اس کے دل سے وہی قریب ترین ہے۔ ایسے آدمی اور اس کے درمیان بڑا فرق ہے کہ جس کا دل مخلوق سے بھرپور ہے اس کا عزم و ہمت رزق ہے۔ انہی کی جانب اس کی نظر ہے۔ اس میں اس کی خواہش ہے۔ انہیں ہی دیکھتا ہے۔ مخلوق ہی اس پر غالب ترچیز ہے اور مخلوق ہی اس کی طرف قریب ترچیز ہے۔ یہ اہل بُعد میں سے ہے۔ اس لیے کہ ان کی صفت بُعد ہے۔ نفس اس پر غالب ہے اس کا اس پر تسلط ہے۔ یہ مقامِ بعد ہے۔ اس کے ساتھ بعد پایا جاتا ہے۔ پہلا گروہ مقربین کا ہے، اس لیے کہ اس کی صفت، قرب ہے۔ اس کا نفس مسخر ہو کر اس کا تابع ہو گیا۔ یہ مقامِ قرب میں ہے۔ قرب اس کے ساتھ ہے۔ اس لیے وہ پروردگار تعالیٰ کی طرف جانے والا ہو اور بُعد اللہ کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا آخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ۔ (چنانچہ اللہ کے ساتھ ساتھ دُوسرا خدا نہ پکارو ورنہ عذاب دیے جانے والوں سے ہو جاؤ گے)

چنانچہ بُعد ایک حجاب ہے اور اہلِ بعد عذاب میں ہے۔ قرب، ایک نعمت ہے اور مقرب آدمی مزید انعام میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حجاب زدہ کے عذاب کے بارے میں فرمایا:

كَلَّآ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ۔ (خبردار بے شک وہ اپنے رب کی طرف سے اس روز روکے جائیں گے پھر مقرر وہ بیٹھنے (پہنچنے) والے ہیں دوزخ میں)

اور مقربین کے آرام میں فرمایا:

فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّةُ نَعِيْمٍ۔ (سو اگر وہ مردہ ہُوا مقرب لوگوں میں تو راحت ہے اور روزی اور جنت نعیم)

یعنی قرب سے انہیں رَوْح ہے۔ حبیب تعالیٰ سے انہیں رَیْحَانٌ ہے اور منعم تعالیٰ کے قرب سے وُہ جنت نعیم میں ہے۔ قرب سے آرام پانے والے ایک بندے نے کیا خُوب کہا: ؎

فَرُوحِی وَ رَیحَانِی اِذَا کُنْتَ حَاضِرًا
وَاِنْ غِبْتَ فَالدُّنْیَا عَلَیَّ مَحَابِسُ
اِذَا لَمْ اُنَافِسْ فِی هَوَاکَ وَ لَمْ اَغَرْ
عَلَیْکَ فَفِیْمَن لَیْتَ شَعْرِی اُنَافِسُ

(ترجمہ: جب تو حاضر ہو تو میری راحت رچین ہے۔ اور اگر تو غائب ہو جائے تو ساری دنیا مجھ پر قید ہی قید ہے۔ جب میں تیری رضا میں رغبت نہ کروں اور تجھ پر مجھے فخر نہ ہو تو پھر میں کس میں رغبت کروں گا)

اور بُعد سے پریشان اور آفت زدہ نے کہا: ؎

فَکَیْفَ یَصْنَعُ مَنْ اَقْصَاهُ مَالِکُہٗ
فَلَیْسَ یَنْفَعُہٗ طِبُّ الْاَطِبَّاءِ
مَنْ غُصَّ دَاوَی بِشُرْبِ الْمَاءِ غَصَّتَہٗ
فَکَیْفَ یَصْنَعُ مَنْ قَدْ غُصَّ بِالْمَاءِ

(ترجمہ: جس کو اس کے آقا نے دُور کر دیا۔ وہ کیا کرے؟ اسے کسی طبیب کا علاج فائدہ نہیں دیتا۔ جس کا کھانے گلا بند ہونے لگے۔ وہ پانی پی کر گلا کھول لیتا ہے۔ مگر جس کا گلا پانی پینے سے ہی بند ہو وہ کیا کرے؟)

جو آدمی اپنے پروردگار کی عبادت میں ڈوب چکا اس کے اور جو مخلوق کی خدمت میں غرق ہے ان میں کس قدر فرق ہے؟ لوگوں سے کٹ جانے والے اور وساوس میں ڈوبنے والے کے درمیان کس قدر فرق ہے؟ اپنے آقا کے عشق میں گم شدہ بندے اور دنیا سے معانقہ کرنے والے خواہش پرست آدمی میں کس قدر فرق ہے؟ نیکی کے باعث یہ اہلِ قرب کے مقامات ہیں اور برائی کے باعث ان کے برعکس دُوسروں کا مقام بُعد اور دُوری کا ہے۔

مقرّبین کے تین گروہ

جب بندہ حقیقی وصف و تقویٰ سے سرفراز ہو تو وہ اپنے آقا سے تعریف کا مستحق ہے۔ نفسانی لذات کے پرہیز کے باعث اسے پروردگار کا قُرب حاصل ہوتا ہے اور خدائے بزرگ تعالیٰ کی حسنِ تعریف سالکین کا مقصود اور اہلِ رغبت کی انتہائی مراد ہوتی ہے اور یہ درجہ صرف اس کے متقی اولیاٗ اور گروہِ مقلحین اور صالح بندوں کو حاصل ہوتا ہے یہ سلیم و طاہر دلوں والے اور خشوع و ذکر سے معمور اعضاٗ اور قابلِ فخر عقل و دانش کے سالک ہوتے ہیں۔ ان اہلِ یمین مقربین کے تین طبقات ہوتے ہیں:۔

۱۔ اہلِ علم ۲۔ اہلِ محبت ۳۔ اہلِ خوف

ہیں اس کے مقرب اولیاء ہیں۔ انہیں بلایا۔ یہ حاضر ہو گئے۔ ان سے علم کی حفاظت کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے حفاظت کی اور ان سے گواہی طلب کی۔ انہوں نے گواہی دی۔

وہ ان کا رہنما اور یہ اس کے دلائل ہیں۔ وہ بندوں کے جامع اور وہ اپنے ہاں ان کا جامع ہے۔ اس کے پاس ابدال، انبیاء، علمائے ربانیین، ائمہ متقین، ارکان دین اور صاحبان قوت و تمکین ہیں۔ انہیں کتاب مبین کا کشف حاصل ہوا۔ انہیں اس کی طرف راہ ملی۔ وہ سیدھی راہ پر ہیں۔ ان کے قلوب پر براہ راست نظر ہے۔ وہ مزید انعامات سے سرفراز اور صبح و شام فضل و کرم سے تحفہ یاب ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے عام مومنین یعنی قراء، عباد، اہل مجاہدہ، اہل زہد و اوراد کو بھی و راثت کا حصہ ملا۔ اعمال و سیاحات میں ان کے اندر امتیاز ہے۔ ان کے سکون قلب اور ان کے اطمینان کی خاطر ان کے لیے کھلی آیات کا اظہار ہوا تاکہ شبہات آکر انہیں ہلاکت میں نہ ڈال دیں اور شہوات انہیں اس مقام سے لوٹا نہ دیں۔ چنانچہ وہ ظاہر سے اظہار کے ساتھ منہمک ہوئے، باطن سے ظواہر کے ساتھ وہ محجوب ہوئے حجاب میں رہ گئے۔ اور اسباب پر انہیں سکون ہوا۔ مقامات پر ٹھہر گئے۔ ملکوت و آیات سے پردہ پوش ہوئے۔ اہل دنیا سے وہ قابل رشک مرتبے ہیں اور اہل رفعت سے وہ مرحوم احیاء ہیں۔ اس لیے کہ ان کا قرب، مقربین کے بعد کا ہے۔ ان کا کشف، مشاہدہ کرنے والوں کے نزدیک حجاب ہے اور مواجہین کے نزدیک ان کی عطائیں رد ہیں مگر جب انہوں نے اپنے نفوس کی طرف دیکھا، اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و کرم کے باعث ان کی طرف نظر فرمائی۔ چنانچہ انہیں اپنے حال میں پرسکون بنا دیا اور انہیں اپنے مقام میں راضی کر دیا تاکہ ان کے دل ٹوٹ نہ جائیں اور ان کی عقلیں حیران نہ رہ جائیں۔ وَالسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ (اور سبقت کرنے والے ہی پہلے ہوتے ہیں) یہی بلند ترین مواجہین ہیں اور یہی سنبوط کرنے سے وابستہ ہیں۔

انہوں نے اللہ سبحانہ کی طرف دیکھا تو اس نے ان کی طرف نظر فرمائی۔ اسی سے سمجھا جیسے ان کی تعریف فرمائی:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ۔ (اور بعض لوگ ایسے ہیں کہ جس نے اپنی جان اللہ کی رضا چاہتے ہوئے بیچ دی)

انہیں مال کی طرف التفات نہیں وہ کسی حال کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ۔ (وہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اس سے محبت کرتے ہیں)

رَضِیَ اللّٰہُ عَنۡھُمۡ وَ رَضُوۡا عَنۡہُ ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ رَبَّہٗ ۔ (اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے یہ اس کے لیے ہے جو اپنے رب سے ڈرے)

چنانچہ وُہ ایسے ہیں جیسے کہ سابقہ کتابوں میں ان کا تذکرہ ہُوا۔

حواریوں نے کہا:

"اسے روح اللہ! ہمیں ان اولیاء اللہ کی تعریف بتائیے کہ جن پر نہ ڈر ہوگا اور نہ وُہ غمگین ہوں گے"!

انہوں نے فرمایا:

"کتاب نے ان کا حال بیان کیا اور انہوں نے اس (کتاب) کا حال بیان کیا۔ انہی سے علم کتاب ہے اور اس سے انہوں نے علم حاصل کیا۔ ان کے ساتھ کتاب قایم ہوئی اور اس کے ساتھ وہ قائم ہوئے انہوں نے دنیا کے باطن کو دیکھا۔ جبکہ لوگوں نے دنیا کے ظاہر کو دیکھا۔ انہوں نے دنیا کا انجام دیکھا جبکہ لوگوں نے دنیا کا (فانی ابھی موجود) حصہ دیکھا۔ چنانچہ جس سے ڈرے کہ وہ انہیں مار دے گا۔ انہوں نے اسے (پہلے ہی) فنا کر دیا۔ اور جس کے بارے میں معلوم کیا کہ وُہ انہیں چھوڑ دے گا۔ انہوں نے (پہلے ہی) اسے چھوڑ دیا۔ چنانچہ (دنیا سے) ان کا پانا، فوت ہونا، بن گیا۔ ان کی اس سے فرحت، محروم ہونا بن گیا۔ اس کا جو حصہ سامنے آیا اسے انہوں نے پھینک دیا۔ اور جو بغیر حق کے ان کے لیے نمودار ہوا۔ اسے پرے ڈال دیا۔ ان کے نزدیک دنیا پرانی ہُوئی۔ اب انہوں نے اس کی تجدید نہیں کی۔ دنیا ان کے سامنے ویران ہُوئی۔ تو انہوں نے اسے آباد نہیں کیا۔ ان کے سینوں میں یہ مرگئی تو انہوں نے اسے زندہ نہیں کیا۔ وُہ اس کے پاس آئے مگر اس کے ذریعہ اپنی آخرت بنائی۔ موت کا ذکر زندہ کیا اور زندگی کا ذکر ختم کر دیا۔ وُہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ اس کے ذکر کو زندہ کرتے ہیں۔ اس کے نور سے منور ہوتے اور اسی سے روشن ہوتے ہیں۔ ان کی عجیب خبر ہے اور ان کے پاس تمام خبروں سے عجیب تر یں خبر ہے۔

اللہ عزوجل نے ان کا وصف بیان کیا۔ فرمایا:

وَ مَنۡ اَصۡدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیۡثًا ۝ (اور اللہ سے سچی بات کس کی؟)

وَ الرَّبّٰنِیُّوۡنَ وَ الۡاَحۡبَارُ بِمَا اسۡتُحۡفِظُوۡا مِنۡ کِتٰبِ اللّٰہِ وَ کَانُوۡا عَلَیۡہِ شُہَدَآءَ ۚ (اور درویش اور عالم اس واسطے کہ نگہبان ٹھہرائے تھے اللہ کی کتاب پر اور اس کے خبردار تھے)

اسی طرح فرمایا:

شَہِدَ اللّٰہُ اَنَّہٗ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ ۙ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ وَ اُولُوا الۡعِلۡمِ قَآئِمًۢا بِالۡقِسۡطِ ؕ (اللہ نے گواہی دی کہ اس کے بغیر کوئی معبود نہیں اور فرشتوں اور علم والوں نے وہی حاکم انصاف کا)

اس میں عجیب مفہوم ہے یعنی بمعنی جمع شہداء۔ گویا اس فرمان میں سابقہ ذکر کردہ وصف بیان کیا کہ:
الصَّابِرِيْنَ وَ الصَّادِقِيْنَ سے لے کر وَ الْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ (اور سحری کے اوقات میں بخشش مانگنے والے گواہی دی اللہ نے کہ اس کے بغیر کوئی معبود نہیں) اور فرمایا:
كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا بَيْنِيْ وَ بَيْنَكُمْ وَ مَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ۔ (کافی ہے اللہ گواہ میرے اور تمہارے درمیان اور جس کے پاس علم کتاب ہے)

چنانچہ یہ وصف ہر وصف پر بڑھ کر ہے اور تمام اوصاف پر حاوی ہے۔ دونوں مقامات کہ دو حال، مراقبہ و مشاہدہ کے ان ساتوں مقامات کو جامع ہیں۔ تمام مقامات کا دارومدار ان دونوں پر ہے۔ ان دونوں سے مزید اکرامات و انعامات آتے ہیں وُہ دو حال یہ ہیں:

۱۔ مقامِ علم سے خوف۔

۲۔ مقامِ علم سے امید و رجاء۔

جو مقام علم باللہ میں ہو، اس کا حال اس کے لیے معاملہ کا ہوتا ہے۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ (بے شک اللہ سے اس کے بندوں میں سے علماء ہی ڈرتے ہیں)

اور ایک جگہ فرمایا:
فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّ لَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا۔ (تو جو اپنے رب سے ملاقات کی اُمید رکھے تو اسے چاہیے کہ اچھا عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے)

فصل ۳۰

قلب اور اہلِ قلوب کے احوال

شیطان دشمن ہے

اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کے فرامین حسب ذیل ہیں:-

۱- وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰاهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰاهَا۔ (اور جی کی اور جیسا اس کو ٹھیک بنایا پھر سمجھ دی اس کو ڈھٹائی کی اور بچ چلنے کی)

یعنی ان میں ڈال دیا۔ اللہ عزوجل نے فرمایا:

۲- وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ۔ (اور ہم نے بنایا انسان کو، اور جانتے ہیں جو باتیں آتی ہیں اس کے جی میں)

۳- فَطَوَّعَتْ لَهٗ نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ۔ (پھر اس کو راضی کیا اس کے نفس نے خون پر اپنے بھائی کے۔ پھر اس کو مار ڈالا)

۴- مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ۔ (وسوسے ڈالنے والے چھپ جانے والے کی بُرائی سے)

۵- اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا اِنَّمَا يَدْعُوْا حِزْبَهٗ۔ (تحقیق شیطان تمہارے واسطے دشمن ہے۔ پس پکڑو اس کو دشمن سوائے اس کے نہیں کہ پکارتا ہے گروہ اپنے کو)

۶- اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ۔ (ان پر شیطان غالب آیا ہے بس ان کو خدا کی یاد بھلا دی)

۷- اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ۔ (شیطان تم سے محتاجی کا وعدہ کرتا ہے اور تمہیں بےحیائی کا حکم دیتا ہے۔)

اللہ سبحانہٗ نے دشمن کے بارے میں خبر دی کہ:

لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ۔ الخ (میں البتہ ضرور ان کے لیے تیرے سیدھے راستہ پر بیٹھوں گا۔ پھر ان کے سامنے سے ضرور آؤں گا۔ الخ)

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ:

"شیطان ابن آدم کے تمام راستوں پر بیٹھا۔ چنانچہ اسلام کی راہ پر بیٹھا اور کہنے لگا: کیا تو اسلام لاتا ہے اور اپنا دین اور اپنا دین اور اپنے آباء کا دین چھوڑ رہا ہے؟ (بندے نے اس کا انکار کیا۔

آخر اسلام قبول کر لیا۔ پھر ہجرت کی راہ پر بیٹھا تو کہا: کیا تو ہجرت کر رہا ہے اور اپنی زمین اور آسمان چھوڑ رہا ہے؟ اس نے اس کا بھی انکار کیا اور ہجرت کر لی۔ پھر جہاد کی راہ پر بیٹھا اور کہا کہ کیا تو جہاد کر رہا ہے اور یہ جان و مال کا جہاد ہے تو مقاتلہ کرے گا اور آخر قتل ہو جائے گا تو تیری بیویاں نکاح کر لیں گی اور تیرا مال تقسیم کر لیا جائے گا؟ (ابن آدم) نے اس کا بھی انکار کیا اور جہاد کیا۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو یہ کرے، پھر مر جائے تو اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ اسے جنت میں داخل کرے۔"

اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں بتایا، فرمایا:

وَ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ الخ

مروی ہے کہ حضرت عثمان بن ابی العاصؓ نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! شیطان میرے اور میری نماز و قرأت کے درمیان حائل ہوا۔"

آپؐ نے فرمایا:

"یہ شیطان ہے اسے خنزب کہا جاتا ہے۔ جب تو اسے محسوس کرے تو اعوذ باللہ پڑھو اور بائیں طرف تین بار تھوک دو۔"

راوی کہتے ہیں۔ میں نے کہا تو اللہ تعالیٰ نے اسے مجھ سے ہٹا دیا۔

حدیث میں آتا ہے کہ

"وضو کے لیے ایک شیطان ہوتا ہے۔ اسے ولہان کہا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل کرو (یعنی اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم پڑھو)۔"

ایک روایت ہے کہ:

"شیطان، ابن آدم میں خون کی جگہ چلتا ہے۔"

اور ایک مشہور حدیث ہے کہ:

"تم میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک شیطان لگا ہوتا ہے۔"

صحابہؓ نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ کے ساتھ بھی؟"

آپؐ نے فرمایا:

"ہاں میرے ساتھ بھی، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلہ میں میری مدد فرمائی اور وہ مسلمان ہو چکا۔"

دل پر پہرا اور وساوس

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے اور یہ بطریق مسند مروی ہے کہ:

" دل میں دو مونس ہیں۔ ایک فرشتہ سے یعنی بھلائی کا وعدہ کرنا اور حق کی تصدیق کرنا اور ایک دشمن کی طرف سے یعنی برائی کا وعدہ اور تکذیب حق اور بھلائی سے وعدہ کرنا۔"

حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے مروی ہے۔ فرمایا کہ

" دل میں دو غم پھرتے ہیں۔ ایک اللہ تعالیٰ کی طرف سے غم اور ایک اس کے دشمن کی طرف سے غم چنانچہ اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم کرے کہ جو اپنے غم کے پاس کھڑا ہو تو جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اس کو کر ڈالے اور جو اس کے دشمن سے ہو تو اس کا مقابلہ کرے۔"

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ کے بارے حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ

" یہ انسان کے دل پر پھیلا ہوتا ہے۔ جب وہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو ہٹ جاتا اور منقبض ہو جاتا ہے اور جب وہ غافل ہوتا ہے تو دل پر پھیل جاتا ہے۔"

حضرت عکرمہؒ فرماتے ہیں:

" مرد میں وسوسے کا مقام اس کے دل اور اس کی آنکھوں میں ہے اور عورت میں اس کی آنکھیں ہیں جبکہ وہ سامنا کر رہی ہو۔ اور اگر واپس جا رہی ہو تو اس کے چوتڑ میں ہے۔"

حضرت جریر بن عبد عدوی نے بتایا کہ میں نے علاؒ بن زیاد سے عرض کیا کہ میرے سینے میں وساوس آتے ہیں۔ فرمایا:

" اس کی مثال ایسے ہے جیسے کہ چوروں نے گزرنے کی نقب لگا رکھی ہو اور وہ اس میں سے جاتے ہوں۔ اگر کچھ ہو تو اس سے سروکار رکھتے ہیں ورنہ اسے چھوڑ کر چل دیتے ہیں۔"

ابو صالحؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ سے انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا:

" بے شک جب بندہ ایک گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں ایک نکتہ لگ جاتا ہے۔ اب اگر وہ رک گیا، اور استغفار کیا اور توبہ کی تو شفاف ہو جاتا ہے اور اگر دوبارہ (گناہ) کیا تو یہ بڑھ جاتا ہے۔ حتیٰ کہ سارے دل پر چھا جاتا ہے۔ یہی وہ ران (زنگ) ہے۔ جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَىٰ قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ۔ (ہرگز نہیں یوں بلکہ ان کے دلوں پر زنگ باندھا ہے اس چیز نے کہ وہ کماتے تھے)

حضرت حصفر بن برقان سے مروی ہے کہ میں نے میمون بن مہران کو یہ فرماتے سنا:

" جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر اس کی وجہ سے سیاہ نکتہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر توبہ کرے

تو اس کے دل سے یہ نکتہ مٹ جاتا ہے۔ اب تو دیکھے گا کہ مومن کا دل ایک آئینے کی طرح صاف ہے کہیں سے شیطان آیا تو فوراً نظر پڑ گیا اور اگر پے در پے گناہ کرتا ہے تو جوں جوں گناہ کرے گا اس کے دل پر سیاہ نکتہ لگتا رہے گا۔ آخر دل پر نکتے پیدا ہو ہو کر سارے دل کو سیاہ کر دیتے ہیں۔ پھر کہیں سے شیطان آئے تو نظر نہیں آتا۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مومن کا دل صاف ہے۔ اس میں ایک چراغ ہے۔ جس کی ضیا پاشی میں دل روشن ہوتے ہیں۔"

حضرت ابو سعید خدریؓ اور ابو کبشہ انماریؓ اور بعض حصہ حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دل چار ہوتے ہیں۔ ایک وہ دل کہ جس میں چراغ روشن ہوتا ہے۔ یہ مومن کا دل ہے۔ ایک سیاہ اوندھا دل ہے یہ کافر کا دل ہے۔ ایک غلاف میں لپٹا اور غلاف پر بندھا دل ہے یہ منافق کا دل ہے۔ ایک چوڑا اور عریض دل ہے۔ اس میں ایمان و نفاق ہے اس میں ایمان کی مثال ایسے ہے جیسے سبزی ہو، اور اسے عمدہ پانی کھینچتا ہو اور نفاق کی مثال ایسے پھوڑے کی طرح ہے کہ جسے پیپ اور کچلہو کھینچتا ہو۔ اب ان میں سے جو بھی غالب آ گیا اسی کا حکم ہو گا۔"

ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ:

"اس پر غالب آئے گی تو وہ اسے لے جائے گی۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۔ (اور اللہ سے زیادہ احسن قول کے لحاظ سے کون ہے)

اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۔ (تحقیق جو لوگ کہ پرہیزگاری کرتے ہیں۔ جب لگتا ہے ان کو وسوسہ شیطان سے، یاد کر لیتے ہیں۔ پس ناگہاں وہ دیکھنے لگتے ہیں)

چنانچہ یہ بتایا کہ ذکر اللہ سے ہی قلبی جلا حاصل ہوتا ہے۔ اس سے دل کی نگاہ تیز ہوتی ہے اور تقویٰ ہی ذکر کی راہ ہے۔ اس کے ذریعہ بندہ ذکر اللہ کر سکتا ہے۔ چنانچہ آخرت کا دروازہ تقویٰ ہے۔ جیسے کہ خواہشات دنیا کا دروازہ ہے اور اللہ تعالیٰ نے ذکر کا حکم دیا اور فرمایا کہ یہ تقویٰ کی کنجی ہے۔ اس لیے کہ تقویٰ یعنی گناہوں سے پرہیز اور ورع کا ذریعہ یہی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۔ (اور جو اس میں ہے اسے یاد کرو تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ)

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ ۝

(اے آدمی کس چیز نے تجھے فریب دیا تیرے پروردگار کرم کرنے والے کے ساتھ، جس نے تجھ کو پیدا کیا پھر تندرست کیا۔ پھر برابر کیا تجھ کو)

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۔

(بے شک ہم نے انسان کو سب سے بہترین تقویم میں پیدا کیا)

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔

(اور ہم نے ہر چیز سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم نصیحت پکڑو)

چنانچہ ظاہری آلات ... بری، تعدیل اور ازدواج وتقویم ہے اور جسم وقلب کے حواس اعراضِ باطن ہیں۔ چنانچہ ظاہری صفات آلاتِ جسم ہیں اور باطنی مفاہیم، اعراضِ قلب ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی حکمت سے ہموار اور اپنی مشیت سے انہیں برابر کیا اور اپنی صنعت سے اسے پختہ اور درست فرمایا۔ ان میں سے پہلا نفس و روح ہے۔ یہی دونوں دشمن وفرشتہ سے ملاقات کے مقام ہیں اور فسق و تقویٰ سے ملاقات کے لیے بھی دو شخص ہیں۔ دونوں جگہوں میں انہی سے دو متمکن ہونے والی غرضیں ہیں۔ یہ دونوں عقل وخواہش ہیں جو کہ مشیتِ حاکم کے دو حکم ہیں اور یہ دونوں توفیق و اغوا ہیں۔ ان سے ہی رحمٰن کی رحمت سے مخصوص ہو کر دل میں دو نور جھلکتے ہیں یعنی علم و ایمان (کے نور)۔ یہ دل کے آلات اور اس کے حواس ہیں اور اس کے غائب معانی و آلات ہیں اور ان تمام آلات میں دل کی حیثیت ایک بادشاہ کی ہے اور یہ اس کے لشکر ہیں جو کہ اس کے سامنے حاضر ہوتے ہیں یا ایک صاف شدہ آئینے کی طرح ہے اور اس کے گرد یہ اس کا آلہ ہے۔ ظاہر ہوتا ہے تو اسے دیکھتا ہے اور اس میں اثر انداز ہو کر اسے پا لیتا ہے۔ مختصر طور پر اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام خواطر چھ ہیں یعنی دل کے حدود و اثرات، اس کے بعد خزائنِ غیب اور ملکوتِ قدرت اور یہ اللہ تعالیٰ کے مضبوط لشکر ہیں اور اس سے اس کی سلطانیت واضح ہے۔

خزائنِ ملکوت سے ایک خزانہ دل کا ہے۔ مقلب القلوب نے رغبت و رہبت کے لطائف سے اس میں ڈال دیا۔ اس میں عظمت و جبروت کے انوارات پھیل گئے جو کہ ملکوتِ ادنیٰ اور اہلِ رفیق اعلیٰ کیلیے چاہا۔

خواطرِ ستّہ

چنانچہ ان کی وضاحت یہ ہے کہ (خواطرِ ستّہ) میں سے پہلا نفس کا خیال اور دوسرا دشمن کا خیال ہوتا ہے۔ ان دونوں خواطر کو عام مومنین معدوم نہیں کر سکتے۔ یہ دونوں مذموم ہیں اور ان دونوں کے لیے برا ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ صرف خواہشِ نفس اور ضدِ علم (جہالت)

کی وجہ سے آتے ہیں اور تیسرا رُوح کا خیال اور چوتھا فرشتے کا خیال آتا ہے۔ ان دونوں خواطر کو خواص اہلِ ایمان معدوم نہیں کر سکتے۔ یہ دونوں محمود ہوتے ہیں اور حق کے ساتھ ہی آتے ہیں اور جس پر علم دلالت کرے اس کو لے کر آتے ہیں۔ پانچواں عقل کا خیال ہے۔ یہ مذکورہ بالا چاروں خواطر کے درمیان متوسط ہے۔ یہ قابلِ مذمت لوگوں کے قابل بھی ہے۔ چنانچہ اس صورت میں بندے کے خلاف حجت بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ عقل میں تمیز اور معقول کی تقسیم کی صلاحیت ہے۔ اس لیے کہ بندہ اپنی خواہش سے شہوت میں پڑتا ہے اور یہ اس کے لیے ایک امتحان ہے۔ عقل نہ ہونے اور جبر ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ اس لیے اس پر یہ مشکل نہیں، اور قابلِ مدح لوگوں کے لیے بھی قابل ہے۔ چنانچہ یہ ان کے لیے گواہ اور خیالِ رُوح کے لیے تائید کرنے والا ہو جاتا ہے اور حسنِ نیت اور صدقِ ارادہ میں بندے کو ان پر ثواب دیا جاتا ہے۔

عقلی خاطر (خیال)، کبھی نفس دشمن کے ساتھ ہوتا ہے کبھی روح و فرشتہ کے ساتھ ہوتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کی صنعت و اتقانِ صنعت کی حکمت ہے تاکہ وجودِ معقول اور صحتِ شعور و تمیز کے باعث بندہ خیر و شر میں داخل ہو جائے اور ان کی جزا و سزا کا انجام اسے پہنچ جائے کیونکہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے اس بدن کو اپنے احکام جاری ہونے اور اپنی حکمت کے طور پر مشیت نافذ کرنے کا محل ہے۔ اسی طرح عقل کو خیر و شر کے لیے سواری بنایا۔ خزانۂ جسم میں ان دونوں کے ساتھ یہ جاری رہتی ہے۔ اس لیے کہ یہی جائے تکلیف اور مقامِ کار ہے۔ بندے کی صورت پر انہی مفاہیم سے لذت یا عذاب ہوتا ہے۔ چنانچہ عقل غائب نہیں ہوتی کہ بندہ عقل سے خالی رہ جائے۔ اور نہ ہی شہوت مفقود ہوتی ہے کہ نفس ہی گم ہو کر رہ جائے۔ اس لیے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی حجت بندے پر مضبوط ہو جاتی ہے کیونکہ عقل حجت کی گواہ ہے اور نفس میں شہوت ایک مقامِ ابتلاء ہے اور دل میں نیت ایک طریقِ حجت ہے اور امر و نہی کی جزا آنے کا اصل سبب یہی ہے۔ چنانچہ طبعی طور پر عقل میں امتیاز کی قوت ہے اور جبلی طور پر وہ حسن و قبح پر آگاہ ہے۔ نفس کی جبلت شہوت پر ہے اور طبعی طور پر خواہش کی طرف مائل ہوتا ہے اور یہ بات دراصل اس کے عطا کردہ ان کا حصہ ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی۔ (ہر چیز کو اس کی خلقت عطا کی پھر ہدایہ دی)

اُولٰٓئِکَ یَنَالُهُمْ نَصِیْبُهُمْ مِّنَ الْکِتٰبِ۔ (وہ اپنا حصہ کتاب سے حاصل کرتے ہیں)

کُتِبَ عَلَیْهِ اَنَّهٗ مَنْ تَوَلَّاهُ فَاَنَّهٗ یُضِلُّهٗ وَیَهْدِیْهِ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیْرِ۔ (اس پر لکھا گیا جس نے اسے دوست بنایا اسے شیطان گمراہ کرے گا اور اسے دوزخ کے عذاب کی طرف لے جائے گا)

چھٹا خاطر (خیال) یقین کا خاطر ہے۔ یہ رُوحِ ایمان اور مزید علم ہے۔ یہ دونوں اس طرف آتے اور اسی سے صادر ہوتے ہیں۔ یہ خاطر خواص کے لیے مخصوص ہے۔ اہلِ یقین کے علاوہ اسے کوئی نہیں پا سکتا۔ یعنی شہداء اور صدیقین ہی اسے پا سکتے ہیں۔ یہ چاہے مخفی اور دقیق ہو مگر یہ حق ہی ہوتا ہے اور مرادِ مختار کے لیے باعلم اختیار کے سوا اس سے حصہ نہیں ملتا۔ چاہے اس کے دلائل بہت ہی لطیف ہوں اور اسلوبِ استدلال مخفی ہو مگر یہ خاطر اس کے منظور دبرار پر پوشیدہ نہیں۔ ذکریٰ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہی کا وصف فرمایا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہی کی طرف فیصلہ دے دیا۔ فرمایا:

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ۔ (بیشک اس میں البتہ عبرت ہے اس کے لیے کہ جس کے پاس دل ہو)

یعنی جس دل کی حفاظت کی اللہ تعالیٰ نے ذمہ داری لے لی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو تیرے سینہ میں جم گئی اسے ہی پکار و اور دلوں میں چھبنے والی چیز گناہ ہے"۔

یعنی جو اس میں اپنا اثر کر ڈالے اور رقت، صفائی، نرمی اور لطافت کے باعث اس میں کھٹکتی ہو۔ ایک آدمی نے نیکی اور گناہ کے بارے میں پوچھا جو اعمالِ خیر اور اعمالِ شر کی جڑ ہوتی ہے تو جواب دیا:

"اپنے دل سے پُوچھ لے۔ چاہے مفتی لوگ تجھے فتویٰ دیں"۔

یعنی اہلِ تقویٰ اپنے ظاہری علم کی برکت سے رخصت و تاویل کا مفہوم سمجھتے ہیں اور تو اُن سے بالاتر علم رکھتا ہے، تو اپنے علم راز کے ذریعہ حقیقت و عزیمت کا طالب ہے۔ اہلِ ظاہر بھی اللہ تعالیٰ کا حکم، زبانِ ظاہر کے علم سے جانتے ہیں جو کہ ظاہری علماء پر حجت ہے اور تیرا دل فقیہ اور نورِ ایمان سے منور ہے تو اس کے ذریعہ دیکھتا ہے یا اللہ تعالیٰ کا باطنی حکم، قلبِ باطن کے علم سے کلام کرتا ہے جو کہ حقیقتِ ایمان ہے اور اس کا نفع باطنی علماء کو حاصل ہے اور یہی مناسب بھی تھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سائل کو فقیہ کی طرف ہی جانے کا حکم فرماتے۔ اب اگر علمِ قلب ہی حقیقتِ فقاہت نہ ہوتی تو اہلِ ظاہر کے فتویٰ سے اس کی طرف جانے کا حکم کیوں فرماتے؟ کہ مفتیوں کی بجائے دل سے پُوچھو۔ اس لیے قلب کا علم ہی علم کا علم ہوا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دے کر اسے ہی اہلِ فتویٰ پر فیصل بنایا اور باطن کا عالم دراصل علماء کا عالم ہُوا۔ اس لیے کہ اسے علماءِ (ظاہر) کی تقلید کافی نہیں۔

دوسری حدیث میں آتا ہے:

"نیکی وُہ ہے کہ جس پر تیرا دل مطمئن ہو جائے اور اس طرف تیرا جی پرسکون ہو۔ چاہے تجھے فتویٰ دیں اور تجھے فتویٰ دیں"۔

یہ اس دل کی تعریف ہے کہ جس کو ذکر کی برکت سے مکاشفہ حاصل ہو چکا اور ایسے نفس مطمئنہ کی توصیف ہے کہ جو مزید سکون و بھلائی سے چین پاتا ہے جیسے کہ صراحت و دلالتِ کلام سے اہلِ ایمان کے قلوب کی تعریف کی گئی۔ صراحت سے یہ فرمایا:

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ تَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔

(جو ایمان لائے اور ان کے دل اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں۔ یاد رکھو اللہ کے ذکر سے ہی دلوں کو اطمینان ملتا ہے)

نیز فرمایا:

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ فِیْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِیْنَ لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِهِمْ۔

(وہی ہے جس نے مومنوں کے دلوں میں سکینت نازل کی تاکہ وہ بڑھ جائیں ایمان میں ساتھ ایمان کے)

اور دلالتِ کلام سے بھی ثابت ہے۔ تدبر کرنے سے فوراً معلوم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حجاب زدہ اعداء کے قلوب کے بارے میں فرمایا:

كَانَتْ اَعْیُنُهُمْ فِیْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِیْ وَ كَانُوْا لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ سَمْعًا۔

(کہ ان کی آنکھیں میری یاد سے پردے میں تھیں اور وہ سن نہیں سکتے تھے)

اسی طرح فرمایا:

اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَیْبِ فَهُوَ یَرٰی۔

(کہاں اس کے پاس علمِ غیب ہے کہ وہ دیکھتا ہے)

ان آیات پر تدبر سے معلوم ہوا کہ اس کے اولیاء اس کی اطاعت کرتے ہیں، اس سے سنتے ہیں اور اس کے ذکر کے باعث انہیں مکاشفہ حاصل ہے۔ اس کے (پردہ) غیب کی جانب نظر کناں ہیں۔ ایک جگہ فرمایا:

مَثَلُ الْفَرِیْقَیْنِ كَالْاَعْمٰی وَ الْاَصَمِّ۔

(دو فریقوں کی مثال جیسے کہ ایک اندھا ہوا اور بہرا ہوا)

یہ فریق ایسا ہے کہ سیدھی راہ سے ہٹ کر دوسرے راستوں پر چل پڑا اور سیدھی راہ سے بھٹک گیا اور سننے دیکھنے والا گروہ ہدایت یافتہ لوگوں کا ہے جو کہ سیدھی راہ پر چلتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَا كَانُوْا یَسْتَطِیْعُوْنَ السَّمْعَ وَ مَا كَانُوْا یُبْصِرُوْنَ۔

(نہ وہ سن سکتے تھے اور نہ ہی وہ دیکھتے تھے)

اَلْقَى السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِیْدٌ۔

(وہ متوجہ ہو کر کان ہی لگا دیتا تھا)

اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۟ وقف

(اگر ہو اللہ ارادہ کرتا یہ کہ گمراہ کرے تم کو ، وہ پروردگار تمہارا ہے)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قلب کی صفت میں صاف خلاصہ بنا دیا۔ فرمایا :

"تقویٰ یہاں ہے اور دل کی جانب اشارہ کیا"

گناہوں کی وجہ سے قفل زدہ دلوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

لَوْ نَشَآءُ اَصَبْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ۔

(اگر ہم چاہیں ہم ان کو ان کے گناہوں کے ساتھ پکڑیں اور اُن کے دلوں پر مہر کر رکھیں۔ پس وہ نہیں سُنتے)

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اسْمَعُوْا۔

(اور اللہ سے ڈرو اور سنو)

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ

(اور اللہ سے ڈرو اور اللہ نہیں سکھاتا ہے)

دل ایک بہترین ناصح ہے

حدیث میں آتا ہے :

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے پر بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے اپنے نفس سے زجر دینے والا دے دیتا ہے اور اپنے دل کا واعظ نصیب کر دیتا ہے"

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ :

"جس کا دل اس کے لیے نصیحت کرنے والا ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف ایک محافظ ہے" اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تشریح میں فرمایا :

رَبَّنَاۤ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ۔

(اے ہمارے رب ہم نے سنا ایک ندا کرنے والے کو جو ندا کر رہا ہے ایمان کی)

کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہم نے اپنے قلوب سے سُنا اور ان کے برعکس گمراہ لوگوں کے بارے میں فرمایا :

اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۭ بَعِيْدٍ۔

(وہ دُور جگہ سے پکارے جاتے ہیں)

یعنی وہ اپنے قلوب سے دُور ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے توبہ میں میلان قلوب کے بارے میں فرمایا :

اِنْ تَتُوْبَاۤ اِلَى اللّٰهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا ۚ

(اگر تم دونوں اللہ کی طرف توبہ کرتے ہو تو بے شک تمہارے قلوب کج ہو گئے ہیں)

اسی طرح فرمایا :

وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا۔ (اور جو انہوں نے حاصل نہیں کیا۔ اس کا انہوں نے ارادہ کیا)

فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ خَيْرًا لَّهُمْ۔ (سو اگر وہ توبہ کریں تو یہ ان کے لیے بہتر ہو گا)

اور دلوں کے اندھاپن کے ایک حقیقت ہونے کے بارے میں فرمایا:

فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى الْاَبْصَارُ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوْبُ الَّتِيْ فِي الصُّدُوْرِ۔ (سو وہ نہیں کہ آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں ولیکن دل اندھے ہو جاتے ہیں جو کہ سینوں میں ہیں)

چنانچہ اہل دل، مخلوق میں سے کسی واعظ کے بغیر نصیحت حاصل کرتے ہیں اور کسی ظاہر زجر کرنیوالے کے بغیر زجر پذیر ہو جاتے ہیں۔ ان تمام مذکورہ خواطر کو اہلِ ایمان معدوم نہیں کرتے اور دل اللہ تعالیٰ کے خزانہ ہائے غیب میں سے ایک خزانہ ہے اور یہ مفاہیم اللہ تعالیٰ کے عساکر ہیں جو کہ دل کے ارد گرد قیام پذیر ہیں۔ ان میں سے جو چاہتا ہے مخفی رکھتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے ظاہر کر دیتا ہے۔ اور ان میں سے جس سے چاہتا ہے دل کو انبساط عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے انقباض دیتا ہے۔

اور جس دل میں یہ تین مفاہیم جمع ہو جائیں، اس سے خاطرِ یقین جدا نہیں ہوتے، البتہ مفاہیم کے ضعیف و رقیق ہونے کے باعث خاطر میں ضعف و اخفائ آسکتا ہے اور ان کے قوی ہونے کے باعث یقین بھی قوی اور نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ تینوں جائے یقین ہیں:

۱۔ ایمان اس کا مقامِ یقین، جس مقام پر آگ کی رکاوٹ ہوتی ہے۔

۲۔ علم، یہ جائے چقماق کے مقام پر ہے۔

۳۔ عقل، یہ تیز رو گھوڑے کے مقام پر ہے۔ جب یہ اسباب جمع ہو جائیں تو دل میں خاطرِ یقین قوت اور جودت و صفائی میں قلب کی مثال قندیل میں رکھے ہوئے چراغ کی سی ہے جو کہ مقام عقل کی طرف ہو اور تیل میں اسی میں علم کی جگہ ہے اور یہی چراغ کی روح ہے۔ اس کی مدد سے یقین نمایاں ہوتا ہے، اور ایمان کی جگہ فتیلہ ہے۔ یہ اصل ہے اور اسی سے (اس کی روشنی) ظاہر ہوتی ہے۔ فتیلے کی قوت و جودت کے مطابق ہی یقین بھی قوی ہو گا۔ ایسے ہی تقویٰ اور کمالِ خوف ہیں ایمان کی مثال ہے اور جس قدر تیل صاف اور رقیق ہو گا، اسی قدر آگ روشن ہو گی۔ یہ یقین ہے۔ زہد اختیار کرنے اور خواہشات ختم کرنے کے بعد علم کی یہی مثال ہے۔ اب علم توحید کی جگہ ہوا۔ چنانچہ موحد کو مقام کی مقدار پر ہی توحید میں رسوخ حاصل ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ۔ (سو جان لے کہ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں)

ایک جگہ فرمایا:

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ (سو جان لیں کہ یہ اللہ کے علم سے نازل کیا گیا اور یہ کہ اس کے بغیر کوئی معبود نہیں)

چنانچہ توحید پر علم کو مقدم کیا اور یہ اول بن گیا۔ اب علم الٰہی اور دنیا میں زہد پر جس قدر قلب زیادہ ہوگا اسی قدر اس کا ایمان زیادہ اور بلند ہوگا۔ اس لیے کہ اب وُہ اوپر سے دیکھ رہا ہے کہ جس کو دوسرا نہیں دیکھتا۔ وہ اتساعِ (قلب بالعلم باللہ) سے جان رہا ہے جس کو دوسرا نہیں جانتا۔ چنانچہ مومن اس پر خدا کی کبریائی کا اقرار کرے گا اور یہ اس کے مزید ایمان اور قوت ایمان کا باعث ہوگا۔ پھر جس جس پر وہ ایمان لایا اس کا مشاہدہ کرے گا اور یہ بات قوتِ نفس اور وسعتِ مشاہدہ سے ہوگی۔

اور جوں جوں اللہ اور اس کی صفات اور اس کے احکام ملکوت کے بارے میں بندے کا علم ناقص اور کم ہوگا۔ اسی قدر اس کا ایمان کم ہو جائے گا اور چونکہ اس پر اسباب کی محبت غالب آگئی تو اب وہ ایمانیات کی حجاب کے پردے سے گواہی دے گا۔ اور پردے کے پیچھے سے ہی کلام سنے گا۔ اس لیے کہ نیکی کی طرح نسبتِ دکھلانے میں وُہ کمزور پڑ گیا۔ اس سے اس کا ایمان بھی کمزور ہُوا، اس کا مشاہدہ تخیل بن گیا اور حقیقت نہ رہا۔ ایک نے صفاتِ الٰہی اور قدرتِ آیاتِ خداوندی کے ایک لاکھ معانی جان لیے۔ پھر ان سب کا قریب سے مشاہدہ کیا (اور دوسرے نے) مثلاً دس معانی معلوم کیے تھے۔ پھر پردے کے پیچھے ان کا مشاہدہ کیا۔ اب یہ دونوں مومن ہیں مگر قرب و بُعد اور رفعت اور کمی میں دونوں کے درمیان دس اور ایک لاکھ کا فرق ہے۔ چنانچہ مومن کا ایمان دس دس کے حساب میں رہتا ہے یعنی دس سے بڑھتا رہتا اور ایک لاکھ سے گھٹتا رہتا ہے اور اس کے درمیان دائرہ رہتا ہے۔

ایمان کے درجات

ہماری عقول کے مطابق اس کی مثال یہ ہے کہ ایک آدمی آپ سے یہ کہے کہ "میرے پاس فلاں آدمی ہے"۔ اب تجھے علم حاصل ہو گیا کہ اس کے پاس فلاں ہے مگر یہ علم یقین نہیں ہے۔ اس لیے کہ ممکن ہے اسے شبہ ہو گیا ہو یا اس کے پاس فلاں تھا مگر اب وُہ نکل گیا اور اب وُہ یہاں نہ ہو۔ یہ ایک مسلمان کے ایمان کی مثال ہے۔ اسے علم خبر ہوتی ہے۔ یہ خبر نہیں۔ پھر تم وہاں آئے اور اگر پردے کے پیچھے سے اس کا کلام سنا تو جان لیا کہ اب وُہ یہیں ہے۔ اس لیے کہ تو نے اس کا کلام سنا اور اس کے موجود ہونے پر اسے دلیل تسلیم کیا مگر یہ علم بھی حقیقی نہیں۔ اس لیے کہ آوازوں میں اشتباہ ہو سکتا ہے اور باہم میں التباس ہو سکتا ہے اور اگر تو یہ کہے کہ وہ میرے پاس نہیں۔ وہ تو دوسرا تھا اور اس کی آواز فلاں سے مشابہ تھی تو احتمال کے پاس شُبہ ہو گیا۔ اس لیے ابھی تک آپ کے

پاس ایسا یقین عین نہیں کہ میرا قول رد کر سکو اور نہ ہی شہادتِ نگاہ ہے کہ مجھ پر انکار ہو سکے۔ یہ عام مومنین کے ایمان کی مثال ہے۔ یہ ایمان خبر ہے۔ اس میں استدلال یقین تو ہے مگر ظن کا اختلاط بھی ہے۔ البتہ یہ مشاہدہ عارفین کے علاوہ کا ایمان ہے۔ اس لیے کہ لگا ہے اس میں تخیل و تشبیہ بھی آ جاتی ہے اور شہادتِ یقین اس کو دُور نہیں کر سکتے۔ پھر تو "وہ میرے پاس ہے" کے قول کے بعد تو اندر داخل ہُوا یا کلام سننے کے بعد اندر گیا۔ تو نے اسے بیٹھے دیکھا۔ تیرے اور اس کے درمیان کچھ حجاب نہ رہا۔ یہ یقینِ معرفت ہے، اور شہادتِ اہل یقین ہے۔ اس وقت ہر طرح کا شبہ دُور ہو گیا۔ خبرِ علم متحقق ہو گئی۔ یہ اہل یقین کے ایمان کی مثال ہے اور اس میں عام مومنین کا ایمان بھی داخل ہے۔ جس میں علم خبر متحمل ہوتا ہے اور حجاب کے پرے سے مشتبہ کلام سنا جاتا ہے۔ وہ بھی اس میں داخل ہے۔ ایمان کا لفظ ان سب پر آتا ہے۔ البتہ پہلے سے کہا گیا تو اس نے جان لیا اور تصدیق کی۔ دوسرے نے سن کر استدلال کیا مگر مشاہدہ نہ تھا کہ قطعیت ہو سکے۔ تیسرے نے دیکھا اور علم قطعی حاصل کیا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس (آخری) کیلیے مزید کی شہادت دی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"خبر، دیکھنے کی طرح نہیں ہوتی"۔

اور فرمایا:

"خبر دینے والا، دیکھنے والے کی طرح نہیں ہوتا"۔

اس کی مثال ایسے ہے کہ تم دن کو کوئی چیز دیکھو تو اس کی حقیقت اور جگہ جان جاؤ گے۔ پھر تم اس کے بارے میں غلطی نہ کرو گے مگر رات میں اس چیز تک جانا چاہو تو چاہے نظر نہ آئے مگر استدلال سے اس کو جان لو گے اور تمہیں اس کے موجود ہونے کا حسنِ ظن ہو گا یا تم سمجھتے ہو گے کہ یہ وہی چیز ہے اور اپنی جگہ سے نہیں ہٹتی۔ اسی طرح غائب اشیأ کے بارے میں دلائل ہوتے ہیں اور مشاہدہ اور معاینہ سے یہ دلائل ختم ہو کر (علم الیقین) حاصل ہو جاتا ہے۔ دیکھنے سے چاند کی روشنی میں کوئی چیز دیکھی جائے تو اس کا شبح (شخصیت) اور اشکال باقی رہتا ہے اور اگر سورج کی روشنی میں وہی چیز دیکھی جائے تو نمایاں ہو کر نظر آتی ہے۔ نورِ یقین اور نورِ ایمان کی یہی مثال ہے۔

اہلِ ایمان کے حقیقی کمال اور دخول در اسمِ ایمان کے درمیان فرق یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ مثلاً چار رکعتوں کی نماز کھڑی ہوئی۔ اب ایک آدمی آیا اور تکبیر تحریمہ میں مل گیا۔ پھر دوسرا آیا اور رکوع میں مل گیا۔ پھر ایک اور آیا اور دوسری رکعت میں ملا۔ پھر تیسرا آدمی آ کر تیسری رکعت میں ملا۔ پھر چوتھا آدمی آ کر چوتھی رکعت میں ملا۔ ان سب نے نماز پڑھی اور جماعت میں مل گئے اور اس کی فضیلت بھی پائی۔ اس لیے کہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے نماز سے ایک رکعت پائی اس نے نماز پالی"

البتہ جس نے پہلی رکعت میں ہی جماعت میں شرکت کی۔ وہ دوسری یا تیسری رکعت میں شریک ہونے کی طرح نہیں ہے اور اسی طرح جس نے تکبیر تحریمہ میں ہی شرکت کر لی وہ قیام وغیرہ کھونے والے کی طرح نہیں۔ ان دونوں کی فضیلت میں بڑا فرق ہوگا۔ اسی طرح اہلِ ایمان کے کمالات و حقائق میں فرق ہوتا ہے۔ اگرچہ اسم و معنی میں یکساں ہیں (یعنی اگرچہ لفظ ایمان سب پر بولا جاتا ہے مگر قوت و ضعف کے لحاظ سے فرق ہوتا ہے) اور آخرت میں بھی اسی طرح فرق ہوگا۔ حدیث میں آتا ہے کہ یوں کہا جائے گا: "جس کے دل میں ایمان کا ایک ذرہ مثقال بھر بھی ہے اسے بھی (دوزخ سے) نکال دو۔ اور (جس کے دل میں) نصف مثقال، چوتھائی مثقال اور جَو بھر اور ذرہ بھر ایمان ہے (اسے بھی نکال دو) اب ذرّہ سے لے کر مثقال تک ان کے ایمانوں میں فرق پایا گیا۔ یہ سب دوزخ میں تھے اور سب کے مقامات بھی مختلف تھے۔

اس میں اس پر دلیل آگئی کہ جس کے دل میں ایمان کا ایک دینار ہوگا وہ اسے دوزخ میں جانے سے رکاوٹ نہ بن سکے گا۔ اس لیے کہ اس نے گناہوں کے بڑے بوجھ اٹھا رکھے ہوں گے۔ اور جس کے دل میں ایمان کا ایک ذرہ بھی ہوگا وہ دائمی دوزخ میں نہ رہے گا۔ اس لیے کہ کچھ یقین تو ہے ہی۔ اور اگر دینار سے زیادہ ایمان حاصل ہو گیا تو آگ کو اس پر تسلط نہ مل سکے گا اس لیے کہ وہ ابرار میں سے ہے اور جس کے دل میں ایمان کا ایک ذرہ بھی نہ ہو۔ وہ چاہے شکل و صورت میں دنیا میں مسلمانوں کی طرح ہوگا۔ وہ آگ سے نہ نکلے گا۔ اس لیے کہ وہ علمِ الٰہی کے مطابق منافقین فاجرین میں سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرمایا:

وَ اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ۔ (اور بیشک فاجر لوگ دوزخ میں ہیں)

پھر فرمایا:

وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِیْنَ۔ (اور وہ اس سے غائب نہ ہوں گے)

اس طرح جنت میں بھی ذرہ بھر اور مثقال بھر ایمان والوں کے درجات کا فرق ہوگا اور مثقال سے زیادہ صاحبِ ایمان ان سب سے بلند تر مقامات پر ہوگا اور بلند درجات کے لوگ ستاروں کی طرح بلند مقامات پر نظر آئیں گے۔ اس طرح فرقِ مراتب کے ساتھ اہل ایمان جنت میں جائیں گے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ:

"انسان کے سوا کوئی چیز اپنے ہزار مثل سے بہتر نہیں"

اس لیے خدا کی قسم ایک اہل یقین دل، ہزار مسلم کے دل سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ اس کا ایمان ایک سو مومن کے ایمان سے بلند ہے اور اللہ کے ساتھ اس کا علم بھی ایک سَو مسلم کے علم سے زیادہ ہے اور یہ قول مشہور ہے کہ تین صد ابدال میں سے ایک کی قیمت تین صد مومنوں کی قیمت کے برابر ہوتی ہے۔

علماء کا مقام

اور ابو محمدؒ فرمایا کرتے تھے:

"بعض مومنوں کو اللہ تعالیٰ کوہِ اُحد کے وزن کے برابر ایمان عطا فرماتا ہے اور بعض کو ایک ذرہ بھر ایمان ملتا ہے۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔ (اور تم بلند ہو گے اگر تم مومن ہو گے)

اور بلندیٔ ایمان کی کوئی انتہا نہیں۔ چنانچہ ہر دل کی بلندی اس کے ایمان کی مقدار پر ہی ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ عام مومنوں کے مقابلہ میں علماؑ کو بلند درجات عطا ہوئے۔ فرمایا:

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ؕ (اللہ ان کو بلند کرے گا جو تم میں سے ایمان لائے اور ان کو عطا ہوئے علم کے درجے)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے وضاحت فرمائی کہ جن کو علم عطا ہُوا وُہ عام مومنوں سے سات سو درجے بلند ہیں اور ہر دو درجوں کے درمیان اس قدر فاصلہ ہے جس قدر زمین اور آسمان کے درمیان فاصلہ ہے۔

حدیث میں آتا ہے:

"اکثر جنتی کمزور عقل ہیں اور اہل خرد بلند مقامات پر ہیں۔" اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ:

"عابد پر عالم کی فضیلت اس طرح ہے جیسے کہ تمام ستاروں پر چاند کی فضیلت ہے۔" اور ان سے بلیغ ترین الفاظ بھی مروی ہیں کہ:

"جیسے میری اُمت پر مجھے فضیلت حاصل ہے۔" (اسی طرح علماء کو عام مومنوں پر فضیلت حاصل ہے۔

چنانچہ مومنوں میں سے اہل یقین بلند مقام پر ہیں اور اہل یقین علماءؑ کا مقام سب سے بلند ہے۔ اس کے بعد قندیل سے پانی کی سفیدی کے مطابق ہی حسن و صفائی نظر آتی ہے۔ عقل کی یہ مثال ہے جبکہ اس میں احوال و اموال سے اعتدال و صفائی آجائے اور قندیل ان سب کی جامع ہے اور اس سے مراد دل ہے چنانچہ قلبی رقت و لطافت اور اس کے حسن و پاکیزگی کے مطابق ہی اس میں علوم و انوار آئیں گے اور صفائی میں شیشے کا جوہر پانی کی صفائی کا محتاج ہوتا ہے جیسے کہ پانی کی صفائی جوہر کی صفائی کی محتاج ہے

اور قلب وعقل انہی کے معیار پر ہوں گے اور نور کی تیزی، فتیلہ کی قوت اور تیل کے تعاون کا محتاج ہے۔ چنانچہ ان کی قوت و مدد سے علم و یقین حاصل ہوتا ہے۔

ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۔ (یہ غالب جاننے والے کی تقدیر ہے)

اور جس دل میں حسب ذیل تین معانی جمع ہو جائیں۔ خواہشات کے خواطر (خیالاتِ خواہشِ نفسانی) اس سے جدا نہیں ہوں گے:

۱۔ جہالت

۲۔ طمع

۳۔ دنیا کی محبت

پھر جس قدر یہ قویٰ ضعیف ہوں گے اسی قدر خواہشات کے خیالات میں بھی قوت وضعف آ جائے گا۔ جیسے کہ خواطرِ یقین کا ضعف و قوت، علم و ایمان و عقل سے ہوتا ہے اور دل میں ان سب کا تسلط نمایاں ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جس لشکر کو بھی مشیت کی مصاحبت حاصل ہو گی وہ غالب ہو گا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے مروی ہے کہ:

"زمین میں اللہ تعالیٰ کا برتن ہے اور یہ دل ہیں۔ چنانچہ محبوب ترین دل، رفیق تر اور صاف تر ہے اور سخت تر ہے"۔ پھر وضاحت فرمائی کہ دین میں سخت تر ہو، یقین میں صاف تر ہو اور بھائیوں پر رفیق تر ہو۔

دلوں کی مثال برتنوں کی طرح ہے جن کا جوہر قریب قریب ہوتا ہے۔ چنانچہ بادشاہ، چہرہ اور خوشبو کے لیے سب سے زیادہ رفیق، اعلیٰ اور صاف ہی موزوں ہوتا ہے اور ذلیل لوگوں کے لیے کثیف ترین اور ردی ترین ہی مناسب ہوتا ہے اور درمیانے لوگوں کے لیے درمیانی حالت کی چیزیں مناسب ہیں۔ ان کی مثال یہ ہے کہ سونے کو وزن کرنے کے لیے ایک لطیف قسم کا معیاری ترازو ہونا چاہیے مگر موٹی اشیاء اور چوپاؤں کو تولنے کے لیے ایک بڑا سا کھلا ترازو وہی کام دیتا ہے اور درمیانی اشیاء کے لیے متوسط ترازو مفید ہوتا ہے۔

چنانچہ ہر چیز اس کے لیے ہو گی جس کے لیے موزوں ہو گی جیسے کہ ہر برتن میں رہی ادنیٰ یا اعلیٰ چیز ڈالی جاتی ہے جس کے لیے وہ مناسب ہو۔ اس طرح ملکوتِ باطن میں حکم و حکمت کا معاملہ ہے جیسے کہ ملکوتِ ظاہر میں حکم و حکمت کا سلسلہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ (اس کے نور کی مثال طاق کی مانند ہے کہ اس کے بیچ

اَلْمِصْبَاحُ فِیْ زُجَاجَۃٍ ۔ چراغ ہو۔ وُہ چراغ شیشہ کے قندیل کے بیچ ہے)

حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے اس کی تفسیر کرتے ہُوئے فرمایا:

"مثل نور المومن (مومن کے نور کی مثال)" اور وہ اسی طرح پڑھتے تھے۔ فرمایا کہ

"مومن کا دل ہی ایک طاق ہے اور اس میں چراغ رکھا ہے۔ چنانچہ اس کا کلام نور ہے۔ اس کا عمل نور ہے۔ اور وہ نور میں الٹتا پلٹتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان اَوْ کَظُلُمَاتٍ فِیْ بَحْرٍ لُّجِّیٍّ کے بارے میں فرمایا:

"یہ منافق کے دل کی مثال ہے۔ چنانچہ اس کا کلام بھی اندھیرا ہے اور اس کا عمل بھی اندھیرا ہے اور وہ اندھیرے میں ہی الٹتا پلٹتا رہتا ہے۔"

حضرت زید بن اسلمؒ نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ کے بارے میں فرمایا:

"یہ مومن کا دل ہے۔"

اور ابو محمد سہلؒ فرماتے ہیں:

"دل اور سینے کی مثال عرش اور کرسی کی طرح ہے۔"

حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں آتا ہے۔ فرمایا کہ:

عرض کیا گیا: "اے اللہ کے رسولؐ! زمین میں اللہ تعالیٰ کہاں ہے؟"

آپؐ نے فرمایا:

"مومن بندوں کے دلوں میں۔"

اور اللہ تعالیٰ سے مروی حدیث (قدسی) میں ہے کہ:

"مجھے میرا آسمان نہیں سمایا اور نہ میری زمین مجھے سمائی اور میرے مومن بندے کا دل مجھے سما گیا۔"

اور بعض روایات میں "اللین الوداع" کے الفاظ آتے ہیں۔ اللین کا معنی ہے نرم، قریب اور الوداع کا معنی ہے ساکن و مطمئن۔"

حدیث میں آتا ہے:

"بندے کو سکینت میں خشوع سے بڑھ کر حسین لباس نہیں پہنایا گیا۔ یہ اہل تقویٰ کا لباس ہے اور عارفین کے لیے اللہ تعالیٰ کا رنگ ہے۔"

حدیث میں آتا ہے:

"عرض کیا گیا۔ اے اللہ کے رسولؐ! لوگوں میں سے بہترین کون ہے؟"

آپؐ نے فرمایا،

"ہر پاک دل مومن"۔

پھر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی وضاحت فرمائی کہ،

"یہ وہ ہے جو پرہیزگار، صاف ہو۔ اس میں کھوٹ نہ ہو، نہ سرکشی ہو، نہ کینہ ہو اور نہ ہی حسد ہو"۔

ایک عارفؒ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی وضاحت کرتے ہیں؛

اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ۔ (مگر وہ جو اللہ کے پاس آیا قلب سلیم لے کر)

"یعنی غیر اللہ سے قلب سلیم لے کر آیا۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں"۔

اور اہلِ تفسیر کے قول میں ہے کہ؛

"شرک و نفاق سے سلامت دل لے کر آیا"۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میری امت میں شرک چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ پوشیدہ ہے"۔ اور صدیقین کے علاوہ عام مومنین اسے معلوم نہیں کر سکتے اور فرمایا؛

"میری امت کے اکثر منافق قراء ہیں"۔ اور عارفین کے علاوہ عام عابدین اسے معلوم نہیں کر سکتے۔ بعض خواطر یقین ایسے ہیں کہ جن کے دلائل نمایاں نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ وہ بہت ہی مخفی اور غامض قسم کے شواہد ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کو صرف لطیف ذہن اور باطنی علم سے معلوم کیا جا سکتا ہے جبکہ کتاب اللہ اور تاویل کا فہم و علم حاصل ہو جائے اور پھر ان لطیف معانی اور باطنی استنباطات پر غور کرے جیسے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے لیے دعا فرمائی:

"اَللّٰھُمَّ فقھہ فی الدین وعلمہ التاویل"۔

"اے اللہ! اسے دین کی فقاہت عطا کر اور تاویل کا علم عطا فرما"۔ اور ایسے ہی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے فرمایا؛

"ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ جسے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا ہو سوائے کتاب اللہ کے، البتہ اللہ تعالیٰ بندے کو کتاب اللہ میں فہم عطا کر دیتا ہے"۔ اور اسی طرح یُؤْتِی الْحِکْمَۃَ مَنْ یَّشَآءُ (جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے) کی تفسیر میں فرمایا:

"یہاں "کتاب اللہ کا فہم" مراد ہے"۔

نیز فرمایا؛

فَفَهَّمْنٰهَا سُلَيْمٰنَ ۔ (سو ہم نے سلیمان کو سمجھایا)

اب حکم و علم سے بڑھ کر آپؑ کو فہم سے مخصوص فرمایا کہ اس میں ان کے والد (حضرت داؤدؑ) بھی شریک تھے۔ اب یہ باپ سے بھی بڑھ گئے۔ ایک طویل حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

"یقین کے چار شعبے ہیں:

۱۔ فطانت کی بصارت۔

۲۔ تاویلِ حکمت۔

۳۔ عبرت کی نصیحت۔ اور

۴۔ پہلوں کا طریق۔

اب جسے فطانت پر بصارت حاصل ہوئی اس نے حکمت کی تاویل جان لی۔ اور جس نے حکمت کی تاویل جان لی وہ عبرت سے آگاہ ہو گیا، اور جو عبرت جان گیا وہ اوّلین میں داخل ہوا۔ البتہ اللہ تعالیٰ کے باطنی احکام کے عارف اور اہلِ یقین حضرات خواطرِ یقین اور ان کے تقاضا کی تفصیل سے خوب واقف ہیں۔ اس طرح کہ انھوں نے غیب سے ان کے جائے طلوع کا مشاہدہ کیا اور اللہ تعالیٰ کے نورِ ثاقب اور اس کے قرب و سلطان سے ان کا باعث پہچان گئے۔

مومن کی فراست

حدیث میں آتا ہے کہ:

"مومن کی فراست سے بچو۔ اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے۔" یعنی یقین کے ساتھ دیکھتا ہے۔

دُوسرے الفاظ یوں آتے ہیں کہ:

"عالم کی فراست سے بچو۔"

گویا یہ اس کی وضاحت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی ہے۔

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِيْنَ ۔ (البتہ اس میں نشانی ہے یقین کرنے والوں کو)

اسی طرح فرمایا:

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۔ (بے شک ہم نے بیان کردیں نشانیاں یقین کرنے والی قوم کے لیے)

یعنی نورِ یقین کے ساتھ (نشانیوں کی وضاحت کر دی)

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں:

"مومن، رقیق پردہ کے پیچھے سے غیب کی جانب دیکھتا ہے۔ اللہ کی قسم! یہ حق ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے ان کے دلوں میں ڈالتا اور ان کی زبانوں پر جاری کرتا ہے۔"

بعض علماء کا فرمان ہے:

"مومن کا گمان کہانت ہے۔" یعنی صحت و توع کے لحاظ سے گویا وہ ایک جادو ہے۔

ایک عالم فرماتے ہیں:

"حکماء کے منہ پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔ وہ صرف کلام حق ہی کرتے ہیں۔ جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اُنہیں تیار کیا۔"

ایک بزرگ فرماتے ہیں:

"اگر تم چاہو تو یہ کہہ سکتے ہو کہ خشوع کرنے والوں پر اللہ تعالیٰ اپنے بعض اسرار کھول دیتا ہے۔"

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک امیرِ لشکر کو فرمان بھیجا۔

"نصیحت کرنے والوں سے جو سنو، اسے یاد رکھو، اس لیے کہ ان پر صحیح امور منکشف ہوتے ہیں۔" اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا۔ (اور اللہ سے قول میں کون زیادہ سچا ہے!)

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا۔ (اے ایمان والو! اگر ڈرتے رہو گے اللہ سے تو کر دے گا تم میں فیصلہ)

ایک قول کے مطابق ایسا نور عطا ہوتا ہے کہ جس سے وہ یقین اور شبہات کے درمیان امتیاز کر لیتے ہیں اور اشکال حل ہو جاتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کا یہ فرمان اسی سے ہے۔

وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا۔ (اور جو کوئی ڈرتا ہے اللہ سے وہ کر دے اس کا گزارا)

ایک قول کے مطابق مراد یہ ہے کہ لوگوں پر جو تنگی آتی ہے اس سے نکلنے کی راہ پیدا فرما دیتا ہے۔

نیز فرمایا:

وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔ (اور اسے روزی دے جہاں سے اسے گمان نہ ہو)

یعنی اسے سیکھے بغیر علم عطا کرتا ہے۔ اور بغیر تجربہ کیے ذہانت و سمجھ عطا فرماتا ہے یعنی شاہدِ صحیح اور حق صحیح عطا ہوتا ہے۔ اسی طرح فرمایا:

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا۔ (اور جنہوں نے محنت کی ہمارے واسطے۔ ہم ان کو

سمجھا دیں گے اپنی راہیں)

یعنی وہ اپنے علم پر عمل کرتے ہیں اور فرمایا :
" انہیں ان باتوں کی توفیق و رہنمائی ہوگی ۔ جو نہیں جانتے ۔ حتیٰ کہ وہ صاحب حکمت اور علماء ہو جائیں گے ۔"

علم پر عمل کرو

بعض سلف کا فرمان ہے :
" یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو لوگوں سے دور اور الگ ہو کر اللہ تعالیٰ کی عبادت میں منہمک ہو چکے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ان کے پاس اُسے بھیج دیتا ہے کہ جو انہیں توفیق و عصمت کا علم سکھاتا ہے یا انہیں یہ بات القا کی جاتی ہے ۔"

حدیث میں آتا ہے :
" جو آدمی اپنے علم پر عمل کرے اللہ تعالیٰ اسے وہ علم عطا کرتا ہے جو نہیں جانتا اور جس پر عمل کیا ہوتا ہے اس کی توفیق عطا کرتا ہے حتیٰ کہ وہ جنت کا مستحق بن جاتا ہے ۔ اور جو اپنے علم پر عمل نہیں کرتا ۔ وہ اپنے علم میں ہلاکت ہو جاتا ہے اور جس پر عمل کیا ہوتا ہے اس کی بھی توفیق نہیں ملتی ۔ حتیٰ کہ آگ کا مستحق ہو جاتا ہے ۔"

اب اورثہ علم ما لم یعلم کا مطلب یہ ہے کہ قلبی اعمال کے علوم معارف عطا ہو جاتے ہیں کہ وہ اختبار اور اختیار میں فرق کر لیتا ہے ۔ ابتلا اور آفت ، ثواب اور سزا ، نقص اور مزید ، قبض اور بسط ، حل اور عقد اور جمعیت اور افتراق وغیرہ ایسے علوم عارفین میں امتیاز کر لیتا ہے ۔ اور یہ بات اُسے مشاہدۂ رقیب و قرب سے حسنِ توفیق و ادب کے بعد حاصل ہوتی ہے ۔ اس لیے کہ اس وقت دل اور وجدان درست ہو جاتے ہیں ۔

ایک تابعی فرماتے ہیں :
" جس نے اپنے علم کے دسویں حصہ پر عمل کیا ۔ اللہ تعالیٰ اسے وہ علم عطا کرے گا جس سے وہ جاہل ہے ۔"

حضرت حذیفہ فرماتے ہیں :
" اب تم اس دور میں ہو کہ جس نے اپنے علم کے دسویں حصہ پر عمل چھوڑ دیا ، وہ ہلاک ہو جائیگا اور تمہارے بعد ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ جس نے اس وقت اپنے علم کے دسویں حصہ پر عمل کر لیا ۔ وہ بھی نجات پا جائے گا ۔"

بعض صحابہ کا فرمان ہے :
" بندہ جس قدر عبادت و ریاضت زیادہ کرتا ہے ۔ اس کے قلب میں اسی قدر قوت و نشاط بڑھ جاتی ہے ۔ اور بندہ جس قدر عبادت میں کمی کرتا ہے ۔ دل میں اسی قدر ضعف و کاہلی پیدا ہو جاتی

ہے۔ اور علمِ یقین خزانۂ عقل پر اثر انداز نہ ہوگا۔ اس لیے کہ علومِ عقلی مخلوقات ہیں اور فکر کا بھی ایک نتیجہ ہوتا ہے۔

چنانچہ افکار کے نتائج اور خواطر و علوم کے فطرتی استخراجات ہی علومِ عقل ہیں اور یہی مومنوں کا مکاشفہ ہے اور اہلِ دین کے قابلِ مدح امور ہیں۔ عین یقین سے خاطرِ یقین ہویدا ہوتا ہے۔ اس کے ذریعہ بندہ مذاکرتا اور اس تک اچانک رسائی حاصل کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اس کے ساتھ مخصوص ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ مراد و مقصود ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ محبوب و مطلوب ہوتا ہے۔ اسے صرف اہلِ معرفت، اہلِ خوف اور اہلِ محبت ہی پا سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے لوگ اپنے حال کے حجاب میں ہیں۔ اپنی عادات سے ہی مطلوب ہیں اور اپنے مقام کی طرف نظر کناں ہیں۔ اپنی عقل سے اپنی راہ پر چل رہے ہیں، اور اہلِ معرفت کا حال یہ ہے کہ انہیں عینِ یقین کے ساتھ شرفِ مواجہت حاصل ہے۔ علمِ صدیقین کے ساتھ انہیں مکاشفہ حاصل ہے۔ چنانچہ اس طرح چل رہے ہیں کہ انہیں لے جایا جا رہا ہے اور وہ سبقت کر رہے ہیں اور فریفتہ ہو کر بھاگے جا رہے ہیں۔ اذکار نے ان سے بوجھ اتار دیے۔ جیسے کہ حدیث میں آتا ہے:

"مفردین کے سبقت کرنے کی طرح چلو۔"

مفردین فتح اور کسرہ بھی آتا ہے۔ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں مفرد بنایا۔ یہ اللہ تعالیٰ کے لیے مفرد ہو گئے۔ جیسے کہ فرمایا:

حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ۔

مفردین کون ہیں؟

پوچھا گیا:

"مفردین کون ہیں؟"

فرمایا: "ذکر نے ان سے بوجھ ہٹا دیے۔ اب وہ قیامت کو ہلکے پھلکے آئیں گے۔"

جب اللہ تعالیٰ نے انہیں دوسروں سے مفرد بنا دیا تو انہوں نے بھی اللہ تعالیٰ کو غیر سے لاشریک جانا۔ چنانچہ ان پر ذکر اللہ ہی غالب آگر رہ گیا اور ان کے قلوب نورِ الٰہی سے جل اٹھے۔ آخر اس کے ذکر میں ان کے ذکر بھی داخل ہو گئے۔ اب وہ ان کا ذاکر ہے اور وہ قدرتِ عزّ و جلّ کے جاری ہونے کی جگہ ہیں۔ اس لیے اس ذکر کی مقدار کا وزن نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی اس نیکی کی کیفیت ضبطِ تحریر میں آتی ہے۔ اگر آسمان و زمین بھی ایک پلڑے میں رکھ دیے جائیں تو ان دونوں سے ان کا ذکر الٰہی بڑھ جاتا ہے۔ انہی کے بارے میں فرمایا:

"جس کو میری مواجہت کا شرف حاصل ہوا تو دیکھے گا کہ وہ یہ جانتا ہے کہ میں اسے کیا عطا کرنا چاہتا ہوں۔ ان کے قلوب میں میرا انس ہے۔ جس طرح میں ان کی خبر دیتا ہوں۔ وہ مجھ سے خبر دیتے ہیں۔" یہ ان کے ظاہری

اوصاف اور پہلا عطیہ ہے۔

ان کی معرفتِ طلب معلوم نہیں۔ ان کے نصیب کی کیفیت غیر معلوم ہے اور ان کا مطلوب یعنی اس کی ماہیت وصف سے باہر ہے۔ ان کے عطیات غیر مخلوق ہیں۔ ان کا مشاہدہ حق یقین کی طرف عین یقین کے ساتھ ایک حقیقی وصف ہے۔ ان کے مطلوب کا پہلا حصّہ، علم یقین ہے اور یہی معرفتِ الٰہی کی صفائی ہے اور علمِ ایمان کا آخر، عینِ یقین کا آغاز ہے اور یہ وصفِ معروف کا مشاہدہ ہے اور یہ توحید کا انداز ہے اور علمِ یقین کے آغاز کوئی آخر نہیں اور حصّۂ مشاہدہ کے آخر کا کبھی انقطاع نہیں۔

چنانچہ واضح توحید یہ ہے کہ ہر چیز میں توحید ہو، ہر چیز کے ساتھ توحید ہو اور ہر چیز سے پہلے اسے پیدا کیا جائے اور علمِ توحید کی کوئی انتہاء نہیں اور نہ ہی موحدین کے مزید عطایا کی کوئی انتہا ہے۔ البتہ ان کے بعض انتہاء ہیں کہ جن کے پیچھے انہیں ٹھہرایا جاتا ہے اور ایسے مقصودات ہیں کہ جہاں سے وہ نکلتے ہیں اور انہیں مزید انعامات کے مقامات ملتے ہیں، جہاں انہیں وسعت حاصل ہوتی ہے اور ایسے ایسے علوم عطا ہوتے ہیں کہ جن کے ذریعہ اس کے بعد کے مقامات ان پر بدالآباد تک منکشف ہوتے ہیں اور ان کا نہ کوئی انجام ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی انتہا ہے۔

مقامِ احسان

علمِ معرفت یعنی نورِ یقین کے بغیر کوئی بندہ بھی مشاہدۂ علمِ توحید تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ جب تک اعضائے ظاہر میں اس طرح اعمالِ صالحہ نہ رچ جائیں جیسے کہ مشک میں دودھ داخل ہو جاتا ہے اور مکھن نکل آتا ہے۔ یہی علم یقین ہے اور یہ مکھن (خلاصہ) ہی سالکین کا مقصود آخری نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے صدیقین کی غایت کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس کے بعد اس سے بھی خالص تر اور صاف تر مقام موجود ہے۔ پھر یہ مکھن پگھلا کر گھی بنا لیا جاتا ہے یہ خالص اور انتہائی چیز ہے۔ علم یقین کے بعد عین الیقین کی یہ مثال ہے اور آئینہ قرب کے ذریعہ مشاہدہ کے بعد یہ درجہ آتا ہے۔ یہی اس کا نور ہے۔ اس وقت اس کی حضوری اور وجدان علیحدہ نہیں ہوتی۔ الغرض علمِ خواطر پگھل جانے کے بعد ہی بندہ کو خواطرِ یقین سے مشاہدۂ صفات تک عروج و ارتقاء حاصل ہوتا ہے اور چہرہ ذات تعالیٰ سے نور شعاع کا جوہر بنتا ہے۔ یہ مقامِ احسان ہے۔

وَ اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (اور بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کے ساتھ ہے)

ان لوگوں نے جان و مال سے اس راہ میں محنت کی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اس کے عوض میں ان پر احسان فرمایا اور وہ ان کے ساتھ ہے۔ فرمایا:

وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَ اللّٰہُ مَعَکُمْ ۔ (اور تم آزاد ہو اور اللہ تمہارے ساتھ ہے)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے احسان کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا:

"تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے کہ گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔"

بندہ ظاہری اعضاء کے اعمال سے مختلف درجات طے کرتا ہے۔ یعنی بندے پر جو محنت ڈالی گئی اور اس نے اسے اٹھالیا۔ علم یقین حاصل ہونے تک اس مشقت کو برداشت کرتا ہے اور یہ درج درضا ہے، اور یہی راہِ ہدایت ہے۔ اس کی ابتداً اس طرح ہوتی ہے کہ توبۃ النصوح کے بعد بندہ مریدین کے احوال میں اور نفس و دشمن کے خلاف جہاد کرنے والے اعمال میں داخل ہوتا ہے۔ پھر خواطرِ یقین کی جانب بڑھتا ہے۔ یہی مجاہدین کی وراثت ہے۔ جیسے کہ فرمایا،

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُ وْا فِیْنَا ۔ یعنی انہوں نے اپنی جان و مال سے جہاد کیا اور دشمن کے خلاف جہاد کیا۔ اس لیے کہ دشمن (شیطان، محتاجی کا وعدہ کرتا ہے اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ ان لوگوں نے صبر کرکے اس پر غلبہ حاصل کر لیا۔ چنانچہ جان و مال بیچ کر خواہشِ نفس کی غلامی سے آزادی حاصل کی اور روزِ حساب کی ہولناکیوں سے نجات پا گئے۔

لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا ۔ (ہم ضرور البتہ انہیں اپنی راہ دکھائیں گے)

یعنی ان پر علوم منکشف فرمائیں گے اور دقیق مطالب و معانی بتائیں گے اور ان کے حسنِ مجاہدہ کی وجہ سے اپنی طرف قریب ترین راہ پر انہیں چلادیں گے۔ پھر آخر میں یہ فرمایا،

وَ اِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الْمُحْسِنِیْنَ ۔ (اور بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کے ساتھ ہے)

یہ مشاہدۂ صفات کا مقام ہے۔ اس لیے اس میں مجاہدہ کرنے والا سب سے پہلے توفیق کا محتاج ہے۔ پھر تائید کی برکت سے صبر ہوتا ہے اور آخر میں محسن تعالیٰ ان مجاہدین کے ساتھ ہے کہ انہوں نے کل کے لیے آج اپنی جانوں پر احسان کیا (اور نیکیاں کمائیں)۔

دل ناصح کیونکر؟

حضرت حسن بصریؒ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا،

"علم کی دو قسمیں ہیں۔ علم باطن جو دل میں ہے۔ یہی نافع علم ہے۔" جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ اَنْ یَّھْدِیَہٗ یَشْرَحْ صَدْرَہٗ لِلْاِسْلَامِ۔ کا مفہوم دریافت کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا:

"اس سے مراد توسع ہے۔ یعنی جب دل میں نورانیت ڈالی جاتی ہے تو سینہ وسیع ہوتا ہے اور شرح صدر حاصل ہوتا ہے۔"

ایک عارفؒ نے فرمایا:

"میرا ایک دل ہے۔ اگر میں اس کی نافرمانی کروں تو میں نے گویا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی" یعنی اس میں طاعت کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اس میں صرف حق ہی ہے اور یہی اس شے کا قاصد بن گیا۔ اگر اس نے اس کی نافرمانی کی تو بھیجنے والے کی نافرمانی ہوئی۔ حدیث میں ہے

"ایمان وہ ہے جو دل میں توقیر پا جائے اور عمل اس کی تصدیق کرے" اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مومن، اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھتا ہے" اب جو آدمی اللہ تعالیٰ کے نور سے دیکھے تو وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے بصیرت پر ہے اور اس کا عمل طاقتِ الٰہی ہے۔

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"بیس سال ہوئے میرا دل ایک گھڑی بھر میں میرے نفس کی جانب نہیں جھکا اور نہ ہی میں ایک پل بھر کے لیے اس کی طرف جھکا ہوں"

ایک عالمؒ سے علم باطن کے بارے میں پوچھا گیا کہ یہ کیا چیز ہے؟ تو انہوں نے فرمایا:

"یہ اللہ تعالیٰ کے اسرار میں سے ایک ستر (راز) ہے جسے وہ اپنے دوستوں کے دلوں میں ڈال دیتا ہے۔ اس سے کوئی فرشتہ اور کوئی دوسرا آدمی باخبر نہیں ہوتا" اس سلسلہ میں ایک مسند خبر بھی آتی ہے۔ جسے ہم مسند کہنا پسند کرتے ہیں۔

ایک آدمی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا:

"مجھے علمی غرائب میں سے کچھ سکھائیے"

آپؐ نے فرمایا:

"کیا تو نے ربّ کو پہچان لیا؟"

چنانچہ بتادیا۔ علمی غرائب تو معرفت میں ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علوم کی اصل کا حکم دیا کہ جس میں غرائب معانی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا:

"قرآن پڑھو اور اس کے غرائب تلاش کرو" یعنی اس کے معانی پر غور کرو اور باطن کلام سمجھو۔ اس لئے کہ اولیاءُ اللہ کو کلام اللہ سے معرفت حاصل ہوئی۔ (صوفیاء) کا فرمان ہے:

"کلام کرو۔ تم پہچان لو گے۔ جس نے کلام اللہ کے مفہومات اور وجوہِ خطاب سمجھ لیے اسے معانیِ صفات اور اسماءِ ذات کے علمی غرائب کی معرفت حاصل ہو گئی"

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں:

"جو آدمی اوّلین اور آخرین کا علم حاصل کرنا چاہے اسے چاہیے کہ قرآن مجید میں غور و فکر کرے۔"

ایک عارفؒ اس آیت کے مفہوم میں بتاتے ہیں:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَ الْاِحْسَانِ ۔ (بے شک اللہ تعالیٰ عدل و احسان کا حکم دیتا ہے)

فرمایا:

"عدل سے مراد یہ ہے کہ قرآن میں تدبر و غور کرے اور اسے سمجھے اور احسان سے مراد مشاہدۂ فہم ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے شعبِ ایمان کے اوصاف بیان فرمائے۔ آپؐ کے عدل کی یہ تعریف اس حدیث کی شاہد ہے۔ فرمایا:

"ایمان چار ستونوں پر ہے:

صبر، یقین، عدل اور جہاد پر۔"

پھر فرمایا:

"اور عدل چار شاخوں پر ہے:

گہرا فہم، اعلیٰ فہم، بردباری کا باغ اور شرائعِ حکم۔"

اب جس کو فہم حاصل ہوا اس نے مجمل علم کی توضیح کر دی اور جس نے جان لیا اُسے شرائعِ حکم کی معرفت حاصل ہوئی۔ جس نے بردباری کی اس نے اپنے معاملہ میں افراط نہ دکھائی اور لوگوں میں قابلِ تعریف ہو کر زندہ رہا۔ اہلِ کشف میں سے ایک بزرگؒ فرماتے ہیں:

"ایک فرشتہ میرے سامنے آیا اور مجھ سے کہا کہ مشاہدۂ توحید کے ذکرِ خفی میں سے کچھ مجھے لکھا دیں! اور کہا کہ ہم آپؐ کا عمل لکھنے والے نہیں ہیں۔ البتہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے کسی عمل کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کریں۔"

میں نے پوچھا:

"کیا یہ دونوں (فرشتے) میرے فرائض نہیں لکھتے؟"

فرشتے نے جواب دیا:

"ہاں لکھتے ہیں۔"

میں نے کہا:

"اس کے لیے یہ عمل کافی ہے۔"

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"میں نے ابدال میں سے ایک صاحب سے مشاہدۂ یقین کا ایک مسئلہ پوچھا۔ انہوں نے بائیں طرف منہ کیا اور کہا:

"اللہ تجھ پر رحم کرے، تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟"

پھر دائیں طرف منہ کیا اور کہا:

"اللہ تجھ پر رحم کرے، تم اس بارے میں کیا کہتے ہو؟"

پھر سینہ کی طرف رُخ کیا اور کہا:

"اللہ تجھ پر رحم کرے تو اس بارے میں کیا کہتا ہے؟"

پھر ایسا عجیب جواب دیا کہ میں نے اس سے اعلیٰ اور کامل جواب کبھی نہ سُنا تھا۔ میں نے پُوچھا:

"آپ نے بائیں اور دائیں طرف منہ کیا اور پھر سینہ کی طرف رُخ کیا۔ یہ کیا بات تھی؟"

اُنھوںؒ نے فرمایا:

"تم نے مجھ سے ایسا سوال پوچھا جس کا میرے پاس پختہ جواب نہ تھا۔ میں نے بائیں فرشتے سے پوچھا، مجھے خیال تھا کہ اس کے پاس اس کا جواب ہو۔ مگر اس نے بتایا کہ میں نہیں جانتا۔ پھر میں نے دائیں فرشتے سے پوچھا کہ وُہ اس سے زیادہ صاحبِ علم ہے۔ اس نے بھی بتایا کہ میں نہیں جانتا۔ پھر میں نے دل کی جانب نظر کی اور اس سے دریافت کیا، تو اس نے مجھے جواب بتا دیا جو میں نے تمہیں بتا دیا۔ یہ ان دونوں (فرشتوں) سے زیادہ عالم نکلا۔

حضرت ابو یزید اور دُوسرے مشائخ فرمایا کرتے:

"عالم وُہ نہیں جو کتاب اللہ حفظ کرتا ہے اور جب بھول جائے تو جاہل بن جائے بلکہ عالم وُہ ہے جو رب عز و جل سے علم حاصل کرے۔ جب چاہے حاصل کرلے اور حفظ کرنے اور پڑھنے کے بغیر یاد رہے۔ خدا کی قسم یہ آدمی کبھی نہ بھولے گا۔ یہ ابدی ذاکر ہے۔ یہ کتاب کا محتاج نہیں اور یہی عالم ربانی ہے اور اہل یقین ابدال کے دلوں کا یہی وصف ہے۔ وہ یاد رہنے میں نہیں لگے رہتے ہیں بلکہ وُہ حافظ تعالیٰ کے ساتھ رہتے ہیں۔ یعنی قائم باحافظؒ ہیں۔"

حدیث میں آتا ہے:

"میری اُمت میں محدثین اور مکلمین ہیں اور عمرؓ ان میں سے ہیں۔"

حضرت ابن عباسؓ نے اس طرح پڑھا:

وَ مَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ وَّ لَا مُحَدِّثٍ۔ (یعنی صدیقین)

صحابہ کرام اور تابعین عظام کا یہی طریق تھا۔ جب ان سے پوچھا جاتا تو توقف کرتے اور انہیں صحیح جواب القاء ہو جاتا۔ اس لیے کہ حسنِ توفیق کے باعث انہیں قرب الٰہی حاصل تھا۔ اور وہ طریقِ صحیح پر ٹھیک ٹھیک گامزن تھے۔

چنانچہ جب ایک مومن کے دل پر خاطرِ یقین آتا ہے تو اس کا مشاہدہ اس پر عمل کرنے کے لیے بے چین کر دیتا ہے اور اگر دوسرے پر یہ مخفی ہو تو اس کی دلیل اور وضاحت کرنا ضروری ہو گی چاہے دوسروں کو اس میں التباس ہی رہے۔ اہل یقین کی تخصیص میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيَاتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ۔ (بیشک ہم نے یقین کرنے والی جماعت کے لیے آیات واضح کر دی ہیں)

هٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ۔[۱] (یہ سوجھ کی باتیں ہیں لوگوں کے واسطے اور راہ کی اور رحمت ان لوگوں کو جو یقین لاتے ہیں)

اور اہل تقویٰ کی توصیف کرتے ہوئے فرمایا:

وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ۔[۲] (اور جو کچھ پیدا کیا اللہ نے آسمان و زمین میں، نشانیاں ہیں ان لوگوں کو جو ڈرتے ہیں)

اور فرمایا:

هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ هُدًى وَّ مَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ۔[۳] (یہ بیان ہے لوگوں کے واسطے اور ہدایت اور نصیحت واسطے پرہیزگاروں کے)

اور علماء کی فضیلت میں فرمایا:

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ۔[۴] (بلکہ یہ قرآن تو آیتیں ہیں صاف ان لوگوں کے سینوں میں جن کو ملی ہے سمجھ)

اور فرمایا:

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ۔[۵] (ہم نے کھول دیے نشان دھیان کرنے والوں کو)

چنانچہ علم کی حقیقت، تقویٰ اور یقین ہے اور یہی علم معرفت ہے کہ جو مقربین کو خصوصیت کے ساتھ حاصل ہے۔

---

[۱] الجاسیہ آیت ۲۰ [۲] یونس آیت ۶ [۳] آل عمران آیت ۱۳۸۔
[۴] العنکبوت آیت ۴۹ [۵] انعام آیت ۱۲۷۔

انہیں نشانات عطا ہُوئے اور انہیں بیان واستدلال سے نوازا گیا۔

بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ۔ (اس واسطے کہ نگہبان ٹھہرائے تھے اللہ کی کتاب پر اور اس کی خبرداری پر تھے)

چنانچہ انہی واسطوں سے دلوں میں خواطر نمودار ہوتے ہیں اور (یہ اواسط) ہی خدا کے خزانے ہیں جو کہ خزائنِ ارضی سے ہیں۔

وَ لِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَلٰكِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ۔ (اور آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ کے لیے ہیں اور لیکن منافق نہیں سمجھتے)

اور فقہ دراصل قلبی صفت کا نام ہے۔ اس سے مراد عربی لغت نہیں ہے۔ کہا کرتے ہیں: فَقِهْتُ یعنی میں سمجھ گیا۔ (فَهِمْتُ) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَا يَفْقَهُوْنَ بِهَا کی تفسیر کرتے ہُوئے فرماتے ہیں کہ لَا يَفْهَمُوْنَ بِهَا (یعنی ان سے نہیں سمجھتے) چنانچہ وہ فقہ کا معنی فہم سے کرتے ہیں۔ چنانچہ یقین، روح اور فرشتہ کا خیال، اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں سے ہے اور عقل، نفس اور دشمنی (شیطان) کا خیال، زمین کے خزانوں میں سے ہے جیسے کہ فرمایا گیا:

"نفس زمینی ہے۔ یہ زمین سے پیدا کیا گیا۔ اس لیے زمین کی طرف مائل ہے اور روح روحانی ہے ملکوت سے پیدا ہُوا۔ اس لیے بلندی کی طرف صعود کرتا ہے اور دل ملکوتی خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے جیسے کہ آئینہ، خزائنِ غیب کے خواطر کو واسطوں سے منعکس کرے اور یہ دل میں چمکیں۔ آخر اثر کے باعث (دل) منور ہو جائے۔

ان میں سے بعض قلبی سمع میں آتے ہیں۔ یہ فہم ہوتا ہے۔ بعض بصارت قلبی میں واقع ہوتے ہیں۔ یہ نظر ہوتا ہے اور یہی مشاہدہ ہے۔ بعض قلبی زبان میں واقع ہوتے ہیں تو یہ کلام بن جاتا ہے اور یہی ذوق ہے۔ بعض شمِّ قلب (قلب کے سونگھنے) میں واقع ہوتے ہیں تو یہ علم ہوتا ہے اور یہی فکر ہے۔ عقلِ غریزی کی تلقیح (آتا ہے) کے باعث عقلِ مکتسب یہی ہے۔ اس کا دخون کم ہوتا ہے اور نسبتاً کم مشقت والی ہے۔ اور جو نگاہِ دل اور حسِ قلب میں واقع ہو اور اس کی شفافیت توڑ کر اس کی ابدی میں جا پہنچے اور یہ کام براہِ راست ہو۔ یہ وجدان ہے اور مقامِ مشاہدہ کا یہی حال ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اسی کی طرف اشارہ ہے کہ دعا کی:

اَسْاَلُكَ اِيْمَانًا يُّبَاشِرُ قَلْبِيْ۔ (میں تجھ سے ایسا ایمان مانگتا ہوں جو کہ میرے دل پر براہِ راست آئے)

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"جب ظاہرِ قلب میں ایمان ہو تو بندہ دنیا اور آخرت سے محبت کرتا ہے۔ گاہے وہ اللہ تعالیٰ کی معیت میں ہوتا ہے اور گاہے نفس کا ساتھی ہوتا ہے اور جب باطنِ قلب میں ایمان داخل ہو جائے تو بندہ کو دنیا سے بغض ہو جاتا ہے اور اپنی خواہش کو چھوڑ دیتا ہے۔"

ہمارے عالم بزرگ ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"قلب میں دو خلا ہوتے ہیں۔ ایک باطنی حصہ میں ہے اور اس میں سمع و بصر یا ہوتی ہے۔ اس کو قلب کا دل کہا جاتا ہے اور ایک دوسرا خلا ہوتا ہے وہ ظاہرِ قلب ہے۔ اس میں عقل رہتی ہے اور دل میں عقل اس طرح ہے، جیسے کہ آنکھ میں بینائی۔ اور یہ مخصوص مقام میں ایک تیز کرنے والی چیز ہے جیسے کہ سوادِ چشم میں نظر تیز کرنے والی چیز ہے۔ جب یہ خواطر، فرشتہ و روح کے ہادیوں کے واسطوں سے آئیں۔ تو یہ تقویٰ اور رشد و ہدایت ہے اور یہ خزائنِ خیر اور رحمت کی کنجی میں سے ہے۔ یہ بندے کے دل میں نور و خوشبو ڈال دیتی ہے جیسے دائیں جانب والے محافظین ملائکہ لیتے ہیں اور نیکیاں ثبت کر لیتے ہیں اور اگر یہ خواطر سرکشوں یعنی دشمن و نفس کے واسطوں سے ہو تو یہ فسق و فجور ہے۔ یہ برائی کے خزانے اور علائقِ فاسدہ ہیں۔ یہ دل میں ظلمت و بدبو ڈالتے ہیں اسے بائیں جانب والے محافظ ملائکہ لیتے ہیں اور انہیں برائیاں لکھ دیتے ہیں اور یہ سب باتیں خالقِ نفس کی جانب سے القاء ہے اور جبار تعالیٰ اور مقلب القلوب کی طرف سے الہام ہے۔ جس کے لیے چاہے حکمت و عدل کا معاملہ کرے۔ اور جس کو پسند کرے ان پر فضل و احسان فرما دے۔ جیسے کہ فرمایا:

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا۔ (اور تیرے رب کا کلمہ صداقت اور عدل کے اعتبار سے کامل ہوا)

یعنی اپنے ابرار کے لیے جو ثواب کا وعدہ فرمایا۔ انہیں اس کی ہدایت دے کر صدق کے اعتبار سے پوری ہوئی اور گمراہوں کے لیے جو سزا طے فرما رکھی ہے عدل کے طور پر انہیں اس کی سزا دی۔

پھر فرمایا:

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ۔ (وہ نہیں پوچھا جاتا جو کرتا ہے اور وہ (لوگ) پوچھے جاتے ہیں)

چنانچہ یہ اس کے حکم کے تابع لشکر ہیں اور وہ بادشاہ جبار عزیز و قہار ہے۔ وہ اشیاء کا سامنا کرنے سے بالا ہے جبکہ وہ اس کی مشیت و قدرت کا اتباع کریں۔ اس کی قدرت اس کا ارادہ ظاہر کرتی ہے۔ اس کی حکمت

اس کے افعال ظاہر کرتی ہے۔ جب کسی چیز کا ارادہ کرے تو مخفی قدرت کے ساتھ کُنْ (ہو جا) فرماتا ہے
تو اس کی ظاہر حکمت سے وُہ ہو جاتی ہے اور پروردگار تعالیٰ ہر چیز پر قدرت والا ہے۔ اس نے اسباب میں
ڈال دیا اور اس پر حجاب پڑ گیا اور سزا وجزا کے احکام کے لیے مقام بنایا۔ چنانچہ اسباب، ابتلاءَ کے
واسطے ہیں اور بندہ جائے ابتلا ہے اور اوّل تعالیٰ ابتلا میں ڈالنے والا ارادہ کرنے والا، آغاز کرنے والا
اور دوبارہ لانے والا ہے۔

وَ نُنَبِّئُكُمْ فِيمَا لَا تَعْلَمُونَ۔ (اور اٹھا کھڑا کریں تم کو جہاں تم نہیں جانتے)
وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا۔ (اور کیا چاہتا تھا ایمان والوں پر اپنی طرف سے خوب احسان)

اور بندے کو وہی مشاہدہ ہوتا ہے جو کرایا جاتا ہے۔ مشاہدہ میں بندوں کا باہمی فرق اسی طرح ہے اور
جو بات بندے پر ظاہر کی جائے وہی اسے معلوم ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ استدلالات میں اختلافات ہُوا۔
جب اللہ تعالیٰ عز اسمہٗ غیب سے کسی چیز کو ظاہر کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو اپنی لطیف قدرت کے ذریعہ
نفس کو حرکت دیتا ہے۔ وُہ اس کے اذن سے متحرک ہوتا ہے۔ آخر اس کی حرکت کے باعث ظلمت پڑتی ہے
اور دل میں ایک بُرا ارادہ طے ہوتا ہے۔ اب دشمن (شیطان) دل کو دیکھتا ہے اور وہ تو پہلے سے گھات
میں لگا ہوتا ہے۔ قلوب و نفوس اس کے سامنے پھیلے پڑے ہیں۔ وُہ ابتلا زدہ انسان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے
اور جب دیکھتا ہے کہ نفس میں ایک بُرا ارادہ آیا تو دل میں اس کی جگہ پر ظلمت کا اثر پڑتا ہے اور اس سے شیطان
کا تصرف شدید ہو جاتا ہے۔

ھمت (ارادہ) تین مفاہیم پر ہوتا ہے۔ اس کی فروعات تو بے شمار ہیں۔ اس لیے کہ ہر بندے کا
ارادہ اس کی خواہش کے مطابق ہوتا ہے۔ ایک تو خواہش ہے۔ یہ نفسانی لذتوں یا خواہشاتِ نفس کا ثمرہ ہوتا
ہے اور یہ جہالتِ غریزی کے باعث ہوتا ہے۔ یا حرکت یا سکون کا دعویٰ اور یہ عقل کے لیے آفت ہے،
اور دل کے لیے محبت ہے۔ ان تین میں سے جو بھی دل میں پڑا تو اسے نفسانی وسوسہ کہا جائے اور یہ سمجھا
جائے گا کہ شیطان موجود ہے۔ اسی کی طرف یہ وسوسہ منسوب ہوگا اور یہ مذموم ارادہ ہوگا۔ اور یہ ارادہ تین
وجوہات سے ہوتا ہے؛

۱۔ جہالت کے باعث۔

۲۔ غفلت کے باعث۔

۳۔ فانی اور فضول دنیا طلبی کے باعث۔

حالاں کہ یہ تینوں چیزیں بے کار ہیں بلکہ دنیا کی طرف منسوب تمام چیزیں اور اعمال ہی لایعنی ہیں۔

افضل بات یہ ہے کہ نفس سے مجاہدہ کرے اور دشمن کو اس پر راہ ہی نہ دے اور اعضاء کو دنیا کی فضول مباحات میں بھی پڑنے سے روکے۔ اگر یہ تینوں مذکورہ امور پائے گئے تو حرام میں پڑ جائے گا۔ اس لیے اعضاً کو ان میں پڑنے سے روکنا فرض ہے۔ اور اگر اس نے ان چیزوں کے ذکر سے یا ان کی طلب میں پڑنے کی باتوں میں دل کو لگایا تو یہ حرکت قلب اور یقین کے درمیان حائل ہو جائے گی اور اگر مباحات کا معاملہ ہو تو بھی بہتر یہ ہے کہ دل کو ان سے باز رکھے تاکہ اس کا دل غافل نہ ہو جائے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے نفس و روح، موت و حیات اور زندگی کی دوسری رنگینیاں پیدا کر کے بندے کو امتحان میں ڈال دیا کہ ان سے ہٹ کر اور اچھے اعمال کر کے زہد کی راہ اختیار کرے۔

وَيَنظُرُ كَيْفَ تَعْمَلُونَ۔ (اور دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو)

نجات و ہلاکت کس طرح؟

گاہے ایسا ہوتا ہے کہ بندہ شیطان و نفس کے تسلط میں ہوتا ہے اور اس کی ہلاکت قریب آچکی ہوتی ہے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ بندے کی سلامتی اور نجات کا ارادہ فرما لیتا ہے تو اس کے دل پر نظر فرماتا اور نورِ ایمان سے منور کر دیتا ہے۔ چنانچہ بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے التجا اور زاری کرتا ہے اور اس پر توکل کر کے پُرخلوص بندگی بجا لاتا ہے۔ اب وہ باطن سے اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے والا اور اسی کی پناہ چاہنے والا بن جاتا ہے اور اس میں خدا ہی کی جانب اضطرار و خلوص کی کیفیت نمودار ہو جاتی ہے۔ اب اللہ تعالیٰ ہی اسے کافی و ناصر بن جاتا ہے۔ اب وہ اپنا تمام اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے۔ اور وہ اسے شیطان کے مکر سے بچاتا ہے اور اس کے لیے نجات و حفاظت کی راہیں کھول دیتا ہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ بندے کے دل پر نظر فرماتا ہے تو اس کی نفسانیت بجھ جاتی ہے۔ ارادہ مٹ جاتا ہے اور دشمن کے اثرات ختم ہو کر رہ جاتے اور اس کا قلب روشن چراغ کی برکت سے منور اور تاباں ہو جاتا ہے اور قوی و عزیز کی قوت سے بندہ (شیطان سے) آزادی حاصل کر لیتا ہے۔ اب پروردگار کی نظرِ کرم کے باعث بندے کا دامن صاف ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے رب سے ڈرتا ہے۔ گناہ سے بھاگتا اور توبہ و استغفار کرتا ہے اور اس پر تقویٰ و پرہیزگاری کی علامات نمایاں ہو جاتی ہیں۔

اور اگر اللہ تعالیٰ کسی بندے کی بربادی کا ارادہ کرے اور اس پر آفت آنے کا حکم دے دیا جائے تو ارادے کے بعد دل کی نظر خواہشِ نفسانی کے ہمراہ عقل کی طرف جاتی ہے۔ عقل نفس کی جانب آتی ہے۔ اور نفس کا اتباع کرتی ہے۔ آخر کار عقل، نفس کی اطاعت میں مطمئن ہو جاتی ہے اور خفتہ منجمد ہونے کے باعث خواہش کا تسلط ہو جاتا ہے اور دل میں خواہش بُری طرح اچھلنے لگتی ہے اور انسان شیطان کے کامل تصرف میں آجاتا ہے اور وہ اس کے ساتھ خوب خوب دھوکے کرتا اور طرح طرح کی رنگینیاں دکھاتا ہے اور

گناہ کا القا کرتا ہے۔ آخر کار ایمان کی کمزوری اور نورِ یقین کے باعث شہوانی قوت غالب آجاتی ہے اور شہوت علم و بیان کی سکت چھین لیتی ہے۔ حیا اٹھ جاتی ہے اور ایمان مستور ہو جاتا ہے۔ حیا اٹھ جانے اور خواہش کے غالب آنے کے بعد گناہ اور انتہا سرزد ہو جاتی ہے۔ خیر و شر اور طاعت و معصیت کے ظہور کے یہ دو مفاہیم ہیں۔ ان جُدا جُدا اسباب کے بعد یہ دونوں اچانک سرزد ہوتے ہیں۔ یہ بندے کے اجزاء بن جاتے ہیں اور مشیّت پر قدرت کے غلبہ کے باعث بجلی کی سی سُرعت کے ساتھ یہ کام ہو جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

کُنْ فَیَکُوْنُ۔ (ہو جا، پس ہو جاتا ہے)

اظہارِ خیر کے تین معانی

اور اگر اللہ تعالیٰ خزائن ملکوت سے کسی بھلائی کا اظہار کرنا چاہے یا تقویٰ کی بات القا فرمانا چاہے تو مخفی لطف سے رُوح کو متحرک کر دیتا ہے۔ وُہ اس کے امر سے متحرک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے جوہر سے دل میں ایک بلند نُور پڑتا ہے۔ ایک اعلیٰ اور خیر کا ارادہ آجاتا ہے اور بھلائی کے ارادہ کے تین مفاہیم ہیں۔ البتہ ان کی فروع بے شمار ہیں۔ اس لیے کہ ہر بندے کا بھلائی میں ارادہ اس کے علم اور اس کے مقام کے مطابق ہوتا ہے تو ایک اصول یہ ہے کہ مفروضہ حکم بجالانے میں جلدی کرنا یا مندوب حکم تیزی سے بجالانا۔ اس لیے کہ بندہ اپنے عمل سے فضیلت حاصل کرتا ہے یا ایسا علم جو کہ اس کے لیے باعثِ فطانت ہو اور یہ علم ملک یا ملکوت کے ذریعہ سے مکاشفۂ غیب سے آتا ہے اور تیسرا مفہوم یہ ہے کہ جن مباح کاموں میں اس کی اصلاح ہے یا جن مباح کاموں میں اس کے نفس کو استراحت حاصل ہوتی ہے اور دُوسروں کا نفع ہوتا ہے یا ان میں پڑنے سے اس کے دل کو مختلف ثقیل اور پریشان کن افکار سے نجات ملتی ہے۔ ایسے مباح امور میں مصروف ہونا۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت و احسان کے باعث بندے کی آسانی کے لیے یہ کر دیا گیا۔ ان سب امور میں اللہ سبحانہٗ کی رضا ہے۔ بندے کے لیے افضل یہی ہے کہ انہیں بجالاتا رہے۔ البتہ ان میں سے بعض زیادہ افضل ہیں۔ خیر و شر کے یہی چھ اصول ہیں۔ ملکوتی القا اور شیطانی وسوسہ میں یہی فرق ہے۔ تقویٰ اور فجور کے القا میں یہی امتیاز ہے۔ نیت اور وسوسہ اور اختیار و اختبار انہیں کہا جاتا ہے۔

گاہے یہ مطالبات بندے کے لیے مزید مکاشفات کا باعث بنتے ہیں اور بندہ ان سے اللہ تعالیٰ کی جانب دیکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کو اپنے پاس پاتا ہے۔ بوجہ اس وجدان کے کہ جو عطا ہُوا اور اللہ تعالیٰ سے تعریف ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ وُہ خدا کی طرف معرفت حاصل کرتا ہے۔ اور اس کے لیے انس و شوق کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ پھر یقین کے سلسلہ میں بھی ان کے مشاہدہ میں بندوں کا

تفاوت ہوتا ہے۔ یہ تفاوت ان کی مقدارِ قوت اور مکانِ تمکین کے برابر ہوتا ہے۔ البتہ مفاہیم خیر اور اس کے واسطوں کے اصول وجوہ ہوتے ہیں کہ فرشتہ سے الہام ہو۔ روح میں انقیاد ہو، انوارات کی تجلیاں پڑیں۔ مامور بہ چیزوں کا علم پا جائے۔ ممنوعہ و مباح کا علم ہو اور مفاہیم شر کے اصول اس کے برعکس ہیں کہ ان میں نفس اور شیطان واسطہ بنتا ہے اور اس کے اسباب شہوت و خواہش ہوتے ہیں جو کہ جہالت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ حجاب ڈال دیتے ہیں اور عذاب پر انجام ہوتا ہے۔

جب اللہ تعالیٰ خزانۂ روح میں سے کسی بھلائی کو ظاہر کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو دل میں ایک نور پڑتا ہے اور خوب اثر کرتا ہے۔ پھر فرشتہ دل کی جانب نظر اٹھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ بھلائی دیکھتا ہے اور جس طرح شیطان خزانۂ شر میں تسلط جماتا ہے یعنی نفس میں، اسی طرح فرشتہ (خزانۂ خیر) میں تمکن ہوتا ہے اور فرشتہ کی تخلیق ہی ہدایت پر ہوئی۔ اس کی سرشت میں طاعت کی محبت ہے جیسے کہ شیطان کی تخلیق ہی سرکشی پر ہوئی اور اس کی طبیعت میں نافرمانی کی محبت داخل ہے۔ آخر کار فرشتہ الہام کرتا ہے۔ دل میں اچھے خیالات کی آمد ڈال دیتا ہے اور اسے اس نیک کام پر آمادہ کرتا ہے۔ اسے تقویٰ و رشد کا الہام کہا جاتا ہے اور جیسے دشمن، نفس کی جانب دیکھتا ہے اسی طرح فرشتہ یقین کی طرف دیکھتا ہے اور فرشتہ کے باعث یقین کو مشاہدہ حاصل ہوتا ہے۔ اب عقل مطمئن ہو جاتی ہے اور شہادتِ یقین کی طرف اسے سکون حاصل ہو جاتا ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کے اذن و تائید کے باعث عقل فرشتہ کے ساتھ ہو جاتی ہے جیسے کہ اس سے پہلے نفس کے ساتھ تھی اور اسی کی طرف مطمئن ہو کر رہ گئی تھی۔ اب عقلی طمانیت کے باعث شرحِ صدر ہو جاتا ہے اور شرحِ صدر ہونے کی وجہ سے علمی استدلالات نمودار ہوتے ہیں اور صفائی ایمان کے باعث، یقین کا تسلط پختہ ہو جاتا ہے اور نورِ یقین میں ظلمتِ خواہشات ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ نورِ ایمان ظاہر ہونے کے باعث شہوت کی آگ بجھ جاتی ہے اور زینتِ حیاء کی وجہ سے ایمان مزین ہو جاتا ہے۔ شہوت ساقط ہونے کی وجہ سے نفسانی صفات کمزور پڑ جاتی ہیں اور نفسانی کمزوری کے باعث دل قوی ہو جاتا ہے۔ علمی استدلالات ظاہر ہونے اور قوتِ یقین پیدا ہونے کے باعث ایمان بڑھتا ہے۔ آخر کار مزید ایمان اور لباسِ حیاء کی برکت سے ہدایت غالب آ جاتی ہے اور غلبۂ حق کی وجہ سے طاعت و بندگی ظاہر ہو جاتی ہے۔

وَ اللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰٓی اَمْرِہٖ وَ لٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۔

ملائکہ کا القاء اور شیطانی وساوس

گاہے فرشتے اور دشمن (شیطان) کی جانب سے مختلف وساوس آتے ہیں اور خیر و شر کے جدا جدا الہامات

اور وسوسے دل کو ستاتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شیطان کی جانب سے برائی کا وسوسہ غالب آتا ہے اور اس کے بعد فرشتہ کی جانب سے بھلائی پر قایم رہنے کی خاطر امداری القا ہوتا ہے۔ یہ رب تعالیٰ کی عنایت ہوتی ہے اور اس طرح بندہ (اس برائی) سے رک جاتا ہے۔

اس صورت میں بندے پر لازم ہے کہ وہ پہلے خاطر کی نافرمانی کرے اور دوسرے خاطر کی اطاعت کرے اور گاہے فرشتہ کا نیکی کا القا پہلے آتا ہے اور اس کے بعد شیطان کی طرف بھلائی سے باز رہنے کا وسوسہ آتا ہے۔ یہ دراصل بندے پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مشقت ہے تاکہ وہ دیکھے کہ اب کیا عمل کرتا ہے اور دشمن کو حسد بھی ہوتا ہے۔ اس صورت میں بندے کو پہلے خیال کی اطاعت اور دوسرے خیال کی نافرمانی کرنی چاہیے پھر فرشتہ کے بھلائی کے خواطر اور دشمن کے برائی کے وساوس بہت دقیق ہو جاتے ہیں۔

اور گاہے ان میں تفاوت آجاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں رغبتِ قویہ کے باعث بھلائی کا خیال کمزور ہو جاتا ہے اور خواہش و شہوت کی زیادتی کی وجہ سے برائی کا خیال شدید ہوتا ہے۔ ان میں کمی و بیشی اور تقدم و تاخر سے بھی فرق پڑ جاتا ہے۔ اس لیے کہ حاکم کے ارادہ و احکام میں تفاوت ہو جاتا ہے اور مشیت کے ساتھ وابستہ احکام و قدرت میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ خزانۂ خیر میں اس کا خزانۂ شر بھی ہے۔ جب چاہے اور خزانۂ شر میں اسی کا خزانۂ خیر ہوتا ہے۔ جب بھی کسی سے محبت کرے اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ وہ اس کے بغیر کہیں سکون نہ پائے اور جو اللہ تعالیٰ نے اس پر ظاہر کیا۔ اس پر وہ بندہ فخر و غرور نہیں کرتا۔ چنانچہ جب عارف اس کا مشاہدہ کرتا ہے تو بھلائی پر قطعیت کی بات نہیں بتاتا اور نہ ہی کبھی اس پر ناز و نخرہ کرتا ہے کیونکہ وہ خزائنِ خیر کے خزائنِ شر سے بدل جانے سے بے خوف نہیں ہو رہتا اور نہ ہی ظاہر شدہ خرابی کو دیکھ مایوس ہو جاتا ہے۔ اس لیے کہ اسے امید ہوتی ہے کہ خزائنِ شر خزائنِ خیر میں بدل جایا کرتے ہیں۔ اس طرح وہ خوف و امید کی حالت میں رہتا ہے اور یہ بات صرف دقیق علوم اور لطیف معانی سے ہی معلوم ہو سکتی ہے کہ جب فطانت تیز ہو اور نورانی صفائی حاصل ہے اور رحیم و جبار سے علم حاصل کیا ہو۔ اب اگر برائی کے خیال کے بعد نیکی کا خیال آجائے اور اسے برائی سے رد کے تو سمجھو کہ اس پر خدائی نظر ہے اور یہی چیز، دل میں متعین ناصح ہے اور یہی عقل کی تائید کرنے والا انتباہ ہے۔

اور گاہے نفس و خواہش کے وساوس پے در پے آنے لگتے ہیں اور اس کے بعد کسی قسم کا ملکی خیال نہیں آتا۔ یہ حالت قساوت اور بُعد کی ہے۔

اور گاہے روح و فرشتہ کی جانب سے بھلائی کے خیالات پے در پے آتے ہیں اور نفسانی خواہشات اور شیطانی وساوس سے بندہ محفوظ ہو جاتا ہے۔ یہ قرب کی علامت ہے اور یہ مقربین کا حال ہے۔ اور

گا ہے ایسا ہوتا ہے کہ شیطان کی جانب سے ہی خیر و بھلائی کے خیالات آنے لگتے ہیں۔ یہ صورت اللہ تعالیٰ کی جانب سے بندے پر امتحان کی ہے اور شیطان یہ کام مکر و فریب کے طور پر کرتا ہے اور اس کا اصل مقصد شرارت ہوتا ہے یا آخرکار اسے گناہ میں مبتلا کر دیتا ہے یا ایسی بھلائی میں مصروف کرتا ہے کہ جس کی وجہ سے وہ واجب یا افضل کام سے رہ جاتا ہے۔ اس طرح وہ ظاہری طور پر نیکی کرتا ہے مگر باطن میں برائی کر رہا ہوتا ہے۔ اس کا آغاز خیر اور انجام شر ہوتا ہے اور نفسانی شہوات اور شیطانی تمناؤں کو ایک خوبصورت جامہ دیتا ہے اور اس کا ظاہر نیکی کا سا نظر آتا ہے۔ یہ ایک دقیق ترین ابتلا ہے جس سے صرف علماء ہی آگاہ ہوتے ہیں۔

اور فرشتہ کا القاء ہمیشہ ہر حال میں خیرِ محض اور خیرِ صریح ہوتا ہے۔ اس لیے کہ ملائکہ کی یہ عادت نہیں ہے کہ وہ دھوکہ و فریب کریں۔ البتہ گاہے قلب سے ملکوتی خواطر ختم ہو جاتے ہیں اور یہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب قساوت بڑھ جائے اور نافرمانی میں ڈوب کر رہ جائے اس وقت دل اور شیطان کے درمیان آڑ ہٹ جاتی ہے اور شیطان نفسانی خواہش لے کر حملہ کر دیتا ہے اور چھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں شیطانی حملوں اور وساوس سے محفوظ رکھے۔ مقامِ ایمان میں رہ کر بندہ ہمیشہ ملکوتی الہامات کے ساتھ رہتا ہے۔ جب اس سے بلند ہو کر مقامِ یقین تک رسائی حاصل کرتا ہے تو روحانی انوارات کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ اس کی کارسازی فرماتا ہے۔ چنانچہ یہ رُوح القائے حق کے مقام پر ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ روحانی انوارات کے واسطہ سے بندے کو بعض ایسے اسرار القاء کیے جاتے ہیں کہ جن سے ملائکہ بھی آگاہ نہیں ہوتے۔ نفسانی خواہشات کے مکمل طور پر ختم ہونے تک یہ کام جاری رہتا ہے۔ آخرکار نفس، روح میں مندرج ہو کر رہ جاتا ہے اور پھر کوئی نفسانی خواہش پیدا ہی نہیں ہوتی۔ پھر اللہ تعالیٰ، نورِ یقین کے باعث اس کی کارسازی فرماتا ہے اور مستور خزائنِ غیب سے مکاشفاتِ جبروتی کے باعث اس کے لیے نورِ یقین چمکتا ہے اور بندہ غیب کے معاملہ کا مشاہدہ، مشاہدۂ حق کی طرح کرتا ہے۔ اس لیے کہ کون مفقود ہو جاتا ہے اور کینونت

اور اس کے بعد کی باتیں کھولنا صرف اہلِ حال ہی کے لیے مناسب ہیں یا جو اس کا سوال کرے۔

اور یہ بات مقامِ توحید میں ہی حاصل ہوتی ہے اور یہ مقربین کا ہی حصہ ہے۔ ہر عمل میں تین باتیں ضروری ہوتی ہیں۔ چاہے وہ قلیل عمل ہی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کارسازی کے ذریعہ یہ باتیں رکھی ہیں:

۱۔ توفیق۔ یعنی تم میں اس کام کرنے کی ہمت و توفیق پیدا ہو جائے۔

۲۔ قوت۔ یہ تحریک پختہ ہونے کا نام ہے جو کہ عقل کا پہلا حصہ ہے۔

۳۔ صبر۔ یعنی اس کی برکت سے ہی فعل پایۂ تکمیل تک پہنچتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان اصولوں کو ہر ایک میں رکھا اور انہی کے ذریعہ اعمال سرزد ہوتے ہیں۔ فرمایا:

وَ مَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ (اور اللہ کے بغیر مجھے کچھ توفیق نہیں)

مَا شَآءَ اللّٰہُ لَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ (جو اللہ چاہے۔ اللہ کے بغیر قوت نہیں)

وَاصْبِرْ وَ مَا صَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ۔ (اور تو صبر کر اور تجھ سے اللہ ہی کی مدد سے صبر ہو سکے)

اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت کے ساتھ، تقلیبِ کون کا مجمل ذکر فرمایا:

یُقَلِّبُ اللّٰہُ الَّیْلَ وَ النَّھَارَ۔ (اللہ بدلتا ہے رات اور دن)

اس لیے کہ یہ دونوں اشیاء کا ظرف ہیں۔ چنانچہ ان سے تعبیر کر دیا۔ فرمایا:

بَلْ مَکْرُ الَّیْلِ وَ النَّھَارِ۔ (کوئی نہیں، پر فریب سے رات دن کے)

مطلب یہ ہوا کہ نہار اور رات کا مکر۔ چنانچہ ان کے مکر کو ان دونوں کے مکر سے تعبیر کر دیا۔ اس لیے کہ یہ دونوں (شب و روز) ہی ان کے جائے مکر ہیں۔ اسی طرح فرمایا:

وَ لَہٗ مَا سَکَنَ فِی الَّیْلِ وَ النَّھَارِ۔ (اور اسی کا ہے جو کہ بستا ہے رات میں اور دن میں)

اس میں دو وجوہ ہیں:

۱۔ جو ٹھہرا اور اقامت پذیر ہوا۔ یہ سکن کا مفہوم ہے۔

۲۔ جو سکون پذیر ہوا۔ یہ سکون سے ہے۔

قلوب رحمٰن کی انگلیوں میں ہیں

حرکت کی بجائے سکون کا ذکر اسی لیے کیا کہ سکون اصل ہے اور حرکت بعد میں پیدا ہوتی ہے اور عجز و عدم کے قریب تر سکون ہے اور حرکت حادث چیز ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے حادث کرنے پر آئی ہے اور سکون کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے تاکہ اس کے ذریعہ حرکت پر استدلال کیا جا سکے کیونکہ سکون حرکت کی ضد کا نام ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

سَرَابِیْلَ تَقِیْکُمُ الْحَرَّ۔ (کرتے جو بچاؤ ہیں گرمی کا)

اور یہ بھی سردی سے بچاتی ہے۔ چنانچہ ایک وصف کا ذکر کر دیا تاکہ دوسرے پر استدلال کیا جائے۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے فرمایا:

وَ نُقَلِّبُ اَفْئِدَتَھُمْ وَ اَبْصَارَھُمْ۔ (اور ہم الٹ دیں گے ان کے دل اور آنکھیں)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھائی:

"نہیں، مقلب القلوب کی قسم"۔ جب کہ آپؐ نے تقلیب میں اللہ تعالیٰ کی عظیم قدرت اور لطیف صنعت دیکھی۔ جب آپؐ نے تقلیبات میں قدرتِ الٰہی کا سرعت سے اثر دیکھا اور ایسا مشاہدہ دوسروں کو

۔ حس نہیں ہے تو آپ نے مخلوق پر قدرت کی عظمتِ شان) اور تقلیب کے سابقہ علم سے خبر دیتے ہوئے اسے قسم بنایا۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا کرتے تھے ،

" اے مقلب القلوب (دلوں کو پھیرنے والے) میرا دل اپنے دین پر پختہ کر دے "

صحابہؓ نے عرض کیا :

" اے اللہ تعالیٰ کے رسولؐ ! اور آپؐ بھی (اس سے) ڈرتے ہیں ؟ "

فرمایا : " اور میں بھی بے خوف نہیں ہو جاتا جبکہ قلوب رحمٰن کی انگلیوں کے درمیان ہیں ۔ وہ جیسے چاہتا ہے انہیں پھیرتا ہے " اور دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ :

" اگر چاہے کہ اسے سیدھا رکھے تو رکھ دیتا ہے۔ اور اگر چاہے اسے ٹیڑھا کر دے تو ٹیڑھا کر دیتا ہے "

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے :

" پھرنے میں دلوں کی مثال چڑیے کی طرح ہے کہ وہ ہر گھڑی میں پھرتا (الٹ پلٹ ہوتا) رہتا ہے "

اور دوسری حدیث میں آتا ہے :

" پھرنے میں دلوں کی مثال ہنڈیا کی طرح ہے کہ جب اس میں بھرپور جوش آتا ہے " اور ایک مشہور حدیث میں آتا ہے :

" دل کی مثال ایسے ہے ۔ جیسے کہ ویران زمین میں ایک پر پڑا ہو اور ہوا اسے پیٹ کے بل سے اُلٹ کر پیٹھ کے بل الٹتی رہے ۔ (یعنی الٹ پلٹ کرتی رہے) "

چنانچہ دل مقامِ تقلیب ہے ۔ اس لیے کہ اس میں خزانہ ہائے غیب ہیں ۔ جیسے کہ تقلیب قلوب پر ایمان اور مختلف زمانوں کے تغیرات سے لاحق احکام کے لیے شب و روز مکان اور ظرف ہے اور یہ بھی لازمی ہے کہ مقلب القلوب ، قلوب اور اصحابِ قلوب کے درمیان حائل ہو جاتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے ایمان کو بعث کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا :

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۔ (اور جان لو کہ اللہ روک لیتا ہے آدمی سے اس کے دل کو اور یہ کہ اس کے پاس تم جمع ہو گے)

حضرت ابن عباسؓ نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا :

" مومن اور کفر کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور کافر اور ایمان کے درمیان حائل ہو جاتا ہے "

اور ایک قول یہ کہ :

" بندے اور اللہ و رسول کی دعوت قبول کرنے کے درمیان حائل ہو جاتا ہے "

اور ایک قول کے مطابق یہ ہے کہ:

"مومن اور بُرے انجام کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور کافر اور حسن خاتمہ کے درمیان حائل ہو جاتا ہے۔"

ایک قول یہ ہے کہ:

"مومن کے سامنے حائل ہو جاتا ہے کہ وہ کسی بڑے گناہ کا ارتکاب کر کے برباد نہ ہو جائے اور منافق کے سامنے حائل ہو جاتا ہے کہ اسے ایسی طاعت کی توفیق ہی نہ ہو کہ وہ نجات پا جائے اور موت اور توحید پر خاتمہ کے درمیان حائل ہو جاتا ہے"۔ اور یہ بات وعید حقیقی ہونے کے باعث مومنین کے لیے بعید نہیں ہے اور اسی طرح موحدین کے نزدیک اس کی تقلیب کی قدرت ہے کہ جیسے کہ تیز ہوا میں ایک پَر پڑا اُلٹ پلٹ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی قدرت اس کی مشیت کے مطابق اسے ادلتی بدلتی رہتی ہے اور قدرت کے لیے کوئی ترتیب و مسافت و بُعد نہیں۔ اور نہ ہی وہ زمان و مکان کی محتاج ہے۔

مشاہدہ و جہالت

چنانچہ ملک سے جو صادر ہوا اور نظروں کے سامنے جو پختہ ہو گیا۔ وہ حکمت و صنعت و اتقان کی وجہ سے ہے اور جو ملکوت سے پوشیدہ رہا اور قلبی بینائی کے ذریعہ متبدل ہوا تو یہ لطف قدرت اور قہر سلطانی کا کرشمہ ہے اور ہر بندے کو اس کی توحید کے حصہ کے مطابق ہی مشاہدہ قدرت کا حصہ ملتا ہے اور جس قدر اس میں یقین ہے۔ اس کے مطابق ہی اسے توحید میں حصہ ملتا ہے اور قریب تعالیٰ سے قرب کے مطابق ہی اسے یقین حاصل ہوتا ہے اور جس قدر اس کے قلب کو قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے اسی قدر اسے قرب ملتا ہے اور جس قدر اسے علم ربانی ہے اسی قدر اسے قرب الٰہی حاصل ہوتا ہے اور اس کے مزید ایمان کے مطابق ہی اسے علم الٰہی کی وسعت حاصل ہوتی ہے اور جس قدر اللہ تعالیٰ اس پر احسان فرمائے۔ اسی قدر اسے مزید ایمان حاصل ہو جاتا ہے اور جس قدر وہ اسی کا ہو رہے اسی قدر اس پر احسانِ خداوندی ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا علم اس سے بالاتر ہے اور یہ محجوب ذات قادر کریم کا راز ہے۔

اور ہر بندہ جس قدر غافل ہے اسی قدر وہ جاہل بھی ہے۔ جس قدر دنیا سے محبت کرتا ہے اسی قدر غافل ہے۔ جس قدر خواہش میں مستغرق ہے اسی قدر دنیا سے محبت کرنے والا ہے۔ جس قدر اس پر نفس اور نفسانی صفات کا غلبہ ہے۔ اسی قدر وہ خواہش میں ڈوبا ہوا ہے۔ جس قدر اس کا یقین کمزور ہے اسی قدر اس پر نفسانی صفات غالب ہیں۔ جس قدر اس پر کثیف پردے ہیں اور جس قدر وہ اللہ عزوجل سے دور ہے اس قدر اس کا یقین کمزور ہے۔ حجاب و بُعد کا انجام تکبر اور قساوتِ قلبی ہے اور قساوت کا انجام نافرمانی اور گناہ ہیں۔ اور گناہوں پر اعراض و ناراضگی آتی ہے اور جب مولائے کریم بندے پر ناراض ہو جائے

تو اس سے نظرِ عنایت ہٹا لیتا ہے اور اس پر نگاہِ غضب کرتا ہے اور اس کے بعد قہار و کریم کا رازِ قدرت ہے جو اس نے مخلوق سے علیحدہ اپنے لیے مخصوص فرما لیا۔

صدق و اخلاص سے رسائی ملتی ہے

بندہ کے مذکورہ صفات اس کی صفاتِ محمودہ کے برعکس ہیں۔ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا۔ (ایک طرف ہے کہ منہ کرتا ہے اس طرف)

اور جس قدر شیطان کا غلبہ ہوتا ہے اور جس قدر وہ سبز باغ دکھاتا ہے اس قدر دل پر خواہش غالب آتی ہے۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ وَ مَنْ يُّرِدْ اَنْ يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا۔

(سو جس کو اللہ چاہے کہ راہ دے کھول دے اس کا سینہ حکم برداری کو اور جس کو چاہے کہ راہ سے بھلا دے اس کا سینہ کر دے تنگ اور خفا)

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَ اِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ

(اگر اللہ تم کو مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہ ہوگا اور جو وہ تم کو چھوڑ دے گا۔ پھر کون ہے کہ تمہاری مدد کرے گا اس کے بعد)

وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ وَ اِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ۔

(اور اگر پہنچا دے تجھ کو اللہ کچھ تکلیف تو کوئی اس کو کھولنے والا اس کے سوا، اور اگر چاہے تجھ پر کچھ بھلائی تو کوئی پھیرنے والا نہیں اس کے فضل کو)

جب ہادی ہی راہ سے ہٹانے والا ہو تو ہدایت کون دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ۔

(پس بے شک اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا جس کو وہ گمراہ کرتا ہے)

اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ جسے وہ گمراہ کرے۔ اسے کوئی راہ یاب نہیں کر سکتا اور جسے اللہ نے اپنے سابقہ علم میں گمراہ کر دیا۔ اب وہ کیونکر راہِ ہدایت پر آ سکتا ہے؟ اسی لیے قرآنِ آخر کے طور پر فرمایا:

فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ۔

اگر عطا کنندہ ہی رکاوٹ ڈال دے تو پھر کون عطا کرے؟ اگر دنیا بھر کی سب بھلائیاں ایک بندے کے قلب میں ہوں۔ پھر بھی وہ اپنے قلب میں اپنے اختیار سے ایک ذرہ بھی نہیں پہنچا سکتا۔ اور نہ ہی رائی کے

دانہ برابر بھی اپنے آپ کو نفع دے سکتا ہے۔ اس لیے کہ اگرچہ اس کا قلب اس کا اپنا عضو ہے مگر یہ باری تعالیٰ کا خزانہ ہے اور اس میں وہ امور ہیں کہ جنہیں بندہ نہیں جانتا اور نہ ہی ان پر اسے آگاہی حاصل ہے۔ جیسے کہ جاہل اور گمراہ پر تعجب کرتے ہوئے فرمایا:

اَطَّلَعَ الْغَیْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا۔ (کیا جھانک آیا ہے غیب کو یا لے رکھا ہے رحمٰن کے ہاں اقرار)

اب یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ وہ امور مخفیہ کو جان کر جیسے چاہے ان میں تغیر کرتا رہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا کرتے تھے:

سُبْحَانَ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ۔ (پاک ہے دلوں کو پھیرنے والا)

اللہ تعالیٰ نے سید البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مخاطب کر کے حکم دیا کہ یہ اعلان کر دو۔

قُلْ لَا اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّ لَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ۔ (کہہ میں اپنے نفس کے لیے کسی نفع اور نہ کسی نقصان کا مالک ہوں مگر جو چاہے اللہ)

پھر فرمایا:

قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّ لَا رَشَدًا قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ وَّ لَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا۔ (کہہ دو میرے ہاتھ نہیں تمہارا برا اور نہ راہ پر لانا۔ تو کہہ مجھ کو نہ بچائے گا اللہ کے ہاتھ سے کوئی اور نہ پاؤں گا اس کے سوا کہیں سرک رہنے کو جگہ)

اور جب مالک غالب و جبار ہو اور ہر چیز اس کے قبضہ میں ہو۔ قوت اور حیلہ کے بل پر اس تک رسائی ناممکن ہو۔ اب اس تک رسائی کی صرف یہی صورت ہے کہ بندہ صداقت، اخلاص اور عجز و انکساری اختیار کرے۔

اس مکار عقل نے بندے کو پیدا کرنے والے اور دوبارہ اٹھانے والے کی جانب نظر کرنے سے روک رکھا ہے۔ اس لیے کہ اس کی صورت و حرکت اس نے ظاہر فرمائی۔ اس نے بندے کو اول تعالیٰ اور مصور تعالےٰ اور قادر محرک کریم سے حجاب میں ڈال دیا۔ چنانچہ اس نے اپنی نظر سے حرکت و سکون کا دعویٰ کر دیا۔ حالانکہ یہ محرک تعالیٰ کے سامنے اس کے لیے حجاب تھا کیونکہ خود حرکت و سکون کا اعتبار ہی غیب میں ہے۔ اس لیے کہ جب وہ مشہور ہو تو اس کی نگاہ اپنے نفس پر ہی ٹھہر جاتی ہے۔ نیز اس کی نظر محرک و مسکن تعالیٰ سے بُعدِ مقام کے باعث اندھی ہے۔ اس لیے کہ وہ حرکت سے پرے غائب ہے اور غیب کا مشاہدہ غیب کے ساتھ ہی ہوتا ہے اور یہی یقین ہے جیسے کہ مشاہدہ کی چیز کا مشاہدہ سے ہی ادراک ہے اور یہ عین (نظر) ہے اور ایک اندھا آدمی، فرشتہ سے کچھ نہیں دیکھتا۔ اسی طرح جس دل پر حجاب پڑ جائے وہ بھی فرشتہ سے

کچھ نہیں دیکھتا۔ چنانچہ عدمِ یقین کے باعث مشاہدہ سے اندھا ہو گیا۔ حجّت وحجاب آنے کے باعث اس نے عقل سے مشاہدہ کا ادراک حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اگر یہ اہلِ بصیرت میں سے ہوتا تو متحرک مشاہد کے ساتھ حرکتِ غیبیہ کا اعتبار کرتا۔ چنانچہ جیسے کہ جسم میں حرکت مخفی ہوئی۔ متحرک ظاہر ہوا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ نے متحرک ظاہر کر دیا اور اس میں حرکت مخفی کر دی۔ صنعت کو ظاہر کر دیا اور اس میں تفصیلِ حکمت کے باعث صنع کو مخفی کر دیا۔ اسی طرح صنعتِ اوّل کا صانع اور حکمت غالبہ والا احاکم اعلیٰ حرکت سے غائب ہوا جس کو اس نے لطائفِ قدرت سے اس کے نیچے مخفی کر دیا۔ چنانچہ معقول کا مشاہدہ کیا۔ جو ان دونوں کا مشاہدہ کرایا اس کیلیے نمایاں کیا اور اس کی جانب اس کا رُخ کر دیا۔ اس لیے کہ یہ بچّہ اور اس کے لیے پکا ہے۔ اور یقین کے فقدان کے باعث باقی مغیبات سے اندھا ہو گیا۔ ان دونوں کے وقت اس نے شاہد کے لیے حرکت و سکون کا دعویٰ کیا۔ چنانچہ شاہد سے حجاب ہو گیا اور موحد نے شہادت توحید کے ذریعہ مشاہدہ کر لیا۔ آخر نورِ یقین کے باعث جو ملکوت اس کے لیے منکشف ہوا۔ اس نے اسے پا لیا اور فرد بن گیا۔

ایمان اور یقین

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"جس نے توحید میں اپنی عقل کی جانب نظر کی اس کی توحید اسے آگ سے نجات نہ دے گی اور دنیا میں جس کی توحید عقل پر معلق ہوگی اس کی توحید اسے یقین نامہ نہیں دے جا سکے گی۔"

میں سمجھتا ہوں کہ اس ایمان کا مثال یہ ہے کہ جیسے فرمایا جائے گا:

"جس کے دل میں ذرہ بھر ایمان ہو اسے بھی آگ سے نکال دو۔ اور جو اس مقدار سے زیادہ ہوگا اس کا انتہا، یقین کے مانند ہے۔ اسے روح کی آبرو حاصل ہے اور وہ بجھے گا نہیں۔ اور اسے آگ سے دُور رکھا جائے گا۔

تین حجابات

اس حجاب کے بعد مخلوق پر تین حجاب دُوسرے بھی ہیں جن میں سے بعض زیادہ کثیف اور بعض کم کثیف ہیں:

۱۔ اسباب اور واسطے۔

۲۔ شہواتِ جاذبہ۔

۳۔ پیدا ہونے والی یا لوٹ کر آنے والی عادات۔

چنانچہ اسباب انسان کو برائیوں پر آمادہ کرتے ہیں، شہوتیں اسے کھینچ کر لاتی ہیں اور عادات انسان کو بار بار اس کا ارتکاب کراتی ہیں اور ان میں سے جو حجاب دل پر ظاہر ہوا اس کا اثر ہو جائے گا اور بعض حجاب زیادہ سخت اور بعض ہلکے ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہ شیطان کی جگہ ہوتا ہے اور جس قدر اس میں وسعت ہوگی،

شیطان کو اس قدر زیادہ تسلط ہو جاتا ہے۔ آخر کار شیطانی اثرات کے باعث نفسانی قوت پکڑ جاتی ہے اور اسے بندے پر شدید تر تسلط حاصل ہو جاتا ہے۔

اور جب بندہ، نفس کے "ابو بیر" (اسیر) تو (نفس کا غلام اور قیدی) بن کر رہ جاتا ہے۔ خواہش نفس اس کی حاکم ہوتی ہے اور اسی حالت میں شیطان اسے سرکشی اور گمراہی کی راہ پر چلاتا ہے۔ اور اولاد و اموال میں شیطان کی شرکت ہو جاتی ہے کہ اس سے اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی یاد سے غافل کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی دوستی اور مصاحبت کی مذمت فرمائی کہ:

وَ مَنْ يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَآءَ قَرِيْنًا۔ (اور جس کا ساتھی ہوا شیطان تو بہت برا ساتھی ہے)

یہ وسوسہ اور اکساہٹ اور عزم و ہمت کے بعد شیطانی خیال سے بالاتر ہے اور اصل میں قلب پر یہ شیطانی وسوسہ ہوتا ہے جو بندے کو پُر امید بناتا اور توبہ میں تاخیر کرنے کا باعث بنتا ہے۔ آخر بندے کے لیے نافرمانی اور گناہ آسان ہوتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کے بعد بخشش مانگ لینا۔ اس طرح سے اسے گناہ پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ ایک جھوٹا وعدہ ہے۔ اس لیے کہ گناہ کے بعد ہلاکت و بربادی کا معاملہ ہے۔ فرمایا:

يَعِدُهُمْ (انہیں وعدے دیتا ہے) کہ توبہ کر لینا اور يُمَنِّيْهِمْ (اور انہیں امیدیں دلاتا ہے) کہ بخشش ہو جائے گی۔ وَ مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا (اور جو توقع دیتا ہے ان کو شیطان سو سب دغا ہے)

یہ تمام کام اسی وقت ہوتا ہے کہ جب بندہ اپنے دشمن پر اعتبار کر کے اس کے بارے میں حسنِ ظن اختیار کر لیتا ہے اور مقامِ بُعد میں پڑ کر خواہش کی تابعداری میں لگ جاتا ہے اور علمِ الٰہی کا کشف ہے۔ اظہارِ حکم اور انفاذِ مشیت الٰہی کے ساتھ۔ اب دشمن ہی سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ لَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (اور سچ کر دکھائی ان پر ابلیس نے اپنی اٹکل، پھر اسی کی راہ چلے مگر تھوڑے سے ایماندار)

اور سابقہ علم کے ساتھ اسے پختہ کیا۔ فرمایا:

وَمَا كَانَ لَهٗ عَلَيْهِمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ۔ (اور اس کا ان پر کچھ زور نہ تھا)

یعنی اس کی قوت کے بغیر یہ نہ تھا اور اس کے قہر و مشیت [illegible] ساتھ کہ

اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يُّؤْمِنُ بِالْاٰخِرَةِ مِمَّنْ هُوَ [illegible] (مگر اتنا واسطے کہ معلوم کریں ہم کون یقین لاتا ہے آخرت پر الگ،

مِنْهَا فِیْ شَكٍّ ۔ (اس سے جو رہتا ہے اس کی طرف سے شک میں)

یعنی ہم اسے دیکھیں کہ ایسا کون ہے؟ اور ایک قول کے مطابق یہ مراد ہے کہ:

"تاکہ ہم وہ علم جان لیں کہ اس پر سزا و جزا کا بدلہ آتا ہے۔"

اور ایک قول یہ ہے کہ ہم امتحان لے لیں۔

اور ایک قول یہ ہے کہ ہم پر ایمان لانے والوں کا پتہ کریں تاکہ ان کے لیے یہ واضح ہو جائے اور جو اس قسم کے اعمال کرے گا اس کا پردہ فاش ہو جائے گا اور اس کا کذب ظاہر ہو کر یہی بداعمالی اس کیلئے حجت بن جائے گی جیسے کہ فرمایا:

فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَ لَیَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِیْنَ ۔ (سو البتہ معلوم کرے گا اللہ جو لوگ سچے ہیں اور البتہ معلوم کرے گا جو جھوٹے ہیں)

چنانچہ کتاب اللہ میں لِنَعْلَمَ اور حَتّٰی نَعْلَمَ کے الفاظ میں اس طرح مجازی مفاہیم مراد ہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کو ان سب باتوں کا علم پہلے سے حاصل ہے اور جب تمام اشیاء اس کے علم سے ہیں اور اس کے علم کے ساتھ جاری ہیں تو اب سابقہ مخفی کردہ علم کو ظاہر و آشکارا کرنے کے لیے ہی دشمن کو مسلّط کیا جیسے کہ بندوں کے باطن کو ظاہر و آشکار کرنے کے لیے ان کے ظاہری افعال کو (ذریعہ اظہار) بنایا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ:

"علم سبقت کر چکا، قلم خشک ہو گئی، قضا کا فیصلہ ہو گیا اور مقدر مکمل ہو گیا۔ اہل طاعت کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سعادت ہے اور نافرمانوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف بدبختی ہے۔"

خیالات کی تقسیم و تفصیل

خواطر کے مختلف اسماء ہیں:

۱۔ دل میں جو بھلائی کی بات آئے اسے الہام کہا جاتا ہے۔

۲۔ اور جو برائی کا خیال آئے اسے وسوسہ کہا جاتا ہے۔

۳۔ اگر بھلائی کرنے کا ارادہ ہو تو اسے نیت کہا جاتا ہے۔

۴۔ مباح امور کا ارادہ کرنا اور ان کے سلسلہ میں خواہش کرنا، امنیہ و امل کہلاتا ہے۔

۵۔ آخرت کی یاد اور وعدہ و وعید کو یاد کرنے کا نام تذکر و تذکیر ہے۔

۶۔ یقین کے بعد غیب کی بات دیکھنا مشاہدہ کہلاتا ہے۔

۷۔ نفس کی طرف سے جو معاشی و احوال زندگی کے بارے میں فکر پیدا ہو اسے ہم کہا جاتا ہے۔

۸۔ شہوانی خیالات اور عادات کے تخیلات کو لم کہا جاتا ہے۔

اور ان سب کا ایک مشترکہ نام خواطر ہے۔ اس لیے کہ یہ یا تو نفس کی ہمت سے آتے ہیں یا دشمن کے حسد کے باعث پیدا ہوتے ہیں یا فرشتہ کی طرف سے القا ہوتے ہیں۔

خزائن غیب سے دل میں آنے والے خیالات کی چھ اقسام ہیں۔ ان میں سے تین قابل معافی ہیں اور تین کے بارے میں پرسش ہوگی۔

ہمت، یہ کسی چیز کے بارے میں نفسانی خیال ہے کہ بندے کے دل میں بجلی کی طرح اچانک آتا ہے۔ اگر بندہ ذکر اللہ کرے تو مٹ جائے گا اور اگر ذکر اللہ سے غافل رہا تو یہ پختہ ہو جائے گا۔ اور یہ شیطان کی طرف سے زینت کا رنگ لے کر آتا ہے۔ اگر اسے ہٹا دے تو یہ ختم ہو جائے گا۔ اور اگر اس میں دھیان دیا اور اسے خوب سمجھا تو یہ غلط خیال طاقت ور ہو کر وسوسہ بن جائے گا۔ نفس شیطان کی طرف راغب ہوتا ہے تو یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ اگر بندہ ذکر اللہ میں مشغول ہو جائے تو نفس قابو میں رہے گا اور ذکر اللہ کی برکت سے شیطانی اثرات ختم ہو جائیں گے۔ یہ تینوں خیالات اللہ تعالیٰ کی رحمت کے باعث قابل معافی ہیں۔ اور (خیالات تک رہنے کی حد تک) ان پر کچھ گرفت نہ ہوگی۔

اور اگر بندہ نے نفس کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ شیطان کی طرف خوب راغب رہے تو وسوسہ طاقت ور ہو کر نیت میں بدل جائے گا۔ اب اگر بندہ، اس نیت کو بدل کر نیک نیت کر لے اور برائی سے توبہ کر کے استغفار کرے تو ٹھیک ورنہ یہ نیت پختہ ہو جاتی ہے۔ یہ تینوں قلبی اعمال ہیں اور بندے کو ان پر مواخذہ و پرسش ہوگی۔ اگر عزم ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں دور کر دے تو ٹھیک ورنہ عزم پختہ ہو کر طلب و سعی بن جاتا ہے اور خزائن غیب و ملکوت کے اعضائے ظاہر کے ذریعہ عمل وجود میں آجاتا ہے۔ چنانچہ خزانہ ملک و شہادت میں یہ ایک بدنی عمل بن جاتا ہے۔ اس طرح نیکی و بدی کے اعمال ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اگر نیکی کے کام میں نیت و عزم کیا تو بندے کے نامۂ اعمال میں اس کا بھی ثواب لکھ دیا جاتا ہے اور اگر برائی کے کام کی نیت و ارادہ کیا تو بدنیتی اور نافرمانی کے ارادہ اور دل کے غلط عزم پر مواخذہ ہوگا، اور نفس ہی شیطان سے زیادہ ہم جنس اور اس سے ملنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے وسوسہ میں ان دونوں کو جمع کر دیا۔ فرمایا:

اَلْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ۔ (وسوسہ ڈالنے والے پھسلانے والے)

اور فرمایا:

و نعلم توسوس بہٖ نفسہٗ ۔

اور اللہ تعالیٰ نے ہر مخلوق کی مثال اور ضد دونوں پیدا فرمائیں۔ چنانچہ شیطان کی مثال نفس ہے اور ان دونوں کی ضد روح ہے۔

اعضائے ظاہر کے اعمال کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ طاعت

۲۔ نافرمانی۔

ان دونوں کا اجر و گناہ بہت ہی زیادہ ہے۔ سوائے اس کے کہ جو ظاہر جسم سے نہ کرے مثلاً توحید کی شہادت دینا یا شک پایا جانا یا کفر یا بدعت کا عقیدہ رکھنا۔

باب آخر **خیالات کی ایک عجیب تقسیم**

اگر دل میں نافرمانی کا خیال آئے مگر پختہ نہ ہو تو یہ شیطانی وسوسہ ہے اور اگر دل میں برائی کا پختہ خیال آئے یا ہر وقت ایسی حالت رہے تو یہ نفس امارہ کا طبعی شر ہے یا بری عادت کے باعث برائی کا مطالبہ ہے۔ اگر بندے کو گناہ کا خیال پیدا ہو اور وہ اس کام میں برا سمجھے تو یہ شیطانی خیال ہے اور گناہ سے کراہت ایمان کی جانب سے ہے۔ اور اگر دل میں گناہ یا نافرمانی کا خیال پیدا ہو۔ پھر کوئی رکاوٹ سی آجائے، تو ممانعت کا یہ ملکوتی القا ہے۔ گاہے بندہ آخرت کی فکر کرتا ہے یا موجودہ حال پر سوچ بچار کرتا ہے تو یہ عقل کی جانب سے القا ہے اور خوف و رجاء، تقویٰ، زہد یا آخرت کی کوئی بات اگر بندے میں پائی جائے تو یہ ایمان کی برکت سے ہے۔ گاہے قلب کو عظمت یا ہیبت یا قرب کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ یقین کی برکات سے ہے اور یہ مزید ایمان ہے۔ فرمایا:

وَ اِلَیْهِ یُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَ تَوَكَّلْ عَلَیْهِ۔ (اور اسی کی طرف رجوع ہے کام سارا، سو اس کی بندگی کر اور اسی پر بھروسہ رکھ)

جیسے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی کہ:

اَعُوْذُبِكَ مِنْكَ۔ (میں تیری پناہ مانگتا ہوں تجھ سے)

دراصل یہ حدود کی توضیح ہے۔ مکان کا اظہار اور علم کو پختہ کرنا ہے۔ فرمایا:

وَ كُلَّ شَیْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِیْلًا۔ (اور سب چیز سنائی ہم نے کھول کر)

اور فرمایا:

قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ۔ (ہم نے کھول دیے نشان دھیان کرنے والوں کو)

توحید و مشاہدہ میں تفکر نہیں ہوتا۔ اشارہ میں دیکھا نہیں ہوتا اور قدرت میں ترتیب نہیں ہوتی۔ البتہ

علمِ تفصیل ضروری ہے نہ کہ توحید سے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ طریقے ظاہر کرنے، راہیں منور کرنے اور سالکین کے مسالک بتانے اور اہلِ عمل کو درجہ پر رکھنے کے لیے زبانِ شرع کے ساتھ خزانۂ جمع سے سب باتیں منتشر کی جائیں۔

لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ۔ (تا مرے جو مرتا ہے سوچ کر، اور جیوے جو جیتا ہے سوچ کر)

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلَىٰ أَمْرِهِ۔ (اور اللہ غالب ہے اپنے امر پر)

اعمال کی تین قسمیں ہیں

بعض علمائے بندوں کے اعمال کی ایک دوسری توضیح کی اور امر و ارادہ میں فرق بتایا۔ فرمایا:

"بندوں کے اعمال کی تین اقسام ہیں:

۱۔ فرض۔

۲۔ فضیلت۔

۳۔ نافرمانی۔"

چنانچہ بتایا کہ ہم کہا کرتے ہیں۔ فرض اللہ تعالیٰ کے حکم کے باعث ہے اور اس کی محبت و مشیت کے باعث ہے۔ چنانچہ فرائض میں یہ تینوں باتیں جمع ہو گئیں۔

فرمایا کہ ہم کہا کرتے ہیں۔ نفل اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوتے۔ اس لیے کہ اس نے واجب نہیں کیا، اور ترکِ نفل پر سزا نہیں رکھی۔ البتہ ان میں اللہ تعالیٰ کی محبت و مشیت ضرور آتی ہے۔ اس لیے کہ یہ مشروع ہیں اور پسند ہیں اور فرمایا کہ ہم کہا کرتے ہیں۔ نافرمانی اللہ تعالیٰ کے حکم سے نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاءٔ علیہم السلام کی زبانی اسے مشروع نہیں فرمایا اور نہ ہی یہ اللہ تعالیٰ کی محبت کے باعث کی جاتی ہے اس لیے کہ اسے یہ ناپسند ہے اور اسی وجہ سے اس کا نہ حکم دیا اور نہ ہی یہ مندوب ہے۔ البتہ اللہ جل جلالہٗ کی مشیت کے ساتھ ہے اس لیے کہ اس کے ارادہ سے کوئی چیز خارج نہیں جیسے کہ کوئی چیز اس کے علم سے خارج نہیں ہے۔ ارادہ اور مشیت دونوں کا ایک مفہوم ہے۔ چنانچہ جس طرح ہر چیز علم میں داخل ہوئی اس میں بھی ہر چیز داخل ہو گئی۔ اور اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے ہر ارادہ کا اُسے سابق علم بھی ہے۔ اسی طرح جس کا اُسے علم ہے اُس کا اسے ارادہ بھی ہے۔ سابق علم نے اس کا ارادہ ظاہر کر دیا۔ موجودہ کے بارہ میں اس کے ظہورِ ارادہ کے ذریعہ اس کا علمِ غیب کھلا۔ چنانچہ وہ عالم الغیب والشہادۃ ہے۔ غیب اس کا علم ہے اور شہادۃ اس کا معلوم ہے۔ چنانچہ معلوم، علم کے خلاف کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ وہ اس کا اجزاء ہے، اور

ارادہ نے معلوماتِ خلق میں علم نافذ کیا اور یہ فرضِ توحید ہے۔ چنانچہ تفصیلِ احکام میں امر سے نوافل نکل گئے۔ اور محبت سے نافرمانی نکل گئی۔ حلال وحرام واضح ہو گیا اور مشیت سے معصیت خارج نہ ہوئی۔ اللہ جل شانہٗ نے فرمایا:

وَكُلُّ صَغِيرٍ وَكَبِيرٍ مُسْتَطَرٌ۔ (اور ہر چھوٹی اور بڑی لکھنے میں آچکی)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہر چیز، قضا وقدر کے ساتھ ہے۔ حتیٰ کہ عجز و دانش مندی۔"

چنانچہ آپؐ نے دو لطیف عوارض بتا دیے کہ جو محرومی اور عطا کے باعث ہوتے ہیں۔

امر و ارادہ میں فرق

ہمارے عالم نے امر و ارادہ کے درمیان ایک لطیف فرق بتایا۔ ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ ان سے اللہ عزوجل کے اس فرمان کے بارے میں پوچھا گیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ابلیس کو حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو کیا اس نے یہ کرنے کا ارادہ بھی کیا یا نہیں؟۔

انہوں نے فرمایا: اس کا ارادہ فرمایا اور اس سے ارادہ نہیں کیا۔ یعنی اس پر واجب کرنے اور مشروع کرنے کا ارادہ کیا مگر اس سے واقع ہونے اور ہو جانے کا ارادہ نہیں کیا۔ اس لیے کہ ہوتا وہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ ارادہ کرے۔ اب اگر وہؒ اس کا ارادہ فرما لیتا تو سجدہ ہو جاتا اور اگر فعل ہو جانے کا ارادہ فرماتا تو یہ واقع ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ (اس کا حکم یہی ہے۔ جب چاہے کسی چیز کو کہ کہے اس کو، ہو، وہ ہو جاتی ہے)

اب جب سجدہ نہیں ہوا تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ نہیں فرمایا۔ اب دونوں امور ساتھ تھے۔ تکلیف و تعبد کا تھا اور یہ بھی ارادہ تھا کہ سجدہ نہ کرے۔ چنانچہ وہ اس پر قادر نہیں ہو سکتا کہ سجدہ نہ کرنے والوں میں سے نہ بنے جیسے کہ وہ اس پر قادر نہیں ہو سکا کہ وہ ایمان لانے والوں میں ہونے سے رک جائے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو درخت کا پھل نہ کھانے کے حکم کے سلسلہ میں بھی یہی توضیح ہے کہ ان سے کھانے کا ارادہ فرمایا اور ان کے لیے اس کا ارادہ نہیں کیا۔ یعنی وقوع و کون کا ارادہ کیا۔ اس لیے کہ یہ واقع ہو چکا۔ جیسے کہ فرمایا:

اِذَآ اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔ (جب ہم نے اس کو چاہا۔ یہی ہے کہ کہیں اس کو، ہو، تو وہ ہو جائے)

اب جب معلوم ہو گیا کہ اس نے ارادہ فرمایا مگر مشروع و مامور ہونے کا ارادہ نہیں کیا۔ اس لیے کہ اس کا

امر نہیں کیا اور نہ ہی اسے مشروع بتایا تو اب دونوں باتیں جمع ہوگئیں :

۱۔ اس کا ارادہ کہ بندہ مکلف و مامور ہو۔

۲۔ اور اسے کھانے کا ارادہ، اس لیے کہ یہ بات واقع ہوگئی۔

اب ہر اس معاملہ میں یہی بحث چلے گی کہ جس کا حکم دیا اور اس کا ارادہ فرمایا کہ امر و نہی کا ارادہ فرمایا تاکہ بندے مکلف اور عبادت کرنے والے ہوں اور یہ ارادہ نہیں کیا کہ وہ طاعت کرنے اور رُکنے والے نہ ہوں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

إِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَيْءٍ إِذَا أَرَدْنَاهُ أَنْ نَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ۔ (ہمارا کہنا کسی چیز کو جب ہم نے اس کو چاہا۔ یہی ہے کہ کہیں اس کو 'ہو' تو وہ ہو جاتی ہے)

چنانچہ یہ بتایا کہ اس کا ارادہ یہ ہُوا کہ یہ ہو جائے۔ جیسے کہ ایک بات ہو جانے سے معلوم ہوا کہ اس کا ارادہ یہی تھا اس لیے کہ یہ ہو گئی۔ اب جب نافرمانوں سے امتثال اوامر نہ ہُوا تو معلوم ہو گیا کہ اس نے ارادہ ہی نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ اگر ارادہ فرماتا تو (امتثالِ اوامر) ہو جاتا۔

اور جب مامورین نے عمل نہیں کیا تو معلوم ہُوا کہ اس کا یہی ارادہ تھا اس لیے کہ اگر یہ ارادہ نہ ہوتا تو یہ بات بھی نہ ہوتی۔ اب ایک چیز کا ہو جانا اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہی ارادہ تھا اور امر و نہی کے ساتھ ارادہ واقع ہو چکا۔ اب ہر ایک مامور ہے اور اسے ممانعت ہے مگر سب سے فعل واقع نہیں ہُوا۔ اس لیے کہ اس کے وقوع کا اس نے ارادہ نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ اگر ارادہ فرمایا ہوتا تو فعل واقع ہو جاتا۔ یہی ابتلاء اور ظہورِ ابتلاء کے ارادہ کی اصل ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک چیز کا حکم فرماتا ہے اور اس کی ضد ہونے کا ارادہ فرماتا ہے اور ایک چیز سے منع فرماتا ہے اور اس کے ہو جانے کا ارادہ فرماتا ہے جبکہ اس سے صرف ممانعت کا ارادہ کرتا ہے۔ ہمارے عالم ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ امر و خیر کے علم میں اور ابتلاء و قہر کے سلسلہ میں ایسی ایسی عالمانہ توضیح فرمایا کرتے کہ آج ان سے مفاہیم تک رسائی ممکن نہیں اور آجکل کوئی بھی وہ باتیں معلوم نہیں کرتا۔ ترک کے ذریعہ امر ظاہر ہوتا ہے اور فعل کے ذریعہ نہی ظاہر ہوتی ہے۔ ابتلاء آنے پر احکام ظاہر ہوتے ہیں اور اس کے ارادۂ ابتلاء کی بناء پر جبر کے باعث اعضاء و جوارح مقہور و مغلوب ہوتے ہیں۔

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ اس علم میں ہمارے پیشوا اور امام ہیں۔ انہوں نے جریانِ علم اور مخالفتِ امر پر عذاب کے درمیان فرق واضح فرمایا۔ آج کے معتزلہ کا امام عمرو بن عبید کچھ مدت تک ان کی صحبت میں رہا۔ پھر ان سے الگ ہو گیا تو حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کو معلوم ہُوا کہ عمرو بن عبید یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی چیز کا فیصلہ نہیں کرتا۔ پھر اس پر عذاب کرتا ہے۔ تو انہوں نے جواب دیا : تیرا ناس ہو، اللہ عزّوجل

اپنے حکم جاری ہونے پر عذاب نہیں دیتا بلکہ وُہ اپنے امر کی مخالفت کرنے پر عذاب دیتا ہے۔
(اس کی وضاحت یہ ہے) کہ جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم دیا۔ وہ اس کے ساتھ منفرد ہے۔ اس میں امر و نہی نہیں کیا۔ اس پر عذاب نہیں دیتا اس لیے کہ اس میں بندے کو شہوت اور فعل سے دخل ہی نہیں دیا۔ اور جس میں بندے پر یہ فیصلہ فرمایا کہ اس میں بندے کو شہوت اور قصد کو دخل دیا۔ اس پر عذاب دے گا اور یہ بات نفسانی خباثت اور کہ جب اسے کسی چیز میں داخل گیا تو اس کی برائی اس پر لوٹ آئی۔ اور ساری امت کا اس قول پر اجماع ہے کہ:

"جو اللہ چاہے وہ ہو جاتا ہے اور جو وُہ نہ چاہے نہیں ہوتا۔"

اور اس قول پر بھی امت کا اجماع ہے۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ (اللہ تعالیٰ کے بغیر کوئی توفیق اور قوت نہیں) - یہ اصول ہر چیز میں جاری ہے۔ یہ نہیں کہ بعض اشیاء میں جاری ہو اور بعض اشیاء اس قاعدے سے مستثنیٰ ہوں اور لغت میں حول کا معنی حرکت ہے اور دُور سے نظر آنے والے کو عرب لوگ دیکھ کر کہا کرتے ہیں۔ دیکھو وُہ کیا ہے؟ انسان ہے، درخت ہے یا پتھر ہے؟

فان حا یحول فھو انسان۔ (اگر وُہ متحرک ہو تو وہ انسان ہے) یعنی فان کان متحرک (اگر وُہ حرکت کرے) اور قوت کا معنی ہے حرکت کے بعد تھم جانا اور پرسکون ہو جانا اور یہ بات صبر کا آغاز ہے۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی قوت سے فعل ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس کی تفسیر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ فرمایا:

"اللہ کے بچائے بغیر، اللہ کی نافرمانی سے بچاؤ نہیں اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر اللہ تعالیٰ کی مدد سے ہی توفیق ملتی ہے۔" اور احکام کے ان مفاہیم کی یہ توضیح ہی ظاہر علم، فرض تقدیر، مضمون تنزیل و شرع ہے اور ملک جبر تعالیٰ کا جبر ہے۔ اپنی مخلوق کو جس پر چاہتا ہے لے جاتا ہے جیسے کہ جسے چاہا پیدا فرمایا اور جدھر چاہتا ہے لے جاتا ہے جیسے کہ جس میں چاہا پیدا فرما دیا۔

فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ۔ (چنانچہ اللہ بزرگ و برتر کے لیے حکم ہے)

یعنی جو واحد و قہار ہے۔ جیسے چاہتا ہے اپنے بندوں پر غالب آتا ہے اور جو چاہتا ہے ان پر جاری کر دیتا ہے۔ اُسی کی حجتِ بالغہ ہے اور غالب عزت، نافذ ہونے والی قدرت، وصفِ ربوبیت اور حکمِ جبریت کے ساتھ مشیتِ سابقہ کا مالک ہے۔ بندوں پر اطاعت و امتثال اور بندگی و اجتہاد لازم ہے۔ خوشی و رضا ہر حال میں بندگی اور مملوکیت کے وصف کے ساتھ اطاعت لازم ہے۔

اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ هُوَ رَبُّكُمْ۔ (اگر اللہ چاہتا ہوگا تو تم کو بے راہ چلادے۔ وہی ہے رب تمہارا)

اِنْ يُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۔ (اگر تو ان کو سزا دے تو وہ تیرے بندے ہیں)

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ وَمِنْهَا جَائِرٌ وَ (اور اللہ پر پہنچتی ہے سیدھی راہ اور کوئی راہ کج بھی ہے

لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ۔ اور وہ چاہے تو راہ دے تم سب کو)

لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ ۔ (اللہ کے ہاتھ میں ہیں کام پہلے اور پچھلے)

فصل ۱۳

علم اور علماء کا بیان

اس فصل میں حسب ذیل امور کا بیان ہوگا :

علم اور اس کی تفصیل ، علماء کے اوصاف ، تمام علوم پر علمِ معرفت کی افضلیت ، علماءِ سلف کے مختلف طُرُق کا بیان ، علومِ سکوت کی فضیلت ، علم میں اہلِ تقویٰ کا طریقہ ، علمِ ظاہر اور علمِ باطن کے درمیان فرق ، علمائے دنیا اور علمائے آخرت کا امتیاز ، علماءِ ظاہر پر اہلِ معرفت کی فضیلت ، علومِ دنیا کے ذریعہ دنیا کمانیوالے علماءِ سؤ کا بیان ، علم کی تعریف اور تعلیم کا طریق ۔ متاخرین کی قصہ گوئی اور کلام کی مذمت ۔ ان اقوال و افعال کا بیان جو سلف میں نہ تھے اور اب عوام نے ایجاد کر رکھے ہیں ۔ تمام علوم پر ایمان و یقین کی فضیلت رائے سے پرہیز ، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو احادیث " طلبِ علم ہر مسلمان پر فرض ہے " اور " علم حاصل کرو چاہے چین میں ہو ۔ اس لیے کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے " کی تشریح و توضیح ۔

ہمارے عالم ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا :

اس سے آپؐ کی مرادِ علمِ حال ہے یعنی بندہ جس مقام پر ہے اس کے حال کا علم کہ تم میں سے ایک آدمی خاص کر کے اس حالت کا علم رکھے جو کہ دنیا و آخرت میں اس کے اور اللہ عزوجل کے درمیان ہے ، چنانچہ وہ اس میں ہی احکامِ الٰہی پر چلتا ہے ۔

ایک عارفؒ فرماتے ہیں :

" اس کا مطلب ہے علمِ معرفت طلب کرنا اور بندے کا اس کی ساعت کے حکم پر قائم رہنا اور دن کی ہر گھڑی میں جو بھی اس سے تقاضا ہو ، اس پر چلنا "

ایک شامی عالمؒ فرماتے ہیں کہ :

" آپؐ کی اس سے مرادِ علمِ اخلاص طلب کرنا ، نفسانی آفات و وساوس کو پہچاننا ، دشمن کی مکاریوں اور دھوکہ دہی سے آگاہ ہونا اور اعمال کو فاسد کرنے والے اور خراب کرنے والے امور سے واقف ہونا ان کی طلب فرض ہے اس لیے کہ اعمال میں اخلاص اختیار کرنا بھی فرض ہے اور آپؐ ابلیس کی دشمنی سے سب سے زیادہ جاننے والے تھے ۔ اس لیے اس کی عداوت کا حکم دیا "

عبدالرحیم بن یحییٰؒ اور موسیٰؒ اور ان کے تابعین کا یہ قول ہے ،

ایک بصری عالمؒ اس کا یہ مطلب بیان فرماتے ہیں کہ " علمِ قلوب طلب کرنا ، خواطر کی پہچان اور

ان کی تفصیل معلوم کرنا فرض ہے ۔ اس لیے کہ یہ امور بندے کی جانب ، اللہ تعالیٰ کے پیام بر ہیں اور شیطان کی طرف سے اور نفس کی طرف سے وساوس آیا کرتے ہیں ۔

اسی سے بندے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتلاؤ امتحان ہوتا ہے اور اس کی نفی میں نفس کا مجاہدہ اس بات کا متقاضی ہے ۔ مزید برآں یہ نیت کی ابتدا ہے اور ہر عمل کا آغاز یہی ہے ۔ اس سے افعال ظاہر ہوتے ہیں ۔ اور اس کے مطابق اعمال (کا اجر) بڑھتا ہے ۔ اس لیے کہ ضروری ہے کہ انسان القائے ملکوتی اور القائے شیطانی میں امتیاز کرے ۔ روحانی اور نفسانی وساوس کا فرق رکھے ۔ علم یقین اور عقلی اپچوں کے درمیان تفریق کر سکے ۔

صوفیاء کے نزدیک یہ علم فرض ہے ۔ یہ مالک بن دینارؒ ، فرقد سنجی ، عبدالواحد بن زید اور ان کے زاہد اتباع کا یہی مذہب ہے ۔ ان کے استاذ حضرت حسن بصریؒ اس میں کلام فرمایا کرتے اور ان حضرات کو علوم قلبی انہیں سے حاصل ہوا ۔

حلال کا علم فرض ہے

شامی عابدین نے فرمایا :
" اس کا مطلب یہ ہے کہ حلال کا علم حاصل کرنا فرض ہے ۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کا حکم دیا ہے " اور تمام مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ حرام خور آدمی فاسق ہوتا ہے ۔ ایک توضیحی حدیث میں آتا ہے کہ ؛

" ادائیگیٔ فریضہ کے بعد حلال روزی تلاش کرنا فرض ہے "

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ ، یوسف بن اسباطؒ ، وہیب بن وردؒ اور حبیب بن حربؒ کا یہی فرمان ہے ۔ ایک عارفؒ فرماتے ہیں ؛

" اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل آدمی پر علمِ باطن حاصل کرنا فرض ہے " مگر یہ بات عام مسلمانوں کے لیے نہیں ہے بلکہ یہ علمِ (باطن) خواصِ اہلِ قلوب کے ساتھ ہی مخصوص ہے ۔ مزید برآں حدیث میں آتا ہے کہ " یقین سیکھو " تو اس کا مطلب ہے : " علمِ یقین حاصل کرو " اور علمِ یقین ، اہل یقین حضرات کے ہاں مل سکتا ہے اور یقین ، اہل یقین کے اعمال سے ایک عمل کا نام ہے جو کہ عارفین کے قلوب میں ہی پایا جاتا ہے اور یہی نفع دینے والا علم ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بندے کے ایک حال کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ وہ مقام ہے جس کی طرف حدیث میں اشارہ آتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ؛

" دل کا علمِ باطن ہی نفع دینے والا علم ہے " یہ ایک مجمل تعریف ہے ۔

حضرت جندب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

"ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے اور آپؐ ہمیں ایمان کی تعلیم دیتے رہتے تھے۔ پھر ہمیں قرآن کی تعلیم دیتے تھے تو ہمارا ایمان بڑھ گیا۔ عنقریب ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ ایمان سے پہلے قرآن سیکھیں گے۔"

یعنی ہم نے علم ایمان سیکھا اور یہ بصرہ کے زاہدین کا مذہب ہے۔

سلفؒ کا فرمان ہے کہ:

"اس کا معنی ہے۔ علم توحید اور امر و نہی کا بقدرِ ضرورت حصہ سیکھنا، نیز حلال و حرام کے درمیان امتیاز کرنا، اس لیے کہ اس کے بعد تمام علوم کی کوئی غایت نہیں کیونکہ چیزوں کے معلومات ہونے کی وجہ سے ان سب پر علم کا اطلاق کیا جاتا ہے"۔

مزید برآں اس پر بھی اجماع ہے کہ مذکورہ علوم سے زیادہ علم حاصل کرنا فرض نہیں۔ البتہ فضیلت و استحباب ضرور ہے۔

ایک کوفی فقیہؒ فرماتے ہیں،

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم پر خرید و فروخت اور نکاح و طلاق کے مسائل جاننا فرض ہے اور جب بھی کوئی آدمی ان امور میں داخل ہو گا تو اس پر ان کا علم حاصل کرنا فرض ہو گا۔ اس لیے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے کہ:

"ہمارے اس بازار میں صرف وہی آدمی تجارت کرے جو کہ (خرید و فروخت) کا علم حاصل کرے اور نہ ہی سُود خور کو تجارت کی اجازت ہے۔ اب اس کا جی چاہے یا نہ چاہے"۔ اور جیسے کہ فرمایا گیا:

"علم حاصل کر پھر تجارت کر"۔

حضرت سفیان ثوریؒ، ابو حنیفہؒ اور ان کے اصحابؒ کا یہی مذہب ہے۔

متقدمین علمائے خراسان میں سے ایک بزرگؒ فرماتے ہیں:

"ایک آدمی گھر میں بیٹھا تھا۔ اس نے چاہا کہ کسی دین کے حکم پر عمل کرے یا اس کے قلب میں کوئی کام کرنے کا خیال آیا تو اس کے لیے خاموش بیٹھ رہنا جائز نہیں، نہ ہی اسے اپنی رائے اور خواہش پر عمل کرنا جائز ہے بلکہ اسے چاہیے کہ جُوتے پہنے اور گھر سے نکل کر شہر کے علماء سے مسئلہ دریافت کرے۔ ایسے موقع پر اس افتاد کے بارے میں علم حاصل کرنا فرض ہے"۔

حضرت ابن مبارکؒ اور بعض محدثین سے یہ قول منقول ہے، دوسرے حضرات نے فرمایا:

"اس سے مراد، علمِ توحید حاصل کرنا فرض ہے"۔

طلبِ علم کا طریق

طلبِ علم کے طریقہ میں اختلاف ہے۔ بعض علماءؒ کا فرمان ہے کہ طریقِ استدلال واعتبار سے علم حاصل کیا جائے۔ بعض نے بحث ونظر کے طریقہ پر اور بعض نے توقیف واثر (منقولات پڑھ کر اور انہی پر بند رہ کر) علم حاصل کرنا ضروری بتایا۔

علما کی ایک جماعت کا فرمان ہے کہ:

"جب بندہ شبہات و اشکالات میں پھنس جائے تو اس وقت اس سے مراد شبہات و اشکالات کا علم حاصل کرنا مراد ہے اور اگر عام مسلمانوں کی طرح وہ (اسلامی نظریات وغیرہ کو) کسی شبہ کے بغیر تسلیم کر رہا ہو اور اس کے دل میں ان کے بارے میں کسی قسم کا شک وشبہ پیدا نہ ہو تو اس صورت میں مندرجہ بالا امور کی تعلیم حاصل نہ کرنا جائز ہے اور اگر اس کے دل میں ان امور کے بارے میں کچھ شبہ یا اشکال پیدا ہو جائے اور وہ اس کا مفصل جواب نہ جانتا ہو تو اس صورت میں سکوت اختیار کرنا جائز نہیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ وہ شبہات میں رہ کر کسی روز اسلامی عقائد سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے۔ اس صورت میں اس پر فرض عاید ہوتا ہے کہ علمائے عصر سے ان شبہات کا جواب معلوم کرے تا آنکہ اس کا شبہ دُور ہو جائے اور اسے یقینِ کامل حاصل ہو جائے اور قلب سے باطل واشتباہ کا غبار تک دُھل جائے۔ اگر اس وقت میں اس نے کاہلی دکھائی اور خاموش بیٹھا رہا تو یہ خطرہ ہو سکتا ہے کہ شبہ بڑھ جائے اور انسان خواہشِ نفس کی پیروی کرنے لگ جائے اور اہل ایمان کی راہ سے محروم ہو کر رہ جائے یا کسی بدعت کو جائز سمجھ بیٹھے اور سنت سے محروم ہو جائے اور اسے اس نقصان کی خبر تک نہ ہو۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس مفہوم کی دعا کیا کرتے:

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا فَنَتَّبِعَهٗ وَ اَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا فَنَجْتَنِبَهٗ وَلَا تَجْعَلْ ذٰلِكَ مُتَشَابِهًا عَلَيْنَا فَنَتَّبِعَ الْهَوٰى۔

(اے اللہ! ہمیں حق کو حق کر کے دکھا تاکہ ہم اس کا اتباع کریں اور ہمیں باطل کو باطل کر کے دکھا تاکہ ہم اس سے پرہیز کریں اور ہم پر اسے مشتبہ نہ بنا کہ ہم خواہش کی پیروی کرنے لگ جائیں)

یہ ابو ثور ابراہیم بن خالد کلبیؒ، داؤد بن علیؒ، حسین کرابیسیؒ، حرث بن اسد محاسبیؒ اور ان کے متکلم اتباع کا مذہب ہے۔ اس حدیث کی شرح میں علماء کے مندرجہ بالا اقوال ملتے ہیں جنہیں ہم نے اپنے علم کے مطابق ذکر کر دیا اور ہر قول کی دلیل بھی بیان کر دی۔ البتہ الفاظ ہمارے ہیں اور مطالب ان کے ہیں۔ ان سب اقوال میں حسن اور احتمال ہر طرح کے اقوال ہیں۔ اگرچہ حدیث کی شرح میں ان بزرگوں نے لفظی اختلاف ظاہر کیا ہے مگر معنوی طور پر سب کی ایک ہی مراد ہے۔ البتہ اہل ظاہر نے اسے اس پر قیاس کیا کہ جس کو

وہ جانتے ہیں اور اہلِ باطن نے اپنے علم پر اس کی تاویل کی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ظاہر و باطن دو علم ہیں۔ ان دونوں میں سے کسی سے بھی استغناءُ نہیں ہو سکتا، جیسے کہ اسلام اور ایمان دونوں لازمی ہیں اور جس طرح دل اور بدن دونوں کا باہم ربط ہے اور ایک دُوسرے سے جدائی ناممکن ہے اور دموت کو دعوت دیتا ہے اس طرح علم ظاہر اور علم باطن دونوں کا حصول ضروری ہے، اور ان سب حضرات کا اس پر اجماع ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس سے مراد یہ نہ تھی کہ علم الاقضیہ اور علمِ فتاویٰ جاننا فرض ہے۔ نہ ہی اختلاف و مذاہب کا علم مراد لیا اور نہ ہی حدیث کی متعین کتابوں کا علم فرض ہونا مراد ہے اگرچہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگ ضرور پیدا کیے رکھتا ہے جو اس کو یاد کر کے اس کی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اس حدیث کا مطلب یہ ہے اور اصل حقیقت سے اللہ تعالیٰ ہی آگاہ ہے کہ "علم حاصل کرنا فرض ہے۔" سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مراد، اسلام کے پانچ ارکان کا علم حاصل کرنا ہے۔ اس لیے کہ عام مسلمانوں پر اس علم کے علاوہ دوسرے امور کا علم فرض نہیں ہے۔ اور ان (ارکان خمس) کے علم کے بغیر کوئی عمل بھی درست اور قبول نہیں ہوتا۔

اب پہلا عمل، اس کا علم حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ عمل فرض ہونے کی حیثیت میں عمل کا علم حاصل کرنا فرض ہوا اور چونکہ مسلمانوں پر یہی ارکانِ خمسہ کے اعمال ہی فرض ہیں اس لیے ان ارکان خمسہ کا علم حاصل کرنا فرض ہُوا کیونکہ ہر فرض کا فرض ہے اور علمِ توحید بھی انھی میں داخل ہے۔ اس لیے کہ یہ بات (ارکانِ خمسہ) کے آغاز یعنی کلمہ شہادت لا الٰہ الا اللہ میں آتی ہے جبکہ خدا تعالیٰ کی ذات سے متصلہ صفات کا اثبات اور اس کے علاوہ صفات کی نفی کی جاتی ہے اور یہ سب لا الٰہ الا اللہ کے اندر داخل ہے۔

اور اسلام درست ہونے کے اندر علمِ اخلاص بھی داخل ہے۔ اس لیے کہ صحتِ اخلاص کے بغیر کوئی آدمی مسلمان نہیں ہو سکتا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تین باتیں ایسی ہیں کہ ایک مسلمان کا دل ان پر خیانت نہیں کرتا۔ (ان میں سے ایک) اللہ کے لیے اخلاص کے ساتھ عمل کرنا۔" چنانچہ اس سے آغاز کیا اور اس کو اسلام کی شرط قرار دیا۔

کس قدر علم فرض ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا طلب علم فرض ہونے سے یہ مراد نہیں کہ جس چیز کو معلوم کرنا جائز ہو۔ اس کا علم فرض ہے۔ مثلاً علم طب، علمِ نجوم، علمِ نحو، علمِ شعر اور علمِ مغازی وغیرہ ان سب کو علوم کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ معلومات ہوتی ہیں۔ اور ان کے سیکھنے والے انہی کے علما کہلاتے ہیں اور امت کا اجماع بھی ہے اور امت کا اس پر بھی اجماع ہے کہ آپ کی مراد فتویٰ اور قضا یا اختلافِ مذاہب و آرا بھی نہیں۔ انہیں بھی علوم کہا جاتا ہے اور ان میں سے

بعض علوم فرضِ کفایہ ہیں اور باقیوں سے ساقط ہیں۔ حدیث کے الفاظ میں عموم پایا جاتا ہے۔ فرمایا:

طلب العلم فریضۃ (علم کا حاصل کرنا فرض ہے)

پھر فرمایا:

علیٰ کل مسلم (ہر مسلمان پر)

اور یہ بھی فرمایا:

اطلبوا العلم (علم حاصل کرو)

یعنی علم کا نام لیا اور اس سے مراد وہ معہود علم ہے۔ اس لیے کہ الف لام تعریف کا دخل کیا گیا۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان درست ہے کہ:

"علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔" یعنی جس قدر علم پر اسلام مبنی ہے۔ مسلمانوں پر اس قدر علم حاصل کرنا فرض قرار دیا گیا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ایک اعرابیؓ نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا:

"مجھے بتائیے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر کیا فرض کیا؟"

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"ہمیں بتائیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو ہماری طرف جو دے کر بھیجا۔" تو آپؐ نے اسے یہی بتایا کہ:

"توحید و رسالت کی شہادت، پانچ نمازیں، زکوٰۃ، ماہِ رمضان کے روزے اور بیت اللہ کا حج۔"

اس نے دریافت کیا:

"کیا اس کے علاوہ بھی کچھ لازم ہے؟"

آپؐ نے فرمایا:

"نہیں، (فرض نہیں) البتہ اگر تو نفل کے طور پر کچھ کرے۔ (تو تجھے ثواب ملے گا)

اس نے کہا:

"اللہ کی قسم! میں اس میں نہ ہی کچھ زیادتی کروں گا اور نہ ہی کمی کروں گا۔"

آپؐ نے فرمایا:

"اگر اس نے سچ کہا تو کامیاب ہوا اور جنت میں داخل ہو گیا۔"

چنانچہ ارکانِ خمسہ کا علم فرض ہے۔ اس لیے کہ علم کے بغیر ان پر عمل ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِلَّا مَنْ شَہِدَ بِالْحَقِّ وَ ہُمْ یَعْلَمُوْنَ۔ (مگر جس نے گواہی دی سچی اور ان کو خبر تھی)

اور اسی طرح فرمایا:

حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ (حتیٰ کہ تم سمجھو جو تم کہتے ہو)

اور فرمایا:

قُلْ ھَلْ عِنْدَکُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوْہُ لَنَا اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ۔ (تو کہہ، کچھ علم بھی ہے تمہارے پاس کہ ہمارے آگے نکالو، یا نری اٹکل پر چلتے ہو)

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اَھْوَآءَھُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ فَمَنْ یَّھْدِیْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰہُ۔ (بلکہ چلتے ہیں یہ بے انصاف اپنی خواہشات پر بن سمجھے۔ سو وہ کون ہے جو راہ دکھائے اس کو جس کو اللہ نے بہکایا)

وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ اِنَّھُمْ لَنْ یُّغْنُوْا عَنْکَ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا۔ (اور نہ چل ان کی خواہشات پر جو بے علم ہیں۔ وہ کام نہ آئیں گے تیرے اللہ کے سامنے کچھ بھی)

اور ایک جگہ حق سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرمایا:

فَاعْلَمُوْا اَنَّمَا اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰہِ وَاَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔ (تو جان لو کہ یہ اترا ہے اللہ کی خبر سے اور کوئی حاکم سوائے اس کے)

اور فرمایا:

فَاسْئَلُوْا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔[1] (سو پوچھو، یاد رکھنے والوں سے اگر تم کو معلوم نہیں)

ان تمام آیات میں اللہ تعالیٰ نے طلبِ علم کو فرض قرار دیا اور اسلام کے ارکانِ خمسہ کا علم حاصل کرنے کی فرضیت کے بارے میں حدیث ذکر ہوئی اور پھر اجمال سے فرمایا:

"علم حاصل کرنا فرض ہے۔" پھر "ہر مسلمان پر" فرما کر اسے پختہ کیا۔ اب اس کی وضاحت یہ ہوئی کہ ارکانِ خمسہ کا علم حاصل کرنا ان کے فرض ہونے کی وجہ سے فرض ہے۔

ایک مرسل روایت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپؐ ایک آدمی کے پاس سے گزرے اور لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ آپؐ نے دریافت فرمایا:

"یہ کیا بات ہے؟"

عرض کیا گیا: "ایک علامہ (بہت جاننے والا) ہے"

آپؐ نے فرمایا:

"کس بات کا (جاننے والا ہے)؟"

انہوں نے عرض کیا: "شعر و انساب اور ایامِ عرب کا جاننے والا ہے۔"

---

[1] سورۃ النحل آیت ۴۳۔

آپ نے فرمایا:

"یہ ایسا علم ہے کہ اس سے جاہل رہنا کچھ مضر نہیں۔"

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ:

"ایسا علم ہے جو نفع نہیں دیتا اور اس سے جاہل رہنا کچھ ضرر رساں نہیں۔"

حدیث میں آتا ہے کہ:

"بعض علم نری جہالت ہیں اور بعض اقوال نری بکواس ہوتے ہیں۔"

ایک دوسری حدیث میں ہے:

"تھوڑی توفیق زیادہ علم (محض) سے بہتر ہے۔"

ایک غریب حدیث میں آتا ہے:

"ہر چیز علم کی محتاج ہے اور علم توفیق کا محتاج ہے۔"

ایک مشہور حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا مذکور ہے:

"میں ایسے علم سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو نفع نہ دے۔"

چنانچہ آپ نے اس (غیر نافع معلوم) کو بھی علم کا نام دیا۔ حالانکہ یہ چیز بھی معلوم ہے اور اس کے جاننے والے اس (معلوم) کے علماء کہلواتے ہیں مگر اس کی منفعت اُٹھ گئی اور آپ نے اس (غیر نافع علم) سے پناہ مانگی۔

ایک حدیث میں مروی ہے:

"یقیناً شیطان بیشتر اوقات تم پر علم کے ذریعہ سبقت کرے گا۔"

ہم نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسول! وہ ہم پر علم کے ذریعہ کیونکر سبقت کرے گا؟"

آپ نے فرمایا:

وہ کہے گا: "علم حاصل کرو مگر جب تک (سارا) علم نہ پڑھ لو۔ اس پر عمل نہ کرو۔ چنانچہ (وہ آدمی) ہمیشہ علم میں (ذہنی طور پر) لگا رہے گا اور عمل رہ جائے گا۔ آخر وہ فوت ہو جائے گا مگر عمل کرنے نہیں پائے گا۔"

اس حدیث میں دو دلائل ہیں:

۱۔ آپ نے ایسا فضول علم مراد لیا کہ جس کا آخرت میں کچھ نفع نہیں اور نہ ہی اس علم حاصل کرنے پر قربِ خداوندی حاصل ہوتا ہے۔

۲۔ افضل اور مندوب علم وہ ہے کہ جس کے تقاضا میں عمل کیا جائے۔ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہیں بھی علم کے بغیر عمل کرنے کا حکم نہیں فرماتے اور عمل کرنے کی نیت سے طلبِ علم بھی ناپسند نہیں فرماتے۔ دیکھیے، ایک دوسری روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"جس نے علم حاصل کیا اس کی فضیلت مجھے اس سے زیادہ محبوب ہے جس نے عمل کیا اور تمہارا بہترین دین ورع (پرہیزگاری) ہے۔"

علمِ معرفت و یقین کی افضلیت

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جب انتقال ہُوا تو آپؐ ہزاروں صحابہ رضوان اللہ علیہم کو (تربیت دے کر) پیچھے چھوڑ گئے اور تمام صحابہؓ علمائے ربانی تھے اور خدا تعالیٰ سے انہیں فقاہت حاصل تھی۔ اللہ تعالیٰ کی رضا انہیں شاملِ حال تھی مگر پھر بھی وہ اس قدر محتاط تھے کہ دس سے کچھ زیادہ صحابہؓ کے علاوہ بہت ہی کم حضرات نے مسندِ فتویٰ سنبھالا اور نہ ہی احکام و قضایا ان سے کثرت کے ساتھ منقول ہیں۔

فتویٰ میں احتیاط

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے جب کوئی فتویٰ دریافت کیا جاتا تو فرماتے،

" امیر کی طرف جاؤ۔ جس کے ذمہ لوگوں کے امور ہیں اِسے بھی اس کی گردن میں ڈال آؤ۔"

حضرت انسؓ اور صحابہ و تابعین کی ایک جماعت سے یہی کلام مروی ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ فرمایا کرتے:

" جو آدمی ہر دریافت کردہ بات میں فتویٰ دیتا ہے وُہ دیوانہ ہے۔"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا یہ حال تھا کہ ان سے دس باتوں کے بارے میں پُوچھا جاتا تو وُہ ایک سوال کا جواب دیتے اور نو کے بارے میں خاموش رہتے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما اس کے برعکس سلسلہ فرماتے۔ ان سے دس باتیں دریافت کی جاتیں تو نو کا جواب دیتے اور ایک کے بارے میں خاموش رہتے۔ بعض فقہا ایسے تھے کہ ان کا یہ قول "میں نہیں جانتا" اس قول "میں جانتا ہوں" سے زیادہ ہوتا۔ حضرت سفیان ثوری، مالک بن انس، احمد بن حنبل، فضیل بن عیاض اور بشر بن حارث رضی اللہ عنہم کا یہی طریقہ تھا۔

یہ حضرات اپنی مجالس میں بعض باتوں کا جواب دیتے اور بعض مسائل میں خاموش رہتے اور ہر مسئلہ کا جواب نہیں دیتے تھے (بلکہ بعض کے جواب میں سکوت اختیار کرتے)

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"میں نے اس مسجد میں ایک سو بیس (کے قریب) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو پایا۔ ان سے اگر حدیث یا فتویٰ معلوم کیا جاتا تو ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی کہ دُوسرا بھائی (صحابیؓ) ہی جواب دے۔

دُوسرے الفاظ یہ ہیں:

"اگر کسی ایک کے سامنے کوئی مسئلہ رکھا جاتا تو وہ دُوسرے (صحابی) کے سامنے پیش کرتے۔ آخر کار جس سے مسئلہ پوچھا جاتا وہیں لوٹ کر آجاتا۔"

حضرت ابن عمرؓ، ابن مسعودؓ اور تابعین سے یہی طریقہ منقول ہے، ایک باسند روایت ہے:

"صرف تین آدمی ہی فتویٰ دیا کریں،

۱۔ امیر

۲۔ جس کو حکم دیا گیا۔

۳۔ متکلف (تکلیف میں پڑنے والا۔)

اس کی توضیح یہ ہے کہ امیر وہی ہوتا ہے کہ جو فتویٰ و احکام جاری کرتا ہے۔ اس طرح امراء (حکامِ اعلیٰ) سے مسائل معلوم کیے جاتے اور فتاویٰ پوچھے جاتے ہیں اور مامور وہ آدمی ہے کہ جس کو امیر اس بات کا حکم دے۔ گویا رعایا کے امور میں وہ اسے اپنا قائم مقام اور مددگار بناتا ہے اور متکلف سے مراد وہ قصّہ گو ہے جو کہ سابقہ زمانوں کے واقعات اور ماضی کی معلومات بتاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت ان باتوں کی ضرورت نہیں اور یہ مندوب علوم بھی نہیں۔ گاہے قصہ گوئی اور واقعہ بیانی میں زیادتی یا کمی ہوجاتی ہے، اور (قابلِ مواخذہ) اختلاف ہوجاتا ہے۔ اس وجہ سے قصّہ گوئی کو مکروہ سمجھا اور قصّہ گو کو ایک متکلف (خواہ مخواہ ایک تکلف اور مصیبت مول لینے والا) قرار دیا۔

حدیث کے دُوسرے الفاظ میں اس کا مفہوم یہ آتا ہے کہ تین آدمی ہی لوگوں کے سامنے (مسائل پر) کلام کریں:

۱۔ امیر

۲۔ مامور

۳۔ مراء

چنانچہ امیر سے مراد فتاویٰ جات اور احکام میں کلام کرنے والا مفتی مراد ہے جیسے کہ ہم شروع میں بتا چکے ہیں اور مامور کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی عالمِ ربانی ہو، دُنیا میں زاہدانہ زندگی گزار رہا ہو۔ وہ

ایمان ویقین اور قرآن کے علوم میں کلام کرتا ہو۔ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی توفیق کے ساتھ دین کی طرف دعوت دیتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق نیک اعمال کی جانب لوگوں کو بلاتا ہو۔

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ [۱] (اور جب اللہ نے اقرار لیا۔ کتاب والوں سے کہ اس کو بیان کرو گے لوگوں کے پاس اور نہیں چھپاؤ گے اسکو)

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے،

"اگر کتاب اللہ میں یہ دو آیات نہ ہوتیں تو میں تمہیں کبھی بھی کوئی حدیث نہ سناتا۔"

پھر یہ اور اس سے پہلے کی تلاوت فرماتے اور فرمایا کرتے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؛

"اللہ تعالیٰ نے جس عالم کو بھی کچھ علم دیا اس سے وہ وعدہ لیا جو کہ انبیاء علیہم السلام سے لیا تھا کہ اسے بیان کریں گے اور اُسے چھپائیں گے نہیں۔"

اور مرائی (مراد) کا مطلب یہ ہے کہ جو خواہش (نفس) سے علوم دنیا میں کلام وبحث کرے اور اس کا مقصد یہ ہو کہ لوگوں کا میری طرف میلان ہو جائے اور میں اس چرب زبانی کے ذریعہ دنیا کماؤں اور دنیاوی بلندی حاصل کروں۔

بعض علماً فرماتے ہیں؛

"صحابہؓ اور تابعینؒ چار باتوں کو پرے ہٹاتے تھے؛

۱۔ امانت

۲۔ ودیعت

۳۔ وصیت

۴۔ فتویٰ

بعض کا فرمان ہے کہ؛

"فتویٰ کی جانب تیزی کرنے والا دوسروں سے کم علم ہوتا اور ان میں سب سے زیادہ متقی، فتویٰ سے سب سے زیادہ رکنے والا اور اسے دور ہٹانے والا ہوتا۔"

صحابہ کا عام انہماک بعض سلفؒ کا فرمان ہے؛

---

[۱] سورۃ آلعمران آیت ۱۸۷

صحابہؓ اور تابعین کا عام انہماک پانچ باتوں میں رہنا :

۱۔ تلاوتِ قرآن مجید

۲۔ مسجد کو آباد کرنا (یعنی نماز اور نوافل میں منہمک رہنا)

۳۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنا ۔

۴۔ نیکی کا حکم کرنا ۔

۵۔ برائی سے روکنا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے :

"بنی آدم کا ہر کلام اس کے خلاف (گواہ ہے) اور اس کے لیے (نفع بخش) نہیں ، سوائے تین کے۔ (اور وہ نفع دینے والے تین کلام حسب ذیل ہیں)؛

۱۔ نیکی کا حکم کرنا ۔

۲۔ برائی سے روکنا۔

۳ ۔ اللہ تعالیٰ کی یاد کرنا ۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ؛

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِنْ نَجْوٰهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ[ل]۔ (کچھ بھلی نہیں اکثر ان کی مشورت مگر جو کوئی کہے خیرات کو یا نیک بات کو یا صلح کروانے کو لوگوں میں) ۔

بعض محدثینؒ نے کوفہ کے اہلِ رائے فقہا میں سے بعض کو فوت ہونے کے بعد خواب میں دیکھا اور بتایا ، کہ میں نے اُن سے پوچھا کہ "جس فتویٰ اور رائے پر آپ تھے اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں کیا کیا؟"

وُہ بتاتے ہیں کہ ان کے چہرہ پر ناپسندیدگی کی لہر دوڑ گئی اور میری طرف سے مُنہ موڑ کر فرمایا ؛

"ہم نے اس کا اجر کچھ نہیں پایا اور نہ ہی اس کا انجام قابلِ مدح ہُوا۔"

آخرت میں کام آنے والے اعمال

حضرت علی بن نصر بن علی جہضمی نے اپنے والد بزرگوار سے نقل کیا ۔ فرماتے ہیں کہ :

میں نے خلیل بن احمد کو فوت ہونے کے بعد خواب میں دیکھا تو پوچھا ؛

ل سورۃ ۔ آیت

"میں نے خلیل سے زیادہ دانش ور نہیں دیکھا۔ میں ضرور اس سے پوچھوں گا۔"

انہوں نے جواب دیا:

"جانتے ہو کہ ہم جس کام میں تھے؟ دیکھو، ہم نے اس کا کچھ اجر نہ دیکھا اور میں نے اس کلمہ سے زیادہ فائدہ مند کلام نہیں پایا۔ کلمہ یہ ہے:

سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰہِ وَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اللّٰہُ اَکْبَرُ۔ (اللہ پاک ہے اور تمام حمد اللہ کی ہے اور اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں اور اللہ سب سے بڑا ہے)۔"

بعض شیوخؒ سے مروی ہے کہ میں نے خواب میں ایک عالم کی زیارت کی تو میں نے ان علوم (کے اجر) کے بارے میں پوچھا کہ:

"جن میں ہم بحث و مجادلہ کیا کرتے تھے۔" تو انہوں نے ہاتھ پھیلایا اور اس میں پھونک لگا کر فرمایا:

"وہ سب کے سب اڑ کر ختم ہو گئے۔ مجھے صرف ان دو رکعتوں نے فائدہ دیا جو کہ مجھے رات کے حصہ میں پڑھنے کی توفیق ہوئی۔"

حضرت ابوداؤد سجستانیؒ نے فرمایا کہ:

"ہمارے بعض ساتھی طلبِ حدیث میں خوب محنت کرتے اور انہیں حدیث اور (نقدِ حدیث) پر خوب عبور حاصل تھا۔ جب ان کا انتقال ہوا تو میں نے انہیں خواب میں دیکھا اور پوچھا: اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟ وہ خاموش رہے۔ میں نے دوبارہ پوچھا تو وہ خاموش رہے۔ میں نے کہا:

"کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو بخش دیا؟"

انہوں نے جواب دیا:

"نہیں"۔

میں نے پوچھا:

"کیوں؟"

کہا: "گناہ بہت ہیں اور پرسش سخت ہے۔ البتہ خیر کا وعدہ ہوا ہے اور مجھے خیر ہی کی امید ہے۔"

میں نے پوچھا:

"آپ نے یہاں کن اعمال کو افضل پایا؟"

فرمایا: "تلاوتِ قرآن مجید اور رات کے حصہ میں نماز کو۔"

میں نے پوچھا: "جو آپ پڑھتے یا پڑھاتے تھے؟"

فرمایا: "میں کچھ نہ پڑھتا تھا۔"
میں نے کہا:
"آپ نے اس قول کو کیسے پایا کہ فلاں ثقہ ہے اور فلاں ضعیف ہے؟"
فرمایا:
"اگر اس جرح میں نیت خالص ہو گی تو بھی نہ تیرے لیے فائدہ ہے اور نہ نقصان ہے۔"
ایک بزرگؒ فرماتے ہیں:
احمد بن عمر خاقانی نے مجھے بتایا کہ مجھے خواب میں نظر آیا۔ گویا میں ایک راہ پر چل رہا ہوں۔ اچانک ایک آدمی ملا اور میری طرف متوجہ ہُوا اور کہہ رہا تھا:

وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ[1] (اور اگر تو کہا مانے اکثر لوگوں کا جو دنیا میں ہیں تجھ کو بھلادیں اللہ کی راہ سے)

میں نے پوچھا:
"آپ کی مراد مجھ سے ہے؟"
اس نے کہا:
"تجھے اور تیرے بعد میں آنے والے سے کہہ رہا ہوں۔"
میں نے اس آدمی کی طرف دیکھا تو وہ حضرت سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ میں نے دُوسرے آدمی کی جانب سے توجہ ہٹا کر ان کی طرف توجہ کی۔ اور کہا:
"یہ ہمارے استاد اور مؤدب ہیں۔ دنیا میں ہمیں ادب سکھایا کرتے تھے۔" پھر میں نے پوچھا:
"اے ابوالحسن! آپ اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہو گئے۔ ہمیں بتائیے اللہ تعالیٰ نے کس عمل کی برکت سے قبول کیا؟" انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور فرمایا:
"آؤ! ہم دونوں کعبہ کی شکل کی ایک عمارت کے پاس آگئے اور اس کے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ اس عمارت سے ایک آدمی نے باہر جھانکا تو یہ جگہ روشن ہو گئی۔ حضرت سریؒ نے اس کی طرف اشارہ کر دیا اور مجھے اس طرف اٹھایا۔ حضرت سریؒ چھوٹے قد کے تھے اور میں بھی چھوٹے قد کا ہُوں۔ اس عمارت پر کھڑے آدمی نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور مجھے پکڑ لیا اور اوپر اٹھایا۔ انوارات کی اس جگہ اس قدر کثرت تھی کہ میں آنکھیں بھی نہیں کھول

---

[1] سُورۃ انعام آیت ۱۱۷۔

سکتا تھا۔ اس نے مجھے کہا:

"میں نے اس شیخ (سریؒ) کے ساتھ تیرا کلام سُنا۔ (یاد رکھ) قرآن مجید میں جس اخلاق کو محمود بتلایا گیا اسے اختیار کر لے اور جس اخلاق کو قرآن مجید میں مذموم بتایا گیا اس سے رک جا اور تیرے لیے اس قدر کافی ہے۔"

حضرت سری سقطیؒ سے مروی ہے۔ فرمایا:

"ایک نوجوان پورے انہماک سے علم ظاہر حاصل کر رہا تھا۔ پھر علم حاصل کرنا چھوڑ دیا اور علیحدہ ہو کر عبادت میں مشغول ہو گیا۔ اس کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگوں سے منقطع ہو کر گھر میں عبادت کرتا رہتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تو علمِ ظاہر حاصل کرنے کے معاملہ میں بہت تیز تھے۔ اب کیا ہوا کہ یہ سلسلہ ختم کر دیا؟" اس نے جواب دیا:

میں نے خواب میں ایک کہنے والے کو سُنا جو کہہ رہا تھا:

"اللہ تجھے برباد کرے تو کب تک علم کو ضائع کرتا رہے گا؟"

میں نے کہا:

"میں تو اسے یاد کرتا ہوں۔"

اس نے جواب دیا:

"علم تو عمل سے یاد ہوتا ہے۔"

چنانچہ میں نے طلبِ علم چھوڑ دی اور عمل پر مستعد ہو گیا۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے:

"کثرتِ روایت کا نام علم نہیں بلکہ خشوع و تقویٰ علم ہے۔"

ایک فقیہ فرماتے ہیں:

"علم ایک نور ہے جو اللہ تعالیٰ دل میں ڈال دیتا ہے۔"

حضرت حسن بصریؒ سے مروی ہے۔ فرمایا:

"اس قدر سیکھو جس قدر تم عمل کرنا چاہتے ہو۔ اللہ کی قسم، اللہ تعالیٰ اس وقت تک اس پر اجر نہیں دے گا جب تک اس پر عمل نہ کر لو۔ اس لیے کہ بیوقوفوں کو روایت کا اہتمام ہے اور علماء کو رعایت (عمل و تقویٰ) کی فکر ہے۔"

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے:

"اللہ تعالیٰ، صاحبِ قول و روایت کو کچھ اہمیت نہیں دیتا بلکہ صاحبِ فہم و درایت کو اللہ تعالیٰ قابلِ اہمیت سمجھتا ہے۔"

حضرت ابوالحصینؒ نے فرمایا:

تم میں سے ایک آدمی ایک مسئلہ پر (فوراً) فتویٰ دیتا ہے۔ حالانکہ جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے سامنے ایسا مسئلہ پیش کیا جاتا تو وہ تمام اہل بدر صحابہؓ کو (مشورہ کے لیے) جمع کر لیتے تھے۔

ایک بزرگؒ فرماتے ہیں:

تم میں سے کسی سے کوئی مسئلہ پوچھا جائے تو وہ فوراً جواب دیتا ہے۔ حالاں کہ جب اہل بدر (صحابہؓ) سے پوچھا جاتا تو انہیں یہ بات بڑی دشوار معلوم ہوتی تھی۔

حضرت عبدالرحمٰن بن یحییٰ اسود اور دوسرے علماء کا فرمان ہے:

"احکام اور فتاویٰ کا اہتمام حکام اور امراء کرتے تھے۔ اور عوام ان سے معلوم کرتے۔ پھر مسلمانوں میں دینی ضعف آ گیا اور حکام نے دنیا کی رغبت کر لی اور لڑائیوں میں مصروفیت کے باعث وہ اس کام میں عاجز آ گئے اب وہ علماء ظاہر اور مساجد کے مفتیوں سے اس کام میں مدد لینے لگے۔ چنانچہ ایک حاکم کی مجلس منعقد ہوتی تو اس کے دائیں بائیں دو مفتی تشریف فرما ہوتے۔ اور قضا و احکام کے معاملات ان کے سامنے پیش کیے جاتے اور وہ حاکم ان کے مشورہ سے احکام جاری کرتا۔ اب لوگ فتویٰ اور قضاء کا علم پڑھنے لگے تاکہ وہ حکمرانوں کی مدد کر سکیں۔ آخر دنیا طلبی اور اقتدار پسندی کی خاطر ایسے مفتیوں کی تعداد بڑھ گئی۔ اس کے بعد ایک زمانہ آیا کہ دینی تعلق مزید کمزور پڑ گیا اور حکام نے علماءؒ سے مدد لینا اور مشورہ کرنا ہی ترک کر دیا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عقبہ بن عامر نے حضرت ابن مسعودؓ کی طرف لکھا:

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو لوگوں کے لیے فتویٰ دیتا ہے حالانکہ تو نہ امیر ہے اور نہ مامور ہے۔"

حضرت ابو عامر ہرویؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت معاویہؓ کے ہمراہ ایک بار حج کیا۔ جب ہم مکہ پہنچے، تو معلوم ہوا کہ بنی مخزوم کا آزاد کردہ غلام جو ایک نوجوان آدمی ہے، وہ فتویٰ اور قضاء کا کام کر رہا ہے۔ حضرت معاویہؓ نے اسے بلایا اور پوچھا:

"کیا تمہیں اس کا حکم دیا گیا ہے؟"

اس نے کہا: "نہیں"

فرمایا: "تو پھر کس وجہ سے یہ کام کر رہا ہے؟"

اس نے کہا:

"ہم فتویٰ دیتے ہیں اور ہمارے پاس جو علم ہے اسے پھیلاتے ہیں۔"

حضرت معاویہؓ نے فرمایا :

آج کے بعد اگر تو نے یہ کام کیا تو میں تیری راہ کاٹ دوں گا۔

پھر اسے منع کر دیا مگر علمِ قلوب اور علم ایمان و یقین کے بارے میں کسی کو وُہ منع نہیں کرتے تھے۔

بلکہ حضرت عمرؓ نے افواج کے اعلیٰ افسروں کو خط لکھا :

" عبادت گزاروں سے جو تم سنتے ہو اسے یاد رکھو۔ اس لیے کہ ان پر صحیح امور منکشف کیے جاتے ہیں۔" اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود بھی ایسے (علمائے باطن) کے پاس بیٹھ کر ان کا کلام سنتے تھے۔

حدیث میں آتا ہے :

" جب تم ایسا آدمی دیکھو کہ جس کا سکوت اور زہد عطا ہُوا تو اس کا قرب حاصل کرو۔ اس لیے کہ اس کو حکمت عطا کی جاتی ہے۔"

ایک محدثؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت سفیان ثوریؒ کو غمگین دیکھا اور اس کا سبب پوچھا تو انھوں نے فرمایا اور وہ پریشان تھے کہ :

" ہم دنیا والوں کے لیے تجارت گاہ بن گئے۔"

میں نے عرض کیا :

" وہ کس طرح ؟"

فرمایا : " ایک آدمی ہمارے ساتھ لگا رہتا ہے۔ جب وُہ ہم سے کچھ معلوم کر لیتا ہے۔ (علم حاصل کر لیتا ہے) تو اس کو عامل، وکیل یا ملازم بنایا جاتا ہے۔"

حضرت حسنؓ فرمایا کرتے :

" اس علم کو (بعض اوقات) ایسی قوم سیکھتی ہے کہ جس کا آخرت میں کچھ حصہ نہیں۔ دراصل اللہ تعالیٰ امت کی خاطر ان لوگوں کے ذریعہ اس علم کی حفاظت فرماتا ہے تاکہ یہ ضایع نہ ہو جائے۔"

حضرت مامون رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا :

" اگر تین نہ ہوتیں تو دنیا برباد ہو جاتی۔

۱۔ اگر شہوت نہ ہوتی تو نسل ختم ہو جاتی۔

۲۔ اگر جمع کرنے کی محبت نہ ہوتی تو معاشِ (دنیا) باطل ہو جاتی۔

۳۔ اگر اقتدار کی محبت نہ ہوتی تو علم ختم ہو جاتا۔

یہ سب علمائے دنیا اور زبانوں کے علماء کا وصف ہے۔

مگر علمائے آخرت اور معرفت و یقین کے اصحاب کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وُہ امراء سے بھاگنے اور ان کے دنیا دار اتباع و انصار سے دُور رہتے ہیں۔ علمائے آخرت کا طریقہ یہ ہے کہ وُہ علمائے دنیا کو ناقص سمجھتے اور ان پر طعن کرتے ہیں اور ان کی مجالس سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔

حضرت ابن ابی لیلیٰ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

" میں نے اس مسجد میں ایک صد بیس صحابہ رضی اللہ عنہم کو پایا۔ جس سے بھی کوئی حدیث یا فتویٰ پوچھا جاتا۔ وُہ چاہتے کہ اس کا دوسرا ساتھی (دوسرا صحابی) ہی اس کا جواب دے "

ایک بار فرمایا :

" میں نے تین صد کو پایا۔ اگر کسی سے کوئی فتویٰ یا حدیث پوچھی جاتی تو وہ دُوسرے ساتھی کی طرف یہ معاملہ پیش کر دیتے۔ اس طرح وہ اس معاملہ کو باہم ایک دوسرے کے سامنے پیش کرتے تھے اور وہ ایسے نہ تھے کہ اگر علمِ قرآن یا علمِ یقین و ایمان کی کوئی بات پوچھی جاتی تو دوسرے پر ڈالتے اور نہ ہی وُہ خاموش رہتے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ [1] ۔ (پس پوچھو یاد رکھنے والوں سے اگر تم کو معلوم نہیں)

اور صحابہؓ اہل ذکر تھے اور اہلِ توحید و عقل تھے۔ یہ اعلیٰ صفات اُنہیں اللہ تعالیٰ سے حاصل تھیں۔ انہیں یہ باتیں کتابوں سے یا دوسروں کے اقوال سے حاصل نہ تھیں بلکہ عمل صالح اور حُسنِ معاملہ کی برکت سے اُنہیں یہ عمل حاصل تھا۔ وُہ دنیا سے الگ ہو کر اللہ تعالیٰ کی یاد کرتے۔ انہیں عبادتِ خداوندی کا ہی مشغلہ حاصل تھا اور اعمالِ قلبی کے ذریعہ وُہ اپنے مالک تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہتے۔

خلوت میں انہیں عبادتِ الٰہی کے سوا کچھ اور کام نہ تھا اور جب وہ لوگوں کے سامنے آتے اور لوگ ان سے سوالات کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کے قلوب میں صحیح بات القاء فرما دیتے اور انہیں قلبی صفائی کی برکت سے حکمت اور قولِ صائب کی دولت حاصل تھی۔ ان کی عقلیں پاکیزہ اور ان کے عزائم بلند تھے۔ حسنِ توفیق کے باعث اللہ تعالیٰ نے اُنہیں حقیقتِ علم سے سرفراز فرمایا اور عبادت و ریاضت کی برکت سے اُنہیں خزائنِ غیب پر مطلع کیا۔ اب وُہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان و توفیق سے سوالات کے جوابات دیتے تھے۔ ان کا کلام، علمِ قدرت سے تھا۔ انہوں نے وصفِ حکمت کو ظاہر کیا۔ ان کی زبان پر علومِ ایمان جاری ہوئے اور انہوں نے

---

[1] سورۃ النحل آیت ۴۳

بواطنِ قرآن کو منکشف کیا۔ یہی وُہ علم ہے کہ جو بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان نافع ہے۔ اس کی برکت سے وُہ جواب دیتا ہے اور اس پر اجر ملے گا اور یہی علم تمام اعمال کا ترازو ہے۔

بندہ اپنے پروردگار کا جس قدر علم رکھے گا (یعنی جس قدر بندہ عالم ربّانی ہوگا) اسی قدر اس کے اعمال وزنی ہوں گے۔ اس کی نیکیاں زیادہ ہوں گی اور اسی علم کی بدولت وہ مقرب الٰہی ہوگا۔ اس لیے کہ وُہ اس کے ہاں اہل یقین میں سے شمار ہوگا۔

یہی (علماء ربانی) اہل حقایق ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے ان کا وصف بیان کیا اور انہیں تمام مخلوق سے افضل بتایا۔ چنانچہ فرمایا:

"قلوب، برتن ہیں اور بہترین وُہ ہے جو زیادہ رکھے۔"

اور لوگوں کی تین اقسام ہیں:

۱۔ عالم ربانی۔

۲۔ راہِ نجات پر چلنے والا متکلم۔

۳۔ کمینے اور ذلیل لوگ جو ہر آواز پر بھاگتے ہیں اور

یہ لوگ ہر آندھی کے ساتھ بہ پڑتے ہیں۔ انہیں نورِ علم سے کچھ روشنی حاصل نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ لوگ کسی پختہ مسلک پر ہوتے ہیں۔

علم، مال سے بہتر ہے۔ علم تیری حفاظت کرے گا اور تو مال کی حفاظت کرتا ہے۔ علم کا تزکیہ عمل کرے گا۔ اور خرچ کرنے سے مال کم ہو جاتا ہے۔ علم کی محبت ایک دین ہے جس کے باعث صلہ ملے گا۔ زندگی میں اسے نیکی کما کر دیتا ہے اور موت کے بعد اچھا اجر ہے۔ حاکم ہے اور مال محکوم ہے اور مال کا فائدہ مال ختم ہوتے ہی مٹ جاتا ہے۔ مالوں کے خزانے ختم ہو جائیں گے جبکہ لوگ ابھی زندہ ہوں گے مگر جب تک زمانہ ہے علماء باقی رہیں گے۔ پھر گہرا سانس لیا اور فرمایا:

آہ! یہاں علم کثرت سے ملتا ہے۔ کاش! اٹھانے والے مل جاتے بلکہ میں بیخوف داعظین کو پاتا ہوں۔ یہ دنیا طلبی کے لیے دین کو استعمال کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے ذریعہ اولیا اللہ پر احسان جتاتے ہیں۔ اس کی حجتوں کے ساتھ مخلوق پر غالب آتے ہیں یا اہل حق کے لیے کسوٹی بنتے پھرتے ہیں۔ معمولی بات پہ اُن کے قلوب شک وشبہ سے بھر جاتے ہیں۔ ایسے آدمی کو کچھ بصیرت حاصل نہیں اور نہ ہی دین میں اس کا کچھ مقام ہے۔ بس وُہ لذت میں غرق ہے۔ طلبِ شہوات کی خاطر سب کچھ کر رہا ہے۔ اپنی خواہشات کی تکمیل کی خاطر مال جمع کرتا ہے۔ حقیقت میں یہ چرتے ہوئے چوپائے کے قریب تر ہو چکا ہے۔ اے اللہ! جب حاملین علم فوت ہو جائیں گے

تو کیا اس طرح علم بھی ختم ہو جائے گا۔ نہیں بلکہ اللہ کی زمین ایسے لوگوں سے خالی نہیں رہے گی۔ جو حجت الہٰی قائم کریں چاہے وُہ کھل کر سامنے ہوں یا پوشیدہ طور پر مغلوب ہو کر رہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے دلائل اور اس کی حجت ختم نہ ہو جائے مگر وُہ لوگ کہاں ہیں کہ جن کی تعداد کم ہے اور ان کا مقام بہت بلند ہے۔ ان کی شخصیتیں غائب ہیں اور قلوب میں ان کی امثال موجود ہیں۔ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنی حجتوں کی حفاظت فرماتا ہے۔ آخر کار قلوب میں ان کی اشباہ و امثال ڈال دیتا ہے۔ ان کے ذریعہ علم، حقیقت واقعہ تک پہنچا۔ چنانچہ انہیں روحِ یقین تک رسائی ہوئی، جس بات کو عیش پسندوں نے دشوار پایا ان کے لیے وُہ آسان ہوئی جس بات سے غافلین کو وحشت ہوئی ان لوگوں کو اس سے انس حاصل ہوا۔ ابدان کے لحاظ سے دُنیا میں رہے مگر ان کی ارواح کا مقامِ ارفع واعلیٰ سے تعلق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں یہی لوگ اولیاء اللہ ہیں اور یہی لوگ خدا کی سرزمین پر اس کے اعمال اور اس کے دین کے داعی ہیں۔"

پھر رو پڑے اور فرمایا:

"کاش! ان کی زیارت ہو جاتی۔"

علمائے آخرت کی یہ صفات ہیں اور علمِ باطن اور علمِ قلوب کی یہ تشریحات ہیں۔ علم السنہ (زبانوں کے علم) کو یہ حیثیت حاصل نہیں ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے بھی علم باللہ تعالیٰ کی یہی توضیح فرمائی۔ رجاء ابن حیوۃ بن عبد الرحمٰن بن غنم نے حضرت معاذؓ سے روایت کیا۔ فرمایا:

"علم سیکھو، اس لیے اللہ تعالیٰ کے لیے اس کا سیکھنا خشیت ہے اور اس کا حاصل کرنا عبادت ہے۔ اور اس کا تکرار و یاد کرنا تسبیح ہے اور اس کی تحقیق کرنا جہاد ہے۔ اور جو اسے نہیں جانتا اسے سکھانا صدقہ ہے اور جو لوگ اس کے اہل ہیں انہیں عطا کرنا نیکی ہے یہ تنہائی کا مونس، منفرد ہونے کی صورت میں ساتھی، تنگی و خوشی کے حال کا رہنما، دوستوں کے وقت زینت، غرباء کے قریب اور جنت کی راہ کا روشن مینارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ کئی اقوام کو سربلندی عطا فرماتا ہے اور انہیں بھلائی میں قیادت عطا کرتا ہے وُہ رہنما بن جاتے ہیں اور ان کا اتباع کیا جاتا ہے۔ ان کے آثار قابلِ اتباع ہیں۔ ان کے افعال و اعمال کی اقتدا کی جاتی ہے۔ ان کی رائے حرفِ آخر ہوتی ہے۔ ملائکہ بھی ان کی دوستی کے خواہاں ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ اپنے پروں کو مس کر کے فرحت محسوس کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہر تر و خشک ان کے لیے بخشش مانگتا ہے۔ سمندر کی مچھلیاں آبی حشرات، زمین کے درندے اور چوپائے، آسمان اور اس کے ستارے سب اس کے لیے بخشش کی دُعا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ علم دلوں کو زندگی بخش کر اندھاپن دُور کرتا ہے اور اندھیرے میں نگاہوں کا نور ہے۔ ناتوانی میں

اجسام کی قوت ہے۔ اس کے ذریعہ انسان کو اعلیٰ درجات اور صالحین کے مقامات تک عروج حاصل ہوتا ہے اس میں غور و فکر بھی روزے کے برابر ہے۔ اس کو یاد کرنا، قیام کرنا ہے۔ اسی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کی جاتی ہے۔ اس سے خدا کی توحید کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اس سے تقویٰ ملتا ہے اور صلہ رحمی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ علم امام ہے۔ عمل اس کا مقتدی ہے۔ خوش بختوں کو علم عطا ہوتا ہے اور بدبخت اس سے محروم رہتے ہیں۔ یہ علمائے آخرت اور علمائے باطن کی صفات ہیں۔

خلفائے اربعہ کے بعد افضل ترین حاکم حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں۔ حضرت زکریا یحییٰ طائی سے مروی ہے فرمایا:

"مجھے میرے چچا زجر بن حصین نے بتایا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ نے حضرت حسنؒ کو خط لکھا:

"اما بعد: مجھے ایسے لوگ بتائیے کہ اللہ کا دین نافذ کرنے کے سلسلہ میں ان سے مدد حاصل کروں"۔

اُنھوں نے جواب دیا:

"اہل دین کو ہرگز تیری طرف آنے کی خواہش نہیں اور اہلِ دنیا کو تم نہیں چاہتے۔ اب تمہیں چاہیے کہ "اشراف اور ذی عزت لوگوں کو حاصل کر۔ وہ لوگ اپنی عزت کو خیانت کی آلودگی سے بچائیں گے"۔

حضرت حسنؒ بعض علمائے بصرہ پر جرح و نقد کیا کرتے۔ ابوحازم مدنی اور ربیعہ مدنی بھی بنی مروان کے علما کی مذمت کرتے۔ حضرت ثوریؒ، ابن مبارکؒ، ایوبؒ اور ابن عونؒ بھی بعض کوفی علما پر تنقید کرتے۔ حضرت فضیل، ابراہیم بن ادھم اور یوسف بن اسباط بھی مکہ اور شام کے بعض دنیا دار علما پر جرح کرتے۔ ہم ان کی جرح ذکر کرنا نہیں چاہتے۔ اس لیے کہ خاموشی ہی سلامتی کے قریب تر عمل ہے۔

حضرت بشرؒ فرمایا کرتے:

ہمیں ابوابِ دنیا میں سے ایک باب نے بتایا۔ اب جب تم ایک آدمی کو حدثنا کہتے سُنو تو گویا وہ یہ کہہ رہا ہے کہ میرے لیے جگہ فراخ دو۔

ان سے پہلے حضرت سفیان ثوریؒ گزرے وہ اہل ظاہر کے بارے میں فرمایا کرتے:

"اس کا طلب کرنا، آخرت کے توشہ میں سے نہیں"۔

ابن وہبؒ فرماتے ہیں:

امام مالکؒ کے سامنے طلبِ علم کا ذکر ہوا تو اُنھوں نے فرمایا:

"علم طلب کرنا اچھی بات ہے، اس کا پھیلانا بھی اچھا ہے جب کہ نیت درست ہو مگر یہ دیکھتے رہو کہ صبح سے لے کر شام اور اس طرح شام سے صبح تک تیرے ساتھ کیا چیز چپکی رہی۔ اس پر کس چیز کو زیادہ

درجہ نہ دینا۔"

حضرت ابو سلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں:

"جب آدمی کسی حدیث کی طلب[1] کرے یا شادی کرے یا طلبِ معاش کے لیے سفر کرے تو وہ دنیا کی طرف مائل ہو گیا۔"

ایمان و توحید اور معرفت و یقین کا علم تو ہر صاحبِ یقین اچھے اسلام والے مومن کو حاصل ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا ایک درجہ ہے۔ اس کا حال اس کے پروردگار کے سامنے ہے اور جنت میں اس کا ایک درجہ ضرور ہے اور اس کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں آخر کار مقربین میں جگہ حاصل کر لیتا ہے۔

علم باللہ اور ایمان باللہ دونوں رفیق ہیں اور ان میں افتراق نہیں ہوتا۔ چنانچہ علم باللہ ہی ایمان کا ترازو ہے۔ اس کے ذریعہ کمی و بیشی معلوم کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ علم ، ظاہرِ ایمان ہے۔ وہ اسے واضح اور منکشف کرتا ہے اور ایمان دراصل باطنِ علم کا نام ہے جو کہ اسے شعلہ زن اور تیز کرتا ہے۔

چنانچہ ایمان، علم کی مدد اور اس کی بصارت ہے اور علم، ایمان کی قوت و زبان ہے۔ جس قدر علم باللہ میں کمی و بیشی ہو گی اسی قدر ایمان میں کمزوری و قوت اور کمی و بیشی پیدا ہو گی۔

علم و عمل دونوں ضروری ہیں

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو وصیت فرمائی:

"اے بیٹا! جس طرح پانی اور مٹی کے بغیر کھیتی درست نہیں ہوتی، اسی طرح علم و عمل کے بغیر ایمان بھی درست نہیں ہوتا۔ ایمان سے یقین سے معرفت کا مشاہدہ ایسے ہی ہے جیسے کہ گندم کے ستو کے آٹے سے غبار ہویدا ہو اور گندم میں یہ تمام چیزیں داخل ہیں۔ اسی طرح ایمان اصل چیز ہے، اور مشاہدہ اس کی اعلیٰ ترین فرع ہے جیسے کہ گندم ان کی تمام مفہومات کی اصل ہے اور غبار اس کی اعلیٰ ترین فرع ہے۔ انوارات ایمان میں یہ تمام مقامات موجود ہیں اور علمِ یقین اس کی مدد کرتا ہے۔ پھر معرفت کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ معرفتِ سمع

۲۔ معرفتِ عیان

معرفتِ سمع اسلام میں ہوتی ہے کہ سُنا اور اسے پہچانا، یہ ایمان کی تصدیق کا نام ہے اور مشاہدہ میں معرفتِ عیان حاصل ہوتی ہے۔ اور اسے عین الیقین کا نام دیا جاتا ہے۔

---

[1] بشرطیکہ طلبِ حدیث سے اس کا مقصد دنیاوی جاہ و جلال یا روپیہ ہو ورنہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے طلبِ حدیث کرنا باعثِ اجر ہے اور اس پر تمام علماء کا اتفاق ہے۔ (مترجم)

مشاہدہ کے بھی دو مقام ہیں:

۱۔ مشاہدۂ استدلال

۲۔ اس سے دلیل کا مشاہدہ۔

چنانچہ معرفت سے پہلے مشاہدۂ استدلال حاصل ہوتا ہے اور یہ معرفتِ خبر ہے اور یہ سمع میں ہے۔ اس کی زبان قول ہے اور اس کا پانے والا واجد (پانے والا) ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان سے علمِ یقین حاصل کرتا ہے۔ فرمایا:

مِنْ سَبَاٍ بِنَبَاٍ یَقِیْنٍ اِنِّیْ وَجَدْتُّ [1] (اور آیا ہوں تیرے پاس سبا سے ایک خبر لے کر بیشک میں نے پایا)

چنانچہ یہ علم وجدان سے پہلے اور سمع کا علم ہے۔ گاہے یہ علم سیکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اسی سے ہے۔

"یقین سیکھو" یعنی اہلِ یقین کے ساتھ مجالست کرو اور ان سے علم یقین سیکھو۔ اس لیے کہ وہ لوگ اس کے علماء ہیں اور مشاہدۂ دلیل ہی معرفت ہے جو کہ عین ہے اور یہی یقین ہے۔ اس کی زبان، وجد ہے، اور اس کا پانے والا قرب و بعد پانے والا ہے اور یہ وجد عینِ یقین کا علم ہے اور یہ ایسا آدمی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے ذریعہ اس کے ہاتھ پر اس کے نور کے باعث اس کی کارسازی فرماتا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان اسی قبیل سے ہے کہ،

"سو میں نے اس کی ٹھنڈک کو محسوس کیا تو میں نے جان لیا۔"

چنانچہ یہ تعلیم یقین کے ساتھ عین الیقین سے وجد کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے اور یہ قلبی اعمال میں سے ہے۔ اور یہی علمائے آخرت، اہلِ ملکوت، اور اربابِ قلوب ہیں۔ یہی لوگ مقربین اور اصحابِ یمین میں سے ہیں۔ علمِ ظاہر، علمِ ملک سے حاصل ہوتا ہے اور یہ (علمِ ظاہر) اعمالِ زبان میں سے ہے۔ اس (علمِ ظاہر) کے علماء علمائے دنیا کے نام سے موسوم ہیں اور ان میں سے صالحین ترین حضرات کو اصحابِ یمین میں سے ہونے کا شرف حاصل ہے۔

یقینِ محکم کی اہمیت

ایک آدمی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا: مجھے دو آدمیوں کے بارے میں بتائیے۔ ایک آدمی خوب سرگرمی اور محنت سے

---

[1] سورۃ النمل آیت ۲۲۔

عبادت کرتا ہے. کثرت سے صالح اعمال کرتا ہے۔ گناہ کم کرتا ہے مگر اس کا یقین کمزور ہے۔ گاہے اسے بعض معاملات میں شبہ آجاتا ہے۔"

حضرت معاذؓ نے فرمایا،

"اس کا شک اس کے اعمال کو برباد کر دے گا۔"

اس نے عرض کیا،

"آپ اس آدمی کے بارے میں بتایئے کہ جس کا عمل کم ہے مگر اس کا یقین قوی ہے اور اس کے گناہ بھی زیادہ ہیں۔" حضرت معاذؓ خاموش رہے۔ وہ آدمی کہنے لگا۔

"اللہ کی قسم! اگر پہلے آدمی کے شک نے اس کے نیک اعمال برباد کر دیئے تو اس کا یقین اس کے تمام گناہوں کو مٹا دے گا۔"

راوی بتاتے ہیں کہ حضرت معاذؓ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اٹھ کھڑے ہوئے، پھر فرمایا،

"میں نے اس سے زیادہ صاحبِ فقاہت کوئی نہیں دیکھا۔" اس مفہوم کی با سند روایت آتی ہے کہ عرض کیا گیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! ایک آدمی ایسا ہے جس کا یقین اچھا ہے اور گناہ زیادہ ہیں اور دوسرا آدمی ایسا ہے جو خوب عبادت کرتا ہے مگر یقین ناقص ہے۔" آپؐ نے فرمایا،

"ہر آدمی کے گناہ تو ہوتے ہی ہیں مگر جس کی فطرت میں عقل ہو اور خصلت میں یقین ہو اسے گناہ ضرر نہیں دیتے۔" اس لیے کہ جب بھی گناہ کرے گا توبہ کرے گا۔ معافی مانگنے لگ جائے گا اور نادم ہوگا۔ آخر یہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہوگا۔ اس کا ثواب باقی رہے گا اور جنت میں داخل ہو جائے گا۔

حضرت ابوامامہؓ کی ایک حدیث جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے،

"تمہیں قلیل ترین چیز جو دی گئی (وہ) یقین اور صبر کی عزیمت ہے اور جس کو ان دونوں سے حصہ ملا وہ پروا نہ کرے کہ اس کا کس قدر قیامِ شب اور صیامِ نہار رہ گیا۔"

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو وصیت فرمائی،

"اے بیٹا! یقین کے بغیر عمل کی ہمت نہیں ہوتی اور انسان یقین کی مقدار بھر ہی عمل کرتا ہے اور عمل میں کمی اس وقت آتی ہے کہ جب یقین میں کمی آجائے۔ گاہے ایسا ہوتا ہے کہ صاحبِ یقین آدمی کا کمزور عمل بھی کمزور یقین والے کے قوی عمل سے افضل ہوتا ہے۔ جس کا یقین کمزور ہو اس پر گناہوں کا غلبہ ہو جاتا ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذؒ فرمایا کرتے،

"توحید نور ہے اور شرک آگ ہے اور نارِ شرک مشرکین کی نیکیاں اس قدر تیزی سے نہیں جلاتی جس قدر کہ نورِ توحید اہلِ توحید کے گناہوں کو جلاتا ہے۔

یقین کے تین مقامات ہیں :

۱۔ یقینِ معاینہ ، اس خبر میں اختلاف نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس کا عالم خبیر کہلاتا ہے اور یہ مقام صدیقین و شہداٗ کے لیے ہے۔

۲۔ یقینِ تصدیق وتسلیم ، یہ خبر میں ہوتا ہے اور اس کا عالم ، مخبر مسلم کہلاتا ہے اور یہ اہلِ ایمان کا یقین ہے اور یہی ابرار لوگ ہیں۔

مِنۡهُمُ الصّٰلِحُوۡنَ وَ مِنۡهُمۡ دُوۡنَ ذٰلِكَ [1] (بعض ان میں نیک اور بعض اور طرح کے)

جیسے کہ فرمایا :

وَ مَا زَادُوۡهُمۡ اِلَّاۤ اِيۡمَانًا وَّ تَسۡلِيۡمًا ؕ [2] (اور ان کو اور بڑھا یقین اور اطاعت کرنا)

گاہے اسباب نہ ہونے اور عادت کی کمی کے باعث یہ کمزور ہو جاتا ہے اور اسباب وعادات ہونے پر یہ قوی ہو جاتا ہے۔ اواسط کو دیکھتے ہوئے محجوب ہوتے ہیں اور ان کے ذریعہ کشف حاصل کرتے ہیں۔ ان کا انس و فضل مخلوق سے ہوتا ہے اور ان کے فقدان کے باعث ان کو نقص و وحشت ہوتی ہے اور یہ انہی اختلافات سے ہوتا ہے اور اشیاٗ کے تلون و تغیر کے باعث پیدا ہونے والے اختلافات سے رنگ پذیر ہوتے ہیں۔

یقین کا تیسرا بیان

استدلالی یقین یقین کا تیسرا مقام ظنِ یقین کا ہے جو کہ علم وخبر اور اقوالِ علماء کے ذریعہ قوی ہوتا ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ سے مزید علم حاصل ہوتا ہے اور ان کے لیے ایک حصہ ہوتا ہے۔ اسی طرح دلائل کی کمزوری اور قائلین کی خاموشی کے باعث یہ یقین بھی کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کو یقینِ استدلال کہا جاتا ہے۔ اور یہ علوم معقول میں ہوتے ہیں اور عام مسلمانوں میں سے اہلِ رائے وعلومِ عقلیہ اور اہلِ قیاس ونظر متکلمین کا یقین یہی ہے اور جو آدمی بھی یقین باللہ رکھتا ہے۔ وہ توحید و معرفت کا علم رکھتا ہے مگر اس کا علم و معرفت اس کے یقین کی مقدار پر ہے اور اس کا یقین اس کی صفائی ایمان کی مقدار پر ہوتا ہے اور جس قدر اس کا معاملہ اور تقویٰ درست ہے۔ اس کے تقاضا کے مطابق اسے قوتِ یقین و ایمان حاصل ہے۔

چنانچہ اعلیٰ ترین علم، عین الیقین سے علمِ مشاہدہ ہے اور یہ مقاماتِ قرب ، محادثاتِ مجالس جائے انس

---

[1] اعراف - آیت ۱۶۸ [2] احزاب - آیت ۲۲

"آگے بڑھو، تمہاری ماں نہ رہے۔ کیا یہ تیرے باپ کا فتنہ ہے جو اس کا قائد و رہنما ہے؟" اور جب انسان یہ کہتا ہے کہ لَا اَدْرِیْ (میں نہیں جانتا) تو اس نے اپنے علم پر عمل کیا اور اپنے حال پر قائم رہا۔ اسے بھی اپنے مقام کا اجر ملے گا۔ اس لیے کہ وہ اپنے حال پر قایم رہا اور اس نے اپنے علم (لا ادری) پر عمل کیا۔ اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ لا ادری بھی نصف علم ہے اور جس آدمی نے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے حُسنِ سکوت اختیار کیا، وہ ایسا ہی ہے کہ جیسے دُوسرا آدمی علم پر عمل کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے

حضرت علی بن حسین اور محمد بن عجلان (رضی اللہ عنہم) نے فرمایا:

"جب ایک عالم غلطی سے بھی لا ادری (میں نہیں جانتا) کہہ دے تو بھی اس کا کلام درست ہے۔"

امام مالکؒ اور شافعیؒ کا بھی یہی قول ہے۔

علم و ایمان

یاد رکھیے۔ مختلف لوگوں میں جس طرح عقل و جنون کے لحاظ سے تفاوت ہوتا ہے اسی طرح علم و جہالت کے اعتبار سے بھی لوگوں میں اختلاف ہوتا ہے۔ عقلاً کی طرح جہلاء کے بھی کئی طبقات ہیں اور علماء کی طرح جہلاً کے بھی کئی طبقات ہیں۔ خواص جہلاً عام علماً سے مشابہ ہوتے ہیں۔ وہ عوام کو شکوک و شبہات میں ڈالتے ہیں اور عوام انہیں علماء سمجھ لیتے ہیں مگر یہ لوگ علمائے ربانیین کے ہاں خوب برہنہ اور ننگے ہوتے ہیں۔ اسی طرح متصوف قسم کے لوگ بھی علماً سے مشابہ ہوتے ہیں مگر اہل یقین کے سامنے ان کی حقیقت عیاں ہوتی ہے۔

ایک عالمؒ فرماتے ہیں:

"علم کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ علمِ امراء

۲۔ علمِ متقین

قضایا کا علم اصل میں امراء و حکام کا علم ہے اور یقین و معرفت کا علم، اہل تقویٰ کا علم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عالم مومنین کے لیے علم کی توصیف کی اور علمِ ایمان کا ذکر فرمایا:

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ [1] (اللہ اونچے کرے ان کو جو ایمان رکھتے ہیں تم سے اور علم، بڑے درجے)

چنانچہ اہل ایمان کو علماء فرمایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ علم و ایمان دونوں میں جدائی نہیں ہوتی اور اہلِ

---

[1] سورۂ مجادلۃ آیت ۱۱۔

اور ان کے لطیف تعلق میں مقربین کے لیے مخصوص ہے۔

اور کمترین درجہ کا علم، عدمِ انکار اور فقدانِ شکوک کے باعث علمِ تسلیم و قبول ہے اور یہ عام مومنین کا علم ہے اور یہ علمِ ایمان اور مزید تصدیق سے ہے اور یہ (مقام) اصحابِ یمین کا ہے۔

ان دونوں کے درمیان ایسے مقاماتِ لطیفہ ہیں جو کہ مقربین کے اعلیٰ طبقات سے لے کر متوسط مقامات تک ہوتے ہیں اور اصحابِ یمین کے ادنیٰ طبقوں سے لے کر متوسط اعلیٰ اصحاب تک ہوتے ہیں۔

علمِ سکوت کی فضیلت

حدیث میں آتا ہے:

علم تین ہیں:

۱۔ کتاب ناطق

۲۔ سنتِ قائمہ

۳۔ لا ادری (میں نہیں جانتا)

حضرت شعبیؒ سے مروی ہے۔ انہوں نے فرمایا:

"لا ادری، آدھا علم ہے۔ یعنی یہ تقویٰ کی بات ہے۔"

حضرت ثوری علیہ الرحمۃ فرمایا کرتے:

"علم اصل میں پختگی کے ساتھ رخصت ہے اور سختی تو ہر ایک کرنا خوب جانتا ہے یعنی تقویٰ اور مختلف امور میں توقف کرنا عام مومنوں کی سیرت ہے چاہے وُہ علماء نہ ہوں کیونکہ ورع کا مطلب شبہات میں پڑنے سے بزدلی دکھانے اور اشکالات میں سکون یا سکوت کے ساتھ توقف کرنے کا نام ہے اور مختلف امور پر بصیرت و تمکین کے ساتھ جرأت کرنے کو یقین کہا جاتا ہے اور علم و خبر کے ساتھ ایک بات کا قطعی فیصلہ کرنے کو یقین کہا جاتا ہے۔ یہ ان علماء کا وصف ہے کہ جن کا علم پختہ ہے اور ان کے علاوہ دُوسرے لوگوں کو اس حسنِ اقدام کی قدرت حاصل نہیں۔ جیسے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے اپنے بیٹے حضرت محمد بن حنیفہؓ کو جنگِ جمل کے موقع پر اپنے آگے رکھا اور فرمایا:

"آگے بڑھو، آگے بڑھو" اور محمد بن حنیفہؓ پیچھے ہٹ رہے تھے۔ حضرت علیؓ نیزے کی نوک سے انہیں ٹھوکے دے رہے تھے۔ حضرت محمدؒ نے اُن کی طرف رُخ کر کے عرض کیا:

"اللہ کی قسم! یہ اندھا اندھیرا فتنہ ہے۔"

حضرت علیؓ نے انہیں نیزے سے ٹھوکا دیا اور پھر فرمایا:

لغت کے نزدیک یہاں واؤ جمع کی نہیں بلکہ مدح کی ہے اور جب عرب لوگ اوصاف بیان کر کے مدح کرتے ہیں تو مبالغہ کے لیے واؤ درمیان میں ذکر کر دیتے ہیں۔ چنانچہ کہا کرتے ہیں کہ:

فلان العاقل و العالم و الادیب۔ (فلاں آدمی دانش ور عالم ادیب ہے)

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لٰكِنِ الرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ۔ (لیکن جو ثابت ہیں علم پر، ان میں اور ایمان والے، سو مانتے ہیں جو اترا تجھ پر، اور جو اترا تجھ سے پہلے، اور آخر میں نماز پر قایم رہنے والوں کو، اور دینے والے زکوٰۃ کے)

یہ تمام صفت ہے اور مومن ہی راسخون فی العلم ہیں۔ وہی مقیمون اور موتون الزکوٰۃ ہیں، اور ان سب کا وصف راسخون فی العلم ہے۔ اس وجہ سے المقیمین الصّلوٰۃ پر نصب آیا کیونکہ یہ مدح ہے اور عرب لوگ مدح کو نصب و رفع دیا کرتے ہیں۔ اس مفہوم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

وَ الرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ۔ (اور جو مضبوط علم والے ہیں۔ سو کہتے ہیں ہم اس پر یقین لائے)

چنانچہ علماء کے ایمان کا وصف فرمایا جیسے کہ مومنین کا علم کے ساتھ وصف بیان کیا۔ اسی طرح ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِيْمَانَ۔ (اور کہیں گے جن کو ملی سمجھ اور یقین)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی حدیث بھی اس قبیل سے ہے کہ:

"میری امت کے پانچ طبقات ہیں۔ ہر طبقہ چالیس برس ہوگا۔ چنانچہ میرا طبقہ اور میرے صحابہ کا طبقہ اہلِ علم و ایمان کا طبقہ ہے اور جو ان کے ساتھ ہی بعد میں اسّی (برس) تک کے اندر کا ہے۔ وہ اہل بر و تقویٰ کا طبقہ ہے اور جو ان کے بعد ایک صد بیس برس کی مدت کا ہے وُہ اہل تواصل و تراحم ہیں"۔ (الحدیث)

چنانچہ آپ نے علم کو ایمان کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا اور ان دونوں کو باقی تمام طبقات پر مقدم فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ایمان کو قرآن کے ساتھ ملا کر ذکر کیا اور قرآن ہی علم ہے جیسے کہ قرآن کو ایمان کے ساتھ ملا کر ذکر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

كَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَ اَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ۔ (لکھ دیا ہے ایمان ان کے دلوں میں اور ان کی مدد کی ہے اپنے غیب کے فیض سے)

اس سے قرآن مراد لیا گیا اور اکثر وجوہ ہیں یا، اللہ تعالیٰ کی طرف جاتی ہے۔ جیسے کہ فرمایا،

مَا كُنْتَ تَدْرِىْ مَا الْكِتٰبُ وَ لَا الْاِيْمَانُ وَ لٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا۔ (تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب اور نہ ایمان پر ہم نے رکھی ہے یہ روشنی)

چنانچہ اہل قرآن ہی اہل ایمان ہیں اور اہل قرآن ہی اہل اللہ اور اس کے خاص بندے ہیں۔

حضرت سفیان بن حسینؒ علماء میں سے تھے وہ مہدی کے پاس آئے تو اس نے پوچھا،

"کیا آپ علماء میں سے ہیں؟"

یہ خاموش رہے۔ اس نے دوبارہ یہی سوال کیا۔ یہ پھر خاموش رہے تو ان سے پُوچھا گیا،

"آپ امیر المومنین کو جواب نہیں دیتے؟"

انہوں نے فرمایا،

"وہ مجھ سے ایسی بات پُوچھ رہے ہیں کہ اس کا کچھ جواب نہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں عالم نہیں تو حقیقت یہ ہے کہ میں نے کتاب اللہ پڑھی ہوئی ہے۔ اب میں جھُوٹا ہوتا ہُوں اور اگر میں یہ کہوں کہ میں عالم ہوں تو جاہل بنتا ہُوں"

ابو جعفر رازی نے ربیع سے انہوں نے حضرت انسؓ سے اس فرمانِ خداوندی کے بارے میں فرمایا،

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ (اللہ سے ڈرتے ہیں وہی اس کے بندوں سے جن کو سمجھ ہے)

(یعنی علماء ہی ڈرنے والے ہیں)

انہوں نے فرمایا،

جو اللہ سے نہ ڈرے وہ عالم نہیں۔ دیکھیے حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا،

اس کی وجہ یہ ہے کہ تو نے خشیۃ کو ہی علم قرار دیا اور حکمت و ایمان تیرے ساتھ ہے۔ چنانچہ جو تجھ سے نہ ڈرے اسے علم حاصل نہیں۔ اور جو تجھ پر ایمان نہ لایا اس نے انصاف نہیں کیا۔ حضرت عبداللہ بن رواحہؓ نے علم کو ہی ایمان کا نام دیا۔ وہ اپنے اصحاب سے فرمایا کرتے،

ہمارے پاس بیٹھو، ایک گھڑی ایمان لائیں، چنانچہ وہ علمِ ایمان کا مذاکرہ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین کو سماعت، بصارت اور قلب عطا کیا۔ یہ علم کے ذرائع ہیں، ان ذرائع سے علم حاصل کیا جاتا ہے اور انہی کے ساتھ علم پایا جاتا ہے۔ یہی اصول و انعامات علم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوق انہی کا انعام فرمایا اور ان پر شکر کرنے کا مطالبہ فرمایا:

اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے،

وَ اللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْئًا وَ جَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَ الْاَبْصَارَ وَ الْاَفْـِٕدَةَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝ [1]

(اور اللہ نے تم کو نکالا ماں کے پیٹ سے، تم کچھ نہ جانتے تھے اور دیے تم کو کان اور آنکھیں اور دل، شاید تم احسان مانو)

چنانچہ ان کے ساتھ نفی کے بعد ان ہی کے ساتھ علم ثابت کیا۔ جو آدمی مومن نہیں اس کا وصف بیان کیا اور ان سے علم کے کام آنے کی نفی فرمائی۔

وَ جَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّ اَبْصَارًا وَّ اَفْـِٕدَةً فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَ لَاۤ اَبْصَارُهُمْ وَ لَاۤ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَیْءٍ اِذْ كَانُوْا یَجْحَدُوْنَ۝ [2]

(اور ان کو دیے تھے کان اور آنکھیں اور دل، پھر کام نہ آئے ان کو کان ان کے اور نہ آنکھیں، نہ دل ان کے کسی چیز میں، کہ تھے اس پر منکر ہوتے اللہ کی باتوں سے)

چنانچہ اللہ تعالیٰ کی آیات پر ایمان لائے اسے سماعت وبصارت اور اس کا قلب اس کے لیے کچھ کام نہ دے گا۔ چنانچہ یہ اس کے لیے علم کی راہیں ہوں گی۔

اسی مفہوم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ لَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓىِٕكَ كَانَ عَنْهُ مَسْـُٔوْلًا۝ [3]

(اور نہ پیچھے پڑ، جس بات کی خبر نہیں تجھ کو، بے شک کان اور آنکھ اور دل ان سب کی اس سے پوچھ ہے۔)

اب اگر سمع وبصر وقلب کے ذریعہ علم واقع نہ ہوتا تو اس کی ممانعت نہ ہوتی جو ان اشیاء کو نہ جانے۔ چنانچہ یہ اواسط اور ان کے اتباع میں اثبات علم اس کے لیے ممنوع ہیں جو علم نہیں رکھتا۔ چنانچہ ہر مومن صاحبِ سمع وبصر قلب ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے عالم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تمام امتوں پر اس امت کو تین باتوں کے باعث شرف وفضیلت عطا کی:

۱۔ ان میں سلسلہ اسناد باقی ہے۔ بعد میں آنے والا ہر آدمی سلسلہ اسناد کے ذریعہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے (کتاب وسنت وعلومِ اسلام) حاصل کرتا ہے اور اس طرح سلف صالحین سے بھی با اسناد اقوال لیتا ہے اور اس پر مشتمل کتابیں تیار کرتے رہتے ہیں۔ اگر ایک کتاب مٹ گئی تو نئی لکھ لی۔ چنانچہ ان کی تمام معلومات با اسناد ہوتی ہیں۔ (اور متداول دین چلا آتا ہے)

---

[1] سورۃ النحل آیت ۷۸

[2] احقاف۔ آیت ۲۶

[3] بنی اسرائیل آیت ۳۶

۲۔ کتاب اللہ کو زبانی حفظ کرنے کا ان میں رواج ہے اور پہلے لوگ اپنی کتابوں کو دیکھ کر پڑھا کرتے اور قرآن مجید کے سوا کسی کتاب کو زبانی حفظ کرنے کا سلسلہ کبھی نہیں چلا۔ البتہ بیت المقدس کے جلنے کے موقع پر تورات کے تمام نسخے جل گئے تھے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیز علیہ السلام کو تورات زبانی حفظ کرا دی، اور یہی وجہ ہے کہ یہودیوں کے ایک گروہ کا یہ دعویٰ ہو گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بیٹا ہے (نعوذ باللہ) حالانکہ اللہ جل شانہ اس تہمت سے بالاتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صرف انہی کو ساری تورات زبانی حفظ کرنے کی قوت بخشی۔

۳۔ اس امت کے ہر مومن سے علم ایمان کی بات دریافت کی جاتی ہے۔ اس کا قول سنا جاتا ہے اور چاہے اس کی عمر چھوٹی ہو اور ایسے نہیں کہ سابقہ لوگوں کی طرح صرف راہبوں، پادریوں اور احبار سے ہی علوم سنیں۔

۴۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت پر ایک چوتھی فضیلت یہ عطا ہوئی کہ انہیں ایمان پر قلبی ثبات و یقین حاصل ہے اور شک و شبہ نہیں آتا اور نہ ہی شرک کا کھٹکا آتا ہے۔ حالاں کہ ان کے قلوب بھی گناہوں میں ملوث ہو جاتے ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت کا یہ حال تھا کہ جس طرح ان کے اعضاء و جوارح گناہ و نافرمانی میں مبتلا ہوئے۔ ان کے قلوب میں شک و شرک بھی آ گیا۔ اس وجہ سے وہ کہنے لگے:

يَا مُوسَى اجْعَل لَّنَا إِلَٰهًا كَمَا لَهُمْ آلِهَةٌ (اے موسیٰ بنا دے ہم کو بھی ایک بت جیسے اُن کے بت ہیں)

جبکہ انہوں نے سمندر پھٹنے، اس میں خشک راستے بننے، انہیں غرق ہونے سے نجات ملنے اور فرعونیوں کے غرق ہونے کی عظیم علامات دیکھیں۔ اس کے باوجود یہ سوال کر دیا۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ بعض نازل شدہ کتب میں یہ آتا ہے۔

اے بنی اسرائیل، یہ نہ کہو کہ علم آسمان میں ہے اسے کون نازل کرے گا اور نہ (یہ کہو) کہ زمینوں کے اندھیروں میں علم ہے اسے کون باہر لائے اور نہ یہ کہو کہ یہ سمندر پار ہے اس کی تعبیر و توضیح کون کرے گا؟ بلکہ علم، تمہارے دلوں میں رکھا گیا ہے۔ میرے سامنے آداب اہل ارواح کے ساتھ مودب رہو اور صدیقین کا اخلاق اختیار کرو اس نے تمہارے قلوب میں علم ظاہر کیا۔ حتیٰ کہ تمہیں ڈھانپ لیا۔

انجیل میں ہے:

"وہ علم طلب نہ کرو جو تم نہیں سمجھتے۔ حتیٰ کہ تم اسے سمجھ لو، جو تم نے سیکھ لیا ہے۔"

روایت میں ہے کہ،

"جس نے حاصل شدہ علم پر عمل کیا، اللہ تعالیٰ اسے وہ علم دے گا جو نہیں جانتا۔" یہ بات اہل علم کی کمی

اور بدعملوں کی کثرت کی وجہ سے ہے۔

کتاب اللہ میں ہے :

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ يُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۔ (اور ڈرتے رہو اللہ سے اور اللہ تم کو سکھاتا ہے)

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْا ۔ (اور ڈرو اللہ سے اور جان لو)

وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَاسْمَعُوْا ۔ (اور اللہ سے ڈرتے رہو اور سنو)

علم پر عمل ضروری ہے

یاد رکھیے کہ جو علم پر عمل کرے یا علم کے مطابق کلام کرے تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ حقیقت رسا ہوا۔ اور اس کے لیے دو اجر ہوں گے :

۱۔ توفیق کا اجر۔

۲۔ عمل کا اجر۔

اور یہ عارفین کا مقام ہے اور جس نے جہالت کے ساتھ کلام کیا یا جہالت پر عمل کیا اور حقیقت کھو بیٹھا تو اس پر دو بوجھ ہوں گے اور یہ جہلاء کا مقام ہے اور جس نے اپنے علم پر عمل کیا یا کلام کیا اور حقیقت کھو بیٹھا۔ علم کے باعث اس کے لیے ایک اجر ہے اور یہ علمائے ظاہر کا مقام ہے اور جس نے جہالت پر کلام کیا یا جہالت پر عمل کیا اور حقیقت بھی پالی۔ پھر بھی ترکِ علم کے باعث اس پہ ایک بوجھ ہے اور یہ جاہل عابدین کا مقام ہے اور عالم کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کہ حاکم ہو۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکام کی تین قسمیں بتائیں :

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

قاضی تین ہوتے ہیں :

۱۔ حق کے ساتھ فیصلے کرنے والا قاضی ۔ اور یہ بات جانتا ہو تو وہ جنت میں ہوگا۔

۲۔ ظلم کے ساتھ فیصلہ کرنے والا قاضی اور وہ جانتا بھی ہو یا ظلم کا فیصلہ کرے مگر جانتا نہ ہو۔

یہ دونوں دوزخ میں جائیں گے۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں یہ قول بہت ہی خوب ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ یعنی علم اور رِيْشًا یعنی یقین وَلِبَاسُ التَّقْوٰى یعنی حیاء کا لباس بہتر ہے۔

حضرت وہب بن منبہ یمانی نے اس مفہوم میں یہ بات فرمائی :

"ایمان برہنہ ہے اور اس کا لباس تقویٰ ہے۔ اس کی زینت حیاء ہے۔ اس کا پھل علم ہے"۔

حضرت حمزہ خراسانی نے حضرت ثوریؒ کی طرف اسے منسوب کیا اور حضرت عبداللہ کی طرف رفع کرکے

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے (مرفوع) روایت بتایا۔

ہم نے اسے با سند بھی روایت کیا ہے۔ حضرت مسعر نے حضرت سعد بن ابراہیم سے روایت کرتے ہوئے بتایا۔ ایک آدمی نے اُسے پوچھا:

"اہل مدینہ میں سے کون زیادہ فقیہ ہے؟"

فرمایا:

"ان میں سے اللہ عزّوجل سے زیادہ ڈرنے والے۔"

ایک عالم فرماتے ہیں:

"اگر مجھے کوئی آدمی پُوچھے کہ کون لوگ زیادہ عالم ہیں تو میں جواب دوں گا کہ سب سے زیادہ پرہیزگار! اور اگر کوئی پوچھے کہ اس شہر والوں میں سے کون سا زیادہ بہتر ہے تو میں جواب دوں گا کہ کیا تم ایسے آدمی کو جانتے ہو جو انہیں زیادہ نصیحت کرتا ہے۔ جب وُہ بتائیں گے کہ ہاں فلاں آدمی ہے تو میں جواب دوں گا:

"یہی آدمی ان میں سب سے بہتر ہے۔"

ایک دُوسرے بزرگ فرماتے ہیں:

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ "سب سے زیادہ احمق کون ہے؟" تو میں قاضی کا ہاتھ پکڑ کر کہوں گا:

"یہ ہے!"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاسْمَعُوْا۔ (اور اللہ سے ڈرو اور سنو)

اتَّقُوا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِیْدًا۔ (اللہ سے ڈرو اور درست بات کرو)

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے درست بات، صحیح علم اور صحیح سمع کی کنجی تقویٰ کو قرار دیا۔ ہم سے پہلے اور اب کے دور میں بھی یہی اللہ تعالیٰ کی وصیت ہے۔ اس لیے کہ اللہ سُبحانہٗ وتعالیٰ فرماتا ہے:

وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَاِیَّاکُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰہَ۔ (اور بے شک ہم نے ان کو جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی اور خاص کر کے تمہیں وصیت کی کہ اللہ سے ڈرو)

یہ آیت قطبِ قرآن ہے اور جیسے چکّی کا مقدار لکڑیاں ہوتی ہیں اسی طرح اس کا مدار یہ آیت ہے۔

جدل و نزاع کی مذمّت

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام سے مروی ہے:

وُہ آدمی جو دنیا کا طلب گار ہے وُہ شروع سے آخر تک اہلِ علم سے کیونکر ہو سکتا ہے اور جو کلام چاہتا ہے کہ اسے خبر دی جائے اور وُہ عمل کرنے کے لیے (کلامِ علم) کا

طلب گار نہیں۔ وُہ اہلِ علم سے کس طرح ہو سکتا ہے؟

حضرت ضحاک بن مزاحم فرماتے ہیں:

میں نے اسلاف کو دیکھا کہ وُہ ایک دُوسرے سے تقویٰ و پرہیز گاری ہی سیکھتے تھے مگر آج کے لوگ صرف کلام سیکھتے ہیں۔

حدیث میں آتا ہے:

"جس ہدایت پر کوئی قوم ہو، وُہ جب بھی اس سے گمراہ ہُوئی تو اسے جدل و نزاع ہی ملا۔"

پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی:

مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ۔

ایک حدیث میں ہے:

"فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ" سے مراد اہل جدال ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مراد لیے۔ اس لیے ان سے بچو۔"

بعض سلفؒ سے منقول ہے:

"آخری زمانہ میں ایسے علماء ہوں گے جن پر عمل کے دروازے بند کر دیے جائیں گے اور ان پر جدال کے دروازے کھول دیے جائیں گے۔"

ایک روایت میں ہے:

"تم ایسے دور میں ہو کہ تمہیں عمل کرنا القاء ہُوا اور ایسی قوم بھی آئے گی جس کو جدل و نزاع القاء ہو گا۔"

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے،

"تم آج ایسے دَور میں ہو کہ تم میں سے بہترین (نیکیوں میں) تیز رو ہے اور تمہارے بعد ایسا زمانہ آئے گا کہ اس میں تم سے بہترین وضاحت کرنے والا ہو گا۔" اس لیے کہ قرنِ اوّل میں حق و یقین واضح ہے۔ اور ہمارے زمانہ کے بعد شبہات و التباسات کی کثرت ہو گی اور تاریکیٔ شب میں گھسنے کی طرح بدعات جاری ہوں گی، چنانچہ دین کے معاملہ میں اشکال پیدا ہو گا اور صرف وہی بچ سکے گا جو کہ سلف صالحین کے طریق پر چلے گا وُہ ان تمام بدعات سے محفوظ رہے گا۔

ایک عالمؒ سے مروی ہے،

"جب اللہ تعالیٰ بندے پر بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اس کے لیے عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے اور جدل کا دروازہ بند کر دیتا ہے اور جب اللہ تعالیٰ بندے کو سزا دیتا ہے تو اس پر عمل کا دروازہ بند کر دیتا ہے اور جدل کا

دروازہ کھول دیتا ہے "۔

ایک مشہور حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے،

" اللہ تعالیٰ کے نزدیک ساری مخلوق سے زیادہ مغضوب جھگڑالو آدمی ہے "۔

ایک حدیث مروی ہے کہ،

"حیا، اور تواضع ایمان کے دو شعبے ہیں۔ فحش گوئی اور بیان و توضیح، نفاق کے دو شعبے ہیں"۔ اور بعض روایات میں وضاحت آتی ہے کہ،

" تواضع اصل زبان کی نہیں بلکہ دل کی تواضع ہے "۔

ایک دوسری حدیث میں آتا ہے جو حکم بن عینیہ نے عبدالرحمٰنؒ بن ابی لیلیٰ سے نقل کی۔ بتایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

" جس قوم کو منطق (بتنگڑ پن اور کلام کا چسکہ) ملا۔ وہ عمل سے روک دی گئی "۔

اور حدیث میں آتا ہے:

" اللہ تعالیٰ ایسے (فصیح و بلیغ) آدمی سے بغض رکھتا ہے جو کہ زبان میں اس طرح کلام پھراتا ہے جیسے کہ گائے گھاس منہ میں پھراتی ہے "۔ (یعنی منہ بنا بنا کر باتیں کرنے والا)

حضرت احمد بن حنبلؒ فرمایا کرتے،

" علم وہ ہے جو اُوپر سے آئے یعنی بغیر سیکھے الہام و القاء سے عطا ہو "۔

ایک موقع پر فرمایا،

" اہلِ کلام علماء، زنادقہ ہیں "۔ اور ان سے پہلے ابو یوسفؒ نے فرمایا،

" جس نے (علم) کلام سے علم طلب کیا وہ زندیق ہوگیا "۔ [۱]

علمِ باطن کی علمِ ظاہر پر افضلیت

یاد رہے کہ جس علم کی علماء نے فضیلت تسلیم کی اور اس کے ذکر و اہمیت کی عظمت کا اعتراف کیا اور اس کے جاننے والے کو عالم قرار دیا اور اس کی مدح کی۔ اس کے شرف میں آثار مروی ہیں اور وہ علم مندوب ہے۔ احادیث میں ان اہلِ علم کی فضیلت آئی ہے۔ یہ علم دراصل علم باللہ ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف راہ دکھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنے کا باعث بنتا ہے۔ علم ایمان و یقین میں ہی وہ توحید کا مشاہدہ کرتا ہے اور علمِ معرفت و

---

[۱] اس سے مراد یہ نہیں کہ اسلامی نظریات کے دفاع کی نیت سے علمِ کلام حرام ہے جو کہ اشاعرہ اور دُوسرے متکلمین میں مروج ہے۔

حقیقت میں تمام علومِ فتویٰ و احکام سے کم درجہ کا ہے۔

صوفیأ فرمایا کرتے ہیں:

جو اپنے علم پر عمل کرتے نہیں اور عمل کا علم کے ساتھ ذکر کرتے ہیں اور خشوع و خضوع سے اس کی توضیح کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ علم لسان نہیں کہ جس کے ذریعہ انسان عالم بنتا ہے بلکہ اس علم سے مراد، علم قلوب ہے اور اس (علمِ لسان) اعمالِ قلوب کی طرح اعمالِ ایمان بھی صادر نہیں ہوتے اور اعمالِ قلوب ہی مقاماتِ یقین اور صفاتِ اہلِ تقویٰ سے ہیں۔ اور نہ ہی ایسے اعمالِ جوارح سرزد ہوتے ہیں جو مزید ایمان کی دولت عطا کریں اور ان پر چلنے والوں کو اہلِ فقر و زہد کہا جائے اور صاحبانِ توکل و خوف اور اصحابِ شوق و محبت سمجھا جائے اور صوفیاء اس (علم کو) بے معنی سمجھتے ہیں کہ ایک آدمی احکام و قضایا کا علم سیکھ لے اور ان میں پڑ کر احکام جاری کرنے کا کام کرے۔ مثلاً علمِ قضا حاصل کر کے قاضی بن جائے اور لوگوں میں فیصلہ کرتا پھرے یا دنیا کا مال حاصل کرے اور خرید و فروخت میں مشغول ہو جائے۔ جبکہ وہ زکوٰۃ اور خرید و فروخت کے اصولوں کا عالم ہو، یا نکاح و طلاق کے مسائل پڑھ کر عورتوں سے نکاح کرنا اور طلاقیں دینا شروع کر دے اور اپنے علم کے باعث ان باتوں پر عمل کرنا شروع کر دے۔ یہ ایک بزرگ کا تبصرہ ہے اور اس کی مذمت و کراہت سے اقوال ملتے ہیں۔ جس کا ذکر نامناسب ہے۔

ایسے علوم کے ماہرین دنیا میں رغبت کرنے والے اور دنیا جمع کرنے کے حریص شمار کیے جاتے ہیں۔ یہ لوگ حکام رس ہوتے ہیں اور ان کے لیے کام کرتے ہیں۔ اس لیے یہ بات غلط ثابت ہوئی کہ یہ لوگ علماء ہیں اور یہ خشوع و خضوع کرنے والے ہیں۔

جمہور سلف نے علم کی عمل پر افضلیت کا جو اعتراف کیا ہے۔ وہ اس قسم کا (علمِ باطن) ہے۔ چنانچہ ان کا فرمان ہے کہ:

"علم کا ایک ذرہ بھی اتنے عمل سے بہتر ہے۔"

"عابد کی ایک ہزار رکعت سے عالم کی دو رکعتیں افضل ہیں۔"

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا کہ:

"عابد پر عالم کی فضیلت ایسے ہے جیسے کہ میری اُمت پر میری فضیلت ہے۔"

اور ایک مشہور حدیث میں آتا ہے:

"جیسے چاند کی تمام ستاروں پر فضیلت ہے۔"

حضرت ابن عباسؓ اور سعدؓ کا قول ہے اور ہم نے اسے باسند بھی روایت کیا ہے کہ:

"ایک عالم، شیطان پر ایک ہزار عابد سے زیادہ سخت ہوتا ہے"

اسی طرح عالم کی موت کے بارے میں آتا ہے کہ شیطان کو ایک عالم کی موت ایک ہزار عابد کی موت سے زیادہ محبوب ہوتی ہے۔ اس سے مراد علم باللہ تعالیٰ ہے جو کہ عمل سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ علم باللہ دراصل ایمان کا ایک وصف ہے اور یہ یقین کا ایک مفہوم ہے کہ اس سے زیادہ قیمتی چیز آسمان سے نازل نہیں ہوئی۔ اس کے برابر کچھ چیز نہیں اور اس کے بغیر نہ کوئی عمل قبول ہوتا ہے اور نہ ہی صحیح ہوتا ہے اور یہ تمام اعمال کا معیار ہے۔ اسی مقدار پر تمام اعمال قبولیت میں ایک دوسرے سے زیادہ کم درجہ حاصل کرتے ہیں اور اس کی مقدار پر ترازو میں انہیں دوسروں سے بڑھ کر وزن ملتا ہے اور اس کی وجہ سے عاملین کو علیین میں ایک دوسرے کے مقابلہ میں بڑھ بڑھ کر درجات حاصل ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ لَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ۔ (اور ہم نے ان کو پہنچادی ہے کتاب جو کھول کر بیان کی ہے خبرداری سے)

پھر فرمایا:

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ۔ (پھر ہم احوال سنادیں گے ان کو اپنے علم سے)

اور فرمایا:

وَالْوَزْنُ يَوْمَئِذِنِ الْحَقُّ فَمَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ[1] (اور تول اس دن ٹھیک ہے پھر جس کی تولیں بھاری پڑیں)

چنانچہ جو علم رب تعالیٰ کی طرف آنے میں زیادہ اقرب ہوگا وہی افضل ہوگا اور عامل کا وصف عمل کہلاتا ہے اور یہ حکم عبودیت ہے۔ یہ نہیں کہ وہ فتویٰ اور احکام و قضاء کے علم کو علم سمجھتے ہوں کہ جو مخلوق کے مقامات ہیں اور انہی پر لوٹتا ہے۔ اسے وہ معاملات اللہ سبحانہٗ سے افضل نہیں سمجھتے تھے جو کہ مقاماتِ رضا و توکل و محبت سے ہے اور قلوب سے اس کا تعلق ہے اور یہی عین الیقین ہے جو کہ مقربین کا مقام ہے۔ اسے عالم نہیں کہا جاتا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن غنم نے معاذ بن جبلؓ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"سب لوگوں سے زیادہ اہلِ علم اور اہلِ جہاد ہی درجۂ نبوت کے قریب ہوتے ہیں۔ اہل علم اس وجہ سے کہ وہ لوگوں کو اس (تعلیم) کی رہنمائی کرتے ہیں جو انبیاء علیہم السلام لے کر آتے ہیں اور اہلِ جہاد

---

[1] سورۃ اعراف آیت ۷، ۸۔

اس لیے کہ انہوں نے اس (دین کی حمایت) پر اپنی تلواروں سے جہاد کیا جو انبیاء علیہم السلام لے کر آئے۔"
اب آپ خود ہی دیکھیے کہ جہاد کی طرح آپ نے کس طرح علم کو اللہ تعالیٰ کی جانب رہنمائی کرنے والا بتایا۔ اسی طرح حدیث میں آتا ہے،

"سب سے پہلے انبیاء علیہم السلام شفاعت کریں گے۔ پھر شہداء (شفاعت کریں گے)۔
ایک حدیث میں ہے:

"علماء پر انبیاء کو ایک درجہ کی فضیلت حاصل ہے اور شہداء پر علماء کو دو درجہ کی فضیلت حاصل ہے۔"
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ خداتعالیٰ کے اس فرمان

يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ۔ (اللہ اونچا کرے گا ان کو جو ایمان رکھتے ہیں تم میں سے اور علم، بڑے درجے)

کی تشریح میں فرمایا کرتے:

(عام) اہل ایمان پر علماء کو سات سو درجات حاصل ہیں۔ ہر دو درجوں کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے۔"

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا:

"جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہُوا تو میں نے سمجھا کہ دس میں سے نو حصہ علم چلا گیا۔" ان سے دریافت کیا گیا:

"آپ ایسی بات کرتے ہیں حالاں کہ ہم میں بڑے بڑے بلند پایہ صحابہؓ موجود ہیں۔"
انہوں نے فرمایا:

"میری مراد وہ علم نہیں جو تم سمجھتے ہو بلکہ میری مراد علم باللہ تعالیٰ سے ہے۔"

چنانچہ انہوں نے عام معلومات کا علم غیر حقیقی علم قرار دے دیا اور علم باللہ تعالیٰ کو دس میں سے نو حصہ فرمایا، علم ظاہر اعمال پر کوئی زیادہ نہیں بڑھتا، اس لیے کہ یہ اعمالِ ظاہرہ میں سے ہے کیونکہ یہ صفتِ لسانی ہے اور یہ عام مسلمانوں کے لیے ہے۔ چنانچہ اس کا اعلیٰ مقام اخلاص ہے۔ اگر اخلاص نہ رہے تو یہ (علم نہیں بلکہ) دُنیا ہے جیسے کہ تمام دوسری شہوات (و خواہشات امورِ دنیا میں سے ہیں)

اور علمِ باطن کے باعث اخلاص تو عالم باللہ کا پہلا حال و مقام ہے اور عارفین کے مقامات اور صدیقین کے درجات کی بلندیوں کی کوئی انتہا نہیں۔

علمائے دنیا اور علمائے آخرت میں فرق

علمائے کرام نے علم باللہ اور علم بامر اللہ کے درمیان فرق کیا ہے۔ اس طرح علمائے دنیا اور علمائے آخرت کے درمیان بھی فرق کیا ہے۔

چنانچہ حضرت سفیانؒ فرماتے ہیں:

علمائے تین ہیں:

۱۔ عالم باللہ و بامر اللہ۔ یہ ہی عالم کامل ہے۔

۲۔ عالم باللہ تعالیٰ، یہ متقی اور ڈرنے والا ہے۔

۳۔ عالم بامر اللہ جو کہ عالم باللہ نہ ہو۔ یہ عالم فاجر ہے۔

ایک قول یہ ہے کہ عالم للہ ہی اپنے علم پر عمل کرنے والا ہوتا ہے اور عالم بایام اللہ ہی ڈرنے والا اور امید رکھنے والا ہوتا ہے۔

حضرت سفیانؒ سے علم کے بارے میں پوچھا گیا کہ یہ کیا ہے؟

انہوں نے فرمایا:

"یہ تقویٰ و پرہیزگاری کا نام ہے۔"

پوچھا گیا:

"ورع (پرہیزگاری) کیا چیز ہے؟"

فرمایا:

"وہ علم طلب کرنا جس کے ذریعہ پرہیزگاری معلوم کر سکے۔"

ایک گروہ کے نزدیک یہ طولِ سکوت اور کمی کلام کا نام ہے مگر یہ بات درست نہیں۔ اس لیے کہ ہمارے نزدیک متکلم عالم، ایک خاموش سے افضل ہے۔

حضرت لقمان سے ان کی وصیت میں یہ مروی ہے:

"علم کی تین علامات ہیں:

۱۔ اللہ کا علم (علم باللہ)۔

۲۔ جس چیز کو اللہ محبوب رکھے اس کا علم۔

۳۔ جس چیز کو وہ ناپسند رکھے اس کا علم۔

چنانچہ انھوں نے حقیقتِ علم اور دلیلِ وجود کو یہ تین بتایا۔ علمائے دنیا اور علمائے آخرت میں اس طرح

فرق کیا جا سکتا ہے کہ :

"جب کوئی حقیقی عالم ہو تو اسے نہ پہچاننے والا جب دیکھے تو اس پر علم کا اثر ظاہر نہ ہو اور نہ ہی یہ پتہ چلے کہ یہ عالم ہے۔ ہاں صرف علمائے ربانی ہی اسے پہچان سکیں۔ وُہ انہیں خشوع و خضوع اور تواضع و سکینت کے باعث ان کے چہروں سے پہچان لیتے ہیں۔ اولیاءُ اللہ کو یہ الٰہی رنگ حاصل ہوتا ہے اور علمائے ربانی کو یہ خدا تعالیٰ کا عطا کردہ لباس ہے۔

وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَۃً۔ (اور کس کا رنگ ہے اللہ سے بہتر)

چنانچہ اس میں ان کی مثال ایسے ہے جیسے صانع اور کاریگر ہو۔ اس لیے کہ اگر کہیں ایک صنعت جلوہ گر ہو تو دوسرے لوگ اس کو نہیں پہچانتے اور صانع کے بغیر کوئی اس مخصوص صنعت اور دُوسرے امور میں فرق نہیں کر سکتا۔ صانع ہی اس کو سمجھتا ہے۔ اس لیے کہ یہ اس کے سامنے واضح ہے یہ اس کا لباس وصف بن چکی ہے کیونکہ وہ اس کام میں مشغول ہے۔ چنانچہ اس کی علامت ایسے ہُوئی جیسے کہ کہا گیا :

" اللہ تعالیٰ نے سکینت میں خشوع سے زیادہ بہترین لباس کسی بندے کو نہیں پہنایا۔ یہ انبیاء کا لباس ہے اور صدیقین و علماء کی نشانی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ سے فقاہت حاصل کرنے والے اور اسی کے ذریعہ عرفان حاصل کرنے والے اہلِ قلوب ہی تمام لوگوں سے زیادہ اس لطف سے آشنا ہیں، جسے اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے اور اُس خفاء سے آگاہ ہیں جس کو خدا تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے۔

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

"علماء تین ہیں :

۱۔ عالم باللہ

۲۔ عالم لِلّٰہ

۳۔ علم بحکم اللہ تعالیٰ

عالم باللہ سے مراد اہل یقین عارف ہے۔ عالم لِلّٰہ سے مراد اخلاص و احوال و معاملات کے علم کا عالم ہے اور عالم بحکم اللہ سے مراد وہ عالم ہے جو حلال و حرام کی تفصیل جانتا ہو۔ ہم نے اس کی وضاحت اس کے قول کے مفہوم پر اور اس کے مذہب کی پہچان پر کی ہے۔

ایک بار زیادہ وضاحت سے بتایا کہ :

"جو امر اللہ کا یا ایام اللہ کا عالم نہ ہو بلکہ عالم باللہ ہو۔ وہی اہل ایمان ہے اور جو ایام اللہ کا عالم

نہ ہو بلکہ امر اللہ کا عالم ہو۔ وہ حلال وحرام میں مفتی ہے اور جو عالم باللہ بھی ہو اور ایام اللہ کا بھی عالم ہو، وہ صدیقین میں سے ہے اور ایام اللہ سے مراد باطنی نعمتیں اور غامض عقوبات کا عالم ہو۔"

پھر فرمایا:

"علماء کے سوا تمام لوگ مُردے ہیں اور خائفین کے علاوہ تمام علماء (غیر خائفین) سو رہے ہیں اور محبین کے علاوہ باقی تمام خائفین منقطع ہیں اور محبین زندہ شہداء ہیں اور ہر حال میں یہی حضرات اللہ کے لیے قربانی دینے والے ہیں۔"

گاہے فرمایا کرتے:

"طالب علم تین ہیں:

۱۔ جو عمل کے لیے علم پڑھے۔

۲۔ اختلافات معلوم کرنے والا تاکہ تقویٰ کی راہ اختیار کرے اور احتیاط برتے۔

۳۔ تاویل معلوم کرنے والا تاکہ حرام کی تاویل کرکے اسے حلال بنانے کی کوشش کرے۔

حق کی ہلاکت ایسے (بدبخت) کے ہاتھ پر ہوتی ہے اور نفسانی اغراض کی خاطر لوگوں نے امام ابو یوسف کی طرف ایک غلط واقعہ منسوب کیا کہ جب سال ختم ہونے کے قریب ہوتا تو وہ اپنا مال اپنی بیوی کو ہبہ کر دیتے اور اس کا مال ہبہ کی صورت میں خود لے لیتے۔ اس طرح ان دونوں سے زکوٰۃ ساقط ہو گئی۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے سامنے اس کا ذکر کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

"یہ ان کی فقاہت ہے۔ اب اگر وہ ورع و احتیاط دین کی خاطر علم حاصل کرتا ہے تو یہ نفع بخش علم ہے۔"

اب جب اس قسم کی خواہش و تاویل کی خاطر علم حاصل کرے تو اس سے جہالت بہتر ہے۔ یہ ایسا علم ہے کہ جس سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پناہ چاہی۔

حضرت عمرؓ وغیرہ سے مروی ہے اور باسند بھی روایت ہے:

"ہر زبان جاننے والے منافق سے بچو، جو تم جانتے ہو۔ وہ کہتا ہے مگر جس کا تم انکار کرتے ہو۔ وہ کرتا ہے۔"

ان سے ایک روایت یہ بھی ہے:

"سکینت و بردباری کی خاطر علم سیکھو اور سکھاؤ۔ جس کو سکھاتے ہو۔ اس کے لیے تواضع کرو، اور تم میں سے جو سیکھ رہا ہو، اسے منکسر اور متواضع رہنا چاہیے اور جابر قسم کے علماء نہ بنو۔ اس لیے کہ

جہالت کے ساتھ ساتھ تمہارا علم نہ ٹھہرے گا۔"

حضرت علی ابن عباس رضی اللہ عنہما اور کعب احبار سے مروی ہے کہ،

"آخر زمانہ میں ایسے علماء ہوں گے جو دنیا میں لوگوں کو زاہد بنائیں گے۔ اور خود زہد اختیار نہیں کریں گے۔ لوگوں کو ڈرائیں گے اور خود نہیں ڈریں گے۔ لوگوں کو حکام کے پاس جانے سے منع کریں گے مگر خود اس کام سے نہیں رکیں گے۔ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیں گے اور زبان کے ذریعہ دنیا کھائیں گے، دولت مندوں کا قرب حاصل کریں گے اور فقراء سے دُور رہیں گے۔ جس طرح عورتیں مردوں پر طرح طرح کی کمندیں ڈالتی ہیں اسی طرح یہ علم پر تیغز بر پا کرتے ہیں۔ اگر ان کے پاس بیٹھنے والا کسی دُوسرے (عالم) کے پاس بھی نشست رکھے تو اس پر ناراض ہوتے ہیں۔ یہی ان کا علم ہے۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے،

"ان کے علماء ہی بدترین مخلوق ہیں۔ ان سے ہی فتنہ ظاہر ہوا اور انہی میں واپس آئے گا۔"

(یہ علمائے سو کی حالت ہے)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آتا ہے،

"یہی لوگ ظالم ہیں اور رحمٰن تعالیٰ کے دشمن ہیں۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے،

"اسلام میں میری پشت دو آدمیوں نے ہی توڑی:

۱۔ بدکار عالم نے

۲۔ بدعتی نے

ایک بدکار عالم لوگوں کو علم کے زور سے زاہد بناتا ہے جبکہ اس کی بدکاری دیکھتے ہیں اور زاہد بدعتی لوگوں کو اپنی بدعت کی طرف بلاتا ہے۔ اس لیے کہ لوگ اس کے زہد کی شکل کو دیکھتے ہیں۔"

حضرت صالح بن حسان بصری نے فرمایا:

"میں نے مشائخ صوفیاء سے سُنا۔ وُہ بدکار عالم سے خدا کی پناہ چاہتے تھے۔"

حضرت فضیل بن عیاضؒ فرماتے ہیں:

"دو عالم ہوتے ہیں:

۱۔ عالمِ دنیا۔

۲۔ عالمِ آخرت۔

دنیا کے عالم کا علم نشر ہو رہا ہے اور عالمِ آخرت کا علم مخفی ہے۔ چنانچہ آخرت کا علم حاصل کرو اور عالم دنیا سے بچ کر رہو۔ وہ اپنی بدمستی کی وجہ سے تمہیں بھی برباد کر دے گا۔ پھر یہ آیت پڑھی:

اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ[۵]

(بہت عالم اور درویش اہل کتاب کے کھاتے ہیں مال لوگوں کے ناحق، اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے)

فرمایا:

"احبار سے مراد علماء ہیں اور رہبان سے مراد زاہد لوگ ہیں۔"

حضرت سہل بن عبداللہ نے فرمایا:

"طالب علم تین ہیں:

۱۔ جو علم تقوٰی حاصل کرے تاکہ کوئی شبہ کی چیز استعمال نہ کر بیٹھے۔ چنانچہ بعض اوقات وہ حرام کے ڈر سے ایک حلال چیز کو چھوڑ دیتا ہے۔ یہ زاہد متقی ہے۔

۲۔ جو اختلافات اور اقوال کی تلاش رکھے۔ چنانچہ اپنی ذمہ داریاں بھلا بیٹھے اور وسعت میں پڑ کر مباحات کا استعمال کرے اور رخصتوں کے پیچھے لگ جائے۔

۳۔ جو ایک معاملہ کے بارے میں معلوم کرے اور اسے جواب دیا جائے کہ یہ جائز نہیں۔ پھر وہ پوچھے کہ اسے جائز بنانے کی کیا ترکیب ہے؟ اور علماء سے اس بارے میں پوچھتا پھرے اور وہ اسے مختلف اقوال اور شبہات بتائیں۔ مخلوق کی بربادی اس کے ہاتھ پر ہے۔ اس نے اپنے آپ کو برباد کیا اور (پھر مخلوق کو برباد کیا) یہ علماء سوء میں داخل ہے۔

یاد رکھیں کہ جو اپنے علم کے ذریعہ دنیا کھا رہا ہے۔ وہ باطل ذریعہ سے مال کھا رہا ہے اور جو آدمی بھی باطل طریق سے لوگوں کا مال کھائے۔ وہ انہیں اللہ کی راہ سے یقیناً ہٹانے والا ہے۔ چاہے اس کی زبان پر یہ بات ظاہر نہ ہو مگر تم بعض باتوں کے ذریعہ یہ چیز سمجھ لوگے۔ مثلاً وہ لوگوں کو دوسرے علماء کی مجالس میں جانے سے روکے گا آخرت کی راہوں سے بڑی چالاکی سے روکے گا۔ اس لیے کہ اس (باطل خوری) کے باعث وہ چاہے یا نہ چاہے۔ اس پر دنیا کی محبت اور خواہش نفس غالب آچکی ہے۔

ایک عالمؒ فرماتے ہیں:

---

[۵] سورۃ توبۃ آیت ۳۴۔

اللہ تعالیٰ تواضع کرنے والے عالم کو پسند کرتا ہے اور ظالم عالم سے بغض رکھتا ہے اور جو اللہ تعالیٰ کی خاطر تواضع اختیار کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے حکمت عطا فرمائے گا۔

حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے،

" اللہ تعالیٰ ایک موٹے عالم پر غضبناک رہتا ہے (جبکہ وُہ دنیادار ہو) جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی عالم مالک بن صیف کو فرمایا:

" میں تجھے اللہ کی قسم دیتا ہُوں کہ کیا اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السّلام پر یہ بھی نازل نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ موٹے اور فربہ عالم سے بغض رکھتا ہے۔"

ابن صیف موٹا تھا۔ وُہ غصہ میں آگیا اور کہنے لگا:

" اللہ تعالیٰ نے کسی انسان پر اس قسم کی کوئی بات نازل نہیں کی۔"

اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی،

قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا۔

اس کے ساتھیوں نے ہی اسے کہا،

تیرا ناس ہو۔ تو نے کیا کہہ دیا؟ تو نے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کا انکار کر دیا۔ وہ کہنے لگے کہ آپ نے مجھ سے جھگڑا کیا۔ اس لیے میں نے یہ جواب دیا۔

مشائخ فرمایا کرتے،

جس بندے کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا، پھر اسے بردباری، تواضع، حُسنِ اخلاق اور نرمی دی گئی تو نفع بخش علم کی علامت ہے۔"

اس مفہوم کی ایک حدیث بھی آتی ہے:

" اللہ تعالیٰ نے جس کو زہد، تواضع اور حسنِ اخلاق عطا کیا۔ وُہ پرہیز گاروں کا امام ہے۔"

حضرت حسنؓ فرمایا کرتے:

" علم کا وزیر بردباری ہے اور اس کا باپ نرمی ہے اور تواضع اس کا راستہ ہے۔"

اخبار داؤد علیہ السّلام میں سے ایک یہ ہے کہ،

" اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی:

" اے داؤدؑ! مجھ سے کسی ایسے عالم کا نہ پُوچھنا جسے دنیا نے بدمست کر دیا۔ یہ تمہیں میری محبت کی راہ سے ہٹا دے گا۔ یہ لوگ میری راہ کے متلاشیوں کے لیے ڈاکو ہیں۔ اے داؤدؑ! جب ایک عالم میری

محبت پر اپنی شہوت (خواہش) کو ترجیح دیتا ہے تو میں اس کو کم درجہ کی یہ سزا دیتا ہوں کہ اپنی مناجات کی لذت سے اسے محروم کر دیتا ہوں۔ اے داؤدؑ! جب تو مجھے طلب کرنے والے کو دیکھے تو اس کا خادم بن جا۔ اے داؤدؑ! جو میری طرف دوڑتے ہوئے واپس آیا میں نے اسے اپنے پاس جہابذہ (کھرے کھوٹے میں امتیاز کی قوت کا مالک) قرار دیا اور جس کو میں نے جہابذہ میں لکھ دیا اس کو کبھی بھی عذاب نہیں دوں گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے:

علماء سوء کی مثال ایسے پتھر کی طرح ہے جو نہر کے دہانے پر پڑا ہو۔ نہ خود پانی پئے اور نہ اسے باہر جانے دیں کہ کھیتیاں سیراب ہوں۔ اسی طرح علمائے دنیا ہیں کہ آخرت کی راہ پر بیٹھ گئے۔ نہ خود ہی اس راہ پر چلتے ہیں اور نہ ہی بندوں کو اللہ کی طرف جانے دیتے ہیں۔

فرمایا:

"علماء سوء کی مثال ایسے ہے جیسے کہ کھجور کا گڑھا ہو۔ جس کا ظاہر اچھا ہے مگر اندر بدبُو ہے اور جیسے پختہ قبریں ہوں جن کا ظاہر آباد ہے اور اندر مُردوں کی ہڈیاں ہیں۔"

حضرت بشر بن حارث فرماتے ہیں:

"جس عالم نے ریاست (اقتدار) چاہی اللہ تعالیٰ اسے اپنے بغض کے قریب کر دے گا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ آسمان و زمین میں اس پر غضبناک ہوتا ہے۔"

حضرت اوزاعیؒ نے بلال بن سعدؒ سے نقل کیا۔ وُہ فرمایا کرتے:

تم لوگ پولیس والے کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ سے اس کے حال سے پناہ مانگتے ہو اور اس سے نفرت کرتے ہو مگر عالمِ دنیا کی طرف نفرت نہیں کرتے حالانکہ اس نے مخلوق کی خاطر تصنع کر رکھا ہے اور حرص و اقتدار کی خاطر سب کچھ کر رہا ہے۔ اس سپاہی سے یہ عالم نفرت کرنے کا زیادہ مستحق ہے۔"

حضرت ابو محمدؒ فرمایا کرتے:

علماء کے مشورہ کے بغیر دین و دنیا کے کسی معاملہ میں قطعی فیصلہ مت دو۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں انجام کار تمہاری تعریف ہو گی۔"

ان سے پوچھا گیا:

"اے ابو محمدؒ! علماء کون ہیں؟" تو جواب دیا:

"جو دنیا پر آخرت کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنی جانوں پر اللہ کو ترجیح دیتے ہیں۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

" اپنے معاملات میں ان سے مشورہ کرو جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں۔"

ایک اسرائیلی روایت ہے کہ:

" ایک حکیم نے حکمت کے بارے میں تین سو ساٹھ کتابیں لکھیں اور حکمت کی خوب وضاحت کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کے نبی کی طرف وحی فرمائی:

" اس سے کہہ دو، زمین منافقت سے بھر گئی مگر اس سلسلہ میں تم نے کچھ نہیں کیا اور میں تیرے نفاق سے کچھ قبول نہیں کروں گا۔"

بتاتے ہیں:

اس نے انہیں اپنے سامنے ڈال لیا اور غم میں ڈوب کر اسے چھوڑ دیا۔ عوام میں اختلاط، بازاروں میں پھرنا، بنی اسرائیل کے ہمراہ کھانا پینا اور تواضع کرنا شروع کر دی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان نبی علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی:

" اسے کہہ دیں کہ تو نے اب میری رضا کی موافقت کی۔"

عالم اور متکلم

ایک عالم فرماتے ہیں:

اہل علم کی دو قسمیں ہیں:

۱۔ خواص کا عالم۔

۲۔ عوام کا عالم۔

عوام کا عالم وہ ہے جو حلال و حرام کے امور کا فتویٰ دیتا ہو۔ یہ اصحابِ اساطین ہیں اور خواص کا عالم وہ ہے کہ جو علمِ توحید و معرفت کا عالم ہو۔ یہ اصحابِ زوایا (کونوں والے) ہیں اور یہی منفرد حضرات ہیں۔

گاہے فرمایا کرتے:

" امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کی مثال دجلہ کی طرح ہے جسے ہر ایک پہچانتا ہے اور بشر بن حارث ایک شیریں کنویں کی طرح ہیں جس پر ایک ایک کر کے آدمی آتا ہے۔"

حماد بن زید نے فرمایا کہ، ایوبؒ سے پوچھا گیا:

" آج علم زیادہ ہے یا گزشتہ زمانہ میں زیادہ تھا؟"

انہوں نے فرمایا:

" گزشتہ زمانہ میں علم زیادہ تھا آجکل کلام زیادہ ہے۔"

چنانچہ انہوں نے علم اور کلام میں فرق کر دیا۔

مشائخ فرمایا کرتے تھے،

"فلاں عالم ہے اور فلاں متکلم ہے۔ فلاں زیادہ کلام کرنے والا ہے اور فلاں علم میں بڑھ کر ہے"۔

حضرت ابوسلیمانؒ فرمایا کرتے تھے،

"معرفت حقیقت میں کلام کے مقابلہ میں سکوت کی طرف زیادہ قریب ہے"۔

ایک عارفؒ فرماتے ہیں :

"اس علم کی دو قسمیں ہیں :

۱۔ نصف علم خاموشی ہے۔

۲۔ اور باقی نصف علم یہ سمجھنا ہے کہ تُو اسے کہاں رکھے"۔

دوسرے بزرگؒ نے اس میں مزید اضافہ کیا کہ نصف علم "پانا" اور نصف "نظر کرنا" ہے۔ یعنی (نصف) تفکر اور (نصف) عبرت حاصل کرنا۔

حضرت سفیانؒ سے پوچھا گیا کہ :

"عالم کون ہے ؟"

فرمایا :

"جو علم کو اس کے مقامات پر رکھے اور ہر چیز کو اس کا حق دے"۔

بعض حکماءؒ کا قول ہے :

"جب علم زیادہ ہُوا تو کلام کم ہو گیا"۔

حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں،

"صوفی کا علم جس قدر بڑھتا ہے اس کی فطرت کم ہو جاتی ہے"۔

ایک بزرگؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جنیدؒ سے دریافت کیا،

"اے ابوالقاسم! کیا دل کے بغیر بھی زبان ہوتی ہے ؟"

فرمایا :

"بہت ہے"۔

میں نے پُوچھا :

"تو کیا زبان کے بغیر دل ہوتا ہے ؟"

فرمایا، "ہاں گاہے ہوتا ہے مگر دل کے بغیر زبان ایک آفت ہے اور زبان کے بغیر دل نعمت ہے"۔

میں نے پُوچھا،

"اگر زبان اور دل دونوں ہوں تو ؟"

فرمایا،

"یہ جھاگِ زرسیان ہے یعنی شہد ہے۔"

ایک مقطوع حدیث میں حضرت سفیانؒ سے مروی ہے۔ انھوں نے مالک بن مغول سے روایت کیا کہ عرض کیا گیا،

"اے اللہ کے رسولؐ! کون سا عمل افضل ہے؟"

آپؐ نے فرمایا:

"محرمات سے بچنا، اور تیرا مُنہ ہمیشہ ذکر اللہ سے تر رہے۔"

عرض کیا گیا،

"اے اللہ کے رسولؐ! کون سے دوست بہتر ہیں؟"

آپؐ نے فرمایا،

"ایسا دوست کہ اگر تو اسے یاد کرے تو وُہ تیری مدد کرے۔ اور اگر تو اسے بھول جائے تو وہ تجھے یاد رکھے۔"

پُوچھا گیا،

"کون لوگ سب سے زیادہ عالم ہیں؟"

آپؐ نے فرمایا،

"جو ان میں اللہ سے سب سے زیادہ ڈرنے والے ہوں۔"

پھر سائل نے پُوچھا،

"ہمیں ہم میں سے بہتر لوگ بتایئے کہ ہم ان کے ساتھ مجلس رکھیں۔"

آپؐ نے فرمایا:

"وُہ لوگ کہ جن کو لوگ دیکھیں تو اللہ یاد آجائے۔"

عرض کیا،

"اے اللہ کے رسولؐ! کون لوگ بُرے ہیں؟"

آپؐ نے فرمایا،

"اے اللہ! بخش دے۔"

عرض کیا گیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! ہمیں بتا دیجئے۔"

آپؐ نے فرمایا:

"وہ علماء ہیں کہ جب بگڑ جائیں۔"

علمائے دُنیا کی حالت

جو علمائے رائے اور خواہش میں ڈوبے رہتے ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے ان کی ایک عجیب انداز میں وضاحت کی۔

خالد بن طلیق نے اپنے والد سے، انہوں نے ان کے دادا سے روایت کیا اور ان کے دادا کا نام حضرات عمران بن حصین تھا۔ فرمایا:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک ہمیں خطاب فرما کر کہا:

میری امانت قابلِ اخذ ہے اور میں ایک سردار ہوں۔ قوم کی کھیتی اسے تقویٰ پر آمادہ نہیں کیا کرتی ہدایت پر اصل کا بخل بیان نہیں کرتا اور سب لوگوں میں جاہل تر وُہ ہے جو اس کی منزلت نہ سمجھے اور انسان کے لیے یہ جہالت کافی ہے کہ وُہ اس کی قدر نہ پہچانے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں سب سے مبغوض مخلوق وہ آدمی ہے جس نے علم جمع کیا اور فتنہ کے اندھیروں میں غارت مچائی۔ غیبی سکون سے اندھا ہوگیا۔ رذیل اور ان جیسے لوگوں نے اسے عالم کہا۔ ایک دن بھی سلامتی کے ساتھ علم میں کچھ نہ کیا۔ صبح کی تو جو جس قدر کم زیادہ خبر مل سکی لی۔ آخر جب بدمزہ پانی سے سیر ہوا اور جب خوب دولت جمع کر لی تو لوگوں کے سامنے مفتی بن کر بیٹھ گیا تاکہ جو مسئلہ دُوسروں پر مشتبہ رہا۔ یہ اسے صاف کر دے۔ اس کے لیے فوراً ناقص رائے دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ یہ ایسا آدمی ہے جس نے شبہات کو قطعیات کہا اور تارِ عنکبوت کو مضبوط رسّی قرار دیا۔ وُہ یہ نہیں سمجھتا کہ اس نے درست رائے دی یا غلط کہا جہالت کی سواری پر بیٹھا ہے، اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہے۔ جس کا علم نہیں اس کے بارے میں وُہ معذور نہیں کہ تسلیم کر دیا جائے۔ وُہ علم پر مضبوط نظر نہیں رکھتا کہ افسوس کیا جائے۔ انسانی خون ان پر روتا ہے۔ اہلِ وراثت ان کا بین کرتے ہیں ان کے فیصلوں سے شرمگاہیں حلال کی جا رہی ہیں۔ اللہ کی قسم جو اس پر وارد ہُوا۔ میں اسے نکالنے کیلیے لکھوں گا اور جس پر تقریظ کر رہا ہے وُہ اس کا اہل نہیں۔ یہی وُہ لوگ ہیں جن پہ دُنیا کی زندگی کے ایام رونا وچلّانا ٹھیک ہُوا۔

حضرت کمیل بن زیاد کی حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے علمائے آخرت کا حال بیان کیا۔ فرمایا:

لوگوں کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ عالمِ ربّانی۔ جو کہ ربوبیّت کا عالم ہو۔ چنانچہ رب تعالیٰ کی طرف نسبت کر دی جیسے کہ فرمایا:
كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ۔ (تم رب والے ہو جاؤ جیسے تھے تم کتاب سکھاتے)
خدا تعالیٰ نے عالم کو اپنی کتاب میں ربانی قرار دیا اور پڑھنے والے کو ربانی فرمایا۔ اس لیے کہ یہ علم و عمل کا جامع ہے اور اسی طرح یہ کہا جاتا ہے کہ عالمِ ربانی وُہ ہے جو عالم بھی ہو، عمل بھی کرے اور لوگوں کو بھلائی کی تعلیم دے۔ یہی وُہ نیک بندہ ہے جس کا ذکر آسمان پر فرشتوں میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی عظمت کے بارے میں فرمایا:

لَوْ لَا يَنْهٰهُمُ الرَّبَّانِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ۔ (کیوں نہیں منع کرتے ان کے درویش اور مُلّا)

چنانچہ احبار پر ربانیین کو مقدم رکھا اور یہ کتب اللہ کے عالم ہی ہیں۔ ایسے ہی حضرت مجاہد سے مروی ہے۔ فرمایا:

"احبار سے علمائے ربانی کو ایک درجہ کی فوقیت حاصل ہے۔"

ایک بزرگؒ فرماتے ہیں:

"احبار کو رہبان پر بلند درجہ حاصل ہے یعنی علمائے السنہ سے علمائے قلوب کا درجہ بلند ہے۔ عام بندوں پر علمائے کتاب کو افضلیت حاصل ہے۔ چنانچہ نصرت و صبر میں ان کا تذکرہ انبیا علیہم السّلام کے ساتھ کیا فرمایا:

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ۔ (اور بہت نبی ہیں جن کے ساتھ ہو کر لڑے ہیں بہت خدا کے طالب)

پھر ان کی ثابت قدمی، دینی پختگی اور صبر کی تعریف فرمائی۔ ربیون کا واحد ربّی آتا ہے۔ کہا کرتے ہیں ربی۔ ربانی (یعنی رب والا) چنانچہ ربّی کی جمع ربّیون آتی ہے اور ربّانی کی جمع ربانیون آتی ہے۔

عالم، شہید سے افضل ہے

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:
"قیامت کے روز انبیاء علیہم السلام سفارش کریں گے۔ پھر علماء اور پھر شہداء (سفارش کریں گے)۔" اس لیے کہ امام اُمّت کا امام ہوتا ہے۔ اسے امت کے برابر اجر ملے گا اور شہید اپنی ذات کی حد تک کام کرتا ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

"علماء کی سیاہی کا شہداء کے خوُن کے ساتھ وزن کیا جائے گا۔"

چنانچہ شہید کا اعلیٰ ترین حال اس کا خون ہے اور عالم کا ادنیٰ حال اس کی سیاہی ہے۔ اسی طرح

آپؐ نے دونوں کے درمیان برابری فرمائی اور عالم کو شہید پر اعلیٰ مقام کے باعث افضلیت دی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے:

"ایک عالم، اللہ کی راہ جہاد کرنے والے، قیام کرنے والے اور روزہ دار سے بھی افضل ہے اور جب عالم فوت ہوتا ہے تو اسلام میں ایسا رخنہ پیدا ہوتا ہے کہ جس کو صرف اس کا خلف (دُوسرا عالم) ہی پُر کرتا ہے۔"

اسی مفہوم کی باسند روایت ہے،

"جب ایک عالم کی وفات ہوتی ہے تو اسلام میں ایسا رخنہ پیدا ہوجاتا ہے جس کو شب و روز کی گردش پُر نہیں کرسکتی۔ یاد رکھو عالم کی موت، ایک ستارہ ڈوب گیا اور عالم کی موت سے قبیلہ کی موت زیادہ آسان ہے۔"

حضرت کمیلؒ کی حدیث میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

"علم حاصل کرنے والا راہِ نجات پر ہے یعنی علمائے ربانی سے بہ طریقِ معاملہ و اخلاص سلامتی چاہنے، دنیا میں جہالت سے نجات پانے اور آخرت کے عذاب سے بچنے کے لیے علم حاصل کرنے والا (راہِ نجات پر ہے)

پھر فرمایا:

وھمج رعاع۔ ھمج کا مطلب وُہ بچھونا ہے جو کر اس کی جہالت کے باعث آگ میں گرتا ہے اسی کا معنی ھمجۃ ہے اور رعاع کا معنی ہے کم عقل۔ جس کی دانش نہ ہو اور اس پر لالچ غالب آجائے اور غصہ اسے بدعقل کردیتا ہے۔ عجُب اسے متکبّر بنا دیتا ہے: تکبّر کے باعث وُہ اکڑنے لگا۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ رو پڑے اور فرمایا:

"عالم کی موت کے باعث اسی طرح علم بھی ختم ہوجائے گا۔"

پھر علمائے ربانی کے ذکر کے موقع پر ایک گہرا سانس لیا اور فرمایا:

"کاش! ان کی زیارت ہوجائے۔"

یعنی علمائے ربانیین کی زیارت ہوجائے۔ ہم نے اس باب سے پہلے اس حدیث کو ذکر کردیا ہے۔

الغرض جن کے اشتیاق میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر گریہ طاری ہُوا۔ یہ بھی رو پڑے۔ فرمایا:

"کاش! میں اپنے بھائیوں سے ملوں۔" (ان سے ملاقات کا بہت اشتیاق ہے) اور میں چاہتا ہوں کہ میں اپنے بھائیوں کی زیارت کرلُوں۔ پھر فرمایا:

"وُہ ایک ایسی قوم ہے جو تمہارے بعد آئے گی۔" اس کے بعد ان کے اوصاف بیان کیے۔ وُہ ان کے

اوصاف بیان کیے۔ وُہ ان کے بھائی تھے۔ اس لیے کہ ان کے قلوب، انبیا علیہم السّلام کے قلوب کی راہ پر تھے اور ان کے اخلاق، صفاتِ ایمان کے مفہوم کو لیئے ہُوئے تھے۔ یہی اس اُمت کے ابدال ہیں۔ ان کے اوصاف نمایاں طور پر مذکور ہیں اور ان کے تین طبقات ہیں:

۱۔ صدیقین

۲۔ شہداء

۳۔ صالحین

ان میں سے بعض کا قلب، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قلب پر ہے۔ بعض کا قلب حضرت موسیٰ کلیم اللہؑ عیسیٰ رُوح اللہ اور حضرت محمد حبیب اللہ صلوٰت اللہ علیہم وسلم اجمعین پر ہے اور بعض کا قلب حضرت جبرئیل، حضرت میکائیل یا حضرت اسرافیل علیہ السلام کے قلب پر ہے۔ مجالست اور اقوال و افعال میں قربِ تشابہ کے باعث دونوں میں اخوت قایم ہو جاتی ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ (اور تو نہ دیکھے وُہ جو دغاباز ہے۔ کہتے ہیں اپنے بھائیوں کو جو منکر ہیں)

اس لیے کہ جب یہ (منافقین کے) قلوب کفر چھپانے اور اسلام کے بارے میں شک رکھنے کے سلسلہ میں کافروں کے قلبی اوصاف پر تھے تو انہیں کافروں کا بھائی قرار دیا۔ اسی طرح فرمایا:

اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ۔ (بے شک فضول خرچی کرنے والے بھائی ہیں شیطان کے)

خلقت میں ان کی مماثلت نہیں تھی۔ نہ ہی ان میں باپ اور ماں کی طرف سے تعلق تھا۔ اس لیے کہ شیاطین، ابلیس کی نسل سے ہیں اور فضول خرچی کرنے والے آدمؑ کی اولاد سے ہیں البتہ وجدان اخلاق و افعال میں مشابہت ہونے کے باعث دونوں میں اخوّت بنادی۔ اب علمائے آخرت کی عقل و دانش کو اس کے قلبی انوارات سے نور حاصل ہوگا اور اس کا فہم و فراست اس کے یقین و قوت اور طریق و سلوک کے مفہوم پر اس کے علم و مشاہدہ اور اس کے اخلاق سے استنباط کے ذریعہ خبر دے گا۔ یہ ان کے اور انبیاؑ علیہم السلام کے اخوان سے ہے جن کو دیکھنے کی خواہش جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی اور ساری دنیا میں یہی وُہ غرباؑ ہیں کہ جن کے بارے میں فرمایا:

" اسلام، حالتِ غریبی میں ظاہر ہُوا۔ عنقریب دوبارہ غریبی میں عود کرے گا جیسے کہ آغاز ہُوا تھا۔ اس لیے خوشخبری ہو غرباؑ کے لیے۔"

عرض کیا گیا،
"غربا کون ہیں؟"
آپؐ نے فرمایا:
"جب لوگ بگڑ جائیں تو ان میں اصلاح کرتے ہیں وہ لوگ۔" (غرباء ہیں)

دُوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:
"جو لوگ اس کی اصلاح کرتے ہیں جو کہ لوگ میری سنت کو بگاڑ دیتے ہیں اور جس کو لوگوں نے ختم کر دیا ہوتا ہے اسے وہ زندہ کرتے ہیں۔"
یعنی جس دین و طریق کو لوگ بھلا دیتے ہیں اور اس سے ناواقف ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہ غرباء اسے دوبارہ زندہ اور مروج کرتے ہیں۔
ایک حدیث میں آتا ہے:
"جو میری سنت سے اور اس راہ سے وابستہ رہتے ہیں جس پر تم آج گامزن ہو۔"
ایک دُوسری حدیث میں آتا ہے:
"غرباء تھوڑی تعداد میں ہوتے ہیں جو لوگوں میں کثرت سے پھیلی ہُوئی بُرائی کو دُور کر کے اصلاح کرتے ہیں۔ ان سے محبت کرنے والوں کی بجائے بغض رکھنے والے زیادہ ہوتے ہیں۔ یہی غرباء ہیں، جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا۔ اس لیے کہ انہیں اعلیٰ علیین میں انبیاء علیہم السلام کی رفاقت حاصل ہو گی فرمایا:
مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ (یعنی یہ لوگ جن پر اللہ کا انعام ہُوا۔ یہ انبیاء، صدیقین، شہدا کے ہمراہ ہوں گے)

سے لے کر رَفِيْقًا تک۔
حضرت ثوریؒ فرمایا کرتے،
"جب تو ایسے عالم کو دیکھے جس کے دوست کثرت سے ہوں تو جان لے کہ وہ اختلاط و ابتلاء میں ہے۔"
نیز فرمایا:
"جب تو ایسے آدمی کو دیکھے جو اپنے دوستوں سے محبت کرنے والا ہو اور اپنے پڑوسیوں کے نزدیک قابلِ مدح ہو تو جان لے کہ وہ ریاکار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علمائے سوٗ کی تعریف یہ کی کہ وہ علم کے ذریعہ دُنیا خوری کرتے ہیں اور علمائے آخرت کا وصف بیان کیا کہ وہ خشوع و خضوع کرنے والے ہوتے ہیں۔ چنانچہ علمائے دنیا کے بارے میں فرمایا،

وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ۔

(اور جب اللہ نے اقرار لیا خدا والوں سے کہ اس کو بیان کرو گے لوگوں کے پاس اور نہ چھپاؤ گے اس کو آخر تک)

سے لے کر ثَمَنًا قَلِيْلًا تک۔

اور علمائے آخرت کی مدح کرتے ہوئے فرمایا،

وَ اِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ۔

(اور کتاب والوں میں بعض وُہ بھی ہیں جو مانتے ہیں اللہ کو اور جو اُترا تمھاری طرف)

سے لے کر لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ تک۔

حضرت ضحاکؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے، انھوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا:

"اس اُمت کے علماء دو آدمی ہیں:

۱۔ جس آدمی کو اللہ تعالیٰ علم عطا فرمائے تو وہ لوگوں پر اسے خرچ کرے اور حرص کی بناء پر کچھ نہ لے، اور نہ ہی ان سے قیمت لے۔ یہ ایسا عالم ہے کہ جس پر آسمانی پرندے، پانی کی مچھلیاں، زمین کے جانور اور کرام کاتبین رحمت بھیجتے ہیں۔ یہ آدمی اللہ تعالیٰ کے سامنے قیامت کے روز سردار باعظمت بن کر آئیگا۔ حتیٰ کہ مرسلین علیہم السلام کی رفاقت اسے حاصل ہو گی۔

۲۔ ایک آدمی ایسا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں علم عطا کیا مگر اس نے خدا کے بندوں پر (علم) کا بخل کیا۔ حرص کی بناء پر ان سے لیا اور اس کی قیمت وصول کی۔ اسے قیامت کو آگ کی لگاموں میں سے ایک لگام پہنائے گا۔ تمام مخلوق کے سامنے ایک آواز دینے والا آواز دے گا۔ یہ فلاں بن فلاں ہے اس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں علم عطا کیا مگر اس نے خدا کے بندوں پر (علم) کا بخل کیا۔ اس پر حرص کی بناء پر لیا۔ اور اس کی قیمت وصول کی۔ اس کو تب تک عذاب دیا جائے گا جب تک کہ سب لوگ حساب سے فارغ نہ ہو جائیں۔"

علم کے ذریعہ دنیا خوری کے سلسلہ میں ایک روایت بہت شدید ہے۔ حضرت عقبہ بن واقد نے حضرت عثمان بن ابی سلیمانؓ سے روایت کیا:

دین فروشی کی سزا

"ایک آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت کیا کرتا تھا اور کہنے لگا: مجھے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یُوں بتایا اور مجھے حضرت موسیٰ نجی اللہ نے یہ بتایا۔ مجھے حضرت موسیٰ کلیم اللہ نے یہ فرمایا: حتیٰ کہ یہ (اقوال بیان کر کے اور لوگوں سے مال لے کر)

مالدار ہوگیا۔ آخر کار وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے (الگ ہوکر) غائب ہوگیا۔ انہوں نے اس کے بارے میں معلوم کیا مگر اس کا کچھ نشان نہ ملا۔ ایک روز ایک آدمی آیا اس کے قبضہ میں ایک خنزیر تھا جس کی گردن میں سیاہ رسی تھی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا:

"فلاں کو جانتے ہو؟"

اس آدمی نے جواب دیا:

"ہاں یہ وہی خنزیر ہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی:

"اے پروردگار! میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس کو اس کے پرانے حال پر لوٹا دو تاکہ میں اس سے معلوم کروں کہ یہ سزا کس وجہ سے اُسے ملی۔"

اللہ تعالیٰ نے اس کی طرف وحی فرمائی:

"اے موسیٰ! اگر تم ان الفاظ سے یہ دعا کرو جن کے ساتھ آدمؑ نے دُعا کی تو بھی قبول نہ کروں گا۔ البتہ میں بتاتا ہوں کہ میں نے اسے یہ سزا کیوں دی؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ دین کے عوض دنیا چاہتا تھا۔"

حضرت حسنؓ سے مروی ہے کہ:

اہلِ خراسان سے ایک آدمی نے حاضری کی اجازت چاہی اور حاضر ہو کر ان کے سامنے پانچ ہزار درہم کی ایک تھیلی رکھ دی اور گٹھڑی سے خراسان کے باریک ریشم کے دس کپڑوں کا گٹھڑ پیش کیا۔

حضرت حسنؓ نے فرمایا:

"یہ کیا ہے؟"

اس نے عرض کیا:

"اے ابوسعیدؒ، یہ خرچ ہے اور یہ لباس ہے۔"

انہوں نے فرمایا:

"اللہ تجھے عافیت میں رکھے۔ اپنا خرچ اور لباس پاس ہی رکھ لے، ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ جو میری اس مجلس میں نشست کرے اور اس قسم کی چیز لوگوں سے قبول کرے۔ وہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ سے اس طرح ملاقات کرے گا کہ اس کا وہاں کچھ حصّہ نہ ہوگا۔"

حدیث میں ہے:

"گا ہے ایسا ہوتا ہے کہ مشرق و مغرب میں بندے کے لیے مدح و ثنا پھیلا دی جاتی ہے۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کی مچھر کے پر جتنی بھی قدر نہیں ہوتی۔"

علم کے ذریعہ دنیا طلبی کرنے والوں، دین کے عوض کھانے والوں، دنیا داروں کو دوست و رفیق بنانے والوں، دنیا والوں سے محبت کرنے والوں اور انہی پر خوش رہنے والوں کو دیکھا جائے تو ہر دور میں وہ لوگ ہر زمانہ میں اپنے اوصاف اور قول و فعل سے معروف ہوتے ہیں۔

علمائے سوء کے احوال میں ایک حدیث بہت ہی شدید ہے۔ اللہ تعالیٰ علمائے سوء سے پناہ میں رکھے اللہ تعالیٰ ہمیں اس ابتلأ سے بچائے۔ ایک طریق سے یہ باسند بھی مروی ہے اور حضرت معاذ بن جبلؓ پر موقوف روایت بھی مروی ہے۔ میں اسے ذکر کر رہا ہوں اور موقوف بہتر سمجھتا ہوں۔

حضرت منذر بن علی نے ابو نعیم شامی سے، انہوں نے محمد بن زیاد سے، انہوں نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت کیا۔ وہ اس بارے میں فرما رہے تھے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اور میں نے حضرت معاذؓ پر موافقت کی۔ فرمایا:

"عالم کے لیے یہ بات فتنہ ہے کہ وہ سننے کی بجائے کلام کرنے کا زیادہ عاشق ہو۔ کلام میں زیادتی و مبالغہ کرے اور اپنے ساتھی پر غلطی سے مامون نہ ہو۔ خاموشی میں سلامتی اور علم ہے۔ بعض علماء ایسے ہیں جن کے پاس علم جمع ہوتا ہے وہ یہ نہیں چاہتے کہ دوسرے کے پاس بھی یہ علم ہو۔ یہ دوزخ کے پہلے طبقہ میں ہوں گے۔ بعض علمأ علم میں، سلطانی انداز رکھتے ہیں۔ اگر ان کی کسی علمی رائے کو رد کیا جائے یا اس کے کسی حق میں کاہلی برتی جائے تو وہ غضبناک ہو جاتا ہے۔ یہ دوزخ کے دوسرے طبقہ میں ہوگا۔ بعض علماء اپنے علمی عجائبات اور حدیث امرا اور اغنیأ تک محدود رکھتے ہیں اور اہلِ حاجت (فقرا) کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ یہ دوزخ کے تیسرے درجہ میں ہوں گے۔ بعض علماء فتویٰ کے منصب پر زبردستی سے بیٹھتے ہیں اور غلط فتوے دیتے پھرتے ہیں۔ حالاں کہ اللہ تعالیٰ تکلف مفتی بننے والوں سے بغض رکھتا ہے۔ یہ دوزخ کے چوتھے طبقہ میں ہوں گے۔ بعض علمائے یہود و نصاریٰ کا مروی کلام پیش کرتے ہیں تاکہ اپنا علمی ارتقا رتبائیں، یہ دوزخ کے پانچویں طبقہ میں ہوں گے۔ بعض علماء لوگوں میں ریاکاری دکھاوا اور اپنا فضل و شرف دکھانے کے لیے علم حاصل کرتے ہیں، یہ دوزخ کے چھٹے طبقہ میں ہوں گے بعض علماء کو اپنے علم پر غرور و ناز ہوتا ہے۔ اگر انہیں نصیحت کی جائے تو وہ بگڑ جاتے ہیں۔ اور اگر دوسروں کو نصیحت کریں تو کرخت لہجہ کر لیتے ہیں۔ یہ دوزخ کے ساتویں طبقہ میں ہیں۔ تم پر سکوت لازم ہے اس کے ذریعہ تو شیطان پر غلبہ حاصل کرے گا اور اس بات سے بچ کر رہو کہ بغیر حیرانی کے ہنسو یا بغیر حاجت

کے چلو۔

علمائے آخرت کے اوصاف کے بارے میں ایک حدیث ہم نے نقل کی ہے۔ اس میں مقاماتِ ایمان اور اسبابِ دین ویقین کے بارے میں مخلوق کو دعوت دینے کے اصول مذکور ہیں۔ یہ روایت ہم نے حضرت شفیق بن ابراہیم بلخی سے، انہوں نے عباد بن کثیر سے، انہوں نے ابوالزبیر سے، انہوں نے حضرت جابرؓ سے نقل کی۔ انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا اور میں نے حضرت جابر بن عبداللہ پر موافقت کی۔ فرمایا:

"ہر عالم کے پاس مت بیٹھو، (صرف اسی) عالم کے پاس (بیٹھو) جو پانچ سے پانچ کی طرف بلائے۔

۱۔ شک سے یقین کی طرف۔

۲۔ ریا سے اخلاص کی طرف۔

۳۔ حرص سے زہد کی طرف۔

۴۔ تکبر سے تواضع کی طرف۔

۵۔ عداوت سے نصیحت کی طرف۔

سلف صالحین کے نزدیک یقین و تقویٰ اور معرفت و ہدایت کا علم ہی علم مقصود تھا۔ صحابہ و تابعین کو اسی کے فقدان کا ڈر رہتا ہے اور اسی علم کے معدوم ہونے کا خوف دامنگیر رہتا تھا۔ وہ آخری زمانہ میں اسی علم کے اٹھ جانے اور کم ہونے کی خبریں دیتے تھے اور اس سے مرادِ علمِ قلوب اور علمِ مشاہدہ ہی لیا کرتے تھے جو کہ تقویٰ کا نتیجہ ہے اور علم معرفت ویقین مراد لیتے تھے جو کہ مزید ایمان اور ہدایت کا ثمرہ ہے۔ جب اہلِ تقویٰ ختم ہو جائیں گے اہلِ خوف کم ہو جائیں گے اور زاہد لوگ معدوم ہو جائیں گے تو یہ علومِ (باطن) بھی ختم ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ یہ علوم انہی حضرات کے وجود کے ساتھ موجود ہیں۔ یہی ان علوم کے حاملین ہیں اور یہی علوم ان کے احوال و طرق ہیں۔ یہی حضرات اس راہ پر گامزن ہیں اور انہیں زندہ رکھنے والے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ و تابعین ان کے معدوم ہونے پر اس علم کے فقدان کے باعث روتے تھے۔

دنیا میں زاہد، علماء اور دنیا کو حقیر جاننے والوں، نیک کرنے والوں اور اہلِ ایمان کے بارے میں اسی طرح مدح فرمائی جیسے کہ دنیا پرست اور دنیا کو اعلیٰ سمجھنے والوں کی نشاندہی کی۔ فرمایا:

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ فِیْ زِیْنَتِهٖ ؕ قَالَ الَّذِیْنَ یُرِیْدُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا یٰلَیْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِیَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ	(پھر نکلا اپنی قوم کے سامنے اپنی تیاری سے، کہنے لگے جو طالب تھے دنیا کی زندگی کے، اے کسی طرح ہم کو ملے جیسا کچھ ملا ہے قارون کو، بے شک اس کی بڑی قسمت ہے

وَ قَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا۔

اور بولے جن کو ملی تھی بوجھ (علم) اے خرابی تمہاری، اللہ کا دیا ثواب بہتر ہے ان کو جو یقین لائے اور کیا بھلا کام)۔

پھر فرمایا،

وَ لَا يُلَقّٰهَا اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۔

(اور یہ بات انہی کے دل میں پڑتی ہے جو سہنے والے ہیں)

یعنی یہ حکمت صرف انہیں ہی عطا ہوتی ہے جو دنیاوی زینت سے صبر کرتے ہیں جس میں قارون تکبر کرتا ہوا نکلا۔

حضرت جندب بن عبداللہ بجلیؓ سے مروی ہے، فرمایا: کہ

"ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس توانا لڑکے تھے۔ چنانچہ آپؐ ہمیں قرآن سے پہلے ایمان سکھاتے۔ آخر ہم نے قرآن سیکھا اور ہمارا ایمان بڑھ گیا۔"

پہلے ایمان اور پھر قرآن

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا:

" قرآن نازل ہوا تاکہ اس پر عمل کیا جائے مگر تم نے اس کا صرف پڑھنا ہی عمل بنالیا۔ عنقریب ایک ایسی قوم آئے گی جو اسے غنا کے انداز پر تعلیم دے گی (پڑھے پڑھائے گی) وہ تم میں سے بہتر لوگ نہیں ہوں گے۔"

دوسرے الفاظ یہ ہیں،

حضرت ابن عمرؓ اور دوسرے صحابہؓ سے مروی ہے کہ ہم ایک اس طرح رہے کہ ہم میں سے ایک کو قرآن سے پہلے ایمان دیا جاتا اور سورت نازل ہوتی تو وہ اس کا حلال و حرام اور اس کا حکم و ممانعت جانتا اور یہ مناسب نہیں کہ اس کے پاس اس سے توقف کیا جائے، جیسے کہ آج تم قرآن سیکھتے ہو۔ میں نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں ایمان سے پہلے قرآن ملتا ہے۔ وہ سورۃ فاتحہ سے لے کر آخر تک پڑھ دیتا ہے مگر اس کے آمر و زاجر (حکم دینے والے اور منع کرنے والے) کی معرفت حاصل نہیں کرتا۔ حالانکہ اس پر بس کرنا مناسب نہیں کر وہ اس پر توقف کر کے ردّی کھجور کی طرح اسے بکھیرتا چلا جائے۔

اسی مفہوم کی ایک دوسری حدیث میں آتا ہے،

" جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم صحابہ کو قرآن سے پہلے ایمان عطا ہوتا اور تمہارے بعد جلدی ہی ایسی قوم آئے گی جس کو ایمان سے پہلے قرآن ملے گا۔ وہ اس کے حروف کو ٹھیک ٹھیک ادا کریں گے مگر اس کے حدود (مفاہیم و احکام) ضائع کریں گے اور کہیں گے ہم نے پڑھا ہے۔ بھلا ہم سے بڑا پڑھا ہوا

کون ہے؟ ہم نے سیکھا ہے بھلا ہم سے زیادہ جاننے والا کون ہے؟ بس ان کا یہی حصہ ہوگا۔"

دوسرے الفاظ یہ ہیں:

"یہ امت کے بدترین لوگ ہیں۔"

سلف سے نقل کردہ علم اور کتابوں میں درج شدہ علم وہ ہے جس کو دوسرے سے نہیں سنا۔ یہ احکام و فتویٰ اور اسلام و قضا کا علم ہے۔ اس کا ذریعہ سماعت ہے اور اس کی کنجی استدلال ہے۔ اس کا خزانہ عقل ہے اور یہ علم کتابوں میں مندرج ہے۔ صفحات پر لکھا ہوا ہے ہر چھوٹا، بڑے سے زبانوں کے ذریعہ حاصل کر لیتا ہے اور اسلام کے باقی رہنے تک یہ علم باقی رہے گا۔ مسلمانوں کے وجود سے یہ موجود ہے۔ اس لیے کہ یہ علم بندوں پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہے۔ اس لیے وہ اس کے ظاہر کرنے کا ضامن ہوا اور یہ علم حاملینِ علم کے ذریعہ ظاہر ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ. (تاکہ اس کو اوپر رکھے ہر دین سے چاہے بُرا مانیں مشرک)

اور جیسے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"علم ظاہر، زبان پر ہے اور یہ مخلوق پر اللہ تعالیٰ کی حجت ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہؓ کو فرمایا:

"تم سنتے ہو اور وہ تم سے سنتا ہے اور جو تم سے سنتا ہے اس سے وہ سنتا ہے۔"

چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تحریر شدہ اور منضبط علم کی خبر دی۔ یعنی کتابیں ظاہر ہونے کی اطلاع دی جو کہ ظاہر دین ہے اور جس سے ناواقف و جاہل رہنے پر شرک وجود پذیر ہو جاتا ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالےٰ نے مشرکین کی ناپسندی کے باوجود اسلام کے باقی رکھنے کی اطلاع دی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ اس پر رحم کرے جو ہم سے ایک حدیث سنے تو اسے اسی طرح پہنچا دے جیسے کہ سنا، کئی حاملِ فقہ ایسے ہوتے ہیں کہ جو فقیہ نہیں ہوتے اور کئی حاملِ فقہ اپنے سے زیادہ فقیہ تک (پہنچانے والے) ہوتے ہیں۔ یعنی آپؐ نے بتایا کہ کئی ایسے آدمی ہوتے ہیں کہ جو قلبی فقاہت سے محروم ہوتے ہیں یعنی علم پر عمل نہیں کرتے اور پھر وہ اسے اپنے سے فقیہ تر بتاتا ہے جو کہ اسے یاد کر کے عمل کرتا ہے۔ جیسے کہ دوسری حدیث میں آتا ہے:

"کئی پہنچانے والے، سننے والے سے زیادہ یاد رکھنے والے ہوتے ہیں۔"

چنانچہ یاد کر کے اس پر عمل کرنے کی مدح فرمائی، یعنی ذکر و فکر کیا۔ چاہے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اسے سماعت حاصل نہ ہو۔

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے فرمایا:

وَ تَعِيَهَا اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ۔ (اور سننے (سنبھالے) اس کو کان سننے والا (سمجھانے والا)

یعنی دل کے کان جو سن کر یاد رکھتے ہیں۔ جیسے کہ فرمایا:

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِيْدٌ۔[1] (اس میں سوچنے کی جگہ ہے اس کو جس کے اندر دل ہے یا لگائے کان دل لگا کر)

یعنی پوری توجہ سے سنا اور سنتے وقت قلب و جان سے حاضر رہا۔

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان وَ تَعِيَهَا اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ کی تفسیر میں ہے:

"یعنی ایسے کان جو اللہ تعالیٰ سے اس کے امرونہی کو سمجھیں اور اسے یاد رکھ کر اس پر عمل پیرا ہوں جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی توصیف فرمائی:

وَ الْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ۔ (اور نگاہ رکھنے والے حدیں باندھی اللہ کی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"علم طلب کرو۔ اس کے ذریعہ تمہیں معرفت حاصل ہو گی اور اس پر عمل کرو، تم اہل علم لوگوں سے ہو جاؤ گے۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"جب تم علم سنو تو انہیں روک لو اور ہزل و فضول گوئی کے ذریعہ اس کو مخلوط نہ کرو ورنہ (لوگوں) کے دل اسے پھینک دیں گے (اور قبول نہیں کریں گے) اور بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"جو ہنسا اس نے علم دُور پھینک دیا۔"

حضرت خلیل بن احمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

لَيْسَ الْعِلْمُ مَا حَوَاهُ الْقِمَطْرُ۔ اِنَّمَا الْعِلْمُ مَا وَعَاهُ الصَّدْرُ۔ (علم وہ نہیں کہ جس کو مشکیزہ بند کرلے۔ علم وہ ہے کہ جس کو سینہ محفوظ کرلے)

جب عالم میں تین باتیں آ جائیں تو اس کے ذریعہ متعلم پر نعمت مکمل ہو جاتی ہے:

۱۔ صبر
۲۔ تواضع
۳۔ حُسنِ اخلاق

---

[1] سورۃ قٓ آیت ۳۷۔

اور جب طالب علم میں تین باتیں جمع ہو جائیں تو اس کے باعث عالم پر نعمت مکمل ہو گئی:

۱۔ عقل

۲۔ ادب

۳۔ حسن فہم ۔ واللہ اعلم

باب وصف العلم وطریقۃ السلف

علم اور طریقۂ سلف

متاخرین کے ایجاد کردہ علم کلام و قصص

عالم ربانی کے لیے پانچ باتیں ضروری ہیں جو کہ علمائے آخرت کی علامات ہیں:

۱۔ خوف خشیت۔

۲۔ خشوع۔

۳۔ تواضع۔

۴۔ حسن اخلاق۔

۵۔ زہد۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ (اللہ سے ڈرتے وہی ہیں۔ اس کے بندوں میں جن کو سمجھ ہے (یعنی علماء)

اور فرمایا:

خَاشِعِيْنَ لِلّٰهِ۔ (اللہ کے لیے خشوع کرنے والے)

اس لیے ضروری ہے کہ وہ تواضع اور حسن اخلاق کا پابند ہو۔ خدا تعالیٰ نے فرمایا:

وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِيْنَ وَقُلْ اِنِّيْٓ اَنَا النَّذِيْرُ الْمُبِيْنُ۔ (اور جھکا اپنے بازو ایمان والوں کے واسطے اور کہہ کہ میں وہی ہوں ڈرانے والا کھول کر)

اور فرمایا:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ۔ (سو کچھ اللہ کی رحمت ہے جو تو نرم دل ملا ان کو)

اور دنیا میں زہد اختیار کرنے کے بارے میں فرمایا :

وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَکُمْ ثَوَابُ اللّٰہِ خَیْرٌ۔ (اور بولے جن کو ملا تھا علم، اے خرابی تمہاری اللہ کا ثواب بہتر ہے)

جس میں یہ خصائل پائے جائیں وہ علمائے ربانیین میں سے ہے۔

یہ یاد رہے کہ دینی اشکالات کے موقع پر عالم کا پتہ چلتا ہے۔ شکوک و شبہات پیدا ہونے کے وقت وہ ایک عارف کا محتاج ہوتا ہے جیسے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا :

"جب تک تم میں ایسے لوگ موجود ہوں گے کہ جب تمہارے سینہ میں شبہ آئے گا تو وہ اس کا شافی جواب دے سکیں اور وضاحت کر سکیں۔ اس وقت تک تم بھلائی پر ہو گے اور اللہ کی قسم ! مجھے امید ہے کہ تم ایسے کو نہ پاؤ گے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا :

"کون زیادہ عالم ہے ؟"

انہوں نے عرض کیا :

"اللہ اور اس کا رسولؐ زیادہ جانتا ہے۔"

آپؐ نے فرمایا :

"جب معاملت میں اشتباہ ہو اور اشکالات واقع ہوں تو جو (اس وقت) حق کا سب سے زیادہ عالم ہو۔ (وہی عالم ہے) چاہے وہ چوتڑوں کے بل چلتا ہو۔ اسی طرح جب لوگوں میں اختلاف واقع ہو، چاہے اس کا عمل کم ہو۔"

حضرت عمران بن حصینؓ کی حدیث میں فرمایا :

"شبہات واقع ہونے کے موقع پر تنقیدی نگاہ کو اور ہجومِ شہوات کے موقع پر عقلِ کامل کو پسند کرتا ہے اور سخاوت کو پسند کرتا ہے۔ چاہے چند کھجوریں ہی دے اور بہادری پسند کرتا ہے۔ چاہے سانپوں کو قتل کرنے پر (بہادری دکھائے)۔"

حضرت ابن مسعودؓ کا محسوس کیا ہوا خطرہ ہمارے اس دور میں پایا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ آج کے زمانہ میں ایسے افراد ناپید ہوتے جا رہے ہیں کہ اگر توحید کے مفاہیم میں مشکل پیش آئے یا صفاتِ موحّد کے مفہومات کے بارے کسی مومن بندے کے دل میں شبہ آ جائے تو وہ اس کا جواب اس انداز سے دے سکے کہ امرِ واقعہ اس طرح کھل کر سامنے آ جائے کہ قلب اس کی صداقت کا شاہد ہو اور انسان کو قلبی اطمینان حاصل

ہو سکے۔ البتہ ان باتوں کا جواب دینے والے پانچ قسم کے (گمراہ) افراد خوب دستیاب ہیں:

۱۔ گمراہ بدعتی، جو خواہشِ نفس کے ساتھ رائے زنی کر کے تجھے مزید پریشان کرے گا۔

۲۔ باتونی اور بیادہ گو قسم کا آدمی جو اپنے ناقص علم کے ذریعہ تجھے اصحابِ یقین سے دور کر دے گا اور عقلی قیاسات کے سہارے تجھے ظاہری دین سے بھی ہٹا دے گا اور یہ خود بھی ایک شبہ ہے۔ اب وہ تجھے شبہات سے کیونکر نکال سکتا ہے۔

۳۔ شطحیات میں ڈوبا ہوا غلط اور گمراہ صوفی جو کہ کتاب و سنت سے ہٹا دے اور ان کی پروا نہ کرے۔ ائمۂ اسلاف کی حکم عدولی کرے۔ محض ظن، وساوس اور اندازوں سے ہی تجھے جواب دے۔ کون و مکان، علم و احکام اور اسماء و رسوم مٹ کر رہ جائیں۔ یہ لوگ میدانِ حیرت میں پریشان رہتے ہیں۔ حجت و دلیل سے ناواقف اور بحرِ توحید میں غرق ہیں۔ یہ اہلِ تقویٰ کے امام نہیں بنائے گئے اور نہ ہی اہلِ یقین کیلئے حجت ہیں بلکہ اس کا قول ہی ساقط ہے۔

۴۔ ایسا عالم جو اپنے رفقاء میں عالم اور فقیہہ مشہور رہے۔ وہ تمہیں بتاتا پھرے کہ تیرے لیے یہ اخروی احکام ہیں اور غیبی امور کے سلسلہ میں باتیں کرتا ہو حالاں کہ ہم ان باتوں کے مکلّف نہیں ہیں۔ یہ آدمی مناظروں میں زیادہ تر ایسے امور کے بارے میں کلام کرتا ہے کہ جس کے ہم مکلّف نہیں ہیں۔

ایسے مسائل میں مجادلہ و مباحثہ کرتا ہے کہ جن کے بارے میں اسلافؒ خاموش ہیں۔ اس کی تعلیم و تعلّم تکلّف سے بھرپور ہے حالانکہ یہ بندۂ خدا نہیں سمجھتا کہ اس پر یقین ایمان اور حقیقتِ توحید کا علم سیکھنا ضروری ہے۔ اخلاصِ معاملہ اور اخلاص کو برباد کرنے والے امور کا علم حاصل کرنا اس پر لازم ہے۔ اس لیے کہ ایمان، صحتِ توحید، اخلاصِ عبودیت، دنیاوی خواہشات سے اعمال کا خالی کر کے اخلاص کرنا اور ایسے ہی دوسرے قلبی امور کا سیکھنا ضروری ہے۔ یہ باتیں دینی فقاہت اور اہلِ ایمان کے اوصاف کی باتیں ہیں کیونکہ اس کا تقاضا انذار و تخویف کی صورت میں ہوتا ہے۔ فرمایا:

لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ۔ (تاکہ سمجھ پیدا کریں دین میں اور تاکہ ڈرائیں اپنی قوم کو)

اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یقین سیکھو، اس لیے کہ میں بھی تمہارے ہمراہ متعلم ہوں۔"

اور صحابہ رضوان اللہ علیہم کا فرمان ہے:

"ہم نے ایمان سیکھا، پھر ہم نے قرآن سیکھا چنانچہ ہمارے ایمان میں اضافہ ہو گیا۔"

یہ چیز ایمان کے باعث ہدایت میں اضافہ کرنے والی ہے اور مومنوں کے ایمان میں اضافہ کا باعث

ہوتی ہے جیسے کہ فرمایا:

فَزَادَتْهُمْ اِيْمَانًا ۔ (پس زیادہ کیا ان کو ایمان)

اور فرمایا:

وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ۔

اور وُہ یہ نہیں سمجھتا کہ اہلِ یقین کی صفات یعنی معرفت و یقین کے ذریعہ ہی معاملہ میں حسنِ ادب پیدا ہوتا ہے۔ معرفت و یقین دراصل بندے اور اس کے رب تعالیٰ کے درمیان ایک حال کا نام ہے اور رب تعالیٰ کی جانب سے یہ بندے کا ایک حصہ ہے۔ اور یہ اسی وقت حاصل ہوتا ہے کہ جب مخفی قسم کے شرک اور علاماتِ نفاق سے اس کی شہادتِ توحید پاک ہو اور ایمان خالص ہو اور یہ حالت فرائض کے ساتھ متصل ہے اور اس فرض کا فرض اخلاصِ معاملہ ہے اور اگر اس نے اس کے علاوہ دوسرے علوم حاصل کیے جن کی طرف اس کا قلبی میلان ہے۔ یعنی فضول معلومات اور غریب قسم کے معانی جمع کیے تو وُہ چیزیں اصل میں انسانی ضروریات میں داخل ہیں اور اس کے لیے یہ علوم حجاب بن جائیں گے۔ اس طرح اس بندۂ خدا نے نافع علم کی حقیقت سے کم فہمی کی بنا پر غفلت برتی اور قلبی میلان کے علومِ فضول کو ترجیح دے بیٹھا۔ اس نے اپنی حاجت اور اپنے حال پر لوگوں کی حاجت اور لوگوں کے حال کو ترجیح دے دی۔ دنیا میں لوگوں پر پیش آمدہ امور میں فتویٰ اور اس قسم کے علوم حاصل کرنے میں لگ گیا اور آخرت میں کام آنے والے اور اپنے پروردگار کے ہاں فائدہ دینے والے امور سے غافل رہا۔ حالاں کہ اس کے لیے اخروی امور ہی باقی رہنے والے ہیں۔ اس کو لوٹ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے جانا ہے اور اس کا ابدی ٹھکانہ بھی وہیں ہے مگر اس نے رب تعالیٰ کے قُرب پر بندوں کے قُرب کو ترجیح دے دی۔ لوگوں کے کام میں لگ گیا اور خدا تعالیٰ کے ہاں اپنے عظیم اجر سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اپنی قلبی اصلاح پر لوگوں کی قلبی اصلاح کو مقدم کر دیا۔ اپنے مولائے کریم کی عبادت کرنے اور اس کی رضا طلبی سے ہٹ گیا۔ اپنے دل کو فراموش کر دیا اور لوگوں کی زبانوں کی اصلاح میں مشغول ہو گیا۔ اپنے باطنی حال کو بھلا بیٹھا اور لوگوں کے ظاہری اعمال کو درست کرنے کا فکر لے بیٹھا۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ اسے اقتدار حاصل کرنے، عوام کے پاس جاہ طلبی، سیاسی حربوں کے ذریعہ عظمت چاہنے اور دنیا کے فائدوں کا لالچ پڑ گیا۔ اس لیے کہ اخروی اجر میں اس کا عزم کمزور اور نیت ضعیف ہے۔ اس نے لوگوں کے لیے فتوے دیے۔ ان کی خواہشات کے لیے عمر لگا دی تاکہ جہلاء اسے عالم سمجھیں۔ اہلِ باطل کے قلوب میں اس کا شمار فضلاء میں ہو۔ آخر یہ قیامت میں محروم اور خالی ہاتھ اٹھے گا مقربین اور عاملین کو ان کے اعمال کا اجر ملے گا۔ علماء کو خدا کی رضا حاصل ہوگی مگر دوسروں کے اجر ایسے

کچھ کام نہ آئیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر عمل کے لیے ایک عامل بنایا اور ہر علم کا ایک عالم بنایا۔ فرمایا،

اُولٰٓئِکَ یَنَالُھُمْ نَصِیْبُھُمْ مِّنَ الْکِتٰبِ۔ (وہ لوگ پائیں گے جو ان کا حصّہ لکھا کتاب میں)

اور ہر آدمی جس کے لیے پیدا ہُوا۔ اس کے لیے وُہ کام آسان کر دیا گیا۔ ان دونوں کے درمیان یہ واضح خطاب ہے۔

امت کا اس پر اتفاق ہے کہ جس وقت شبہات واقع ہوں اور اشکالات سامنے آئیں تو اس وقت علم توحید فرض ہے۔ البتہ دو باتوں میں اختلاف ہے کہ:

۱۔ توحید کیا چیز ہے؟

۲۔ اس تک وصول اور اس کی طلب کا طریق کیا ہے؟

بعض کا قول یہ ہے کہ تحقیق و طلب کے ذریعہ علم توحید حاصل کیا جائے۔ بعض نے فرمایا کہ استدلال و نظر سے، بعض نے سمع و روایت سے، بعض نے تسلیم و توقیف کے ذریعہ اس کا علم حاصل کرنا ضروری بتایا اور بعض کا خیال یہ ہے کہ اس کے ادراک سے عاجز آنے اور قاصر رہنے سے توحید کا ادراک کیا جائے گا۔

ناقل روایات

۵۔ عالم کی پانچویں قسم وُہ ہے جو حدیث و آثار کا عالم ہو۔ اور مرویات و اخبار کو روایت کرتا ہو۔ جب تم اس سے کوئی مسئلہ پوچھو تو وہ جواب دے گا کہ جیسے حدیث میں حکم ہے ویسے ہی عقیدہ رکھو اور زیادہ کھود کرید مت کرو۔ سلامتی و عافیت میں یہ مفتی سلامتی کے قریب تر ہے۔ یہ آدمی ایک اچھے حال میں ہے اور عوام سلف کے مشابہ ہے۔ اس کے پاس شہادتِ یقین نہیں اور نہ ہی وُہ اس کی حقیقت سے آگاہ ہے جس کو اس نے دیکھا نیز وہ مروی بات کے وصف کا مشاہدہ نہیں رکھتا۔ اس کا علم صرف روایت ہے۔ وہ خبر و روایت کو نقل کرنے والا ہے، دوسروں سے لے کر آگے روایت کرنے والا ہے۔ وُہ اپنے پروردگار سے دلیل پر ہے مگر اسے اس پر شہادت حاصل نہیں۔

حضرت زہریؒ فرمایا کرتے:

حدثنی فلان و کان من اوعیۃ العلم۔ (مجھے فلاں نے بتایا اور وہ علوم کے ظروف میں سے تھا)

اور یہ نہ فرماتے کہ وُہ عالم تھا۔

حضرت مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے:

"میں نے ستّر تابعی شیوخ کو پایا۔ ان میں بڑے بڑے عابد اور مستجاب الدعا حضرات بھی تھے۔ بعض ایسے بزرگ بھی تھے کہ جن کی وساطت سے بارش کی دُعا کی جاتی تھی مگر میں نے ان میں سے

کسی سے علم حاصل نہیں کیا۔"

ان سے دریافت کیا گیا کہ اس کی وجہ کیا ہے؟

انہوں نے فرمایا:

"وہ اس شان کے نہ تھے۔"

ایک روایت میں فرمایا:

"وہ جو روایت کرتے تھے اسے سمجھتے نہ تھے اور ان سے جو بات دریافت کی جاتی تھی اس پر انہیں وثوق نہ تھا۔"

امام مالکؒ فرماتے ہیں:

"حضرت ابن شہاب زہریؒ نو عمر تھے۔ ہمارے ہاں تشریف لائے تو ان کی مجلس میں اس کثرت سے لوگ حاضر ہوتے کہ ان تک ہم پہنچ نہ سکتے۔ اس لیے کہ وُہ جو روایت کرتے اسے سمجھتے بھی تھے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس روایت کا یہی مطلب ہے۔ فرمایا: کئی حاملِ فقہ فقیہ نہیں ہوتے اور کئی حاملِ فقہ اپنے سے فقیہ تر کو (پہنچاتے) ہیں۔"

بعض سلفؒ کا قول ہے:

"جو اختلافِ علماء کی معرفت کو علم نہ جانتا اسے وُہ عالم نہ سمجھتے۔"

ایک بزرگؒ فرماتے ہیں:

"جو علماء کے اختلافات سے آگاہ نہ ہو اسے فتویٰ دینا جائز نہیں اور نہ ہی اسے عالم کہا جا سکتا ہے۔"

حضرت قتادہ اور سعید بن جبیر رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"لوگوں کے اختلافات سے آگاہ آدمی ہی سب سے بڑا عالم ہے۔"

امام احمد رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ جو آدمی ایک لاکھ حدیث لکھے کیا اسے فتویٰ دینے کا حق حاصل ہے؟

فرمایا: "نہیں"۔

پوچھا گیا: "اگر دو لاکھ احادیث لکھے تو؟"

فرمایا: "نہیں"۔

پوچھا گیا: "اگر تین لاکھ احادیث لکھے تو؟"

فرمایا: "اب امید کی جا سکتی ہے۔"

تورات میں آتا ہے :

" باطنی مرض کا تجربہ کار طبیب ہی اصلاح کر سکتا ہے "

جاہل طبیب

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے مدائن سے حضرت ابوالدرداؓ کو لکھا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے درمیان مواخات قائم فرمائی تھی، لکھا:

" اے بھائی! مجھے پتہ چلا ہے کہ تُو طبیب بن چکا ہے اور مریضوں کا علاج معالجہ کرتا ہے۔ اس لیے دیکھنا، اگر تو طبیب ہے تو کلام کر۔ تیری کلام میں بھی شفا ہو گی اور اگر تو تبکلف طبیب بن رہا ہے تو خدا سے ڈرو، مسلمان کو قتل نہ کرو۔"

راوی بتاتے ہیں : کہ اس کے بعد اگر حضرت ابوالدرداؓ سے پوچھا جاتا تو خاموش ہو جاتے۔ ایک آدمی نے ان سے کچھ پوچھا۔ انہوں نے کچھ جواب نہ دیا۔ پھر فرمایا:

" اسے بلاؤ " جب وہ آیا تو فرمایا :

" دوبارہ پوچھو "

اس نے دوبارہ سوال کیا تو فرمانے لگے :

" اللہ کی قسم! تبکلف طبیب ہوں ! " چنانچہ اپنے کلام میں رجوع کر لیا۔

حضرت عمرؓ کی حدیث میں ہے کہ :

" جس نے طبابت کی اور وہ طب نہیں جانتا اور کسی کو مار بیٹھا تو وہ ضامن ہے "

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے :

" جابر بن زید سے پوچھو، اگر تمام بصرہ والے بھی ان سے فتوے پوچھیں تو یہ سب کے لیے کافی ہوں گے۔" اور یہ تابعینؒ میں سے تھے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کچھ پوچھا جاتا تو فرماتے :

" سعید بن مسیبؒ سے معلوم کرو "

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے :

" ہمارے محترم حسنؒ سے پوچھو اس لیے کہ انہیں یاد رہا اور ہم بھول چکے "

ایک بصری بزرگؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے ہاں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی تشریف لائے تو ہم حضرت حسنؒ کے پاس آئے اور عرض کیا :

کیا ہم ان صحابیؓ کے پاس نہ آئیں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پوچھیں اور

آپؓ بھی ہمارے ساتھ چلیے"۔ انہوں نے فرمایا:

"ہاں چلو!" چنانچہ ہم حاضر ہوئے اور ان سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث پوچھتے رہے۔ انھوں نے ہمیں بیس احادیث بتائیں۔ (راوی) بتاتے ہیں کہ حضرت حسنؓ خاموش سنتے رہے۔ اس کے بعد حضرت حسنؓ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کہنے لگے:

"اے رسول اللہؐ کے صحابیؓ! آپ نے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے اس کی تفسیر بھی فرمادیں تاکہ ہم اس میں فقاہت حاصل کر لیں"۔ وہ صحابی خاموش رہے اور فرمایا:

"میں نے جو سنا ہے میرے پاس وہی ہے"۔

حضرت حسنؓ نے اس کی وضاحت شروع کی کہ پہلی حدیث آپ نے یہ روایت کی۔ اس کی تفسیر اس طرح ہے۔ دوسری حدیث کی تفسیر یہ ہے۔ حتیٰ کہ تمام روایت کردہ احادیث پڑھ کر ان کی تفسیر کر دی۔ راوی کہتے ہیں کہ ہم حضرت حسنؓ کی قوتِ حافظہ اور ادائیگی حدیث پر اور ان کے علم و تفسیر پر حیران رہ گئے۔ راوی بتاتے ہیں کہ پھر صحابیؓ نے مٹھی بھر کنکرے کر ہمیں مارے اور فرمایا:

"تم مجھ سے علم پوچھتے ہو، حالاں کہ ایسا زبردست عالم تمہارے ہاں موجود ہے"۔

نورِ علم کا مقام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی یہ شان تھی کہ فتویٰ اور علم لسان کی کوئی بات پوچھی جاتی تو اپنے سے کم درجہ والے کی طرف بھیجتے جو کہ توحید و معرفت اور ایمان کے علم میں ان میں سے بڑھ کر ہوتا اور طرح طرح کے شبہات میں ان کی طرف نہ جاتے اور نہ ہی علم معرفت و یقین میں ان کی طرف رجوع کرتے۔ جیسے کہ فرمایا گیا:

"علم ایک نور ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کے دلوں میں ڈالتا ہے"۔

گاہے یہ ایسا ہوتا ہے کہ دیکھنے والوں کے لیے اس میں ایک کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔ گاہے اس میں جوان کو بوڑھے پر اور بعد میں آنے والے کو پہلے والے پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ گاہے خشوع و خضوع کرنے والے سادہ قسم کے لوگوں کی عزت افزائی کرنے کے لیے ہوتی ہے تاکہ لوگ ان کی عزت و رفعت کو جان لیں۔ جیسے کہ فرمایا:

وَنُرِيدُ اَنْ نَّمُنَّ عَلَى الَّذِيْنَ اسْتُضْعِفُوْا فِي الْاَرْضِ وَنَجْعَلَهُمْ اَئِمَّةً۔ (اور ہم چاہتے ہیں کہ احسان کریں ان پر جو کمزور پڑے تھے ملک میں اور کر دیں ان کو سردار)

اور جب دل میں نور ڈالا جائے تو علم میں شرح صدر حاصل ہوتا ہے اور یقین پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ زبان کو حقیقتِ بیان کا اطمینان حاصل ہوتا ہے اور یہ وہی حکمت ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنے اولیاءؒ کے قلوب میں

ہی ودیعت فرماتا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تفسیر میں آیا۔

وَ اٰتَیْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَ فَصْلَ الْخِطَابِ یعنی درست کلامی اور اصابتِ قول کا انعام فرمایا۔
گویا اسے حقیقت کی توفیق حاصل ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

یُّؤْتِی الْحِكْمَةَ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَ مَنْ یُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا كَثِیْرًا۔ (دیتا ہے سمجھ جس کو چاہے اور جس کو سمجھ ملی، بہت خوبی ملی)

یعنی اسے فہم فطانت عطا کی گئی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

فَمَنْ یُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ یَّهْدِیَهٗ یَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ۔ (سو جس کو اللہ چاہے راہ دے، کھول دے اس کا سینہ حکم برداری کو)

تو ہدایت کی تفسیر کی۔ آپؐ سے دریافت کیا گیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! یہ شرح (صدر) کیا ہے؟"

آپؐ نے فرمایا:

"جب دل میں نور ڈالا جائے تو اس کے لیے سینہ فراخ اور منکشف ہو جاتا ہے۔"

عرض کیا گیا:

"تو کیا اس کی کوئی علامت ہے؟"

آپؐ نے فرمایا:

"ہاں، اس دھوکہ کے گھر سے علیحدگی اختیار کرنا اور ابدی گھر کی جانب توجہ ہو جانا اور موت آنے سے پہلے موت کی تیاری کرنا۔"

چنانچہ آپؐ نے دنیا میں زاہد بننے، اپنے مالک کی عبادت کرنے اور حسنِ توفیق کا ذکر فرمایا۔

علم میں اصابت رائے بھی اللہ تعالیٰ کا ایک فضل اور انعام ہے اور جس کو چاہتا ہے، عطا فرماتا ہے جیسے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ جن دنوں کوفہ کے امیر تھے تو ان سے پوچھا گیا، کہ

"ایک آدمی اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو جاتا ہے اور سینہ سامنے کر کے قتال کر رہا تھا، پشت نہیں دکھائی وہ کہاں ہے؟"

حضرت ابو موسیٰؓ نے فرمایا:

"وہ جنت میں ہے۔"

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا:

"امیر سے دوبارہ پوچھ۔ شاید وہ تمھارے سوال کو نہیں سمجھے"۔

سائل نے عرض کیا،

"اے امیر! آپ اس آدمی کے بارے میں کیا فرماتے ہیں جو اللہ تعالٰی کی راہ میں قتال کرے چنانچہ پشت دکھائے بغیر سامنا کرتے ہُوئے شہید ہُوا، وُہ کہاں ہے؟"

حضرت ابوموسیٰؓ نے فرمایا:

"وُہ جنت میں ہے"۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"امیر سے دوبارہ پوچھو، شاید وہ تمھاری بات نہیں سمجھے"۔

اس نے تین بار سوال دُہرایا اور حضرت ابوموسیٰؓ ہر بار یہی جواب دیتے رہے کہ "وہ جنت میں ہے"۔

پھر فرمایا،

"میرے خیال میں یہی بات ہے۔ آپ اس کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟"

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا:

"مگر میں تو یہ نہیں کہتا"۔ اُنھوں نے پوچھا:

"آپ کا کیا فرمان ہے؟"

اُنھوں نے جواب دیا:

"میں یہ کہتا ہوں۔ اگر وُہ اللہ کی راہ میں قتل ہُوا اور حق پالیا تو وُہ جنّت میں ہے"۔

حضرت ابوموسیٰؓ نے فرمایا:

انھوں نے سچ فرمایا۔ جب تک یہ باعظمت عالم تم میں موجود ہے تب تک مجھ سے کچھ نہ پُوچھنا۔

اصحابِ حدیث کا فرمان یہی ہے کہ صفات کی روایات کو تسلیم کر لیا جائے اور ان کی تفسیر کا مطالبہ نہ کیا جائے مگر حقیقت یہ ہے کہ اسماء و صفات کی تفسیر و معرفت معلوم کرنے کے بعد وسوسہ اور ظن ختم ہوجاتا ہے اور تشبیہ و تمثیل چھوڑ دینا اور معرفت مشاہدہ کے باعث یقین پر مطمئن ہونا، مقام اہل یقین ہے۔ کسی حد و عدد کے بغیر اس کی صفات کا یقین رکھنا، جس سے اس کی صفات کا یقین رکھنا، جس سے اس کی معرفت حاصل ہوتی ہو اور کسی صفت سے کوئی صفت معلوم ہوتی ہو۔ جیسے وُہ چاہے بہ صفت پر

موقوف نہیں اور اظہارِ غیریت کے بغیر نہ ہی اس پر کسی صورت کا حکم دیا جا سکتا ہے بلکہ وہ ہے جیسے بھی ظاہر ہُوا۔ اور جس وصف کے ساتھ بھی کھلا۔ البتہ کیفیت اور تمثیل کی نفی کی جائے گی۔ کیونکہ اس کی جنس وجوہریت ہی مفقود ہے۔ اور یہ مشاہدہ سے سرفراز ہونے والے مقربین کا مقام ہے۔ یہی لوگ صدیقین اور خواص اہل یقین ہیں۔ جو آدمی ان کی توجیہ سے اعراض کرے گا اور ان کی شہادت پر دھیان نہ دے گا اسے تسلیم و تصدیق کی جانب آنا پڑے گا اور وہ مقامِ سکوت پر خاموش کھڑا ہوگا۔ اس کے بعد کوئی قابلِ مدح مقام اور نہ قابلِ ذکر وصف نہیں اور جس نے اپنی عقل سے اس کی تلاش کی اور اپنی رائے سے اس کی تفسیر کی۔ وہ تشبیہ و تمثیل کی طرف جا گرا یا نفی و ابطال کی گمراہی میں ڈوب گیا۔

قصہ گوئی کی مذمت

باقی تمام علوم پر اس کی افضلیت، مجالس ذکر اور فضیلت ذاکرین کے سلسلہ میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بکثرت احادیث اور صحابہ و تابعین کے اقوال میں ملتی ہے اور وہاں ان کی مراد ایمان و معرفت کا علم، علم معاملات، قلبی بصارت کا تفقہ اور رازہائے غیبی کے بارے میں تنظرِ یقین مراد ہے اور ان فضائل میں ان کی مراد کبھی بھی قصہ گوئی کی مجالس اور قصہ گو افراد نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ وہ قصہ گوئی کو بدعت سمجھتے تھے۔ اور فرمایا کرتے کہ:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قصہ گوئی کا رواج نہ تھا۔ نہ ہی ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں اس کا رواج تھا۔ آخر (شہادتِ عثمانؓ) کا فتنہ ظاہر ہُوا اور جب یہ فتنہ ظاہر ہُوا تو قصہ گوئی کو بھی رواج حاصل ہُوا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ بصرہ میں تشریف لائے تو مسجد سے قصہ گو لوگوں کو نکال باہر کیا اور فرمایا:
ہماری اس مسجد میں کوئی آدمی قصہ گوئی نہ کرے آخر وہ (ان کو نکالتے نکالتے) حضرت حسنؓ تک پہنچے۔ وہ اس علم کے بارے میں کلام کر رہے تھے۔ ان کی بات سُن کر چلے گئے اور انہیں نہیں نکالا۔

ایک دفعہ حضرت ابن عمرؓ مسجد میں اپنی جگہ پر تشریف لائے تو دیکھا کہ ایک آدمی قصہ گوئی کر رہا ہے۔ فوراً ایک پولیس والے کو بلا کر اس قصہ گو کو مسجد سے نکال دیا اور اگر مجالس ذکر کے قصے (واقعات) بیان کیے جاتے اور علماء واقعات کو بیان کرنے والے ہوتے تو اس قدر بلند تقویٰ و پرہیزگاری کے باوجود انہیں مسجد سے باہر نہ نکالتے۔

حضرت ابن شوذب سے مروی ہے۔ انہوں نے ابوالتیاحؒ سے نقل کیا۔ میں نے حسنؒ سے عرض کیا، کہ ہمارا امام قصے سناتا ہے اور مرد و عورتیں اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ پھر دعا کے موقع پر آواز بلند کی جاتی ہے اور ہاتھ اٹھاتے ہیں تو حضرت حسنؒ نے فرمایا:

"دعا کے موقع آواز بلند کرنا بدعت ہے اور دعا کے موقع پر ہاتھ اٹھانا بھی بدعت ہے۔"

ابو الاشہبؒ نے حضرت حسنؒ سے نقل کیا:

"قصے بیان کرنا بدعت ہے۔"

حضرت ابن سیرینؒ سے عرض کیا گیا:

"کاش! آپ اپنے بھائیوں کے سامنے قصے (واقعات) بیان کریں۔"

فرمایا:

"حکم تو یہ ہے کہ صرف تین آدمی ہی لوگوں پر کلام کریں:

۱۔ امیر

۲۔ مامور (جس کو حکم دیا جائے)

۳۔ احمق

اب میں نہ امیر ہوں اور نہ مامور ہوں۔ اور تیسرا بننا مجھے ناپسند ہے۔

حضرت عون بن موسیٰ سے مروی ہے۔ انہوں نے معاویہ بن قرةؓ سے نقل کیا کہ میں نے حضرت حسنؒ سے پوچھا:

"میں ایک مریض کی عیادت کروں۔ آپ کے نزدیک یہ بہتر ہے یا ایک قصہ گو کی مجلس میں بیٹھوں؟"

فرمایا:

"مریض کی عیادت کر۔"

پھر میں نے پوچھا:

"آپ کے نزدیک میرا ایک قصہ گو کی مجلس میں بیٹھنا زیادہ پسندیدہ ہے یا ایک جنازہ میں شرکت کرنا؟"

تو فرمایا:

"جنازہ میں شرکت کرو۔"

میں نے کہا:

"اگر کوئی آدمی مجھ سے تعاون چاہے تو میں اس کی امداد کروں یا کسی قصہ گو کی مجلس میں بیٹھوں؟"

فرمایا:

"اپنے کام میں لگے رہو۔"

حتیٰ کہ انہوں نے فارغ رہنے کو بھی قصہ گوئی کی مجلس سے بہتر بتایا۔ اب اگر ان کے نزدیک

مجالسِ ذکر کا بھی مجالس قصہ گوئی جیسا مقام ہوتا اور قصے ہی ذکر اللہ ہوتے تو حضرت حسنؒ اس آدمی کو اس سے نہ ہٹاتے اور کئی اعمال کو اس کام پر ترجیح نہ دیتے۔ اس لیے کہ وُہ خود بھی توحیدِ الٰہی کے داعی تھے اور علمِ معرفت و یقین میں کلام فرمایا کرتے اور ذاکرین کے مقامات کی توضیح کرتے اور یہ بتاتے کہ مجلسِ ذکر میں حاضری ایمان میں تقویت و اضافہ کا باعث ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عام اہل ایمان سے ذاکرین کا مقام زیادہ بلند بتایا۔ فرمایا:

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمَاتِ وَالْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ۔

اس کے بعد ذَاکِرِیْنَ وَالذَّاکِرَات (ذکر کرنے والے مردوں اور ذکر کرنے والی عورتیں) کا مقام بلند تر فرمایا:

مجلسِ ذکر میں حاضری ہزار رکعت سے افضل ہے

حضرت ابو ذرؓ کی حدیث میں آتا ہے:

"مجلسِ ذکر میں حاضر ہونا، ایک ہزار رکعت (نفل) سے افضل ہے اور مجلسِ علم میں حاضر ہونا ایک ہزار بیمار کی عیادت سے افضل ہے، اور مجلسِ علم میں حاضر ہونا ایک ہزار جنازہ میں شرکت سے افضل ہے۔"

عرض کیا گیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! اور کیا قرآن کی تلاوت سے بھی؟"

آپؐ نے فرمایا:

"اور کیا تلاوتِ قرآن، علم کے بغیر بھی نفع دیتی ہے؟"

بعض سلفؒ سے مروی ہے:

"مجلسِ ذکر میں حاضری دینا دس باطل مجالس کا کفارہ بن جاتا ہے۔"

حضرت عطاءؒ فرماتے ہیں:

"ایک مجلسِ ذکر ستر مجالس لہو کا کفارہ بن جاتی ہے۔"

حضرت معاذؒ جیسے بزرگ ترین عالم کے بارے میں آتا ہے۔ وُہ فرماتے ہیں کہ: میں معتزلہ کی مجلس میں بیٹھا تھا اور یونس بن عبیدؒ نے مجھے دیکھ کر فرمایا:

"یہاں آؤ!"

میں گیا تو فرمانے لگے:

"اگر ضرور کہیں بیٹھنا ہو تو (اس کی بجائے) کسی قصہ گو کی مجلس میں بیٹھ لیا کرو (یعنی معتزلہ کی مجلس

بدترین مجلس ہے)۔ حضرت حسن بصریؒ بہت ذاکر اور دوسروں کو ذکر کی نصیحت کرنے والے تھے۔ ان کی مجالس، مجالس ذکر ہی ہوا کرتیں۔ وہ اپنے مکان میں اپنے بھائی بندوں اور پیروکاروں کے ہمراہ نشست کرتے۔ ان کے ہمراہ مالک بن دینار، ثابت بنانی، ایوب سختیانی، محمد بن واسع اور فرقد سنجی رحمہم اللہ مجلس کیا کرتے۔ حضرت عبدالواحد بن زیدؒ فرماتے ہیں:

"آؤ! نور پھیلائیں۔"

پھر اس مجلس میں یقین و قدرت کے علوم کا ذکر کرتے۔ خواطرِ قلبی، مفسداتِ اعمال اور نفسانی وساوس کا تذکرہ ہوتا اور گاہے اصحابِ حدیث میں سے کوئی صاحب سر چھپا کر پوشیدہ طور پر کچھ سنتے۔ اور جب حضرت حسنؒ انہیں دیکھتے تو فرمایا:

"اے بچے، تم یہاں کر رہے ہو؟"

ہم اپنے بھائیوں کے ساتھ خلوت میں مذاکرہ کر رہے ہیں اور اس علم میں جس میں کلام کر رہے ہیں۔

حضرت حسن بصریؒ

حضرت حسنؒ ہمارے امام ہیں۔ ہم ان کے نشان پا پر رواں اور ان کی راہ پر رواں ہیں۔ ان کے چراغ سے ہی روشنی حاصل کر رہے ہیں اور اس فن کی امامت ان تک جا پہنچتی ہے۔ یہ بلند پایہ تابعین میں سے تھے۔

ایک قول کے مطابق چالیس سال تک حکمت جمع کرتے رہے۔ پھر اس میں کلام فرمایا ان کی ستر بدری صحابہؓ سے ملاقات ہوئی اور کل تین سو صحابہؓ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا۔ ۲۱ھ میں جب کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی خلافت میں دو راتیں باقی تھیں تو ان کی پیدائش ہوئی۔

یہ مدینہ میں پیدا ہوئے۔ ان کی والدہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت ام سلمہؓ کی آزاد کردہ غلام تھیں۔ کہتے ہیں کہ یہ رو پڑے تو انھوں نے ان کے منہ میں پستان ڈالا اور ان سے دودھ بہایا۔ ان کا کلام جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے مشابہ تھا۔ انہوں نے حضرت عثمان بن عفان، علی بن ابی طالب اور ان کے عہد میں زندہ عشرہ مبشرہ میں سے باقی صحابہؓ کو دیکھا۔ پھر حضرت عثمانؓ کے عہد میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کی زیارت کی۔ یعنی ۷۰ھ سے کچھ زیادہ سے لے کر ۹۰ھ سے زیادہ تک اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ میں سے جن کا سب سے آخر میں انتقال ہوا۔ ان کے اسماء گرامی حسبِ ذیل ہیں:

۱۔ حضرت انسؓ بن مالک جو بصرہ میں فوت ہوئے۔

۲۔ حضرت سہلؓ بن سعد ساعدی جن کا مدینہ میں انتقال ہوا۔

۳۔ حضرت ابو الطفیلؓ جن کی مکہ میں وفات ہوئی۔

۴۔ حضرت ابیضؓ بن جمال مازنی، یہ یمن میں فوت ہوئے۔

۵۔ حضرت عبد اللہؓ بن ابی اوفی، یہ کوفہ میں فوت ہوئے۔

۶۔ حضرت ابو قرصافہؓ۔ یہ شام میں فوت ہوئے۔

۷۔ حضرت بریدہ اسلمیؓ، ان کا انتقال خراسان میں ہوا۔

جب ایک صدی ختم ہوئی تو روئے زمین پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنے والی آنکھ نہ تھی۔ پھر سنہ ۱۱۰ھ میں حضرت حسنؒ کا انتقال ہوا۔

حضرت ابو قتادہ عدویؒ فرماتے ہیں:

"اس بزرگ سے وابستہ رہو۔" خدا کی قسم میں نے ایسا کوئی آدمی نہیں دیکھا جس کو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہونے کا شرف حاصل نہ ہو مگر پھر بھی وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے اس قدر مشابہ ہو جس قدر یہ ہیں۔

اور وہ فرمایا کرتے کہ ہم ان کے حلم وخشوع اور وقار وسکینت میں ان کی مشابہت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریق سے دیا کرتے۔ اس لیے کہ یہ ان کے شمائل مقدسہ پر گامزن تھے۔

بصرہ کی ایک عورت نے نذر مانی کہ اگر اللہ تعالیٰ نے میرا یہ کام کر دیا تو میں خود کات کر ایک کپڑا بنا کروں گی اور بصرہ کے سب سے نیک آدمی کو پہناؤں گی۔ جب اس نے نذر ادا کرنے کا ارادہ کیا تو پوچھا کہ بصرہ کا سب سے نیک آدمی کون ہے؟ تو سب نے جواب دیا:

"حضرت حسن بصریؒ!"

حضرت حسن رضی اللہ عنہ پہلے آدمی ہیں جو اس علم کی راہ چلے۔ اس پر زبان کھولی اور اس کے مفاہیم بیان کیے۔ اس کے انوارات پھیلائے اور اس کے مخفیات کو ظاہر فرمایا۔ وہ ایسا بلند پایہ کلام فرماتے کہ اس سے قبل سنا نہیں گیا۔ ان سے پوچھا گیا:

اے ابو سعید، آپ اس علم میں ایسا کلام کرتے ہیں کہ ہم نے دوسروں سے کبھی نہیں سنا۔ یہ آپ کو کہاں سے ملا؟ تو فرمایا:

"حذیفہؓ بن یمان سے۔"

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ

کہتے ہیں کہ حضرت حذیفہ بن یمان سے پوچھا گیا کہ: ہم اس علم میں آپ کو ایسا کلام کرتا دیکھ رہے ہیں کہ ہم نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

باقی صحابہؓ سے نہیں سنا۔ فرمانے لگے :

" مجھے مخصوص طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمایا ہے۔ لوگ آپ سے خیر و بھلائی کی باتیں پوچھتے اور میں خطرات اور شرور کے بارے میں پوچھتا کہ کہیں ایسا نہ ہو میں ہی ان میں گر جاؤں اور میں جان چکا تھا کہ بھلائی تو (ان شاء اللہ) مجھے ملے گی۔" ایک بار فرمایا :

" میں سمجھ چکا تھا کہ جو شر کو نہ پہچانے وہ بھلائی سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔"

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں :

" لوگ پوچھا کرتے : اے اللہ کے رسولؐ ! جو آدمی یہ عمل کرے اس کے لیے کتنا اجر ہے۔ یعنی اعمال کے فضائل معلوم کرتے۔" اور میں عرض کرتا :

" اے اللہ کے رسولؐ ! جو آدمی ایسا ایسا خراب کام کرے اس کے لیے کیا سزا ہے ؟"

جب آپؐ نے دیکھا کہ میں اعمال کی آفات کے بارے میں سوال کیا کرتا ہوں تو آپؐ نے اس علم کے لیے مجھے مخصوص فرمایا۔

حضرت حذیفہؓ کو مخصوص طور پر منافقین کا حال معلوم تھا اور علم نفاق پہچاننے، علمی راز، دقیق فہمی اور یقین کے مخفیات سمجھنے میں انہیں صحابہؓ کے اندر ایک امتیازی شان حاصل تھی۔ حضرت عمر و عثمان اور دوسرے اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم ان سے عام اور خاص فتنوں کے بارے معلومات حاصل کرتے اور اس مخصوص علم میں انہی کی طرف رجوع کرتے اور منافقین کے بارے میں ان سے دریافت کرتے اور یہ معلوم کرتے کہ کیا ان میں سے کوئی باقی ہے۔ چنانچہ وہ ان کی تعداد بتا دیتے مگر ان کے نام نہ لیتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے پوچھتے کہ کہیں میرے اندر کوئی نفاق تو نہیں ؟ تو حضرت حذیفہؓ نے انہیں نفاق سے پاک اور بری بتایا۔ پھر نفاق کی علامات دریافت کیں تو جن علامات کے بتانے کی انہیں اجازت تھی اور ان کو دور کر کے اصلاح کی جا سکتی تھی، وہ بتا دیتے اور جن کے بتانے کی اجازت نہ تھی ان کے بارے میں عذر کر دیتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادت مبارک تھی کہ جب جنازہ کے لیے انہیں بلایا جاتا تو لوگوں پر نظر کرتے اور دیکھتے کہ حضرت حذیفہؓ کو ان میں موجود پاتے تو اس کی نماز جنازہ پڑھتے۔ اور اگر جنازہ پڑھنے والوں میں حضرت حذیفہؓ کو نہ دیکھتے تو اس کا جنازہ نہ پڑھتے۔ حضرت حذیفہؓ کو صاحب سِرّ (صاحب راز) کہا جاتا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے اگر کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تو وہ فرماتے :

" تم مجھ سے پوچھ رہے ہو، حالانکہ صاحب سِرّ تمہارے اندر موجود ہے ؟ یعنی حضرت حذیفہؓ موجود ہیں

ان سے معلوم کرو۔

صحابہؓ کی مجالس ذکر

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ جب وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مجلسِ ذکر کی یہ فضیلت روایت کرتے کہ:

" میں جماعت کے ہمراہ بیٹھا صبح سے لے کر طلوعِ آفتاب تک ذکر اللہ کرتا رہوں، یہ مجھے چار گردنیں (غلام) آزاد کرنے سے زیادہ محبوب ہے۔"

راوی بتاتے ہیں کہ پھر انہوں نے یزید رقاشیؒ اور زیاد نمریؒ کی طرف توجہ کرکے فرمایا:

وہ مجالسِ ذکر تمہاری آج کی مجالس کی طرح نہ تھیں کہ تم میں سے ایک آدمی قصہ بتا رہا ہے اور اپنے ساتھیوں کو مخاطب ہے اور احادیث فرفر روانی سے پڑھے جارہا ہے بلکہ ہم بیٹھ کر ایمان کا ذکر کرتے، پھر قرآن پر تدبر کرتے اور دین کی معلومات و فقاہت حاصل کرتے اور اس کو اپنے اوپر اللہ کا انعام شمار کرتے۔

حضرت عبداللہؓ بن رواحہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ سے کہا کرتے:

" آؤ، ایک گھڑی ایمان لائیں۔"

پھر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ، توحید اور آخرت کے علوم پر کلام فرماتے۔

گاہے ایسا ہوتا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد لوگ ان کے پاس جمع ہو جاتے اور یہ انہیں ایام اللہ کی باتیں بتاتے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین سناتے۔ گاہے ایسا بھی ہوتا کہ لوگ ان کے پاس بیٹھے ہوتے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آتے، اور سب خاموش رہتے۔ پھر آپؐ ان کے پاس بیٹھ جاتے اور آپؐ لوگوں کو فرماتے کہ اس طرح علم حاصل کرتے رہو۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے:

" مجھے اسی کا حکم دیا گیا اور میں نے اسی کی طرف دعوت دی۔"

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی یہی منقول ہے۔ وہ بھی اس علم میں کلام فرماتے تھے۔

حضرت جندبؓ کی حدیث میں یہ بات واضح طور پر ملتی ہے کہ:

" ہم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ہوتے تو آپؐ ہمیں قرآن سیکھنے سے پہلے ایمان کی تعلیم دیتے۔"

چنانچہ انہوں نے بھی حضرت ابن رواحہؓ کی طرح ایمان کو علمِ ایمان کا نام دیا۔ اس لیے کہ علمِ ایمان دراصل ایمان کا وصف ہے اور عرب لوگ وصف کے ساتھ بھی چیز کا نام رکھ دیتے ہیں اور اصل کے ساتھ بھی چیز کا نام رکھ دیتے ہیں جیسے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مثال دی۔ فرمایا:

"یقین سیکھو۔" یعنی علم یقین سیکھو۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ[1] (اور ان کی آنکھیں غم سے سفید ہوگئیں)

یعنی رونے کے باعث سفید ہوگئیں۔ چنانچہ اصل حزن تھا۔ اس کو (بکاء) پر استعمال کر دیا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مروی ہے کہ ایک روز آپ باہر تشریف لائے اور دو مجالس دیکھیں۔ ایک مجلس میں اللہ تعالیٰ سے دعا کی جا رہی تھی (یعنی خالی ذکر اللہ تھا) اور دوسری مجلس میں دین کا علم سیکھا جا رہا تھا اور لوگوں کو تعلیم دین دی جا رہی تھی۔ آپ دونوں کے درمیان کھڑے ہوگئے اور فرمایا:

"یہ لوگ اللہ سے مانگ رہے ہیں چاہے تو ان کو دے اور چاہے تو روک لے اور یہ لوگ، عوام کو تعلیم دے رہے ہیں اور دین کا علم حاصل کر رہے ہیں اور مجھے معلم بنا کر مبعوث کیا گیا۔ پھر آپ اس مجلس کی جانب تشریف لے آئے جو لوگوں کو دین کی تعلیم دے رہی تھی۔ اور (اسی طرح) اللہ تعالیٰ کی یاد کر رہی تھی۔ چنانچہ آپ ان کے ہمراہ بیٹھ گئے۔

بعض سلف سے منقول ہے۔ فرمایا: کہ

میں ایک روز مسجد میں آیا تو دو حلقے دیکھے۔ ایک میں قصہ گوئی اور دعا ہو رہی تھی اور دوسرے حلقہ میں علم اور اعمال کی تعلیم دی جا رہی تھی۔ بتاتے ہیں کہ میں دعا کے حلقہ کی طرف چلا اور ان میں بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں بوجھل ہوگئیں اور سو گیا۔ اچانک کسی فرشتہ نے آواز دی یا کسی شخص نے کہا: تو ان میں بیٹھ گیا اور مجلس علم کو چھوڑ دیا؟ میاں اگر وہاں بیٹھے ہوتے تو ان کے ہمراہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو پاتے تو حقیقی ذکر اللہ تعالیٰ کے بارے میں علم حاصل کرنا ہے۔

دیکھیے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ:

افضل ترین ذکر لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ہے۔ اور آپ کی تصدیق کرتے ہوئے حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے فرمایا:

فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۔ (سو جان لے کہ اللہ کے بغیر کوئی معبود نہیں)

ایک جگہ فرمایا:

فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ[2] (تو جان لو کہ یہ اترا ہے اللہ کے علم سے اور کوئی حاکم نہیں سوائے اس کے)

---

[1] سورۃ یوسف آیت ۸۴۔ [2] سورۃ ہود آیت ۱۴۔

پھر علمِ ذکر یہی علم مشاہدہ ہے۔ اور مشاہدہ عین الیقین کی صفت ہے۔ جب آنکھ سے پردہ ہٹا تو صفات اور ان کے انوارات کے مفاہیم کا مشاہدہ حاصل ہُوا اور یہ نورِ یقین کو بڑھانے والی ہے اور نورِ یقین کا نام کمالِ یقین اور حقیقتِ یقین ہے۔ چنانچہ وہاں پر نورِ وصف کے باعث مشاہدۂ مذکور کے ساتھ موصوف کا ذکر کیا۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

کَانَتْ اَعْیُنُھُمْ فِیْ غِطَآءٍ عَنْ ذِکْرِیْ۔ (آنکھوں پر پردہ پڑا تھا میری یاد سے)

اور جس کی آنکھیں اس کے ذکر کا کشف حاصل کر لیں۔ وہ مذکور کا مشاہدہ حاصل کر کے ذکر کرے گا۔ پھر مخلوق کو فراموش کر کے حقیقی علم پا یا جائے گا۔ جیسے کہ فرمایا:

وَاذْکُرْ رَّبَّکَ اِذَا نَسِیْتَ۔ (اور یاد کرے اپنے رب کو جب بھول جائے)

چنانچہ ذکر اللہ کا حق یہ ہے کہ غیر اللہ کو فراموش کر دے جیسے کہ ایمان کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر باطل معبود کا انکار کرے۔ جیسے کہ فرمایا:

فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ یُؤْمِنْ بِاللّٰہِ۔ (پس جو انکار کرے طاغوت کا اور ایمان لائے اللہ پر)

ایک محدث ؒ فرماتے ہیں کہ عارفین میں سے میرے ایک بھائی میرے پاس تشریف لائے۔ فرمانے لگے:

"میں اپنے قلب میں کچھ غفلت پاتا ہُوں۔ مجھے کسی مجلسِ ذکر میں لے چلو۔"

میں نے عرض کیا:

"ہاں چلیے! ان کے سامنے ایک ذکر کرانے والا کا نام لیا جو علومِ عوام میں کلام کرتے تھے۔" راوی بتاتے ہیں: آخر ہم اس کے پاس حاضر ہُوئے۔ لوگ ان کے پاس جمع ہُوئے تو قصے سنانے لگے اور جنت و دوزخ کا ذکر کیا۔ میرے ساتھی نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ کیا اس کو یہ نہیں سمجھ رکھا کہ یہ ذکر اللہ کراتا ہے اور رب تعالیٰ کا اور ایامِ اللہ کا ذکر کرتا ہے؟ میں نے جواب دیا:

"ہاں! ہمارے خیال میں یہ ایسے ہی ہیں۔"

فرمانے لگے:

"میں تو ان سے صرف مخلوق کا ذکر ہی سُن رہا ہُوں۔ ذکر اللہ کہاں ہے؟" پھر تھوڑی دیر ٹھہرے کہ شاید علمِ معرفت کی کوئی بات کریں جو وُہ چاہتے تھے۔

اور شیوخِ صوفیا سے جو روایت ہے۔ اس میں ہے کہ صرف حکایات و قصص ہی بتا رہا تھا۔ چنانچہ میری طرف دیکھ کر کہنے لگے:

"چلو، چلیں۔ یہاں بیٹھنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ اس میں میرا مطلوب نہیں۔"

میں نے عرض کیا:

"مجھے حیاء آتی ہے کہ لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر باہر جاؤں۔ آپ کی جیسے مرضی ہو کرلیں۔ چنانچہ وہ گردنیں پھلانگتے ہوئے باہر نکل گئے۔

قصہ گوئی بدعت ہے

حضرت زہریؒ نے سالمؒ سے، انہوں نے حضرت ابن عمرؓ کے بارے میں نقل کیا کہ وہ مسجد سے نکلے اور فرمایا:

"مجھے ان قصہ گو لوگوں نے مسجد سے نکالا۔ اگر یہ نہ ہوتے تو میں نہ نکلتا۔"

حضرت حمزہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا:

"کیا ہم قصہ گو کا چہرہ سے استقبال کریں؟"

فرمایا:

"بدعتوں کی طرف اپنی پشت پھیر لو۔"

ابن عونؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ابن سیرینؒ کے پاس حاضر ہوا اور پوچھا:

"آج کیا خبر ہے؟"

فرمایا:

"امیر نے قصہ گو کو قصہ گوئی سے منع کر دیا۔"

حضرت ابو معمر سے مروی ہے۔ انہوں نے خلف بن خلیفہؒ سے روایت کیا کہ میں نے مسجد کے دروازے پر حضرت ابوالحکمؒ کو مسواک کرتے دیکھا اور مسجد میں ایک قِصّہ گو قصہ سنا رہا تھا۔ ایک آدمی ان کے پاس آیا اور کہنے لگا:

لوگ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں (کہ قصہ گو کی مجلس میں بیٹھنے کی بجائے آپ باہر کھڑے ہیں)

فرمایا:

"جس کام میں لوگ ہیں میں ان سے بہتر کام میں مصروف ہوں۔ وہ بدعت میں اور میں سنّت میں مصروف ہوں۔"

حضرت اعمشؒ کا فعل اس سے بھی زیادہ واضح اور شدید تھا۔ وہ بصرہ میں تشریف لائے اور یہاں پر یہ اجنبی تھے۔ جامع مسجد میں ایک قصہ گو کو دیکھا۔ وہ کہہ رہا تھا:

ہمیں اعمشؒ نے بتایا، انہوں نے اسحٰق سے روایت کی۔ ہمیں اعمشؒ نے حضرت ابووائلؒ سے روایت کرتے ہوئے بتایا۔ راوی بتاتے ہیں کہ: حضرت اعمشؒ یہ سن کر کھڑے ہوئے اور حلقہ کے درمیان آکر

بازو اٹھایا اور اپنی بغل کے بال اکھیڑنے لگے۔ قصہ گو نے ان کو دیکھ کر کہا:

"بڑے میاں، شرم نہیں کرتے۔ ہم علم کی باتیں کر رہے ہیں اور تم یہ کام کر رہے ہو!"

حضرت اعمشؒ نے فرمایا:

"میں جس کام میں ہوں یہ اُس کام سے افضل ہے جس میں تم ہو!"

اُس نے پوچھا:

"وُہ کس طرح؟"

حضرت اعمشؒ نے فرمایا:

"اس لیے کہ میں سنت میں مصروف ہوں اور تم جھوٹ میں ہو۔ میں اعمش ہوں اور تم نے جو کچھ کہا ہے۔ میں نے تمھیں کچھ نہیں بتایا"

جب لوگوں نے حضرت اعمشؒ کی بات سنی تو قصہ گو سے ہٹ کر ان کے گرد جمع ہو گئے اور عرض کیا:

"اے ابو محمدؒ! آپ ہمیں سنائیے۔"

محمد بن ابی ہارون سے مروی ہے کہ انہیں اسحاق نے بتایا۔ فرمایا:

میں نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ نمازِ عید ادا کی۔ دیکھا تو ایک قصہ گو بدعتیوں پر لعنت کر رہا تھا اور سنت کا ذکر کر رہا تھا۔ جب ہم نے نماز ادا کر لی اور راستہ میں جا رہے تھے تو ابو عبد اللہؒ نے قصّہ گو کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

یہ عوام کے لیے کس قدر نفع بخش ہے چاہے جو وہ بیان کر رہے ہیں، وُہ جھوٹ ہی ہو۔

محمد بن جعفرؒ سے مروی ہے کہ ابو الحرثؒ نے انہیں بتایا اور انہوں نے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فرماتے سنا:

"تمام لوگوں سے بڑھ کر جھوٹا قصہ گو اور مانگتا ہے۔"

ان سے یہ بھی مروی ہے کہ فرمایا:

"لوگ ایک سچے قصہ گو کے کس قدر ضرورت مند ہیں۔ اس لیے کہ وُہ میزان اور عذابِ قبر یاد کراتے ہیں۔"

میں نے پوچھا:

"کیا آپ بھی ان کی مجالس میں جاتے ہیں؟"

فرمایا: "نہیں"۔

حضرت حبیب بن ابی ثابت نے زیاد نمیریؒ سے نقل کیا۔ وُہ فرماتے ہیں کہ:

حضرت انس بن مالک ایک کونے میں تھے۔ میں ان کے پاس حاضر ہُوا۔ انہوں نے مجھے حکم دیا:

"کوئی واقعہ بیان کرو۔"

میں نے عرض کیا:

"یہ کیونکر کروں۔ لوگ تو اسے بدعت سمجھتے ہیں؟"

انہوں نے فرمایا:

"ذکر اللہ میں سے کوئی چیز بدعت نہیں۔"

راوی بتلاتے ہیں۔ چنانچہ میں نے قصہ بیان کیا اور میرے اکثر قصے ایسے تھے کہ جن میں دعائیں ہوتیں تاکہ وہ آمین کہیں۔

راوی بتاتے ہیں کہ میں قصہ بیان کر رہا ہوتا اور وہ آمین کہتے جاتے اور گاہے دعا ہی کا قصہ بنا لیا جاتا۔

یوسف بن عطیہ نے محمد بن عبدالرحمٰن خرازؒ سے نقل کیا کہ حضرت حسنؒ نے عامر بن عبداللہ عنبری کو غائب پایا تو فرمایا:

چلو! ابو عبداللہ کی طرف چلیں۔

چنانچہ حضرت حسنؒ ان کے پاس آئے۔ حضرت عامرؒ گھر میں تھے۔ سر لپیٹ رکھا تھا اور گھر میں ریت کے سوا کچھ نہ تھا۔

حضرت حسنؒ نے فرمایا:

"اے ابو عبداللہ، کئی روز ہوئے ہم نے تمہیں دیکھا نہیں؟"

انہوں نے عرض کیا:

"میں ان مجالس میں بیٹھا کرتا تھا اور خلط ملط باتیں سُنا کرتا تھا اور میں نے اپنے بزرگوں سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سُنا کہ:

"قیامت کے روز سب سے صاف ایمان والا وہ ہوگا جو دنیا میں سب سے زیادہ رونے والا ہوگا۔ آخرت میں سب لوگوں سے زیادہ خوش وُہ ہوگا جو دنیا میں سب سے زیادہ غمگین ہوگا۔"

چنانچہ میں نے اپنے گھر کو ایسا پایا کہ اس میں قلبی خلوت کا سامان کرتا ہُوں اور اس میں رہ کر یہ معاملات کرتا ہوں۔

حضرت حسنؒ نے فرمایا:

آپ کی مراد ہماری یہ مجالس نہیں بلکہ آپ کی مراد راستوں میں واقعہ قصّہ گو لوگوں کی مجالس ہیں جوکہ اناپ سناپ اور غلط سلط باتیں پھیلاتے ہیں اور تقدّم و تاخر کرنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔

بعض علماء نے متکلمین کی تین اقسام بتائیں اور ان کے مقامات کے ساتھ ان کی نشان دہی فرمائی۔ فرمایا:

کلام کرنے والے تین قسم کے لوگ ہیں:

۱۔ کرسیوں والے۔ یہ قصّہ گو لوگ ہیں۔

۲۔ ستونوں والے۔ یہ فتویٰ دینے والے حضرات ہیں۔

۳۔ کونوں میں بیٹھنے والے۔ یہ اہل معرفت ہیں۔

چنانچہ علمائے ربانی اور اہل توحید و معرفت کی مجالس ہی ذکر اللہ کی مجالس ہیں اور انہی کی فضیلت میں روایات آتی ہیں۔

حدیث میں آتا ہے:

"اللہ تعالیٰ کے سیر کرنے والے فرشتے ہوا میں ہیں جو مخلوق کے کاتب فرشتوں سے علاوہ ہیں۔ جب وُہ مجالسِ ذکر کو دیکھتے ہیں تو ایک دُوسرے کو آواز دیتے ہیں۔ آؤ! تمھارا مطلوب یہ ہے۔ پھر وُہ ان کی طرف آتے ہیں۔ ان کے پاس بیٹھ جاتے ہیں انہیں گھیر لیتے ہیں اور ان کا (کلام) سنتے ہیں۔ یاد رکھو، سو اللہ تعالیٰ کو یاد کرو اور ایام اللہ کا ذکر کرو۔"

حضرت وہب بن منبہ یمانیؒ فرماتے ہیں:

"جس مجلس میں علمی مباحثہ ہو رہا ہو۔ میرے نزدیک اسی قدر نماز (نفل) سے افضل ہے شاید ان میں سے ایک آدمی کوئی کلمہ سن کر ایک سال یا جب تک اس کی عمر باقی ہے فائدہ حاصل کرے۔"

حضرت احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے مجالسِ ذکر اور ان کی فضیلت کے بارے میں پُوچھا گیا تو انہوں نے ان کی ترغیب دی اور فرمایا:

"اس بات سے زیادہ کیا چیز اچھی ہو سکتی ہے کہ لوگ جمع ہو کر اللہ عزّ و جل کا ذکر کریں اور اپنے اوپر اس کے انعامات کا شمار کریں جیسے کہ انصار نے کہا۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے مروی ہے:

"مجھے اس سے مسرّت نہیں ہوتی کہ اللہ تعالیٰ مجھے بچپن میں موت دے کر جنّت کے بلند ترین درجات عطا فرما دیتا۔"

اس کا سبب دریافت کیا گیا تو فرمایا:

"اس لیے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے زندہ رکھا۔ آخر کار مجھے اس کی معرفت حاصل ہوگئی۔" (یعنی معرفت سے محرومی بہت بڑی نعمت سے محرومی بن جاتی)

حضرت مالک بن دینارؒ فرماتے ہیں:

"لوگ دنیا سے چلے گئے مگر اس میں ایک عمدہ چیز نہ چکھی۔"

پوچھا گیا:

"وہ کیا چیز ہے؟"

فرمایا: "معرفت"۔

پھر یہ اشعار پڑھے:

اِنَّ عِرْفَانَ ذِی الْجَلَالِ لِعِزٌّ وَ ضِیَاءٌ وَ بَهْجَةٌ وَ سُرُوْرٌ

بے شک خدائے ذوالجلال کی معرفت عزت ہے اور روشنی، فرحت و سرور ہے

وَعَلَی الْعَارِفِیْنَ اَیْضاً بَهَاءٌ وَعَلَیْهِمْ مِنَ الْمَحَبَّةِ نُوْرٌ

اور اہل معرفت پر یہ بات رونق ہے اور ان پر یہ بات محبت کا نور ہے

فَهَنِیْئاً لِمَنْ عَرَفَكَ اِلٰهِیْ هُوَ وَاللّٰهِ دَهْرُهُ مَسْرُوْرٌ

اے اللہ جس نے تیری معرفت حاصل کی اسے مبارک۔ اللہ کی قسم وہ ایسا ہے کہ اس کی ساری عمر مسرت ہے

حضرت یحییٰ بن معاذ رازیؒ نے فرمایا:

"دنیا میں ایک جنت ہے۔ جو اس میں داخل ہُوا وہ کسی دوسری چیز کا مشتاق نہیں ہوتا اور نہ ہی اسے وحشت ہوتی ہے۔"

پوچھا گیا:

"وہ کون سی جگہ ہے؟"

فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کی معرفت۔"

ایک دوسرے بزرگ فرماتے ہیں:

"عارف پر تمہیں ہمیشہ تین باتوں میں سے ایک ضرور نظر آئے گی۔ اس پر وقار ہوگا یا حلاوت یا انس چھایا ہوگا۔"

ہمارے عالم ابو سہل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"علماء، زاہد اور عابد حضرات نکلے مگر ان کے قلوب قفل زدہ تھے اور صرف صدیقین اور شہداء کے قلوب کھلے۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ۔ (اور اسی کے پاس ہیں غیب کی کنجیاں، ان کو کوئی نہیں جانتا اس کے سوا)

یعنی معرفت کی کنجیاں اور عین توحید کی شہادت سے مقفل ہیں چنانچہ یہ مجالس ذکر قدیم دور سے ہی اہل معرفت اور علمائے قلوب اور علمائے باطن کی مجالس تھیں اور یہی حضرات ہی دین میں فقاہت کے مالک اور علمائے آخرت ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ [1] (سو کیوں نہ نکلے ہر فرقہ میں سے ایک حصہ، تاکہ وہ دین میں سمجھ پیدا کریں)

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فقہ کا ذکر فرمایا جو کہ قلبی صفت ہے اور خوف جو کہ فقہ کا باعث ہے اور علم ظاہر میں علم عقل داخل ہے اور یقین میں علم باللہ داخل ہے۔" جیسے کہ حدیث میں مروی ہے:

"یقین سارا ایمان ہی ہے۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ۔ (اور اسے صرف علماء ہی سمجھتے ہیں)

چنانچہ عقل کو علم کا ایک وصف بتایا اور جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم طلب کرنے کا حکم دیا۔ اسی طرح آپؐ نے یقین سیکھنے کا بھی حکم دیا۔ چنانچہ یہ حدیث اسی سے مخصوص ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کہ "یقین سیکھو" خواص کے لیے ہے۔ اس لیے کہ یقین کا درجہ علم سے بالاتر ہے اور آپؐ کا یہ فرمان کہ "علم طلب کرنا فرض ہے۔" عوام کے لیے ہوا اور "یقین سیکھو" کے حکم میں اہل یقین کی مجلس میں حاضری کا حکم بھی پایا گیا۔ اس لیے کہ یقین خود بخود تو آیا نہیں کرتا بلکہ یہ اہل یقین کے پاس ہی پایا جاتا ہے۔ اس لیے انہی کو حکم دیا اور یہ نہیں فرمایا:

"علم معقول سیکھو، علم فتویٰ سیکھو۔" حالاں کہ قدیم زمانہ سے ہی علمائے ظاہر کو مفتی کہا جاتا رہا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بھی اسی قبیل سے ہے کہ:

---

[1] سورۃ توبہ - آیت ۱۲۲ -

"اپنے دل سے فتویٰ لو، چاہے تجھے مفتی فتویٰ بھی دیں"۔ یعنی آپؐ نے اسے قلبی فقاہت کی طرف راجع کیا اور مفتیوں کے فتویٰ سے ہٹا دیا۔ اب اگر اس کو قلبی فقاہت حاصل نہ ہو سکے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اسے غیر فقیہ چیز کی جانب رہنمائی نہ فرماتے اور اگر علم باطن، علم ظاہر پر فیصل نہ ہوتا تو آپؐ اسے علوم ظاہر سے ہٹا کر علم باطن کی جانب جانے کا حکم نہ فرماتے۔ اور یہ بھی جائز نہیں کہ ایک آدمی کو بلند پایہ فقیہ سے ہٹا کر کم درجہ فقیہ کی طرف لے جایا جائے اور یہ کیونکر ہو سکتا تھا۔ دیکھیے حدیث میں کس قدر تاکید و شدت کے ساتھ فرمایا:

اپنے قلب سے فتویٰ لو، چاہے تجھے فتویٰ دیں، تجھے فتویٰ دیں"۔

یہ اسی کے لیے مخصوص ہے جو صاحبِ قلب ہو، سماعت رکھے اور اسے مشاہدہ حاصل ہو، شہوات سے محفوظ ہو، اس لیے کہ فقہ، لسانی وصف کا نام نہیں۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَهُمْ قُلُوبٌ لَا يَفْقَهُونَ بِهَا۔ (ان کے دل ہیں مگر ان کے ساتھ نہیں سمجھتے)

اب جس کا قلب سمیع کے ساتھ سننے والا اور شہید کے ساتھ حاضر ہو وہ خطاب کی فقاہت حاصل کرتا ہے اور وہی جب سنتا ہے تو سمجھتا اور انابت اختیار کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"تاکہ وہ دین میں فقاہت حاصل کریں"۔

اب فقہ سے دو اوصاف معلوم ہوئے:

۱۔ ڈرانا۔ یہ دعوت الی اللہ میں ایک مقام ہے اور ڈرانے والا وہی ہوتا ہے جو خوف دلائے اور خوف وہی دلاتا ہے جو خود خائف اور ڈرنے والا ہو اور خائف ہی عالم ہوتا ہے۔

۲۔ پرہیزگاری۔ یہ معرفت ربانی کے باعث ایک حال کا نام ہے۔ یہ اس کے ڈر سے پیدا ہوتا ہے۔ فقہ اور فہم دونوں کا ایک مطلب ہے۔ عرب کہا کرتے ہیں۔ فقہت یعنی فہمت (میں سمجھ گیا) اللہ تعالیٰ نے علم و حکمت پر فہم کو بلند درجہ دیا اور قضاء و احکام پر افہام کو بڑا درجہ دیا۔ فرمایا:

فَفَهَّمْنَاهَا سُلَيْمَانَ۔[1] (پھر سمجھا دیا ہم نے وہ فیصلہ سلیمانؑ کو)

چنانچہ انہیں فہم کے باعث ممتاز و منفرد بنایا۔ انہیں اپنے والدؑ کے ساتھ حکم و علم میں شریک کرنے کے بعد اس امر میں فضیلت بخشی۔

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما نے اللہ تعالیٰ کی جانب ہدایت دینے والے علماء کی فضیلت بیان کی۔ جو کہ اللہ کی معرفت سکھاتے ہیں۔ انہیں علماء کا نام دیا اور اپنی کلام میں اسے علم قرار دیا جو کہ اشعار ہیں ان سے

---

[1] سورۂ انبیاء۔ آیت ۷۹۔

مروی ہے۔ نیز یہ اشعار حضرت علی کرم اللہ وجہہ' سے مروی ہیں۔ فرمایا:

مَاالْفَخْرُ اِلَّا لِاَهْلِ الْعِلْمِ اِنَّهُمْ ۔ عَلَی الْهُدٰی لِمَنِ اسْتَهْدٰی اَدِلَّآءٗ

صرف اہلِ علم کو فخر ہے بے شک وہ ہدایت پر ہیں اور جو ہدایت کا طالب ہے اس کے رہنما ہیں۔

وَ وَزن کل امرءٍ مَا کان یَحْسِنَهٗ والجاھلون لاھل العلم اعداءٗ

اور ہر آدمی کا درجہ اس کا حسن ہے اور جاہل لوگ علماء کے دشمن ہوتے ہیں۔

جو عالم ہو وہ معلوم یعنی حق سبحانہٗ و تعالیٰ کی معرفت رکھتا ہے۔ اب اس سے کون افضل ہو سکتا ہے؟ اور اس کی کیا قیمت لگائی جا سکتی ہے؟ اس لیے کہ ہر علم کی قیمت اس کا معلوم ہے اور ہر عالم کا درجہ اس کا علم ہے۔

امام زاہدین شیخ عبدالواحد بن زیدؒ اسی مفہوم کا کلام فرماتے ہیں۔ اس میں وہ علمائے ربانیین کو فرد بتاتے ہیں۔ اور ان کے طریق کو ہر طریق پر فوقیت دیتے ہیں۔ فرمایا:

الطرق شتی و طرق الحق مفردۃ و السالکون طریق الحق افراد

راہیں مختلف ہیں اور حق کی راہیں مفرد ہیں اور راہِ حق کے سالک فرد ہیں۔

لا یعرفون و لا تسلک مقاصدھم فھم علی مھل یمشون تصاد

وہ پہچانے نہیں جاتے اور تو ان کے مقاصد پر نہیں چلتا وہ سکون سے اعتدال کے طریق پر چلتے ہیں۔

و الناس فی غفلۃ عما یراد بھم فجعلھم عن سبیل الحق رقاد

اور لوگ ان کی مرادات سے غافل ہیں اس لیے انہیں راہِ حق سے سونے والے قرار دے دیا۔

حضرت ابن مسعودؓ کے بارہ میں مروی ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو فرمایا:

"میں سمجھتا ہوں کہ اس مردِ خدا کے انتقال سے علم کے دس حصوں میں سے نو حصے ختم ہو گئے۔"

ان سے پوچھا گیا:

"آپ ایسی بات کر رہے ہیں حالاں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ ابھی کثرت سے زندہ ہیں۔"

فرمایا:

"میری مراد وہ علم نہیں جو تم سمجھ رہے ہو، میری مراد علم باللہ سے ہے۔"

حضرت ابن مسعودؓ فرمایا کرتے:

"متقی وقفہ وقفہ کے بعد آتے ہیں۔" اسی طرح فرمایا کرتے:

"متقی سردار ہیں اور علماء قائد ہیں اور ان کی ہمنشیں زیادت (در ایمان) ہے۔ یعنی متقی تمام لوگوں کے سردار ہیں جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ (بے شک تم میں سے بڑا عزت والا وہی ہے جو زیادہ ڈرنے والا ہے)

اور علمائے کرام متقیوں کے سردار ہیں یعنی ان کے امام ہیں اور ان کے نشانات و مرویات کا اتباع کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا۔ (اور ہمیں متقیوں کا امام بنا دے)

چنانچہ علماء کو اہلِ تقویٰ پر فضیلت بخشی اور انہیں ان کا امام بنایا۔ اب متقی لوگ ان کے اصحاب ہوئے اور یہ بھی بتایا کہ غیر علماء متقی لوگوں کی مجلس سے زیادہ ان (علماء) کی مجلس میں زیادتی ایمان نصیب ہو گی۔ اس لیے کہ ہر عالم متقی تو ہوتا ہی ہے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر متقی عالم بھی ہو جیسے کہ اس مفہوم کی روایت ہے کہ "علماء کثرت سے ہیں اور علماء میں سے حکماء قلیل ہی ہیں اور صالحین کثرت سے ہیں اور صالحین میں سے صادقین، قلیل ہی ہیں۔"

حضرت ابن مبارکؒ سے دریافت کیا گیا:

"لوگ کون ہیں؟"

فرمایا: "علماء"

پوچھا گیا: "تو بادشاہ کون ہیں؟"

فرمایا: "زاہد حضرات۔"

پوچھا گیا:

"احمق کون ہے؟"

فرمایا: "جو اپنے دین کے عوض کھاتا ہے۔"

ایک روایت میں ہے کہ ایک بار فرمایا:

"جو کپڑے پہن کر مانگتے ہیں اور گواہیوں کے لیے پیش ہوتے ہیں۔"

ایک بار فرقد سنجیؒ نے حضرت حسنؒ کو ایک سوال کے جواب میں کہا:

ل سورۃ حجرات آیت ۱۳۔

"اے ابوسعید، فقہاء کو آپ سے اختلاف ہے"۔

فرمایا:

"فرقد، تیری ماں تجھے روئے۔ کیا تم نے اپنی آنکھوں سے فقہاء دیکھے بھی ہیں؟ فقیہ وُہ ہوتا ہے جو دُنیا میں زاہد اور آخرت میں رغبت کرنے والا ہو، اپنے دین پر بصیرت رکھے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں ہمیشہ معروف رہے۔ متقی ہو، مسلمانوں کی عزتوں سے کھیلتا نہ ہو۔ ان کے اموال سے بچا رہے اور اپنی جماعت کو نصیحت کرنے والا ہو"

ہم نے تین مختلف روایات سے ان کا یہ قول مکمل کر کے لکھ دیا ہے۔ یہ علمائے ربانیین کی صفات ہیں اور یہی حضرات عارفین ہیں۔

عبداللہ بن احمد بن حنبلؒ نے بتایا کہ میں نے اپنے والد رحمۃ اللہ علیہ سے پُوچھا،

"ہمیں معلوم ہُوا ہے کہ آپ حضرت معروفؒ کے پاس کثرت سے جایا کرتے تھے۔ کیا ان کے پاس حدیث ہے؟"

انہوں نے جواب دیا:

"بیٹا! ان کے پاس اصل معاملہ یعنی تقویٰ اور پرہیزگاری تھا"۔

امام احمد رضی اللہ عنہ سے پُوچھا گیا:

"ان ائمہ کرام کا ذکر و وصف کس چیز سے ہُوا؟"

فرمایا: "وہاں صرف صدق ہی تھا جو ان میں پایا جاتا تھا"۔

پوچھا گیا: "صدق کیا ہے؟"

فرمایا: "اخلاص"۔

پوچھا گیا: "اخلاص کیا ہے؟"

فرمایا: "زہد"

پُوچھا گیا: "زہد کیا ہے؟"

اس پر اُنہوں نے سر نیچے کیا، پھر فرمایا:

"زاہدین سے پوچھو، بشر بن حرث سے پوچھو"۔

منصور بن عمار کے بارے میں بشر رحمۃ اللہ علیہ نے عجیب عجیب حکایات بیان کیں۔ منصور بن عمار واعظ تھے اور اپنے دور میں بشرؒ، احمدؒ اور ابو ثورؒ جیسے علماء کی طرح عالم نہ تھے۔ لوگ ان کو عالم سمجھتے اور علماء ان کو

قصہ گو سمجھتے۔

نصر بن علی جہنی کے بارے میں مروی ہے کہ ایک روز اس نے حد سے زیادہ مزاح کیا۔ اس سے کہا گیا:

"ایسی باتیں کرتے ہو حالاں کہ تم علماء میں سے ہو؟" تو جواب دیا:

"میں نے ہر عالم کو مزاح کرتے دیکھا ہے"۔ کسی نے کہا:

"تم نے بشر بن حرثؒ کو دیکھا۔ کبھی ان سے مزاح کی بات سُنی؟"

اس نے کہا، "ہاں ایک روز میں ان کے ہمراہ ایک راستہ پر بیٹھا ہُوا تھا تو منصور بن عمار دوڑتا ہُوا آیا اور کہا:

"اے ابو نصر، امیرِ وقت نے حکم دیا ہے کہ علماء اور صالحین کو جمع کیا جائے تو کیا خیال ہے کہ میں چھپ جاؤں؟"

حضرت بشرؒ نے اسے دھکا دے کر فرمایا:

"ہم سے دُور ہو جا، اپنے سر کی آفت ہم پر ڈالتا ہے کہ ہم مریں۔"

علمائے سلفؒ کے نزدیک قصہ گو لوگوں کا یہ مقام تھا۔ آخر یہ علم ختم ہُوا اور مجالسِ ذکر اور علومِ یقین و معاملات معدوم ہو گئے۔ ہاں چند لوگ جو متقدمین کی سیرت اور اسلاف کی راہ سے آگاہ ہیں۔ وہی ذکر اور قصہ گوئی کی مجالس میں امتیاز کر سکتے ہیں انہیں ہی علماء اور متکلم، علم لسان اور فقاہتِ قلبی کے درمیان فرق معلوم ہے اور وہی علمِ یقین اور علمِ عقل میں امتیاز سمجھتے ہیں۔

عالم اور قصہ گو میں فرق

اس لیے کہ عالم اور قصہ گو میں یہ امتیاز ہے کہ عالم خاموش رہتا ہے۔ جب پُوچھا جائے تب کلام کرتا ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ اسے سمجھائے۔ اس کے مطابق جواب دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر جو حقیقت منکشف فرمائے۔ وُہ اس کے مطابق زبان کھولتا ہے اور اگر خاموش رہنا افضل ہو تو افضل بات کو سمجھنے کے باعث وُہ خاموش رہتا ہے اور اگر علم کا اہل نہ دیکھے تو اہل آدمی کا انتظار کرتا ہے اور علم کو اہل ہی کے پاس رکھتا ہے اور اہل وُہ ہے جو اسے پہچانے اور اس کے مشاہدہ و وجدان میں اس کا حصہ ہو۔ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے فرمایا:

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (تو سوال اہل ذکر سے پوچھو۔ اگر تم نہیں جانتے)

اس میں دو مفہوم ہیں:

۱۔ علمائے ربانیین ہی اہل ذکر ہیں۔ اس لیے کہ فرمایا:

اِنۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ (اگر تم نہیں جانتے)

اس لیے یہ کہنا جائز نہیں کہ "جو نہ جانتا ہو اس سے پوچھو" اس لیے کہ نہ جاننے والے جہلا ہیں اور ایسا کرنے سے جہالت میں اضافہ ہوگا۔

۲۔ دُوسرے معنی سے معلوم ہوتا ہے کہ علماء خاموش ہیں۔ جب ان سے پوچھا جائے تو ان پر کلام کرنا واجب ہوتا ہے اس لیے جو نہیں جانتا اس کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاسۡئَلُوۡا (سو پوچھو)

اس سے معلوم ہُوا کہ علماء کی مجالس ہی مجالسِ ذکر ہیں جن کے بارے میں فضائل مروی ہیں۔ اس میں غور کرنے سے پتہ چلا کہ یہی جن سے سوال کیا جارہا ہے (یعنی علماء) ہی اہل ذکر ہیں، جن سے سوال کیا۔ انہی کے لیے لعلھم یتذکرون کا فرمان ساتھ لگایا۔ جب جدا کلام کو ان کے لیے ساتھ لگایا تو اللہ تعالیٰ کے وعدہ سے انہیں نصیحت حاصل ہُوئی۔ جب انہیں نصیحت ملی تو یہ عالم ہُوئے۔ اب لوگوں کو حکم ہُوا کہ ان سے پُوچھو۔

یہی وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"جاہل کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اپنی جہالت پر برقرار رکھے۔ اور نہ ہی عالم کے لیے مناسب ہے کہ اپنے علم پر چپ سادھ لے۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاسۡئَلُوۡا اَهۡلَ الذِّکۡرِ اِنۡ کُنۡتُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ۔ (سو اہل ذکر سے پوچھو، اگر تم نہیں جانتے)

اس طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ حدیث اہل بیت کی سند سے مروی ہے کہ:

"علم خزانے ہیں ان کی کنجیاں پوچھتے رہنا ہے۔ اس لیے سوال کیا کرو اس میں چار کو اجر ملے گا:

۱۔ سوال کرنے والے۔

۲۔ عالم۔

۳۔ سننے والے۔

۴۔ ان سے محبت رکھنے والے کو۔

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں:

"جو آدمی ہر اس سوال میں فتویٰ دیتا ہے۔ جو لوگ اس سے پوچھتے ہیں تو وہ دیوانہ ہے۔"

حضرت اعمشؒ نے فرمایا:

"بعض کلام ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا جواب خاموشی ہے"

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"اہلِ صدق حضرات کا حسنِ سوال، عارفین کے دلوں کی کنجیاں ہیں" اور جو آدمی قصہ گو ہو، کلام کرے اور خبریں بتانا شروع کر دے۔ قصے اور منقولات پیش کرنے لگ جائے۔ اس کو قاص (قصہ گو) کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہ گزشتہ واقعات کے بارے میں قصے بیان کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَقَالَتْ لِاُخْتِهٖ قُصِّيْهِ۔ (اور کہا اس نے اپنی بہن سے اس کے پیچھے چلی جا)

یعنی مجھے اس کا قصہ بتاؤ اور اس کی خبر سے آگاہ کرو۔

حضرت مالک بن انس رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"سوال کرنے سے پہلے کلام کرنا علم کو ذلیل کرنا ہے"

ایک بار فرمایا:

"ہر سوال کا جواب دینا، علم کو ذلیل کرنا ہے"

یعنی اس میں اس کی اہانت ہے۔ صوفیاء فرماتے ہیں:

"اگر کوئی آدمی سوال کرنے سے پہلے علم کی بات کرے تو اس کا دو تہائی نور ختم ہو جاتا ہے"

حضرت ابراہیم بن ادہمؒ اور دُوسرے مشائخؒ فرماتے ہیں:

"آدمی کی عزت اس میں ہے کہ جب تک اس سے پُوچھا نہ جائے تب تک جو اس کے پاس علم ہے اس پر خاموش رہے اور قسم ہے اگر وُہ سوال کے بعد کلام کرے تو وہ آقا ہوگا اور ہمیشہ ایسے باعزت رہے گا، اور گاہے کلام فرض ہو جاتا ہے اور فرائض کی ادائیگی کی ہی ضرورت ہوتی ہے (ورنہ ہر جگہ مغز نہ مارے)۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ۔ (اہل ذکر پوچھو) تو اب اگر کوئی پُوچھے تو جواب دینا لازم کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس سے علم کی بات پوچھی گئی اور اس نے چھپا لی تو اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی" یعنی اس پر سزا کی دھمکی دی اور گاہے ابتدائی کلام میں مخفی خواہشات اور دنیاوی شہوات کار فرما ہوتی ہیں۔ (اس لیے خود آغازِ کلام نہ کرے)

بعض ابدال نے ابدال کا وصف بیان کیا۔ فرمایا:

"ان کا کھانا فاقہ ہے، ان کا کلام ضرورت ہے۔ جب تک ان سے پُوچھا نہ جائے وُہ کلام نہیں کرتے۔ (پوچھنے پر) جواب دیتے ہیں۔" اور آدمی صرف پوچھنے پر کلام کرے وُہ لغو کلام اور لایعنی کلام کا مرتکب شمار نہیں کیا جاتا۔ اس لیے کہ سوال کے بعد جواب دینا، سلام کے جواب کی طرح فرض ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"میں سلام کے جواب کی طرح، سوال کا جواب دینا فرض سمجھتا ہوں۔"

حضرت ابو موسٰی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

"جس سے علم کی بات دریافت کی جائے اسے بتا دینا چاہیے اور جس سے (کچھ نہ پوچھا جائے) تو اسے خاموش رہنا چاہیے ورنہ وہ تکلّف کرنے والوں میں سے لکھا جائے گا اور دین سے نکل جائے گا۔" حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہی منقول ہے۔

سلفؒ کو ہر چیز میں تکلّف آجانے کا بہت ڈر رہتا تھا اور بعض مشائخؒ بلا ضرورت و داعیۂ ابتداءً کلام کرنے کو یا سوال سے پہلے محل دیکھے بغیر یا اہل دیکھے بغیر بولنے کو تکلّف قرار دیتے۔

حضرت ابن عباسؓ نے حضرت مجاہدؒ کو وصیت فرمائی۔ اس میں ہے کہ:

"لایعنی معاملہ میں کلام نہ کر اس لیے کہ (کلام نہ کرنا) افضل ہے اور مجھے خطرہ ہے کہ تو غلطی کر بیٹھے۔ اور ضرورت کے موقع پر اس وقت کلام کر جبکہ اس کا محل دیکھ لو، اس لیے کہ کئی ضرورت کے موقع پر بھی کلام کرنے والے غیر محل میں کلام کر کے پھنس جاتے ہیں۔"

حضرت انصاریؓ کی حدیث میں ہے کہ ان کی والدہ نے اس انصاری کی وفات کے موقع پر کہا:

"تجھے جنّت مبارک ہو، تُو نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جہاد کیا اور اللہ تعالٰی کی راہ میں قتل ہوا۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تجھے کیا خبر کہ وُہ جنّت میں ہی ہے، شاید وُہ لایعنی امور میں کلام کرتا ہو اور اس میں بخل کرتا ہو کہ جو اسے غنی (اور دولت مند) نہیں بنا سکتا۔"

اور جس نے سوال کیے بغیر علم ظاہر کیا اور نا اہل لوگوں میں پھیلایا۔ پھر لوگوں نے اس پر انکار کیا تو اس سے پرسش ہو گی اور اس سلسلہ میں اس پر مطالبہ ہو گا۔ اس لیے کہ اس نے علم ظاہر کرنے کا تکلّف کیا۔ اگر اس سے پوچھا جاتا۔ پھر اس میں کلام کرتا تو اس پر انکار ہونے کے باوجود بھی مطالبہ نہ ہوتا۔ اس لیے کہ اس نے سوال کے جواب میں یہ جواب دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ سلف صالحین اس علم میں اس وقت تک

کلام نہ فرماتے جب تک کہ ان سے سوال نہ کیا جاتا۔

حضرت ابو محمدؒ فرماتے ہیں:

"عالم خاموش بیٹھ جاتا ہے۔ اور اپنا دل اپنے آقا کی طرف مائل کر دیتا ہے وہ حسنِ توفیق میں اس کا محتاج ہوتا ہے اور اس سے دعا کرتا ہے کہ صائب فکر القاء فرمائیے۔ اب اس سے جو سوال کیا جائے گا وہ اپنے آقا کی جانب سے القاء شدہ جواب دے گا۔"

چنانچہ انہوں نے عالم کی حالتِ خاموشی اور اپنے مولائے کریم کی طرف نظر کو توکل کا محتاج اور وکیل تعالیٰ کا منتظر بتایا کہ اب کیا چیز القا ہوتی ہے۔

بعض مشائخ کا فرمان ہے:

"عالم وہ ہوتا ہے کہ جب اس سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جائے تو اسے محسوس ہو کہ اس کی داڑھ نکالی جا رہی ہے۔" ابن معتقلہ اور دوسرے مشائخؒ کا فرمان ہے:

"عالم وہ نہیں کہ لوگ اس کے گرد جمع ہو جائیں اور وہ قصے کہانیاں سنا دے۔ بلکہ وہ عالم ہے کہ جب اس سے علم کی کوئی بات پوچھی جائے تو اُسے ایسا معلوم ہو کہ اسے رائی کا سوتہ دیا جا رہا ہے۔" (یعنی اسے کوفت و غم ہو۔)

ایک روایت میں یہ حضرت اعمشؒ کا فرمان ہے۔ یہ حضرت محمد بن سوقہؒ سے حدیث پوچھتے تو وہ ان سے منہ پھیر لیتے اور کچھ جواب نہ دیتے۔

حضرت اعمشؒ رفقیہ کی طرف منہ کر کے فرمانے لگے:

"پھر وہ تیری طرح احمق ہوگا کہ میری بد اخلاقی کے باعث اپنا فائدہ ترک کر دیتا ہے۔"

محمد بن سوقہؒ نے فرمایا:

"تیرا ناس ہو، میں اسے دوا کی طرح بنانا چاہتا ہوں۔ اس کی تلخی پر صبر کر، اس لیے کہ مجھے اس کے نفع کی امید ہے۔"

حضرت علی اور ابن مسعود رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ

یہ ایک آدمی کے پاس سے گزرے وہ لوگوں کے سامنے کلام کر رہا تھا تو انہوں نے فرمایا:

"یہ کہہ رہا ہے مجھے پہچانو۔"

ایک خراسانی عالم اپنے شیخ سے روایت کرتے ہیں اور وہ ابو حفص کبیرؒ سے نقل کرتے ہیں۔ یہ وہاں حضرت جنید کے ثانی سمجھے جاتے تھے۔ انہوں نے فرمایا:

"عالم وہ ہے کہ جس سے دین کا مسئلہ معلوم کیا جائے تو وہ مغموم ہو جائے۔ حتیٰ کہ اگر اسے زخمی کیا جائے تو دہشت کے باعث اس سے خون نہ نکلے۔ اسے یہ ڈر ہے کہ دنیا میں جو سوال ہوا اس کی آخرت میں پرسش ہوگی اور اسے یہ بھی پریشانی ہوگی کہ سوال کے جواب سے چھٹکارا نہیں۔ اس لیے کہ علماء نہ پائے جانے کے باعث اس پر جواب دینا فرض ہے۔"

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما (دس میں سے) نو مسائل میں خاموش رہ جاتے اور ایک کا جواب دیتے اور فرماتے،

"کیا تم یہ چاہتے ہو کہ مجھے جہنم پر پل بنا کر اس سے گزرو اور یوں کہہ دو کہ ہمیں اس کا فتویٰ حضرت ابن عمرؓ نے دیا۔"

حضرت ابراہیم تیمیؒ سے جب کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو وہ رو دیتے اور فرماتے،

"کیا میرے بغیر تمہیں کوئی نہ ملا کہ تو اس سے پوچھ لیتا۔"

اور جب ان سے کوئی بات دریافت کی جاتی تو وہ رو دیتے اور فرماتے،

"لوگ میرے محتاج ہو گئے!"

حضرت سفیان بن عیینہؒ اپنے زمانہ میں بلند اور امتیازی علمی شان کے مالک تھے۔ اس کے باوجود اپنے بارے میں یہ شعر پڑھا کرتے،

خَلَتِ الدِّيَارُ فَسُدْتُ غَيْرَ مَسُوْدٍ ۔۔۔ وَمِنَ الشَّقَاءِ تَفَرُّدِيْ بِالسُّوْدَدِ

اوطان خالی ہو گئے اور میں نے یونہی سرداری بنا لی۔ یہ بدبختی ہے کہ میں ہی سرداری کرنے تنہا رہ گیا۔

مجالسِ علم کا منظر

حضرت ابو العالیہ ریاحی کی عادت تھی کہ دو یا تین آدمیوں کے سامنے کلام فرماتے جب چار آدمی ہو جاتے تو اٹھ جاتے۔ اس طرح ابراہیم ثوری اور ابن ادھم رحمہم اللہ تعالیٰ کی عادت تھی کہ چند آدمیوں کے سامنے کلام کرتے اور جب کثرت سے لوگ جمع ہو جاتے تو اٹھ جاتے۔ حضرت ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں عام طور پر پانچ سے دس تک آدمی ہوتے۔ ایک شیخؒ نے مجھے بتایا کہ حضرت جنیدؒ دس سے کچھ اوپر آدمیوں کے سامنے کلام فرماتے اور راوی بتاتے ہیں کہ کبھی بیس آدمی پورے نہیں ہوئے۔

ہمارے شیخ حضرت ابو الحسن بن سالمؒ کے بارے میں منقول ہے کہ ان کی مسجد میں لوگ جمع ہو گئے اور انہیں بلایا کہ آپ کے بھائی حاضر ہیں۔ آپ سے ملاقات اور کچھ نصیحت سننا چاہتے ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو تشریف لائیے۔ مسجد ان کے گھر کے دروازہ پر ہی تھی۔ وہ باہر تشریف لائے اور قاصد سے پوچھا:

"کون لوگ ہیں؟"

اس نے بتایا: کہ

" فلاں فلاں ہے اور ان کے نام لیے۔"

انھوں نے فرمایا:

"یہ میرے اصحاب نہیں ہیں بلکہ یہ اصحابِ مجلس ہیں۔" اور باہر نہ آئے گویا انھوں نے اپنے مخصوص علم کے لیے ان کو نا اہل سمجھا۔ اس لیے ان کے وقت کی خاطر اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔ اسی طرح ایک عالم کی خلوت اسے عزیز ہوتی ہے۔ اگر اسے خاص اصحاب مل جائیں تو خلوت پر انہیں ترجیح دیتا ہے اور ان کی مجلس ان کے لیے اضافۂ ایمان کا باعث بنتی ہے اور اگر مناسب اصحاب نہ مل سکیں تو اپنی خلوت پر دوسروں کو ترجیح نہیں دیتا ورنہ بے کار لوگوں کا کھلونا بن کر رہ جائے گا۔

ابن سالم ابوالحسنؒ اپنے بھائیوں کے پاس آتے جن کو اپنے علم کے اہل سمجھتے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر مذاکرہ کرتے۔ گاہے دن کو اور گاہے رات کو بھی ان کے پاس تشریف لائے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اہل نظر کے درمیان مذاکرہ ہوتا ہے اور بھائیوں کے درمیان محادثہ ہوتا ہے اور علم کی خاطر نشست اصحاب علم کے لیے ہوتی ہے اور سوال کا جواب دینا عوام کا حصّہ ہے۔

اس علم کے جاننے والوں کے نزدیک یہ مسئلہ ہے کہ ان کا علم مخصوص ہے اور خواص کے قابل ہے اور خواص بہت کم ہیں اور اہل لوگوں کے سامنے ہی اس پر زبان کھولتے اور یہ سمجھتے کہ یہ اہل آدمی کا حق ہے اور ان پر حق کی ادائیگی لازم ہے جیسے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اپنے فرمان میں وضاحت کی:

"حتیٰ کہ اسے ان کی ہم مثل لوگوں میں امانت رکھو اور ہم شکل قلوب میں اس کی کھیتی کرو۔" حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس سلسلہ میں احکام مروی ہیں۔

نا اہل کے سامنے حکمت نہ رکھو

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں:

" نا اہل کے پاس حکمت نہ رکھو ورنہ تم اس حکمت پر ظلم کرو گے اور اہل آدمی سے اسے نہ روکو، ورنہ تم اُن پر ظلم کرو گے۔ ایک نرم مزاج طبیب کی طرح ہو جاؤ۔ جو مرض کی جگہ پر ہی دوا رکھتا ہے۔"

دُوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"جس نے نا اہل کے پاس حکمت رکھی اس نے جہالت کی۔ اور جس نے اہل سے اسے روکا اس نے ظلم کیا۔ حکمت کے لیے ایک حق ہے اور اس کا ایک اہل ہے اور اس کے اہل کا بھی حق ہے۔ اس لیے ہر

حقدار کو اس کا حق ادا کرو۔"

حضرت عیسٰی صلوٰت اللہ وسلامہٗ علیہ نے فرمایا:

"خنازیر کی گردنوں میں جواہرات نہ لٹکاؤ اور حکمت، جوہر (موتی) سے بھی بہتر ہے۔ جس نے اس کو ناپسند کیا وہ خنزیر سے بدتر ہے۔"

اس گروہِ صوفیاء میں سے ایک بزرگؒ فرماتے ہیں:

"یہ نصف علم خاموشی ہے اور نصف یہ ہے کہ تو یہ سمجھے کہ اسے کہاں رکھے؟"

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"جس نے اپنے علم اور اپنی عقل کے درجہ پر لوگوں کو خطاب کیا اور ان کی حدود کے مطابق ان سے مخاطب نہ ہُوا۔ اس نے ان کا حق برباد کیا اور ان میں اللہ تعالیٰ کا حق قائم نہ کیا۔"

حضرت یحییٰ بن معاذؒ فرماتے ہیں:

"اپنی نہر میں ہر ایک کو چلو بھرنے دے مگر اس کے پیالہ سے اسے پلا۔" اور ہم اس مفہوم کو یوں ادا کرتے ہیں۔

"ہر بندے کیلئے اس کے عقلی معیار پر تول اور اس کے علمی درجہ پر اس کا درجہ رکھ تاکہ تو اس سے محفوظ رہے اور وہ تجھ سے نفع حاصل کر سکے اور اگر اختلافِ معیار ہُوا تو انکار ہو گا۔"

ہمارے اس گروہ کے ایک بزرگؒ نے ابو عمرانؒ سے نقل کیا، وہ مکی تھے، فرمایا: کہ میں نے ان کو سُنا، یہ ابو بکر کتانیؒ کو فرما رہے ہے اور وہ تمام فقراء کو یہ علم بخشتے ہیں خوب سخاوت کیا کرتے۔ حضرت ابو عمرانؒ نے انہیں ٹوکا اور اس سلسلہ میں سخاوت اور کثرتِ کلام سے منع فرمایا اور کہا:

"میں بیس برس تک اللہ تعالیٰ سے اس علم کے بھُول جانے کی دعا کرتا رہا۔"

پوچھا: "یہ کیوں؟"

فرمایا: میں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور آپؐ کو یہ فرماتے سنا:

"ہر چیز کی اللہ تعالیٰ کے ہاں حرمت ہوتی ہے اور حکمت کی حرمت تمام چیزوں سے بڑی ہے جس نے اسے نااہل کے سامنے رکھا۔ اللہ تعالیٰ اس سے اس کے حق کا مطالبہ کرے گا اور جس سے مطالبہ ہوا اس سے خصومت ہُوئی۔"

بعض سلفؒ فرماتے ہیں:

"اگر ایک آدمی ستون کا سہارا لے۔ یہ چاہے کہ لوگ اس سے کچھ پوچھیں تو اس کے پاس مت بیٹھو،

اور نہ ہی اس سے پوچھنا مناسب ہے۔"
سلف صالحین کی مجالس میں شاذ و نادر ہی ایسی مجالس کے اندر بیس یا تیس آدمی موجود ہوتے بلکہ زیادہ تر چار سے لے کر دس آدمی اور دس سے کچھ زیادہ ہی ملتے۔

مگر اس کے مقابلہ میں حضرت حسنؒ کے زمانہ سے ہی آج تک کے دور تک قصہ گو لوگوں کی مجالس میں سینکڑوں آدمی بیٹھے ہوتے ہیں۔ ان دونوں میں یہی فرق ہے کہ علم، قلیل لوگوں کے لیے مخصوص ہے اور قصے اور کہانیاں عام لوگوں کے لیے ہوتی ہیں۔

ایک عالمؒ فرماتے ہیں:

"بصرہ میں ایک سو بیس آدمی وعظ و نصیحت کیا کرتے مگر ان میں سے معرفت و یقین اور مقامات و احوال کے بارے میں صرف چھ اللہ کے بندے کلام کرتے تھے۔ ابو محمد سہلؒ، صبیحیؒ اور عبدالرحیمؒ ان چھ میں سے تھے۔

مشائخ کا قول ہے کہ:

"جو آدمی عالم کے سکوت سے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ وہ اس کی کلام سے بھی فائدہ حاصل نہیں کرتا۔" یعنی عالم کے سکوت اور اس کے خشوع و تقویٰ سے ادب سیکھنا چاہیے اور اس سلسلہ میں اس کے یقین کا اقتدار کرے جیسے کہ اس کی زبان اور کلام سے اس کا اتباع کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مشائخ فرمایا کرتے:

"علم ظاہر علم ملک سے ہے اور علم باطن علم ملکوت سے ہے۔" یعنی یہ علم دنیا سے ہے اس لیے کہ دنیاوی امور میں علم ظاہر کی ضرورت پیش آتی ہے اور (معرفت و یقین کا) علم اخروی علم ہے اور وہیں کا یہ زادِ راہ ہے جیسے کہ صوفیاؒ نے فرمایا:

"اس لیے کہ زبان ظاہر ہے۔ اس لیے وہ فرشتہ سے ہے اور وہ علمِ ظاہر کا خزانہ ہے اور دل ملکوت کا خزانہ ہے اور یہ علمِ باطن کا دروازہ ہے۔ اس لیے علمِ باطن کی علمِ ظاہر پر ایسی ہی فضیلت ہوئی جیسے کہ ملکوت کو ملک پر فضیلت ہے اور (ملکوت) دراصل باطن کا مخفی فرشتہ ہے یا جیسے کہ دل کو زبان پر فضیلت حاصل ہے اور زبان ظاہر اور واضح ہے۔

حضرت بشر بن حرثؒ فرمایا کہتے کہ

حدثنا اور اخبرنا (ہمیں بتایا اور خبر دی) ابوابِ دنیا میں سے ہے۔ (یعنی اس کے ذریعہ بعض لوگ دنیا طلب کرتے ہیں)

اور ایک بار فرمایا:

"حدیث، زادِ آخرت میں سے نہیں۔" (جبکہ دنیا طلبی کے لیے حاصل کی جائے)

ہمارے ایک بزرگ نے اپنے بعض اصحاب سے نقل کیا۔ فرمایا،

"ہم نے دس سے زیادہ ٹوکرے اور مشکیزے کتابیں دفن کر دیں اور ان میں سے کچھ روایت نہ کیا۔ سوائے اس کے کہ نادر طور پر اس سے سن لیا۔"

نیز وُہ فرمایا کرتے ؛

"میں حدیث بیان کرنا چاہتا ہوں اور اگر مجھ سے حدیث کی شہوت چلی جائے تو میں حدیث بیان کروں[1]۔"

پھر فرمایا:

"میں چالیس برس سے اپنے نفس سے مجاہدہ کر رہا ہوں۔"

اور فرمایا ؛

"جب تم کسی آدمی کو سنو کہ وہ کہہ رہا ہے۔ حدثنا اور اخبرنا (ہمیں بتایا اور ہمیں خبر دی) تو یُوں سمجھو کہ وُہ کہہ رہا ہے۔ میاں میرے لیے جگہ فراخ کر دو (میں بڑا عالم فاضل ہوں) یہ بہت ہی عالم و زاہد تھے۔"

فرماتے ہیں ؛

"جب تجھے حدیث بیان کرنے کی خواہش پیدا ہو تو حدیث بیان نہ کر اور جب خواہش پیدا نہ ہو تو حدیث بیان کر۔"

حضرت رابعہ عدویہ رحمہا اللہ تعالیٰ نے حضرت ثوریؒ کو فرمایا ؛

"سفیانؒ ایک اچھا آدمی ہے۔ بشرطیکہ حدیث بیان کرنے کی محبت نہ رکھے[2]۔"

اور فرمایا کرتیں ؛

"حدیث کا ابتلاء، مال اور بچے کے ابتلاء سے زیادہ سخت ہے۔"

ایک بار فرمایا ؛

"کاش! وُہ دنیا سے محبت نہ کرے یعنی حدیث کے لیے لوگوں کا اپنے گرد جمع ہونا پسند نہ کرے۔"

حضرت ابوسلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؛

"جس نے نکاح کیا یا (دنیا کے لیے) حدیث لکھی یا طلبِ معاش کی وُہ دنیا کی طرف مائل ہو گیا۔"

---

[1] یعنی احتیاط و ورع کا یہ عالم تھا کہ حدیث بیان کی خواہش کو شہوت سے تعبیر کر کے اسے دنیاوی اور نفسانی چیز سمجھ رہے ہیں اور اس سے بھی پرہیز کرنے کی کوشش فرماتے ہیں۔

[2] یعنی دنیا یا جاہ حاصل کرنے کی خاطر حدیث بیان نہ کرے۔ (مترجم)

اس گروہ کے ایک بزرگؒ فرماتے ہیں :

"جس نے علم باللہ کے علاوہ علوم حاصل کیے اس نے خود تدارک کیا اور جس نے علم باللہ حاصل کیا اس کا تدارک کیا گیا۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی :

لَوْ لَا اَنْ تَدَارَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ لَنُبِذَ بِالْعَرَآءِ۔ (اگر نہ سنبھالتا اس کو احسان تیرے رب کا تو پھینکا گیا ہی تھا چٹیل میدان میں)

یعنی خواہش کے بعد میں گرنے کے بعد علم معرفت کے ذریعہ اس کا تدارک ہوا اور عَرَآء کا معنی : بُعد ہے اور علم یقین کے مقابلہ میں علم معقول بُعد ہی ہے۔ اور اس آیت

وَلَوْ لَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ ۔[۱] (اور اگر یہ نہ ہوتا کہ ہم نے تجھ کو ٹھہرا رکھا تو تُو لگ ہی جاتا جھکنے ان کی طرف تھوڑا سا)

کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا :

یعنی ہم نے تجھے معرفت کے ذریعہ ثابت قدم کیا ورنہ تو علوم عقل کی طرف سکون حاصل کرنے لگا۔

حضرت سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تشریح کی۔ فرمان یہ ہے :

وَاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا ۔[۲] (اور بنا دے مجھ کو اپنے پاس سے ایک حکومت کی مدد)

فرمایا :

"کہ ایسی زبان عطا فرماؤ جو تجھ سے کلام کرے اور تیرے غیر سے کلام نہ کرے۔"

علم باللہ اور ایمان و یقین کے علم کی احکام و قضایا کے علم پر ایسی فضیلت ہے جیسے کہ مشاہدہ کو خبر پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا :

"خبر، (معاینہ) دیکھنے کی طرح نہیں ہوتی۔"

اور دُوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں :

"خبر، معائنہ (دیکھی ہُوئی) کی طرح نہیں ہوتی۔"

حضرت عیاض رضی اللہ عنہ بن غنم نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ کی تفسیر میں نقل کیا کہ :

---

[۱] بنی اسرائیل آیت ۷۴

[۲] بنی اسرائیل آیت ۸۰۔

"علم یقین آنکھ کے دیکھنے کی طرح ہے۔"

علم معرفت کی اہمیت

اور اس حدیث میں بھی آتا ہے کہ:

"میری امت کے بلند پایہ لوگوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہے کہ وہ ان پر اپنے رب تعالیٰ کی وسعتِ رحمت سے ظاہر میں ہنستے ہیں اور اس کے عذاب کے ڈر سے باطن میں روتے ہیں۔ ان کے قدم زمین پر ہیں اور ان کے قلوب آسمان میں ہیں۔ ان کی رُوحیں دنیا میں ہیں اور ان کی عقلیں آخرت میں ہیں۔ سکینت کے ساتھ چلتے ہیں اور وسیلہ کے ساتھ تقرب حاصل کرتے ہیں۔"

چنانچہ فتویٰ دراصل خبر دینا ہے اور استفتاء خبر حاصل کرنا ہُوا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان اسی سے ہے:

فَاسْتَفْتِهِمْ (سوان سے فتویٰ لے)

اور فرمایا:

وَ يَسْتَفْتُوْنَكَ (اور تجھ سے (فتویٰ) معلوم کرتے ہیں) ۔ یعنی تجھ سے خبر معلوم کرتے ہیں ۔ اب علمِ خبر میں گاہے ظن و شک بھی آجاتا ہے اور مشاہدہ ظن کو اٹھا دیتا ہے اور شک کو زائل کر دیتا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى[1] (جھوٹ نہ دیکھا دل نے جو دیکھا)

چنانچہ قلب کے لیے آنکھ کے ساتھ روایت ثابت ہوگئی اور قلبی روایت ہی یقین ہوتی ہے اور صاحبِ قلب ہی صاحبِ یقین کہلاتا ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یقین کا غنا ہونا کافی ہے۔"

چنانچہ یقین میں تمام دُوسرے علوم سے استغنا ہے۔ اس لیے کہ حقیقی اور خالص علم یہی ہے اور باقی تمام علوم میں یہ بات نہیں پائی جاتی کہ ان کے سیکھنے کے بعد یقین سے استغنا ہو جاتا ہو۔ اس لیے کہ علمِ توحید و علم ایمان میں یقین کا جس قدر احتیاج ہے۔ یہ علوم فتویٰ وغیرہ کی طرف احتیاج سے زیادہ ہے اس طرح یقین حاصل کر کے غنا حاصل کرنا باقی تمام علوم حاصل کر کے استغناء حاصل کرنے سے زیادہ باعظمت ہے۔

اس علم کی مثال ایسے ہے۔ جیسے کہ سارے قرآن کے مقابلہ میں فاتحۃ الکتاب کو حاصل ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ:

---

[1] سورۃ النجم - آیت ۱۱ -

"فاتحۃ الکتاب، تمام قرآن سے بدل بن سکتی ہے اور قرآن سارا بھی فاتحۃ الکتاب سے بدل نہیں ہوتا۔"
علم باللہ کی مثال باقی علوم کے ساتھ یہی ہے۔ علم باللہ تمام باقی علوم سے بدل ہو جاتا ہے مگر تمام علوم مل کر بھی علم باللہ کا بدل نہیں ہو سکتے اور ہر علم اپنے معلوم پر موقوف ہے اور علم یقین کا معلوم، اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لیے اس کی فضیلت باقی علوم پر اسی طرح ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کی فضیلت غیر خدا پر ہے۔

بعض حکمائے اس مفہوم میں فرمایا:
"جس نے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی۔ وُہ کس بات سے جاہل رہا؟ اور جو اللہ سے جاہل رہا اس نے کیا پہچانا؟"

چنانچہ علماء باللہ ہی انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں۔ انہیں انبیاء سے وراثت ملی تاکہ وُہ اللہ کی جانب رہنمائی کریں اور اسی کی طرف دعوت دیں اور اعمالِ قلوب میں انبیاء علیہم السلام کی پیروی کریں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ مَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّا دَعَا اِلَى اللّٰهِ وَ عَمِلَ صَالِحًا۔ (اور اس سے بہتر کس کی بات جس نے بلایا اللہ کی طرف اور کیا نیک کام)

اسی طرح فرمایا:

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ۔ (بلا اپنے رب کی راہ پر پکی باتیں سمجھا کر)

اور جیسے دعا کا حکم دیا اور ان کے اتباع کو دعوت الی اللہ میں حصّہ دار بنایا نہ کہ بصیرت میں۔ فرمایا:

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَ مَنِ اتَّبَعَنِيْ۔ (کہہ، یہ میری راہ ہے۔ بلاتا ہُوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں اور جو میرے ساتھ ہیں)

اور قیامت کو انہیں انبیاء علیہم السلام کی مصاحبت حاصل ہو گی جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ۔ (سو ان کے ساتھ ہیں جن کو نوازا اللہ نے، نبی)

اور ایک جگہ فرمایا:

وَجِايْٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَ الشُّهَدَآءِ۔ (اور حاضر آئے پیغمبر اور گواہ)

پھر اس کی وضاحت فرما کر فرمایا:

بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ۔ (اس واسطے کہ نگہبان ٹھہرائے تھے اللہ کی کتاب پر اور اس کی خبرداری پر تھے)

حضرت معاذ بن جبلؓ سے بھی اس مفہوم کی روایت منقول ہے۔ فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" تمام لوگوں سے زیادہ درجۂ نبوت کے قریب اہل علم اور اہلِ جہاد ہوتے ہیں۔ اہلِ علم اس لیے کہ انہوں نے اس (تعلیم) کی طرف رہنمائی کی جو انبیاء علیہم السلام لے کر مبعوث ہُوئے اور اہل جہاد اس لیے کہ انہوں (اس تعلیم کی حفاظت) پر تلواروں سے جہاد کیا جو کہ انبیاء علیہم السلام لے کر مبعوث ہُوئے اور علمائے دنیا کا حشر حکام وسلاطین کے ہمراہ ہوگا۔"

بعض سلفؒ سے مروی ہے۔ فرمایا کہ:

" علماء کا تو انبیاءؑ کے زمرہ میں حشر ہوگا اور قاضیوں کا سلاطین کے زمرہ میں حشر ہوگا۔"

اسمٰعیل بن اسحاق قاضی علمائے دنیا سے تھے اور قاضیوں کے سردار تھے۔ ان کا حضرت ابوالحسن بن ابی دردؒ سے بھائی چارہ تھا اور یہ (موخرالذکر) اہل معرفت میں سے تھے۔ جب اسمٰعیل قاضی بنے تو انہیں ابی وردؒ نے قاضی اسمٰعیل کے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا:

" اے اسمٰعیل! جس علم نے تجھے اس جگہ بٹھایا ہے اس سے جہالت بہتر تھی۔"

اسمٰعیل (سمجھ گئے) اور چہرے پر چادر رکھ کر اس قدر روئے کہ ڈاڑھی کے بال تر ہو گئے۔

علمائے ظاہر ہی ملک اور زمین کی زینت ہیں اور علمائے باطن، آسمان اور ملکوت کی زینت ہیں۔ علمائے ظاہر، اربابِ خبر و لسان ہیں اور علمائے باطن، اربابِ قلوب و مشاہدہ ہیں۔

ایک عالمؒ فرماتے ہیں:

" جب اللہ تعالیٰ نے زبان کو پیدا کیا تو فرمایا:

" یہ میری خبر سمجھنے کا ذریعہ ہے۔ اگر اس نے سچ کہا تو میں اس کو نجات دے دوں گا اور جب اللہ تعالےٰ نے دل کو پیدا کیا تو فرمایا: یہ میری نظر کا مقام ہے اگر میرے لیے صاف ہوا تو میں اس کو صاف و شفاف کر دوں گا۔"

خلف میں سے ایک بزرگ فرماتے ہیں:

" جاہل، علم کے باعث نجات پاتا ہے اور عالم، محبت کے ذریعہ نجات پاتا ہے اور عارف جاہ کے باعث نجات پاتا ہے۔"

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

علم ظاہر حکم ہے۔ علمِ باطن حاکم ہے اور حاکم کے آنے تک حکم موقوف رہتا ہے۔ جب حاکم آتا ہے تو

اس میں فیصلہ کرتا ہے۔"

علمائے ظاہر کا ایک طریقہ تھا کہ جب اختلافِ ادلّہ کے باعث انہیں کسی مسئلہ میں مشکل پیش آتی تو کسی عالم باللہ سے معلوم کرتے۔ اس لیے کہ یہ حضرات ان کے نزدیک بھی توفیق کے زیادہ قریب ہوتے۔ خواہش و نافرمانی سے دُور ہوتے ہیں۔ امام شافعیؒ کو اقوالِ علماء کے اختلاف کے باعث اگر کسی مسئلہ میں اشکال پیدا ہوتا ہے تو وہ اہل معرفت علماء کے پاس حاضر ہوتے اور ان سے حقیقتِ حال دریافت کرتے۔ گاہے وہ نوجوان چرواہوں کے سامنے اس طرح بیٹھتے جیسے کہ ایک بچہ مکتب میں استاد کے سامنے بیٹھتا ہے اور پوچھتے کہ اس مسئلہ میں کیا کیا جائے اور یہ مسئلہ کیوں کر حل ہو گا۔ ان سے کہا جاتا:

"اے ابو عبداللہ، تیرے جیسا عالم اور فقیہ اس بدوی سے مسائل دریافت کرتا ہے؟" تو وہ فرماتے:

"جس کا ہمیں علم دیا گیا ہے اس کو اس کی توفیق دی گئی ہے۔"

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو ایک سخت مرض ہو گیا اور وہ یہ دعا کرنے لگے:

"اے اللہ! اگر اس میں تیری رضا ہے تو اسے بڑھا دے۔"

مصر کے علاقہ سے معاصریؒ نے انہیں لکھا:

"اے ابو عبداللہ! نہ نہ، ابتلاء والوں سے مت ہو کر رضا مانگیے۔ ہمارے لیے بہتر یہ ہے کہ ہم نرمی اور عافیت کی درخواست کریں۔"

چنانچہ شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس قول سے رجوع کر لیا اور کہا:

"میں اللہ تعالیٰ سے بخشش چاہتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔"

اس کے بعد یوں دُعا کیا کرتے:

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ خَیْرَتِیْ فِیْمَا اُحِبُّ۔ (اے اللہ جس کو میں پسند کروں۔ اس میں میری بھلائی کر دے)

حضرت امام احمد بن حنبل اور یحییٰ بن معین رضی اللہ عنہما عام طور پر امام معروف بن فیروز کرخی رحمہم اللہ کے پاس حاضر ہوتے۔ حالاں کہ یہ بزرگ ان دونوں سے علم و سنن میں زیادہ علمی درجہ کے مالک نہ تھے، اور پھر بھی یہ ان سے مسائل معلوم کرتے۔

حدیث میں آتا ہے:

"عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسولؐ! جب کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جس کو ہم کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نہ پائیں تو کیا کریں؟"

فرمایا: "صالحین سے دریافت کرو اور باہم مشورہ کر لو اور ان کے بغیر کسی بات کا فیصلہ نہ کرو۔"

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آتا ہے:

"اگر تیرے پاس ایسا معاملہ آئے کہ کتاب اللہ میں نہ ہو اور نہ ہی سنتِ رسولؐ میں ہو" تو انہوں نے عرض کیا: کہ

"اس میں وُہ فیصلہ کروں گا جو صالحین نے کیا"۔

آپؐ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کی حمد ہے، جس نے اپنے رسولؐ کے قاصد کو یہ توفیق بخشی"۔

ایک روایت کے الفاظ ہیں:

"میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا"۔

علمِ ظاہر کی اہمیت

حضرت جنیدؒ سے مروی ہے۔ فرمایا: کہ

"جب میں حضرت سری سقطیؒ کے پاس سے اُٹھا تو مجھے فرمایا:

"جب تم مجھ سے جدا ہوتے ہو تو کس کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے ہو؟"

میں نے عرض کیا:

"حارث محاسبیؒ کے پاس"

فرمایا: "ہاں، اس کے علم وادب سے حاصل کر اور اس کی کلامی نکتہ سنجیاں چھوڑ دے اور انہیں متکلمین کے حوالہ کر دے"۔

یہ بتاتے ہیں: جب میں واپس ہُوا تو میں نے ان کو یہ کہتے ہُوئے سُنا:

"اللہ تعالیٰ تجھے محدث صوفی بنا دے اور صوفی محدث نہ بنائے"۔

یعنی جب تم علم حدیث اور اصول وسنن کا علم حاصل کرو۔ پھر زہد وعبادت میں مشغول ہو تو تم اہل معرفت صوفی ہو گے اور اگر تم نے عبادت وتقویٰ اور حال سے آغاز کیا تو تم علم وسنن سے اعراض کر بیٹھو گے اور پھر اصول وسنن سے جہالت کی وجہ سے یا تو شطحیات میں یا مغالطوں میں ڈوب مرو گے۔ اس لیے تمہارا بہترین حال یہ ہے کہ پہلے علم ظاہر اور حدیث کی کتب پڑھو۔ اس لیے کہ یہ جڑ ہے اور عبادت وعلم کی شاخیں اسی پہ پھوٹتی ہیں اور اگر (عبادت پہلے شروع کر دی تو گویا) جڑ کی بجائے شاخوں سے آغاز کر دیا۔

ایک قول یہ ہے کہ اصول کو ضائع کر کے وصول حاصل کرنے والے محروم رہتے ہیں اور حدیث کی کتابیں اور آثار وسنن کا علم حاصل کرنا اصول ہیں اور جب تو (شاخوں سے ہو کر) اصول کی طرف جائے تو تُو درجہ ناقدین سے گر گیا۔ عارفین کے مقام سے اُتر گیا اور یقین وایمان کے اسنا نہ سے ہاتھ

دھو بیٹھا۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"جب لوگوں نے علم حاصل کیا تو عمل کیا اور جب عمل کیا تو صاحبِ اخلاص ہوئے اور جب صاحبِ اخلاص ہوئے تو بھاگ گئے۔"

ایک بزرگ فرماتے ہیں:

"جب ایک عالم لوگوں سے بھاگے تو اسے تلاش کر، اور جب وہ لوگوں کو تلاش کرے تو اس سے بھاگ جا۔"

علم و عمل

حضرت ابو محمد سہل رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"علم، عمل کو آواز دیتا ہے۔ اگر وہ جواب دے تو ٹھیک ورنہ کوچ کر جاتا ہے۔"

حضرت ذوالنون رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس کے پاس بیٹھو، جس کی صفت (اخلاق) تجھ سے کلام کرے اور جس کی زبان تجھ سے بولے، اس کے پاس مت بیٹھو۔"

صوفیاء کا ایک گروہ کثرت سے اہلِ معرفت کی مصاحبت کرتا تاکہ ان سے ادب حاصل کرے۔ ان کے طریق و اخلاق کو دیکھتا، چاہے وہ علماء نہ ہوتے۔ اس لیے کہ افعال کے ذریعہ ہی ادب حاصل ہوتا۔ محض اقوال سے ادب نہیں ملتا اور اس مفہوم میں ایک روایت بہت ہی اعلیٰ مروی ہے۔ حکماء میں سے ایک بزرگ فرماتے ہیں:

"ایک فعل کے ساتھ ہزار آدمی کو نصیحت کرنا، ایک ہزار وعظ کے ذریعہ ایک آدمی کو نصیحت کرنے سے بہتر ہے۔"

حضرت سہل رحمہ اللہ فرمایا کرتے:

"علم سارے کا سارا دنیا ہے اور اس پر عمل کرنا آخرت کی بات ہے اور عمل بھی اخلاص کے بغیر ہوا ہو کر اڑ جائے گا۔"

ایک بار فرمایا:

"علماء کے سوا تمام لوگ مردے ہیں اور عمل کرنے کے سوا علماء بھی مست ہیں اور اخلاص والوں کے علاوہ عمل کرنے والے بھی دھوکہ میں اور مغرور ہیں اور اخلاص والے اس وقت تک خوف و ڈر میں ہیں جب تک کہ اسی حالت میں ان کی وفات نہیں ہو جاتی اور جو آدمی غیر کے علم کا عالم ہو۔ علماء کے

نزدیک وُہ عالم نہیں اور جو اس کے غیر کی فقہ کا حافظ ہو وُہ بھی عالم نہیں۔ اس کو تو راوی محافظ، حاصل اور ناقل ہی کہا جائے گا۔

حضرت ابُو حازم زاہدؒ فرمایا کرتے:

"علماء ختم ہُوئے اور سیاہ برتنوں میں علوم باقی رہ گئے۔"

حضرت زہریؒ فرمایا کرتے:

"فلاں آدمی علم کا برتن تھا۔ فلاں نے ہمیں بتایا اور وُہ علم کے برتنوں میں سے تھا۔ اسے عالم نہ کہتے۔"

اسی طرح حدیث میں مروی ہے:

"کئی حاملِ فقہ ایسے بھی ہیں کہ جو فقیہ نہیں ہوتے اور کئی حاملِ فقہ (علم کو) اپنے سے فقیہ تر کی طرف پہنچاتے ہیں۔"

حضرت حماد کو حماد راویہ کہا کرتے۔ اس لیے کہ یہ راوی تھے اور وصف میں مبالغہ کے باعث اسم میں ہا، کو داخل کیا جیسے کہ کہا کرتے ہیں۔ علامہ اور نسابہ۔ ان کے نزدیک وہی عالم ہوتا تھا جو اپنے دُوسرے کی بجائے اپنے علم سے بھرپُور ہوتا۔

ان کے نزدیک فقیہ صرف وہ ہوتا جو دُوسرے کی حدیث کی بجائے اپنے علم و قلب کی نقاہت سے فقیہ بنتا جیسے کہ حدیث میں آتا ہے:

"سب لوگوں سے زیادہ غنی کون ہے؟"

آپؐ نے فرمایا:

"جو اپنے علم سے غنی (بھرپور) ہو تو نفع دے ورنہ لوگوں سے الگ رہ کر اپنے علم پر اکتفا کرے۔"

اس لیے کہ ہر وُہ آدمی جو غیر سے علم کا عالم ہو وُہ اس کے مجموعہ کا عالم ہے اور اس کا مجموعہ ہی علماء ہیں۔ اور ہر فاضل جو دوسرے کے وصف کے باعث فضیلت حاصل کرے تو اس کا موصوف فاضل ہے اور وُہ لوگ فضلائُ ہیں اور جب انہیں چھوڑا اور الگ ہوا تو خاموش ہُوا۔ اب اس نے اپنے سے مخصوص اپنے علم کی طرف رجوع نہ کیا تو حقیقت میں وُہ جہالت سے متصف ہُوا۔ اہلِ فضل کے طریقوں کو بیان کرنیوالا اور سمع و نقل کے علم کا بتانے والا ہُوا۔ اسی طرح علمِ غیر کا عالم احوالِ صالحین بتانے والے کی طرح ہُوا جو مقاماتِ صدیقین کا جاننے والا ہے مگر اس کا اپنا کوئی حال یا مقام نہیں۔ اب اس کے خلاف صرف علم و کلام کے باعث حجت ہی واپس آئی اور عارفینؒ نے اعمال و مقام کے ذریعہ حجت میں سبقت کی۔ اسکی

مثال ایسے ہے جیسے کہ فرمایا:

وَلَکُمُ الْوَیْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ۔ (اور تم کو خرابی ہے ان باتوں سے جو بتاتے ہو)

اور فرمایا:

کُلَّمَا اَضَآءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِیْهِ وَ اِذَا اَظْلَمَ عَلَیْهِمْ قَامُوْا۔ (جس بار چمکتی ہے ان پر، چلتے ہیں اس میں، اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے، کھڑے ہو جاتے ہیں)

علماء کے اختلافات میں شکوک و شبہات کے باعث پیدا ہونے والے اشتباہات کے باعث بصیرت کی طرف نہیں آتے اور اپنے وجد کے باعث جو حال اس نے اختیار کیا اس (وجد) میں یوں متحقق نہ ہوگا بلکہ وہ دوسرے کے وجدان سے پانے والا ہے۔ دوسرا واجد ہے اور یہ دوسرے کی شہادت کا شاہد ہے۔ چنانچہ دوسرا ہی شاہد ہوا۔ (اور یہ نہ واجد ہوا اور نہ شاہد ہوا)

حضرت حسنؓ فرمایا کرتے،

"اللہ تعالیٰ صاحبِ روایت کی پروا نہیں کرتا بلکہ وہ صاحبِ فہم اور صاحبِ درایت کا خیال رکھتا ہے۔"

ایک بار فرمایا،

"جس کے پاس علم نہ ہو جو اسے آگاہ کرے تو اسے حدیث کی کثرتِ روایت فائدہ نہیں دیتی۔ اسی مفہوم میں بعض حکماء کے یہ اشعار مشہور ہیں۔ فرمایا:

رَأَیْتُ الْعِلْمَ عِلْمَیْنِ فَمَسْمُوْعٌ وَ مَطْبُوْعٌ

میں نے علم، دو علم ہی دیکھے۔ یا سنا ہوا یا لکھا ہوا۔

وَ لَا یَنْفَعُ مَسْمُوْعٌ اِذَا لَمْ یَکُ مَطْبُوْعٌ

اور سنا ہوا تب تک فائدہ نہیں دیتا جب تک کہ لکھا ہوا نہ ہو۔

کَمَا لَا تَنْفَعُ الشَّمْسُ وَ ضَوْءُ الْعَیْنِ مَمْنُوْعٌ

جیسے کہ رکی ہوئی دھوپ اور آنکھ کی روشنی کوئی نفع نہیں دیتی۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کثرت سے یہ اشعار پڑھا کرتے:

عِلْمُ التَّصَوُّفِ عِلْمٌ لَیْسَ یَعْرِفُهٗ اِلَّا اَخُوْ فِطْنَةٍ بِالْحَقِّ مَعْرُوْفُ

علم تصوف کو صرف وہی پہچانتا ہے جو کہ حق سے آگاہ اور نیکی کرنے والا ہو۔

وَ لَیْسَ یَعْرِفُهٗ مَنْ لَّیْسَ یَشْهَدُهٗ وَ کَیْفَ یَشْهَدُ ضَوْءُ الشَّمْسِ مَکْفُوْفُ

اور جس کو مشاہدۂ حق حاصل نہ ہو وہ اسے نہیں پہچانتا اور سورج کی بند روشنی کا مشاہدہ کیونکر ہو سکتا ہے؟

زبانی علم کی اہمیت

اس لیے کہ کتابیں اور (علوم کے) مجموعے بعد میں ظہور پذیر ہوئے۔ اقوال اور ایک امام کے مذہب پر فتاویٰ کی کتابیں بعد میں لکھی گئیں۔ ایک ہی امام کے مذہب پر تفقہ کا انداز بعد کی پیداوار ہے۔ قرن اول وثانی میں لوگ اس اسلوب پر نہ تھے۔ "تاریخ کی کتابیں ۱۲۰ھ کے بعد وجود میں آئیں جبکہ صحابہ و بلند پایہ تابعین دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

کہتے ہیں کہ زمانہ اسلام میں آثار و تفسیر میں پہلی کتاب ابن جریج کی تھی جس میں حضرت مجاہد، عطاء اور اصحابِ ابن عباسؓ کے آثار تھے۔ یہ کتاب مکہ میں ضبطِ تحریر میں آئی۔ پھر یمن میں معمر بن راشد صنعانی کی کتاب لکھی گئی۔ اس میں مختلف سنن ابواب کے لحاظ جمع کیں۔ پھر مدینہ میں مالک رضی اللہ عنہ نے فقہ میں موطا تحریر فرمائی۔ پھر سنن و آداب میں ابن عیینہ کی کتاب الجوامع لکھی گئی اور احرفِ قرآن کے علم میں کتاب التفسیر تحریر ہوئی۔ اور فقہ واحادیث میں حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ کی جامع کبیر مرتب ہوئی۔

۱۲۰ھ کے بعد اور حضرت سعید بن مسیب اور دوسرے بلند پایہ تابعین کی رحلت کے بعد یہ کتابیں وجود میں آئیں۔ چنانچہ ان علماءؒ کے ائمہ علمائے کرام صحابہؓ کے طبقاتِ اربعہ میں سے تھے۔ یہ اور بلند پایہ تابعین تصنیف کتب کے دور سے پہلے رخصت ہو چکے تھے۔

صحابہ کرام کتب حدیث لکھنے اور کتابیں مرتب کرنے کو ناپسند کرتے تھے تاکہ قرآن اور ذکر و فکر سے لوگ اعراض نہ کر جائیں اور فرمایا :

"جیسے ہم نے یاد کیا تم بھی زبانی یاد کرو۔" مقصود یہ تھا کہ لوگ تحریرات میں مصروف ہو کر ذکر اللہ سے غافل نہ ہو جائیں جیسے کہ حضرت ابوبکر صدیق اور اجلہ صحابہ رضی اللہ عنہم ابتداء میں قرآن مجید کو کتابی صورت میں تحریر کرنے کو ناپسند کرتے تھے اور فرماتے :

"جو کام جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا ہم کیوں کریں؟" اور خطرہ محسوس کرتے کہ لوگ قرآن مجید کو زبانی حفظ کرنے کی بجائے کتابوں پر انحصار کر لیں گے اور صحابہ فرماتے :

"ہم چاہتے ہیں کہ لوگ ایک دوسرے سے تلقین اور پڑھنے پڑھانے کے طریق پر قرآن مجید سیکھیں تاکہ ان کا ذکر جاری رہے اور عزم و ہمت بلند رہے مگر حضرت عمرؓ اور دوسرے صحابہ رضی اللہ عنہما نے مشورہ کیا کہ قرآن مجید کو کتابی صورت میں جمع کر لیا جائے۔ اس لیے کہ اس طرح یاد کرنے کی آسانی رہے گی۔ مزید برآں لوگوں کے دنیا میں مصروف ہونے کے باوجود بھی کتابی صورت میں قرآن کی نعمت سے محروم نہ رہیں گے آخر کار اللہ تعالیٰ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کا شرح صدر فرمایا اور متفرق اجزاء پر لکھے ہوئے قرآن کو ایک ہی مجلد میں جمع کر دیا گیا۔ صحابہ کا یہی طریق تھا کہ وہ ایک دوسرے سے علم حاصل کرتے اور زبانی یاد کرتے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ

وہ لوگ دنیاوی آلائشوں سے پاک اور صاف دل تھے۔ ان کے عزم بلند اور نیتیں خالص تھیں۔ پھر دوسری صدی کے بعد اور تیسری صدی ختم ہوتے ہی چوتھی صدی میں علم کلام کی تصانیف منظرِ عام پر آنے لگیں۔ رائے، عقلیات اور قیاسات کے مجموعے تیار ہو گئے۔ اہل تقویٰ کا علم ختم ہُوا۔ رشد و یقین اور علم تقویٰ سے سرشار اہل یقین کی معرفت غائب ہو گئی۔

فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ۔ (پھر ان کے پیچھے آئے ناخلف وارث)

اور اس دور تک خلفیت جاری ہے اور اس زمانہ میں معاملہ ہی اختلاط پذیر ہو کر رہ گیا۔ لوگ متکلمین کو علماء کہنے لگے۔ قصہ گو لوگوں کو عارف قرار دیا جانے لگا اور جن راویوں اور ناقلوں کو دین میں کچھ فقاہت حاصل نہیں۔ اور نہ ہی انہیں یقین کی بصارت سے کچھ حصہ ملا ہے، وُہ علماء و مشائخ کہلانے لگے۔

صرف علماء کو تقریر کا حق ہے

حضرت ابن ابی عیلہ سے مروی ہے کہ ہم صبح کے بعد عطاء خراسانی کی مجلس میں بیٹھا کرتے، وُہ ہمیں خطاب کرتے۔ ایک روز وُہ نہ آسکے۔ تو ایک مؤذن نے خطاب کیا اور اس انداز میں خطاب کیا جیسے کہ عطاؒ کیا کرتے تھے۔ حضرت رجاء بن ابی حیاۃ نے آواز اجنبی محسوس کی تو فرمایا:

"یہ خطاب کرنے والا کون ہے؟"

اس نے کہا:

"میں فلاں (مؤذن) ہوں۔"

فرمایا: "خاموش رہو۔"

اس لیے کہ انہیں ایک نااہل سے خطاب سننا مکروہ محسوس ہُوا۔ اسی طرح علمائے ربانیین کا یہ دستور رہا ہے کہ وُہ صرف زاہد اور اہل علم کے خطاب سنتے اور دنیاداروں کے خطاب سننے کو ناپسند فرماتے اور یہ فرمایا کرتے کہ اہل دنیا اور نااہل لوگوں کو خطاب کرنے کا کوئی حق نہیں۔

یہ یاد رہے کہ جب بندہ عارف اور صاحبِ یقین ہو تو اسے کسی دُوسرے عالم کی تقلید کی حاجت نہیں اسی طرح جن کو یہ مقام عطا ہو جاتا ہے وہ بھی گاہے ان سے اختلاف کر سکتے ہیں جن سے انہیں علم حاصلِ مزید یقین حاصل ہُوا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ باقی ہر آدمی کا قول لیا بھی جا سکتا ہے اور ترک بھی کیا جا سکتا ہے[1]۔"

---

[1] یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ کے قول کو "اصل" ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور باقیوں کے اقوال کتاب و سنت کے (باقی صفحہ ۔۔۔ پر)

یہ حضرت زید بن ثابتؓ سے فقہ کا علم حاصل کرتے تھے اور حضرت ابی ابن کعبؓ پر پڑھا۔ پھر فقہ میں حضرت زیدؓ سے اختلاف کیا اور دونوں نے قرأت میں بھی اختلاف کیا ہے۔

فقہائے سلفؒ کا فرمان ہے کہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے وہ سر آنکھوں پر اور جو صحابہ سے ملے ہم لیتے بھی ہیں اور ترک بھی کرتے ہیں۔ اور جو تابعین سے ملے وہ بھی رجال ہیں اور ہم بھی رجال ہیں۔ ان کا بھی قول ہے اور ہمارا بھی قول ہے۔ اسی وجہ سے فقہاء کرام تقلید کو ناپسند کرتے اور فرماتے: کسی آدمی کو اس وقت تک فتویٰ دینے کا حق نہیں جب تک کہ وہ اختلافِ فقہاءؒ سے آگاہ نہ ہو۔ یعنی احتیاط و تقویٰ اور یقین کے انداز پر وہ ان میں سے مختار قول کا انتخاب کر سکتا ہو۔ اب اگر انہیں یہ پسند ہوتا کہ ایک عالم دوسرے کے مذہب پر فتویٰ دے سکتا ہے تو اختلاف سے آگاہی کی ضرورت نہ تھی اور اپنے امام کا مذہب جان جانا ہی کافی ہو جاتا۔

اسی وجہ سے فرمایا گیا، کہ بندہ کل مانگے گا تو اسے کہا جائے گا، تو نے اپنے علم پر کس قدر عمل کیا؟ اور یہ نہیں کہا جائے گا کہ غیر کے علم پر کس قدر عمل کیا؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ قَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَ الْاِیْمَانَ۔ (اور کہیں گے جن کو ملی سمجھ اور یقین)

چنانچہ خدا تعالیٰ نے علم و ایمان میں تفریق کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس کو ایمان و یقین ملا اسے علم عطا ہوا جیسے کہ جس کو علم نافع ملا۔ اسے ایمان عطا ہوا اور یہ بات اس آیت کے وجوہِ مطالب میں سے ایک ہے۔

کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْاِیْمَانَ وَ اَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ۔[1] (ان کے دلوں میں لکھ دیا ہے ایمان اور ان کی مدد کی ہے اپنے غیب کے فیض سے)

یعنی انہیں علمِ ایمان سے قوت عطا کی چنانچہ علمِ ایمان ہی اس کی روح ہے اور ہادِ ایمان کی طرف جاتی ہے اسی طرح کتاب و سنت سے استنباط و استدلال کے اہل عالم کی بات ہے۔ اس لیے کہ یہ صنعت کا ذریعہ ہے کیونکہ وہ صاحبِ تمیز اور صاحبِ بصیرت ہے اور اہل تدبر و عبرت میں سے ہے مگر ایک جاہل اور عامی آدمی کے لیے ضروری ہے کہ وہ علماء کی تقلید کرے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۰۳) تقاضا کے مطابق ہوں تو قابلِ عمل ہوں گے ورنہ متروک ہوں گے اور کسی کے قول کے کتاب و سنت کے مطابق ہونے کا فیصلہ کرنے کا حق بھی صرف علمائے ربانیین کو حاصل ہے۔

[1] سورۃ مجادلہ آیت ۲۲۔

ایک عام عالم پر بھی خاص عالم کی تقلید کرنا ضروری ہے اور ظاہری علوم کے عالم کو بھی اپنے سے بلند تر دور کے اہلِ قلب عالمِ باطن کی تقلید کرنی چاہیے۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے علم لغات و فتویٰ کو علمِ باطن کے ماتحت کیا اور اہلِ قلوب کو مفتیوں کی پابندی کرنے کے بارے میں ارشاد نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ وہ مفتیوں سے فتویٰ لے کر دل میں ایک کھٹک پلتے ہیں اور پھر دل کے فتویٰ پر چلتے ہیں۔ فرمایا:

"اپنے دل سے فتویٰ طلب کرو۔"

اور اس سے پہلے فرمایا:

"دلوں کے کھٹکے کا نام گناہ ہے۔"

اور آخر یہ فرمایا:

"جو تیرے سینہ میں کھٹکے اسے چھوڑ دے چاہے تجھے فتویٰ دیں اور تجھے فتویٰ دیں۔"

اس معرفت کو دکتابوں سے ہی، پڑھنا تو جہالت ہے اور ایسا کرنے سے جو آدمی باتونی ہو اور عوام کے سامنے مختلف اسالیب کے ساتھ کلام کر سکے وُہ عالم کہلانے لگا اور جو بھی بات کو سنگار دے سکے وہ عالم اور علامہ بن گیا۔ اس لیے کہ عوام کو یہ خبر ہی نہیں کہ علمائے سلف میں کیا کیا خصوصیات تھیں۔ اس طرح آج کل کے بیشتر متکلین فتنہ و فساد برپا کر رہے ہیں اور رائے، کلام اور معقولیات کا زیادہ حصہ علم شمار ہونے لگا۔ حالانکہ یہ سب جہالت کا پلندہ ہے۔ آجکل لوگوں میں متکلین اور علماً کے درمیان امتیاز کرنے کی صلاحیت ہی نہیں۔ علم اور کلام کا باہمی فرق کرنا ان کے بس سے باہر ہے۔

ہم یہ بتا چکے ہیں کہ بعض خاص خاص جاہل لوگ بھی علماً سے مشابہ ہوتے ہیں۔ انھی کی طرح اظہارِ جدال و کلام کرتے ہیں۔ اس لیے آج کے دور میں وہی سب سے بڑا عالم ہے جو کہ سیرتِ متقدمین سے خوب آگاہ ہو، سلف صالحین کے طریق سے واقف ہو، پھر اس علم اور عالم و متعلم سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔ طالب علم پر یہ لازم ہے کہ اسے پہچانے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"علم حاصل کرنا فرض ہے۔"

تو اب طالبِ علم پر علمائے ربانیین کو پہچاننا بھی فرض ہُوا تاکہ ان سے علم حاصل کر سکیں۔ اس لیے کہ جس سے انسان آگاہ نہ ہو اس سے علم حاصل نہیں ہو سکتا۔ علم ایک عرض ہے اور یہ کسی بدن کے ساتھ وابستہ ہو کر موجود رہتا ہے اور اہل علم کے پاس ہی مل سکتا ہے جیسے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے عرض کیا گیا:

"آپؓ نے فلاں سے اختلاف کیا؟" تو فرمایا:

"ہم میں سے بہترین آدمی نے بھی اس دین کے سلسلہ میں ہمارا اتباع کیا۔" اور جیسے حضرت سعدؓ سے

عرض کیا گیا کہ حضرت ابن مسیبؒ یوں پڑھتے ہیں:

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نَنْسَاهَا۔

تو انہوں نے فرمایا:

"قرآن مجید ابن مسیب پر نازل نہیں ہوا اور نہ ہی ان کے باپ پر نازل ہوا۔"

پھر یوں پڑھا:

اَوْ نُنْسِهَا۔

چنانچہ اس دور میں وہی آدمی رشد و توفیق سے قریب تر ہے جو کہ سلف صالحین کا سب سے زیادہ تابعدار اور اخلاق و عادات میں سلفؒ کا سب سے زیادہ مشابہ ہے۔

دیکھیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ آپؐ سے دریافت کیا گیا: کہ

"سب لوگوں سے زیادہ عالم کون ہے؟"

آپؐ نے فرمایا:

"جب (مختلف) امور میں اشتباہ واقع ہو تو سب سے زیادہ آگاہ ہو۔"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"سب لوگوں سے زیادہ عالم وہ ہے جو لوگوں کے اختلاف سے زیادہ آگاہ ہو۔"

حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے:

"دو نئی چیزیں اسلام میں بعد میں پیدا کی گئیں:

۱۔ ایک غلط رائے کا آدمی جو یہ سمجھتا ہے کہ جنت صرف اس کے لیے ہے جو اس کی رائے سے اتفاق رکھے۔

۲۔ فضول خرچ آدمی جو دنیا کی پوجا کرتا ہے۔ دنیا کی خاطر غضبناک ہوتا اور اس کی خاطر خوش ہوتا ہے اور دنیا طلبی میں ہی منہمک ہے۔

ان دونوں کو دوزخ میں ڈال دو اور ان کے مقابلہ میں ایک آدمی ایسا ہے کہ جو دنیا کی طرف بلانے والے اور خواہشِ نفس کے داعی سے الگ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے دونوں کی غلط روی سے محفوظ رکھا ہے سلف صالحین کے آثار و اقوال کی تلاش کرتا ہے۔ اسلافؒ کے اقوال و اعمال کی پیروی کرتا ہے۔ یہ آدمی قابلِ اتباع ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور یہ باسند روایت بھی آتی ہے:

"یہ دو ہیں:
۱۔ کلام
۲۔ ہدی (طریق)

اعلیٰ ترین کلام، اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اعلیٰ ترین طریق، طریق محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ یاد رکھو، امور محدثہ سے بچتے رہنا۔ اس لیے کہ بدترین کلام محدثہ ہے اور ہر محدثہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ یاد رکھو تمہیں طویل طویل امیدیں نہ لگنے پائیں ورنہ تمہارے دلوں میں قساوت آجائے گی۔ یاد رکھو، جو آنے والی ہے وہ قریب ہے اور دُور وُہ ہے کہ جو آنے والی نہیں۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خطبہ حضرت ابانؒ سے مروی ہے۔ انہوں نے حضرت انسؓ سے نقل کیا:

"جس کے اپنے عیب نے اسے دوسروں کے عیوب سے غافل کر دیا، نافرمانی کیے بغیر کمائے ہوئے مال سے (خدا کی راہ میں) خرچ کیا۔ اس نے اہل فقہ وحکمت سے اختلاط (و مجالست) کی۔ ذلیل اور نافرمانوں سے جدُا رہا۔ اس کے لیے خوشخبری ہے۔ جس نے اپنے جی میں انکساری کی، اپنا فالتو مال خرچ کیا۔ فالتو کلام روکے رکھا، سنت کو (کافی سمجھ کر) اس پر چلا اور بدعت کی طرف نہیں آیا۔ اس کے لیے خوشخبری ہے۔"

بعض ادباؑ نے ہمارے زمانہ کا نقشہ ان اشعار میں کیا خوب بیان کر دیا ؎

ذَهَبَ الرِّجَالُ الْمُقْتَدٰى بِفِعَالِهِمْ وَالْمُنْكِرُوْنَ لِكُلِّ اَمْرٍ مُنْكَرٍ

جن کے افعال کی پیروی کی جاتی ہے وہ مرد خدا چلے گئے اور جو ہر منکر بات کا انکار کرنے والے تھے۔

وَبَقِيْتُ فِىْ خَلْفٍ يُزَكِّىْ بَعْضُهُمْ بَعْضًا لِيَدْفَعَ مُعْوِرٌ عَنْ مُعْوِرٍ

میں ایسے اخلاف میں رہ گیا کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے کو پاک بتا رہا ہے یعنی بدخصلت دوسرے بدخصلت کا دفاع کر رہا ہے

اِبْنِىْ اِنَّ مِنَ الرِّجَالِ بَهِيْمَةً فِىْ صُوْرَةِ الرَّجُلِ السَّمِيْعِ الْبَصِيْرِ

اے بیٹا! کئی ایسے آدمی ہیں جو سنتے دیکھتے آدمی کی صورت میں چوپائے ہیں۔

فَطِنًا بِكُلِّ مُصِيْبَةٍ فِىْ مَالِهٖ فَاِذَا اُصِيْبَ بِدِيْنِهٖ لَمْ يَشْعُرٖ

ان کے مال میں آنے والی ہر آفت سے خوب آگاہ، مگر ان کے دین میں آفت آئے تو سمجھتے ہی نہیں۔

فَسَلِ الْفَقِيْهَ تَكُنْ فَقِيْهًا مِثْلَهٗ مَنْ يَّسْعَ فِىْ اَمْرٍ بِفِقْهٍ يَظْفَرٖ

اس لیے فقیہ سے پُوچھ تو بھی (اس مسئلہ میں) اس کی طرح فقیہ ہو جائے گا جو کسی بات میں فقاہت برتے وہ کامیاب ہو جاتا ہے۔

آخرزمانہ کی بدعملی

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے،
" آخرزمانہ میں کثرتِ عمل سے حسُن طریق زیادہ بہتر ہوگا۔"
اور اپنے زمانہ کو یقین کا اور ہمارے زمانہ کو شک کا زمانہ قرار دیا۔ فرمایا؛
" تم ایسے زمانہ میں ہو کہ (مختلف) امور میں تیزی سے جانے والا بہترین ہے۔ اور تمھارے بعد ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ ان میں بہترین وُہ ہوگا جو ثابت و متوقف رہے۔" یعنی کثرتِ شبہات کے باعث توقف کرے۔
حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ اس سے عجیب تر قول مروی ہے۔ فرمایا،
" تمھاری آج کی نیکی بھی گزشتہ زمانہ میں برائی تھی اور ایک زمانہ آئے گا کہ تمھاری برائی بھی نیکی بن جائیگی۔ جب تک تم حق پہچانو گے اور تم میں نڈر قسم کے علماءٔ رہیں گے۔ تم بھلائی پر رہو گے۔"
نیز فرمایا کرتے؛
" آخری زمانہ میں ایسی قوم بھی آئے گی جس میں ایک عالم کی حیثیت ایک مُردہ گدھے کے برابر ہو گی کہ وُہ اس کی طرف التفات ہی نہ کریں گے۔ ان میں ایمان دار اس طرح چھپتا پھرے گا جیسے کہ آج کے دور میں منافق چھپتا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ رسوا مومن ہی ہوگا۔"
حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی حدیث میں آتا ہے،
" لوگوں پر ایسا دور بھی آئے گا کہ حق کے دس حصوں میں سے نو حصہ کا انکار کر دیا جائے گا۔ اُس وقت صرف سونے والا مومن ہی نجات پائے گا۔ یعنی خاموش اور چُپ سادھ جانے والا بھی بچے گا۔" یہی لوگ علم کے چراغ اور ائمہ ہدایت ہیں اور فضول ڈھنڈورچی نہیں ہیں کہ بڑھ بڑھ کر باتیں ہی بنائیں۔"
حدیث میں ہے،
" لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ جس نے اس میں حق پہچان لیا۔ وُہ نجات پا گیا۔"
پوچھا، " تو عمل کہاں ہے؟ "
فرمایا: " اس زمانہ میں عمل نہ ہوگا، اس وقت وہی نجات پائے گا۔ جو اپنا دین لے کر ایک چوٹی سے دوسری چوٹی کو بھاگ جائے۔"
حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں آتا ہے:
" لوگوں پر ایک زمانہ ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ جس نے اس وقت ماموراتکے دسویں حصہ پر بھی عمل کر لیا تو بھی نجات پا جائے گا۔" اور بعض روایات میں یہ الفاظ ہیں کہ؛
" علم کے دسویں حصہ پر۔"

بعض صحابہؓ سے مروی ہے ،

"تم آج ایسے زمانہ میں ہو کہ تم میں سے جس نے اپنے علم کے دسویں حصہ پر بھی عمل چھوڑ دیا۔ وہ ہلاک ہوا اور تم پر ایسا زمانہ بھی آنے والا ہے کہ جس نے اپنے علم کے دسویں حصہ پر بھی عمل کر لیا وہ نجات پا جائے گا۔"

بعض خلفاءؒ سے منقول ہے ،

"تم پر ایسا زمانہ آنے والا ہے کہ اس وقت افضل ترین علم خاموشی ہے اور افضل ترین عمل نیند ہو گی۔" یعنی منافقین کی کثرت ہو گی اور شبہات کی بہتات ہو گی۔ اس لیے جاہل کے لیے خاموشی ہی علم بن جائے گا اور شہواتِ نفسانیہ کی کثرت کے باعث نیند عبادت بن جائے گی۔ قسم ہے عالم کا کمترین حال خاموشی اور نیند ہے اور جاہل کا اعلیٰ ترین حال بھی دو باتیں ہیں۔"

حضرت یونس بن عبید فرماتے تھے ،

"جو آدمی سنت سے آگاہ ہو وہ آج غریب و اجنبی شمار ہوتا ہے اور جو سلف کا طریق سمجھتا ہو وہ غریب تر ہے۔ فرماتے ہیں کہ جو اسلاف کا طریق سمجھے وہ بھی غریب ہے اس لیے کہ اس نے ایک غریب یعنی اجنبی کو پہچانا۔"

حضرت حذیفہ مرعشی فرماتے ہیں کہ

"یوسف بن اسباطؒ نے میری طرف مکتوب ارسال فرمایا اور لکھا ،

"طاعت اور طاعت کی معرفت رکھنے والے چلے گئے۔"

یہ فرمایا کرتے ،

"اب کوئی مونس باقی نہیں۔"

ایک بار فرمایا ،

"اس زمانہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے کہ جب علمی مذاکرہ بھی نافرمانی ہو گا؟"

پوچھا گیا ،

"اس کی کیا وجہ ہے ؟"

فرمایا ،"اس لیے کہ اہل علم نہ ملیں گے۔"

حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے ،

"جب تک تم اپنے بہتر لوگوں سے محبت رکھتے ہو تم اس وقت بھلائی پر رہو گے اور تم میں حق کی بات کہی جائے تو اسے پہچان لو (اور قبول کر لو) اور جب تمہارے اندر عالم کی حیثیت ایک سینگ لگی ٹوٹی بکری کی

طرح (پڑا) ہو تو تمہارے لیے بربادی ہے۔"

متقدمین کے پاس بعض ایسے علوم بھی تھے جن پر ان کا اجماع تھا مگر ہمارے دور میں وہ نابود ہو کر رہ گئے۔ سلف صالحین کے بعض ایسے طرق و مسالک بھی تھے جن کا اہتمام فرماتے اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہتے مگر ہمارے وقت میں وہ ختم ہو گئے۔ یقین و معرفت کے ایسے مقامات و احوال بھی تھے جن کا ان کے درمیان مذاکرہ ہوتا اور وہ اہلِ معرفت کی تلاش کیا کرتے مگر آج طالبین کی کمی کے باعث یہ باتیں مفقود ہو گئیں۔ علماء اور سالکین ناپید ہوئے اور ان راہوں پر چلنے والے نابود ہو کر رہ گئے۔ سلوک کی چند راہیں یہ ہیں۔ حلال کی طلب، معاملات و کتابت میں تقویٰ کا علم، اخلاص کا علم، آفاتِ نفسانی اور فسادِ اعمال کا علم، عمل و علم میں نفاق کا علم، نفاقِ علم میں فرق، نفاقِ قلب اور نفاقِ نفسانی کے درمیان امتیاز، نفس کے اظہارِ شہوت اور اخفاءِ شہوت میں فرق، اللہ تعالیٰ کے ساتھ سکونِ قلبی اور اسباب کے ساتھ سکونِ نفس کے درمیان امتیاز، روحانی اور نفسانی خیالات کے درمیان فرق، ایمان و یقین و عقل کے خیالات کا باہمی فرق، اخلاقِ احوال اور طرقِ اعمال کا علم، مشاہداتِ عارفین کا تفاوت معلوم کرنا، مریدوں پر مشاہدہ کا رنگ دیکھنا، قبض و بسط کا جاننا، صفاتِ عبودیت کا و تورع اور اخلاقِ ربانی اپنانا، علماء کے مقامات سے آگاہی حاصل کرنا وغیرہ ایسے بیشتر عنادین ہیں مثلاً علم توحید، معانی صفات کی معرفت، تجلیٔ ذات کے باعث علومِ مکاشفہ، باطنی صفات پر روشنی ڈالنے والے افعال کا ظاہر کرنا، نظر اور اعراض بتانے والے مفاہیم کا ظہور، قرب حاصل کرنا، دور کرنا، کمی و زیادتی، ثواب و عذاب اور انتخاب و اختیار۔ ہم نے انہی مفاہیم کو کئی فصلوں میں واضح کر دیا ہے اور ان کی تفصیل شرح کر دی ہے جو کہ غور و تدبر کرنے سے معلوم ہو جائے گا۔ ہر آدمی اپنے مقدر کے مطابق اس سے استفادہ حاصل کر سکتا ہے۔

ہمارے بعض علماء کا فرمان ہے،

"میں جانتا ہوں کہ متقدمین کے ہاں ستر علوم تھے جن کو وہ اس علم میں سمجھتے اور سیکھتے سکھاتے مگر آج ان میں سے ایک علم بھی باقی نہیں رہا۔ جو معروف ہو۔"

فرمایا: "میں سمجھتا ہوں کہ آج کے دور میں باطل اور مکر و فریب پر مشتمل علوم کثرت سے پیدا ہو چکے ہیں۔ ماضی میں ان کا نشان بھی نہ تھا اور اس کے باوجود انہیں علوم کہا جا رہا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً حَتّٰٓى اِذَا جَآءَهٗ لَمْ يَجِدْهُ شَيْــٴًـا۔[1] (پیاسا جانے اس کو پانی، یہاں تک کہ جب پہنچا اس پر، اس کو کچھ نہ پایا)

---

[1] سورۃ النور۔ آیت ۳۹۔

اس سے پہلے حضرت جنیدؒ فرمایا کرتے :

"یہ علم، جس میں ہم کلام کر رہے ہیں۔ اس کی بساط تو بیس برس ہوئے لپیٹی جا چکی۔ اور ہم تو اس کے حواشی میں ہی کلام کر رہے ہیں۔"

نیز فرمایا کرتے :

"میں مشائخِ صوفیا کے پاس برسوں تک بیٹھا رہا وہ علوم (معرفت کی باتیں) کیا کرتے اور میں کچھ نہ سمجھتا۔ اور نہ ہی کچھ پتہ چلتا کہ یہ کیا ہیں، مگر اس کے باوجود کبھی انکار بھی نہیں کیا بلکہ میں انہیں جانے بغیر ہی ان سے محبت رکھتا اور انہیں قبول کرتا۔"

فرمایا کرتے :

"پرانے وقت میں ہم اپنے بھائیوں کے ساتھ ایسے علوم میں گفتگو کیا کرتے کہ آج وہ علوم غیر معروف ہو گئے اور نہ ہی اب کسی نے مجھ سے ان کے بارے میں پوچھا ہے بلکہ یہ دروازہ ہی بند ہو گیا۔"

جب ہمارے شیخ ابوسعید بن اعرابیؒ نے طبقات النساک تصنیف فرمائی اور یہ بتایا کہ سب سے پہلے کس نے اس علم میں کلام فرمایا اور کس نے اسے ظاہر کیا۔ پھر اہل بصرہ، اہل شام، اہل خراسان اور آخر میں اہل بغداد کا ذکر کیا۔

ایک دوسرے بزرگؒ بتاتے ہیں کہ اس علم میں حضرت جنید قواریریؒ نے بھی کلام فرمایا۔ انہیں اس سلسلہ میں گہری بصیرت حاصل ہے اور تعبیر پر کامل دسترس حاصل ہے ان کے بعد تو مجالس غیظ و غضب ہی رہ گئی ہیں۔"

ایک بار فرمایا :

"حضرت جنیدؒ کے بعد جو لوگ باقی ہیں ان کا ذکر بھی باعثِ شرم ہے۔"

ہمارے امام ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے :

۳۰۰ھ کے بعد کسی کے لیے جائز نہیں کہ ہمارے اس علم میں کلام کرے۔ اس لیے کہ پھر ایسی قوم پیدا ہو جائے گی جو مخلوق کے لیے تصنع کرے گی اور کلام کی رنگ آمیزی سے کام لے گی۔ ان کے لباس ان کے وجدان ہوں گے۔ ان کا کلام ان کا اخلاق و زیور ہوں گے اور ان کے پیٹ ان کے معبود ہوں گے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا :

"کون سا فتنہ سب سے زیادہ شدید ہے۔"

انہوں نے جواب دیا :

"اگر تیرے سامنے خیر و شر پیش کیا جائے اور تجھے پتہ نہ چلے کہ کس کو لے۔" اس لیے کہ شبہات کی کثرت ہو گی جیسے کہ حضرت سہلؒ فرمایا کرتے، کہ

سن ۳۰۰ھ کے بعد کسی کی توبہ صحیح نہ ہو گی۔ اس لیے کہ روٹی ان کی توبہ کو توڑ دے گی اور وہ روٹی سے صبر نہیں کریں گے۔ یعنی توبہ کا آغاز حلال کھانا ہے۔

حدیث میں آتا ہے،

"لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ انہیں دین کے بارے میں گمراہ کیا جائے گا اور وہ سمجھیں گے نہیں۔ صبح ایک آدمی ایک دین پر ہو گا تو شام کو دوسرے دین پر ہو گا۔ یقین نہ ہونے پر ان کو گمراہی لاحق ہو گی۔ اس زمانہ کے بیشتر لوگوں کی عقلیں سلب کر لی جائیں گی اور سب سے پہلے ان سے خشوع، پھر دعا کا قبول ہونا، پھر تقویٰ اٹھا لیا جائے گا۔" اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "سب سے پہلے الفت و محبت اٹھا لی جائے گی۔"

نئے ایجاد کردہ افعال و اقوال

آدابِ ملاقات پرانے دور میں جب لوگ ایک دوسرے سے ملتے تو پوچھتے،

"کیا حال چال ہے؟" اور اس سے ان کی مراد مجاہدہ و صبر ہوتا تھا اور مزید ایمان اور علمِ یقین کے سلسلہ میں دل کی کیفیت کیسی ہے؟ ان کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ اپنے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تمہارا کیا معاملہ ہے اور دنیا و آخرت کے امور میں تمہارا حال کیسا ہے؟ کچھ اضافہ ہوا یا کمی ہو گئی؟ چنانچہ سلف صالحین، قلبی احوال اور اعمالِ علوم پر تبصرہ کرتے اور خدا تعالیٰ کی طرف سے عطا شدہ حسنِ معاملہ ان کے زیرِ بحث آتا اور یہ بتاتے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے یہ عجیب فہمی عطا کی۔ یعنی ان کی مجالس میں انعاماتِ الٰہی کا ذکر اور اس پر شکر ہوتا اور اس طرح انہیں معرفت و معاملہ میں ترقی حاصل ہوتی۔

بعض سلف فرمایا کرتے،

ہمارے بیشتر علوم و وجدان ان معلومات پر مشتمل ہیں جو باہمی ملاقات کے موقع پر ہم اپنے بھائیوں سے اخذ کرتے اور باہمی مذاکرہ میں معلوم ہوتے۔ آج جہالت چھا چکی اس لیے یہ باتیں متروک ہو گئیں۔ آج جب لوگ خبر و حال کے بارے میں پوچھتے ہیں تو ان کی مراد دنیاوی امور اور اسباب خواہش ہوتے ہیں اور پھر ہر آدمی اپنے مولائے کریم کی شکایت دوسرے بندے کے سامنے کرتا ہے۔ اس کے احکام پر ناراض ہوتا، اس کی قضاء پر تنگ ہوتا، اپنے نفس کو اور جو اس کے ہاتھوں نے آگے بھیجا ہے اسے فراموش کر دیتا ہے۔

جیسے کہ فرمایا:

وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ (اور کون ظالم اس سے جس کو سمجھایا اس کے رب کے

اَعْرَضَ عَنْهَا وَ نَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ۔[1] کلام سے۔ پھر منہ پھیرا اس کی طرف۔ پھر بھول گیا جو آگے بھیج چکے ہیں)

اور فرمایا:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ۔ (بیشک انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے)

ایک قول کے مطابق اس کے انعامات کا ناشکرا ہے۔ اس لیے کہ اس پر آفات کی کثرت ہے اور وہ انعاماتِ خداوندی کو فراموش کر دیتا ہے۔ یہ سب باتیں صرف اس لیے ہُوئیں کہ وہ خدا سے جاہل و غافل ہے۔

اسلاف کا طریق یہ تھا کہ جب وہ باہم ملتے تو السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ' کہتے اور آجکل یہ کہتے ہیں کہ صبح کیسی کی اور شام کیسے ہُوئی؟۔

حدیث میں ہے:

جو سلام کرنے سے پہلے کلام کرے اس کا جواب مت دو۔

سلام سے پہلے کلام کرنے کی عادت لوگوں کو اس وقت سے ہُوئی جب شام کے علاقہ میں عمواس میں طاعون پھیلا اور اس قدر اموات ہُوئیں کہ صبح کو ملنے والا شام کو موت کے منہ میں ہوتا تو جو بھی دوسرے کو دیکھتا وہ فوراً یہ پُوچھتا کہ کہو: صبح کیسی ہے اور شام کیسی ہے؟ اور سلام فراموش کر بیٹھا۔ اس وقت سے اس کا رواج پڑ گیا اور اس کا سبب لوگ ذہن سے بھُلا بیٹھے۔

حضرت احمد بن ابی حواریؒ سے منقول ہے کہ ایک آدمی نے ابوبکر بن عیاشؒ کو کہا:

"صبح کیسے ہُوئی یا شام کیسے ہُوئی؟"

اُنہوں نے اس کو کچھ جواب نہ دیا اور فرمایا:

"اُس نے ہمیں اس بدعت کے ذریعہ سے بلایا"

راوی بتاتے ہیں کہ میں نے ایک بزرگؒ سے پُوچھا:

"صبح کیسے رہی؟" تو انہوں نے مجھ سے اعراض کر لیا اور فرمایا:

"یہ کیا فضول بات ہے کہ صبح کیسے ہُوئی؟ یُوں کہو: السلام علیکم!"

حضرت ابو معشرؒ نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے نقل کیا:

"صحابہ یُوں کہا کرتے تھے: السلام علیکم سلمت واللہ القلوب" اور آج کل لوگ یُوں کہتے ہیں کہ صبح

---

[1] سورۃ الکہف آیت ۵۷۔

کیسے ہُوئی۔ خدا تیرا بھلا کرے۔ کیسے شام ہُوئی۔ خدا تجھے عافیت بخشے۔ اب اگر ہم اِن کا قول لیں تو یہ بدعت ہوگی۔ یاد رکھو۔ یہ کوئی عزت نہیں اور اگر وُہ چاہیں تو ہم پر غصہ منانے بیٹھ جائیں۔

اس کے علاوہ خطوط وغیرہ لکھنے کے موقع پر بھی بعض لوگ مکتوب الیہ کا نام پہلے لکھ دیتے ہیں۔ حالاں کہ سنت یہ ہے کہ اپنا نام پہلے لکھے۔ چنانچہ لکھا کرتے:

من فلان الی فلان (از فلاں بطرف فلاں)

میں کچھ مدت غائب رہا اور پھر اپنے والد کی طرف خط لکھا اور اس میں ان کا نام پہلے لکھا تو میرے والد نے میری طرف لکھا:

"اے بیٹا! جب مجھے خط لکھو تو خط میں اپنا نام پہلے لکھو اور اگر تم نے اپنے نام سے پہلے میرا نام لکھا تو میں تمہارا کوئی خط نہ پڑھوں گا اور نہ ہی جواب دوں گا۔"

حضرت علاء بن حضرمی رضی اللہ عنہ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف خط بھیجا تو اپنا نام پہلے لکھا۔ یوں لکھا:

از علاء بن حضرمی بطرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور بتاتے ہیں کہ اس کی بدعت سب سے پہلے زیاد نے جاری کی اور علماء نے اسے بُرا سمجھا اور کہا کہ یہ بنی امیہ کے احداث میں سے ہے۔ مگر پھر آج تک یہی طریقہ مروج ہو کر رہ گیا۔ حالاں کہ اسلاف کی عادت تھی کہ پہلے اپنا نام لکھتے پھر مکتوب الیہ کا نام لکھا جاتا۔

ایک نئی بات یہ بھی رواج پکڑ چکی ہے کہ ایک آدمی اپنے بھائی کے گھر میں آتا ہے اور کہتا ہے: اے لڑکے، اے لڑکی! (یعنی آواز دیتا ہے) حالاں کہ یہ طریق بھی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی میں داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰۤی اَهْلِهَا۔

(اے ایمان والو! مت جایا کرو کسی کے گھروں میں اپنے گھروں کے سوا، جب تک نہ بول چال کرو اور سلام دے لو اس گھر والوں پر)

اور مفسرین نے فرمایا:

استئناس سے مراد، دروازہ کھٹکھٹانا یا کھانسنا یا ایسی حرکت کرنا ہے کہ جس کی وجہ سے یہ معلوم ہو جائے کہ دروازے پر کوئی آدمی ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم میں سے جب کوئی آدمی اپنے بھائی کے گھر آئے تو اسے چاہیے کہ تین بار السّلامُ علیکم کہے۔ اگر اسے اجازت دی جائے تو داخل ہو ورنہ واپس چلا آئے"

سلفِ صالحین کا طریق یہ تھا کہ دروازہ کھٹکھٹاتے اور پھر تین بار السلامُ علیکم کرتے۔ ہر سلام کے بعد ذرا سا وقفہ کرتے۔ اب اگر اجازت ملتی تو داخل ہو جاتے اور اگر گھر والا اس وقت کسی کے آنے کو ناپسند کرے اس لیے کہ اسے کوئی عذر ہو تو وُہ کہہ دے: "وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔ اللہ تجھے عافیت بخشے۔ اس وقت واپس جائیے۔ مجھے کچھ کام ہے"

اب آدمی کو چاہیے کہ وہ مجبور نہ کرے اور واپس ہو جائے اور اس پر دل میں بھی نہ بگڑے اور گاہے اس کے نزدیک "لوٹ جائیے" کا قول ہی پسند ہوتا ہے۔ اس لیے تزکیہ کی امید ہونے کے باعث یہی افضل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۔[۱] (اور اگر تم کو کہا جائے کہ پھر جاؤ تو پھر جاؤ، اس میں خوب ستھرائی ہے تمہاری)

اور ایسا بھی ہُوا کہ سلفِ صالحین میں سے بعض حضرات دن میں دو یا تین بار واپس ہُوئے اور کسی نے دل میں بُرا محسوس نہیں کیا۔ اگر ہمارے اس دور میں یہ کیا جائے تو شاید اسے بُرا سمجھے اور اس دن دوبارہ واپس ہی نہ آئے۔

علماء سے ملاقات کے آداب

بعض حضرات اس بات کو بھی بُرا سمجھتے کہ علماء کو ان کے گھروں سے بلایا جائے بلکہ ان کے دروازوں پر یا ان کے قریب کی مساجد میں بیٹھ جاتے۔ آخر وہ اوقاتِ نماز میں باہر تشریف لاتے تو ملاقات کرتے۔ علم کی عظمت اور علماء کے وقار کے باعث ایسا کرتے۔

حضرت ابو عبید سے منقول ہے۔ فرمایا:

میں نے کسی عالم کا دروازہ کبھی نہیں کھٹکھٹایا بلکہ اس کے گھر پر آ کر اس کے دروازے پر بیٹھ جاتا ہوں اور انتظار کرتا ہُوں کہ وہ خود ہی باہر تشریف لائیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَ لَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۔[۲] (اور اگر وُہ صبر کرتے جب تک تو نکلتا ان کی طرف تو ان کیلئے بہتر تھا)

---

[۱] سورۃ النور آیت ۲۸ ۔ [۲] سورۃ حجرات آیت ۵ ۔

(اور چونکہ علماء، انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں۔ اس لیے اس آیت سے ان کے احترام کا حکم ثابت ہوا)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔ وہ علم کا اس قدر احترام کرتے کہ ایک آدمی گزرتا تو دیکھتا کہ گا ہے وہ کسی انصاریؓ کے گھر کے دروازہ پر کھڑے ہیں۔ ہوائیں ان پر چل رہی ہیں، تو گزرنے والا پوچھتا کہ اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے بیٹے! آپؓ یہاں کیوں بیٹھے ہیں؟ تو فرماتے:

"میں اس گھر والے کے باہر آنے کا منتظر ہوں۔"

جب گھر والا باہر آتا تو کہتا:

"اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے بیٹے! آپؓ مجھے بلا بھیجتے۔" تو فرماتے:

"نہیں، میں تمہارے پاس آنے کا زیادہ مستحق ہوں۔"

پھر پوچھتے کہ فلاں حدیث تمہارے پاس ہے اور میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنی۔

اسی طرح بھائی کے حال کی خبر گیری کا معاملہ ہے مگر اسے اس طرح معلوم کرنا ناپسند سمجھا۔

پردے کی باتیں پوچھنے کی ممانعت

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے نکاح کیا۔ رات گھر میں جانے کے بعد جب صبح لوگوں کے پاس تشریف لائے تو ایک آدمی نے پوچھا:

"اے ابو عبداللہ کیسے ہیں؟"

فرمایا: "خیریت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہوں۔"

اس نے کہا:

"کیسے حال رہا۔ رات کیسے گزاری؟"

دوسرے الفاظ یہ منقول ہیں کہ:

"اپنے اہل کو کیسے پایا؟"

حضرت سلمانؓ غضبناک ہوئے اور فرمایا:

"تم میں سے بعض لوگ غلط سوالات کرتے ہیں اور اصرار کر کے پردے کی باتیں پوچھتے ہیں؟ یاد رکھو، صرف ظاہری حالات کی خیریت معلوم کر لینا ہی کافی ہے۔"

حضرت سلیمان بن مہران اعمشؒ کو ایک آدمی نے ان کے گھر میں پوچھا:

"اے ابو محمدؒ! کیا حال ہے؟"

انھوں نے فرمایا :

" خیریت ہے ۔"

پھر پوچھا : " کیا حال ہے ؟ "

انھوں نے فرمایا :

" خیر و عافیت ہے ۔"

اس نے پھر کہا :

" رات کیسے گزاری ؟ "

وہ چلائے اور فرمایا :

" اری لونڈی ! بستره اور تکیہ لے کر نیچے آؤ ۔" جب وہ یہ چیزیں لے کر نیچے آئی تو فرمایا :
" بستره بچھا دو اور لیٹ جاؤ ۔ میں بھی تمھارے ساتھ لیٹتا ہوں تاکہ ہم اپنے بھائی کو دکھائیں کہ ہم نے رات کس طرح گزاری ؟ "

(یعنی زجراً یہ بات کر کے انھیں متنبہ کیا کہ ایسا سوال بالکل غلط ہے)

فرمایا کرتے :

آجکل ایک آدمی اپنے بھائی سے ملتا ہے تو مرغی اور انڈے تک ہر بات کے بارے میں پوچھتا ہے اور اگر وہ اس سے ایک درہم مانگے تو (اس قدر کنجوس ہے) کہ ہرگز نہ دے ۔

سلف صالحینؒ کا طریق تھا کہ جب اپنے بھائی سے ملاقات ہوتی تو ان الفاظ سے اضافہ نہ کرتے :
" آپ کیسے ہیں ؟ " اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے اور اگر کچھ مال مانگتا تو فوراً اسے دے دیتا ۔

اسی طرح آج کل ایک آدمی راستہ چلتے ہوئے اپنے بھائی سے ملتا ہے تو یہ پوچھنے بیٹھ جاتا ہے کہ :
" کہاں جا رہے ہو ؟ کہاں سے آئے ہو ؟ " ایسا کرنا مکروہ ہے ۔ نہ یہ سنت ہے اور نہ ہی ادب کی بات ہے بلکہ یہ بات تو جاسوسی کرنے اور خبر معلوم کرنے کا انداز ہے ۔ اس لیے کہ آثار میں تجسس اور اخبار میں تجسس ہوا کرتا ہے اور یہ سوال ان دو باتوں کا جامع ہے اور گاہے ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنے آنے یا جانے کی جگہ بتانا پسند نہیں کرتا ۔

حضرت مجاہدؒ اور حضرت عطاءؒ اسے مکروہ سمجھتے اور فرماتے :

" جب تم راستہ میں اپنے بھائی سے ملو تو یہ مت پوچھو کہ کہاں سے آئے اور کہاں جا رہے ہو ؟ شاید وہ سچ بولے اور تمھیں بُرا لگے اور یا وہ جھوٹ بولے اور تم اس کے جھوٹ بولنے کے باعث بن جاؤ ۔"

اسلافؒ مصاحفِ مقدسہ کو خریدنا اور فروخت کرنا ناپسند کرتے اور بعض کے نزدیک اس کا فروخت کرنا اس کے خریدنے سے زیادہ مکروہ ہے۔

آج کی بدعات

آج کل لوگوں نے ایسے کئی علوم ایجاد کر لیے جو سلفؒ کے زمانہ میں نہ تھے۔ مثلاً علم کلام و جدل، علومِ قیاس و نظر، رسول اللہؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنن پر رائے اور عقلی استدلالات۔ اسی طرح قرآن مجید کے اور احادیث کے ظواہر پر قیاس۔ رائے اور عقل کے علم کو ترجیح دینا۔ مواجید کے اشارات کو جانے بغیر اور ان کی تفصیل کے بغیر انہیں ظاہر کرنا۔ اس طرح سامعین کو حیران و پریشان کرتے ہیں اور عمل کرنے والوں کو گمراہ کرتے ہیں۔

علماء کا طریقہ یہ تھا کہ اس علم کے ذریعہ علومِ مواجید کو ظاہر کرتے اور وجدان کے اشارات مخفی رکھتے۔ لوگوں کے فائدے کی چیزیں ظاہر کرتے اور جو انہیں ضرر دیتیں، انہیں پوشیدہ رکھتے۔ اس لیے کہ مواجید دراصل احوالِ قلوب کا نام ہے۔ اس لیے ان کا مخفی رکھنا افضل ہے اور اس کے علوم حاصل کرنا دراصل سالکین و عاملین کا ہی حصہ ہے۔ ان کو ظاہر کرنا انہی کا مقصود ہے۔ اس لیے انہیں ظاہر کیا اور وجدان کو مخفی رکھا۔ اس لیے کہ یہ ان کا ایک راز ہے۔ اس طریق سے یہ لوگ تصنع و دعویٰ سے بچ گئے، سامعین کو ان کا حصہ ملا اور جو ان کا حصہ نہ تھا وہ روک رکھا۔ چنانچہ ان حضرات نے دونوں باتوں میں عدل کیا اور دونوں حالوں میں افضل کام کیا۔ آج اس علم میں جہالت ہو گئی۔ اس لیے اس کے عکس و ضد کو ظاہر کر دیا اور یہ معاملہ ضرر سے قریب اور سلامتی سے بعید تر ہے۔ اب جس کو اس کی تفصیل معلوم نہ ہو اور وہ اس علم کی تفسیر پر قدرت نہ رکھتا ہو۔ اس کے لیے خاموشی ہی بہتر ہے۔

جو آدمی سنت کے مطابق علم پر کلام نہ کر سکے۔ اس کے لیے خاموشی میں ہی قربِ الٰہی ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ مَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰهُ اللّٰهُ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰهَا۔¹	(اور جس کو ملتی ہے اس کی روزی تو خرچ کرے جیسے دیا اس کو اللہ نے، اللہ کسی پر ذمہ نہیں رکھتا مگر اتنا جو اس کو دیا)

اور جنہوں نے ازراہِ تکبر فقراء سے امتیاز کرنے کی خاطر رغبت کے مفہوم پر علومِ معرفت کا اظہار کیا تو وہ اپنا مقام نہیں بناتے تاکہ ان کے انس و احوال کے مطابق ان کی طرف اسباب پھیرے جائیں۔

---

¹ سورۃ الطلاق - آیت ۷

اسی طرح علم شرع کے خلاف توحید میں ایک علم کلام جاری کیا گیا ہے اور یہ کہ حقیقت، علم کے خلاف ہے اور حقیقت ہی علم ہے اور یہ شریعت کا ایک طریق ہے اور علم شرع اس (حقیقت) سے ہے اس لیے اس کے منافی کیونکر ہو سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس نے اس (شرع) کو لازم کیا۔ یہ اصل میں عزیمت و تنگی ہے اور علم ظاہر، رخصت و وسعت کا نام ہے۔ اب جس نے علم ظاہر کے قواعد و اصول کے بغیر علم باطن میں کلام کیا تو یہ شریعت میں الحاد کی راہ ہے اور کتاب و سنّت میں مداخلت ہے۔

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

میں نے ان شطحیات میں مبتلا لوگوں کی طرف نظر کی تو انہیں جاہل اور دھوکہ میں مبتلا یا خسارہ پانے والا پیشوا دیکھا یا لاشئی کو نمایاں و ظاہر کرنے والا پایا۔ تو ایجاد علوم میں سے ایک بات یہ ہے کہ کتاب و سنّت کی وجدان کو پھیرے بغیر دین کے معاملہ میں وساوس پیدا کیے جاتے ہیں۔ حالاں کہ ان کی تفصیل جاننا لازم ہے اور کتاب و سنت جس کی شاہد نہ ہو اس کی نفی کرنا ضروری ہے۔ اس لیے کہ جب سنت کی بتائی ہوئی راہ سے انکار کیا جا رہا ہو اور دعویٰ محبت کا ہو تو مشاہدات میں باطل و کذب اور وجدانات میں گمراہی و دھوکہ ہی پایا جائے گا۔ جبکہ موصوف کا مشاہدہ نہ ہو مگر معرفت کے بغیر، معرفت کا دعویٰ کیا جاتا ہو۔

آج کل دعا میں بھی نئی بات پیدا کر لی گئی ہے کہ دعا میں بھی مرصّع جملے اور مسجّع عبارات استعمال کی جانے لگیں اور کتاب اللہ میں وہ کلمات ذکر نہیں ہوئے اور نہ ہی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے وہ الفاظ مروی ہیں بلکہ صحابہ کرام دعا میں زیادتی کرنے سے منع کرتے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کی جو جامع دعائیں بیان فرمائیں ان کی پابندی کا حکم دیتے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"دعا میں سجع سے بچو، تم میں سے ایک آدمی کے لیے یہی کافی ہے کہ یوں کہو:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ الْجَنَّۃَ وَ مَا قَرَّبَ اِلَیْھَا مِنْ قَوْلٍ وَ عَمَلٍ وَ اَعُوْذُبِکَ مِنَ النَّارِ وَ مَا قَرَّبَ اِلَیْھَا مِنْ قَوْلٍ وَ عَمَلٍ۔

(اے اللہ میں تجھ سے جنت اور اس قول و عمل کا سوال کرتا ہوں جو اس کی طرف قریب کر دے اور میں آگ سے اور اس قول و عمل سے تیری پناہ مانگتا ہوں کہ جو اس (نار) کے قریب کرے)"

حدیث میں ہے:

"عنقریب ایک قوم ایسی آئے گی جو دعا و طہارت میں زیادتی کرے گی۔"

حضرت عبداللہ بن مغفل نے اپنے بیٹے کو گہرے انداز سے دعا کرتے سنا تو فرمایا:

"اے بیٹے! دعا میں جدّت پیدا کرنے اور زیادتی کرنے سے بچو"۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔ ؎۱ (اپنے رب کو گڑگڑاتے اور چپکے پکارو، اس کو پسند نہیں آتے حد سے بڑھنے والے)

ایک قول کے مطابق مراد ہے دعا میں ایسا کرو، چنانچہ دعا میں زیادتی اس بات کا نام ہے کہ اولیاء اللہ کی ان دعاؤں کو چھوڑ دیا جائے جن کی خبریں اللہ تعالیٰ نے دیں۔ جن میں مغفرت، رحمت کا سوال کیا گیا اور توبہ کا ذکر آیا۔ الغرض دعا میں تصنّع کرنے اور تغریب و تدقیق کرنے سے بچے۔

مشائخ بتاتے ہیں کہ :

"علماء اور ابدال اپنی دعا میں سات سے زیادہ کلمات نہیں لاتے"۔

میں نے کتاب اللہ میں اس کی تصدیق بھی پائی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی طرف سے صرف ایک ہی جگہ میں سات سے زیادہ دعاؤں کا ذکر کیا ہے اور یہ سورۃ البقرہ کے آخر میں ہیں ورنہ عام طور پر کتاب اللہ میں مستغرق مقامات پر دو تین یا پانچ کا ہی ذکر ہُوا۔

سلف صالحین میں سے ایک بزرگ ایک قصّہ گو کے پاس سے گزرے جو دعا میں خُوب تعمق دکھا رہا تھا۔ فرمایا :

"تیرا ناس ہو تو اللہ پر مبالغہ کرتا ہے؟ میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے حبیب عجمی کو دعا مانگتے دیکھا تو وہ اس سے زیادہ کلمات نہ کہتے :

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا جيدين اَللّٰهُمَّ لَا تَفْضَحْنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنَا الْخَيْرَ۔ (اے اللہ ہمیں باعزت بنا دے۔ اے اللہ ہمیں قیامت کے دن رسوا نہ کرنا۔ اے اللہ ہمیں بھلائی کی توفیق عطا فرما)

اور لوگ ہر طرف رو رہے ہوتے اور ہمیں ان کی دعا کی قبولیت و برکت کا یقین ہوتا۔

حضرت ابویزید بسطامیؒ فرمایا کرتے :

"اس سے زبانِ حاجت سے مانگ، زبانِ حکمت سے نہ (مانگ)"۔

حضرت حسنؓ نے فرمایا :

؎۱ سورۃ اعراف - آیت ۵۵۔

" اس سے فصاحت وطلاقت کی زبان سے نہ مانگ بلکہ زبانِ احتیاج وزاری کے ساتھ اس سے مانگ۔"

تلاوتِ قرآن میں بدعات

ایک بات یہ نئی نکل آئی کہ گھما کر قرآن کی تلاوت لیتے ہیں یا دو آدمی دو آیات کو ایک ہی جگہ میں جھپٹنے اور چھیننے کے انداز میں لیتے ہیں۔ اور خشوع وخضوع کا نام بھی نہیں ہوتا بلکہ کھیل سمجھ رکھا ہے۔ حالاں کہ تلاوتِ قرآن مجید میں حزن وسکون اور خشوع کی ضرورت ہے۔ اس طرح دو پر قرأت لینا۔ کاش کہ وہ ایک کی قرأت کا اہتمام (سماعت) کرتا اس لیے سہوِ قلب کا ڈر ہوتا ہی ہے۔ جیسے کہ ابراہیم حربی سے کہا گیا کہ فلاں دو پر (قرأت) لیتا ہے تو فرمایا، افسوس۔ حالانکہ دو کو ایک پر لینی چاہیے۔

ایک بدعت یہ پیدا ہوئی کہ قرآن کی تلاوت میں اس طرح کا لحن کیا جاتا ہے کہ تلاوت ہی سمجھ نہیں آتی آواز اس قدر طویل ہوتی ہے کہ چھوٹی مد سے تجاوز ہو جاتا ہے۔ مدغم، ظاہر اور ظاہر، مدغم ہو جاتا ہے۔ اور لحن کو درست رکھنے کی فکر کی جاتی ہے مگر کلمات کے بدل جانے اور اصل حالت سے نکل جانے کی کچھ پروا نہیں ہوتی۔ یہ بات بدعت ہے اور اسے سننا بھی مکروہ ہے۔

حضرت بشر بن حرثؒ نے فرمایا:

میں نے ابی داؤد حربی سے دریافت کیا۔ انھوں نے ایک آدمی کو بیٹھ جانے کا حکم دیا جو پڑھ رہا تھا

کہا: وہ طربیہ طور پر کہہ رہا تھا؛

میں نے کہا: "ہاں"۔

کہا: "نہیں، اس نے بدعت ظاہر کر دی۔"

اس طرح اذان میں لحن پیدا کیا گیا یعنی زیادتی کر دی گئی۔ ایک آدمی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے کہا:

"میں اللہ تعالیٰ کی خاطر آپ سے محبت رکھتا ہوں۔"

انھوں نے فرمایا:

"لیکن میں اللہ تعالیٰ کی خاطر تم سے بغض رکھتا ہوں۔"

اس نے پوچھا:

"اے ابو عبدالرحمٰن! یہ کیوں؟"

فرمایا: "اس لیے کہ تو اذان میں (لحن کرتے ہوئے) زیادتی کرتا ہے اور اذان پر اُجرت لیتا ہے۔"

حضرت ابوبکر آجری ؒ فرمایا کرتے،

"میں بغداد سے نکلا اور اس وقت میرے لیے وہاں کوئی مناسب جائے قیام نہ تھا۔ لوگوں نے ہر بات میں بدعات جاری کر رکھی تھیں۔ حتیٰ کہ تلاوتِ قرآن اور اذان تک میں (لحن وغیرہ کی) بدعات جاری کر رکھی تھیں اور وُہ مکہ میں ۳۰ھ میں آئے۔

الغرض بعد والوں نے کئی بدعات پیدا کیں۔ اسلاف کے برعکس بعض باتوں میں شدت پیدا کر دی۔ جن میں سلف صالحین شدت کرتے۔ ان میں ان لوگوں نے رخصت کر دی مثلاً خوارج نے صغیرہ گناہوں کے بارے میں شدت اختیار کی اور آثار وسنت میں رخصت کی راہ لی اور جماعت کا مذہب ترک کر کے ان سے جُدا ہو گئے۔ اس طرح احادیث کے انواعِ طرق لکھنے، طرح طرح کے غرائب تلاش اور الفاظ کی تحری کرنے میں شدت اختیار کر لی۔

ابن عون ؒ فرماتے ہیں:

"میں نے تین کو معانی میں رخصت اختیار کرتے ہُوئے پایا:

۱۔ ابراہیم ؒ

۲۔ شعبی ؒ

۳۔ حسن ؒ

اور صحابہ وسلف رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت احادیث کے مفہومات میں توسع کی قائل تھی۔

اسی طرح تجویدِ حروف اور ایک ہی آیت کو تمام اختیاری اسالیب کے مقابلہ میں ایک ہی اسلوب پر زور دیا۔ گویا وہی اس پر فرض ہے۔ قیاس ونظر میں دقت نظری پیدا کرنا، علوم نحو وادب عربی میں تبحر حاصل کرنا بھی بعد کی پیداوار ہے جیسے کہ ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

ہم نے فصاحت سے کلام کیا۔ چنانچہ لحن نہیں کیا اور اعمال میں لحن کر لیا۔ کاش! ہم کلام میں لحن کرتے اور اعمال میں فصاحت (خلوص) دکھاتے۔ حضرت قاسم بن مخیمرہ ؒ کے سامنے عربیت کا ذکر کیا گیا تو فرمایا:

"اس کا آغاز تکبر ہے اور انجام سرکشی ہے۔"

سلف صالحین میں سے ایک بزرگ ؒ فرماتے ہیں:

"نحو کا علم، دل سے خشوع کو نکال دیتا ہے۔"

ایک بزرگ ؒ فرماتے ہیں:

"جو تمام لوگوں کی عیب جوئی کرنا چاہے اسے ادب (زبان دانی) سیکھنا چاہیے۔ اس کے علاوہ آجکل لوگوں نے پانی کے ساتھ طہارت کرنے اور کپڑوں کو صاف و پاک کرنے اور غسل میں شدت اختیار کر رکھی ہے کہ جنبی کے پسینہ اور حائضہ کے لباس کے لگنے سے بدن دھونے لگے ہیں۔ اس طرح ماکول جانوروں کے گوبر و پیشاب لگنے پر بھی (غسل) کرنے لگے ہیں اور معمولی خون وغیرہ کو بھی دھونے لگے۔ حالاں کہ ان سب امور میں سلف صالحین رخصت پر چلتے تھے۔"

اور سلف صالحین نے جن امور میں شدت اختیار کر رکھی تھی ان میں آج کل رخصت نکالی جا رہی ہے سلف کا طریقہ تھا کہ کاروبار کے معاملہ میں حلال روزی تلاش کرنے اور دنیا میں زیادہ مصروفیت سے بچنے، لایعنی کلام سے بچنے میں شدت کرتے۔ اس طرح باطل امور، غیبت، چغلی اور ان باتوں کے سننے میں سختی سے پرہیز کرتے۔ بدظنی سے دُور رہتے۔ اس لیے کہ بدظن کا غیبت و چغلی میں حصّہ ہے اور مبالغہ سے دُور رہتے۔ اس لیے کہ مبالغہ میں کمی یا بیشی ہو جاتی ہے۔ اگر برائی میں مبالغہ ہے تو وُہ بڑھ گئی اور اگر نیکی میں ہے تو وہ کم ہوگئی مگر آج کل لوگوں نے جھُوٹ، کھیل اور اہلِ باطل کی مجالس میں شرکت کرنے، خواہش و تعصب کی راہوں پر چلنے اور دنیا کی حرص کرنے میں سہولت اختیار کر لی۔ حالانکہ سلف صالحین ان امور سے سختی سے پرہیز کرتے۔

آجکل ایک بُرائی یہ جاری کی گئی ہے کہ بلا ضرورت عورتیں حمام میں جانے لگیں اور مرد بغیر ازار بند کے حمام میں جانے لگے۔ حالاں کہ یہ فسق و بد معاشی ہے۔

حضرت ابراہیم حربی رحمۃ اللہ علیہ سے پوُچھا گیا کہ "ایک آدمی نبیذ پیتا ہے مگر اسے نشہ نہیں ہوتا۔ کیا اس کے پیچھے نماز پڑھ لی جائے؟"

فرمایا: "ہاں"

پھر پوچھا گیا کہ "جو آدمی ازار بند کے بغیر حمام میں داخل ہو اس کے پیچھے نماز ہو سکتی ہے؟" تو انہوں نے فرمایا:

"اس کے پیچھے نماز نہ پڑھی جائے۔"

اس کی وجہ یہ ہے کہ نبیذ پینے والے پر اگر سکر نہ آئے تو اس کے بارے میں اختلاف ہے اور بغیر ازار بند کے حمام میں جانا بالاجماع حرام ہے۔

بعض علماء کا فرمان ہے:

"حمام میں داخل ہونے والے کے لیے دو پردے چاہئیں۔ ایک چہرہ کا پردہ اور ایک شرمگاہ کا پردہ۔

ورنہ حمام میں داخلہ پر سلامتی نہیں۔"

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں:

"حمام ایسی عیاشی ہے جو کہ بعد والوں کی ایجاد ہے اور حمام میں ایک برائی ہونے لگی کہ ایک مسلمان کی شرمگاہ کے لیے نورہ لگانے کا معاملہ ایک کے سپرد کیا جائے۔" (یعنی وہ نورہ دے)

علمائے سلفؒ کا یہ طریق تھا کہ وہ مجلس میں اس انداز سے بیٹھتے کہ دونوں گھٹنے کھڑے کر لیتے۔ بعض پاؤں پر بیٹھتے اور اپنی دونوں کہنیاں اپنے دونوں گھٹنوں پر رکھ لیتے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے ہی علمائے کرام کی خطاب کے وقت یہ عادت تھی اور حضرت حسن بصریؒ کے دور سے بھی طریق تھا کہ یہاں آنے سے پہلے حضرت ابوالقاسم جنیدؒ کے دور تک یہی طریق مروج رہا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہی مروی ہے کہ:

"آپ اکڑوں بیٹھتے اور بازو لپٹا لیتے۔"

دوسری روایت یہ ہے کہ:

"آپ اپنے دونوں پاؤں پر بیٹھتے اور اپنی کہنیاں اپنے دونوں گھٹنوں پر لگا لیتے۔"

ان اہل علم میں سے سب سے پہلے حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ مصر میں کرسی پر بیٹھے۔ بغداد میں ابوحمزہؒ نے بھی ان کا اتباع کیا۔ دوسرے مشائخ نے اس بات کو معیوب سمجھا۔ اس لیے کہ علمِ معرفت و یقین میں کلام کرنے والے عارفین اسلافؒ کا یہ طریق نہ تھا۔ اہلِ نحو اور اہلِ لغت اور دنیا دار مفتیوں کا طریقہ چوکڑی بھر کر بیٹھنے کا ہے۔ یہ متکبرین کا انداز ہے۔ حالاں کہ مجلس میں تواضع اختیار کرنی چاہیے۔

پرانے اور نئے علوم

اسلاف کے چار علوم

یاد رہے کہ آج کل علوم کی تعداد نو ہے۔ ان میں سے چار تو صحابہ و تابعین کے زمانہ میں مشہور تھے اور پانچ نو ایجاد ہیں جو کہ اسلاف کے دور میں نہ تھے۔ مشہور چار علوم حسب ذیل ہیں:

۱۔ علم الایمان۔

۲۔ علم القرآن۔

۳۔ علم سنن و آثار۔

۴۔ علم فتاویٰ و احکام۔

اور نئے ایجاد ہونے والے پانچ علوم حسب ذیل ہیں:

۱۔ نحو

۲۔ عروض

۳۔ علم پیمائش

۴۔ فقہ میں جدل کا علم۔

۵۔ علم معقول،

علم علل حدیث، طرق کا طریقہ، ضعیف راویوں کی تقلیل اور ناقلین آثار کی تضعیف کا علم، یہ نوایجاد علوم ہیں۔ البتہ جو لوگ ان کے اہل ہیں ان کے لیے یہ علوم ہیں اور اس کے اصحاب اس علم کو سنتے ہیں۔

صحابہ کرام قصہ گوئی کو بدعت سمجھتے اور اس سے منع فرماتے اور قصہ گو کی مجلس میں بیٹھنے کو ناپسند کرتے بعض علماء کا فرمان ہے:

"فلاں آدمی اچھا ہے۔ بشرطیکہ وہ قصہ گوئی نہ کرے۔"

اسی گروہ کے ایک بزرگؒ فرماتے ہیں:

"اہل معرفت میں حکایات بیان کرنے والا، فقہاء میں قصہ گو کی طرح ہے"۔

ایک بزرگؒ فرماتے ہیں:

"علماء میں قصہ گو لوگوں کی مثال ایسے ہے جیسے اہل شہر میں سیاہ فام لوگ ہوں۔"

اور دین کے عوض دنیا کھانا اور علم کو فروخت کر کے دنیا حاصل کرنا اور عوام کے لیے تصنع اور زیب و زینت اختیار کرنا سب سے بدترین ایجاد ہے۔ جو آدمی بھی علمی بصیرت رکھتا ہو۔ وہ اس کی خرابی سے بخوبی آگاہ ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس قسم کے دنیا داروں کو اس زمانہ کے جاہل لوگ علماء سمجھتے ہیں، اور متقدمین عظامؒ سے طریق سے ناواقف لوگ ایسے لوگوں کو فضلاء میں شمار کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ لوگوں کو علم دین کی حقیقت کی ہوا بھی نہیں لگی۔

یاد رہے کہ ہمارے نزدیک کلام کی سات اقسام ہیں۔ ان میں سے صرف ایک قسم کا نام علم ہے اور باقی چھ قسم کا کلام لغو اور مردود ہے۔ ان چھ مردود اقسام میں سے صرف وہی آدمی حصہ لیتا ہے جس کو کچھ معرفت حاصل نہ ہو اور جو علم و جہالت کے درمیان بھی تمیز نہ کر سکے۔

عرب لوگ ہر گری ہوئی چیز کو لاقطعۃ کہا کرتے ہیں اور ہر قائل کو ناقلۃ کہا کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ چھ اقسام کا کلام انک، سفاہت، خطا، ظن، زخرف اور وسوسہ کہلاتا ہے۔ علماء کے نزدیک ان کے یہ نام ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ علم کے مطابق وہ ان کی توضیح فرماتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے علماء کو اپنے دین

اور بندوں پر شاہد بنایا۔

کلام کی ساتویں قسم علم ہے اور وُہ ان چھ سے جُدا ہے۔ علم وُہ ہے جو قرآن و سنت کی نص سے ثابت ہو۔ یا کتاب و سنت اس پر دلالت کریں اور وہ بات کتاب و سنت سے استنباط کی جائے یا قول و فعل کے اعتبار سے اس کا مفہوم ان میں پایا جائے اگر تاویل اجماع سے خارج نہ ہو تو علم میں داخل ہے اور اگر استنباط کا مرکز کتاب میں ہو۔ مجمل اس کا شاہد ہو اور نص اس کے خلاف نہ ہو تو یہ علم ہے۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے:

"آج تم ایسے دور میں ہو کہ خواہش علم کے تابع ہے۔ تم پر ایک زمانہ بھی آنے والا ہے کہ اس وقت علم خواہش کے تابع ہوگا۔"

اللہ تعالیٰ نے زخرف کا نام دے کر عقلی رونق اور دنیاوی فائدہ کو جمع کر دیا۔ فرمایا:

وَلِبُيُوتِهِمْ اَبْوَابًا وَّ سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِئُوْنَ ۝ وَ زُخْرُفًا۔ (اور ان کے گھروں کو دروازے اور تخت جن پر ٹیک بیٹھیں اور سونے کے)

اسی طرح فرمایا:

زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا۔ (ملمع باتیں فریب کی)

چنانچہ جاہل آدمی، دنیاوی دھوکہ سے بھرپور رنگین کلامی کو مستحق سمجھتا ہے جیسے کہ ایک دنیا دار جاہل حقیقت واقعی سے ہٹ کر محض ملمع سازی کے ذریعہ کام چلاتا ہے اور زخرف کا معنی ہے ایسا رنگ چڑھانا کہ سونے سے مشابہ چیز معلوم ہو۔ ایک جاہل آدمی اور ایک بچہ اس ملمع شدہ چیز کو دیکھ کر سچ مچ سونا سمجھ بیٹھے۔ اسی طرح اگر کلام پر رنگ آمیزی کر کے اسے علم سے مشابہ بنایا جائے تو یہ زخرف القول ہوگا۔ جس کو ایک جاہل سامع علم سمجھتا ہے۔ اس طرح دونوں کو زخرف میں جمع کر دیا۔ ایک قول یہ ہے کہ زخرف ہی سونا ہے۔ اس طرح ایک دھوکہ باز اور سونے سے مشابہت دینے والے کا قول علمائے ربانیین کے نزدیک صاف اور عیاں ہوتا ہے اور زاہدین اسے پہچان لیتے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ پتھر اور مٹی کو انبیاء اور صدیقین سے مشابہت دی جائے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے:

"لوگوں نے علم چھوڑ دیا اور (درخت) لگانے میں توجہ کر لی۔" (باغات میں توجہ کر لی) کس قدر کم علم ہیں یہ لوگ۔ بس اللہ سے ہی مدد کی درخواست ہے۔

امام مالک بن انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"گزشتہ زمانہ میں لوگ اس قسم کی باتیں نہیں پُوچھتے تھے جیسے کہ آجکل پُوچھتے ہیں اور اکثر امور میں علماءؒ کھٹ سے یہ نہ کہتے کہ" یہ حرام ہے اور یہ حلال ہے۔"

میں نے انہیں دیکھا کہ وہ کہا کرتے کہ:

"یہ مستحب ہے، یہ مکروہ ہے۔" اور امام مالکؒ سے جب پوچھا جاتا تو عام طور پر توقف فرماتے اور اکثر اوقات فرماتے:

"مجھے معلوم نہیں کسی دُوسرے سے پوچھو۔"

ایک آدمی نے عبدالرحمٰن بن مہدیؒ سے کہا:

"آپ جانتے ہیں۔ فلاں آدمی علم میں علمی قطعیت کے ساتھ یہ کہتا ہے کہ: "یہ حلال ہے، یہ حرام ہے۔" یعنی اہل رائے میں سے ایک آدمی ایسا کرتا ہے اور امام مالک کا طریق یہ ہے کہ ان سے بات پوچھی جائے تو وُہ فرماتے ہیں:

"میرا خیال اس طرح ہے، میرا خیال اس طرح ہے۔" تو اس پر عبدالرحمٰنؒ نے جواب دیا:

"تیرا ناس ہو، میرے نزدیک مالک کا قول اُحِبُّ اَحِبُّ (میرا خیال اس طرح ہے) اس آدمی کے اشہد اشہد (میں قطعیت سے گواہی دیتا ہُوں) سے زیادہ پسندیدہ ہے۔"

حضرت ہشام بن عروۃؒ فرمایا کرتے:

"جو ان لوگوں سے نئی ایجاد کی ہے۔ اس کے بارے میں نہ پُوچھو بلکہ ان سے سنن کے بارے میں دریافت کرو۔ یہ انہیں پہچانتے ہی نہیں۔"

حضرت شعبیؒ جب لوگوں کی نو ایجاد رائے وخواہش کو دیکھتے تو فرماتے:

"مجھے اس مسجد میں بیٹھنا، اس چیز سے زیادہ محبوب تھا کہ جس کے یہ برابر ہو۔ مگر جب سے اس میں ریاکار لوگ آئے تو مجھے یہاں بیٹھنا بُرا لگنے لگا اور میرے لیے کوڑے کے ڈھیر پر بیٹھنا ان کے پاس بیٹھنے سے زیادہ پسند ہے۔"

نیز فرمایا کرتے:

"ان لوگوں نے جو سنن و آثار نئے معلوم کیے ان کو لازم پکڑ لو اور ان لوگوں نے جو رائے ایجادات کیں ان پر لکیر پھیر دو۔"

ایک بار فرمایا:

"ان پر پیشاب کر دو۔"

سلف صالحین اس بات کو پسند کرتے کہ علمِ معقول سے انسان عاجز اور نادان رہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس (بلاہت) کو ایمان میں سے قرار دیتے۔ اسے حیاء کے ساتھ ملا کر فرمایا:

"حیاء اور تواضع دونوں ایمان کے دو شعبے ہیں اور فحش گوئی اور بیان، نفاق کے دو شعبے ہیں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ کو مخلوق میں سے مبغوض ترین وُہ بلیغ آدمی ہے جو کہ اپنی زبان کے ساتھ کلام کی اس طرح (جگالی کرتا ہے) منہ میں کلام اولتا بدلتا ہے جیسے کہ گائے گھاس کو منہ میں اولتی بدلتی ہے۔"

ایک دوسری حدیث میں آتا ہے:

"دل سے تواضع ہو نہ کہ زبان سے ہی تواضع ہو۔"

اور فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے بیان، کامل بیان کو ناپسند کیا۔"

چنانچہ اصل فقہ، پروردگار کریم سے فقاہتِ قلبی کا نام ہے اور زبان کی فقہ صرف بیان ہے اور یہ شہادت و یقین سے قلبی تواضع ہے اور سلف صالحین جس طویل سکوت اور زبانی تواضع کو مستحب سمجھتے تھے۔ آج وُہ عُجب و فخر ہے۔

اور آج کل بعض ایسے متکلمین پائے جاتے ہیں کہ جو بدعت اور نفاق کے کلام میں تمیز نہیں کر سکتے۔ جس کی متقدمین نے مذمت فرمائی مگر آج وہی (بدعت) سنت بن گئی اور اس کا کلام کرنے والے علماء کہلانے لگے۔ آج بُرائی نیکی بن گئی اور نیکی کو برائی سمجھا جانے لگا۔ سنت بدعت بن گئی اور بدعت کو سنت قرار دیا جارہا ہے۔ آخری زمانہ میں علماء سوء کی یہی تعریف احادیث میں آئی ہے۔

ایک مشہور حدیث میں ہے:

"اللہ تعالیٰ بکواسی اور جبڑے چلانے والوں سے بغض رکھتا ہے۔"

اب جس پر یہ حال طاری ہُوا وہ علم رائے و عقلیات میں بلیغ اور اس کا دل مشاہدۂ یقین اور علمِ ایمان سے عاجز ہے۔ یہ نفاق کے قریب تر اور حقیقتِ ایمانی سے دُور ہے۔

حضرت ابوسلیمان داراٹی فرمایا کہتے:

"جس آدمی کو کچھ بھلائی کی بات القاء ہو، اسے چاہیے اس وقت تک اس پر عمل نہ کرے جب تک کہ اس پر (عمل کرنے کے حکم کی) حدیث نہ سن لے۔ (اگر ایسا ہو) تو اللہ تعالیٰ کی حمد کہے کہ جو اس کے جی میں آیا وُہ (سنت کے) مطابق ہے۔"

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"میں نے اس وقت تک اپنے دل کا خیال قبول نہیں کیا جب تک کہ دو عادل گواہوں نے اسے درست قرار نہ دے دیا ہو۔ کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔"

ہمارے امام ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے:

جب بندے میں یہ چار باتیں ہوں۔ اسی وقت ہی وہ حقیقی ایمان تک پہنچتا ہے۔

۱۔ مسنون طریق پہ ادائیگیِ فرائض۔

۲۔ تقویٰ کے ساتھ حلال کھانا۔

۳۔ ظاہر و باطن میں ممنوعات سے پرہیز کرنا۔

۴۔ اس حال پر موت تک صبر کرنا۔

اسلافؒ طلوعِ فجر کے بعد سے لے کر طلوعِ آفتاب تک ذکر اللہ کی بجائے باتیں کرنے کو بُرا سمجھتے اور باتیں کرنے والوں کو مسجدوں سے باہر نکال دیتے چنانچہ مسجد میں صرف نماز پڑھنے والے اور ذکر اللہ کرنے والے ہی باقی رہ جاتے۔

سلف صالحینؒ کا طریق یہ تھا کہ وہ دین کے معاملے میں ذرا سے اعتراض اور اسلام میں دقائق بازی کو سخت خوفناک بات سمجھتے۔ اس لیے کہ ان کے قلوب میں ایمان و سنّت راسخ تھے اور حقیقی نیکی و تقویٰ سے وہ بخوبی آگاہ تھے۔ حضرت عبداللہؓ بن مغفل نے اپنے بیٹے کو امام کے پیچھے پڑھتے ہوئے سُنا، تو فرمایا:

"اے بیٹے! بدعت سے بچو، بدعت سے بچو۔"

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو کلام میں سجع کرتے سُنا تو فرمایا:

"ایسا طریقہ تجھے میرے نزدیک مبغوض کر دے گا اور میں کبھی بھی تیری ضرورت پُوری نہیں کروں گا۔"

وُہ کسی ضرورت کے سلسلہ میں ان کے پاس آئے تھے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا:

"طلاقتِ لسانی سے زیادہ بُری چیز انسان کو نہیں ملی۔"

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن رواحہؓ کو سجع کرتے ہُوئے سُنا کہ انہوں نے تین کلمات کو مسلسل مسجع کیا اور فرمایا:

"اے ابنِ رواحہ! سجع سے بچو۔"

چنانچہ جو دو کلمات سے زیادہ میں ہُوا وہ سجع ہے۔ اس طرح ایک آدمی کو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے جنین کی دیت دینے کا حکم دیا اور آپؐ نے فرمایا :

کیف ندی من لا شرب و لا اکل و لا صاح و لا استھل ؟

جس نے نہ پیا ، نہ کھایا اور نہ آواز دی اور نہ رویا اس کی دیت کیسے دیں؟

اس قسم کا سجع باطل ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" اعراب کے سجع کی طرح سجع کرو "

منقول ہے کہ جب مروان نے نمازِ عید کے لیے منبر ایجاد کیا تو حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اٹھے اور فرمایا :

" اے مروان ! یہ کیا بدعت ہے ؟"

اس نے کہا کہ "یہ بدعت نہیں بلکہ اس سے بہتر ہے جو آپ سمجھتے ہیں۔ لوگوں کی کثرت ہو چکی ہے۔ میں نے سوچا کہ ان تک آواز پہنچ جائے "

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے فرمایا :

" جو میں جانتا ہوں اس سے بہتر تم ابد تک نہیں لا سکتے۔ اللہ کی قسم، آج میں تیرے پیچھے نماز نہیں پڑھوں گا "

چنانچہ وہ تشریف لے گئے اور اس کے ہمراہ نمازِ عید ادا نہیں فرمائی۔ چنانچہ نمازِ عید میں منبر پر خطبہ اور استسقاء کا خطبہ دونوں باتیں بدعت ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں موقع پر کمان پر یا لاٹھی پر سہارا لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ایک بار نمازِ مغرب میں تاخیر ہوگئی۔ حتیٰ کہ ستارہ طلوع ہُوا تو اُنہوں نے ایک غلام آزاد کیا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی سنّت پر عمل کرتے ہُوئے غلام آزاد کیا۔ وہ ان کے نانا تھے۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ ایک بار انہوں نے نمازِ مغرب میں تاخیر کر دی۔ حتیٰ کہ دو ستارے طلوع ہو گئے تو انہوں نے دو غلام آزاد کیے۔

حدیث میں ہے :

" میری اُمت اس وقت تک دین سے بھلائی پر ہو گی۔ جب تک کہ جو یہودیوں سے مشابہت کرتے ہُوئے ستاروں کے نکل آنے تک نمازِ مغرب میں تاخیر نہیں کریں گے اور عیسائیوں کی مشابہت کرتے ہُوئے ستاروں کے غائب ہونے تک صبح کی نماز میں تاخیر نہیں کریں گے "

حضرت سفیان ثوریؒ اور یوسف بن اسباطؒ نے فرمایا:

"جس کا کوئی دین نہ ہو، اپنا دین اس کی تقلید میں نہ ڈال۔"

حضرت وکیعؒ نے فرمایا:

"میں کسی بدعتی سے دینی معلومات حاصل کرنے کی بجائے زنا کو پسند کروں۔" (یعنی بدعتی سے دین کا علم حاصل کرنا بدکاری سے بڑا جرم ہے۔ اس لیے کہ اس صورت میں بدعتی کا احترام کرنا ہوگا)

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ عام طور پر عبید اللہ بن موسیٰ علیسی کے پاس آیا کرتے۔ پھر انہیں معلوم ہوا کہ وہ کوئی معمولی سی بدعت کر رہا ہے۔ ایک قول کے مطابق وہ (عبید اللہ) حضرت علیؓ کو حضرت عثمانؓ پر مقدم رکھتا تھا۔ ایک قول کے مطابق حضرت معاویہؓ کا برائی سے ذکر کرتا تھا تو حضرت احمد بن حنبلؒ چلے گئے اور ان سے حاصل کردہ تمام روایات پھاڑ دیں اور ان سے کچھ روایت نہیں کیا۔

ایک بار ان سے پوچھا گیا:

"اے ابو عبداللہ! وکیع سلف سے زیادہ مشابہ ہیں یا عبید اللہ زیادہ مشابہ ہیں؟"

فرمایا: "وکیع زیادہ مشابہ ہیں۔ چاہے اس نے زنا کیا ہو۔"

حضرت ابراہیم حربیؒ سے مروی ہے۔ فرمایا:

"میں نے اللہ تعالیٰ (کی رضا) کی خاطر یہ حضرت علی بن مدینی رضی اللہ عنہ کے بارے میں لکھا کہ میں ان سے کبھی ایک حرف بھی روایت نہیں کروں گا۔"

پوچھا گیا: "اے ابو اسحٰق یہ کیوں؟"

اس پر انہوں نے ایک بار ان کا ایک بدعتی کے پیچھے نماز ادا کرنے کا ذکر کیا۔

وہ فرمایا کرتے، میں نے کئی فقہاء و محدثین اور اہل لغت و عربیت کی ستر سال تک مصاحبت کی، مگر آجکل جن مسائل کا ذکر کیا جاتا ہے میں نے ان سے اس قسم کا کوئی مسئلہ نہیں سنا۔ یعنی یہ اسم ہے اور یہ مسمّٰی ہے وغیرہ۔ اور فرمایا:

میرے لیے یہ بات سخت پریشان کن ہے کہ اہل کلام اور اہل جدل میں سے ایک آدمی آکر میری مجلس میں حاضر ہو یا مجھ سے اس قسم کا کوئی سوال پوچھے۔ اس لیے کہ مجھے علم کلام کا کچھ علم نہیں اور نہ ہی میں اس کو اچھا سمجھتا ہوں اور نہ ہی میں ان کے ماہرین کی بات کروں۔ اگر میں ان میں سے کسی کو پہچان لوں تو بھی ان سے کلام نہ کروں اور نہ ہی انہیں کسی بات کا جواب دوں۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ نے شافعیؒ کے صاحب ابو ثورؒ کو اس وجہ سے چھوڑ دیا کہ ایک بار

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے اس فرمان" ان اللّٰہ تعالیٰ خلق آدم علیٰ صورتہ" کا معنی معلوم کیا تو انہوں نے کہا:

ھا اصل میں آدم کی طرف جاتی ہے" اس پر امام احمدؒ ناراض ہوئے اور فرمایا:

تیرا ناس ہو، آدم کی کون سی صورت تھی جس پر اسے پیدا کیا جا رہا ہے۔ اس کا ناس ہو۔ یہ کہہ رہا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مثال پر پیدا کیا تو اس حدیثِ مفسّر کا کیا جواب ہو گا؟ کہ

" ان اللّٰہ تعالیٰ خلق آدم علیٰ صورۃ الرحمٰن"۔

حضرت ابو ثور کو جب یہ بات پہنچی تو وہ ان کے پاس حاضر ہوئے اور معذرت چاہی اور حلف اٹھایا کہ انہوں نے اعتقاد سے یہ بات نہ کی تھی بلکہ یہ ان کی محض ایک رائے تھی اور اصل بات وُہ ہے جو آپ نے فرمائی اور یہی میرا مذہب ہے۔

امام احمدؒ نے حضرت حارث محاسبی رحمۃ اللہ علیہ کو چھوڑ دیا، حالاں کہ وُہ اہل سنّت سے تھے۔ اس لیے کہ وہ بدعتیوں کا رد کرتے۔ امام صاحب فرماتے کہ:" جب تم نے ان کا قول نقل کیا تو ان کا رد کیونکر کیا؟" نیز یہ بھی فرماتے کہ ایسا کرنے سے تم ہی انہیں اپنے دلائل کے جواب سوچنے اور رائے دینے پر آمادہ کرتے ہو۔ اس طرح یہ حق کو باطل طریق سے رد کرنے کا باعث بنتا ہے۔

ایک موقع پر حضرت یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ سے بھی علیحدہ ہو گئے۔ اس لیے کہ انہوں نے کہا تھا کہ " اگر مجھے شیطان بھی دے تو لے لوں گا"۔

حضرت مالک بن انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

" یہ مسنون نہیں ہے کہ تم سنت سے مجادلہ کرو بلکہ سنت کی خبر دیا کرو۔ اگر قبول کر لیا جائے تو ٹھیک ورنہ خاموش رہو"۔

حضرت عبدالرحمٰن بن مہدی رضی اللہ عنہ سے کسی نے کہا کہ فلاں آدمی بدعتیوں کا ردّ کرتا ہے تو انہوں نے فرمایا:

" کیا کتاب اللہ اور سنّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ذریعہ رد کرتا ہے؟"

انہوں نے جواب دیا:

" نہیں، بلکہ عقلیات کے ذریعہ رد کرتا ہے"۔ تو فرمایا:

" بہت بُرا کرتوت ہے۔ بدعت کا ردّ بدعت سے کر رہا ہے"۔

زید بن احزمؒ نے وہب بن جریرؒ سے نقل کیا۔ فرمایا:

میں نے حضرت شعبہ رحمۃ اللہ علیہ کو یہ فرماتے سُنا کہ میں حرث عکلی ؒ کے پاس حاضر ہوا اور پُوچھا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا کیا مطلب ہے ،

" اذا تبع احدکم جنازہ فلا یجلس حتی توضع ۔" (جب تم میں سے کوئی کسی جنازہ میں جائے تو جب تک رکھا نہ جائے ، وُہ بھی نہ بیٹھے) تو انھوں نے فرمایا :

کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ لایا جائے اور ابھی قبر نہ کھدی ہو تو ہم اس مدت تک کھڑے ہی رہیں ؟ چنانچہ جب انہوں نے فرمایا :

" کیا تم یہ سمجھتے ہو ؟" تو میں نے اسے چھوڑ دیا ۔

محمود بن غیلان نے وہب سے اور شعبہ سے بھی روایت کیا ۔ بتایا کہ میں منہال بن عمرو کے پاس ایک حدیث معلوم کرنے آیا تو ان کے گھر سے ڈھول کی آواز سُنی تو میں واپس آگیا اور کچھ نہ پوچھا ۔ پھر اس کے بعد مجھے ندامت ہوئی اور سوچا کہ کیوں نہ پوچھ لیا ہوتا ۔ شاید وہ اسے جانتا ہی ہو ۔

اسی طرح آجکل لوگ راستوں پر خرید و فروخت کرنے لگے ہیں ۔ حالاں کہ پرہیزگار لوگوں کا طریقہ یہ ہے کہ راستوں پر بیٹھ کر سودا بیچنے والوں سے وُہ کچھ نہیں خریدتے (اس لیے کہ راستہ گزرنے والوں کا حق ہے اور وہاں دکان لگانا مسافروں کا حق مارنا ہے ۔ ہاں البتہ اگر راستہ فراخ ہو تو کچھ حرج نہیں ۔مترجم)

اس طرح لوگوں نے آج کل مکانوں میں روشن دان بنا لیے اور راستہ پر دکان کے سامنے تھڑا بڑھانا مکروہ ہے ۔ اس کے علاوہ بچوں کے ذریعہ خرید و فروخت کرنا بھی مکروہ ہے ۔ اس لیے کہ بچے کسی چیز سے مالک نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کا قول قبول کیا جاتا ہے ۔

مکانات میں تعدی

حضرت ابوبکر مروزی ؒ سے مروی ہے کہ ایک آدمی امام احمد بن حنبل ؒ کی مجلس میں بیٹھا کرتا ، بڑا پر رعب آدمی تھا ۔ حضرت امام احمد ؒ اس کی طرف خوب توجہ فرماتے اور اس کی عزت کرتے ۔ انہیں معلوم ہُوا کہ اس آدمی نے گھر کی دیوار کو باہر سے لپوا دیا ہے تو امام احمد ؒ نے مجلس میں اس آدمی سے اعراض کر لیا ۔ اس آدمی کو بھی کھٹک گئی ۔ پوچھا ، اے ابو عبداللہ ، کیا میرے متعلق آپ کو کچھ معلوم ہُوا ہے کہ میں نے کوئی بدعت یا غلط کام کیا ہے ؟

فرمایا : " ہاں ۔ تم نے دیوار کو باہر سے لپوایا ہے ۔"

اس نے پوچھا : " تو کیا یہ جائز نہیں ؟ "

فرمایا : " نہیں ، اس لیے کہ تم نے انگلی بھر مسلمانوں کے راستہ سے زمین لے لی ۔" اس نے دریافت کیا : " پھر کیا کروں ؟ "

امام احمدؒ نے فرمایا:

یا تو جو لپوایا ہے اسے کھرچوا دے اور یا دیوار ہی کو گرا دے اور دیوار گرا کر ایک انگلی کے برابر اندر کی طرف دیوار بناؤ اور پھر باہر سے لپوالو۔ راوی بتاتے ہیں کہ اُس آدمی نے دیوار گرائی اور اسے ایک انگلی بھر اندر کی جانب بنوا کر باہر سے لپوا دیا۔ اس کے بعد حضرت امام ابو عبداللہؒ نے اس کی جانب پہلے کی طرح توجہ فرمائی۔

سلف صالحینؒ اس بات کو بھی غلط سمجھتے کہ راستوں میں چوپائے کھونٹے گاڑ کر باندھ دیے جائیں اور راستہ چلنے والے گوبر وغیرہ کی بدبُو سے تکلیف اٹھائیں۔ اس کے علاوہ ان کے نزدیک مکان سے باہر پرنالہ بنانا بھی معیوب تھا۔ کیونکہ راستہ پر لوگوں کو یہ پریشان کرے گا۔ امام احمد بن حنبلؒ اور دُوسرے اتقیاء کرام رحمہم اللہ کا طریقہ یہ تھا کہ وہ مکانوں کے اندر پرنالے بناتے تھے۔

حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے:

لگتا ہے ایک آدمی دو بار جھوٹ بول جاتا ہے مگر اسے سمجھتا نہیں، مثلاً وُہ کہتا ہے کچھ چیز نہیں، سوائے ایک چیز کے، جو کچھ چیز نہیں؛ یعنی اگر تھوڑی سی چیز موجود ہو اور زیادہ مقدار میں نہ ہو تو کہہ دیتے ہیں "یہ کچھ چیز نہیں"۔ انہوں نے اس کو شدت سے محسوس کیا اور فرمایا، "یہ دو بار کا جھوٹ ہے"۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے حضرت عوانہؒ کو فرمایا:

"میں پہلے تیرے نابیناپن پر مرثیہ کہتا تھا۔ اب میں اس پر رشک کروں گا"۔

انہوں نے پوچھا: "وہ کیسے؟"

فرمایا کہ تم اپنی آنکھ سے ابوالصفری کو نہیں دیکھتے"۔ اور ابوالصفری مدینہ میں ایک بدعتی کا نام ہے۔

حضرت قتادہؒ سے پوچھا گیا:

"کیا آپ بینا ہونا چاہتے ہیں؟"

فرمایا: "نہیں، میں کس پر اب آنکھیں کھولوں؛ ہاں اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا زمانہ ہوتا تو میں ان کی طرف نظر کرتا"۔

قصہ گو سے قطع تعلق

حضرت فضل بن مہران سے مروی ہے۔ فرمایا کہ میں نے حضرت یحییٰ بن معینؒ سے کہا:

"میرا ایک بھائی ایک قصہ گو کے پاس بیٹھتا ہے"۔

فرمایا: "اسے منع کرو"۔

میں نے عرض کیا: "وہ مانتا نہیں"۔
فرمایا، "اسے نصیحت کرو۔"
میں نے عرض کیا: "وہ تو مانتا نہیں۔ کیا میں اس سے تعلق قطع کر لوں؟"
فرمایا: "ہاں"۔

راوی بتاتے ہیں کہ پھر میں امام احمد بن حنبلؒ کے پاس آیا اور یہی ذکر کیا تو انہوں نے فرمایا:
"اسے کہو۔ قرآن میں (دیکھ کر) پڑھا کرے اور دل میں ذکر اللہ کیا کرے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سیکھا کرے۔"
میں نے عرض کیا: "اگر وہ ایسا نہ کرے تو؟"
فرمایا: "نہیں، نہیں، اِن شاءاللہ وہ کرے گا۔ اس لیے کہ یہ (قصہ گو لوگوں کے) اجتماعات، بدعت ہیں۔" میں نے عرض کیا:
"اگر وہ نہ مانے تو کیا اس سے تعلق توڑ لوں؟" اس پر وہ مسکرا دیے اور خاموش رہے۔

ایک آدمی نے حضرت بشر بن حرث رحمۃ اللہ علیہ سے علمِ قلوب کا ایک مسئلہ دریافت کیا تو انھوں نے توقف کر کے جواب دیا۔ پھر اس نے علم معاملات کا ایک مسئلہ دریافت کیا تو اس کی طرف دیکھا اور خاموش رہے۔ پھر اس نے پوچھا:
"تم کس کے ساتھ بیٹھتے اٹھتے ہو؟" اس نے عرض کیا:
"منصور بن عمار اور ابن سماک کے پاس۔"
اُنھوں نے فرمایا: "تجھے حیا نہیں آتی ہم سے علمِ قلوب کا مسئلہ دریافت کرتے ہو اور قصہ گو لوگوں کے پاس بیٹھتے ہو!"

راوی بتاتے ہیں کہ پھر انھوں نے اس سے اعراض کر لیا۔ آخر ہم نے بتایا:
"اے ابوالنصر، وہ بُرا آدمی نہیں۔ وہ بھی اہل سنت میں سے ہے۔ سلف صالحینؒ (مسجد سے لاحق) مقصورہ میں نماز پڑھنا مکروہ سمجھتے اور وہ فرماتے کہ مساجد میں یہ پہلی بدعت ہے۔ اس طرح مسجدوں کی زیب و زینت اور طلائی سازی قرآن پاک کے از حد خوب صورت غلاف کو بھی نئی ایجادات و بدعات شمار کرتے۔

مساجد کی زینت

حدیث میں آتا ہے:
"جب تم اپنی مساجد کو سجاؤ گے اور مصاحف (قرآن) کو لباس (تمینہ) پہناؤ گے

تو اس کا اوبار تم پر پڑے گا۔"

سلف صالحینؒ کے نزدیک ایک ہی محلہ میں کئی کئی مساجد بنانا ناپسند بات تھی۔ منقول ہے کہ جب انس بن مالک رضی اللہ عنہ بصرہ میں داخل ہوئے تو ہر دو ایک ندم پر مسجد دیکھی۔ فرمایا:

"یہ کیا بدعت ہے؛ جب مساجد زیادہ ہوں گی تو نمازی کم ہو جائیں گے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ (صحابہ کے دور میں) سارے قبیلہ کے لیے ایک ہی مسجد ہوتی اور بعض اوقات (چھوٹے چھوٹے) قبائل مل کر ایک ہی مسجد بناتے۔"

اگر ایک محلہ میں دو مسجدیں ہوں تو اس بات میں اختلاف ہے کہ کسی مسجد میں نماز ادا کی جائے؛ بعض کا فرمان ہے کہ دونوں میں سے قدیم ترین میں نماز پڑھے۔ انس بن مالکؓ اور دوسرے صحابہ کا یہی مذہب ہے۔

بتایا کہ سلف صالحین نئی مساجد کو چھوڑ کر پرانی مساجد کی طرف آگے بڑھ جاتے تھے اور حضرت حسنؒ فرمایا کرتے:

دونوں میں سے قریب تر میں نماز پڑھ لی جائے۔

مشائخ فرماتے ہیں کہ چار بدعتیں اب جاری ہوئیں:

۱۔ دسترخوان

۲۔ چھلنیاں

۳۔ اشنان

۴۔ پرخوری

صحابہؓ اس بات کو ناپسند فرماتے کہ گھر میں مٹی کے علاوہ (دھات وغیرہ) کے برتن ہوں اور تقویٰ کی بنا پر تانبے اور پیتل کے برتنوں میں وضو نہ فرماتے۔

حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ مجھے حضرت سری سقطیؒ نے فرمایا:

"کوشش کرنا کہ اپنے گھر میں صرف وہی برتن استعمال کرو جو تیرے بدن (یعنی مٹی) کے بنے ہوں اور کہا جاتا ہے کہ اس (مٹی کے برتنوں) پر حساب نہیں۔"

سلف صالحینؒ نے چونے اور پختہ اینٹ سے مکانات تعمیر کرنے کو ناپسند کیا۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے ہامان نے پختہ اینٹ تیار کی۔ فرعون نے اسے اس بات کا حکم دیا اور مشائخ فرماتے ہیں کہ یہ ظالموں کی عمارت ہے۔

اس کے علاوہ دروازوں اور چھتوں پر نقش و نگار کرنے کو ناپسند فرماتے اور ان چیزوں کی جانب

نگاہ بھی نہ کرتے۔

حضرت احنف بن قیسیؒ کچھ مدت غائب رہے۔ جب واپس آئے تو معلوم ہُوا کہ ان کے گھر کی چھت میں سبز اور زرد رنگ کر دیا گیا ہے۔ جب دیکھا تو گھر سے باہر آگئے اور قسم کھالی کہ جب تک اس کو گھر کے پہلے کی طرح سادہ نہ بنا دیا جائے گا مکان میں داخل نہ ہوں گا۔

حضرت یحییٰ بن معینؒ، حضرت ثوریؒ کے اصحاب میں سے تھے۔ فرماتے ہیں کہ میں حضرت ثوریؒ کے ہمراہ ایک راستہ پر جا رہا تھا تو ہم ایک منقش اور مزین دروازے کے پاس سے گزرے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ حضرت ثوریؒ نے مجھے کھینچ لیا۔ آخر ہم گزر گئے۔ میں نے پوچھا:

"اس کو دیکھنا تو مکروہ نہیں؟"

فرمایا: "انہوں نے اسی لیے بنایا ہے کہ اسے دیکھا جائے۔ اگر گزرنے والا کوئی بھی اسے نہ دیکھتا تو نہ بناتے۔" گویا انہیں یہ ڈر ہوا کہ اس کی طرف نظر کرنا اور دیکھنا بھی اس کے بنانے میں معاون بات نہ ہو جائے۔ ململ کی طرح باریک کپڑے بھی وہ ناپسند فرماتے اور عورتوں اور مردوں کے لیے مسر کا ریشم تو بہت ہی مکروہ اور معیوب ترین بات ہے۔

فرمایا کرتے: "باریک کپڑے فاسقوں کا لباس ہے اور جس کا کپڑا باریک ہُوا اس کا دین پتلا پڑ گیا۔"

اور یہ بھی فرماتے:

"زہد کا آغاز لباس سے ہوتا ہے۔"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے۔

"لباس، لباس سے اس وقت مشابہ ہوگا جب دل، دل سے مشابہ ہوگا۔"

بشر بن مروان نے خطبہ دیا۔ اس پر باریک لباس تھا۔ حضرت رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے فرمایا:

"اپنے امیر کی جانب دیکھو، لوگوں کو وعظ کر رہا ہے اور بدن پر فساق کا لباس ہے۔"

جب عبداللہ بن عامر ربیعہ کتان کے (اعلیٰ) کپڑے میں حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور زہد کے بارے میں پوچھا اور زہد کے معاملہ میں کلام کرنے لگا۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اس کے کف پر تھوک دیا اور منہ پھیر لیا اور بات تک نہ کی۔ ابن عامر کو غصہ لگا وہ صاحب عزت قریش تھا۔ اس نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس شکایت کی۔ انہوں نے فرمایا:

"تو نے خود اپنے ساتھ یہ سلوک کیا۔ اس لباس میں ابوذرؓ کے پاس جاتا ہے اور ان سے زہد کے بارے

پوچھتا ہے ؟

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں آخری زمانہ کی عورتوں کے بارے میں خبر آتی ہے۔ فرمایا:

"لباس پہننے والیاں (مگر) برہنہ ہوں گی۔ مائل ہونے والیاں اور مائل کرنے والیاں، ان کے سروں پر بیل کے کوہان کی طرح ہوں گے (یعنی جوڑے اور بال اونچے اونچے کوہان نما ہوں گے)۔ یہ عورتیں جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھیں گی۔"

حضرت ابن عباسؓ تبرج کی وضاحت اس طرح فرماتے، کہ برہنہ کرنے والے کپڑے پہننے اور اللہ تعالیٰ کے فرمان

وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ۔

میں فرمایا کہ جاہلیت کے زمانہ میں عورتیں بیش قیمت لباس پہنتیں مگر ان کی پردے کی جگہیں برہنہ رہتیں۔ یعنی اس قدر مقام برہنہ ہوگا کہ جس میں نماز جائز نہ ہو۔ ایسا لباس جائز نہیں۔ مزید برآں جو لباس باعثِ برہنگی و عریانی ہو وہ بھی جائز نہیں۔

سلفؒ کا لباس عام طور پر موٹا کپڑا یعنی سنیلانی، قطوانی اور یمن کی چادر ہوتی۔ مصر کا موٹا کپڑا اور دمیاط کا کپڑا جیسے کہ کعبہ کا غلاف، یمانی کے سحولی کپڑے اور حضرمی کپڑے اور یہ سب موٹے کپڑے ہوتے اور مصر و خراسان کے سوت کے بنے ہوتے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ازار بند کی طوالت ساڑھے چار ذراع تھی اور اس کی قیمت چار سے لے کر پانچ تک تھی اور ان کی قمیصوں کی قیمتیں عام طور پر پانچ سے دس تک ہوتیں مگر حدیث میں آیا کہ،

"تب تک قیامت قائم نہ ہوگی جب تک کہ نیکی کو برائی اور برائی کو نیکی نہ سمجھا جانے لگے۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے:

"لوگوں پر کوئی سال ایسا نہ گزرے گا کہ جس میں ایک سنت ختم نہ کریں اور ایک بدعت زندہ نہ کریں۔ آخر کار سنن ختم ہو جائیں گی اور بدعات زندہ ہو جائیں گی اور اسے منکر اس لیے کہا جائے گا کہ یہ معروف نہ ہوگی۔"

جب حق ختم ہو جائے گا اور معلوم نہ ہوگا تو اس (حق) پر منکر کا اطلاق کیا جانے لگا۔ اس طرح معروف کہی جائے گی۔ اس لیے کہ وہ مشہور و محبوب ہو گی۔ جب باطل پھیل جائے گا، جہالت کی کثرت ہو جائے گی۔ حتیٰ کہ باطل و جہالت سے لوگ مانوس ہوں گے اسے ہی جانیں گے تو اس پر معروف (نیکی) کا اطلاق کر دیا جائے گا۔ اس طرح فرمایا: "نیل" یعنی ظلم کی کثرت ہوگی اور ظلم میں ہی اس کی پیدائش ہوگی۔ حتیٰ کہ

وہ عدل کو جانتا ہی نہ ہو گا۔

حضرت شعبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے،

”لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ اس بات میں حجاج پر لوگ دعائے رحمت کریں گے اور آج وہ دور آچکا اس لیے کہ جن غلط باتوں کا حجاج نے رواج دیا تھا اور اس وقت لوگوں نے اسے معیوب اور بُرا خیال کیا۔ آج وہی اعمال نیکی اور مستحسن بن چکے۔ اب لوگ اس کے ایجاد کرنے والے پر رشک کرتے اور اس کے لیے دُعا کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو ان باتوں پر اجر ملے گا اور وہ ثواب کا مستحق ہے اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس نے یہ نئی بات جاری کی تھی۔ اگرچہ یہ لوگ اس کا نام لے کر اس کے لیے دعا نہیں کرتے مگر اس کی ایجادات پر عمل کر کے اور مستحسن سمجھ کر گویا اس کے لیے رحم طلب کرتے ہیں اور ترحم ہی دعا ہے۔ اس لیے کہ اس نے بعض اشیائے خیر اور اخروی دنیا میں داخلی امور کی ایجادات کیں۔ اس کے بعد کئی ایسے حکام آئے کہ جنھوں نے ظلم کیے اور نامنفانہ قسم کی بدعات ایجاد کیں اور بعد میں انھی باتوں کو سنت قرار دیا جانے لگا۔ اس طرح یہ امور بھی حجاج پر دعائے رحمت ہی بن گئی کہ اس کے اتباع میں لوگوں نے ایسی بدعات کو رواج دیا۔

سفری بدعات

سلف صالحینؒ میں ان قبوں اور محملوں کا رواج بھی نہ تھا۔ وہ حضرات ان چیزوں کو عیاشی اور فضول خرچی کا درجہ دیتے تھے مگر آجکل لوگ بیش قیمت محملوں پر بیٹھ کر اور قبے لگا کر چلتے ہیں۔ حالاں کہ ماضی میں لوگ معمولی کجاووں پر بیٹھتے، دھوپ کو برداشت کرتے، اللہ تعالیٰ کی راہ میں خیمے نصب کرنے اور غبار کا سامنا کرتے۔ ان کی خوراک اور نیند کم ہوتی۔ اونٹوں کی مشقت اور بوجھ کم ہوتا اور جانوروں کو آسائش دیتے۔ اس طرح حج کے موقع پر زیادہ اجر و ثواب حاصل کرتے۔ اونٹ کی صحت بہتر رہتی اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر چلتے۔ اس آدمی نے ان کو ان تمام سننِ اسلاف سے باہر نکال دیا اور اپنی بدعت پر گامزن کر دیا۔ اب یہ اونٹوں پر گھروں سے ہی چھاتے لگا کر نکلتے ہیں۔ اس طرح اونٹوں پر بوجھ و مشقت بڑھ جاتی ہے اور گاہے اونٹ ہی مر جاتا ہے۔ ان باتوں کے علاوہ اس نے اخماس و عواشر، آیت کی نشانی، سواد کی سُرخی، سبزی اور زری لگانے کا نیا سلسلہ شروع کیا۔ چنانچہ غیر داخل نمائش کو قرآن مجید میں داخل کر دیا۔

اعراب و نقاط کا اضافہ

سلف صالحین فرمایا کرتے،

قرآن کو اسی طرح خالی رکھو۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے اسے نازل فرمایا اور غیر قرآن کا اس میں اختلاط نہ کرو۔“ یہی وجہ ہے کہ علمائے اس پر انکار بھی کیا۔ حتیٰ کہ ابو زرینؒ نے فرمایا،

”لوگوں پر ایسا زمانہ بھی آئے گا کہ ایک نئی بات پیدا ہو گی تو سمجھیں گے کہ جس طرح حجاج نے

قرآن مجید میں (اعراب وغیرہ) لگائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی طرح نازل کیا،' چنانچہ اس وجہ سے وہ اس کی مذمت کرتے بلکہ اس میں تو اختلاف بھی منقول ہے اور بعض کا فرمان ہے کہ سُرخ سیاہی کے ساتھ منقوط قرآن میں تلاوت کو ٹھیک نہ سمجھتے۔ جیسے کہ قرآن کی خرید و فروخت بھی بعض کے نزدیک مکروہ ہے۔ اس طرح اگر قرآن مجید ایسا ہو کہ جس میں تم نے نقطے نہیں لگائے بلکہ دُوسرے آدمی نے (سرخ نقطے) اور (نشانات) لگا رکھے ہیں تو اس میں تلاوت کرنا جائز ہے۔ اس کے علاوہ اسلافؒ کے نزدیک قرآن پر نقطے لگانے کی مزدوری لینا مکروہ ہے۔ اس لیے کہ یہ مبتدع ہے۔

حضرت ابو بکر ہذلیؒ نے فرمایا: کہ میں نے حضرت حسنؓ سے دریافت کیا:

"قرآن پر معاوضہ پر نقطے لگانا کیسا ہے؟" تو فرمایا:

"وہ نقطے کیا چیز ہے؟"

میں نے کہا:

"کلمات کو عربیت کے لحاظ سے بااعراب کرنا مراد ہے۔"

فرمایا:

"قرآن کے اعراب میں کچھ حرج نہیں۔"

حضرت خالد حذاؒ نے فرمایا کہ میں حضرت سیرینؒ کے پاس آیا تو میں نے انہیں منقوط قرآن میں پڑھتے دیکھا۔ حالاں کہ وُہ خود نقاط لگانے کو ناپسند کرتے۔

حضرت فراسی بن یحییٰ نے فرمایا:

میں نے حجاج کے جیل خانہ میں نحو کے مسائل پر مشتمل ایک پرچہ پایا تو اس پر حیران ہُوا اور یہ پہلا پرچہ دیکھا جو کہ نقطوں والا تھا۔ میں یہ پرچہ لے کر شعبیؒ کے پاس آیا اور انہیں بتایا۔ انہوں نے فرمایا:

"اس پر پڑھو مگر تو اپنے ہاتھ سے اسے مت مٹا۔"

اس نے ایک کام یہ کیا کہ تیس قاریٔ قرآن جمع کیے۔ وُہ قرآن مجید کے حروف شمار کرتے اور ایک ماہ کے اس کے کلمات شمار کر کے مکمل کیا۔ اگر حضرت عمر یا عثمان رضی اللہ عنہما اسے دیکھتے یا حضرت علیؓ دیکھتے کہ یہ قرآن کے ساتھ کیا کر رہے ہیں؛ یعنی اس کے حروف شمار کر رہے ہیں تو ان کے سروں پر خوب مار لگاتے صحابہ کرام اس کام کو ناپسند فرماتے اور بتاتے کہ آخری زمانہ میں لوگ قرآن مجید کے حروف کی حفاظت کریں گے اور اس کے احکام برباد کریں گے۔

حجاج سب سے بڑا قاری اور حروفِ قرآن کا خوب حافظ تھا۔ ہر تین دن میں ایک بار قرآن مجید

ختم کرتا تھا مگر احکام و حدودِ قرآن کو سب سے زیادہ ضائع کرنے والا تھا۔

اس نے ایک بدعت یہ کی کہ مسجد سے کنکر اور ریت نکال دی اور چٹائیاں بچھا دیں۔ حضرت قتادہؓ کے بارے میں مروی ہے۔ یہ نابینا تھے۔ مسجد میں گئے اور جب سجدہ کیا تو آنکھ میں تنکا کھب گیا۔ فرمایا،

حجاج پر خدا کی پھٹکار، اس نے ان چٹائیوں کی بدعت جاری کی اور نمازیوں کو ایذا دے رہا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم زمین اور مٹی پر سجدہ کرنا پسند کرتے۔ اس لیے کہ اس صورت میں خشوع و خضوع زیادہ ہوتا ہے۔ الغرض حجاج نے بے شمار بدعات جاری کیں جن کو ہم آجکل سنت سمجھنے اور پسند کرنے لگے۔ حالاں کہ متقدمین کی سیرت اور صالحین کے طریقہ سے دیکھا جائے تو یہ تمام امور بدعات و منکرات ہیں۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"منکر اور بدعت ظاہر ہوگی اور اگر اس میں سے کچھ بدلا جائے تو لوگ کہہ دیں گے کہ سنت کو بدل دیا گیا۔"

ایک دوسری حدیث میں ہے:

"اس زمانہ کا دانشور بھی لومڑ کی مکاری کی طرح اپنے دین کے ساتھ فریب و مکاری کرے گا۔"

سنہ ۸۰ھ میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے۔ یہ حجاج کا عہد تھا۔ فرماتے:

"میں کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ کے سوا ایسی کوئی بات نہیں جانتا کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دور جیسی ہو اور بدل نہ دی گئی ہو۔"

عرض کیا گیا،

"اے ابو حمزہ! کیا نماز بھی بدل دی؟"

فرمایا:

"کیا نماز میں بھی ان لوگوں نے تغیر نہیں کر لیا؟ تم جانتے تو ہو کہ نماز میں تاخیر ہونے لگی۔ نماز سے پہلے نماز کی پکار کی جانے لگی اور سلام متعین ہوا جیسے کہ اقامت ایک لازمی چیز ہے اسے بھی روا کیا جانے لگا اور اسے سنت قرار دے دیا گیا۔"

جب ان کے پاس قرّا آتے مثلاً یزید رقاشیؒ، زیاد نمیری اور فرقد سنجی آتے تو وہ فرماتے:

تم لوگ اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر مشابہ ہو تو وہ خوش ہوتے۔ پھر فرماتے: ہاں تمہارے سر اور تمہاری ڈاڑھیاں (ہی مشابہ ہیں) یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ مجنوں نے کہا: ؎

اَمَّا الْخِيَامُ فَاِنَّهَا كَخِيَامِهِمْ   وَ اَرٰى نِسَآءَ الْحَيِّ غَيْرَ نِسَائِهَا

(خیمے تو اُن خیموں کی طرح ہی ہیں۔ البتہ میں قبیلے کی عورتیں دیکھتا ہوں تو اُن عورتوں کے علاوہ ہیں)
صحابہؓ کی ایک جماعت کے بارے میں منقول ہے کہ اگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ تمہیں دیکھیں تو باجماعت نماز کے علاوہ کس بات میں تمہارا مسلمان ہونا نہ جان سکیں۔ دوسرے الفاظ یہ ہیں:
"سوائے اس کے کہ تم مل کر (باجماعت) نماز ادا کرتے ہو"
حضرت حسنؓ فرمایا کرتے:
"میں نے ایسے گروہوں (صحابہؓ) کے ساتھ مصاحبت کی کہ اگر تم انہیں دیکھ لو تو تم انہیں دیوانے کہو، اور اگر وہ تمہیں دیکھ لیں تو کہیں کہ ان لوگوں کے پاس کچھ بھی اسلامی (اخلاق و سیرت) کا حصہ نہیں۔"

پرانے اور نئے قراء

حضرت ابو حازمؒ فرماتے ہیں:
"میں نے قراء کو دیکھا اور وہ واقعی قراء تھے۔ اگر ایک سو آدمیوں میں بھی وہ حاملِ قرآن کھڑا ہوتا تو شدتِ تواضع اور حسنِ سیرت کے باعث پہچانا جاتا۔ قرآن نے ان کی سیرت پر گہرا اثر ڈالا۔ قرآن نے انہیں خشوع و خضوع سکھایا مگر اللہ آج کل کے قراء ہرگز قاری نہیں بلکہ یہ جگالی کرنیوالے ہیں۔"
ایک بزرگ فرماتے ہیں:
"ہم جنازہ میں شرکت کرتے تو صاحبِ مصیبت کا پتہ نہ چلتا اور ہمیں معلوم نہ ہوتا کہ کس کی تعزیت کریں۔ اس لیے کہ ساری قوم غم سے نڈھال ہوتی۔"
فرمایا: جنازہ میں جانے کے تین روز بعد تک ان میں کا ہر آدمی ایسا رہتا کہ اس سے کچھ کام نہ ہوتا۔
حضرتِ فضیل رحمۃ اللہ علیہ اپنے زمانہ کے قاریوں سے بہت دُور رہتے۔ فرمایا:
"ان قاریوں کی مصاحبت سے بچ کر رہو۔ اس لیے کہ اگر تم کسی بات میں ان سے اختلاف کرو گے تو تمہیں کافر قرار دیں گے۔"
حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:
"مجھے نوجوان کی مصاحبت سب سے زیادہ پسند ہے اور (آجکل) کے قاری کی مصاحبت سے زیادہ کچھ میرے نزدیک مبغوض نہیں۔"
اکثر یہ بھی فرمایا کرتے:
"اب جو بہترین طریق پر گانہ سکے وہ بہترین قاری ہی نہیں بن سکتا۔"
حضرت بشر بن حارث فرمایا کرتے:
"مجھے آج کے قاری کی مصاحبت کے مقابلہ ایک نوجوان کی مصاحبت زیادہ پسند ہے، ان قاریوں

کی مصاحبت سے بچ کر رہو۔ اس لیے کہ یہ لوگ ہر چیز میں حدودِ شرعی سے تجاوز کرتے اور ہر چیز کا انکار کرنے میں بہت تیز ہیں کیوں کہ ان پر جہالت غالب ہے۔ یہ لوگ علماء کی مجالس میں کم ہی بیٹھتے ہیں۔ علم کے دشمن ہیں اور خود تصنع اور ریاکاری کے شکار ہیں۔ چنانچہ غیر منکر کا انکار کرتے اور ذرا سی قابل فروگزاشت بات پر بغض و غضب دکھاتے ہیں۔ ان میں حسنِ اخلاق اور خوش خلقی کا نام بھی نہیں۔ عوام پر سختی اور تنگی کرتے ہیں اور اغنیاء پر حق جتا جتا کر ان سے جھگڑتے ہیں۔ گویا انہی کی روزی کھاتے ہیں اور جیسے کہ انہی کے لیے عبادت کرتے ہیں۔ خوش خلق انسانوں کے لیے ان کے پاس ناراضگی اور غیض و غضب ہے۔ اسی لیے بعض مشائخ کا فرمان ہے:

"جب شریف آدمی کی ضیافت کی جائے تو وہ تواضع اختیار کرتا ہے اور جب ایک کمینے کی ضیافت کی جائے تو وہ تکبر دکھاتا ہے۔"

ایک بزرگ فرماتے ہیں:

"جب کمینے کی ضیافت کی جائے تو نیکی کی باتیں بہت ہی کثرت سے بتاتا ہے اور ہر ہر بات میں پڑوسیوں کو ٹوکتا ہے۔ یعنی کثرت سے نیکی کی باتیں بتا کر وہ شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس وجہ سے علمائے اسے مسترد کیا اور حکماء نے اس کی مذمت کی۔ اس لیے کہ علم میں وسعت ہوتی ہے اور اس کے ساتھ اخلاقِ حسنہ اور آداب و مروت بھی پائی جاتی ہے۔ ایک عالم آدمی لوگوں میں ہر چیز کو اس کے مقام پر رکھتا ہے، نہ اس سے تجاوز کرتا ہے اور نہ ہی ان کی ہمت سے بالاتر بات کرتا ہے اور ان کے لیے سہولت کی راہ نکالتا ہے۔"

مخلوق کی بساطت میں علماء ذرا سا انقباض پیدا کرتے ہیں۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

"لوگوں پر (زیادہ) انقباض، ان کی عداوت کو دعوت دینا ہے۔ اس لیے انقباض و انبساط کے درمیان درمیان رہو۔"

حدیث میں آتا ہے:

"تم اپنے اموال کے ذریعہ لوگوں کو کافی نہیں ہو سکتے۔ اس لیے حسنِ اخلاق اور خوش خلقی سے تو انہیں پیش آؤ۔"

دوسرے الفاظ یہ ہیں:

"خوشی و بشاشت سے۔"

یہ تمام باتیں قراء کے ہاں معدوم ہیں اور وہ اس (خوش اخلاقی) کو جانتے ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے

ہر چیز کا ایک حصّہ بنا دیا جس نے چیز کی حدود سے تجاوز کیا اس نے اُسے برباد کیا۔

بعض سلفؒ فرماتے ہیں :

" تھوڑا سا تواضع بھی کثیر عمل سے کفایت کر سکتا ہے اور تھوڑا سا تقویٰ بھی کثیر علم سے کفایت کرتا ہے "

غیبت کی مذمّت

سلف صالحین میں ایک بات یہ بھی تھی کہ جس میں آج کل لوگوں پر کاہلی چھا گئی کہ وہ اس بات کو بھی نفاق میں سے جانتے کہ جس میں اس نے کلام کیا یا دُوسرے نے اس میں کلام کیا۔ وُہ پھر اس پر کلام کرے۔ اس لیے کہ ان کا طریق یہ تھا کہ جب ایک آدمی کسی مسئلہ پر کلام کر دیتا یا اسے وُہ تسلیم کر لیتے تو سب کے قلوب اسے تسلیم کر لیتے اور اس پر جرح نہ کرتے اور جب کسی آدمی کے بدعتی ہونے یا اس کا فسق ظاہر ہونے کی وجہ سے اس پر جرح کرتے تو اس (بدعتی یا فاسق) سے کلام نہ کرتے۔

اور جب وہ زبان سے کسی کی مذمت کرتے تو فعل سے اس کی مدح نہ کرتے اور جب فعل کے ساتھ کسی کی مذمت کرتے تو قول کے ذریعہ اس کی مدح نہ کرتے۔ اس لیے کہ اس طرح دو زبانیں بن جاتی ہیں اور انسان کے دو چہرے ہو جاتے ہیں۔ ظاہری چہرہ الگ اور باطنی چہرہ الگ۔ اور ملاقات کے وقت سلام کرتے تو اس سے یہ مراد لیتے کہ ؛ تو میری طرف سے سلامت رہا۔ میں تیری غیبت اور مذمت نہیں کروں گا۔ اور ان کے نزدیک یہ دو رُخی ' منافقت کی علامت شمار ہوتی تھی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے ؛

" دو رُخا آدمی سب سے بدترین آدمی ہے جو اس کے پاس ایک رخ لے کر آئے اور دوسرے کے پاس دُوسرا رُخ لے کر آئے۔ "

دُوسری حدیث میں ہے :

" جو آدمی دنیا میں دو زبانوں والا (دو رخا) ہو۔ قیامت کے روز اس کو آگ کی دو زبانیں دی جائیں گی "

بعض کا فرمان ہے کہ "جب بھی کسی آدمی کا میرے سامنے ذکر کیا گیا تو میں نے اسے اپنے سامنے بیٹھا ہُوا پایا اور اس کے بارے میں وہی کلام کیا جسے وُہ پسند کرے "

ایک بزرگ فرماتے ہیں :

" میرے سامنے جس کا ذکر ہُوا۔ میں نے اپنے دل میں اس کا تصوّر کیا اور جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں وہی اس کے بارے میں بھی کہا "

بعض سلفؒ کا فرمان ہے ؛

" تھوڑی سی تواضع ، زیادہ عمل سے ۔۔۔ تھوڑا سا تقویٰ زیادہ علم سے کفایت کر جاتا ہے "

یہ ان مسلمانوں کے حالات ہیں کہ لوگ دل وجان سے ان کا اتباع کرتے تھے۔
ان کی عادت تھی کہ اگر کوئی آدمی ان کے سامنے کسی کا برائی کے ساتھ ذکر کرتا تو وہ اپنے حال پر غور کرتے۔ اگر ان میں کوئی ایسی بات ہوتی تو اپنے بھائی کے بارے میں حیا کی بنا پر کلام نہ کرتے اور خاموش رہتے۔ اور اگر اپنے اندر وہ خرابی نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کی حمد کرتے اور اپنے بھائی پر رحم کرتے۔ اس طرح مولائے کریم انہیں شکر کے باعث (غیبت سے) محفوظ رکھتا۔ یہ سلف صالحین کی سیرت کا ادنیٰ نمونہ ہے۔

ایک آسمانی کتاب میں ہے:
"اس آدمی پر تعجب ہے کہ جس میں بھلائی نہیں مگر اسے کہا جاتا ہے کہ تو اچھا آدمی ہے اور وہ اس (جھوٹی تعریف) پر خوش ہوتا ہے۔ اور جس کو کہا جاتا ہے کہ تیرے اندر برائی ہے اور وہ واقعی بُرا بھی ہے مگر پھر بھی ناراض ہوتا ہے اور اس سے بڑھ کر اس پر تعجب ہے کہ جو یقیناً (برا ہونے کے باوجود) اپنے آپ سے محبت رکھتا ہے۔ اور محض شک کی بنا پر لوگوں سے بغض رکھتا ہے۔"

سلف صالحینؒ خود ستائشی اور حمد و ثنا کے لالچ کی سختی سے تردید کرتے۔ ایک بزرگؒ فرماتے ہیں:
"جو مدح پسند کرے اور مذمت کو ناپسند کرے وہ منافق ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک آدمی سے پوچھا:
"تیری قوم کا سردار کون ہے؟"
اس نے کہا: "میں ہوں۔"
انہوں نے فرمایا:
"اگر تو سردار ہوتا تو (میں) نہ کہتا۔"

محمد بن کعبؒ نے خط لکھا اور صرف نسب لکھا۔ قرظی بتلاتے ہیں۔ انہیں عرض کیا گیا:
"آپ "انصاری" بھی لکھیں۔"
انہوں نے فرمایا:
"میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ اللہ عزوجل پر احسان دھروں جو کہ میں نہ ہو۔"

حضرت ثوری رضی اللہ عنہ نے فرمایا:
"اگر تمہیں یہ کہا جائے کہ تُو بُرا آدمی ہے اور تو ناراض ہو تو پھر تُو واقعی بُرا آدمی ہے۔"

ایک دوسرے بزرگؒ فرماتے ہیں:
"جب تک تُو یہ سمجھے کہ تیرے اندر خیر نہیں تو تُو اچھا آدمی ہے۔"

بعض علماؒ سے پوچھا گیا:

"نفاق کی علامت کیا ہے؟"

فرمایا: "منافق وہ ہے کہ جس کی تعریف ایسی صفت پر کی جائے جو اس میں نہیں تو اس (جھوٹی تعریف) پر اس کو قلبی راحت ہو۔"

حضرت سفیان رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے:

"جب تو ایسے آدمی کو دیکھے جو یہ چاہے کہ تمام لوگ اس سے محبت رکھیں اور کوئی آدمی اس کا ذکر برائی کے ساتھ نہ کرے تو جان لے کہ وہ منافق ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے منافقین کی نشان دہی کی۔ یہ ان میں داخل ہے۔ فرمایا:

سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِیْنَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّاْمَنُوْکُمْ وَیَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ۔ (اب تم دیکھو گے۔ ایک اور لوگ چاہتے ہیں کہ امن میں رہیں تم سے بھی اور اپنی قوم سے بھی)

اس لیے اہل سنت ہیں ایمان دار کو چاہیے کہ وہ اہل بدعت کے بارے میں خوف رکھے اور قاری لوگ اس بات میں مبتلا ہیں اور علمائے ان کی سخت مذمت کی اور شاید ایک دھوکہ میں مبتلا ایک آدمی اس حدیث

"جب مومن کی مدح کی جائے تو اس کے دل میں ایمان بڑھتا ہے۔"

کی تاویل کرے اور اس کا غلط مطلب لے۔ اس لیے کہ حدیث "ایمان بڑھتا ہے" فرمایا اور "مومن بڑھتا ہے" نہیں فرمایا۔ چنانچہ ایمان کا بڑھنا، اس کا اضافہ ہے اور اس کا اضافہ، مکر و استدراج سے ڈرنے سے ہوتا ہے۔

اس میں عارفین کے لیے بھی رہنمائی ہے کہ جب بلند پایہ مومن کو بلند پایہ ایمان ملتا ہے تو اپنے مولائے کریم کے انعام پر خوش ہوتا ہے اور اسے اپنے پروردگار کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اس صنعت کو صانع کریم اور اس کی پیدائش کو خالق رحیم کی طرف منسوب کرتا ہے۔ اب یہ صانع تعالیٰ اور خالق تعالیٰ کی حمد و ثنا بن گئی۔ وہ اپنے نفس کی جانب نہیں دیکھتا اور نہ ہی اپنے ذاتی وصف پر تعجب کرتا پھرتا ہے مگر افسوس یہ راہیں منہدم ہو گئیں اور یہ طریقے مٹ کر رہ گئے۔

اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ۔ (ہاں وہ جس پر تیرا رب رحم کرے)

علم ایمان و یقین افضل ترین ہے

یہ یاد رکھیے کہ گاہے ایک منافق یا بدعتی یا مشرک آدمی بھی ایک علم سیکھ لیتا ہے بشرطیکہ وہ اس کی کوشش کرے۔ اس لیے کہ حصول علم دماغی محنت کا پھل ہے۔ اور عقل و محنت ہو تو علم ایمان و یقین بھی حاصل کر سکتا ہے۔ مگر اس کا مشاہدہ اور خفائق تک رسائی صرف اس مومن کو ہو سکتی ہے جو صاحب یقین ہو۔ اس لیے کہ

یہی بات مزید ایمان اور علم و ایقان کی حقیقت کا باعث ہے۔ مکاشفہ قدرت و عظمت اور مشاہدہ آیاتِ الٰہی فاسقوں کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور اس کا وعدہ ظالموں کو نہیں ملتا۔ اہل باطل اور سرکشوں کو مشاہدہ کی دولت نصیب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس میں آیاتِ الٰہی اور خدا تعالیٰ حجتوں کی توہین ہے اور اس کے براہین و قدرت میں نقص آ جاتا ہے۔ یقین میں شک داخل ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ اہل اخلاص کے لیے یقین ہی دلیل ہے اور ایسا ہونے سے حق و باطل میں اشتباہ پڑ جاتا ہے۔ جبکہ اہلِ صدق کا وصف، حق ہے۔ علمِ معرفت کی فضیلت پر یہ سب سے بڑی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَوَلَمْ یَکُنْ لَّھُمْ اٰیَۃً اَنْ یَّعْلَمَہٗ عُلَمٰٓؤُا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ۔ (کیا ان کو نشانی نہیں ہو چکی، اس کی خبر رکھتے ہیں بڑے لوگ بنی اسرائیل کے)

اور فرمایا:

بَلْ ھُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ۔ (یہ قرآن آیتیں ہیں صاف سینے میں ان کو جن کو ملی ہے سمجھ)

ایک جگہ فرمایا:

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِیْنَ۔ (بے شک اس میں پتے ہیں دھیان کرنے والوں کو)

اور فرمایا:

قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ۔ (ہم نے بیان کر دیں نشانیاں واسطے ان لوگوں کے جن کو یقین ہے)

ایک جگہ خدا تعالیٰ نے فرمایا:

وَلِنُبَیِّنَہٗ لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ۔ (اور تا واضح کریں ہم اس کو واسطے سمجھ والوں کے)

یہی حضرات علماءُ باللہ اور متکلم عن اللہ تھے۔ انہیں اس میں سے حصّہ و مقام عطا ہُوا اور جو آدمی نا اہل ہو اور اس کا مستحق نہ ہو تو اسے یہ (علم و مشاہدہ) نہیں ملتا۔ اس لیے کہ یہ امور خدا تعالیٰ کی نشانیاں اور دلائل ہیں۔ یہ شہود و بصائر ہیں۔ اس کی راہ کو واضح کرنے والے اور اسے بیان کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا بَیَانَہٗ۔ (پھر مقرر ہمارا ذمّہ ہے)

پھر فرمایا:

خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَہُ الْبَیَانَ۔ (پیدا کیا انسان کو، پھر سکھایا اس کو بیان)

اور اس سے پہلے فرمایا:

وَکَانَ حَقًّا عَلَیْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ۔ (اور ہم پر حق ہے مومنوں کی مدد کرنا)

اور ساتھ ہی یہ فرمایا:

وَکَانُوْا اَحَقَّ بِھَا وَ اَھْلَھَا۔ (اور یہی تھے اس کے لائق اور اس کام کے)

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جس کے ذریعہ ان کی مدد فرمائی۔ انہوں نے بھی نصرت کی اور جس سے انہیں حقیقت آگاہ کیا۔ وہ آگاہ ہوئے اور جس کا انہیں مشاہدہ کرایا۔ یہ شاہد ہوئے۔ یہ حضرات ہی اہلِ تقویٰ کے امام اور راہِ ہدایت کے روشن مینار ہیں۔

علمِ معرفت سے محرومی کی سزا

ایک عارف فرماتے ہیں:

"جس کو اس علم سے کچھ مشاہدہ حاصل نہ ہو وُہ شرک یا نفاق سے خالی نہیں۔ اس لیے کہ وُہ علم یقین سے خالی ہے اور جو یقین سے خالی ہُوا اس میں شک کے باریک اجزا پائے گئے۔"

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"جس کو اس علم کا کچھ حصّہ حاصل نہ ہو، مجھے اس کے بُرے انجام کا ڈر ہے اور اس میں سے ادنیٰ حصّہ یہ ہے کہ اس کی تصدیق کرے اور اہل باطن کو تسلیم کرے۔"

ایک دُوسرے عارفؒ فرماتے ہیں:

"جس میں دو خصلتیں ہوں اس کے لیے اس علم میں سے کچھ بھی نہیں ملتا۔

۱۔ بدعت کرے۔ یا

۲۔ تکبّر کرے۔

مشائخ نے فرمایا:

"جو دنیا سے محبت کرنے والا ہو۔ یا خواہشِ نفس پر اصرار کرے۔ اسے (اس علم کا کچھ حصہ) نہیں ملتا۔"

حضرت ابو سہل محمدؒ نے فرمایا:

"اس علم کے منکر کے لیے کمترین سزا یہ ہے کہ اس کا کچھ حصّہ بھی اسے کبھی نہ ملے گا۔"

مشائخ کا اس پر اتفاق ہے کہ:

"یہ صدیقین کا علم ہے اور جس کو اس علم کا کچھ حصہ بھی ملا وہ مقربین میں سے ہے اور اسے اصحابِ یمین کا درجہ ملے گا۔"

یہ بھی یاد رکھیں کہ علمِ توحید اور معرفتِ صفات کا علم تمام علوم سے جدا ہے۔ چنانچہ علومِ ظاہرہ میں اختلاف، رحمت ہے۔ مگر علم توحید میں اختلاف گمراہی اور بدعت ہے۔ علمِ ظاہر میں غلطی معاف ہوسکتی ہے اور گاہے ایسا

ہوتا ہے کہ اگر دیانت سے اجتہاد کیا تو ایک نیکی بھی مل جائے مگر علم توحید و شہادتِ یقین میں غلطی کرنا کفر ہے۔ یہ اس طرح کہ بندوں کو علمِ ظاہر کی طلب میں اللہ تعالیٰ کے ہاں حقیقی علم کی تکلیف نہیں دی۔

اور ان پر توحید میں اللہ تعالیٰ کے ہاں حقیقت کی موافقت کی تلاش لازم ہے اور جس نے کچھ بدعت جاری کی۔ وہ بدعت اس پر ماری جائے گی اور اس کے بارے میں اس سے پرسش ہوگی اور بندوں پر یہ اللہ تعالےٰ کی حجت نہ ہوگی۔ نہ ہی دنیا میں یہ نفع بخش بارش ہوگی بلکہ اس آدمی کو دنیادار اور دنیا کا راغب سمجھا جائے گا اور یہ اللہ تعالیٰ کی جانب رہنما نہ ہوگا۔ نہ ہی دین کا داعی شمار ہوگا۔ نہ ہی اہل تقویٰ کا امام ہوگا۔

حدیث میں آتا ہے:

"علماء رسولوں کے امین ہیں۔ جب تک کہ دنیا میں داخل نہ ہو جائیں۔ جب دنیا میں داخل ہوئے تو اپنے دین کے سلسلہ میں ان سے بچو۔"

ایک مشہور حدیث میں ہے:

"جس نے ہمارے دین میں بدعت جاری کی۔ جو اس میں نہیں تو وہ (بدعت) مردود ہے۔ حضرت عیسےٰ علیہ السلام سے مروی ہے۔ ان سے پوچھا گیا:

"لوگوں پر کس کا فتنہ سب سے زیادہ سخت ہے؟"

فرمایا: "عالم کی لغزش، جب وہ پھسل گیا تو اس کی لغزش سے دنیا پھسل جائے گی۔"

اسی مفہوم کا فرمان ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"مجھے اپنی امت پر عالم کی لغزش کا اور قرآن میں منافق کے جدال کا خطرہ ہے۔"

بعض سلف فرماتے ہیں:

"عالم جب لغزش کھائے۔ اس کی مثال کشتی کی طرح ہے کہ جب غرق ہو تو اس کے ساتھ ساتھ ایک کثیر مخلوق بھی غرق ہو جاتی ہے اور جیسے سورج گرہن ہو کر وہ لوگوں کو چلا چلا کر کہہ رہا ہے۔ اے غافلو! نماز پڑھو اور عوام کے نزدیک (سورج گرہن) صرف ایک ایسی علامت ہے کہ اس وقت (نماز سے خالی) ایک گھبراہٹ ہی ہو۔

بدعتی پر خدا کی لعنت

ایک غریب خبر میں آتا ہے:

"جس نے میری امت سے دھوکہ کیا، اس پہ اللہ، فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہے۔"

پوچھا گیا: "اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ کی امت سے دھوکہ کس طرح؟"

فرمایا: "یہ کہ اسلام میں ایک بدعت جاری کرے اور لوگوں کو اس پر چلنے کے لیے آمادہ کرے۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے :

"عالم کے لیے تابعداروں کی طرف سے بربادی ہے اور تابعداروں کے لیے عالم کی طرف سے بربادی ہے۔ عالم جب لغزش کھاتا ہے تو اس قدر کثرت سے لوگ لغزش کھاتے ہیں کہ آفاق بھر جائیں اور اس سے بڑا مجرم بھی کوئی نہیں جانتا کہ جو اللہ عزوجل کے دین میں ایک بدعت جاری کرے۔ پھر اسے کتاب اللہ اور علم معرفت میں ڈال کر دکھائے۔ جس کا اللہ نے حکم نہیں دیا۔ پھر وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کی پروا نہ کرے جو کہ تمام مخلوق پر حجتِ الٰہیہ ہیں اور مقربین کا راہ ہیں۔ اس طرح اس نے اللہ عزوجل کے بندوں کو گمراہ کیا۔ دین میں بدعت جاری کرنے اور اسے کتاب وسنت سے ہٹ کر اور اہلِ ایمان کی راہ سے جدا ہو کر قابلِ اتباع طریق مقرر کرنے کی مثال اس آدمی کے مقابلہ میں ایسے ہے جو خواہشاتِ نفسانی اور دنیا میں غرق ہے کہ جیسے ایک آدمی لوگوں پر ظلم کرتا۔ ان کے مال وجان تلف کرتا ہے۔ یہ آدمی اس کے مقابلہ میں زیادہ بُرا ہے جو صرف اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے اور انفرادی طور پر گناہ اور خدا کی نافرمانی میں مبتلا ہے۔ بندوں پر ظلم کرنا سب سے بڑا جرم ہے اور اس کی بخشش کا سلسلہ مشکل ہے۔ اسی طرح دینِ اعظم میں بدعت چلانا سب سے بڑا جُرم ہے۔ اس لیے کہ ایسا کرنا لوگوں پر اخروی زندگی کے بارے میں ظلم ہے۔ بدعت جاری کرنا انبیاء علیہم السلام کی شریعت کو مٹانا اور مسلمانوں کے دین پر ڈاکہ ڈالنا ہے۔ اس کی مثال ایسے ہے کہ جیسے ایک آدمی گناہ کرے اور پھر اقرارِ گناہ کرکے معذرت چاہے اور معافی مانگ لے۔ آئندہ گناہ سے رُک جائے۔ اس کی مغفرت کی امید کی جاسکتی ہے اور یہ بخشش ورحمت کے قریب تر ہے۔ اسی طرح جو آدمی خود غلطیاں کرے مگر لوگوں کے سامنے کتاب اللہ اور دینِ اسلام صحیح طور پر بیان کرتا ہو تو اس کے بارے میں بھی امید کی جاسکتی ہے کہ کسی وقت اپنی کوتاہیوں کا تدارک کرلے اور رحمت سے حصہ پالے مگر جو آدمی کتاب وسنت کے برعکس امت میں بدعت جاری کرتا ہے۔ اس نے گویا دین وشریعت کو ہی بدل دیا۔ اس وجہ سے اس کے دل میں نفاق پیدا ہوگا۔ آخرکار دل پر مہر لگ جائے گی۔ صرف ذاتی گناہوں میں مبتلا ہونے کے مقابلہ میں بدعت جاری کرنے والا اس قدر خبیث ہے جیسے کہ ایک آدمی کسی ملک میں رہ کر اسی ملک کے بادشاہ کے خلاف بغاوت کردے اور اس کے خلاف چڑھائی کردے اور رعایا میں سے جس نے صرف غلطی کی، مگر بغاوت نہ کی۔ اس کا یہ درجہ نہیں ہوسکتا۔

بعض حکماءؒ کا فرمان ہے :

"تین باتیں ایسی ہیں کہ بادشاہ کے لیے مناسب نہیں کہ انھیں بخش دے :

۱۔ اس کی رعایا میں سے جو اس کی سلطنت کا تختہ الٹنا چاہے۔

۲۔ ایسا کام کرے جس میں بادشاہ کی تذلیل ہوتی ہو۔

۴۔ بادشاہ کے حرم کی عزت برباد کرے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم سے مروی ہے:

"اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ ہر روز آواز دیتا ہے کہ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی مخالفت کی، اسے آپ کی شفاعت نصیب نہیں ہوگی۔"

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ، نے فرمایا:

"خواہش، اندھاپن کی حصہ دار ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا۔ (اللہ سے سچی بات کس کی)

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا لِّیُضِلَّ النَّاسَ بِغَیْرِ عِلْمٍ۔ (اور اس سے ظالم کون جو جھوٹ باندھے اللہ پر، تاکہ وہ گمراہ کرے لوگوں کو بغیر علم سے)

ایک جگہ فرمایا:

اَوْ قَالَ اُوْحِیَ اِلَیَّ وَلَمْ یُوْحَ اِلَیْہِ شَیْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ۔ (یا کہے مجھ کو وحی آئی اور اس کو وحی کچھ نہیں آئی اور جو کہے کہ میں اتارتا ہوں برابر اس کے جو اللہ نے اتارا)

چنانچہ اللہ پر افتراء باندھنے والے کذاب اور رب تعالیٰ سے مشابہت کا دعویٰ کرنے والے کذاب دونوں کو برابر کا (کذاب و دجال) بتایا۔ اسی طرح وہ آدمی بھی بڑا مجرم ہے جو اہلِ حق سے حق سن کر انکار کرتا ہے اور حق کی تکذیب کرتا ہے۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے حق کی تکذیب کرنے اور ابتداءً خالق کریم پر افتراء باندھنے کو برابر کا جُرم قرار دیا۔ فرمایا:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ کَذِبًا اَوْ کَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَہٗ۔ (اور اس سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یا سچی بات کو جھٹلائے جب اس تک پہنچے۔)

اس طرح ایک جگہ فرمایا:

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَذَبَ عَلَی اللّٰہِ وَکَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَہٗ[1] (پھر اس سے ظالم کون، جس نے جھوٹ بولا اللہ پر اور جھٹلایا سچی بات کو جب پہنچی اس کے پاس)

اور اس کے برعکس سچ کہنے والے اور حق کی تصدیق کرنے والے کو برابر (متقی و عادل) بتایا۔ فرمایا:

---

[1] الزمر آیت ۳۲۔

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۔ (اور جو لایا سچی بات اور سچ مانا اس کو وہی لوگ ہیں ڈر والے)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"عالم اور متعلم دونوں علم میں شریک ہیں۔"

اسی مفہوم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا،

"سننے والا کہنے والے کا شریک ہے۔"

البتہ اللہ تعالیٰ کا یہ انتظام ہے کہ ہر قسم کے بدعتی گمراہ اور شطحیات میں مبتلا جاہل اور اہل ایمان کی راہ سے ہٹ جانے والے کی علماء ربانیین کے ذریعہ تردید ہوتی رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علماء ربانیین کو علم الیقین عطا کیا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے علم و عدل کی شہادت دی۔ فرمایا،

"اس علم کو ہر بعد والا عادل حاصل کرے گا اور وہ غلو کرنے والوں کی تحریف، اہل باطل کی بد دینی اور جاہلوں کی غلط تاویلات سے اس کو پاک کریں گے۔"

چنانچہ غلو کرنے والے شطحیات میں مبتلا ہیں۔ یہ لوگ صحیح علم سے ہٹ گئے، اصل طریق کو مٹا دیا اور حکم ساقط کر دیا اور اہلِ باطل یہی بدعتی ہیں۔ ان لوگوں نے حق کو زیر کرنے کے لیے باطل کے ذریعہ مجادلہ کیا۔ جھوٹے دعوے باندھے۔ رائے و خواہش نفس کے ذریعہ بدعات جاری کیں اور جاہل لوگ علمی غرائب کے منکر ہیں۔ جب ظاہر عقل کی کوئی بات دیکھتے ہیں تو افتراء باندھتے ہیں۔

جیسے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے،

"بعض علم ایسے ہیں جیسے کہ مخفی (خزانہ) ہو، معرفتِ الٰہی رکھنے والوں کے سوا اسے کوئی نہیں جانتا۔ جب وہ اس علم کی بات کرتے ہیں تو صرف وہی لوگ جہالت سے پیش آتے ہیں جو خدا پر محض دھوکہ و غرور میں مبتلا ہیں۔" اور کسی عالم کی تذلیل نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ نے اسے علم عطا کیا اور اس کی تذلیل نہیں کی۔ (تو تم کرو گے تو اس کا عذاب چکھو گے) اور جس نے اپنی رائے سے یا عقلیات سے سنن کی تاویل کی یا سلف کے خلاف کلام کیا۔ یا سلف کے فرامین کے برعکس مفہوم کا کلام کیا تو وہ اہل باطل اور (جھوٹا) متکلف ہے۔

چنانچہ علمائے ربانی کا یہ طریق ہے کہ علم یقین کے ذریعہ، علومِ معقول کی اور علمِ سنت کے ذریعہ علم رائے کی تردید فرماتے ہیں۔ اہل آثار کی تصویب کرتے اور ناقلین احادیث کی تائید کرتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ احادیث و روایات کی وضاحت کرتے ہیں جس کی طرف ناقلین کو بھی راہ حاصل نہیں اور اللہ تعالیٰ نے ان کو مشاہدہ کرایا اور ان کے قلوب منور فرما دیے اور ان کی زبانوں پر یہ علوم چلا دیے۔ چنانچہ وہ روایات کی توضیح اللہ تعالیٰ سے حاصل

کر کے بیان کرتے ہیں۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ۔ (یہ اللہ کا فضل ہے دیتا ہے جس کو چاہتا ہے)

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ۔ (اور کیے ہم نے ان میں سردار جو راہ چلاتے ہمارے حکم سے اور جب وہ ٹھہرے رہے اور رہے ہماری باتوں پر یقین رکھتے)

بعض علماء کا فرمان ہے کہ:

"جس میں سلف نے کلام فرما لیا۔ اس سے خاموشی جفا ہے اور جس سے سلف نے سکوت فرمایا اس میں کلام کرنا تکلف ہے۔"

ایک بزرگ فرماتے ہیں:

"حق بھاری ہے جس نے تجاوز کیا۔ اس نے ظلم کیا اور جس نے کمی کی وہ عاجز رہا اور جس نے اس کے ساتھ توقف کیا۔ اسے کافی رہا۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"تم پر متوسط راہ اختیار کرنا لازم ہے۔ جس طرف بلند ہمت آدمی آتا ہے اور باتیں بنانے والے اس سے ہٹ جاتا ہے۔"

سلف صالحین کی یہی عادت تھی کہ وہ بدعتی کی بات ہی نہ سنتے۔ اس لیے کہ یہ منکر ہے اور جدال ونظر کے ذریعہ اس کا رد بھی نہ کرتے۔ اس لیے کہ یہ بدعت ہے۔ البتہ سنت سے آگاہ کرتے اور ماثورات کے ذریعہ استدلال کرتے۔ اگر وہ قبول کرلے تو تمہارا بھائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خاطر اور اس کی محبت لازم ہے اور اگر انکار کر دے تو اس کے انکار کے باعث اس سے قطع تعلق کرلے۔ اور وہ اپنی بدعت کے باعث معلوم ہو گیا۔ اس کی عداوت لازم ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کی رضا کے باعث اس سے علیحدہ ہو جائے۔ آجکل صرف وہی لوگ اس راہ پر چلتے ہیں جن کو اس کی فضیلت اور طریق سلف سے آگاہی حاصل ہے۔

ابلیس لعنۃ اللہ علیہ کے بارے میں مروی ہے کہ اس نے صحابہ رضی اللہ عنہم کے دور میں اپنے لشکر بھیجے مگر وہ نامراد ہو کر واپس آگئے اور کہنے لگے "ہم نے اس جیسی کوئی قوم نہیں دیکھی۔ ان لوگوں نے ہمیں تھکا دیا اور ہمیں ان سے کچھ حاصل نہ ہو سکا۔" ابلیس نے کہا: تم ان پر قدرت حاصل نہیں کر سکتے۔ انھوں نے اپنے نبی کی مصاحبت کی اور اپنے رب تعالیٰ کی وحی کا مشاہدہ کیا۔ ان کے بعد ایک قوم آئے گی جن سے تم اپنا کام پورا کرا لوگے جب تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کا زمانہ آیا تو پھر اس نے اپنے لشکر بھیجے مگر پھر نامراد و مایوس ہو کر واپس آگئے۔ اس نے

پوچھا: "کیا معاملہ ہوا!"

انھوں نے جواب دیا:

"ہم نے ان سے عجیب تر کوئی قوم نہیں دیکھی۔ ہم ان سے کچھ کچھ گناہ کرا لیتے مگر جب دن کا آخری حصہ ہوتا ہے تو توبہ واستغفار میں لگ جاتے ہیں۔ آخر ان کی برائیاں بھی نیکیوں میں بدل دی جاتی ہیں۔"

ابلیس ملعون نے کہا:

"ان کی توحید درست ہے یہ اپنے نبی کے طریق پر چلتے ہیں۔ اس لیے تم ان سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ البتہ ان کے بعد ایسی قوم آئے گی کہ تم ان کے ذریعہ اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرو گے۔ تم ان سے کھیلو گے اور ان کی خواہشات کے ذریعہ جیسے چاہو گے ان کی قیادت کرو گے۔ اگر وہ استغفار بھی کریں گے تو بھی ان کی مغفرت نہ ہو گی اور نہ ہی وہ توبہ کریں گے کہ ان کی برائیاں، نیکیاں بننے لگیں۔ راوی بتاتے ہیں کہ پھر قرنِ اوّل کے بعد وہ قوم آ گئی کہ لوگوں میں خواہشات نمودار ہوئیں۔ بدعات خوب صورت کر کے سامنے لائی گئیں۔ بدعات کو جائز سمجھا اور انہیں دین بنا لیا۔ اب نہ بدعات سے توبہ کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف آتے ہیں اور نہ بخشش مانگتے ہیں۔ اس طرح ان پر شیاطین کا غلبہ ہوا اور وہ جیسے چاہتے ہیں انھیں دوڑاتے پھرتے ہیں۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا:

"گمراہ لوگوں کے دلوں میں گمراہی کی بھی شیرینی ہوتی ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّ لَهْوًا۔ (ٹھہرا اپنا دین کھیل اور تماشا)

ایک جگہ فرمایا:

اَفَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ فَرَاٰهُ حَسَنًا[1] (بھلا ایک شخص کی بھلی سوجھائی اس کو اس کے کام کی برائی پھر دیکھا اس نے اس کو بھلا)

اسی طرح فرمایا:

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ وَ يَتْلُوْهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ۔ (بھلا ایک شخص جو ہے، نظر آتی راہ پر اپنے رب کی اور پہنچتی ہے اس کو گواہی اس سے)

چنانچہ علم وہی ہے جس پر سلف صالحینؒ چل رہے تھے۔ انہی کے آثار قابل اتباع ہیں اور اخلاف کو انہی کی

---

[1] سورۂ فاطر آیت ۸۔

پیروی کا حکم دیا گیا ہے۔ (سلف میں) صحابہ کرامؓ تھے جو کہ اہل سکینت و رضا ہیں۔ پھر ان کے تابعین آئے جنہوں نے احسان ان کا اتباع کیا اور زہد کی زندگی اختیار کی۔ اب عالم وہی ہے جو سلف صالحین کی طرح ہو، اور لوگوں کو (صحابہ کی) مثل ہونے کی دعوت دے۔ جب لوگ اسے دیکھیں تو اس کے زہد کے باعث زاہد بن جائیں جیسے کہ حضرت ذوالنون رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے،

"جس کا عمل تجھ سے کلام کرے اس کے پاس بیٹھ اور جس کی زبان (ہی) تجھ سے کلام کرے، اس کے پاس مت بیٹھ۔"

(یعنی جس کا عمل صحابہ کی طرح ہو اس کے پاس بیٹھ اور صرف باتونی کے پاس مت بیٹھ)

ان سے پہلے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اپنے فعل سے لوگوں کو نصیحت کر اور (صرف) اپنے قول سے نصیحت نہ کر۔"

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"علم، عمل کو آواز دیتا ہے۔ اگر جواب دے تو ٹھیک ورنہ رخصت ہو جاتا ہے۔"

اسی مفہوم کا ایک فرمان جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی مروی ہے: آپ سے پوچھا گیا:

"کون سا ہم نشین بہتر ہے؟"

آپ نے فرمایا:

"جس کو دیکھنا ہی تمہیں اللہ کی یاد کرا دے، اس کی کلام تیرے علم میں اضافہ کرے اور اس کا عمل، تمہیں آخرت کو یاد کرائے۔" اور جو لوگ ان کی دنیا کے طالب ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی طرح دولت مند بن جائیں۔ جب انہیں دیکھیں تو ان کے حال پر رشک کریں۔ یہ بدترین لوگ ہیں۔ یہ اپنے مولائے کریم کی بجائے اپنی طرف دعوت دیتے ہیں۔ ایسا آدمی ان کی دنیا کا حریص ہے اور وہ (اہل دنیا ان کے پاس آ کر) اس میں زہد کر رہے ہیں۔ علمائے کرام ہی انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں۔ یہی حضرات اللہ تعالیٰ کے دین میں پرہیزگار، دنیاوی فضولیات میں زاہد، علم رائے و خواہش کی بجائے علم یقین و قدرت کے ساتھ کلام کرنے والے اور شبہات و آرائے خاموشی اختیار کرنے والے ہیں۔ کسی کی رائے اور اہل باطل و جاہل کے قول کے باعث ان علمائے ربانیین کا سلسلہ قیامت تک ایسے ہی رہے گا اور کبھی بھی ان کا حال نہ بگڑے گا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا:

"اس امت کی ابتداء میں زہد و یقین کے ذریعہ اصلاح ہوئی اور آخر میں جا کر بخل و امید کے باعث اس کی بربادی ہوگی۔"

حضرت یوسف بن اسباطؒ فرماتے ہیں: کہ حذیفہ مرعشی نے میری طرف یہ لکھا کہ آپ اس آدمی کے بارے میں کیا گمان رکھتے ہیں۔ جو زندہ باقی ہے اور کوئی ساتھی ایسا نہیں پاتا کہ جس کے ساتھ مل کر اللہ تعالےٰ کا ذکر کرے۔ بس گناہ گار ہی ساتھی ملتا ہے اور گناہگار کا مذاکرہ نافرمانی کی باتیں ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اہلِ (ذکر) کو نہیں پاتا۔ تو میں نے یوسف سے کہا:

"اے ابو محمدؒ! تم انہیں پہچانتے ہو؟"

اس نے کہا:

"وہ ہم پر مخفی نہیں رہتے۔"

مشائخ فرماتے ہیں کہ ابدال زمین کے اطراف میں الگ ہو گئے۔ عوام کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اس لیے کہ وہ اس وقت کے علماء کو دیکھنے کی تاب نہیں رکھتے۔ اور ان کا کلام سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کے نزدیک یہ لوگ خدا سے جاہل ہیں۔ اپنے نزدیک اور جہلاء کے نزدیک یہ علماء کہلواتے ہیں۔ یہ اہل جہل میں سے ہوئے اور جاہل آدمی جہالت پر اس طرح ہوتا ہے جیسے کہ سہل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"جہل کے ساتھ جہل اور عوام پر نظر سب سے بڑی نافرمانی ہے۔"

غافلین کا کلام سننا ان کے نزدیک غافلین کا کلام سننا ان کے نزدیک آسان بات ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ اس کو معدوم نہیں کرتے کیوں کہ عوام دین میں گڑبڑ نہیں کرتے۔ انہیں علماء ہونے کا دعویٰ نہیں ہوتا۔ اس لیے تمام اہل ایمان کو فریب میں مبتلا نہیں کرتے۔ انہیں اپنی جہالت کا اعتراف ہوتا ہے۔ اس طرح وہ رحمت کے قریب اور غضب سے دُور ہوتے ہیں۔

حضرت ابو محمدؒ بھی فرمایا کرتے:

"علم کے ساتھ جہالت کی قساوتِ قلبی، نافرمانی کی قساوت سے شدید تر ہوتی ہے۔ اس لیے کہ علم سے جاہل رہنے والا عمل کو ترک کرنے والا ہے اور بس مگر فعل کا نافرمان، علم کا اقرار کرنے والا ہے۔"

نیز فرمایا کرتے:

"علم دوا ہے اس کے ذریعہ امراض دُور ہوتی ہیں۔"

چنانچہ علم ہی تدارک کرنے کے ذریعہ اعمال کی خرابی دُور کرتا ہے اور جہالت خود ایک مرض ہے۔ یہ اعمال کے ٹھیک ہونے کے بعد بھی اعمال کو بگاڑ دیتی ہے۔ چنانچہ جہالت نیکیوں کو فنا کر کے برائیاں بنا دیتی ہے۔ اب خراب کو درست کرنے والے اور نیکیوں کو برباد کرنے والے کام میں کس قدر فرق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُصۡلِحُ عَمَلَ الۡمُفۡسِدِیۡنَ۔ (بے شک اللہ نہیں سنوارتا شریروں کے کام)

اور فرمایا:

اِنَّا لَا نُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُصۡلِحِیۡنَ۔ (بیشک ہم نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کریں گے)

یہ بات اس بات کی زبردست دلیل ہے کہ ایک محنتی عابد پر بھی ایک کم عمل عالم کو افضلیت حاصل ہے۔

یہ بھی یاد رکھیں کہ اگر ایک آدمی تمام حالات میں لوگوں سے جُدا ہو جائے اور کسی سے بھی تعلق نہ رکھے تو سب سے کٹ جائے گا اور اگر اکثر احوال میں جدا ہو جائے تو اکثر سے کٹ جائے گا اور اگر بعض احوال میں جدا ہو اور بعض احوال میں اختلاط رکھے تو اہل خیر سے اختلاط کا موقع مل جائے گا اور بُرے لوگوں سے جدا ہو جائے گا۔

باب الاخبار

فضیلت اخبار و طریق ارشاد

روایت میں رخصت اور وسعت کی تفصیل

ہم نے اس کتاب میں جس قدر احادیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آثار صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم درج کیے ہیں۔ یہ سب زبانی یا دداشت سے لکھے ہیں اور زیادہ تر روایت بالمعنی کا التزام رکھا ہے۔ ہاں جو مرویات ہمیں ہاتھ لگیں ان میں روایت بالالفاظ کا بھی التزام کر لیا۔ اب جو کلام درست ہے وہ اللہ تعالیٰ کا احسان و توفیق ہے۔ اور اس سے قوت حاصل ہوئی۔ اور اگر کہیں غلطی ہو گئی تو یہ ہماری سہو و غفلت کا نتیجہ ہے اور شیطان کی طرف سے عجلت و نسیان کا باعث ہے جیسے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کا ایک فیصلے میں فرمان ہے جس میں انہوں نے اپنی رائے سے فیصلہ کیا اور ہمارا قول ان کی رائے کے تابع ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ بیان اور پختہ قدمی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے اور عجلت و نسیان، شیطان کی جانب سے ہوتا ہے یعنی شیطان کے واسطہ سے اور توفیق کی کمی کے باعث ہوتا ہے میں نے بیشتر روایات میں الفاظ کا زیادہ اہتمام نہیں رکھا۔ البتہ مفہوم سے انحراف نہیں کیا۔ اس لیے کہ میرے نزدیک الفاظ کا اہتمام واجب نہیں۔ جبکہ روایت بالمعنی ٹھیک طرح سے ہو اور روایت کرنے والا تغیرِ کلام سے خوب آگاہ ہو اور مختلف مفاہیم کے اختلافات کو خوب جانتا ہو۔ وہ لفظوں میں تغیر کرنے اور تحریف کرنے سے بھی بچتا ہو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت نے بھی روایت بالالفاظ کے علاوہ روایت بالمعنی کی اجازت و رخصت دی ہے مثلاً حضرت علیؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت انسؓ بن مالک، حضرت واثلہؓ بن اسقع اور حضرت ابوہریرہؓ، تابعین کی ایک بڑی جماعت سے بھی اس کی رخصت منقول ہے۔ ان میں سے امام حسن بصریؒ، شعبی، عمروؒ بن دینار اور ابراہیم نخعیؒ، مجاہد اور حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہم زیادہ مشہور ہیں۔ کتبِ سیر میں ان کی روایات مختلف الفاظ کے ساتھ مروی ہیں۔

ابن سیرینؒ نے فرمایا:

"میں دس آدمیوں سے حدیث سنتا، الفاظ مختلف ہوتے اور معنی ایک ہی ہوتا۔"

یہی وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہؓ کی روایتِ حدیث میں لفظی اختلاف پایا جاتا ہے بعض صحابہ مکمل روایت کرتے، بعض مختصر کر کے روایت کرتے۔ بعض روایت بالمعنی کرتے اور بعض دو لفظوں میں جب معنی کا اختلاف نہ پاتے تو دوسرے لفظ سے تغیر کر دیتے مگر ان کا مقصود انحراف و ابطال نہ ہوتا تھا اور ان میں سے کسی کا مقصد عمداً کذب لگانا نہ ہوتا تھا وہ سب کے سب جو سنا ہوتا اس میں معنی اور صداقت کو پیش نظر رکھتے اور کوئی بھی سرکشی کا ارادہ نہ کرتا تھا اس لیے انھیں وسعت حاصل تھی اور فرمایا کرتے،

"کذب اس پر ہے جو تعمد کے طور پر ایسا کرے۔"

حضرت عمران بن اسلم فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت حسنؓ سے عرض کیا؛

"اے ابوسعیدؒ! آپ حدیث بیان کرتے ہیں مگر آپ ہم سے بہترین اسلوب، اعلیٰ تعبیر اور فصیح ترین انداز میں بیان کرتے ہیں۔"

انھوں نے فرمایا:

"جب تم معنی درست پاؤ تو پھر کچھ حرج نہیں۔"

نضر بن شمیل نے کہا کہ ہشام ماہرِ کلام تھا۔ میں نے اس کی حدیث کو اچھا لباس پہنا دیا یعنی فصاحت کے ساتھ، اور نضر نحوی تھا۔

ہماری تمام مرویات یا جو ہم نے ذکر کی ہیں اسی اصول کے قائل ہیں۔ حضرت ابن مسعودؓ نے بھی اپنی حدیث میں یہی فرمایا اور حضرت سلیمان تیمی بھی جو حدیث بیان کرتے اس کے بارے میں یہی فرماتے۔ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے؛

"جب تم دیکھو کہ ایک آدمی [illegible] الفاظِ حدیث پر سختی کر رہا ہے تو جان لو کہ وہ یہ [illegible] رہا ہے "مجھے پہچانو"۔"

اور بتایا کہ ایک آدمی حضرتِ یحییٰ [illegible] تعالیٰ سے حدیث کے بارے میں اس کے الفاظ پر بات کرنے لگا تو

حضرت یحییٰ نے اسے فرمایا:

"اے بھائی! ہمارے ہاتھوں میں کتاب اللہ سے زیادہ باعظمت کوئی نہیں ہے اور اس میں بھی سات احرف پر (سات قرآنوں پر) تلاوت کی اجازت دی ہے۔ اس لیے (الفاظ پر) زیادہ سختی نہ کرو۔"

ہم نے جو مراسیل و مقاطیع نقل کی ہیں اور ان میں سے بعض کے اسانید میں جرح بھی ہوئی تو یاد رکھیں۔ بعض اوقات مقطوع و مرسل روایت، ایک مسند سے بھی زیادہ صحیح ہوتی ہے جبکہ اسے "ائمہ" روایت کریں اور کئی وجوہ کی بنا پر ہمارے لیے یہ بات جائز ہے۔

۱۔ ہمیں یہ یقین نہیں کہ یہ (مرسل و مقطوع روایت) ضرور ہی غلط ہے۔

۲۔ ہمارے پاس اس کی ایک حجت یہ بھی ہے کہ یہ روایت ہو کر ہم تک پہنچی۔ اور ہم نے اسے سنا۔ اگر اللہ کے ہاں ہم سے (سہواً) غلطی ہو گئی تو یہ معاف ہو گی جیسے کہ اسباط نے کہا تھا۔

وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ۔ (اور ہم نے وہی کہا تھا جو ہم کو خبر تھی اور ہم کو غیب کی خبر یاد نہ تھی)

یہ اس وقت کہا جب انہوں نے یہ کہا کہ:

اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ۔ (بیشک تیرے بیٹے نے چوری کی)

حالاں کہ انہیں امرِ واقعہ میں مغالطہ ہو گیا مگر پھر بھی دلیل ہونے کے باعث وہ معذور سمجھے گئے۔ دلیل یہ تھی کہ شاہی پیمانہ ان کے بھائی کے سامان سے نکالا گیا۔

۳۔ جو ضعیف روایات کتاب و سنّت کے خلاف نہ ہوں۔ ان کا رد کرنا ہم پر لازم نہیں بلکہ ان میں وہی باتیں ہیں جو کتاب و سنّت پر دلالت کرتی ہیں۔

۴۔ ہمیں حسنِ ظن رکھنے کا حکم دیا گیا اور بدظنی سے منع کیا گیا اور بدظن پر مذمت کی گئی۔

۵۔ ان کے (غلط ہونے کا) ایک ہی طریقہ ہے کہ خود معاینہ حاصل ہو اور اس کی طرف ہمیں کوئی راہ حاصل نہیں۔ اب ہم ناقلینِ حدیث پر حسنِ ظن رکھ کر تصدیق و تقلید کے لیے مجبور ہیں اور اس کے ساتھ ہمیں دلوں کو اطمینان بھی ہے۔ ہمارے اجسام اس کے سامنے خوشی سے پیروی میں حاضر ہیں اور ہم اسے حق ہی سمجھتے ہیں جیسے کہ حدیث میں آیا۔

مزید برآں ہم پر لازم ہے کہ ہم اسلافِ کرام کے بارے میں یہ عقیدہ رکھیں کہ وہ ہم سے بہتر لوگ تھے۔ اب جب ہم خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین پر جھوٹ باندھنے کو آمادہ نہیں تو ہم یہ بدظنی کیوں کر رکھ سکتے ہیں۔ کہ وہ لوگ جھوٹ بولتے ہوں جو ہم سے بلند تر درجہ کے مالک ہیں اور جبکہ کئی ضعیف احادیث صحیح

اسانید کے ساتھ بھی مروی ہیں۔ اس طرح ہمارے لیے اس میں بہتری ہے کہ ہم ضعیف سند کے ساتھ مروی صحیح احادیث کو بھی تسلیم کر لیں۔ اس لیے کہ ممکن ہے یہی حدیث کسی دوسری صحیح سند کے ساتھ مروی ہو کیونکہ تمام علم پر ہم لوگ تو حاوی نہیں ہیں یا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ ایک محدث اسے ضعیف بتا رہا ہو تو دوسرا اس سند کو قوی بتا رہا ہو۔ ایک مذمت کر رہا ہو اور دُوسرا مدح کر رہا ہو۔ اس لیے کم درجہ والے ناقد کے قول پر یا برابر کے ناقد کے قول پر حدیث کو مردود نہیں سمجھا جا سکتا۔ گاہے یوُں بھی ہوتا ہے کہ روایتِ حدیث پر جرح کرکے اسے معلول بتایا جاتا ہے مگر فقہاء کے نزدیک وہ معلول نہیں ہوتی اور نہ ہی علماء ربانیین کے نزدیک وہ مجرُوح ہوتی ہے مثلاً راوی مجہول ہو، اور اس پر عدمِ شہرت کا پردہ پڑا ہو یا اس کی روایات کم ہونے کے باعث معروف نہ ہو یا ایک لفظ ہیں یا جو حدیث اس میں روایت کی اس میں منفرد ہو اور ثقات اس سے جدا ہوں۔ یا اس کے لفظ پر حدیث نہ لا رہا ہو یا اس کو یاد کرنے اور پڑھنے کا خوب نہ رکھا ہو۔ گاہے ایسا ہوتا ہے کہ حفاظِ حدیث ہی جرح میں حد سے بڑھ جاتے ہیں اور لفظ میں زیادتی کر ڈالتے ہیں۔ گاہے وُہ راوی جس پر جرح کی جا رہی ہوتی ہے۔ علماء کے نزدیک وہ زیادہ افضل ہوتا ہے اور بلند درجہ کا مالک ہوتا ہے۔ چنانچہ جرح کرنے والے پر جرح پلٹ آتی ہے یا رائے اس پر پردہ دبا س ہوگا یا اس سے ایسا کلام سُنا ہو کہ فقہاء کے نزدیک وُہ مجروح ہو جائے۔ بعض قرائے روایت نے اسے معلول کہا ہو یا اصحابِ حدیث جس کی تضعیف کریں وُہ علمائے آخرت میں اور عارفین باللہ میں سے ہو اور اصحابِ حدیث کے طریقہ کے علاوہ حدیث و روایت میں اس کا الگ مذہب ہو اور وہ اس مذہب کے ساتھ اس روایت پر عمل پیرا ہو۔ اب اصحابِ حدیث اس پر حجت نہ ہوں گے۔ ہاں البتہ وُہ ان پر حجت ہوگا۔ اس لیے کہ وُہ اس کے علماء اصحاب سے نہیں ہے سوائے محدثین کے کہ جنھوں نے اس کی تضعیف کی کیونکہ غیر کی رائے اس کے مذہب کی رائے ہوتی ہے۔

بعض علماء کا فرمان ہے کہ حدیث اگرچہ حسنِ ظن کی وسعت ہے جیسے کہ اس میں ایک آدمی کی شہادت قبول ہونا جائز بتایا۔ یعنی ضرورت کی بنا پر۔ جیسے کہ قابلہ وغیرہ کی شہادت کا معاملہ ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بھی اسی مفہوم کی روایت ہے۔ اور جب ایک حدیث ایسی ہو جو کتاب و سنت کے منافی نہ ہو تو چاہے دو شہادتیں نہ ہوں تو جب تک اس کی تاویل اجماعِ امت سے خارج نہ کر دے اسے قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا لازم ہے اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کیوں کر اور جب کہ کہی گئی ہے"۔ (کَیْفَ وَ قَدْ قِیْلَ)

میرے نزدیک قیاس و رائے کے مقابلہ میں ضعیف حدیث بھی قابلِ ترجیح ہے۔ امام ابو عبداللہ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی مذہب ہے۔ نیز جب حدیث دو زمانوں میں متداول رہی ہو یا تین قرون تک

روایت ہوتی رہے یا ایک زمانہ میں مروی رہے اور علمائے حدیث اس کا انکار نہ کریں اور وہ مشہور ہو۔ مسلمانوں کا ایک گروہ اس کا انکار نہ کرتا ہو۔ اب اگر اس کی سند میں جرح بھی ہو تو بھی وہ حجت ہے۔ ہاں اگر کتاب و سنت کے ہی مخالف ہو یا اجماعِ اُمت کے خلاف ہو یا ائمہ صادقین کی شہادت سے اس کے راویوں کا کذب ظاہر ہو جائے تو یہ حدیث (مردود ہو گی)۔

حضرت وکیع بن جراحؒ نے فرمایا:

"کسی کے لیے یہ مناسب نہیں کہ یوں کہے کہ یہ حدیث باطل ہے۔ اس لیے کہ حدیث اس سے بالا تر ہوتی ہے۔"

حضرت ابو داؤدؒ نے فرمایا کہ ابو زرعہؒ فرماتے ہیں:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو بیس ہزار نگاہیں ایک دُوسرے کو دیکھ رہی تھیں جنہوں نے ایک دوسرے سے روایت کیا ہے۔ چاہے ایک حدیث یا ایک کلمہ یا ایک روایت ہی نقل کی ہو۔ اس لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث تعداد سے باہر ہیں۔

حضرت زہری کے پاس ایک آدمی نے ایک حدیث نقل کی تو انہوں نے فرمایا:

"ہم نے یہ نہیں سنی۔"

تو اس نے کہا: "کیا آپ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام احادیث سُن رکھی ہیں؟"

انھوں نے فرمایا: "نہیں۔"

اس نے پوچھا: "تو کیا دو تہائی سنی ہیں؟"

انھوں نے کہا: "نہیں۔"

تو اس نے کہا: "کیا نصف سُنی ہیں؟"

یہ خاموش رہے۔ اس نے کہا: "اسے ان نصف میں سے سمجھ لیں جو آپ نے نہیں سُنی۔"

امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا:

"یزید بن ہارون ایک آدمی سے (حدیث) لکھتے تھے۔ حالانکہ وہ جانتے تھے کہ یہ ضعیف ہے اور خود علم حدیث اور ذکاوت میں بلند مقام کے مالک تھے۔ حضرت اسحٰق بن راہویہؒ نے فرمایا، کہ امام احمد بن حنبلؒ سے پوچھا گیا کہ "یہ فوائد کیا ہیں جن میں منکر بھی ہیں۔ کیا ہم ان سے عمدہ عمدہ لکھ لیں۔"

وہ کہنے لگے: "منکر ہمیشہ منکر ہی ہوتا ہے۔" (عمدہ اس میں سے کہاں ہو گا)

پوچھا گیا: "تو ضعفا کے بارے ہیں؟"

فرمایا: "گاہے ایک وقت میں ان کی احتیاج بھی ہوتی ہے۔گویا انھوں نے ضعفاؔ سے نقل حدیث میں کچھ ہرج نہیں سمجھا۔"

حضرت ابوبکر مروزی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"گاہے ضعفاؔ سے مروی حدیث کا احتیاج بھی ہوتا ہے جبکہ وہ توسع کے سلسلہ میں اس کے مذہب پر دلالت کرے۔ خود امام نے اپنے مسند (احمدؒ) میں ایسی احادیث روایت کی ہیں جن کو ہم نے اپنے شیوخ سے روایت کیا اور انھوں نے ان کے بیٹے عبداللہ سے روایت کیا۔ اور ہمیشہ صحیح کا التزام نہیں رکھا بلکہ اس میں ایسی احادیث بھی بہت ہیں جن کے بارے میں ثقات بھی جانتے ہیں کہ یہ ضعیف ہیں اور امام صاحبؒ خود ان سے زیادہ ان کے ضعف سے آگاہ تھے مگر پھر بھی انہیں اپنی مسند میں داخل کیا اس لیے کہ ان کا مقصد مسند تیار کرنا تھا اور تصحیح مسند مقصود نہ تھا۔ (کہ ضعاف کو نکال دیتے) چنانچہ جیسے سُنا ویسے ہی ان کی روایت کی اجازت چاہی اور ۲۲۶ھ میں قطعیت کے ساتھ لوگوں کو حدیث سُنائی۔ اور ۲۴۱ھ میں وفات پائی۔ اس زمانہ میں ان سے صرف ان کے بیٹے عبداللہ اور ابن منیع نے ایک جزو سنا اور ان کے دادا احمد بن منیع کی سفارش سے سنا۔

ان سے یعنی امام احمدؒ سے مروی ہے۔ فرمایا:

"عبدالرحمٰن ایک حدیث کا انکار کرتا تھا، پھر دُوسرے وقت میں ہمارے پاس آتے اور کہتے کہ یہ صحیح ہے میں نے پالی۔"

فرمایا: "البتہ وکیعؒ انکار نہ کرتے اور جب ان سے پوچھا جاتا تو کہتے کہ مجھے یاد نہیں۔"

ابن اخت عبدالرحمٰن بن مہدی سے مروی ہے۔ فرمایا کہ میرا ایک ماموں تھا اس نے بعض احادیث پر لکیر کھینچ دی۔ پھر اس کے بعد ان کی صحت کر دی اور میں نے اس کے سامنے انہیں پڑھا اور میں نے پُوچھا:

"آپ نے ان پر لکیر کھینچ دی تھی؟"

فرمایا: "ہاں"۔

پھر میں نے غور کیا تو جان لیا کہ اگر میں اس کی تضعیف کروں تو اس کے راوی کی عدالت ساقط کر دوں گا اب اگر وُہ مجھے اللہ کے سامنے لایا اور یہ کہا کہ تو نے میری عدالت کیوں ساقط کی؟ کیا تو نے مجھے دیکھا کہ میں نے ایسا کلام سُنا ہے جو میرے لیے حجت نہ تھا۔ سلفؒ میں سے متقی حضرات کا یہ مذہب ہے۔

بعض یہ فرمایا کرتے تھے:

"ہم شعبہ کی مجالست ترک کر دیتے تھے اس لیے کہ وہ ہمیں غیبت میں ڈال دیتا تھا اور اس کا کلام (روایت کی) تضعیف میں ہوتا تھا۔"

تضعیف روایت کے بارے میں بعض علماء کا فرمان ہے:

"اگر تیری نیت خالص ہوگی۔ یعنی اس سے تیرا مقصود اللہ تعالیٰ اور دین ہو۔ تو یہ بات نہ تیرے لیے فائدہ کی ہے اور نہ تجھ پر وبال ہے۔ یہ مذکور باتیں معرفتِ حدیث میں اصول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اہل فن کا علم و راہ ہے۔ اس کے بعد پھر ایک قوم پیدا ہوئی جس کو کچھ علم نہ تھا اور نہ ہی انہیں علمی مقام حاصل تھا۔ نہ ہی انہیں عبادت کا شغل حاصل تھا۔ ان لوگوں نے اپنے لیے علم پیدا کیا اس میں مشغول ہو گئے اور جو ان کے پاس آتا اسے بھی اس میں ہی مشغول کر دیا۔ ان لوگوں نے کتابیں لکھیں اور ناقلین احادیث میں جرح کرنے لگے۔ چنانچہ ان لوگوں نے اہلِ بدعت کو موقع دیا کہ وہ سنن کا رد کریں اور رائے و معقول کو ترجیح دیں۔ جبکہ انہیں رواۃ میں طعن نظر آیا اور اس دور میں جب انہیں سنت و حدیث سے علیحدہ ہوتے دیکھا تو قیاس و نظر کو غنیمت جان کر اسے لیا۔

حالاں کہ آخرت میں ترغیب، دنیا میں زہد اور خدائی وعید کے ذریعہ ترہیب کے سلسلہ میں ہر صورت میں احادیث و روایات کو قبول کیا جائے گا۔ چاہے احادیث مقطوع و مرسل ہی ہوں۔ وہ مردود نہ ہوگی۔ اسی طرح احوالِ قیامت، اس کے زلزلوں اور ہولناکیوں کو عقل کے باعث رد نہ کیا جائے گا بلکہ ہم تصدیق و تسلیم کے ساتھ انہیں قبول کریں گے۔ سلف صالحینؒ کا یہی طریق ہے۔ اس لیے کہ علم اس بات کی نشان دہی کرتا ہے اور اصول اس چیز کو ثابت کرتے ہیں۔

مروی ہے:

"جس کو اللہ کی طرف سے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہی فضیلت پہنچے اور اس نے اس پر عمل کر لیا تو اللہ تعالیٰ اسے اس کا ثواب دے گا چاہے یہ کہا نہ ہی گیا ہو۔"

دوسری حدیث یہ ہے:

"مجھ سے جو حق روایت کیا جائے تو میں اس کا کہنے والا ہوں اور جو مجھ سے باطل نقل کیا جائے تو میں باطل کا حکم نہیں دیتا۔"

اس کتاب میں جو کچھ ہم نے کہا وہ ہمارا قول ہے اور اللہ تعالیٰ ہی اعلم و احکم ہے۔ اس کا علم مقدم ہے اور حقایق اسی کو معلوم ہیں۔ اسی کی طرف امور لوٹ کر جائیں گے جو وہ چاہے وہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ سے ہی مدد کی درخواست ہے۔ اللہ کے بغیر نہ قوت ہے اور نہ ہی توفیق ہے۔ کتاب العلم، علوم کی تفصیلات، طریقِ سلف کی توضیح اور بعد والوں کی بدعات وغیرہ کے بارے میں یہ آخری سطور ہیں۔

فصل ۳۲

مقاماتِ یقین اور اہلِ یقین کے احوال

مقاماتِ یقین کے دُہ اصول نو ہیں جن کی طرف احوالِ متقین کی فروع جاتی ہیں - وہ اصول حسب ذیل ہیں:

۱۔ توبہ

۲۔ صبر

۳۔ شکر

۴۔ رجاء

۵۔ خوف

۶۔ زہد

۷۔ توکل

۸۔ رضا

۹۔ محبت

یہ خواص کی محبت ہے اور محبتِ محبوب ہے۔

توبہ کا بیان

اللہ تعالیٰ نے پہلے بیان میں خطابِ عام فرمایا:

وَ تُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔

(اور توبہ کرو اللہ کے آگے سب مل کر، اے ایمان والو! شاید تم بھلائی پاؤ)

یعنی تمام شہوات سے توبہ کرکے اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ آؤ تاکہ تم آخرت میں اپنا مطلوب پالو اور اللہ عزوجل کے بقاء کے ساتھ ایسی نعمت میں باقی رہے جس کو زوال نہیں اور نہ ہی وہ نعمت ہی ختم ہوگی اور تاکہ تم دخولِ جنت کی سعادت و کامرانی حاصل کرو اور آگ سے نجات پا جاؤ۔ یہی کامرانی ہے۔

اور دوسرے بیان میں خطاب خاص فرمایا:

يَاۤ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ يُدْخِلَكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ۔

(اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی طرف، صاف دل کی توبہ، شاید تمہارا رب اتارے تم سے تمہاری برائیاں، اور داخل کرے تم کو باغوں میں جن کے نیچے بہتی ہیں نہریں)

چنانچہ نصوح دراصل نصح سے ہے اور فعول کے وزن پر ہے جو کہ مبالغہ کے لیے ہے اور نُصوحا بھی پڑھا گیا۔ نون پر ضمہ ہے۔ اس صورت میں یہ مصدر ہے۔ نصحت لہ نصحا و نصوحا۔ اس کا مطلب ہے خالص کر کے اللہ کے لیے اور نصاح سے مشتق ہو تو اس کا مطلب ہے اور یہ دھاگے کو کہتے ہیں۔ یعنی خالی ہو۔ کسی چیز سے تعلق نہ ہو اور نہ ہی کوئی چیز اس سے متعلق ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ لامڑ کی مکاری کی طرح مکاری نہ کرے اور طاعت و عبادت پر پختہ قدم رہے اور موقع پانے پر گناہ کی طرف جانے کا خیال بھی نہ لائے۔ اور محض اللہ تعالیٰ کی خاطر گناہوں سے توبہ کرے جیسے کہ اس نے خواہشِ نفس کی خاطر گناہوں کا ارتکاب کرتا رہا تھا۔ اب جب خواہشِ نفس سے ہٹ کر قلبِ سلیم کے ساتھ اللہ عزوجل کے سامنے آئے اور سنت طریق پر عمل خالص اختیار کرے تو اس کے لیے حسنِ خاتمہ کا یقین ہوگا۔ اس صورت میں بھلائی حاصل ہوئی اور یہی توبۃ النصوح ہے اور یہی تائب، پاک اور حبیب بندہ ہے اور جس کو اللہ سے بھلائی میں سبقت ملی یہ اس کی خبر دی جس کو خدا کی نعمت ملی اس پر اللہ کی رحمت ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس خطاب میں یہی مراد لیا۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَہِّرِیْنَ۔ (اللہ کو خوش آتے ہیں توبہ کرنے والے اور خوش آتے ہیں ستھرائی والے)

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"توبہ کرنے والا اللہ کا پیارا ہے اور گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے کہ اس کا کچھ گناہ نہیں۔"

حضرت حسنؓ سے توبہ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:

"یہ دل کی ندامت کا نام ہے۔ زبان سے بخشش مانگنے، اعضائے ظاہری کے ساتھ (گناہ) ترک کر دینے اور اس بات کو (توبہ) کہا جاتا ہے کہ (دل میں، یہ بات پوشیدہ رکھے کہ لوٹ کر ایسا بُرا کام نہ کرے گا۔"

حضرت ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"توبہ سے زیادہ کوئی چیز مخلوق پر لازم نہیں اور نہ ہی علمِ توبہ غائب ہونے سے زیادہ ان پر سخت سزا ہوگی۔" حالانکہ آجکل، تو لوگ علمِ توبہ سے ہی جاہل بن گئے۔ ایک موقع پر فرمایا:

"جو یہ کہتا ہے کہ توبہ فرض نہیں۔ وہ کافر ہے اور جو آدمی اپنے ہی قول پر راضی ہو چکا (چاہے غلط ہو) تو وہ کافر ہے۔"

اور فرمایا:

"ہر وقت اور ہر لحظہ طاعات میں غفلت سے توبہ کرنے والا ہی تائب ہے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ترکِ توبہ کو اندھاپن کا ایک مقام قرار دیا اور اس بات کو اتباعِ ظن اور ذکر اللہ

کی فراموشی سے ملایا۔ چنانچہ ایک طویل حدیث میں فرمایا:

"جو اندھا ہوا وہ ذکر بھول گیا، اس نے ظن کا اتباع کیا اور توبہ و عجز کے بغیر مغفرت طلب کرنے لگا۔" چنانچہ فرض توبہ وہ ہے جو تائب کے لیے لازمی ہے اور توبہ اسی وقت سچی توبہ ہو سکتی ہے کہ گناہ کا اقرار کرے، ظلم کا اعتراف کرے۔ خواہش نفسانی سے نفرت کرے اور بداعمالیوں سے متنفر ہو جائے۔ سکت کی حد تک عمدہ غذا (رکھے۔ اس لیے کہ (حلال) کھانا اور گزشتہ گناہوں پر ندامت ہی صالحین کی بنیاد ہے۔ ہر حق کی ایک حقیقت ہوتی ہے اور ندامت اگر حق و درست ہو تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ ایسا کام دوبارہ کبھی نہ کرے۔ جس کی وجہ سے ندامت اٹھانی پڑے۔ اس کے بعد استقامت رکھے اور برائی سے دور رہے۔

استقامت کا مفہوم

استقامت کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ کبھی بھی ایسا کام نہ کرے کہ جس کی وجہ سے پہلے ندامت اٹھانا پڑی اور اللہ کی طرف جانے والوں کی راہ پر تن دہی سے چلتا رہے کسی جاہل سے دوستی نہ رکھے ورنہ اسے برباد کر دے گا۔ اور ماضی میں جو خرابی کر چکا تھا اس کی اصلاح کی فکر کرے تاکہ تائبین و مصلحین میں سے ہو جائے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ مفسدوں کے اعمال کی اصلاح نہیں کرتا جیسے کہ نیکوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ خدا تعالیٰ ان کی برائیوں کو نیکیوں سے بدل دیتا ہے تاکہ حسنِ انابت اور توبہ کی برکت سے ان لوگوں میں سے ہو جاؤ جن کی برائیاں بھی (توبہ کے بعد) نیکیاں بن جاتی ہیں۔ اس لیے کہ دنیا میں بدل کر نیک بننا یہی ہے کہ بُرے اعمال کو بدل کر اچھے اعمال کیا کرے۔ فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔ (اللہ نہیں بدلتا جو ہے کسی قوم کو جب تک وہ نہ بدلیں جو اپنے بیچ ہے)

اور جب ہم بداعمال کو بدل کر نیک کام کرنے لگیں گے پھر ندامت و دوام حزن کی کیفیت رہے گی تو اللہ تعالیٰ ہماری برائیوں کو نیکیوں میں بدل دے گا۔ گزشتہ اعمال پر ندامت و حزن کا مطلب یہ ہے کہ موقع پانے پر افراط سے کام نہ لے۔ نیکی کا موقع ہاتھ سے نہ گنوائے ورنہ دوسرا موقع بھی ضائع کر بیٹھے گا۔ اس لیے کہ عمل کر کے گزشتہ کا تدارک کرنا اور آئندہ مستعد و بیدار رہنا ہی طریق ہے کہ جس سے گزشتہ کی تلافی ہو سکے اور گزشتہ کی تلافی غفلت سے نہیں ہو سکتی اور نہ ہی نعمتیں کھانے سے انعامات حاصل ہوتے ہیں تاکہ ایسا ہو جائے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِہِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ اٰخَرَ سَیِّئًا۔ (اور بعضے مانیں اپنے گناہ، ملایا ایک کام نیک اور دوسرا بد)

یعنی اعتراف کرے اور نادم ہو۔

توبہ کیا ہے

حضرت ابو سلیمان دارانیؒ نے فرمایا:

"اگر عاقل اپنی گزشتہ زندگی پر نہ روئے۔ سوائے اس زندگی کے کہ جو غیر طاعت میں گزری تو وہ اس بات کا مستحق ہے کہ موت تک اسے یہ حرکت غمگین رکھے۔ اب جو آدمی گزشتہ جہالت کی زندگی کی طرح آئندہ بھی (جہالت کی زندگی گزارے) اس کا معاملہ تو اس سے بڑھ کر ہے۔"

حضرت سہل بن عبداللہ" فرماتے ہیں:

"تائب آدمی کو کوئی چیز ذلیل نہیں کر سکتی۔ اس کا دل، روح نکل جانے تک عرش سے متعلق رہتا ہے اس کی زندگی صرف زندہ رہنے کے لیے ضروری چیز کی حد تک ہے۔ گزشتہ پر غم کرتا اور عبادت میں محنت کرتا ہے۔ آئندہ زندگی میں ممنوعات سے بچتا ہے اور یہ چیز تب ہی مکمل ہوتی ہے کہ ہر چیز میں علم یقین استعمال کرے۔ پھر نیک اعمال کرے تاکہ ان میں سے ہو جائے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ يَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ۔ (اور کرتے ہیں برائی کے مقابل بھلائی)

یعنی گزشتہ برائیوں کو آئندہ نیکیاں دور کرتے ہیں۔

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا:

"جب برا عمل کر بیٹھے تو اس کے بعد ایک نیکی کرو۔ پوشیدہ (برائی کے بعد) پوشیدہ (نیکی) اور علانیہ (برائی کے بعد) علانیہ (نیکی کرو)۔"

حضرت معاذؓ کی وصیت میں ہے:

"برائی کے بعد نیکی کرو وہ اسے مٹا دے گی" اور صالحین میں داخل کر دے گی۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِی الصّٰلِحِيْنَ۔ (اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔ البتہ ہم ضرور ان کو داخل کریں گے نیکو کاروں میں)

پھر جب موقع حاصل ہو تو سابقہ تساہل کا تدارک کرے اور نیکی کے کاموں میں تیزی دکھا کر صالحین میں سے بن جائے۔ اس مقام پر وہ اپنے خدا کے بندہ ہونے اور اس کی حفاظت و ولایت میں ہونے کا اہل ہو گا جیسے کہ فرمایا:

وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ[1] (اور وہ حمایت کرتا ہے نیک بندوں کی)

توبہ میں دس باتیں لازم ہیں

توبہ کے سلسلے میں بندے پر دس امور لازم ہیں:

۱۔ اس پر فرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرے۔

---

[1] انفال آیت ۱۹۶۔

۲۔ اگر گناہ میں مبتلا ہو گیا تو اس پر اصرار نہ کرے۔

۳۔ اس گناہ سے فوراً اللہ کے سامنے توبہ کرے۔

۴۔ اس غلطی پر نادم و شرمندہ ہو۔

۵۔ یہ عزم کرے کہ موت تک نیکی اور اطاعت پر قایم رہے گا۔

۶۔ سزا کا خوف رکھے۔

۷۔ بخشش کی امید رکھے۔

۸۔ گناہ کا اعتراف کرے۔

۹۔ یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر یہ مقدر کیا اور اس نے عدل کیا۔

۱۰۔ اس کے بعد نیک اعمال کرے تاکہ کفارہ ہو جائے۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"برائی کے بعد نیکی کرو وہ اسے مٹا دے گی۔"

ان مذکورہ دس باتوں کے سلسلہ میں صحابہ و تابعین سے کثرت کے ساتھ مروی ہیں۔ بتاتے ہیں کہ جب موت کا فرشتہ بندے کے سامنے آتا ہے اور اس کو بتاتا ہے کہ اب تیری عمر میں ایک گھڑی باقی ہے اور پلک بھر بھی موت میں تاخیر نہ ہوگی تو بندے پر افسوس و حسرت طاری ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے پاس آغاز سے انجام تک ساری دنیا اس کے پاس ہو تاکہ وہ دے کر رہائی حاصل کرے اور اس گھڑی کے ساتھ (زندگی کی) ایک گھڑی مزید ملا لے تاکہ اس میں کچھ بھلائی کا کام کرے مگر اس کے لیے کوئی راہ نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے یہی اشارہ نکلتا ہے:

وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ۔ (اور آڑ کا دُ پڑ گیا ان میں اور جو ان کا جی چاہے ان میں)

یعنی توبہ کے درمیان، ایک قول کے مطابق عمر میں زیادتی کے اور ایک قول کے مطابق حسنِ خاتمہ اور ان کے درمیان حائل کر دیا گیا۔

كَمَا فُعِلَ بِاَشْيَاعِهِمْ مِنْ قَبْلُ۔ (جیسا کیا گیا ہے راہ والوں سے پہلے)

فرمایا: چنانچہ بندے پر جو گھڑی بھی گزرتی ہے وہ بمنزلہ اسی گھڑی کے ہے۔ اس کی قیمت تمام دنیا ہے جبکہ اس کی قیمت معلوم ہو جائے۔ اسی وجہ سے فرمایا گیا:

"جب تغیر و حکمت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے وجہِ تقدیر معلوم ہو جائے تو بندے کی عمر کے باقی حصہ کی کوئی قیمت نہیں اور اس مفہوم میں خدا تعالیٰ کا فرمان ہے:

مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ (اس سے پہلے کہ پہنچے کسی کو تم میں موت، تب کہے۔ اے رب کیوں نہ ڈھیل دی مجھ کو تھوڑی مدت)

اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ[1]

فرمایا کہ اجل قریب سے مراد وقتِ قریب ہے۔ یعنی موت کے قریب بندہ کہے جبکہ پردہ ہٹ جائے کہ اے موت کے فرشتہ، مجھے ایک روز کی مہلت دے۔ میں اس میں اپنے پروردگار کی عبادت کروں اور گناہ دھوؤں اور اپنے لیے نیک اعمال جمع کر لوں۔ مگر فرشتہ جواب دے گا کہ تو نے تمام دن برباد کیے۔ اب کوئی دن نہ ملے گا۔ بندہ کہے گا کہ اچھا، مجھے ایک گھڑی کی مہلت دے دے۔ وہ کہے گا کہ تو نے گھڑیوں کو برباد کیا۔ اب کوئی گھڑی نہیں ملے گی۔ بتایا کہ پھر روح گلے تک پہنچتی ہے اور غرغرہ ہونے لگتا ہے۔ پھر توبہ کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے اعمال منقطع ہو جاتے ہیں۔ اوقات ختم ہو جاتے ہیں۔ دنیا کے سامنے حجاب آ جاتا ہے اور انفاس اوپر اٹھنے لگتے ہیں۔ اس وقت (برزخ کا) پردہ ہٹ جاتا ہے اور ہر چیز کا مشاہدہ ہونے لگتا ہے اور اس کی نگاہ تیز ہو جاتی ہے۔ جب آخری سانس باقی رہ جاتا ہے اور سانس نکلنے کو ہوتا ہے۔ سعادت بڑھ کر اسے لیتی ہے تو توحید پر اس کی جان نکلتی ہے۔ اسے حسن خاتمہ کہا جاتا ہے یا پھر اسے شقاوت آن لیتی ہے اور شک پر اس کی جان نکلتی ہے۔ اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰٓى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ[2]

(اور ان کی توبہ نہیں جو کرتے جاتے ہیں بُرے کام، جب تک سامنے آئی ایسے کسی کو موت۔ کہنے لگا، میں نے توبہ کی)

اس کو سوء خاتمہ کہا جاتا ہے۔ ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔ ایک قول کے مطابق یہ منافق ہے ایک قول کے مطابق اصرار کرنے والے نافرمان کی یہ حالت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ۔

(توبہ قبول کرنی اللہ کو ضرور، سو ان کی جو کرتے ہیں بُرا نادانی سے، پھر توبہ کرتے ہیں شتاب سے)

ایک قول کے مطابق موت سے پہلے، ایک کے مطابق آخرت کی علامات ظاہر ہونے سے پہلے اور ایک کے مطابق گلے میں سانس کی آخری خرخراہٹ سے پہلے توبہ کریں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرما دی کہ اخروی علامات ظاہر ہونے کے بعد توبہ قبول نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

---

[1] سورہ منافقون آیت ۱۰

[2] سورۃ النساء آیت ۱۷ - ۱۸۔

يَوْمَ يَأْتِي بَعْضُ آيَاتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا إِيمَانُهَا لَمْ تَكُنْ آمَنَتْ مِنْ قَبْلُ۔ (جس دن آئے گا ایک نشان تیرے رب کا کام نہ آئے گا۔ ایمان لانا کسی کو جو پہلے سے ایمان نہ لایا تھا)

یعنی نشانات (آخرت) دیکھنے سے پہلے۔

أَوْ كَسَبَتْ فِي إِيمَانِهَا خَيْرًا۔ (یا اپنے ایمان میں کچھ نیکی نہ کی تھی)

ایک قول کے مطابق تو یہ ہی ایمان حاصل کرنے اور بھلائیوں کی جڑ ہے۔ ایک قول کے مطابق اعمالِ صالحہ، مزید ایمان اور علامتِ یقین ہے۔ اور فرمایا گیا:

ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ۔ (پھر قریب ہی توبہ کر لیتے ہیں)

یعنی گناہ ہو جانے کے فوراً بعد نیک عمل کرتے ہیں اور گناہ کے بعد پھر گناہ نہیں کرتے۔ برائی سے نکل کر فوراً نیکی کی جانب جاتے ہیں۔ برائی سے نکل کر دوسری برائی میں مشغول نہیں ہوتے۔

ایک قول یہ ہے کہ اُمت میں سب سے پہلے وہ آدمی لوٹنے کا سوال کرے گا جس نے مال کی زکوٰۃ ادا نہیں کی یا حج نہیں کیا۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے معلوم ہوئی کہ:

فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ۔ (کہ میں خیرات کرتا اور ہوتا نیک لوگوں میں)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے:

"یہ آیت اہلِ توحید پر سب سے شدید تر ہے۔ اس لیے کہ اس کے آغاز میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ۔ (اے ایمان والو، نہ غافل کریں تم کو تمہارے مال اور تمہاری اولاد، اللہ کی یاد سے)

ایک قول یہ ہے کہ اگر بندے کے لیے خدا تعالیٰ کے ہاں ذرہ بھر بھی بھلائی ہوئی تو وہ واپس آنے کی خواہش نہیں کرے گا۔

اس مفہوم کی ایک روایت یہ ہے:

"اگر کسی کے لیے آخرت میں ذرہ بھر بھی بھلائی ہو گی تو اگر اسے دنیا اور جو کچھ اس میں ہے شروع سے آخر تک دیا جائے۔ پھر بھی وہ دنیا کی طرف واپس آنا پسند نہیں کرے گا۔"

عمر خدا کی امانت ہے

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

" اللہ تعالیٰ کے اپنے بندے کی طرف دو سِتر ہوتے ہیں جو وہ اس کی طرف پوشیدہ طور پر کرتا ہے اور وہ اسے الہام کے ذریعہ پاتا ہے۔ ایک وقت ہوتا ہے جبکہ وہ اپنی ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے۔ اسے کہتا ہے " اے میرے بندے! میں نے تجھے دنیا کی طرف پاک صاف نکالا ہے۔

اور تجھے عمر امانت دی۔ تجھے اس پر امین بنایا۔ اس لیے دیکھنا کہ تو امانت کی حفاظت کس طرح کرتا ہے؛ اور دیکھنا کہ جیسے میں نے تجھے (پاک صاف) نکالا۔ اسی طرح تو مجھے ملتا ہے؟"

دُوسرا سِرّ رُوح نکلنے کے وقت ہوتا ہے۔ فرماتا ہے:

"میرے بندے! میری امانت تیرے پاس تھی۔ اس میں تو نے کیا کیا؟ کیا تو نے اس کی حفاظت کی کہ مجھے عہد و رعایت پر چل رہا ہو اور میں تجھ سے مطالبہ و سزا کے ساتھ ملاقات کروں؟"

یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مفہوم میں داخل ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَ عَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ۔ (اور وہ جو اپنی امانتوں سے اور اپنے اقرار سے خبردار ہیں)

اور دُوسری جگہ فرمایا:

وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ۔ (اور پُورا کرو اقرار میرا، میں پورا کروں اقرار تمہارا)

بندے کی عمر اس کے پاس امانت ہے۔ اگر اس نے اس کی حفاظت کی تو امانت ادا کر دی اور اگر اسے برباد کر دیا تو اللہ کی امانت میں خیانت کی۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ۔ (اللہ کو خوش نہیں آتے دغاباز)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے:

"جس نے اللہ عزوجل کے فرائض ضائع کر دیے وُہ خدا کی امانت سے نکل گیا۔" اور توبۃ النصوح کے ذریعہ گناہوں کا کفارہ ہوتا اور جنت میں داخلہ ملتا ہے۔ بعض مشائخ کا فرمان ہے:

"میں جانتا ہُوں کہ مجھے اللہ کب بخشے گا؟"

پوچھا گیا: "کب؟"

فرمایا: "جب مجھ پر (رحمت) کے ساتھ لوٹ آئے گا (یعنی توبہ قبول کرے گا)"۔

ایک دوسرے بزرگ فرماتے ہیں:

"میں توبہ سے محروم ہونے کو مغفرت سے محروم ہونے کے مقابلہ میں زیادہ خطرناک سمجھتا ہوں"۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا۔ (اللہ سے زیادہ سچی کس کی بات)

فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ۔ (سو معاف کیا اور درگزر کی تم سے)

اسی طرح فرمایا:

وَ هُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ (اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے،

وَ یَعۡفُوۡا عَنِ السَّیِّاٰتِ۔ اور برائیوں کو معاف کرتا ہے)

سچی توبہ کی علامات

بعض علماء کا فرمان ہے:

" بندے کی توبہ اس وقت تک صحیح نہیں ہوتی جب تک کہ وہ اپنی شہوات (وخواہشات) کو فراموش نہ کر دے اور اس کے بعد (اسے چاہیے) کہ اس غم کو یاد رکھے، کبھی دل سے نہ مٹائے۔ گناہوں سے ایسا دُور رہو کہ باطن میں بھی ان کا رُخ نہ کرے۔"

بعض شامی علماء کا فرمان ہے:

" ایک سالک اس وقت تائب کہلا سکتا ہے جب کہ بایاں فرشتہ بیس برس تک اس کی نافرمانی نہ لکھے۔"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

" توبہ کرنے والے کی توبہ میں صداقت کی ایک علامت یہ ہے کہ حلاوتِ خواہش کو حلاوتِ طاعت و بندگی میں بدل ڈالے۔ گناہ کی خوشی پر غم غالب کر دے اور حسنِ انابت پر مسرور ہو۔"

اسی مفہوم میں بعض علماء کا فرمان مروی ہے کہ:

" بندہ اسی وقت ہی توبہ کرنے والا شمار ہوتا ہے جب کہ اطاعتِ نفس کی شیرینی میں مخالفتِ نفس کی تلخی داخل ہو جائے۔"

اسرائیلیات میں ہے کہ اللہ عزوجل کے ایک نبی علیہ السلام نے ایک آدمی کے توبہ قبول کرنے کی درخواست کی جس نے ساٹھ سال تک عبادت میں خوب محنت دکھائی مگر توبہ قبول ہونے کا نشان نہ دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

" میرے عزت وجلال کی قسم! اگر تمام آسمانوں اور زمین والے بھی اس کی سفارش کریں تو بھی میں اس کی توبہ قبول نہیں کروں گا۔ جبکہ اس گناہ کی شیرینی اس کے دل میں ابھی تک ہے جس سے اس نے توبہ کی۔" اور جس کے دل میں نافرمانی کی شیرینی باقی رہے یا جب نافرمانی یاد آجائے تو اس کو دماغ و فکر میں لایا کرے۔ اس کے بارے میں یہ خطرہ ہے کہ وہ دوبارہ اس گناہ میں مبتلا ہو جائے گا۔ گناہ سے بچنے کے لیے سخت مجاہدہ اور اس سے شدید نفرت کی ضرورت ہے اور یہ ضروری ہے کہ جب یاد آئے تو خوف و گرفت یاد کر کے فوراً دل سے اسے باہر نکال دے۔"

حضرت ابو محمد سہلؒ فرماتے ہیں:

" مبتدی سالک کو سب سے پہلے توبہ کا حکم دیا جاتا ہے۔ توبہ کا مطلب یہ ہے کہ مذموم کام چھوڑ کر محمود کام اختیار کرے۔ اپنے آپ کو خلوت و خاموشی کے حوالہ کر دے اور حلال کھانے کے بغیر اس کی کوئی توبہ درست نہیں ہوتی اور جب تک وہ مخلوق میں حقوقِ الٰہی اور اپنے آپ میں حقوقِ الٰہی ادا نہ کرے اسے حلال کھانے کی

توفیق نہیں ہو سکتی۔ اور جب تک حرکت و سکون میں اللہ تعالیٰ کی رضا کا دھیان نہ رکھے۔ اس کی توبہ صحیح نہیں۔ اور جب تک نیک اعمال کو استدراج سے محفوظ نہ رکھے۔ تب تک اس کی توبہ صحیح نہیں۔

توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ اپنا مال چھوڑ دے۔ حتیٰ کہ جس پر ہے اس میں اسے داخل نہ کر اور کبھی ٹالتا نہ ہو۔ اور وقت میں نفس کو حال لازم رکھے۔"

حضرت سری سقطیؒ سے مروی ہے۔ فرمایا :

"توبہ کی ایک شرط یہ ہے کہ صحیح توبہ کرنے والا نافرمانوں سے قطع تعلق کر لے۔ پھر اپنے اس نفس سے بھی تعلق ہٹالے جو کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کیا کرتا تھا اور اسے صرف لازم ترین ضروریات ہی مہیا کرے (عیاشی میں نہ ڈالے) پھر اس بات کا پختہ عزم کرلے کہ دوبارہ کبھی بھی نافرمانی نہیں کروں گا۔ لوگوں پر سے اپنا بوجھ اتار دے جو اسے غلطی کی جانب سے لے جائے۔ اسے بھی چھوڑ دے۔ خواہشِ نفس کا اتباع نہ کرے اور سلف صالحینؒ کی پیروی کرے۔"

توبہ کرنے والوں کو چاہیے کہ ہر وقت اپنے نفوس کا محاسبہ کرتا رہے۔ ہر شہوت کو چھوڑ دے۔ فضول کاموں سے الگ ہو جائے۔ اور فضول امور چھ ہیں :

۱۔ فضول کلام چھوڑنا۔
۲۔ فضول نظری سے الگ ہونا۔
۳۔ فضول چلنا بند کرنا۔
۴۔ فضول کھانا۔
۵۔ فضول پینا۔ اور
۶۔ فضول لباس چھوڑ دینا۔

فرمایا : "ترکِ شبہات پر صرف اسے ہی قوت حاصل ہوتی ہے جو شہوات سے باز آجائے۔"

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

"توبہ کرنے والا کیسے معاملہ کرے؟"

فرمایا : "وہ اپنی عمر میں دو دنوں کے درمیان ہے۔ ایک گزشتہ دن اور ایک آئندہ کا دن۔ ان دونوں کو تیسری چیز سے درست کرے۔ گزشتہ دن پر ندامت کرے اور بخشش چاہے اور آئندہ کو برائیوں اور بُرے لوگوں سے جُدا رہے۔ سالکین کی مصاحبت کرے اور اہلِ ذکر کی ہم نشینی اختیار کرے اور تیسری بات یہ ہے کہ ہمیشہ خالص غذا کھائے۔ عمل کو لازم پکڑے۔

اور توبہ کی صداقت کی علامت یہ ہے کہ :

"قلب میں رقت رہے اور آنسو جاری رہیں۔"

حدیث میں ہے :

"توبہ کرنے والوں کے پاس نشست رکھو۔ اس لیے کہ ان کے دل سب سے زیادہ رقیق ہوتے ہیں۔"

اور توبہ اس وقت ہو سکتی ہے کہ جب گناہوں کو سخت خوفناک سمجھے۔ اس لیے کہ فرمان ہے :

"بندہ جس قدر گناہ کو بڑا خوفناک سمجھتا ہے وہ اسی قدر اللہ کے ہاں چھوٹا ہو جاتا ہے۔"

گناہ کو معمولی نہ سمجھو

گناہ کو معمولی سمجھنا بھی کبیرہ گناہ ہے جیسے کہ حدیث میں آتا ہے :

"مومن اپنے گناہ کو ایسے سمجھتا ہے جیسے کہ اس پر پہاڑ کھڑا ہو اور ڈرتا ہو کہ اوپر گر پڑے گا اور منافق اپنے گناہ کو ایک مکھی کی طرح (معمولی) سمجھتا ہے کہ ناک پر گزری اور اُسے اُڑا دیا۔"

ایک مرسل حدیث میں ہے :

"تمہیں اس بات سے بچنا چاہیے کہ اس پر اس گناہ کی وجہ سے مواخذہ ہو جائے جس کو وہ اپنے تئیں معمولی سمجھ رہا ہے۔"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے :

"جو گناہ نہیں بخشا جاتا وہ بندے کا یہ قول ہے کہ کاش! میں ہر بات اس طرح کرتا۔"

حضرت بلالؒ بن سعد نے فرمایا :

"گناہ کے چھوٹا پن کو نہ دیکھو، یہ دیکھو کہ تُو نے کس کی نافرمانی کی !"

مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک ولی کی جانب وحی کی :

"تحفہ کی کمی کی طرف نہ دیکھو، بلکہ جس کے سامنے ہدیہ پیش کر رہے ہو اس کی عظمت کی طرف دیکھو اور گناہ کے چھوٹا پن کی طرف نہ دیکھو بلکہ جس ذات کی تو نے نافرمانی کی اس کی کبریائی کی طرف دیکھو۔ جس کے سامنے یہ ہوتے ہیں اس کی عظمت کے باعث گناہ بھی خوفناک ہو جاتے ہیں۔ ذاتِ کبریا کے مشاہدہ اور اس کے حکم کی مخالفت پر قلبی طور پر یہ شدید تر ہو جاتے ہیں۔ اس صورت میں گناہ معمولی بات نہیں ہوتی اور اہل خوف کے نزدیک صغائر بھی کبائر ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

ذٰلِكَ وَ مَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ۔ [illegible] "یہ سن چکے جو کوئی بزرگی رکھے اللہ کے ادب کی سو وہ [illegible] ہے اس کو)

اسی طرح فرمایا :

وَ مَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّہَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ۔ (یہ سن چکے اور جو کوئی ادب رکھے اللہ کے نام لگی چیزوں کا سووہ دل کی پرہیزگاری سے ہے)

یعنی حرمات کی قلوب میں عظمت ہو تو انہیں توڑنے کی جرأت نہیں کرے گا۔

صحابہ کرامؓ نے تابعینؒ کو فرمایا،

"تم بعض ایسے کام کرتے ہو کہ جو تمہاری نظروں میں بال سے بھی باریک تر ہوتا ہے مگر ہم حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایسی باتوں کو مہلک باتیں شمار کرتے تھے۔" یہ مطلب نہیں ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جو باتیں کبیرہ گناہ تھیں انہیں بعد میں صغیرہ گناہ کہا جانے لگا۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قلوب میں نورِ ایمان کی اس قدر عظمت تھی کہ وہ صغیرہ گناہوں کو بھی بہت خوفناک سمجھتے تھے اور بعد والوں کے دلوں میں یہ کیفیت نہ رہی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے ولی کو وحی فرمائی:

"میں نے تجھ سے کئی ایسے گناہ بھی دیکھے کہ اس کی وجہ سے (سابقہ) امتوں میں سے ایک امت برباد ہو گئی۔"

حضرت ابان بن اسمٰعیلؒ نے حضرت انسؓ سے، انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا،

"اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کو اس وجہ سے ہلاک کیا کہ وہ اپنے ذکور (نروں) کے ساتھ بیہودگی کرتے۔"

گناہ کو بھول جائے یا یاد رکھے؟

گناہ کو توبہ کر کے بھول جائے یا یاد کر کے شرمندہ ہوتا رہے۔ اس کے بارے میں عارفین کا اختلاف ہے بعض کا فرمان ہے کہ،

"توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ تو گناہ کو نظروں کے سامنے رکھے" (اور نادم ہوتا رہے)۔

ایک دوسرے بزرگؒ فرماتے ہیں:

"توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ تو گناہ کو نہ بھولے۔"

دراصل یہ دو گروہوں کے جُداجُدا طریقے اور اہل مقام کے دو حال ہیں۔

سالکین اور خائفین کا طریق وحال یہ ہے کہ گناہوں کو یاد رکھے ان کو یاد کر کے ہمیشہ غم وخوف میں مبتلا رہے۔

عارفین اور اہل محبت کا طریق وحال یہ ہے کہ اذکار میں مصروف ہو کر اور اعمالِ صالحہ میں انہماک کر کے گناہوں کو بھول جائے اور ان کا طریقہ مشاہدۂ توحید کا ہے اور تصرّف میں یہی مقام ہے اور پہلوں کا طریق

مشاہدۂ توصیف و تمدید ہے اور وہ تعریف میں ایک مقام ہے۔ اب بندہ ان دو میں سے جس مقام پر بھی سرفراز ہوا وہ مشاہدہ کے ساتھ ہے اور اپنی حالت کے حکم کے ساتھ ہی اس نے کام کیا۔

عارفین کے نزدیک مشاہدۂ تعریف کے مقام سے شہادتِ توحید کا مقام افضل ہے۔ یہ (مشاہدۂ تعریف کا مقام) اگرچہ وسعت رکھتا ہے مگر یہ اصحابِ یمین میں ہیں اور عمومِ مقربین میں داخل ہیں اور شہادتِ توحید قلیل تر و ضیق تر ہے اور اہلِ شہادتِ توحید کا مقام اعلیٰ و افضل ہے اور یہ مقربین اور خواص عارفین میں داخل ہیں۔

گاہے سالک کے سامنے گناہ پر ایسے حالات آجاتے ہیں کہ جیسے کہ حضرت داؤد و نوح علیہ السلام کا معاملہ تھا مگر انبیاء علیہم السلام پر انہیں قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام معصوم ہیں۔ سالکین کے احوال میں گاہے تغیر کیا جاتا ہے اور وہ منتقلین کی راہ پر چلتا ہے یہ ا[illegible] ہیں امت کی وجہ سے ہے تاکہ وہ تمام جہانوں کے لیے راہ ہو۔

یہ یاد رکھیں کہ جس کا نفس قوی ہو، یقین کمزور ہو۔ اس وقت اگر گناہ یاد آجائے تو خطرہ ہے کہ شہوت کے ساتھ دل کا اس کی طرف میلان ہوگا یا نفس حلاوت پاتے ہوئے اس کی جانب مائل ہوگا۔ یہ بات اس کیلئے فتنہ کا باعث ہوگا اور ٹھیک ہوا کام بھی بگڑ کر رہ جائے گا جیسے کہ اگر کسی کو نظر کے ذریعہ سے گناہ کی عادت ہو تو نظر کرنے سے نفسانی حرکت کا خطرہ ہے۔ اس لیے ایسی صورت میں عوام سے اختلاط ختم کرنا اور اسباب سے منقطع ہونا زیادہ سلامتی کی راہ ہے اور جو بات سالک کے لیے زیادہ سلامتی کی ہو۔ اس کے لیے وہی افضل بھی ہے ماضی کی بداعمالی پر چپ چاپ ہو کر بیٹھ جانا اور ماضی میں گناہ ہوجانے کے باعث غم میں آئندہ ذکر کو فراموش کر بیٹھنا، دوسرا وقت بھی برباد ہوجانے کا خطرہ ہو جائے گا۔

بعض اہلِ معرفت، سالک کے لیے اس بات کو ناپسند سمجھتے کہ اس کا جنت میں ہی دھیان رہے یا جنت کے انعامات، جنت کے لباس اور وہاں کی بیویوں کو یاد کرتا رہے۔ اور فرمایا:

"سالک کو چاہیے کہ اس کا سارا دھیان اللہ کی یاد میں لگا رہے اور ذکر اللہ کے سوا کسی سے کچھ سروکار نہ رکھے۔"

فرمایا: "اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سالک، نیا نیا توبہ کرنے والا آدمی ہے ابھی اسے پاکیزگی اور استقامت پر پختگی حاصل نہیں ہوئی۔ اس لیے اگر اس نے جنت کے انعامات کو یاد کرنا شروع کیا تو ضعفِ قلب کے باعث یہ خطرہ ہے کہ وہ اس قسم کے انعامات کا دنیا میں ہی مطالبہ شروع کر دے گا اور چاہے گا کہ اس قسم کے (اعلیٰ) لباس، خوشبوئیں اور نکاح کا سلسلہ مہیا ہوجائے۔ دنیا کی یہ باتیں موجود و عاجل ہیں،

اور وہ امورِ آخرت کے بعد آنے والے آجل ہیں اور یہ آدمی عجلت کرتے ہوئے انہی باتوں کو دنیا میں چاہنے لگ جائیگا کہ یہیں مل جائیں۔"

فرمایا: "اور اگر اس کا سارا دھیان اللہ تعالیٰ کے ذکر کی طرف رہا تو یہ طریقہ اسے دنیاوی زینت اور دنیاوی شہوتوں سے دور رکھے گا اور شیطان اسے دنیاوی عاجل نعمتوں میں پھنسانے کی جرأت نہیں کر سکے گا۔ آخر کار اس کا یقین پختہ ہو جائے گا۔ اس کی عادت بدل جائے گی اور اس کی عصمت دائمی صورت اختیار کر لے گی۔"

افضل ترین عمل کونسا ہے؟

جو خوشی کے ساتھ کیا جائے یا اکراہ سے ہو

اہل علم کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ ایک آدمی گناہ چھوڑ دے اور استقامت اختیار کرے مگر اس کا نفس ابھی نزاع کر رہا ہو اور وہ مجاہدہ کر رہا ہو اور دوسرا آدمی ایسا ہو جو گناہ چھوڑ دے مگر بعد میں اصلاح سے معاملہ میں غافل ہو۔ نفس بھی اس کا مطالبہ نہ کرتا ہو اور اسے گناہ پر نہ لے جا رہا ہو۔ نہ ہی اس کے دل پر ثقالت و محنت کی صورت ہو۔ ان دونوں میں سے کون سا افضل ہے؟

بعض شامی علماءؒ کا فرمان ہے کہ،

"جس کا نفس اسے گناہ کی طرف زبردستی لے جانے کی کوشش کرتا ہو اور وہ مجاہدہ کر رہا ہو۔ یہ افضل تر ہے۔ اس لیے کہ اس پر نزاع و زبردستی ہو رہی ہے اور اسے مجاہدہ کی فضیلت حاصل ہے۔"

احمد بن ابوالحواری اور اصحاب ابی سلیمان دارانی کا بھی خیال ہے۔ علمائے بصرہ کا فرمان ہے:

"جس میں شواہدِ یقین و طمانیت میں سے کسی شاہد کی وجہ سے نفسانی منازعت ختم ہو جائے۔ اس میں دوبارہ عود کرنے کی فضیلت باقی نہ رہے گی۔ (یعنی اسے محنت اٹھانے کی فضیلت نہیں مل سکتی) اور مفسدات کی طلب افضل بات نہیں ہو سکتی۔ رباح بن عمرو قیسیؒ جو کبار علمائے بصرہ میں سے ہیں۔ ان کا بھی یہی خیال ہے اور فرمایا،

"اگر یہ فترت (سکون) اختیار کر کے رہ گیا تو یہ بات سلامتی کے زیادہ قریب ہے اور انجام میں رجوع کا اندیشہ نہ ہوگا اور یہ بات اس طرح ہے جیسے فرمایا،

دو بندوں کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ ان میں سے ایک سے کہا جائے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو مگر اس کا نفس انکار کرے اور یہ بات اس پر بوجھ بن جائے۔ پھر وہ جی کڑا کر کے اور مجاہدہ سے کام لے کر مال خرچ کر ڈالے اور دوسرا آدمی ایسا ہے کہ جس سے مال خرچ کرنے کو کہا گیا اور اس نے نفسانی نزاع کے بغیر خوشی خوشی

مال خرچ کر دیا۔ اس پر یہ بات بوجھ نہ بنی اور نہ ہی اسے مجاہدہ کرنا پڑا۔ ان دونوں میں سے کون سا افضل ہے؟"

مشائخ کے ایک گروہ کا فرمان ہے کہ:

" نفس کے خلاف مجاہدہ کر کے (خرچ کرنے والا) افضل ہے۔ اس لیے کہ اس کے سامنے اکراہ اور مجاہدہ دو باتیں جمع ہوگئیں اور اس کو دو عمل حاصل ہوئے۔" حضرت ابن عطاء اور ان کے اصحاب کا یہی فرمان ہے۔

دُوسرے گروہِ مشائخ نے یہ فرمایا:

" جس نے کسی اکراہ و جبر کے بغیر خوشی خوشی مال خرچ کر دیا وہ افضل ہے۔ اس لیے کہ سخاوتِ نفس کا مقام ہے اور تمام اعمال سے زیادہ افضل بات زہد ہے۔ یہ اکراہ و جبر سے بھی افضل ہے اور مال خرچ کرنے سے بھی زہد کو افضلیت حاصل ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ پہلے آدمی کا نفس اس بار تو قابو میں آگیا اور اس نے مال خرچ کر لیا۔ مگر یہ خطرہ باقی ہے کہ دوسری یا تیسری بار نفس قابو میں نہ آئے اور سخاوت کا یہ مقام نہیں، بلکہ سخاوت و زہد انسان کو مال خرچ کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔" حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مسلک ہے اور میرے نزدیک بھی یہ ایسے ہے جیسے کہ انہوں نے فرمایا:

قلبی شہوات

حضرت امام ابو محمد سہل سے پوچھا گیا:

" ایک آدمی ایک کام سے توبہ کرتا ہے اور اسے چھوڑ دیتا ہے مگر پھر یہ چیز اس کے دل پر کھٹکتی یا متصور ہوتی ہے یا وہ اسے سُن لیتا ہے تو اسے اس کی حلاوت سی محسوس ہوتی ہے۔ انہوں نے فرمایا:

" حلاوت تو بشری طبع ہے اور طبع کا وجود ایک لازمی بات ہے۔ اب اس کے لیے ایک ہی راہ ہے کہ اپنے مولائے کریم کے سامنے فریاد کرے۔ دل سے اس کو برا سمجھے اور نفس کو اس بات پر لگائے رکھے کہ اس گناہ کو برا سمجھتا رہے اور اس کا انکار کرتا رہے۔ اس پر دوام کیے رکھے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ اے اللہ میرے قلب سے ہی یہ بری بات فراموش کر دے۔ دل کو اس سے ہٹا کر ذکر اللہ اور اعمالِ صالحہ میں لگائے۔"

فرمایا: " اس لیے کہ اس بات کا خطرہ ہے کہ اگر وہ لمحہ بھر بھی غافل ہوا تو اس کے دل میں اس کام کی حلاوت آنے لگی اور وہ مامون نہ رہ سکے گا۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ حلاوت پاتے ہی قلبی طور پر اس کا انکار کرے اور غمزدہ ہو جائے۔ پھر یہ بُرا خیال اسے ضرر نہ دے سکے گا۔" میرے نزدیک یہ اس طرح ہے اس لیے کہ بقائے شہوت کے ساتھ ساتھ توبہ درست نہیں ہوتی۔ بندہ کا مطلوب مجاہدہ ہے اور یہ سالکین کا حال ہے قلب پر نگہداشت میں مداومت کر کے دل سے شہوات کو ختم کر کے رکھ دینا، عارفین کا حال ہے۔ گاہے ایسا ہوتا ہے کہ ایک گناہ کے بعد کثرت سے گناہ ہونے لگتے ہیں جو اس سے بھی بڑے ہوتے ہیں مثلاً گناہ پر اصرار، گناہ پر رشک کرنا، توبہ کر کے توڑتے رہنا، گناہ پر موقع حاصل کر کے مزے لینا، گناہ نہ کر سکنے پر افسوس

کرنا یا گناہ پر مسرت حاصل کرنا یا دُوسرے آدمی کو گناہ پر آمادہ کرنا۔ اب اگر یہ گناہ دو کے درمیان کا ہے یا اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا مال اس گناہ میں خرچ ہو رہا ہے تو یہ نعمت کا کفران ہے۔ اس لیے کہ فرمایا گیا:

"جس نے حرام میں ایک درہم بھی خرچ کیا وہ فضول خرچ ہے۔"

اس کے علاوہ جو آدمی بھی گناہ کو معمولی سمجھے تو یہ حرکت گناہ کرنے سے بھی بدتر ہے یا اللہ کی ستاری اور اپنے بارے میں خدا تعالیٰ کے حکم کو معمولی سمجھے تو یہ بھی خطرناک خود فریبی ہے یا اللہ کی ستاری کی نعمت سے جاہل رہے اور اس کے برعکس بات ظاہر کرے جیسے کہ اس ماثورہ دعا میں کہا، اور اس میں اللہ تعالیٰ کی مدح و ثنا بیان کی:

يَا مَنْ اَظْهَرَ الْجَمِيْلَ وَ سَتَرَ الْقَبِيْحَ وَلَمْ يُؤَاخِذْ بِالْجَرِيْرَةِ وَ لَمْ يَهْتِكِ السِّتْرَ۔

(اے وہ ذات جس نے خوبیاں سب ظاہر کر دیں اور برائیاں چھپا دیں اور جرم پر گرفت نہیں فرمائی۔)

مشائخ فرماتے ہیں کہ ہر گناہ گار کی اللہ تعالیٰ ستاری کر رہا ہے۔ جونہی اللہ وہ اس سے ہاتھ اٹھاتا ہے تو اس کا پردہ کھل جاتا ہے۔ برملا گناہ کرنا اور ظلم و ستم ڈھانا اسی قسم سے ہے اور یہ سرکشی کی قسم ہے۔

حدیث میں آتا ہے:

"برملا گناہ کرنے والوں کے سوا سب کے لیے معافی ہے۔ ایک آدمی رات کو گناہ کرتا ہے۔ اللہ تعالےٰ اس کی پردہ داری کرتا ہے مگر صبح اٹھ کر وہ "اللہ کی طرف سے پردہ" کو کھولتا ہے اور رات کے گناہ کا خود ہی تذکرہ کرتا ہے۔" گاہے ایک آدمی ایک گناہ کو رواج دیتا ہے۔ اس صورت میں جب تک وہ گناہ ہوتا رہے گا اس کا وبال آغاز کرنے والے پر پڑے گا۔ ایک قول یہ ہے کہ:

"اس کے لیے خوشخبری ہے۔ جو مرے تو اس کے گناہ بھی اس کے ساتھ ہی فنا ہو جائیں اور اس کے بعد ان کی وجہ سے اس پر مواخذہ نہ ہو اور اس کے لیے خوشخبری ہے کہ اس کا گناہ بڑھ کر دوسرے کو ملوث نہیں کرتا۔"

ایک بزرگؒ فرماتے ہیں:

"گناہ نہ کر، اگر ایسا کرنا ہی ہو تو دوسرے کو گناہ پر آمادہ نہ کر، ورنہ دو گناہ سر پر پڑیں گے۔" اللہ تعالیٰ یہ بات منافقین کے اوصاف میں بیان کی۔ فرمایا:

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ۔

(منافق مرد اور عورتیں، سب کی ایک چال ہے، سکھاویں بات بُری اور چھڑاویں بھلی سے)

چنانچہ جس نے اپنے بھائی کو گناہ پر اکسایا۔ اس نے برائی کا حکم دیا اور نیکی سے روکا۔

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"جس آدمی نے اپنے بھائی کی نافرمانی کرنے میں مدد دی۔ پھر اس پر ان کو آسان تر کرتا ہے۔"

گاہے ایسا ہوتا ہے کہ بندے کی عمر چالیس سال ہوتی ہے۔ پھر وہ مرجاتا ہے مگر اس کے بعد ایک سو برس اس کے گناہ باقی رہتے ہیں اور قبر میں اسے ان گناہوں کی سزا ملتی ہے۔ جن کو وہ دنیا میں رائج کر گیا اور لوگ اس پر چلنے لگے۔

آخر جب وہ گناہ ہی ناپید ہو جاتا ہے یا اس گناہ کا ارتکاب کرنے والا مر کر ختم ہوتا ہے تب اس کی سزا ختم ہوتی ہے اور اسے چین نصیب ہوتا ہے۔

مشائخ کا فرمان ہے:

"سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ اس پر ظلم کرے جو مقتدین میں سے ہو۔ نہ اسے پہچانتا ہو اور نہ اسے دیکھتا ہو مثلاً سلف صالحین اہل دین اور ائمہ متقین میں سے کسی کے بارے میں زبان درازی کرے۔ یہ تمام مفاہیم ایک ہی گناہ پر آتے ہیں۔ اور وہ اس سے بڑا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان اسی سے ہے۔

وَ نَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ آثَارَهُمْ[1] (اور لکھتے ہیں جو آگے بھیج چکے اور ان کے پیچھے نشان رہے)

یعنی وہ طریقے جن پر بعد والے عمل پیرا ہیں۔ حدیث میں ہے:

"جو آدمی کوئی بڑا طریقہ پر چلا دے پھر بعد والے اس پر عمل پیرا ہو جائیں تو اس پر اس ندر بوجھ ہے جس ندر (ہر ہر) عمل کرنے والے پر ہے ان کے اوزار سے کچھ بھی کم نہ ہوگا۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے:

"عالم کے لیے پیروکاروں سے خرابی ہے۔ ایک لغزش کھاتا ہے۔ پھر یہ رجوع کر لیتا ہے مگر لوگ اُسے اٹھا کر آفاق تک پہنچا دیتے ہیں۔"

بعض اہل ادب کا فرمان ہے:

"عالم کی لغزش کی مثال ایسے ہے جیسے کہ کشتی ٹوٹ کر غرق ہو جائے اور اس کے ساتھ ساتھ مخلوق بھی غرق ہو جائے۔"

ایک اسرائیلی روایت میں ہے:

"ایک عالم بدعات کے ذریعہ لوگوں کو گمراہ کیا کرتا تھا۔ پھر اس نے توبہ کر لی اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹ آیا اور ایک مدت تک اصلاحِ عمل میں مصروف رہا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے نبی کی جانب وحی فرمائی:

---

[1] سورۃ یٰسین آیت ۱۲۔

"اسے کہہ دو، اگر تیرا گناہ تیرے اور میرے درمیان ہی ہوتا تو چاہے کس قدر ہی ہوتا میں اسے بخش دیتا، لیکن میرے ان بندوں کا کیا معاملہ ہو جن کو تو نے گمراہ کر کے دوزخ میں داخل کر دیا۔"

گناہ کو جائز قرار دینا کفر ہے

نافرمانی کو جائز سمجھنا یا دوسروں کے لیے اسے جائز و حلال قرار دینا ملتِ اسلامیہ سے خروج و بغاوت، تبدیلیٔ شریعت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کفر ہے جیسے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے:

"جس نے (قرآن) کے محارم کو حلال قرار دیا وہ قرآن پر ایمان نہیں لایا۔" اللہ تعالیٰ نے جہالت کے باعث بُرائی کرنے کا ذکر کیا اور فرمایا:

اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءً ۢا بِجَهَالَةٍ ۔ (کہ جو کوئی کرے تم میں برائی نادانی سے)

اور فرمایا:

بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ۔ (بلکہ تم وہ قوم ہو جو جہالت کرتی ہو)

ایک جگہ فرمایا:

بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۔ (بلکہ تم اسراف کرنے والی قوم ہو)

فرمان ہے کہ:

"تین کاموں پر اللہ تعالیٰ کا عرش بھی ہلنے لگتا ہے اور رب تعالیٰ غضب ناک ہو جاتا ہے:

۱۔ ایک جان کو بغیر (دوسری) جان کے عوض قتل کر دینا (یعنی ناحق قتل کرنا)۔

۲۔ مرد کی مرد سے بدفعلی۔

۳۔ عورت کی عورت سے بدفعلی۔

ایک حدیث میں ہے:

"اگر لواطت کرنے والا سمندروں کے ساتھ بھی نہا لے پھر بھی توبہ کے بغیر اسے کوئی چیز پاک نہیں کرتی۔"

اب اگر نافرمانی میں اس قدر خرابی ہوتی کہ طاعتِ خداوندی سے محرومی ہو جاتی۔ حلاوتِ خدمت سے محرومی ہوتی اور مولائے کریم کی ناراضگی ہوتی تو بھی یہ سب سے بڑی سزا تھی۔ جیسے کہ وہیب بن وردؒ سے پوچھا گیا:

"کیا نافرمان بھی طاعت کی حلاوت پاتا ہے؟"

فرمایا: "نہیں، اور نہ ہی وہ جس نے نافرمانی کا ارادہ کیا۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو

سَیِّدًا (سردار) فرمایا۔ اس لیے کہ انھوں نے نافرمانی کا ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔ چنانچہ سردار ہونے کی علامت، نافرمانی کا ارادہ بھی نہ کرتا ہے اور جو نافرمانی کا ارادہ بھی نہ کرے وہ سردار (سید) ہوا۔

نافرمانی کی سزا

حدیث میں آتا ہے،
"جس نے شہرت کا لباس پہنا۔"

بعض روایات میں یہ الفاظ ہیں:

"جس نے اپنے دونوں پہلوؤں کی طرف دیکھا، پھر اکڑا تو اللہ تعالیٰ اس سے اعراض فرما لیتا ہے چاہے اس کے نزدیک وہ (پہلے) محبوب ہی تھا۔" اور یہ کیوں نہ ہو جبکہ گناہ کرنے اور نافرمانی کرنے میں خدا تعالیٰ سے بُعد و انقطاع پیدا ہو جاتا ہے۔"

حدیث میں آتا ہے:

"جب حضرت آدم علیہ السلام نے درخت کا پھل کھایا تو ان کے بدن سے لباس اتر گیا اور ان کا ستر برہنہ ہو گیا۔" بتاتے ہیں کہ تاج و اکلیل کو ان سے اٹھتے حیا آئی۔ اس پر حضرت جبریل علیہ السلام آئے اور ان کے سر سے تاج لے لیا اور میکائیلؑ نے اتر کر ان کی پیشانی سے تاج (اکلیل) اٹھا لیا اور پھر عرش پر سے ندا آئی کہ تم دونوں میرے پڑوس سے اتر جاؤ۔ اس لیے کہ جو میری معصیت میں مبتلا ہوتا ہے وہ میرے جوارِ (رحمت) میں نہیں رہ سکتا۔"

اس پر حضرت آدمؑ نے روتے ہوئے حضرت حواؑ کی طرف دیکھا اور کہا:

"یہ معصیت کی پہلی نحوست ہے کہ ہمیں جوارِ حبیب سے نکالا گیا۔"

حضرت سلیمانؑ کا واقعہ

مروی ہے کہ جب اللہ کے نبی حضرت سلیمان علیہ السلام کو اس بات پر عتاب کیا گیا کہ ان کے گھر میں چالیس روز تک (ان کی بے خبری میں) بت کی پرستش کی گئی۔ ایک قول یہ ہے کہ ایک عورت نے درخواست کی کہ میرے خاوند کے حق میں اس کے دشمن کے خلاف فیصلے فرمائیے۔ تو انہوں نے فرمایا:

"اچھا۔" مگر کیا نہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ دل میں انہوں نے چاہا کہ اس کے خاوند کے حق میں فیصلے کر دوں اس لیے کہ عورت (خوب رُو) تھی۔ اس پر ان کی سلطنت چالیس روز تک چھین لی گئی۔ اور وہ پریشان ہو کر ویرانے کی طرف بھاگ گئے۔ ہاتھ پھیلا کر کھانا مانگتے مگر کوئی انہیں کھانا نہ کھلاتا۔ جب انہوں نے کہا: "مجھے کھانا کھلاؤ اس لئے کہ میں سلیمان بن داؤد ہوں" تو لوگوں نے آپ کو مارا اور زخمی کر دیا۔

مروی ہے کہ آپؑ نے ایک گھر سے کھانا مانگا تو انہیں دھکیل دیا گیا اور اس عورت نے آپؑ کے چہرہ پر تھوک دیا۔

ایک روایت میں ہے:

"ایک بڑھیا نکلی اس نے پیشاب کا برتن لیا اور ان کے سر پر بہا دیا۔ آخرکار ایک مچھلی کے پیٹ سے انہیں اپنی انگوٹھی ملی اور چالیس روز گزرنے کے بعد اسے پہنا یہ عتاب کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد پرندے دوبارہ مطیع ہو کر سامنے حاضر ہو گئے اور آپؑ کے گرد جمع ہو گئے۔ جب شکاریوں نے آپؑ کو پہچانا تو ان پر لرزہ طاری ہو گیا اور آپؑ سے معذرت چاہنے لگے کہ ہم نے زخمی کرنے اور واپس دھکا دینے میں غلطی کی تھی۔"

حضرت سلیمان علیہ السلام نے فرمایا:

"جو تم نے کیا تھا اس کے بارے میں میں تمہیں ملامت نہیں کرتا اور جو تم اب کر رہے ہو میں اس پر تمہاری تعریف نہیں کرتا۔ یہ آسمانی معاملہ تھا جس کے بغیر چارہ نہ تھا۔"

ایک روایت یہ ہے کہ وہ سفر میں تھے اور دوسرے لشکروں کے ہمراہ آپؑ کو ہوا اٹھائے جا رہی تھی۔ اچانک آپؑ نے اپنی قمیص پر نظر کی اور یہ نئی قمیص تھی۔ انہیں یہ قمیص بھلی معلوم ہوئی۔ گویا عجب کی صورت سی بن گئی۔ ہوا نے آپؑ کو زمین پر رکھ دیا۔ انہوں نے فرمایا:

"میں نے تمہیں اس کا حکم نہیں دیا تھا پھر تم نے یہ کیوں کیا؟"

اس نے کہا:

"ہم اس وقت تک ہی آپؑ کی تابعداری کرتے ہیں جب تک آپؑ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں۔"

گناہوں پر طرح طرح کی سزائیں ملتی ہیں

ایک عالمؒ اسی مفہوم پر فرماتے ہیں:

"جو اللہ سے ڈرے گا اس سے ہر چیز ڈرے گی اور جو غیر اللہ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اسے ہر چیز سے ڈرائے گا۔"

چنانچہ اسی طرح جو آدمی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرے گا اللہ تعالیٰ ہر چیز کو اس کے سامنے مسخر کر دے گا یا ہر چیز پر اس کو مسلط کر دے گا۔ اگر نافرمانی پر اصرار کرنے کی وجہ سے صرف یہی نحوست ملے کہ بندے پر جو حال بھی آئے وہ اس کے لیے سزا کا حال ہو۔ اگر وسعت ملے تو سزا کے طور پر ملے اور استدراج سے بچ نہ سکے۔ اور اگر تنگی آئے تو بھی اس کے لیے سزا کی صورت میں ہو تو یہ سزا بھی نہایت خوفناک ہے۔

حدیث میں آتا ہے:

"بے شک بندہ ایک گناہ کرنے کی وجہ سے روزی سے محروم کر دیا جاتا ہے۔"

اور فرمایا گیا،

"حرام روزی بھی اعمالِ صالحہ نہ کرنے کے باعث پلے پڑتی ہے۔"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے،

"میں سمجھتا ہوں کہ گناہ کرنے کے باعث انسان علم کو بھول جاتا ہے۔ تو بہ، علم اور استقامت بر طاعت کی اگر صرف یہی برکت ہو تو بھی کافی ہے کہ انسان پہ جو حال آئے وہ اس کے لیے بھلائی کا ہو۔ اگر وسعت آئے تو یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے لطف و کرم اور رفق کی بات ہے اور اگر تنگی آئے تو اللہ کی جانب سے امتحان اور بندے کے لیے بھلائی کا معاملہ ہے۔ وہ اس کی حلاوت و لذت محسوس کرے گا۔ اس لیے کہ یہ تنگی بھی اللہ کی راہ میں ہے اور وہ اطاعتِ خداوندی پہ قائم ہے اور اگر عوام کے اختلاط کے باعث ناقص رہنے اور گناہوں میں مبتلا ہونے کی نحوست یہ ہی کافی ہے کہ ان کے ساتھ مل کر گناہ کی صورت اجتماعی اور شدید تر ہو جائے۔ اس لیے کہ دین و دنیا کے معاملہ میں مظالم کا تعلق ہو گیا اور جن کا عرفان کم ہوا ان کے ہمراہ اس کے گناہ بھی کم ہو گئے۔

بعض سلف کا فرمان ہے کہ،

"صرف چہرہ کا سیاہ ہونا اور مال کا کم ہونا ہی لعنت نہیں ہے بلکہ اصل لعنت یہ ہے کہ انسان ایک گناہ سے فارغ ہو کر اس جیسے یا اس سے بڑے گناہ میں جا پڑے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لعنت کا مطلب ہے دُور کرنا اور بُعد ہو جانا۔ اب جب وہ طاعتِ خداوندی سے مسترد ہوا اور نیکیوں سے دُور ہوا اور ان کی توفیق سے محروم ہوا تو وہ ملعون ہے۔

ہم نے آغازِ کلام میں ایک حدیث نقل کی تھی کہ،

"گناہ کی وجہ سے بندہ روزی سے محروم کر دیا جاتا ہے۔"

اس کے معنی میں بتایا گیا کہ وہ حلال سے محروم کر دیا جاتا ہے اور نافرمانی میں پڑنے کی وجہ سے اُسے نیکی کی توفیق نہیں ملتی۔ ایک قول کے مطابق یہ وضاحت کی گئی کہ وہ علماء کی مجلس سے محروم ہو جاتا ہے اور اہل خیر کی مجلس میں بیٹھنے کے لیے اس کو شرح صدر نہیں ہوتا۔

ایک قول کے مطابق یہ توضیح ہے کہ صالحین اور علمائے ربانی اس پر ناراض ہو کر اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔

ایک قول یہ ہے کہ جہالت پر اس کے جم جانے کے باعث اصلاحِ عمل کے لیے مفید علم سے محروم ہو کر رہ جاتا ہے۔ شہوات پر قائم رہنے کی وجہ سے اس کے شبہات نہیں کھلتے بلکہ اس پر التباس پہلے سے بڑھ جاتا ہے

اور اللہ کی حفاظت سے نکل کر اس کی حیرانی و پریشانی میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے اور نہ ہی اسے زیادہ قابلِ ترجیح و افضل راہ کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔

حضرت فضیلؒ فرمایا کرتے:

"تجھ پر جو زمانے کا تغیر ہوا اور بھائیوں سے جو ستم ہوا۔ دراصل تیرے گناہوں نے یہ سب کچھ تجھے دیا۔"

مشائخ فرماتے ہیں:

"قرآن مجید حفظ کرنے کے بعد اسے فراموش کر دینا سب سے بڑی سزا ہے۔ اس کی تلاوت میں رکاوٹ اور تلاوت میں سینہ تنگ ہونا اور اس سے اعراض کر لینا مسلسل گناہوں کا نتیجہ ہے۔"

شام کے ایک صوفی بتاتے ہیں کہ:

"میں نے ایک خوب صورت نصرانی لڑکے کو دیکھا تو اس پہ نظریں جما دیں۔ اچانک حضرت ابن جلاؒ دمشقیؒ کا گزر ہوا۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، مجھے ان سے شرم محسوس ہوئی" اور میں نے کہا:

"اے ابو عبداللہ! اللہ پاک ہے۔ اس خوبصورت شکل پہ مجھے تعجب ہوا۔ یہ خوبصورت اور پختہ صنعت آگ کے لیے کیونکر پیدا ہوئی؟"

انہوں نے میرا ہاتھ دبایا اور کہا:

"کچھ مدت بعد تجھے اس کی سزا ضرور ملے گی۔"

راوی بتاتے ہیں کہ تیس سال کے بعد مجھے اس کی سزا ملی۔

بعض صوفیاء کا فرمان ہے:

"میں اپنے گناہ کی سزا کا اثر اپنے گدھے کی بد خلقی میں پا لیتا ہوں۔"

ایک دوسرے بزرگؒ فرماتے ہیں:

"میں سزا کا اثر گھر کی آگ تک میں محسوس کرتا ہوں۔"

حضرت منصور فقیہؒ سے مروی ہے۔ بتایا:

"میں نے حضرت ابو عبداللہ سکریؒ کو خواب میں دیکھا۔ میں نے پوچھا:

"اللہ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا؟"

انہوں نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے سامنے پسینہ کی حالت میں کھڑا کیا۔ حتیٰ کہ میرے رخسار کا گوشت گر پڑا۔ میں نے پوچھا: "یہ کیوں؟"

فرمایا: "میں نے آتے اور جاتے ہوئے ایک لڑکے کو دیکھا اور عقوبت کا مقام شدت و مشقت ہے۔
چنانچہ ہر بندے کی عقوبت، اس پر سختی و شدت کی صورت میں ہوتی ہے۔ چنانچہ دنیا میں روزی سے محرومی، کمائی
میں مشقت اور مال ضائع ہو جانے کی صورت میں دنیاداروں کو سزا ملتی ہے اور اہل آخرت کو آخرت کی روزی
کم ہونے، اعمالِ صالحہ کی قلتِ توفیق اور علومِ صادقہ کے انشراح مشکل ہو جانے کی صورت میں سزا ملتی ہے۔

ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ۔ (یہ غالب جاننے والے کی تقدیر ہے)

حضرت ابوسلیمان دارانیؒ فرمایا کرتے،

"احتلام بھی ایک سزا ہے۔"

اور فرمایا: "جب بھی کسی کی باجماعت نماز فوت ہو تو وہ کسی گناہ کے باعث ہی فوت ہوتی ہے۔" چنانچہ
مراتب کی رفعت کے مطابق ہی ایسی دقیق سزائیں ملتی ہیں۔

روایات میں ہے:

"تم پر تغیرِ زمانہ کا باعث تمہارے اعمال کی خرابی ہی ہے۔"

حدیث میں ہے۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے،

"جب بندہ میری طاعت پر اپنی شہوت کو ترجیح دیتا ہے تو میں اس کے ساتھ ادنیٰ برتاؤ یہ کرتا ہوں کہ اسے
اپنی مناجات کی لذت سے محروم کر دیتا ہوں۔"

یہ اہل معاملہ کی سزا ہے اور اگر نافرمانی کے موقع میں نافرمان کے چہرے پر قلبی تغیر ظاہر ہو جائے تو اس کا
سارا چہرہ سیاہ پڑ جائے مگر اللہ تعالیٰ ستار و حلیم ہے اور اس کیفیت کو قلب میں ہی چھپا رکھا ہے اور اس کا اثر
ہوتا رہتا ہے۔ گناہگار پر پردہ حائل ہو جاتا ہے۔ ذکر الٰہی، طلبِ خیر، نیکی اور بھلائی میں تیزی سے جانے سے
محروم و غافل ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ بات سب سے بڑی سزا ہے۔

گناہوں سے دل پر مہر لگ جاتی ہے۔

مشائخ کا فرمان ہے،

"جب ایک بندہ خدا کی نافرمانی کرتا ہے اس کے قلب پر ظلمت چھا جاتی ہے
اور اس سے دل پر دھواں نکلتا ہے اور ایمان اس کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یہ
مقام بندے کی غمگینی کا ہے کہ اس کی برائی اسے پریشان کرتی ہے اور جس طرح سورج کے سامنے ابر آڑ بن
جاتا ہے۔ چنانچہ دل کی بینائی ختم ہو جاتی ہے اور اس کا قلب غلاف زدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ آخر جب بندہ توبہ
کرتا ہے اور اصلاحِ حال کر لے تو حجاب کھل جاتا ہے اور ایمان ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جیسے سورج،
حجاب سے نکل آتا ہے۔ اسی طرح قلب بھی علم کے مطابق حکم دیتا ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

كَلَّا بَلْ سكتہ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ (کوئی نہیں۔ پر زنگ پکڑ گیا ہے ان کے دلوں پر، وہ جو کچھ کماتے تھے)[1]

ایک قول کے مطابق اس سے مراد، گناہ پر گناہ کرنا ہے۔ آخر کار دل سیاہ ہو جاتا ہے اور ایمان، پردوں کے پیچھے مخفی ہو کر رہ جاتا ہے اور نیکی نہیں سمجھتا۔ نہ ہی برائی کا انکار کرتا ہے۔ جب اس کی سیاہی کامل ہو جاتی ہے تو اس کی رفعت، ذلت میں الٹ کر گر جاتی ہے۔ اس صورت میں وہ نفاق پر پختہ ہو جاتا ہے اور وہ نفاق پر مطمئن و پختہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اب اللہ ہی اس پر کرم فرمائے اور اس پر اپنا فضل فرمائے تو بات بنتی ہے۔

حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے:

"بندے اور اس کے پروردگار تعالیٰ کے درمیان گناہوں کی ایک معلوم حد ہوتی ہے۔ جب بندہ اس حد تک جا پہنچتا ہے تو اس کے قلب پر مُہر لگ جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد اسے بھلائی کی توفیق نہیں ہوتی۔"

حضرت ابن عمرؓ کی حدیث میں ہے:

"طابع، عرش کے پائے کے ساتھ معلق ہے۔ جب حرمات کو توڑا جائے اور محارم کو حلال کہا جائے تو اللہ تعالیٰ طابع (مہر لگانے والا) بھیجتا ہے۔ پھر قلوب میں جو کچھ ان میں ہو، ان پر مہر لگا دی جاتی ہے۔"

حضرت مجاہدؒ کی حدیث میں ہے:

"قلب کی مثال کھلی ہوئی ہتھیلی کی طرح ہے۔ چنانچہ جب بھی کوئی گناہ کرتا ہے تو ایک انگلی سکڑ جاتی ہے آخر کار تمام انگلیاں سکڑ کر رہ جاتی ہیں۔ پھر قلب پر سخت ہو کر بند ہو جاتی ہیں۔ اس کو قفل پڑ جانا کہتے ہیں۔"

مشائخ کہتے ہیں:

"ہر گناہ کا ایک پودا ہوتا ہے جو دل پہ اگتا ہے۔ جب گناہوں کی کثرت ہوتی ہے تو جلد از شگوفے کی طرح دل کے ارد گرد پودے اُگ آتے ہیں۔ پھر دل پر پیوست ہو جاتے ہیں اس کو غلاف زدگی کہا جاتا ہے اسے کنان کہا جاتا ہے اس کی جمع اکنۃ ہوتا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا: کہ قلب اس کے ساتھ نہ سنتا ہے اور نہ سمجھتا ہے۔"

جماعتِ صوفیاءؒ میں سے ایک بزرگؒ کے ایک طویل قصہ میں ابو عمرو بن علوان سے روایت کیا۔ فرمایا:

"چنانچہ ایک روز میں نماز پڑھ رہا تھا کہ میرے دل میں خواہش نفس پیدا ہوئی میں اس میں ڈوب گیا۔ حتیٰ کہ اس سے مرد کی شہوت پیدا ہوئی۔"

---

[1] المطففین آیت ۱۴۔

راوی بتاتے ہیں کہ "میں زمین پر گر پڑا اور میرا سارا بدن سیاہ پڑ گیا اس پر میں تین روز تک گھر میں چھپ رہا اور باہر نہ نکلا اور خود ہی اس آفت کا علاج کرنے لگا۔ حمام میں صابون ملتا اور دوسرے دھونے والی اشیاء استعمال کرتا مگر سیاہی بڑھتی ہی جاتی۔"

راوی بتاتے ہیں کہ "پھر تین روز کے بعد یہ حالت دور ہو گئی اور میرا سفید رنگ لوٹ آیا۔" بتاتے ہیں کہ اس کے بعد میں حضرت ابوالقاسم جنید رحمۃ اللہ علیہ سے ملا ان کا رخ میری جانب تھا۔ چنانچہ انہوں نے رقہ سے مجھے بلا بھیجا۔ جب میں حاضر ہوا تو فرمایا:

"تمہیں اللہ سے حیا نہ آئی تو اس کے سامنے کھڑا تھا۔ پھر تو نے اپنے نفس کو شہوت میں لگا دیا حتیٰ کہ رقہ میں تم پر یہ حالت مسلط ہو گئی۔ پھر میں نے تجھے اللہ تعالیٰ کے (عذاب سے خدا کے حکم سے) نکالا۔ اگر میں تیرے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا نہ کرتا اور تیری طرف سے توبہ نہ کرتا تو تو اس رنگ میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرتا۔

راوی بتاتے ہیں کہ مجھے تعجب ہوا۔ انہیں یہ بات کیونکر معلوم ہوئی۔ وہ بغداد میں تھے اور میں رقہ میں تھا؟ اللہ عزوجل کے بغیر کسی کو اس کی خبر نہ تھی۔ ایک عالم کے سامنے یہ واقعہ پیش کیا گیا تو انہوں نے فرمایا:

"دراصل یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے رفق و نرمی اور بھلائی کی صورت تھی کہ ان کا دل سیاہ نہیں پڑا بلکہ وہی سیاہی بدن پہ چھا گئی۔ اگر قلب میں یہ سیاہی آجاتی تو اسے ہلاک کر دیتی۔"

پھر فرمایا:

"جب بھی کوئی آدمی گناہ کرتا ہے تو جس طرح اس آدمی کا بدن سیاہ ہوا تھا اس طرح اس کا قلب سیاہ پڑ جاتا ہے اور پھر توبہ کے بغیر وہ صاف نہیں ہوتا لیکن ہر آدمی کے لیے ابن علوان جیسی سہولت نہیں ملا کرتی اور نہ ہی ہر آدمی کو ابوالقاسم جنید رحمۃ اللہ علیہ جیسا مہربان مل سکتا ہے ہر گناہ کی سزا ہوتی ہے۔ ہاں خدا ہی معاف کر دے تو بات الگ ہے اور گناہ کی مقدار کے مطابق سزا بھی ملتی ہے۔ بندے کے علم کے مطابق اس کی مقدار نہیں ہوتی بلکہ یہ تقدیر مشیت اور سابقہ علم ربانی کے مطابق ہوتی ہے۔ گاہے یہ سزا دل میں ملتی ہے۔ یہ امراض قلب کی ایک قسم ہے اور گاہے بدن میں سزا ملتی ہے اور گاہے احوال و اہل میں اور گاہے علمائے اسلام اور اہل ایمان کے سامنے قدر و منزلت ختم ہونے کی صورت میں سزا ملتی ہے۔ گاہے یہ سزا آخرت میں جا کر ملتی ہے اور یہ سب سے سخت سزا ہے اور یہ سزا ان کبیرہ گناہوں کے ارتکاب کرنے والوں کو ملتی ہیں جو توبہ کیے بغیر مریں اور جو لوگ گناہوں پر اصرار کریں اور تکبر و غرور دکھائیں انہیں اخروی سزا ملتی ہے۔ اس لیے کہ جب دنیا میں یہ سزا ملے تو دنیا کی حقارت کے مطابق یہ سزا بھی حقیر اور کم درجہ کی ہو گی اور اگر یہ سزا آخرت پہ موخر ہو گئی تو آخرت کی عظیم مقدار کے مطابق سزا بھی شدید ترین ہو گی۔

غم و عافیت بھی گاہے سزا ہوتی ہے

حدیث میں ہے :

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے متعلق بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے گناہ کی سزا معجل کر دیتا ہے اور جب اس کے ساتھ سختی کا ارادہ کرتا ہے تو (سزا کو) موخر کر کے آخرت میں مکمل (سزا) دیتا ہے۔"

یاد رکھیے کہ دنیا کی ہاتھ سے نکل جانے والی نعمتوں پر غم کھانا اور ان کو حاصل کرنے کی شدید خواہش رکھنا بھی ایک قسم کی سزا ہے۔ گاہے گناہوں کی وجہ سے دائمی عافیت اور وسعتِ سرمایہ بھی سزا ہوتا ہے۔ جبکہ یہ دونوں باتیں گناہوں کا باعث ہوں۔ کبھی ایسے ہوتا ہے کہ گناہ کی سزا کے باعث انسان اس جیسا یا اس سے بڑا گناہ شروع کر دیتا ہے جیسے کہ ایک نیکی کی برکت سے انسان اُس جیسی یا اُس سے بڑی نیکی کی توفیق حاصل کر لیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

وَعَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُمْ مَا تُحِبُّونَ[1] (اور بے حکمی کے بعد اس کے کہ تم کو دکھا چکا تمہاری خوشی کی چیز)

اس آیت کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ غنا و عافیت کو۔ جیسے کہ فقر و مرض بھی اللہ تعالےٰ کی رحمت ہے جبکہ وہ عصمت کا باعث ہو اور یہی دونوں باتیں گناہوں کی جڑ بھی بن جاتی ہیں جبکہ یہ گناہوں کا باعث اور نافرمانی کا سبب ہوں۔

یاد رہے کہ حلم و بردباری سزا کو ختم نہیں کرتی بلکہ اسے موخر کر دیتی ہے اور حلیم کی شان یہ ہے کہ سزا میں جلدی نہ کرے اور گاہے کچھ مدت کے بعد سزا دی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ :

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ[2] (پھر جب بھول گئے جو نصیحت کی تھی ان کو کھول دیے ہم نے ان پر دروازے ہر چیز کے)

یعنی رخصت و فراوانی کر دی جاتی ہے۔

حَتَّى إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُمْ بَغْتَةً۔ (یہاں تک کہ جب خوش ہوئے پائی ہوئی چیز سے پکڑا ہم نے ان کو بے خبر)

ایک قول کے مطابق ساٹھ برس کے بعد بھی گرفت ہو جاتی ہے۔

---

[1] سورۃ آل عمران آیت ۱۵۲۔

[2] سورۃ انعام آیت ۴۴۔

غم بھی گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے

حدیث میں ہے :

" بعض گناہ ایسے بھی ہیں کہ جن کا کفارہ صرف طلبِ معاش کی فکر و پریشانی ہے"!

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں :

" ان کا کفارہ صرف غموں اور پریشانیوں سے ہوتا ہے۔"

فقرا کے لیے دنیا کی مباح حاجات میں انہماک رکھنے میں بھی کفارۂ ذنوب ہو جاتا ہے۔ اہل ایمان اگر دنیاوی مباحات میں حصہ لینے پر مجبور ہوں تو اخروی نیکیوں کے ہاتھ سے جانے پر انہیں بلند درجات ملیں گے اور دوسرا آدمی حبِ دنیا اور دنیا طلبی میں رہ کر سزا پاتا ہے۔

بعض سلفؒ کا فرمان ہے :

" جو دنیاوی محبت سے استغفار نہیں کرتا اس کے لیے یہ ہی گناہ کافی ہے۔"

ایک دوسرے بزرگؒ فرماتے ہیں :

" بندے کے لیے گناہوں کی یہی سزا کافی ہے کہ وہ دنیاوی آفات میں مبتلا رہے۔ زادِ آخرت اور آخرت کے کاموں میں حصہ نہ لے سکے۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے :

" جب بندے کے گناہ کثرت سے ہوں اور اس کے پاس ایسے اعمال نہ ہوں کہ جو اس کی برائیوں کا کفارہ بن سکیں تو اللہ تعالیٰ اس پر غم و پریشانیاں ڈال دیتا ہے۔ اور یہی اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے۔"

فرماتے ہیں :

" اگر بندے پر کسی وقت ایسا غم طاری ہو جائے جس کا باعث نہ سمجھے تو یہ بات اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔"

فرماتے ہیں :

" یہ بدنی جرائم کی بنا پر محاسبہ گویا دکھ کے عقلی غم ہے۔ چنانچہ عقل پر یہ غم مسلط ہو جاتا ہے اور بندے کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ وہ غم کا باعث نہیں سمجھتا۔"

حضرت یعقوبؑ کا واقعہ

حضرت یعقوب علیہ السلام کے واقعات سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی :

" اگر تیرے لیے میرے علم عنایتِ سابقہ نہ ہوتی تو میں تیرے نزدیک اپنے آپ کو سب سے بڑا کنجوس بناتا۔ اس طرح کہ تو کثرت سے سوال کرے اور طویل مدت تک سوال کرے اور قبولیت کو مؤخر کر دوں۔ مگر یہ

میری تجھ پر عنایت ہے کہ میں نے تیرے دل میں اپنے آپ کے بارے میں یہ ڈال دیا کہ میں سب سے زیادہ رحم کرنے والا اور سب سے بڑا حاکم ہوں اور میرے ہاں تیرا بلند درجہ ہے جس کو تو یوسفؑ پر غم کھاتے کے بغیر حاصل نہیں کرے گا۔ اس لیے میں نے ارادہ کیا کہ تجھے اس درجہ تک پہنچا دوں۔

اسی طرح مروی ہے :

"جب حضرت جبرئیل علیہ السلام جیل خانہ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس آئے تو انھوں نے پوچھا: "آپ نے غمزدہ بوڑھے کو کس حال میں چھوڑا؟"

انہوں نے جواب دیا: "انہوں نے ایک سو (بیٹے کے مرنے پر) غمزدہ عورت کے برابر تجھ پر غم کیا۔"

انہوں نے پوچھا: "تو اللہ تعالیٰ کے ہاں انہیں کیا ملا؟"

فرمایا: "ان کے لیے ایک سو شہید کا اجر ہے۔"

سلفؒ سے مروی ایک روایت میں ہے :

"جب بھی کوئی آدمی نافرمانی کرتا ہے تو زمین کا وہ حصہ اللہ سے اجازت چاہتا ہے کہ اس کو دھنسا دے، اور آسمان کا وہ حصہ اجازت چاہتا ہے کہ اس پر گر پڑے، پھر اللہ تعالیٰ زمین و آسمان کو حکم دیتا ہے کہ میرے بندے سے رک جاؤ اور اسے مہلت دو، تم نے اسے پیدا نہیں کیا اور اگر تم نے اسے پیدا کیا ہوتا تو تم اس پر رحم کرتے۔ شاید یہ توبہ کر کے میری طرف آجائے اور میں اسے بخش دوں۔ شاید وہ بدل کر نیک بن جائے اور میں اس کی (برائیوں کو) نیکیوں میں بدل دوں۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مطلب ہے۔ فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ یُمۡسِکُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ اَنۡ تَزُوۡلَا۔ (تحقیق اللہ تھام رہا ہے آسمانوں کو اور زمین کو اور ٹل نہ جائیں)

یعنی بندوں کی نافرمانیوں کی وجہ سے ایسا ہو۔

وَ لَئِنۡ زَالَتَاۤ اِنۡ اَمۡسَکَہُمَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنۡۢ بَعۡدِہٖ ؕ اِنَّہٗ کَانَ حَلِیۡمًا۔ (اور اگر ٹل جائیں تو کوئی تھام نہ سکے ان کو اس کے سوا، وہ ہے تحمل والا)

یعنی ان کی نافرمانیوں پر حلیم ہے۔ غَفُوۡرًا۔ یعنی ان کی برائیوں کو بخشنے والا ہے۔

اس کی تفسیر میں فرمایا گیا کہ :

"جب اللہ تعالیٰ نے بندوں کی نافرمانیوں کی طرف دیکھا تو غضبناک ہوا۔ اس پر زمین کانپ اٹھتی اور آسمان پر

لہ فاطر آیت ۴۰

لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ پھر آسمانی فرشتے اتر کر زمین کے اطراف کو تھام لیتے ہیں اور زمینی فرشتے اوپر چڑھ کر اطرافِ سماوی تھام لیتے ہیں اور مسلسل قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ پڑھتے ہیں۔ آخر کار اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کا غضب تھم جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ نے بھی فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ "......

بعض علماء کا فرمان ہے کہ جب زمین پر ناقوس بجایا جائے اور جاہلیت کی پکار پکاری جائے تو رب سبحانہٗ و تعالیٰ کا غضب شدید ہو جاتا ہے مگر جب وہ مکاتب کے بچوں (دینی مدارس کے طلباء) اور مسجد میں آباد کرنے والوں کو دیکھتا ہے۔ ایک قول کے مطابق جب وہ اللہ کی خاطر دو باہم محبت کرنے والوں کو یا اس کی خاطر ایک دوسرے کی زیارت و ملاقات کرنے والوں کو دیکھتا ہے اور اذان دینے والوں کی آواز سنتا ہے تو حلم و مغفرت فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا۔ (وہ ہے تحمل والا بخشتا)

چنانچہ جب بندہ ایک گناہ کے بعد دوسرا گناہ کرتا ہے اور دو گناہوں کے درمیان توبہ و استغفار نہیں کرتا تو اس پر ہلاکت کا خطرہ ہے۔ اس لیے کہ یہ آدمی گناہوں پر اصرار کرنے والا ہے۔ اس نے اپنے آقائے کریم کی طرف توبہ و رجوع ترک کر دیا اور نفسانی خواہش پر پختہ ہو گیا۔ چنانچہ خدا تعالیٰ سے دُور ہُوا اور یہ بُعد ہی مقامِ غضب ہے۔

مجاہدۂ نفس بڑا جہاد ہے

افضل ترین کام یہ ہے کہ انسان اپنی نفسانی خواہشات کو قطع کر دے اور خواہشِ (نفس) سب سے شیریں چیز محسوس ہوتی ہے۔ اس لیے کہ خواہشات کا کوئی انجام نہیں جیسے کہ ان کے آغاز کی کوئی متعین بات نہیں۔ اب اگر خواہشات کو قطع نہ کیا تو ان کی انتہا نہ رہے گی۔ اگر مزید طاعت اور حلاوتِ بندگی پانے میں لگ جائے تو ٹھیک ورنہ صبر و مجاہدہ سے کام لے اور یہی طالبِ صادق کا طریق ہے۔

اللہ تعالےٰ کا فرمان ہے:

اِسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ۔ (صبر اور نماز کے ساتھ دعا مانگو)

یعنی طاعت کے ذریعہ مدد حاصل کرو اور نافرمانی کے سلسلہ میں مجاہدہ پر صبر کرو۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا:

"امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مقابلہ میں تمام اہلِ خیر اس طرح ہیں جیسے کہ سمندر کے مقابلہ میں ذرا سا تھوک ہو۔ اور راہِ خدا میں جہاد کے مقابلہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اس طرح ہے جیسے کہ سمندر کے مقابلہ میں ذرا سا تھوک ہو اور برائی سے پرہیز کرنے کے سلسلہ میں نفس کو خواہش سے روکنے کے مجاہدہ کے مقابلہ میں)

جہاد فی سبیل اللہ اس طرح ہے جیسے کہ بے پایاں سمندر کے مقابلہ میں ذرا سا تھوک ہو۔" اور اسی مفہوم پر ایک روایت آتی ہے :

"تم چھوٹے جہاد سے پلٹ کر بڑے جہاد یعنی مجاہدۂ نفس کی طرف جا رہے ہو۔"

حضرت سہل بن عبداللہؒ فرمایا کرتے :

"صدق کی تصدیق صبر سے ہوتی ہے اور نافرمانی (نہ کرنا اور اس پر) صبر کرنا افضل ترین درجہ نیکی ہے پھر طاعت پر صبر کرنا آتا ہے۔"

گناہ سے پرہیز کا انعام

اسرائیلیات میں مروی ہے :

"ایک آدمی نے ایک شہر میں ایک عورت سے نکاح کیا اور اپنے غلام کو بھیج کر وہ اسے لے آئے۔ اس عورت نے اس کو پھانسنا چاہا اور برائی کا مطالبہ کیا۔ اس نے مجاہدہ سے کام لیا، اور اللہ تعالیٰ سے بچنے کی دعا کی (آخر بچ گیا) بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو نبوت عطا فرمائی اور وہ بنی اسرائیل میں ایک نبیؑ تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں بھی ہے کہ انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام سے پوچھا:

"اللہ تعالیٰ نے کس بات کی وجہ سے آپ کو علمِ غیب پر مطلع فرمایا؟"

انہوں نے کہا :

"اللہ تعالیٰ کی خاطر، نافرمانیوں کو ترک کرنے کے باعث یہ انعام ہوا۔"

چنانچہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے محض مقدارِ عمل کے مطابق ہی جزا نہیں ملتی بلکہ اس کا عطیہ از حد زیادہ ہوتا ہے اور جب بندہ اللہ تعالیٰ کی خاطر کچھ عمل کرے تو وہ اسے بے حساب اجر عطا فرماتا ہے۔ پھر تائب، گناہ کی عادت نہیں لیتا۔ کہ اس کی وجہ سے اس کی توبہ دشوار ہو جائے۔ اس لیے کہ عادت، اصل میں جنودِ الٰہی میں سے ایک ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو تمام لوگ توبہ کرنے والے ہو جائیں۔ اور اگر ابتلاء نہ ہو تو توبہ کرنے والے سب سیدھی راہ پر ہوں۔ پھر اگر عادی ہو تو اس کو کاٹنے کی کوشش کرے۔ اس کے بعد نفسانی خواہشات کے خلاف مجاہدہ پر صبر و استقامت دکھائے جبکہ ایسی خواہش میں مبتلا ہو۔ یہ بات سالکین کے افضل و اعلیٰ ترین اعمال میں سے ہے اور اس وصف کے ساتھ ہی نفسِ مطمئنہ کو رشد و تقویٰ عطا کیا جاتا ہے اور اس کے ذریعہ وصفِ امّارہ سے نکل نفسِ مطمئنہ کی طرف اور اخلاقِ ایمان کی طرف آسکتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ :

"افضل ترین عمل وہ ہے جس پر نفوس کو مجبور کیا جائے۔"

اس کی وجہ یہ ہے کہ نفس خواہش کی مخالفت کو ناپسند کرتا ہے اور خواہش دعویٰ [illegible] کی ضد ہوتی ہے

اب یہ آدمی نفس کو خواہش کی مخالفت پر مجبور کرنے والا اور حق کی موافقت کرنے والا بن گیا۔ اس لیے کہ افضل ترین عمل حق کی محبت ہے۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

وَ الْوَزْنُ يَوْمَئِذِ ِالْحَقُّ ۔ (اور تول اس دن ٹھیک ہے)

چنانچہ جو حق سے (وابستہ رہ کر) ایک دوسرے کو نصیحت کرتے رہے اور ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے رہے۔ ان کو خسارہ پانے والوں سے مستثنیٰ کیا۔

بعض معتبر حضرات کے بارے میں مروی ہے کہ:

"وہ کیچڑ کے راستہ میں چل رہے تھے۔ لباس پنڈلیوں سے اُوپر کر کے اور راہ کے کناروں پر ہو ہو کر بچتے ہوئے چل رہے تھے۔ اچانک ان کا پاؤں پھسل کر کیچڑ میں چلا گیا۔ انہوں نے دونوں پاؤں کیچڑ میں داخل کر دیئے اور اس کے درمیان چلنے لگے۔ راوی بتاتے ہیں۔ پھر وُہ رو پڑے۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ کیوں روئے؟"

فرمایا: "یہ بندے کی مثال ہے وہ گناہوں سے بچتا رہتا ہے اور اطراف سے ہو کر چلتا رہتا ہے۔ آخر ایک گناہ یا دو گناہوں میں گرتا ہے تو اس کے بعد گناہوں میں ڈوب کر ہی رہ جاتا ہے"۔

غفلت کا انجام

بندے پر لازم ہے کہ غفلت سے توبہ کرے اور یہ ایک لازمی آفت ہے جو اکثر آجاتی ہے جب اس کو جان لے گا تو بغیر انقطاع کیے ہمیشہ توبہ کرتا رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں غافل رہنے والوں کو آخرت میں خسارہ پانے والوں میں ذکر کیا۔ فرمایا:

وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ۔[1] (اور وہی ہیں بیہوش، آپ ہی ثابت ہُوا کہ آخرت میں وہی خراب ہیں)

مگر غفلت در غفلت اور خسارہ در خسارہ سے بچو اور غفلت کو معمولی نہ سمجھو۔ اس لیے کہ گناہوں کا آغاز و ابتدا ہے اور اہلِ یقین کے ساتھ یہ کبائر کی جڑ ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے غفلت کو بھی کفر کا ایک مقام قرار دیا اور اسے اندھاپن اور شک سے مقارن بتایا۔ اور رشد و ہدایت سے جدا اور حسرت سے موصوف بنایا۔ اہل بیت کے طریق سے مروی حدیث میں بتایا:

"چنانچہ عمار بن یاسر کھڑے ہُوئے اور کہا:

"اے امیر المومنینؓ! ہمیں بتائیے کہ کفر کی بنیاد کس پر ہے؟"

انہوں نے فرمایا،" چار ستونوں پر۔ جفا، اندھاپن، غفلت اور شک پر۔ جس نے جفا کی اس نے

---

[1] النحل آیت ۱۰۸، ۱۰۹ ۔

حق کو حقیر جانا۔ باطل کو ظاہر کیا اور علماء سے ناراض ہُوا اور جس نے اندھا پن اختیار کیا اس نے ذکر (اللہ) کو بھلا دیا اور جس نے غفلت کی اس نے رشد و ہدایت سے عداوت رکھی اور امیدوں نے اُسے دھوکے میں ڈال دیا۔ چنانچہ اس پر حسرت و ندامت آکر رہے گی۔ اور خدا تعالیٰ سے وُہ سزائیں آئیں گی جو اس کے وہم و گمان میں نہ تھیں اور جس نے شک کیا وہ گمراہی کی وادی میں بھٹک کر رہ گیا۔

توبہ پر پختہ رہو

بعض علماءؒ کا فرمان ہے:

"جس نے صداقت کے ساتھ شہوت ترک کی اور اللہ تعالیٰ کی خاطر نفس سے سات بار مجاہدہ کیا۔ اللہ تعالیٰ اسے دوبارہ اس میں مبتلا نہیں کرتا۔"

ایک دُوسرے بزرگؒ فرماتے ہیں:

"جو گناہ سے توبہ کرے اور سات برس تک استقامت رکھے۔ وُہ گناہ کی طرف دوبارہ نہیں آئے گا۔"

ایک عالمؒ فرماتے ہیں:

"معتاد گناہ کا کفارہ یہ ہے کہ جس قدر تُونے وُہ گناہ کیا اسی قدر اس پر قابُو رکھ اور دوبارہ یہ کام نہ کر۔ چنانچہ ہر ترکِ فعل اسی فعل کا کفارہ ہو جائے گا۔"

پوری قوت سے توبہ کرنے والوں اور صاحبانِ قوت تائبین کا یہی طریق ہے اور کمزور سالک کا یہ طریقہ نہیں بلکہ ایک کمزور سالک کا حال فرار و بعد کا حال ہوتا ہے۔ اب جو آدمی گناہ کے موقع پر اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے ایک طالبِ صادق کو چاہیے کہ وہ گناہ کے وساوس کو ہی جڑ سے کاٹ کر رکھ دے ورنہ ان میں گر پڑے گا۔ اس لیے کہ خیالات سے وسوسہ کو قوت حاصل ہوتی ہے اور جب وسوسے کثرت سے آنے لگیں تو شیطان کے لیے مائل کرنے اور گناہ کو مزیّن کر کے اس پر آمادہ کرنے کی راہ کھل جاتی ہے اس طرح ایک تائب کے لیے سب سے خطرناک اور نقصان دہ بات یہ ہے کہ وُہ ایک بُرے خیال کی طرف قلب کو مائل کر لے اور آخر کار وُہ اسے ہلاکت میں ڈال دے۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ جو بات گناہ کا سبب ہو یا اس کی وجہ سے کوئی گناہ یاد آجائے (اور پھر اس میں پڑنے کا خطرہ پیدا ہو) تو یہ بات بھی گناہ ہے۔ اور جو سبب انسان کو گناہ تک لے جائے وہ بھی گناہ ہے۔ چاہے وہ کام اصل میں مباح ہی ہو اس کو ختم کرنا بھی نیکی ہوگا۔ یہ دقائقِ اعمال کی باتیں ہیں۔ فرمایا کرتے ہیں:

"جس پر عمر کے چالیس سال گزر جائیں اور وُہ اب تک گناہ پر قایم ہو تو ان میں سے قلیل ترین لوگ ہی توبہ کر کے (ماضی کی) تلافی کرتے ہیں۔"

حدیث میں مروی ہے:

"مومن ہر وہ ہے جو ابتلا میں پڑنے والا اور توبہ کرنے والا ہو اور مومن کا ایک گناہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس میں وہ گاہے گاہے پڑ جاتا ہے۔"

حدیث میں ہے:

"ہر بنی آدم گنہگار ہے اور سب سے بہترین گنہگار استغفار کرنے والے ہیں۔"

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ:

"مومن واہ (افسوس کناں) اور راقع (تلافی کرنے والا) ہوتا ہے۔ ان میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے رقع (توبہ) پر وفات پائے۔ یعنی گناہوں پر افسوس کرنے والا اور توبہ و استغفار کے ساتھ تلافی کرنے والا ہوتا ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی توصیف فرمائی کہ وہ پے در پے گناہ نہیں کرتے اور گناہ ہو جائے تو فوراً نیکی کرتے ہیں۔ فرمایا:

وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ۔ (اور بھلائی دیتے ہیں برائی کے جواب میں)

اور اللہ تعالیٰ نے صابر و عامل حضرات کا یہ وصف بتایا۔ فرمایا:

أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ۔[1] (وہ لوگ پائیں گے اپنا حق دُہرا، اس پر ٹھہرے رہے اور بھلائی دیتے ہیں برائی کے جواب میں)

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ یہ لوگ گناہوں سے رکنے اور توبہ پر استقامت کرنے میں صبر و استقامت کرتے ہیں اور انہیں دُہرا اجر ملے گا۔ اللہ تعالیٰ نے توبہ کرنے والے مومنوں پر تین شرائط عائد کیں اور توبہ کرنیوالے منافقین پر چار شرائط لگائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منافقین نے اپنے اعمال میں مخلوق کو قابل توجہ سمجھا، اور اخلاص میں انہیں بھی خالق تعالیٰ کا شریک بنا دیا۔ چنانچہ ان پر شدتِ ناراضگی کے باعث ایک شرط بڑھا دی اور اہل ایمان پر تخفیف فرمائی۔ چنانچہ مومنوں کے بارے میں فرمایا:

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا[1] وَأَصْلَحُوا[2] وَبَيَّنُوا[3]۔

تَابُوا کا معنی ہے خواہشاتِ نفسانی سے توبہ کر کے حق کی طرف رجوع کیا۔

وَأَصْلَحُوا جو انہوں نے اپنے نفوس کے ذریعہ فساد برپا کیا تھا۔ اس کی اصلاح کی۔

---

[1] القصص۔ آیت ۵۴۔

وَبَیَّنُوْا ۔ اس کی توضیح دو طرح ہے ،

۱۔ انہوں نے جو حق چھپایا اور جو حقیقتِ علم مخفی رکھی، اسے واضح کر دیا اور ظاہر کر دیا۔ یہ پابندی اس پر ہے جس نے کتمانِ علم اور حق کو باطل کے ساتھ ملتبس کرنے کا جرم کیا۔

۲۔ انہوں نے توبہ واضح طور پر کی۔ حتیٰ کہ ان میں توبہ کرنے کے آثار کھل کر نظر آنے لگے اور توبہ کے احکام ان پر واضح ہو گئے۔ اور منافقین کے بارے میں فرمایا:

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَ لَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِیْرًا اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ اعْتَصَمُوْا وَ اَخْلَصُوْا دِیْنَهُمْ لِلّٰهِ ۔

(منافق ہیں سب سے نیچے درجے میں آگ کے اور ہرگز نہ پائے گا تو ان کے واسطے کوئی مددگار، مگر جنہوں نے توبہ کی اور اصلاح کی اور مضبوط پکڑا اللہ کو اور نرے حکم بردار ہوئے اللہ کے)

اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ انسانوں اور اموال کے ذریعہ بچاؤ تلاش کرتے اور دکھاوے کے لیے اعمال کرتے تھے۔ اس لیے ان پر لازم کیا گیا کہ اعتصام باللہ اور اخلاص للہ میں پورے اتریں۔

اب گناہوں کی مقدار کے بالمقابل توبہ ہونی چاہیے۔ اگر گناہ کثرت سے کیے ہوں تو توبہ بھی کثرت سے کرنی چاہیے۔ اور جس قدر انسان نے بگاڑ و فساد کر رکھا تھا اس کے مطابق توبہ کرنے والے کو اصلاح کی فکر کرنی چاہیے تاکہ اللہ کے فرمان کے مطابق بات بن جائے۔ فرمایا:

اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِیْنَ ۔ (ہم اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتے)

اور جب تک بندہ اصلاح کی فکر نہ کرے وہ تائب نہیں ہوتا اور جب تک اچھے اعمال نہ کرے وہ اصلاح کرنیوالا نہیں بنتا۔ آخر کار وہ صالحین میں داخل ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ هُوَ یَتَوَلَّى الصّٰلِحِیْنَ ۔ (اور وہ صالحین کا کارساز ہے)

یہ توبہ کرنے والے کا وصف ہے اور یہی آدمی صحیح توبہ کرنے والا ہے اور خدا تعالیٰ کا محبوب ہے جیسے کہ فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ ۔ (بے شک اللہ توبہ کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے)

یعنی جو لوگ شہوات سے ہٹ کر خدا کی طرف آتے ہیں اور اس کی خاطر غلط باتوں سے پاک رہتے ہیں۔ اللہ ان کو محبوب رکھتا ہے اور ان کا کارساز ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بھی فرمایا:

"توبہ کرنے والا، اللہ کا محبوب ہے۔"

حضرت ابو محمد سہلؒ سے پوچھا گیا، "توبہ کرنے والا بندہ کس وقت اللہ کا محبوب بنتا ہے؟"

فرمایا: "جب وہ یوں ہو جائے جیسے خدا تعالیٰ نے فرمایا:
اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الخ (توبہ کرنے والے عبادت کرنے والے)"
پھر فرمایا: "محبوب آدمی اس کام میں کبھی داخل نہیں ہوتا جس کو حبیب تعالیٰ پسند نہ کرے۔"
اور فرمایا: "توبہ اس وقت تک درست نہیں ہو سکتی جب تک کہ وہ اپنی نیکیوں سے بھی توبہ نہ کرلے!"
یعنی نیکی کی ادائیگی میں جو کوتاہیاں ہوئیں ان سے بھی توبہ کرلے تو ہی درست ہوگی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہیں حق تعالیٰ سبحانہٗ کی طرف سے جو مشاہدہ حاصل ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ ان پر جو نظرِ کرم فرماتا ہے یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے اور اس کی عظمت کا یہی تقاضا ہے۔

افضل ترین عمل، توبہ ہے۔

حضرت سہلؒ فرمایا کرتے:
"تمام اعمال سے افضل عمل توبہ ہے۔ اس لیے کہ توبہ کے بغیر کوئی عمل درست نہیں ہوتا اور جب تک کئی حلال امور بھی نہ چھوڑ دے تب تک اس کی توبہ درست نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ (بعض حلال امور بھی) ایسے ہوتے ہیں کہ جو انسان کو (گناہ کی طرف) لے جاتے ہیں۔ (جبکہ نیت بد ہو) توبہ کرنے والوں کی خوراک، استغفار ہے اور خطا کاروں کی پریشانی کا علاج بھی استغفار ہے۔ فرمایا:
اِسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ۔ (اپنے پروردگار سے بخشش مانگو پھر اس کی طرف توبہ کرکے (لوٹ) آؤ)

اور ایک جگہ فرمایا:
اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ۔[1] (کیوں نہیں توبہ کرتے اللہ پاس اور گناہ بخشواتے)
چنانچہ استغفار کے ساتھ توبہ کا ذکر شروع کیا اور استغفار کے بعد توبہ کا ذکر کیا۔ چنانچہ گناہ ہونے پر استغفار کا مطلب دراصل اللہ سے ستاری و پردہ پوشی کا سوال کرنا ہے اور گناہگار ہونے کی حالت میں خدا تعالیٰ کا بخشش دینا، دراصل اس پر خدا کی پردہ پوشی و حلم کی علامت ہے۔
مشائخ کہا کرتے ہیں:
"اللہ تعالیٰ دنیا میں جس گناہ کی پردہ پوشی فرما دے اسے آخرت میں بخشش دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بالاتر ہے کہ جس گناہ کی اس نے پردہ پوشی فرمائی اسے پھر کھول دے اور دنیا میں اللہ تعالیٰ نے جس گناہ کی

---

[1] مائدہ آیت ۷۴۔

پردہ دری کردی اس کو اس کی آخرت کی سزا ہی قرار دے دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بالا تر ہے کہ وہ اپنے بندے کو دُہری مار دے۔"

حضرت علی و ابن عباس رضی اللہ عنہم سے بھی اسی طرح منقول ہے اور انہوں نے توبہ کے بعد استغفار کے طریق سے اسے مسند بنایا۔ یعنی بندہ اپنے آقائے کریم سے مواخذہ سے معافی کا سوال کرتا ہے اور توبہ کے بعد خدا کی مغفرت، اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے اور خدا تعالیٰ تجاوز فرما کر برائیوں کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے جیسے کہ یَا کَرِیْمَ الْعَفْوِ کی توضیح کرتے ہوئے حدیث میں آتا ہے۔ فرمایا:

" اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی رحمت سے برائیوں کو معاف کر کے انہیں نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ذریعہ اسے پختہ کر دیا۔"

فَاسْتَقِیْمُوْٓا اِلَیْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ۔ (سو سیدھے رہو اس کی طرف اور اس سے گناہ بخشواؤ)

اور اس سے پہلے فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا[1] (تحقیق جنہوں نے کہا رب ہمارا اللہ ہے پھر اس پر ٹھہرے رہے۔ ان پر اترتے ہیں فرشتے کہ تم نہ ڈرو اور نہ غم کھاؤ)

یعنی اللہ تعالیٰ کو ایک تسلیم کرو۔ پھر توحید پر پختہ ہو جاؤ۔ اور اس کے ساتھ شرک نہ کرو۔ ایک قول یہ ہے کہ توبہ پر پختہ ہو جاؤ اور مکاریوں سے کام نہ لو۔

اَلَّا تَخَافُوْا (کہ خوف نہ کرو) یعنی گناہوں کی سزا نہ خوف کرو۔ اس لیے کہ توحید کی برکت سے گناہوں کا کفارہ ہو چکا۔ وَلَا تَحْزَنُوْا (اور غم نہ کرو) یعنی فوت شدہ اعمال پر غم نہ کرو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کی برکت سے ان کا بھی تدارک فرما دیا اور استقامت کے باعث تمہیں اہلِ احسان کے مقام پر پہنچا دیا۔ اس کے بعد فرمایا:

وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ (اور جس جنت کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا اس کی خوشخبری لو)

یعنی پہلے زمانہ میں جس جنّت کا تم سے وعدہ ہوتا تھا۔

نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ (ہم تمہارے کارساز ہیں) یعنی ہم تمہارے قریب ہیں اور تمہارے مددگار ہیں۔

فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ۔ (دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں)

---

[1] حم السجدہ آیت ۳۰

یعنی تمہیں ایمان پر ثابت قدمی عطا کر کے تمہاری کارسازی کرتے ہیں۔

وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ۔ (اور تم کو وہاں ہے جو چاہے جی تمہارا اور تم کو وہاں ہے جو منگواؤ)

یعنی تمہارے اجسام جیسی دائمی نعمتیں چاہتے ہیں اور تمہارے قلوب مولائے رحیم و کریم کی زیارت وغیرہ کی جو جو خواہش کرتے ہیں تمہیں حاصل ہوں گی۔

توبہ کا طریقہ

حدیث میں آتا ہے:

"گناہ سے توبہ کرنے والا ایسے ہے جیسے کہ اس کا کوئی گناہ نہیں اور گناہ سے بخشش چاہنے والا جبکہ وہ گناہ پر اصرار بھی کرتا ہو۔ ایسا ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات سے استہزاء کرنے والا ہوتا ہے۔"

بعض مشائخ فرمایا کرتے۔

"میں اپنے قول استغفر اللہ سے بھی خدا کی مغفرت چاہتا ہوں جبکہ استغفار زبان سے پڑھوں اور نہ توبہ ہو اور نہ ہی قلبی ندامت ہو۔"

حدیث میں آتا ہے:

"توبہ اور قلبی ندامت کے بغیر صرف زبان سے استغفار کرنا کذابوں کی توبہ ہے۔"

حضرت رابعہؒ فرمایا کرتیں:

"ہمارا استغفار بھی استغفار کا محتاج ہے۔"

چنانچہ کئی ایسی توبہ ہیں جو کہ صحتِ توبہ میں توبہ کی محتاج ہوتی ہیں اور ان میں اخلاص و سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب جو آدمی برائیوں کے بعد نیکیاں کر سکے اور غلطیاں ہو جانے کے بعد اعمالِ صالحہ کر ڈالے۔ اسے آخرت میں نجات اور وفات سے پہلے استقامت کا امیدوار رہنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللَّهُ أَن يَتُوبَ عَلَيْهِمْ۔

(ملایا ایک کام نیک اور دوسرا برا شاید اللہ معاف کرے ان کو)

یعنی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر کرم فرمائے اور ان کی طرف نظرِ رحمت سے دیکھے۔ ایک قول یہ ہے کہ خلطوا عملا صالحا کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے گناہوں کا اور شروع ہونے والی توبہ کا اعتراف کیا اور آخر سیئا سے مراد سابقہ غفلت و جہالت ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے: "جو توبہ کرے اس کے لیے غفور (بخشنے والا) ہے

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ۔ (اور میں بخشنے والا ہوں اس کو جو توبہ کرے)

یعنی شرک سے توبہ کرے۔

وَ آمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا۔ (اور ایمان لائے اور اچھے اعمال کرے)

یعنی توحید پر ایمان لائے، فرائض ادا کرے اور محارم سے بچتا رہے۔

ثُمَّ اهْتَدٰی۔ (پھر وہ سیدھی راہ پر رہے)

پھر وُہ سنت پر رہے۔ ایک قول کے مطابق "توبہ پر پختہ رہے" ہے۔ یہ اہل ایمان کی صفات ہیں۔ چنانچہ منافقین پر جو شرط لگائی وہ مخلصین پر نہیں لگائی۔ اور یہ توبہ ہے۔ اس طرح مشرکین کو بھی فرمایا کہ توبہ کرو اس لیے کہ توبہ کے بغیر کسی کے لیے کوئی راہ نہیں اور نہ ہی اس کے بغیر محبت و رضا تک رسائی حاصل ہوتی ہے۔

منافقین کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَ اٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَ اِمَّا اَنْ يَّتُوْبُ عَلَيْهِمْ۔ (اور بعضے اور لوگ ہیں کہ ان کا کام ڈھیل میں ہے حکم پر اللہ کے یا ان کو عذاب کرے یا ان کو معاف کرے)

یعنی اصرار پر انہیں سزا دے اور استغفار کے باعث ان کی توبہ قبول فرمالے اور کافروں کے بارے میں حکم بیان کرتے ہوئے اسے زیادہ محکم فرمایا:

فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ۔

(سو اگر توبہ کریں اور کھڑی رکھیں نماز اور دیتے ہیں زکوٰۃ تو چھوڑ دو ان کی راہ)

اللہ تعالیٰ نے اُمت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کے ساتھ استغفار برائے عبادات کو ملا کر ذکر کیا اور اپنے فضل و کرم کے باعث ان سے آپؐ کے وجودِ اقدس کی برکت سے رفع عذاب کا ذکر فرمایا۔ فرمایا:

وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ[1] (اور اللہ ہرگز نہ عذاب کرتا ہے جب تک تُو تھا ان میں اور اللہ نہ عذاب کرے گا ان کو جب تک بخشواتے رہیں)

(یعنی استغفار کرتے رہیں)

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"ہمارے لیے دو امان تھے۔ ایک چلا گیا اور ایک باقی ہے۔ اگر دُوسرا بھی چلا گیا تو ہم ہلاک ہو جائیں گے۔"

---

[1] انفال آیت ۳۳۔

یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور استغفار باقی ہے۔

حضرت سہلؒ سے استغفار کے بارے میں پوچھا گیا کہ "جو گناہوں کا کفارہ بنتا ہے۔"

انہوں نے فرمایا:

" استغفار کی ابتدا استجابت ہے، پھر انابت ہے، پھر توبہ ہے۔ استجابت کے لیے ظاہری اعضاء کے اعمال (صالحہ) ہیں اور انابت کا مطلب قلب کے اعمال (صالحہ) ہیں اور توبہ کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق سے قطع کر کے خالق تعالیٰ کے سامنے آن گرے۔ پھر جو غلطی کر بیٹھا اس کی بخشش کا سوال کرے۔ نعمت سے جہالت اور ترکِ تشکر کی معافی چاہیے۔ اس طرح اس کی مغفرت ہو جائے گی اور اللہ کے ہاں اسے پناہ گاہ مل سکے گی پھر اسے انفراد، پھر ثبات، پھر بیان، پھر قرب، پھر معرفت، پھر مناجات، پھر مصافات، پھر موالات، پھر محادثۂ سر یعنی خلت (دوستی) تک رسائی ہوتی چلی جائے گی اور بندے کے قلب میں یہ بات اس وقت ٹھہر سکتی ہے کہ جب اس کی غذا علم ہو، اس کا قوام ذکر ہو اور اس کا زادِ راہ رضا ہو۔ اس کا مطلوب، تفویض (اپنے آپ کو سپردِ خدا کر دینا) ہو اور اس کا ساتھی توکل ہو۔ پھر ہی اللہ تعالیٰ اس کی طرف نظرِ کرم فرما کر اُسے عرش تک اٹھا لیتا ہے اور اس کا مقام حاملینِ عرش کا ہو جاتا ہے۔

توبہ کے بعد کیا کرے ؟

(حضرت سہلؒ) فرمایا کرتے :

" بندے کو لازمی طور پر آقائے کریم کی جانب ہر طرح حال دیکھنا پڑتا ہے اور احسن ترین حال یہ ہے کہ وہ ہر چیز میں اپنے مولائے کریم کی طرف رجوع کرے۔ اگر نافرمانی کرنے ہی لگ جائے تو کہے : اے پروردگار! میری پردہ پوشی فرما اور نافرمانی سے فارغ ہو کر کہے، اے پروردگار! میری توبہ قبول فرما، اور جب توبہ کرے تو کہے : اے پروردگار! مجھ سے یہ عمل قبول فرما لے۔

آٹھ اعمال ایسے ہیں کہ اگر وہ کیے جائیں تو اُمید ہے کہ توبہ کے بعد گناہوں اور گناہوں پر اصرار کی حرکت سب کا کفارہ ہو جائے گا اور معافی مل جائے گی۔ ان میں سے چار ظاہری اعضاء کے اعمال ہیں اور چار قلبی اعمال ہیں۔

اعضائے ظاہر کے اعمال حسب ذیل ہیں :

دو رکعت نماز (نفل) ادا کرے۔ پھر ستّر بار استغفار کرے اور یہ کلمہ ایک سو بار کہے :

سُبْحَانَ اللّٰہِ الْعَظِیْمِ وَ بِحَمْدِہٖ۔ (اللہ عظمت والا پاک ہے اور اپنی حمد کے ساتھ)

اس کے بعد کچھ صدقہ کر دے اور اس روز روزہ رکھے۔

قلبی اعمال حسب ذیل ہیں :

اعتقاد سے خوب جم کر توبہ کرے۔ گناہ دُور کرنے کی سخت خواہش رکھے۔ گناہ پر سزا سے بھی ڈرے اور اللہ سے مغفرت کی امید بھی رکھے۔ پھر حسنِ ظن اور صدق یقین کے ساتھ اللہ تعالیٰ پر امید رکھے کہ اس نے گناہ بخش دیا ان اعمال کے بارے میں روایات بھی مروی ہیں کہ ان کی برکت سے لغزشیں اور خطائیں معاف کر دی جاتی ہیں۔ بعض میں یہ شرط بھی ہے کہ وضو کرے اور خوب کامل وضو کرے اور مسجد میں جاکر دو رکعت (نفل) ادا کرے۔ بعض روایات میں ہے کہ چار رکعت (نفل) پڑھے۔

بتایا کہ یہ بھی فرماتے ہیں، کہ جب بندہ گناہ کرتا ہے تو دائیں جانب کا فرشتہ بائیں جانب والے فرشتے کو حکم دیتا ہے اور یہ (دائیں جانب والا) دوسرے پر امیر ہوتا ہے کہ "اس سے چھ گھڑیوں تک قلم اٹھالے۔ اگر توبہ کر لے اور بخشش مانگ لے تو اس پر اس کا (گناہ) نہ لکھا جائے اور اگر بخشش نہ مانگے تو لکھ دیتا ہے۔"

فرماتے ہیں: "شب کا صدقہ، دن کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے اور پوشیدہ صدقہ، رات کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے۔"

ایک روایت میں ہے،

"اگر تو برائی کر بیٹھے تو فوراً بعد میں نیکی کرلے۔ یہ اس کا کفارہ بن جائے گی۔ پوشیدہ (کے بعد) پوشیدہ اور علانیہ (کے بعد) علانیہ۔"

مختلف روایات میں آتا ہے،

"جو ہم جمع کر کے ذکر کریں گے کہ ہر طلوع ہونے والی فجر اور ہر غائب ہونے والی رات میں دو فرشتے باہم باتیں کرتے ہیں چار آوازوں کے ساتھ۔"

ایک کہتا ہے:

"کاش! یہ مخلوق پیدا ہی نہ ہوتی!"

تو دوسرا کہتا ہے:

"کاش! جب پیدا ہوئی تو جان لیتی کہ انہیں کیوں پیدا کیا گیا؟"

ایک کہتا ہے:

"کاش! جب انہیں معلوم ہو گیا کہ وہ کیوں پیدا کیے گئے تو جو جان لیا تھا اس پر عمل کرتے۔"

بعض میں ہے:

"باہم مل بیٹھتے اور جو جان لیا تھا اس کا مذاکرہ کرتے۔"

پھر دُوسرا کہتا ہے :

"کاش ! جب انہوں نے اپنے علم پر عمل نہیں کیا تو جیسا (کام و) عمل کیا تھا۔ اس پر توبہ کرے۔"

بندے پر کیا واجب ہے

بندے پر اللہ عزوجل کی جانب سے سب سے پہلے یہ بات لازم ہے کہ اس کی نعمتوں پر نافرمانی نہ کرے تاکہ اس کے انعامات پر اس کی معصیت ناشکری و کفرانِ نعمت نہ بن جائے۔ بندے کے اعضاء اور اس کا مال بھی اللہ تعالیٰ کے انعامات میں سے ہے۔ اس لیے کہ انسان کا قوام اس کے اعضاء کے ذریعہ ہے اور حرکت کے ذریعہ اس کے اعضاء ٹھیک ہیں اور عافیت سے حرکت کا فائدہ ملتا ہے۔ اب اگر اس نے خدا کی دی ہوئی نعمت کے ساتھ ہی اس کی نافرمانی کی تو اس نے اسے کفر میں بدل دیا۔ جیسے کہ فرمایا :

بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا۔ (بدلا کیا اللہ کے احسان کا ناشکری)

یعنی ان کے ذریعہ اس کی نافرمانی پر امداد لی۔ پھر اس تبدیلی پر سخت سزا کی دھمکی دی اور فرمایا :

وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ۔ (اور بدل ڈالے اللہ کی نعمت بعد اس کے کہ پہنچ چکی اس کو تو اللہ کی مار سخت ہے)

گاہے دنیا میں ہی نافرمانی کر کے تبدیلیٔ نعمت کے جرم کی سزا مل جاتی ہے اور گاہے آخرت میں ملتی ہے اور گاہے دنیاوی اسباب میں سزا کی صورت بنا دی جاتی ہے اور گاہے اخروی اسباب سے محروم کر کے سزا دی جاتی ہے۔ اس لیے کہ آخرت ہی اس (مرنے کے بعد) کا ٹھکانہ و مآل ہے۔ اور گاہے دونوں مقامات پہ سزا ملتی ہے۔ گاہے ایسا ہوتا ہے کہ نعمت پر نفسِ معصیت اور نعمت سے جہالت ہی سزا ہوتی ہے۔ نعمت پر شکر نہ کرنا اُسے حقیر جاننا، نعمتِ دنیا کا ہو کر رہ جانا، اس میں انہماکِ طویل کر لینا، اس پر غرور تفاخر دکھانا یہ سب سزاؤں کی اقسام ہیں۔

بندے پر لازم ہے کہ اگر نافرمانی کر بیٹھے تو فوراً مولائے کریم کی طرف بھاگے۔ نفسانی شرارت پر آگاہی کے بعد یہ ہی توبہ ہے۔ توبہ میں تاخیر کرنا اور گناہ پر اصرار کرنا دو گناہ ہیں۔ اگر اس نے گناہ سے توبہ کی اور پختگی کے ساتھ توبہ کی توبہ پر استقامت دکھلانے اور ہمیشہ گناہوں سے پرہیز کرنے کا پکا ارادہ کرے۔ پھر اپنی ہمت کے مطابق صغائر سے بھی ہمیشہ توبہ کرتا رہے۔ اس طرح مخلوق سے خوف کھانے، مخلوق کے ہاں طمع رکھنے سے بھی توبہ کرے یہ خواص کے گناہ ہیں۔ اس طرح ایک چیز پر جم جانا اور ایک چیز سے راحت پانا مقربین کے گناہ ہیں۔ غرض توبہ پہ قایم رہے۔ حتیٰ کہ اس کے علم کی حد تک اس میں کوئی گناہ کی عادت باقی نہ رہے اور علم اسے وفا کی گواہی دے دے اب علم الٰہی میں ہی اس کے گناہ باقی رہیں گے۔ ربوبیت کے وصف وشان کے تسلط سے پیدائش کا وجود

اور نفسِ عبودیت کی حقیقت اور مطالعۂ علمِ الٰہی کے گناہ باقی رہ گئے۔ یعنی وہ علم جو اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے مخصوص فرمادیا جس کے ذریعہ وہ حقائق معلوم کرتا ہے۔ جب وہ اپنے علم سے گھبرا کر اس طرف آئے گا جن کا ذکر ممکن نہیں اور اس کی تفصیل معلوم نہیں۔ یعنی مقربین کے گناہ جو کہ اصحابِ یمین کی نیکیاں ہیں تو اس کے لیے اس کا خوف ہی اجر و ثواب بن جائے گا اور اصحابِ یمین کے لیے یہ نیکیاں اس وجہ سے ہیں کہ انہیں مشاہدہ حاصل نہیں اور عوام کو ان کے مقامات کی معرفت حاصل نہیں۔ اب اس مقرب کا یہ حال ہوگا کہ موت تک ہر لحظہ اور ہر سانس ڈرتا رہے۔ اور ہر حرکت میں اعراض و حجاب ہو جانے کا خوف رکھے۔ یہاں تک کہ وہ دارِ آخرت کو سدھار جائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ

ایک غریب روایت میں ہے:

"اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ جانتے ہو میں نے تیرے اور یوسفؑ کے درمیان فراق کیوں ڈالا؟"

انہوں نے عرض کیا، "نہیں۔"

فرمایا: "اس لیے کہ تُو نے اس کے بھائیوں سے یوں کہا:

اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یَّاۡکُلَهُ الذِّئۡبُ۔ (میں ڈرتا ہوں کہ اسے بھیڑیا کھا جائے)

اب تو اس پر بھیڑیئے سے کیوں ڈرا اور مجھ سے اس کے لیے امید کیوں نہ رکھی؟ اور اس کے بھائیوں کی غفلت کی جانب کیوں دھیان دیا اور میری حفاظت کی جانب کیوں نظر نہ کی؟

حضرت یوسفؑ نے ساقی سے جو کہا اس کا بھی یہی مفہوم ہے۔ فرمایا:

اُذۡكُرۡنِیۡ عِنۡدَ رَبِّكَ۔ (اپنے بادشاہ کے پاس میرا ذکر کر دینا)

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ پھر کیا ہوا؟

فَاَنۡسٰهُ الشَّیۡطٰنُ ذِكۡرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِی السِّجۡنِ بِضۡعَ سِنِیۡنَ۔

(سو بھلا دیا اس کو شیطان نے ذکر کرنا اپنے خاوند سے پھر رہ گیا قید میں کئی برس)

اصل میں خواص اگر دقیق ترین حد تک بھی غیر اللہ کی جانب نظر کریں تو ان پر اس قسم کے عتاب ہوتے ہیں اگر بعد میں آنے والوں میں سے زیادہ لوگ اس مزید احسان سے محروم رہ گئے انہیں توبہ کی حلاوت نصیب نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ انہوں نے توبہ کے حال کی رعایت نہ رکھی۔ مراقبہ میں تساہل برتنا اور یہ بات توبہ کے احکام کی کم فہمی سے ہوئی ورنہ اگر یہ لوگ گناہ سے پختہ توبہ کریں اور سچے توبہ کرنے والوں کا سا حال بنالیں تو انہیں بھی اللہ تعالیٰ سے مزید انعام و احسان عطا ہو۔ اس لیے کہ جب بھی یہ مُحۡسِنِیۡنَ (بھلے کام کرنے والے) میں اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

سَنَزِيدُ الْمُحْسِنِينَ ۔ (ہم بھلائی کرنے والوں کو مزید عطا کریں گے)

اب جب خدا تعالیٰ تمہیں توبہ پر پختہ اور اعمالِ صالحہ کرنے والا دیکھے گا اور تجھے وجدانِ حلاوت یا زہد آنے یا کسی نیکی کی خاصیت کا پہلا نظارہ آئے تو مراقبہ کرو یا اپنے آپ کی نگرانی کرو۔ ان دو پر عمل کر کے تم مقصود پاؤ گے۔

بعض علماء کا فرمان ہے:

"جس نے ننانوے[99] گناہوں سے توبہ کی اور صرف ایک گناہ سے توبہ نہ کی ہمارے نزدیک، وہ تائبین میں سے نہیں اور نمازوں کے بعد توبہ کی تجدید پورے التزام سے کرتے رہو۔ اس لیے کہ عاملین پر اس انداز سے لغزشیں آتی رہتی ہیں کہ انہیں معلوم بھی نہیں ہوتا۔ اگر محاسبۂ نفس چھوڑ دیا جائے اور نفس سے تسامح برتا جائے، تو گناہوں کی آمد خاموشی کے ساتھ آسان ہو جاتی ہے۔

سچی توبہ کی دس شرائط ہیں

یہ یاد رہے کہ ہر گناہ کے کام میں دراصل دس حصّے یعنی دس اعمالِ سیئہ ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ جب تک ہر گناہ سے دس توبہ نہ کرے تب تک اس توبۃ النصوح کا حق ادا نہیں ہوتا جو کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پہ لازم کی:

۱۔ گناہ کے کام کی طرف دوبارہ جانا بند کر دے۔

۲۔ پھر زبان کے ساتھ توبہ کرے۔

۳۔ پھر گناہ کے سبب بننے والے کام کے ساتھ جمع ہونے سے توبہ کرے۔

۴۔ پھر اس قسم کے ہر گناہ کی طرف جانے سے توبہ کرے۔

۵۔ پھر اس کی جانب نگاہ اٹھانے سے بھی توبہ کرے۔

۶۔ پھر اس گناہ کا تذکرہ کرنے والوں کا کلام سننے سے بھی توبہ کرے۔

۷۔ پھر ایسے عزم سے توبہ کرے (کہ یہ ارادہ و عزم ہی نہیں کروں گا)

۸۔ پھر توبہ میں جو خامی رکھی اس سے توبہ کرے (کہ پوری قوت سے توبہ کرے)

۹۔ پھر اس بات سے توبہ کرے کہ افسوس میں نے گناہ چھوڑا اس میں اخلاص نہ تھا اور اللہ عزوجل کی رضا کی خاطر نہیں چھوڑا۔ (اور فوراً اخلاص کی نیت کرے)

۱۰۔ پھر توبہ کی نظر کرنے اور توبہ کی توفیق پا کر توبہ کرنے پر فخر کرنے سے بھی توبہ کرے۔ پھر اس بات کا دھیان کرے کہ اس نے پروردگارِ کریم کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی برتی۔ اس لیے کہ اسے اللہ تعالیٰ کی کبریائی و عظمت و جلال کی توحید پر مزید مشاہدہ حاصل ہوا۔ اب اس کے بعد حقیقتِ مشاہدہ میں کوتاہی سے توبہ کرے اور ضعفِ قلبی اور ناقص ہمتی پر اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہے کہ عدمِ مقام کے باعث مشاہدہ ہونے میں قلبی ضعف

اور ناقص ہمتی کے باعث قاصر رہا۔

اور عابد کی توبہ کا کوئی انجام نہیں۔ نہ ہی اس کی توضیح کی کوئی غایت ہے۔ وہ ہر وقت توبہ کناں ہے اور اس کے دقیق ابتلاؤں کی توصیف بھی ممکن نہیں اور کوئی نبی اور اس سے کم درجہ کا کوئی آدمی بھی توبہ سے مستثنیٰ نہیں۔ ہر مقام کی ایک توبہ ہے اور ہر مقام کے ہر حال کی ایک توبہ ہے۔ ہر مشاہدہ و مکاشفہ کی ایک توبہ ہے۔ چنانچہ ایک صاحبِ انابت تائب کا یہ حال ہے جو کہ اللہ کا مقرب و حبیب ہے اور یہ مقام صاحبِ امتحان تائب کا ہے کہ مختلف چیزوں سے اس کی آزمائش ہوتی رہتی ہے مگر وہ توبہ کرنے والا اور اللہ تعالیٰ کی جانب نظر رکھنے والا ہوتا ہے۔ یہ امتحان اس لیے ہوتا ہے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ وہ قلب سے اپنے آقائے کریم کی طرف نظر کرتا ہے یا ان اشیاء کی جانب نظر کرتا ہے۔ اس کا وجدان خدا پر ہی رہتا ہے یا ان اشیاء پر، وہ ان چیزوں کے ساتھ خدا پر مطمئن ہوتا ہے یا ان میں اطمینان تلاش کرتا ہے یا ان سب چیزوں سے فرار کر کے صرف اللہ کو ہی مطلوب سمجھتا ہے یا ان اشیاء ہی کو مطلوب بنا بیٹھتا ہے۔ چنانچہ اس کے لیے ہر غیر اللہ کے مشاہدہ میں گناہ ہے اور اس پر غیر اللہ کی طرف تسکین میں عتاب ہے جیسے کہ اس کے لیے ہر مشاہدہ میں علم ہے اور ہر اظہارِ کون میں ایک علم ہے۔ چنانچہ اس کے گناہ بے شمار ہیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی توبہ کی تعداد بھی شمار سے باہر ہے۔ توبۃ النصوح کی حقیقت بھی ہے اور یہ توبہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کے سامنے جبینِ اطاعت رکھنے والا، بھلائی کرنے والا، جبین پانے والا ہے اور اس کا دین اللہ کے نزدیک سیدھا اور صائب ہے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس کا مقام، مقامِ تسلیم ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بے شک اللہ تعالیٰ ہر صاحبِ ابتلا توبہ کرنے والے کو پسند کرتا ہے۔"

گناہوں کی سات اقسام ہیں

گناہوں کی سات اقسام ہیں۔ بعض اقسام شدید تر اور بعض کی شدت ذرا کم ہے اور ہر قسم میں درجات ہیں۔ اور گناہگاروں کے ہر درجہ میں مختلف طبقات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً

بعض گناہگار، پروردگار کریم کی صفات کے مفاہیم کے ساتھ خدا کی نافرمانی کرتے ہیں مثلاً کبر، فخر، جبر، مدح و ثنا چاہنا، عزت و غنا کا وصف۔ یہ گناہ انسان کو برباد کرنے والے ہیں۔

ان میں کئی طبقات ہیں۔ اور بعض گنہگار شیطانی اخلاق کے مفاہیم لے کر نافرمانی کرتے ہیں۔ مثلاً حسد، سرکشی، مکر و فریب اور فساد برپا کرنا یا اس کا حکم دینا۔ یہ بھی ہلاکت کرنے والے گناہ ہیں۔

ان میں اہل دنیا کے کئی طبقات ہیں اور ایسے نافرمان ہیں کہ خلافِ سنت طریقے پر چل کر نافرمانی کرتے ہیں یعنی بدعات جاری کرنا اور اہلِ بدعات کی اختراع کردہ روایات کو رواج دینا۔ یہ کبائر میں سے ہیں اور ان سے

ایمان ختم ہو جاتا اور نفاق پیدا ہوتا ہے۔

چھ گناہ ایسے ہیں جو کہ کبائرِ بدعت سے ہیں اور ان کے ماننے پر انسان ملتِ اسلامیہ سے خارج ہو جاتا ہے۔ قدریہ، مرجیہ، رافضیہ، اباحیہ، جہمیہ اور مغالطے دینے والے شطحیات میں مبتلا لوگ جو کہ قوانینِ شرعیہ توڑنے اور علمی تجاوزات (غلط مسائل پھیلانے) پر کسی حکم کو نہیں مانتے۔ نہ ہی وہ کسی قانون و اخلاق کے پابند ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اس امت کے زندیق ہیں۔

بعض نافرمان ایسے ہیں کہ جو دین میں مظالم کی راہ سے مخلوق سے متعلقہ امور میں گناہ کرتے ہیں۔ اہلِ ایمان کی راہ سے ہٹا کر الحاد پھیلاتے، انہیں سیدھی راہ سے گمراہ کرتے اور سنن سے دور کرنے کی ناپاک کوشش کرتے ہیں۔ کتاب اللہ کی تحریف کرتے اور سنت کی تاویل کر کے (نیا دین) جاری کرتے ہیں اور لوگوں کو اس کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ خود اس پر چلتے اور دوسروں کو اس طرف بلاتے ہیں۔

بعض علماءؒ کا فرمان ہے:

"ان نافرمانیوں کی توبہ نہیں۔" جیسے کہ بعض کا فرمان قاتل کے بارے میں ہے کہ اس کے لیے توبہ نہیں۔ اس کے لیے اس کے خلاف صحیح روایاتِ عذاب موجود ہیں۔

نافرمانیوں کی پانچویں قسم وہ ہے جو دنیاوی امور میں بندوں پر مظالم سے متعلق ہے۔ مثلاً کسی انسان کو ناحق پیٹنا، گالی دینا، اموال لوٹنا، جھوٹ اور بہتان باندھنا۔ یہ بھی ہلاکت میں ڈالنے والے گناہ ہیں اور یہ ضروری ہے کہ ایک عادل حکمران کے سامنے ان مظالم کا قصاص لیا جائے۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مظلوموں کو معاوضہ دے کر راضی کر لیا جائے یا آخرت میں اللہ تعالیٰ ان پر تفضل فرما دے تو الگ بات ہے۔

حدیث میں آیا:

"دیوان تین ہیں:

۱۔ جس دیوان کی مغفرت ہو جائے گی۔

۲۔ جس دیوان کی مغفرت نہ ہو گی۔

۳۔ اور جس دیوان کو نہ چھوڑا جائے گا۔

جس دیوان کی مغفرت ہو جائے گی وہ بندوں اور خدا تعالیٰ کے درمیان تعلق رکھنے والے (امور کے سلسلہ میں) گناہوں کا ہے۔ جس دیوان کی مغفرت نہ ہو گی وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرنے کا ہے اور جس دیوان کو چھوڑا نہیں جائے گا وہ بندوں پر مظالم کا دیوان ہے یعنی ان کا مطالبہ اور ان پر مواخذہ ضرور ہو کر رہے گا۔

گناہوں کی چھٹی قسم وہ ہے جو بندے اور اس کے مولائے کریم کے درمیان ہو اور اس کا تعلق شہوات

اور عاداتِ جاریہ سے ہو۔ یہ خفیف تریں ہے اور معافی کے قریب تر ہے۔ اس کی دو اقسام ہیں :

۱۔ کبائر گناہ

۲۔ صغائر گناہ

کبائر گناہ وہ ہیں جن پر کوئی وعید منصوص ہو (نص سے اس پر وعید آئی ہو) اور اس میں حدِ شرعی (مثلاً قصاص وغیرہ) لازم ہو اور صغائر وُہ گناہ ہیں جو خطرہ و نظر میں ان سے کم تر درجہ پہ ہوں اور توبۃ النصوح میں ان سب سے توبہ کرنا لازم ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان عام ہے۔

فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ۔ (سو معاف کیا تم کو اور درگزر کی تم سے)

اور ظاہر فرمانِ الٰہی میں بھی یہی ثابت ہے کہ :

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا۔ (جو دین پھلانے (بھٹکانے) لگے ایمان والے مردوں کو اور عورتوں کو، پھر توبہ نہ کی)

اسی طرح فرمایا :

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا اسے لے کر اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔[1]

(پھر یوں ہے کہ تیرا رب ان لوگوں پر کہ وطن چھوڑا ہے بعد اس کے کہ پچلائے سے لے کر آخر تک)

اسی طرح اہل شام کی قرأت ہے اس میں فا، اور تا پر نصب ہے۔ مزید برآں توبہ سے مقصود بھی یہی ہے کہ گناہ کی مغفرت ہو جائے اور دوزخ سے نجات مل جائے۔ اور ہماری رائے میں مرتکبین کو ابدی عذاب نہیں ہوگا بلکہ ہم اسے اللہ کی مشیت میں سمجھتے ہیں اور اس بات کو ممکن سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے درگزر کر کے انہیں اصحابِ جنت میں داخل کر دے جیسے کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان

فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيْهَا کی تفسیر کرتے ہوئے حدیث میں آتا ہے۔ یعنی اگر اسے سزا دی۔ اور جیسے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے :

" جس عمل پر اللہ تعالیٰ نے کسی ثواب کا وعدہ فرمایا اسے وُہ پُورا کرے گا اور جس عمل پر سزا کا وعدہ فرمایا تو اس کی پسند و اختیار ہے۔ چاہے تو اس کی سزا دے اور چاہے تو اس سے معاف فرما دے۔"

اور جیسے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ :

---

[1] النحل ۱۱۰۔

يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ (جس کو چاہتا ہے بخش دیتا ہے) یعنی بڑے گناہ چاہے تو بخش دے، اور يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ (جس کو چاہتا ہے عذاب دیتا ہے) یعنی چھوٹے گناہ پر بھی چاہے تو سزا دے۔ چنانچہ شرک کے سوا ہر گناہ کی بخشش کی راہ نظر آتی ہے اور مسلمانوں کو تمام گناہوں کے ساتھ اپنی مشیت میں رکھا۔

بدعتی پر توبہ کی راہ بند ہے

چنانچہ جو آدمی اس روایت سے استدلال کرتا ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ نے ہر بدعتی پر توبہ کو روک دیا"

تو اب اس کی توبہ قبول نہ ہوگی تو یاد رکھیں یہ بات صرف اس کے لیے مخصوص ہے جس پر شقاوت کا غلبہ ہوا اور اس نے توبہ ہی نہیں کی۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی توبہ قبول کرنے کی راہ بند کر دی۔ جس نے توبہ کی بلکہ جس نے توبہ نہیں کی۔ اس کے بارے میں خبر دی کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے توبہ کو روک دیا۔ ایک قاتل جس پر برا انجام آچکا اس کے بارے میں ہم کہا کرتے ہیں کہ بغیر توحید پر مرے گا۔ اس طرح بدعتی کا نام اگر اہل نار میں لکھا جا چکا تو اس کا بھی یہی حال ہے۔ پھر قتل اور بدعت اس عدم توبہ کی علامات ہوئیں اور اس کا سبب یہ ہے کہ دونوں ہی توبہ سے رکاوٹ ہیں۔ اب یہ ان سے رکاوٹ ہو گئی۔

اسی طرح جب آدمی پر برے انجام آجانے سے عذاب کا فیصلہ ہو چکا تو اس میں یہی بحث چلے گی۔ اب اگر اس نے ستر توبہ بھی کر لی تو بھی آگ سے نجات نہ ملے گی۔ اس کی توبہ اس سے زیادہ نہیں جس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ایک بندہ ستر سال تک اہلِ جنت کے اعمال کرتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ جنتی ہے۔ اس کے اور جنت کے درمیان صرف ایک بالشت کا فیصلہ رہ جاتا ہے۔ پھر اس کو بدبختی آن لیتی ہے۔"

دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"پھر اس پر اہلِ نار کے عمل کے ساتھ کتاب سبقت کرتی ہے چنانچہ وہ دوزخ میں چلا جاتا ہے۔" اب اس کے اعمالِ حسنہ میں کئی توبہ بھی داخل تھیں مگر اس کی شقاوت و بدبختی کے غلبہ سے سب اکارت گئیں۔

اور جس کو برے انجام نے نہیں لیا اور اسے توبۃ النصوح کی توفیق مل گئی۔ اس پر شقاوت کا غلبہ نہیں ہوا تو اس سے توبہ بند نہیں ہوئی اور اب اللہ تعالیٰ نے اسے توبہ کی توفیق بخشی تو اس کی مغفرت بھی فرمائے گا جیسے کہ منافقین کے ذکر میں فرمایا:

اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَ اِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ۔

(یا ان کو عذاب کرے یا ان کو معاف کرے)

اور نفاق کا گناہ بدعت سے چھوٹا نہیں اور یہ بھی نہیں ہوا کہ ہر منافق کی توبہ قبول کر لی ہو اور نہ ہی تمام منافقین پر توبہ کا دروازہ بند کیا اور اللہ تعالیٰ کا فرمان بھی عام ہے کہ :

فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۔ (سو معاف کیا تم کو اور درگزر کی تم سے)

جس نے توبہ کی اس کے بارے میں یہ مجمل ہے اور خبر اس کے لیے مخصوص ہے جس نے توبہ نہیں کی۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان بھی ہے :

ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوبُوا ۔ (پھر مہربان ہوا ان پر کہ وہ پھر آویں)

اور ایک جگہ یہ فرمایا :

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (شاید اللہ معاف کرے ان کو، بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے)

توبہ کرنے والوں کی چار اقسام ہیں

توبہ کرنے کے معاملہ میں لوگوں کی چار اقسام ہیں۔ ہر قسم میں ایک گروہ ہے اور ہر گروہ کے لیے ایک مقام ہے۔

۱۔ گناہ سے توبہ کر کے توبہ وانابت پر ثابت قدمی دکھانے والا۔ زندگی بھر یہ دوبارہ نافرمانی کا خیال بھی نہیں لاتا۔ برائیوں کو نیکیوں میں بدل لیتا ہے۔ یہ بھلائیوں میں بڑھ جانے والا (سابق بالخیرات) ہے اور یہی توبۃ النصوح ہے اور یہ ہی نفسِ مطمئنہ ہے اور اس کے بارے میں روایت آتی ہے۔

"چلتے جاؤ، مفرد سبقت کر گئے جو کہ ذکر اللہ پر شیدا و فریفتہ ہیں۔ ذکر نے ان کے بوجھ اتار دیئے۔ اب قیامت کے روز ہلکے پھلکے آئیں گے۔"

۲۔ اس سے قریب تر وہ بندہ ہے جو پختگی سے توبہ کرے۔ اس کی نیت استقامت کی ہو۔ گناہ کی سعی کرے نہ قصد کرے اور نہ ہی اس کا دھیان رکھے اور نہ ہی اس کا اہتمام کرے۔ مگر بلا قصد گاہے اس سے خطا ہو جائے اور اس پر غم اور چھوٹی چھوٹی خطائیں امتحان کے طور پر آجائیں۔ یہ مومنین کی صفات ہیں۔ اس کے لیے استقامت کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ یہ استقامت کی راہ میں ہے اور ان لوگوں میں سے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالےٰ نے فرمایا :

يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۔ (بچتے ہیں بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کے کاموں سے مگر کچھ آلودگی، بے شک تیرے رب کی بخشش میں سمائی ہے)

اور یہ ایسے متقین کے وصف میں داخل ہے جن کے بارے میں خدا تعالیٰ نے فرمایا :

وَ الَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ۔ (اور وہ لوگ جب کر بیٹھیں کچھ کھلا گناہ یا برا کریں اپنے حق میں)

اور اس کا نفس، نفسِ لوّامہ ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم کھائی۔ یہ مقتصد اور میانہ رو ہے ۔ اور یہ گناہ عام طور پر نفسانی صفات کے مفاہیم سے اور نفسانی جبلات کی فطرتوں کے ذریعہ سے آتے ہیں ارضی نباتات سے ان کے نسب کا آغاز ہوتا ہے اور ارحام میں مختلف اطوار کی صورت اختیار کرتے ہیں اور پھر ایک دوسرے سے اختلاط کرنا ۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ وَ اِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۔[1] (وہ خوب جانتا ہے جب نکالا تم کو زمین سے اور جب تم بچے تھے ماں کے پیٹ میں)

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین سے پیدا ہونے والے اور ارحام میں پیدا ہونے والے کو اپنا نفس پاک بتانے سے منع فرمایا۔ اس لیے کہ یہ ٹیڑھا ہی ہوتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ ۔ (سومت بولا اپنی ستھرائیاں)

یہ اس کی ابتدائی پیدائش کا وصف ہے ۔ اسی طرح بتایا کہ اس کی پیدائش میں ہی ابتلاء کا اختلاط ہے ۔ فرمایا:

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيْهِ فَجَعَلْنٰهُ سَمِيْعًا بَصِيْرًا ۔ (بے شک ہم نے بنایا آدمی بوند کے لچھے سے پلٹتے رہے اس کو، پھر کر دیا سنتا بولتا)

اس کی شرح طویل ہے اور نفوس کی ترکیبات اور فطرتی جبلت تک بات جا پہنچی ۔ ہم نے اس کتاب کے بعض ابواب میں اصولی باتیں بتائی ہیں ۔ اس حدیث کا مفہوم اس بندے کی شان ہے کہ :

"المومن مفتن تواب ۔ (مومن ابتلا میں اور توبہ کرنے والا ہوتا ہے)

اور مومن گاہے سنبل کی طرح دراز ہوتا ہے اور گاہے جھک جاتا ہے ۔"

چنانچہ اس کی معرفت حاصل کر کے بندہ اپنے آپ کو حقیر سمجھتا ہے اور اپنی طرف دیکھتا بھی نہیں ۔ اور اگر اس پر بھلائی نمودار ہو تو اس سے تسکین پاتا ہے اور یہ اس کے گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے ۔ اس لیے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کے اس خطاب میں غور و تدبر سے حاصل ہوئی ۔ فرمایا :

فَلَا تُزَكُّوْا اَنْفُسَكُمْ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۔ (سومت بولو اپنی ستھرائیاں وہ خوب جانتا ہے اسکو جو ڈرا)

---

[1] النجم ۳۲

۳۔ توبہ کرنے والے کی تیسری قسم، حال میں دوسرے کے قریب تر ہے۔ یہ وہ آدمی ہے جو گناہ کرتا ہے پھر توبہ کرلیتا ہے۔ پھر دوبارہ کر بیٹھتا ہے۔ پھر اسے غم لاحق ہوتا ہے مگر یہ قصد وسعی کرکے غلطی کرتا ہے اور اسے طاعت پر ترجیح دے دیتا ہے مگر پھر جلدی سے توبہ کرتا ہے اور دل میں استقامت کا ارادہ کرتا ہے۔ تائبین کے مراتب حاصل کرنا چاہتا ہے اور مقامات صدیقین کی طرف ہی اس کے قلب کو چین پڑتا ہے مگر وہاں آیا نہیں اور نہ ہی وہ مقام ظاہر ہُوا۔ اس لیے کہ اسے خواہش دھکیل کرلے جاتی ہے اور عادت وغفلت اسے بہکا دیتی ہے۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ وہ گناہوں کے درمیان توبہ واستغفار کرتا رہتا ہے اور عادی ہونے کے باعث بار بار گناہ میں گر پڑتا ہے۔ اس کی توبہ دراصل ایک وقت سے دُوسرے وقت تک فوت ہوتا ہے۔ اس جیسے آدمی کی استقامت کی امید کی جاسکتی ہے۔ اس لیے اس کے اعمال حسنہ موجود ہیں اور اسے سابقہ برائیوں کا افسوس واحساس ہے۔ مگر مسلسل گناہوں کی پاداش میں بعض اوقات اس پر حالت بدل جانے کا بھی خطرہ رہتا ہے۔ یہ نفسِ مسولہ ہے، یہ ان میں سے ہے جنہوں نے نیکیوں اور برائیوں کا اختلاط کیا۔ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے اور یہ استقامت اختیار کرکے سابقین بالخیرات سے جاملے۔ یہ آدمی دو حالوں کے درمیان ہے۔ اس پر نفسانی وصف کا غلبہ ہُوا تو اس پر آفت مسلط ہوجانے کا قول طے ہوگیا۔ اور اگر مولائے کریم نے اس کی طرف نظرِ کرم فرمادی تو ہر خامی دُور ہوجائے گی اور ہر احتیاج، غنا میں بدل جائے گا۔ اور وہ اپنے احسان سے اس کی لغزشوں کا تدارک فرمادے گا۔ پھر یہ بھی درجۂ مقربین سے جاملے گا۔ اس لیے کہ یہ خدا تعالیٰ کے فضل ورحمت سے انہی کے طریق پر چلا اور اس کی نیت آخرت تھی۔

۴۔ چوتھا آدمی بدترین حال میں ہے اس پر سب سے سخت وبال ہے اور یہ سب سے زیادہ محروم آدمی ہے۔ یہ وہ آدمی ہے جو ایک گناہ کرتا ہے پھر پے در پے گناہ کرتا چلا جاتا ہے۔ اس جیسے یا اُس سے سخت گناہوں کا مسلسل ارتکاب کررہا ہے۔ جب گناہ کا موقع ملتا ہے کر گزرتا ہے توبہ کی نیت ہی نہیں کرتا اور نہ ہی استقامت کا ارادہ رکھتا ہے۔ یہ حسن ظن کے باعث کسی وعدے کی امید نہیں رکھتا اور نہ ہی کسی عذاب و وعید سے ڈرتا ہے۔ حقیقی اصرار یہی ہے اور یہ سرکشی وتکبر کے درمیان کا ایک مقام ہے۔ اس قسم کے آدمی کے بارے میں روایت ہے:

"آگ کی جانب قدم اٹھانے پر اصرار کرنے والے ہلاک ہُوئے۔"

اس نفس کو نفسِ امّارہ کہا جاتا ہے۔ اس کی رُوح، بھلائی کے کام سے ہمیشہ راہِ فرار اختیار کرتی ہے۔ اس جیسے انسان پر بُرے انجام کا خطرہ ہے۔ اس لیے کہ یہ اس راہ پر جارہا ہے۔ بری قضا اور شقاوت، و بدبختی اس سے دُور نہیں۔ اس قسم کے آدمی کے بارے میں فرمایا گیا:

"جس نے توبہ کے ذریعہ خدا کو ٹالا، اس نے اُسے جھٹلایا۔"
اور لعنت کا مطلب یہ ہے کہ گناہ سے فارغ ہو کر اس سے بڑے گناہ میں مبتلا ہو جائے۔ یہ گروہ عام مسلمانوں میں ملتا ہے۔ یہ فاسقین میں سے ہے اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی مشیت میں ہیں۔ جیسے کہ فرمایا:
مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ۔ (ان کا کام ڈھیل میں حکم پر اللہ کے)
یعنی ان کے بارے میں خدا کا حکم موخر ہے۔ چاہے تو ان کے اصرار کے باعث انہیں عذاب دے اور
وَ اِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ۔ (اور یا توبہ قبول کرے ان کی)
یعنی ان کے سابقہ حسن امتحان کے باعث ان کو معاف کر دے اور ان کی توبہ قبول کر لے۔ ہم اللہ تعالیٰ کے عذاب سے اس کی پناہ مانگتے ہیں اور اس سے ثواب کی نعمت کا سوال کرتے ہیں۔ یہ کتاب التوبہ کے آخری کلمات تھے۔

صبر اور صابرین کا بیان

یہ دوسرا مقامِ یقین ہے

اللہ تعالیٰ نے صابرین کو اہل تقویٰ کا امام بنایا اور دین میں ان پر کامل و مکمل انعام فرمایا۔ چنانچہ ایک جگہ فرمایا:
وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا۔ (اور ان کو کیا ہم نے پیشوا۔ راہ بتاتے ہیں ہمارے حکم سے)
اور فرمایا:
وَ تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ بِمَا صَبَرُوْا۔ (اور پورا ہوا نیکی کا وعدہ تیرے رب کا بنی اسرائیل پر کہ وہ ٹھہرے رہے)
اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"تیری کراہت کے باوجود صبر میں بہت ہی بھلائی ہے۔"
اور حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا:
"تم لوگ کراہت کے باوجود صبر کے بغیر وہ چیز حاصل نہیں کر سکتے جس کو تم پسند کرتے ہو۔"
بعض صحابہؓ کا فرمان ہے:
"تقویٰ اور صبر میں اللہ تعالیٰ نے کس قدر شفا و فضل رکھا ہے!"

حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا:

"صبر کرنا نصف ایمان ہے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے صبر کو ارکان ایمان میں سے ایک رکن قرار دیا اور اسے جہاد و عدل و یقین کے ساتھ مقارن فرمایا۔ فرمایا:

"اسلام چار ستونوں پر مبنی ہے۔

۱۔ یقین

۲۔ صبر

۳۔ جہاد اور

۴۔ عدل پر۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا:

"ایمان میں صبر کی مثال ایسے ہے جیسے کہ بدن میں سر ہو۔ جس کا سر نہ ہو اس کا بدن نہیں ہوتا۔ اور جسے صبر حاصل نہ ہو اس کا ایمان نہیں ہوتا۔" اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقامِ یقین تک صبر کو عظیم الشان قرار دیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ۔ (اور ہم نے ان میں سربراہ کیے جو راہ چلاتے ہیں ہمارے حکم سے جب وہ ٹھہرے رہے اور رہے ہماری باتوں پر یقین کرتے)

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا:

"جس کو ان دونوں سے حصہ ملا۔ اسے فروگزاشت کے بارے میں پرسش نہ ہوگی۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی بتایا:

"کمالِ عمل و اجر ہی صبر ہے۔"

چنانچہ حضرت شہر بن حوشب نے ابو امامہ باہلیؓ سے اور انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا۔ آپؐ نے فرمایا:

"تمہیں قلیل ترین چیز یقین و عزیمتِ صبر دی گئی اور جس کو ان دو میں سے حصہ ملا اسے قیامِ شب اور صیامِ نہار کے بارے میں فروگزاشت پر پرسش نہ ہوگی اور مجھے یہ بات زیادہ پسند ہے کہ تم اس پر صبر کرو جس پر ہو بجائے اس کے کہ تم میں سے ہر ایک ٹھیک ٹھیک میری موافقت (مماثلت) کرے۔ تمہارے تمام عمل

کی طرح ۔ مگر مجھے یہ خطرہ ہے کہ میرے بعد تم پر دنیا فراخ کر دی جائے گی اور تم ایک دوسرے کا انکار (و اجنبیت کا سلوک) کرو گے اور پھر اہل آسمان بھی تمہارا انکار کریں گے ۔ اب جس نے صبر کیا اور اپنا محاسبہ کرتا رہا ، وہ کامل ثواب لے کر ظفریاب ہوا ۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی :

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ وَ لَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۔

(جو تم کے پاس ہے ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہتا ہے اور ہم بدلہ میں دیں گے ٹھہرنے والوں کا حق ، بہتر کاموں پر جو کرتے تھے)

حضرت ابن منکدر نے حضرت جابرؓ سے نقل کیا :

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا :

" صبر اور سماحت (فیاضی) ۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا ۔

(وہ لوگ پائیں گے اپنا حق دُہرا اس پر کہ صبر کیا انہوں نے)

اور فرمایا :

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔

(ٹھہرنے والوں کو ہی ملتا ہے ان کا اجر بغیر حساب کے)

چنانچہ ہر عمل پر صبر کرنے والوں کا اجر دوگنا بتایا ۔ پھر صبر کی جزاء کو ہر عمل کی جزا سے بڑھ کر بتایا ۔ اس کی جزاء بے حد و بے انتہا قرار دی ۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ افضل ترین مقام ہے اور جو تین انعام دوسرے تمام اعمال پر تقسیم کر کے بیان کیے صبر پر تینوں انعام فرمائے ۔ یعنی آخرت میں اور انجام میں بشارت کے بعد ان پر صلاۃ و رحمت و ہدایت کی بشارت دی ۔

صبر اور علوِ درجہ

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے ،

" دونوں عدل خوب ہیں اور صابرین کے لیے علاوت خوب ہے ۔"

دو عدل سے مراد صلاۃ و رحمت ہے اور علاوت سے مراد وہ چیز ہے جو کہ اونٹ پر سامان کے اوپر تانی جاتی ہے ۔ اب یہ تیسرے عدل کی طرح ہوا ۔

اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ۔ اور جس کے ساتھ خدا ہو وہ سر بلند ہوتا ہے ۔ فرمایا :

وَ اصْبِرُوْا اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۔

(اور صبر کرو ، بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے)

اور فرمایا :

وَ اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ وَ اللّٰهُ مَعَكُمْ ۔

(اور تم ہی رہو گے اوپر اور اللہ تمہارے ساتھ ہے)

اور اپنی امداد و نصرت حاصل کرنے کے لیے صبر کی شرط لگائی۔ چنانچہ فرمایا:

بَلٰی اِنْ تَصْبِرُوْا وَ تَتَّقُوْا وَ یَاْتُوْکُمْ مِنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا یُمْدِدْکُمْ رَبُّکُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِیْنَ۔ (اگر تم صبر کرو اور پرہیزگاری کرو اور وہ آئیں تم پر اسی دم تو مدد بھیجے تمہارا رب پانچ ہزار فرشتے پلے ہوئے گھوڑوں پر)

حضرت سہلؒ فرمایا کرتے:

"تصدیق قلبی کا نام صبر ہے اور برائی سے صبر کر کے رکنا، درجاتِ طاعت میں افضل ترین بات ہے۔ پھر طاعت پر استقامت و صبر دکھانے کا مقام آتا ہے۔"

انھوں نے اللہ تعالیٰ کے فرمان اِسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ "امر الٰہی پر اللہ سے مدد حاصل کرو اور ادبِ خدا پر صبر دکھاؤ۔"

اور فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے صرف اس کی مدح فرمائی جس نے ابتلاء و سختی میں صبر سے کام لیا۔ اس وجہ سے وہ اس کی مدح فرماتا ہے۔"

نیز فرمایا کرتے:

"اہل ایمان میں صالحین بہت کم ہیں اور صالحین میں صادقین کم ہیں اور صادقین میں صابرین کی تعداد کم ہے۔"

چنانچہ صبر کو صداقت کی خاصیت بتایا اور اہل صبر کو خواص صادقین قرار دیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی ترتیبِ مقامات میں صادقین پر صابرین کو فوقیت بخشی۔ اب اگر یہ تمام اوصاف مسلمانوں کے نعتِ واحد کی طرح اوصاف ہوں تو صبر کو صدق میں ایک مقام قرار دیا اور واؤ مدح کی ہوگی۔ اور اگر واؤ ترتیب کی ہو تو یہ کئی مقامات ہوئے جن میں ترتیب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صادقین اور قانتین پر صابرین کو اس آیت میں فوقیت دی۔

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمَاتِ وَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنَاتِ۔ الخ (بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں الخ)

مومن کی علامت

حضرت عطاء کی حدیث میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے: کہ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انصار کے پاس تشریف لائے تو پوچھا:

"کیا تم مومن ہو؟" وہ خاموش رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا:

"ہاں! اے اللہ کے رسولؐ!"

آپؐ نے پوچھا: "تمہارے ایمان کی کیا علامت ہے؟"

انہوں نے عرض کیا:

"ہم کشائش میں شکر کرتے ہیں اور ابتلا میں صبر کرتے ہیں اور قضاء پر راضی رہتے ہیں۔"

آپ نے فرمایا:

"کعبہ کے رب کی قسم۔ تم مومن ہو۔"

صبر دو عملوں پر منقسم ہوتا ہے۔

ایک کام ایسا ہوتا ہے جو دینی اصلاح کے لیے ضروری ہوتا ہے اور دوسرا کام دین کو بگاڑتا ہے۔ اس طرح صبر کی اقسام بنتی ہیں۔ اب اگر ایک آدمی دینی اصلاح کے کام پر صبر و استقامت اختیار کرتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کا ایمان مکمل ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ ایسے کاموں سے (باز رہنے) میں صبر و استقامت دکھاتا ہے تو اس کا یقین خوب ہو جاتا ہے۔

اسی مفہوم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ جب وہ بصرہ میں آئے اور ان کی سطوت مضبوط ہو گئی تو آپ جامع مسجد میں تشریف لائے اور قصہ گو لوگوں کو باہر نکال دیا اور فرمایا کہ قصہ گوئی بدعت ہے۔ چلتے چلتے ایک نوجوان کی مجلس تک پہنچے جو لوگوں کو خطاب کر رہا تھا۔ اس کا کلام سُنا تو اس کا کلام مستحسن سمجھا اور فرمایا:

"اے نوجوان! میں دو باتیں تم سے پوچھتا ہوں۔ اگر تو نے جواب دیا تو تمہیں اجازت ہو گی کہ لوگوں کو خطاب کرے ورنہ تجھے بھی باہر نکال دوں گا جیسے تیرے دُوسرے ساتھیوں (قصہ گو لوگوں) کو باہر نکال دیا ہے۔"

اس نے کہا:

"اے امیرالمومنین! پوچھیے۔"

انہوں نے فرمایا:

"یہ بتاؤ کہ دین کی اصلاح اور دین کا بگاڑ کس کس بات میں ہے؟"

اس نے جواب دیا:

"دین کی اصلاح، تقویٰ سے اور دین کا بگاڑ طمع سے ہوتا ہے۔"

فرمایا: "تم نے صحیح کہا، خطاب کرو تم جیسے ہی اس قابل ہیں کہ لوگوں کو خطاب کیا کریں۔"

بتاتے ہیں کہ یہ نوجوان اس علم (باطن) میں ہمارے امام امام الائمہ حضرت حسن بن یسار بصریؒ تھے، جو انصار کے آزاد کردہ غلام تھے۔

حضرت میمونؒ بن مہران فرمایا کرتے:

"ایمان، تصدیق، معرفت اور صبر ایک ہی ہیں۔"

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا،

"ایمان کی چوٹی حکم پر صبر (و استقلال) رکھنا ہے اور (قضاءُ) قدر پر راضی ہونا ہے۔"

ورع اور طمع

زہد کی ابتداء ورع (تقویٰ) سے ہوتی ہے اور یہ ابوابِ آخرت میں سے پہلا دروازہ ہے اور رغبت کا آغاز طمع سے ہوتا ہے اور یہ ابوابِ دنیا میں سے بڑا دروازہ ہے۔

طمع دراصل دنیاوی محبت سے پیدا ہوتا ہے اور دنیا کی محبت ہی ہر گناہ کی جڑ ہے۔

مشائخ فرمایا کرتے ہیں :

"اللہ تعالیٰ کی سب سے پہلی نافرمانی طمع کے ذریعہ ہوئی۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام نے جنت میں ابدی طور پر رہنے کا طمع کیا۔ چنانچہ ممنوعہ درخت کا پھل کھا لیا اور ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالنے کا طمع کیا اور انہیں وسوسہ میں مبتلا کیا۔ چنانچہ اپنے رب کی معصیت میں دونوں ایک نام میں جمع ہو گئے مگر پھر حکم میں اور طمع والی چیز میں دونوں کا افتراق ہو گیا۔ حضرت آدم علیہ السلام نے حسنِ عمل اور بھلائی میں تیزی دکھانے کی برکت سے ان کی لغزش کا تدارک ہو گیا اور ابلیس پر بدبختی غالب آگئی اور وہ برباد ہو گیا۔"

طمع کا مطلب ہے۔ "بدگمانی کی تصدیق کرنا" اس لیے اللہ تعالیٰ نے شیطان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا،

وَ لَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ - (اور سچ کر دکھائی ان پر ابلیس نے اپنی اٹکل)

اور ظن (بدگمانی) یقین سے متضاد ہوتا ہے اور یہ حق سے عبارت نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کا قول ذکر کرتے ہوئے فرمایا،

اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّ مَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ. (ہم کو آتا ہے تو ایک خیال سا اور ہم کو یقین نہیں ہوتا)

اب جو آدمی مخلوق میں طمع سے صبر رکھے اس کو صبر تقویٰ کی طرف لے جائے گا اور جس نے دین میں تقویٰ پر صبر رکھا اسے صبر زہد تک پہنچا دے گا اور جس نے جھوٹے ظن کی تصدیق کرنے میں طمع کیا اس کو یہ طمع، دنیا کی محبت میں ڈال دے گا اور جس نے دنیا کی محبت کا طمع کیا اسے دنیا کی محبت، حقیقتِ دین سے نکال باہر کرے گی۔

صبر کرنا سچے مومن کی علامت ہے

بعض علماء کا فرمان ہے:

"جس آدمی کو ایذاء نہ دی جائے۔ اور اگر ایذا دی جائے تو ایذا نہ سہے (بلکہ بے صبری دکھائے)۔ اور ایمان کے لحاظ سے اس پر صبر نہ کیا تو ہم اس کا ایمان ہی شمار نہ کرتے۔"

اللہ تعالیٰ نے مومنین پر امتحان کی خاطر یہ حالت وارد فرمائی ہے اور بتایا کہ یہ حال عذاب کا حال نہیں بلکہ یہ امتحان و ابتلاء کا حال ہے۔ جس کے بارے میں چاہتا ہے امتحان لیتا ہے اور جس کو تکلیف سہنا پڑی اس کیلئے

یہ ابتلاء رحمت و بھلائی بن گیا۔ چنانچہ فرمایا:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ۔

(اور کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے پھر جب اس کو ایذا پہنچے اللہ کے واسطے، ٹھہراتے لوگوں کا ستانا، برابر اللہ کی مار کے)

لوگوں کی طرف سے ایذا رسانی کو اللہ تعالیٰ کا عذاب سمجھ لیتا ہے۔ حالاں کہ یہ عذاب نہیں بلکہ یہ باطن سے رحمت ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ فرمایا:

وَ اَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ كَلَّا۔

(اور وہ جس وقت اس جانچے، پھر کھینچ کرے اس پر روزی کی، تو کہے میرے رب نے مجھے ذلیل کیا کوئی نہیں)

یعنی میں نے محتاجی دے کر، تیری اہانت نہیں کی جیسے کہ دوسرے (غافل) آدمی کو دنیاوی نعمتیں دے کر اس کی عزت نہیں کی۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس مفہوم میں صبر کرنے کا حکم دیا گیا۔ فرمایا:

وَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ۔ (اور صبر کر اس پر جو وہ کہتے ہیں)

وَ اذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ۔ (اور یاد کر ہمارے بندے داؤد کا (واقعہ)۔

چنانچہ اس طرح آپ کو تسلی دی اور اس پر آپ کو فضیلت بخشی۔ اور حدیث میں آتا ہے:

"اہلِ ارض میں سے سب سے زیادہ شکر گزار کو لایا جائے گا اور اللہ تعالیٰ اسے شکر گزاروں کا صلہ عطا فرمائے گا اور اہلِ ارض میں سے سب سے زیادہ صابر کو لایا جائے گا اور اسے کہا جائے گا۔ کیا تم اس پر راضی ہو کہ ہم تجھے وہی صلہ عطا کریں جو اس شکر گزار کو دیا؟"

وہ کہے گا: "ہاں! اے پروردگار!"

پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

"جس طرح میں نے اس پر انعام کیا اور اس نے شکر کیا اور میں نے تجھے ابتلاء دیا اور تو نے صبر کیا تو میں تجھے ضرور اس سے دوگنا اجر دوں گا۔" چنانچہ اس کو شکر گزاروں سے دوگنا اجر عطا کیا جائے گا۔

حضرت ابن ابی نجیحؒ نے ایک خلیفہ کو تعزیتی مکتوب لکھا اور اس میں یہ بھی لکھا کہ:

"سب سے زیادہ حق بات یہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ نے واپس لے لیا اس میں اللہ کا حق پہچانے۔ یہ بات اس سے زیادہ اہم ہے جو اللہ نے اسے دیا۔ اس میں اس کی عظمت کا خیال رکھے۔"

یہ یاد رکھیں کہ تجھ سے پہلے ماضی تیرے لیے باقی ہے اور تیرے بعد باقی رہنے والا، تجھ میں ماجور رہے۔

یہ بھی یاد رکھیں کہ اہلِ صبر جس میں درست رہتے ہیں ان کا اجر، اہلِ نعمت کے اس (اجرِ شکر) سے زیادہ ہے۔

جس میں وہ پاک دامن رہتے ہیں۔

روایات میں ہے:

"صابرین کے علاوہ ہر آدمی کو اس کا اجر ایک مقررہ حدو حساب سے ملے گا اور ان (اہل صبر) کو بغیر تول کے اور بغیر حدو شمار کے عطا کیا جائے گا۔"

ایک روایت میں ہے:

"جنت کے دروازوں کے دو کواڑ ہیں ان پر لوگوں کی خوب بھیڑ لگی ہوگی مگر صبر کے دروازہ کا ایک ہی کواڑ ہے اور اس میں سے صرف دنیا میں صبر کرنے والے اور ابتلا میں (زندگی والے) ہی ایک ایک کرکے داخل ہوں گے۔"

اللہ تعالیٰ نے مخلص بندوں کی جزا کا ذکر کیا اور فرمایا:

اُولٰٓئِکَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ۔ (وہ جو ہیں ان کی روزی ہے مقرر)

اور اہل صبر کی جزاء کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ۔ (صبر کرنے والوں ہی کو ملنا ان کا اجر بے حساب)

اس کی تفسیر میں فرمایا گیا کہ،

"ان کے لیے چلّو بھر بھر (بے حساب) دیے جائیں گے۔"

اس میں یہ مفہوم بھی ہے کہ نفس پر صبر کرنا سب سے زیادہ شاق اور ناپسند گزرتا ہے اور طبیعت پر صبر سب سے زیادہ تلخ اور دشوار ہوتا ہے۔ اس میں درد ہے۔ اہانت کے وقت اس میں غصہ پینا اور بُردباری دکھانی پڑتی ہے۔ تواضع اور کتم (غضب) بھی اسی سے ہے۔ ادب و حسنِ اخلاق بھی اس میں داخل سمجھا گیا ہے اس میں مخلوق سے ایذا سہنا پڑتی ہے اور مخلوق سے ایذار کا ڈر بھی ہوتا ہے۔ یہ سخت ترین امور ہیں اور ان میں اکثر اوقات تنگی ہوتی ہے اور ان باتوں میں نفس کو مجبور کر کے سختی اور عزیمت کی راہ پر چلانا پڑتا ہے۔

روایت میں ہے:

"افضل ترین عمل وہ ہے جس پر نفوس کو مجبور کیا جائے۔"

اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سچے پرہیزگاروں اور شدائد و آفات میں صبر کرنے والوں پر صبر کی شرط لگائی اور صبر کے ذریعہ ہی ان کی صداقت و تقویٰ کو ثابت کیا۔ اس سے ان کے اعمال صالحہ کو کامل کیا۔ فرمایا:

وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا (اور صبر کرنے والے سختی میں اور تکلیف میں، وہی لوگ ہیں جو سچے ہوئے اور وہی بچاؤ میں آئے)

وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۔

صبر کا مفہوم صبر کا مفہوم یہ ہے کہ نفس کو خواہشات میں جانے سے روکنا اور مجاہدات کے ذریعہ اس کو مولائے کریم کی مرضیات پر آمادہ کرنا اور بندے پر جس قدر ابتلاء ہو اسی قدر مجاہدہ کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور نفس کو دائمی اطاعت پر جمانا؛ طبعی غلط رجحانات سے ہٹانا کہ جن کے باعث پروردگار تعالیٰ کے سامنے بے ادبی ظاہر ہوتی ہے اور ہر کام میں اُسے حسنِ ادب کی تعلیم دینا صبر کا مفہوم ہے۔ پھر خواہشات کے تفاوت کے باعث صبر کے مفاہیم میں بھی تفاوت ہو جاتا ہے اور مولائے کریم کی اطاعت پر پختگی میں فرق ہونے کی وجہ سے صبر میں فرق پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ ایک صبر یہ بھی ہے کہ جس میں ایسا مجاہدہ کیا جاتا ہے کہ اس سے عزم ہٹ جائے۔ خواہشات، شیطانی وساوس اور دنیا کی زیبائش سے دل پاک وصاف ہو جائے۔

صبر کی اقسام بعض آفات ایسی ہیں کہ جن پر اعضائے ظاہر سے رک کر صبر کرنا پڑتا ہے۔ بعض میں اس طرف جانے سے ہی نفس کو روکنا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایک صبر یہ ہے کہ

نفس کو حق پر بند رکھے۔ زبان و قلب اور جسم کے ساتھ حق سے وابستہ کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے اس صبر کی توصیف اس طرح فرمائی کہ "جو لوگ نیک اعمال کرتے ہیں" اور اعمال صالحہ کی شرط لگائی کہ صبر کریں اور بتایا کہ تمام لوگ خسارے میں ہیں مگر اہلِ حق اور اہلِ صبر خسارے میں نہیں ہیں اور صبر کی عظمت اس طرح بیان کی کہ اسے "ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے رہے" کے جملہ سے دوبارہ بیان فرمایا؛

ایک صبر یہ ہے کہ اپنے نفس کو قابو کر کے اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کی عبادت پر جما دے اور اسے قناعت اور رزاق تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی و ثابت قدم کر دے۔

ایک صبر یہ ہے کہ مخلوق کو ایذا دینے سے باز رہے کہ یہ اہلِ عدل کا مقام ہے اور اس فرمان میں یہ داخل ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ ۔ (بے شک اللہ تعالیٰ عدل کا حکم دیتا ہے)

پھر مخلوق سے ایذا رسانی کا بھی خطرہ ہوگا (مگر صبر کرے)۔ محسنین کا مقام ہے اور وَ الْاِحْسَانِ (اور احسان) (کا حکم دیتا ہے) میں داخل ہے۔

ایک صبر یہ بھی ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے اور حق والوں کو درجہ بدرجہ (الاقرب فالاقرب) کو سامنے رکھتے ہوئے ان کے حقوق ادا کرے۔ یہ منفقین (خرچ کرنے والوں) کا مقام ہے جو اس فرمان میں داخل ہے کہ

وَ اِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى ۔ (اور قرابت داروں کو ان کا حق دے کر استقامت و صبر دکھائے)

بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرنا بھی صبر ہے اور فحشائ سے مراد ہے علم و ایمان میں امر فاحش کا حکم دینا یا کرنا۔

برائی سے بچنا بھی صبر ہے۔ یعنی جس کو علماء کرام برائی بتائیں بغاوت و سرکشی سے دُور رہنا بھی صبر ہے یعنی امورِ دین میں غلو کرنا، تکبر کر کے حدودِ شرعیہ پھاند جانا اور امورِ دنیا میں اسراف سے کام لینا سرکشی کی باتیں ہیں اور ان سب سے پرہیز کرنا صبر ہے اور یہ قطبِ قرآن ہیں۔ ان میں سے تین یہ ہیں کہ عدل و احسان و عطا پر صبر و استقامت دکھانا۔ اور تین یہ ہیں کہ بے حیائی، بُرائی اور سرکشی سے دوُر رہنے پر صبر کرنا۔

حضرت ابن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے:

"کتاب اللہ میں یہ آیت امر و نہی کی سب سے جامع آیت ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ الَّذِیْنَ صَبَرُوْا۔ (خوب اجر ہے عمل کرنے والوں کا جنہوں نے صبر کیا)

چنانچہ ان کا صبر ذکر کیا تو ہی ان کے اجر کو خوب فرمایا۔ اور صبر سے ان کی مدح کر کے ہی ان کے وصف و رزق کو اعلیٰ و عمدہ بتایا۔

کن باتوں سے صبر مکمل ہوتا ہے؟

عمل سے پہلے اور اس کے ساتھ ساتھ اور اس کے بعد بھی صبر کامل کرنے کے لیے حسب ذیل باتوں کی ضرورت ہے:

عمل کے آغاز میں ضروری ہے کہ نیت درست کرنے اور عزم پورا کرنے کے سلسلہ میں صبر دکھائے حتیٰ کہ اعمال درست طور پر ادا ہو جائیں۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اعمال کا دارو مدار نیتوں پر ہے اور ہر آدمی کے لیے وہی ہے جو اس نے نیت کی۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ۔ (اور ان کو حکم یہی ہوا کہ عبادت کریں اللہ کی خالص کر کے اس کے واسطے بندگی۔)

اور نیت کی حقیقت اخلاص ہے۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صبر کو عمل پر مقدم رکھا۔ چنانچہ فرمایا:

اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّ اَجْرٌ کَبِیْرٌ۔ (سوائے ان کے کہ جنہوں نے صبر کیا اور نیک کام کیے۔ وہی ہیں۔ بخشش ہے اور بڑا اجر ہے)

اور اجر کا مطلب یہ بھی ہے کہ عمل میں استقامت دکھائے اور عمل کرتا رہے۔ یہاں تک کہ وہ مکمل ہو جائے اس لیے کہ خدا تعالیٰ کا فرمان ہے:

نِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ الَّذِیْنَ صَبَرُوْا۔ (خوب اجر ہے عمل کرنے والوں کا جنہوں نے صبر کیا)

اور عمل کے بعد صبر یہ ہے کہ اسے مخفی رکھنے پر صبر دکھائے اور اس کا اظہار نہ کرتا پھرے، نہ ہی اس کی طرف نظر اٹھائے تاکہ سمع اور عجب سے بچا رہے اور اس کا ثواب مکمل ہو جائے جیسے کہ ریا سے بچا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ لَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَكُمْ۔ (اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور اپنے اعمال ضائع نہ کرو)

اور اسی طرح فرمایا:

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى۔ (اپنے صدقات کو احسان اور ایذاء کے ساتھ برباد نہ کرو)

بعض سلف کا فرمان ہے:

"نیکی تین باتوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔

۱۔ اس میں سبقت کرنا۔

۲۔ کرکے اسے معمولی سمجھنا۔

۳۔ اور اسے مخفی رکھنا۔"

ایک صبر یہ ہے کہ مولائے کریم پر توکل کرکے ایذاء دہی پر صبر کرے اور نفس کو انتقام لینے سے روکے اور اس پر صبر دکھائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ لَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَاۤ اٰذَیْتُمُوْنَا وَ عَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ۔ (اور ہم صبر کریں گے ایذاء پر، جو ہم کو دیتے ہو اور اللہ پر توکل کرنا چاہیے توکل کرنے والوں کو)

یہ خواص کا صبر ہے اور اس وجہ سے ایک عارف فرماتے ہیں کہ:

"بندے کا توکل میں اس وقت مقام پختہ ہوتا ہے کہ جب اسے ایذا دی جائے اور وہ ایذا پر صبر کرے۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان میں اس کا ذکر کیا فرمایا:

وَ دَعْ اَذٰىهُمْ وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ۔ (اور ان مستانہ، اور اللہ پر توکل کرو)

اور ایک جگہ فرمایا:

فَاتَّخِذْهُ وَكِیْلًا وَاصْبِرْ عَلٰى مَا یَقُوْلُوْنَ۔ (اس کو کام سونپ دے اور سہتا رہ جو کہتے رہیں)

اور یہ رضا کی ابتداء ہے۔

رضا کا دوسرا مقام احکام پر صبر کرنا ہے اور یہ اہل ابتلاء کا صبر ہے۔ جو جس قدر انبیاء علیہم السّلام سے مماثل ہوگا۔ اس قدر اس کا امتحان شدید ہوگا۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہم انبیاء کی جماعتوں پر سب لوگوں سے زیادہ سخت ابتلاء (امتحان) آتا ہے۔ پھر جو زیادہ مماثل ہو!"

اس پر ابتلاء اس درجہ کا شدید ہوتا ہے۔ اللہ تعالےٰ نے مجمل کلمات میں فرمایا:

وَ لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ۔ (اور اپنے پروردگار کے لیے، سو صبر کر)

پھر مفسر کلام میں اس کی وضاحت فرمادی کہ،

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا۔ (اور تو اپنے رب کے حکم کے لیے صبر کر اس لیے کہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے)

ایک صبر یہ ہے کہ تقویٰ پر نفس کو جمائے اور تقویٰ ہر خیر کا جامع نام ہے۔ چنانچہ صبر ایسا مفہوم ہے جو کہ ہر نیکی میں داخل ہے۔ اب جب بندہ ان دونوں کا جامع ہوگا تو وہ محسنین میں سے ہوگا۔ اور

مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِنْ سَبِيلٍ۔ (اور نہیں ہے نیکوکاروں پر کوئی راہ)

اور فرمایا:

إِنَّهُ مَنْ يَتَّقِ وَ يَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ۔ (بے شک جو پرہیزگار ہو اور صبر کرے تو اللہ نہیں ضائع کرتا حق نیکی والوں کا)

اور اسی طرح ایک یہ فرمایا کہ:

لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَ أَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ مِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا وَ إِنْ تَصْبِرُوا وَ تَتَّقُوا فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ۔ (البتہ تم آزمائے جاؤ گے مال سے اور جان سے، اور البتہ سنو گے اگلی کتاب والوں سے اور مشرکوں سے بہت بدگوئی اور اگر تم ٹھہرے رہو اور پرہیزگاری کرو تو یہ ہمت کے کام ہیں)

یعنی اگر تم ایذا پر صبر کرو اور انتقام کے پیچھے نہ پڑو۔ ابتلاء اور مصائب میں تقویٰ کی راہ پر گامزن رہو اور حدود سے تجاوز نہ کرو تو بڑا افضل ترین بات ہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ۔ (اور اگر بدلا دو تو بدلہ دو اسی قدر، جتنی تم کو تکلیف پہنچی۔ اور اگر صبر کرو تو یہ بہتر ہے صبر والوں کو)

اور فرمایا:

وَ لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ۔ (اور جو کوئی بدلہ لے اپنے ظلم پر، سو ان پر بھی نہیں راہ)

پھر یہ فرمایا کہ:

وَ لَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔ (اور اس کے لیے جو صبر کرے اور بخش دے، بیشک یہ بات ہے عزم کے امور میں سے)

بتایا کہ پہلا یعنی مکافات اور بدلہ کا مسئلہ یہ ہے کہ حق کے ساتھ مدد لینا عدل ہے اور عدل اچھی بات ہے۔ اور دوسرا یعنی معاف کر دینا اور صبر کرنا فضیلت کی بات ہے اور یہی احسان ہے۔

فرمانِ خداوندی ہے کہ:

اَلَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَ اُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ[1]۔ (جو سنتے ہیں بات، پھر چلتے ہیں اس کے نیک پر، وہی ہیں جن کو راہ دی اللہ نے، اور وہی ہیں عقل والے)

چنانچہ قول سننا عدل ہے اور عدل اچھی بات ہے اور یہی انتصار (بالحق) ہے اور معاف کرنا بہت ہی احسن ہے۔ اس میں ہدایت وعقل پر مدح ہے اور محبین کا یہی مقام ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن پر ظلم نہیں کیا جاتا۔ اور اگر کوئی زیادتی کر بیٹھے تو یہ انتقام نہیں لیتے۔ چنانچہ اس مقام والے کی مدح اخبات سے کی یعنی یہ لوگ خشوع وطمانیت اختیار کرتے ہیں اور آخرت میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے حسنِ جزا چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ قربِ لقاء کا باعث ہے اور دنیا تیزی سے فنا ہونے والی ہے اور یہی طریق سب سے زیادہ قابلِ مدح ہے جیسے کہ فرمایا:

وَ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ۔ (اور قیامت مقرر آنی ہے۔ پس کنارہ پکڑ اچھی طرح کنارہ)

تقویٰ وصبر کا باہمی تعلق ہے

تقویٰ اور صبر دونوں جدا جدا مفہوم ہیں اور یہ ایک دوسرے سے وابستہ و متعلق ہیں۔ ان میں سے ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ جس کو مقامِ تقویٰ حاصل ہو، وہ حالِ صبر میں ہے۔ اب اس حیثیت سے

---

[1] الزمر آیت ۱۸۔

کہ تقویٰ اعلیٰ ترین مقام ہے۔ صبر بھی اعلیٰ ترین حال ہُوا۔ کیونکہ سب سے زیادہ متقی ہی اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت ہے اور خدا تعالیٰ کی نظر میں سب سے باعزت ہی سب سے افضل ہے۔

اللہ تعالیٰ نے صبر کو فضیلت دی کہ صبر کا حکم کر کے اسے اپنی طرف منسوب فرمایا:

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ (اور صبر کر اور اللہ کی مدد کے بغیر تیرا صبر نہ ہوگا)

اور فرمایا:

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ۔ (اور اپنے رب کی خاطر صبر کر)

اگرچہ ہر چیز اسی کے ذریعہ ہوتی ہے اور ہر عمل اسی کے لیے کیا جاتا ہے مگر اللہ تعالیٰ صرف اسی صورت میں کسی بندے کی تعریف فرماتا ہے کہ جب اسے صبر میں ڈال آزمائے اب اگر اس نے صبر کیا اور ابتلاء سے کامران ہو کر نکلا تو اس کی تعریف و توصیف کی جاتی ہے ورنہ اس کا دعوائے تقویٰ جھوٹ ثابت ہو گیا۔

حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا:

"افضل ترین عمل کون سا ہے؟"

فرمایا: "ابتلاء کے وقت صبر کرنا۔"

بعض علماءؒ کا فرمان ہے:

"اور صبر سے افضل بات ہو بھی کیا سکتی ہے۔ دیکھیے اللہ نے اپنی کتاب مقدس میں نوے سے زیادہ بار اس کا ذکر فرمایا اور صبر کے علاوہ ہماری دانست میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کا اس قدر کثرت سے ذکر فرمایا ہو۔ اس لیے ابتلاء میں پڑنے اور اس میں صبر کرنے سے انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تعریف کی چاہت نہ کرے۔ تو وہ بُرے انجام سے قطعی محفوظ نہیں ہے۔ یہ عادۃ اللہ ہے کہ جب وہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے اور اس کے عمل کو پسند فرماتا ہے تو اس کی تعریف و توصیف فرماتا ہے۔ اب جس کو اس نے کسی ناپسند حال یا سختی یا خواہش یا شہوت میں مبتلا کیا اور اس نے اس میں صبر و استقلال سے کام کیا تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کی تعریف و توصیف فرماتا ہے اور یہ بندہ اسمائے موصوفین و ممدوحین میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس وقت اس کے قدم لغزش سے محفوظ ہو جاتے ہیں اور گزشتہ اعمالِ صالحہ کی برکت سے اس کا انجام بخیر ہو جاتا ہے۔

ایک صبر یہ ہے کہ کشائش اور عافیت کی زندگی میں (نیکی) پر صبر و استقامت رکھے اور عافیت آنے پر وہ غلط راہ پر چل پڑے اور ثروت کے زمانہ میں صبر کرے یعنی خواہشِ نفس میں مال خرچ نہ کرے اور نعمت پر صبر کرے یعنی اس کے ذریعہ نافرمانی نہ کرے۔ اس مفہوم میں مسلمان کو صبر کی ضرورت اس طرح ہے جیسے کہ شدائد و فقر پر اور آفات و مصائب پر اُسے صبر کی ضرورت ہے۔

مشائخ فرمایا کرتے ہیں:

"مومن ابتلاء و فقر دونوں پر صبر کر لیتا ہے مگر عافیتوں میں صبر سے کام لینا صدیقین کا کام ہے"۔

عافیت میں صبر کرنا دشوار تر ہے

حضرت سہلؒ فرمایا کرتے:

"عافیت پر صبر کرنا، ابتلاء پر صبر کرنے سے زیادہ دشوار ہے۔ جب دنیا کی فراخی ہوئی اور صحابہؓ کو دنیا کی وسعت و فراوانی حاصل ہوئی تو انہوں نے فرمایا:

"ہمیں اچانک سختی کا سامنا کرنا پڑا مگر ہم نے صبر کیا اور اب ہم پر آسائش کی ابتلاء آئی تو ہم نے صبر نہ کیا"۔
چنانچہ اس طرح انہوں نے آسائش کے فتنہ کو سختی پر صبر سے زیادہ دشوار قرار دیا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ۔ (جو خرچ کرتے ہیں فراخی اور تنگی میں)

چنانچہ مختلف حالات میں خرچ کرنے پر یعنی ایک ہی وصف پر رہنے کے باعث ان کی تعریف فرمائی۔ اس لیے کہ ان کا یقین درست ہے اور ان میں سخاوت و حقیقتِ صبر پائی جاتی ہے۔ اسی مفہوم میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَاۤ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ (اے وہ جو ایمان لائے تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ بنا دیں)

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں انسان مصروف و مسرور رہ کر ذکرِ الٰہی سے غافل ہو جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَ اَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ۔ (بے شک تمہاری بیویوں اور تمہاری اولاد میں سے (بعض) تمہارے دشمن ہیں سو ان سے بچو)

اس لیے کہ بیویوں اور اولاد میں انسان کو فرحت حاصل ہوتی ہے اور پھر خواہشِ نفس میں ان کی موافقت اور اپنے مولائے کریم کی نافرمانی کر بیٹھتا ہے۔ اس لیے کہ دونوں ہی آخرت میں دشمن ہوئے۔ اس لیے کہ یہ حالت ان دونوں کے پاس واقع ہوئی۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مروی ہے:

جب آپؐ نے اپنے لختِ جگر حضرت حسنؓ کو قمیص میں گرتے گرتے چلتے دیکھا تو آپؐ منبر سے اُترے اور اُنہیں گود میں لے کر فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا: کہ

اِنَّمَا اَمْوَالُکُمْ وَ اَوْلَادُکُمْ فِتْنَۃٌ"۔ (بیشک تمہارے اموال اور تمہاری اولاد فتنہ (ابتلا) ہیں)
یعنی جب میں نے اپنے اس بیٹے کو دیکھا تو مجھ سے نہ رہا گیا اور اسے اٹھا لیا۔ اس واقعہ میں اہلِ بصیرت
کے لیے عبرت کا سامان ہے۔

اب جس انسان نے کشائش یعنی عافیتوں، غنا، اور اولاد وغیرہ کے موجود ہونے کے باوجود (تقویٰ و زہد
اختیار کرکے) صبر کیا۔ ہر ایک کو اس کا حق دیا اور ہر چیز اس کے حق وضع میں رکھی تو وہ آدمی صبر کرنے والوں اور
اور شکر کرنے والوں میں سے ہے۔ حقیقی رضا و شکر کے بغیر اہل ابتلا اور اہل فقر اس سے نہیں بڑھ سکتے۔ اسی
طرح اللہ تعالیٰ نے مسرت و تنگی کو جمع فرما دیا اور ان دونوں سے متصف ہونے کو محمود قرار دیا۔ چنانچہ فرمایا:

اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ الْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَ الْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ وَ اللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ[1] (تیار ہوئی ہے واسطے پرہیزگاروں کے جو خرچ کیے جاتے ہیں خوشی میں اور تکلیف میں، اور دبا لیتے ہیں غصہ اور معاف کرتے ہیں لوگوں کو اور اللہ چاہتا ہے نیکی والوں کو)

آفات پر صبر

مصائب و پریشانیوں کو پوشیدہ رکھنا اور حرفِ شکایت زبان پر نہ لانا بھی صبر کی ایک قسم ہے۔ یہ صبر جمیل کہلاتا ہے۔ صبر جمیل کی ایک تعریف یہ کی گئی کہ:

"جس میں حرفِ شکایت زبان سے نکالا جائے اور نہ ہی اس تکلیف کا اظہار کرے۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے:

"قرآن میں صبر تین طریق کا مروی ہے:
۱۔ اللہ تعالیٰ کے لیے ادائیگی فرض پہ صبر و استقلال دکھانا۔
۲۔ اللہ تعالیٰ کے محرمات سے پرہیز پہ صبر کرنا۔
۳۔ پہلے صدمہ کے موقع پر مصیبت میں صبر کرنا۔

چنانچہ جس نے ادائیگی فرض پر صبر کیا اس کے لیے تین سو درجات ہیں اور جس نے اللہ تعالیٰ کے محرمات سے پرہیز کرکے صبر کیا۔ اس کے لیے چھ صد درجات ہیں۔ (یعنی حرام سے بچتا رہا)۔ اور جس نے پہلے صدمہ کے موقع پر مصیبت میں صبر کیا۔ اس کے لیے نو سو درجات ہیں۔ البتہ یہ وضاحت طلب کلام ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اس وجہ سے مصیبت سے صبر کو افضل نہیں بتایا کہ یہ محارم سے صبر اور فرائض پہ

---

[1] آل عمران۔ آیت ۱۳۴۔

صبر سے افضل ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں پر صبر کرنا، مقام اہل اسلام ہے اور مصیبت پر صبر کرنا، مقاماتِ یقین میں سے ہے اور مقام اسلام پر مقامِ یقین کو افضلیت حاصل ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے

اَسْاَلُکَ مِنَ الْیَقِیْنِ مَا تُھَوِّنُ بِہٖ اِلَیَّ مَصَائِبَ الدُّنْیَا۔ (میں آپ سے وہ یقین مانگتا ہوں کہ جس کی برکت سے مجھ پر مصائبِ دنیا آسان ہوجائیں)

چنانچہ سب سے بڑا صابر ہی مصائب کے موقع پر سب سے زیادہ صاحبِ یقین ہوتا ہے اور مصائب میں سب سے زیادہ واویلا اور شور مچانے والا سب سے کمتر یقین کا آدمی ہوتا ہے۔

حضرت سلمہ بن وردان نے حضرت انس بن مالک سے اور انہوں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کی روایت نقل کی ہے۔ فرمایا:

"جس نے ریاء ترک کی اور وہ اس کا اہل تھا۔ (یعنی قابلِ فخر تھا) تو اس کے لیے جنت اعلیٰ میں مکان بنایا گیا اور جس نے ریاء ترک کی حالاں کہ وہ غلط تھا۔ (یعنی ناقابلِ فخر تھا) اس کے لیے درمیان کی جنت میں مکان بنایا گیا اور جس نے جھوٹ چھوڑ دیا اس کے لیے۔ اور یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ غلط دکھاوا چھوڑنا اور جھوٹ سے پرہیز سب سے زیادہ لازم ہے۔ اس لیے ان دونوں کو افضل ہونا چاہیے تھا مگر بات یہ ہے کہ جھوٹ اور غلط دکھاوا تو مسلمان چھوڑ ہی دیا کرتے ہیں۔ مزہ جب ہے کہ کچھ دکھاوے کے قابل چیز ہو پھر بھی اسے چھوڑ دے۔

اب بندے کو کچھ دکھاوے کے قابل چیز حاصل بھی ہو پھر بھی وہ اظہار کرنے میں زہد کرے اور خاموشی اور سلامتی کو ترجیح دے تو ایسا صبر اس میں صرف اہل یقین دکھا سکتے ہیں اور یہی خواص اہل ایمان ہوتے ہیں۔ اس کا مقام، مقامِ یقین و زہد ہے اور یہ کلام پر خاموشی و سکوت کو ترجیح دینا ہے اور اس کی خواہش افضل بات ہے اور اس کی خواہش افضل بات ہے اور یہ یقین میں سے ہے۔ اس طرح اس مومن کا مقام ان عام مومنین سے بلند تر ہے کہ جو کذب و ریا چھوڑتے ہیں۔ چاہے یہ دونوں زیادہ فرض یا زیادہ واجب ہی ہوں۔ یہی اس کی وضاحت و تشریح ہے۔

اعمالِ خیر کو مخفی رکھو

ایک صبر یہ ہے کہ اعمالِ خیر کو مخفی رکھے اور نفس کو ان اعمال کے جگہ جگہ ذکر کر کے خوش ہونے اور مزے لینے سے بچائے۔ نیکی اور صدقات کا ذکر نہ کرے۔ اس لیے کہ اگرچہ کہ اعلان میں بھی سود مندی ہوتی ہے اور بتانے میں بھلائی پر دوسروں کو آمادگی ہوتی ہے مگر ان کے اخفاء میں ادب و ثواب زیادہ ہے اور ان کا مخفی رکھنا سب سے افضل اور اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے۔

بلکہ نیکی کے خزانے تو تین ہیں:

ا۔ تکالیف کا پوشیدہ رکھنا۔

۲۔ مصائب کا مخفی رکھنا۔

۳۔ صدقہ کو مخفی رکھنا۔

یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ تینوں باتیں اعلیٰ ترین ذخائر میں سے ہیں۔

افلاس کا اخفاء

فقر پہ صبر کرنا اور فقر کو چھپانا بھی صبر ہے اور فاقے آنے پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے اس امتحان میں صبر کرنا اہل رضا زاہدین کا حال ہے۔ افضل صبر یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے لیے مجالست پر اور اسی کی طرف دھیان پر صبر کرے۔ اس کا فکر رکھے اور اسی کے ساتھ قوت وجد پائے۔ یہ تو اص مقربین کا صبر ہے یا اس سے حیا کرتے ہوئے یا اس کی محبت کی خاطر یا تسلیم و رضا کے باعث یا تفویض و سپردگی کے طور پر صبر کرے۔ تفویض کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو قضاء و قدر کے حوالے کر دے اور انعامات کا مشاہدہ کرے اور ان میں پرسکون رہے نیز ابتلا کے موقع پر میانہ روی اختیار کرے اور معاملہ پڑنے اور اس میں کی حکمت میں حسن تدبیر اختیار کرے۔

اور یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں داخل ہے کہ:

وَ لِرَبِّكَ فَاصْبِرْ۔ (اور اپنے پروردگار کی خاطر صبر کر)

اور فرمایا:

وَ اصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا۔ (اور اپنے رب کے حکم کے لیے صبر کر، پس بیشک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے)

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے ائمہ" فرماتے ہیں:

"میری سیر یوں ہوئی کہ مجھے صرف مقاماتِ قدر میں (تفویض میں) ہی مسرت ہوتی ہے" اور ایک جگہ "صرف انتظارِ قضا میں مسرت" بھی مروی ہے۔"

مشائخ فرماتے ہیں:

"یقین کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ حسن صبر و رضا کے ساتھ قضاء کو تسلیم کرلے"۔ اور یہ عارفین کا مقام ہے۔

متوکلین کا صبر

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قول کا مفہوم بتاتے ہوئے حضرت سہل نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ ہر سونے والے (قضاء پر راضی و پرسکون) بندے سے محبت رکھتا ہے"

حضرت سہل نے بتایا:

"اس سے مراد احکامِ قضاء میں پر سکون رہنے والے بندے مراد ہیں جو کہ کراہت و اعتراض نہ کریں۔"
حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان میں پہلے صدمہ کے موقع پر صبر کی شرط تھی؛ "صبر تو پہلے صدمہ کے موقع پر ہی ہوتا ہے۔" اس لیے کہ مشائخ فرماتے ہیں کہ مصیبت کے علاوہ ہر چیز آغاز سے چھوٹی ہوتی ہے اور مصیبت آغاز سے بڑی ہو کر آتی ہے پھر چھوٹی ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ چھوٹی ہونے سے پہلے بڑی آفت ہونے کے موقع پر زیادہ ثواب مشروط کیا اور یہ وہ موقع ہے کہ حبیب اچانک آفت کا سامنا کرنے سے دل کو صدمہ سہنا پڑے اور اس وقت وہ اللہ تعالیٰ کی نگاہِ کرم پر دھیان کرتا ہے اور اسے حیاء آتی ہے۔ اس لیے حسنِ صبر سے کام بنتا ہے۔ جیسے کہ فرمایا:

فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا۔ (پس بیشک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے)

اور یہ متوکلین کا مقام ہے۔

محبین کا صبر

کرامات ظاہر کرنے اور قدرت و نشانات آشکارا کرنے کی باتوں کو مخفی رکھنا اور صبر کرنا بھی حسنِ ادب میں داخل ہے اور یہ اللہ تعالیٰ سے حیاء کے مفہوم میں داخل ہے اور یہ محبین کا طریق ہے اور یہی حقیقی زہد ہے۔

مدح خواہی اور حمد و اقتدار کی چاہت سے نفس کو روکنا بھی صبر کی خصوصیات میں سے ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مقطوع روایت ہے کہ:

"صبر کی تین اقسام ہیں:

۱۔ تزکیۂ نفس سے صبر کرنا۔

۲۔ مصیبت پر شکوہ کرنے سے صبر کرنا۔

۳۔ خیر و شر پر قضائے الٰہی پر راضی رہ کر صبر کرنا۔"

تواضع اور انکساری پر اس نیت سے قایم رہنا صبر ہے کہ دنیا پر آخرت کو ترجیح دے کر اللہ تعالیٰ کی جانب لپک کر، وصفِ عبودیت قائم کرنے، اوصافِ ربوبیت کے مفاہیم سے تشبہ حاصل کرنے، خدا کے احکام پر تسلیم رضا کی خاطر تواضع و انکساری پر قایم رہ کر صبر دکھائے۔ چنانچہ بے صبری کی وجہ سے کچھ قابلِ مواخذہ کام نہ کرنا ورنہ ثابت قدمی کے بعد لغزش کھا جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں سے پناہ میں رکھے۔

اہل و عیال کے لیے روزگار کرنے اور ان پر خرچ کرنے میں صبر و استقلال سے کام لینا بھی صبر ہے جبکہ ان سے ایذاء کا بھی احتمال ہے۔ اس لیے کہ اہل و عیال بھی ایک طریق الی اللہ ہے۔ ان کی ضروریات کا اہتمام صبر کا ادنیٰ درجہ ہے اور اللہ پر راضی رہنا اور توکل کرنا اعلیٰ درجہ ہے۔ خرچ کرنا اور اس پر نفس کو مطمئن رکھ کر روکنا متوسط

درجہ ہے۔

یہ یاد رکھیے کہ عام طور پر دو باتوں میں لوگ گناہ کیا کرتے ہیں :

۱۔ جن سے محبت ہو ان سے صبر کی کمی۔

۲۔ یا جن باتوں کو ناپسند کرے ان پر صبر کی کمی۔

اللہ تعالیٰ نے بھلائی کے ساتھ کراہت اور شر کے ساتھ محبت کو مقارن کرکے بیان کیا۔

وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ۔ (اور شاید تم کو بری لگے ایک چیز اور وہ بہتر ہو تم کو اور شاید تم کو خوش لگے ایک چیز اور وہ بری ہو تم کو)

صبر کی حدود اس کا آغاز فرض ہے جیسے کہ شروع میں اخلاص فرض ہوتا ہے۔ مزید برآں جس کے سامنے کچھ راہ نہ ہو اس کے لیے صبر ایک راہ ہے کیونکہ جب دوسرے کے ہاتھ میں معاملہ ہو تو صبر کے سوا چارۂ کار نہیں۔ اور جب ایک چیز تھوڑی تھوڑی مقدار میں مل رہی ہو اور تجھے اس کی ضرورت ہو تو اس پر صبر کے سوا کوئی راہ نہیں ورنہ یہ بھی ختم ہو جائے گی اور صبر اس وقت کم ہوتا ہے جب کہ صابر کے لیے حسن جزا پر یقین کمزور پڑ جائے۔ اس لیے کہ اگر یقین مضبوط ہو تو انسان وعدہ کو بھی موجود کی طرح پختہ سمجھتا ہے اور پھر عطیہ ملنے پر یقین کے باعث حسن صبر سے کام لیتا ہے۔

صبر مفروض و مسنون بندہ دو طرح ہی صبر کیا کرتا ہے :

۱۔ معاوضہ کا مشاہدہ حاصل کرکے صبر کرے۔ یہ ادنیٰ ترین درجہ ہے اور یہ عام مومنین کا حال اور اصحاب یقین کا مقام ہے۔

۲۔ یا معاوضہ دینے والے کی جانب نظر کرکے صبر کرے۔ یہ اہل یقین کا حال اور مقربین کا مقام ہے۔ اب جس نے معاوضہ کو دیکھا۔ وہ صبر کرے گا اور جس نے معاوضہ دینے والے کی جانب نظر رکھی اسے یہ نظر ہی ایسا کرنے پر آمادہ کرے گی۔

بعض عارفین نے صبر کے تین مفاہیم بتائے کہ یہ تین مقامات والوں میں ہوتا ہے۔ فرمایا :

۱۔ اس کا آغاز ترکِ شکوی سے ہوتا ہے اور یہ تائبین کا درجہ ہے۔

۲۔ مقدور پھر راضی ہو جائے اور یہ زاہدین کا درجہ ہے۔

۳۔ مولائے کریم اس کے ساتھ جو کر رہا ہے اس سے محبت رکھے۔ یہ صادقین کا درجہ ہے۔

سلف صالحینؒ نے بھی صبر کی تین اقسام بتائی ہیں :

حضرت حسنؒ وغیرہ سے مروی ہے :

"صبر کے تین مفاہیم ہیں :

۱۔ نافرمانی سے صبر کرنا۔ اور یہ افضل ترین ہے۔

۲۔ طاعت و نیکی پر صبر کرنا۔

۳۔ مصائب پر صبر کرنا۔"

ہم نے صبر کے جو مفاہیم بتلائے ہیں یہ ان میں داخل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو مفروض اور مفضول ہے۔ احکام کی معرفت سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ جس صبر کے لیے امر حکم دیا جائے یا واجب بتایا جائے تو اس پر صبر کرنا لازم ہے یا اس سے صبر کرنا فرض ہے۔ جو کام مندوب و مستحب ہو اور اس پر آمادہ کیا جائے تو اس پر یا اس سے صبر افضل بات ہے۔ اور صبر کے علاوہ صبر کی کوشش کرنا مجاہدہ نفس ہے۔ اسے صبر کی ترغیب دینا، صبر کے لیے کام کرنا ہے اور صبر کے لیے کام کرنا زہد کے بمنزلہ ہے۔ یعنی اسباب زہد جمع کرے تاکہ زہد حاصل ہو جائے اور صبر یہ ہے کہ وصف صبر حاصل ہو جائے اور یہی مقام (صبر) ہے۔ نفسانی کراہت اور درد و الم محسوس کرنے سے انسان صبر کی حدود سے خارج نہیں ہوجاتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ بھی وہ صابر رہتا ہے اس لیے کہ یہ بشری صفات ہیں۔ البتہ اس کا حال یہ ہونا چاہیے کہ شکوی سے منہ بند رکھے اور آقائے کریم کے حکم پر برہمی کا اظہار نہ کرے کیوں کہ ایسی باتوں کے فقدان کا نام ہی رضا و توکل ہے۔ اور یہ دونوں مقامات یقین میں سے اعلیٰ ترین مقام ہیں۔ البتہ مراتب یقین کے فقدان سے وہ حدود صبر سے خارج نہیں ہوتا جو چیز صبر سے خارج کرتی ہے وہ اس کی ضد ہے یعنی جزع فزع کرنا، اظہار برہمی، کثرت شکوی، اور برے الفاظ منہ سے نکالنا ہی انسان کو صبر سے خارج کرتا ہے۔

صبر کی مشق

نفس کو صبر پر آمادہ کر کے مشق کرانا، مقام متصبرین اور ضعیف طبع سالکین کا حال ہے۔ جب نفس امارہ تجھے شہوات کی طرف لے جانے کی کوشش کرے یا تیرا نفس مجھے پرانی غلط روی پر لے جانے کی ترغیب دے۔ چنانچہ اس کی بات نہ ماننے۔ فاقہ دے کر اسے رام کرے تاکہ غلط شہوتوں سے وہ کنارہ کش ہو جائے۔ اب اگر تو نے اسے نہ دے کر اور حلال سے بھی صبر دلا کر راضی کر لیا اور لگام دے لی تو تم عاجل عوض کے بدلے ترک شہوت کرنے والا ہوا اور اسے فاقہ دے کر فضول شہوت سے صبر کرنے والا بن گیا۔ یہ بات ابواب ریاضت میں سے ایک بہت بڑا دروازہ ہے۔ جو لوگ قوی ہیں اور ان کے نفوس صبر و صلاۃ اور بھوک پیاس پر آمادہ نہیں ہوتے۔ اگر وہ صبر کریں تو ان کے لیے بڑی فضیلت ہے مگر تیسرے طبقہ کے کمزور لوگ جو کہ پہلے دو طبقات یعنی اہل صوم وصلاۃ میں سے نہیں ہیں اور نہ ہی ان میں سے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ ان کے نفوس، ضرورت سے صبر نہیں کرتے۔ جیسے کہ ان کے نفوس شہوت سے صبر نہیں کرتے۔

ان کی ریاضت و مشق کا طریقہ یہ ہے کہ انہیں ہر حرام سے الگ کیا جائے۔ بلکہ بعض اس حلال سے بھی ہٹایا جائے جس کا مفہوم حلال سے بھی ہو اور ہر مہلک شہوت سے دور رکھا جائے کہ جس کا وصف معتدل شہوت ہو، تاکہ ان کے نفوس جکڑ کر محرمات سے کٹ جائیں اور ان کی مہلک شہوات کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے۔ کمزور طبع لوگوں کے نفوس اس طریق پر مطمئن ہو سکتے ہیں۔

صبر و شکر میں افضل کیا ہے؟

صبر و شکر میں لوگوں کا اختلاف ہے کہ ان میں سے افضل کون سا ہے؟ مگر ان میں سے کسی مقام کی ترجیح ممکن نہیں۔ اس لیے کہ ہر مقام میں متفاوت طبقات ملتے ہیں۔

اہلِ تحقیق عارفینؒ کا فرمان ہے:

کسی مقام میں دو بندے برابر برابر نہیں ہیں بلکہ یہ ضروری ہے کہ ان دو میں سے ایک بندہ، علم یا عمل یا وجدان یا مشاہدہ، غرض کسی وجہ سے افضل ہو۔ چاہے صواب، قصد اور اصل کے لحاظ سے ایک ہوں اور مشاہدات وجہ کا تفاوت سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ مَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ حَدِیْثًا۔ (اور اللہ سے ہے سچی کس کی بات؟)

وَ لِکُلٍّ وِّجْھَۃٌ ھُوَ مُوَلِّیْھَا۔ (اور ہر کسی کو ایک طرف ہے کہ منہ کرتا اس طرف)

اور فرمایا:

قُلْ کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ فَرَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ ھُوَ اَھْدٰی سَبِیْلًا۔ (تو کہہ، کام کرتا ہے اپنے طریق پر، سو تیرا رب بہتر جانتا ہے۔ کون خوب ہدایت پر ہے راہ کے)

اس کی وضاحت یہ کی گئی کہ سب سے معتدل اور قریب تریں راہ۔ اور کتاب و سنت کے ظاہری الفاظ بھی صبر کو افضل تریں بتلاتے ہیں۔

اللہ تعالےٰ نے فرمایا:

یُؤْتَوْنَ اَجْرَھُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا۔ (دیے جاتے ہیں اجر ان کا دوگنا بوجہ اس کے کہ صبر کیا)

چنانچہ شاکر کو اس کا اجر ایک بار ملتا ہے (اور صابر کو دو بار) چنانچہ مقامِ صبر، مقامِ خوف سے زیادہ مشابہ ہے اور مقامِ شکر مقامِ رجاء سے زیادہ مشابہ ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ جَنَّتٰنِ۔ (اور جو کوئی ڈرا کھڑا ہونے سے اپنے رب کے آگے۔ اس کو

ہیں دو باغ)

عارفین کا اس پر اتفاق ہے کہ رجاء پر خوف کو افضلیت حاصل ہے اور اس طرح عمل پر علم کو بالاتفاق افضلیت حاصل ہے۔ چنانچہ صبر، مقامِ خوف سے ایک حال ہے اور صابر کے حال کو فضیلت ہیں اس سے قرب حاصل ہے اور شکر مقامِ رجا کا ایک حال ہے۔ اسی طرح شاکر کا حال اس کے قریب تر ہے۔

اسی طرح حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مذکور ہے کہ :

"تمہیں قلیل ترین چیز جو دی گئی وُہ یقین اور عزیمتِ صبر ہے اور جس کو ان دو میں سے حصّہ ملا وُہ کچھ پروا نہ کرے کہ اس سے کیا رہ گیا۔" اب اس میں آپؐ نے صبر کے ساتھ ملا کر یقین کا ذکر فرمایا کیوں کہ اس سے بڑھ کر اعلیٰ چیز کوئی نہیں اور اعمال و یقین کو رخصت بھی اس سے حاصل ہوتی ہے :

حضرت ایوب علیہ السلام کی مناجات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں وحی فرمائی :

" اے ایوبؑ ! میں نے اپنی ذات کی قسم کھائی کہ میں صابرین کے لیے دیوانِ توبیخ نہ کھولوں گا ، نہ ہی وہ حدِ صراط کی طرف دیکھیں اور نہ ہی میزان کی کمی سے میں ان پر گھبراہٹ طاری کروں گا۔ ان کا گھر، سلامتی کا گھر (دارالسلام) ہے۔"

صبر کی ایک خاص فضیلت

صبر کرنا ابتلاء کا ایک حال ہے اور شکر کرنا نعمت کا ایک حال ہے اور ابتلاء افضل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ نفس پر یہ شاق گزرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّٰبِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ ۔ (صبر کرنے والوں کا اجر بغیر حساب کے پورا کیا جائے گا)

چنانچہ شکر گزار کو حساب کے ساتھ اجر ملے گا اور صبر کرنے والوں کو بغیر حساب اجر ملے گا۔ اس لیے کہ انما کا لفظ وصف کے وقوع اور غیر کی نفی کے لیے ہوتا ہے۔

صبر کے چار ستون

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے چار مقاماتِ یقین میں سے بالاتر بنایا اور ان چار کو اس کے ستون قرار دیا۔ چنانچہ فروعاتِ ایمان بتلاتے ہوئے فرمایا :

" صبر کے چار ستون ہیں :

۱۔ شوق

۲۔ شفقت (ڈر)

۳۔ زہد

۴۔انتظار۔

چنانچہ جو آگ سے ڈرا وہ محرمات سے دُور ہو گیا اور جو آدمی جنت کا مشتاق ہُوا وہ شہوات سے سلامت رہا۔ جو آدمی دنیا میں زاہد ہُوا اس پر مصائب آسان ہو گئیں اور جس نے موت کا انتظار کیا اس نے بھلائیوں کی طرف جلدی کی۔ چنانچہ انہوں نے ان مقامات کو صبر کے ارکان بتایا۔ اس لیے کہ صبر سے یہ ہویدا ہوتے ہیں اور ان تمام ارکان میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے اور زہد کو ان میں سے ایک رکن قرار دیا۔

اللہ تعالیٰ نے صبر کو تقویٰ کا حال فرمایا اور متقی لوگوں کے لیے بلند درجات بنائے۔ چنانچہ اللہ عزوجل نے فرمایا:

اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَ يَصْبِرْ۔ (بے شک جو ڈرے اور صبر کرے)

اور فرمایا:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ۔ (بے شک تم میں اللہ کے ہاں زیادہ عزت والا، تم میں کا زیادہ پرہیزگار ہے)

چنانچہ اکرمکم المتقون سے زیادہ فوقیت اَكْرَمَ اور اَتْقٰى کو حاصل ہے۔ اس لیے کہ اَكْرَمَ اور اَتْقٰى میں بلند اور متفاوت درجہ کا پتہ چلتا ہے۔ اب جو آدمی اَتْقٰى (سب سے پرہیزگار) ہوگا وہ اللہ تعالےٰ کے ہاں اَكْرَمَ (سب سے بڑا باعزت) ہوگا اور جو آدمی اسباب تقویٰ پر سب سے زیادہ صبر و استقلال دکھائے گا وہی سب سے بڑا متقی ہوگا۔

یہ بھی یاد رکھیں کہ صبر کرنا جنت میں داخل ہونے کا سبب ہے اور آگ سے نجات پانے کا باعث ہے۔ اس لئے کہ حدیث میں آتا ہے:

"جنت کا احاطہ کیے ہُوئے ہیں ناپسندیدہ باتیں (تکالیف و محن) اور آگ کا احاطہ شہوات سے ہے۔"

چنانچہ انسان کو اس بات کی ضرورت ہے کہ تکالیف و محن پر صبر کرے اور جنت میں داخل ہو جائے اور شہوات سے بچنے پر صبر کرنے کا بھی انسان محتاج ہے تاکہ آگ سے نجات پائے۔

فضیلت کی تین اقسام

پہلی قسم گاہے صبر و شکر دو حال ہوتے ہیں اور گاہے یہ دو مقام ہوتے ہیں۔ اب جس کا مقام صبر ہو اس کا حال شکر کا ہوگا۔ یہ افضل ہے۔ اس لیے کہ یہ صاحبِ مقامِ (صبر) ہے اور جس کا مقام شکر کا ہو اور اس کا حال صبر کا ہو تو اس کا حال اس کے مقام کے لیے اضافہ کا باعث ہے۔ چنانچہ شاکر کے لیے صبر کرنا اس کے مقام میں ترقی کا سبب ہُوا۔

دوسری قسم مقربین حضرات، اصحاب یمین سے بلند تر درجہ کے مالک ہیں۔ چنانچہ مقربین میں سے صابرین کا

درجہ ان شاکرین سے بھی افضل ہے جو اصحابِ یمین میں ہیں۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ اگر شاکر اور صابر دونوں ہی اصحابِ یمین میں سے ہوں تو ان میں سے کس کا درجہ افضل ہے، تو جواب یہ ہوگا کہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ کوئی دو آدمی ہر ایک مقام ہر انداز سے برابر برابر نہیں ہوتے اس لیے کہ صفات کے تشابہ اور ذرائع کی یکسانیت کے باوجود جس طرح مختلف لوگوں کا باہم باریک ترین فرق ضرور ہو جاتا ہے۔ اس طرح خدائے لطیف کے الطاف کے مفاہیم کے ساتھ ایک بندے کو (متفاوت کرنے والی) انفرادیت ضرور حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ اس صورت میں (اصحابِ یمین میں سے صابر و شاکر میں سے) افضل ترین وہی ہے جو زیادہ صاحبِ معرفت ہو۔ اس لیے کہ وہی اللہ تعالیٰ کا زیادہ محبوب ہے اور اُسے ہی زیادہ قرب اور حسنِ یقین کا درجہ حاصل ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے عطیات میں سے یقین سب سے زیادہ قیمتی عطیہ ہے۔

تیسری قسم ہم کہتے ہیں کہ وہ صبر جو شکر کا باعث ہو وہ افضل ہے اور جس پر صبر لازم ہو اس پر شکر افضل ہے اب یہ اختلافِ احوال سے مختلف ہو جاتا ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ نفسانی مزے اور عیش و آرام سے صبر کرنا افضل تر ہے۔ اگر بندے پر انعامات ہوں تو ان سے صبر، معرفت کا ایک مقام بن جاتا ہے اور یہی افضل ہے۔ اس لیے کہ اس میں ہر طرح کا زہد ہے اور اس کی فضیلت پر اجماع ہے۔

اور ہم یہ کہتے ہیں کہ فقر و ابتلاء اور آفات و مصائب پر صبر کرنا افضل ہے۔ اگر بندے پر تنگی و ابتلا کا زمانہ ہو تو اس حالت پر شکر کرنا اس کے لیے معرفت میں ایک مقام ہے اور اس صورت میں یہی افضل ہے۔ اس لیے کہ اس میں رضائے خدا پائی جاتی ہے جس کی افضلیت پر اجماع ہے۔

صبر و صابر کی فضیلت

ایک عارف صابر، عارف شاکر سے افضل ہے اس لیے کہ صبر کرنا فقر کا حال ہے اور شکر کرنا، غنا کا حال ہے۔ اور جس نے صبر پر شکر کو مفہوم میں افضل بتایا۔ اس نے گویا فقر پر غنا کو افضل بتایا اور متقدمین میں سے کسی کا یہ مذہب نہیں بلکہ یہ علمائے دنیا کا طریق ہے۔ اس طریقہ سے انہوں نے اپنے لیے دنیا حاصل کرنے کیلئے ایک راہ نکالی اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس لیے کہ جس نے فقر پر غنا کو فضیلت دی۔ اس نے زہد پر رغبت و طلب کو فضیلت دی۔ ذلت و انکساری پر عزت و بڑائی کو تواضع پر تکبر کو فضیلت دی۔ اور اس اصول میں اہلِ رغبت اور اغنیاء کو زاہدین و فقراء پر فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ مزید برآں اس اصول سے علمائے آخرت پر دنیا داروں کو فضیلت مل جاتی ہے۔ مگر ہم نے ہر ہر مرحلہ پر اور معنی میں بھی صبر کو شکر سے افضل بتایا۔ اس لیے کہ صبر دراصل مقامِ ابتلاء کا ایک حال ہے اور اہلِ ابتلاء ہی انبیاء علیہم السلام کے دوسروں سے زیادہ مماثل ہیں۔

نیز صبر کرنا، خواہشاتِ نفسانی سے دُور رہنا اور تنگی و شدت کے قریب رہنا ہے اور یہ بات نفوس پر بڑی شاق اور طبیعت پر بار گزرتی ہے اور سہولت کے برعکس تر بات ہے۔ اب جب وہ اس حالت پر پُرسکون و مطمئن ہُوا تو اس کی مدح سکون و طمانیت سے ہُوئی اور یہ راضی ہو گا۔

مزید برآں اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے کا حکم دیا اور اس میں مبالغہ فرمایا اور اس میں تاکید فرمائی:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا۔ (اے ایمان والو! ثابت رہو اور مقابلے میں مضبوطی کرو اور لگے رہو)

ایک قول میں یہ ہے کہ دونوں پر استقلال رکھو۔ یہ ایک ہی جگہ میں صبر کے معنی سے تین امور ہیں اور اس سے صبر کی عظمت اور اس کی محبت الٰہی کا پتہ چلتا ہے۔ اب جس کو صبر سے حصہ ملا وہ شعائر اللہ کی سب سے زیادہ تعظیم کرنے والا ہو گا اور جو آدمی شعائر اللہ کی عظمت کا خیال رکھے وہی اللہ سے ڈرنے والا اور زیادہ متقی ہے اور جو سب سے زیادہ متقی ہو وہی خدا تعالیٰ کے نزدیک زیادہ باعزت ہے۔ اس لیے کہ فرمایا:

وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ۔ (اور جو کوئی ادب رکھے اللہ کے نام لگی چیزوں کا سو وہ دل کی پرہیزگاری سے ہے)

پھر فرمایا:

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ۔ (بے شک مقرر عزت اللہ کے ہاں اس کی بڑی، جس کا ادب بڑا)

اس کے علاوہ اصحاب عزم مرسلین علیہم السلام کا صبر بھی ایک مقام ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے اقتداء کرنے کا حکم دیا اور اللہ تعالیٰ نے ان پر فخر فرمایا۔ چنانچہ فرمایا:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ۔ (سو تو صبر کر، جیسے صبر کیا ہمت والے رسولوں نے)

کیونکہ دین میں عزائم کا درجہ رخصتوں پر فوقیت رکھتا ہے۔

حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ نے حبیب بن ابی ثابتؓ سے مروی ہے۔ فرمایا کہ مسلم بطین سے پُوچھا گیا کہ "صبر اور شکر میں سے کون سا افضل ہے؟"

انہوں نے جواب دیا کہ "صبر و شکر اور عافیت ہمیں زیادہ پسندیدہ ہے۔"

ا۵ آل عمران آیت ۲۰۰۔

اس فرمان اَلَّذِیْنَ یَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَیَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ کی تشریح میں فرمایا کہ اس سے مراد اس کے شدائد و عزائم ہیں۔ اس لیے کہ دنیا میں سے حلال چیز اچھی ہے اور اس میں زہد اختیار کرنا سب سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صبر کو عزائم میں سے بنایا۔ فرمایا:

وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔ (اور اگر تم صبر کرو اور پرہیزگاری کرو تو یہ بات ہمت کے کاموں میں سے ہے)

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو شکر میں شریک بنایا اور صبر کو اپنے لیے علیحدہ بیان فرمایا۔ اب مفرد کیلیے مفرد، مشترک یا عبد سے اعلیٰ ہونا ہی موزوں ہوا۔ چنانچہ فرمایا:

اَنِ اشْكُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْكَ۔ (یہ کہ شکر کر میرا اور اپنے والدین کا)

اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس پر فرمایا:

"جس نے لوگوں کا شکر ادا نہ کیا اس نے اللہ کا شکر ادا نہ کیا۔" اور صبر میں کسی مخلوق کو شریک نہیں کیا۔ فرمایا:

وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ۔ (اور اپنے رب کے لیے صبر کر)

ایک جگہ فرمایا:

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ۔ (اور اپنے رب کے حکم کے لیے صبر کر)۔

صبر کے ضمن میں شکر موجود ہے

یہ بھی یاد رکھیے کہ صبر میں شکر داخل ہے اور صبر در اصل شکر کو جامع ہے۔ اس لیے کہ جس نے صبر کیا کہ وہ کسی نعمت کے ساتھ خدا کی نافرمانی نہ کرے گا تو اس نے اس نعمت کا شکر بھی ادا کر دیا اور جس نے اللہ کی اطاعت کی اس نے اطاعت پر اپنے نفس کو صابر بنایا۔ اس نے اس کی نعمت کا شکر بھی ادا کر دیا۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ:

"شکر گزار غنی اور صابر فقیر میں سے کون سا افضل ہے؟"

فرمایا: "غنی کی مدح اس لیے نہیں کہ دولت پائی گئی اور فقیر کی مدح عدم (سرمایہ) سے نہیں ہے بلکہ دونوں میں ان پر لازم واجبات کے قیام کے باعث مدح ہوتی ہے۔ اب غنی آدمی واجبات ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اطمینان، لذت اور تنعم بھی حاصل کر رہا ہے مگر فقیر آدمی واجبات ادا کرنے کے ساتھ ساتھ دکھ درد کی زندگی بھی گزار رہا ہے۔ اس لیے تنعم و لذت کی حالت میں واجبات ادا کرنے والے سے دکھ درد کی حالت میں واجبات ادا کرنے والا زیادہ کامل حال کا مالک ہے۔" البتہ حضرت ابو العباس بن عطاءؒ نے اس سے

اختلاف کیا ہے۔

بتاتے ہیں کہ حضرت جنیدؒ نے ان کے لیے بددعا کی تو ان پر ابتلا آیا۔ اولاد قتل ہوئی۔ مال برباد ہوا، اور عقل جاتی رہی۔ چودہ برس تک یہ حالت رہی۔ چنانچہ وُہ کہا کرتے:

"جنیدؒ کی بددعا سے مجھ پر یہ ابتلا آیا۔ اس کے بعد انہوں نے فقر پر غنا کو ترجیح دینے کے قول سے رجوع کر لیا اور فقر کو زیادہ افضل و اشرف قرار دینے لگے۔"

حدیث میں آتا ہے:

"تم میں سے اپنے نفس کو زیادہ پہچاننے والا اس سے زیادہ آگاہ ہے کہ جس کا اسے اس سے ابتلا آیا، اور جس کے ساتھ اسے اس سے مبتلا کیا گیا۔"

چنانچہ ہم پر سب سے بڑا ابتلا یہ ہے کہ ہمیں اس کی محبت ہے اور اس کی عداوت سے ہمارا امتحان ہو رہا ہے۔ اب جو اپنے دشمن کے خلاف محنت صبر سے کرتا ہے۔ جبکہ وُہ خدا کا بھی دشمن ہے۔ اس لیے کہ وُہ صفاتِ ربُوبیت سے منازعت کرتا ہے تو وہی افضل تر ہے اور اس سے زیادہ ابتلا میں کون ہے کہ جو تیری عداوت اور اس کی محبت کے امتحان میں ڈال دیا گیا اور تیری حالت یہ ہے کہ تو اللہ کی محبت کی خاطر اس کی محبت چھوڑ رہا ہے۔ خدا تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کی خاطر اس کی دائمی عداوت پر صبر دکھا رہا ہے۔ یہی سب سے زیادہ بہتر و افضل عمل ہے اور صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق و نصرت اور اس کے رحم و کرم کے باعث ہی یہ سعادت حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے کہ خدا تعالیٰ کے بغیر کہیں سے توفیق و قوت اور صبر نہیں ملتا۔

صبر و شکر کا ایک تقابل

بعض متقدمین سے پوچھا گیا کہ ایک آدمی پر ابتلا آیا اور اس نے صبر کیا اور دوسرے پر انعام ہوا اور اس نے شکر کیا تو ان کے بارے میں انہوں نے فرمایا کہ یہ دونوں برابر ہیں اور فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صابر اور شاکر اپنے دونوں بندوں کی تعریف ایک ہی انداز سے فرمائی۔ حضرت ایوب علیہ السّلام کے بارے میں فرمایا:

نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ۔ (بہت خوب بندہ وُہ ہے رجوع رہنے والا)

اور حضرت سلیمان علیہ السّلام کی تعریف بھی انہی الفاظ میں فرمائی کہ

نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ۔ (بہت خوب بندہ وُہ ہے رجوع رہنے والا)

مگر یہ یاد رہے کہ (خدا اس پر رحم کرے) اس قول میں لطیف معانی سے غفلت برتی گئی اور تدبرِ کلام کا ثبوت پیش نہیں کیا۔ اس لیے کہ ہمارے نزدیک حضرت ایوب علیہ السّلام کی تعریف کو حضرت سلیمانؑ کی تعریف پر فضیلت میں تیرہ معانی حاصل ہیں۔ اس کے بعد دو وصفوں میں حضرت سلیمانؑ کو شریک فرمایا اور

نیز رجات کے لحاظ میں فضیلت میں حضرت ایوب علیہ السلام کو جُدا ذکر کیا۔

پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاذْكُرْ (اور یاد کر)

یہ مباحات کا کلمہ ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے حضرت ایوب علیہ السلام کا ذکر فرمایا اور فرمایا:

(اے محمدؐ!) "اور یاد کر!"

چنانچہ ان کا ذکر کرنے اور ان کے اتباع کا حکم دیا۔ جیسے کہ فرمایا:

وَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ۔ (اور صبر کر جیسے کہ صبر کیا ہمت والے رسولوں نے)

یعنی شدائد و ابتلاء میں رہنے والے انبیاء علیہم السلام اصحاب عزم ہیں۔ ان کے صبر کی طرح صبر کر۔ ان میں سے حضرت ایوب علیہ السلام بھی ہیں۔ تلیجیوں سے انہیں کاٹا گیا، آروں سے چیرا گیا اور سب نے صبر کیا اور یہ ستر انبیاء تھے۔

ایک قول کے مطابق اس سے مراد حضرت ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام ہیں۔ یہ انبیاء علیہم السلام کے آباؤ اجداد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ ۔[1] (اور مذکور کر کتاب میں ابراہیم کا)

اور فرمایا:

وَاذْكُرْ عِبَادَنَا إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ أُولِي الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ ۔[2] (اور یاد کر ہمارے بندوں کو ابراہیم، اسحٰق اور یعقوب، ہاتھوں والے اور آنکھوں والے)

یعنی اصحاب قوت اور اہل بصیرت و یقین بندوں کو یاد کرو۔ پھر حضرت ایوب علیہ السلام کو ان کے مقام تک اٹھایا اور ان سے ملایا اور اسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسلی بنایا۔ پھر خصوصیت سے ان کا ذکر کر کے آپؐ کو یاد دلایا۔ پھر فرمایا:

عَبْدَنَا ۔ (ہمارا بندہ)

---

[1] مریم آیت ۴۱
[2] ص آیت ۴۵

چنانچہ اللہ تعالیٰ ان کی نسبت اپنی طرف نسبتِ تخصیص و قرب کے ساتھ فرمائی۔ عبد اور نا کے درمیان لامِ ملک نہیں ڈالا۔ یعنی یوں نہیں فرمایا کہ عَبْدً لَنَا۔ چنانچہ دوسرے صابرین و اہل ابتلاء سے لاحق فرمایا کہ:

وَاذْكُرْ عِبَادَنَا اِبْرَاهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ۔

ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ابتداء علیہم السلام پر مباحات و فخر فرمایا اور ان ہی کی اولاد ہیں۔ سے انبیاء علیہم السلام چنے۔ چنانچہ حسن ثنا اور اُذْكُرْ کے لفظ میں حضرت ایوب علیہ السلام کو ان کی طرف منسوب کیا۔ پھر فرمایا:

اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ۔ (جب اس نے اپنے پروردگار کو پکارا)

تو اسے اپنے لیے مفرد کر کے بیان فرمایا اور خطاب میں اس کے وصف کے ساتھ منفرد کیا اور فرمایا:

مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَ اَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ۔ (مجھے تکلیف پڑی اور تو سب رحم والوں سے رحم والا)

چنانچہ اس کے سامنے تملق و مناجات کرنے سے موصوف کیا اور وصفِ رحمت ان کے لیے ظاہر فرمائی۔ چنانچہ اس سے انہیں راحت ہوئی اور پکارا اور فریاد پیش کر کے مدد چاہی۔ چنانچہ ان کے مقام کو حضرت موسیٰ و یونس علیہم السلام سے تشبیہ دی جبکہ انہوں نے کہا:

سُبْحَانَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ۔ (تو پاک ہے میں نے توبہ کی تیرے پاس)

اور حضرت یونسؑ نے کہا:

لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۔ (تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو پاک ہے۔ میں ہی ظالموں میں سے ہوں)

یہ خطاب مشاہدہ ہے۔ اس کے بعد قبول کرنے اور تکلیف دُور کرنے کا وعدہ فرمایا اور اس کلام کو اپنی قدرت کے نفاذ کا باعث اور جریان حکمت کا محل قرار دیا اور قبولیت کی کنجی کہا۔ ان سب کے بعد یہ فرمایا کہ:

وَ وَهَبْنَا لَهٗ اَهْلَهٗ۔ (اور ہم نے اس کو اس کا اہل دیا)

چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام سے وصف میں اضافہ فرمایا۔ اس لیے کہ وَهَبَ لِاَهْلِهٖ اور وَهَبَ لَهٗ اَهْلَهٗ میں بڑا فرق ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

وَ وَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمَانَ۔ (اور ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا)

چنانچہ حضرت سلیمانؑ پر حضرت ایوبؑ کی فضیلت ایسے ہی ہے جیسے کہ حضرت موسیٰؑ کو حضرت ہارونؑ پر فضیلت حاصل ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ہارونؑ پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی فضیلت بیان کرتے ہوئے

فرمایا:

وَ وَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَا اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا۔ (اور ہم نے اپنی رحمت سے اس کو اس کا بھائی ہارون نبی)

اسی طرح حضرت داؤدؑ کی مدح میں فرمایا:

وَ وَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ۔ (اور ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا)

چنانچہ جس طرح خدا تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو بیٹا عطا کیا۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کا بھائی عطا فرمایا۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام کے موقع پر مقامِ ایوب کو مباحات و یاد میں تشبیہ دی۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت داؤد علیہ السلام کے وصف میں فرمایا:

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ۔ (سو صبر کر اس پر جو وہ کہتے ہیں اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کر)

حضرت ایوبؑ کی تعریف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا اَيُّوْبَ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ۔ (اور یاد کر ہمارے بندے ایوب کو جب اس نے اپنے رب کو پکارا)

چنانچہ معنی میں حضرت ایوبؑ کو حضرت داؤد و موسیٰ علیہم السلام سے تشبیہ دی اور مشابہت یوں دی کہ حضرت ایوبؑ کا حال حضرت سلیمانؑ کے حال سے اعلیٰ ہے۔ وعلم اللہ المقدم (اللہ کا علم ہی مقدم ہے) باقی ہمارے دل میں یہی القاء ہوا، واللہ اعلم۔

ان سب کے بعد فرمایا:

رَحْمَةً مِّنَّا۔

چنانچہ اپنے آپ کا ذکر کر کے بندے کی عزت افزائی کے لیے بندے کے پاس متصف فرمایا۔ پھر فرمایا:

وَ ذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ۔ (اور اہلِ خرد کے لیے یاد ہے)

چنانچہ اسے عقلاء کا امام اور اہلِ صبر و ابتلاء کے لیے اور اصفیاء کرام کے لیے تسلی و تذکرہ (یاد) بنا دیا۔

پھر فرمایا:

اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا۔ (ہم نے اسے صابر پایا)

اس میں اللہ جل شانہٗ نے اپنے بندے کا دوبارہ ذکر فرمایا اور محبت و قرب کے باعث ناہ میں اپنے نام کے ساتھ ہی اس کا (ہٗ) ذکر کیا۔ اس لیے کہ وجدنا میں نا خدا تعالیٰ کا اسم مبارک ہے اور ہٗ سے

مراد خدا کا بندہ حضرت ایوب صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

پھر فرمایا،

صَابِرًا۔ (صبر کرنے والا)

اور صبر کے انتہا کی تعریف کی، چنانچہ ان کے درجہ کو دو چند فرمایا۔

اس کے بعد آخر میں فرمایا:

نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ۔ (خوب ہے بندہ رجوع رہنے والا)

یہ دونوں وصف حضرت سلیمان کے آغاز اور ان کے اختتام کے اوصاف ہیں اور یہیں انہیں بھی شمار ہیں شرکت حاصل ہوئی مگر حضرت ایوب علیہ السلام کی تعریف و شان میں پہلے بھی کئی کلمات طیبہ اچھے ہیں۔ چنانچہ خداتعالیٰ کے اس فرمان وَاذْكُرْ عَبْدَنَا اَيُّوْبَ سے لے کر نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ تک غور کیا جائے تو اہل فہم کو نمایاں فرق نظر آئے گا۔ حضرت سلیمانؑ کی تعریف کے شروع میں یہ فرمایا کہ یہ حضرت داؤد علیہ السلام کو عطا ہوئے۔ اب یہ حضرت داؤد علیہ السلام کی حسنات میں سے ایک نیک بات ہوئی اور نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ کا فرمان ان کے پہلے اور اوسط وصف پر حاوی ہے اور حضرت ایوب علیہ السلام کا یہ آخری وصف ہے۔ تمام انبیاء پر صلوٰۃ و سلام ہو۔

جنت میں پہلے اور آخر میں جانے والے

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"انبیاء علیہم السلام سے آخر میں جنت میں جانے والے سلطنت کے بلند مقام کے باعث حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام ہیں اور میرے صحابہؓ میں سے درجۂ غنا کے باعث آخر میں جنت میں جانے والے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ و عنہم ہوں گے۔"

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"حضرت سلیمان بن داؤدؑ دوسرے انبیاء علیہم السلام سے چالیس خریف بعد جنت میں داخل ہوں گے۔"

اور آثار میں آتا ہے:

"اہل ابتلاء میں سے سب سے پہلے حضرت ایوب علیہ السلام جنت میں داخل ہوں گے اور یہ اہل ابتلاء کے امام ہیں اور جنت کے ہر دروازے کے دو دو کواڑ ہیں۔ سوائے باب صبر کے کہ اس کا ایک ہی کواڑ ہے اور اس میں سب سے پہلے اہل ابتلاء ہی داخل ہوں گے۔"

چنانچہ عام خبر سے بھی حضرت ایوب علیہ السلام کو حضرت سلیمان علیہ السلام پر بڑھ کر درجہ حاصل ہوا۔

اس لیے کہ وُہ اہل ابتلائ کے سردار اور عبرت وذکر ہیں اور صبر کرنے والوں، دُکھ اٹھانے والوں اور ابتلاء میں رہنے والوں کے امام ہیں۔ اس تحریر سے ہمارا مقصود انبیاء علیہم السّلام کو ایک دُوسرے پر فضیلت دینا نہیں ہے اس لیے کہ ہمیں اس سے منع کیا گیا ہے۔ ہمارے نبی حضرت محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

"انبیاء کو ایک دُوسرے پر فضیلت نہ دو، البتہ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ انہیں ایک دُوسرے پر فضیلت حاصل ہے"

چنانچہ فرمایا:

وَ لَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِيِّيْنَ عَلٰى بَعْضٍ (اور بے شک ہم نے فضیلت دی بعض نبیوں کو بعض نبیوں پر)

اور ہم نے کتاب اللہ میں مخفی تمنا کو ہی واضح کیا ہے۔ چنانچہ ہم نے حضرت سلیمان علیہ السّلام کے واقعہ پر حضرت ایوب علیہ السّلام کے واقعہ کو جو باطنی فوقیت حاصل ہے اسے ہی بیان کیا۔ یہ کلام کے مفہوم پر غور کرنے سے صاف واضح ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا علم ہی مقدم ہے اور وہی اعلم و احکم ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ:

"قرآن پڑھو اور اس کے غرائب تلاش کرو"

چنانچہ ہم نے اس فرمان پر عمل کرنے کو مندوب جانا۔ اس لیے کہ اس فرمان میں اہلِ صبر و بلا کے لیے عبرت ہے۔ ان کے قلوب کو تقویت ہوتی ہے اور ان پر کمالِ انعاماتِ الٰہی کا پتہ چلتا ہے۔ بواطن نعمت کا اظہار ہوتا ہے۔ لطائف کلمات پر آگاہی ہوتی ہے۔ دنیا و نفس میں زہد اختیار کرنے اور آخرت میں صبر میں رغبت کرنے کا سبق ملتا ہے اور اہلِ ابتلاء کے طریق کی فضیلت واضح ہوتی ہے جو کہ انبیاء علیہم السّلام سے زیادہ سے زیادہ مماثل ہیں۔ اس بحث سے پتہ چلا کہ مصیبت پر صبر کرنے والے اپنے مولائے کریم کے حکم پر راضی رہنے والے اور خدا تعالیٰ کی رضا کی باتوں کو تسلیم کرنے والے کو انعاماتِ الٰہی پر شاکر آدمی پر فوقیت حاصل ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انعامات، طبع کے لیے موزوں اور نفس کے مطابق ہوتی ہیں۔ ان میں نفس کو مشقت کر کے صبر کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی اور نفس کو مشقت پر آمادہ نہیں کرنا پڑتا اور ابتلاء طبع کے خلاف حالت ہے۔ نفس اس سے گریز کرتا ہے۔ اس پر آمادہ کرنے کے لیے مشقت کرنی پڑتی ہے اور نفس اسے ناپسند کرتا ہے۔ چنانچہ حالتِ صبر کو افضلیت حاصل ہے۔ صبر کرنے کی قوت صرف خدا تعالیٰ کے لطف و کرم اور اس کی توفیق سے حاصل ہوتی۔ فرمایا:

وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔ (اور صبر کرنا اور اللہ کی مدد کے بغیر تجھے صبر نہ ہوگا)

مقاماتِ صبر کی تفصیلات ہیں یہ آخری کلام ہے۔

شکر اور اہل شکر کا بیان

تیسرا مقامِ یقین، شکر ہے

یہ تیسرا مقامِ یقین ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ اِنْ شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ۔ (کیا کرے گا اللہ تم کو عذاب کر کر، اگر تم حق مانو اور یقین رکھو)

چنانچہ حق تعالیٰ نے ایمان کے ساتھ شکر کو ملا کر ذکر کیا اور ان دونوں کو رفعِ عذاب کا باعث فرمایا اور فرمایا:

وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِيْنَ۔ (اور عنقریب ہم شکر کرنے والوں کو جزا دیں گے)

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

"شکر کر کے کھانے والا، صابر روزے دار کی طرح ہے۔"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"شکر کرنا نصف ایمان ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے شکر کرنے کا حکم دیا اور اسے ذکر کے ساتھ مقارن فرمایا۔ فرمایا:

فَاذْكُرُوْنِيْ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنَ۔ (سو یاد کرو مجھے میں یاد کروں گا تم کو، اور میرا شکر کرو اور کفر نہ کرو)

اس فرمان کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ذکر کو ذی عظمت بتایا۔ فرمایا:

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ۔ (اور البتہ اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے)

چنانچہ ذکر کا اقتران (اللہ کے) ساتھ ہے۔ اس لیے یہ سب سے بڑا ہے اور خدا کی جزا بھی شکر کے باعث اس کے فرط کرم کی وجہ سے ہے۔ اس لیے کہ خدا تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَاذْكُرُوْنِيْ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ۔ (سو مجھے یاد کرو، میں تمہیں کروں گا اور میرا شکر ادا کرو)

تحقیقِ امر اور تعظیمِ شکر کے باعث، لفظِ مجازات سے خروج ہے۔ اس لیے کہ فا، شرط و جزا کے لیے ہے اور گزشتہ کاف تمثیل کے لیے ہے۔ چنانچہ فَاذْكُرُوْنِيْ کا فرمان كَمَا اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ سے

منفصل ہے۔ یعنی سو میرا ذکر کرو اور میرا شکر ادا کرو۔

اس کا مطلب یہ ہُوا کہ جیسے میں نے تم میں سے تمہارے اندر ایک رسول بھیجا۔ سو تم میرا شکر ادا کرو اور عرب لوگ مثل کی بجائے کاف کا ذکر کر دینا کافی سمجھتے ہیں۔ جیسے کہ سوف کی بجائے سین کا ذکر کرنا کافی ہے۔ جیسے کہ فرمایا:

سَنُوْتِیْهِمْ اور سَنَسْتَدْرِجُهُمْ۔ شکر کی یہ بہت بڑی فضیلت ہے جیسے علمائے ربانیین ہی سمجھتے ہیں۔ حضرت ایوب علیہ السّلام کے واقعات میں ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی:

"میں اپنے اولیاء سے صلہ کے طور پر شکر پر راضی ہُوا۔"

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ (میں بیٹھوں گا ان کی تاک میں تیری سیدھی راہ پر) کی تشریح میں بتایا کہ صراطِ مستقیم سے مراد راہِ شکر ہے اور اگر شکر کی راہ خدا تک رسائی نہ دیتی۔ شیطان اس راہ کو کاٹنے کی دھمکی نہ دیتا اور اگر شاکر آدمی رب العالمین کا حبیب نہ ہوتا تو ابلیس لعین یُوں نہ کہتا جیسے کہ بتایا:

وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شَاكِرِيْنَ۔ (اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا)

اور اسی طرح فرمایا:

وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ۔ (اور میرے شکر گزار بندے کم ہیں)

اور جیسے کہ فرمایا:

وَلَقَدْ صَدَّقَ عَلَيْهِمْ اِبْلِيْسُ ظَنَّهٗ فَاتَّبَعُوْهُ اِلَّا فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (اور سچ کر دکھائی ان پر ابلیس نے اپنی اٹکل، پھر اسی کی راہ چلے مگر تھوڑے سے ایماندار)

شکر پر ایک عجیب انعام

اللہ تعالیٰ نے شکر پر مزید انعام کا وعدہ فرمایا اور استثناء نہیں فرمایا مگر پانچ باتوں میں استثناء فرمایا:

۱۔ غنی بنانے۔

۲۔ دعا قبول کرنے۔

۳۔ روزی دینے۔

۴۔ بخشش کرنے۔

۵۔ توبہ قبول کرنے میں استثناء فرمایا۔

چنانچہ فرمایا:

۱۔ فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ إِنْ شَاءَ۔ (تو عنقریب اللہ تمہیں غنی کر دے گا اپنے فضل سے اگر اس نے چاہا)

۲۔ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ۔ (پھر کھول دیتا ہے جس پر پکارتے تھے اگر چاہتا ہے)

۳۔ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ۔ (روزی دیتا ہے جسے چاہتا ہے)

۴۔ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ۔ (بخشتا ہے جسے چاہتا ہے)

اور فرمایا:

۵۔ ثُمَّ يَتُوبُ اللّٰهُ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰى مَنْ يَشَاءُ۔ (پھر لوٹ آئے گا اللہ (توبہ قبول کرے گا) اس کے بعد جس پر چاہے گا)

مگر شکر کے موقع پر بلا استثناء ہی مزید انعام کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ۔ (اگر تم شکر کرو گے تو ہم ضرور مزید عطا کریں گے)

چنانچہ شاکر کو مزید ملتا ہے اور زیادہ شکر گزار (شکور) کو بہت ہی زیادہ عطا ہوتا ہے۔ شکور سے مراد وہ بندہ ہے کہ جو قلیل نعمت پر بھی خوب خوب شکر کرے۔ اور ایک ہی نعمت پہ بار بار شکر کرے۔ یہ اخلاقِ پروردگار ہیں سے ہے۔ اس لیے کہ اس نے اپنے اسماء میں سے اس کو موسوم فرمایا اور مزید منعم کی طرف ہے اسے جہاں چاہتا ہے فرماتا ہے۔

چنانچہ افضل ترین مزید انعام یہ ہے کہ حسنِ یقین اور مشاہدۂ اوصاف کی دولت مل جائے اور مزید انعام کا آغاز شہودِ نعمت سے ہوتا ہے کہ یہ منعم تعالیٰ سے حاصل ہیں اور خدا تعالیٰ کے بغیر کچھ توفیق و قوت نہیں اور اوسط مزید یہ ہے کہ یہ حال و دوام اختیار کر لے اور طاعت میں مسلسل لگا رہے۔

شکر پر مختلف انعامات ہوتے ہیں

شکر پر مزید انعام، اخلاق کی صورت میں، علوم کی صورت میں اور آخرت میں انعام کی صورت میں ملتا ہے اور اس طرح موت کے وقت ثابت قدمی کی صورت میں انعام ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے شکر کو اہل جنت کے کلام کی کنجی اور ان کی تمنا کا آخر قرار دیا۔ فرمایا:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهٗ۔ (سب حمد اسی کی ہے جس نے ہمارے ساتھ اپنا (کیا ہوا) وعدہ سچا فرمایا)

اور ایک جگہ فرمایا:

وَ آخِرُ دَعْوَاهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ (اور ان کی آخری پکار (کلام) یہ ہوگی کہ سب حمد اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے)

حضرت ایوب علیہ السلام کی مناجات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف صفتِ صابرین بیان کرتے ہوئے وحی فرمائی کہ:

" ان کا گھر دارِ سلام ہے۔ جب وہ اس میں داخل ہوں گے تو انہیں شکر کا الہام (القاء) ہوگا اور وہ بہترین کلام ہے اور شکر پر میں ان کے انعام میں اضافہ کرتا ہوں اور میری جانب نظر رکھنے پر میں ان پر مزید عطا کرتا ہوں "۔ یہ ازحد فضل وکرم کی دلیل ہے۔

نعمت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے

انعامات کے شکر کی ابتدا اس سے ہے کہ یہ جان لے کہ انعامات دینے والا تنہا مولائے کریم ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں اور نہ ہی انعام دینے میں اس کا کوئی مددگار ہے۔ اس لیے کہ ہر تنگی و آسانی اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہی بندوں پر آتی ہے۔ فرمایا:

وَ مَالَهٗ فِيْهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَّ مَالَهٗ مِنْهُمْ مِّنْ ظَهِيْرٍ۔ (اور نہ ان کا ان دونوں میں ساجھا اور نہ ان میں کوئی ان کا مددگار)

یعنی شرک کا اختلاط نہیں اور ظہیر کا معنیٰ ہے مددگار۔

پھر فرمایا:

وَمَا بِكُمْ مِنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ثُمَّ اِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَاِلَيْهِ تَجْـَٔرُوْنَ۔ (اور جو تمہارے پاس ہے کوئی نعمت سو اللہ کی طرف سے پھر جب لگتی ہے تم کو سختی تو اسی کی طرف چلاتے ہو)

اور فرمایا:

وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ وَ اِنْ يَّمْسَسْكَ بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔[1] (اور اگر پہنچادے تجھ کو اللہ کچھ سختی، پھر اس کو کوئی نہ اٹھائے سوائے اس کے، اور اگر تجھ کو پہنچا دے بھلائی تو وہ ہر چیز پر قادر ہے)

اور پھر مجمل طور پر فرمایا:

---

[1] سورۃ انعام آیت ۱۷۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ۔ ۵ (اور کام لگایا تمہارے جو کچھ ہے آسمانوں میں اور زمین میں سب اس کی طرف سے)

اور فرمایا:

وَاَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً۔ (اور بھر دیں تم کو اپنی نعمتیں کھلی اور چھپی)

چنانچہ صحیح اسباب اور پختہ واسطے اسی کے حکم و احکام ہیں۔ اور ظروفِ عطاء و آثارِ معطی حکم میں موثر نہیں اور نہ ہی انہیں حکم بناتے ہیں یعنی نہ حکم کرتے ہیں اور نہ بناتے ہیں۔ اس لیے کہ یہ سب محکومات ہیں۔ اب حاکم کیونکر ہوں، یہ سب معمولات ہیں۔ یہ (جعل) کریں کیوں کر؟ اور اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں۔

وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔ (اور نہیں شریک کرتا اپنے حکم میں کسی کو)

اہلِ شام کی قرأت میں یہ لفظ زیادہ پختہ و بلیغ ہے۔ اس لیے کہ یہ امر کے طریق پر آرہا ہے۔ اہلِ شام نے اسے تاء اور کاف مجزوم کے ساتھ پڑھی یعنی

وَلَا تُشْرِكْ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا۔ (اس کے حکم میں کسی کو شریک نہ بناؤ)

چنانچہ اسباب، احکام حق تعالیٰ ہیں اور واسطے اس کے احکام ہیں۔ چنانچہ نعمت میں منعم کا مشاہدہ اور عطاء کے وقت عطا کرنے والے کا ظہور ہوتا ہے۔ حتّٰی کہ تو ہر نعمت اس سے دیکھے اور ہر عطا اس سے جانے۔ یہ قلب کا شکر ہے کیوں کہ اہلِ شکر کے نزدیک قلبی معرفت اور قلبی وصف کا نام شکر ہے اور یہ صرف لسانی وصف نہیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم فرمایا اور دنیا کا مال جمع کرنے کی بجائے آخرت کا مال یعنی شکر حاصل کرنے کا حکم دیا۔ حضرت ثوبان اور عمر بن خطاب رضی اللہ عنہما کی حدیث میں فرمایا۔ جبکہ خزانوں کے بارے میں احکام نازل ہوئے کہ:

حضرت عمرؓ نے پوچھا:

"ہم کون سا مال لیں؟"

آپؐ نے فرمایا:

"تم میں سے ہر ایک، آدمی کو چاہیے کہ وہ ذکر کرنے والی زبان اور شکر کرنے والا دل لے۔"

---

۵ جاثیہ۔ آیت ۱۳۔

حضرت موسیٰ و داؤد علیہم السلام کی اخبار میں ہے :

" اے میرے پروردگار ! میں کس طرح تیرا شکر کروں جبکہ میں تیرا شکر صرف اس طرح کر سکتا ہوں کہ ایک دوسری نصیحت ہو تو ہی ؟ "

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں :

" میرا شکر کرنا بھی دراصل مجھ پر تیری دوسری نعمت ہے جس کا شکر کرنا مجھ پر لازم ہے ." تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی :

" جب تُو نے یہ پہچان لیا تو تُو نے میرا شکر ادا کیا ."

ایک دوسری روایت ہے :

" جب تُو نے پہچان لیا کہ تمام نعمتیں میری طرف سے ہیں تو میں (تیرے) اس شکر کی وجہ سے تجھ سے راضی ہو گیا ."

لسانی شکر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرے اور اس کے انعام و اکرام کو بیان کرے اور اس کے احسانات کو ظاہر کرے . اور کسی مملوک کے سامنے مالک حقیقی کی شکایت نہ کرے اور نہ ہی کسی بندے کے سامنے معبود جلیل تعالیٰ کی شکایت کرے .

حدیث میں آتا ہے :

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو فرمایا :

" صبح کیسے کی ؟ "

اس نے عرض کیا :

" خیریت سے ."

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ پوچھا :

" کیسے ہو ؟ "

اس نے عرض کیا : " خیریت سے ہوں ."

آپؐ نے تیسری بار پوچھا :

" کیسے ہو ؟ "

اس نے عرض کیا : " خیریت سے ہوں . میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کرتا ہوں اور اس کا شکر کرتا ہوں ."

آپؐ نے فرمایا : " میں نے تم سے یہی (حمد و ثنا) چاہی تھی ." یعنی حمد و ثنا اور شکر کا اظہار کرے .

سلف صالحینؒ کا طریقہ تھا کہ جب ملاقات کرتے اور ایک دوسرے کا حال پوچھتے تو وہ خدا تعالیٰ کی حمد و ثناء اور شکر بیان کرتے۔ چنانچہ وہ سب ہی حمد و ثناء میں حصہ لیتے اور یہ بات اجتماعی ذکر اللہ میں بن جاتی اور اگر کسی کو معلوم ہوتا کہ فلاں آدمی اپنے مولائے کریم کی شکایت کرتا ہے تو اُسے بُرا سمجھتے اور اس سے پوچھتے ہی نہ تھے تاکہ پوچھنے والا اس کی شکایت کا باعث اور اس کی جہالت میں حصہ دار نہ بن جائے اور حقیقت یہ ہے کہ ایسے مولائے کریم کی شکایت بدترین فعل ہے کہ

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ۔ (اس کی مثل کوئی چیز نہیں)

اور اَلَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ۔ (جس کے ہاتھ میں ہر چیز کی ملکیت ہے)

چنانچہ کسی چیز پر قدرت نہ رکھنے والے بندے کے سامنے خدائے کریم کی شکایت کرنا از حد بُری بات ہے۔

قلیل نعمت پر بھی شکر کرو

تھوڑی سی نعمت پر شکر کرنا بھی لازم ہے۔ اس لیے کہ حبیب تعالیٰ کی طرف سے قلیل چیز بھی کثیر ہے اور اللہ تعالیٰ حکیم ہے۔ اس کا نہ دینا بھی اس کی حکمت اور قدرت ہے۔

اب جب اس نے پہچان لیا کہ عطا پر قدرت کے باوجود اس نے کسی حکمت سے روک دیا تو سمجھ لے گا کہ صرف اسی لیے روکا ہے تاکہ (موقع پر) اسے عطا کرے۔ اب منع ہی عطا بن گیا۔ اور قلیل بھی کثیر ہو گیا۔ اور یہ بھی جان لے گا کہ منع کے وقت ذلت و صبر بھی عزت و شرف ہے اور علماء کے نزدیک یہ حال سب سے اعلیٰ و اشرف ہے اس لیے کہ بندے کو اس حال پر بلند درجہ و عزت ملتی ہے مگر اپنے جیسے بندے کے سامنے ذلیل ہونا اور اس سے طمع رکھنا فی الحقیقت ذلت و رسوائی ہے اور عزیز کے لیے حسنِ ذلت دراصل حبیب کے لیے حسنِ زینت کی طرح ہے اور ذلیل کی خاطر ذلت کی قباحت دراصل دشمنی (شیطان) کی خاطر ذلت کی برائی کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَمْلِکُوْنَ لَکُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْہُ۔[1]

(بے شک جن کو پوجتے ہو اللہ کے سوا، مالک نہیں تمہاری روزی کے، سو تم ڈھونڈو اللہ کے ہاں روزی اور اس کی بندگی کرو)

اور اسی مفہوم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ عِبَادٌ (جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا، بندے ہیں

---

[1] العنکبوت آیت ۱۷۔

اَمۡثَالُكُمۡ [1] تم جیسے)

اور عبادت، خدمت ہی ہے اور حاجت خرچ کرنا ہے اور ایک نیک بندے کے یہ بات مناسب نہیں کہ وُہ مولائے کریم کے سوا کسی کے سامنے اپنے فقر و فاقہ کا حال بیان کرے بلکہ اپنے خدا سے چھپا ہے۔ اس لیے کہ وُہ اس کے حال سے آگاہ ہے۔ اس کی زاری سن رہا ہے اور اس کے حال کو دیکھ رہا ہے اور وُہ خُوب جانتا ہے کہ اس بندے کے جیسے کیا حالت زیادہ مناسب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس مفہوم میں فرمایا:

وَ لَوۡ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزۡقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوۡا فِي الۡاَرۡضِ۔

ہر حال پر راضی رہے

اہل یقین پر لازم ہے کہ قبض و منع میں اس طرح شکر کرے جیسے کہ عطا و بسط میں شکر کرتا رہے۔ شاکر کو یہ بھی چاہیے کہ وُہ قلبی یقین سے یہ تسلیم کرے کہ اس کا وصف بندہ ہونا ہے اور اس پر بندوں کے احکام جاری ہوں گے۔ اس پر پروردگار تعالیٰ کے احکام نافذ ہیں اور اس پر وُہ کسی اجر کا مستحق نہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ کو اس پر ہر طرح بات کا حق ہے۔ بندہ، اس کی مخلوق و مصنوع ہے۔ پروردگار اس کا مالک اور صانع ہے۔

اگر بندہ، اس مشاہدہ سے کام لے تو وُہ دیکھے گا کہ اس پر ہر نعمت اللہ تعالیٰ ہی کی جانب سے ہے۔ چنانچہ وُہ اس کی طرف سے معمولی چیز پر راضی ہو گیا۔ اور اللہ پر اپنا کچھ حق نہیں سمجھا اور نہ ہی اس سے مطالبہ کرنے کی جرأت کی۔ چنانچہ لسانی شکر یہ ہے کہ کثرتِ ذکر کرے۔ انعامات کا اچھے انداز میں تذکرہ کرے اور اپنے اوپر خدا تعالیٰ کے انعامات کا وانشگاف اقرار کرے۔ اس لیے کہ لغت میں شکر کا معنی ہے "اظہار کرنا اور کھولنا"۔ کہا کرتے ہیں، كَشَرَ وَ شَكَرَ یعنی جب اس کی سرحد کھلی تو اس کا اظہار کیا۔ اب یہ اظہارِ شکر اور کھولنا، زبان سے ہُوا۔ جیسے کہ حدیث میں آتا ہے:

"کسی ذکر کا اس قدر کئی گنا اجر نہیں ملتا جس قدر حمد کا اجر ملتا ہے"۔

اور ایک حدیث میں ہے کہ:

"جس نے سُبۡحَانَ اللّٰهِ کہا اس کے لیے دس نیکیاں ہیں اور جس نے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا اس کے لیے بیس نیکیاں ہیں اور جس نے اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ کہا اس کے لیے تیس نیکیاں ہیں"۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ حمد کا درجہ توحید سے بڑھ کر ہے بلکہ اصل میں یہاں مقامِ شاکر کی فضیلت بیان کرنا مقصود ہے۔ مزید یہ کہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب مقدس بھی (اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ) حمد سے شروع کی۔

---

[1] اعراف آیت ۱۹۴۔

حدیث میں آتا ہے کہ :

"الحمد، رحمٰن تعالیٰ کی چادر ہے۔"

ایک حدیث میں ہے :

"افضل ترین ذکر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ہے اور افضل ترین دعا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ہے۔"

قلبی شکر

دل میں شکر کا غلبہ کرنا اور قلب سے اعتراف کرنا قلبی شکر ہے۔ بندے کے لیے اللہ تعالیٰ کا (اجر) شکر یہ ہے کہ وہ مستور بات کھول دے اور مخفی علوم و قدر ظاہر کر دے۔ یہ مزید انعام ہے اور ان سب باتوں سے اسے اللہ تعالیٰ کی حسنِ معرفت اور مشاہدہ حاصل ہوتا ہے اور یہ تمام امور کشف و اظہار سے عبارت ہیں۔

اعضاء کا شکر

اعضاء کا شکر یہ ہے کہ اعضاء کے ساتھ کسی نعمت کے ذریعہ خدا تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرے اور اللہ تعالیٰ کی نعمت پر اس کی مزید اطاعت و عبادت کرے اور نعمت سے اس کی نافرمانی پر مدد حاصل نہ کرے اور نافرمانی کرنا کفرانِ نعمت بن جائے گا جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا۔ (کیا تم نے نہ دیکھا جنہوں نے بدلہ کیا اللہ کے احسان کا ناشکری)

یعنی ان لوگوں نے نعمت کے ساتھ خدا کی نافرمانی کی۔ اب مخلوق میں یہ قوت نہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی نعمت کو بدل دے۔ اس لیے اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ کی نعمت پر شکر کی بجائے کفر کیا۔ یہ مضمر مفہوم تھا۔ اس لیے کہ اس پر واضح دلیل ہے کیوں کہ نعمت پر انہیں طاعت کا حکم دیا گیا تھا مگر انھوں نے برعکس کام کیا اور اس کے ذریعہ نافرمانی کی اب ان کا فعل در اصل حکم کو تبدیل کرنا ہوا۔ اسی طرح فرمایا :

وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ[1] (اور اپنا حصہ یہی لیتے ہو کہ تم جھٹلاتے ہو)

یعنی روزی ملنے کا شکر یہی ادا کرتے ہو کہ اللہ کے رسولوں کی تکذیب کرنے لگ جاتے ہو۔ یہ بھی محذوف ہے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت میں یہ واضح اور مفسّر ہے۔

نعمت کے بعد گناہ ناشکری ہے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے پڑھا :

وَتَجْعَلُوْنَ شُكْرَكُمْ (اور تم اپنا شکر یہ کرتے ہو) یہ مفہوم واضح ہے اور اسی مفہوم میں یہ آیت آئی ہے :

وَمَنْ يُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ (اور جو کوئی بدل ڈالے اللہ کی نعمت، بعد اس کے کہ

---

[1] الواقعہ آیت ۸۲۔

فَاِنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعِقَابِ [۱]۔ (پہنچ چکی اس کو، تو اللہ کی مار سخت ہے)

یعنی جو آدمی نعمت ملنے پر کفر کرے اس کو سزا ملے گی۔ اس نے نافرمانی کر کے شکر کو ضائع کیا۔ اسی طرح فرمایا:

وَ لَئِنۡ کَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِیۡ لَشَدِیۡدٌ۔ (اور اگر تم کفر کرو تو بے شک میرا عذاب سخت ہے)

یعنی اگر تم نے کفرانِ نعمت کیا تو دنیا میں سزا یہ ہو گی کہ نعمت بدل کر عذاب کی صورت اختیار کرے گی، اور نعمت کی بجائے ذلت و رسوائی مسلط ہو جائے گی اور گاہے موجل (آخرت میں) عذاب ہو گا۔ فرمایا:

اِنَّ عَذَابَہَا کَانَ غَرَامًا۔ (بے شک اس کا عذاب بڑی چٹی ہے)

یعنی نعمت پر شکر کا مطالبہ کیا اور ان کے پاس شکر نہ تھا۔ اس لیے نعمت کی قیمت ان کے ذمے رہی۔ آخر انہیں جہنم میں ڈال دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ اَسۡبَغَ عَلَیۡکُمۡ نِعَمَہٗ ظَاہِرَۃً وَّ بَاطِنَۃً۔ (اور بھر دیں تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں)

پھر فرمایا:

وَ ذَرُوۡا ظَاہِرَ الۡاِثۡمِ وَ بَاطِنَہٗ۔ (اور چھوڑ دو ظاہری گناہ اور باطنی)

اس میں ان اہلِ خرد کو انتباہ ہے کہ جن تک دین کی آواز پہنچی کہ وہ اس سے نصیحت حاصل کریں اور ظاہری نعمت کے شکر کے طور پر ظاہر میں گناہ چھوڑ دیں اور باطنی نعمت کے شکر میں باطن کا گناہ بھی ترک کر دیں۔

ظاہری و باطنی انعام اور گناہ

ظاہری انعامات حسبِ ذیل ہیں۔

"اجسام کا تندرست ہونا، حسبِ ضرورت مال کا مالک ہونا۔"

اور ظاہری گناہ یہ ہیں:

"نفسانی مزے پینے کے اعضائے ظاہر کے کام۔"

باطنی انعامات حسبِ ذیل ہیں:

"قلوب کی عافیت و صحت، نیت کی سلامتی۔"

باطنی گناہ یہ ہیں:

"قلوب کے بُرے اعمال۔ مثلاً اصرار سے گناہ کرنا، بدظنی اور بدنیتی۔"

حضرت مطرف بن عبداللہؒ نے فرمایا:

"مجھے عافیت حاصل ہو اور میں اس پر شکر کروں۔ مجھے یہ بات ابتلا میں آنے اور اس پر صبر کرنے سے

---

[۱] البقرۃ۔ آیت ۲۱۱۔

زیادہ محبوب ہے۔" اس لیے کہ عافیت کا مقام، سلامتی سے زیادہ قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے صبر پر شکر کے حال کو پسند کیا۔ کیونکہ صبر دراصل اہلِ ابتلاء کا حال ہے۔

عافیت ہی مانگو

حضرت حسن بصریؒ سے اس حدیث کے معنی میں آتا ہے کہ جس میں کچھ برائی نہیں۔ وہ یہ ہیں کہ عافیت ہو اور اس کے ساتھ شکر ہو اور مصیبت کے ساتھ صبر ہو۔ کئی ایسے لوگ ہیں جن پر انعام ہوا مگر وہ شکر گزار نہیں ہیں اور کئی ایسے آفت زدہ ہیں کہ جو صبر سے محروم ہیں۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مفہوم میں ہے کہ:

"اور مجھے تیری عافیت زیادہ محبوب ہے۔" اور حضرت علیؓ کو جب سنا کہ وہ مرض میں یہ کہہ رہے ہیں:

"اے اللہ! میں تجھ سے صبر مانگتا ہوں۔" تو انہیں فرمایا:

"تو نے اللہ سے آفت و بلاء مانگی اس لیے عافیت کا سوال کرو۔"

اعمالِ صالحہ شکر ہے

اعمالِ صالحہ بھی شکر ہیں اور منعم تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کی توضیح اللہ تعالےٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اعمال صالحہ کے ساتھ کی۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا:

اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا۔ (کام کرو، داؤد کے گھر والو، حق مان کر)

اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب کہا گیا کہ آپ اس قدر ریاضت اور طویل کیوں کرتے ہیں کہ پاؤں متورم ہو گئے تو آپؐ نے فرمایا:

"کیا شکر گزار بندہ نہ بنوں!"

چنانچہ بتایا کہ مجاہدہ اور حسنِ معاملہ دراصل نعمت اور منعم تعالیٰ کے انعام کا شکر ہے۔

بعض علماءؒ کا فرمان ہے:

"قلب کا شکر یہ ہے کہ اس بات کی معرفت حاصل ہو جائے کہ تمام انعامات صرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔ دوسرے کسی کی طرف سے نہیں ہیں اور جب بھی اللہ تعالیٰ کسی عمل کی توفیق بخشے تو اس کے بعد دوسرا عمل، پہلے عمل کا شکر ہے۔ اس لیے کہ دوامِ عمل سے شکر کو بھی دوام و اتصال حاصل ہو جاتا ہے۔"

عارفینؒ کے نزدیک شکر کی ابتداء یوں ہے کہ کسی نعمت کے ذریعہ تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کرے اور خواہش کا اتباع نہ کرے اور شاکرین کا شکر یہ ہے کہ ہر نعمت پر اللہ تعالیٰ کی طاعت کرے اور اسے اللہ کی راہ میں ڈال دے یہ بندے کا شکر ہے۔ اور حقیقی شکر تقویٰ اختیار کرنا ہے۔ اور یہ ایسا نام ہے جو تمام مامور بہ عبادت پر حاوی ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۔ (اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔ جس نے تمہیں اور ان کو جو تم سے پہلے تھے، پیدا کیا تاکہ تم بچ جاؤ)

پھر حقیقی شکر کو تقویٰ سے تعبیر کیا اور اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اصل تقویٰ شکر کرنا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

فَاتَّقُوْا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔

(سو اللہ سے ڈرو تاکہ تم شکر کرو)

شکر میں مشاہدہ کے دو مقام

پہلا مقام ان میں سب سے بڑا شکور (شکرگزار) کا ہے اور یہ وہ آدمی ہے کہ جو ناپسندیدہ باتوں اور ابتلاء پر اور شدائد و آفات پر صبر کرے اور تب تک ایسا نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ ایسی نعمت کا مشاہدہ نہ کرے کہ جس پر صدقِ یقین اور حقیقی زہد کے ساتھ شکر لازم سمجھے اور یہ رضا میں ایک مقام ہے اور محبت میں ایک حال ہے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر اس وصف کے ساتھ فرمایا:

اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا۔ (وہ شکرگزار بندہ تھا)

تفسیر میں ہے کہ وہ دکھ سکھ یا نفع و نقصان ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر کرتے۔

حدیث میں آتا ہے کہ قیامت کے روز ایک ندا دینے والا ندا دے گا۔ حمد کرنے والے اٹھیں، چنانچہ ایک گروہ اٹھے گا اور ان کے لیے ایک جھنڈا نصب کر دیا جائے گا اور وہ جنت میں داخل ہو جائیں گے۔"

پوچھا گیا: "حماد (حمد کرنے والے) کون ہیں؟"

فرمایا: "جو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر کرتے ہیں۔"

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"ہر تنگی و آسانی پر" (شکر کرتے ہیں)

بعض علماء کا فرمانا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً میں مراد ظاہرۃً سے "عافیت اور غنا ہے" اور باطنۃً سے مراد "ابتلاء و فقر" ہے۔ یہ آخرت کے انعامات ہیں۔

جیسے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"آخرت کی زندگی کے علاوہ کوئی زندگی ہی نہیں۔"

دوسرا مقام شکر کا دوسرا مقام یہ ہے کہ بندہ اپنے سے کم درجہ کے آدمی کی طرف دیکھے اور اپنے اوپر خدا کے فضل و کرم کو دیکھے۔ چنانچہ قلب و دین کی سلامتی اور اس کی عافیت کی نعمت کی تعظیم کرے۔ دوسرا آدمی جس آفت میں مبتلا ہے اور یہ اس سے محفوظ ہے اس پر شکر کرے۔ پھر دین کے اعتبار سے

اپنے سے بلند تر درجہ والے پر نظر کرے اور اپنے سے بلند درجہ آدمی کے علمِ ایمان اور حسنِ یقین پر رشک کر کے اپنے آپ کو بُرا سمجھے اور اپنے آپ کو ملامت کرے اور اس قسم کے اعلیٰ احوال حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ جب ایسا ہو گیا تو وہ شاکرین میں داخل ہوگا اور اس کا نام بھی مدحین میں آجائے گا۔

اسی مفہوم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔ آپ نے فرمایا:

"جس نے دنیا میں اپنے سے کم تر کی طرف نظر رکھی اور دین میں اپنے سے برتر کی طرف نگاہ رکھی۔ اللہ تعالیٰ اسے صابر شاکر لکھے گا اور جس نے دنیا میں اپنے سے برتر کی طرف دیکھا اور دین میں اپنے سے کم تر کی طرف دھیان رکھا اسے نہ صابر لکھے گا اور نہ شاکر لکھے گا۔"

ہم نے مقامِ رضا میں اس کی کافی تفصیل کر دی جس کا اعادہ ضروری نہیں اور بندہ جس وصف کے ساتھ شاکر ہو اس کے لیے شکر میں وہی مقام ہے۔ اس لیے کہ نعمت کے کفران سے اس کی ضد لازم آتی ہے کیونکہ شکر کی ضد کفر ہے۔

تین بڑی نعمتیں

ستر کی نعمت

تین نعمتیں بہت بڑی ہیں۔ جو ان سے جاہل رہا اس نے ان کا شکر ضائع کر دیا اور ان کو پہچاننا عارفین کا شکر ہے۔

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے لوگوں کی نگاہوں سے مخفی اور پوشیدہ رہے۔ اگر وہ بندوں کے سامنے ظاہر ہو جاتا تو ان کے گناہ کفر بن جاتے۔ اس لیے کہ جو گناہ ان لوگوں نے کرنے ہی ہیں ان میں پھر کے پر بھی کمی نہ کرتے اور اللہ تعالیٰ ایک وصف کے ساتھ ظاہر ہوتا مگر وہ نافرمانی سے نہ رکتے۔ اس بات کے پیچھے بھی کئی غیبی راز ہیں اور یہ لوگ مشاہدہ کی حرمت توڑ کر کھلم کھلا کفر کرتے۔

مزید برآں جس قدر ایمان لا کر انہیں اب بلند درجاتِ ایمان مل رہے ہیں وہ درجات انہیں مشاہدہ کی حالت میں نہ ملتے۔ اس لیے کہ آجکل وہ ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔ اس لیے حسنِ یقین کی برکت سے ان کے درجات بلند کر دیے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی مدح و توصیف فرمائی۔

قضا و قدر کا اخفاء

دوسری نعمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عام مخلوق سے قضا و قدر کو پوشیدہ رکھا۔ کیونکہ یہ امور، غیبی اسرار میں سے ہیں اور ان میں بندے کی اصلاح ہے۔

دین و دنیا کی استقامت بھی اسی میں ہے۔ اگر یہ چیزیں ظاہر ہو جائیں تو آیاتِ الٰہی دیکھنے کی وجہ سے ان کے صغیرہ گناہ بھی کبائر بن جائیں اور جس طرح آجکل ایمان بالغیب کی وجہ سے ان کے نیک اعمال میں بہت اضافہ ہو رہا ہے۔ اس قدر اضافہ نہ ہو۔

موت کا اخفاء

تیسری نعمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر موت کو مخفی کر دیا۔ اگر انہیں اپنی عمر اور موت معلوم ہو جاتی تو ان کی نیکی و بدی میں ذرّہ بھر اضافہ نہ ہوتا اور موت کے علم ہونے کے باعث ان پر مطالبہ بھی شدید ہو جاتا۔ اب انہیں معذور رکھنے کے لیے اسے مخفی کر دیا کہ وہ موت کا وقت نہیں جانتے۔ یہ ان پر عنایت و کرمِ خداوندی ہے کہ انہیں ٹھیک وقتِ اجل معلوم نہیں۔

ایک عجیب نعمت

پھر ایک لطیف ترین نعمت یہ ہے کہ ان کے لیے یہ سب باتیں مخفی ہیں، وُہ ایک دوسرے سے حجاب میں ہیں۔ علماء و صالحین کے سامنے بھی وُہ مخفی رہتے ہیں۔ اگر یہ نہ ہوتو وہ ان کی طرف نہ دیکھیں۔ پھر صالحین اور اولیاء کو بھی ان سے مخفی کر دیا اور اگر ان پر آیات کو ظاہر کر دیتا اور جہلاء بھی یقین سے ان کی ولایت اور قُربِ الٰہی کو جان لیتے تو ان میں سے محسنین کا ثواب باطل ہو جاتا اور وُہ قبولیتِ عمل سے محروم ہو جاتے اور بُرے لوگوں کے اعمال برباد ہو جاتے۔ عمل کرنے والوں کے اعمالِ خیر و شر پوشیدہ رہیں۔ اور یقین کے پردے کے پیچھے امید رکھے اور حسنِ ظن سے کام لے اور سزائیں موخر کر دی جائیں چنانچہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی عظمتِ شان اور بلند درجات مخفی ہیں۔ چنانچہ اس کے اخفاء میں ان کی دینی سلامتی ہے اور فتنہ میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہتے ہیں اور ان کی حرمت خراب کرنے والوں پہ اور ان کی وجہ سے شعائر الٰہی کی توہین کرنے والوں پر بھی (مہلت) کا انعام ہے جبکہ وہ پس پردہ برائیاں کرتے ہیں یہ اللہ کریم وہاب کا لطف و احسان ہے جیسے کہ حدیث میں آیا، کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"جس نے میرے اولیاء میں سے کسی ولی کو ایذا دی اس نے مجھے جنگ کی دھمکی دی۔ پھر اگر اس نے مجھے پکارا تو میں بدلہ لینے والا ہوں اور اس کی مدد اپنے سوا کسی غیر کے سپرد نہیں کروں گا۔"

جن نعمتوں کے اخفاء پر ہم پر شکر لازم ہُوا اس کے مفہوم میں حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے تین کو تین میں چھپا دیا۔ اپنی رضا کو اپنی اطاعت میں چھپا دیا۔ اس لیے کسی طاعت کو بھی معمولی نہ سمجھو۔ شاید کہ اسی میں اس کی رضا ہو اور نافرمانیوں میں غضب چھپا دیا۔ اس لیے کسی نافرمانی کو معمولی نہ جانو شاید اسی میں اس کا غضب پوشیدہ ہو۔ اپنی ولایت اس نے اپنے مومن بندوں میں چھپا دی۔ اس لیے کسی مومن کو حقیر نہ جانو شاید کہ وہ اللہ تعالیٰ کا ولی ہو۔ یہ اسی طرح ہے جیسے کہ کسی نے ایک نبی کو ایذا دی اور وہ اس کے نبی ہونے سے آگاہ نہ ہو مگر اللہ تعالیٰ نے اسے نبی بنایا ہو اور وہ اس بات سے باخبر ہونے سے پہلے ایسا کرے۔ اب اس پر اس کا گناہ اس وقت بہت زیادہ ہو گا جبکہ وہ یہ جانتا ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کا نبی ہے۔ اس لیے کہ نبوت کا احترام بہت زیادہ ہے۔

شاکرین کے دو طریق ہیں

شاکرین کے دو طریق ہیں :

۱۔ ایک طریق دوسرے سے بلند تر ہے۔ ان میں سے ایک اہلِ رجاء کا شکر ہے یعنی جب وُہ ظاہر نعمتوں سے امید رکھتے ہیں اور حسنِ معاملہ کی وجہ سے انہیں اچھی امید ہوتی ہے تو اس کو مکمل کرنے کی امید میں کام کرتے ہیں۔ اب ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ شکر کے طور پر تیزی سے اعمالِ صالحہ کی طرف دوڑتے ہیں۔ اس لیے کہ دوسری مخلوق کے مقابلہ میں انہیں اس بات سے مخصوص کیا گیا اور ان پر یہ انعام ہُوا۔

۲۔ دوسرا خائفین کا شکر ہے جو کہ زیادہ بلند درجہ کا ہے یعنی بُرے انجام کا خوف ہو۔ حکم سابقہ کے باعث بدبختی غالب آنے کا ڈر ہو۔ اللہ تعالیٰ بدبختی سے پناہ دے۔ چنانچہ ان کا خوف انہیں ایمان کے انعامات ملنے کا باعث اور راہ رُو بنا دیتا ہے اور یہ انعاماتِ انعام کا غبطہ ان کے دلوں میں اسلام کی قدر و منزلت اور عظمت پیدا کر دیتا ہے۔ اس لیے اس کی وجہ سے ان پر نعمت بھی خوب ہوتی ہے اور اس کی معرفت ہی ان کا شکر ہے۔ اب خوف و ڈر در اصل رزاق کے لیے شکر میں ان کے لیے ایک راہ بن گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو نعمت قرار دیا۔

عارفین کا شکر اور مقربین کا مشاہدہ

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ہر نعمت پر شکر لازم ہے :

قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا[1] (کہا دو مردوں نے ڈرنے والوں میں سے، خدا کی نوازش تھی ان دو پر)

بعض مفسرین کا فرمان ہے کہ ان دونوں پر خوف کے ذریعہ انعام فرمایا اور کلام کی دو وجوہ میں سے ایک توجیہ ہے۔ اور اگر بندہ اپنے مولائے کریم کا شکر کیوں نہ کرے۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ اس قدر جود و سخا اور کرم فرماتا ہے۔ جس کی انتہا نہیں۔ اس کا فضل و احسان اندازے سے باہر ہے۔ جب اللہ کریم ایسی اعلیٰ اور صفات اور کریمانہ شان دکھاتا ہے، تو بندے پر لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی خاطر شکر کرے نہ کہ ان نعمتوں و افعال پر۔ اور یہ محبین کا ذکر ہے۔ اس لیے کہ اگر اللہ کریم ایسی کریمانہ و حلیمانہ صفات سے پیش نہ بھی آتا تو بندے کیا بگاڑ سکتے تھے؟ اور ان کے پاس کیا تدبیر تھی؟ اس لیے تمام حمد و ثناء اس ذاتِ کریم کے لیے ہے اور تمام شکر کا وہی حقدار ہے وُہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور اس کی ذاتِ اعلیٰ اور کریمانہ صفات ہمیشہ

---

[1] مائدہ آیت ۲۳۔

فضل وکرم برساتی رہیں گی۔ اس کی معرفت حاصل کر لینا، عارفین کا شکر ہے اور اس کا مشاہدہ کرنا مقربین کا مقام ہے۔ ان کا شکر اللہ تعالیٰ کی خاطر ہے۔ ان کی دعا حمد و تقدیس بیان کرنا ہے۔ ان کے اعمال، اجل عظیم تعالیٰ کی تعظیم و اجلال ہیں اور ان کی درخواست وسوال، معانی ذات کے مشاہدہ سے حصہ پانا اور تجلی صفات ہیں۔ اور یہ ایسی بات ہے کہ جو تحریر و بیان سے بالاتر ہے۔ عقل سے اس کی توضیح سمجھ میں نہیں آتی ہے بلکہ یہ تو مشاہدہ میں داخل ہے جو رازِ کلام کا مشاہدہ کرے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ۔ (اس کی مثل کوئی چیز نہیں)

اس مشاہدہ کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام رب تعالیٰ کے ساتھ نثار ہوئے اور قرب پانے سے مانوس ہوئے اور فرصت تمکین حاصل ہوئی۔ چنانچہ عرض کیا:

"میرے لیے ہے جو تیرے لیے نہیں۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وہ کیا ہے؟"

میرے لیے تیری مثل ہے اور تیری مثال صرف تو ہی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "تو نے سچ کہا۔"

مطلب یہ ہوا کہ میرے لیے تو ہے ان اوصاف پر اور یہ سالکین کا مقصود ہے اور راغبین کے لیے اس پر مزید نہیں اور تیری مثل تو ہے۔ اس لیے کہ تیری مثل کوئی چیز نہیں اور تیرے بغیر کوئی معبود نہیں۔ چنانچہ ان مفاہیم پر شکر بھی ایک دقیق شکر ہے۔ جس نے تجھے دنیاوی فضولیات سے کنارہ کش کر کے شکرِ الٰہی میں مشغول کر دیا۔ اب وہ دنیا میں کاموں کے اندر سب سے کم انہماک رکھنے والا ہے اور اس پر حساب بھی آسان ہو چکا ہے اور دوسروں کو دنیا میں مشغول کر کے اس نعمت سے محروم کر دیا۔ دنیا تجھ سے دور ہوئی اور دوسرے سے جا چپکی۔ اس میں بھی تجھ پر دو نعمتیں ہوئیں اور ان پر دو شکر لازم ہوئے۔ اس طرح جب تم دیکھو کہ ایک آدمی منافق کی عادات میں ملوث ہو گیا یا اس میں متکبرین کا اخلاق آ گیا یا دونوں حالات اس پر آ گئے اور فاسقین کی حالت اس پہ جاری ہو گیا تو ان سب باتوں سے بچنے کو اپنے اوپر خدا کی نعمت سمجھو۔ اس لیے کہ اگر خدا تعالیٰ تجھ پر فضل نہ فرماتا تو تو ان سے بری صفات سے نہ بچ سکتا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تجھے جس جس برائی سے محفوظ رکھا اور جس جس نیکی کی توفیق بخشی۔ یہ سب خدا تعالیٰ کے انعامات ہیں ورنہ عام لوگ سب تجھ جیسے انسان ہیں۔ ان سب پہ خدا تعالیٰ کی قدرت و مشیت جاری ہے مگر ان میں سے تجھ پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہوا۔ اور انعامات کو سمجھنا اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔

سزاؤں کا باعث، قلّتِ شکر ہے

اور

قلّتِ شکر کا باعث، جہالت ہے

لوگوں پر عام سزائیں اور تکالیف اس لیے آتی ہیں کہ وہ شکر نہیں کرتے یعنی کمیٔ شکر ان آفات کا باعث ہے اور کمی شکر کا باعث نعمت سے جاہل ہونا ہے اور جہالتِ نعمت کا باعث یہ ہے کہ انہیں اللہ تعالےٰ کی معرفت حاصل نہیں ہوتی یا بہت کم حاصل ہوتی ہے اور منعم تعالیٰ سے طویل غفلت برتتے ہیں۔ اس کی نعمتوں پر غور کرنا چھوڑ بیٹھتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے احسانات کا ذکر ترک کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کا حکم بھی دیا کہ؛

فَاذْكُرُوْٓا اٰلَاۗءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ [1] (سو یاد کرو احسان اللہ کا، شاید تمہارا بھلا ہو)

یعنی اس کے انعامات کا ذکر کرو اور مفسرین نے فرمایا؛

وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ [2] (اور یاد کرو احسان کا، جو تم پہ اور جو اتاری تم پر کتاب اور کام کی باتیں کہ تم کو سمجھاوے)

اور اسی کے مفہوم میں ہے کہ؛

وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰي مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ [3] (اور اس واسطے کہ پوری کرو گنتی اور بڑائی اللہ کی اس پر کہ تم کو راہ بتائیں اور شاید تم احسان مانو)

یعنی خدا تعالیٰ نے تمہیں ہدایت اور توفیق کی نعمت عطا فرمائی۔ اب جب بندہ ایک نعمت سے جاہل ہوا تو اسے اس کی معرفت حاصل نہ ہوگی۔ اور جب اسے نہ پہچانا تو اس کا شکر ادا نہیں کرے گا اور جب شکر نہ کیا تو مزید انعام ملنا بند ہو جائے گا اور جس سے مزید انعام کٹ گیا وہ چاہے جو دعویٰ بھی کرے مگر وہ خسارے اور نقصان میں ہی ہے۔

مزید برآں جو آدمی جہالت کی وجہ سے نعمت پر شکر ادا نہ کرے اس کے بارے میں کفر تک کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور اگر خدانخواستہ کفر کر بیٹھا تو سخت ترین اور دائمی عذاب میں گرفتار ہو جائے گا۔ ہاں اللہ تعالیٰ ہی کرم کرے

---

[1] اعراف آیت ۶۹

[2] البقرۃ آیت ۲۳۱

[3] البقرۃ آیت ۱۸۵

راہِ ہدایت دے دے تو بات الگ ہے۔

پیدائش کی آسانیوں کے سلسلہ میں چار انعامات اصول ہیں:

۱۔ تمام جانداروں اور چوپاؤں کے ارحام سے نطفہ کو نکالا۔

۲۔ پھر کاشت کاری کے ذریعہ زمین کے پیٹ سے پھل اُگائے۔

۳۔ پھر پانی پیدا فرمایا جو ہمارے پینے اور نباتات کے لیے غذا کے کام آتا ہے۔

۴۔ پھر آگ پیدا فرمائی۔ اس میں روشنی اور تمام کھانوں کو تیار و درست کرنے کی قوت ڈال دی۔ ان انعامات میں اہلِ خرد کے لیے نصیحت ہے۔ منعم تعالیٰ نے سورۃ واقعہ کے آخر میں انہی انعامات کا ذکر فرمایا اور ان کو اپنی جانب منسوب فرمایا اور ان میں کسی کو شریک نہیں بنایا اور کام کرنے والے بندوں پر اپنی نعمتوں کے دروازے کھول دیے۔

افضل ترین انعام سب سے افضل نعمت، اللہ سبحانہ' و تعالیٰ پر ایمان کی، پھر رسول اللہؐ پر، پھر قرآن پر ایمان کی نعمت ہے۔ پھر یہ انعام فرمایا۔ ہمیں ساری دنیا سے بہترین امت قرار دیا، پھر منجمد اور مردہ قسم کی مخلوق کی بجائے جاندار مخلوق بنایا اور تمام چوپاؤں کے مقابلہ میں ہمیں ایک انسان بنایا، پھر ہمیں عورت کی بجائے مرد بنا کر پیدا فرمایا اور پھر ہمیں اچھی صورت عطا فرمائی۔ پھر گمراہی سے محفوظ دل عطا فرمائے اور نفس امارہ سے بچا کر رکھا۔ پھر اجسام کو صحت مند بنایا، پھر پردہ ہٹایا، پھر تمام ضروریات پوری کر دیں۔ پھر کھانے کے لیے طرح طرح کے پھل وغیرہ پیدا فرمائے۔ پھر زمین و آسمان کی ہر صنعت کو انسان کے لیے مسخر کر دیا۔ اب جس قدر کثرت سے انعام ہوئے اس قدر ان پر کثرت سے اور بہترین طریق سے ان نعمتوں پہ شکر کرنا لازم ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔ (اور اگر تم شمار کرو اللہ کی نعمت کا تو انہیں نہیں شمار کر سکتے)

حضرت ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

نعمتوں کی معرفت اور اللہ تعالیٰ کے علم دستاری کی پہچان مخصوص طور پر صدیقین کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ اصدق القائلین اور احسن الواصفین ہے۔ اس نے فرمایا:

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ (اور اگر تم اللہ کی نعمت کا شمار کرو تو انہیں نہیں گن سکتے۔ بے شک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے)

چنانچہ مغفرت و رحمت کے اہل لوگوں کے لیے یہ دونوں اوصاف مل کر کامل نعمت ہے۔ پھر اس طرح فرمایا:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ۔ (بےشک انسان بڑا بے انصاف ہے ناشکرا)

چنانچہ یہ نعمتِ (مغفرت و رحمت) تو بہت ہی بڑی نعمت ہوئی اور بہت بڑا احسان ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ تقویٰ اور مغفرت والا ہے اور بندہ اس کے اہل ہے۔ اس لیے کہ مولائے کریم نے اس کے ساتھ اس کا وصف فرمایا حتیٰ کہ وہ اپنی کارسازی کی بنا پر اس پر فیض فرماتا ہے اور اس کی نعمت سے عاملین نے عمل کیا۔ اس کی نعمت سے انہیں جزا حاصل ہوئی اور اس کی نعمت کے ذریعہ جہلا نے اس کی نافرمانی کی اور یہ اسی کی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ستاری و حلم سے کام لیا۔ اسی طرح جمیل کو ظاہر کرنا اور برائی کو چھپا دینا بھی اسی کی نعمت ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ اس کی دونوں میں سے کون سی نعمت بڑی ہے، ظاہر کردہ اچھی بات یا بری بات کہ جس پر پردہ ڈال دیا۔ یعنی اظہار یا ستاری میں کیا چیز بڑی ہے؟ ایک منقولہ دعا میں اللہ تعالیٰ نے دونوں اوصاف سے مدح فرمائی۔

یَا مَنْ اَظْهَرَ الْجَمِيْلَ وَ سَتَرَ الْقَبِيْحَ۔ (اے وہ جس نے جمیل کو ظاہر اور قبیح کو مخفی کر دیا)

اس کے علاوہ صحت اور فراغت بھی نعمت ہے۔ یہ دنیا کی پہلی نعمتیں ہیں اور اعمالِ آخرت کی جڑ ہیں۔ ان دونوں کے ذریعہ ہی قابلِ رشک اعمال ہوتے ہیں جیسے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دو نعمتیں ایسی ہیں جن میں اکثر لوگ رشک کرتے ہیں۔ صحت اور فراغت۔"

نعمت پر شکر کرتے رہو

حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ نے فرمایا:

"نعمتوں پر ہمیشہ شکر کرتے رہو۔ اس لیے کہ کم ہی ایسا ہوا کہ کسی قوم سے کوئی نعمت جا کر پھر واپس آئی ہو۔"

بعض سلف رحمہ اللہ نے فرمایا:

"نعمتیں بھاگنے والی ہیں انہیں شکر کے ذریعہ قابو کرو۔"

ایک حدیث میں مروی ہے:

"جس بندے پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں زیادہ ہوں اس کی طرف لوگوں کو کثرت سے حاجات لاحق ہوتی ہیں جس نے ان کو معمولی سمجھا تو اس سے نعمتیں واپس جانا شروع کر دیں گی۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ[1] (اللہ نہیں بدلتا جو ہے کسی قوم کو جب تک وہ نہ بدلیں جو اپنے بیچ ہے)

اس کی ایک توضیح یہ ہے کہ وہ ان پر اپنی نعمتیں اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک کہ وہ شکر کو ضائع کر کے

---

[1] سورۃ رعد۔ آیت ۱۱۔

خود ہی نعمتوں کو نہ بدل ڈالیں۔ اب انہیں اس تعبیر کی سزا ملتی ہے۔ دوسری توجیہ یہ ہے کہ " ان کی سزا میں اس وقت تبدیلی ہوتی ہے جبکہ وہ توبہ کر کے نافرمانیوں میں تبدیلی کر لیتے ہیں۔ (یعنی نافرمانی چھوڑ کر اطاعت کرنے لگتے ہیں" اس سے اپنی حکمت کا پہلا سبب بیان کیا۔ پھر دوسرا سبب بیان فرمایا اور وہ حکمت و مشیت کا مسبب الاسباب ہے۔ کہا جاتا ہے کہ " بندے کے جسم کے ہر بال کے نیچے ایک نعمت ہے اور اس کے بدن کی ہر رگ میں دو نعمتیں ہیں۔ ایک نعمت سکون دینے کی اور دوسری نعمت حرکت پیدا کرنے کی ہے۔ اس کے علاوہ ہر ہڈی میں چار نعمتیں ہیں اور ہر جوڑ میں سات نعمتیں ہیں اور انسانی بدن میں تین سو ساٹھ جوڑ ہیں ہڈیوں کے بارے میں ایسے ہی معاملہ ہے۔ ہر پلک جھپکنے میں دو نعمتیں ہیں۔ ہر سانس میں دو نعمتیں ہیں۔ زندگی کے ہر دقیقہ پر خدا کی نعمت ہے اور ان نعمتوں کا شمار ناممکن ہے اور شعیرہ کا بارھواں حصہ دقیقہ ہے اور ساعت کا بارھواں حصہ شعیرہ ہے اور دن رات میں انسان چوبیس ہزار سانس لیتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کی اخبار میں ہے:

" اے پروردگار! میں تیرا کیوں کر شکر کر سکتا ہوں جبکہ میرے بدن کے ہر بال میں نعمتیں ہیں کہ اس کی جڑ کو تُو نے نرم کیا اور اس کے سر کو تُو نے پختہ فرمایا۔"

روایت میں ہے:

" جو آدمی صرف کھانے پینے کے امور میں ہی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو پہچانتا ہو تو اس کا علم کم ہوا اور اس کا عذاب موجود ہوا۔"

یہ اس صورت میں ہے کہ عافیت بقدرِ کفایت روزی اور ہر طرح کا آرام حاصل ہو۔

باطن جسم میں دو گنا انعامات ہیں

مشائخ فرماتے ہیں کہ جسم کے باطن میں ظاہر سے سات گنا انعامات ہیں اور تمام بدن پر جس قدر انعامات ہیں صرف دل پر ان سب سے کئی گنا انعامات ہیں اجسام و قلوب کی نعمتوں سے کئی گنا نعمت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اور علم و یقین باللہ کی نعمت حاصل ہوئی۔ یہ تمام نعمتیں دیکھیں تو ان کی تعداد شمار سے باہر ہے اور ان کی عظمت گمان سے بالاتر ہے۔ بس خالق کریم کو ان کا علم حاصل ہے۔

اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَ هُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ۔ (بھلا وہ نہ جانے جس نے بنایا اور وہی ہے بھید جانتا خبردار)

کھانے پینے اور لباس و نکاح کی نعمتوں کو موزوں بنایا۔ ان کی اذیت دُور کر دی اور ان میں خوشگواری بھر دی یعنی مدخل عمدہ اور مخرج آسان کر دیا۔ اور نفع کو باقی رکھا۔ اس کی صورت یا کسی صفت کو بدلنے نہیں دیا۔

چنانچہ یہ بھی اس کی نعمتیں ہیں۔

فرمایا: ایک روٹی ہی کو لو۔ یہ بھی اُس وقت تک تیار ہو کر سامنے نہیں آتی جب تک آسمان و زمین اور ان کے درمیان کے اجسام و اعراض، روز و شب اور ہوائیں اس میں تین صد ساٹھ افعال نہ کر ڈالیں۔ آدم اور اس کے اعمال اور چوپائے اور ارضی معدنیات بھی اس خدمت میں حصہ لیتی ہیں۔ تب جا کر ایک روٹی تیار ہوتی ہے۔ سب سے پہلے میکائیل علیہ السلام خزائنِ (سماوی) سے پانی ناپ کر بادلوں پر ڈالتے ہیں۔ پھر بادل اسے اٹھائے اٹھائے چلتا ہے۔ پھر ہوا گرج اور بجلی اس بادل کو اٹھاتی ہے اور دو فرشتے بادل کو ہنکاتے ہیں۔ اس طرح چلتے چلتے سب سے آخر میں نانبائی روٹی پکاتا ہے۔ جب ایک روٹی تیار ہوتی ہے تو اس میں در اصل سات ہزار صنعتیں ہو چکی ہوتی ہیں۔ اور ہر صانع اس میں اصل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ایک روٹی مہیا کرنے میں اللہ تعالیٰ کے کس قدر عظیم و کثیر انعامات ہیں اور باقی انعامات کا شمار ہی احاطہ تصوّر و تحریر سے باہر ہے۔ اور بندے پر ہر نعمت کے بدلے ایک شکر لازم ہے۔ اس طرح اگر صرف ایک روٹی ہی کا شکر طلب کر لیا گیا تو ہلاکت سامنے ہوگی۔ اب اللہ کریم ہی ہے کہ بندے کو اپنی رحمت کے آغوش میں لے لے۔

کامل نعمت

مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو یہ کہتے سنا:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ تَمَامَ النِّعْمَۃِ۔ (اے اللہ میں تجھ سے تمام نعمت و کامل نعمت مانگتا ہوں)

آپؐ نے فرمایا:

"جانتے ہو کہ کمال نعمت کون سی ہے؟"

اس نے عرض کیا: "نہیں"

آپؐ نے فرمایا:

"جنت میں داخل ہونا۔"

بعض حکماء سے پوچھا گیا: "نعمت کیا ہے؟"

اس نے جواب دیا: "غنا۔ اس لیے کہ میں نے فقیر و محتاج کو دیکھا۔ اس کی کچھ زندگی نہیں۔"

پوچھا گیا: "اور بتائیے؟"

انہوں نے کہا: "عافیت، اس لیے کہ میں نے بیمار کو دیکھا اس کی بھی کچھ زندگی نہیں۔"

عرض کیا گیا: "اور بتائیے؟"

فرمایا: "امن۔ اس لیے کہ میں نے خائف آدمی کو دیکھا کہ اس کی بھی زندگی کچھ نہیں۔"

کہا گیا: "اور بتایئے؟"

فرمایا: "جوانی۔ اس لیے کہ میں نے بوڑھے کو دیکھا اس کی بھی کچھ زندگی نہیں۔"

کہا گیا: "اور بتایئے؟"

کہا: "مجھے مزید معلوم نہیں۔"

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں

اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيٰوتِكُمُ الدُّنْيَا۔ (ضائع کیے تم نے اپنے مزے اپنی دنیا کی زندگی میں)

ایک توجیہ یہی بن سکتی ہے کہ شباب چلا گیا۔ ایک قول یہ ہے کہ فراغت اور ایک قول میں امن وصحت جاتی رہی، اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں بھی ایک توجیہ ہے۔

وَعَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا اَرٰكُمْ مَا تُحِبُّوْنَ۔ (اور نافرمانی کی بعد اس کے کہ تم کو دکھا چکا تمہاری خوشی کی چیز)

یعنی عافیتیں اور غنا۔ اس مفہوم میں ایک جگہ فرمایا:

وَ اَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّ بَاطِنَةً۔ (اور بھر دیں تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں)

ظاہری انعامات عافیتوں کے ہیں اور باطنی انعامات ابتلاؤں کے ہیں۔ اس لیے کہ انہی کے ذریعہ اخروی نعمت حاصل ہوتی ہے اور اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ۔ (اور مالوں اور جانوں اور پھلوں میں کمی کر کے اور خوشخبری دو صبر کرنے والوں کو)

حدیث میں آتا ہے: کہ

"جس نے اس حالت میں صبح کی کہ اس کا بدن صحت مند ہے۔ گھر میں وہ مامون ہے اور اس کے پاس آج کے دن کی خوراک ہے گویا اس کے لیے دنیا بہتات کے ساتھ جمع کر دی گئی۔"

بعض اہل قناعت نے اس مفہوم کو شعر میں ادا کر دیا:

اِذِ الْقُوْتُ تَاتِيْ لَكَ وَ الصِّحَّةُ وَ الْاَمْنُ

وَ اَصْبَحْتَ اَخَا حُزْنٍ فَلَا فَارَقَكَ الْحُزْنُ

(جب تیرے پاس خوراک، صحت اور امن موجود ہو)

(اور تو غمگین حالت میں صبح کرے تو تجھ سے غم جدا ہی نہ ہو)

ایک دوسرے صاحب فرماتے ہیں:

کُنّ وَ فَلْقَۃُ خُبْزٍ ✦ وَ کُوزُ مَاءٍ وَ اَمْنٌ
اَلَذُّ مِنْ کُلِّ عَیْشٍ یَحْوِیْہِ سَخَبٌ وَ سِجْنٌ

(یوں تھیں کہ روٹی کا ٹکڑا اور پانی کا لوٹا ہو اور امن چین ہو)
(یہ ہر اس عیش سے لذیذ تر ہے کہ جس کو فراوانی اور تنگی گھیرے)

اللہ کی رحمت سے ہی جنّت میں داخلہ ہوگا

بتلاتے ہیں کہ ایک عابد نے ستر سال تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی اور اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتے کے ذریعہ اسے اپنی رحمت سے جنّت میں داخلہ کی خوشخبری دی۔ اس نے سوچا بلکہ میرے عمل کے باعث (جنت ملی)۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا یہ کھٹکا معلوم کیا تو اس کی ایک رگ کو حکم دیا کہ خوب پھڑکو۔ بتاتے ہیں کہ اب وہ بڑا پریشان و بے قرار ہوا۔ اس کی عبادت چھوٹ گئی۔ اس کے تمام اعمال ختم ہوئے اور اس بے چینی و بے قراری میں رہ گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے رگ کو پُرسکون ہوجانے کا حکم دیا۔ اور وہ بندہ دوبارہ عبادت کرنے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی انقار فرمائی کہ "تیری عبادت کی قیمت صرف ایک رگ ہے۔ وہ پرسکون ہوگئی۔" چنانچہ اس نے اعتراف کرلیا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس مفہوم کی ایک روایت آتی ہے کہ

"ایک آدمی نے ستر برس تک خدا تعالیٰ کی عبادت کی۔" فرمایا کہ "اب اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت کے باعث جنت میں داخل ہونے کا حکم دے گا تو وہ کہے گا بلکہ میرے عمل کے باعث اللہ تعالیٰ فرمائے گا" میرے بندے کو اس کے عمل کے باعث جنت میں داخل کردو۔"

فرمایا کہ" پھروہ ستر برس جنت میں رہے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ اسے نکال دینے کا حکم دے گا اور اس آدمی سے کہا جائے گا کہ تیرے عمل کا ثواب پورا ہوگیا۔"

فرمایا کہ" وہ خدا کے سامنے گر پڑے گا اور نادم و شرمندہ ہوگا۔ چنانچہ اپنے اور اپنے پروردگار کے درمیان سب سے قوی ترین تعلق سوچے گا تو وہ رجاء (امید) اور حسنِ ظن کا تعلق ہوگا۔ چنانچہ کہے گا:

"اے پروردگار! مجھے میرے عمل کے باعث نہیں، بلکہ اپنی رحمت سے جنت میں رہنے دو۔"

فرمایا: "پھر اللہ عزوجل فرمائے گا:

"میرے بندے کو میری جنت میں میری رحمت کے باعث رہنے دو۔"

رنج پر شکوہ نہ کرو

ایک آدمی کے متعلق منقول ہے کہ اس نے اہلِ شہر میں سے کسی کے سامنے اپنے فقر و فاقہ کی شکایت کی اور بتایا کہ مجھے اس کا بڑا غم ہے۔ اس آدمی نے کہا:

"کیا تو پسند کرتا ہے کہ تو اندھا ہو اور تجھے دس ہزار مل جائیں؟"

اس نے کہا: نہیں۔"
اس نے پُوچھا: "کیا تو اسے پسند کرتا ہے کہ تُو گونگا ہو اور تجھے دس ہزار مل جائیں؟"
اس نے کہا: "نہیں"
اس نے پُوچھا، کیا تُو پسند کرتا ہے کہ تیرے ہاتھ پاؤں کٹے ہوں اور تجھے دس ہزار مل جائیں؟"
اس نے کہا: "نہیں"
اس نے کہا: "کیا تو پسند کرتا ہے کہ تو دیوانہ ہو اور تجھے دس ہزار مل جائیں؟"
اس نے کہا: "نہیں"
اس نے کہا: "پھر تجھے حیا نہیں آتی کہ تُو اپنے آقا کی شکایت کرتا ہے۔ حالانکہ تیرے پاس پچاس ہزار کے برتن موجود ہیں۔ اور واقعہ بھی یہی ہے۔ اس لیے کہ انسان کے اعضاء و جوارح کی قیمت یہی ہے کیونکہ ان چیزوں کی یہی دیت ہے۔

قرآن سب سے بڑی دولت ہے

بعض شیوخ سے اس مفہوم میں منقول ہے کہ ایک اللہ کے مقرب قاریِ قرآن پر فقر کی حالت شدت اختیار کر گئی۔ اسے بہت غم ہوا اور تنگی محسوس کی۔ بتاتے ہیں کہ انھوں نے خواب میں ایک کہنے والے کو یہ کہتے سُنا:
"کیا تو پسند کرتا ہے کہ ہم تجھے الانعام بھلا دیں اور تجھے ایک ہزار دینار دے دیں؟"
اس نے کہا: "نہیں"
اس نے کہا: "اچھا۔ سورۃ ہُود؟"
اس نے کہا: نہیں"
اس نے کہا: "اچھا سورۃ یوسف؟"
اس نے کہا: "نہیں"
اس نے کہا: "تیرے پاس ایک لاکھ کی ملکیت کا سرمایہ ہے اور تو پھر بھی فقر کی شکایت کرتا ہے" چنانچہ صبح کو اٹھا تو اس کا غم دور ہو چکا تھا۔
اس طرح حدیث میں آتا ہے:
تَغَنَّوْا بِالْقُرْآنِ۔
یعنی قرآن کے ساتھ استغناء حاصل کرو اور جو آیات اللہ تعالیٰ کے ساتھ استغناء حاصل نہیں کرتا تو اسے خدا غنی ہی نہ کرے۔ قرآن ہی تو غنا ہے اس کے ساتھ کچھ فقر نہیں اور نہ ہی اس کے بعد کہیں اور غناء

ملتا ہے اور جس کو اللہ تعالیٰ قرآن عطا کرے۔ پھر وہ سمجھے کہ ایک آدمی مجھ سے بھی زیادہ غنی ہے تو اس نے اللہ تعالیٰ کی آیات کا استہزاء کیا۔"

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں :

"اس نے اللہ عزوجل کے نازل کردہ (کلام) کو ہلکا سمجھا۔"

حدیث میں آتا ہے : کہ

"جو قرآن کے ساتھ (غنا حاصل نہ کرے یا) تغنی نہ کرے تو وہ ہم سے نہیں۔"

اور ایک مجمل خبر میں ہے کہ :

"یقین کے ساتھ غنا کافی ہے۔" اور قرآن ہی حق الیقین ہے۔

بعض سلفؒ سے منقول ہے : کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

"میں نے جس بندے کو تین سے مستغنی کر دیا اس پر اپنی نعمت مکمل کر دی :

۱۔ سلطان سے کہ وہ اس کے پاس آئے۔

۲۔ طبیب سے جو اس کا علاج کرے۔

۳۔ اور اس سے جو اس کے [illegible] ہاتھ میں (مال) ہے۔

ہر وقت شکر کرو

حضرت ایوب علیہ السلام کی مناجات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی :

"آدمیوں میں سے میرے ہر بندے کے ساتھ دو فرشتے ہیں۔ جب بندہ میری نعمتوں پر شکر کرتا ہے تو دونوں فرشتے کہتے ہیں :

"اے اللہ ! اس پر اپنی نعمتیں مزید فرما۔ اس لیے کہ تو اہل شکر و حمد ہے۔ چنانچہ شاکرین سے خوب قریب ہو اور ان کو مزید کی توفیق دے اور ان پر مزید انعام فرما۔ اور اے ایوبؑ! شاکرین کے لیے یہ (انعام) کافی ہے کہ ان کا درجہ میرے ہاں اور فرشتوں کے ہاں بڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ میں ان کے شکر کا شکر کرتا ہوں اور میرے فرشتے ان کے لیے دعا کرتے ہیں اور زمین ان سے محبت کرتی ہے اور میرے فرشتے ان کے لیے دعا کرتے ہیں اور زمین ان سے محبت کرتی ہے اور آثار و نشانات ان پر روتے ہیں۔ اس لیے اے ایوب شکر گزار بن جا اور میرے احسانات و انعامات کو یاد کرنے والا ہو جا۔ اور میں تمہیں ذکر کی توفیق دوں تو ہی تو میرا ذکر کر سکتا ہے اور میں تجھے شکر کی توفیق دوں تو ہی تو میرا شکر کر سکتا ہے اور میں ہی اپنے اولیاء کو نیک کاموں کی توفیق دیتا ہوں۔ پھر جن کی توفیق دیتا ہوں ان پر ان کا شکر کرتا ہوں اور شکر پر انہیں جزا دیتا اور ان پر راضی ہوتا ہوں، چنانچہ میں نے تھوڑے پر کثیر رضا کی۔ قلیل کو قبول کر کے خوب خوب جزا دی اور میرے نزدیک بد ترین بندہ

وہ ہے جو کہ صرف ضرورت کے وقت ہی میرا شکر کرے اور صرف سزا اور ابتلاء کے وقت ہی میرے سامنے زاری کرے۔

اللہ تعالیٰ نے شاکرین کو صالحین، مقربین اور عالمین فرمایا۔ یہ تینوں اعلیٰ ترین مقاماتِ یقین میں سے ہے۔

اللہ عزوجل نے فرمایا:

وَ قَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ۔ (اور تھوڑے ہیں میرے شکر کرنے والے بندے)

جیسے کہ فرمایا،

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ قَلِیْلٌ مَّا ھُمْ۔ (مگر جو یقین لائے اور کام کیے اچھے، اور تھوڑے لوگ ہیں ویسے)

اور مقربین کے ذکر میں فرمایا:

ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَ قَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ۔ (بڑی جماعت ہے پہلوں میں سے اور تھوڑے ہیں بعد والوں میں سے)

اور اسی طرح فرمایا:

مَا یَعْلَمُھُمْ اِلَّا قَلِیْلٌ۔ (نہیں جانتے انہیں مگر تھوڑے)

عافیّت و یقین کا انعام

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے۔ انہوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا:

"اللہ تعالیٰ سے عافیت مانگو اور عافیت سے بڑھ کر بندے کو صرف یقین ہی کا انعام عطا ہوا ہے۔"

چنانچہ عافیت کو ہر عطا پر افضلیت حاصل ہے اور عافیت سے بڑھ کر یقین کو ہی درجہ حاصل ہے۔ اس لیے کہ دنیا کی نعمتیں عافیت کے ساتھ مکمل ہوتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ یقین بھی ہو تو آخرت کی نعمت بھی مل گئی۔ اس لیے یقین کو عافیت پر ایسی فوقیت حاصل ہے جیسے کہ دوام کو انتقال پر اور عافیت کا مطلب ہے کہ بدن کا بیماریوں اور امراض سے سلامت رہنا اور یقین کا مطلب ہے۔ دین کا خواہشات و گمراہی سے محفوظ رہنا۔ اس لئے یہ دونوں نعمتیں تمام انعامات پر حاوی ہیں اور ان کی وجہ سے بندے پر عظیم شکر لازم ہے۔ جیسے کہ دل اور جسم تمام نعمتوں پر حاوی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّ لَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ۔ (جس دن نہ کام آوے کوئی مال اور نہ بیٹے، مگر جو کوئی آیا اللہ کے پاس لے کر قلب سلیم)

اس کے مفہوم میں قوی ترین قول یہ ہے کہ شک و شرک سے محفوظ دل کو قلب سلیم کہا جاتا ہے اور ویسے صحیح

سالم دل ہو تو اسے عافیت والا دل کہا جائے گا اور شک و نفاق دل کی امراض ہیں۔ جیسے کہ فرمایا:
فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ۔ (ان کے دلوں میں بیماری ہے)
یعنی شک و نفاق کی مرض ہے اور دل کی کبائر گناہوں سے بھی عافیت ہو۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا:
فَیَطْمَعَ الَّذِیْ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ۔ (پھر لالچ کرے کوئی جس کے دل میں مرض ہے)
یعنی یہ یاری کا مرض ہے۔

ہر مصیبت پہ پانچ انعام

ہر مصیبت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے پانچ انعامات ہیں:
۱۔ یہ دین میں نہیں۔ اور ایک قول یہ ہے کہ غیر دین میں ہر مصیبت بھی دین کا ایک طریق ہے۔
۲۔ اس سے بڑھ کر آفت نہیں آئی۔
۳۔ وہ لازمی طور پر اس پر لکھی ہوئی تو تھی ہی اب ختم ہو گئی اور اسے اس سے چین آگیا۔
۴۔ دنیا میں ہی مصیبت آ کر ٹل گئی اور آخرت میں یہ آفت نہیں رکھی گئی ورنہ آخرت میں عذاب شدید کی صورت اختیار کرے گی۔
۵۔ اس کا اجر و ثواب اس سے بڑھ کر ہے۔ اس لیے کہ چاہے دین کے معاملہ میں مصیبت آئی مگر یہ بھی آخرت کی ایک راہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہمارے لیے باعثِ نصیحت ہے۔
اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ کَفَّارٌ۔ (بے شک انسان ہے بڑا بے انصاف، ناشکرا)
یعنی آفات پر بگڑ کر اور ناراضگی ظاہر کر کے ظلم کرتا اور نعمتوں کا کفران کر کے اور نافرمانیاں کر کے کفران کرنے والا ہے۔
منقول ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی جب وفات ہوئی تو ان کے لڑکے حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ تعزیت والوں کے لیے بیٹھے۔ بہت سے لوگ تعزیت کے لیے آئے۔ ان میں ایک اعرابی بھی تعزیت کیلیے آیا۔ اس نے یہ اشعار پڑھے:

اِصْبِرْ نَکُنْ بِکَ صَابِرِیْنَ فَاِنَّمَا صَبْرُ الرَّعِیَّةِ بَعْدَ صَبْرِ الرَّاسِ
خَیْرٌ مِّنَ الْعَبَّاسِ اَجْرُکَ بَعْدَهٗ وَاللّٰهُ خَیْرٌ مِّنْکَ لِلْعَبَّاسِ

(تو صبر کر، ہم بھی تیری وجہ سے صابر ہو جائیں گے اس لیے کہ سردار کے صبر سے رعایا صابر ہوتی ہے)
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس اعرابی سے بہتر کسی نے تعزیت کی۔ اس کی تعزیت کو انہوں نے مستحسن فرمایا۔
اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ۔ (بے شک انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے)

ایک قول یہ ہے کہ اس سے مراد وہ آدمی ہے جو مصائب پر شکوہ کرے اور خدا کی نعمتوں کو فراموش کر دے۔ اگر اس کو معلوم ہو جاتا کہ ہر مصیبت کے ساتھ دس سے زیادہ نعمتیں بھی ہیں تو شکایت کم ہو جاتی اور شکر بڑھ جاتا۔

مصائب کی تین اقسام

مصائب کی تین اقسام ہیں اور یہ سب اللہ کی نعمتیں ہیں :

۱۔ یا تو مصیبت درجہ بڑھائے گی۔ یہ مقربین و محسنین کی مصیبت ہے۔

۲۔ یا مصیبت کفارہ بن جائے گی۔ یہ خواص اصحاب یمین اور نیک بندوں کی مصیبت ہے۔

۳۔ یا سزا کے طور پر مصیبت آتی ہے۔ یہ صورت تمام مسلمانوں کے لیے ہے۔ یہ بھی اللہ کی رحمت و نعمت ہے کہ دنیا ہیں مصیبت آ کر ٹل گئی۔ ان نعمتوں کو پہچاننا، شاکرین کا طریق ہے۔

علماءؒ کے نزدیک افضل ترین نعمت، ایمان کی نعمت ہے۔ پھر دوامِ ایمان نعمت ہے۔ اس لیے کہ دوامِ ایمان دوسری نعمت ہے۔ اس لیے کہ یہ دوسری مشیت کا دوسرا حکم ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے صرف اول حکم سے دوام مظہر نہیں ہو جاتا۔ خدا تعالیٰ کے ارادہ سے ایک چیز ظاہر ہوتی۔ پھر نہ ہونے کی طرح معدوم ہو جاتی ہے۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ دُوسرا حکم دے کہ یہ چیز ثابت و دوام رہے۔ پھر وہ دوام اختیار کرتی ہے۔ یہ اس کا دُوسرا حکم ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ آسمان و زمین کے مسلسل قائم رہنے کا ارادہ نہ فرماتا تو وہ قائم نہ رہتے۔ اگر اللہ تعالیٰ پہاڑوں کے مسلسل قائم رہنے کا ارادہ نہ کرتا تو وُہ قائم نہ رہتے۔

اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ قلوب میں دوام و ثباتِ ایمان کا ارادہ نہ فرمائے لکھے جانے کے بعد۔ تو لکھے جانے کے بعد پھر مٹ جائے اور وُہ کفر کی طرف لوٹ جائے مگر اللہ کریم کے بے شمار احسانات ہیں کہ دل میں ایمان کو دوام و ثبات بخشتا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے :

يَمْحُوا اللّٰهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ[1] (مٹاتا ہے اللہ جو چاہے اور رکھتا ہے)

یعنی جس کا ثبات نہ چاہے اُسے مٹا دیتا ہے اور جس کا ثبات پسند کرتا ہے اسے ثبات و دوام عطا فرماتا ہے۔

توفیقِ شکر اللہ کے فضل سے ہوتی ہے

بندہ، نعمتِ ایمان پر بھی خود شکر کی استطاعت نہیں رکھتا۔ نہ ہی خود اس میں طاقت ہے کہ اس کے

---

[1] رعد آیت ۳۹ ۔

فضل و کرم اور احسان تدبیر کو پہچان سکے۔ یہ سب باتیں اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت سے حاصل ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مفاہیم میں ایک توجیہ یہ ہے۔ فرمایا:

كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَا أَمَرَهُ۔ (کوئی نہیں، پورا نہ کیا جو اس کو فرمایا)

یعنی نعمتِ اسلام پر بندہ اب تک شکر ادا نہیں کرسکتا اور یہ نعمت دنیا و آخرت کی تمام نعمتوں کی جڑ اور اصل ہے۔ یہی نعمت آگ سے نجات کا باعث اور جنت میں داخلہ کی کنجی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس حال میں بندے کے لیے نہ کوئی کارساز ہے اور نہ سفارشی ہوگا۔

پھر حرکات و انفاس کے ساتھ اسلام و ایمان کا ثبات و دوام اللہ تعالیٰ کی دوسری نعمت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ۔ (لکھ دیا ہے ان کے دلوں میں ایمان اور ان کی مدد کی اپنے غیب کے فیض سے)

یعنی اپنی مدد و نصرت سے اسے پختہ و قوی فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کا یہی مفہوم ہے۔

يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ [1] (مضبوط کرتا اللہ ایمان والوں کو مضبوط بات سے دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں)

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان "یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ" (اے دلوں کے بدلنے والے) بھی اسی ہے۔ یعنی اے ایمان سے دلوں کو بدلنے اور شک و شرک میں گرا دینے والے۔ (یعنی ہدایت و رحمت کا سایہ ہٹا کر شیاطین کے قبضہ میں دے کر گمراہی میں ڈال دینے والے) "میرا دل اپنی طاعت پر پختہ کر دے۔" (عربی میں یہ ہے)

يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى طَاعَتِكَ

(اے دلوں کو پھیرنے والے میرا دل اپنی اطاعت پر پختہ فرما دے)

اس لطیف و عظیم نعمت کی معرفت کی برکت سے قلب سے سوءِ خاتمہ کا ڈر جاتا رہتا ہے۔ اس لیے کہ اسے مشیت کے ساتھ قلب کی سرعتِ تقلیب کا مشاہدہ حاصل ہو جاتا ہے اور یہ اس کا مزید شکر ہے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے مفہوم میں یہ داخل ہے۔

آپ نے فرمایا:

---

[1] ابراہیم آیت ۲۷۔

" اللہ تعالیٰ سے محبت رکھو۔ اس لیے کہ اس نے تم پر اپنی نعمتیں فرماتا ہے اور اس کے ذریعہ تمہیں غذا کی دیتا ہے۔ اب افضل ترین غذا اور عطاء ایمان کی نعمت اور معرفت کی نعمت ہے اور یہ غذا ہمیں مسلسل مل رہی ہے یعنی اسے دوام حاصل ہے۔ مختلف احوال میں ایمان پر ثابت قدمی اسی کی مدد سے ہے اور یہی تمام اعمال کی جڑ ہے اور اعمال اس کے احسانات کا ظرف ہیں۔ (اب کامل ترین احسان نعمت ایمان ہے)

اگر خدانخواستہ، اللہ تعالیٰ جس طرح لگا ہے ہمارے اعضاء کو گناہوں میں مبتلا ہونے دیتا ہے اسی طرح اگر وہ ہمارے قلوب کو توحید سے پھیر دیتا اور جس طرح لگا ہے اعمال کرنے میں ہماری نیتوں میں تقلیب کرتا ہے اگر اسی طرح پھیر کر ہمیں شک و گمراہی میں دھکیل دیتا تو ہم کیا کرتے؟ اور ہم کس کا سہارا تلاش کرتے؟ پھر ہم کس چیز سے اطمینان حاصل کرتے اور کس سے امید رکھتے؟ اس لیے خوب یاد رکھیں کہ (ثباتِ ایمان)، اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ نعمتِ ایمان کا شکر یہ ہے کہ اسے پہچانے اور نعمتِ ایمان کی ناشکری یہ ہے کہ اس نعمت سے غافل رہے اور اس کا انجام سنتا ہے۔ یہ یاد رہے کہ ایمان کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا بھی نعمتِ ایمان کا کفران ہے کہ یہ عقل سے اکتسابی چیز ہے یا قوت سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ جو آدمی ایسا سمجھتا ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ اس کا ایمان ہی نہ چھین لیا جائے۔ اس لیے کہ اس نے اللہ کی نعمت پر شکر کی بجائے کفر کیا۔

اللہ تعالیٰ نے کسبِ ایمان سے بھلائیاں عطا کیں مگر بھلائیاں حاصل کر لینا ہمارے اپنے بس میں نہیں ہے یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں ایمان کی طرف ہدایت دی اور اپنے احسان سے ہمارے لیے اس کو نیکیاں کمانے والا کر دیا۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَوْ كَسَبَتْ فِیْۤ اِیْمَانِهَا خَیْرًا۔

یعنی توبہ۔ اور ایک قول میں تمام نیکیاں ہی ایمان کی کمائی ہیں۔ ایمان کے بعد ہم پر انعام فرمایا کہ نیکیوں کی توفیق بخشی اور ہماری سہولت کے لیے آسانی کر دی۔ پھر کفر اور کافروں کے اخلاق و اعمال کو ہم سے دور کر دیا۔ پھر ہمارے دلوں میں اسلام اور ایمان کو مزیّن کر دیا اور اسے محبوب کر دیا۔ ہمارے دلوں میں نافرمانی اور فسق کی نفرت بھر دی۔ یہ بھی اس کا فضل و کرم ہے۔ الغرض اس کے انعامات شمار سے باہر ہیں۔ اس کا شکر تو ہو نہیں سکتا۔ ہاں جس قدر اللہ تعالیٰ توفیق دے۔ اور حیا بھی مسلسل انعامات کے بعد ایک انعام ہے اور یہ شکر ہے اور شکر میں کمی کرنے کا اعتراف و معرفت بھی شکر ہے اور شکر میں کمی پر معافی مانگنا بھی شکر ہے۔ اللہ کے عظیم حلم اور ستاری کی معرفت بھی شکر ہے۔ یہ سمجھنا کہ مجھ پر جس قدر انعام و احسان ہوا میں اس کا مستحق نہ تھا۔ یہ بھی شکر ہے بلکہ یہ بھی اس کی نعمت ہے بلکہ یہ بھی شکر ہے۔ نعمتوں کے ساتھ ساتھ تواضع و انکساری اختیار کرنا بھی شکر ہے۔ مخلوق کا شکر

یہ ہے کہ ان کے لیے دعا کرے۔ ان کی تعریف ہے اس لیے کہ عطیات کے ظروف یہی ہیں۔ اور عطا کرنے کے ظاہری اسباب اور مولائے کریم کے اخلاق کا اتباع کرنے والے بھی ہیں۔ یہ بھی شکر ہے۔ منعم تعالیٰ کے سامنے شکایت نہ کرنا اور حسنِ ادب سے رہنا بھی شکر ہے۔ نعمتوں کو اچھے انداز میں لینا، تھوڑی کو بہت سمجھنا اور معمولی کو عظیم جاننا بھی شکر ہے۔ اس لیے کہ ایک جماعت صرف اس وجہ سے برباد ہو گئی کہ انہوں نے بعض چیزوں کو حقیر اور معمولی سمجھا اور اللہ تعالیٰ کی حکمت سے جاہل رہے۔ اس کی نعمتوں کو معمولی شمار کیا۔ یہ بھی اس کی نعمتوں پر کفران ہے۔

صبر و شکر میں افضل کون؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ: "صبر کرنا شکر سے افضل ہے۔ اہل تحصیل کے نزدیک ان دونوں میں ایک دوسرے کو افضلیت نہیں دی جا سکتی۔ تمام اہل ایمان کو شکر سے ایک مقام حاصل ہے اور مشاہدات میں یقین میں ان کے تفاوت کی طرف سے دیکھا جائے تو کسی جماعت کے درمیان ترجیح درست نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ بعض صابرین بہتر معرفت اور حسنِ صبر کی وجہ سے بعض شاکرین سے افضل ہوتے ہیں۔" اور خواص شاکرین، اپنے حسن یقین اور رفعتِ مشاہدہ کی وجہ سے عام صابرین سے افضل درجہ رکھتے ہیں۔

البتہ یہ افضلیت، احوال و مقامات کے طریق سے ہوتی ہے۔ میں اسے بیان کرتا ہوں۔ واللہ اعلم۔ کہ صبر نعمت سے افضل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ صبر میں زہد و خوف ہے اور یہی دو اعلیٰ ترین مقام ہیں اور ناپسندیدہ پر بھی شکر کرنا افضل ہے۔ اس لیے کہ اس میں ابتلاء و رضا ہے۔ شدائد و آفات پر صبر کرنا نعمتوں و آسائیوں پر شکر سے افضل ہے اور یہ بات نفس پر بڑی شاق گزرتی ہے۔ نافرمانیوں پر قدرت ہونے اور غنا کی حالت کے باوجود صبر کرنا بھی نعمتوں پر شکر ہے۔ مزید برآں نعمتوں کے ذریعہ نافرمانیوں سے صبر کرنا نعمتوں کے ذریعہ طاعت سے بھی افضل ہے۔ جبکہ اسے نفس سے مجاہدہ کرنا پڑے اور جب اس نے اس حالت پر شکر کیا، جس پہ صبر کر رہا ہے تو یہ ابتلا بھی نعمت ہے اور یہی افضل ہے۔ اس لیے کہ یہ مشاہدۂ مقربین ہے۔ اور جن نعمتوں پر شکر کرتا ہے جب ان سے صبر کرے تو یہ افضل ہے۔ اس لیے کہ یہ مجاہدہ کا حال ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ:

"ہم انبیاء کی جماعتیں، سب سے سخت امتحان میں ہوتی ہیں۔ پھر جو ہم سے مماثل ہو۔" یعنی جو ہمارے اخلاق سے زیادہ قریب و مشابہ ہو۔ چنانچہ ابتلاء والوں کو رفعت بخشی اور انہیں اپنی حالت کی توصیف اس سے فرمائی اور انہیں امثل فالامثل بنایا۔ اب جو آدمی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ امثل ہے وہی افضل بھی ہے۔

سخت امتحان کے باوجود حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم شکر کرتے۔ چنانچہ صابرین میں سے شکر کرنیوالوں کا درجہ اس طرح افضل تر ہے۔ اس لیے کہ وہ ابتلاء پر بھی شکر کرتے ہیں اور یہی آدمی انبیاء کے زیادہ قریب و اشبہ ہے۔ مقاماتِ مقربین میں سے ہر مقام میں صبر و شکر کی ضرورت ہے۔ ان دونوں میں کوئی ایک بھی دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ صبر کرنا شکر کا محتاج ہے تاکہ یہ مکمل ہو جائے اور شکر کرنا صبر کا محتاج ہوتا ہے۔ تاکہ مزید انعام کا باعث بن سکے۔

اللہ تعالیٰ نے دونوں کو ملا دیا اور مومنین کی ان دونوں کے ساتھ توصیف فرمائی۔ چنانچہ فرمایا:

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّکُلِّ صَبَّارٍ شَکُوْرٍ۔ (بے شک اس میں نشانیاں ہیں واسطے ہر صبر کرنے والے شکر کرنے والے کے)

چنانچہ فعول کے وزن پر مبالغہ کے صیغہ کے ساتھ شکور فرمایا جیسے کہ فعّال کے وزن پر صبار فرمایا۔ یہ بھی مبالغہ کے لیے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایمان کو دو حصوں میں تقسیم کیا جیسے کہ حدیث میں آتا ہے:

"صبر نصف ایمان ہے اور شکر نصف ایمان ہے اور یقین کامل ایمان ہے۔" اس لیے کہ یقین ہی ان دونوں کی اصل ہے اور یہ دونوں اسی کے پھل ہیں۔ اسی سے یہ پائے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ شکر کرنیوالے نے یقین کیا کہ نعمت منعم تعالیٰ کی جانب سے ہے اور مزید عطا ہونے کے وعدہ پورا ہونے پر یقین کیا۔ یہ شکر ہوا جیسے کہ ابتلاء میں آنے والے صابر نے یقین کیا کہ اجر و ثواب ملے گا اور یقین کیا کہ صابرین کی تعریف کی گئی ہے تو اس نے صبر کیا۔ اب اللہ بزرگ و برتر سے (صبر کی) توفیق و قوت ہے۔ الغرض صاحبِ یقین کے یہ دو حال ہیں۔

جب انسان کا وقت دو حال سے خالی نہیں ہوتا یا ابتلاء ہے یا نعمت و آرام ہے اور ہر چیز میں اس کیلئے ایک نفسانی ہے۔ اس لیے ابتلاء کی حالت میں صبر اور انعام و آرام کی حالت میں شکر ہونا چاہیے۔

وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ۔ (اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)

اور شاکرین سے بھی محبت رکھتا ہے۔

مقامِ شکر کی شرح میں یہ آخری کلمات تھے۔ والحمد للہ رب العلمین۔

رجا اور اہل رجاء کا بیان

یہ چوتھا مقام یقین ہے

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَللّٰہُ لَطِیْفٌ بِعِبَادِہٖ یَرْزُقُ مَنْ (اللہ نرمی رکھتا ہے اپنے بندوں پر روزی دیتا ہے

يَشَآءُ وَ[1] (جس کو چاہے)

ایک جگہ فرمایا:

وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيمًا۔ (اور اللہ ایمان داروں پر رحم کرنے والا ہے)

اور فرمایا:

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا[2] (کہہ دے اے بندو میرے، جنھوں نے زیادتی کی اپنی جان پر۔ نہ آس توڑو اللہ کی رحمت سے، بے شک اللہ بخشتا ہے سب گناہ)

اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت میں یوں مروی ہے:

وَلَا يُبَالِي إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ۔ (اور وہ پروا نہیں کرتا۔ بے شک وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے)

روایاتِ مشہورہ میں ہے کہ:

"اس نے ایک مٹھی بھری اور فرمایا۔ یہ جنت میں ہیں اور مجھے پروا نہیں" واللہ اعلم معنی یہ ہے کہ میری رحمت ہر چیز پر حاوی ہے۔ اس لیے ان کے وہاں جانے سے تنگی نہیں۔ جنت میں ان کے داخلہ سے مجھے پروا نہیں اور یہ بھی جنت میں ہوں گے اور مجھے ان کے بُرے اعمال سے کچھ پروا نہیں۔

متقی لوگوں کے وصف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ[3] (اور وہ لوگ کہ جب کر بیٹھیں کچھ کھلا گناہ یا برا کریں اپنے حق میں، تو یاد کریں اللہ کو، اور بخشش مانگیں اپنے گناہوں کی اور کون ہے گناہ بخشتا سوائے اللہ کے)

اللہ تعالیٰ نے متوکلین کا وصف بیان فرمایا:

إِلَّا اللَّمَمَ إِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ[4] (مگر کچھ آلودگی، بے شک تیرے رب کی بخشش وسعت والی ہے)

---

[1] الشوریٰ آیت ۱۹

[2] الزمر آیت ۵۳

[3] آل عمران آیت ۱۳۵

[4] النجم آیت ۳۲

اللہ تعالیٰ نے اپنے عرش کے گرد گھیرا ڈالنے والے ملائکہ کا ذکر فرمایا:

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَ يَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ[1] (اور فرشتے پاکی بیان کرتے ہیں خوبیاں اپنے رب کی اور گناہ بخشواتے ہیں زمین والوں کے)

اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ دوزخ خدا کے دشمنوں کے لیے تیار کیا گیا اور اپنے اولیاء کو اس سے ڈرایا۔

چنانچہ فرمایا:

لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَ مِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ[2] (اُن کے اوپر سے بادل ہے آگ کے اور نیچے سے بادل، اس چیز سے ڈراتا ہے اللہ اپنے بندوں کو)

اسی طرح فرمایا:

وَ اتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ۔ (اور بچو اس آگ سے جو کافروں کے لیے تیار کی گئی)

اور فرمایا:

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى لَا يَصْلٰىهَا اِلَّا الْاَشْقَى الَّذِيْ كَذَّبَ وَ تَوَلّٰى[3] (سو میں نے سنا دی تم کو خبر تلپتی آگ کی، اس میں وہی پہنچے گا جو بڑا بدبخت ہے۔ جس نے جھٹلایا اور منہ موڑا)

اور ظالموں سے معاف کرنے کے بارے میں فرمایا:

وَ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ عَلٰى ظُلْمِهِمْ۔ (اور تیرا رب معاف بھی کرتا ہے لوگوں کو ان کے ظلم پر)

اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تفسیر میں ہے کہ:

وَ لَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى۔ (اور عنقریب تجھے دے گا تیرا رب پھر تو راضی ہوگا)

علمائے تفسیر نے فرمایا:

"حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس پر راضی نہ ہوں گے کہ ان کا ایک امتی بھی دوزخ میں جائے۔"

امام ابو جعفر محمد بن علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے:

"اے اہل عراق! تم یہ کہتے ہو کہ کتاب اللہ میں یہ آیت سب سے زیادہ امید دلانے والی ہے۔"

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ (کہہ دو اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر

---

[1] الشوریٰ آیت ۵

[2] الزمر آیت ۱۶

[3] اللیل آیت ۱۴، ۱۵، ۱۶۔

لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰہِ۔ (زیادتی کی، اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہو جاؤ)

مگر ہم اہل بیت کتاب اللہ میں سب سے زیادہ امید دلانے والی آیت یہ شمار کرتے ہیں۔

وَ لَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی۔ (اور عنقریب تجھے تیرا رب دے گا پھر تو راضی ہوگا)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے سے وعدہ فرمایا کہ اسے اپنی امت کے بارے میں راضی کرے گا۔

اُمت مرحُومہ

حضرت ابو بردہؓ نے اپنے والدؓ سے اور انہوں نے حضرت ابو موسیٰؓ سے حدیث روایت کی کہ:
"میری امت مرحومہ ہے۔ آخرت میں اس پر عذاب نہ ہوگا۔ اس کی سزا دنیا میں زلزلوں اور فتنوں کی صورت میں رکھ دی گئی۔ جب قیامت آئے گی تو میری امت کے ہر آدمی کے عوض اہل کتاب (کفار) کا ایک آدمی پکڑ کر (دوزخ میں) ڈال دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ آگ سے یہ تیرا فدیہ ہے۔"

دُوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"اس امت کا ہر آدمی ایک یہودی یا نصرانی کو جہنم کی طرف لائے گا اور کہے گا کہ آگ سے یہ میرا فدیہ ہے پھر اس کو جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔"

حدیث میں ہے کہ:

"بخار دوزخ کی گرم ہوا سے ہے اور آگ سے مومنوں کا یہی حصہ ہے۔"

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

یَوْمَ لَا یُخْزِی اللّٰہُ النَّبِیَّ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَہٗ۔[1] (جس دن اللہ ذلیل نہ کرے گا نبی کو اور جو یقین لائے ہیں اس کے ساتھ)

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف وحی فرمائی:

"کیا تو چاہتا ہے کہ میں تیری امت کا حساب تیرے پاس کر دوں؟"

عرض کیا:

"نہیں، اے پروردگار! مجھ سے تُو ان کے لیے بہتر ہے۔"

فرمایا:

"پھر ہم ان کے بارے میں تجھے رُسوا نہیں کریں گے۔"

---

[1] التحریم آیت ۸۔

حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

"میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میرا حساب کتاب میرے والدین کے سپرد کیا جائے۔ اس لیے کہ میں جانتا ہوں کہ میرا اللہ ان (والدین) سے زیادہ مجھ پر رحم کرنے والا ہے۔"

حضرت سلمہ بن وردان کی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں ہے کہ:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے گناہوں کے بارے میں رب تعالیٰ سے دعا کی اور کہا:

"اے پروردگار! ان کا حساب میرے سپرد کر دے تاکہ ان کے گناہوں پر میرے سوا کوئی دوسرا مطلع نہ ہو۔"

اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی:

"وہ تیرے امتی ہیں اور وہ میرے بندے ہیں۔ اور تجھ سے زیادہ میں ان پر رحم کرنے والا ہوں۔ میں ان کا حساب اپنے سوا کسی دوسرے کے سپرد نہیں کروں گا تاکہ دوسرا اور تو کوئی بھی ان کے گناہوں پر آگاہ نہ ہو۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ فرمایا:

"میری زندگی ان کے لیے بہتر ہے اور میری موت ان کے لیے بہتر ہے۔ میری زندگی اس لیے کہ میں تمہارے لیے سنن بیان کرتا اور تمہارے لیے شرائع کی (توضیح و تکمیل کرتا ہوں اور میری موت اس لیے کہ تمہارے جو اعمال میرے سامنے آتے ہیں اور جب بھی کوئی نیکی دیکھتا ہوں تو اللہ عزوجل کی حمد کرتا ہوں۔ اور جب بھی کوئی برائی دیکھوں تو تمہارے لیے اللہ تعالیٰ سے بخشش و مغفرت مانگتا ہوں۔"

روایت میں ہے:

"جب ایک بندہ گناہوں سے توبہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں اور زمین کے حصے کو اس کی نافرمانیاں بھلا دیتا ہے اور ان کو نیکیوں میں بدل دیتا ہے۔ آخر کار وہ قیامت میں آئے گا تو اس کے خلاف کچھ چیز بھی گواہی نہ دے گی۔"

اسی طرح کہا جاتا ہے کہ:

"جب بندہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے تو وہ اسے فرشتوں کی نظروں سے اوجھل کر دیتا ہے تاکہ وہ اسے نہ دیکھیں کہ اس کے خلاف گواہی دینے لگیں۔"

ایک روز جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی:

"یَا کَرِیْمَ الْعَفْوِ۔" تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا:

"آپ یا کریم العفو کی تفسیر جانتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت سے برائیوں کو معاف

فرمایا. پھر اپنے کرم سے انہیں نیکیوں میں بدل دیا۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو یہ دعا کرتے سُنا:

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ تَمَامَ النِّعْمَةِ۔ (اے اللہ میں تجھ سے تمام النعمۃ مانگتا ہوں)

آپؐ نے پوچھا:

"سمجھتے ہو کہ تمام النعمۃ کیا چیز ہے؟"

اس نے عرض کیا:

"نہیں۔"

آپؐ نے فرمایا:

"جنت میں داخل ہونا!"

اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ اس نے ہمارے لیے اسلام کے دین ہونے پر راضی ہو کر ہم پر اپنی نعمت کامل فرما دی۔ یہی دخولِ جنت کی دلیل ہے۔ فرمایا:

اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْكُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔[1] (آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت مکمل کر دی، اور تمہارے لیے اسلام کے دین ہونے پر راضی ہوا)

اور ہمیں اس معاملہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشتراک حاصل ہوا یعنی اسلام لانے میں (البتہ مدارج میں بہت فرق ہے) اب ہم بھی اس کے فضل و کرم سے اپنے گناہوں کی مغفرت کی امید رکھتے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لِیَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَ مَا تَاَخَّرَ وَ یُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَیْكَ۔[2] (تاکہ معاف کرے اللہ تجھ کو جو آگے ہوئے تیرے گناہ اور جو پیچھے رہے اور پورا کرے تجھ پر اپنا احسان)

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی روایت میں ہے کہ:

"جو آدمی دنیا میں کوئی گناہ کرے پھر اللہ تعالیٰ دنیا میں اس کی پردہ پوشی کر دے تو اللہ تعالیٰ اس سے بلند ہے کہ وہ اب آخرت میں اس کی پردہ دری کرے اور جو دُنیا میں کوئی گناہ کرے پھر اسے دنیا میں اس کی سزا

---

[1] مائدہ آیت ۳

[2] الفتح آیت ۲

دی جائے تو اللہ تعالیٰ سب سے زیادہ عدل کرنے والا ہے۔ آخرت میں اس بندے پر (سزا معاف کرے گا) اور دوبارہ سزا نہ دے گا۔"

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"دنیا میں جو بندہ گناہ کرے پھر اللہ تعالیٰ اس کی پردہ پوشی کر ڈالے تو آخرت میں اسے معاف ہی کر دے گا۔"

بعض سلفؒ سے مروی ہے کہ:

ہر نافرمان جو نافرمانی کرتا ہے وہ کنف الرحمٰن میں ہے اور کنف الانسان کا معنی ہے۔ اس کے ہاتھوں اور سینہ کا درمیان یعنی پہلو۔

فرمایا: "اب جس پر اس کا کنف (حفاظت) آیا۔ اس کی پردہ پوشی ہو گئی۔ اور جس سے اس کی حفاظت اُٹھ گئی، وہ رُسوا ہُوا۔"

مشائخ فرماتے ہیں:

"جس کو دنیا میں کسی گناہ کی وجہ سے رسوائی حاصل ہو وہ اس کا کفارہ ہے وہ آخرت میں رُسوا نہ ہو گا۔"

استغفار و مغفرت

حدیث میں ہے:

"جب بندہ گناہ کرتا ہے پھر اللہ تعالےٰ سے بخشش و معافی مانگتا ہے تو اللہ تعالےٰ اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے کہ میرے بندے کی طرف دیکھو۔ اس نے ایک گناہ کیا۔ پھر جان لیا کہ اس کا ایک پروردگار ہے اور وہ گناہ پر مواخذہ کرتا ہے۔ میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اسے بخش دیا۔"

حضرت محمد بن مصعبؒ فرماتے ہیں کہ، اسود بن سالمؒ نے اپنے ہاتھ سے مجھے لکھا کہ:

"جب بندہ اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے اور پھر وُہ اپنے اللہ کے سامنے ہاتھ اٹھا کر کہتا ہے: یا ربِّ (اے پروردگار) تو فرشتے اس کی آواز پر پردہ ڈال دیتے ہیں، وُہ دوبارہ کہتا ہے: "یا رب۔" فرشتے پھر پردہ ڈال دیتے ہیں۔ جب تیسری بار کہتا ہے: یا رب۔ اور فرشتے اس کی آواز پر اب بھی پردہ ڈال دیتے ہیں۔ اب چوتھی بار یہی کلام کہتا ہے تو اللہ تعالےٰ فرماتا ہے: تم میرے بندے کی آواز کو کب تک مجھ سے (ہٹائے) اور پردے میں رکھو گے؟ میرے بندے نے جان لیا کہ میرے سوا کوئی دوسرا رب نہیں جو اس کے گناہوں کو بخش دے۔ میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اُسے بخش دیا۔"

حدیث میں ہے کہ:

"اگر بندہ (غلطی سے) گناہ کرے اور اسکے گناہ آسمان کے کناروں تک پہنچ جائیں۔ جب تک وُہ مجھ سے بخشش

مانگتا رہے گا اور مجھ سے امید رکھے گا میں اس کے گناہ معاف کر دوں گا۔"

دوسری حدیث میں ہے کہ:

"اگر میرا بندہ زمین کے برابر گناہ لے کر مجھ سے ملے تو میں اس کے برابر بخشش کے ساتھ اسے ملوں گا، بشرطیکہ میرے ساتھ کچھ بھی شرک نہ کرتا ہو۔"

ایک حدیث میں ہے:

"جب بندہ گناہ کرتا ہے تو فرشتہ چھ گھڑیوں تک اس سے قلم اٹھائے رکھتا ہے (یعنی اس کا گناہ نہیں لکھتا) اگر توبہ کر لے اور بخشش مانگ لے تو اس پر نہیں لکھتا ورنہ اس کی ایک برائی لکھ لیتا ہے۔"

دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"جب وہ لکھ لیتا ہے اور ایک نیکی کرتا ہے تو (دائیں جانب والا جو کہ) بائیں فرشتہ پر امیر ہے۔ وہ (بائیں جانب والے فرشتہ سے) کہتا ہے۔ اس کی یہ برائی مٹا دو۔ اور ایک نیکی کی دس نیکیوں میں سے میں ایک نیکی مٹا دیتا ہوں اور نو نیکیاں درج کر لیتا ہوں۔ چنانچہ وہ اس کی برائی مٹا دیتا ہے۔"

مشائخ فرماتے ہیں کہ دائیں طرف والے فرشتے کے دل میں بندے کے لیے بائیں طرف والے کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ رحمت بھر دی گئی اور دائیں طرف والا بائیں طرف والے پر امیر بھی ہے۔ اب جب بندہ کوئی نیکی کا کام کرتا ہے تو دائیں طرف والا فرشتہ خوش ہوتا ہے اور بتاتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ملائکہ خوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس کی فرحت کے باعث اس کی نیکیاں لکھی جاتی ہیں۔

حضرت انسؓ بن مالک کی طویل حدیث میں آتا ہے کہ:

"جب بندہ گناہ کرتا ہے تو اس پر لکھ دیا جاتا ہے تو اعرابی نے کہا،

"اگر توبہ کر لے؟"

کہا: "پھر اس کے نامۂ اعمال سے مٹا دیا جاتا ہے۔"

اس نے پوچھا: "اگر پھر گناہ کرے؟"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "اس پر لکھ دیا جاتا ہے۔"

اعرابی نے عرض کیا: "اگر توبہ کر لے؟"

فرمایا: "اس کے نامۂ اعمال سے مٹا دیا جاتا ہے۔"

اعرابی نے کہا: "اے اللہ کے رسولؐ! کب تک؟"

آپؐ نے فرمایا: "جب تک وہ بخشش مانگتا رہے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرتا رہے۔ اللہ تعالیٰ

بخشش کرنے سے تنگ نہیں آتا۔ جب تک بندہ ہی استغفار و مغفرت مانگنے سے تنگ نہ آجائے۔ جب بندہ کسی نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو دائیں جانب کا فرشتہ عمل کرنے سے پہلے اس کی ایک نیکی لکھ دیتا ہے اور جب وہ عمل کرتا ہے تو اس کی دس نیکیاں لکھتا ہے۔ پھر اللہ عزوجل سات سو گنا تک اسے بڑھا دیتا ہے اور جب وہ کسی گناہ کا ارادہ کرتا ہے تو نہیں لکھتا۔ اب اگر وہ گناہ کرے تو اس کا ایک گناہ لکھ دیتا ہے اور اس کے نیکی، اللہ تعالیٰ کی معافی ہے۔"

غیبت و جھوٹ سے پرہیز کا انعام

ایک آدمی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! میں صرف ایک ماہ کے روزے رکھتا ہوں اس سے زیادہ نہیں۔ میں صرف پانچ نمازیں پڑھتا ہوں ان سے زیادہ نہیں کرتا اور میرے مال میں (اس قدر کمی ہے) کہ اللہ تعالیٰ کے لیے صدقہ، حج و نفل نہیں کر سکتا۔ اب جب میں مروں گا تو میں کہاں ہوں گا؟"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جنت میں!"

اس نے پوچھا: "اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ کے ہمراہ ہوں گا؟"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا:

"ہاں، میرے ہمراہ۔ اگر تُو نے اپنے دل کو دو باتوں سے پاک رکھا۔ کینہ اور حسد سے اور اپنی زبان کو غیبت کرنے اور جھوٹ سے اور اپنی آنکھ کو دو سے (پاک رکھا) جس کو اللہ تعالیٰ نے حرام فرمایا اس کی طرف نظر کرنے سے اور اس بات سے کہ ان کے ساتھ تو کسی مسلمان کو ذلیل سمجھے تو میرے ساتھ جنت میں داخل ہوگا۔ حتیٰ کہ یہ دو۔"

اُمید کا ایک منظر

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک طویل حدیث میں آتا ہے، کہ

"ایک اعرابی نے عرض کیا،

"اے اللہ کے رسولؐ! مخلوق کے حساب کا کون والی ہے؟ (یعنی کون حساب لے گا؟)"

آپؐ نے فرمایا: "اللہ عزوجل۔"

اس نے عرض کیا: "کیا وہ خود (حساب کتاب) لے گا؟"

آپؐ نے فرمایا: "ہاں۔"

راوی بتاتے ہیں۔ اس پر اعرابی مسکرا دیا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا،

"اے اعرابی! کس بات سے ہنستے ہو؟"

اس نے عرض کیا، "کریم جب قدرت حاصل کرتا ہے تو معاف کرتا ہے۔"

ایک روایت میں ہے کہ:

"درگزر کرتا ہے اور جب حساب لیتا ہے تو تسامح کرتا ہے۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

"اس نے سچ کہا۔ یاد رکھو۔ اللہ عزوجل سے بڑھ کر کوئی کرم کرنے والا نہیں وہ سب سے بڑھ کر کرم فرمانے والا ہے۔"

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اعرابی فقیہ ہوگیا (یعنی سمجھ گیا)۔

مومن کی عظمت

اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کو بہت ہی عظمت و شرف بخشا۔ اب اگر ایک آدمی اس کو ایک ایک پتھر کر کے گرائے (نعوذ باللہ من ذٰلک) پھر اسے بلائے تو اس کا جرم اس آدمی کے برابر نہیں پہنچا جس نے اللہ تعالیٰ کے اولیاء میں سے کسی ولی کی اہانت کی۔"

اعرابی نے عرض کیا، "اللہ کے اولیاء میں سے ؟"

آپ نے فرمایا:

"تمام اہل ایمان اللہ کے اولیاء ہیں۔ سنا نہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ۔ (اللہ کارساز ہے ایمان والوں کا، نکالتا ہے ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف)

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ایک مفرد خبر میں آتا ہے کہ:

"مومن کعبہ سے بھی افضل ہے اور مومن طیب و پاک ہے اور مومن اللہ تعالیٰ کے نزدیک فرشتوں سے بھی زیادہ مکرم ہے۔"

حضرت عبداللہ بن عمرو اور حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہما اور کعب احبارؓ سے ایک خبرِ مشہور ہ میں ہے کہ اس نے کعبہ کو دیکھا اور کہا:

"تجھے کس قدر شرف و عظمت عطا ہوئی اور اللہ کے نزدیک ایک مومن کی عظمت تجھ سے بڑھ کر ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے اولیاء کو عزت بخشتے ہوئے اپنے انبیاء علیہم السلام کو حکم دیا کہ وہ بیت اللہ کو پاک کریں۔ چنانچہ ان کے باعث بیت اللہ کو شرف حاصل ہوا۔

اللہ تعالیٰ سے روایت میں ہے کہ

"جس نے میرے کسی ولی کی توہین کی اس نے میرے ساتھ جنگ مچادی اور دنیا و آخرت میں اپنے ولی کے لیے اور میں دنیا و آخرت میں اپنے اولیاء کا بدلہ لوں گا۔"

حضرت یعقوب علیہ السلام کی اخبار میں ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی۔ جانتے ہو میں نے تیرے اور یوسف علیہ السلام کے درمیان اس مدت تک کیوں فراق ڈال دیا؟"

انھوں نے عرض کیا: "نہیں۔"

فرمایا: "اس لیے کہ تو نے اس کے بھائیوں سے یہ کہہ دیا:

اَخَافُ اَنْ یَّاْكُلَهُ الذِّئْبُ وَ اَنْتُمْ عَنْهُ غٰفِلُوْنَ۔ (میں ڈرتا ہوں کہ اسے بھیڑیا کھا جائے اور تم اس سے غافل رہو)

تُو نے مجھ سے امید کیوں نہ رکھی اور بھیڑیئے سے کیوں ڈرا؟ اور اس کے بھائیوں کی غفلت کی طرف کیوں دھیان دیا اور میری اس کے لیے حفاظت پر نظر کیوں نہ رکھی؟ یہ میری تجھ پر پہلے عنایات یاد کر میں نے تیرے نزدیک اپنے آپ کو ارحم الراحمین کیسے رکھا۔ اب تو نے مجھ سے امید رکھی اور اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تیرے نزدیک اپنے آپ کو سب سے بڑا بخیل سمجھاتا۔"

رجاء کا مفہوم

رجاء دراصل کسی چیز میں شدید ترین طمع کا نام ہے جیسے کہ کسی چیز سے شدید ڈر کا نام خوف ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے نام لیتے وقت رجاء کی جگہ طمع فرمایا اور خوف کے مقام حذر فرمایا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

یَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّ طَمَعًا۔ (پکارتے ہیں اپنے رب کو خوف اور طمع کرتے ہوئے)

اور فرمایا:

یَحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَ یَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ۔ (ڈر رکھتا ہے آخرت کا اور امید رکھتا ہے اپنے رب کی رحمت سے)

یہ چیز اہل ایمان کے اوصاف میں سے ایک وصف اور اہلِ ایمان کے اخلاق میں ایک خلق ہے۔ جس طرح خوف کے بغیر ایمان صحیح نہیں ہوتا اسی طرح اس کے بغیر یہ بھی صحیح نہیں ہوتا۔

چنانچہ جس طرح پرندہ دو بازوں کے ساتھ ہی اڑتا ہے۔ اس کے دو بازوؤں میں سے ایک بازو رجاء (امید) ہے۔ اسی طرح جو آدمی اس سے ڈرتا اور اس پر ایمان رکھتا ہے۔ جب تک اس پر امید نہ رکھے وہ

مومن نہیں ہو سکتا۔ گویا یہ حسنِ ظن کا مقام بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت فرمائی تو فرمایا:

"تم میں کوئی نہ مرے مگر وہ اللہ تعالیٰ حسن ظن رکھتا ہو" اس لیے کہ آپؐ نے اللہ تعالیٰ سے یہ فرمایا:

"میں اپنے بندے کے اپنے ساتھ ظن کے مطابق ہوتا ہوں۔ اب جو چاہے میرے ساتھ ظن رکھے۔"

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ اللہ کی قسم کھا کر فرماتے تھے کہ جو بندہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن رکھے اللہ تعالیٰ اسے عطا کرے گا۔ اس لیے کہ تمام بھلائی اللہ ہی کے قبضہ میں ہے۔ اب جب اللہ تعالیٰ اسے حسن ظن عطا کرے گا تو حسن ظن کے مطابق اس کو (انعام) بھی عطا کرے گا۔ اس لیے کہ جس ذات تعالیٰ نے اس کا ظن اچھا کر دیا اس نے یہ ارادہ بھی فرما لیا کہ اس حسن ظن کو واقع فرما دے۔ (یعنی عطا فرمائے)

حضرت یوسف بن اسباط سے مروی ہے۔ فرمایا کہ میں نے حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے ذیل میں فرماتے سنا۔ فرمان یہ ہے کہ

وَ اَحۡسِنُوۡا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ۔ (اور نیکی کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ نیکو کاروں کو پسند کرتا ہے)

فرمایا: یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسنِ ظن رکھو۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک آدمی کے پاس تشریف لائے۔ وہ آدمی موت کی حالت میں تھا۔ آپؐ نے فرمایا:

"اپنے آپ کو کیسا پا رہے ہو؟"

اس نے عرض کیا: "اپنے گناہوں سے ڈرتا ہوں اور اپنے پروردگار کی رحمت کا امیدوار ہوں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اس مقام پر کسی بندے کے دل میں یہ دو باتیں جمع ہوتی ہیں تو اسے اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے جو وہ اُمید رکھتا ہے اور جس سے وہ ڈرتا ہے اسے امن عطا فرماتا ہے۔"

ناامیدی کا گناہ

ایک آدمی پر خوف کا اس قدر غلبہ ہوا کہ اس کے ہوش جاتے رہے اور وہ ناامید ہو بیٹھا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اسے فرمایا:

"اے آدمی! تیرے گناہ سے زیادہ تیری اپنے رب سے ناامیدی بڑا گناہ ہے۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے سچ فرمایا۔ اس لیے کہ اللہ کی رحمت ہی میں گناہگار بندے کو چین ملتا ہے اور ناامیدی اختیار کرنا تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے۔ اس لیے کہ اس طرح اس نے اپنے جی سے ہی خدا کی صفات مرجوہ (یعنی امید و کرم) کو کاٹ دیا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اس فعل کی مذمت فرمائی۔ چنانچہ یہ (قنوطیت) سب سے بڑا جرم اور سب سے بڑا گناہ ہے۔

تفسیر میں اس طرح آتا ہے کہ:

وَ لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ۔ (اور نہ ڈالو اپنی جان کو ہلاکت میں)

فرمایا: اس سے مراد وہ بندہ ہے کہ جو کبیرہ گناہ کرتا ہے اور توبہ نہیں کرتا ہے۔ بس گناہوں میں چلا جا رہا ہے اور یہ کہہ رہا ہے: میں تو برباد ہو گیا مجھے کوئی عمل نفع نہیں دے گا۔ چنانچہ اس سے منع فرمایا۔ یہ یاد رکھیں کہ رجاء (امید) ایک اعلیٰ مقام اور باعظمت حال ہے۔ یہ صرف اہلِ علم و حیاء لوگوں کے لیے موزوں ہے اور یہ ایسا حال ہے جو کہ ان پر خوف کے بعد طاری ہوتا ہے۔ وہ دکھوں اور مصائب سے اس میں چین حاصل کرتے ہیں اور گناہوں سے جدا ہونے کے بعد اس حال میں انہیں سکون حاصل ہوتا ہے۔

خوف و رجاء کا باہمی تعلق

جو خوف کی معرفت حاصل نہ کرے وہ رجاء کی معرفت حاصل نہیں کر سکتا اور جو مقامِ خوف میں کھڑا نہ ہو اسے صحت وصفا کے مطابق اہلِ رجا کے مقامات تک رسائی حاصل نہیں ہوتی۔ ہر بندے کو اس کے خوف کے مطابق ہی رجاء کا مقام ملتا ہے اور اسے جس قدر خوف دلانے والی صفات کا کشف حاصل ہو اسی قدر اسے رجاء کے اخلاق میں سے حصہ ملتا ہے۔

اگر وہ مخلوقات کے مقامِ تخویفات پر کھڑا ہوا۔ مثلاً گناہوں، عیوب اور اسبابِ (ظاہر) تو اس حیثیت سے اسے اہلِ رجاء کے مقامات سے حصہ ملے گا۔ یعنی اس سے وعدہ ہو گا۔ گناہوں کی بخشش ہو گی۔ جنت کا اشتیاق دلایا جائے گا اور جنت کی اعلیٰ نعمتوں کا نمونہ ملے گا یہ اصحاب یمین کا طریق ہے۔ اور اگر وہ صفات کے مقامِ تخویفات پر قائم ہوا۔ یعنی معانیِ ذات کے مشاہدہ سے اسے مقام ملا۔ مثلاً سابقِ علم (پہلے سے علمِ الٰہی کس کے بارے میں ایسا ایسا ہے) اور برُے انجام، مخفی مکر اور باطنی استدراج، قدرت کی گرفت، کبر و جبروت، تعالیٰ کا حکم۔ تو اب اسے مقامِ محبت و رضا کی جانے والے مقامات تک سربلندی حاصل ہو گی۔ چنانچہ رجاء اصل میں معانیِ اخلاق میں سے اور کرم و احسان، فضل و احسان، لطف و عنایت کے اسماء میں سے ہے۔ مقاماتِ رجاء میں اہلِ رجاء کے مشاہدات جو ہم جانتے ہیں۔ سب باتوں کی خبر نہیں بتا دینا ٹھیک نہیں۔ یہ باتیں عام اہلِ ایمان کے لیے بھی مناسب نہیں بلکہ یہ اس کے لیے موزوں ہیں جو ان کا اہل ہے اور صرف محبت کے جذبہ سے ہی انہیں قبول کیا جاتا ہے اور جب تک دل کو خوف کے ساتھ نصیحت نہ کی جائے۔ محبت بھی نہیں آتی۔ البتہ زیادہ تر لوگ ڈرانے دھمکانے سے ہی ٹھیک رہتے ہیں۔ جیسے کہ ایک برا غلام ہو۔ اس کی ڈنڈے سوٹے سے خبر لیتے رہو یا تلواروں سے ان کی گوشمالی ہوتی رہے تو ہی یہ سیدھی راہ پر رہتے ہیں۔

صحتِ رجاء کی علامت

بندے میں صحتِ رجاء کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے رجاء (امید) کے

بارے میں اندر ہی اندر ڈرتا رہے۔ اس لیے کہ جب اُسے ایک بات کے بارے میں امید آگئی۔ اب دل میں جس کی امید رکھے ہے اس کی عظمت اور شدتِ فرحت کے بارے میں یہ خطرہ ہے کہ وہ بات ہی جاتی رہے۔ اس طرح اہل رجا سے اپنی امیدوں میں فوتِ رجاء کا خطرہ کبھی جدا نہیں ہوتا اور رجاء تو اصل میں خائفین کے لیے ایک ذرا سا آرام ہے۔ اس لیے عرب لوگ رجا کو بھی خوف کہہ دیتے ہیں کیونکہ یہ دونوں ایسے اوصاف ہیں جو ایک دوسرے سے کبھی جدا نہیں ہوتے۔

اور یہ قاعدہ ہے کہ جب ایک چیز کسی چیز کے لیے لازم ہو یا اس کا وصف ہو یا اس کا سبب، ہو تو اس کو بھی اس سے تعبیر کر دیا کرتے ہیں۔ چنانچہ کہا کرتے ہیں:

مَالَكَ لَا تَرْجُوْا كَذَا ؟ (تجھے کیا ہے کہ ایسی امید نہیں رکھتا)

اور مراد یہ ہوتی ہے کہ تجھے کیا ہے کہ تو ڈرتا نہیں ؟ اس لعنت پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

مَالَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا۔

اس کی تفسیر پر اجماع ہے کہ "تمہیں کیا کہ تم اللہ کی عظمت شان سے نہیں ڈرتے۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ۔ (پھر جس کو امید ہو ملنے کی اپنے رب سے)

اس کی ایک تفسیر بھی یہی ہے کہ جو اس کی ملاقات کے بارے میں ڈرتا ہے۔

رجا سے خوف ایسے ہی ہے جیسے کہ رات سے دن ہو کہ یہ ایک دُوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ مدت بیان کرتے ہُوئے ان میں کسی ایک کا نام لیا جا سکتا ہے مثلاً ثلثۃ ایام (تین دن) ثلث لیال (تین راتیں)۔ ایک ہی واقعہ بیان کرتے ہُوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اٰيَتُكَ اَنْ لَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا۔ (تیری نشانی، یہ کہ بات نہ کرے تو لوگوں سے تین رات تک چنگا بھلا)

اور ایک جگہ فرمایا:

ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا۔ (تین دن، مگر اشارات سے)

اب جب دن، اپنی رات سے جدا نہیں ہوتا اور رات، اپنے دن سے جدا نہیں ہوتی۔ اس لیے ایک کی بجائے دُوسرے سے خبر دے دی۔ اس لیے کہ ایک (رات) دوسرے (دن) کے مشابہ اور اس میں داخل ہے اور ان دونوں میں سے کوئی ایک بھی اللہ تعالیٰ کی حکمت و قدرت کے بغیر نمودار نہیں ہوتی کیونکہ دونوں کے احکام مختلف ہیں اور ان دونوں کے ذریعہ جُدا جُدا انعامات ہیں۔

اگر دن نکل آئے تو خدا تعالیٰ کی قدرت سے رات اس میں داخل ہو جاتی ہے اور اگر رات ظاہر ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی حکمت سے دن اس میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ ایک دوسرے میں او خال کی یہ حقیقت ہے اور ایک کا دوسرے پر تہ در تہ آنے کا مطلب یہی ہے۔ معانی ملکوت میں خوف و رجاء کی یہی حقیقت ہے کہ جب خوف نمودار ہوتا ہے تو بندہ خائف ہوتا ہے اور اس پر وصفِ تخویف کے باعث مشاہدۂ تجلّی سے خوف کے احکام ظاہر ہوتے ہیں۔ چنانچہ خوف کے غلبہ کے باعث بندے کو خائف بندہ کہا جاتا ہے اور اس کے خوف میں رجاء پوشیدہ ہوتا ہے اور جب رجاء (امید) نمودار ہوتا ہے تو بندے کو عبدِ راجی (امید رکھنے والا بندہ) کہا جاتا ہے اور وصف مرجوّ کے باعث تجلی ربوبیت کے مشاہدہ سے اس پر احکام رجاء نمودار ہوتے ہیں۔ چنانچہ بندہ اسی سے موصوف ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا اس پر غلبہ ہے اور اس کے رجاء میں خوف بھی پوشیدہ ہوتا ہے کیونکہ یہ دونوں ایمان کے اوصاف ہیں جیسے کہ پرندے کے دو بازو ہوں۔

خوف و امید کی حالت رکھو

جس طرح پرندہ دو بازوؤں کے درمیان ہوتا ہے اسی طرح ایک مومن ہمیشہ خوف و امید کے درمیان رہتا ہے۔ یعنی ان پر صفاتِ مخوفہ اور اخلاقِ مرجوّۃ کے مقامِ مشاہدہ سے طاری ہونے والے احوال جاری رہتے ہیں اور دوسرا مقامِ اصحابِ یمین ہے۔ یہ وُہ ہے جو اُنہوں نے احکام کے تفاوت اور اقسام کے فرق سے معلوم کیا۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ نے مخلوق پر اپنے فضل و کرم سے جبر کی حالت نہیں رکھی بلکہ اختیار عطا فرمایا۔ جب انہیں یہ بتایا تو انہوں نے ابتداء سے کامل نعمت کی امید رکھی۔ چنانچہ (موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے) جادوگروں کو مغفرت کا طمع یہیں سے ہُوا کہ جب انہوں نے ایمان سے آغاز کیا۔ (یعنی ایمان لاتے ہی انہیں مغفرت کی امید و خواہش پیدا ہوئی)۔ چنانچہ انھوں نے (ایمان لاکر) کہا:

اِنَّا نَطۡمَعُ اَنۡ یَّغۡفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰیٰنَاۤ اَنۡ كُنَّاۤ اَوَّلَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ [1] (ہم غرض رکھتے ہیں کہ بخشے ہم کو رب ہمارا گناہ ہمارے، اس واسطے کہ ہم ہُوئے پہلے قبول کرنے والے)

یعنی اس مقام پر ہم پہلے ایمان لا رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں بخش دے گا۔ اس لیے کہ اس نے ہمیں ایمان عطا فرمایا۔ چنانچہ اسی وجہ سے انہیں مغفرت کی اُمید ہُوئی۔

اللہ تعالیٰ نے ایسے بندے کی مذمت فرمائی کہ جس سے ایک نعمت چِھن گئی اور وہ اس کے واپس آنے سے

---

[1] الشعراء آیت ۵۱۔

مایوس ہو بیٹھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ۔[1] (اور اگر ہم چکھا دیں آدمی کو اپنی طرف سے رحمت، پھر وہ چھین لیں اس سے، تو وہ ناامید ناشکر ہے)

پھر صالحین اور اس پر صبر کرنے والے بندوں کو مستثنیٰ کر کے فرمایا:

اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔ (سوائے ان کے کہ جنہوں نے صبر کیا اور اچھے کام کیے)

منقول ہے کہ حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے فرمایا:

"اللہ سے ایسے خوف کھا کہ تو اس کے مکر (گرفت) سے بے خوف نہ ہو اور اپنے خوف سے زیادہ اس سے امید رکھ۔"

اس نے عرض کیا:

"میں یہ کیونکر کر سکتا ہوں میرا تو ایک ہی دل ہے؟"

فرمایا: "تمہیں خبر نہیں کہ مومن دو دل والے کی طرح ہوتا ہے؟ ایک کے ساتھ ڈرتا ہے اور دوسرے کے ساتھ امید رکھتا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ ایمان کے دو اوصاف ہیں۔ خوف اور امید۔ اور مومن کا دل ان دونوں میں سے کسی سے بھی خالی نہیں ہوتا۔ گویا یہ دو دلوں والے کی طرح ہوا۔

پھر مخلوق کے چار طبقات ہیں اور ہر طبقہ میں ایک گروہ ہے۔ ان میں سے بعض مومن کی حالت میں زندہ رہتے ہیں اور مومن حالت میں فوت ہوتے ہیں۔ یہیں سے انہیں اپنے لیے اور دوسرے اہل ایمان کے لیے امید رہتی ہے۔ اس لیے کہ جب انہیں عطا کیا گیا تو انہیں امید ہوئی کہ ان پر یہ نعمت کامل ہوگی اور اپنے فضل و کرم سے ان سے یہ نعمت سلب نہیں ہوگی جو کہ انہیں ابتداءً دی گئی۔

بعض لوگ مومن کی حالت میں زندہ رہتے ہیں اور کفر کی حالت میں مرتے ہیں۔ اس سے ان پر اور دوسروں پر خوف طاری رہتا ہے۔ اس لیے کہ انہیں اس حکم کا علم ہے اور اللہ کا حکم علمِ سابق کے ساتھ غائب اور مخفی ہے۔

بعض لوگ کافر حالت میں زندہ رہتے ہیں اور مومن حالت میں فوت ہوتے ہیں اور بعض کافر حالت میں زندہ رہتے اور کافر حالت ہی میں مرتے ہیں۔ ان دونوں حکموں نے انہیں رجاء لازم کیا۔ مشرک کو جب دیکھا تو بھی مایوس ہوئے اس کا ظاہر دیکھ کر۔ اور اس رجاء کا خوف دوسرا خوف ہے کہ اس حال پر نہ مر جائے اور

---

[1] ہود۔ آیت ۹۔

یہی اللہ تعالیٰ کے ہاں حقیقت نہ ہو۔

ایک مومن ان چاروں احکام سے آگاہ ہوتا ہے۔ اس لیے اس پر خوف و امید کی حالت ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ چنانچہ ان کے معتدل ایمان کی برکت سے ان کا حال بھی معتدل ہو گیا۔ مخلوق پر ظاہر کے ساتھ حکم کیا اور بواطن کو علام الغیوب کے سپرد کر دیا اور کسی بندے پر ظاہری شر سے قطعی حکم نہیں دیا بلکہ اللہ کے نزدیک اس کے باطنی خیر کے بارے میں امید رکھی اور ظاہری خیر کے ساتھ اپنے لیے اور دوسرے کے لیے گواہی نہیں دی بلکہ ڈرتا رہا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کہیں باطن میں کوئی برائی مستور نہ ہو۔ البتہ یہ حالت رہی کہ بندہ اپنے نفس پر ڈرتا رہے اور دوسرے کے لیے امید رکھے۔ اس لیے کہ اہلِ ایمان حسنِ ظن کے ساتھ عبادت کرنے والے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ بات اہلِ ایمان میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ وہ لوگوں کے ساتھ حسنِ ظن رکھتے ہیں اور ان کے لیے اعذار تسلیم کرتے ہیں کیوں کہ ان کے قلوب سلامت ہیں اور خدا کی طرف تمام امور جانے والے ہیں اور ان کا معاملہ نظروں سے غائب ہے۔ اس لیے عام مومنین کے بارے میں حسنِ ظن سے ہی کام لیتے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ اپنے نفوس کے بارے میں بدظنی سے کام لیتے ہیں کیونکہ وہ ان کی صفات سے آگاہ ہیں اور اپنے نفوس پر ملامت کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ باطنی طور پر ڈرتے رہنے کے باعث اور اس خطرہ کے باعث کہ وہ انہیں پاک بتانے لگیں گے۔ ان کے لیے استدلال نہیں دیتے۔ (یعنی اپنے نفوس کی پاکیزگی پر دلائل نہیں دیتے پھرتے)

اور جب یہ دونوں مفاہیم اُلٹ جائیں وہ فریب میں آ گیا۔ اب وہ اپنے نفس پر حسن ظن رکھے گا اور دوسروں سے بدگمان ہو گا۔ لوگوں کے بارے میں ڈرے گا اور اپنے بارے میں امیدوار رہے گا۔ اپنے لیے عذر تلاش کرے گا اور لوگوں کو ملامت کرے گا اور ان کی مذمت کرے گا۔ یاد رکھیے۔ یہ (موخر الذکر) منافقین کے اخلاق ہیں۔

رجاء کی علامت، کثرتِ عبادت ہے

اہلِ رجاء کی اپنے حال سے ایک علامت ہے اور اس کے حال کی اس کے رجاء سے علامت ہے۔ چنانچہ رجاء کی علامت یہ ہے کہ اسے مشاہدۂ مرجو حاصل ہوتا ہے۔ عبادت کرنے اور اس کا تقرب حاصل کرنے اور نوافل ادا کر کے اس کا قرب پانے کی مسلسل کوشش کرتا ہے۔ اس لیے کہ اسے اس پر حسنِ ظن ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اچھی امیدیں وابستہ رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ وہ بندے پر لازم ہونے کے اعتبار سے نہیں اور نہ ہی ہمارے استحقاق کے باعث بلکہ محض اپنے فضل و کرم سے اعمال صالحہ کو قبول فرماتا ہے اور اپنی رحمت و احسان کے صدقہ سے بُرے اعمال کو معاف فرماتا ہے۔ یہ اس کا لطف و کرم ہے اور یہ اس پر لازم نہیں اور اس پر حسنِ ظن کے اعتبار سے وہ نوازش کرتا ہے۔

جیسے کہ حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"جس نے گناہ کیا اور یہ جان لیا کہ اللہ تعالیٰ کو اس پر قدرت حاصل ہے اور اس سے امیدِ (رحمت و مغفرت) رکھی تو اللہ تعالیٰ اس کا گناہ معاف کر دے گا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کی مذمت فرمائی۔ فرمایا:

وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِيْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ اَرْدٰىكُمْ [۱] (اور یہ وہی تمہارا خیال ہے جو تم رکھتے تھے اپنے رب کے حق میں اس نے تم کو کھپایا)

اور اس طرح ایک جگہ فرمایا:

وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا [۲] (اور اٹکل کی تم نے بری اٹکلیں، اور تم لوگ تھے کھپنے والے)

یعنی تم ہلاک ہونے والی قوم ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے خطاب میں یہ دلیل آئی کہ "جو اچھا ظن رکھے وہ نجات پانے والوں میں سے ہے"۔

روایت میں آتا ہے:

"جو گناہ کر بیٹھے۔ پھر اُسے اس کی وجہ سے غم لاحق ہو تو اس کا گناہ معاف کر دیا جائے گا۔ چاہے (زبان سے) استغفار نہ کیا جائے"۔ اور جس طرح مقاماتِ یقین مختلف ہیں اسی طرح رجا، (امید) کے مقامات بھی مختلف ہیں۔ بعض فرضی ہیں اور بعض نفلی درجہ پر ہیں۔ بندے پر یہ فرض ہے کہ اپنے مولائے کریم، خالق و معبود اور رازق تعالیٰ پر اس کے فضل و کرم کے اعتبار سے امید رکھے اور اپنے نفس کی صفات پر نظر کرنے کے اعتبار سے امید نہ لگاتا پھرے۔

قبولیتِ دُعا کی اُمید رکھو

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"جو اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگے پھر اپنے نفس اور اپنے اعمال کی طرف دیکھے تو وہ قبولیت نہ پائے گا۔ (قبولیت دعا) اس وقت ہوگی کہ جب تنہا اللہ تعالیٰ اور اس کے لطف و کرم پر نظر کرے اور دعا کی قبولیت کا یقین رکھے"۔

میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو آدمی اللہ تعالیٰ سے کچھ مانگے اور [illegible] پر کسی بات کی امید رکھے۔ مگر اپنے نفس اور اپنے عمل پر اس کی نگاہ رہے۔ وہ اللہ تعالیٰ سے اُمید باندھنے میں خلوص سے محروم ہے۔ اس لیے کہ

---

[۱] حٰمٓ السجدہ آیت ۲۳۔
[۲] الفتح آیت ۱۲۔

وہ اپنی طرف نظر کر کے اس کے ساتھ شرک کر رہا ہے۔ جب مخلص نہ ہوا تو صاحبِ یقین نہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ اس کا عمل و دعا صرف اخلاص و یقین کی برکت سے ہی قبول کرے گا۔ جب اسے توحید کا مشاہدہ ہُوا اور وحدانیت کی طرف اس کی نگاہ رہی۔ اب وہ مخلص و صاحبِ یقین ہے۔ حدیث میں اس طرح فرمان ہے کہ :

"جب تم دعا کرو تو قبولیت کا یقین کرنے والے ہو جاؤ۔ اس لیے کہ اللہ صرف یقین کرنے والے کی دعا ہی قبول فرماتا ہے اور اس دعا کرنے والے کی دعا (قبول فرماتا ہے) کہ جو دل سے دعا کر رہا ہو۔" اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے جس آدمی کو دعا کرنے پر لگا دیا۔ سمجھ لو اس کے لیے عبادت کا ایک دروازہ کھول دیا۔

حدیث میں ہے کہ :

"دعا کرنا، نصف عبادت ہے اور نافلۃ (خلوص والے) کے بغیر دعا قبول نہیں فرماتا۔"

نافلۃ کا معنی ہے خلوص والا۔ دعا کا قلیل ترین اجر یہ ہے کہ اُسے دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک نیکیاں عطا فرماتا ہے اور سب سے بڑا اجر یہ ہے کہ اس کے لیے آخرت میں ذخیرہ فرماتا ہے جو کہ دنیا اور اس کے اندر کی ہر چیز سے بڑھ کر ہوگا اور اس قدر اجر ہوگا کہ کبھی کسی کے دل پر بھی نہیں کھٹکا اور یہ درجہ اسے اللہ تعالیٰ کی جانب سے حسنِ نظر و اختیار کے باعث حاصل ہوتا ہے اور متوسط درجہ یہ ہے کہ اس سے وہ آفت ٹل جاتی ہے کہ اگر اسے جانتا ہوتا تو دعا مانگنے کی بجائے اسے دور کرنا زیادہ پسند کرتا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ :

"جو آدمی بھی قبولیت کا یقین رکھتے ہُوئے دعا کرے اور کسی معصیت کی بات یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اسے تین میں سے ایک ضرور عطا فرماتا ہے :

یا جو مانگتا ہے وہی دعا قبول فرماتا ہے۔

یا اس کی طرح کی تکلیف اس سے دُور کر دیتا ہے۔

یا اس کے لیے آخرت میں ذخیرہ کر دیتا ہے جو اس کے لیے بہتر ہوتا ہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اخبار میں ہے :

"اے پروردگار! تو کس مخلوق پر سب سے زیادہ ناراض ہے؟"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

"جو میری قضا پر راضی نہ ہو اور جو آدمی کسی بات میں مجھ سے بھلائی مانگے۔ پھر میں اس کے لیے فیصلہ کر دوں اور وُہ اسے ناپسند کرے۔"

دُوسری روایت میں ہے کہ انھوں نے عرض کیا :

"اے پروردگار! تیرے نزدیک کون سی چیز سب سے زیادہ محبوب اور کون سی مبغوض ہے؟"

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے فرمایا:

"میرے نزدیک محبوب ترین چیز میری قضا پر راضی رہنا اور مبغوض ترین بات یہ ہے کہ تو اپنے نفس کی تعریف کرتا پھرے۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

ایک آدمی نے آپؐ سے عرض کیا:

"مجھے وصیت فرمائیے۔"

آپؐ نے فرمایا:

"اور کسی بات میں اللہ کو متہم نہ کرو کہ تجھ پر اس کا فیصلہ ہو گیا ہو"! (یعنی قضائے الٰہی کے بارے بُرے کلمات زبان سے نہ نکالو۔ واللہ اعلم)

ایک دوسری روایت میں ہے:

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آسمان کی جانب نظر کی اور ہنس پڑے۔ آپؐ سے اس کا سبب دریافت کیا گیا تو فرمایا:

"ایک مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کی قضا سے مجھے تعجب ہُوا کہ ہر قضا میں اس کے لیے خیر و بھلائی ہوتی ہے۔ اگر اس کے لیے مسرت کا فیصلہ ہو تو وُہ راضی ہوتا ہے اور یہ اس کے لیے بھلائی ہے اور اگر اس کے لیے تنگی کا فیصلہ ہو اور وُہ راضی ہوتا ہے اور یہ اس کے لیے بہتر ہے"!

بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے عجز و تملق اختیار کرتا ہے۔ یہ بھی حسن ظن کا نتیجہ ہے۔ حدیث میں آتا ہے:

"اللہ تعالیٰ کے لیے حسن ظن رکھنا اللہ تعالیٰ کی حسن عبادت سے ہے۔" جیسے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيۡهِ[۵] (پھر سیکھ لیے آدم نے اپنے رب سے کئی باتیں، پھر متوجہ ہُوا اس پر)

اس کی تفسیر میں مروی ہے کہ یہ کلمات حضرت آدم علیہ السلام کے یہ کلمات ہیں کہ:

"اے پروردگار! میرا یہ گناہ جو مجھ سے سرزد ہُوا یہ میرے نفس کی طرف سے ہے یا تیرے سابق علم کی کسی چیز سے ہے۔ پہلے اس کے کہ تُو نے مجھے پیدا کیا اور تُو نے مجھ پر اس کا فیصلہ فرما دیا؟"

---

۵ البقرہ آیت ۳۷۔

جواب آیا کہ:

"میرے علم سے ہے۔ میں نے اسے تم پر نافذ کر دیا۔"

انہوں نے عرض کیا:

"اے پروردگار! اب جیسے تو نے مجھ پر اس کی قضا کی (فیصلہ فرمایا)۔ اب اسے بخش دیجئے۔"

فرمایا: "یہی وہ کلمات تھے جو کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں القاء فرمائے۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"اللہ تعالیٰ قیامت کے روز بندے سے پُوچھے گا کہ جب تو نے ایک بُرائی کو دیکھا تو اس کا انکار کرنے سے کس بات نے تجھے روکا؟"

فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو دلیل القاء فرمائی اور بندہ جواب دے گا:

"اے پروردگار! میں نے تجھ سے امید رکھی اور لوگوں سے ڈرا۔"

فرمائے گا: "میں نے اسے بخش دیا۔"

خبرِ مشہور میں ہے کہ:

"ایک آدمی لوگوں کو قرض دیتا تھا تو ان سے درگزر کرتا اور تنگ حال آدمی سے تجاوز کر جاتا۔ اس کی اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہُوئی تو اس نے کوئی نیک نہیں کر رکھا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم اس کے تجھ سے زیادہ حقدار ہیں۔ بتایا کہ (اللہ تعالیٰ نے) اس کی امید و (حسن) ظن کے باعث ہی بخش دیا۔"

اہل رجاء کا تفاوت

فضائلِ رجاء میں اہل رجاء کو باہمی امتیاز حاصل ہے۔ ان میں سے مقربین کو قرب و مجالست اور تجلی سے امید کا اعلیٰ درجہ حاصل ہوتا ہے یعنی جن معانی صفات کی انہیں معرفت و تجلی حاصل ہوتی ہے اور یہ ان کے اس علم کے ساتھ ہوتا ہے۔ اہل رجاء میں سے اصحابِ یمین کو مزید انعام کے باعث امید کا وافر حصہ حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے وعدہ ہائے عطاء و بخشش پر یقین ہوتا ہے۔

اگر نیک اعمال کے لیے شرحِ صدر حاصل ہو جائے تو یہ رجاء کی علامت ہے۔ اس طرح یہ بھی رجاء کی علامات ہیں کہ انسان نیک اعمال کے فوت ہونے سے ڈرے۔ ان کے قبول ہونے کی اُمید رکھے۔ وعدے پُورے ہونے کی امید رکھ کر مجاہدہ کرے اور بُرائی چھوڑ دے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے یہ اعمالِ خیر کرے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان اس طرح ہے۔ فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا (بے شک جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ یَرْجُوْنَ رَحْمَۃَ اللّٰہِ۔ لڑے اللہ کی راہ میں، وہی اللہ کی رحمت کی رکھتے ہیں)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت وجہاد کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

"مہاجر وہ ہے جو برائی چھوڑ دے اور مجاہد وہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے (امر) میں اپنے نفس سے جہاد کرے اور نماز قائم کرے جو کہ معبود کی خدمت (عبادت ہے)۔ پوشیدہ اور علانیہ (ہر حال میں) تھوڑا اور زیادہ مال خرچ کرے اور ان سے جُدا ہو کر دنیا کی تجارت میں مصروف نہ ہو جائے۔" جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل حقیقت امید رکھنے والوں کا وصف بیان فرمایا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّ عَلَانِیَۃً یَّرْجُوْنَ تِجَارَۃً لَّنْ تَبُوْرَ۔

(بے شک جو لوگ اللہ کی کتاب پڑھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو ہم نے انہیں دیا اس سے خرچ کرتے ہیں۔ چھپے اور کھلے، وہ امید رکھتے ہیں ایک تجارت کی، جو کبھی نہ ٹوٹے)

رات کی گھڑیوں میں مناجات کرنا بھی رجاء میں ہے یعنی تہجد کے لیے طویل قیام کرنا بستروں سے الگ ہو کر عبادت و دعا میں مشغول ہونا۔ اس لیے کہ دلوں میں خوف شدت اختیار کر لیتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اہل رجاء کا وصف بیان کرتے ہوئے فرمایا:

اَمَّنْ ھُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّیْلِ سَاجِدًا وَّ قَآئِمًا یَّحْذَرُ الْاٰخِرَۃَ وَ یَرْجُوْا رَحْمَۃَ رَبِّہٖ قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ۔[1]

(بھلا ایک جو بندگی میں لگا ہے گھڑیوں رات کی، سجدے کرتا اور کھڑا، خطرہ رکھتا ہے آخرت کا، اور امید رکھتا ہے اپنے رب کی رحمت کی، تو کہہ، کوئی برابر ہوتے ہیں سمجھ والے اور بے سمجھ)

چنانچہ ڈرنے والوں، امید رکھنے والوں اور راتوں کو تہجد ادا کرنے والوں کو علماء قرار دیا۔ اس بحث کا خلاصہ یہ نکلا کہ جس میں خوفِ خدا نہ ہو اور نہ ہی وہ امید رکھے وہ عالم نہیں۔ اس لیے کہ دونوں کے درمیان میں نفی مساوات موجود ہے، اس قسم کے کلام میں خبر حذف کر دی جاتی ہے اور ایک ہی وصف کا ذکر کافی سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اندازِ کلام میں اس پر دلیل موجود ہوتی ہے۔

رجاء واقع ہونے کی شرائط

مقربین کے نزدیک مقامِ یقین میں سب سے پہلے رجاء (امید) آتی ہے اور صدیقین کے بہ ظاہری اوصاف میں سے ہے۔ ایک بندے کے دل میں رجاء اس وقت کامل و واقع نہیں ہو سکتی۔ جب تک حسبِ ذیل اوصاف بھی نہ پائے جائیں۔

---

[1] الزمر۔ آیت ۹

" اللہ تعالیٰ پر ایمان۔ اللہ تعالیٰ کی جانب مہاجرت اختیار کرنا (ممنوعات سے پرہیز اور ماموررات کا اتباع)۔ اس میں مجاہدہ کرنا۔ تلاوتِ قرآن مجید۔ نماز قائم کرنا۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا۔ رات و قیام و سجود کرنا۔ یہ سب کام کرنے کے باوجود ڈرتے رہنا۔"

یہ تمام صفات اہلِ رجاء کی ہیں اور احوالِ یقین میں سے یہ پہلا مرحلہ ہے۔ پھر اعضائے ظاہر اور قلوب کے ذریعہ، ظاہری اور باطنی طور پر اس سلسلہ میں اعمال بڑھتے رہتے ہیں۔ جس قدر انوار و علوم اور پائی جانے والی اوصاف کے باعث مکاشفاتِ غیبی میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

خوف و رجا میں فرق

واضح بات کی جائے گی تو یہ ہے کہ خوف و رجاء دراصل دو مقاموں کی طرف جانے والے دو طریق ہیں؛

" خوف، علماء کا مقامِ علم کی طرف جانے والا طریق ہے اور رجاء، عمال (عبادات کرنے والوں) کا مقامِ عاملین کی طرف جانے والا ایک طریق ہے۔"

جو لوگ اعمالِ صالحہ کے ساتھ ساتھ امید رکھتے ہیں اس لیے کہ انہیں خوف کے باعث امید میں قوت حاصل ہوتی ہے۔ صدقِ رجاء اور اس میں انہماک سے یہ انعام کامل ہو جاتا ہے۔ ان کا وصف بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا؛

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ۔ (اور جو لوگ دیتے ہیں اور ان کے دلوں میں ڈر ہے)

اللہ تعالیٰ نے ان کی حالتِ وفا اور نیک اعمال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا؛

اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِىْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا۔ (ہم بھی تھے اپنے گھر میں ڈرتے رہتے۔ پھر احسان کیا اللہ نے ہم پر)

اور ایک جگہ فرمایا؛

يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَ يَخَافُوْنَ يَوْمًا۔ (نذر پوری کرتے ہیں اور اس دن سے ڈرتے ہیں)

یہ اس اعتبار سے ہے کہ خوف کو رجاء سے ارتباط حاصل ہے۔ اب جہاں رجاء آئے گی وہاں اسے شعلہ بننے سے کم رکھنے کے لیے خوف آ جائے گا۔ (تاکہ امید میں رہ کر اعمال سے غافل نہ ہو جائے)۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اہلِ عربیت کہا کرتے ہیں؛

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ۔[۵] (کہہ دے ایمان والوں کو کہ معاف کریں ان کو جو امید نہیں رکھتے اللہ کے دنوں کی)

۵: جاثیہ آیت ۱۴۔

یعنی جو لوگ اللہ تعالیٰ کے عذابوں سے نہیں ڈرتے۔ جب اس کا اس قدر فضل ہے کہ جو امید نہ رکھے۔ اس کی مغفرت کا حکم دے تو اب جو امید رکھے اس پر کس قدر مغفرت وفضل ہوگا۔ (یہ تو گمان سے باہر ہے)۔ بعض اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے تحت فرماتے ہیں:

تَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰہِ مَا لَا یَرْجُوْنَ۔

یعنی اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں جو وہ نہیں ڈرتے۔ اب اگر علماء کے نزدیک (رجاء، خوف) ایک ہی چیز کی طرح نہ ہوتے تو ایک کی تعبیر دوسرے کے ساتھ کیونکر کی جاتی۔

رجاء کی علامت یہ بھی ہے کہ خلوتوں میں بندہ اپنے پروردگار کے ساتھ مانوس ہو۔ علماء کے ساتھ انس رکھ کر اور اولیاء سے مانوس ہو کر خدا کا انس وتقرب حاصل کرے۔ نیک لوگوں کے ساتھ مجلس کرتے ہیں وحشت نہ رہے۔ ان کے پاس بیٹھنے سے سکون وشرحِ صدر حاصل ہو۔ رجاء کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ اعمالِ خیر کی حلاوت کے باعث نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں مشقت محسوس نہ کرے۔ گھر والوں کو خیر وتقویٰ پر آمادہ کرے نیک اعمال رہ جانے پر افسوس کرے اور کر لینے پر فرحت حاصل ہو۔

اہلِ یقین کا وصف، رجاء ہے

ایک روایت میں ہے کہ:

"جس کو اس کی نیکی مسرت دے اور اس کی برائی اسے بُری لگے وہ مومن ہے۔"

ایک روایت میں ہے کہ:

"میری اُمت کے بہتر لوگ وہ ہیں جو نیکی کریں تو خوش ہوں۔ اور برائی کر بیٹھیں تو معافی مانگیں۔" اس لیے کہ مومن کو اس معاملہ میں یقین اور دینی بصیرت حاصل ہوتی ہے اور خدا تعالیٰ پر یقین کرنے والوں کا وصف، خوف و رجاء ہے۔ اب جب وہ نیک کام کرے گا اسے اس کے ثواب کا یقین ہوگا۔ اس لیے کہ وہ وعدہ سچا ہے اور وعدہ کرنے والا کریم ہے اور جب برائی کرے گا تو اس کی بُرائی کا اسے یقین ہے۔ اس لیے برائی کر کے بیٹھنے پر خدا تعالیٰ کی ناراضگی سے ڈرے گا کیونکہ وعید کا خوف ہے اور وعید کرنے والے کی عظمت بھی سامنے ہے اور علم کی دلالت اس پر ہے کہ نیک کاموں میں لگ جانا در اصل اللہ تعالیٰ کی محبت ورضا میں داخل ہونا ہے۔ یہ تو دنیا میں اللہ کی رضا ہے۔ اب اسے خدا کی رضا سے مسرت کیونکر نہ ہوگی؟ اور خدا کی نافرمانی میں داخل ہونا در اصل اللہ تعالیٰ کے غضب میں داخل ہونا ہے۔ اس لیے کہ یہ بات اسے بُری لگے گی کیونکہ آج اس کی نافرمانیوں پہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ہے تو کل اس پہ عذاب آئے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

یُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰہِ اَکْبَرُ مِنْ مَّقْتِکُمْ (ان کو پکار کر کہیں گے، اللہ بیزار ہوتا تھا زیادہ اس سے کہ

اَنۡفُسَكُمۡ ۔ (تم بیزار ہوئے ہو)

اس کی وضاحت میں بتایا گیا ؛

" جب آگ میں جلنے کے بعد اپنے نفوس کو دیکھیں تو ان پر غصہ منائیں گے تو انہیں آواز دی جائے گی کہ لَمَقۡتُ اللّٰہِ ۔ دنیا میں اس کی نافرمانیوں پر اللہ تعالیٰ کی ناراضگی ، اَكۡبَرُ مِنۡ مَّقۡتِكُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ آج عذاب میں پھنس کر تمہاری اپنی جانوں پر ناراضگی سے بڑھ کر ہے جیسے کہ اس کی رضا کل جنت کے انعامات کی صورت میں ملے گی ۔ اسی طرح آج کی رضا کا پھل یہ ہے کہ نیک کاموں اور طاعات کی توفیق حاصل ہوئی ۔ جس بندے کو علم الیقین سے کشف حاصل ہوا ایک مراد بندے (خدا کے چاہے ہوئے بندے) کا وصف یہ ہے ۔

حضرت زید خیل کی حدیث بھی اسی قبیل سے ہے ۔ وہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور عرض کیا ؛

" میں آپ کے پاس حاضر ہوا تا کہ یہ معلوم کروں کہ جس کو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اور جس کو نہیں چاہتا ان کی علامات کیا ہیں ؟"

آپ نے فرمایا ؛ " تم نے صبح کیسے کی ؟"

انہوں نے عرض کیا ؛ " میں نے اس حال میں صبح کی کہ بھلائی اور بھلائی والوں سے محبت رکھتا ہوں ۔ اگر مجھے کسی بھلائی پر قدرت حاصل ہو جائے تو تیزی سے اسے کروں اور مجھے اس کے ثواب کا یقین ہے ۔ اور اگر کوئی بھلائی رہ جائے تو مجھے اس پر غم ہوتا ہے اور اس (بھلائی کے کام) کی طرف جی دوڑتا ہے ۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ؛

" اللہ تعالیٰ جس میں رغبت رکھتا ہے یہ اسی کی علامت ہے اور اگر اللہ تعالیٰ تجھے دوسرے کے لیے چاہتا تو اسی کے لیے تجھے تیار کرتا ۔ پھر اسے پروانہ ہوتی کہ تو کس وادی میں ہلاک ہوتا ۔"

رجا کی یہ علامت بھی ہے کہ مسلسل عبادت اور ذی الجلال کے سامنے مناجات کرنے سے اسے لذت و فرحت حاصل ہو ، قریب تعالیٰ کے ساتھ سرگوشی میں خوب دھیان لگائے ۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے تملق اختیار کرے اور اس کے فضل و کرم اور عطا ، واحسان و مغفرت میں حسن ظن رکھے ۔

بعض عارفین کا فرمان ہے ؛

" توحید کا نور ہوتا ہے اور شرک کی آگ ہوتی ہے ۔ شرک کی آگ مشرک کی نیکیاں جس تیزی سے جلاتی ہے اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ توحید کا نور ، مومن کی برائیوں کو جلا دیتا ہے ۔"

موت کے وقت اُمید کا ذکر

حضرت سلیمان تیمیؒ نے انتقال کے وقت اپنے بیٹے سے کہا:

"اے بیٹے! میرے سامنے رخصت کی باتیں کرو اور امید کا تذکرہ کرو۔ حتیٰ کہ میں حسنِ ظن کے ساتھ اپنے اللہ سے جا ملوں۔"

حضرت سفیان ثوری رضی اللہ عنہ نے بھی وفات کے وقت ایسے ہی کیا۔ علماء کو اپنے پاس جمع کر لیا اور وہ انہیں امید دلانے لگے۔

حضرت احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے وفات کے وقت اپنے بیٹے سے کہا:

"میرے سامنے وہ اخبار پڑھو جن میں حسنِ ظن اور امید کا ذکر ہو۔ اب اگر حسنِ ظن اور رجاء اعلیٰ ترین مقامات میں سے نہ ہوتے تو بڑے بڑے علماء انتقال کرنے اور اپنے مولائے کریم سے ملاقات کے وقت اس کی خواہش نہ کرتے۔ وہ چاہتے تھے کہ حسنِ ظن اور امید پر ان کا خاتمہ ہو ورنہ زندگی بھر وہ حسنِ خاتمہ کی دعائیں کیا کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخ فرمایا کرتے،

"جب تک انسان زندہ رہے اس پر خوف کی حالت بہتر ہے اور جب موت کا وقت آئے تو امید کی حالت افضل ہے۔"

مقاماتِ رجاء کے بارے میں حضرت یحییٰ بن معاذ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے:

"جب ایک گھڑی کی توحید پچاس پچاس برس کے گناہ کو مٹا دیتی ہے تو پچاس سال کی توحید گنا ہوں پر کیا کیا اثر کرے گی (یہ تو تصور سے باہر ہے)۔

حضرت ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"صرف اہل رجاء کا ہی خوف صحیح ہے۔"

ایک بار فرمایا:

"علماء مقطوع ہیں سوائے خائفین کے اور خائفین مقطوع ہیں سوائے امید رکھنے والوں کے" اور وہ محبت میں رجاء کا ایک مقام فرمایا کرتے۔ البتہ علماء کے نزدیک مقاماتِ محبت میں پہلا مقام رجاء ہے۔ پھر رجاء اور حسنِ ظن ہی بقدر رفعت کے محبت میں اسے بلندی حاصل ہوتی ہے۔

غضب پر رحمت کا غلبہ

احادیثِ رجاء میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی بشارتیں مروی ہیں جو کہ عام لوگوں کے سامنے ذکر کرنا مناسب نہیں بلکہ جو ظاہر ہو چکیں ان کا ہم

ذکر کرتے ہیں۔

" اللہ تعالیٰ نے جہنم کو اپنے فضل و رحمت سے ایک کوڑا بنا کر پیدا کیا۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو جنت کی طرف ہنکاتا ہے۔"

ایک حدیث میں ہے:

" میں نے مخلوق کو پیدا کیا تاکہ وہ مجھ سے فائدہ حاصل کریں اور میں نے ان سے فائدہ حاصل کرنے کی خاطر مخلوق کو پیدا نہیں کیا۔"

حضرت عطاء بن یسار کی حضرت ابو سعید خدریؓ سے اور ان کی حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی حدیث میں ہے کہ:

" اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز ایسی پیدا نہیں کی مگر یہ کہ ایسی چیز بھی بنائی جو اس پر غالب آئے اور اپنی رحمت کو ایسا کیا کہ وہ اس کے غضب پر غالب آتی ہے۔"

ایک خبر مشہور میں ہے:

" مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ پر یہ لکھ دیا کہ میری رحمت، میرے غضب پر غالب آئے گی۔"

حضرت معاذ بن جبل اور انس بن مالک رضی اللہ عنہما سے اخبارِ مشہور میں ہے کہ:

" جس نے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہا وہ جنت میں داخل ہو گیا اور جس کا آخری کلام لا الٰہ الا اللہ ہو۔ اسے آگ نہیں چھوئے گی اور جو اللہ سے اس حال میں ملاقات کرے کہ اس کے ساتھ کچھ بھی شرک نہ کرتا ہو اس پر آگ حرام کر دی گئی اور جس کے دل میں ایمان کا ایک ذرہ بھر بھی ہو وہ آگ میں داخل نہ ہوگا۔"

ایک دوسری روایت میں ہے:

" اگر کافر اللہ کی رحمت کی وسعت جان لے تو اس کی رحمت سے کوئی ایک بھی مایوس نہ ہو۔"

بڑے بڑے کبیرہ گناہوں پر بھی اللہ تعالیٰ نے معافی کا قلم پھیر دیا۔ جب کہ آیاتِ الٰہی سامنے آئیں اور (لوگوں نے نافرمانی کی مگر اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیا) چنانچہ فرمایا:

ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ۔ (پھر بنا لیا بچھڑا (معبود) بعد اس کے کہ آئیں ان کے پاس نشانیاں، پھر ہم نے وہ بھی معاف کیا)

اللہ تعالیٰ اپنے اولیاء کو مخاطب کرتا ہے اور انہیں بتاتا ہے کہ ان میں میرے احکام اور میری مشیت جاری ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ فرمایا:

فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ۔ (پھر اگر ڈگ گئے گو بعد اس کے کہ پہنچے تم کو صاف حکم، تو جان رکھو کہ اللہ زبردست ہے حکمت والا)

یعنی غالب ہے۔ اس کے بغیر کسی کو اس تک رسائی حاصل نہیں ہوتی۔ حکیم ہے یعنی اپنے بندوں پر اپنی مشیت کے ساتھ حکم دیتا ہے۔ پھر تمام گناہوں کو معاف کر دیتا ہے اور اسے پروا نہیں۔ جیسے کہ جن کو اللہ نے تمام جہانوں پر فضیلت دی۔ ان پر کافروں والا کلام جاری کیا (یعنی وہ ہی کافروں والا کلام کر بیٹھے) اور موسیٰ علیہ السلام سے کہنے لگے؛

اجْعَلْ لَنَا اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ۔ (بنادے ہم کو بھی ایک بت جیسے ان کے بت ہیں)

اور فضیلت کے باوجود یہ کلام انہیں مضر نہ ہوا۔ اسی مفہوم میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے راس جالوت کا معارضہ کیا کہ "تم اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد صرف تیس سال ہی ٹھیک رہ سکے اور پھر ایک دوسرے پر تلواریں اٹھانے لگے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا؛

"ابھی سمندر کے پانی سے تمہارے پاؤں خشک بھی نہ ہونے پائے تھے کہ تم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ جیسا" ان کا خدا ہے ویسا ہمیں بھی ایک خدا بنا دو۔"

خوشخبری سناؤ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ؛

"جب لوگوں کے سامنے تم ان کے پروردگار سے کچھ بیان کرو۔ ایسی چیز بیان نہ کرو جس سے انہیں گھبراہٹ و نفرت نہ ہو۔"

دوسری حدیث میں فرمایا؛

"خوشخبری سنا اور نفرت نہ سنا۔ آسانی کرو اور تنگی کرو۔"

اور جب حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نصیحت کی تو فرمایا؛

"اگر تم وہ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم کم ہنستے اور زیادہ روتے۔"

اس پر حضرت جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے اور کہا؛

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرے بندوں کو کیوں مایوس کر رہے ہو؟"

پھر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور انہیں امید دلائی اور اشتیاق دلایا۔ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت کی۔

اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِيْمٌ۔ (بے شک قیامت کا زلزلہ ایک بڑی چیز ہے)

تو پوچھا، "جانتے ہو یہ کون سا دن ہے؟" جس دن حضرت آدم علیہ السلام سے کہا جائے گا: "اٹھو، اپنی

اولاد میں سے دوزخ کا حصہ بھیج دو۔"

وُہ عرض کریں گے، "کس قدر ؟"

کہا جائے گا: "ہر ہزار میں سے نوصد ننانوے آگ کی طرف اور ایک جنّت کی طرف۔"

راوی بتاتے ہیں کہ (صحابہ) سارا دن روتے رہے اور تمام کام چھوڑ دیے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہُ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور پُوچھا:

"تمہیں کیا ہُوا۔ تم تو اقوام میں اس طرح ہو جیسے کہ سیاہ بیل کی جلد میں ایک سفید بال ہو۔"

ایک روایت میں ہے کہ:

"اگر تم گناہ نہ کرو تو اللہ تعالیٰ ایک دُوسری قوم پیدا کرے گا جو گناہ کرے گی تاکہ انہیں بخشے۔"

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"البتہ تمہیں لے جائے اور ایک ایسی قوم کو لے آئے جو گناہ کرتی ہو تاکہ انہیں بخشے۔ بے شک وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔" یعنی اللہ تعالیٰ کا وصف مغفرت و رحمت ہے۔ اب ضروری ہے کہ اس کے وصف کے تقاضا کے مطابق مخلوق پیدا فرمائے تاکہ یہ وصف اس پر فرمائے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ علمِ معرفت کے بارے میں فرمایا:

"اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے لیے ہر اسم سے ایک وصف ہے اور ہر وصف سے ایک فعل ہے۔" اس میں معرفت کا راز ہے اور خواص کی معرفت اسی سے ہے۔"

حضرت ابراہیم بن ادھمؒ سے بھی اسی مفہوم کی بات مروی ہے، فرمایا:

"ایک رات کو میں طواف کر رہا تھا۔ یہ بارش اور اندھیرے والی رات تھی۔ میں باب کے نزدیک ملتزم میں کھڑا ہُوا۔ اور عرض کیا:

"اے پروردگار! مجھے (گناہوں سے اس طرح) بچالے کہ میں کبھی بھی تیری نافرمانی نہ کروں۔ بیت اللہ سے ایک غیبی آواز آئی:

"اے ابراہیم، تو مجھ سے عصمت مانگتا ہے اور تمام بندے مجھ سے یہی مانگتے ہیں۔ اب اگر میں انہیں عصمت دے دوں تو میں کس پر فضل کروں اور کس کو بخشوں؟"

حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

"اگر مومن گناہ نہ کرے تو وہ اڑتا ہُوا پرندہ ہو جائے مگر اللہ تعالیٰ نے اسے گناہوں کے باعث ذلیل کر رکھا ہے۔ (یعنی دبا رکھا ہے)"

عُجب کا نقصان

اسی طرح روایت میں آتا ہے،

"اگر تم گناہ نہ کرو تو مجھے تم پر گناہوں سے زیادہ سخت بات کا خطرہ ہے۔"

پوچھا گیا، "وہ کیا چیز ہے؟"

فرمایا، "عُجب۔"

میں قسم کرکے کہتا ہوں کہ عجب کا وصف ایک متکبر نفس میں پایا جاتا ہے اور یہ مرض اعمال کو برباد کرنے والا ہے اور یہ بڑے بڑے قلبی اعمال میں سے ہے اور گناہ دراصل شہوانی نفس کے اخلاق میں سے ہے۔ ایک شہوت میں مبتلا آدمی دس گنا نفسانی شہوات میں مبتلا ہو جائے تو بھی یہ کبر و عُجب اور حسد و سرکشی اور مدح و شہرت کی محبت جیسی نفسانی صفات میں مبتلا ہونے سے بہتر ہے اس لیے کہ ان میں سے بعض صفات دراصل صفاتِ ربوبیت میں سے ہیں۔ اور ان میں سے بعض ابلیس کی صفات ہیں اور انہی کے باعث ابلیس برباد ہُوا اور نفسانی شہوات مخلوق کی صفات ہیں اور انہی کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے پروردگار کی معصیت کی مگر بعد میں اللہ تعالیٰ نے انہیں چن لیا اور ان کی توبہ قبول فرما کر انہیں ہدایت بخشی۔

حضرت بشر بن حارث نے فرمایا،

"نافرمانیوں پر نفسانی سکون کے مقابلہ میں مدح سننے پر نفسانی سکون زیادہ نقصان دہ ہے۔"

حضرت یوسف بن حسین نے ایک ہیجڑے کو دیکھ کراہت کے باعث منہ پھیر لیا۔ ہیجڑے نے اس کی طرف مخاطب ہو کر کہا،

"جو تجھ میں (عیب) ہے۔ وہ بھی تیرے لیے کافی (شرمناک) ہے۔" وہ اس کی اس بات پر پریشان ہو گئے اور پوچھا،

"کیا بات تم جانتے ہو؟"

اس نے کہا،

"تجھ میں یہ ہے کہ تُو مجھ سے اچھا ہے۔" (یعنی تو اپنے آپ کو بہتر گمان کرتا ہے)

حضرت یوسف نے اعتراف کیا اور توبہ کر کے اللہ سے معافی چاہی۔

اہلِ رجاء میں سے ایک عارف نے جب سورۃ البقرۃ کی یہ آیتِ دین (جزاء کی آیت) پڑھی تو اُسے مسرت ہوتی ہے اور فرحت محسوس کرتے ہیں۔ ان کی امید بڑھ جاتی ہے۔ کسی نے سبب پُوچھا اور کہا کہ اس میں رجاء نہیں اور نہ ہی کوئی خوشخبری دینے کی بات ہے۔ (اب امید و فرحت کیسی ہو)

جواب دیا، "ہاں ہاں! اس میں بہت بڑی امید ہے۔"

پوچھا گیا: "وہ کیسے؟"

جواب دیا: "تمام دنیا قلیل سی ہے اور قلیل میں سے قلیل سی انسان کی روزی ہے اور یہ دین اس کے رزقِ قلیل سے ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس میں احتیاط کی اور مجھ پر نظرِ شفقت فرمائی کہ میرے دین کو کتاب و گواہوں کے ساتھ موکد کر دیا اور اپنی کتاب میں ایک طویل ترین آیت نازل فرمائی۔ اگر یہ رہ جاتی تو مجھے اس کی پرواہ نہ تھی۔ چنانچہ آخرت میں اس کا میرے ساتھ کیا برتاؤ ہوتا کہ جس میں تیرے پاس کوئی عوض نہ ہوتا۔"

اسی طرح بعض اہلِ رجا، کا یہ طریق تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے جو دو سخا کی امید رکھتے اور اس قدر احسان کی امید رکھتے کہ دنیا میں اس کا کبھی بھی گمان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ آیت یہ ہے:

وَبَدَا لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ۔ (اور نظر آیا ان کو اللہ کی طرف سے جو خیال نہ رکھتے تھے)

حضرت جنید رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے:

"اگر کرم کا ایک ہی چشمہ جاری ہو جائے تو وہ گناہ گاروں کو نیکیوں کے ساتھ لاحق کر دے۔" اس بنا پر روایت میں آتا ہے:

"اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس قدر مغفرت فرمائے گا کہ جو کسی کے دل پر کبھی نہ کھٹکے۔ حتیٰ کہ ابلیس بھی گردن اٹھا اٹھا دیکھے گا کہ شاید مجھے بھی کچھ مل جائے۔"

ایک روایت میں ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ کی ننانوے رحمتیں ہیں ان میں سے اس نے ایک ہی رحمت دنیا میں ظاہر فرمائی۔ جس کی وجہ سے مخلوق ایک دوسرے پر رحمت کرتی ہے۔ ایک ماں اپنے بچے کی مشتاق ہوتی ہے اور چوپایہ اپنے بچے پر رحم کرتا ہے۔ جب قیامت آئے گی تو اس رحمت کے ساتھ ننانوے (باقی) رحمتیں بھی ملا دے گا۔ پھر انہیں تمام مخلوق پر پھیلا دے گا اور ان میں سے ہر رحمت آسمانوں اور زمینوں کے برابر ہے۔"

فرمایا: "پھر تو صرف (خود) ہلاک ہونے والا ہی اللہ کی (رحمت کے باوجود) ہلاک ہوگا۔"

بعض علماء کا فرمان ہے:

"جب اللہ تعالیٰ قیامت کے میدان میں کسی بندے کا کوئی گناہ معاف کر دے گا تو ہر ایک کا اس کے عمل سے یہ گناہ معاف کر دے گا۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"عمل کرو اور خوشخبری دو۔ اور جان لو کہ کسی آدمی کو اس کا عمل نجات نہیں دے گا۔"

دوسری حدیث میں ہے:

"تم میں سے کوئی ایسا نہیں کہ جس کا عمل اسے جنت میں داخل کر دے اور نہ ہی کوئی ایسا ہے کہ اس کا عمل اسے آگ سے نجات دے۔"

(صحابہؓ) نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسولؐ! اور آپؐ بھی نہیں؟"

فرمایا: "اور نہ میں ہُوں، سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت وفضل سے مجھے ڈھانپ لے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"میں نے اپنی سفارش اپنی امت کے کبیرہ گناہوں کے (مرتکبین) کے لیے چھپا رکھی ہے۔"

دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"کیا تم اسے صاف شفاف پرہیزگاروں کے لیے سمجھتے ہو بلکہ یہ مخلص (مگر گناہوں) میں ملوث ہونیوالوں کے لیے ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ اور ابو موسیٰ رضی اللہ عنہما کو یمن کی طرف حاکم مقرر فرماتے ہُوئے حکم دیا۔ اور انہیں دوسری وصیتوں کے ساتھ ساتھ یہ وصیت بھی فرمائی۔ فرمایا:

"آسانی کرو اور تنگی نہ کرو۔ خوشخبری سناؤ اور بھگاؤ نہیں۔" ان سے مومنین کو خوب معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور لطف وعطا کس قدر بے پایاں و بے انتہا ہے اور کوئی آدمی بھی اس کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی امید ورجا میں کمی کرتا ہے بلکہ اس پر حُسنِ ظن رکھتا ہے۔ اس لیے کہ وُہ خوب جانتے ہیں کہ اللہ کریم ہی ان کا محبوب ہے اور اس کی محبت انہیں انس وامید عطا کرتی ہے اور اس کی ہیبت انہیں ڈراتی اور مرعوب کرتی ہے۔ چنانچہ ہیبت میں اگر ان کا خوف بھی لذت ہے اور ہیبت میں رہ کر وُہ محبت کی نعمت بھی حاصل کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ خوف ومحبت کے مقام میں معتدل ہو کر رہتے ہیں۔ قوتِ علم کے باعث دونوں سے سرفراز ہیں اور مخوف ومحبوب کے مشاہدہ میں راہِ ہدایت پر ہیں۔ اہل یقین عارفین کا یہی وصف ہے۔ اور یہی لوگ کامل ایمان والے ہیں اور یقین کے مالک اور صفوۃ خواص کے درجہ پر فائز ہیں۔ اس لیے کہ انہیں اس کی معرفت حاصل ہو چکی کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات میں کامل ہے۔ اس میں کسی وصف کی کمی نہیں آتی، اور وسعتِ قدرت کے لیے علم ہے۔ ایسے ہی وسعتِ علم کے لیے رحمت ہے۔ جب اُنہوں نے یہ کلام سُن کر اس کے وصف کا مشاہدہ کر لیا۔ فرمایا:

اِنَّهٗ كَانَ عَلِيْمًا قَدِيْرًا۔ (بے شک وہ جاننے والا قدرت والا ہے)

اسی طرح فرمایا:

وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّ عِلْمًا۔ (ہر چیز سمائی ہے تیری رحمت وعلم میں)

اور فرمایا:

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ کُلَّ شَیْءٍ۔ (اور میری رحمت ہر چیز پر وسیع ہوئی)

اب جہنم وغیرہ سب ہی شئی میں آ کر اس کی رحمت میں داخل ہو گئے۔

ایسے ہی فرمایا۔

فَسَاَکْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ۔ (سو وہ لکھ دوں گا ان کو جو ڈر رکھتے ہیں)

یعنی خاص رحمت اس کا کنہ نہیں اس کا وصف ہے۔ اس لیے کہ اس کی رحمت کی کوئی انتہا نہیں۔ کیونکہ یہ ایسے رحم کرنے والے کی صفت ہے جس کی کوئی حد نہیں اور اس کی رحمت سے کچھ چیز بھی باہر نہیں کیونکہ جہنم اور آگ اس کے عذاب کی کنہ نہیں اور نہ ہی اس کا بہ تمام عذاب ہے جو ایسا گمان کر بیٹھے اس نے اسے پہچانا ہی نہیں البتہ اس نے مخلوق کی طاقت کے قدر اپنا عذاب ظاہر کیا۔

جیسے کہ اس نے مخلوق کی مصالح کے مطابق ہی اپنی نعمتیں اور ملک ظاہر فرمایا اور مخلوق کے لیے جو مناسب نہ تھا اور جس کے ظاہر ہونے پر انہیں اس کی قوت نہیں وہ نعمت و عذاب (موجودہ ظاہرہ) سے بہت زیادہ ہے بلکہ جو اس نے ظاہر فرما دیا اس سے بڑھ کر پہچاننا بھی ان کے لیے مناسب نہیں۔ اس لیے کہ اس کے عذاب و انعام کی انتہا، تو اس کے ملک کی انتہا سے ہے جو اس کے ساتھ قائم ہے اور اس کا ملک اس کی سلطنت و قدرت کی حد تک ہے اور اس کی (قدرت و سلطنت) غیر محدود ہے اور اس کا اظہار ہو تو مخلوق کی طاقت سے قطعاً باہر ہے۔ مزید برآں یہ بھی اس کی صفات اور اسماء کی رونق سے ہے اور یہ امورِ غیبیہ ہیں جن کے انکشاف کے لیے کوئی راہ نہیں۔ پس پاک ہے وہ ذات کہ جس کی قدرت بے انتہا ہے اور جس کی عظمت غیر محدود ہے۔ اور جس کی سلطنت حدود سے باہر ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سُن کر انہیں مشاہدہ حاصل ہوا۔

اِنَّهٗ کَانَ حَلِیْمًا غَفُوْرًا۔ (بے شک وہ علم والا بخشنے والا ہے)

وَکَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَکِیْمًا۔ (اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے)

اب انہوں نے سمجھ لیا کہ اس کی مغفرت اس کے وسعتِ حلم پر ہے جیسے کہ اس کا حلم اس کے وسعتِ علم پر ہے۔ جب انہوں نے اس کا عظیم حلم دیکھا تو انہیں عظیم بخشش کی امید ہوئی اور جب انہوں نے اس قدر پردہ پوشی کا مشاہدہ کیا تو وہ خوب خوب معافی کے امیدوار ہوئے۔

حلمِ خداوندی

اس طرح مروی ہے کہ:

حاملین عرش (فرشتے) آواز دے کر ایک دوسرے کا جواب دیتے ہیں کہ:

سُبْحَانَكَ عَلٰی حِلْمِكَ بَعْدَ عِلْمِكَ، (پاک ہے تو اے علم کے بعد اپنے پر، پاک ہے تو

سُبْحَانَكَ عَلٰی عَفْوِكَ بَعْدَ قُدْرَتِكَ۔ (اپنی قدرت کے بعد اپنے عفو پر)

چنانچہ اہل رجا، عارفین کو کلام اللہ سن کر اس قدر مفاہیم حاصل ہوتے ہیں جیسے کہ ان کو معانی صفات کی رفعتِ علم پر بلند نظری حاصل ہے اور ہر صاحبِ مقام، اپنے مقام کا مشاہدہ کرتا اور مشاہدہ کے اعتبار سے سنتا ہے۔ چنانچہ سب سے اعلیٰ ترین مشاہدہ صدیقین کو، پھر شہداء کو، پھر صالحین کو، پھر خواص اہلِ اسلام کو ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہی اس پر استدلال کیا اور اسی سے اس کی طرف دیکھا:

هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِمَا يَعْمَلُوْنَ۔[1] (لوگ کئی درجے ہیں اللہ کے ہاں اور اللہ دیکھتا ہے جو کرتا ہے)

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"نیکی کرنے والا اس کی وسعتِ رحمت میں زندہ رہتا ہے اور بُرائی کرنے والا وسعتِ حلم میں زندگی گزارتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفات کامل ہیں اور جو بعض کو بعض پر ترجیح دینے لگے تو اس کا مشاہدہ ناقص ہو گیا۔ اس لیے کہ اس سے بلند درجہ کے اہلِ مشاہدہ سے اس کا علم ناقص ہے اور اس لیے اس کا مرادی مقام صادقین سے کم ہے۔"

اس لیے یہ بندے پر لوٹ آیا اور قُرب و بُعد میں اس کا یہی مقام بن گیا اور نقصان وحد سے وصفِ شہود بالاتر ہو گیا۔ خوف کے ساتھ ساتھ رجاء کی مثال ایسے ہے۔ جیسے کہ دین میں عوام کے ساتھ ساتھ رخصت ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کی رخصت کو لیا جائے جیسے کہ وہ پسند کرتا ہے کہ اس کے عزائم کو پسند کرتا ہے۔"

دوسری روایت کے الفاظ اس سے بھی پختہ تر اور بلیغ تر ہیں:

"جیسے اللہ تعالیٰ نافرمانیاں کرنے کو ناپسند کرتا ہے ایسے ہی اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند کرتا ہے کہ اس کی رخصتوں کو قبول کیا جائے۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ:

"یہ دین مضبوط ہے۔ چنانچہ اس میں آسانی داخل کر دی اور اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی عبادت سے بغض نہ دلا اور بہترین دین، آسان ہے۔" اور فرمایا:

"تعمق کرنے والے ہلاک ہوئے غلو کرنے والے ہلاک ہوئے۔"

---

[1] آل عمران۔ آیت ۱۶۳

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

"میں آسان درگزر کرنے والے (دینِ) حنیفی کے ساتھ مبعوث ہوا ہوں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"میں پسند کرتا ہوں کہ اہل کتاب یہ جانتے کہ ہمارے دین میں سہولت ہے۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ۔ (اور اتارتا ہے ان سے بوجھ ان کے، اور پھانسیاں جو ان پر تھیں)

اور اہل ایمان نے یہ دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمالی:

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا۔ (اے ہمارے رب اور ہم پر بوجھ نہ ڈالنا جیسے کہ تو نے ان پر ڈالا جو ہم سے پہلے تھے)

مومنین نے یہ دُعا کی اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"قَدْ فَعَلْتُ۔ (میں نے کر دیا)"

اہل خرد کے لیے ان باتوں کا علم، قوتِ رجاء کا باعث ہے اور یہ کیوں نہ ہو جبکہ خود اللہ تعالیٰ کا فرمان غلبہ رجاء کے لیے ہے۔ فرمایا:

"میں رحمت و عفو کی طرف سزا سے زیادہ قریب ہوں۔"

ایک روایت میں ہے:

"جب تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوگوں کے سامنے کوئی بات بیان کرو تو وہ بیان نہ کرو جو انہیں پریشان کر دے اور ان پر شاق گزرے۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے کلام میں ہے:

"عالم وہ ہے جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مایوس نہ کرے اور نہ انہیں خدا تعالیٰ کی گرفت سے بے خوف بنا دے۔"

خدا کے بندوں سے محبّت کا انعام

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی:

"تجھے کیا ہوا کہ تُو نے تنہائی اختیار کر لی؟"

انہوں نے عرض کیا: "میں نے تیری (محبت) میں مخلوق سے دشمنی کر لی۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"تو نہیں جانتا کہ میری محبت یہ ہے کہ تو میرے بندوں پر نوازش کرے اور ان پر (رحم کر کے) فضل حاصل کرے۔ اس وقت میں تجھے اپنے اولیاء و محبوبین میں درج کروں گا اور میرے کسی بندے کی طرف بے رحمی وجفا کی نظر نہ کرنا۔ اگر ایسا کیا (یعنی نظرِ جفا کی) تو میں تیرا اجر ضائع کر دوں گا۔ تین باتیں مجھ سے یاد رکھ:

۱۔ میرے حبیب سے خالص دوستی رکھ۔

۲۔ اہل دنیا سے قطعی مخالفت رکھ۔

۳۔ اور دین سے چپکا رہ۔

حضرت داؤد وغیرہ دوسرے انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام سے مروی ہے:

"مجھ سے محبت رکھ اور جو مجھ سے محبت کرے اس سے محبت رکھ اور مجھے میری مخلوق کا محبوب بنا۔"

انھوں نے عرض کیا:

"اے پروردگار! یہ تو ہوا کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں اور میں اس سے محبت کرتا ہوں جو تجھ سے محبت کرے مگر میں تیری مخلوق کی طرف تجھے کیسے محبوب بناؤں؟"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"مجھے اچھے طریق پر یاد کر۔ میرے انعامات و احسانات کو یاد کر۔ اور انہیں بھی یہ یاد دلا۔ اس لیے کہ وہ مجھ سے صرف اچھا (سلوک) ہی جانتے ہیں۔"

حضرت یزید رقاشیؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کیا میں تمہیں ایسی قوم کی خبر نہ دوں جو کہ نہ انبیاء ہیں اور نہ شہداء ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے درجات کے باعث ان پر انبیاء و شہداء بھی رشک کریں گے۔ وہ نور کے منبروں پر ہوں گے اور ان پر صاف پہچانے جائیں گے۔"

(صحابہؓ) نے عرض کیا:

"وہ کون لوگ ہیں؟"

آپؐ نے فرمایا:

"جو اللہ کے بندوں کو اللہ کا محبوب بنا دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو اس کے بندوں کا محبوب بناتے ہیں اور اور زمین میں نصیحت کرتے ہوئے چلتے ہیں۔"

(صحابہؓ) نے عرض کیا: "اللہ کو بندوں کا محبوب بنانا تو ظاہر ہے مگر اللہ کے بندوں کو اللہ کا محبوب کرنا

بتاتے ہیں ؟"

آپؑ نے فرمایا ؛

" انھیں ایسی باتوں کا حکم دیتے ہیں جن کو اللہ پسند کرتا ہے اور جن کو اللہ نے حرام کردیا ان سے منع کرتے ہیں جب وہ انہیں اطاعت گزار بنائیں گے تو انہیں اللہ کا محبوب بنایا ۔"

حضرت ابان بن عیاشؒ کو ان کی وفات کے بعد خواب میں کسی نے دیکھا۔ یہ لوگوں کو رخصت کی روایات بتایا کرتے اور انہیں خوب امید دلاتے ۔ انہوں نے بتایا کہ :

" اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے ساتھ کھڑا کیا اور پوچھا :

" تجھے کس بات نے اس پر آمادہ کیا کہ تو مجھ سے معلوم شدہ رخصتوں کو بیان کرتا رہے ؟"

انہوں نے عرض کیا :

" اے پروردگار ! میں نے چاہا کہ میں تیری مخلوق کے نزدیک تجھے محبوب بنا دوں ۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا ؛

" میں نے تجھے بخش دیا ۔"

حضرت مالک بن دینارؒ سے منقول ہے ۔ وہ حضرت ابانؒ سے ملے اور کہا ،

" تو لوگوں کو کب تک رخصتیں بتاتا رہے گا ؟"

انہوں نے جواب دیا ؛

" اے ابو یحییٰ ! مجھے امید ہے کہ قیامت کے روز تو اللہ تعالیٰ کا اس قدر عفو دیکھے گا کہ تیری یہ چادر خوشی کے مارے پھٹ جائے ۔"

وفات کے بعد کلام کا واقعہ

حضرت ربعی بن حراشؒ اپنے بھائی کے بارے میں بتاتے ہیں ۔ یہ بلند پایہ تابعین میں سے تھے اور جن لوگوں نے موت کے بعد کلام کیا ان میں سے یہ بھی ہیں ۔ انہوں نے بتایا کہ جب میرا بھائی فوت ہُوا تو اس پر کپڑا ڈال کر نعش کو ڈھک دیا ۔ پھر ان کے چہرے سے کپڑا ہٹایا گیا اور وہ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور کہا ؛

" میں اپنے پروردگار سے ملا ۔ اس نے خوشگوار اور خوشبو دار حال میں ملاقات فرمائی ۔ وہ ایسا رب ہے غضبناک نہیں ہے اور تمہیں جیسا جیسا گمان تھا میں نے اس سے آسان تر معاملہ دیکھا اور تم غافل نہ ہونا ۔ اب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ میرا انتظار فرما رہے ہیں ۔ حتیٰ کہ میں ان کے پاس واپس ہو جاؤں !"

راوی بتلاتے ہیں کہ یہ کہہ کر انہوں نے اپنا آپ ایسے گرا دیا جیسے کہ ایک کنکر طشتری میں گر پڑے ۔ آخر ہم نے

انہیں اٹھایا اور دفن کیا۔

حضرت بکر بن سلیمان نے بتایا کہ جس عشاء کے قریب حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہُوا۔ ہم ان کے پاس اس وقت حاضر ہوئے۔ ہم نے پُوچھا:

"کیسے معاملہ پا رہے ہیں؟"

انھوں نے فرمایا:

"میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں کیا بتاؤں۔ البتہ تم کل دیکھو گے کہ اللہ تعالیٰ کا عفو اس قدر بے پایاں ہے کہ تمہارے گمان سے باہر ہے۔"

راوی بتاتے ہیں کہ ابھی وہیں تھے کہ (ان کا انتقال ہوا) ہم نے ان کی آنکھیں بند کیں اور انھیں دفن کیا۔

اللہ پر حسنِ ظن رکھو

حضرت یحییٰ بن اکثم کو (وفات کے بعد) خواب میں کسی نے دیکھا تو پوچھا:

"آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیسا معاملہ فرمایا؟"

اُنھوں نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کیا اور فرمایا:

"اے برے بوڑھے، تو نے فلاں فلاں کام کیا!"

بتاتے ہیں کہ مجھ پر اس قدر رعب و پریشانی طاری ہُوئی کہ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ پھر میں نے عرض کیا:

"اے پروردگار! مجھے آپ تعالیٰ سے اس طرح روایت نہیں بتائی گئی۔"

فرمایا: "تو مجھ سے کیا روایت ملی؟"

میں نے عرض کیا:

"ہمیں عبدالرزاقؒ نے بتایا، انھوں نے معمرؒ سے، انھوں نے زہریؒ سے، انھوںؓ نے انس بن مالک سے اور انھوں نے تیرے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا۔ اور آپؐ نے تجھ تعالیٰ سے روایت کیا، تُو برکت والا اور بلند شان والا ہے۔ تو نے فرمایا کہ:

"میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوں۔ اب وہ میرے ساتھ جو چاہے گمان کرے۔" اور مجھے تجھ پر یہ گمان تھا کہ تُو مجھے عذاب نہیں دے گا۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"میرے نبی نے سچ کہا اور انس نے سچ کہا اور زہری نے سچ کہا اور معمر نے سچ کہا اور تو نے سچ کہا۔"

بتاتے ہیں کہ پھر میری پردہ پوشی کر دی گئی۔ مجھے خلعت عطا کیا گیا اور پہنا دیا گیا اور جنّت کی طرف (جاتے ہوئے)

میرے سامنے لوٹ کے چلے۔ میں نے کہا:

"واہ واہ فرحت ملی۔"

حدیث میں ہے کہ:

"بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی لوگوں پر سختی کرتا تھا اور انہیں اللہ کی رحمت سے مایوس کرتا تھا۔ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اُسے فرمائے گا:

"آج میں تجھے اپنی رحمت سے مایوس کروں گا جیسے کہ تو میرے بندوں کو اس سے مایوس کیا کرتا تھا۔"

حدیث میں ہے کہ:

بنی اسرائیل میں سے دو آدمیوں نے اللہ تعالیٰ کی خاطر باہم بھائی چارہ قائم کیا۔ ایک آدمی عبادت گزار تھا اور دوسرا اپنی جان پر زیادتی کرتا تھا۔ یہ عابد اس کو اس سے منع کرتا اور جھڑکتا اور وہ جواب دیتا۔ چھوڑو مجھے اور رب کو، کیا تو مجھ پر نگران بنا کر بھیجا گیا ہے؟ آخر ایک روز اُس نے اسے ایک بہت بڑے گناہ میں مبتلا دیکھا تو (عابد) غضبناک ہو کر کہنے لگا:

"تجھے اللہ تعالیٰ نہیں بخشے گا۔" فرمایا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اسے کہے گا: "کیا تجھے اس کی ہمت ہے کہ تو میرے بندوں سے میری رحمت باز رکھے؟ جا، میں نے تجھے بخش دیا۔" پھر عابد کو فرمایا:

"اور تیری سزا یہ ہے کہ میں نے تیرے لیے آگ واجب کر دی۔"

پھر فرمایا کہ "اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اس نے ایسا کلمہ نکالا کہ اس نے اس کی دنیا و آخرت برباد کر دی۔"

اس مفہوم کی ایک روایت ہے کہ:

"بنی اسرائیل میں سے ایک چور نے چالیس برس تک ڈاکے ڈالے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے پاس سے گزرے اور ان کے پیچھے پیچھے بنی اسرائیل کے عابدوں میں سے آپؑ کا ایک حواری عبادت گزار بھی تھا۔ چور نے اپنے دل میں کہا: یہ اللہ کا نبی ہے اور اس کے ساتھ اس کے حواری ہیں، اگر یہ پڑاؤ کریں تو میں بھی ان کے ساتھ تیسرا ہو جاؤں۔ چنانچہ انھوں نے پڑاؤ کیا اور یہ چور حواری کے قریب ہوا مگر حواری کے احترام کی خاطر اپنے آپ کو ملامت کرتا جا رہا تھا اور دل میں کہہ رہا تھا۔ میرے جیسا (خطاکار) اس عابد کے ساتھ ساتھ چلتا ہے؟

بتایا کہ حواری نے اس کی آمد محسوس کی تو دل میں کہا: یہ (چور) میرے ساتھ چل رہا ہے۔ اس نے اپنا آپ سکیڑ لیا اور عیسیٰ علیہ السلام کی طرف بڑھ گیا اور ان کے پہلو کے ساتھ چلنے لگا۔ اب چور اس کے پیچھے رہ گیا۔

بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ ان دونوں سے کہو۔ اپنے اپنے عمل دوبارہ شروع کریں۔ میں نے دونوں کے سابقہ اعمال مٹا دیے۔ اس حواری کی نیکیاں مٹا دیں کہ اس کو اپنے نفس پر عجب پیدا ہوا اور دوسرے کی برائیاں مٹا دیں کہ اس نے اپنے آپ کو ملامت کی۔ بتایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان دونوں کو یہ بات بتائی اور پھر سفر میں اس چور (تائب) کو اپنے ساتھ ملا لیا اور اسے اپنے حواریوں میں شامل کر لیا۔

حضرت سروق بن اجدعؒ سے منقول ہے کہ :

"ایک نبی سجدہ میں تھا۔ ایک سرکش آدمی نے ان کی گردن پر پاؤں رکھا۔ حتیٰ کہ ان کی پیشانی پر کنکر لگ گئے۔ ان نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غضبناک ہو کر سر اٹھایا اور فرمایا :

"جاؤ، تجھے اللہ ہرگز نہیں بخشے گا۔"

بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی اور فرمایا :

"تو میرے بندوں کے بارے میں مجھ پر قسم ڈالتا ہے۔ میں نے اسے بخش دیا۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ :

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مشرکین پر بددعا کرتے تھے اور نماز میں ان پر لعنت کرتے تھے تو یہ آیت نازل ہوئی :

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ يَكْبِتَهُمْ سے لے کر لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ[1] تک۔

(تاکہ کاٹ ڈالے بعض کافروں کو، یا ان کو ذلیل کرے...... سے لے کر آخر تک)

راوی بتاتے ہیں کہ پھر آپؐ نے ان پر بددعا کرنا ترک کر دی اور راوی بتلاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں اکثر کو اسلام کی ہدایت عطا فرمائی۔

رجاء و حسن ظن کی روایات شمار سے باہر ہیں اور تمام روایات کو یہاں تحریر کرنا ہمارا مقصود بھی نہیں بلکہ قلیل کا ذکر کر کے ہم نے کثیر کی نشان دہی کر دی ہے اور اصحابِ خرد کو آگاہ کر دیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ۔ (اے انسان، تجھے کس چیز نے اپنے ربِ کریم پر بہکایا)

---

[1] آل عمران آیت ۱۲۷، ۱۲۸

چنانچہ بندے کو خبردار کیا کہ اس کے کرم پر غفلت نہ اختیار کر لینا اور یہ بتایا کہ جہالت ہے تو اسے یاد کرتے رہنا تاکہ حسنِ اعتدال ہو جائے۔ یہ بھی اس کی نعمت ہے۔

حضرت ضحاکؒ فرماتے ہیں کہ:

"بندہ پیشی کے وقت اپنے پروردگار تعالیٰ کے قریب ہوگا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

"میرے بندے! کیا تو نے اپنے اعمال شمار کر رکھے ہیں؟"

وہ جواب دے گا:

"اے میرے خدا! میں انہیں کیسے شمار کر سکتا ہوں۔ یہ تیرے ہی بس میں ہے اور تو ہی تمام اشیاء کا حافظ ہے۔" پھر اللہ تعالیٰ دنیا کی گھڑیوں میں کیے ہوئے تمام گناہ یاد کرائے گا اور فرمائے گا:

"تو میرا بندہ ہے۔ اس لیے میں نے جو تمہیں بتا دیا اور یاد کرایا اس کا اقرار کر لے۔"

وہ عرض کرے گا:

"ہاں، میرے مالک۔"

پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

"میں نے ہی دنیا میں تیری پردہ پوشی کی اور تیرے گناہوں کی بدبو نہیں نکلنے دی اور نہ ہی تیرے چہرہ پر کوئی دھبہ لگایا۔ اب آج کے دن تیرے مجھ پر ایمان اور میرے مرسلین (علیہم السلام) کی تصدیق کے باعث میں تجھے بخش دوں گا۔"

حضرت محمد حنیفہ نے اپنے والد حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے روایت کیا۔ فرمایا:

"جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت نازل ہوئی:

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ۔ (سو کنارہ پکڑ، اچھی طرح کنارا)

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے جبرئیل! یہ الصفح الجمیل کیا ہے؟"

انھوں نے جواب دیا:

"اے محمد، جو تجھ پر ظلم کرے۔ جب تو اسے معاف کر دے تو پھر اس پر عتاب نہ کرے۔"

پھر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اے جبرئیل! تو اللہ تعالیٰ اپنے اس قدر کرم کے ساتھ زیادہ لائق ہے کہ جس کو وہ معاف فرما دے اس پر عتاب نہ کرے۔"

بتاتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام رو پڑے اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی روئے۔ اللہ تعالٰی نے حضرت میکائیل علیہ السلام کو دونوں کی طرف بھیجا اور فرمایا:

"تمہارا پروردگار تم کو سلام فرما رہا ہے اور تم دونوں کو یہ فرما رہا ہے کہ "جس کو میں معاف کر دوں اس پر میں کیوں کر عتاب کروں؟ یہ وہ بات ہے کہ جو میرے کرم سے مشابہ نہیں ہے۔"

رجاء کی صورتیں

رجاء اور امید کی صورت ایک یہ ہے کہ جس کی طرف کریم تعالیٰ اشتیاق دلائے اس کا زبردست شوق پیدا ہو جائے اور رحیم تعالیٰ کے نزدیک جو کام مندوب ہو تیزی سے اس کی طرف بڑھے اور عوام جس بات کو رجاء و امید سمجھتے ہیں کہ نافرمانیوں میں لگا رہے اور گناہوں میں مشغول رہے اور اللہ کی مغفرت و کرم کا منتظر رہے۔ یہ طریقہ علماء کے نزدیک رجاء و امید میں سے نہیں ہے۔ اس لیے کہ رجاء تو اصل میں ایک مقامِ یقین کا نام ہے اور اصحاب یقین کا یہ طریقہ نہیں۔ اس لیے کہ رجاء کی ایسی تعریف دراصل خدا تعالیٰ سے غفلت اور احکامِ الٰہی سے جہالت اور اللہ تعالیٰ پر فریب میں مبتلا رہنے کا نام ہے۔

جس قوم نے رجاء کا یہ مطلب سمجھا ہے اور وہ دنیا کی محبت اور دنیا کی رضا سے وابستہ ہوئے اور اس پر مغفرت کی آس لگالی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دھمکی دی اور انہیں گئے گزرے، گرے ہوئے لوگ قرار دیا اور انہیں سخت سزا کی وعید سنائی۔ فرمایا کہ

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَ يَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا۔

(پھر ان کے پیچھے آئے ناخلف وارث کتاب کے، لیتے اسباب زندگی کا، اور کہتے ہیں ہم کو معاف ہوگا)

جو لوگ فریب میں مبتلا ہیں ان کے لیے رجاء کی روایات سے ان کی خود فریبی میں اضافہ ہوتا ہے اور استدراج میں مبتلا لوگوں کو مزید خسارہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر سچی توبہ کرنے والوں کے لیے یہ مزید انعام کا سبب اور مخلص محبین کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور حیاء و کرم والوں کی مسرت اور اصحابِ عصمت و وفاء کے لیے یہ چین و سکون ہے۔ وہ اس سے نفع حاصل کرتے ہیں۔ ان کی زندگی پُر مسرت ہوتی ہے اور انہیں بے قراریوں سے چین ملتا ہے۔ ان کی عقلیں اس سے آرام پاتی ہیں۔ یہ لوگ خوف سے زیادہ رجاء و حسن ظن کے باعث عبادات بجا لاتے ہیں۔ اس لیے کہ خوف دلانے کے امور، اکثر معاملات کو ختم کر دیتے ہیں (کہ آدمی ڈر سے نڈھال ہو کر عام عبادات سے رہ جاتا ہے) اب ان کے لیے رجاء کی راہ ہی موزوں ہے اور اس سے وہ پُر امید ہو سکتے ہیں۔ جیسے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ صہیب پر رحم فرمائے۔ اگر اللہ تعالیٰ سے نہ ڈرے تو اس کی نافرمانی نہ کرے۔ یعنی اس نے خوف کی وجہ سے نہیں بلکہ رجاء کے باعث معصیت ترک کر دی۔ اب رجاء ہی اس کا طریق ہوا۔ یہی حقیقی رجاء والے لوگ تھے اور یہی ان کی علامت ہے۔ اس وجہ سے ہم نے ان موجباتِ رضا کا ذکر کیا اور صاف قلوب میں حسنِ ظن پیدا کرنے کی باتیں کیں۔

مخلوق کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا اور ان سے تکلیف آنے پر صبر جمیل کا مظاہرہ کرنا۔ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کی خاطر ان سے درگزر کرنا اور ان کے ساتھ لطف و مدارات سے پیش آنا بھی رجاء میں داخل ہے اور یہ نیت یہ ہو کر مولائے کریم کے اخلاق اپنائے اور اس سے ثواب کا امیدوار رہے اور اس کے دل میں اجر کے لالچ کا خیال ہو اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ حسنہ کا اتباع ملحوظِ خاطر ہو۔

غلط خواہشات اور بیہودہ شہوات کو ترک کرنا بھی رجاء میں داخل ہے جبکہ ان کاموں کو چھوڑنے پر اللہ تعالیٰ کے دربار سے اعلیٰ درجات اور اجر و ثواب کا گمان ہو۔

حمیدؒ نے حضرت انسؓ سے روایت کیا: فرمایا کہ رحمٰن کے عرش کے سامنے ایک بالاخانہ ہے حضرت جبریل علیہ السلام کو اس طرف بھیجا جاتا ہے جب وہ وہاں پہنچتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور عرض کرتے ہیں:

"اے پروردگار! تو نے یہ کس کے لیے بنایا؟ کس نبی کے لیے؟ کس صدیق کے لیے؟ کس شہید کے لیے؟"

بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عزوجل جواب دیتا ہے:

"اس کے لیے جو میری خواہش کو اپنی خواہش پر ترجیح دے۔"

طاعات اور نیک اعمال میں مشغول ہونا اور اللہ تعالیٰ سے اچھے اعمال کی توفیق مانگنا اور اجر و ثواب کی درخواست کرنا بھی رجاء میں داخل ہے اور حسنِ ظن عطا ہونے پر (جو اعمال کیے ان پر خوب خوب عطا ہو)۔

فردوسِ اعلیٰ مانگو

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ:

"جب تم اللہ تعالیٰ سے مانگو تو خوب رغبت دکھاؤ اور اس سے فردوسِ اعلیٰ مانگو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کوئی چیز بڑی نہیں۔"

ایک دوسری حدیث میں ہے:

"چنانچہ کثرت سے (مانگو) اور بلند درجات مانگو۔ اس لیے کہ تم ایک کریم سخی سے مانگ رہے ہو۔"

آثار میں ہے کہ: "دو عابد آدمی عبادت میں برابر تھے۔ جب دونوں جنت میں داخل ہوئے تو

ایک کا درجہ دوسرے پر بلند کر دیا گیا۔ دوسرا عرض کرتا ہے: "اے پروردگار! دنیا میں یہ آدمی مجھ سے زیادہ عبادت گزار نہ تھا مگر تو نے علیین میں اس کا درجہ بلند کر دیا۔"

اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ:

"دنیا میں وُہ مجھ سے بلند درجات مانگتا تھا اور تو مجھ سے، آگ سے نجات مانگتا تھا۔ اس لیے میں نے ہر بندے کا مانگا دے دیا۔"

اُمید کی برکت

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت آتی ہے کہ:

"ایک آدمی آگ سے نکالا جائے گا اور اسے اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا۔ پھر (اللہ تعالیٰ) اسے فرمائے گا:

"تُو نے اپنی جگہ کیسے پائی؟"

وُہ عرض کرے گا:

"اے پروردگار! بدترین جگہ ہے۔"

وُہ فرمائے گا:

"اسے اس کی جگہ واپس کر دو۔"

بتایا کہ وُہ چلتا جائے گا اور پیچھے کی طرف دیکھتا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

"کس مطلب کی طرف (پیچھے) دیکھ رہے ہو؟"

وُہ عرض کرے گا:

"اے پروردگار! مجھے امید ہو گئی تھی کہ وہاں سے نکالنے کے بعد تو مجھے واپس اُس طرف نہیں لوٹائے گا۔"

اللہ تعالیٰ فرمائے گا:

"اسے جنت کی طرف لے جاؤ۔"

اب جنت کی طرف جانے کا ذریعہ اس کی رجا ہی بن گئی جیسے کہ دنیا میں اس کے دُوسرے ساتھی کا جنت میں جانے کا طریق، طریقِ خوف تھا۔

مروی ہے کہ:

"دوسرے آدمی کو جب کہا جائے گا کہ اسے لوٹا دو تو وہ بھاگ کر آگ کی طرف جائے گا اس سے اس کی وجہ پوچھی جائے گی تو وہ کہے گا کہ میں نے دنیا میں تیری نافرمانی کا مزہ چکھا۔ اب آخرت میں اس کے عذاب سے نہیں ڈرا۔ چنانچہ کہا جائے گا کہ "اسے جنت میں لے جاؤ۔" (یعنی اب اطاعت کر رہا ہوں چنانچہ جنت میں بھیج دیا جائے گا)

اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کا وصف بتایا اور فرمایا:

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَ يَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ[1]

(وہ لوگ جن کو یہ پکارتے ہیں، ڈھونڈتے ہیں اپنے رب تک وسیلہ کہ کون بندہ بہت نزدیک ہے اور امید رکھتے ہیں اس کی رحمت کی، اور ڈرتے ہیں اس کے عذاب سے)

چنانچہ اولیاء کرام کے قرب کے کئی طریق ہیں اور وسیلہ سے مراد رجاء ہے جیسے کہ خوف کے کئی طریق ہیں جو اس کو اصنام کی وصف نہیں بتاتے وہ آیت کی ایک توجیہ کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اس کی ایک قرأت تدعون کی بھی ہے۔ حضرت طلحہ بن مصرف کی یہ قرأت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں اہلِ ایمان کے لیے طلبِ قرب کو مندوب فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَابْتَغُوْٓا اِلَيْهِ الْوَسِيْلَةَ۔

(اے ایمان والو! ڈرتے رہو اللہ سے اور ڈھونڈو اس تک وسیلہ)

یہ تمام باتیں احکامِ رجاء اور اوصافِ اہلِ رجاء میں سے ہیں جو ان تمام باتوں کو پالے اس نے اہلِ درجات کے تمام درجات پالئے۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ مقربین میں سے ہے اور جس میں ان میں سے ایک آدھ وصف پایا گیا اسے بھی رجاء میں سے ایک مقام مل گیا۔

حرفِ آخر

یہ یاد رکھیں کہ مقاماتِ یقین کی یہ حالت نہیں کہ ایک مقام دوسرے مقام کو زائل کر دے بلکہ یہ ایک دوسرے میں داخل ہوتے ہیں۔ جس پر حالِ مشاہدہ کا غلبہ ہُوا وہ غلبہ والے حال سے ہی موصوف ہُوا اور دُوسرے مقامات اس میں مندرج رہ کر وہ آگے بڑھتا چلا گیا اور جس نے اس کے ایک مقام کی شرط کے ساتھ عمل کیا اور اسی میں اللہ تعالیٰ حکم پر قائم رہا۔ وہ اس کے سوا دُوسری طرف منتقل ہوا۔ اس کے لیے پہلا مقام علم کے لحاظ سے ہے اور دوسرے مقام میں وہ قائم ہُوا۔ وہ وجد کے اعتبار سے ہے۔ اب اس نے وجد چھپا لیا۔ اس لیے کہ یہ اس کا راز ہے اور علم سے تعبیر کی۔ اس لیے کہ وُہ اس سے آگے بڑھ گیا۔ اب یہ اس کے لیے علانیہ بن گیا۔

مقامِ رجاء، دراصل اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے۔ بعض بندے اس کے ذریعہ ایسے ایسے اعمال کر جاتے ہیں کہ دُوسرے (احوال) سے نہیں کرتے۔ اس لیے کہ بعض قلوب کرم و احسان کے مشاہدہ سے

---

[1] بنی اسرائیل۔ آیت ۵۷۔

اسی قدر نرم اور آمادہ ہوتے ہیں اور انعامات و احسانات سے اس قدر پرسکون و تابع ہوتے ہیں کہ ڈرانے دھمکانے سے اس قدر اعمال نہیں کرتے بلکہ گاہے ڈرانے دھمکانے سے ان سے اعمال چھوٹ جاتے ہیں اور انہیں اعمال سے وحشت ہو جاتی ہے۔ اب ان کے لیے رجاء کا طریق مناسب ہوا۔

جس طرح انسان میں عافیت اور غناء کے احوال ہیں اسی طرح رجاء کا حال ہے کہ اس سے قلب قبولیت پر آمادہ ہوتا ہے اور ان دونوں (عافیت و غنا) کے پائے جانے سے خوب جمعیتِ خاطر حاصل ہوتی ہے نشاط اور حسنِ معاملہ انہی دونوں کے ساتھ پایا جاتا ہے۔

اسی طرح اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ سے مروی ہے کہ،

"میرے بعض بندے ایسے ہیں کہ ان کے لیے غنا ہی مناسب ہے۔ اگر میں انہیں فقیر کر دوں تو یہ انہیں بگاڑ دے اور میرے بعض ایسے ہیں جن کے لیے صحت ہی مناسب ہے۔ اگر میں انہیں بیمار کر دوں تو یہ انہیں بگاڑ دے۔ میں اپنے علم کے مطابق اپنے بندوں کے ساتھ معاملہ کرتا ہوں۔ میں ان سے خوب آگاہ ہوں۔ اسی طرح میرے بعض بندے ایسے ہیں کہ جن کے لیے رجاء (امید) ہی مناسب ہے اور ان کا ول اسی پر ہی درست رہتا ہے"۔ اور حسنِ ظن کے ساتھ ان کے کام ٹھیک رہتے ہیں۔ اب یہی اس کا طریق ہوا اور یہی اس سے اس کا مقام ہے اور اس سے اس کا اس کے ساتھ علم ہے اور اس کے ہوتے ہوئے ہی وہ قلبی معیت پاتا ہے۔ ہاں البتہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف لے جانے والا ایک طریق ہے۔ خوف کا طریق اس سے قریب تر ہے اور جو قریب تر ہو وہ اعلیٰ ہوتا ہے جیسے غناء اور عافیت بھی اللہ کی طرف لے جانے والے دو طریق ہیں مگر میرے نزدیک فقر و ابتلاء ان دونوں سے قریب تر ہیں۔ اس لیے اعلیٰ ہیں۔

وَ اللّٰہُ غَالِبٌ عَلٰۤی اَمۡرِہٖ۔ (اور اللہ غالب ہے اپنے حکم پر)

حضرت معمرؒ نے حضرت حسنؒ سے روایت کیا: وہ فرماتے ہیں کہ لوگوں کا عمل ان کے اپنے پروردگار کے ساتھ گمان کی مقدار کے مطابق ہوتا ہے مگر ایک مومن آدمی اللہ پر سب سے بہتر گمان رکھتا ہے اور سب سے اچھے عمل والا ہوتا ہے اور کافر اور منافق، اللہ پر بدگمانی رکھتا ہے۔

وَ لٰکِنَّ اَکۡثَرَ النَّاسِ لَا یَعۡلَمُوۡنَ۔ (اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے)

مقام خوف اور اہل خوف کا بیان

یہ پانچواں مقام یقین ہے

اللہ عزوجل نے فرمایا:

وَ مَا یَعۡقِلُهَاۤ اِلَّا الۡعٰلِمُوۡنَ۔ (اور اسے نہیں سمجھتے سوائے عالموں کے)

چنانچہ علم کو قلم پر رفعت بخشی اور علم میں اس کا ایک مقام بنایا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا۔ (بے شک ڈرتے ہیں اللہ سے، اس کے بندوں سے علماء ہی)

چنانچہ علم میں خشیت کو ایک مقام قرار دیا اور خشیت درحقیقت مقامِ خوف سے ایک حال ہے اور خوف بحقیقی تقویٰ کا نام ہے اور تقویٰ، عبادت کا ایک جامع مفہوم ہے اور یہ اوّلین و آخرین کے لیے ایک رحمت ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں یہ دونوں مفاہیم آتے ہیں۔ فرمایا:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعۡبُدُوۡا رَبَّكُمُ الَّذِیۡ خَلَقَكُمۡ وَ الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ لَعَلَّكُمۡ تَتَّقُوۡنَ۔ (اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو جس نے تمہیں پیدا کیا اور جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم بچ جاؤ)

اسی طرح فرمایا:

وَ لَقَدۡ وَصَّیۡنَا الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡكِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِكُمۡ وَ اِیَّاكُمۡ اَنِ اتَّقُوا اللّٰہَ۔ (اور ہم نے کہہ رکھا ہے پہلی کتاب والوں کو اور تم کو کہ ڈرتے رہو اللہ سے)

یہ آیت قطبِ قرآن ہے اور اس کا مدار اسی (تقویٰ) پر ہے اور تقویٰ ایک سبب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اپنی طرف اضافت فرما کر اسے شرف عطا کیا اور یہ ایک ایسا مفہوم ہے کہ جس کے ذریعہ خدا تک رسائی حاصل ہوئی اور بندوں کو اسی کے باعث عزت و عظمت حاصل ہوئی۔ چنانچہ فرمایا:

لَنۡ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوۡمُهَا وَ لَا دِمَآؤُهَا وَ لٰكِنۡ یَّنَالُهُ التَّقۡوٰی مِنۡكُمۡ۔ (اللہ کو نہیں پہنچتے ان کے گوشت اور نہ لہو، اور لیکن اس کو پہنچتا ہے تمہارے دل کا ادب)

اور ایک جگہ فرمایا:

اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰىكُمۡ۔ (بے شک تم میں سے اللہ کے ہاں زیادہ عزت والا وہی ہے جو تم میں زیادہ ڈرنے والا ہے)

اہلِ خوف کے بعض مقامات

جب اللہ تعالیٰ اوّلین و آخرین کو ایک مقررہ دن میں (حساب کتاب کیلئے) اٹھائے گا تو انہیں ایک آواز سے ندا دے گا۔ جس طرح قریب والا سُنے گا اسی طرح دور والا بھی سُنے گا۔ فرمائے گا:

"اے لوگو! جب سے میں نے تمہیں پیدا کیا تب سے اس آج کے دن تک میں تمہارے لیے خاموش رہا اس لیے آج تم میرے لیے خاموش رہو۔ یہ تمہارے اعمال ہی ہیں جو تم پر پیش کیے جائیں گے۔ اے لوگو! میں نے

ایک نسب بنایا اور تم نے ایک نسب بنایا مگر میرے نسب کو تم نے گرا دیا اور اپنے نسب کو بلند کیا۔ میں نے کہا تھا کہ،
اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ (بے شک مقرز عزت اللہ کے ہاں اس کو بڑی جس کو ادب بڑا)
مگر تم نے انکار کیا (اور کہا) کہ فلاں بن فلاں، فلاں سے زیادہ دولت مند ہے۔ آج میں تمہارا نسب گرا دوں گا اور اپنا نسب بلند کروں گا۔

کہاں ہیں متقی لوگ؟ بتایا کہ پھر ایک جماعت کے لیے پرچم نصب کیا جائے گا۔ آخر وہ جماعت (اہل تقویٰ) کی اس پرچم کے پیچھے پیچھے چلے گی اور انہیں جنت میں بغیر حساب داخل کر دیا جائے گا۔"

اور مقام علم سے خوف ایک حال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خائفین کے لیے وہ باتیں جمع فرما دیں جو عام مومنین کے لیے متعرق رکھیں یعنی ہدایت، رحمت، علم اور رضا۔ اور یہ تمام اہل جنت کے مقامات ہیں۔ فرمایا،
هُدًى وَّ رَحْمَةٌ لِّلَّذِيْنَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُوْنَ۔ (ہدایت اور رحمت ان کے لیے جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں)
اور فرمایا؛
اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا۔ (بے شک اللہ سے ڈرتے ہیں اس کے بندوں سے علماء)
اور ایک جگہ اللہ عزوجل نے فرمایا؛
رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ۔ (اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اس سے راضی ہوئے، یہ اس کے لیے جو اپنے رب سے ڈرا)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ہے کہ جو خائفین ہیں ان کے لیے رفیق اعلیٰ ہے۔ اس میں (دوسرے) شریک نہ ہوں گے، چنانچہ انہیں رفیق اعلیٰ کے ساتھ بلا شرکت انفرادیت عطا کی جیسے کہ آج شہادت تصدیق کے ساتھ انہیں شرف بخشا۔ یہ مقام نبوت ہے اور یہ لوگ وارثین انبیاء ہونے کے اعتبار سے انبیاء کے ساتھ ہوں گے اس لیے کہ یہی علماء ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا؛
فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ۔ (سو یہ لوگ ان کے ساتھ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا۔ (یعنی) نبیوں اور صدیقوں سے)
پھر ان کے درجات بتاتے ہوئے فرمایا؛
وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔ (اور خوب ہے ان کی رفاقت)
بمعنی رفقاء کے۔ جماعت کو واحد سے تعبیر کیا۔ اس لیے کہ وہ سب اس طرح متحد تھے گویا ایک ہوں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنت کے اندر اعلیٰ علیین میں رفیق ایک مقام ہو۔ اس لیے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں رہنے اور اللہ سے ملنے میں سے ایک کا اختیار دیا گیا تو آپؐ نے دعا کی کہ؛

"اے اللہ! میں رفیق اعلیٰ مانگتا ہوں۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ہے کہ ان کے لیے رفیقِ اعلیٰ ہے۔ چنانچہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تفصیل سے معلوم ہُوا کہ وہ انبیا علیہم السلام کے ہمراہ ہوں گے اور ہر مقام پر ان کے مقام کو شرف بخشا۔ اس لیے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا سوال کیا تھا۔

خوف کا مفہوم

حقیقتِ ایمان کا جامع نام خوف ہے یعنی وجود و یقین کا علم۔ ہر ممنوعہ کام سے بچنے کا سبب اور ہر مامور بہ کام کرنے کی کنجی یہی (خوف) ہے۔ مقامِ خوف ہی ایسا مقام ہے کہ جو نفسانی شہوتوں کو جلاتا اور نفسانی آفات کو جڑ سے کاٹ کر رکھ دیتا ہے۔

حضرت ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"کمالِ ایمان علم ہے اور کمالِ علم خوف ہے۔"

ایک بار فرمایا:

"علم ایمان کی کمائی ہے اور خوف معرفت کی کمائی ہے۔"

ابوالفیض مصری نے فرمایا:

"ایک محب اس وقت تک جامِ محبت نوش نہیں کرتا جب تک کہ اس کے قلب پر خوف کے چھینٹے بھی نہ پڑ جائیں۔"

اور فرمایا:

"فراق کے خوف کے وقت آگ کا خوف بحرِ ذخار میں بمنزلہ ایک قطرہ کے ہے اور اللہ تعالیٰ پر ہر ایمان رکھنے والا اس سے ڈرتا ہے لیکن اس کا خوف اس کے قرب کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ اسلام کا خوف یہ ہے کہ عزت و جبریت کا مالک اللہ کو سمجھے۔ اس کی قدرت و سطوت تسلیم کرے اور اس نے جو عذاب و سزا کی خبریں دیں ان کی تصدیق کرے۔"

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"جب تجھ سے پُوچھا جائے کہ کیا تو اللہ سے ڈرتا ہے؟" تو خاموش رہ۔ اس لیے کہ اگر تو نے کہا: نہیں تو تُو نے کفر کیا اور اگر کہا، ہاں، تو تجھ میں خائف کا وصف نہیں پایا جاتا۔ (اس لیے کذب بن جائے گا)

ایک واعظ نے ایک حکیم سے شکایت کی اور کہا،

"آپ دیکھتے ہی ہیں کہ میں ان کو نصیحت کرتا ہوں اور انہیں یاد کراتا ہوں مگر ان کے دل نرم نہیں ہوتے"

تو حکیم نے جواب دیا:

"جس کے دل میں اللہ کا خوف نہ ہو اُسے نصیحت کس طرح نفع دے سکتی ہے؟ اور اللہ تعالیٰ نے بھی اس کی تصدیق کی۔ فرمایا کہ:

سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى وَ يَتَجَنَّبُهَا الْاَشْقَى۔ (سمجھ جائے گا جس کو ڈر ہوگا اور الگ رہے گا اس سے بڑا بدبخت)

یعنی نصیحت تو ایک بدبخت آدمی سے ایک طرف ہو کر گزر جاتی ہے۔ اس طرح عدم خوف کو شقاوت اور نصیحت سے محرومی قرار دیا۔

عوام اہل ایمان کا خوف یہ ہے کہ نیت کے ساتھ باطنِ علم سے ظاہر قلب کے ساتھ خوف کھائیں اور خواص کا خوف یہ ہے کہ باطن علم سے وجد کے ساتھ خوف کھائیں اور یہ لوگ باطنِ قلب کے ساتھ یقین رکھنے والے ہوتے ہیں۔ اور یقین کا خوف تو صدیقین کے لیے ہوتا ہے جو کہ صفاتِ مخوفہ پر ایمان لا کر اس کا عرفان و مشاہدہ حاصل کر چکے ہیں۔

روایت میں ہے کہ:

"جب بندہ قبر میں داخل کیا جاتا ہے تو کوئی چیز ایسی نہیں رہتی جس سے وہ اللہ کے علاوہ ڈرتا ہو کہ اس کے لیے اس کی مثال بنا دی جاتی ہے اور وہ اسے قیامت کے دن تک ڈراتی اور پریشان کرتی رہے گی۔"

چنانچہ ایمان سے موصوف ہونے والوں کے خوفِ یقین کی ابتدا یہ ہے کہ ہر وقت محاسبۂ نفس کرتا رہے۔ ہر لمحہ پروردگار کے لیے مراقبہ (نگرانی نفس) رکھے۔ جن اشیاء کے بارے میں اسے قطعی علم نہ ہو اور جن اعمال کے بارے میں اسے قطعی سمجھ حاصل نہ ہو۔ (یہ امورِ شبہات ہیں) ان شبہات کے امور سے بچتا رہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خبر میں ہے:

"پرہیزگار لوگوں کا تو حساب ہو چکا ان میں سے کوئی بھی ایسا باقی نہیں کہ (جس کا حساب نہ ہو چکا ہو)۔"

ان سے میں حیاء کرتا ہوں اور انہیں حساب کے لیے کھڑا کرنے سے بالاتر قرار دیتا ہوں۔ چنانچہ ورع، خوف کا ایک حال ہے۔ پھر اعضائے ظاہر کو شبہات اور ہر چیز میں نہ اللہ حلال باتوں سے قلبی خشوع و انابت کے ساتھ بچائے رکھنا (ورع یعنی پرہیزگاری ہے)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا:

"جو جنت کا اشتیاق رکھے وہ شہوات سے بچ کر رہے اور جو آگ سے ڈرے وہ محرمات سے واپس ہو جائے۔ پھر زبان کو گرفت میں کرلے اور کلام کو خزانہ میں رکھے (یعنی کلام کم کرے) تاکہ وہ اللہ عزوجل کے دین میں داخل نہ ہو جائے اور نہ ہی اس علم میں داخل ہو جائے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں مشروع فرمایا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت میں اس کا ذکر نہیں فرمایا یا ائمہ اسلاف نے اپنی سیر میں نہیں کہا۔ یعنی جس کی

اصل کتاب وسنت میں نہ ہو (اور اس میں ائمہ اسلاف نے نہیں فرمایا) اور علم میں اُس کا تعین واضح ہے۔ ان سب (ممنوعہ امور) سے بچتا رہے۔ (فرمایا):

وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ (اور نہ پیچھے پڑ جس بات کی خبر نہیں تجھ کو)

پرسش سے ڈرتے ہوئے اور دقیق ترین خواہش کے باعث اور عظیم ترین دنیاوی نفع کی خاطر بھی اس میں مداخلت نہ کرے اور اللہ کی خاطر اپنے آپ کو نصیحت کرتا رہے۔ اس لیے کہ یہ بہترین خُلق ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے بارے میں مخلوق کو نصیحت کرے۔ چنانچہ سب سے پہلے دین اور آخرت کے امور میں نصیحت کرے۔ پھر اسبابِ دنیا کے بارے میں نصیحت کرے۔ اس لیے کہ اخروی امور ہم پر زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ دین میں فریب سب سے بڑا جرم ہے اور آخرت کے لیے زادِ راہ ہی قابلِ ترجیح کام ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

"جو میری امت سے دھوکہ کرے اس پر اللہ کی لعنت۔"

پوچھا گیا،

"اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ کی امت سے دھوکہ کیا ہے؟"

فرمایا کہ "ان کے لیے کوئی بدعت جاری کر دے تاکہ اس کے ذریعہ وہ متبوع بن جائے۔ جب اس نے یہ کیا تو ان سے دھوکہ کیا۔"

خوف کا پھل

خوف کا پھل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم اور اللہ تعالیٰ سے حیاء حاصل ہو جائے اور یہ اہلِ مزید کے اعلیٰ ترین مقامات سے ہے۔ دو معنوں میں اس کے احکام ظاہر ہوتے ہیں اور یہی دونوں خلاصہ عبد ہیں۔

۱۔ سر کی اور اس کے آس پاس کی مثلاً سماعت، بصارت اور زبان کی حفاظت کرے۔

۲۔ پیٹ اور اس کی ذیلی اشیاء مثلاً دل، شرم گاہ، ہاتھ اور پاؤں کی حفاظت کرے۔ یہ عوام کا خوف ہے اور حیاء کی یہ ابتداء ہے۔

خواص کا خوف

خواص کا خوف یہ ہے کہ جو نہ کھائے اسے جمع نہ کرے اور جس میں نہ رہے اس (مکان) کو بنائے نہیں۔ اور جس سے جدا ہو کر چلے جانا ہو اس کی زیادتی نہ کرے اور غافل نہ رہے اور جس سے کٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف کوچ کرنا ہے اس کی کثرت نہ کرے۔ یہی زہد ہے اور اہلِ حیا اصحابِ یمین کے تقویٰ میں یہ حیاء اضافہ کرتی ہے۔ ہم نے دو حدیثوں میں ایک عام اور دوسری خاص میں مذکورہ مفہوم بتا دیا ہے اور جو آدمی آغاز میں اپنے قلب کو عمل پر نہ لگائے اور خوف کو اپنے ارادہ سے ایک زائد چیز سمجھے وہ اس کام کے

انجام میں کوئی شرف حاصل نہیں کر سکتا اور نہ ہی رفعتِ معرفت میں وہ اہل تقویٰ کا امام بن سکتا ہے۔

خوف کا اعلیٰ تر درجہ یہ ہے کہ اس کا دل، انجام کے ڈر میں لگا رہے۔ کسی علم اور عمل کی طرف پر سکون نہ ہو بیٹھے۔ اور نہ ہی بلند سے بلند تر علوم میں سے کسی چیز کے باعث نجات کا یقین ہی کرلے۔ نہ ہی کسی اعلیٰ ترین عمل کے باعث نجات کو یقین سمجھ لے۔ اس لیے کہ انجام کا حقیقی علم اسے حاصل نہیں۔ اور یہ طے شدہ ہے کہ اعمال کا اعتبار انجام کے لحاظ سے ہوگا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ :

"ایک بندہ، پچاس برس تک اہلِ جنّت کے کام کرتا رہتا ہے۔ آخر لوگ کہتے ہیں کہ وہ اہل جنّت میں سے ہے"۔

اور ایک روایت میں ہے کہ :

"حتیٰ کہ اسکے درمیان اور جنّت کے درمیان صرف ایک بالشت کا (فاصلہ) رہ جاتا ہے۔ پھر کتاب (لکھی ہوئی تقدیر) اس پر غالب آتی ہے اور اہلِ نار کے عمل پر اس کا خاتمہ ہوجاتا ہے"۔

وقت کی اس مقدار میں اعضائے ظاہر کا کوئی عمل نہیں ہوتا بلکہ عقلی مشاہدہ سے قلبی اعمال ہوتے ہیں۔ دراصل یہ (قلبی عمل) توحید میں شرک اور یقین میں شک کا ہوتا ہے جو کہ دنیاوی زندگی میں واقع اور مشاہدہ میں نہیں آیا۔ مگر پردہ ہٹتے ہی یہ کھل کر سامنے آگیا اور اس کے حال میں اس کا وصف ظاہر و غالب آگیا۔ جیسے کہ بُرے اعمال نمودار ہوتے ہیں تو اس کا دل ان سے رنگ آمیز ہوتا اور زبان ان سے متکلم ہوتی اور وجدان اس میں داخل ہوجاتا ہے۔ یہی اس کا خاتمہ ہے۔ جس پر اس کی روح نکل جاتی ہے اور یہ حالت سابقہ نوشتہ میں لکھی ہوتی ہے۔

جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

أُولَٰئِكَ يَنَالُهُمْ نَصِيبُهُم مِّنَ الْكِتَابِ۔ (وہ لوگ پائیں گے جو ان کا حصّہ لکھا کتاب میں)

یہ جسم سے رُوح کے جُدا ہونے کے وقت ہوتا ہے۔

وَإِنَّا لَمُوَفُّوهُمْ نَصِيبَهُمْ غَيْرَ مَنقُوصٍ۔ (اور ہم دینے والے ہیں ان کو ان کا حصّہ بن گھٹایا)

حدیث میں آتا ہے کہ :

"حتیٰ کہ اس کے اور جنّت کے درمیان فواقِ ناقہ کا فاصلہ باقی رہ جاتا ہے کہ اس کا خاتمہ اہل نار کے عمل پر ہوجاتا ہے"۔ اور یہ کام رُوح کے نکلنے کے وقت ہوتا ہے جب کہ تمام بدن سے جان نکل چکی ہوتی ہے اور دل میں گلے کے قریب جمع ہوجاتی ہے۔ یہی شبر (بالشت کا مفہوم) ہے اور فواقِ ناقہ سے مراد تھنوں کے دو بار ہاتھ سے دھونے کا درمیانی وقفہ ہے۔ ایک قول میں اونٹنی کی دو دوڑوں کے درمیان کا پھیرا ہے۔

توحید سے ہٹ کر گمراہی و شرک کی طرف جانے کی حقیقت تصویر یہی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا ہے جس وقت

• دنیاوی عقل زائل ہوتی ہے اور عقلی علم جاتا رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے وہ حال نمودار ہوتا ہے جس کا اسے گمان نہیں ہوتا۔

تین کا انجام خراب ہوتا ہے

عام طور پر تین قسم کے لوگوں کا انجام خراب ہوتا ہے:

۱۔ دین میں بدعت اور فریب جاری کرنے والا، اس لیے کہ ایسے لوگوں کا ایمان عقلیات سے وابستہ ہوتا ہے۔ ان پر اللہ تعالیٰ کی قدرت کی پہلی علامت یہ ظاہر ہوتی ہے کہ وُہ (آیۃ اللہ) کے مشاہدہ کے موقع پر بھی اپنی عقل کا اتباع کرتے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کا ایمان جاتا رہتا ہے۔ اور مشاہدۂ (آیتِ الٰہی) کے باوجود اس کے ایمان کو ثبات نصیب نہیں ہوتا جیسے کہ فتیلہ جل جاتا ہے تو چراغ بجھ جاتا ہے۔

۲۔ دنیا کی زندگی میں آیات اللہ عزوجل کا انکار کرنے والے متکبرین اور اولیاء اللہ کی کرامات کا انکار کرنیوالے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا کچھ یقین ہی نہیں ہوتا کہ جو حالِ قدرت ہو اور ایمان اس کی مدد کرے۔ آخر کار ان پر شک چھا جاتا ہے اور یقین کے فقدان کے باعث ان پر شک و شبہ کی حالت پختہ و قوی ہو جاتی ہے۔

۳۔ تیسرے طبقہ کی تین اقسام ہیں:۔

برے انجام میں ان میں باہمی فرق و تفاوت ہوتا ہے مگر یہ تمام اقسام پہلی ذکر کردہ دو انواع سے کم تر درجہ رکھتی ہیں۔ اس لیے کہ جیسے زندگی بھر یقین و شرک کے مختلف مقامات ہیں۔ اسی طرح بُرے انجام میں بھی کئی ایک مقامات ملتے ہیں۔ بعض لوگ برملا اور کھلم کھلا برائیوں کا ارتکاب کرتے ہیں اور اعلانیہ فسق و فجور میں مبتلا رہتے ہیں اور اس حالت پر اصرار و دوام کی صورت پیدا کر لیتے ہیں اور عمر کے آخری حصہ تک پے در پے نافرمانیاں کرتے چلے جاتے ہیں اور پردہ ہٹنے تک وُہ گناہوں میں قلابازیاں کھاتے رہتے ہیں۔ آخر کار جب وہ (موت کے وقت) کی آیاتِ الٰہی کا منظر دیکھتے ہیں تو توبہ کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ اس وقت ان کے ظاہری اعمال منقطع ہو جاتے ہیں۔ اب ان کی توبہ قبول نہیں ہوتی اور نہ ہی ان کے بوجھ میں کمی کی جاتی ہے اور نہ ہی ان کی حالت پر رحم کیا جاتا ہے۔ وہ اس فرمان کے مستحق ہوتے ہیں:

وَ لَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰۤى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْـٰٔنَ۔

(اور ان کی توبہ نہیں جو کرتے جاتے ہیں بُرے کام، جب تک سامنے آئی ایسے کسی کو موت، کہنے لگا۔ میں نے توبہ کی اب)

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں یہی لوگ مراد ہیں:

وَحِيْلَ بَيْنَهُمْ وَ بَيْنَ مَا يَشْتَهُوْنَ۔

(اور اٹکاؤ پڑ گیا ان میں اور جو جی چاہے ان میں)

اور اس فرمان میں بھی یہی لوگ مقصود ہیں:

فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْآ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَحْدَہٗ۔ (پھر جب دیکھی انھوں نے ہماری آفت، بولے ہم یقین لائے اللہ اکیلے پر)

چنانچہ نصوص آیت دراصل کفار کے لیے ہیں اور ان سے مراد اور ان سے مقام کبائر کا ارتکاب کرنے والے اور فسق و فجور پر اصرار کرنے والوں کے لیے ہے۔ اس لیے کہ بُرے انجام میں انہیں باہم اشتراک ہے۔ البتہ مقامات میں اختلاف ہے۔ ان کے قلوب، ذکر و خوف سے خالی ہیں۔ اس لیے نافرمانیوں کی شہوات اور ان کی یاد ان پر لوٹ لوٹ کر آتی ہے۔ آخر کار ان کا خاتمہ انہی (بداعمالیوں) کی گواہی کے ساتھ ہو جاتا ہے اور یہی ایسے اسباب ہیں جو کہ خوف سلب کر لیتے ہیں اور اہل خرد کے دلوں کے ٹکڑے کر دیتے ہیں۔

سالک اور عارف کا خوف

امام ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے:

"سالک کو نافرمانی میں مبتلا ہونے کا خوف رہتا ہے اور عارف، کفر میں مبتلا ہونے سے ڈرتا رہتا ہے۔"

ان سے پہلے ابویزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"جب میں مسجد کی طرف جاتا ہوں تو میری کمر میں زنار (معلوم) ہوتا ہے اور ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے کہیں گرجا یا آتش کدہ میں نہ لے جائے۔ آخر مسجد میں داخل ہو جاتا ہوں تو زنار ٹوٹتا ہے۔ یہ بات روزانہ پانچ بار ہوتی ہے۔" یہ حال اس وجہ سے تھا کہ وہ علام الغیوب کی قدرت میں قلب کے سرعتِ تقلبی سے آگاہ تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اس مفہوم میں مروی ہے، فرمایا:

"اے حواریوں کی جماعت! تم گناہوں سے ڈرتے ہو اور ہم انبیاؑ کی جماعت، کفر کا خوف کھاتے ہیں۔"

اخبارِ انبیاء میں ہے کہ:

"ایک نبی (علیہ السلام) نے اللہ تعالیٰ کے سامنے برسوں کی بھوک، برہنگی اور جوؤں کی شکایت کی۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی:

"کیا تو اس پر راضی نہیں کہ میں نے تیرے دل کو میرے ساتھ کفر کرنے سے محفوظ رکھا۔ اب تو مجھ سے دنیا مانگتا ہے؟"

انہوں نے مٹی لے کر اپنے سر پر ڈالی اور کہا:

"بلکہ اے پروردگار! میں راضی ہو گیا۔ مجھے کفر سے بچائے رکھنا۔" چنانچہ اپنے اوپر نعمتِ نبوت اور

اس کے کفر پر پیش کرنے کا ذکر نہیں کیا اور نبوّت کے بعد بھی اس (آفت) کے آنے کا خطرہ روا رکھا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا اعتراف کیا اور اس حالتِ (فاقہ) پر راضی ہو کر عصمت ہی مانگی۔

ان سے پہلے اہل زہد کے امام عبدالواحد بن زید نے فرمایا کہ:

"اس خائف نے کبھی سچ نہیں کہا۔ جس نے یہ گمان کیا کہ وہ آگ میں داخل نہیں ہوگا اور جس نے یہ گمان نہ کیا کہ وہ آگ میں داخل ہو کر کبھی بھی نہیں نکلے گا۔"

امام العلماء حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"ایک آدمی ایک ہزار سال کے بعد دوزخ سے نکلے گا اور کاش! میں وہی آدمی ہوتا۔" یہ بات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں جانے کے ڈر سے کہا کرتے اور کہتے کہ اس کے بعد میں جب بھی نکال لیا جاؤں کچھ پروا نہیں۔ (یعنی خلود فی النار تو نہ ہو) یہ ڈر کی شدّت کے باعث کہا کرتے۔

عارفین کا خوف شدید تر ہوتا ہے

شیطان کا کام یہ ہے کہ وہ عارفین پر توحید میں الحاد، یقین میں شک پیدا کرنے اور صفاتِ ذات میں وساوس ڈالنے کی راہ سے حملہ آور ہوتا ہے اور سالکین پر آفات و شہوات کی راہ سے حملہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عارفین کا خوف سب سے بڑا ہوتا ہے۔ مزید برآں ہر بندے پر اس کی ہمت کے مفہوم پر ہی شیطان حملہ کرتا ہے۔ چنانچہ جیسے اس کیلئے شہوات کو مزیّن کرتا ہے۔ اس طرح اس کے یقین میں بھی شبہات ڈالتا ہے چنانچہ ان کی ارواح، کلمہ سابقہ کے فیصلہ سے لگی رہتی ہے۔ (انہیں اس کا فکر رہتا ہے کہ فیصلہ ازلی ہمارے بارے میں کیا ہے) ان کا مشاہدہ وہیں اور ان کی پریشانیاں وہاں سے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ ان کے پروردگار کے ہاں ان کے لیے نیک ازلی فیصلہ ہو چکا کہ ان کا اس پر خاتمہ ہوگا اور رجائے صداقت ملے گی اور ان میں سے ہوں گے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰىٓ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ۔ (جن کو آگے ٹھہر چکی ہماری طرف سے نیکی، وہ ان سے دور رہیں گے)

اور اس بات سے بھی ڈرتے رہتے ہیں کہ ان کے خلاف فیصلۂ ازل نہ ہو اور کہیں وہ ان لوگوں میں سے نہ ہوں کہ ان کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ آگ میں ہیں اور مجھے کچھ پروا نہیں۔"

چنانچہ ان کو نہ کوئی سفارش کام دے گی اور نہ ہی کوئی ہٹانے والا انہیں آگ سے چھڑائے گا جیسے کہ مولائے حق تعالیٰ نے فرمایا:

اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ۔ (بھلا جس پر ٹھیک ہو چکا عذاب کا حکم۔ بھلا تو خلاص کرے گا آگ میں پکڑے کو؟)

اسی طرح فرمایا:

وَلٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّيْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ۔ (اور لیکن ٹھیک پڑی، میری کہی بات کہ مجھ کو بھرنی ہے دوزخ)

یہ آیت اور اس کا مفہوم اہل بصیرت کے لیے خوف پیدا کرتا ہے۔

ہمارے عالم رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان

وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنَ (اور صرف مجھ سے ہی ڈرتے رہو)

میں فرمایا کہ یہ عام ہے یعنی جس بات سے میں نے منع کیا اور

وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنَ (اور صرف مجھ سے ہی ڈرتے رہو)

میں فرمایا کہ فیصلہ سابق (ازلی حکم) میں ڈرتے رہو اور یہ خاص ہے۔

خوفِ مومنین کے دو مقام

بعض عارفین نے مومنین کے خوف کے دو مقام بتائے۔ فرمایا: ابرار کے دل خاتمہ پر لگے رہتے ہیں اور کہا کرتے ہیں:

"دیکھیے، ہمارا خاتمہ کس بات پر ہوتا ہے؟" اور مقربین کے دل' فیصلہ سابق (ازلی حکم) پر لگے رہتے ہیں وہ کہا کرتے ہیں:

"دیکھیے، ہمارے لیے ازل میں کیا فیصلہ ہوا ہے؟"

یہ دونوں دو مشاہدات سے ہیں۔ ان میں سے ایک مقام، دو حالوں کی وجہ سے دُوسرے سے بلند اور زیادہ پختہ ہے۔ ان میں سے ایک کامل تر و مکمل تر ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ:

"مقربین کے گناہ' ابرار کی نیکیاں ہوتی ہیں۔"

یعنی ابرار جن امور کو چاہتے ہیں اور ان کے نزدیک ان کاموں میں فضائل و اجر ہوتا ہے مقربین ان میں بھی زہد اختیار کرتے ہیں اور ان کے نزدیک یہ بھی حجاب ہوتا ہے اور جس پر کلمۂ عذاب (ازل سے) ثابت ہو گیا اور خدا تعالیٰ کی جانب سے اس پر بُرا انجام حکمِ سابق میں سنا دیا گیا۔ اس کے لیے کچھ چیز نفع بخش نہیں ہو سکتی۔ وہ بے کار محنت کر رہا ہے۔ اس کے لیے کچھ اجر نہیں اور نہ ہی بہتر انجام ہے۔ اس پر (نظرِ کرم) کی بجائے نظرِ بُعد ہو چکی۔ وُہ بُرے انجام تک پہنچنے سے پہلے بُعد پیدا کرنے والے اعمال میں ہی بڑھتا رہے گا۔ اور یہ گاہے وسطِ عمر میں ہوتا ہے۔ اس لیے آخر تک انتظار نہ کرے کہ یہی آخری نافرمانی، بد انجامی کے موقع پر

اس کا باعث بن جاتی ہے۔ اس لیے کہ دونوں علمِ ازلی میں برابر ہیں۔ اس صورت میں خاتمہ، آغاز ہے، اور دونوں اوقات ایک ہیں۔

بدعتی کا عمل مردود ہے

جب عمریں ختم ہوتی ہیں اور اعمال انتہا کو پہنچ جاتے ہیں (انقطاعِ اعمال ہو جاتا ہے) تو بُعد میں انتہا ہو جاتی ہے۔ اب وُہ بُعد کے گھر میں گر پڑتا ہے۔ (یعنی دوزخ میں)۔

حدیث میں ہے کہ:

"اللہ تعالیٰ کسی بدعتی کا عمل قبول نہیں کرتا۔ اس نے اللہ پر اس کی سنن رد کر دیں۔ اس (اللہ) نے اس کا عمل مردود کر دیا۔ جس قدر بھی زیادہ محنت کرتا ہے اسی قدر وہ اللہ سے زیادہ دُور ہو جاتا ہے۔" جیسے کہ ایک دانا نے کہا ہے:

مَنْ غَصَّ دَاوٰى بِشُرْبِ الْمَاءِ غُصَّتَهُ ۔۔۔ فَكَيْفَ يَصْنَعُ مَنْ قَدْ غَصَّ بِالْمَاءِ

بَلْ كَيْفَ يَصْنَعُ مَنْ اَقْصَاهُ مَالِكُهُ ۔۔۔ فَلَيْسَ يَنْفَعُهُ طِبُّ الْاَطِبَّاءِ

(جس کا گلا اٹک جائے وہ پانی پی کر اٹکاؤ دور کر لیتا ہے اور جس کو پانی سے اُٹکاؤ ہو پھر وُہ کیا کرے)

(بلکہ جس کو اس کا مالک ہی دور ہٹا دے۔ اب اس کے لیے اطبا کا علاج کچھ نفع نہیں دے سکتا)

سلفؒ میں خوف کی شدت

اس مفہوم کے مشاہدہ کے باعث حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ خوف و غم میں مبتلا رہتے۔ اس لیے کہ وُہ خوب جانتے تھے۔ اللہ عزوجل کو کچھ پروا نہیں کہ کیا عمل ہُوا۔ اب وہ اس بات سے ڈرتے کہ وصفِ جبریت سے اس میں نہ جا پڑیں کہ (یہ دوزخ میں ہیں) اور مجھے کچھ پروا نہیں۔ ان کے اصحاب اور دُوسرے سالکین و اہل طبقہ کے لیے یہ مقامِ عبرت و نصیحت ہے۔

بتاتے ہیں کہ آپ چالیس سال تک نہیں ہنسے۔ جب میں انہیں بیٹھا دیکھتا تو محسوس کرتا جیسے کہ وُہ قیدی بیٹھا ہو جس کی گردن ماری جانے والی ہو۔ جب وُہ کلام کرتے تو معلوم ہوتا گویا وُہ آخرت کو دیکھ رہے ہیں اور اس کے مشاہدہ کی اطلاع دے رہے ہیں اور جب خاموش ہوتے تو ان کی نظروں میں گویا آگ بھڑک رہی ہوتی۔

انہیں شدتِ غم پر کسی نے کچھ کہا تو فرمایا:

"میں اس بات سے بے خوف نہیں کہ مجھ سے کوئی نامناسب بات سرزد ہو جائے اور وُہ اس کو دیکھ کر ناراض ہو اور فرما دے: جاؤ، میں نے تجھے نہیں بخشنا۔ اور میں بے عمل ہی عمل کرتا رہ جاؤں۔" اور ہمیں تو حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ سے زیادہ اس کا فکر کرنا چاہیے اور یہ بھی یاد رکھیں کہ گناہوں کی کثرت کے باعث ہی

خوف کی زیادتی نہیں ہوتی - اگر ایسا ہی ہوتا تو ہم ان سے زیادہ خوف میں ہوتے بلکہ قلب کی شدتِ صفائی اور اللہ تعالیٰ کی بہت ہی زیادہ تعظیم کے باعث ان پر حالت خوف کی شدت رہتی۔

حضرت علاء بن زیاد عدوی کو جنت کی خوشخبری دی گئی - یہ بڑے عابد بزرگ تھے - انہوں نے سات روز دروازہ بند کر لیا اور کھانا چکھا تک نہیں اور روتے رہے اور کہتے :

" میں ایک طویل معاملے میں ہوں "۔ (خدا جانے کیا ہو؟)

آخر حضرت حسنؒ ان کے پاس تشریف لائے اور انہیں شدتِ غم اور رونے کی کثرت پر ملامت کرنے لگے اور فرمایا :

" اے میرے بھائی ! اِن شاءُ اللہ جنت میں سے ہو گے اب کیا اپنے آپ کو قتل کر دو گے ؟"

اب جس آدمی کو حضرت حسنؒ بھی شدتِ خوف پر ملامت فرما رہے ہیں - ان کے بارے میں آپ کیا اندازہ کر سکتے ہیں اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم تو ان سے بھی بلند مقام پر تھے - وُہ تمنا کیا کرتے کہ کاش وہ (مکلف) انسانوں میں پیدا ہی نہ ہوتے - (بلکہ ایک پرندہ یا گھاس کا تنکا ہوتے) حالانکہ کئی روایات میں انہیں یقیناً جنت میں جانے کی خوشخبریاں دی گئیں۔

صحابہؓ کا خوف

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کا خوف اسی قبیل سے ہے - فرمایا کرتے :

" اے پرندے، کاش ! میں تیرے جیسا ہوتا اور میں (مکلف) انسان بن کر پیدا ہی نہ ہوتا "

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے :

" میری خواہش ہے کہ میں ایک درخت ہوتا جس کو کاٹ دیا جاتا "

حضرت طلحہ اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے :

" ہماری خواہش یہ ہے کہ ہم پیدا ہی نہ ہوتے "

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرمایا کرتے :

" میں اسے پسند کرتا ہوں کہ جب میں مر جاؤں تو دوبارہ زندہ ہی نہ کیا جاؤں "

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتیں :

" میں اس کو پسند کرتی ہوں کہ میں نسیاً منسیا (فراموش شدہ) ہوتی "

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے :

" کاش ! میں راکھ ہوتا " اور ان سے ایک روایت میں یہ الفاظ بھی مروی ہیں کہ :

"کاش! میں ایک مینگنی ہوتا۔ کاش! میں کچھ چیز بھی نہ ہوتا۔"

الغرض ان میں اس قسم کے اقوال بکثرت منقول ہیں اور ہماری حالت یہ ہے کہ ہم کبیرہ گناہوں میں ملوث ہیں مگر پھر بھی اپنے لیے بڑے بڑے درجات اور سدرۃ المنتہیٰ تک کے قرب کی باتیں بناتے رہتے ہیں اور اس بات کو فراموش کر بیٹھے کہ ہمارے باپ حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام جنت میں داخل کیے جانے کے بعد ایک ہی گناہ کے باعث نکال باہر کیے گئے اور ہم نے اس کے بعد اسے کبھی نہیں دیکھا اور اب ہم ٹھنڈے لوہے پر ہتھوڑے چلا رہے ہیں اور خوابوں کی دنیا میں خوش ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ اہلِ صُفّہ میں سے ایک آدمی شہید ہو گیا۔ ان کی والدہ نے کہا:

"تجھے مبارک ہو، جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے۔ تو نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی اور تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہوا۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تجھے کیا خبر۔ شاید اس نے لایعنی سلسلہ میں کام کیا ہو اور جو اسے نقصان نہیں دے سکتی اس کو روکا ہو۔"

ایک دوسری حدیث میں بھی اسی طرح کا واقعہ مذکور ہے کہ:

"آپؐ اپنے ایک صحابیؓ کے پاس تشریف لائے۔ وہ بیمار تھے۔ آپؐ نے اس کی ماں کو یہ کہتے سنا کہ:

"تجھے جنت مبارک ہو۔"

آپؐ نے فرمایا:

"یہ اللہ پہ قسمیں دینے والی کون ہے؟"

ان صحابیؓ نے عرض کیا:

"یہ میری والدہ ہیں اے اللہ کے رسول!"

آپؐ نے فرمایا:

"تجھے کیا خبر کہ فلاں آدمی لایعنی معاملات میں باتیں کر رہا ہو اور بخل کر تا رہا ہو کہ جو اسے غنی نہیں بنا سکتا۔"

اس معنی میں یہ روایت بھی آتی ہے:

"حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نوزائیدہ بچے کا جنازہ پڑھا۔" ایک روایت میں ہے کہ آپؐ کو یوں دُعا کرتے ہوئے سنا گیا کہ:

"اے اللہ! اسے عذابِ قبر سے اور عذابِ جہنم سے بچا۔"

اور دُوسری روایت میں ہے کہ آپؐ نے ایک کہنے والی کو یہ کہتے سُنا کہ:

"عصافیر جنت سے ایک عصفور (پرندہ) ہے!"

آپؐ ناراض ہُوئے اور فرمایا:

"تجھے کیا خبر یہ ایسے ہی ہے؟ اللہ کی قسم! میں اللہ کا رسول ہوں اور میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا؟ بے شک اللہ تعالیٰ نے جنت کو پیدا فرمایا اور اس کے لیے اہلِ (جنت) پیدا فرمائے اور دوزخ پیدا فرمایا اور اس کے لیے اہلِ (دوزخ) پیدا فرمائے۔ نہ ان میں زیادتی ہوگی اور نہ ان میں کمی ہوگی۔"

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے جنازہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اور یہ مہاجرین اوّل میں سے تھے اور شہادت پائی۔ جب حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے ان کے بارے میں عرض کیا اس کے بعد وہ فرمایا کرتیں: کہ

"عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد میں کسی کا تزکیہ نہیں کروں گی!"

حضرت محمد بن حنیفہ رضی اللہ عنہ سے اس سے بھی عجیب بات منقول ہے۔ فرمایا کہ:

"اللہ کی قسم! میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کا تزکیہ نہیں بتاتا پھرتا، نہ اپنے باپ کا کہ جس نے مجھے جنا۔"

بتاتے ہیں کہ اہل شیعہ نے اعتراضات کیے۔ چنانچہ وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے فضائل بیان کرنے لگے۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ جن کو پڑھ پڑھ اہل خوف کے قلوب جل اٹھے اور یہ بُعد کا ہی خوف تھا کہ جس نے حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑھاپے سے ہمکنار کر دیا۔ آپؐ فرمایا کرتے کہ:

"سورۃ ہُود اور اس کے ساتھ کی دوسری سورتوں، واقعہ، اذا الشمس کورت اور عمّ یتساءلون نے مجھے بوڑھا کر دیا۔" اس لیے کہ سورۃ ھود میں آتا ہے:

اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ۔ (سُن لو۔ پھٹکار ہے ثمود کو)

اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُوْدٍ۔ (سُن لو پھٹکار ہے ہُود کی قوم عاد کو)

اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ۔ (سن لو پھٹکار ہے مدین پر جیسے کہ پھٹکار ہوئی ثمود کو)

اور سورۃ واقعہ میں آتا ہے:

لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ۔ (نہیں اس کے ہو پڑنے میں جھوٹ)

یعنی جس کے لیے فیصلہ سابق (ازلی حکم) سبقت کر چکا اور حقت الحاقۃ یعنی جس پر حق ہُوئی۔

خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ۔ (اتارتی ہے چڑھاتی)

یعنی آخرت میں جب حقائق سامنے آئیں گے اور ہر مخلوق کا انجام کھلے گا تو دنیا میں بلندیوں پر نظر آنے والی اقوام ذلیل و رُسوا ہو جائیں گی۔

سورۃ تکویر میں قیامت کے حالات ملتے ہیں۔ اہل یقین کے لیے یہ صفتِ قیامت ہے اور اہلِ نظر کے لیے اس میں مفاہیم غضب صاف نظر آتے ہیں:

وَ اِذَا الْجَحِیْمُ سُعِّرَتْ وَ اِذَا الْجَنَّةُ اُزْلِفَتْ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا اَحْضَرَتْ۔ (اور جب دوزخ دہکائی جائے، اور جب بہشت پاس لائی جائے، جان لے جی، جو لے کر آیا)

یہ واضح تر بین خطاب ہے یعنی آگ جلنے اور جنت کے قُرب کے وقت۔ اس وقت نفس کو معلوم ہو گا جو اُس نے بُرائی آگے بھیجی جس کے لیے دوزخ مناسب تھا یا خیر آگے بھیجی جس کے لیے نعمت مناسب تھی اور اس وقت جان لے گا کہ وہ دونوں گھروں (جنت و دوزخ) میں سے کسی کے لیے ہے؟ اور کس گھر میں اُترے گا؟

کتنے ہی دل ایسے ہیں جو جنت کا قُرب حاصل کرنے کے بعد دُور جا پڑنے پر حسرتوں میں ڈوب ڈوب کر رہ گئے۔ کتنی جانیں ایسی ہیں جو آگ کو دیکھ کر کہ اُنہیں جلائے گی۔ آنسو بہاتی رہیں۔ خوفناک مناظر کو دیکھ کر کئی نگاہیں ذلیل و رُسوا ہو گئیں اور دہشتناک احوال دیکھ کر کتنی عقلیں جنون کی نذر ہو گئیں۔

بُرے انجام سے ڈرتے رہو

حضرت ابو سہل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

ایک شب میں نے خواب دیکھا کہ گویا میں جنت میں داخل کر دیا گیا تو میں نے وہاں پر تین سو انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام سے ملاقات کی۔ میں نے اُن سے پوچھا:

"دنیا میں آپ پر خطر امور میں سب سے زیادہ کس چیز کا خوف محسوس کرتے تھے؟"

انہوں نے فرمایا:

"بُرے انجام سے۔"

خاتمہ اور انجام اللہ تعالیٰ کا ایسا مکر (معاملہ) ہے جس کی توضیح ناممکن ہے اور نہ ہی (قبل از وقت) اس کا علم حاصل ہو سکتا ہے اور اس کے مکر کی کوئی انتہا نہیں۔ اس لیے کہ اس کی مشیت و احکام انتہائے سے باہر ہیں۔

حضورؐ کا خوف

ایک مشہور خبر اسی سے ہے کہ:

"حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبریل علیہ السلام دونوں اللہ تعالیٰ کے خوف سے روئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی بھیجی کہ تم کیوں روتے ہو حالانکہ میں نے تم دونوں کو مامون کر دیا ہے"

اُنھوں نے عرض کیا :

" تیرے مکر (تدبیر) سے کون بے خوف ہو سکتا ہے ؟ "

اب اگر انہیں یہ معلوم نہ ہوتا کہ اس کا مکر (تدبیر) انتہا سے باہر ہے۔ اس لیے کہ اس کا حکم ، غایت سے باہر ہے تو یہ بات کیوں کہتے ہو کہ : ؟

" اور تیرے مکر (تدبیر) سے کون بے خوف ہو سکتا ہے ؟ " حالاں کہ تسلی آ چکی تھی کہ،

" میں نے تم دونوں کو مامون کر دیا۔ "

اور خدا کے فرمان سے مکرِ الٰہی ختم ہو چکا تھا مگر وہ بھی مکرِ الٰہی سے بخوبی آگاہ تھے مگر لقیۂ مکرِ الٰہی سے خائف ہوئے جو کہ ابھی غائب تھا اور وہ جانتے تھے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے غیب پر آگاہ نہیں ہیں بلکہ وہی علام الغیوب ہے چنانچہ علام الغیوب کا علم بے انتہا ہے اور غیبی امور کی کوئی غائت نہیں۔ اس لیے اپنے فضل و عنایت کے باعث ان پر (ازلی) حکم نہیں لگایا۔ مزید برآں یہ دونوں مزید معرفتِ صفات کی حالت رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ مکراز وصف اور اظہارِ قول ، باطنی وصف پہ قضائی حکم نہیں کرتا۔ اس لیے دونوں کو خوف ہُوا کہ یہ فرمانِ الٰہی کہ " میں نے تم دونوں کو مامون کر دیا۔ " بھی اس کی حکمت سے مخصوص طریق پہ مکر ہی نہ ہو کہ علم تو اسے ہے ہی ، مگر اب ان کا امتحان ہو رہا ہو اور یہ دیکھ رہا ہو کہ اب اس کے بعد ان کا عمل کیسا رہتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا مبتلی (ابتلاء و امتحان میں ڈالنے والا) ہے اور ابتلاء اس کا وصف ہے جو کہ اس سے جُدا نہیں ہوتا ، اور بندوں میں سابقہ سُنن الٰہی میں تغیر نہیں ہوتا جیسے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق میں ڈلوا کر آزمایا۔ تو اُنھوں نے کہا :

" میرے لیے اللہ میرا پروردگار ہی کافی ہے۔ "

حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا تھا :

" کیا کوئی ضرورت ہے ؟ "

تو انھوں نے فرمایا : " نہیں۔ "

اور فرمایا :

" حسبی اللہ۔ (میرا اللہ ہی کافی ہے)

چنانچہ عمل کر کے بات کو سچ کر دکھایا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

وَ اِبْرَاهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰۤی۔ (اور ابراہیم کے ، جس نے پورا اتارا)

یعنی حسبی اللہ کہہ کر وفا کی۔ مزید برآں اللہ تعالیٰ احکام کے تحت نہیں آتا اور مخلوق پہ جو حکم لگایا جاتا ہے

اس پر لازم نہیں اور اس سبحانہ' و تعالیٰ کا صدق آزمایا نہیں جاتا۔ (بلکہ وُہ خود آزمانے والا ہے) اور صدق کے برعکس وصف سے اس کی توصیف جائز نہیں۔ اگر وُہ بات بدل دے تو یہ اس کی جانب سے تبدیلی ہے، اس لیے کہ کلام بھی اسی کے ساتھ قائم ہے۔ اسے حق حاصل ہے کہ جو چاہے بدل دے اور پھر بھی وُہ دونوں کلاموں میں سچا ہے۔ دونوں حکموں میں عادل ہے اور دونوں حالوں میں حاکم ہے۔ اس لیے کہ وُہ اس پر خود حاکم ہے اور اس پر کوئی حکم لازم نہیں آتا اس لیے کہ امر و نہی کی حدود کے مقامات یعنی علوم و عقول سے وُہ متجاوز و بالاتر ہے اور احکام و اقدار کے ذرائع یعنی رسُوم و معقول ختم ہو چکے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا خوف

ہم نے جس کا ذکر کیا ہے اس کے مشاہدہ میں علومِ توحید کا دقیق علم اور احوالِ توحید کا بلند ترین مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کلامِ الٰہی میں اس مفہوم کو واضح فرمایا:

فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِہٖ خِیْفَۃً مُّوْسٰی۔ (پھر موسیٰ اپنے جی میں ڈر پانے لگا۔)

اس سے پہلے فرمایا:

لَا تَخَافَا اِنَّنِیْ مَعَکُمَا۔ (تم دونوں نہ ڈرو بیشک میں تم دونوں کے ساتھ ہوں)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطرہ ہُوا اور انہوں نے خوف چھپائے رکھا اور اللہ تعالیٰ نے فِیْ نَفْسِہٖ میں اسے پوشیدہ فرمایا۔ آخر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ظاہر کر دیا۔ اس لیے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مخفی مکر اور باطن وصف سے آگاہ تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ انہیں حکم ملا ہے اور وُہ محکوم و مجبور ہیں۔ اب دوبارہ ڈر ہُوا اور اللہ تعالیٰ نے بھی دوبارہ امن کا مژدہ سنایا کہ:

لَا تَخَفْ اِنَّکَ اَنْتَ الْاَعْلٰی۔ (نہ ڈر بے شک تو ہی رہے گا اوپر)

اب اطمینان ہُوا اور پہلے اظہار پر تسکین نہ ہُوئی۔ اس لیے کہ وسعتِ علم الٰہی سے آگاہ تھے کہ وُہ علام الغیوب ہے۔ اس کے علوم کی انتہا نہیں۔ مزید برآں قول، احکام ہیں اور حاکم پر حکمِ احکام نہیں آتا جیسے کہ اس پر احکام لوٹ کر نہیں آتے اور حاکم سے احکام کی توضیح ہوتی ہے۔ پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محکوم پر ہی احکام آتے ہیں۔ نیز اللہ عزّ و جل پر وُہ بات لازم نہیں جو مخلوق پر لازم ہے۔ مخلوق زیرِ حکم ہے اور وہ عقل و علم کے معیار میں نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ ان سب (عقل و علم) سے بالاتر ہے جس نے اسے پہچانا۔ اس نے اس کی عظمت دیکھ کر اپنی جہالت کا اقرار کیا۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام کا خوف

حضرت عیسٰی علیہ السلام کا قول بھی اسی قبیل سے ہے کہ:

اِنْ کُنْتُ قُلْتُہٗ فَقَدْ عَلِمْتَہٗ تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ

وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ ۔[1]

(اگر میں نے اسے کہا، تو تُو اسے جانتا ہے تو جانتا ہے جو میرے جی میں ہے اور میں نہیں جانتا جو تیرے جی میں ہے)

یہ اس وقت کہا کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ:

ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِیْ وَ اُمِّیَ اِلٰـهَیْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔ (کیا تو نے کہا لوگوں کو کہ ٹھہراؤ مجھ کو اور میری ماں کو دو معبود سوائے اللہ کے)

قیامت کے روز بھی ان کا قول اسی طرح ہو گا کہ:

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۔ (اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں)

چنانچہ اللہ تعالیٰ کی حکمت و عظمت کے باعث انہیں اس کی مشیت میں کیا۔ ہم نے جو تفصیل کی ہے، یہ مناسب نہیں کہ ہم اُسے کسی کتاب میں کھول دیں اور نہ ہی ہمارے لیے یہ مناسب ہے کہ ہم رمزِ خطاب کو صفحۂ قرطاس پر ڈال دیں۔ اس لیے کہ انکار کا خطرہ ہے اور اہلِ عقل و اہلِ معیار کا علم مختلف ہے۔ ہاں البتہ اہلِ قوت و بصیرت اس میں لایا گیا اور اس نے چاہا اور معلوم کیا تو اسے (بتا دیا جائے گا) اس طرح یہ علم سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہے گا۔ اس صورت میں مشاہدہ کرنے والا اسے پڑھے گا یا پھر جس کے سامنے الہام کے ذریعہ خود علام الغیوب تعالیٰ ہی اسرارِ قلب کھول دے اور اسے نورِ ہدایت کے ذریعہ راہ دکھائے۔ اسے معلوم ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے توفیق بخشتا ہے۔ جسے چاہتا ہے اس کو علم عطا فرماتا ہے۔ اور وہی کھولنے والا، جاننے والا ہے۔ جب دل کھولے تو اسے علم عطا کرے اور جب اسے یقین سے منوّر فرمائے تو اسے الہام فرمائے۔

عارفین کو ایک یہ خوف بھی ہوتا ہے کہ انہیں خوب معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو، بلند تر درجہ والے بندوں سے یوں ڈراتا ہے کہ ان (بلند تر درجہ والے بندوں) کو چھوٹے درجہ والوں کیلئے عبرت بنا دیتا ہے اور عام مخلوق کو اس طرح ڈراتا ہے کہ اپنی حکمت و حکم سے بعض خواص کو باعثِ عبرت بناتا ہے۔

خائفین یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بعض نیک اور صالح لوگوں کو نکال کر عبرت بنایا اور اہلِ ایمان کو ان کے ذریعہ ڈرایا۔ بعض شہداء کو عبرت بنا کر صالحین کو ان کے ذریعہ ڈرایا اور اس سے پرے کی سب

---

[1] مائدہ آیت ۱۱۶۔

باتیں اللہ ہی خوب جانتا ہے ۔

انبیاء و ملائکہ بھی ڈرتے ہیں

ملائکہ کی ایک جماعت کو نکال کر انبیاء علیہم السلام کو ڈرایا۔ نیز ان کے ذریعہ ملائکہ مقربین کو بھی ڈرایا۔ اب ہر صاحبِ مقام اپنے سے کم درجہ والے کے لیے عبرت بن گیا اور اپنے سے بلند درجہ والے کے لیے نصیحت بن گیا اور یہ تخویف وتہدیب اہلِ بصیرت کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں داخل ہے :

اٰتَیْنٰهُ اٰیٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا۔ (ہم نے اس کو دی ہیں اپنی آیتیں ، پھر ان کو چھوڑ نکلا)

بعض مفسرین نے بلعم بن باعوراء کی اخبار میں بتایا کہ اسے نبوت عطا ہوئی اور مشہور یہ ہے کہ اسے اسمِ اعظم عطا ہوا اور یہ اس کی ہلاکت کا باعث ہوا اور یہ اس کے اوصاف میں سے ایک وصف کا تقاضا ہے ۔ یعنی جو علم و اعمال اس کے سامنے ظاہر ہوئے اس نے ان سے لاپرواہی برتی۔ اس لیے اس وقت کوئی صاحبِ مقام بھی کسی مقام میں بالکل پُرسکون نہیں اور نہ ہی کسی اہل حال نے ایک حال کی طرف نظر کی اور نہ ہی کسی حال میں کوئی ایک بھی مکرِ الٰہی سے بے خطر ہوا۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ ہی فرماتا ہے کہ :

اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَیْرُ مَاْمُوْنٍ۔ (بے شک ان کے رب کے عذاب نڈر نہ ہوا جائے)

اب جو آدمی غیر مامون کو مامون قرار دے وہ سب سے بڑا جاہل ہے اور جو امن میں بھی ڈرتا ہے وہ سب سے بڑا عالم ہے تاآنکہ اس مقامِ خوف سے کوچ کر کے مقامِ امن تک جا پہنچے ۔

خوف کا مقام

یہ ایسا خوف ہے کہ کوئی چیز اس کے لیے نہیں ٹھہر سکتی۔ اور ایسا کرب و اضطراب ہے کہ کوئی مقام اور کوئی عمل اس کے برابر نہیں ہو سکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ رجاء و امید کے ذریعہ اس کی تعدیل نہ فرمائے تو یہ انسان کو ناامیدی میں دھکیل دے اور اگر اللہ تعالیٰ حسنِ ظن کے ذریعہ اس میں سکون وچین وانس نہ ڈال دے تو یہ یاس و قنوطیت میں گرا دے مگر جب وہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ ہی تعدیل کرنیوالا اور وہی چین و سکون دینے والا ہو تو خوف و رجاء میں کیونکر اعتدال نہ ہو اور اضطراب اور چین و رضا میں اختلاط کیوں نہ ہو۔ علمِ سابق اور تقدیرِ جاری کے باعث اس کی حکمت رسا اور حکم نافذ ہے جو اللہ تعالیٰ چاہے وہی ہو۔ اللہ کے بغیر کوئی قوت نہیں۔

مذکورہ علوم کے مشاہدات میں ایک مشاہدۂ توحید کا علم ہے۔ جب کو اس کا مشاہدہ ہو جائے اہل خوف کو اس علم کا کم از کم فائدہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ اپنے اعمال کی جانب نظر کرنا بھی بند کر دیتے ہیں۔ اپنے علوم پر انہیں سکون و ناز نہیں رہتا۔ ہر حال میں وہ اللہ کے سچے محتاج اور نفس پر ہر معاملہ میں بے اعتمادی کر کے اور ہر غم لے کر دنیا سے جدا ہو کر خدا کے بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہ ایک گروہ کے مقامات ہیں۔ اب یہی خوف ان حوادث سے

ان کے نجات کا باعث بن جاتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے خوف کو اچانک گرفت آنے سے مامون رہنے کا ذریعہ بتایا اور اپنی رحمت و لطف کا سبب بتایا۔ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں دو توجیہات میں سے ایک یہی ہے۔ فرمایا:

اَفَاَمِنَ الَّذِیْنَ مَکَرُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ یَّخْسِفَ اللّٰہُ بِھِمُ الْاَرْضَ[1] (سو کیا نڈر ہوئے ہیں جو بُرے داؤ کرتے ہیں کہ دھنسا دے اللہ ان کو زمین میں)

پھر فرمایا:

اَوْ یَاْخُذَھُمْ عَلٰی تَخَوُّفٍ فَاِنَّ رَبَّکُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ[2] (یا پکڑ لے ان کو ڈرانے کر، (خوف و دہشت سے) سو تمہارا رب بڑا نرم ہے مہربان)

اور ہمارے لیے یہ مناسب نہیں کہ ہم خاتمہ اور سابق (ازلی قول) کے خطرات کا راز ظاہر کریں۔ اس لیے کہ یہ ان معانی صفات کے حقائق میں سے ہے جو کہ حقیقتِ ذات سے ظاہر ہوئیں تو عجیب عجیب افعال اور عجیب عجیب انجام نمایاں ہوئے اور ان کے ساتھ جو ظاہر کیا اس پر احکام دو بارہ فرمائے اور ان کے لیے کیا ان میں سے کہ جس پر کلمہ حق ہوا۔ (لازم ہوا) اور صفات کے اس پوشیدہ معانی سے اس کا حصہ بنایا۔ اس طرح اسے اوصافِ باطن کے مکاشفہ تک رسائی حاصل ہوئی اور یہ نہ تو مامور بہ ہے اور نہ ہی ماذون فیہ ہے۔ کیونکہ یہ واجب نہیں۔ اس لیے مامور نہیں اور کیونکہ یہ مباح نہیں اس لیے اس میں اجازت نہیں۔ (ماذون فیہ نہیں) یہ تقدیر کا راز ہے اور اس کے اظہار کی ممانعت ہے اور اگر اولیاء کرام کو اس پر آگاہی حاصل نہ ہوتی تو انہیں اظہار نہ کرنے کا حکم بھی نہ ہوتا۔ اب اگر اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اس مقامِ مشاہدہ میں کھڑا کر دے تو معاینہ کر لینے کے باعث وُہ خبر سے مستغنی ہو گیا۔ اور اس کے نشان کی بات کرنے سے اسے انس عطا کیا اور یہی وہ نفع بخش علم ہے کہ جس کا سکھانے والا خود علام (الغیوب) ہے اور یہی وُہ اثر لازم ہے کہ جس کا بنانے والا ہی اس کا موثر ہے۔ (اور بات تو یہ ہے) کہ

وَمَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ (اور جو کوئی ڈرتا ہے اللہ سے، وہ کر دے اس کا گزارا، اور روزی دے اس کو جہاں سے اس کو خیال نہ ہوا اور جو کوئی بھروسہ رکھے اللہ پر تو وہ اس کو بس ہے)

---

[1] النحل آیت ۴۵۔
[2] النحل آیت ۴۷۔

چنانچہ جو کتابیں اس کے نور سے ہیں وُہ نہیں مٹتیں اور جو آنکھ مخفی نہیں ہوتی اس لیے کہ وُہ اس کے حضور کے ساتھ ہے اور جو روشنی نہیں بجھتی اس لیے کہ وہ اس کے روح سے ہے اور جس روح میں کوئی اضطراب نہیں اس لیے کہ وہ اس کے چین و راحت سے ہے اور جو مدد منقطع نہیں ہوتی وہ اس کے روح سے ہے، اس نے لکھا اور ابدیت بخشی۔ اور مخلوق کے قبضہ میں ہر کتاب غیر محفوظ ہے اور گاہے ضائع ہو جاتی ہے اور اس کی رُوح کے بغیر ہر ہاتھ کٹا ہُوا ہے اور جو صانع تعالیٰ نے اپنی صنعت سے حفاظت کرنے والے قلب میں لکھا۔ وُہ پختہ و پائدار ہے۔

قلب کا بیان

حضرت زید بن اسلم سے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں مروی ہے کہ:

فِیْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ۔ (لوحِ محفوظ میں)۔

فرمایا کہ:

مومن کا قلب۔ اور دُوسرے بزرگ نے

وَالْبَیْتِ الْمَعْمُوْرِ۔ (اور بیت معمور)

کے قول میں فرمایا کہ قلب عارف۔

اور ایک عارف نے فرمایا کہ:

فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ۔ (ان گھروں میں کہ اللہ نے حکم دیا ان کو بلند کرنے کا)

فرمایا کہ مقربین کے قلوب کو مخلوقین کے ذکر سے وصفِ خالق کی طرف رفعت ملی اور

وَیُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُہٗ۔ (اور ذکر کیا جاتا ہے ان میں اس کا نام)

اور ان میں اس کا نام توحید کے ساتھ شہادتِ احدیت سے بر تجریدِ وحدانیت ذکر کیا جاتا ہے۔

حضرت ابُو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے:

سینہ ہی کرسی ہے اور دل ہی عرش ہے اور اللہ تعالیٰ اس پر اپنی عظمت و جلال رکھے ہُوئے ہے اور وہ اپنے لطف و قرب کے ساتھ مشہود ہے۔ اب مومن کے سینہ کی ابتداء صمدیت اور انجام رُوحانیت ہے اور اس کا وصف ربُوبیت ہے۔ اس طرح (ایک مومن) صمدی روحانی ربانی ہوتا ہے۔ اور اس کے قلب کا آغاز، قدرت اور انجام نیکی ہے اور اس کا وسط، لطف و کرم ہے۔ اس طرح وہ ایک چراغ ہے جس میں فتیلہ ہے اور اس سے وہ شیشہ دیکھتا ہے گویا وُہ ایک تابدار ستارہ ہے جس کے ساتھ انعامات کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ وُہ ایک جسمانی آئینہ ہے، اس کے ذریعہ چہرہ نظر آتا ہے اور اسے اپنے پاس ہی پاتا ہے جیسے کہ آئینہ کے پس پردہ، صاحبِ یقین کے دل سے، نظرِ یقین کے ساتھ مشاہدہ ہوتا ہے۔ سینہ، کرسی کا مشاہدہ

کرنا ہے اور قلب، عرش کا مشاہدہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس (عرش) پر ہے۔

پردہ داری کا حکم

علماء کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ جن لوگوں میں بُرے انجام کو دیکھ پائیں ان کی علامت (انجام بد) کو بیان کریں۔ اس لیے کہ اہلِ کشف کے سامنے ان کی علامت واضح ہے اور عارفین کے نزدیک یہ پوشیدہ دلائل ہیں۔ وُہ ان باتوں پر آگاہ ہیں مگر یہ (علامات) بندے میں معبود تعالیٰ کا ایک مخفی راز ہے اور خزائنِ نفوس (افراد متفرقہ) میں یہ پوشیدہ ہے اور صرف "افراد" ہی کو اس پر آگاہی عطا ہُوئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و حلم سے اسے پوشیدہ فرمادیا اور عنقریب یہ راز کھلے گا۔

یَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ۔ (جس دن جانچے جائیں بھید)

یعنی اس کے غضب اور شدید رعب و سطوت کے باعث۔

فَمَالَهٗ مِنْ قُوَّةٍ۔ (تو کچھ نہ ہوگا اس کو کچھ زور)

یعنی عمل کی کوئی قوت حاصل نہ ہوگی اور

وَلَا نَاصِرٍ۔ (اور نہ کوئی مدد کرنے والا)

یعنی اسے علم کی قوت نہ ہوگی کہ اس سے مدد حاصل کرے۔ اس لیے کہ نصرت دراصل عزت ہے مگر یہ تو ذلیل ہے اور کوئی مددگار نہ ہوگا۔ اس لیے کہ مدد کرنے والا ہی ذلیل کرنے والا ہے اور قوت دینے والا ہی کمزور کرنے والا ہے۔ اب جو اپنی مدد نہ کرسکے وہ از حد ہی بدحال ہے اور اس کا مصاحب و آقا نہیں ہے اور اگر وہ اس کی مصاحبت کرتا تو اس کی مدد کرتا اور اگر اس کی مدد کرتا تو اس کو عزت عطا کرتا۔ اور جب وُہ ہی اس کا کارساز ہو گا تو شیطان اس سے بھاگ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَ أَنفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُونَ۔ (وُہ اپنی مدد نہیں کر سکتے اور نہ ان کو ہماری طرف سے رفاقت ہوگی)

اور اسی طرح ایک جگہ فرمایا:

قُلْ أَنزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ۔ (کہہ دو۔ اتارا ہے اس نے جو جانتا ہے چھپے بھید آسمانوں میں اور زمین میں)

اس کی مغفرت، اس کی حکمت ہے۔ اس کی رحمت اس کی ستاری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

يُخْرِجُ الْخَبْءَ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَيَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ۔ (جو نکالتا ہے چھپی چیز آسمانوں میں اور زمین میں اور جانتا ہے جو چھپاتے ہو اور جو کھولتے ہو)

یہ مذکورہ علم ہی علم ہی حقیقی خوف کا باعث بنتے ہیں اور یہ رازِ شاہی اور خفائے ملکوت ہے۔

موت کے وقت بعض بندوں پر ایسی علامات پائی جاتی ہیں جن کو ایک عارف پہچان کر اس کے بُرے انجام کو جان لیتا ہے۔ یہ علم ان کے ساتھ مخصوص ہے کہ جن کو مشاہدۂ حقیقتِ ذات سے مقاماتِ مکاشفات سے مقام ملا۔ یہ اس پر مطلع ہونے والے اہلِ قلوب کے نزدیک علام الغیوب کا راز ہے۔ مفاہیم کے اعتبار سے کشف کی کئی انواع ہیں۔ بعض اخروی معانی کے کشف ہیں۔ بعض دنیاوی بواطن کے کشف ہیں۔ اور بعض کشف ایسے ہیں کہ جن میں ظاہری احکام کے مخفی حقائق کا پتہ چلتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ :

"تقدیر، اللہ کا راز ہے۔ اس کو ظاہر نہ کرو۔"

یہ خطاب اس کو ہے جس کو اس کا کشف ہوا۔ ایک دوسری روایت میں ہے :

"(یہ) سترالله (اللہ کا راز) ہے۔ اسے نہ کھولو۔"

یہ اس کو خطاب ہے جس کو اس کا مکاشفہ حاصل نہیں ہوا۔ یعنی یہ اس کے بارے میں سوال ہی کی ممانعت ہے اور یہ ممانعت اللہ تعالیٰ کے فرمان میں ہے۔ فرمایا :

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ [۱] (اور نہ پیچھے پڑ اس کے کہ جس کا تجھے علم نہیں)

یعنی تم جس بات کے مکلف نہیں اس کا علم حاصل کرنے میں جان نہ کھپاؤ اور جو بات تیرے علم میں ہونے کی نہیں کی گئی اور نہ ہی تیرے سپرد کی گئی۔ اس کے بارے میں سوالات نہ کر۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ جب وُہ اُسے جان لے گا تو اس کا علم اسے کچھ بھی فائدہ نہ دے گا بلکہ اس کے لیے احکام و اسباب کا علم ہی نافع ہے کیونکہ یہی اصل میں ذرائع ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو یعنی اپنے انبیاء کو خطاب کرتے ہُوئے دراصل مومنین کو خطاب فرمایا۔ جب حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا :

اِنَّ ابْنِيْ مِنْ اَهْلِيْ وَاِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ [۲] (بیشک میرا بیٹا میرے اہل سے ہے اور بے شک تیرا وعدہ سچ ہے)

اللہ تعالیٰ نے ان سے ان کے اہل کے نجات پانے کا وعدہ فرمایا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس دعا پہ فرمایا :

---

[۱] بنی اسرائیل - آیت ۳۶۔

[۲] ہود - آیت ۴۵ - ۴۶۔

اِنَّهٗ لَیْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَیْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔

(وہ نہیں تیرے گھر والوں میں، اس کے کام ہیں ناکارہ، سومت پوچھ مجھ سے جو تجھ کو معلوم نہیں)

یعنی تیری یہ درخواست وسوال جس کے بارے میں میں نے اُسے تیرے علم میں نہیں کیا اور نہ ہی یہ بات تیرے سپرد کی ہے۔ یہ غیر صالح عمل ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السّلام نے اس وقت استغفار کیا اور اپنے پروردگار سے رحم و عفو کی درخواست کی۔

موت کے وقت بندے کے سامنے سے پردہ ہٹتا ہے اور کئی باتیں اس کی نظروں کے سامنے آتی ہیں اس نے اللہ کے سوا جس جس کو خدا بنا رکھا تھا یا اللہ کے ساتھ اس نے جو جو شریک ٹھہرا رکھا تھا اور یہ تمام باتیں خوب بن سنور اور فریب کن انداز میں سامنے آتی ہیں۔ اگر ان میں سے کسی کے ساتھ دل جم گیا یا ان میں سے کسی کی زینت و حسن میں کھب کر اللہ سے اعراض کر بیٹھا اور اس کا آخری سانس اس حالت میں نکل گیا تو اس کا انجام اور خاتمہ اسی (خراب حالت پر) ہوگیا اور اس کی رُوح، شک یا شرک پہ نکل گئی تو یہی بُرا انجام اور بُرے خاتمہ کہلاتا ہے۔ ارواح کی پیدائش کے وقت، فیصلۂ ازلی کی سبقت کرنے کا جو معاملہ ہے اب بندے کے حصّہ میں آیا اور یہ ازمنہ و امکنہ کے ظہور سے پہلے ابد و ازل میں اشباح (و صور) کی صورت میں معدوم تھا۔ وہاں ارواح نے انہیں قریب سمجھا اور انہی میں ڈوب کر رہ گئے اور پیدائش اجسام سے پہلے قلب میں خطوط کی صورت میں ان کے غلط نشانات بڑھتے چلے گئے۔ اور وجود میں نمایاں ہونے کے وقت، اصل راز کھلنے کے باعث حجابات سے قبل اور عقلی شواہد کے باعث ان کے قرار پذیر ہونے سے قبل یہ غلط نشانات بڑھتے رہے مگر شواہد ازلیت کے ساتھ یہ ظاہر ہُوئے اور مفہوم قیومیت کے ساتھ ہی وجود پذیر ہُوئے۔ وصفِ جامع کے باعث جمع ہُوئی اور یہاں آکر بکھر گئی اور اب فراق (موت) کے وقت سامنے آئی۔ اس لیے کہ اب اس کا مشاہدہ ہُوا اور آغاز میں جو بات ہُوئی تھی آخر کار (آج) اس کا اعتراف کر لیا اور جو مشاہدہ ہُوا اسی پر رُوح نکلی۔ ارواح نے خاتمہ کے وقت جو حالت پائی یہ وہی خبرِ سابق (فیصلہ ازلی کی خبر) ہے۔

اس وجہ سے حدیث میں آیا کہ:

"فرشتۂ ارحام، نطفہ کو ہاتھ میں لے کر کہتا ہے:

"اے پروردگار! مذکر ہے یا مونث؟ سیدھی (راہ پر) ہے یا ٹیڑھی (راہ پر) ہے؟ اس کی روزی کیا ہے؟ اس کا عمل کیسا ہے؟"

فرمایا: پھر اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر پیدا کرتا ہے جیسے کہ اس نے فرما دیا اور جب اس کی صورت بناتا ہے،

تو (فرشتہ) عرض کرتا ہے:

"اے پروردگار! اس میں سعادت ڈال دوں یا شقاوت؟"

یہی وجہ ہے جو ڈال دی گئی اسی پر اس کی روح بھی نکلی۔

فَاَمَّا اِنْ کَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِیْنَ فَرَوْحٌ وَّ رَیْحَانٌ وَّجَنَّةُ نَعِیْمٍ۔ (سو جو اگر وُہ ہُوا مقربین میں تو راحت ہے اور روزی ہے اور باغ نعمت کا)

وَ اَمَّا اِنْ کَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ فَسَلٰمٌ لَّکَ مِنْ اَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ۔ (اور جو اگر وُہ ہُوا اصحاب یمین سے تو سلامتی پہنچے تجھ کو اصحاب یمین سے)

وَ اَمَّا اِنْ کَانَ مِنَ الْمُکَذِّبِیْنَ الضَّآلِّیْنَ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِیْمٍ وَّ تَصْلِیَةُ جَحِیْمٍ۔ (اور جو اگر وُہ ہوا جھٹلانے والے گمراہوں میں تو مہمانی ہے جلتا پانی اور بیٹھانا آگ میں)

فرمایا:

کَمَا بَدَاَکُمْ تَعُوْدُوْنَ فَرِیْقًا هَدٰی وَ فَرِیْقًا حَقَّ عَلَیْهِمُ الضَّلٰلَةُ۔ (جیسے کہ تم کو پہلے بنایا دوسری بار ہو گے، ایک فرقے کو ہدایت دی اور ایک فرقے پر ٹھہری گمراہی)

کَمَا بَدَاْنَآ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ۔ (جیسا سرے سے بنایا پہلی بار پھر اس کو دُہرائیں گے)

وَلَوْ شِئْنَا لَاٰتَیْنَا کُلَّ نَفْسٍ هُدٰهَا وَلٰکِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّیْ۔ (اور اگر ہم چاہتے تو دیتے ہر جی کو سوجھ اپنی راہ کی، لیکن ٹھیک پڑی میری کہی بات)

اور ایک حق سبحانہٗ و تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ الَّذِیْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰی۔ (جن کو آگے ٹھہر چکی ہماری طرف سے نیکی)

اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْهِمْ کَلِمَتُ رَبِّکَ۔ (جن پر ٹھیک آئی بات تیرے رب کی)

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ کَثِیْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ۔ (اور ہم نے رکھے دوزخ کے واسطے بہت جن اور آدمی)

وَلَهُمْ اَعْمَالٌ مِّنْ دُوْنِ ذٰلِکَ هُمْ لَهَا عٰمِلُوْنَ۔ (اور ان کو اور کام لگے ہیں اس کے سوا کہ وہ ان کو کر رہے ہیں)

وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ یَکُوْنُوْا یَحْتَسِبُوْنَ۔ (اور نظر آیا ان کو اللہ کی طرف سے جو خیال نہ رکھتے تھے)

اِنَّ فِیْ هٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ۔ (اس میں مطلب کو پہنچتے ہیں ایک لوگ بندگی والے)

یہ آیات و نظائر، فیصلۂ ازلی اور خاتمۂ اخروی کے بارے میں موجود ہیں۔ ان میں غیبی سرائر و غرائب صاف

ہیں اور جو لوگ عرش و اعراف کے بلند مقامات پر رسائی و شرف حاصل کرتے ہیں ۔ ان کے لیے یہ نشان تنبیہ ہے ۔

ایک عارف فرماتے ہیں کہ اگر مجھے پچاس برس سے کسی کے توحید پر پختہ رہنے کا علم ہو اور پھر اس کے اور میرے درمیان ایک دیوار سی حائل ہو جائے اور وہ مر جائے تو میں قطعیت کے ساتھ اس کی توحید کی (گواہی) نہیں دے سکتا۔ اس لیے کہ مجھے خبر نہیں کہ اس پر کیا کیا انقلابات آ چکے ۔

سوءِ خاتمہ کا خوف

امام ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ،

"صدیقین کو ہر لمحہ بُرے انجام کا ڈر رہتا ہے اور ہر گھڑی اس کا خوف کھاتے ہیں وہ خدا تعالیٰ سے دُور ہونے سے ڈرتے رہتے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے انھی لوگوں کی تعریف کی اور فرمایا :

وَّ قُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ ۔

اور فرمایا ،

"جس طرح وہ اپنی برائیوں سے ڈرتا ہے اسی طرح اگر نیکیوں سے بھی نہ ڈرتا رہے تو اس کا خوف صحیح نہیں ۔"

ایک بار فرمایا ،

"خوف کا اعلیٰ درجہ یہ ہے کہ اپنے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ازلی علم سے ڈرے اور اس بات سے ڈرتا رہے کہ کہیں خلافِ سنت کوئی کام نہ کر بیٹھے کہ جس کی نحوست اسے کفر تک لے جائے ۔"

اور فرمایا ،

"فیصلۂ ازلی کا خوف دراصل خوفِ تعظیم کا ترازو ہے ۔"

ایک عارف فرماتے ہیں کہ :

"اگر گھر کے دروازہ پر شہادت ہو اور کمرے کے دروازہ پر اسلام پر موت ہو تو میں شہادت پر موت کو پسند کر دوں گا ۔"

پوچھا گیا : "کیوں ؟"

فرمایا : "اس لیے کہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ گھر کے دروازے سے کمرے کے دروازے تک آنے کی مدت میں کیا واقع پیش آ جائے اور توحید میں تغیّر آ جائے ۔"

زہیر بن نعیم البانی سے مروی ہے ۔ فرمایا ، کہ

"یہ میرا سب سے بڑا غم ، میرے گناہ نہیں ہیں ۔ مجھے گناہوں کے وبال سے بڑھ کر ایک غم ہے اور وہ غم مجھ سے توحید سلب ہو جانے کا اور توحید کے علاوہ حالت پر موت ہو جانے (کے خطرہ) کا غم ہے ۔"

ابن مبارکؒ نے ابولہیعہؒ سے، انہوں نے بکر بن سوادہؒ سے نقل کیا، فرمایا کہ:

"ایک آدمی لوگوں سے علیحدہ رہتا۔ جہاں جاتا تنہا رہتا تھا۔ حضرت ابوالدرداء اس کے پاس تشریف لائے اور فرمایا:

"میں تجھے اللہ کی قسم دیتا ہوں۔ بتادے کہ تُو نے لوگوں سے علیحدگی کیوں اختیار کر لی؟"

اس نے کہا:

"مجھے ڈر ہے کہ میرا دین چھن جائے اور مجھے پتہ بھی نہ ہو۔"

فرمایا:

"کیا قبیلہ میں ایک سو آدمی ایسے دیکھتے ہو کہ انہیں ایسا خوف ہو کہ جیسا تمہیں خوف رہتا ہے؟" اور پھر کم کرتے گئے حتیٰ کہ دس پر پہنچے۔ راوی بتاتے ہیں کہ میں نے اہلِ شام میں سے ایک آدمی کے سامنے یہ واقعہ بیان کیا تو اس نے کہا:

"یہ شرحبیلؓ بن سمط کا واقعہ ہے جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں سے ہیں۔"

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ قسم کھا کر فرمایا کرتے:

"جو آدمی بھی موت کے وقت ایمان چھن جانے سے بے خطر ہو گیا اس کا ایمان چھن گیا۔"

ہمارے ایک عالم فرماتے ہیں:

"جس کو توحید عطا ہوئی اس کو سب کچھ مل گیا۔ اور جو توحید سے محروم رہا وہ ہر (نعمت) سے محروم رہا۔ جب اس میں توحید ہو گی تو پھر اس میں بعض (نعمت) نہیں (بلکہ کامل نعمت ہے)۔"

جب حضرت سفیان رضی اللہ عنہ کا وفات کا وقت قریب آیا تو وہ رونے لگے۔ پوچھا گیا:

"اے ابوعبداللہ! تجھے امید رکھنی چاہئے۔ اس لیے کہ تیرے گناہوں سے اللہ تعالیٰ کا عفو زیادہ ہے۔"

انہوں نے فرمایا:

"کیا میں کوئی اپنے گناہوں پر روتا ہوں؟ اگر میں (یقینی طور پر) جانتا کہ میری موت (ضرور ہی) توحید پہ ہو گی تو مجھے کچھ پروا نہ ہوتی چاہے پہاڑوں کے برابر گناہ لے کر خدا سے ملتا۔"

ایک بار زمین سے ایک دانہ اٹھایا اور فرمایا:

"میرے گناہ اس سے بھی ہلکے ہیں۔ مجھے صرف یہ ڈر ہے کہ آخری وقت میں کہیں توحید ہی نہ چھن جائے۔"

اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے۔ یہ خائفین میں سے تھے اور خوف کی شدّت سے خون کا پیشاب کرنے لگتے۔

خوف کی وجہ سے اکثر بیمار رہتے۔ ان کا پیشاب ایک اہل کتاب کے سامنے پیش کیا گیا تو وُہ کہنے لگا:

"یہ کسی راہب کا پیشاب ہے۔"

یہ حضرت حماد بن سلمہ رضی اللہ عنہ کو کہا کرتے:

"اے ابو سلمہؓ! کیا میرے جیسے کی بھی بخشش ہوگی یا میرے جیسے کو معافی ملے گی؟"

حضرت حمادؓ جواب دیتے:

"ہاں، مجھے اس کی امید ہے۔"

ایک عالمؒ فرماتے ہیں:

"اگر مجھے یقین ہو جائے کہ میرا انجام سعادت پر ہوگا تو میری زندگی بھر جس جس چیز پر سورج طلوع ہوتا ہے سب سے زیادہ یہی بات محبوب ہے اور میں سب چیزوں کو اللہ کی راہ میں خیرات کر دوں۔ (اگر یہ یقین ہو جائے خوشی کے باعث)۔"

ایک صادق کی وصیت

میرے ایک بھائی نے ایک طالبِ صادق کا واقعہ سُنا۔ یہ بہت ہی ڈرنے والا تھا۔ اس نے اپنے بھائیوں کو وصیت کی اور کہا:

"جب میری موت قریب ہو تو میرے سرہانے بیٹھ جانا۔ جب تو دیکھے (کہ میری وفات کا وقت آگیا) تو میری طرف دھیان رکھنا۔ اگر تُو نے دیکھا کہ توحید پر میری موت ہُوئی تو میری تمام مملوکہ اشیاء لے کر بادام اور چینی لینا اور اہل شہر کے بچّوں میں تقسیم کر دینا اور کہنا کہ یہ ایک رہا ہونے والے کی خوشی کا موقع ہے۔ اور اگر تو دیکھے کہ میں توحید کے علاوہ حالت پر مرا ہوں تو لوگوں کو یہ بات بتا دینا کہ میری موت توحید پہ نہیں ہُوئی تاکہ وُہ میرے جنازہ میں دھوکہ سے شرکت نہ کریں اور پھر جس کا جی چاہے اپنی مرضی سے جنازہ میں آئے تاکہ میرے ساتھ ریاکاری وابستہ نہ ہو اور یہ نہ ہو کہ میں نے مسلمانوں کو دھوکہ دیا۔"

میں نے کہا:

"مجھے کیونکر معلوم ہوگا کہ تمہاری موت توحید پر ہُوئی ہے؟"

انہوں نے بعض مرنے والوں کی ایسی علامات بتائیں جن کا تذکرہ کرنا ہم پسند نہیں کرتے۔ راوی بتلاتے ہیں کہ پھر میں اس کے سرہانے بیٹھ کر دیکھنے لگا۔ میں نے ان پر اچھے انجام کی علامت دیکھی اور توحید پر وفات پانے کی علامت دیکھی۔ آخر ان کی رُوح (توحید پر) نکل گئی۔ راوی بتاتے ہیں کہ میں نے ان کی وصیت پُوری کی، مگر یہ بات میں نے اپنے بعض خاص دوست کو ہی بتائی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی میں انسان جو بُرائی کرتا رہتا ہے موت کے وقت وُہ اس کے سامنے آتی ہے اور زندگی کے آخری لمحے میں اس بُرائی کا مشاہدہ ہوتا ہے

اب اگر دل نے اسے سمجھایا نفس نے اس کی طرف میلان کیا اور اس برائی کے دھیان میں لگ گیا۔ اب اگر اس کے دھیان میں لگا تو اس کا ویسا ہی عمل سمجھا گیا۔ چاہے وہ قلیل ہی ہو اور اس کا انجام بھی اس پر ہوا اور جس نے کوئی بھلائی کا کام کیا ہوگا اس کی یاد دوبارہ موت کے وقت اس کو آئے گی اور اس کا مشاہدہ کرے گا۔ اب اگر دل سے اس پر جم گیا یا اُسے پسند کیا اور اس میں دھیان دیا تو وہی عمل سمجھا جائے گا۔ اور یہ اس کا حسنِ خاتمہ اور اچھا انجام ہے۔

خوف نعمت ہے

مشائخ کی جماعت میں سے بعض نے اللہ تعالیٰ کے اس فرمان خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ۔ (پیدا کیا موت اور زندگی کو تاکہ آزمائے تمہیں) کے تحت فرمایا کہ زندگی میں گناہوں کے خیالات کے ذریعہ تقلیبِ قلوب کے ساتھ آزماتا ہے، اور موت کی حالت میں توحید سے ہٹ جانے کے ذریعہ اب جس کی رُوح توحید پر نکلی اور تمام ابتلاؤں سے کامیابی کے ساتھ گزر گیا تو وہ مومن ہے اور یہی بلاءِ حسن ہے۔ جیسے کہ فرمایا،

وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِينَ مِنْهُ بَلَاءً حَسَنًا۔ (اور کیا چاہتا تھا ایمان والوں پر خوب احسان اپنی طرف سے)

ان علوم کے مفاہیم نے ان میں علم الٰہی کے خوف کو مسلط کر دیا۔ اب وہ اپنے اعمال کے محاسن کی طرف نظر بھی نہیں کرتے۔ اس لیے کہ انہیں اپنے رب کی معرفت حاصل ہے اور یہ خوف ان کے عمل کا ثواب و اجر ہے۔

ان کے لیے ان میں علمِ الٰہی کا خوف ان پر خدا کی طرف سے نعمت بن گیا اب ان کا یہ مقام ہو گیا۔ (یعنی مقامِ خوف) جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمَا۔ (کہا دو مردوں نے ان سے جو ڈرتے ہیں، اللہ نے ان دونوں پر انعام کیا)

یعنی ان پر خوف کا انعام ہوا۔

خوف کی مزید اقسام

دوسرا مقام اصحابِ یمین کے لیے ہے جو پہلے (مقامِ خوف) والوں سے کم درجہ کا ہے یعنی جرائم اور گناہوں کا خوف، دھمکی اور سزا کا خوف اور سزا کا راز، اطاعتِ حکم میں کمی ہو جانے کا خوف، حد سے بڑھ جانے کا خوف، مزید (توفیق و انعام) چھن جانے کا خوف، غفلت کے باعث بیداری کے حجاب کا خوف، طاعات میں خوب محنت کے بعد کاہلی و انقطاع واقع ہو جانے کا خوف، قوت کے بعد ضعفِ عزم کا خوف، توبہ ٹوٹنے کے بعد وعدہ ختم ہو جانے کا خوف، جس وجہ سے توبہ واقع ہوئی اس کی بناء پر ابتلاء میں آ جانے کا خوف، استقامت کے بعد دوبارہ غلط روی پر بہ جانے کا

خوف، شہوت کی عادت ہو جانے کا خوف، زیادتی کے بعد نقصان کا خوف، یعنی محبت سے رجوع کر کے خواہش و دنیا پرستی کی طرف چلے جانے کا خوف، سابقہ گناہوں کے باعث ان پر اللہ تعالیٰ کے مطلع ہونے (مواخذہ کرنے) کا خوف، اور یہ خوف ان کے بُرے افعال کی جانب دیکھے گا تو اعتراض کرے گا اور ناراض ہو جائیگا۔ عارفین کے لیے یہ تمام خوف اور طرق ہیں۔ بعض بلند تر اور بعض اس سے کم درجہ پر ہوتے ہیں۔ بعض میں خوف کی شدت زیادہ ہوتی ہے اور بعض میں ان سے کم۔

بتاتے ہیں کہ عرش ایک جوہر تاباں ہے جو کہ تمام امورِ کونیہ سے بھرپور ہے۔ بندہ جس حال میں ہوتا ہے اس کی صورت عرش پر اس طرح بن جاتی ہے جس صورت میں وہ دنیا میں رہ رہا ہوتا ہے۔ جب قیامت برپا ہوگی اور وہ حساب کتاب کے لیے کھڑا کیا جائے گا تو عرش سے اس کی صورت اس کے سامنے کر دی جائے گی۔ دنیا میں وہ جس انداز میں رہتا ہوگا اسی صورت پر اپنے آپ کو دیکھ لے گا۔ اور اپنا آپ دیکھ کر اسے اپنے افعال یاد آجائیں گے۔ اب اسے اس قدر شرم و ندامت لاحق ہوگی کہ جو بیان سے باہر ہے۔

بتاتے ہیں کہ جب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کسی بندے کو معرفت عطا فرماتا ہے پھر وہ اس پر عمل نہیں کرتا تو اس سے (معرفت) سلب نہیں کرتا بلکہ اس کے پاس باقی رکھتا ہے تاکہ اس کی مقدار کے مطابق اس کا محاسبہ کیا جائے۔ البتہ اس کی برکت ختم کر دیتا ہے اور مزید انعام روک دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ایسے آدمی کی مذمت فرمائی کہ جس کو پہلے ابتلاء میں ڈالا تھا مگر اب انعام آنے پر وہ انعام فخر کرنے لگا اور سابقہ لغزشوں کو بھول گیا اور سابقہ حالات پیش آجانے سے نہیں ڈرتا۔ فرمایا:

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۭ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ۔

(اور ہم چکھائیں اس کو آرام بعد تکلیف کے جو پہنچی اسکو تو کہنے لگے گئی برائیاں مجھ سے، تو وہ خوشیاں کرے برائیاں کرتا)

خوفِ نفاق

ایک خوف، نفاق کا ہوتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور کبار تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ اس بات سے بہت ڈرتے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک آدمی جس بات کے کہنے پر منافق سمجھا جاتا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے جا ملے۔ آج میں تم سے دن بھر (ایسے کلمات) دس دس بار سنتا ہوں۔"

نیز فرمایا کرتے:

"دل پر ایسی گھڑی بھی آتی ہے کہ جب وہ ایمان سے بھرپور ہو جاتا ہے اور اس میں سوئی کے ناکے بھر

بھی نفاق کے لیے جگہ نہیں رہتی۔ اور ایسی گھڑی بھی آتی ہے کہ جب (دل) نفاق سے اس طرح بھر جاتا ہے کہ اس میں ایمان کے لیے سوئی کے ناکے بھر جگہ نہیں رہتی۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ فرمایا کرتے:

"تم ایسے ایسے کام کرتے ہو جو تمہاری نظروں میں بال سے باریک تر ہیں مگر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہم انہیں کبائر میں سے سمجھتے۔"

اور دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں:

"اور وہ ہلاک کرنے والے ہیں۔"

حضرت حسن رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے:

"اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میں نفاق سے محفوظ ہوں تو یہ بات مجھے ہر اس چیز سے زیادہ محبوب ہے جس پر سورج طلوع ہوتا ہے۔"

مشائخ کا فرمان ہے کہ:

"اہل ایمان کے تین طبقات ہی نفاق سے محفوظ رہتے ہیں:

"صدیقین، شہداء اور صالحین۔"

اللہ تعالیٰ نے انہی پر کامل نعمت فرمائی اور انہی کی مدح فرمائی اور انہیں مقاماتِ انبیاء میں جگہ عطا کی۔ اس لیے کہ ان کا ایمان مکمل اور انہیں حقیقی یقین حاصل ہے:

مشائخ فرماتے ہیں کہ جو نفاق سے بے خوف رہا وہ بھی منافق ہے۔

بعض مشائخ کا فرمان ہے کہ:

"نفاق کی علامت یہ ہے کہ جو خود کرتا ہے لوگوں سے وہی کام برا سمجھے اور کچھ بھی ظلم پسند کرے اور کچھ بھی حق بات کو ناپسند کرے اور یہ بھی نفاق میں سے ہے کہ کسی آدمی کی مدح کی جائے اور وہ خصوصیت اس میں نہ ہو اور اُسے (غلط مدح) اچھی لگے۔"

علاماتِ نفاق شمار سے باہر ہیں اور ستر (بڑی بڑی) علامات ہیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں چار علامات کا ذکر آتا ہے جو کہ اصل ہیں اور ان سے فرعی علامات کا پتہ چلتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس میں چار باتیں پائی جائیں وہ پکا منافق ہے۔ چاہے وہ روزہ رکھے اور نماز پڑھے اور یہ سمجھتا رہے کہ وہ مسلمان ہے اور اگر اس میں ان میں سے ایک عادت پائی جائے تو اس میں نفاق کا ایک حصہ پایا گیا

تا آنکہ اسے چھوڑ دے۔ (علاماتِ نفاق یہ ہیں)

ا۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ جب وعدہ کرے تو اس کا اُلٹ کرے۔ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو خیانت کرے۔ اور جب غصّہ میں آئے تو بدکلامی کرے۔ (گالیاں دے)

دوسری روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ

"جب معاہدہ کرے تو (غداری کرتے ہُوئے) توڑ دے۔" اس طرح علاماتِ نفاق کی تعداد پانچ ہوگئی۔

ایک آدمی نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے عرض کیا کہ ہم ان امراء کے پاس جاتے ہیں اور ان کے کلام کی تصدیق بھی کرتے رہتے ہیں مگر جب ہم ان کے پاس سے واپس ہوتے ہیں تو ان پر نکتہ چینی کرتے ہیں۔

تو انہوں نے فرمایا:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہم اسے نفاق سمجھتے تھے۔"

ایک دوسری سند کے ساتھ مروی ہے کہ انہوں نے ایک آدمی کو حجاج کی مذمت کرتے ہُوئے دیکھا تو فرمایا:

"اگر حجاج یہاں پر ہو تو کیا تو ایسی ہی نکتہ چینی کرے گا۔ جو اب (اس کی غیر حاضری) میں کر رہا ہے؟"

اس نے کہا: "نہیں"۔

فرمایا: "جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہم اسے منافقت میں شمار کرتے۔"

اس سے بھی سخت تر واقعہ مروی ہے کہ کچھ لوگ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے دروازہ پر ان کی باہر تشریف آوری کا انتظار کر رہے تھے اور ان ہی پر نکتہ چینی بھی کر رہے تھے جب وُہ باہر تشریف لائے تو وُہ شرم کی وجہ سے خاموش ہو گئے تو انہوں نے فرمایا:

"تم جو باتیں کر رہے تھے کرتے جاؤ۔"

مگر وہ خاموش رہے۔ پھر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ہم اسے منافقت شمار کرتے تھے۔"

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ نے اس سے بھی سخت انتباہ کیا۔ فرمایا:

"باطن و ظاہر کا اختلاف بھی منافقت ہے۔ زبان و قلب کا اختلاف اور اندر و باہر کا اختلاف بھی منافقت ہے۔"

چنانچہ عام طور پر توحید کی کمی اور ضعفِ یقین کے باعث مخفی شرک اور دقیق قسم کا نفاق پیدا ہوتا ہے۔ اہلِ ایمان کو اس پر خدا تعالیٰ کی ناراضگی اور اعمال ضائع ہو جانے کا خوف رہتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے ؛

" آدمی گھر سے نکلتا ہے اور اس کے پاس اس کا دین بھی ہوتا ہے اور پھر گھر میں واپس آتا ہے مگر اس کے پاس کچھ دین بھی نہیں ہوتا۔ اس آدمی سے ملتا ہے اور کہتا ہے کہ تو ایسا ایسا بزرگ ہے اور دوسرے سے ملتا ہے اور کہتا ہے ، بھائی تو ہی ایسا ایسا بزرگ ہے۔ وہ اس سے تو کچھ وصول نہیں کرتا مگر اللہ تعالیٰ کو ناراض کر بیٹھتا ہے یعنی جس کو جانتا نہیں اس کا تزکیہ کرتا ہے اور مذموم آدمی کی مدح کرتا ہے اس کے قلب و زبان میں اختلاف رہا۔ یہی بات خدا تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہے "

ان سے بڑھ کر ایمان چھن جانے کا خوف ہے جو تیرے نزدیک خزانۂ مومن میں ہوتا ہے جیسے چاہتا ہے اسے ظاہر کرتا ہے۔ اور جب چاہتا ہے اسے لے لیتا ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ یہ ہبہ تھا جو اس نے تجھے عطا کیا۔ اب وہ اپنے کرم کے صدقہ سے اس کی حفاظت فرماتا ہے یا ایک امانت بااستعار چیز ہے جو کہ خاص طور پر تجھے عطا ہوئی اور اس تعرنے تجھے عطا فرمائی۔ وہ اپنے عدل و حکمت سے پھر واپس لے لے۔ (تو تو کیا کر سکتا ہے) اور اس کی حقیقت اس نے تجھ سے چھپا رکھی ہے اور اس کے انجام کے ساتھ مخصوص کر رکھا ہے۔

ایک عارف فرماتے ہیں کہ ؛

" ایک قوم کے بارے میں وصول مع الخاتمہ پر قطعی فیصلہ کیا جاتا ہے "

ایک دوسرے عارفؒ فرماتے ہیں کہ ؛

" ہائے، کس قدر خطرہ ہے ! "

جیسے کہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے قسم کھا کر فرمایا ؛

" جو آدمی ، ایمان چھن جانے سے بے خوف ہو کر رہ جائے۔ اس سے ایمان ہی سلب ہو گیا "

دیکھیے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کسی وقت کا ذکر کیا ۔ فرمایا ؛

" قلب پر ایسی گھڑی آتی ہے کہ جب وہ نفاق سے بھر جاتا ہے۔ آخر اس میں سوئی کے ناکے بھر بھی ایمان کے لیے جگہ باقی نہیں رہتی "

اب اگر اسی وقت ، موت کی گھڑی بھی آن پہنچی اور وہی آدمی کا آخری وقت ہو تو اب اس کی روح کیا نفاق پر نہ نکلی ؟ قلبی تغیرات کا یہی معاملہ ہے کہ اگر شرک یا شک کی حالت میں کہیں موت کا سامنا کرنا پڑ گیا تو مولائے کریم کی ملاقات کے وقت اس کا انجام کیسا رہے گا ؟ اسی کو خاتمہ کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ یہی اس کا آخری عمل ہے اور عمر کی آخری گھڑی بھی یہی ہے اور خاتم الشئ کا معنی اس کا آخری حصہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے ؛

وَخَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۔ (اور خاتم النبیین) یعنی آخری نبی۔

اور ایسے ہی فرمایا،

"خِتَامُهٗ مِسْكٌ - یعنی اس کا ختام مشک کے ساتھ ہے - یعنی آخری پیالہ یہ ہوگا۔

ایک خوف یہ بھی ہوتا ہے کہ کہیں استدراج کے طور پر معرفت باقی رہے اور مزید علم ایمان کا انقطاع ہو جائے جیسے بعض علماء کا فرمان ہے،

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو معرفت عطا کرے اور اس پر عمل نہ کرے تو اس سے یہ معرفت سلب نہیں کرتا مگر ان کا باقی رہنا ان کے خلاف حجت کے طور پر ہوتا ہے تاکہ اس مقدار پر ان کا محاسبہ کیا جائے۔ اور مزید انعام کا انقطاع ہو جاتا ہے۔ دل میں قساوت آجاتی ہے اور آنکھیں آنسو برساتی ہیں۔ یہ وہ نقصان ہے جس سے صرف اہلِ مقام ہی آگاہ ہوتے ہیں کیونکہ نفع مند چیز اس سے رک جاتی ہے اور فریب میں مبتلا کرنے والی اور مخلوق کے نزدیک فتنہ برپا کرنے والی چیز ملتی ہے۔ کیونکہ بادشاہ کی جانب سے چہرہ کی آنکھ دنیا کے لیے ہے اور ملکوت کی جانب سے دل کی آنکھ آخرت کے لیے ہے۔

نفاق کا رونا

حضرت مالک بن دینارؒ فرماتے ہیں:

"میں نے تورات میں پڑھا کہ جب بندے کا نفاق مکمل ہو جاتا ہے تو وہ اپنی آنکھوں پر قابو پا لیتا ہے۔ چنانچہ جب چاہتا ہے رو دیتا ہے۔"

سلف صالحینؒ نفاق کے رونے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے تھے۔ یعنی یہ کہ بندہ کئی کئی رنگوں سے روئے مگر خشوع و خضوع کا دروازہ اس پر بند ہو۔

اللہ عزوجل نے فرمایا،

وَجَآءُوْٓا اَبَاهُمْ عِشَآءً یَّبْكُوْنَ۔ (اور آئے اپنے باپ پاس اندھیرا پڑے روتے ہوئے)

سلفؒ فرمایا کرتے تھے،

"منافقانہ خشوع سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگا کرو۔"

پوچھا گیا:

"وہ کیا صورت ہے؟"

فرمایا کہ "آنکھ روئے اور دل میں قساوت و سنگدلی ہو۔"

اس لیے کہ آنکھ خشک ہو اور دل میں رقت طاری ہو۔ یہ حالت انسان پر قساوتِ قلبی کے ساتھ ساتھ آنکھوں کے آنسوؤں سے بہتر ہے۔

خشوع کا رونا

اور اہل قلوب کے نزدیک، رقتِ قلب کا مطلب خشوع و خضوع ہے یعنی جس (رونے)

میں انکسار اور عاجزی پائی جائے۔ جس کو یہ ملا اگر اس کی آنکھ آنسو نہ بہا سکے تو بھی اسے کچھ ضرر نہیں۔ اور اگر خشوع کے ساتھ ساتھ آنکھوں سے آنسوؤں کی توفیق بھی مل گئی تو یہ فضیلت کی بات ہے اور جس کو آنکھ کا رونا ملا اور قلبی خشوع سے محروم رہا تو یہ فریب میں مبتلا ہے اور اسے ہی حقیقی محرومی اور عدمِ نفع کہا جاتا ہے اور آنکھ کا تمام رونا علمِ عقل میں ہوتا ہے اور مشاہدۂ یقین کے ساتھ علمِ توحید میں رونا نہیں پایا جاتا۔ اس لیے کہ وہ وحدانیت کا مشاہدہ کرنے والے کے لیے اب اسے علمِ قدرت پر آمادہ کرتا ہے اور بھرپور قوت کے ساتھ اس پر گریہ طاری ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رونے والوں کی توصیف فرمائی کہ گریہ ان کے اندر مزید خشوع پیدا کرتا ہے۔ فرمایا:

يَبْكُونَ وَيَزِيدُهُمْ خُشُوعًا ۔ (روتے ہوئے اور زیادہ ہوتی ہے ان کو عاجزی)

لیکن جب رونے سے تکبر و غرور بڑھے تو جان لو کہ دل میں خشوع کا نام بھی نہیں اور یہ سارا رونا نفس کے باطنی آفات یعنی تصنع کا رونا ہے۔

علماء کا خوف خوف کا اعلیٰ ترین درجہ، فیصلہ ازلی (قولِ ماسبق) اور انجام کا خوف ہے جیسے کہ ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"میرا رونا اور میرا غم، میرے گناہوں اور شہوتوں کے باعث نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ میرے اخلاق و صفات ہیں جو میرے سواد و سکر کے لایق نہیں۔ میرا غم و حسرت تو اس پر ہے کہ جب قسمتیں تقسیم ہوئیں اور بندوں میں ان کے نصیب بٹے تو میرا نصیب و قسمت کیسی تھی! یہی علماء (ربانیین کے خوف ہیں کہ جو انبیاء علیہم السلام) کے حقیقی وارث ہیں اور ابدال نبیین و ائمہ متقین اور اصحاب قوت و تمکین ہیں۔

حضرت ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا گیا:

"کیا اللہ تعالیٰ کسی کو ایک مثقال بھر بھی خوف عطا کرتا ہے؟"

فرمایا: "بعض اہل ایمان کو پہاڑ کے وزن کے برابر بھی خوف عطا ہوتا ہے۔"

پوچھا گیا:

"پھر ان کا کیا حال ہوتا ہے۔ کیا وہ کھاتے، سوتے اور نکاح کرتے ہیں؟"

فرمایا:

"ہاں، یہ سب کام کرتے ہیں اور پھر بھی مشاہدہ ان سے جدا نہیں ہوتا اور جائے پناہ انہیں سایہ کیے رہتی ہے۔"

پوچھا گیا: "تو خوف کہاں ہے؟"

فرمایا:

"حکمت لطیفہ کے ساتھ حجابِ قدرت اُسے اٹھاتا ہے اور بشری صفات کے باعث تغیرات ہیں حجاب کے نیچے دل کو مستور کر دیتا ہے۔ اب اس بندے کی مثال مرسلین علیہم السلام کی سی ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ فرمایا: اس لیے کہ حکمت و تصریف (تغیر) کے باعث مشاہدۂ توحید اسے احکام بجا لانے پر آمادہ کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دل میں نورِ ایمان بہت زیادہ ہے۔ اگر وُہ دل پر (کامل طور پر) ظاہر ہو جائے تو وُہ تمام بدن اور اس کے ساتھ لگے فرشتوں تک کو جلا کر رکھ دے۔ البتہ یہ فضل وکرم سے مستور اور علم کے ساتھ زیرِ پردہ ہے تاکہ احکام باقی رہیں اور ان میں تغیرات ہوتے رہیں اور یہ قیام، قدرت و صفات کے مفاہیم کے انتہائی مقاصد کے قائم مقام ہے۔ اس لیے کہ انوار تو اسماء کے باعث حجاب میں ہیں اور اسماء پر افعال کا پردہ ہے۔ اور افعال پر حرکات کا پردہ ہے۔ اب قدرت کے ساتھ حرکت نمودار ہُوئی اور اس کے پس پردہ غائب ہے۔ اسی طرح نورِ ایمان سے، حکمت کے باعث تغیر ظاہر ہوتا ہے اور اس کے پسِ پردہ انوارِ ایمان مخفی ہوتے ہیں۔

نورِ مومن

ایک عارفؒ فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کے ہاں مومن کے چہرہ کی نورانیت جس درجہ کی ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ اس کو عام مخلوق کے سامنے ہویدا کر دے تو لوگ خدا کو چھوڑ کر اس کی پرستش کرنے لگ جائیں اور اگر مومن کا نورِ قلب، دنیا کے سامنے ظاہر ہو جائے تو رُوئے زمین کوئی چیز بھی اس کے سامنے نہ ٹھہر سکے (بلکہ ہر چیز جل کر راکھ ہو جائے)۔ اللہ پاک ہے جس نے قدرت اور اس کے مفاہیم کو اپنی حکمت و اسبابِ (حکمت) کے ساتھ چھپا دیا۔ یہ اس کا علم و رحمت ہے۔ فائدہ کے لیے مخلوق کی طرف یہ ایک طریق ہے۔ حضرت ابیؓ بن کعب فرماتے ہیں:

"مَثَلُ نُوْرِ الْمُؤْمِنِ"

اب اگر اس کا نور، اس کے نور سے نہ ہوتا تو وُہ بغیر معنی کے ابدالِ حرف کو جائز کیوں سمجھتے۔

خوف کے اثرات

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"خوف، ممانعت کے متضاد ہے۔ اور خشیۃ سے مراد، تقویٰ و ورع ہے اور اشفاق سے مراد، زہد ہے"

اور فرمایا کرتے:

"جاہل پر خوف آئے تو اسے علم حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ عالم پر خوف آتا ہے تو اسے زہد کی

دعوت دیتا ہے اور عامل (کام کرنے والے) پر خوف چھاتا ہے تو اسے اخلاص کی دعوت دیتا ہے۔"

نیز فرماتے،

"اخلاص فرض ہے اور یہ صرف خوف سے حاصل ہوتا ہے اور خوف صرف زہد سے حاصل ہوتا ہے۔ اب خوف سب کے لیے مناسب ہوا اس لیے کہ عوام پر خوف چھاتا ہے تو انہیں حرام سے نکالتا ہے اور خواص پر خوف چھاتا ہے تو انہیں تقویٰ و زہد کی طرف لے جاتا ہے۔ اس لیے کہ جو ڈرا اس نے (برا کام) چھوڑا۔"

نیز فرمایا،

"جو آدمی اپنے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف دیکھنا چاہے تو وہ حلال کے سوا کچھ نہ کھائے اور علم رجا (امید کا علم) صرف اہل خوف کے ہی مناسب ہے۔"

ایک بار فرمایا،

"خوف مذکر ہے اور محبت مونث۔ دیکھتے نہیں عام طور پر عورتیں ہی محبت کا دعویٰ کرتی ہیں۔" اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ امید پر خوف کو ایسی ہی فضیلت حاصل ہے جیسے کہ مونث پر مذکر کو فضیلت حاصل ہے۔" اور واقع بھی اسی طرح ہے۔ اس لیے کہ خوف اصل میں علماء کا حال ہے اور رجاء اصل میں عاملین کا حال ہے۔ عابد پر عالم کی فضیلت ایسے ہے جیسے کہ چاند کو ستاروں پر فضیلت حاصل ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ

"عالم کی میرے نزدیک عمل کرنے سے زیادہ فضیلت ہے اور تمہارا بہترین دین تقویٰ ہے"

علماء کا خوف کیسا ہے؟

علماء کے نزدیک خوف کا مفہوم، عوام کے تصور سے جدا ہے۔ عوام کے نزدیک اضطراب و پریشانی اور قلق واحتراق کو خوف کا نام دیا کرتے ہیں۔ مگر علماء کے نزدیک ان باتوں کو خوف نہیں کہا کرتے۔ اس لیے کہ یہ باتیں خطرات و احوال ہیں اور یہ احوال، عارف صوفیاء کے احوال محبت کے احتراق و قلق کے درجہ کے مقابلہ میں کچھ بھی حقیقی علم نہیں۔

علماء کے نزدیک، صحیح علم اور صدقِ یقین عطا ہوا تو اسے خائف کا نام دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ساری مخلوق سے زیادہ خائف تھے اس لیے کہ آپ حقیقی علم پر تھے اور اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ محبت کرتے تھے۔ کیونکہ آپ کو سب سے زیادہ قرب حاصل ہے اور گا ہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ دو مقامات میں ایک ساتھ سکینت اور وقار کی حالت پائی جاتی ہے اور تمکین و تثبیت کی حالت تمام احوال میں پائی جاتی ہے اور قلق و اضطراب کا وصف وہاں نہیں ہوتا اور نہ ہی حیرانی اور والہانہ شیدا ہونے کا وصف ہوتا ہے۔ آپ کو تمام مخلوق کے علوم و عقول سے کئی گنا بڑھ کر عطا ہو۔ آپ کے قلب میں ان کے لیے بہت وسعت ہے اور

ان پر صبر و تحمل ہیں آپؐ کا سینہ خوب کھلا ہے۔

ایک اعرابی کے ساتھ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک اعرابی کی طرح (بے تکلفی سے) برتاؤ فرماتے۔ ایک نیچے کے ساتھ اسی انداز میں رہتے اور ایک عورت کے ساتھ اس کا لحاظ کیا کرتے۔ آپؐ ان کے علوم کے قریب ہو کر کلام فرماتے۔ ان کی عقول کے قریب ہو کر خطاب فرماتے۔

آپؐ سے ان کی طرح کا وجدان ظاہر ہوتا تاکہ عوام آپؐ سے مانوس ہو کر آپؐ سے مستفید ہو سکیں۔ اور آپؐ ان کو فائدہ دے کر ان کے حقوق پورے کر سکیں۔ مزید براں ایک فائدہ یہ ہے کہ آپؐ کا رعب لوگوں پر اس قدر شدت اختیار نہ کرے کہ وہ کچھ پوچھنا بھی چھوڑ دیں اور آپؐ سے انس ہی ختم کر بیٹھیں۔ یہ خدا تعالیٰ کی حکمت و رحمت ہے۔ جس کو لوگ نہیں سمجھتے اور آپؐ کی جبلت ہی میں رحمت رکھ دی گئی اور آپؐ پر تکلف و تصنع سے محفوظ رنگ دیا گیا۔ یہ بات تم عزیز حکیم تعالیٰ سے جان سکتے ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اسی وجہ سے اس کی پیدائش کا ذکر فرمایا اور تعجب انگیز توصیف کی۔ چنانچہ فرمایا:

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۔ (اور بیشک تو بڑے خلق پر ہے)

یعنی آپؐ اخلاقِ ربانی پر ہیں اور اضافت کے ساتھ پڑھی گئی تاکہ عظمتِ اسمِ الٰہی، قوتِ تمکین و فضیلتِ عقلاء کے باعث ان کا کچھ نصیب کم کر دے اور نہ ہی حقیقتِ زہد و انتہائے خشوع کا کچھ حصہ نمایاں ہو اور رفعتِ قوت اور رسوخ علم و حکمت کے پاس اس پر کچھ ظاہر نہ ہو۔ اس طریق پر ان اہل ابتلاء عارفین کی توصیف ہُوئی جو کہ انبیاء علیہم السلام کے درجہ بدرجہ مماثل ہیں۔

ایک عارف فرماتے ہیں:

"جس نے مخلوق سے اپنے علم کا مطالبہ کیا اور اپنی عقل کے مطابق ان کو خطاب کیا۔ اس نے ان کی ادائیگیِ حقوق میں کمی رکھی اور ان میں خدا تعالیٰ کا حق قائم نہیں کیا۔"

ایک عالمؒ فرماتے ہیں:

"جو آدمی لوگوں کے سامنے ہر وہ بات بیان کر دے جس کو وہ جانتا ہے اور ان کے سامنے اپنا نصیب (حصہ) ظاہر کر دے۔ وہ امام نہیں ہے۔"

حضرت یحییٰ بن معاذ فرماتے ہیں:

"کسی کو اس کے طریق سے نکال اور اس کے علم کے بغیر اس سے خطاب نہ کرنا ورنہ تو ہی تھک جائے البتہ اس کی نہر سے اس کے لیے ایک چلو دے دے اور اسی کے پیالہ سے اسے پلا۔"

ایک عالمؒ نے ایک عارفؒ سے پوچھا:

"کیا مخلوق سے وحشت ہو جاتی ہے؟"

فرمایا:

"نہیں، وحشت نہیں ہوتی۔ البتہ گاہے آدمی نفرت کرنے لگتا ہے۔"

پوچھا:

"کیا اس سے وحشت ہو جاتی ہے؟"

فرمایا:

"نہیں، اس سے وحشت نہیں ہوتی البتہ اس کی ہیبت چھا جاتی ہے۔"

اور یہ معلوم ہے کہ حضرت ابی بن کعب کی قرأت میں ہے کہ:

فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا۔ (پھر ہم ڈرے کہ ان دونوں کو عاجز کرے گا)

یعنی حقیقت علم کا نام خوف ہے۔ اب مطلب یہ ہوا کہ

فَخَافَ رَبُّكَ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا

حضرت یحییٰ بن زیاد نحویؒ نے فرمایا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ:

فَعَلِمَ رَبُّكَ۔ (پس تیرے رب نے جان لیا)

اور کہا:

اسمائے علم میں سے ایک نام خوف بھی ہے۔ (یعنی خَافَ کا معنی علم بھی ہے)۔ واللہ اعلم

خوف کا ایک دُوسرا مفہوم

اسمائے معانی سے بھی خوف ایک اسم ہے۔ چنانچہ اس کی ضد کی نفی سے اس کا وجود ہوتا ہے۔ جب انسان کا دل، دنیاوی و اخروی تمام احوال و امور کے خطرات سے مامون ہو گیا تو بھی وُہ کسی حال میں اللہ کی گرفت (مکر اللہ) سے بے خطر نہیں ہو سکتا کہ دنیا کے احکام میں تغیر آ جائے۔ قلب و نفس کی حرکات بدل کر رہ جائیں۔ شہوات میں بہ پڑے۔ عادات کی طبائع بھڑک اٹھیں اور کسی عرف و عادت میں سکون نہ ملے۔ الغرض کسی چیز میں اس کی سلامتی و برأت کی خبر قطعی طور پر نہیں دی جا سکتی۔ یہی خوف ہے اور امن کے فقدان سے بندے کو خائف کہا جاتا ہے۔ کلامِ عرب میں یہ لفظ عام طور پر مستعمل ہے۔ چنانچہ اگر خطرہ سے مامون نہ ہو تو کہا کرتے ہیں کہ:

اَخَافُ مِنْ كَذَا۔ (مجھے ایسا خوف ہے)

یا اَخَافُ اَنْ يَّكُوْنَ كَذَا۔ (مجھے ایسا ہونے کا خوف ہے)

جبکہ اسے معلوم ہو جائے کہ ایسا خطرہ آ رہا ہے۔

ایک عالمؒ سے کہا گیا:

"ایک عارفؒ ہر حال میں ڈرتا رہتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟"

فرمایا:

"اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتا ہے کہ گاہے اللہ تعالیٰ ہر حال میں گرفت کر لیتا ہے"۔

قلق و وحشت پیدا کرنے والے خوف، جلا کر رکھ دینے والے ڈر اور خوف میں اہلِ خوف کے کئی طُرق ہیں۔ البتہ یہ عام طور پر ائمہ کرام کے مقررہ طرق سے متجاوز ہیں اور بعض تو نری ہلاکت و بربادی کی وادیاں ہیں جنہیں بڑے بڑے علماء اور صوفیاء کرام سے نقل کیا گیا۔ البتہ بعض صوفیاء اور بعض زاہدین ان راہوں پر چلے اور بعض اہل معرفت انہی کے ذریعہ بامراد ہوئے مگر علماء سے ان کی فضیلت مروی نہیں اور نہ ہی اہلِ معرفت کے نزدیک یہ قابل رشک راستے ہیں۔ اس لیے کہ گاہے ایسے دشوار راستے صحیح مسالک سے ہٹا کر انسان کو وادیٔ ہلاکت میں گرا دیتے ہیں۔ اب ان میں سے بعض کی خبر و اطلاع ہونا مناسب ہے اور بعض میں صرف بربادی و ہلاکت ہی پائی جاتی ہے۔ البتہ عوام کی نظروں میں یہ راہیں بہت مشہور اور عجیب تر اور ہولناک تر ہیں۔

ان مخاوف کی تفصیل

خوف کے سات مقام

یاد رہے کہ خوف سے جائے سقوط کے سات مقامات ہیں۔ دل سے ان مقامات پر خوف کے اثرات گرتے ہیں۔ اب قلب نے جس پر خوف ڈال دیا اسے ہی تباہ کر دیا۔ ہاں البتہ جسے وہ مستثنیٰ کر دے وہ محفوظ رہے گا۔

گاہے قلب سے خوف نکل کر مرارہ (پِتے) پر گرتا ہے اور یہ جلد کی رقیق ترین صفت ہے اور یہ جلد کا داخلی حصہ ہے۔ اسے جلا دیتا ہے اور آخر انسان کو موت کے منہ میں دھکیل دیتا ہے۔ یہ وہ (اہل خوف) ہیں جو کہ غشی، صعقہ اور ابتدائی حملے میں ختم ہو جاتے ہیں اور یہ کمزور قسم کے عاملین ہیں۔

گاہے قلب سے خوف نکل کر دماغ پر جا چڑھتا ہے اور عقل کو پھونک دیتا ہے۔ اب بندہ حیران ہو کر رہ جاتا ہے اور وہ حال ختم ہو جاتا ہے اور مقام گر جاتا ہے۔

اور گاہے سحر یعنی پھیپھڑے پر خوف گرتا ہے اور اس میں سوراخ کر دیتا ہے۔ کھانا پینا ختم ہو جاتا ہے بدن کا خون خشک ہو جاتا ہے۔ یہ بات بھوکے رہنے والوں، بستر لپیٹ دینے والوں اور زرد پڑ جانیوالوں کے لیے ہوتی ہے۔

گاہے جگر میں خوف کا اثر پڑتا ہے۔ چنانچہ ہمیشہ رنگ متغیر رہتا ہے اور لمبے افکار اور مسلسل بیداری کا

تنکاز ہوجاتا ہے ۔ اس صورت میں نیند اُڑ جاتی ہے اور بیداری کا مرض لاحق ہوجاتا ہے۔ یہ افضل صورت کا خوف ہے۔ اس خوف میں علم و مشاہدہ ملتا ہے اور یہ عاملین کا خوف ہے ۔

اور گاہے (فرائص) پہلوؤں پر خوف کا اثر ہوتا ہے۔ فرائص سے مراد، کاندھوں پر کا گوشت ہے ۔ چنانچہ کاندھوں کے گوشت کو فریصۃ کہا جاتا ہے اور اس کی جمع فرائص آتی ہے ۔ اسی کے بارے میں حدیث آتی ہے کہ :

"حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو گوشت کا پہلو کا حصّہ خوب لگتا تھا"

اس لیے کہ یہ جانور کا رقیق تریں اور شیریں تر حصّہ ہوتا ہے۔ اس حصّہ میں خوف کے باعث تڑپن اور اُلٹ پلٹ حرکات پیدا ہوجاتی ہیں۔

گاہے قلب سے خوف مکمل کر عقل کو ڈھانپ لیتا ہے اور بندے کو پریشان و حیران کر دیتا ہے اور وہ حال رخصت ہوجاتا ہے اور مقام ساقط ہوجاتا ہے۔

اب اس کے بوجھ سے عقل کمزور ہوجاتی ہے اور اس کی کمزوری کے باعث بدن بھی مضطرب ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ ضعفِ صفت کے باعث انسان کھڑا نہیں رہ سکتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ حکمت و پختگی کے لیے انسانی عمارت کے اجزاء مختلف ہیں۔ مگر ایک ہی چیز کی طرح ہے اور لطیف قدرت ، اظہارِ مشیت کے ذریعہ اسے جمع رکھتی ہے۔ چنانچہ اس کے نچلے حصّے کا تعلق بالائی حصّہ سے ہے۔ جب بالائی حصّہ میں اضطراب واقع ہوتا ہے تو نچلا حصّہ بھی جھک جاتا ہے اور جب دوا یا مرض ایک عضو میں جاتی ہے تو تمام اجزائے بدن میں اس کا اثر ہوتا ہے۔ یہ گروہ زیادہ افضل ہے اور وصفِ علم میں زیادہ داخل ہے ۔

اس طریق پر اکابر علماء اور بڑے بڑے درجہ کے اہلِ قلوب گامزن ہوئے۔ تابعین میں اس طریق پر چلنے والے کثرت سے ملتے ہیں۔ مثلاً ربیعؒ بن خثیم ، اویس قرنیؒ ، زرارہ بن اوفیؒ اور ان کی طرح دوسرے کبار تابعین پائے جاتے ہیں۔ رضی اللہ عنہم اور صحابہؓ نے ان پر انکار بھی نہیں فرمایا۔

صحابہؓ کی حالتِ خوف

حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر گاہے غشی طاری ہوجاتی اور وہ اُونٹ کی طرح تڑپنے لگتے اور کھڑے کھڑے گر پڑتے۔ حضرت سعید بن حذیمؓ پر گاہے یہ حالت طاری ہوجاتی۔ یہ اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بہت ہی زاہد صحابی تھے رضی اللہ عنہ۔ اور کئی بار لشکروں کے امیر مقرر ہوئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں شام کا حاکم بنا کر بھیجا۔ ان کا زہد اور شدتِ فاقہ اس درجہ کا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں عتاب کرتے (یعنی رخصت کی تلقین فرماتے) اور انہیں کبھی ایک سو دینار اور کبھی چار سو دینار بھیجتے تاکہ وہ اپنے گھر والوں پر اسے خرچ کریں۔ مگر وہ اس رقم کو مجاہدینِ اسلام

پر تقسیم کر دیتے۔ یہ طویل واقعہ ہے۔ آخر اہلِ شام نے (حضرت عمرؓ) کی طرف ان کی حالت لکھی کہ مجلس میں ان پر گاہے غشی طاری ہو جاتی ہے۔ انہیں خطرہ ہُوا کہ شاید ان کے دماغ میں کوئی خرابی ہے مگر اہلِ شام اصل بات کو سمجھ نہ سکے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان سے ملے اور تحقیق کی تو انھوں نے اپنے مشاہدہ کا حال بتایا جو کہ صوفیاء کے وجدانی احوال میں سے ایک حال کا نام ہے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمجھ گئے اور انہیں معذور سمجھا اور اس کے بعد ان کے نزدیک ان کا درجہ بڑھ گیا اور وہ ان کا بہت احترام کرنے لگے اور ان کے شرف کا اعتراف کیا اور اہل شام کو لکھ بھیجا کہ ان کے معاملہ میں زیادتی نہ کرو اور انہیں (اپنے حال پر) چھوڑ دو۔

حضورؐ کی حالتِ خوف

قوی اعظم اور ہادیٔ اعظم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کے موقع پر غشی کی سی حالت طاری ہو جاتی۔ جب یہ حالت آتی تو مرتب شعور رہ جاتا مقام کون اُڑ جاتا۔ آپؐ کا چہرہ کا رنگ متغیر ہو جاتا اور سخت سردی کے دن میں بھی آپ پر موتیوں کی طرح پسینہ لڑھکنے لگتا۔ البتہ یہ صورت وحی کی ایک خاص صورت میں پیش آتی اور آپؐ پر آپ کی روح میں روح القدس نازل ہوتا اور آپؐ کے باطنِ قلب میں داخل ہوتا۔ اس لیے کہ وحی کی چار اقسام ہیں۔ دو قسمیں متصل ہیں یہ ان میں سے ایک ہے اور دو قسمیں جدا جدا ہیں اور ہر ایک میں سے اہلِ دل بنیاد اہلِ شہادت علماء ربانیین کو بھی آتی ہیں۔ اس کی تفصیل ایک طویل بحث ہے اور اسے صرف وہی یقینی طور پر جان سکتا ہے جو اس راہ پر چلا اور صرف وہی اس کا حقیقی مشاہدہ کر سکتا ہے جو اس حقیقت کا مزہ چکھ لے اور جو اسے تسلیم کر لے اور اس کی تصدیق کر لے۔ وہ بھی حصہ پا گیا البتہ یہ بات تین اہلِ مقاماتِ مقربین میں ہی ملتی ہے:

۱۔ مقامِ معرفت

۲۔ مقامِ محبت

۳۔ مقامِ خوف

ان چار اقسام کے بعد وحی کی دس اقسام ہیں جو ان اہلِ مقامات کے لیے ہیں۔ ان میں سے تین تو خواطر (خیالات) یا وجدان یا مشاہدہ یا حال یا مقام کا حصہ ہیں اور انواعِ وحی میں سے دو کے علاوہ یہ مکمل بیان ہے۔ البتہ دو اقسام صرف مرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مخصوص ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ فرشتہ اپنی اصلی صورت میں سامنے آئے اور آپؐ اللہ تعالیٰ کا کلام اس کی صفت کے ساتھ سنیں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وادی میں حضرت جبریل علیہ السلام کو اپنی اصلی صورت میں دیکھا اور آپؐ پر غشی طاری ہو گئی۔

حضرت حمزہؓ نے حمرانؒ بن اعین سے نقل کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۃ الحاقہ تلاوت کی،

تو آپ پر غشی طاری ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے بھی فرمایا:

وَخَرَّ مُوسٰى صَعِقًا[1] (اور گر پڑا موسیٰ بے ہوش)

گا ہے قلب سے خوف نکل کر نفس پر پڑتا ہے اور شہوات کو بھسم کر دیتا ہے، عادات کو مٹا کر رکھ دیتا ہے۔ اور طبیعت کو بجھا دیتا ہے۔ شعلۂ خواہش کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ یہ بھی مخاوف میں سے ایک ہے اور عارفین کے نزدیک یہ سب سے بلند درجہ کا خوف ہے اور اسی خوف کے حاملین حضرات اہل خوف میں افضل ترین اور بلند ترین مقام کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ انبیاء، صدیقین اور خواص شہداء کا خوف ہے اور اس سے بلند درجہ کا خوف نہیں ہوتا کہ اہل خوف اس پر رشک کریں اور عارفین اس پر خوش ہو جائیں۔ اب اگر ان اوصاف سے بھی خوف تجاوز کر گیا تو وہ حد سے نکل گیا اور مقدار سے بڑھ گیا۔ اس لیے کہ جب اس نے شہوتوں کو خاکستر کر دیا اور خواہشات کو مٹا دیا تو اب کوئی شہوت اور خواہش باقی ہی نہ رہنے دی۔ (اب کیا جلائے گا)

خوف کے درجات

اگر انسان حدودِ خوف کے تجاوز سے محفوظ نہ رہ سکے تو خوف اسے تین حالات کی طرف لے جاتا ہے۔ ان میں سے بہترین حالت یہ ہے کہ نفس کی طرف خوف سرایت کر کے اسے جلا دے اور بندے کو ہلاک کر دے۔ یہ بات اس کے لیے شہادت کا درجہ ہے۔ البتہ علوم و مشاہدات کے حامل علمائے خائفین کے نزدیک یہ قابل ستائش نہیں۔ ہاں بعض علماء کا یہ بھی قول ملتا ہے کہ شہدائے بدر اس آدمی سے زیادہ ماجور نہیں جو کہ وجد (خوف) سے مرے۔ مگر یہ یاد رکھیں کہ یہ کمزور سالکین کا وصف ہے۔ اس لیے کہ اصحابِ یقین علماء کو ہر شہادتِ یقین پر شہید کا اجر ملتا ہے۔

اور متوسط درجہ ہے کہ (خوف) دماغ کی طرف چڑھ جائے اور عقل پگھل کر عقدہ کھول دے۔ اب عقدۂ عقل کھل جانے کی وجہ سے طبیعت میں اضطراب کی کیفیت پیدا ہو جائے اور طبیعت کے اضطراب کی وجہ سے امزجہ میں اختلاط ہو جائے۔ آخر صفراء جل کر سوداء بن جائے اور سوداء کی وجہ سے وساوس آنے لگیں۔ ہذیان اور تحیر کی حالت پیدا ہو جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دماغ ٹھوس ہے اور یہ جائے عقل ہے۔ اس پر مرکب اور اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔ جب امزجہ میں اختلاط ہوتا ہے تو ان میں شعلہ پیدا ہو کر دماغ کو جلا دیتا اور پگھلا دیتا ہے۔ اب جائے عقل میں وہ اتر آتا ہے جو کہ دماغ کے مغز کی جگہ ہے اور اس کا تسلط قلبِ ظاہر کا چمکنا ساتویں آسمان کی چمک کی طرح ہے۔ یہ طلوع ہونے والے سورج کی طرح ہے کہ اس کا محل فلک علوی ہے

---

[1] اعراف آیت ۱۴۳

مگر زمین پر اس کی شعاعیں آ رہی ہیں۔ اسی طرح عقل کا محل مغز ہے اور اس کا تسلط قلب میں ہے اور اس مقام میں غصہ اور پریشانی ہے۔ علماء کے نزدیک یہ ناپسندیدہ ہے۔ مقامِ محبت میں بعض محبین پر یہ حالت طاری ہوئی تو ان پر یہ کیفیت راسخ ہوئی تو وہ حالتِ حیرانی میں رہ گئے۔ اور بعض ایسے بھی گزرے ہیں کہ ان کے قلوب سے یہ حالت دور ہوئی تو انہوں نے اسے بیان کیا۔

متقشف لوگوں اور خوراک و آرام میں شدید کمی کرنے والوں سے امام ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے:

"اپنی عقلوں کی حفاظت کرو۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ولی ناقص العقل نہیں ہوتا۔"

خوف کا تیسرا مقام یہ ہے کہ خوف اعتدال سے بڑھ جائے۔ یہ بدترین خوف ہے۔ یعنی شدید ترین اور سخت ترین خوف پیدا ہو جائے۔ امید جاتی رہے جبکہ جود و کرم اور احسان کا علمِ اخلاق سامنے نہ ہو جو کہ اس مقام میں اعتدال پیدا کرتا ہے اور جس کی وجہ سے کرب و اضطراب سے چین آتا ہے۔ خوف کی شدت اسے خدا تعالیٰ کی رحمت سے ناامید کر دے۔ اور اللہ تعالیٰ کے کرم سے مایوس بنا دے، ان پر یہ مشاہدہ دراصل معیارِ عقل کے ذریعہ بطور عدل و انصاف کے آیا۔ چنانچہ اس کے وصفِ کرم اور مخفی الطاف کے علم سے یہ (مشاہدہ) آگے بڑھ گیا اور ان لوگوں نے اپنے (کسب و اعمال) کی جانب دیکھنے سے حدود سے تجاوز کیا۔ اور (یہی دیکھا کہ) شہادتِ اسباب کا حکم پختہ ہوا۔ قوت و استطاعت میں اپنی جانوں پر نظر کی اور اپنے اوپر ہر صورت میں یقیناً سزا آتی سمجھی اور اپنے عقول و علوم (ناقصہ) کے ساتھ حاکم رحمٰن تعالیٰ پر حکم لگا دیا۔ (کہ وہ ضرور سزا دے گا اور ہرگز معاف نہ کرے گا) اور اس کی مشیت کو معاملہ نہیں سونپا اور نہ ہی اس کی قدرت کے سامنے جھک گئے۔ اور نہ ہی اس کی صفاتِ حسنہ کو دیکھ کوئی امید باندھی جو کہ ان کی تمام بُری صفات پر سایہ (عفو و کرم) کرنے والی ہیں۔ آخر کار ان کی برائیاں دوبارہ ان کے سامنے آئیں اور انہیں محسنِ اوّل سے حجاب میں ڈال دیا اور یہ نہ جان سکے کہ انہوں نے اس کے احسان سے غلطیاں کی تھیں۔ (تاکہ وہ معاف فرما دے) اور ان کی زیادتیاں اس کے علمِ ازلی میں تھیں۔ اور اس کا قلم ان کے قبضہ میں نہیں ہے جبکہ ان پر یہ معاملہ گزرا اور اس کی غالب قدرت و سلطانی جبروت نے ان سے وہی ظاہر کیا جو ان میں تھا۔ بصرہ، عبادان والوں کو اور لشکریوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام مذکورہ باتیں بالکل صحیح ہیں۔ ان کا مذہب قدریہ تھا۔ اور لطف، تفویضِ مشیت اور تقدیمِ استطاعت ان کا قول ہے۔

ان میں سے اصحابِ عمرو کو عمریہ، اصحابِ عباد کو عبادیہ، ہشام فوطی کے ماننے والوں کو فوطیہ اور ابن عطاء غزالی کے گروہ کو عطویہ کہا جاتا ہے۔

تیمیہ بھی انہی میں سے ہیں۔ انہوں نے لفظ تقدیر کا انکار کیا۔ اسی طرح منازیہ فرقہ ہے جو کہ دو پہلوؤں

ین سے درمیانی حالت میں ہیں اور ایک نمقدور ہیں۔ جوکہ تمادین میں سے ہیں اور فعل کا قول جو قائلین سے ہیں۔
یہ لوگ اسباب پر اعتماد کرنے میں مبتلا ہوئے اور ابتدائے کسب پر ہی ان کی نظر رہ گئی۔ چنانچہ یہ بات ان کیلئے تقدیر کے مالک وہاب تعالیٰ سے حجاب بن گئی۔ یہ لوگ امن سے فرار کر گئے اور قنوطیت و ناامیدی سے بڑھ کر آفت میں گر گئے۔ چنانچہ ان سے ڈر کر کبائر گناہوں میں پڑے۔

مثلاً خوارج۔ جنھوں نے ائمہ خلفاء کا انکار کیا اور تلوار لے کر ان کے خلاف بغاوت کر دی۔ ائمہ صادقین کی تکفیر اور ان کا انکار کر کے یہ شدید ترین جرم میں ملوث ہوئے۔ صغیرہ گناہوں پر امت کو کافر سمجھنے لگے۔ یہ بد ترین بدعتی اور یہ لوگ جہنمیوں کے کتے ہیں۔

اسی طرح معتزلہ فرقہ ہے۔ یہ لوگ طریقِ مرجیہ سے بھاگے جن کا مسلک یہ ہے کہ موحدین دوزخ میں نہیں جائیں گے اور موحدین پر عذاب کا فتویٰ دے دیا اور فاسقین کو دائمی دوزخی بتایا۔ چنانچہ یہ لوگ مرجیہ کی حدود بھی پھاند گئے۔ جیسے کہ مرجیہ فرقہ بھی اہل سنت کے طریق تجاوز کر گیا اور ان کے طریق سے کم رہا۔

ہمارے شیخ ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے:

"تمام اہل بدعت، سلطان (مسلمان حاکم) پر خروج کرنا جائز سمجھتے ہیں اور امت پر تلوار اٹھانا روا رکھتے ہیں اور ائمہ (خلفاء) کی تکفیر کرتے ہیں۔ مقدارِ خوف میں تجاوز میں یہ مضر ترین طریق ہے اور یہ بات حدود اللہ اور امر اللہ میں زیادتی ہے۔"

قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا۔ (اللہ نے رکھا ہے ہر چیز کا اندازہ)

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ۔ (اور جس نے زیادتی کی اللہ کی حدوں سے تو اس نے اپنے نفس پر ظلم کیا)

خوف و رجاء ہی اعتدال ہے

چنانچہ صحیح امید اور معتدل خوف ہی علمِ ربانی کی حقیقت ہے اور ایک چیز سے تجاوز کرنا دراصل اس میں کمی کرنا (ناقص رہنا) ہے اور حقیقی مومن وہی ہے جو کہ خوف و رجاء میں اعتدال قائم رکھے۔ نفس کو موت کے منہ میں دے کر ہلاک کرنے والا خوف یا عقل ہی زائل کرنے والا خوف اس قنوطیت، دراصل علم برباد کرنے والی۔ مقام سے گرانے والی اور کبائر میں ڈالنے والی چیز ہے۔

البتہ خوف کے ان دو مقامات میں نہ علم پایا جاتا ہے اور نہ ہی کشف پر مشاہدہ حاصل ہوتا ہے بلکہ یہ اصل میں قوتِ وجدان ہے کہ اس کا پتہ بلاتی ہے اور نفس کو ہلاکت میں ڈال دیتی ہے اور انسان کی عقل خراب ہو جانا دراصل خاص قسم کے مصائب و آفات زدہ لوگوں کے خوف کی طرح ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ روحانی

مقربین کی طرح مختلف مقامات میں منتقل نہیں ہوتے۔

مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ عرش کے نیچے سے روزانہ انسانی تعداد کے برابر ایک جماعت نکلتی ہے۔ انہیں اشتیاق نے بے چین کر رکھا ہے۔ اور وہ کرب میں مبتلا ہیں۔ خدائے تعالیٰ کے دیدار کے مشتاق ہوتے ہیں۔ چنانچہ انہیں اللہ کریم سبحانہٗ و تعالیٰ کے انوارات کی شعاعیں جلا کر رکھ دیتی ہیں اور چراغِ شمع کی طرح بھسم ہو جاتے ہیں۔ دوسرے روز انہی کی تعداد پر مزید آتے ہیں۔ روزِ قیامت تک یہی سلسلہ چلتا رہے گا۔ ہر فرشتہ اس قدر بڑا ہوتا ہے کہ اگر تمام آسمان اور زمینیں اس کی ایک ہتھیلی میں رکھیں تو اس کی مٹھی میں چھپ جائیں۔

ہر فرشتے کا ایک مقام ہے

میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مومنین کی طرح تمام فرشتے مقاماتِ (مختلفہ) میں منتقل نہیں ہوتے بلکہ ہر فرشتے کا ایک معلوم (مقررہ) مقام ہے وہ اس سے دُوسرے (مقام) کی طرف منتقل نہیں ہوتا۔ انہیں اس مقام سے مدد ملتی رہتی ہے۔ قیامت تک اس کی انتہا نہیں اور تمام انسانوں سے زیادہ مدد ملتی ہے۔ البتہ ان کے قویٰ ان کا خوف برداشت کر لیتے ہیں۔ خوف دلانے والے کے وصف کے مشاہدہ کے ساتھ ان کا خوف و صفات کو قایم رکھا جاتا ہے نہ انہیں زندہ در گور کرتا ہے اور نہ ہی انہیں موت کے منہ میں دھکیل دیتا ہے۔ اس لیے کہ آخری اوقات تک ان کی عمروں کی حفاظت کی جاتی ہے اور انہیں موت سے بچایا جاتا ہے اور قویٰ کے ساتھ ان کی مدد کی جاتی ہے البتہ ان میں سے بعض ایسے ہیں کہ جن کی عقل اڑ جاتی ہے اور قلب پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ بعض حیرانی میں چیختے چلاتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ جن پر گھبراہٹ طاری ہوتی ہے اور پھر وُہ دوبارہ نظر نہیں اٹھاتے۔ اور قیامت تک ان کے ہوش ہی ٹھکانے نہیں آئیں گے۔ بعض پر صعقہ (بے ہوشی) طاری ہو جاتی ہے تو صور پھونکے جانے تک بے ہوشی میں ہی رہیں گے۔ کئی ایسے ہیں کہ ملک جبّار تعالیٰ کا کلام سن کر ان پر بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے۔

حَتّٰی اِذَا فُزِّعَ عَنْ قُلُوْبِهِمْ۔ (یہاں تک کہ جب گھبراہٹ اٹھائی جائے ان کے دل سے)

حضرت جبریل، اسرافیل اور میکائیل علیہم السّلام سے جو کہ بلند مرتبہ کے ملائکہ ہیں اور قریب کے حجابات کے ملائکہ مقربین ہیں۔ ان سے ملائکۂ روحانیین پوچھتے ہیں:

مَا ذَا قَالَ رَبُّكُمْ۔ (کیا کہا تمہارے رب نے)

تو پھر اصحابِ حب و انس و اصحاب مشاہدۂ حجابات قدس تعالیٰ جواب دیتے ہیں کہ:

قَالُوا الْحَقَّ وَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ۔ (وُہ ہیں جو واجبی ہے اور وہ سب سے بزرگ و برتر)

ایسے خائفین، مخلص اہل ایمان کی طرح ہیں۔ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

أُولَٰئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُومٌ۔ (وہ جو ہیں ان کے لیے روزی ہے مقرر)

علمائے خائفین کے مقامات

اصحاب بصیرت و تمکین اور بلند پایہ علماء کی مثال ایسے ہے جیسے کہ صابرین ہوں جنہیں بغیر حساب کے اجر دیا جاتا ہے اور اصحاب یقین علماء کی شان یہ ہے کہ وہ تبقاضائے احکام (مقامات) مقامِ خوف سے اسی کی طرح کے مقامِ رجاءٗ کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ جب وہ اس مقام میں حسبِ مقتضیٰ کام کرتے ہیں تو پھر انہیں اس سے بلند تر مقامِ رجاء عطا ہوتا ہے جو اس پہلے سے بہتر ہے۔ اسی طرح ایک حالِ خوف سے بہتر حالِ خوف عطا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ مقامِ خوف سے مقامِ شوق میں اور حالِ خوف و احتراق سے مقامِ تملق و طمانیت کی طرف، حالِ فزع (پریشانی) سے مقامِ انس کی طرف، بُعد، وحشت اور ہول سے رضا و محبت و امید کی طرف بلندی حاصل کرتے رہتے ہیں۔ یہ مقامِ فضیلت ہے جو ان کے مقام سے آگاہ ہے۔ اور اسے عوم سے نہیں بڑھایا اور جو اپنے حال میں مستور ہوا اور اسی سایہ میں رہا تو وہ اپنے سے بلند و فائق تر سایہ کی جانب نہیں بڑھا اور اس سے بلند تر مقام تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔

خائف اہل ایمان کی مثال ایسے ہے جیسے کہ ملائکہ کروبیان ہوں اور اہل رجا محبین، مقرب روحانیین (ملائکہ) کی طرح ہیں۔ رجاء کی اصل اور اس کی فضیلت یہ ہے کہ علمائے ربانیین کے نزدیک عظیم رجاء وہ ہے جو عظیم خوف سے مشابہ ہو۔ چنانچہ عمارت میں اعتدال پیدا کر دے اور دو مقام کے درمیان برابری کا حکم دے۔ صفاتِ خوف کے مشاہدہ سے اگر دل پر خوف کی حالت نمودار ہو تو اس کے بعد رجاء کی کیفیت بھی ظاہر ہو جائے ہو کہ اخلاقِ لطف و کرم کا مشاہدہ کرا کر اسے چین و سکون بخشے اور اگر قلب پر وحشت چھا جائے تو اس کے بعد امید کی کرن بھی آئے۔ جو اسے سکون بخشے۔ اس طرح اعتدالِ صفات ہو جائے گا اور مقامات میں ایک مفہوم کے بعد دوسرے مفہوم کے مشاہدہ سے استداری اور ہمواری رہے گی۔ اس لیے کہ اس کی ذات تعالیٰ میں استواءِ کامل ہے۔ اب ان کے قلوب، خوف و رجاء میں ترازو کے کانٹے کی طرح اور ایسے پرندے کی طرح ہو جاتے ہیں جو دو پروں کے درمیان بالکل اعتدال سے کھڑا ہو۔ اس لیے کہ انہیں مشاہدہ وصف ہوتا ہے اور ابتلاء و انعام کے ظاہر ہونے کا تقاضا پیدا ہونے کے باعث اعتدال آجاتا ہے۔ اب خوف ہی امید پیدا کر دے گا اور خوف پر امید آجائے گی۔ اور یہ دونوں مل کر وسعت و قوتِ قلب میں روا ہوں گے۔ آخر دونوں اس میں غائب ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ یہ قوی تعالیٰ سے صاحبِ قوت ہوا۔ واسع کریم سے اسے وسعت ملی، مقتدر تعالیٰ کے باعث اسے قدرت ملی اور دو مفاہیم کے اعتبار سے عوم منفرد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ

مشاہدۂ منزہ تعالیٰ میں رہ جاتا ہے۔ آخر کار وہ اس پر اس بات کا حکم لگاتا ہے جس کے ساتھ اسے فرد بنایا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اسی قبیل سے ہے۔ فرمایا:

"تیرے سہارے پر میں بچتا ہوں۔ تیرے سہارے کہتا ہوں اور تیرے سہارے حملہ کرتا ہوں"

آپ کی یہ دعا میں آپ کی رفعتِ مشاہدہ اور پختگیٔ علم کا پتہ چلتا ہے۔ دعا کی:

اَعُوْذُ بِكَ مِنْكَ۔ (میں تجھ سے تیری پناہ مانگتا ہوں)

اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ:

اَلَا كُلُّ شَیْءٍ مَا خَلَا اللّٰهِ بَاطِلٌ"۔ (یاد رکھو، اللہ کے سوا ہر چیز فانی و باطل ہے)

دراصل یہ حالِ فنا ختم ہونے کے بعد مقامِ بقاء میں وجدان کی تعبیر ہے۔ وہیں باقی مغنی تعالیٰ کا کلام سنا۔ فرمایا:

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ۔ (جو کوئی ہے زمین پر فنا ہونے والا ہے اور رہے گا منہ تیرے رب کا)

ایک حدیث قدسی بھی اسی قبیل سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"مجھے نہ میرا آسمان اور نہ میری زمین سمائی اور مجھے میرے مومن بندے کا دل سمایا"

یعنی ایسا مومن جو شاکر، نرم اور صلح کیش بندہ ہو۔ البتہ اس اجمال کی تفصیل اور ان اشارات کی توضیح مناسب نہیں۔

علمائے سلف کا فرمان ہے کہ:

"ایک مومن کو خشوع میں سکینت سے زیادہ جمیل لباس نہیں پہنایا گیا"

اور یہ خوف کے دو حال ہیں اور یہی انبیاء علیہم السّلام اور خصوصاً اولیاء علماء کا لباس ہے۔

مومن میں خوف و رجاء

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے سے فرمایا:

"اے بیٹے! اللہ سے ایسا خوف کر کہ تو اس میں اس کی کچھ رحمت کی امید نہ رکھے اور ایسی امید رکھ کہ تو اس میں اس کی تدبیرِ دگرفت سے مامون نہ رہے)۔ پھر اس اجمال کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"ایک مومن دو دل والے کی طرح ہوتا ہے۔ ایک (دل) سے ڈرتا ہے اور دوسرے (دل) سے اُمید رکھتا ہے۔ اس لیے کہ مومن اوّل اور شاہدِ اعلیٰ دراصل وصفِ خوف والا ہوتا ہے جیسے کہ گرفت کرنا سطوت، عزت اور انتقام لینا۔ اب جب بندے کو ان صفات سے امن دینے والی چیز کا مشاہدہ ہوتا ہے تو ان کی

معرفت کے باعث اس پر خوف بھی طاری ہوجاتا ہے اور ان کے شاہد کے ساتھ اس کے لیے تجلی ہوتی ہے اور نیکی بھی اخلاق امید والی مالوف چیز ہے مثلاً کرم، رفق اور رحمت ولطف - اب جب قلب کو ان اخلاق کا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے تو ان کے مشاہدہ کے باعث اسے امید لگ جاتی ہے۔ چنانچہ خوف دلانے اور امید دلانے والے کے وصف خوف و امید دلانے کے مشاہدہ کے مفہوم سے یہ بندہ رجاء و خوف کے اوصاف کا حامل بن جاتا ہے اور دونوں والے کی طرح ہوجاتا ہے۔ گویا وہ ایک دل کے ساتھ امید باندھتا ہے اور دوسرے دل کے ساتھ خوف کھاتا ہے اور یہ دونوں مشاہدے ایک ہی دل میں واقع ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ مشاہدۂ مخوف و مرجو (خوف دلانے والے اور امید دلانے والے کے مشاہدہ) سے ایک قلب کے لیے یہ دو مقامات ہیں۔ حضرت لقمانؑ کے اس فرمان کی یہ تفسیر ہے۔ اور یہ صفت ایک صاحبِ یقین مومن کی ہے۔ البتہ خائف آدمی کی توصیف اس حال (خوف) کے ساتھ کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ اس پر مشاہدہ کے باعث یہ (حالِ خوف) غالب آچکا ہے۔

اور رجا، اس کے مقام میں داخل ہوجاتا ہے اور صاحبِ رجاء کی توصیف، اس پر حالِ (رجاء) کے غلبہ کے باعث کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ اس پر مشاہدۂ (رجاء) کا غلبہ ہے اور اس کے مقام میں خوف بھی داخل ہے اور مخوف تعالیٰ کریم کی حقیقت وکنہ نہیں (معلوم) اور نہ ہی مرجو تعالیٰ کی انتہا ہے وہ سبحانہٗ تعالیٰ اس سے بلند و بالاتر ہے۔

اور صاحبِ یقین مقرّب عالم دونوں حالوں (رجاء و خوف) کے ساتھ اعتدال رکھتے ہوئے متصف ہوتا ہے اور دونوں اوصاف کی برابر کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ پھر اس پر وصفِ کامل اور حالِ کامل کا غلبہ ہوجاتا ہے۔ جب وہ اس کی معرفت حاصل کرتا ہے تو اس میں دونوں وصف داخل ہوجاتے ہیں اور اسے صدیق کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ وہ صدق سے موصوف ومتحقق ہوا۔ اب وہ مخلص کہلانے سے بھی مستغنی ہے، (اس لیے کہ صدیق اس سے عام تر ہے) پھر عارف کہا جائے گا۔ اس لیے کہ اسے علم میں رسوخ حاصل ہوگیا۔ اب اسے صادق کہنا کافی ہے۔ پھر اسے مقرب کہا جائے گا اس لیے کہ اسے قرب کا مشاہدہ حاصل ہوگیا، اور اب وہ مقرب ہوچکا اور اسے عامل کہنے کی ضرورت نہیں اور یہ تمام اسماءِ کمال اور احوالِ تام ہیں۔ اب ان سے کم تر درجات کا ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔ اور اسے کسی وصف مثلاً اہلِ خوف یا اہلِ رجاء کے ساتھ توصیف کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ اس لیے کہ اس میں دونوں پائے جاتے ہیں اور اس وقت یہ دونوں حالتِ اعتدال میں پائے گئے ہیں کیونکہ اس پر خوف و رجاء کا فیضان ہوچکا۔ پھر یہ اس میں غوطہ زن ہوچکے۔

اب اگر تو نے کہا، عارف۔ یا کہا، صدیق۔ یا کہا، مقرب۔ تو اس میں اہلِ خوف، اہلِ رجاء اور عامل کی صفت بھی لازمی طور پر داخل ہوگئی۔ جیسے کہ جب تو یہ کہے کہ ہاشمی۔ تو اب قرشی یا عربی کہنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ

ہر ہاشمی، عربی، قریشی لازماً ہوتا ہے۔ پھر جب تو ایک کامل وصف کے ساتھ توصیف کرے تو اس میں دونوں اوصاف داخل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً

فلان حسنی ۔ (فلاں آدمی حسن کی اولاد سے ہے)

فلان حسینی ۔ (فلاں آدمی حسین کی اولاد سے ہے)

تو اب ہاشمی یا قریشی یا علوی کہنے کی ضرورت بھی نہیں ۔ چاہے وہ ہاشمی، قریشی، علوی ضرور ہے۔

اس لیے یہ معلوم ہی ہے کہ ہر حسینی، ہاشمی، قریشی، علوی بھی لازمی طور پر ہے۔ اور اگر تو کہے، عربی، یا ہاشمی کہے یا قریشی کہے یا علوی کہے تو اس سے سابقہ بات معلوم نہیں ہوتی۔ اس لیے گاہے علویا کا معنی ہے نسب میں بلند آدمی۔ اور وہ حسینی نہیں ہوتا۔

اور گاہے ہاشمی ہوتا ہے مگر علوی نہیں ہوتا اور قریشی ہوتا ہے مگر ہاشمی نہیں ہوتا اور گاہے عربی ہوتا ہے مگر قریشی نہیں ہوتا۔ اب اس پر وہی وصف لازم ہوگا جو اس کا حسب بتائے۔ اسی طرح عارف یا محب یا مقرب یا صدیق کا قول ایسا ہے کہ تمام اسباب پر حاوی مقامات میں اسم کمال ہے اور شرفِ کمال وہ ہوتا ہے جو کہ تمام انساب پر فائق ہو۔

مقام معرفت کی صحت تب ہو سکتی ہے کہ نظرِ یقین اور مشاہدہ توحید کے ساتھ (معرفت حاصل) ہو، اور مقامِ یقین میں کچھ بھی نفسانیت کی بات باقی نہ رہے اور نہ ہی مشاہدہ توحید میں کچھ بھی مخلوق کے لیے ریاکاری کا شائبہ باقی رہے۔ اب یقین کے ساتھ فنائے نفس کے بعد وہ روحانی ہوگا اور مشاہدۂ خالق کے وقت وہ ربانی ہوگا۔ اس سے توحید سبقت کر گئی۔ اس لیے کہ عارف تمام احوال میں مستغرق ہوتا ہے۔ اور وہ کسی ایک مخصوص حال سے موسوم نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی ایک مخصوص مقام سے موسوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ وہ تمام مقامات طے کر چکا ہے۔

اب اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ عارف بالمعروف ہو جو کہ فضل و شرف کے انتہائی درجہ پر ہے اور غیر ابنائے جنس میں وہ عجیب سانگ رہا ہے کہ وہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ اب اگر ان کے ہاں وہ معروف ہو یا وہ اسے پہچان لیں تو وہ عارف نہیں۔

بعض مشائخ نے عارف کی یہ توضیح کی کہ:

"وہ ہر چیز کی معرفت رکھتا ہو اور خود کسی چیز کے سامنے اپنی پہچان نہ کرائے۔"

اور ایک قول یہ ہے کہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اسے عرفان حاصل ہو اور اوصاف ربوبیت کے کسی وصف کا مقتضیٰ نہ پہچانے۔ اس لیے کہ یہ روحانی ربانی ہے اور تین مقامات بے قیاس و بے مثال ہیں۔

جس نے ان پر قیاس کیا۔ اس نے غلطی کھائی اور جس نے ان سے مماثلت کی۔ اس نے مقامِ نبوت و مقامِ معرفت اور مقامِ محبوب کا دعویٰ کیا۔ کتاب محبین میں ہم نے مقامِ محبت کی شرح کرتے ہوئے اس کی وضاحت کر دی ہے۔ یہ اہلِ خوف کے طریقے ہیں اور عارفین کے اوصاف ہیں۔ اس لیے کہ قرب واقتراب میں ان کا درجہ مختلف ہوتا ہے اور تقرب وحصولِ تقرب اور تصرف اور حصولِ معرفت میں ان کو باہمی بلند رفعت حاصل ہوتی ہے۔

چنانچہ اہل یقین شہدا ہی صدیقین میں سے مقربین ہیں اور اپنے مشاہدہ کے ساتھ قائم ہیں انہیں قرب سے اقتراب اور تقرب سے تقریب اور تصریف سے تصرف ہمہ ایلاف سے تالیف حاصل ہے۔ اس لیے کہ ان کا مقام قریب اور بلند ہوتا ہے اور قریب ترین راہ ہوتا ہے اور یہی لوگ سابقین ہیں اور انہیں ہی مقاماتِ یقین حاصل ہیں۔ قرب کا آغاز تقرب ہے اور حب کا آغاز تحبب ہے اور انہیں ہی تالف وتالیف وتعریف حاصل ہے اور یہی ابرارِ کرام ہیں۔

افضل ترین خوف

افضل ترین طریقۂ خوف یہ ہے کہ اس کا خوف نفس میں اس طرح سرایت کر جائے کہ خواہشِ نفس ختم کر دے اور شہوانی آگ بجھا کر رکھ دے۔ چنانچہ اس سے مجاہدہ کے بوجھ ختم کر دیے اور محنت ومشقت کا معاملہ ساقط کر دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کو طاعت کا مزہ حاصل ہوا۔ اس لیے کہ نافرمانی کا مزہ ختم ہو چکا ہے۔ خواہش ومخلوق کے ساتھ انتشار کے ختم ہونے پر انہیں حق کے جمعیت حاصل ہوئی۔ قلب کے مشاہدہ کے باعث نفس کو طمانیت ملا اور سکون حاصل ہوا۔ باطنی صداقت واخلاص کے باعث زہد ورضا کی نعمت نمودار ہوئی۔ پھر اس کے بعد دل میں خوف متمکن ہو گیا اور آگے نہیں بڑھا کر بعض مذکورہ مقاماتِ فیض تک بڑھتا بلکہ اس (خوف) کی وجہ سے دائمی حزن اور دائمی خشوع کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ایک ٹوٹے ہوئے دل اور غمزدہ بندے کی یہی حالت ہوتی ہے کہ جس کی دلجوئی کی جا رہی ہو اور وہ ملک جبار تعالیٰ کے سامنے ہو۔ دوسرے کا معاملہ بگڑ چکا تھا۔ مگر اس کی اصلاح فرمائی اور کشفِ یقین ایک خائف عالمِ ربانی کے لیے مزید انعام کا اور خدا تعالیٰ کے ہاں مشاہدۂ مقربین میں داخل ہونے کا سبب بن گیا۔ اب قریب تعالیٰ اس کے نزدیک موجود بن گیا اور حبیب تعالیٰ مطلوب ہو گیا۔ اس لیے کہ یہ ان لوگوں میں سے ہے کہ جن کا دل اس تعالیٰ کی خاطر ٹوٹا اور یہ اہل اللہ میں سے بن چکا۔

یاد رہے کہ خوف کی تلخی کا گھونٹ ہی ایسی چیز ہے کہ جس مخلوق کو خواہش کی شیرینی سے باز رکھا اور اس حرف شاذ ہی آنے دیتا ہے۔ چنانچہ یہ (تلخی خوف کا گھونٹ) خواہش کی حلاوت پر غالب آ کر اسے باہر نکال دیتا ہے یا محبت کی حلاوت کا غلبہ ہے اور خواہش کی حلاوت اس میں ڈوب کر رہ جاتی ہے اور وہ اسے ختم کر دیتی ہے۔ اب اگر ان دونوں میں سے ایک بھی غائب ہوئی تو یہ آدمی مذبذب حال لیے ہوئے ہے۔

مایوسی بڑا گناہ ہے

مروی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک خائف کو فرمایا جس کی عقل بھی پریشان ہو چکی تھی

اور خوف کے باعث وُہ مایوس ہو چکا تھا۔ فرمایا:

"جو تیری حالت دیکھ رہا ہُوں کس چیز نے تجھے ایسا کر دیا؟"

اس نے عرض کیا:

"میرے گناہ بہت زیادہ اور عظیم ہیں۔"

فرمایا:

"تیرا ناس ہو، اللہ کی رحمت تیرے گناہوں سے (زیادہ) اور بڑی ہے۔"

اس نے کہا:

"میرے گناہ اس قدر بڑے ہیں کہ کوئی چیز ان کا کفارہ نہیں بن سکتی۔"

فرمایا:

"اللہ کی رحمت سے تیری مایوسی تیرے گناہوں سے بھی بڑا جُرم ہے۔"

خوف کے پانچ طبقات

خوف دراصل اللہ تعالیٰ کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے۔ اس کی وجہ سے سالکین و عابدین سے ایسے ایسے کام کراتا ہے کہ رجاء وہ کام نہیں کرا سکتا۔ اس کی وجہ سے سالکین کے دل از حد زہد اختیار کرتے ہیں۔ حقیقی توبہ اور شدتِ مراقبہ (نگرانیِ نفس) بھی اسی کا کرشمہ ہے۔ گاہے ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ تمام کام اہلِ رجاء کے ساتھ محبت سے کرا لیتا ہے اور مقامِ رجاء سے کرم و حیاء پیدا ہوتا ہے اور خوف درحقیقت مقاماتِ خائفین کا ایک جامع نام ہے۔

پھر یہ پانچ طبقات پر مشتمل ہے ہر طبقہ میں تین مقامات ہیں۔ خوف کا پہلا مقام تقویٰ ہے اور یہ متقی لوگوں، صالحین اور عاملین کا مقام ہے۔

خوف کا دوسرا مقام حذر (پرہیز) ہے۔ اس مقام میں زاہد لوگ، اہل ورع اور اہل خشوع ملتے ہیں۔

تیسرا مقام خشیت کا ہے۔ اس طبقہ میں عالم، عابد اور محسنین حضرات ہوتے ہیں۔

چوتھا مقام، وجل (ڈر) کا ہے یہ اہلِ ذکر اور اہلِ معرفت کا ہے۔

پانچواں مقام، اشفاق (خوف و ڈر) کا ہے۔ یہ صدیقین کا مقام ہے اور یہی شہداء، محبین اور خواص مقربین ہیں۔ اور ان حضرات کا خوف، موصوف تعالیٰ کی خاطر معرفتِ صفات (کریم تم) سے ہوتا ہے۔ سزاؤں کے ڈر سے مشاہدۂ اکتساب سے نہیں ہوتا۔

جیسے کہ حدیث میں آتا ہے، کہ

"اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی کہ:

"اسے داؤدؑ! مجھ سے ایسے ڈرو جیسے کہ تم ضرر رساں درندے سے ڈرتے ہو"۔

اب درندے کا ڈر، اس کی گرفت وسطوت کے وصف سے ہے۔ اس کے چہرے پر رعب اور وحشت برپا ہوتی ہے۔ اس لیے ڈر نہیں ہوتا کہ انسان نے اس کا گناہ کر رکھا ہے۔ اسی طرح ان حضرات کا خوف جن کو رجاء و خوف ، سے وافر حصہ ملا۔ ان کا خوف، عوام کے تصور سے بالاتر ہے۔ ان کا حسن ظن اور رجاء کے باعث طلب وسوال کا جو مقام ہے وہی آگاہ ہیں اور ان کے سوا دوسرا آدمی اس (حسن ظن) کی کیفیت سے واقف نہیں۔ انہیں قرب کا حصہ، انس کی نعمت، ملاقات کا سرور، تملق کی فرحت، حلاوت خدمت، مناجات کی خوشی اور خلوت کا چین حاصل ہوتا ہے۔ الغرض ان کو معانی صفات کی تجلیات حاصل ہے اور محاسن اوصاف کے مفاہیم کا ظہور دیکھتے ہیں۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ[۱] (سو کسی جی کو معلوم نہیں جو چھپا دھرا ہے ان کے واسطے جو ٹھنڈک ہے آنکھوں کی)

اور اصحاب یمین کے لیے افعال کی نعمتوں کا اظہار ہوتا اور فضل وعطاء کی بارش ہوتی ہے۔

حضرت یحییٰ بن معاذؒ فرمایا کرتے تھے،

"جس نے رجاء کی بجائے خوف کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی یاد کی وہ افکار کے سمندروں میں غرق ہوا اور جس نے خوف کی بجائے رجاء کے ساتھ خدا تعالیٰ کو یاد کیا وہ (امیدوں) کے فریب میں حیران ہو کر رہ گیا اور جس نے رجاء اور خوف دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی یاد کی وہ محبت اذکار میں پختہ رہا"۔

حضرت مکحول نسفی رحمۃ اللہ علیہ کا اسی مفہوم کا فرمان ہے۔ البتہ انہوں نے حد سے تجاوز کیا۔ کہا کہ،

"جس نے خوف کے ساتھ اللہ کی عبادت کی وہ حروری (خارجی) ہے۔ اور جس نے رجاء کے ساتھ اس کی عبادت کی وہ مرجیہ میں سے ہے اور جس نے محبت کے ساتھ اس کی عبادت کی وہ زندیق ہے اور جس نے خوف ورجاء اور محبت (تینوں) کے ساتھ عبادت کی وہ موحد ہے"۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم

مقامِ زہد اور اہلِ زہد کے احوال

یہ چھٹا مقام یقین ہے

علماء ہی زاہد ہیں | اللہ تعالیٰ نے اہل زہد کو ان الفاظ مبارکہ کے ساتھ علم عطا فرمایا جب قارون کا ذکر کیا تو

---

[۱] السجدہ - آیت ۱۷

فرمایا:

فَخَرَجَ عَلٰی قَوْمِہٖ فِیْ زِیْنَتِہٖ[1] (پھر نکلا اپنی قوم کے سامنے اپنی تیاری سے)

سے لے کر

وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَکُمْ ثَوَابُ اللّٰہِ خَیْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ۔ (اور کہا جن کو ملا تھا علم، اے خرابی تمہاری، اللہ کا دیا ثواب بہتر ہے اُن کو جو یقین لائے)

چنانچہ بتایا گیا کہ یہی (علماء) ہی دنیا میں زاہد ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اُولٰٓئِکَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَھُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا۔ (یہ وہ ہیں جن کو دیا جائے گا اجر ان کا دوگنا بوجہ اس کے کہ صبر کیا انہوں نے)

تفسیر میں ہے کہ یعنی ان لوگوں نے دنیا میں زہد پر صبر کیا۔

ایک جگہ فرمایا:

وَالْمَلٰٓئِکَۃُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْھِمْ مِّنْ کُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ۔ (اور فرشتے ان پر ہر دروازے سے آتے ہیں۔ سلامتی ہے تم پر بوجہ اس کے کہ تم نے صبر کیا)

یعنی فقر پر صبر کیا۔

اللہ تعالیٰ نے ان دو آیات میں علمائے زاہدین کا وصف بیان کیا جن میں صبر کرنے کی شہادت ملتی ہے۔

فرمایا:

وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَکُمْ ثَوَابُ اللّٰہِ خَیْرٌ۔ (اور کہا انہوں نے جن کو علم دیا گیا۔ اے خرابی تمہاری، اللہ کا ثواب بہتر ہے)

اس کے بعد تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

وَلَا یُلَقّٰھَآ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ۔ (اور یہ بات انہی کے دل میں پڑتی ہے جو صبر کرنے والے ہیں)

یعنی جو لوگ دنیاوی زیب و زینت سے رک کر صبر کرتے ہیں۔ پھر ان کی مدح کرتے ہوئے دوسری توصیف فرمائی:

یُؤْتَوْنَ اَجْرَھُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا۔ (دیا جائے گا ان کو اجر دوہرا بوجہ اس کے کہ انہوں نے صبر کیا)

---

[1] القصص۔ آیت ۷۹۔

چنانچہ زاہد کو دو اجر ملے۔ اس لیے کہ اس نے فقر پر صبر کیا اور زہد بھی پایا گیا۔

فقر کا انعام

ایک خالی ہاتھ فقیر آدمی کے لیے ایک اجر اس لیے ہے کہ وہ غنی نہیں بلکہ فقیر ہے اور زہد (جاہ ہے) معدوم ہے۔ اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حدیثیں مروی ہیں۔ ایک میں آپؐ نے فرمایا:

"میری امت کے فقراء ان کے اغنیاء سے جنت میں چالیس خریف پہلے جائیں گے"۔

دوسری حدیث میں آتا ہے:

"مومن فقراء، اغنیاء سے پانچ سو برس پہلے جنت میں جائیں گے"۔

اس لیے کہ زاہد فقیر، اصلاح کرنے والے غنی سے پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل ہوں گے مگر یہ خواص فقراء ہیں اور غیر زاہد فقیر اغنیاء سے چالیس خریف پہلے جنت میں داخل ہوں گے اور یہ صرف اس کے فقر کے باعث ہے اور یہ عام فقراء کے لیے قانون ہے۔ اب ہر حالت میں اغنیاء پر (فقراء) کو افضلیت ہے اور تمام فقراء ہی جنت میں دنیا میں اہلِ غنا سے قبل ہی داخل ہوں گے اور عام اغنیاء کو قیامت کے لیے حساب کے لیے کھڑا کیا جائے اور ان سے پوچھا جائے گا کہ اس نے کہاں کہاں خرچ کیا اور کہاں کہاں سے کمایا؛

تیسری (روایت) یہ ہے کہ:

"میں نے جنت میں جھانکا تو اکثر اہل (جنت) کو (دیکھا) کہ وہ فقراء ہیں اور میں نے دوزخ میں جھانکا اور (دیکھا) کہ اکثر اہلِ (دوزخ) اغنیاء ہیں"۔

اسی مفہوم کی دوسری روایت ہے کہ:

"میں نے پوچھا: اغنیاء کون ہیں؟"

جواب دیا کہ "انہیں حد نے روک رکھا ہے"۔ یعنی (حد سے مراد) دولت نے گھیر رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زاہد فقراء کو محسنین کا نام دیا اور ان سے پرسش ہٹا دی۔ چنانچہ فرمایا:

وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يُنفِقُونَ حَرَجٌ۔ (اور نہ ان پر جن کو پیدا نہیں جو خرچ کریں۔ کوئی تکلیف)

پھر فرمایا،

مَا عَلَى الْمُحْسِنِينَ مِن سَبِيلٍ۔ (نہیں ہے نیکو کاروں پر الزام کی راہ)

پھر جس پر حجت و مطالبہ لازم تھا اس کی تصریح کر دی۔ فرمایا:

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ (راہ الزام کی ان پر ہے جو رخصت مانگتے ہیں تجھ سے

وَهُمْ اَغْنِيَآءُ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا مَعَ الْخَوَالِفِ۔ (اور مالدار ہیں، راضی ہو گئے کہ رہ جائیں ساتھ پچھلی عورتوں کے)

یعنی عورتوں کے ہمراہ رہ جائیں۔ (جو کہ جنگ سے پیچھے رہتی ہیں) اور اس معنی پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے :

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ (ہم نے بنایا جو کچھ زمین پر ہے اس کی رونق، تاکہ ہم جانچیں لوگوں کو، کون کرتا ہے ان میں اچھا کام)

کہ دنیا میں سب سے زیادہ زاہد کون ہے۔ اب احسان مقامِ زاہدین بن گیا اور یہ یقین کا وصف ہے۔ حبیب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ احسان کیا ہے؟ تو آپ نے اس طرح اس کی وضاحت کی اور فرمایا: کہ

"تو اس طرح اللہ کی عبادت کرے گویا کہ تو اسے دیکھ رہا ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ یقین کے ساتھ یعنی مشاہدہ کے ساتھ اس کی عبادت کرے۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ زہد تو دراصل اہل یقین کا حال ہے۔ اس لیے کہ اس کے یقین کا تقاضا ہی یہ (زہد) ہے۔

بعض کو یہ شبہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فقراء کی جو حالت بتائی اس سے پتہ چلا کہ اغنیاء کو فقراء پر افضلیت حاصل ہے کہ،

تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ۔ (الٹے پھرے اور ان کی آنکھوں سے بہتے ہیں آنسو، اس غم سے کہ وہ پاتے نہیں جو خرچ کریں)

حالانکہ اگر قرآن پر غور کرنے والے سامنے واضح ہے کہ یہ کلام فقراء کے حال کے کمال میں اضافہ کرتا ہے۔ اس لیے کہ وہ محسنین ہیں جیسے کہ فرمایا،

وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (اور زیادہ بھی دیں گے نیکی والوں کو)

چنانچہ خوف دور اور کوتاہی ہو جانے کے خوف سے ان پر انعام میں اضافہ ہوا۔ اس لیے کہ ان پر حق ربانی کی عظمت ہے اور اس کا انہیں مشاہدہ حاصل ہے۔ انہیں ایسا خوف ہے جیسے کہ وہ گناہگار ہوں۔ آخر اللہ تعالیٰ نے انہیں خوشخبری دی کہ وہ نیکوکار ہیں۔ فرمایا کہ:

مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ۔ (نہیں ہے نیکوکاروں پر الزام کی راہ)

اس لیے کہ خدا تعالیٰ نے ان پر نوازش فرمائی اور انہیں اہلِ احسان کے وصف میں شامل فرمایا۔

مزید برآں ان کا گریہ، دنیا نہ ملنے پر اور طلبِ غناء پر نہیں اور اللہ تعالیٰ نے دنیا سے ان کے صبر کرنے اور ان کے نزدیک دنیا کے مذموم ہونے پر ان کی مدح فرمائی۔ بلکہ ان کی حالتِ (محمودہ) یہ ہے کہ وہ خرچ کرتے

مزید فقر اور مزید انعام چاہتے ہیں۔ دولت چاہتے ہیں تاکہ اسے قبضہ سے جُدا کرکے فقر حاصل کریں۔ چنانچہ ان کا غم دراصل یہی ہے کہ انہیں کیوں کثرتِ انفاق اور (مزید) حقیقی فقر حاصل نہیں۔ فقراء کی یہ دوسری فضیلت ہے اور مال جمع کرنے اور ذخیرہ کرنے کی یہ فضیلت نہیں۔

اہل استنباط و اہل فکر کے نزدیک اس آیت سے فقراء کو جس وجہ سے افضل ترین مقام ملا۔ وہ یہ ہے کہ انہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالِ (فقر) سے مشابہت حاصل ہوئی اور اللہ اور اس کے رسولؐ نے ان کی تعریف کی۔ فرمایا:

قُلْتَ لَا اَجِدُ مَا اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ۔ (تونے کہا، میں نہیں پاتا کہ جو تم کو سواری دوں)

پھر ان لوگوں کی تعریف آپؐ کی طرح فرمائی۔ اس لیے کہ یہ لوگ آپؐ کے زیادہ سے زیادہ مماثل ہیں۔ چنانچہ فرمایا:

اَنْ لَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ۔ (کہ وہ نہیں پاتے جو خرچ کریں)

اب جو آدمی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زیادہ مشابہ ہو وہی افضل بھی ہے۔

فقر تحفۂ مومن ہے

دیکھیے، حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، کہ

"دنیا میں مومن کے لیے تحفہ فقر ہے۔"

چنانچہ مبارک تحائف میں سے فقر کو ایک تحفہ قرار دیا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ ایک خبر مشہور میں ہے کہ

"مومن آدمی پر فقر، تیز رو گھوڑے کے رخسارے پر لگام سے زیادہ حسین ہوتا ہے۔"

اور فقر تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پسندیدہ حال اور انبیاء علیہم السلام کا نشان اور بلند پایہ صحابہ و اتقیاء کرام کا طریق ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ:

"جنت میں داخل ہونے والے سب سے آخری نبی حضرت سلیمان بن داؤد (علیہم السلام) ہیں۔ اپنی سلطنت کی عظمت کے باعث اور میرے صحابہ میں سے سب سے آخری جنت میں داخل ہونے والے صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف (رضی اللہ عنہ) ہیں، دنیا میں ان کی ثروت کے باعث۔"

ایک دوسری روایت میں ہے کہ:

"میں نے انہیں (عبدالرحمٰن بن عوفؓ) کو جنت میں گھٹنوں کے بل داخل ہوتے دیکھا۔"

اور امت میں سب سے افضل دو ہی گروہ ہیں:

۱۔ مہاجرین اور اہل صفہؓ اور وہ تمام حضرات کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی فقر کے ساتھ مدح فرمائی۔ فرمایا:

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ (فقراء کے لیے جو روکے گئے اللہ کی راہ میں)

چنانچہ اعمالِ ہجرت وحصر پر فقر کو مقدم کیا اور اللہ تعالیٰ جس سے محبت کرتا ہے اس کی مدح اسی مدح کے ساتھ فرماتا ہے کہ جس کے باعث وہ اس سے محبت کرتا ہے اور جب تک محبت نہیں کرتا۔ اس کی مدح نہیں فرماتا۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا۔ (اور ہم نے انہیں پیشوا بنایا۔ راہ دکھاتے ہیں ہمارے حکم سے جب انہوں نے صبر کیا)

یعنی جب انہوں نے دنیا سے صبر کیا اور ایک حدیث میں ہے:

"علماء رسولوں کے امین ہیں جب تک کہ دُنیا میں داخل نہ ہو جائیں اور جب دنیا میں داخل ہوں گے تو اپنے دین کے (معاملہ پر) ان سے پرہیز کرو۔"

ایک روایت میں آیا:

"لا الٰہ الا اللہ ہمیشہ لوگوں پر سے خدا تعالیٰ کا غضب ہٹاتا رہے گا جب تک کہ وہ دنیاوی کمی کے (تدارک) میں نہ پڑ جائیں۔"

اور ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"جب تک کہ دنیا کے خسارہ کو اپنے دین پر ترجیح نہ دیں گے اور جب انہوں نے ایسا کیا۔ (دین پر دنیا کے خسارہ کے خطرہ کو ترجیح دی اور دین دے کر دنیا لے لی) اور کہا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہ۔ تو اللہ عزوجل فرمائے گا: تم نے جھوٹ بولا۔ تم سچے نہیں ہو۔"

اہل بیت سے ایک روایت منقول ہے:

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے ابتلاء میں ڈالتا ہے اور جب اس سے ازحد محبت کرتا ہے تو اس سے اقتناء (کا معاملہ) کرتا ہے۔ پوچھا گیا:

"اس کا اقتناء کیا ہے؟"

فرمایا: "اس کا نہ اہل چھوڑتا ہے اور نہ مال۔"

اہل کتاب کی اخبار میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک ولی کی طرف وحی فرمائی:

"بچ کر رہنا، جب میں تجھ سے ناراض ہوں گا تو تُو میری نظروں سے گر جائے گا اور میں تجھ پہ دنیا بری طرح بہا دوں گا۔"

اور کہا کرتے ہیں:

"دنیا میں زہد ہی ایسا عمل ہے جو کہ نیکیوں کے تمام اعمالِ خیر پر حاوی ہے۔"

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے منقول ہے:

"ہم نے تمام اعمال کی جانچ کی مگر آخرت کے معاملہ میں "دنیا میں زہد" سے زیادہ کوئی مؤثر ترین عمل نہیں دیکھا۔"

بعض صحابہؓ نے تابعینؒ کے پہلے گروہ کو فرمایا:

"تم لوگ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحابؓ سے زیادہ اعمال کرتے ہو، حالانکہ وہ (صحابہؓ) تم سے بہتر تھے۔"

پُوچھا گیا:

"اس کی وجہ کیا ہے؟"

فرمایا: "وہ (صحابہؓ) دنیا (کے معاملہ میں) تم سے زیادہ زاہد تھے۔"

حضرت لقمان علیہ السلام کی اپنے بیٹے کو وصیت میں ہے:

"یاد رکھو، دین کے معاملہ میں سب سے مددگار چیز، دنیا (کے معاملہ) میں زہد ہے۔"

مشائخ فرماتے ہیں:

"جس نے دنیا میں چالیس دن زہد اختیار کیا۔ اللہ تعالیٰ اس کے قلب میں حکمت کے چشمے جاری کر دے گا اور اس کی زبان پر (حکمت کی باتیں) جاری کر دے گا۔"

ایک دُوسری حدیث میں ہے:

"جب تم کسی ایسے بندے کو دیکھو کہ جس کو خاموشی اور دنیا میں زہد عطا کیا گیا ہو تو اس کا قرب حاصل کرو۔ اس لیے کہ وہ حکمت (کی باتیں) کرے گا۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا۔ (اور جس کو حکمت مل گئی تو اس کو بہت بھلائی دی گئی)

دنیا کی اور آخرت کی فکر

روایت میں ہے کہ:

"جو صبح کرے اور اس کو (سارا) فکر دنیا کا ہو تو اللہ تعالیٰ اس پر اس کا معاملہ پریشان کر دیتا ہے اور اس پر اس کی معاشی (منفعت) متفرق ہو جاتی ہے اور احتیاج اس کی نظروں کے سامنے کر دیتا ہے اور دنیا سے اسے صرف اسی قدر ملتا ہے کہ جس قدر اس کے لیے لکھا جا چکا اور جو صبح کرے اور اس کو (سارا) فکر آخرت کا ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کے فکر کو جمعیت بخشتا ہے اور اس کے مال کی حفاظت کرتا ہے۔

اور اس کے دل میں غنا (ڈال) دیتا ہے اور دنیا اس کے پاس ذلیل ہو کر آتی ہے۔"

اسی مفہوم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

مَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ۔

(جو کوئی چاہتا ہو آخرت کی کھیتی بڑھائیں ہم اس کو، اس کی کھیتی، اور جو کوئی چاہتا ہے دنیا کی کھیتی، اس کو ہم اس میں سے، اور اس کو نہیں آخرت میں کچھ حصہ)

روایت میں آتا ہے "ہم نے عرض کیا،

"اے اللہ کے رسولؐ! کون سا آدمی بہتر ہے؟"

فرمایا، "غمگین دل والا اور سچی زبان والا۔"

ہم نے عرض کیا:

"اے اللہ کے رسولؐ! محموم القلب کیا ہے؟"

فرمایا،

"پرہیزگار صاف جس میں نہ کینہ ہے اور نہ دھوکہ ہے۔ نہ حسد ہے اور نہ سرکشی ہے۔"

عرض کیا گیا،

"اے اللہ کے رسولؐ! اس راہ پر کون ہے؟"

فرمایا،

"جو دنیا سے بغض رکھتا ہے اور آخرت سے محبت رکھے۔" اور چیز کا پتہ اس کی ضد سے چلتا ہے جیسے کہ اس کے مثل سے معلوم ہوتی ہے اور شنان کی ضد محبت ہے اور زہد کی ضد رغبت ہے۔

اسی دلیل خطاب میں ہے کہ بدترین آدمی وُہ ہے کہ جو دنیا سے محبت کرے اور دنیا کا چاہنے والا اسی کا محب ہو چنانچہ اس کو حاصل کرنا اور کثرتِ دنیا کی خواہش کرنا، دنیا کی رغبت کی علامت ہے، دیکھئے یہ آتا ہے کہ "اگر تو چاہے کہ اللہ تجھ سے محبت کرے تو دنیا میں زہد اختیار کر۔" چنانچہ زہد کو اللہ تعالیٰ کی محبت کا باعث قرار دیا۔ اب زاہد آدمی اللہ تعالیٰ کا محبوب ہو گیا۔ اس لیے کہ محبت کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔

دلیلِ کلام میں یہ ہے کہ جس نے دنیا میں رغبت کی تو وہ خدا تعالیٰ کے بغض کے سامنے آگیا اور اس سے بڑی (مار) اور کچھ نہیں۔ اور دنیا سے محبت رکھنے والا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہے۔

ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے،

تمام اعمالِ خیر کو زاہدوں کے ترازو میں رکھو تو بھی ان کے زہد کا ثواب ان کے لیے زیادہ ہوگا۔"

نیز فرمایا،

"قیامت کے روز عبادت گزار، علماء کے ترازوؤں میں ہوں گے اور علماء، زاہدین کے ترازوؤں میں ہوں گے اس لیے جو آدمی دنیا کی محبت کرتا ہے اسے چاہیے کہ وُہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں ہرگز کچھ طمع نہ رکھے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ (دنیا سے) بغض رکھتا ہے۔"

دنیا مردار ہے

ایک روایت میں ہے:

"جب سے اسے پیدا کیا اس کی طرف نظر بھی نہیں کی۔ اسے فرمائے گا۔ بغیر کچھ چیز کے ٹھہری رہو۔ تو اور تیرے اہلِ (دنیا) آگ کی طرف ہیں۔"

روایت میں ہے،

"قیامت کے روز اللہ تعالیٰ، دنیا کو فرمائے گا: اس میں سے جو میرے لیے تھا وہ اس سے جدا کر دو۔ اور (باقی) تمام اس (دنیا) کو آگ میں ڈال دو۔"

اسی طرح ایک روایت میں ہے:

"دنیا ملعون ہے اور جو کچھ اس میں ہے وُہ ملعون ہے سوائے اللہ کے ذکر کے اور جو اس سے قریب کرتی ہے۔"

دُوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں، کہ

"دنیا کی مثال ابلیس کی طرح ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے بُعد و لعنت کے لیے پیدا کیا تاکہ اسے مبتلا کرے اور اس کے ساتھ ابتلاء کرے اور اسے ہلاک کرے اور اس کے ذریعہ ہلاک کرے۔"

بعض اہلِ کشف نے دُنیا کا مشاہدہ کیا تو فرمایا،

"میں نے دنیا کو ایک مردار کی صورت میں دیکھا اور ابلیس کو کتے کی صورت میں دیکھا اور وُہ اس پہ چپکا ہُوا ہے۔ اور اوپر سے ایک آواز دینے والا آواز دے رہا ہے: تو میرے کتوں میں سے ایک کتا ہے اور یہ میری مخلوق میں سے مردار ہے اور میں نے اس سے تیرا حصّہ کر دیا۔ اب جو تجھ سے کچھ بھی اس سلسلہ میں جھگڑے گا تو میں نے تجھے اس پر مسلّط کر دیا۔"

اس واقعہ سے دنیا کا درجہ (مردار) معلوم ہو گیا۔ چنانچہ جو بھی دنیا میں کچھ بھی سر مارے گا شیطان کو اس پہ اسی قدر تسلط حاصل ہو جائے گا۔

بعض اولیاء کو ایک عورت کی صورت میں دنیا کا کشف حاصل ہُوا اور دیکھا کہ مخلوق نے اس عورت کی طرف

ہاتھ پھیلا رکھے ہیں اور وہ ان کے ہاتھوں میں کچھ کچھ رکھ رہی ہے۔ راوی بتاتے ہیں کہ میں نے پوچھا:

"وہ کیا چیز تھی؟"

فرمایا: "کچھ چیز جس سے لذت حاصل کی جائے اور ایک گروہ ایسا بھی ہے جو اس کے پاس سے ہاتھ بند کیے گزر رہا ہے۔ وہ انہیں کچھ بھی نہیں دیتی۔"

ایک بزرگ نے دنیا کو ادھیڑ عمر کی ایک بدشکل گنگناہٹ کرنے والی بڑھیا کی صورت میں دیکھا۔ جس پر طرح طرح کے رنگ اور طرح طرح کی آرائش تھی۔ فرمایا کہ میں نے کہا:

"میں تجھ سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔"

وہ کہنے لگی:

"اگر تو چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے مجھ سے پناہ دے تو درہم (روپیہ پیسہ) سے بغض رکھ۔"

اسی طرح حدیث میں آیا:

"جب سے دنیا کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا۔ یہ آسمان اور زمین کے درمیان پڑی ہے۔ اس کی طرف نظر بھی نہیں کرتا۔ قیامت کے روز یہ کہے گی: اے پروردگار، آج کے روز مجھے اپنے کم درجہ کے ولی کے لیے مجھے حصہ بنا دے۔ (اللہ تعالیٰ) فرمائے گا: کچھ نہ چیز کے ساتھ خاموش رہو۔ میں دنیا میں ان کے لیے تجھے (دینے پر) راضی نہ ہوا۔ اب آج کے روز ان کے لیے تجھے (دینے پر) راضی ہوں گا؟"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"دنیا کمینی چیز ہے اور اس سے کمینہ تر دل وہ ہے جو اس سے محبت کرے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے مروی ہے:

"دنیا مردار ہے۔ جس نے اس کو چاہا اسے چاہیے کہ وہ کتوں کی مزاحمت پر صبر کرے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اخبار میں ہے:

"جس طرح تو ایک دولت مند کو ملتا ہے اگر تو اس طرح فقیر کو نہ ملا تو تجھے جو علم دیا گیا اسے مٹی کے نیچے ڈال دے۔ جب تو ایک فقیر کو آتا دیکھے تو یوں کہہ:

مرحبا لشعار الصالحین۔ (خوش آمدید، صالحین کی علامت لیے ہو)

اور جب دولت مند کو آتا دیکھے تو کہہ:

ذنب عجلت عقوبتہ"۔ (کوئی گناہ ہے جس کی ابھی سزا آگئی)

ہمارے امام ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

اخبارِ داؤد علیہ السلام کے سلسلہ میں ہمارے ایک شیخ نے بتایا:

"میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی خاطر پیدا کیا اور آدم علیہ السلام کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خاطر پیدا کیا اور تمام مخلوق کو اولادِ آدم کے لیے پیدا کیا۔ اب ان میں سے جو اس میں منہمک ہو کر رہ گیا، جس کو میں نے اس کے لیے پیدا کیا تھا تو میں نے اسے (اس پر) اپنے سے حجاب بنا دیا۔ (مخلوق میں کھونا خود اسے حجاب بن گیا) اور جو ان سے الگ رہ کر میری (یاد) میں مشغول ہُوا تو میں نے جس کو اس کے لیے پیدا کیا تھا اسے اس کی طرف چلا کر لے جاؤں گا۔" (مخلوق خود اس کے پاس آئے گی)

اور فرمایا کرتے،

صدیقین نے آغاز میں اللہ تعالیٰ سے دنیا طلب کی مگر اس نے ان سے اسے روک دیا۔ جب وُہ اپنے احوال میں پختہ ہو گئے تو ان پر (دنیا) پیش کی مگر وہ خود ہی اس سے رُک گئے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا کو فرمایا کرتے:

"اے خنزیرہ! مجھ سے دُور ہو جا۔"

حضرت یزید بن میسرہ سے یہ قول مروی ہے اور یہ علمائے شام میں سے تھے۔ فرمایا:

"ہمارے شیوخ دنیا کو خنزیرہ کا نام دیا کرتے اور اگر انہیں اس سے بدتر نام مل جاتا تو وہی نام دھرتے۔"

راوی بتاتے ہیں کہ جب کسی آدمی پر دنیا آتی تو وُہ اسے فرماتا:

"اے خنزیرہ! ہم سے دُور ہو جا۔ ہمیں تیری ضرورت نہیں۔ ہم نے اپنے اللہ عزوجل کی معرفت حاصل کرلی۔"

مطلب یہ ہے کہ ہم نے جان لیا کہ تیرے ساتھ ابتلاء آتا ہے تاکہ وہ دیکھے کہ ہم تیرے معاملہ میں زہد اختیار کر کے کیسا رویّہ اختیار کرتے ہیں اور خدا تعالیٰ کو دنیا پر ترجیح دیتے ہیں یا نہیں؟ ہم نے یہ بھی جان لیا کہ وُہ تجھ پر غضبناک ہے۔ چنانچہ ہم نے اللہ کی موافقت کرلی۔ ہمارے قلوب اللہ کے لیے بن گئے اور اس کے سوا ہر چیز سے اعراض کر لیا۔ حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ہمارے شیوخ میں سے کسی پر اگر حلال مال پیش کیا جاتا اور کہا جاتا کہ اسے لے کر اس سے غنا حاصل کرو تو وُہ فرماتے:

"مجھے اس کی کچھ ضرورت نہیں۔ مجھے خطرہ ہے کہ یہ میرے دل میں ہی بگاڑ پیدا نہ کر دے۔" ان کا قلب صالح ہوتا ہے اور وہ اس کی رعایت کرتے ہیں اور اس کے تغیر کا خطرہ محسوس کرتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس طرح مروی ہے کہ: ایک بار آپؐ کھجلی زدہ مرے ہُوئے بکری کے بچے کے پاس سے گزرے۔ آپؐ نے فرمایا:

"کیا تم سمجھتے ہو کہ یہ اس کے مالکوں کے نزدیک گرا ہُوا تھا؟"
ہم نے عرض کیا:
"اے اللہ کے رسولؐ! اس کی ذلّت کے باعث ہی اسے گرا دیا۔"
فرمایا:
"یہ دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ ذلیل ہے۔"
دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:
"تم میں سے کون یہ چاہتا ہے کہ اسے یہ (بھیڑ مردہ) ایک درہم میں مل جائے؟"
ہم نے عرض کیا:
"ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں اور آخر یہ کس چیز کے برابر ہو سکتا ہے؟"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جس قدر یہ تمہارے نزدیک (قابلِ نفرت) ہے یہ دنیا اللہ تعالیٰ کے سامنے اس سے بھی ذلیل تر ہے۔"
اسی طرح آپؐ نے اس کے از حد ناقص اور بے قیمت ہونے کی خبر دی اور فرمایا:
"اگر یہ دنیا اللہ تعالیٰ کے لیے نزدیک مچھر کے پَر کے برابر بھی وقعت رکھتی تو کافر کو اس میں سے پانی کا ایک گھونٹ بھی نہ پلایا جاتا۔"
دُنیا کی بدبُو و بگاڑ کے لیے یہ ایک مثال ہے کہ ایک اعرابی سے فرمایا:
"تم نے دیکھا ہے کہ تم لوگ کیا کھاتے اور پیتے ہو! کیا تم پاخانہ و پیشاب نہیں کرتے؟"
اس نے کہا: "ہاں۔"
فرمایا: "پھر یہ کیا چیز بن جاتی ہے؟"
اُس نے عرض کیا: "اے اللہ کے رسولؐ! جو بنتا ہے وُہ آپؐ جانتے ہی ہیں۔"
آپؐ نے فرمایا:
"کیا ایسا نہیں کہ تم میں سے کوئی آدمی جب اپنے مکان کے پچھواڑے میں بیٹھتا ہے اور اس (پاخانہ) کی بدبُو کے باعث اپنے ناک پر اپنا ہاتھ رکھ لیتا ہے؟"
اس نے عرض کیا: "ہاں!"
فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے دنیا کی مثال بتا دی جو کہ ابن آدم سے نکلتا ہے۔"
اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ۔ (اور تمہاری اپنی جانوں میں، کیا پس نہیں دیکھتے)

اس کی تاویل میں ہے کہ پاخانہ وپیشاب کے مقامات ۔ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا فِی الۡاٰخِرَۃِ اِلَّا مَتَاعٌ ۔ (اور دنیا کی زندگی کچھ نہیں آخرت کے حساب میں مگر تھوڑا برتنا)

اس کی تاویل میں بعض اہلِ زبان نے بتایا کہ مَتَاعٌ سے مراد مردار ہے ۔

میں نے اصمعیؒ سے سُنا کہ بعض عرب کا قول ہے ۔ وُہ کہا کرتے ہیں کہ مَتَعَ اللَّحۡمُ یعنی گوشت متعفن اور بدبودار ہو گیا ۔

ضرورت کے مطابق دُنیا لو

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے،

"حضرت آدم علیہ السلام کو جب دنیا میں اتارا گیا تو سب سے پہلا کام جو اُنہوں نے کیا وہ یہ تھا کہ انہیں حدث لاحق ہوا۔" (ہوا خارج ہوئی)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے ۔ فرمایا:

"انہوں (آدمؑ) نے نکلنے والی چیز کو دیکھا تو اس کی بدبُو سے انہیں تکلیف ہُوئی اور اس سے انہیں غم ہوا۔" حضرت جبریل علیہ السلام نے فرمایا:

"یہ تمہاری خطا کی بدبُو ہے۔"

عقلا کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے دنیا کا مشاہدہ پاخانہ کی جگہ کی صورت میں ہُوا۔ اس لیے وُہ ضرورت کے سوا حالت میں اس میں نہیں گھسے ۔ اور جس قدر بھی آپ پاخانہ گاہ سے بے نیاز رہیں وہی اچھا ہے اور بعض کو مردار کی صورت میں دنیا کا مشاہدہ ہُوا۔ اس لیے انہوں نے صرف اس قدر حصہ لیا جو ان کی جان بچانے کے لیے ضروری تھا اور مردار جس قدر کم ہو۔ اچھا ہے ۔

حضرت وہب بن منبہؒ نے فرمایا کہ میں نے بعض کتب میں پڑھا:

"اے ابن آدمؑ ۔ اگر تو مجھے چاہتا ہے تو دنیا چھوڑ دے ۔ اگر تو دنیا چاہتا ہے تو تیری مشقت طویل ہو گئی ۔"

بعض کتبِ سماوی میں ہے:

"اے ابن آدم میں تیری لازمی (ضرورت ہوں جس کے بغیر) چارہ نہیں ۔ اس لیے مجھ پر کسی چیز کو ترجیح نہ دو ۔ (اس لیے کہ میں وُہ ذات ہوں) کہ جس کے بغیر چارہ نہیں۔"

بعض اہل القاء فرماتے ہیں؛

"اللہ تعالیٰ نے دنیا کی طرف وحی کی کہ جس نے میری عبادت کی تو اس کی خادم ہو جا اور جس نے تیری خدمت کی تو اسے تھکا دے۔"

ایک اور بزرگ فرماتے ہیں کہ یہ با سند روایت ہے:

"اللہ تعالیٰ نے دنیا کی طرف وحی فرمائی کہ میرے اولیاء کے لیے کڑوی بن جا حتیٰ کہ ان کی رغبت اسی میں رہ جائے جو میرے پاس ہے اور میرے دشمنوں کے لیے شیریں ہو جا حتیٰ کہ وہ میری ملاقات ناپسند کریں۔"

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث میں ہے:

"جس نے اللہ کی ملاقات پسند کی اللہ نے اس کی ملاقات پسند کی اور جس نے اللہ کی ملاقات ناپسند کی اللہ نے اس کی ملاقات ناپسند کی۔"

یہ تمام روایات اہل دنیا کی پشت توڑ دینے والی ہیں۔ اس کے برعکس زہد فقر کا شرف ایسی چیز ہے جو سچے فقراء کی سربلندی کا باعث ہے۔ اللہ کے صالح و زاہد بندوں کے لیے راحتِ چشم ہے۔ فرمایا:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ (سو کسی جی کو معلوم نہیں جو چھپا دھرا ہے ان کے واسطے جو ٹھنڈک ہے آنکھوں کی، بدلہ اس کا جو کرتے تھے)

اور ضعفِ یقین ہی دنیاوی خواہش کی اصل جڑ ہے۔ اس لیے کہ اگر بندے کا یقین قوی ہو تو اس کے نور سے وہ آخرت (کے انعامات) پر نظر رکھے گا اور دنیائے (عاجل) اس کے سامنے سے غائب ہو جائے گی۔ چنانچہ غائب (دنیا) میں زہد اختیار کرے گا اور حاضر (آخرت) کو پسند کرے گا اور دنیا پر آخرت ہمیشہ باقی رہنے والی، زیادہ نافع اور اپنے مولائے کریم کو راضی کرنے والی چیز کو ترجیح دے گا۔ فانی اور ختم ہونیوالی چیز کو دائمی اور متصل چیز کی طرف بڑھائے گا۔ یہی صورتِ زہد اور شہادتِ اہلِ یقین ہے اور حاضر آدمی غائب ہونے اور منتقل ہونے والی سے پیار نہیں رکھتا۔ دیکھیے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی توصیف فرمائی؛

وَلِيَكُونَ مِنَ الْمُوقِنِينَ۔ (اور تاکہ اس کو یقین آئے)

قَالَ لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ۔ (بولا مجھ کو خوش نہیں آتے چھپ جانے والے)

اور اہلِ یقین کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کے اتباع کا حکم دیا گیا۔ فرمایا:

مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ۔ (ملت تمہارے باپ ابراہیم کی)

یعنی تم پر اپنے باپ ابراہیمؑ کی ملت کا اتباع لازم ہے اور تم اس کی ملت کا اتباع کرو۔ آخرت کے وعدہ وعید پر صرف نور عقل ہے۔ شہادت نہیں ملتی بلکہ یہ شہادت نورِ یقین سے ہی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ:

انوار چار ہیں اور اس (نور) کو قلب چار سمتوں کی طرف موڑتا ہے، ملک[1] اور ملکوت[2] کی طرف۔ عزت[3] اور جبروت کی طرف۔ چنانچہ نورِ عقل سے مشاہدۂ ملک ہوتا ہے اور نورِ ایمان سے مشاہدۂ ملکوت یعنی آخرت (کا مشاہدہ) ہوتا ہے اور نورِ یقین سے مشاہدۂ عزت یعنی صفات (کا مشاہدہ) ہوتا ہے اور نورِ معرفت کے ساتھ مشاہدۂ جبروت یعنی وحدانیت کا (مشاہدہ) ہوتا ہے اور جبار تعالیٰ، دل کے اوپر، اسے محیط ہے جو چاہتا ہے اسے مکاشفہ کراتا ہے۔ چنانچہ جو اسے مشاہدہ کراتا ہے وجد اس پر غالب آجاتا ہے اور لگا ہے ہر چیز میں صنعتِ یقین داخل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ ہر عمل میں قوتِ یقین کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ دنیا ہے اور اس کی طرف نورِ عقل سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ اب جس کو نورِ یقین نہ ملا اس نے مُلکِ کبیر کو نہیں دیکھا۔ اب اس کی خواہش مُلکِ صغیر ہوئی۔ چنانچہ اس نے لاَ شَیْءٍ (معدوم) چیز سے محبت رکھی اور اس کا عزم بلندی کی طرف نہ رہا اور نہ ہی اس کے پاس بلند چیز ہے۔

زہد کی حقیقت کیا ہے؟

سات چیزیں دُنیا ہیں

جب تک انسان کو یہ معلوم نہ ہو جائے کہ دُنیا کیا چیز ہے۔ اس وقت تک وہ زہد کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔ زہد کی تعریف کرتے ہوئے لوگوں کے کثرت سے مختلف اقوال ملتے ہیں اور جب اللہ تعالےٰ نے ہی زہد کی حقیقت بیان فرمادی تو اب لوگوں کے اقوال ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی شافی کافی کتاب میں اس کا ذکر وضاحت سے کر دیا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"یہ مضبوط رسی اور سیدھی راہ ہے۔ جس نے اس کے بغیر ہدایت تلاش کی اس کو اللہ گمراہ کر دے گا۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ۔ (اور جس بات میں جھگڑے ہو تم لوگ کوئی چیز ہو اس کا حکم اللہ کی طرف ہے)

اور فرمایا:

فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ۔ (سو ہدایت دی اللہ نے ان کو جو ایمان لائے، جس میں انہوں نے اختلاف کیا، سچی بات کی اپنے حکم سے)

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بتایا کہ سات اشیاء دنیا ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ۔

(زینت دی گئی لوگوں کے لیے مزوں کی محبت عورتوں، بیٹوں اور ڈھیر جوڑے ہوئے سونے کے اور روپوں کی اور گھوڑوں پلے ہوؤں کی اور مویشیوں اور کھیتی کی)

پھر آخر میں فرمایا:

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ (یہ فائدہ ہے دنیا کی زندگی کا)

اور شہوات کی محبت کو زینت کرنے سے تعبیر کیا۔ پھر سات اوصاف کا ذکر چلایا کر ان سے محبت (دنیا) ہے پھر ذٰلِكَ کہہ کر ان کی طرف اشارہ کیا۔ چنانچہ یہ کاف کی جانب اشارہ ہے اور کاف دراصل مقدم مذکور کا کنایہ ہے۔ ذَا اور كَ کے درمیان تاکید و تمکین کے لیے لام آیا۔ چنانچہ خطاب پر غور کرنے سے معلوم ہوا کہ یہی سات چیز ساری دنیا ہیں اور یہ دنیا، انہی سات اوصاف کا نام ہے اور شہوات جیسی فروع دراصل انہی سات اصل کی طرف جاتی ہیں اب جس نے ان تمام (سات اشیاء) کے ساتھ محبت رکھی اس نے ساری دنیا کے ساتھ ازحد محبت رکھی۔ اور جس نے ان میں سے ایک اصل یا اصل کی ایک فرع کے ساتھ محبت رکھی۔ اس نے بعض دنیا کے ساتھ محبت رکھی۔ الغرض نفس کلام سے معلوم ہوگیا کہ شہوت، دنیا ہے۔

ضرورت اور دنیا میں فرق ہے

اس دلیل سے ہم یہ بھی سمجھ گئے کہ ضروریات و حاجات دنیا نہیں ہے۔ اس لیے کہ ضروریات واقع ہوا کرتی ہیں۔ اور جب حاجت، دنیا نہ ہوئی تو معلوم ہوگیا کہ اس کا نام شہوت بھی نہیں ہوگا۔ چاہے گا ہے شہوت آیا کرتی ہے۔ کیونکہ شہوت دنیا ہے، اور اسماء کا اختلاف اس وجہ سے ہے تاکہ ان پر احکام نافذ کیے جائیں۔

اسرائیلیات میں ایک روایت اللہ تعالیٰ سے مروی ہے کہ

"حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ضرورت پڑی تو وہ ایک دوست کے پاس قرض لینے گئے مگر اس نے انہیں قرض نہ دیا۔ چنانچہ غمگین حالت میں واپس آئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی:

"اگر تو اپنے خلیل تعالیٰ سے مانگتا تو وہ تجھے ضرور عطا کرتا۔"

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا:

"اے پروردگار تعالیٰ! میں نے دنیا کے لیے تیری ناراضگی کو جان لیا تھا۔ اس لیے ڈرا کہ میں اس (دنیا) کی کوئی چیز، تجھ سے مانگوں اور تو مجھ پر ناراض ہو جائے۔"

اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی کہ،

"حاجت دنیا میں سے نہیں ہے۔"

پھر ہم نے سن لیا کہ ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ان سات اوصاف کو پانچ مفاہیم تک بیان فرمایا،

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّ لَھْوٌ وَّ زِیْنَۃٌ وَّ تَفَاخُرٌۢ بَیْنَکُمْ وَ تَکَاثُرٌ۔ (جان رکھو کہ دنیا کا یہی ہے کھیل اور تماشا اور بناؤ اور بڑائیاں کرنی آپس میں اور کثرت ڈھونڈنی)

یہ پانچ ہیں جس نے ان سات سے محبت کی۔ اس کا یہ وصف ہے۔ پھر پانچ کو دو معنی میں مختصر کر کے بیان کیا جو کہ سات کو جامع ہیں۔ فرمایا،

اِنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَھْوٌ وَّ لَعِبٌ۔ (دنیا کا یہی ہے کھیل اور تماشا)

پھر ان دو کو ایک میں بند کر دیا اور اس کو دو معنوں سے تعبیر کیا۔ یہ دونوں معنوں پر حاوی ہے اور ان دو میں سے ہر معنی کو دنیا کہنا صحیح ہے۔

دُنیا کو ترجیح نہ دینا زہد ہے

چنانچہ جس وصفِ واحد میں دونوں مفاہیم یعنی لعب اور لہو داخل کر دیا۔ وہ وصف ہویٰ کا ہے۔ اس لفظ میں ساتوں باتیں داخل ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

وَ نَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی۔ (اور روکا جی کو خواہش سے، سو بہشت ہی ہے ٹھکانہ)

اب دنیا کا مطلب یہ ہوا کہ

"ہویٰ (خواہش) کی خاطر نفس کی اطاعت کرنا۔"

دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

فَاَمَّا مَنْ طَغٰی وَ اٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی۔ (سو جس نے شرارت کی اور بہتر سمجھا دنیا کا جینا، سو دوزخ ہی ٹھکانہ)

اب جب جحیم (دوزخ) کی ضد جنت ہے تو ہویٰ (خواہش) ہی دنیا ہوئی۔ اس لیے کہ اس کی مخالفت اس کو ترجیح دینے کی ضد ہے اور جس نے نفس کو ہویٰ سے روک لیا اس نے دنیا کو ترجیح نہیں دی اور جب دنیا کو ترجیح نہیں دی تو یہی زہد ہوا اور اس کے لیے جنت ہے جو کہ جحیم (دوزخ) کی ضد ہے اور دوزخ اس کے لیے ہے جس نے دنیا کو ترجیح دے کر نفس کو ہویٰ (خواہش) سے نہیں روکا۔ اب ہر معاملہ میں طاعتِ ہویٰ اور ہویٰ کو ترجیح دینے کا نام دنیا ہوا اور اب ہر معاملہ میں ہویٰ کی مخالفت کرنے کا نام زہد ہونا چاہیے۔

دوسرا مفہوم جو اس وصفِ ہوئی سے معلوم ہوتا ہے اور اسے بھی دنیا قرار دیا۔ وُہ یہ ہے کہ نفسانی فائدہ حاصل کرنے کے لیے باقی اور زندہ رہنے کی خواہش۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ قَالُوْا رَبَّنَا لِمَ کَتَبْتَ عَلَیْنَا الْقِتَالَ لَوْ لَآ اَخَّرْتَنَا اِلٰی اَجَلٍ قَرِیْبٍ۔ (اور کہنے لگے اے رب ہمارے کیوں فرض کی ہم پر لڑائی۔ کیوں نہ جینے دیا ہم کو تھوڑی سی عمر)

چنانچہ قتال کا مطلب ہُوا۔ دنیاوی زندگی سے جدائی۔ اس لیے کہ قتال میں تلوار تلوار سے ٹکراتی ہے۔ اور تلواروں کے درمیان موت کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ کہنے لگے، تو نے ہمیں آخری وقت یعنی ہماری اموات کے وقت تک کیوں نہ رہنے دیا۔ اور قتل کا معاملہ کیوں سامنے کر دیا۔ یہی باقی رہنے کی محبّت ہے۔ چنانچہ حبِ بقاء کو دنیا بتایا۔ چنانچہ فرمایا:

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ وَ الْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰی۔ (تو کہہ، فائدہ دنیا کا تھوڑا ہے اور آخرت کا بہتر ہے پرہیزگار کو)

اس وقت لوگ کھل کر سامنے آگئے۔ جہاد فرض ہونے کی صورت میں منافقین ذلیل ہُوئے اور مومنین کی آزمائش ہوگئی اور اہلِ محبت ظاہر ہو گئے۔ یعنی

اَلَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا کَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ۔ (جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں قطار باندھ کر جیسے وہ دیوار سیسہ پلائی ہُوئی)

اور اس موقع پر جن لوگوں نے اپنی جانیں اور اموال پیش کر دیے۔ انہوں نے نفع حاصل کیا اور جو لوگ آخرت کے عوض دنیا خریدنے لگے وہ خسارہ اٹھا گئے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (بے شک اللہ نے ایمان والوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے کہ ان کے لیے جنّت ہے)

یعنی جب اللہ نے ان کے (جان و مال) خریدے، انہوں نے فوراً بیچ دیے۔ اور خسارہ پانے والے خریداروں کے بارے میں فرمایا:

اِشْتَرَوُا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَةِ۔ (انہوں آخرت کے عوض دنیا کی زندگی خریدی)

یعنی مختصر اور فانی زندگی کی خواہش کی اور اسے خرید لیا اور اخروی زندگی کو فروخت کر دیا۔

دو قسم کی تجارت

اب جس نے تیس یا چالیس برس خرید کر کے لاکھوں کروڑوں بلکہ ابدالآباد اور دائمی زندگی فروخت کر دی۔ اس کی تجارت نے نفع نہیں دیا اور نہ ہی وُہ راہ یاب ہُوا۔ یہ

خسارہ کی تجارت اس آدمی کے لیے ہے جس نے حیاتِ دنیا میں رغبت دکھا کر دائمی زندگی کے عوض فانی زندگی خریدی اب وہ بہتر و بلند زندگی بیچ کر گھٹیا زندگی خرید رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اِشْتَرَوُا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا۔ (خریدا انہوں نے دنیا کی زندگی کو)

یعنی انہوں نے بلند ترین زندگی کو فروخت کر دیا۔ اب پہلا گروہ ہے جس نے زندگی فروخت کی اور اپنا سارا مال بانٹ دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ خرید کر دارِ جنت عطا کیا اور اپنے پڑوس میں ٹھہرایا۔ ان کی تجارت نفع مند ہوئی اور وہ راہ یاب ہوا۔ جبکہ اس نے بیس تیس سال کی زندگی فروخت کر کے دائمی زندگی خرید لی۔ دنیا میں زہد کرنے والے اور آخرت خریدنے والے تجار کے نفع کا یہ منظر ہے اور خواہش میں ڈوب کر دنیا چاہنے والے تاجروں کا وہ خسارہ ہے۔

اب دونوں تجارتوں میں کس قدر فرق ہے؟ موت کے بعد اہل زہد کے نفع کے معاملہ میں کوتاہی کرنے والوں کو کس شدت کی حسرت ہو گی۔ اس کا اندازہ بھی ناممکن ہے۔

باقی زندگی چاہنے اور دنیا میں اظہارِ زہد کے اعتبار سے عام لوگ مخفی ہیں۔ آخر یہ آیت نازل ہوئی۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ (اے وُہ جو ایمان لائے تم وہ کیوں کہتے ہو جو نہیں کرتے)

اور یہ آیت نازل ہوئی کہ:

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ قِیْلَ لَهُمْ كُفُّوْۤا اَیْدِیَكُمْ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْیَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْیَةً۔ (کیا تم نے نہ دیکھے وُہ لوگ جن کو حکم ہوا تھا کہ اپنے ہاتھ بند رکھو اور قائم کرو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ، پھر جب حکم ہوا ان پر لڑائی کا، اس وقت ایک جماعت ڈرنے لگی لوگوں سے جیسے ڈر ہو اللہ کا یا اس سے زیادہ ڈر)

انہوں نے کہا تھا کہ ہم اپنے رب سے محبت کرتے ہیں۔ اور اگر ہمیں معلوم ہو گا کہ کس بات میں خدا کی محبت ہے تو ہم وہ کام کریں گے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا۔ (بڑی بیزاری ہے اللہ کے ہاں کہ کہو وہ چیز جو نہ کرو۔ بیشک اللہ چاہتا ہے ان کو جو لڑتے ہیں اس کی راہ میں قطار باندھ کر)

یہی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"ہم نہیں سمجھتے تھے کہ ہم میں بھی دُنیا چاہنے والا آدمی ہو گا۔ آخر یہ آیت نازل ہوئی:

مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الدُّنۡيَا وَ مِنۡكُمۡ مَّنۡ يُّرِيۡدُ الۡاٰخِرَةَ ۔ (بعض تم میں سے وُہ ہیں جو دنیا چاہتے ہیں اور بعض تم میں سے وُہ ہیں جو آخرت چاہتے ہیں)

اور جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اس طرح فرمایا۔ آیت یہ تھی :

وَ لَوۡ اَنَّا كَتَبۡنَا عَلَيۡهِمۡ اَنِ اقۡتُلُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ اَوِ اخۡرُجُوۡا مِنۡ دِيَارِكُمۡ مَّا فَعَلُوۡهُ اِلَّا قَلِيۡلٌ مِّنۡهُمۡ ۔ (اور اگر ہم ان پر حکم کرتے کہ ہلاک کر اپنی جان ، یا چھوڑ نکلو اپنے گھر، تو کوئی نہ کرتے ، مگر تھوڑے ان میں)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے فرمایا کہ :

" مجھے یہ بتایا گیا کہ تو ان میں سے ہے۔" یعنی ان قلیل میں سے ہے جو (اللہ کا حکم فوراً) بجا لائیں گے۔ اب حبِ حبّ بقاء ہی دنیا ہوئی تو باقی (اخروی) ، زندگی کے بقاء کی محبت ہی زہد ہوا۔ اس طرح دنیا میں زہد دراصل بقاء (دنیاوی زندگی) میں زہد بن گیا۔ اور جس نے نفس کے ساتھ جہاد کر کے اور اللہ کی راہ میں مال خرچ کر کے جان و مال میں زہد اختیار کیا اسی نے دنیا میں زہد اختیار کیا اور جس نے دنیا میں زہد اختیار کیا۔ اللہ تعالےٰ اس سے محبت کرے گا۔ جیسے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : اور اس وجہ سے جہاد کرنا تمام اعمال سے افضل تر عمل ہے۔ اس لیے کہ یہ (جہاد) دنیا میں زہد سے عبارت ہے اور اللہ تعالیٰ دنیا میں زاہدین سے ہی محبت کرتا ہے۔

افضل جہاد مخالفتِ ہوئی ہے

خواہشات کی مخالفت ہی افضل ترین جہاد ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں رغبت کی اصل جڑ یہی خواہشات ہیں۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی حدیث میں زہد فی الدنیا سے یہی تعبیر کی۔ فرمایا ،

" دنیا میں زہد اختیار کرو۔ اللہ تعالیٰ تم سے محبت کرے گا۔"

پھر اسی مفہوم کی دوسری حدیث میں فرمایا ،

" محارم سے بچو ، اللہ تعالیٰ تجھ سے محبت کرے گا۔"

اور حرام کاموں سے بچنا ہی " دنیا میں زہد " کہلاتا ہے۔ اس طرح دنیا میں زاہد آدمی ہی حبیبِ ربِ تعالیٰ ہے۔ اور نفس کی خاطر زندگی سے پیار رکھنے والا آدمی اپنے پروردگار کے دین میں منافق ہے۔ اس سے حدیث میں آیا :

" جو آدمی مر جائے اور جہاد نہ کرے اور نہ ہی اس کو جہاد کا خیال پیدا ہو تو وہ نفاق کے ایک شعبہ پر مرا۔"

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جھوٹوں اور دل کے بیماروں کو برہنہ کیا اور فرمایا :

فَاِذَاۤ اُنۡزِلَتۡ سُوۡرَةٌ مُّحۡكَمَةٌ وَّ ذُكِرَ فِيۡهَا (پھر جب اتری ایک سورت جانچی ہوئی اور ذکر ہوا اس میں

الْقِتَالُ رَاَیْتَ الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ[1] (لڑائی تو تُو دیکھتا ہے جن کے دل میں روگ ہے)

یعنی ان کے دلوں میں نفاق کا مرض دیکھو گے۔

پھر فرمایا،

یَنْظُرُوْنَ اِلَیْكَ نَظَرَ الْمَغْشِیِّ عَلَیْهِ مِنَ الْمَوْتِ فَاَوْلٰی لَهُمْ۔ (تکتے ہیں تیری طرف جیسے تکتا ہے کوئی بے ہوش پڑا مرنے کے وقت سو خرابی ہے ان کی)

یہ دھمکی اور وعید ہے۔ یعنی انہیں سزا ملے گی اور عذاب ان کے قریب آچکا۔ پھر فرمایا،

طَاعَةٌ وَّ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ۔ (حکم ماننا ہے اور بھلی بات کہنی)

یعنی ان سے طاعت اور اچھا کام سرزد ہوتا ہے۔

فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ۔ (پھر جب تاکید ہو کام کی)

یعنی جب حقائق پختہ ہو کر سامنے آئے تو انہوں نے جھوٹ بولا اور وعدہ شکنی کی۔

فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ۔ (تو اگر سچے رہے اللہ سے)

یعنی وفاداری میں سچے ہوتے۔

لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ۔ (تو ان کا بھلا ہے)

یہ مضمر کلام میں سے ہے۔ اس لیے اشکال پیدا ہوا اور بقاء و حیات دونوں ایک ہی مفہوم کے نام ہیں۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حیات کو دنیا کا ایک وصف فرمایا۔ اب دنیا ہی حیات ہوئی اور دنیا کے ساتھ اس کا وصف، وصفِ مونث ہے۔ اس لیے کہ اسم میں ھا آتی ہے جو کہ مونث کی تین علامات میں سے ایک ہے۔ چنانچہ حیات ہی دنیا ہوئی اور دنیا کے ساتھ اس کا وصف بیان کرنا در اصل دنائت (معمولی قریب) کے ساتھ وصف کرنا ہوا۔ اور اگر اسم مذکر ہوتا تو مثلاً بقاء۔ تو اس کی لغت بھی مذکر ہوتی۔ چنانچہ فرمایا: ادنیٰ۔ اس کی مثال فرمانِ الٰہی میں یہ ہے:

یَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰی۔ (لیتے ہیں اسباب ادنیٰ زندگی کا)

چنانچہ دُنیا کا مذکر اَدنیٰ ہے اور اَدنیٰ کا مونث دُنیا ہے۔ جیسے کہ عَیْنَآءَ، قَنْوَآءَ اور شَعْثَآءَ کا مذکر اَعْیَنُ، اَقْنٰی اور اَشْعَثُ ہے۔ جو چیز پیش کی جائے اسے عرض کہا جاتا ہے اور اس کا بقاء مختصر اور تھوڑا سا ہوتا ہے۔ اب جس نے اس (قلیل فانی) سے محبت کی اس نے ناقص ترین (ادنیٰ)

---

[1] محمد۔ آیت ۲۰

محبت کے ساتھ دنیا سے محبت کی۔ اور یہ بات حیات اصل کی محبت کی جانب جاتی ہے۔ اس لیے کہ وہ زندگی کی خاطر ادنیٰ ترین چیز کا خواہشمند ہے اور جس ادنیٰ ترین چیز کی خواہش کی خاطر حبِ بقا ہی دنیا بن گئی اور عرض (سامان دنیا) کی محبت دنیا کے بقاء کی خاطر ہوئی۔ اس سے واضح ہو گیا کہ حقیقی دنیا یہ ہے کہ اطاعتِ خواہش کے لیے زندہ و باقی رہنے کی محبت ہے۔ اور محبت عرض (سامان کی محبت) میں خواہش کی موافقت اس لیے ہے تاکہ باقی رہے چنانچہ ان دونوں مذکورہ باتوں کا تداخل ہو گیا۔ کیونکہ باقی رہنے کی محبت فائدہ حاصل کرنے کی خاطر ہے اور یہ خواہش کا نتیجہ ہے۔ اور خواہش نفس امارہ کی صفت ہے جو کہ برائی کا حکم دیتا ہے اور خواہش کی اطاعت اس لیے ہو رہی ہے کہ اس میں نفس کو مزہ ملتا ہے اور یہ حبِ بقاء کے لیے ہے۔ کیونکہ اگر بندے کو ابھی اسی وقت مرنے کا یقین ہو جائے تو وہ خواہشِ نفس پر حق کو ترجیح دے گا۔ اور اگر زندگی سے مایوس ہو جائے تو اسے عرض للادنیٰ (دنیائے فانی) میں رغبت پیمانہ ہو۔ اب اس کی محبتِ زندگی در اصل خواہشِ نفس سے ہے اور زندگی کی محبت کی خاطر ہی وہ خواہشِ نفس کو ترجیح دے رہا ہے اور یہی دنیا کی حقیقت ہے۔ جو آدمی دنیا میں زندگی کی کم از کم امید (و خواہش) رکھتے ہیں وہی دنیا میں زہد اختیار کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ کل کے لیے کچھ چیز بھی جمع نہیں کر رکھتے اس لیے کہ وہ کل تک زندگی رہنے کا سا انداز بھی نہیں رکھتے۔ اور دنیا کا سب سے بڑا طلبگار وہی ہوگا جو طویل طویل امیدیں باندھتا ہے۔ اس کی حرص و طمع بڑھ گئی اور دنیا میں زندگی کے لیے اس کی امیدیں طویل ہو گئیں کیونکہ اگر وہ کل آئندہ کے لیے مختصر امید باندھتا تو اب فقر کی حالت پسند کرتا اور فقر کی حالت اختیار کرنا بھی زہد ہے۔

زہد کی ایک دوسری تشریح

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَ شَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُوْدَةٍ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزَّاهِدِيْنَ [1] (اور بیچ آئے اس کو ناقص مول کو، گنتی کے دراہم اور تھے وہ اس میں زاہد (بے زار))

معنوی طور پر ان کا زہد سے اتصال ہوا۔ اس لیے کہ یہاں بھی زہد کا لفظ بول دیا گیا۔ اس کا مفہوم واضح کرنے کی ضرورت ہے تاکہ جو اس معنی میں زاہد ہو اس کا پتہ چل سکے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

وَ شَرَوْهُ۔ یعنی انہوں نے فروخت کیا۔ عرب لوگ کہا کرتے ہیں: شَرَيْتُ، میں نے بیچا۔ یعنی جب انہوں نے بیچا اور ان کے قبضہ سے نکل گیا تو وہ زاہد بن گئے۔ اس طرح جب ایک بندہ اپنی جان و مال

---

[1] یوسف آیت ۲۰۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے بیچتا ہے اور اپنی خواہش سے علیحدگی اختیار کر کے مولائے کریم کی راہ میں نکل آتا ہے تو وہ زاہد بن جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا،

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ۔ (بے شک اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں اور ان کے اموال خرید لیے کہ ان کے لیے جنت ہے)

جیسے کہ فرمایا،

وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى۔ (اور روکا نفس کو اپنی خواہش سے تو جنت ہی ٹھکانہ ہے)

اگرچہ عوض یعنی جنت ایک ہی ہے مگر دو معنوں میں اس کا ذکر فرمایا۔ گویا نفس اور مال کی فروخت اور ان دونوں کا اللہ تعالیٰ کے لیے نکالنا اس معنی میں ہے کہ ان دونوں میں خواہشِ (نفس) سے ممانعت ہے۔ اور (خواہش) ہی جہاتِ دنیا ہے اور یہی نفسانی خواہش و اکتساب ہے۔ نفس اس یعنی مال سے چمٹ کر رہ جاتا ہے۔ نفس سے خواہش نکالنا اور مال پر فقر داخل کرنا اس کی ضد ہے اور اس سے اس حالت کو بدلنا دنیا میں زہد ہے اور یہ بات برائی کا حکم دینے والے (نفس امارہ) سے حاصل نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ یہ از حد خیر و بھلائی کی بات ہے۔ اب یہ اس سے ممانعت از ہوی بن گئی۔ اور ہوٰی کا مطلب ہے مال حاصل کرنا۔ تاکہ اسے جمع کر کر رکھا جائے اور مال خرچ نہ کرنا۔ نفس امارہ کے وصف کے ساتھ یہی دنیا ہے۔ اس لیے کہ یہ تمام کی تمام برائی ہے۔

جو آدمی اس وصف کا حامل ہو اس کا نفس قابلِ رحمت نہیں۔ اس لیے کہ وہ برائی کا حکم دینے والا نفس ہے اور جب مرحوم نفس نہ ہُوا تو اس کا مالک آدمی اس کا بائع بھی نہ ہوا۔ اور جب یہ اس کا بائع نہ ہوا، تو اس کا کوئی خریدار بھی نہ پایا گیا۔ چنانچہ ایسے نفس والا آدمی مال ہی جمع کرنے والا اور اس کو ذخیرہ کر کے (راہِ خدا میں خرچ کرنے سے) روکنے والا ہُوا۔ یہ آدمی دنیا کا لالچی، دنیا کی محبت میں غرق ہے (حالاں کہ یہ مومن کی شان کے خلاف ہے) اور مومن کی یہ صفت نہیں ہوتی۔ واللہ اعلم۔

بخوشی اطاعت زہد ہے

اللہ تعالیٰ نے جان و مال کو خرچ کر دینے کا نام زہد قرار دیا اور فرمایا:

يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَ يُقْتَلُوْنَ۔ (لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں، سو قتل کرتے ہیں اور قتل ہوتے ہیں)

اور زہد کا مطلب تھا اطاعتِ ہوئی کو چھوڑ دینا، اور اپنے مولائے کریم کے سامنے نفس کو بیچ دینا اور اس کا عوض جنت ہے۔ اب زاہد ہی ایسا آدمی ہے جو اپنے رب تعالیٰ کے مقام سے ڈرتا ہے۔ یہ آدمی مجبوراً جان پروردگار کے سپرد ہونے سے پہلے ہی بخوشی اپنی جان خدا کے سامنے بیچ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کا محبوب ہے اور اس کے قریب ہے۔ اب یہ بندہ خدا کا محب ہوگیا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے مقربین میں سے بنا لیا۔

اور دنیا ایسی چیز ہے جو حیاتِ کیبن کی محبت اور طاعت ہوئی سے عبارت ہے تاکہ شہوانی نفس کو مزہ مل جائے۔ جو دنیا کا لالچی ہے خدا کی تدبیر سے بے خوف ہے۔ اعلیٰ زندگی بیچ کر دنیا کی زندگی لے رہا ہے۔ اس لیے یہ آدمی خدا کا محب نہیں۔ یہ بدراہی کے باعث بُعد میں ڈوب مرا۔ اس پر آخرت میں خسارہ و جہنم لازم ہوا۔ اس لیے کہ یہ بدبخت زاہد و مقرب اور جوارِ حبیب تعالیٰ میں جگہ حاصل کر لینے والے آدمی کے برعکس راہ پر ہے۔

زہد و زاہد اور اس کے احکام

یاد رکھیے کہ دو مفہوم سے زہد ہوتا ہے:

۱۔ اگر چیز موجود ہو تو زاہد وہ ہے جو اس کو اپنے قبضہ سے نکال دے اور دل بھی اس کے ساتھ لگا نہ رہے اور نفسانی بقاء کے ساتھ ساتھ زہد درست نہیں۔ اس لیے کہ یہ اس میں رغبت رکھنے کی دلیل ہے اور یہ اغنیاء کا زہد ہے۔

۲۔ اور اگر چیز موجود نہ ہو اور عدم ہی حال ہو تو اسی حال پر خوش رہنا اور فقدان (شئی) پر راضی رہنا زہد ہے۔ یہ فقراء کا زہد ہے۔ اس طرح ترک ہوئی میں زہد کے اندر بحث ہوگی کہ یہ بھی اس میں ابتلاً ہونے اور (ہوی پر چلنے کی) قدرت ہونے کے بغیر صحیح نہیں۔ دیکھئے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے قول کے ساتھ زہد کا ارادہ کیا۔

لَيُوْسُفُ وَ اَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰٓى اَبِيْنَا مِنَّا۔ (البتہ یوسف اور اس کا بھائی زیادہ پیارا ہے ہمارے باپ کو ہم سے)

مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں زاہدین نہیں فرمایا۔ انہوں نے اس میں ان الفاظ کے ساتھ زہد کے ساتھ کلام کیا۔ کہا:۔

اُقْتُلُوْا يُوْسُفَ اَوِ اطْرَحُوْهُ اَرْضًا يَّخْلُ لَكُمْ وَجْهُ اَبِيْكُمْ۔ (مار ڈالو یوسف یا پھینک دو کسی ملک میں کہ اکیلی رہے تم پر توجہ تمہارے باپ کی)

اور زاہدین نہیں کہا اور اس میں زہد کا عزم کیا اور کہا:

اَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَّرْتَعْ وَ يَلْعَبْ۔ (بھیج اس کو ہمارے ساتھ کہ کچھ چر لائے اور کھیلے)

اور اس میں زہد کے ساتھ متحقق نہیں ہُوئے۔ البتہ اس میں زہد کا عزم کیا اور اس پر اتفاق کر لیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا واقعہ بیان کرتے ہُوئے یہ الفاظ فرمائے مگر پھر بھی انہیں زاہدین کا نام نہیں دیا۔ فرمایا،

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَ اَجْمَعُوْٓا اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِيْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ۔ (پھر جب لے کر چلے اس کو اور متفق ہُوئے کہ ڈالیں اس کو گمنام کنوئیں میں)

اس لیے کہ یہ تمام اسبابِ زہد اور اس کے مقدمات تھے۔ البتہ جو آدمی زہد کی حقیقت سے آگاہ نہیں وہ اس میں شبہ میں پڑ جاتا ہے اور وہ اسے زہد گمان کرنے لگتا ہے۔ حالانکہ یہ زہد نہیں۔ اس لیے کہ ابھی وہ ان کے قبضہ میں ہے۔ جب ان کے قبضہ سے نکلا اور اس کے علاوہ انہوں نے اس کا عوض لے لیا تو اب اس کے بارے میں ان کا زہد واقع ہوا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کا واقعہ بتاتے ہُوئے خبر دی۔ فرمایا:

وَ شَرَوْهُ۔ (اور انہوں نے اسے فروخت کر دیا)

وَ كَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ۔ (اور تھے اس میں زاہد (بے رغبت))

اسی طرح مثلاً اگر تم ایک کپڑا لپیٹ لو، اسے فروخت کرنا چاہو اور یہ بات طے کر لو تو ابھی تک تم زاہد (بے رغبت ہو کر چھوڑ دینے والے) نہیں بنے۔ جب تم اسے فروخت کر کے اس کا معاوضہ لے لو گے تو پھر ہی اس کپڑے کے بارے میں تم زاہد ہو گے۔

اب اس آیت

وَ كَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ۔

کا یہ حاصل مطلب ہُوا کہ جس نے ایک چیز بخوشی اپنے قبضہ سے نکال دی اور اس کا نفس اس کا پیچھا کر رہا ہے تو مجاہدہ کے باعث اس کا بھی زہد میں ایک مقام ہے۔ اور جس نے چیز کو پاس ہی روکے رکھا اور اس کے نفس نے ارادہ اور عزم کی صورت میں زہد کا اظہار کیا تو اس کا زہد میں کچھ بھی مقام نہیں۔ اس لیے کہ چیز کو روکے رکھنا اس میں لالچ رکھنے کی علامت ہے اور رغبت و لالچ دراصل زہد کی ضد ہے۔ اب ضد ہوتے ہُوئے ایک چیز کی توصیف اس سے کیونکر درست ہو سکتی ہے۔ اب جو آدمی چیز کو روکے ہُوئے اور زہد کی باتیں بنا رہا ہے، اس کی دو حالتیں ہیں۔

یا تو وہ زہد کو سمجھتا نہیں۔

اور یا نفس کی مخفی شہوت سے باخبر نہیں۔

یہ اس صورت میں ہے کہ وُہ رغبت کرنے والوں میں سے نہ ہو اور جو دل سے اس کا خیال نکال دے وہی حقیقی زاہد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہی وصف حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں میں بتایا اور اگر ایک آدمی

چیز روک کر اس پر خوش ہو تو وہ اس میں رغبت رکھنے والا شمار ہو گا جبکہ اس کا دل اس سے لگا ہوا ہو۔ یہ وصف یوسف علیہ السلام کے بارے میں عزیز مصر کا ہے کہ جب اس نے انہیں خریدا تو اس کی تمنائے حصول اور ان میں رغبت کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جب اس نے خریدا تو کہا،

اَكْرِمِي مَثْوٰاهُ عَسٰى اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا۔ (آبرو سے رکھ اس کو شاید ہمارے کام آئے۔ یا ہم کر لیں اس کو بیٹا)

اسی طرح فرعون کی بیوی کا وصف ہے کہ انہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام میں رغبت ہے۔ فرماتی ہیں:

قُرَّتُ عَيْنٍ لِّي وَلَكَ لَا تَقْتُلُوْهُ عَسٰى اَنْ يَّنْفَعَنَا اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا۔ (آنکھوں کی ٹھنڈک ہے مجھ کو اور تجھ کو، شاید ہمارے کام آئے یا ہم کر لیں اس کو بیٹا)

اس طرح جو آدمی کسی چیز کی امید رکھے وہ اپنے لیے اس کا ذخیرہ کرتا ہے۔ اب وہ اس میں زاہد نہ رہا۔ زاہد اس وقت ہو گا کہ اسے اپنے قبضہ سے اور اپنے دل سے بھی نکال دے۔ یہ وصف برادران یوسفؑ میں نہ آیا جب تک کہ انہوں نے انہیں معمولی سمجھتے ہوئے نکال نہ دیا اور ان کا عوض نہ لے لیا۔ (یعنی اب زہد کا مفہوم آیا۔ جس کا معنی ہے بے رغبت ہو کر چیز کو اپنے آپ سے جدا کر دینا ہے۔)

زہد کا ایک دوسرا مفہوم

یہ یاد رکھیے کہ برادران یوسف علیہ السلام کا اپنے بھائی کے وصف کے بارے میں زہد کا ہے انہیں یوسف علیہ السلام میں ان کا زہد قریب قریب کر دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی نظر ان کے والد محترم کے پاس ہے۔ جب برادران یوسف علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کے بارے میں زہد (بے رغبتی) اختیار کی تاکہ ان دونوں سے (حضرت یعقوب علیہ السلام) کا رُخ ہٹا کر اپنی طرف کر لیں۔ اور کہا:

لَيُوْسُفُ وَاَخُوْهُ اَحَبُّ اِلٰى اَبِيْنَا مِنَّا۔ (البتہ یوسف اور اس کا بھائی زیادہ پیارا ہے ہمارے باپ کو ہم سے)

روایت میں آتا ہے کہ انہوں نے ارادہ کیا کہ (حضرت یوسف علیہ السلام) کے بھائی کو بھی ان کے ہمراہ ساتھ ہی گڑھے میں ڈال دیں مگر یہوذا (برادران یوسف میں سے ایک) نے اپنا آپ اس پر گرا لیا اور اس کی سفارش کی اور انہیں اس کام سے باز رکھا۔ یہ ان میں سے زیادہ طاقت ور اور بارعب تھا۔ ایک قول یہ ہے کہ اس بھائی کو (یہوذا) نے ان سے مانگ لیا تھا۔ اور کہا تھا کہ اسے رہنے دو، بوڑھے باپ کو سکون رہے گا۔ دونوں بیٹے چھین کر اسے ایذا نہ دو۔ چنانچہ انہوں نے اسے رہنے دیا۔ پھر اس ارادہ و عزم کے باوجود اللہ تعالیٰ نے وکانوا فیھما من الزاھدین نہیں فرمایا۔ اس لیے کہ جس طرح ان کی (یوسفؑ)

کے بارے میں زہد (بے رغبتی) واقع ہوئی۔ اسی طرح (یوسف علیہ السلام) کے بھائی کے بارے میں زہد (بے رغبتی و اخراج از ملک) واقع نہیں ہوا۔ اس لیے کہ یہ ابھی ان کے پاس ہی ہے اور اسے نکالا ہی نہیں۔

بس اسی طرح جب تک ایک چیز تیرے پاس موجود ہے اور تو نے اسے اپنے لیے روک رکھا ہے۔ پھر بھی تو اپنے آپ کو زاہد سمجھتا ہے۔ اس لیے کہ ارادۂ زہد یا ارادہ انفاق تو ہے۔ مگر یاد رکھو، محض اس قدر سے تو زاہد نہیں۔ تو جھوٹا آدمی ہے۔ اس چیز کے وجود کے باعث تیرے نفس نے جھوٹ بولا۔ یا تو وہ زہد سے ہی جاہل ہے یا تیرے وجدان نے جھوٹ بولا اور تیری جہالت کا نتیجہ ہے یا تو نے دُوسرے کے سامنے ملمع سازی کی جو کہ زہد سے جاہل ہے اور یہ زہد میں تیرا زہد ہے اور تیری طرف سے دنیا میں بھی رغبت ہے، تا آنکہ جس کے بارے میں تو زہد کا گمان کر رہا ہے وہ تیرے قبضہ سے نکل جائے اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ کی محبت لے لے اور اس کی رضا کا طلب گار ہو جائے یا جو اس کے پاس اجر و ثواب ہے اسے مانگے۔ اس صورت میں علم پر اور علماء کے نزدیک تیرا زہد اس چیز کے سلسلے میں صحیح ہو گا۔ اب تو سچا ہو گا اور صفتِ زہد سے موسوف صحیح زاہد ہو گا اور زاہد لوگ بھی تجھے زاہد کہیں گے۔

اور جب تیرے پاس چیز موجود نہ ہو تو اب تیرا زہد ایک غیر مملوکہ چیز کے بارے میں ہے اور معدوم چیز کے بارے میں زہد باطل کام ہے۔ اس لیے کہ غیر مملوکہ چیز میں تیرا تصرف ہی درست نہیں۔ اس طرح اس کے بارے میں تیرا زہد بھی درست نہیں۔ ممکن ہے کہ وہ چیز تمہارے پاس موجود ہوتی تو تیرا دل بدل ہی جاتا اور تقلب واقع ہونے سے دوسرا معاملہ ہوتا۔ اس لیے کہ خبر، دیکھے کی طرح نہیں ہوتی کیونکہ گاہے خبر مشتبہ ہو جاتی ہے اور معاینہ سے حقیقتِ حال سامنے آتی ہے۔ مزید بر آں نفس کی کئی راہیں ہوتی ہیں۔ اس پر عیش و آرام کے فائدے کی محبت کی چھاپ بھی ہے۔ اس طرح ظنی معدوم چیز کو یقینی موجود چیز کی طرح نہیں سمجھا جا سکتا۔ اگر ایسا ہو تو پھر کیا حالت ہو گی؟ وہ تم سمجھتے ہی ہو۔ البتہ گاہے ایسا ہوتا ہے کہ شرائط کی پابندی کی جائے تو معدوم چیز کے بارے بھی زہد معتبر ہوتا ہے یعنی تم چیز کے موجود ہونے کو نہ چاہو، چیز کے فقدان پر افسوس نہ کرو۔ بلکہ معدوم ہونے پر خوش رہو۔ فقر پر مسرت حاصل کرو اور اللہ تعالیٰ غیبی طور پر اس حالت سے آگاہ ہوتا ہے اور تیرے باطن کی کیفیت سے واقف ہے کہ اگر تو اسے پائے تو اس کے وجود سے خوش نہ ہو گا۔ اور تیرا دل دنیاوی اشیاء کے معدوم ہونے پر بھی خدا کے فیصلہ پر راضی لہٰذا اس حالت پہ قانع ہے۔ فضیلتِ زہد کے باعث صدق یقین کے درجہ پر ہے اور اس حالت کو بدلنے کا خواہشمند نہیں۔

جب تو اس وصف سے متصف ہو گیا تو تیرے لیے یہ زہد مبارک و خوب ہے اور ایک مفہوم سے تجھے زاہدین کا اجر ملے گا۔ چاہے دنیا میں (وہ اشیاء) تجھے نہ مل سکیں جن میں زہد اختیار کرے۔ یہ سچے

فقراء کا زہد ہے اور یہ حالتِ فقر میں واقع ہوتا ہے۔

بعض مشائخ کا فرمان ہے :

حقیقی فقر یہ ہے کہ بندہ اپنے فقر پر فرحاں وشاداں ہو اور فقر کی حالت چھن جانے سے ڈرتا ہو جیسے کہ دولت مند، سرمایہ پر شاداں رہتا ہے اور فقر سے ڈرتا رہتا ہے۔

حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ کو جب کہا جاتا کہ آپ زاہد ہیں تو آپ فرماتے :

" زاہد تو عمر بن عبدالعزیزؒ ہیں جن کے پاس دنیا آئی اور وہ اس کے مالک ہُوئے مگر پھر اس سے زہد اختیار کیا اور میں کس بات میں زہد کروں گا ؟"

گاہے ایسا بھی ہے کہ ایک عارف کے پاس چیز موجود ہے مگر اسے اپنے نفع کے لیے حاصل نہیں کیا اور نہ ہی اس پر مالکانہ قبضہ کیے بیٹھا ہے۔ اس صورت میں بھی ایک عارف کا زہد صحیح ہوتا ہے بلکہ اس چیز کو وہ خدا تعالیٰ کے خزانہ کی چیز سمجھتا ہے اور اس کے بارے میں خدا تعالیٰ کے حکم کی انتظار میں لگا رہتا ہے (کہ جہاں خرچ کرنے کا حکم ملے فوراً خرچ کر دوں) اس وقت اس چیز کا وجود و عدم برابر ہے اور اس صورت میں گویا وُہ خدا کے احکام نافذ کرنے کا بندہ ہے اور یہ چیز اس کی اپنی نہیں بلکہ اس کے اہل کی، اس کے دُوسرے مسلمان بھائیوں کی یا اللہ کی راہوں میں سے کسی ایک راہ میں خرچ کرنے کی (امانت) ہے۔ یہ زہد سے بالاتر ایک مقام ہے۔ اس طرح چیز اس سے جُدا نہیں ہُوئی بلکہ کسی خصوصیت کے باعث اس سے مخصوص ہے، اور یہ توکل میں سے ایک مقام ہے اور سنّت کی روشنی میں حقیقتِ زہد یہ ہے کہ دنیا کم کرنا اور قلب سے اسے ذلیل وحقیر جاننا۔ یومِ جمعہ کی خاص گھڑی کے بارے میں آنے والی حدیث میں ہے کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

" یہ آخری ساعت میں ہے۔"

بتایا کہ :

" اور آپؐ اسے زہد یعنی قلیل تریں کرنے لگے۔" (یعنی قلیل تریں آخری وقت) ۔ یعنی اس کا وقت غروبِ آفتاب سے بالکل قریب کا مختصر وقت ہے۔

جب آیت صدقہ نازل ہُوئی تو دوسری روایت میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو خطاب کرتے ہُوئے فرمان ہے کہ :

" مناجات (حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بُلانے اور ملاقات کرنے) سے پہلے کس قدر صدقہ تمہارے خیال میں ہم ان پر لگائیں ؟"

تو انہوں نے عرض کیا :

" سونے کا ایک جو "

آپؐ نے فرمایا :

" تو زہید (بہت ہی زاہد) آدمی ہے ۔یعنی دنیا کو بہت حقیر و قلیل کرنے والا ہے ۔ البتہ ہم ان پر (آسانی کی خاطر) ایک دینار لگاتے ہیں " اور زہید کا لفظ زاہد سے وصفِ زہد میں مبالغہ کے لیے بنایا گیا۔ جیسے کہ شاہد سے شہید اور ماجد سے مجید ہے ۔ اور جیسے کہ عالم، قادر اور راحم سے علم و قدرت و رحمت میں مبالغہ کے لیے علیم، قدیر اور رحیم آتے ہیں۔

زاہد کی تعریف و فضیلت

زاہد کی تعریف زاہد کی خوراک جس کے بغیر چارۂ کار نہیں اور جس سے زاہد کی صفت واضح ہوتی ہے۔ اور جس کے باعث وہ لالچی آدمی سے جُدا معلوم ہوتا ہے ۔ وہ یہ ہے کہ موجود اب ملنے والے نفسانی مزے پر خوش نہ ہو اور اس کے فقدان پر اسے غم نہ ہو اور ضرورت پڑنے پر ہی ہر چیز میں سے بقدرِ حاجت ہی لے اور صرف فاقہ دُور کرنے تک ہی ضرورت رکھے اور حاجت سے پہلے کسی چیز کا طلب گار نہ ہو۔

زہد کا آغاز یہ ہے کہ دل میں آخرت کا غم آجائے ۔ پھر اللہ کی عبادت کی شیرینی پائے اور جب تک دنیا کا غم دل سے نہ نکلے ۔ دل میں آخرت کا غم داخل نہیں ہوتا اور جب تک خواہش (نفس) کی حلاوت دل سے نہ جائے تب عبادت و معاملۂ الٰہی کا مزہ حاصل نہیں کر سکتا اور جو آدمی توبہ کرے اور پھر طاعت و عبادت کا مزہ نہ پائے تو وہ اپنے آپ کو دوبارہ گناہ میں پلٹ آنے سے بے خوف نہ سمجھے اور جس نے دنیا چھوڑی اور زہد کی حلاوت نہ چکھی وُہ دوبارہ دنیا میں جا پڑے گا اور جب تک معاملہ کی شیرینی اس وقت آ سکتی ہے جب کہ خواہش کی شیرینی نکل جائے اور خالص زہد یہ ہے کہ موجود کو دل سے نکال دے ۔ پھر جس موجود (اشیائے دنیا) کو دل سے نکالا انہیں اپنے قبضہ سے بھی نکال دے یعنی دنیا اور اس کی اشیاء کو حقیر و ذلیل جان کر اپنے آپ سے الگ کر دے ۔ اب اس کا زہد مکمل ہوگا ۔ اس کے بعد زہد کے اندر زہد کو فراموش کر دے ۔ اب وہ اپنے زہد میں بھی زاہد ہوگا ۔ اس لیے کہ اس کو خدا (زہد دینے والے) کی طلب لگ گئی اور اس کے ساتھ اس کا زہد کامل ہوگا اور یہی اس کی حقیقت و مغز ہے اور مقاماتِ یقین میں یہ سب سے کمیاب اور اعلیٰ حال ہے ۔ یہ اصل میں زہد فی النفس ہے اور یہ نفس کی خاطر زہد نہیں اور نہ ہی زہد کے لیے زہد میں رغبت کے لیے ہے اور یہ صدیقین کا مشاہدہ ہے اور نظرِ یقین مل جانے کے وقت مقربین کا زہد ہے ۔

زہد کے اس سے کم درجہ کے کئی مقامات ہیں مثلاً جس میں رغبت تھی اس پر نظر رکھتے ہُوئے بھی آسے

اپنے قبضہ سے نکالے اور مجاہدہ کر کے قبضہ سے نکالے اور یہ مومنین کا زہد ہے۔ زہد کے باعث یہ عمل اعقد و عمل ہے۔ جبکہ زہد ایمان سے ہو اور ایمان دراصل قول و عمل کا نام ہے۔ اس طرح زہد، عقد و عمل ہے۔ اس کا عقد یہ ہے کہ قلب میں اخروی محبت داخل ہو جائے اور دنیا کی محبت خارج ہو جائے اور زہد کا عمل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ، وتعالیٰ سے عوض لے لے یا اس کے جنت میں مقامِ قرب حاصل کر کے اپنی محبوب چیز اپنے قبضہ سے نکال دے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں لگا دے اور اگر دنیا موجود نہ ہو تو اس پہ افسوس کرنا بند کر دے اور عدم چیز پہ سکونِ قلبی رکھے اور معمولی حصّہ پہ راضی رہے۔ اب بندہ زاہد شمار ہوگا۔ اس لیے کہ یہ ایک فقیر کا حال ہے اور اگر اس کے حکم میں رہا تو اس سے زیادہ اس پہ واجب نہیں اور اصل ورع و تقویٰ زہد ہی ہے جیسے کہ ایمان سے زہد ہے اور حیا و ایمان ایک ہی اہل بیت کے طریق سے مروی ہے کہ :

" ہر شب، دل میں زہد و تقویٰ آتے ہیں۔ اگر اس وقت قلب میں ایمان و حیاء کا وجود پائیں تو وہ اس میں ٹھہر جاتے ہیں ورنہ کوچ کر جاتے ہیں۔"

اور قناعت بھی زہد کا ایک دروازہ ہے اور اشیاء کی معمولی مقدار پہ راضی ہو جانا، زہد کا ایک حال ہے اور اشیاء میں کمی کرنا زہد کی کنجی ہے :-

ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :

" ہمارے قلوب پر تین پردے حجاب بن چکے۔ جب تک یہ پردے نہ ہٹیں تب تک بندے کو یقین کا مکاشفہ حاصل نہیں ہوتا :"

۱۔ موجود پہ خوش ہونا۔

۲۔ مفقود پہ غم۔

۳۔ اور تعریف سن کر مسرت محسوس کرنا۔

جب تو موجود پہ خوش ہُوا تو تُو حریص ہے اور حریص محروم ہے۔ اور جب تو مفقود پہ برہم ہوا تو تُو برہم ہونے والا ہے اور برہم ہونے والا عذاب میں مبتلا ہے اور جب تو مدح سن کر مسرور ہُوا تو تُو عُجب میں مبتلا ہے اور عُجب عمل کو برباد کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتَاكُمْ۔ (تا کہ تم غم نہ کھایا کرو اس پر جو ہاتھ نہ آیا اور نہ خوش ہوا کرو اس پر جو تم کو دیا)

یعنی اس پر یہ نہ ہو اور یہ دونوں وصف زہد میں کامل حال ہیں کہ ان میں ایک کے بعد دُوسرا آتا ہے کیونکہ جو دنیا نہ ملنے پر غمگین نہ ہو وُہ دنیا مل جانے پر خوش بھی نہیں ہوتا۔ اور جو دنیا ملنے پہ فرحت محسوس نہ کرے

وہ اس کے چھن جانے پر غمگین نہیں ہوتا۔ اور یہ اس بندے کا وصف ہے کہ جو کسی چیز کا مالک نہ بنتا پھرے۔ خصوصاً جو بندہ اپنے پروردگار کے حکم پر قائم رہے اور صاحبِ یقین و محبت ہو، دنیاوی فائدہ سے اعراض کر کے آخرت کے مشاہدہ میں لگ گیا ہو اور آخرت کے مشاہدہ نے اسے قابلِ توجہ و ضروری کام میں مصروف کر دیا ہو۔ یہ اس بندے کی صفت ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے،

وَ اَنَّہٗ ھُوَ اَغْنٰی وَ اَقْنٰی۔ (اور یہ کہ اس نے دولت دی اور پونجی)

اس کے ایک مفہوم میں بتایا گیا کہ اہلِ آخرت کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ غنی کیا (کہ وہ غنی و مغنی ہے) اور آخرت کے انعام دے کر دنیا سے بے پروا کر دیا اور اہلِ دنیا کو دنیا سے بے نیاز کیا۔ یعنی اسے خوب مال و دولت عطا کی۔ جیسے کہ اس کی مذمت میں فرمایا،

جَمَعَ مَالًا وَّ عَدَّدَہٗ۔ (جمع کیا مال اور اس کو گن گن کر رکھا)

یعنی یہ کہا کہ یہ اس کے لیے ذخیرہ ہے اور یہ اس کے لیے ذخیرہ ہے۔ چنانچہ اسے ویل (ذلت و رسوائی) کی دھمکی دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک زاہد آدمی کا سارا ذخیرہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ وہی اس کا خزانہ ہے۔ اس آدمی کے لیے خوشخبری ہے اور اسی کا انجام اچھا ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے، آپ نے فرمایا،

"یقین کا غنا کافی ہے۔ عبادت کا شغل کافی ہے اور موت کی نصیحت ہونا کافی ہے۔" اب جو آدمی موت کی انتظار کر رہا ہے اور اہلِ یقین زاہد ہے اس کا یہ ہی وصف ہے۔

ایک خبرِ مشہور بھی ہے کہ،

"کثرتِ سامان کا نام غنا نہیں ہے بلکہ غنا دراصل نفس کا غنا ہے۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا میں زہد کو حقیقتِ ایمان کا علم فرمایا اور اس کا قرب مشاہدۂ یقین کے ساتھ ہی حاصل ہوتا ہے۔ جیسے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حارثہؓ کو فرمایا،

"تُو نے پہچان لیا۔ اب لازم پکڑ۔"

ایک بندے کا دل اللہ تعالیٰ نے منوّر فرما دیا۔ جب اس نے کہا کہ میں حقیقی مومن ہوں۔ پوچھا کہ "تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟"

تو اس نے زہد سے ابتداء کی اور کہا،

"میں نے نفس کو دنیا سے بے رغبت کر دیا۔ اب میرے نزدیک پتھر اور سونا برابر ہو گیا۔ گویا میں جنت

اور دوزخ (کو دیکھ رہا ہوں) اور گویا میں اپنے پروردگار کے عرش کو سامنے پاتا ہوں۔"

اور اس سے شدید تر دوسری روایت ہے جس میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے زہد کو نور کے ساتھ شرحِ صدر کی علامت بتایا۔ یہ نورِ تصدیق ہے جو کہ عام مومنین کا وصف ہے۔ اس لیے کہ وہی اسلام کے واقع ہونے میں نور ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ[1] (سو جس کو اللہ چاہے کہ راہ دے کھول دے اس کا سینہ حکم برداری کو)

عرض کیا گیا،

"اے اللہ کے رسولؐ! یہ شرح (صدر) کیا ہے؟"

آپؐ نے فرمایا:

"جب دل میں نور داخل ہوتا ہے تو اس کے لیے شرحِ صدر حاصل ہوتا ہے اور (سینہ) کھل جاتا ہے۔"

پوچھا گیا،

"اے اللہ کے رسولؐ! کیا اس کی کوئی علامت ہے؟"

فرمایا،

"ہاں! دارِ غرور (دنیا) سے الگ رہنا اور ابدی گھر کی طرف انابت کرنا اور (موت) آنے سے پہلے موت کی تیاری کرنا۔"

یہی زہد ہے جس کو حقیقتِ اسلام کی شرط بنایا اور ان دونوں روایتوں سے زیادہ شدید تیسری روایت ہے جس نے زہد در دنیا کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے حیا، کی توضیح کی۔ فرمایا:

"اللہ تعالیٰ سے حیاء کرو جس قدر حیاء کا حق ہے۔"

ہم نے عرض کیا:

"بے شک ہم حیاء کرتے ہیں۔"

آپؐ نے فرمایا،

"تم بناتے ہو، جن میں نہیں رہتے اور جمع کرتے ہو جو نہیں کھاتے۔"

اس مفہوم کے ساتھ اس وفد کا ایمان کامل ہوا جن سے آپؐ نے پوچھا تھا: "تم کیا ہو؟"

---

[1] انعام آیت ۱۲۵

انہوں نے کہا:

"مومن ہیں۔"

آپؐ نے فرمایا:

"تمہارے ایمان کی کیا علامت ہے؟"

انہوں نے ابتلاء ونکالیف پر صبر کا، آسانی پر شکر کا، مواقع قضاء میں رہنا کا، اور جب دشمنوں پر مصیبت نازل ہو تو ترکِ شماتت (طعنہ زنی نہ کرنے) کا ذکر کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اگر تم ایسے ہو تو وہ جمع نہ کرو جو تم نہیں کھاتے۔ اور وہ (عمارات) نہ بناؤ۔ جن میں نہیں رہتے اور ان میں بڑھ بڑھ کر رغبت نہ کرو جن سے تم کوچ کر جاتے ہو۔"

یہی زہد ہے جس کو ان کے ایمان کا تتمہ اور رفعتِ مقام بتایا۔ اور ان کی نیکی کا کمال فرمایا۔

اخلاص توحید کی شرط زہد ہے

ان سب سے بڑھ کر ایک چوتھی روایت میں ہے جس میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زہد کو اخلاصِ توحید کی شرط قرار دیا۔ یہ ابن مکندرؒ سے مروی ہے۔ انہوں نے حضرت جابرؓ سے روایت کیا۔ بتایا کہ ہمیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطاب کیا اور فرمایا:

"جو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ لے کر آیا اور اس کے ساتھ کچھ دوسرا اختلاط نہ کیا تو اس کے لیے جنت واجب ہو گئی۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اٹھے اور عرض کیا:

"میرے ماں باپ آپؐ پر قربان اے اللہ کے رسولؐ! جو اس کے ساتھ دوسری چیز کا اختلاط نہ کرے ہمارے لیے اس کی وضاحت فرما دیں۔"

آپؐ نے فرمایا:

"دنیا کی محبت اور اس کی طلب اور اس کی تابعداری۔ اور ایک قوم انبیاء کا قول کہتی ہے اور جابرہ کے سے اعمال کرتی ہے۔ چنانچہ جو لا الٰہ الا اللہ لے کر آیا اس میں اس سے کچھ چیز نہیں تو اس کے لیے جنت واجب ہو گئی۔"

یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ زہد کو صبر کا ایک مقام فرماتے ہیں اور دو مروی حدیثوں میں صبر کو ایمان کا ستون بتاتے ہیں۔

پہلی طویل حدیث ہے جس کو عکرمہؓ، عقبہؓ بن حمید، حارث اعورؓ اور قلیقہؓ بن جابر اسدی نے مبانی ایمان میں روایت کیا۔ فرمایا کہ:

" ایمان کے چار ستون ہیں:

۱۔ صبر

۲۔ یقین

۳۔ عدل

۴۔ جہاد۔"

پھر اس میں بتایا کہ:

" ان میں سے صبر کے چار شعبے ہیں:

۱۔ شوق

۲۔ ڈرنا

۳۔ زہد (بے رغبتی)

۴۔ انتظار۔

جو جنت کا مشتاق ہُوا وُہ شہوتوں سے بچا اور جو آگ سے ڈرا اس نے حرام چیزوں سے رجوع کر لیا جس نے دنیا میں زہد اختیار کیا اس پر مصیبتیں آسان ہو گئیں اور جس نے موت کا انتظار کیا اس نے نیکیوں میں جلدی کی۔"

دوسری روایت صبر میں ہے۔ جس کو ایمان کا ستون بتایا اور اس کے منہدم ہونے سے ایمان منہدم ہو جاتا ہے۔ فرمایا:

" ایمان میں صبر ایسے ہے جیسے کہ بدن میں سر ہے۔ جس کا سر نہ ہو اس کا بدن نہیں اور جس کا صبر نہیں اس کا ایمان نہیں۔"

سخی اللہ تعالیٰ کے قریب ہے

ایک مقطوع روایت میں ہے:

" سخاوت یقین سے ہے اور اہل یقین آدمی آگ میں نہیں جائے گا اور بخل شک سے ہے اور جس نے شک کیا وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔" اور یہ حدیث، خبر مجمل کی توضیح کرتی ہے کہ:

" سخی (آدمی) اللہ تعالیٰ کے قریب ہے۔ لوگوں کے قریب ہے۔ جنت کے قریب ہے، آگ سے

دُور ہے اور بخیل (آدمی) اللہ تعالیٰ سے دور ہے، لوگوں سے دُور ہے اور آگ کے قریب ہے۔" اس روایت میں وضاحت کر دی کہ سخی آدمی کس مفہوم سے اللہ کے قریب یعنی جنت کے قریب ہے۔ اس لیے کہ سخاوت یقین سے ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ بخیل آدمی اللہ تعالیٰ سے دُور اور آگ کے قریب ہے۔ اس لیے کہ بخل دراصل شک سے ہے، چنانچہ زاہد کا وصف سخاوت ہے اور صرف بخیل ہی حریص ہوتا ہے اور بخیل آدمی زاہد نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ زہد کا تقاضا یہ ہے کہ چیز کو قبضہ سے نکال باہر کرے اور بخل چاہتا ہے کہ چیز پر قبضہ جمائے رکھے۔ اب نفسِ سخاوت، زہد ہے۔ اس وجہ سے بخل کی مذمت کی گئی کیونکہ یہ دنیا میں حرص کا نام ہے۔

حرص و لالچ بخل کی علامت ہے۔ اس لیے کہ یہ رغبت کی دلیل ہے اور قناعت، سخاوت کی علامت ہے اس لیے کہ یہ زہد کا دروازہ ہے۔ اس وجہ سے فرمایا گیا،

"نفس کے قبضہ میں جو ہے اس سے نفس کی سخاوت، خرچ کرنے کی سخاوت سے افضل ہے۔" پھر ایک نام میں دونوں کے اجتماع کے بعد حکم میں یہ مختلف ہو جاتے ہیں جس نے اللہ تعالیٰ کی خاطر اپنی مملوکہ چیز میں سخاوت کی۔ وہ اللہ تعالیٰ کی خاطر اس میں زاہد ہُوا اور اس کا اجر اللہ پہ ہے اور جس نے اپنے مال میں لوگوں کی خاطر سخاوت کی۔ وُہ بھی اسی کے بارے میں زاہد اور سخاوت کی صفت سے متصف ہے مگر یہ مؤخر الذکر سخاوت نفسانی عمل اور اپنی خواہش کی تسکین کا سامان ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا کچھ اجر نہیں کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں داخل نہیں۔ چنانچہ اس کا عمل باطل ہے اس نے اپنے نفس کے لیے عمل کیا۔ اس کا شکر و اجر دنیا میں ہی وصول کر لیا۔

حضرت ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں،

"میں نے جوانمردی اور قرأت میں صرف ایک چیز میں فرق دیکھا کہ جوانمردی نے جسے بُرا سمجھا قرأت میں اسے ہی چھوڑا۔"

البتہ ان کے درمیان یوُں فرق ہو جاتا ہے کہ قرأت میں اللہ تعالیٰ کی (رضا) مراد ہوتی ہے اور جوانمردی میں لوگوں کی مدح و درخ مراد ہوتا ہے۔

ان کے استاذ حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"جو حسنِ شباب کی استطاعت نہ رکھے وُہ حسنِ قرأت کی استطاعت بھی نہیں رکھتا۔" یعنی جو احکامِ شباب سے آگاہ نہیں کہ ان پر چلے تاآنکہ شباب کے وصف کا مستحق ہو۔ اس میں اوصافِ قرأت بھی پختہ نہیں ہوتے کہ اسے قاری (قرأت کرنے والا) کہا جا سکے۔

گاہے بندے کو خواہشِ (نفس) کی مخالفت کرنے کی طرح زہد پر آنے کے لیے نفس سے جہاد کرنا پڑتا ہے جیسے کہ وُہ حق پر قایم رہنے کے لیے صبر کے ساتھ جہاد کرتا ہے۔ یعنی مرغوب و پسندیدہ چیز کو قبضہ سے نکال دیتا ہے اور نفس کی ناپسندیدگی کے باوجود محبوب چیز کو خرچ کر دیتا ہے اور اسے زہد پر آمادہ کرتا ہے اب اس کا بھی زہد میں ایک مقام ہوگا۔ وُہ نیکی پائے گا اور نیکی پر ماجور ہوگا اور جو آدمی متزہد بنے وُہ زاہد نہیں ہوتا۔ متزہد وُہ ہے جو زہد کا تصنع کرے اور ہر چیز میں اسبابِ معاش اور اشیائے صرف میں (متکلفانہ) کمی و قلت کرے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ صابر کے مقابلہ میں متصبر ہے کہ جس کو جہالت کے باعث اپنے اوپر صابر ہونے کا وہم ہے اور علم پر اپنے نفس کو صابر بناتا ہے۔ اب اس کا صبر سے ایک مقام ہے اور زہد خالص یہ ہے کہ موت کا انتظار کرے اور امیدیں کم کر دے۔ اس لیے کہ ان دونوں میں ترکِ ذخیرہ اندوزی اور خوب خوب اعمالِ صالحہ کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

زاہد کون ہے؟

ابن عینیہؒ فرماتے ہیں:

"زاہد کی حد یہ ہے کہ وُہ آسانی میں شکرگزار اور ابتلاء میں صبر کرنے والا ہو"۔

حضرت بشر بن حارث رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"لوگوں میں زہد ہی دنیا میں زہد ہے" جس نے (لوگوں میں) زہد اختیار کیا۔ اس نے دنیا میں زہد کیا"۔

ایک حکیم فرماتے ہیں،

"جب زاہد، لوگوں کو چاہے تو اس سے دُور بھاگ۔ اور جب یہ لوگوں سے بھاگے تو اس کی طلب کر"۔

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ سے دریافت کیا گیا کہ

"آدمی کب زاہد ہوتا ہے؟"

فرمایا:

"جب ترکِ دنیا میں اس کی حرص اس قدر ہو جائے جس قدر طالبِ دنیا کی حرص ہوتی ہے اب وُہ زاہد ہوگا"۔

قاسم جوعیؒ نے فرمایا:

"دنیا میں زہد وہی زہدِ جوف ہے یعنی جس قدر تو اپنے پیٹ کا مالک ہے۔ اسی قدر تو زہد والا ہے اب اس کے نزدیک سیر ہو کر کھانا اور شہوات (خواہش سے) کھانا، دُنیا ہوگی"۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"زہد ہی قناعت ہے۔ اب اس کے نزدیک حرص و لالچ کا نام دنیا ہے۔"

حضرت ثوریؒ فرماتے ہیں:

"امید کی کمی کا نام زہد ہے۔ اب طویل امید اس کے نزدیک دنیا ہوگی۔"

حضرت ابوسلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"جو چیز تجھے اللہ تعالیٰ سے غافل کر دے وُہ دنیا ہے۔ اب یہ زہد ہوا کہ انسان اللہ تعالیٰ کی (عبادت) کیلئے فارغ ہو جائے۔"

فرمایا:

"جو دنیا سے خلوت اختیار کرے اور عبادت و ریاضت میں لگ جائے وہ زاہد ہے اور جس نے اسے ویسے ہی ترک کر دیا اور بے کار رہا اس نے اپنے نفس کے لیے راحت کا موقع نکالا۔ (اور زہد اختیار نہیں کیا)

حضرت داوٗد طائی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"اہل و مال میں سے جو چیز بھی تجھے اللہ تعالیٰ سے غافل کرے وہ تجھ پر نحوست ہے۔"

حضرت ابوسلیمانؒ نے فرمایا:

"جس نے نکاح کیا، یا حدیث لکھی یا معاش کی تلاش کی تو وہ دنیا کی طرف جھکا اور اللہ تعالیٰ کا فرمان پڑھا:

اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ ۔ (مگر جو آیا اللہ کے پاس قلب سلیم لے کر)

فرمایا:

"یہ وہ قلب ہے کہ جس میں غیر اللہ کا نام بھی نہ ہو۔"

اور فرمایا:

"(صحابہؓ) نے دنیا میں زہد اختیار کیا تاکہ اخروی امور میں ہی ان کے قلوب منہمک ہو کر رہ جائیں۔"

حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"جب (ایک آدمی) طلب میں نکلا تو زہد چلا گیا۔"

کمالِ زہد

ہمارے امام و شیخ ابو محمد سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"زہد کا آغاز توکل سے اور اس کا وسط اظہارِ قدرت ہے۔"

اور فرمایا:

"بندہ اس وقت تک ایسا حقیقی زاہد نہیں بنتا کہ جس میں رحمت کا خطرہ نہ رہے۔ جب تک کہ مشاہدۂ قدرت حاصل نہ ہو جائے۔ اس لیے کہ میرے نزدیک انتہائے قدرت یہ ہے کہ قادر کریم سے جو سنے اس کا

مشاہدہ کرے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

وَمِمَّا يُوقِدُونَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَاءَ حِلْيَةٍ أَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِثْلُهُ،[1] (اور جس چیز کو دھونکتے ہیں آگ میں واسطے زیور کے یا اسباب کے، اس میں بھی جھاگ ہے ویسا ہی)

اب حلیہ سے مراد سونا چاندی ہے۔ یہی دو چیزیں اشیاء کی قیمتیں بنتی ہیں اور انہی کے سامنے لوگوں کی گردنیں خم ہیں۔ ان دو کے علاوہ باقی اشیاء ارض معدنیات میں داخل ہیں۔ جب بندے نے سونے کو دیکھا جو دنیا کا سبب ہے اور اسی کی خاطر مشرکین نے شرک کیا اور شک کرنے والوں نے شک کیا۔ قلب میں اس کی حلاوت سے کئی حوادث پیدا ہوئے جب اس سونے چاندی کے جوہر کو دیکھا کہ پانی پر تیرنے والی جھاگ کو دیکھا کہ اس میں کچھ فائدہ نہیں۔ اور یہ بالکل بے کار و بے قیمت ہے تو اس وقت صحیح زہد اختیار کرے گا۔ اب اس کا زہد خبر کے بعد نہیں بلکہ دیکھ کر ہوگا۔ (یعنی مشاہدہ و معاینہ پر زبردست زہد ہوگا) اور یہ حقیقی مومنوں میں سے ہوگا جن کا وصف اللہ تعالیٰ کے فرمان میں آیا:

إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا۔ (جب نام آئے اللہ کا ڈر جائیں دل ان کے اور جب پڑھا جائے ان پر اس کی آیات، زیادہ ہوئے ان کو ایمان)

چنانچہ زہد ایمان میں اضافہ کرتا ہے۔ پھر فرمایا،

وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ۔ (اور اپنے رب پر وہ توکل رکھتے ہیں)

اب زہد انہیں توکل میں داخل کرتا ہے۔ پھر فرمایا،

فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ۔ (سو اسے کارساز پکڑ لو اور صبر کر اس میں جو وہ کہتے ہیں)

چنانچہ توکل انسان کو صبر پر استقامت بخشتا ہے اور یہ آدمی ایسا ہوگا کہ گویا اس نے اللہ تعالیٰ سے کلام سنا اور سمجھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے باغات و چشموں کی جائے امن میں پہنچا دیا اور اللہ تعالیٰ کی طرف تعریف کا مستحق ہوا کہ جب یقین کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو (اس کے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے) اور وہ مومن ہے۔ چنانچہ فرمایا،

الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ۔ (جن کو دی ہے ہم نے کتاب وہ اس کو پڑھتے ہیں جو حق ہے پڑھنے کا، وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں)

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے "زبد" کی تشبیہ ذکر کی جیسے کہ حق و باطل کے لیے مثال دی گئی۔ اب

---

[1] الرعد، آیت ۱۷

مثال ہے ماء اور زبد ۔ نفع و بقاء میں یہ پانی کی طرح ہے اور ختم ہونے اور قلیل ترین فائدہ میں یہ جھاگ کی طرح ہے ۔ پھر حقیقت ہی ختم ہوجانے کے باعث سونے کی جھاگ سے تشبیہ دی جو کہ تشبیہ مجاز ہے ۔ اس لیے کہ فرمایا ؛

زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ۔ (جھاگ مانند اس کی)

اور مماثلت ۔

پھر فرمایا ؛

كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمُ الْحُسْنٰى ۔ (یوں بتاتا ہے اللہ مثالیں، جنہوں نے مانا ہے اپنے رب کا حکم ان کو بھلائی ہے)

یعنی جنت اور اس کے باقی رہنے کی مثال دی ۔

اور فرمایا ؛

لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ مَثَلُ السَّوْءِ ۔ (جو نہیں مانتے پچھلے دن کو، انہی پر بری کہاوت ہے)

یہ لوگ دنیا کی زندگی، دنیا کی زینت چاہتے ہیں اور اس پر مطمئن ہو کر رہ گئے ۔

لَيْسَ لَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۔ (نہیں ہے ان کے لیے آخرت میں سوائے آگ کے)

پاک ہے وہ ذات کہ جس نے بینائی عطا کی ۔ پاک ہے جو شب و روز کو بدلنے والا ہے ۔ پاک ہے وہ ذات کہ ہر چیز اس کے پاس اندازے میں ہے ۔ جو نظر نہیں آتا اسے بھی دیکھتا ہے ۔ جس پر ہمیں قدرت نہیں اس پر اسے قدرت ہے ۔ اہل مشاہدہ کو مشاہدہ کے مفہوم سے مخصوص فرمایا ۔ جیسے کہ انہیں علم کا کچھ حصہ عطا فرمایا ۔ اب جو چاہا ان کو عطا فرما دیا ۔ ان (اہل مشاہدہ و علمائے ربانیین) کے نزدیک سونے چاندی کی حیثیت فنا ہونے والی جھاگ کی طرح ہے جس کو ہوائیں اڑا دیں اور پانی خالی صاف پانی رہ جائے ۔ اور یہ دونوں (سونا چاندی) معدنیات جبال میں سے ہے ۔ اب ان کے نزدیک پہاڑ چند موجیں ہیں ۔ انہیں ٹھہرا دیا گیا تو پرسکون اور منجمد ہیں ۔

تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَّهِىَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ ۔ صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِىْٓ اَتْقَنَ كُلَّ شَىْءٍ ۔ (جم رہے ہیں اور وہ چلیں گے جیسے چلے بدلی کاریگری اللہ کی جس نے سادھی ہے ہر چیز)

اور یہ زمین ایک طوفانی سمندر بن گیا جس میں بڑی بڑی موجیں اٹھ رہی ہیں اور ان میں شہر اور ویرانے پیدا ہو رہے ہیں اس لیے کہ کہیں سے پانی ہموار ہے اور کہیں بلند و بالا ہے اور تمام مخلوق ان سردیوں میں تیر رہی ہے ہر بلندی سے اتر رہے ہیں ۔ ان میں ہر چیز کو ایک مقررہ اندازے پر نمودار فرمایا جیسے کہ شب میں دن نکلتا ہے اور سیلاب پر جھاگ آتا ہے ۔ یہ اس کی حکمت کا ظہور ہے اور اس کی مخفی قدرت اور لطیف و دقیق

صنعت کا کرشمہ ہے اور یہ اس لیے ہے کہ اس کی نعمت دیکھ کر اس کا شکر بجا لائے۔

جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِیْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ۔ (کیا تمہارے آگے زمین کو پست، پھر اس کے کندھوں پر اور کھاؤ کچھ روزی دی اس کی)

اور فرمایا:

وَهُمْ مِّنْ كُلِّ حَدَبٍ يَّنْسِلُوْنَ۔ (اور وہ ہر اُونچان (اونچی سے) پھیلتے آئیں)

اِنَّ رَبِّیْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَآءُ۔ (بے شک میرا رب تدبیر سے کرتا ہے جو چاہے)

پس اجتماع بکھر گیا اور پھٹن جڑ گئی اور متفرق غائب ہو کر رہ گیا اور بنا دیا:

وَكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ۔ (اور اس کا تخت پانی پر تھا تاکہ تم کو آزمائے)

یہ اہل آخرت کا مشاہدہ ہے۔ یہ ان کے دنیا میں زہد سے بلند تر ہے۔ اجتماع بکھر گیا، پھٹن جڑ گئی اور پانی سے ہر چیز زندہ و ظاہر ہو کر نمودار ہوئی۔ فضا وسیع ہو گئی، پردہ چھپ گیا، تفصیل پائی گئی اور گمان پر حاصل ہو جانے کا حکم لگ گیا۔

كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ اَفَلَا يُؤْمِنُوْنَ۔ (منہ بند تھے پھر ہم نے ان کو کھولا اور بنائے ہم نے پانی سے جس چیز میں ہے، پھر کیا یقین نہیں کرتے)

یہ اہل دنیا کا مشاہدہ ہے۔ یہ ان پر بہت پر عظمت ہے کہ وہ غائب ہو کر پھر بیدار ہو گئے۔

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ۔ (اور آئی بے ہوشی موت کی۔ تحقیق یہ وہ ہے جس سے تو ٹل رہا تھا)

لَقَدْ كُنْتَ فِیْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ۔ (تو بے خبر رہا اس دن سے، اب کھول دیں ہم نے تجھ پر سے تیری اندھیری، اب تیری نگاہ آج تیز ہے)

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا وَّالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا وَّالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا۔ (قسم ہے گھسیٹ لانے والوں کی ڈوب کر، اور بند چھڑا دینے والوں کی کھول کر، اور تیرنے والوں کی تیرنے پر)

یہ عوام کا موت کے وقت مشاہدہ ہے۔ اس وقت ان پر کوتاہی کی حسرت بڑھا دیتی ہے۔ خواص اس کے مشاہدہ کے باعث اپنے حضر سے فارغ ہوئے۔ اب وہ مزید آنے والے (انعام) کی طرف نظر کناں ہیں۔ بندوں سے ہٹ کر اس میں کھو چکے ہیں۔ شاہد حق کے ساتھ قائم ظاہر و باطن، لطیف و استتار، معروف و منکر ہر طرح سے خصوصاً انہیں اس کے اشہاد کے ذریعہ تعرف کرتے ہیں۔

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔

جو اس پر غالب آیا وہ ظاہر نہیں ہوتا۔ اور جو اس نے ان پر غالب کیا وہ غالب آیا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"صادق ترین کلمہ ہے جو شاعر نے کہا:

اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهِ بَاطِلٌ"۔ (یاد رکھو اللہ کے سوا ہر چیز باطل (و فنا ہونے والی) ہے)"

اور فرمایا:

فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ۔ (تو ٹھیک بات یہ ہے اور میں ٹھیک ہی کہتا ہوں)

خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَّ اَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا۔ (اللہ وہ ہے جس نے بنایا سات آسمان اور زمینیں بھی اتنی، اترتا ہے حکم ان کے بیچ تاکہ تم جانو کہ اللہ ہر چیز کر سکتا ہے اور اللہ کا علم ہر چیز پہ احاطہ کیے ہے)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرمایا کرتے تھے:

"اگر میں اس آیت کی تفسیر کردوں تو تم کفر کرو گے۔"

عرض کیا گیا:

"وہ کیسے؟"

فرمایا:

"تم اس کا انکار کرو گے اور تمہارا اس (آیت) کا انکار اس کے ساتھ کفر ہوگا۔"

دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:

"اگر میں اس آیت کی تفسیر کروں جو سورت نساء قصری میں ہے تو تم مجھے پتھروں سے مارو۔" مطلب یہ ہے کہ تم میری تکفیر کرنے لگو۔ اس لیے کہ (سلف صالحین) صرف کافر کو ہی قتل کرتے تھے۔ (اور مسلمانوں کا خون بہانا حرام سمجھتے تھے)

اللہ تعالیٰ کا فرمان جَمِيْعًا مِّنْهُ۔ اس میں مروی ہے کہ، فرمایا:

"ہر چیز میں اس کے اسماء سے اسم حرف ہوتا ہے۔ چنانچہ ہر چیز کا اسم، اس تعالیٰ کے اسم سے ہے اب تو اس کے اسماء صفات و افعال کے درمیان ہے۔ اس کی قدرت کے ساتھ بولنے والا اور اس کی حکمت کے ساتھ ظاہر ہے۔"

حضرت ابو محمد رحمۃ اللہ علیہ اس قول کی تاویل اس مفہوم میں فرماتے کہ:

"جو آسمان سے نازل ہُوا وُہ یقین سے عزیز تر ہے۔ چنانچہ سات اعلیٰ اور سات اسفل میں غائب ہُوئے جبکہ نفسِ خواہش لپٹی۔ اور اعلیٰ و اسفل، ملکوتِ عرش و ثری ہیں غائب ہُوئے جبکہ نفس کی ضمیر (یا نیت) لپٹ گئی۔ اور جب طی الطی (نیت کی نیت) لپٹ گئی تو عرش و ثری، جبروتِ اعلیٰ میں غائب ہُوئے اور جب حدثانِ ثانی (ابتدائے ثانی) غائب ہوا تو ازلی اوّل سامنے آگیا اور جب ظاہر و ساتر مخفی ہُوا تو باطنِ اخیر ظاہر ہوا۔ اب بندہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کا گواہ بن گیا کہ،

الا کلّ شیءٍ ماخلا اللہ باطل۔ (یاد رکھو اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے)

اور اسے آفاق میں نشانیاں دکھائیں۔ اب حق سبحانہٗ تعالیٰ کے بقول حق واضح ہو گیا۔

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّهِمْ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ۔

(اب ہم دکھائیں گے ان کو اپنے نمونے دنیا میں اور آپ ان کی جان میں، جب تک کہ کھل جائے ان پر کہ یہ ٹھیک ہے کیا تیرا رب تھوڑا ہے ہر چیز پر گواہ جو سنتا ہے وہ دھوکے میں ہیں اپنے رب کی ملاقات سے، سنتا ہے وُہ گھیر رہا)

اس طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی کو فرمایا جب اس نے دُعا کی:

"اے اللہ! مجھے دنیا ایسے دکھا جیسے کہ تو اسے دیکھتا ہے۔"

آپ نے فرمایا:

"اس طرح مت کہو۔ اس لیے کہ جس طرح تو (دنیا کو) دیکھتا ہے اللہ تعالیٰ اس طرح دنیا کو نہیں دیکھتا بلکہ یُوں دُعا کرو:

اَرِنِي الدُّنْيَا كَمَا يَرَاهَا الصَّالِحُ مِنْ عِبَادِكَ۔ (مجھے دنیا ایسے دکھا جیسے کہ تیرے بندوں میں سے صالح بندہ اسے دیکھتا ہے)

یہ اہل اللہ کی گواہی ہے اور اس میں پہلی شہادت بھی غائب ہُوئی جیسے کہ اس پہلی نے اہل دنیا کا مشاہدہ غائب کر دیا۔ اب اس مقام کا انکشاف کرنا اور اس شہادت کا ظاہر کرنا صرف شہید (گواہ) کے لیے جائز ہے جو کہ صدیقین میں ایک پختہ مقام رکھتا ہو۔

ایک حکیمؒ نے فرمایا:

"اس کے مفاہیم نادر و عزیز ہیں۔ چنانچہ شہید (گواہ) کے سوا دوسروں کی نظروں سے غائب ہُوئے۔ یہ

(شہداء) ہی قرآن میں اصحاب اطلاع ہیں جو کہ عیاں میں ہولِ مطلع (ہولِ اطلاع) سے محفوظ رہے۔ رازِ ربانی کھول دینا معصیت ہے اور رازِ سر کا اعلان کرنا کفر ہے مگر اس زاہد کو اس بات کی ضرورت ہے کہ اگر اس کی نظر شہادتِ احد و مزید تک نہ جا سکے تو بمنزلہ جھاگ کے زہد کا مشاہدہ کرے تا کہ اہلِ سمع و شہادت میں سے بن جائے۔

اور اللہ کے ہاں وہ شہید (گواہ) ہو جائے گا اور اس کے لیے اجر و نور ہوگا جیسے کہ شاہد اعلیٰ نے فرمایا:

وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَ نُوْرُهُمْ۔ (اور احوال بتانے والے اپنے رب کے پاس ان کو ہے ان کا اجر اور ان کی روشنی)

اب جو اس کی شہادت کی شہادت نہ دے وہ کیونکر گواہ ہو سکتا ہے بلکہ اس کے نور کے بغیر وہ وصفِ الٰہیت کی شہادت کس طرح دے سکتا ہے؟ یا جو اس کی قیومت کا مشاہدہ نہ کرے۔ وہ اس کی شہادت کے ساتھ کیونکر قائم ہو سکتا ہے بلکہ اس کے نورِ وحدانیت کے بغیر وہ اس کی قیومیت کو کیسے دیکھ سکتا ہے۔ اگر اب مقام میں قرب حاصل نہ کیا تو یوں ہے جیسے کہ فرمایا:

اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِيْدٌ۔ (یا لگائے کان دل لگا کر)

چنانچہ وہ سمتِ قریب کی جگہ سے سنے گا مگر دور ہے اور اہلِ بیان و فکر میں سے ہوگا۔ جیسے کہ حق تعالےٰ نے فرمایا:

كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ۔ (اسی طرح بیان کرتا ہے اللہ تمہارے واسطے حکم، شاید تم دھیان کرو، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی)

یعنی تم دنیا کے فنا و زوال اور آخرت کے بقاء دوام پر غور و فکر کرتے ہو۔ اس لیے تم زائل و فانی پر باقی و دائمی کو ترجیح دیتے ہو اور باقی میں ہی رغبت رکھتے ہو اور فانی میں زہد اختیار کرتے ہو۔ کیونکہ جس کا انجام فنا ہو اس کا اول آخر برابر ہے۔ اس کا اول بھی کچھ نہیں اور جس کا انجام بقاء ہو۔ گویا وہ دائمی ہے۔ اب اس کا آغاز بھی بقاء میں آخرت کے مشابہ ہوا۔ علیم و حکیم تعالیٰ نے اسی طرح فرمایا:

وَ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى۔ (اور آخرت بہتر ہے اور باقی رہنے والی)

اللہ تعالیٰ نے اس کے بقاء کی انجام میں اپنی صفات سے دو وصفوں کے ساتھ توصیف فرمائی۔ فرمایا:

۱۔ وَ اللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى۔ (اور اللہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا)

۲۔ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ۔ (جو تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے)

چنانچہ دنیا کی نسبت ہماری طرف کی تاکہ ہماری ذلت ظاہر کی جائے۔ اس لیے کہ ہم فانی ہیں اور ہمیں دنیا میں زاہد بنانے کے لیے ایسا کیا جائے اور آخرت کی نسبت اس کی طرف کی تاکہ اس کی وجہ سے اسے عزت عطا کرے۔ اس لیے کہ وہ اہل بقا ہے اور ایک وجہ یہ ہے کہ ہمیں آخرت کی ترغیب دینا مقصود ہے۔ اگر ایک آدمی نظرِ قلب اور یقینِ ایمان کے ساتھ آخر کے لحاظ سے فنا ہونے والی چیز پر غور کرے تو وہ جان لے گا کہ یہ گویا تھی ہی نہیں اور جو باقی رہنے والی ہے وہ گویا ابدی ہے اس پر کبھی عدم آیا ہی نہیں جن لوگوں نے اس آیت کی تلاوت کا حق ادا کیا اور اس پر غور و فکر کیا۔ جن کو اس کا مشاہدہ حاصل ہوا، وہ حقیقی ایمان لایا اور اس نے دنیا میں حقیقی زہد اختیار کیا اور آخرت میں حقیقی رغبت دکھائی۔ یہی اہل بصیرت میں سے ہے یعنی دین کے معاملہ میں قوی اور یقین میں صاحبِ بصیرت ہے۔ جب وہ اس قوت کے ساتھ غور کرے گا تو دنیا سے آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کی طرف چل پڑے گا اور اس کا زادِ راہ (دنیا نہیں) بلکہ تقویٰ ہو گا جیسے کہ فرمایا:

وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۔ (اور ہر چیز کے بنائے ہم نے جوڑے، شاید تم دھیان کرو)

یعنی تم فرد تعالیٰ کو یاد کرو۔ چنانچہ

فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ۔ (سو بھاگو اللہ کی طرف)

یعنی اشکال و انداد سے ہٹ کر اللہ کو یاد کرو اور جیسے فرمایا:

فَاعْتَبِرُوْا يَا اُولِي الْاَبْصَارِ۔ (سو ہشت پکڑو اے آنکھ والو)

چنانچہ بصیرت والے کو بھی یہی قرار دیا کہ ان میں سے ہے جنہوں نے کتاب اللہ کو قوت سے پکڑا۔ ایک قول یہ ہے کہ اس پر عمل کر کے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس میں یقین کے ساتھ، ایک قول میں خوب محنت و جہد کر کے۔ اب یہ محسنین میں سے ہوا جو کتاب اللہ کو مضبوطی سے تھامے رہتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔

تفکر کی اہمیت

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَ يَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ۔

(اور وہ جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے، اور دھیان کرتے ہیں آسمان اور زمین کی پیدائش میں)

اور فرمایا:

"بربادی ہے اس کے لیے جو یہ (آیت پڑھے اور اس میں غور نہ کرے، بربادی ہے اس کے لیے جو

یہ (آیت) پڑھے اور مونچھوں کو بل دے (تکبر کرے)۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ زمین و آسمان کا ذکر کر کے ان سے بالاتر مقامات یعنی جنت و دوزخ کی طرف اشارہ کیا اور یہ ملکوت ہے۔ ملک باطن اور ملکِ کبیر کی جانب ان دونوں نے اعلیٰ و اسفل کو کھول دیا اور جس نے ان میں تفکر کیا اس کے لیے ان کے ذریعہ عرش و ثریٰ کا احاطہ کیا۔ پھر اس کے لیے اس نے ان سے بالاتر یعنی مقامِ رفیقہ کا انکشاف کیا اور افکارِ ملکوت سے آگے بڑھ گیا جبکہ انوارِ یقین کے باعث قلوب کو اُفقِ اعلیٰ و جبروت کا انشراح حاصل ہُوا۔ اب اہلِ تفکر کی نظروں نے ان کی قوت سے اس مشاہدہ پر گرہ لگا دی اور انوارِ یقین اس احاطہ شدہ کو دیکھنے میں باقی رہے۔ اس کا ذکر ہم ابتدا میں کر چکے ہیں جس کا کشف ظاہر نہیں ہُوا۔ جیسے کہ جس بندے کو اللہ تعالیٰ نے (عقل سے) بالاتر امور کی آگاہی بخشی اور اس سے ان کا یقین پختہ تر ہوا، اور عام مومنین کو دنیا کا جو مشاہدہ حاصل ہے وہ اس (مذکورہ) کے مقابلہ میں قریب لبعقل ہے۔ مگر وُہ لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ یہ عقوبت و سزا ہے۔ جیسے کہ فرمایا،

"کسی بندے پر دنیا صرف اس کو تدبیر میں پھانسنے کے لیے کھلی اور جب بھی اس سے دنیا لپیٹ دی گئی تو اس پر (نظرِ کرم) کے باعث ایسا ہوا"۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعات میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی فرمائی:

"جانتے ہو کہ آدمؑ کو درخت (کا پھل) کھانے میں کیوں مبتلا کیا؟ اس لیے کہ میں نے اس کی معصیت کو دنیا کی آبادی کا سبب بنایا۔"

اب خطاب سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ طاعت و نیکی اس دنیا کے برباد کرنے کا باعث ہے۔ یعنی دنیا میں زہد اختیار کرے تو برباد ہو جائے گی۔ اس تشریح سے اس خبرِ مشہور کا مضمون حل ہو گیا۔ فرمایا:

"دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے"۔ اس لیے کہ یہی اس کی اساس ہے اور عوام میں اس کی ہمت نہیں، کیونکہ وہ لوگ دنیا آباد کرنے میں مراد (لگا دیے گئے) ہیں۔ البتہ خواص کے ایک گروہ کے لیے یہ بات مناسب ہے۔ کیونکہ سب لوگوں میں سے کچھ لوگوں کا کم ہونا، دنیا کی آبادی کے لیے کچھ مضر نہیں۔ اس لیے کہ اس کی آبادی اہلِ دنیا سے ہے۔

دنیا مقامِ نجاست ہے

جب حضرت آدم علیہ السلام نے درخت کا پھل کھایا تو بتاتے ہیں کہ ان کے معدہ میں حرکت پیدا ہوئی تاکہ بوجھ نکلے اور یہ خاصیت جنت کے صرف اسی درخت میں رکھی گئی ہے۔ اسی وجہ سے اس درخت کو کھانے سے منع فرمایا۔ بتاتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت میں پھرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتے کو حکم دیا کہ معلوم کرو۔ کیا چاہتے ہیں؟

حضرت آدم علیہ السلام نے جواب دیا:

"میں چاہتا ہوں کہ پیٹ میں جو تکلیف کی چیز ہے اسے کہیں ڈال دوں۔"

فرشتے سے کہا گیا:

"ان سے کہو: کہاں رکھو گے، بستروں پر، چارپائیوں پر، نہروں میں یا درختوں کے سایہ میں؟ کیا ان میں سے کوئی اس کام کے لیے موزوں جگہ دیکھتے ہو؟ ہاں، البتہ دنیا میں اتر جاؤ۔"

بتایا: چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کرم فرمایا اور انہیں زمین پر اتار دیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دنیا کے پھلوں وغیرہ میں حشو و ثقل رکھ کر ناقص کر دیا تاکہ ان میں لوگ زہد اختیار کریں اور بتایا کہ یہ فانی چیزیں ہیں۔ اس لیے دائمی انعامات میں رغبت رکھو۔

بعض علماءؒ کا فرمان ہے:

"دنیاوی آرائش کی جو زینت بھی میرے سامنے آئی۔ میرے سامنے اس کی اندرونی حالت بھی کھل گئی۔ چنانچہ میرے لیے اس سے نفرت ہویدا ہو گئی۔"

یہ اللہ تعالےٰ کی اپنے اولیائے مقربین پر خاص عنایت ہے۔ جو آدمی دنیا کا اس کے ابتدائی وصف کے ساتھ مشاہدہ کر لے۔ وہ اس کے انجام سے دھوکہ میں نہیں رہ سکتا اور جس نے اس کی اندرونی حقیقت جان لی وہ اس کے ظاہر پر متعجب نہ ہو گا اور جس کے سامنے اس کا انجام کھل گیا اسے اس کی آرائش نہیں بہکا سکتی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمایا کرتے تھے:

"اے علماء سوء! تمہارے لیے بربادی ہے۔ تمہاری مثال ایسے ہے جیسے کہ کھجور کے پودے کا گڑھا ہو جس کا ظاہر اچھا ہو اور اس کا باطن بدبودار ہے۔"

حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"جادو کی چیز (دنیا) سے بچو۔ اس لیے کہ یہ علماء کے قلوب پر جادو کر دیتی ہے۔ یعنی دنیا سے بچو جس نے باطل طریق پر دنیا کا لالچ کیا۔ اس نے اپنی جان کو قتل کیا اور اگر اس کا لالچ بڑھ گیا اور اس کی محبت تیز ہو گئی تو وہ دوسرے کو بھی قتل کرے گا۔"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔ (اور نہ کھاؤ مال ایک دوسرے کا آپس میں ناحق)

وَلَا تَقْتُلُوٓا أَنْفُسَكُمْ۔ (اور اپنی جانوں کو قتل نہ کرو)

اور دوسرے آدمی کو اللہ کی راہ سے بند کر کے قتل کرنے کا بیان فرمایا:

اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَيَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔

(بہت عالم اور درویش اہل کتاب کے کھاتے ہیں مال لوگوں کے ناحق اور روکتے ہیں اللہ کی راہ سے)

حرصِ دنیا کا انجام

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں ہے،

" وہ سفر میں تھے اور ان کے ہمراہ ان کے حواریوں کی ایک جماعت تھی۔ زمین پر ایک جگہ سونا گِرا ہوا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس پر کھڑے ہوئے اور فرمایا:

" یہ قاتول (بہت ہی قتل مچانے والا) ہے۔ اس سے بچو۔ پھر وہ اور ان کے اصحاب آگے بڑھ گئے۔ اور سونے کی خاطر تین آدمی پیچھے رہ گئے۔ ان میں سے دو کھڑے رہے اور ایک کو بھیجا کہ قریب کے شہر سے ان کے لیے کچھ عمدہ اشیاء خرید لاؤ۔ شیطان نے ان دونوں کے دل میں وسوسہ ڈالا۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ یہ تمام مال تم دونوں کے لیے ہو یا تین میں تقسیم کرنا چاہتے ہو؟ اس لیے اس تیسرے کو قتل کر دو اور آپس میں آدھا آدھا مال بانٹ لو۔ چنانچہ ان دونوں نے ارادہ کر لیا کہ جب وہ واپس آئے تو اسے قتل کر دو۔ اب تیسرے کے پاس شیطان آیا اس نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ کیا تو تیسرا حصّہ مال ہی لے گا؟ نہیں، بلکہ ان دونوں کو قتل کر دے اور سارا مال خود ہی لے لے۔"

بتاتے ہیں کہ اس (تیسرے آدمی) نے زہر خریدا اور کھانے میں ڈال دیا۔ جب وہ کھانا لے کر ان کے پاس آیا تو ان دونوں نے اس پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔ پھر کھانا کھانے بیٹھے۔ جب کھانا کھایا تو خود بھی مر گئے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سفر سے واپس آئے تو سونے کے پاس مُردے پڑے دیکھے اور سونا اسی طرح پڑا تھا۔ ان کے اصحاب کو بڑا تعجب ہوا اور پُوچھا کہ " ان کا کیا معاملہ ہے"؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہ تمام ماجرا بتایا۔

حضرت ابن مبارکؒ سے پوچھا گیا:

" لوگ کون ہیں؟"

فرمایا: " علماء"۔

پوچھا گیا،

" ملوک کون ہیں؟"

فرمایا: " زاہدین"۔

حضرت ابن مسیبؒ نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا:

"جس نے دنیا میں زہد اختیار کیا اللہ تعالیٰ اس کے قلب میں حکمت ڈال دے گا اور اس کی زبان پر (حکمت) جاری کرے گا۔ دنیا کی بیماری اور اس کا علاج اسے دکھا دے گا اور اسے دارالسلام (جنت) کی طرف سلامتی کے ساتھ نکال کر لے جائے گا۔"

ایک حدیث میں ہے:

"دنیا اس کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہیں اور (دنیا) اس کا مال ہے جس کا کچھ مال نہیں اور اس (دنیا) کے لیے وہی جمع کرتا ہے جس کی کچھ عقل نہ ہو۔"

صحابہؓ کا زہد

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"میں نے ستر بدری (صحابہؓ) کو دیکھا۔ اللہ کی قسم اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے جو حلال کیا اس میں بھی تم سے زیادہ زاہد تھے۔ جو تم پر اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا۔ (یعنی تم محرمات میں بھی نہیں رکتے اور وہ حلال اشیاء میں بھی زہد سے کام لیتے۔)"

ایک دوسری حدیث میں آتا ہے:

"جس قدر تم لوگ آسانی و فراغت پر خوش ہوتے۔ اس سے بڑھ کر وہ ابتلاء و مشقت میں خوش ہوتے تھے۔ اگر تم انہیں دیکھ لو تو کہو یہ مجنون ہیں اور اگر وہ تم میں سے بہتر کو دیکھیں تو کہیں۔ انہیں کچھ حصہ حاصل نہیں اور اگر تم میں بدتر کو دیکھیں تو کہیں۔ یہ لوگ قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے۔"

فرمایا:

"اگر ان میں سے کسی کو حلال پیش کیا جاتا تو بھی وہ نہ لیتے اور کہتے، مجھے ڈر ہے کہ اس سے میرا دل بگڑ کر رہ جائے گا۔"

اب جس کا دل ہو تو وہ اسے خراب ہونے سے بچائے گا اور اس کے بگڑ جانے اور بُعد ہونے سے ڈرے گا اور اس کی اصلاح و صحت کی کوشش کرے گا اور جس کا دل ہی نہ ہو وہ خواہشِ (نفس) کے اندھیروں میں بھٹکے گا۔ بسا اوقات وہ متغیر ہو کر رہ جائے گا اور دنیا و آخرت میں خسارہ اٹھائے گا یا دنیا پر راضی رہنے والوں میں اور خدا تعالیٰ کی نشانیوں سے غفلت برتنے والوں میں سے بن جائے گا اب یہ محرومی پر راضی ہوا اور محرومی کو بے مثال اور اعلیٰ ترین چیز (آخرت) پر ترجیح دی۔ جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا وصف بتلاتے ہوئے فرمایا:

وَرَضُوا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنْ اٰيٰتِنَا غٰفِلُوْنَ۔ (اور دنیا کی زندگی پر راضی ہوئے اور اسی پر چین پکڑا، اور جو ہماری قدرتوں سے خبر نہیں رکھتے)

اب وہ حبیب تعالیٰ سے اعراض کا مستحق ہُوا اور خدا کی ناراضگی مول لی جیسے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم اعراض کرنے اور اسے قبول نہ کرنے پر خدا کا غضب آتا ہے۔ فرمایا:

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی عَنْ ذِکْرِنَا وَ لَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا ذٰلِکَ مَبْلَغُھُمْ مِّنَ الْعِلْمِ۔

(سو تو دھیان نہ کر اس پر جو منہ موڑے ہماری یاد سے اور کچھ نہ چاہے مگر دنیا کا جینا)

اور فرمایا:

وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِکْرِنَا وَاتَّبَعَ ھَوٰهُ وَ کَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔

(اور نہ کہا مان اس کا، جس کا دل غافل کیا ہم نے اپنی یاد سے، اور پیچھے لگا ہے اپنی خواہش کے، اور اس کا کام ہے حد پر نہ رہنا)

یعنی ممنوعہ سے تجاوز کرنے والا اور مامورین کو تاہی کرنے والا ہو تو اس کا اتباع نہ کرنا۔ اور ایک قول یہ ہے کہ جو ہلاکت میں پڑنے والا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے اہلِ دنیا پر ناراضگی کے باعث اپنے رسول کو بھی اہل دنیا کی جانب نظر اٹھانے سے منع فرمایا اور بتایا کہ میں نے دنیاوی آرائش ابتلاء کے لیے نمایاں کی اور بتایا کہ بہتر اور باقی رہنے والی چیز قناعت ہے۔ اس فرمان میں ان امور کو بیان فرمایا۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْھُمْ زَھْرَۃَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا لِنَفْتِنَھُمْ فِیْهِ وَ رِزْقُ رَبِّکَ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی۔

(اور نہ پسار اپنی آنکھیں اس چیز پر جو برتنے کو دی ہم نے ان بھانت بھانت لوگوں کو، رونق دنیا کے جیتے ان کے جانچنے کو۔ اور تیرے رب کی دی روزی بہتر ہے)

ایک قول میں ہے کہ قناعت کرے۔ ایک قول یہ ہے ایک ایک دن کی خوراک رکھے۔ ایک قول میں دنیا میں زہد ہے اور کتاب اللہ کے ساتھ یہی توجیہ زیادہ مناسب معلوم ہوتی ہے۔ دلیل یہ ہے کہ فرمایا،

وَ الْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی۔

(اور آخرت بہتر ہے اور باقی رہے)

اسی طرح فرمایا:

وَ رِزْقُ رَبِّکَ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی[1]

(اور تیرے رب کی روزی بہتر اور باقی رہنے والی ہے)

---

[1] طٰہٰ آیت ۱۳۱۔

یعنی دنیا میں زہد اختیار کرنا اور اس کی مثال میں فرمایا؛

وَبَقِیَّۃُ اللّٰہِ خَیْرٌ لَّکُمْ۔ (اور خداوندی بقیہ تمہارے لیے بہتر ہے)

یعنی قناعت بہتر ہے اور ایک قول میں "حلال" بہتر ہے۔

حدیث میں ہے کہ؛

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحابؓ کے ہمراہ دس ماہ کی اُونٹنیوں کے پاس سے گزرے، واپس آئے تو وہ حاملہ تھیں۔ اور یہ ان کے نزدیک محبوب تریں مال ہے۔ اس لیے کہ ان میں گوشت، دُودھ، بچے اور گوبر خوب ہوتا ہے۔ یہی وُہ اُونٹنیاں ہیں جن کی مثال حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین لوگوں کے لیے دی۔ آپؐ نے فرمایا؛

"لوگ سو اُونٹوں کی طرح ہیں کہ ان میں کوئی ہی راحلہ ہوگی۔ یعنی اُونٹ کثرت سے ہیں اور راحلہ جو کہ ان پانچ صفات کی جامع ہے۔ وُہ بہت ہی کمیاب ہے اور یہی عشار ہیں جن کا ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ [1] (اور جب بیاہی اونٹنیاں چھٹی پھریں)

یعنی اہل راحلہ نے اسے چھوڑ دیا اور ان میں مصروفیت کے باعث قیامت کے طویل روز قیامت کے باعث بھاگ اُٹھے۔ بتایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے اعراض کیا اور آنکھیں بند کریں۔

عرض کیا گیا؛

"اے اللہ کے رسولؐ! یہ صرف ہمارے اموال ہیں۔ آپؐ ان کی جانب کیوں نظر نہیں اٹھاتے؟"

آپؐ نے فرمایا؛

"اللہ تعالیٰ نے مجھے اس سے منع فرما دیا۔"

پھر یہ آیت تلاوت کی؛

وَلَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْكَ ۔ الآیۃ (اور اپنی آنکھیں نہ پسار)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہُوئی:

وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ۔ [2] (اور جو لوگ جمع کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی)

تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا؛

---

[1] تکویر۔ آیت ۴ ۔

[2] توبہ ۔ آیت ۳۴ ۔

"بردباری ہے دینار اور درہم کے لیے۔"

راوی بتاتے ہیں کہ ہم نے عرض کیا کہ "ہمیں اللہ تعالیٰ نے سونے چاندی کو ذخیرہ کرنے سے منع کر دیا۔ اب ہم کس چیز کا ذخیرہ کریں؟"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم میں سے ہر آدمی کو چاہیے کہ وہ ذکر کرنے والی زبان، شاکر دل اور ایسی صالحہ بیوی لے جو اس کے اخروی معاملہ میں تعاون کرے۔"

حبِ دنیا کا انجام

حدیثِ حذیفہ رضی اللہ عنہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"جس نے آخرت پر دنیا کو ترجیح دی۔ اللہ تعالیٰ اس کو تین باتوں میں مبتلا کر دے گا:

۱۔ غم (ڈال دے گا) جو کبھی بھی اس کے دل سے جدا نہ ہو گا۔

۲۔ فقر (طاری کر دے گا) جو کبھی اسے غنی نہ ہونے دے گا۔

۳۔ لالچ (میں پھنسا دے گا) کہ کبھی سیر نہ ہو سکے گا۔

ایک مرسل حدیث حضرت علی بن ابی طلحہ سے مروی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بندے کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ جو نہیں سمجھتا وہ اس کے نزدیک اس سے زیادہ محبوب ہو جائے کہ جو سمجھے اور چیز کا کم ہونا اس کے نزدیک کثرتِ چیز سے زیادہ محبوب ہو۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے منقول ہے:

"دنیا ایک پل بنا کر پیدا کی گئی کہ اس پر سے گزر کر آخرت کو جاتے ہیں۔ اس لیے اس کو عبور کرو۔ اور اس پر بسیرا نہ کر لو۔"

ایک آدمی نے ان سے کہا:

"اپنے سفر میں مجھے بھی ساتھ لے لیں۔"

فرمایا:

"جاؤ، پانی پر ایک مکان بناؤ۔"

لوگوں نے کہا:

"پانی پر عمارت کیونکر قایم رہ سکتی ہے؟"

فرمایا:

"تو دنیا کی محبت پر عبادت کیونکر قائم رہ سکتی ہے؟"

اور فرمایا:

"تم میں سے کوئی اس وقت ہی حقیقی ایمان تک رسائی حاصل کر سکتا ہے جب کہ وُہ خدا تعالےٰ کی عبادت پر مدح کو ناپسند کرے اور دنیا کے کھانے کی پروانہ کرے۔"

حضرت بشر بن حارث فرماتے تھے:

"زہد کے ساتھ ہی تقوی میں حسن آتا ہے۔"

ایک بار فرمایا:

"اغنیاء کو عبادت سجتی نہیں۔ دولت پر عبادت ایسے ہی ہے جیسے کہ کوڑے پر باغ لگا دیں اور فقیر پر عبادت ایسے ہے جیسے کہ ایک حسین گردن میں جواہرات کا ہار پہنا دیں۔ ہم نے یہ بات کتاب اللہ سے استنباط کی چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فرمان میں وصفِ فقراء کا مفہوم یہ ہے:

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ[1]

پھر فرمایا:

تَرٰهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا۔ (ان فقراء کو جو اٹک رہے اللہ کی راہ میں)

چنانچہ ان کے حسنِ فقر کی بنا پر ان کی عبادت بھی حسن وجمال اختیار کر گئی۔

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو شیطانی دخل اندازیوں سے آگاہ کرتے ہوئے وصیت کی اور فرمایا:

"جب وہ تیرے پاس فقر کی طرف سے آئے تو اسے بتا دے کہ غنی وہ ہے جو اللہ تعالےٰ کی اطاعت کرے اور فقیر وُہ ہے جس کو اس کی معصیت رُسوا کر دے اور جب وُہ تجھے دولت کی خواہش دے تو اسے بتا دے کہ میں دولت و عبادت کو مناسب طریق پر جمع نہیں کر سکتا۔

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"علمائے ربانیین کا طریقہ یہ ہے کہ وہ حکمت و موعظت کی بات صرف دنیا میں زہد کرنے والوں سے ہی سنتے ہیں اور فرمایا کہ اہلِ دنیا اس قابل نہیں اور یہ (حکمت و موعظت) کے قابل نہیں ہیں۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں وحی فرمائی:

"اسے ابنِ آدم! زندگی کے ایام اس طرح گزار جس طرح وہ روتا ہے جس نے دنیا کو الوداع کہا اور جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس کی خواہش کی۔ بقدر ضرورتِ (زندگی) ہی دنیا پر اکتفا کر تاکہ تجھ سے بدمزگی اور

---

[1] البقرہ۔ آیت ۲۷۳

گھُوڑا بن رک جائے ۔ میں تجھے صحیح کہتا ہُوں ، تو صرف اپنے دن و ساعت کے ساتھ ہی ہے ۔ تو نے جو دنیا سے لیا اور جس میں اسے خرچ کیا تیرے خلاف وہ (حساب) لکھا ہُوا ہے ۔ اب اس کو دیکھ کر عمل کر۔ اس لیے کہ تجھ سے پرسش ہوگی ۔ اگر تو جان لے کہ صالحین سے کیا کیا وعدے کیے تو تیری جان نکل جائے ۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام فرمایا کرتے تھے :

" دنیا کی شیرینی آخرت کی تلخی ہے اور لباس کی عمدگی ، دل کا تکبر ہے اور پیٹ کا بھرنا نفس کا بھرپور پیمانہ یعنی اس کی قوت واجتماع ہے ۔ میں تمہیں حق کہتا ہوں کہ جس طرح ایک بیمار آدمی کو عمدہ کھانے میں بھی مزہ نہیں آتا اسی طرح دنیا سے محبت کرنے والے کو عبادت میں حلاوت محسوس نہیں ہوتی ۔ دنیا میں یہ بات بھی زہد کی ہے کہ ملائم لباس ترک کر دے جس پر نظریں اٹھیں اور پُرلطف کھانوں سے پرہیز کرنا ، اہلِ نعمت جن شہوات میں ڈوبے ہُوئے ہیں انہیں ختم کرنا ۔ اہلِ ثروت جن فخر و زینت کی اشیاء پر لٹو ہو چکے ان سے علیحدگی اختیار کرنا بھی زہد ہے ۔ یہ بھی زہد میں داخل ہے کہ ایک ہی چیز کو کئی اشیاء کی جگہ استعمال کرے ۔ سامان کے سلسلہ میں سلف کا یہی طریق تھا کہ جیسے دنیا دار لوگ ایک ہی کام میں بکثرت اشیاء استعمال میں لاتے ہیں ۔ وہ ایک ہی چیز کام میں لاتے "اور کثرتِ اشیاء ، دراصل تکاثر (کثرت کی خواہش) کا مذموم وصف ہے اور یہ بات ابوابِ دنیا میں سے ہے ۔"

بعض سلف ؒ کا فرمان ہے :

" زہد کی ابتداء لباس ہے " ۔

اور بعض علماءؒ کا فرمان ہے :

" جس کا لباس رقیق ہوا اس کا دین بھی رقیق ہو گیا " ۔

تواضع کا انعام

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا :

" لباس ، لباس سے اس وقت مشابہ ہوتا ہے جبکہ دل دل سے مشابہ ہو جائے " ۔

اور ایک خبرِ مشہور میں ہے :

" شکستہ حال ہونا ایمان سے ہے " ۔

ایک قول کے مطابق یہ لباس میں شکستگی کے قریب ہونا مراد ہے ۔ اس کی توضیح کرنے والی حدیث ہے کہ :

" جس نے لباسِ جمال ترک کیا حالاں کہ وہ اس پر قدرت رکھتا ہے ۔ (اور صرف) اللہ تعالیٰ کی خاطر تواضع کرتے ہُوئے (ایسا کیا) ۔ تو اللہ تعالیٰ اسے لباس ہائے ایمان میں اختیار دیں گے کہ وہ

دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"جس نے اللہ تعالیٰ کی خاطر زینت ترک کردی اور اللہ تعالیٰ کی خاطر تواضع کرتے ہُوئے اچھا لباس اتار دیا۔ اس کی (رضا) چاہتے ہوئے (ایسا کیا) تو اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ یاقوت کے تختوں میں اعلیٰ ترین جنت اس کے لیے جمع کرے۔"

جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اہل قبا کے ہاں تشریف لائے تو انہوں نے شہد ملا مشروب پیش کیا۔ آپؐ نے اپنے ہاتھ سے پیالہ رکھ دیا اور فرمایا:

"میں اس کو حرام نہیں کرتا مگر اس کو اللہ تعالیٰ کے لیے تواضع کرتے ہُوئے چھوڑتا ہوں۔"

موٹا لباس پہنو

ایک بار ایک گرم دن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ٹھنڈا پانی پیش کیا گیا تو فرمایا:

"اس کا حساب مجھ سے ہٹا دو۔"

اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف وحی فرمائی:

"میرے اولیاء کو کہہ دو کہ میرے دشمنوں کا (سا) لباس نہ پہنیں اور میرے دشمنوں کے گھروں میں نہ جائیں ورنہ جس طرح وہ میرے دشمن ہیں تم بھی میرے دشمن ہو جاؤ گے۔"

بشر بن مروان نے کوفہ کے منبر پر خطبہ دیا تو ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"اپنے امیر کو دیکھو، لوگوں کو وعظ کر رہا ہے اور اس پر فساق کا لباس ہے۔"

میں نے پوچھا:

"اس پر کیسا لباس تھا؟"

کہا: "باریک لباس تھا۔"

عامرؓ بن عبداللہ بن ربیعہ ایک روز حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے پاس کتان کے لباس میں آئے اور ان سے زہد کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ حضرت ابوذرؓ نے ہتھیلی منہ پر رکھ کر تھو تھو کر دیا۔ (اس کی مذمت کا انداز اختیار فرمایا)۔ عامر کو غصہ آیا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا:

"آپ نے دیکھا نہیں کہ آپ کے بھائی ابوذر نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

انہوں نے پوچھا:

"کیا بات ہُوئی؟"

کہا: "میں زہد کے بارے میں کلام کرنے لگا اور وہ میرے ساتھ تمسخر کرنے لگے۔"

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"یہ (تمسخر) تو نے خود اپنے ساتھ کیا۔ تُو ابو ذرؓ کے پاس اس کتان (کے اچھے) بناس میں جاتا ہے اور زہد کی باتیں کرتا ہے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے ائمہ ہدایت پر پابندی لگائی کہ وُہ معمولی درجہ کے حال کی طرح رہیں تاکہ دولت مند ان کی پیروی کرے اور فقیر کو اس کا فقر شکستہ دل نہ کرے۔"

لباس کے معاملہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہا گیا۔ وہ سوت کا موٹا لباس پہنتے تھے۔ ان کی قمیص کی قیمت تین درہم اور پانچ درہم ہوتی اور انگلیوں سے آگے جو حصّہ بڑھ آتا اسے کاٹ دیتے اور فرماتے:

"یہ تواضع کے قریب تر ہے اور اس قابل ہے کہ مسلمان میری اقتداء کرے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس یمن سے چادریں آئیں۔ آپؓ نے انہیں صحابہؓ پر ایک ایک چادر کر کے تقسیم کیں۔ پھر جمعہ کے روز منبر پر چڑھ کر لوگوں کو خطبہ دیا اور اس وقت ان پر نیا جوڑا (حلّہ) تھا اور عربوں میں حلّہ سے مراد ایک ہی جنس کے دو کپڑے مراد ہیں۔ ان کے نزدیک یہ خوبصورت ترین لباس ہے۔ فرمایا:

"خبردار سنو، خبردار سنو" پھر نصیحت فرمائی۔

حضرت سلمانؓ اٹھے اور کہا:

"واللہ ہم نہیں سنیں گے۔"

پوچھا: "یہ کیوں؟"

کہا: "اس لیے کہ آپ نے ہمیں ایک ایک چادر دی اور خود جوڑا پہن لیا۔ تم نے ہم سے زیادہ دنیا لی۔"

حضرت عمرؓ مسکرا دیے اور فرمایا:

"اے ابو عبداللہ! تُو نے جلدی کی۔ اللہ تجھ پر رحم فرمائے۔ میں نے اپنے پرانے کپڑے دھوئے تھے اس لیے عبداللہ بن عمر کی چادر مستعار لی اور اپنی چادر کے ساتھ ساتھ اسے بھی اوڑھ لیا۔"

حضرت سلمانؓ نے کہا:

"اب کہیے، ہم سنیں گے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنعّم کی زندگی بسر کرنے سے منع کیا اور فرمایا:

"اللہ کے بندے تنعّم کی (زندگی) نہیں گزارتے۔"

حضرت فضالہ بن عبید مصر کے حاکم تھے۔ یہ شکستہ حال اور برہنہ پا رہتے۔ کسی نے کہا:

"تم امیر ہو اور یہ حال ہے؟"

فرمایا؛ "ہمیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عیش و مزے کی زندگی سے منع فرمایا اور ہمیں حکم دیا کہ ہم گاہے گاہے ننگے پاؤں چلیں۔"

منقول ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو خطاب کیا اور فرمایا؛

"میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں۔ اگر کوئی آدمی میرے اندر عیب دیکھے تو مجھے بتا دے۔"

ایک نوجوان اٹھا اور کہا؛

"تیرے اندر دو عیب ہیں۔"

پوچھا؛ "وہ کیا کیا ہیں؟ اللہ تجھ پر رحم فرمائے۔"

کہا؛ "تم دو چادروں میں دامن ملاتے ہو اور دو سالن جمع کرتے ہو۔"

راوی بتاتے ہیں کہ وصال تک نہ دو چادروں میں دامن ملایا اور نہ انہوں نے دو سالن جمع کیے۔ اس طرح مروی ہے۔ شیخ نے اس کے اسناد سے بتایا کہ یذیل، ذال کے ساتھ ہے کہ (الفاظ یہ تھے؛ تذیل بین البردین و تجمع بین الادمین) اب معنی یہ ہے کہ تم ان دونوں پلوؤں کو جمع کرتے ہو۔ چنانچہ اوپر کا پلو نیچے کے پلو پر مل جانا اوپر کی چادر کے طول سے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تذیل دال کے ساتھ ہے۔ یعنی تم ایک کو دوسرے کے ساتھ بدلتے ہو۔ اس کا بدلنا اور اس کا بدلنا۔ اور یہ بھی درست ہے کہ ذال کے ساتھ اذالۃ میں سے ہو یعنی رسوا کرنا۔ کہا کرتے ہیں؛ اشل ھذا و اذل ھذا (اس کو شل کر دیا اور اس کو رسوا کر دیا)۔

ایسے ہی قول ہے کہ یہ بات بھی علم کو ذلیل کرنے کی ہے کہ ایک عالم ہر سوال کا جواب ضرور دے۔ گویا وہ اسے تمہارے پاس رکھ کر (رسوا) کر رہا ہے اور یہ دولۃ سے تدیل کے معنی کی طرف جاتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کہا؛

"اگر تو اپنے دو ساتھیوں (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) سے ملنا چاہے تو قمیص پر پیوند لگاؤ۔ تہ بند چھوٹا رکھو۔ جوتے میں پیوند لگاؤ اور سیر ہونے سے کم کھاؤ۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے؛

"بوسیدہ کرو (کپڑے وغیرہ کو)۔ کھردرا (لباس وغیرہ) رکھو۔ چست رہو اور عجم کے لباس (یعنی کسری و قیصر (وغیرہ) کے لباس سے بچ کر رہو۔"

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا؛

"جس نے جس قوم کا لباس اختیار کیا وہ انہی میں سے ہے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان اس سے بھی شدید تر ہے۔ فرمایا:

"میری امت کے بدترین لوگ وہ ہیں جن کو نعمتیں ملیں۔ جو رنگا رنگ قسم کے کھانے اور رنگا رنگ قسم کے لباس پہنتے ہیں اور باچھیں کھول کھول کر باتیں کرتے ہیں۔"

جب حمص کے حاکم حضرت عمیر بن سعدؓ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو (حضرت عمر رضی اللہ عنہ) نے پوچھا:

"اے عمیر! تیرے پاس دنیا کس قدر ہے؟"

انہوں نے کہا:

"میرے پاس میری لاٹھی ہے جس پہ سہارا لیتا ہوں اور اس کے ساتھ اگر سانپ دیکھ لوں تو اسے قتل کرتا ہوں اور میرے پاس جراب (چمڑے کا برتن) ہے جس میں اپنا کھانا رکھتا ہوں اور میرے پاس پیالہ ہے، جس میں کھاتا ہوں۔ اس میں (پانی ڈال کر) اپنا سر اور کپڑے دھو لیتا ہوں اور میرے پاس پاک کرنے والی چیز ہے جس میں پینے اور وضو کے لیے پانی رکھتا ہوں۔ یعنی مشک ہے۔ اس کے بعد جو دنیا ہے وہ جو میرے پاس ہے۔ اس کی ماتحت ہے۔"

حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"تم نے سچ کہا، اللہ تجھ پر رحم کرے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اہل حمص کو لکھا کہ فقراء کے نام بھیجو۔ انہوں نے رقعہ میں کچھ نام بھیجے اور ان میں سعید بن جذیم رضی اللہ عنہ کا بھی ذکر کیا۔ ایک قول یہ ہے کہ عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ کا ذکر کیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

"یہ سعید بن جذیم کون ہیں؟"

انہوں نے عرض کیا:

"اے امیر المومنین! یہ ہمارے حاکم ہیں۔"

پوچھا:

"کیا یہ فقیر ہیں؟"

انہوں نے کہا:

"ہاں، ان سے زیادہ فقیر ہم میں سے کوئی نہیں۔"

پوُچھا:" توانہوں نے وظیفہ کا کیا کیا؟"

کہا:" وہ سارا (اللہ کی راہ میں) خرچ کر دیتے ہیں۔ اپنے لیے اور اپنے گھر کے لیے کچھ نہیں رکھتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چار صد دینار انہیں بھیجے اور کہا کہ انہیں اپنے آپ پر اور اپنے گھر والوں پر خرچ کریں۔

جب یہ رقم پہنچی تو وُہ اپنی بیوی کے پاس روتے ہوئے آئے۔ اس نے پوچھا:

"کیا معاملہ ہے۔ کیا امیرالمومنین کی وفات ہوگئی ہے؟"

فرمایا:" اس سے بھی بڑی آفت ہے۔"

پوچھا:" کیا مسلمانوں میں پھوٹ پڑ گئی ہے؟"

فرمایا:" اس سے سخت تر معاملہ ہے۔"

پوچھا:" آخر کیا بات ہُوئی ہے؟"

فرمایا:" میرے سامنے دنیا آ گئی جب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا تو مجھ پر دنیا نہ کھلی اور میں ایامِ ابوبکر رضی اللہ عنہ میں تھا تو مجھ پر دنیا نہ کھلی اور آج عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں رہ گیا۔ یاد رکھو میرے بدتر دن یہی ہیں۔ پھر سارا واقعہ کہہ سُنایا۔"

بیوی نے کہا:

"میری جان قربان جو تیرا جی چاہے اس مال سے معاملہ کر۔"

انہوں نے فرمایا:

"کیا تُو میری مدد کرے گی کہ میں جیسا چاہتا ہوں اس کے ساتھ کروں؟"

اس نے کہا:" ہاں!"

فرمایا:" مجھے میری پرانی چادر دے دو۔"

راوی بتاتے ہیں کہ انہوں نے چادر کے کئی ٹکڑے کیے اور دس دس، پانچ پانچ اور تین تین کی کئی تھیلیاں سی بنائیں۔ تمام دینار بھر کر اپنے توبرے میں رکھے اور بغل میں دبا کر نکل گئے۔ آخر مسلمانوں کا لشکر ملا جو جہاد پر جا رہا تھا تو ان کے حال کے مطابق ایک ایک تھیلی ہر ایک کو دے دی۔ پھر واپس آ گئے اور اپنے گھر والوں کے لیے ایک دینار بھی نہ رکھا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اور تابعین عظام کا یہ اسوۂ حسنہ ہے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

حضرت عیاض بن غنم کی حدیث میں ہے۔ انہوں نے اخیار و صالحین کے اوصاف کے بارے میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا:

آپؐ نے فرمایا:

"میری امت کے بہترین لوگ جو مجھے ملاءِ اعلیٰ نے بتایا۔ وہ جماعت ہے کہ جو ظاہر میں اپنے پروردگار کی وسعتِ رحمت کے باعث ہنستی ہے اور باطن میں خدا تعالیٰ کے خوف سے روتی ہے۔ لوگوں پہ ان کا بوجھ کم ہے اور اپنی جانوں پر زیادہ ہے۔ پرانے کپڑے پہنتے ہیں، خائفین کی راہ چلتے ہیں۔ ان کے ابدان زمین پر ہیں اور ان کے دل عرش کے پاس ہیں۔"

حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے، اس میں ابدال کا وصف بیان کیا۔ راوی بتاتے ہیں کہ میں نے ان سے عرض کیا:

"میرے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ میں اس وصف کا حامل بن جاؤں؟ اور میرے لیے یہ کب ہوگا کہ میں ان جیسا ہو جاؤں؟"

فرمایا:

"اے برادرزادے! تیرے اور اس کے درمیان یہی فاصلہ ہے کہ تُو اس کے آغاز و وسط میں دنیا میں زہد اختیار کرے۔ پھر تو اپنے قلب کے ساتھ آخرت کا مشاہدہ کرے اور اس کے لیے ہی کام کرے گا۔"

حدیث میں ہے:

"اللہ تعالیٰ (پھٹے پرانے) کپڑے پہننے والے کو دوست رکھتا ہے جو اس کی پروا نہ کرے کہ کیا پہنا۔"
(یعنی نفاست اور قرینے میں نہیں ڈوبا رہتا بلکہ جیسے آیا پہن لیا)

حضرت ثوری اور حضرت فضیل رحمہما اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"تمام شر ایک مکان میں رکھا گیا اور اس کی کنجی، دنیا میں رغبت رکھنا بنا دی گئی اور تمام خیر و بھلائی ایک مکان میں رکھی گئی اور اس کی کنجی دنیا میں زہد کرنا قرار دی گئی۔"

حضرت یوسف بن اسباط اور سفیان ثوری رحمہما اللہ تعالیٰ سے پوچھا گیا:

"کون سا عمل افضل ترین ہے؟"

انہوں نے فرمایا:

"دنیا میں زہد اختیار کرنا۔"

اور یہ بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مروی ظاہر روایت میں موجود ہے۔

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"دنیا کی محبت ہر گناہ کی جڑ ہے۔" اس میں غور سے معلوم ہوا کہ دنیا سے بغض رکھنا ہر نیکی کی جڑ ہے۔ بعض

سلفؒ اس طرح فرمایا کرتے تھے،

"یہی گناہ کافی ہے کہ دنیا کی محبت سے توبہ و استغفار نہ کرے۔"

اس سے سخت تر روایت حضرت سفیانؒ نے حضرت یحییٰ بن سلیم طائیؒ سے نقل کی۔ انھوں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوعاً بیان کیا:

"اگر ایک بندہ تمام اہلِ آسمان و اہلِ زمین کے برابر عبادت کرے اور دنیا سے محبت رکھتے ہوئے (اللہ) سے ملے۔ اللہ تعالیٰ اسے مخلوق کے درمیان ایک مقام پر کھڑا کرکے اس کی تشہیر کرے گا کہ فلاں ابن فلاں نے ایسی چیز سے محبت کی جو اللہ تعالےٰ کی مبغوض ہے۔"

حضرت یحییٰ بن جابر طائیؒ نے بتایا کہ حضرت عمرو بن اسود عنسیؒ نے فرمایا:

"میں کبھی بھی لباسِ شہرت (فاخرہ لباس) نہیں پہنوں گا۔ میں رات کو کبھی گرم بدن سے لپٹے ہوئے (امیرانہ) کپڑے (دثار) میں نہیں سوؤں گا۔ (یعنی امیرانہ رضائی اور زاید گرم کپڑے نہیں اوڑھوں گا) اور میں کبھی بھی مابور (نشان زدہ) سواری پہ سوار نہ ہوں گا اور میں کبھی بھی اپنا پیٹ کھانے سے پُر نہیں کروں گا۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا،

"جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریق دیکھنے میں مسرت محسوس کرے وہ عمروؓ بن اسود کو دیکھے۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک سفر سے واپس تشریف لائے۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لائے تو دیکھا کہ ان کے دروازے پر ایک پردہ ہے اور ہاتھوں میں چاندی کے کنگن پہن رکھے ہیں۔ آپؐ واپس چلے گئے۔ حضرت ابو رافعؓ ان کے پاس آئے تو وہ رو رہی تھیں۔ (حضرت فاطمہؓ) نے انہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واپس چلے جانے کی اطلاع دی۔ (حضرت ابو رافعؓ نے فرمایا:"پردے اور کنگنوں کی وجہ سے (آپؐ واپس چلے گئے)۔ (حضرت فاطمہؓ) نے پردہ پھاڑ دیا اور کنگن اتار کر حضرت بلالؓ کے ہاتھ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیج دیے اور عرض کیا:

"میں نے ان کو صدقہ کر دیا۔ آپؐ جہاں مناسب سمجھیں خرچ کر دیں۔"

آپؐ نے فرمایا،

"جاؤ۔ اسے فروخت کر کے (اس کی قیمت) اہل صفہ کو دے دو۔"

چنانچہ دونوں کنگن اڑھائی درہم میں فروخت ہوئے اور (اصحاب صفہ پر) صدقہ کو دیے گئے۔ پھر آپؐ (حضرت فاطمہؓ کے) گھر تشریف لائے اور فرمایا،

"تیرا باپ تجھ پر قربان، تُو نے اچھا کیا۔"

ایک روایت میں ہے:

"جو آدمی بھی لباسِ شہرت پہنے، جب تک اسے اتار نہ دے اللہ تعالیٰ اس سے اعراض فرما لیتا ہے۔ چاہے اس کے نزدیک وہ (پہلے) محبوب آدمی ہو۔"

حضرت سفیان ثوری اور دیگر مشائخ کا فرمان ہے:

"ایسا لباس پہنو جو علماء کے ہاں تیری شہرت نہ کرے اور جہلاء کے نزدیک تیری تحقیر نہ ہو۔"

اور فرمایا کرتے:

"اگر ایک فقیر میرے پاس سے گزرے اور میں نماز پڑھ رہا ہوں تو اسے گزرنے دیتا ہوں۔ اور اگر دنیاداروں میں سے کوئی گزرے اور اس پر کتان کا (بڑھیا) لباس ہو تو مجھے ان پر غصہ آتا ہے اور میں انہیں گزرنے نہیں دیتا۔"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"حضرت ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں میں نے دولت مند سے زیادہ ذلت اٹھانے والا نہیں دیکھا۔ اور حضرت ثوریؒ ہی کی مجلس میں میں نے فقیر سے زیادہ عزت مند کسی کو نہیں دیکھا۔"

ایک دوسرے بزرگؒ فرماتے ہیں:

"ہم جب حضرت سفیان (ثوری رحمۃ اللہ علیہ) کے پاس بیٹھتے تو تمنا کرتے۔ کاش! ہم فقراء ہوتے جبکہ ہم دیکھتے کہ وہ فقراء سے کس قدر عزت و توجہ سے پیش آتے ہیں۔"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"عالم وہ ہے کہ جس کے پاس فقیر آدمی غنی ہو کر اٹھے اور غنی آدمی فقیر ہو کر اٹھے۔"

بعض مشائخؒ کا فرمان ہے:

"میں نے حضرت سفیانؒ کے کپڑوں اور جوتوں کی قیمت لگائی تو ایک درہم اور چار دانق کا سب سامان تھا۔"

ابن شبرمہؒ نے فرمایا:

"بہترین کپڑا وہ ہے جو میری خدمت کرے اور بدترین کپڑا وہ ہے جس کی میں خدمت کروں۔"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"مجھے سب سے پسندیدہ لباس وہ ہے جو مجھ سے خدمت نہ کرائے اور مجھے سب سے محبوب کھانا وہ ہے جس کے بعد ہاتھ تک دھونے نہ پڑیں۔"

ایک عالمؒ فرماتے ہیں:

" ایسا لباس پہنو جو تجھے عوام میں ملائے رکھے اور ایسا لباس مت پہنو جو تیری شہرت کرے کہ لوگ تیری طرف نظریں اٹھائیں "

صحابہؓ کا لباس

راوی بتاتے ہیں :

" ہم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قمیص میں چودہ پیوند شمار کیے ان میں سے بعض چمڑے کے پیوند تھے ."

بعض علماءؒ فرمایا کرتے :

" ابنِ آدم پر کپڑوں کی کثرت ، خدا تعالےٰ کی طرف سے اس کے لیے سزا ہے ."

حضرت خواص رحمۃ اللہ علیہ دو ٹکڑوں سے زیادہ نہ پہنتے . دو چادریں ہوتیں یا ایک قمیص اور اس کے نیچے ایک تہ بند ہوتا . اور قمیص کا پلو سر پر ڈال لیتے اور درمیان سے کھلا چھوڑ دیتے . اور اس طرح سر ڈھانپ لیتے . ایک فقیر کے لیے یہی طریق مستحب ہے اور لباس کی یہی حد ہے .

حضرت ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا :

" کپڑے تین ہیں :

۱ . اللہ تعالیٰ کے لیے کپڑا .

۲ . نفس کے لیے کپڑا .

۳ . اور لوگوں کے لیے کپڑا .

چنانچہ جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے وہ اس قدر ہے جو پردہ پوشی کرے اور اس میں فرض ادا ہو سکے اور جو نفس کے لیے ہے وہ ایسا ہے جس کی ملائمت و صفائی کا نفس خواہشمند ہو اور جو لوگوں کے لیے ہے وہ ایسا ہے جس کا حسن و جمال اور عمدگی لوگوں کو مطلوب ہو . پھر فرمایا :

گاہے ایک کپڑا اللہ تعالیٰ کے لیے بھی ہوتا ہے اور نفس کے لیے بھی ہوتا ہے .

بعض علماء کے نزدیک ایک آدمی کو چالیس دراہم سے زیادہ قیمت کے کپڑے نہیں پہننے چاہئیں (یعنی سارا لباس چالیس درہم سے زیادہ قیمتی ہونا مکروہ ہے) . اور بعض نے ایک صد دراہم بتایا . اور اس سے قیمتی لباس پہننا فضول خرچی اور اسراف میں داخل ہے .

جمہور صحابہ اور تابعینِ عظام کے لباس عام طور پر بیس سے تیس درہم تک کے ہوتے اور متقدمین صحابہ میں سے بعض ایسے بھی ہیں کہ جن کے تہ بند کی قیمت صرف بارہ درہم ہوتی . چنانچہ وہ دو ایسے کپڑے پہنتے جن کی مجموعی قیمت بیس درہم سے چند درہم زاید ہوتی .

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک کپڑا چار درہم میں خریدا اور آپؐ کے دو کپڑوں کی قیمت دس درہم سے لے کر ایک دینار تک ہوتی اور آپؐ کے تہ بند کی لمبائی ساڑھے چار ذراع تھی۔ آپؐ نے تین درہم میں سلوار خرید فرمائی اور آپؐ اون کی دو سفید چادریں بھی زیبِ تن فرمالیتے۔ اسے حلّہ کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں ایک ہی جنس کے دو کپڑے ہوتے ہیں۔ بسا اوقات اس قسم کے موٹے (کپڑے) کی دو یمنی یا رومی چادریں بھی استعمال فرمائیں۔

ایک روایت میں ہے کہ،

"جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیص ایسی (بھی دیکھی گئی) تھی گویا کہ وہ ایک زیات (تیل والے) کی قمیص ہے۔"

ریشم حرام ہے

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز سندس (ریشم) کا دھاری دار کپڑا بھی زیبِ تن فرمایا جس کی قیمت دو صد درہم تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسے چھونے اور کہتے،

"کیا آپؐ پر یہ جنت سے نازل ہوا ہے؟" یعنی تعجب کرتے۔ اور یہ لباس آپؐ کو مقوقس شاہِ اسکندریہ نے ہدیہ میں ارسالِ خدمت کیا تھا۔ آپؐ نے اس کا ہدیہ قبول کرنے کی خاطر اور اس کی عزت افزائی کی خاطر اسے پہنا۔ پھر اتار کر مشرکین میں سے ایک آدمی کو صلہ رحمی کرتے ہوئے دے دیا۔ پھر حریر و دیباج (ریشم) حرام کر دیا گیا اور لگتا ہے اگر بعد میں پہنا ہو تو حرمت کی تاکید کی خاطر پہنا ہوگا۔ اور (پھر اتار کر بتا دیا کہ یہ حرام ہے) جیسے کہ ایک روز آپؐ نے سونے کی انگوٹھی پہنی پھر اُسے اتار دیا۔ چنانچہ مردوں پر اسے حرام کر دیا گیا۔ اور حضرت بریرۃ رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں آپؐ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا کہ،

"اس کے اہل کے لیے ولاء (لباس قرابت داری وغیرہ) جب انہوں نے خریدا تو آپؐ منبر پر تشریف لائے اور اسے حرام قرار دیا۔ یہ تاکیدِ تحریم میں سے ہے۔ جیسے کہ آپؐ نے تین روز متعہ مباح بتایا۔ پھر نکاح کے معاملہ کی تاکید کے لیے اسے حرام فرمایا۔"

علمائے دنیا کا ہے اس واقعہ کو پیش کر کے استدلال کرتے ہیں اور اپنے لیے حیلہ و راہ تلاش کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی اس کی دعوت دیتے ہیں اور پھر متشابہ حدیث کے ساتھ تاویل کرتے ہوئے اللہ تعالے تک دعوت بلند کرتے ہیں جیسے کہ اہل زیغ و گمراہ لوگوں کا طریق ہے کہ وہ دنیا طلبی اور فتنہ خواہی کی خاطر متشابہ آیاتِ قرآن میں تاویلات کرتے پھرتے ہیں۔ یہ یاد رکھیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کلام اللہ کا مفہوم ہے۔ اس میں بھی ناسخ و منسوخ، محکم و متشابہ اور خاص و عام ہیں۔ علمائے دنیا اور اہل ہوی

نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محکم فرامین کو چھوڑ کر متشابہات کو لیا۔

سنّتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک منقش جبّہ میں نماز ادا کی۔ جب آپؐ نے سلام پھیرا تو فرمایا:

"اس میں نظر نے مجھے مشغول کیا۔ اسے ابوجہم کے پاس لے جاؤ اور اس کی چادر مجھے لادو" یعنی آپؐ نے موٹی چادر کو ملائم کپڑے پر ترجیح دی اور اسے پسند فرمایا۔

آپؐ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے دروازہ پر پردہ لٹکا دیکھا تو اسے پھاڑ دیا اور فرمایا:

"میں جب بھی اسے دیکھتا ہوں تو دنیا یاد آتی ہے۔ اسے آلِ فلاں کے پاس بھیج دو"

ایک شب کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کیلئے نیا بستر بچھایا آپ اس سے قبل دوہرے عباء پر سوتے تھے۔ اس رات آپؐ شب بھر پہلو بدلتے رہے۔ جب صبح ہوئی تو فرمایا:

"میرا پرانا عبا ہی ڈال دو۔ اس بستر نے مجھ سے رو کے رکھا اور شب بھر بیدار رکھا"

اس طرح آپؐ کے پاس عشار کے وقت پانچ یا چھ دینار آگئے تو آپؐ نے یہ رات جاگتے ہی گزار دی آخر کار رات کے آخری حصہ میں انہیں گھر سے نکالا۔ حضرت عائشہؓ نے بتایا۔ آپؐ اس کے بعد سوئے، حتیٰ کہ میں نے آپ کے خرّاٹوں کی (آواز) سنی۔

پھر آپؐ نے فرمایا:

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اپنے پروردگار کے ساتھ کیا گمان ہوگا کہ اگر وہ (اپنے) اللہ تعالیٰ سے ملے اور یہ (دینار) اس کے پاس ہوں!"

آپؐ کے عربی نعل مبارک کا تسمہ پرانا ہو گیا۔ اسے بدل کر نیا تسمہ ڈال دیا گیا۔ آپؐ نے اس میں نماز ادا فرمائی۔ جب سلام پھیرا تو فرمایا:

"پرانا تسمہ دوبارہ ڈال دو اور یہ نیا نکال لو۔ اس لیے کہ نماز کی حالت میں اس پر نظر چلی گئی"

آپؐ نے انگوٹھی پہنی۔ جب آپؐ منبر پر تشریف فرما تھے تو اس پر نظر کی تو اسے پھینک دیا اور فرمایا:

"اس نے مجھے تم سے ہٹا کر مشغول کیا۔ ایک نظر اس کی طرف اور ایک نظر تمہاری طرف رہونے لگی تھی"

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ[۱] (کہہ دو اگر تم محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری تابعداری کرو۔ اللہ تم سے محبت رکھے گا)

---

[۱] آل عمران۔ آیت ۳۱۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" جو مجھ سے محبت کرے اسے چاہیے کہ میری سنت پر چلے "

ایک خبرِ مشہور میں ہے :

" تم پر لازم ہے کہ میری سنت اور میرے بعد میرے خلفائے راشدین مہدیین کی سنت پر (پختہ) رہو۔ اس کو ڈاڑھوں سے پکڑے رہو " (یعنی خوب پختگی دکھاؤ)

محبتِ رسول ؐ کی علامت

حضرت ابو محمد سہل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے :

" اللہ کی محبت کی علامت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہو ، اور حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی علامت یہ ہے کہ آپؐ کی سنت سے محبت رکھے اور سنت سے محبت کی نشانی یہ ہے کہ دنیا سے بغض رکھے اور دنیا سے بغض کی نشانی یہ ہے کہ دنیا میں سے صرف زادِ راہ اور اس قدر لے کہ جو اس کے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے "

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فرمایا :

" اگر تو مجھ سے ملنا چاہے تو اغنیا کی ہم نشینی کرنے سے بچنا اور اس وقت تک کپڑا نہ اتارنا جب تک اسے پیوند نہ لگا لے "

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو نئے جوتے لیے ۔ ان کا جمال آپؐ کو خوب لگا ۔ آپؐ نے سجدہ کیا اور فرمایا :

" ان کا جمال مجھے خوب لگا ۔ میں نے اس ڈر سے فوراً اپنے رب کے سامنے (سجدہ کر کے) تواضع اختیار کی کہ وہ ناراض نہ ہو جائے "۔ پھر ان (جوتوں) کو لے کر باہر تشریف لائے اور جس پہلے مسکین کو دیکھا اسی کو دے دیئے ۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو (جوتے بنوانے کا) حکم دیا اور انہوں نے آپؐ کے لیے دو سندی (معمولی درجہ کے) جوتے بنوائے ۔ راوی بتاتے ہیں کہ میں نے آپؐ کو دیکھا کہ آپؐ نے یہ پہن رکھے ہیں ۔ یعنی بالوں سے صاف چمڑے کے نعلین تھے ۔

بقدرِ کفایت پر صبر کرو

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

" قیامت کے روز مجلس کے لحاظ سے لوگوں میں سے مجھ سے زیادہ قریب وہ ہوگا جو دنیا سے اس (طریقِ زندگی) پر ہوگا جس پر میں ہوں "

حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے :

"اے اللہ! آلِ محمدؐ کی روزی (گزارے) کی خوراک ہی کر دے۔"

حضور صلی اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ دنیا میں جس آدمی کی روزی دن، دن کی رکھے گا اس کو عذاب نہیں دے گا۔" (ایک دم کی بجائے آج ملی اور کل پھر ملے گی)۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"خوشخبری ہے اس کے لیے جس کو اسلام کی طرف ہدایت ملی اور دنیا میں اس کی روزی خوراک (گذارے بھر) ہے اور اس پر وُہ قانع ہے۔"

دوسرے الفاظ یہ ہیں:

"اس پر وہ عابد ہے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ہر دولت مند اور فقیر قیامت کے روز اس کی خواہش کرے گا، کاش! دنیا میں اس کی روزی خوراک بھر (گزارے مطابق) ہی ہوتی۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"اے اللہ! جو مجھے محبوب رکھے اور میری دعوت قبول کرے اس کا مال اور اولاد کم کر دے اور مجھ سے بغض رکھے اور میری دعوت قبول نہ کرے اس کا مال و اولاد زیادہ کر دے اور اس کی ایڑیاں لتاڑ یعنی کثرت سے اس کے پیچھے چلنے والا (پاؤں) ہوں۔" (کہ ان ہی میں مشغول رہ کر آخر نامراد مرے) اور صحابہ کرامؓ اس پر یہ بد دعا کرتے جو (آپؐ سے) بغض رکھتا۔

حدیث میں ہے:

"دنیا کی کمی، آخرت کی زیادتی ہے اور دنیا کی زیادتی آخرت کی کمی ہے۔"

ایک روایت میں ہے:

"جس کو بھی دنیا میں سے کچھ دیا گیا اس کا درجہ کم ہُوا چاہے وُہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کریم (صالح) ہو۔"

حضرت ابراہیم بن احمد خواص رحمۃ اللہ علیہ نے مدعوین کا وصف بیان کیا اور فرمایا:

"ایک گروہ ایسا ہے جس نے زہد کا دعویٰ کیا اور قیمتی لباسِ فاخرہ پہنے لوگوں کے سامنے باتیں بناتے ہیں۔ تاکہ وہ ان کے لباس جیسے قیمتی تحائف دیں اور فقراء کی طرح انہیں نہ دیکھیں کہ (فقراء کی طرح) دیکھ کر انہیں حقیر نہ سمجھیں اور جیسے مساکین کو معمولی خیرات دیتے ہیں۔ انہیں ایسی خیرات نہ دیں اور اپنے لیے وُہ

وُسعتِ علمی سے کام نکال لیتے ہیں کہ ہم سنت کے طریق پر ہیں اور یہ (اعلیٰ لباس اہلِ دنیا پر) مضر ہے۔ ہم پر مضر نہیں۔ اہل دنیا ہی سنت سے خارج ہیں۔ جب ان سے حقائق کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور جب ان کا دائرہ (استدلال و کلام) تنگ کیا جاتا ہے تو دوسروں کی علت سے دلیل پکڑتے ہیں۔ یہ لوگ دین کے عوض دنیا کھانے والے ہیں۔ انہیں باطنی صفائی کی پروا نہیں، نہ ہی انہیں اپنے نفوس کے لیے تہذیبِ اخلاق مطلوب ہے۔ ان کی (غلط) باطنی صفات ان پر ظاہر آ کر چھا گئیں۔ چنانچہ انہوں نے اس مال کا دعویٰ کر لیا۔ یہ لوگ دنیا پر فریفتہ اور خواہشِ (نفس) کے پیروکار ہیں۔"

حضرت خواص رحمۃ اللہ علیہ دو ٹکڑوں سے زیادہ لباس نہ رکھتے۔ دو چادریں ہوتیں یا ایک قمیص اور اس کے نیچے ایک تہ بند ہوتا اور قمیص کا آستین (ذیل) سر پر ڈال سر چھپا لیتے۔ ایک فقیر کے لیے یہی لباس مستحب ہے فقر و فقراء کی فضیلت کے سلسلہ میں اور دنیا اور اغنیاء کی مذمت کے بارے میں کثرت سے روایات ملتی ہیں اور ہمارا مقصد ان سب کا ذکر کرنا بھی نہیں اور نہ ہی یہاں پر کثرتِ استدلال کا منظر پیش کرنا مقصود ہے۔

بلند عمارات کی مذمت

فضول اور فالتو عمارات نہ بنانا بھی زہد ہے۔ بلند عمارات اور پختہ عمارات سے دُور رہنا حتیٰ کہ بلا ضرورت مٹی بھی نہ لیپنا زہد ہے۔ مشائخ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پہلی بدعت چھلنیوں اور دستر خوانوں کی پیدا ہوئی اور طویل ابد کے سلسلہ میں پہلی چیز یہ پیدا ہوئی کہ باریک سلائی ہونے لگی اور پختہ عمارات تعمیر ہونے لگیں ورنہ زمانۂ رسالت میں موٹی موٹی سلائی ہوتی تھی اور چُونے اور پکی اینٹوں سے عمارت تعمیر کرنے کو تشیید کہا جاتا ہے۔ حالاں کہ (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) کھجور کی شاخوں اور ٹہنیوں سے مکانات بنا لیتے تھے۔

روایت میں آتا ہے:

"لوگوں پر ایسا زمانہ آئے گا کہ لوگ اپنے مکانات کو اس طرح منقّش کریں گے جیسے کہ یمنی چادروں کو منقّش کیا جاتا ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شام جاتے ہوئے راستہ میں ایک چُونے اور پختہ اینٹوں کی عمارت دیکھی تو اللہ اکبر کہا اور فرمایا:

"مجھے گمان نہ تھا کہ اس اُمّت میں بھی بعض ایسے ہیں جو کہ ایسی عمارات بنائیں گے جیسے ہامان نے فرعون کے لیے عمارت بنائی یعنی فرعون کے قول کی طرف اشارہ ہے،

فَاَوْقِدْ لِیْ یَا هَامَانُ عَلَى الطِّيْنِ [1] (سو آگ دے اے ہامان میرے واسطے گارے کو)

---

[1] القصص آیت ۳۸۔

یعنی اس سے اینٹیں پختہ تیار کرو۔ کہتے ہیں کہ سب سے پہلے فرعون کے لیے پختہ اینٹیں اور چُونا تیار کیا گیا۔ اور سب سے پہلے اس کام کو ہامان نے کیا۔ پھر بڑے بڑے ظالم حکمرانوں نے یہ کیا۔ یہی زخرف (دنیاوی آرائش) ہے۔

بعض سلفؒ سے منقول ہے۔ انہوں نے کسی شہر کی ایک جامع مسجد کا ذکر کیا اور فرمایا:

"میں نے یہاں ایک مسجد کھجور کے پتّوں والی اور بے پتّہ شاخوں سے ایک مسجد بنی دیکھی۔ پھر میں نے اسے مٹی کے روڑے سے بنی دیکھی اور پھر دیکھا تو اینٹوں سے بنی ہے"۔

چنانچہ کھجور کی شاخوں والے مٹی کے روڑے والوں سے بہتر تھے اور مٹی کے روڑے والے لوگ اینٹوں والوں سے بہتر ہیں۔

سلفؒ میں ایسے آدمی پائے جاتے، جو زندگی میں بار بار مکان بناتے۔ اس لیے کہ عمارت کمزور ہوتی اور امید مختصر ہوتی اور پختہ عمارت کے سلسلہ میں وہ لوگ زاہد تھے۔ بعض ایسے بھی تھے کہ حج کرنے گئے یا جہاد پر گئے تو مکان کو گرا دیا یا پڑوسیوں کو بخش دیا۔ جب واپس آئے تو دوبارہ بنا لیا۔ ان کے مکانات زیادہ تر پھونس، گھانس اور چمڑے کے ہوتے اور بلادِ یمن میں عرب لوگ آج تک (زمانۂ مصنف تک) اسی طریق پر زندگی گزار رہے ہیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو (عمارت کا) اُونچا حصّہ جو بلند کر دیا تھا، گرا دینے کا حکم دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار اونچے مکان کے پاس سے گزرے تو پُوچھا:

"یہ کس کا ہے؟"

(صحابہؓ) نے عرض کیا:

"فلاں کا ہے"۔

جب وہ آدمی حاضر ہُوا تو آپؐ نے اس سے اعراض فرمایا۔ صحابہ نے اس کو اطلاع دی تو اس نے واپس آکر اسے گرا دیا۔ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ وہاں سے گزرے تو اسے نہ دیکھا۔ اس کے بارے میں پُوچھا تو صحابہؓ نے عرض کیا: کہ

"اس نے گرا دیا ہے"۔ آپؐ نے اس کے لیے دعائے خیر کی اور سلفؒ کے مکانات سیدھے اور فراخ ہوتے تھے۔

حضرت حسنؓ نے فرمایا:

"جب میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ کے گھروں میں جاتا تو ان کی چھت تک ہاتھ سے

چھو لیتا تھا۔"

حضرت عمرو بن دینارؒ نے فرمایا:

"جب بندہ چھ گز سے بلند عمارت اٹھاتا ہے تو ایک فرشتہ آواز دیتا ہے: اے بدمعاشوں کے بدمعاش کہاں تک؟"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو آدمی کفایت سے زیادہ (شدید ضرورت سے زیادہ) عمارت بنائے گا اسے قیامت کے روز اسے اٹھانے کی سزا دی جائے گی۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک بلند عمارت کے پاس سے گزرے تو فرمایا:

"آخر دراہم نے سر نکال ہی لیا۔"

ایک عامل کے پاس سے گزرے جس نے بلند اور پختہ عمارت بنائی تھی۔ مجھے فرمایا:

"ہر خائن پر دو امین ہیں۔ پانی اور گارا۔" (ترمذی)

پھر اس کے مال کا نصف حصہ لے کر بیت المال میں داخل کر دیا۔

ایک روایت میں ہے:

"ہر خرچ پر بندے کو اجر ملے گا۔ سوائے اس کے جو اس نے پانی اور گارے پر خرچ کیا۔"

بعض سلفؒ سے مروی ہے:

"جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے مال پر ناراضگی فرماتا ہے تو اس پر پانی اور گارا مسلط کر دیتا ہے۔"

خوب صورت عمارات ممنوع ہیں

حضرت یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"میں حضرت ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے ہمراہ راستہ میں جا رہا تھا کہ ایک پختہ خوب صورت دروازہ نظر پڑا۔ میں اسے دیکھنے لگا تو مجھے فرمایا:

"اسے مت دیکھ۔"

میں نے کہا:

"اے ابو عبداللہ! دیکھنے میں کیا کراہت ہے؟"

فرمایا: "جب تو اسے دیکھے گا تو تو اس کے بنانے میں مددگار ہو جائے گا۔ اس لیے کہ اس نے اسی لیے بنایا ہے کہ لوگ اسے دیکھیں اور اگر ہر گزرنے والا طے کر لے کہ ہم اسے نہیں دیکھیں گے تو وہ نہیں بنائے گا۔" ان سے پہلے بعض سلفؒ کا قول ملتا ہے کہ:

" ان کی عمارات کی طرف دیکھو نہیں۔ اس لیے کہ انہوں نے تمہارے (دکھانے دیکھنے) کی خاطر ہی انہیں آراستہ کر رکھا ہے۔"

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا۔[۱]

(وہ گھر پچھلا ہے ہم دیں گے وہ ان کو جو نہیں چاہتے چڑھنا ملک اور نہ بگاڑ ڈالنا)

ایک قول میں یہ ہے کہ جنہیں اقتدار اور کثرتِ مال کی محبت نہیں۔ اور بڑی بڑی عمارات نہیں بناتے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" قیامت کے روز ہر تعمیر (عمارت) انسان پر وبال ہوگی (جو اس نے بنائی ہوگی)۔ سوائے اس کے جو اس نے گرمی یا سردی سے بچاؤ کے لیے (سایہ) کیا۔"

ایک آدمی نے مکان کی تنگی کی شکایت کی تو فرمایا:

" آسمان میں وسیع (مکان) بناؤ۔" یعنی جنت میں۔ اور یہ ایک مفہوم ہے اور دوسرا مفہوم یہ ہے معرفت میں وسعت پیدا کرو اور مکان کی وسعت کے پیچھے نہ پڑو۔"

زہد سے روزی کم نہیں ہوتی

یاد رکھیں زہد کرنا انسان کی روزی کم نہیں کرتا۔ البتہ صبر میں اضافہ ضرور کرتا ہے اور بھوک و فقر میں دوام پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ یہ چیز اس وصف پر زاہد آدمی کے لیے آخرت کی روزی بن جائے گی۔ اس لیے کہ دنیاوی حصہ سے وہ محروم رہا اور دنیا میں کثرت سے بچا رہا۔

چنانچہ دنیا میں زہد کرنا ہی اس کا باعث ہوا۔ اب جس قدر اللہ کی طرف سے حسنِ امتحان کے باعث اس نے دنیا کے غنا اور توسع سے پرہیز کیا۔ آخرت میں اسی قدر روزی اور بلند درجات عطا ہوں گے۔

جیسے کہ بعض علماءؒ کے بارے میں مروی ہے کہ ان کے پاس ایک سبزی فروش آیا اور کہا:

میں ایک ایسے محلہ میں سبزی فروخت کرتا تھا جہاں میرے سوا کوئی دوسرا سبزی فروش نہ تھا۔ چنانچہ میری خوب بکری ہوتی۔ پھر ایک دوسرا سبزی فروش میرے مقابلے میں آ گیا تو کیا اب میری روزی میں سے کچھ حصہ کم ہو جائے گا؟"

فرمایا: " نہیں! البتہ تجارت سے تجھے فراغت زیادہ ملے گی۔"

---

[۱] القصص۔ آیت ۸۳۔

اب شاید کوئی اہل باطل اور گمراہ آدمی اس وسعت سے استدلال کرے اور خواہشِ نفس کے ساتھ یہ استنباط کرتا پھرے کہ حبِ دنیا میں زہد کرنے سے میری روزی میں کمی نہیں آسکتی تو وسعتِ دنیا اور کثرتِ مال اور عیش و تنعم کے باوجود میرا زہد میں ایک مقام ہے۔ اور رضا و توکل میں مجھے بھی ایک حال حاصل ہے اور روزی تو اپنی کھاتا ہوں اور اپنا نصیب لیتا ہوں۔ یا کہے کثرتِ مال وزینت و آرائش کے باوجود زہد صحیح ہو سکتا ہے۔ جو آدمی زہد سے آگاہ نہیں اس کے سامنے بڑ بڑ ہانکتا پھرے اور اہل زہد کے طریقوں سے ناواقف لوگوں کو بہکانا شروع کر دے بلکہ یہ آدمی تموین کے عوض دنیا کھاتا یا اہلِ غفلت کے سامنے علم کے مشابہ باتیں کرتا اور فریب کاری کرتا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے خوارج کو فرمایا:

جب خوارج نے کہا:

لاحکم الا اللہ۔ (اللہ کے بغیر کسی کا حکم نہیں)

تو حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے فرمایا:

"کلمۂ حق ہے مگر اس سے باطل مراد لیا گیا۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ نے صحیح فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خوارج نے اس کلمہ کے ذریعہ خلفائے راشدین کے احکام ساقط کرنے کی کوشش کی اور امام عادل کی بغاوت کی جیسے کہ اس قائل نے مراد لیا کہ:

"میں اپنی روزی کھاتا ہوں اور اشیاء میں سے اپنا نصیب لیتا ہوں۔ اس کا یہ استدلال اپنے نفس کی خواہش کی خاطر اور جہلاء کے سامنے معذرت گھڑنے کی خاطر ہے۔ اسے خطرہ ہے کہ جہلاء (اس کا لباسِ فاخرہ) دیکھ کر اسے ملامت کریں گے اور یہ فریب میں مبتلا آدمی اپنی اس مرض سے بے خبر ہے۔ اگرچہ یہ دنیا میں سے اپنی روزی کھا رہا ہے اور عطیات میں سے اپنا نصیب لے رہا ہے مگر یہ سب کچھ کوتاہی، بُعد حاصل کرنے اور حرص و لالچ کے انداز پر کر رہا ہے۔ اس لیے کہ ایک چور اور ڈاکو بھی اپنی روزی کھاتا ہے اور اپنا نصیب لیتا ہے مگر غضب و غلط انداز سے یہ کر رہا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو ہی حرام روزی دیتا ہے جیسے کہ پرہیزگاروں کو حلال روزی دیتا ہے اور ان دونوں کے درمیان یہ بھی ہے کہ مولائے کریم کی طرف سے اعدائے حق تعالیٰ کو بدبختی اور سزا کی سزا ملتی ہے اور اولیائے حق تعالیٰ پر سعادت و حسنِ توفیق کا انعام ہوتا ہے۔

استدراج کا شکار انسان

اس مدعی نے زہد کرتے کرتے اپنا رزق حرام کر لیا اور حبِ فقر سے اپنا نصیب کھو بیٹھا اور آخرت کا افضل ترین حصہ ضائع کر دیا۔ اس لیے کہ دنیا آخرت کی ضد ہے اور دنیا میں تصرفات جس قدر زیادہ ہوں گے درجۂ زہد اسی قدر کم ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا اور ثروت و وسعت کے ساتھ اس کا امتحان لیا تا کہ اس کا صدق و کذب کھل جائے۔ اب یہ فتنہ میں پڑ گیا

اور ابتلاء کو نہ سمجھ سکا۔ اگر یہ آدمی اپنے اس مشاہدہ میں سچا ہوتا اور جھوٹا نہ ہوتا تو جان لیتا کہ یہ بات اہلِ معرفت کے علوم سے حجاب بن گئی۔ اور وہ اپنے اس علم سے استدراج میں پھنس کر رہ گیا۔ اس لیے کہ یہ دنیاوی علم ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ فنا ہو جائے گا۔ اس کا آخرت میں کوئی پھل نہیں۔ یہ اس کی وجہ سے خود پھنس گیا اور اس کی وجہ سے یہ اہلِ خوف کے علوم سے دور جا پڑا اور اہل ورع و زہد کے مشاہدہ سے اعراض کر بیٹھا۔ یہی (اہل ورع و زہد) ہی ایسے حضرات ہیں کہ جنہوں نے دقیق امور میں بھی حلال کو دیکھ لیا اور زہد پر حقیقی عمل کرتے ہوئے ترکِ حرص و طمع میں صحیح بات کی۔

اب اگر وہ اپنے مشاہدہ میں جھوٹا ہے اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے۔ یعنی اس دعوائے وجدان میں کاذب ہے تو یہ اولیائے شیطان میں سے ہے اور ائمہ ضلالت میں سے ہے۔ یہ باطل پرستوں میں پڑا اور انہیں فتنہ میں ڈالنے پر ان کی طرف دھکیل دیا گیا۔ یہ اہلِ تقویٰ کا امام نہیں بلکہ یہ محروم اور گمراہ لوگوں کا پیش رو ہے۔ غافل دنیا داروں، دنیا کے حریص اور سلف کے طریقوں سے دُور رہنے والوں کا امام ہے۔ اس لیے کہ اس میں بھی طمع اور عدمِ یقین پایا گیا۔ اہل یقین کے علوم سے اعراض کر کے وُہ خود ہی تدبیرِ الٰہی میں گرفتار ہُوا اور وہ اس تدبیر کو نہیں سمجھتا۔ تقلیبِ قلوب سے مراد وصف کے مشاہدۂ حقائق سے مُنہ پھیر کر خود گرفتارِ بلا ہوا اور وہ انعامات کے ذریعہ استدراج کو نہیں پہچانتا اور اسے یہ علم (معرفت) حاصل بھی کیونکر ہو سکتا ہے؛ جبکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا؛

سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ [1] (سہج سہج پکڑیں گے جہاں سے وہ جانیں گے)

اور ایک جگہ فرمایا؛

وَ مَكَرُوْا مَكْرًا وَّ هُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ [2] (اور انہوں نے بنایا ایک فریب اور ہم نے بنایا ایک فریب اور ان کو خبر نہیں)

دُور ہُوا، دُور ہُوا اس سے کہ تدبیر زدہ تدبیر کو سمجھ سکے یا استدراج کا شکار، اس استدراج کو جان سکے۔ اس لئے کہ تدبیر کنندہ لطیف تعالیٰ اور استدراج میں ڈالنے والا احکم الحاکمین اللہ تعالےٰ ہمیں علمِ اظہار کے ساتھ فریب میں آنے سے پناہ میں رکھے اور ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے آل واصحاب سب پر صلوٰۃ و سلام فرمائے اور ہمیں علمِ حقیقت کے مشاہدہ کے لیے حسنِ توفیق

---

[1] اعراف۔ آیت ۱۸۲۔
[2] النمل۔ آیت ۵۰۔

عطا فرمائے۔

دُنیا و آخرت میں سے ایک ملے گی

مذکورہ بحث کے متعلق کثرت سے آثار و روایات آتی ہیں:

"دنیا اور آخرت کی مثال دو سوتنوں کی طرح ہے ان میں سے ایک کی رضا دوسری کی ناراضگی ہے اور یہ دونوں بمنزلہ مشرق و مغرب کے ہیں جو ایک کی طرف رُخ کرے گا۔ دوسرے کی طرف پشت کرے گا اور یہ دونوں بمنزلہ ترازو کے دو پلڑوں کے ہیں۔ ایک کو ترجیح دینے سے دوسری کی کمی ہوگی۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

"اللہ کی قسم یہ بمنزلہ دو پیالوں کے ہے۔ ان میں سے ایک ہی بھرا جائے گا اور ان میں سے ایک کو خالی کرکے دوسرے میں ڈالنا پڑے گا۔"

یعنی اگر تو نے دنیا کا پیالہ بھر لیا تو آخرت سے محروم ہونا پڑے گا اور اگر آخرت کا پیالہ بھر لیا تو دنیا سے محرومی ہو کر رہے گی۔ اگر تو نے آخرت کا ایک تہائی پیالہ بھرا تو تُو نے دنیا کا دو ثُلُث بھر لیا اور اگر تُو نے آخرت کا دو تہائی حصہ لے لیا تو دنیا کا ایک ثُلث حاصل کیا۔ یہ خوب مثال ہے۔ اس لیے کہ اس میں خُوب شدت اور سختی ہے۔

بعض سلفؒ کا فرمان ہے:

"دنیا میں تنعم میں رہنے کے باوجود زہد کرنے والے کی مثال ایسے ہے جیسے کہ کوئی آدمی چکنائی لگے ہاتھوں کو مچھلی کے ساتھ دھوئے۔"

ایک بزرگؒ فرماتے ہیں:

"جو آدمی زہد بھی کرے اور دنیا بھی طلب کرتا ہو اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی آدمی خشک گھانس (حلفاء) کے ذریعہ آگ بجھائے۔" (اب گھانس ڈالنے سے آگ بجھے گی نہیں بلکہ تیز ہوگی)

اہل شام میں اہل زہد لوگوں کے سامنے ان میں سے ایک زاہد عالم درس دیتا تھا۔ رجا بن حیوۃ اس مجلس میں آتے۔ یہ شام کے فقیہ تھے۔ ایک روز وہ (زاہد درس دینے والا) نہ آسکا تو جامع مسجد کا موذن اس (انداز) پر خطاب کرنے لگا۔ حضرت رجا بن حیوۃؒ نے اجنبی آواز سن کر فرمایا:

"یہ کون ہے؟"

اس نے کہا:

"میں فلاں (موذن) ہوں۔"

فرمایا: "خاموش ہوجا۔ اللہ تجھے عافیت میں رکھے۔ ہم زہد کی باتیں صرف اہل زہد سے ہی سُننا چاہتے ہیں۔"

دوسرے الفاظ یہ مروی ہیں:

"ہم اہل زہد کے علاوہ، دوسرے آدمی سے وعظ سننا ناپسند کرتے ہیں"۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

"اہل دنیا کے مالوں کو نہ دیکھو۔ اس لیے کہ ان کے مالوں کی چمک تمہارا نورِ ایمان ختم کر دے گی"۔

ایک عالم ؒ نے فرمایا:

"مالوں کو اُلٹ پلٹ کرنا، ایمان کی شیرینی چوس لیتا ہے"۔

ایک روایت میں ہے:

"ہر اُمت کے لیے ایک بچھڑا (ابتلاء) ہے اور اس امت کے لیے دینار و درہم بچھڑ (ابتلاء و آفت) ہے"۔ اور بنی اسرائیل کا بچھڑا بھی حلیہ (زیورات) کا تھا۔ اللہ تعالےٰ نے فرمایا:

اِبْتِغَآءَ حِلْیَۃٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُہٗ[1] (واسطے زیور کے یا اسباب کے اس میں بھی جھاگ ہے ویسے ہی)

چنانچہ اس سنت کی سمجھ اس آیت سے ہے:

بتاتے ہیں کہ ہر روشن ہونے والے دن میں چار فرشتے آفاق میں چار آوازوں کے ساتھ ندا دیتے ہیں۔ دو فرشتے مشرق میں اور دو فرشتے مغرب میں۔ مشرق والوں میں سے ایک فرشتہ آواز دیتا ہے:

"اے بھلائی چاہنے والے! چلے آؤ اور برائی چاہنے والے! ترک کر دو"۔

اور دوسرا فرشتہ آواز دیتا ہے:

"اے اللہ (تیری راہ میں) خرچ کرنے والے کو خلف (بعد میں مال) عطا کر اور (کنجوسی کرتے ہوئے مال) روکنے والے کو بربادی عطا کر"۔

مغرب والوں میں سے ایک فرشتہ آواز دیتا ہے:

"موت کے لیے پیدا کرو اور بربادی کے لیے تعمیر کرو"۔

اور دوسرا فرشتہ آواز دیتا ہے:

"کھاؤ اور نفع اٹھاؤ، طویل حساب دینے کے لیے"۔

ایک عالم ؒ فرماتے ہیں:

---

[1] [illegible] آیت

"اللہ تعالیٰ نے دنیا کو وحشت کا داغ دیا تاکہ اطاعت گزاروں کو اپنے ساتھ انس عطا فرمائے۔"

معلوم ہُوا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک دعا یہ بھی کرتے :

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ الذُّلَّ عِنْدَ النِّصْفِ مِنْ نَفْسِیْ وَ الزُّهْدَ فِیْمَا جَاوَزَ الْكِفَافَ۔ (اے اللہ! انصاف کے وقت میں اپنے نفس سے تواضع کا اور جس میں گزارے سے بڑھ جائے اس میں زہد کا سوال کرتا ہوں)

ایک عارفؒ فرماتے ہیں :

"ہر چیز خزائن میں پھیکی ہُوئی ہے مگر معرفت کے ساتھ فقر پرو رکھا ہے اور اس پر مہر لگی ہُوئی ہے۔ یہ صرف اسے ملتا ہے جس پر شہداء کی مہر ثبت کی گئی ہے۔"

علمائے دنیا کی ایک تاویل

گاہے علمائے دنیا نفسانیت کی خاطر فقر پر غنا کی فضیلت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان سے تاویل کرتے ہیں۔ فرمایا :

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ۔ (یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے)

"تدبر خطاب سے معلوم ہو گا کہ اس سے فقراء مراد ہیں۔ اس لیے کہ آغازِ کلام میں ان کے لیے کہا گیا :

" اگر تم ایسا کرو گے تو تم سے پہلے بھی کوئی تم سے سبقت نہ کرے گا اور نہ بعد میں تم تک پہنچ سکے۔" یہ قول جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور یہ صحیح ہے۔ اس لیے کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے فعل میں معصوم ہیں۔ اس طرح قول میں بھی معصوم ہیں۔ اس لیے یہ نہیں ہو سکتا کہ ان کا پہلا کلام آخری حصّہِ کلام کا ناقض ہو۔ (یعنی آپ متناقض کلام نہیں کرتے) بلکہ بعد والا کلام اس پر محمول ہو گا اور بدلنا مناسب نہ ہو گا۔ کیونکہ یہ اصل میں ایک چیز کی خبر دینا ہے اور اس سے رجوع جائز نہیں۔ اب جب اغنیاء نے بھی فقراء کا عمل کرنا شروع کر دیا تو فقراء پھر واپس حاضر ہُوئے اور دریافتِ حال کرنے لگے۔

آپؐ نے فرمایا :

جلدی نہ کرو۔ اس لیے کہ میں نے جو تمہیں کہا تھا۔ ویسے ہی معاملہ ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور تم لوگ ان میں سے ہو جن پر اللہ تعالیٰ فضل فرمانا چاہتا ہے۔ اب ہماری تاویل صحیح ہُوئی اور (علمائے دنیا) کی تاویل غلط ہوئی۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پہلے قول کی دلیل سے کہ یہ دوسرے کی تائید کرتی ہے اور آپؐ کا دوسرا فرمان پہلے کا نقیض نہیں۔

فقراء کی عظیم سعادت

ہم نے جو ذکر کیا ہے۔ اس کی دلیل حدیثِ مفسّر میں وضاحت سے آتی ہے۔

حضرت زید بن اسلم سے مروی ہے۔ انہوں نے حضرت انسؓ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ

"فقراء نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب ایک قاصد بھیجا۔ اس نے عرض کیا:

"میں آپؐ کی طرف فقراء کی طرف سے قاصد بن کر حاضر ہوں۔"

آپؐ نے فرمایا:

"خوش آمدید تجھے اور ان کو جن کی طرف سے توُ آیا۔ اس قوم سے کہ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔"

کہا: "(فقراء) کہتے ہیں:"

اے اللہ کے رسولؐ! اغنیاء تو جنّت لے گئے۔ وُہ حج کرتے ہیں اور ہمیں حج کی قدرت نہیں۔ وہ عمرہ کرتے ہیں اور ہم عمرہ پر قدرت نہیں رکھتے اور جب وُہ بیمار ہوتے ہیں تو اپنے اموال (خدا کی راہ) میں ذخیرہ کے لیے خیرات کرتے ہیں۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

فقراء کو میری طرف سے یہ بات پہنچا دو کہ تم میں سے جس نے صبر کیا اور اپنا محاسبہ کیا تو اسے تین انعام ملیں گے جو اغنیاء کو نہیں ملیں گے:

۱۔ ایک یہ ہے کہ جنّت میں ایک بالاخانہ ہے۔ اہل جنّت اس کی طرف یوُں دیکھتے ہیں۔ جیسے کہ زمین والے آسمان کے ستاروں کی طرف دیکھتے ہیں۔ ان میں نبیؐ، فقیر یا شہید فقیر یا مومن فقیر کے سوا اور کوئی داخل نہ ہوگا۔

۲۔ دوسرے یہ کہ فقراء لوگ، اغنیاء سے نصف دن پہلے جنت میں داخل ہوں گے اور یہ (نصف دن) پانچ سو برس کا ہے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ جب غنی آدمی یہ کہتا ہے:

سُبْحَانَ اللّٰهِ وَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَ اللّٰهُ اَکْبَرُ۔

اور پھر فقیر بھی یہی کلمات کہتا ہے تو غنی آدمی فقیر کے ثواب تک نہیں پہنچ سکتا۔ چاہے اس کے ساتھ وُہ دس ہزار درہم خیرات بھی کرے اور تمام نیکی کے اعمال کا یہی معاملہ ہے۔"

وہ قاصد فقراء کی طرف واپس آیا تو فقراء نے کہا:

"ہم راضی ہوگئے، ہم راضی ہوگئے۔"

یہ روایت ہماری تاویل کے صحیح ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

فقر بہترین ہے

ایک مجمل روایت میں حضرت اسمٰعیل بن عیاس نے، عبداللہ بن دینار سے، انہوں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت کیا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے

صحابہؓ سے پُوچھا:

"کون سا آدمی بہتر ہے؟"

انہوں نے کہا:

"مال کے اعتبار سے خوشحال اور اپنی جان و مال میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرتا ہو۔"

آپؐ نے فرمایا:

"بہترین آدمی ہے یہ، مگر میری یہ مراد نہیں۔"

صحابہؓ نے پوچھا:

"پھر کون سا آدمی بہتر ہے؟"

آپؐ نے فرمایا:

"ایک فقیر مومن جو اپنی مشقت دیتا ہے۔"

چنانچہ لوگوں نے علمِ عقل کی طرف دھیان دیا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں علمِ یقین کی جانب راہ دکھائی۔ اس طرح غنی کے حال کا فقیر کے حال کے مقابلہ میں معاملہ ہے کہ غنی آدمی علم میں نظرِ عقل سے کام لیتا ہے اور وہ (فقیر) آدمی نظرِ یقین کے ساتھ آخرت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ یہ بات حالتِ فقر کی فضیلت پر نص ہے جس نے اس کے بعد بھی غنا کو افضل جانا۔ اگر وہ عالم ہے تو اس نے سنت معاندانہ حرکت ہے۔ اس نے اس کا احسن حال، آثار سے جہالت کا ہے اور اگر یہ جاہل آدمی ہے تو اس کا مقامِ جہالت علم بالہوٰی کے ذریعہ کلام کرنے والے کے لیے زیادہ ضرر رساں ہے۔

ایک دوسری روایت ہے:

"اس اُمت کے بہترین لوگ فقراء ہیں اور جنت میں سب سے پہلے (آرام) کے ساتھ لیٹنے والے ان میں کے کمزور ہیں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ کو فرمایا:

"اللہ تعالیٰ سے حالتِ فقر میں ملاقات کرو اور غنی بن کر ملاقات نہ کرو۔"

اس نے عرض کیا:

"میرے لیے یہ کیونکر ممکن ہے؟"

فرمایا: "جب تجھ سے مانگا جائے تو روکو نہیں اور جب تجھے دیا جائے تو نہ چھپا۔"

اب کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ آپؐ حضرت بلالؓ کو ادنیٰ احوال کا حکم دیں گے؟ یہ بات کیونکر ہو سکتی ہے جب کہ (حضرت بلالؓ) بلند درجہ کے صحابی ہیں۔ چنانچہ آپؐ نے ایمان میں فقر کو احوالِ یقین میں مشابہت دی۔

جیسے کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا،

"اللہ تعالیٰ کے لیے رضا و یقین کے ساتھ عمل کر۔ اگر یہ نہ کر سکے تو صبر میں باوجود کراہت (مشقت) کے بہت بھلائی ہے۔ اس کی فضیلت کے باعث یقین تک اٹھایا جیسے کہ حضرت بلالؓ کو اشرف ترین حال یعنی فقر تک پہنچایا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت بلالؓ کے لیے وہی حال پسند فرماتے ہیں۔ چنانچہ حالتِ فقر اہلِ یقین کا حال ہے کیونکہ یہی حال آخرت کا مکاشفہ کرتا ہے اور حالتِ غنا میں شکر کرنا مومن کا حال ہے۔ اس لیے کہ وہ دنیا پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ شکرگزار غنی پر زاہد فقیر کو ایسی فضیلت دی جیسے کہ اہلِ یقین مجاہد پر اہلِ مشاہدہ صاحبِ یقین کو فضیلت ہے۔"

حضرت عطاء ابن ابی سعید خدری رضی اللہ عنہ کی حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دعا کرتے ہیں،

اَللّٰهُمَّ تَوَفَّنِیْ فَقِیْرًا وَّلَا تَوَفَّنِیْ غَنِیًّا۔ (اے اللہ مجھے حالتِ فقر میں وفات دینا اور مجھے حالتِ غنا میں وفات نہ دینا)

اور (اگر فقر افضل نہ ہوتا) تو آپؐ حضرت بلالؓ کو ادنیٰ تر حال کا حکم نہ دیتے اور یہ نہ فرماتے:

"اللہ تعالےٰ کو حالتِ فقر میں نہ ملو۔"

اور حضرت ابن عمرؓ بھی کم تر حال کو مندوب نہ سمجھتے کہ فرمایا گیا،

"یقین میں رضا کے ساتھ اللہ کے لیے عمل کرو۔"

اسی طرح ایک خبرِ مشہور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنے لیے دعا آتی ہے کہ جس میں آپؐ نے اپنے لیے حالتِ مسکین میں زندہ رہنے، حالتِ مسکین میں وفات پانے اور مساکین میں دوبارہ اُٹھنے کی دعا کی۔ ان سب روایات سے معلوم ہُوا کہ فقر اور فقراء کو (غنی اور اغنیاء پر) فضیلت و شرف حاصل ہے۔

مزید برآں آپؐ کا یہ فرمان بھی ہے کہ،

"میری امت کے فقراء ان کے اغنیاء سے نصف یوم (یعنی) پانچ صد سال پہلے جنت میں جائیں گے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے۔ فرمایا،

"میں مسکینی سے محبت رکھتا ہوں اور غنا کے لیے مال سے بغض رکھتا ہوں اور مال میں بکثرت امراض (و آفات) ہیں۔"

عرض کیا گیا،

"اے روح اللہ علیہ السلام! چاہے وہ حلال طریق سے کمایا ہُوا ہو؟"

فرمایا، "اس کا کمانا انسان کو اللہ تعالےٰ کی یاد سے غافل کر دیتا ہے۔"

حضرت وہب بن منبہ نے حضرت ابن عباسؓ کو فرمایا،

"ہم تورات میں دیکھتے ہیں کہ ایک نیک فقیر، ایک نیک دولت مند سے بہتر ہے۔"

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا،

"تم جانتے نہیں کہ ایک فقیر سے جب کہ وُہ نیک ہو۔ اس سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کو کوئی چیز محبوب نہیں۔"

بتاتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے پکارنے کے لیے سب سے محبوب ترین نام یہ تھا،

"اے مسکین"۔

اور فرمایا کرتے،

"غنا، کی ایک برائی یہ بھی ہے کہ غنی بننے کے لیے انسان خدا کی نافرمانی کرتا ہے مگر فقیر بننے کے لیے نافرمانی نہیں کرتا۔"

بعض حکماء کا منظوم فرمان ہے:

یا غائبًا للفقرِ تبغِي الغنا ؛ عَيبُ الغِنیٰ اَعظَمُ لَو تعتَبِر

اِنّکَ تَعصِیُ لِتَنَالَ الغِنیٰ وَ لَستَ تَعصِی اللّٰہَ کَیُ تَفتَقِر

(اے فقر پر عیب لگانے والے تو غنا چاہتا ہے۔ غنا کا عیب زیادہ بڑا ہے اگر تو عبرت حاصل کرے)

(بے شک تو غنا حاصل کرنے کے لیے نافرمانی کرتا ہے مگر فقر حاصل کرنے کے لیے تو اللہ کی نافرمانی نہیں کرتا)

حضرت عطاءؒ کی حدیث میں ہے کہ حضرت ابوسعید خدریؓ نے روایت کیا،

"اے لوگو! تم کو عسرت و فاقہ اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم حلال کے علاوہ روزی تلاش کرنے لگو۔"

میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا،

"اے اللہ! مجھے حالتِ فقر میں وفات دینا اور مجھے حالتِ غنا میں وفات نہ دینا اور مجھے مساکین کی جماعت میں دوبارہ اٹھانا۔"

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو فرمایا:

"اے بیٹے، اصلاحِ دین پر سب سے زیادہ معاون اخلاق، دنیا میں زہد اختیار کرنا ہے۔ جو آدمی دنیا میں زہد اختیار کرے گا وہ اس میں رغبت رکھے گا جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اور جو آدمی اس میں رغبت رکھے گا، جو اللہ تعالےٰ کے پاس ہے وہ (خالص) اللہ تعالیٰ کے لیے عمل کرے گا اور جو اللہ تعالیٰ کے لیے عمل کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو اجر عطا فرمائے گا۔"

حواریوں نے کہا:

"اے روح اللہ! جیسے آپ نماز پڑھتے ہیں ایسے ہم بھی نماز پڑھتے ہیں۔ جیسے آپؑ روزے رکھتے ہیں ویسے ہم بھی روزے رکھتے ہیں۔ اور جیسے آپؑ نے ہمیں حکم دیا ویسے ہم اللہ کا ذکر بھی کرتے ہیں مگر جیسے آپؑ پانی پر چل لیتے ہیں ہم پانی پر نہیں چل سکتے۔"

فرمایا: "مجھے بتاؤ۔ دنیا کے لیے تمہاری محبت کیسی ہے؟"

انہوں نے فرمایا: "بیشک ہم اس سے محبت رکھتے ہیں۔"

فرمایا: "اس (دنیا) کی محبت دین کو خراب کرتی ہے۔ مگر میرے نزدیک یہ بمنزلہ پتھر اور ڈھیلے کے ہے۔"

ایک دوسری روایت میں ہے کہ انہوں نے ایک پتھر اٹھایا اور فرمایا:

"ان دو (سونے اور پتھر) میں سے تمہیں کون سا زیادہ محبوب ہے؟ یہ یا دینار و درہم؟"

انہوں نے کہا: "دینار"۔

فرمایا: "مگر میرے نزدیک یہ دونوں برابر ہیں۔"

کہتے ہیں کہ جو دنیا میں صحیح زہد اختیار کرے حتیٰ کہ اس کے نزدیک پتھر اور سونا ایک برابر ہو جائے۔ وہ پانی پر چل سکتا ہے اور یہ بات عوام میں مشہور ہے۔ چنانچہ شاعر کا شعر ہے، ؎

لَوْ كَانَ زُهْدُكَ فِی الدُّنْیَا كَزُهْدِكَ فِی

وَصْلِیْ مَشَیْتَ بِلاَ شَكٍّ عَلَى السَّمَآءِ

(اگر دنیا میں تیرا زہد یوں ہوتا جیسے کہ تیرا زہد میرے وصال میں سے ہے تو تُو بلا شبہ پانی پر چلتی)

مروی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے سفر کے دوران ایک سوتے ہوئے آدمی کے پاس سے گزرے جو کہ گدڑی میں لپٹا ہوا تھا۔ آپؑ نے اسے جگایا اور فرمایا:

"اے سونے والے اُٹھ، اللہ تعالیٰ کو یاد کر۔"

اس نے عرض کیا:

"آپؑ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟ میں نے دنیا کو اہل دنیا کے لیے چھوڑ دیا ہے۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

"پھر سو جا میرے حبیب، سو جا۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مروی ہے کہ وہ ایک آدمی کے قریب سے گزرے جو مٹی پر سو رہا تھا اور اس کے سر کے نیچے ایک کچی اینٹ رکھی ہوئی تھی۔ اس کا سر اور داڑھی مٹی میں لتھڑے ہوئے

تھے اور کمبل لپیٹ رکھا تھا تو انہوں نے عرض کیا:

"اے پروردگار! تیرا یہ بندہ دنیا میں خستہ حال ہو چکا۔"

اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی اور فرمایا:

"اے موسیٰ! تم جانتے نہیں کہ جب میں نے اپنے بندے کی طرف پوری توجہ سے نظر فرمائی تو میں نے اس سے ساری دنیا ہٹا دی۔"

فقراءِ صادقین پر ایک انعام

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی طرف وحی فرمائی:

"مجھے ان کے پاس تلاش کرو (جن کے) دل ٹوٹے ہوئے ہیں!"

انہوں نے عرض کیا:

"اے پروردگار! وُہ کون ہیں؟"

فرمایا: "فقراءِ صادقین۔"

یہ بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خبر کی توضیح کرتی ہے۔ وُہ یہ تھی کہ:

"میں تجھے کہاں پاؤں؟"

فرمایا: "شکستہ قلب لوگوں کے پاس۔"

حضرت احمد بن عطاءؒ متاخرین میں سے ہیں۔ یہ فقر پر غناء کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ اس لیے کہ انہیں ایک شبہ سا ہو گیا (یعنی نیک نیتی سے ایسا کرتے) قصہ یوں ہوا کہ ایک شیخؒ نے ان سے پوچھا:

"دو اوصاف میں سے کون سا افضل ہے؟"

فرمایا: "غناء۔ اس لیے کہ یہ صفتِ حق تعالیٰ ہے۔"

اس شیخؒ نے فرمایا:

"تو کیا اللہ اسباب و سامان کے ساتھ غنی ہے؟"

چنانچہ وہ شیخ اُن سے جُدا ہوئے اور کچھ کلام نہ کیا اور بات بھی درست تھی اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے وصف کے ساتھ غنی ہے۔ چنانچہ فقیر اس مفہوم کا زیادہ حق دار ہے۔ اس لیے کہ وہ اس کے وصفِ ایمان کے ساتھ غنی ہے اسباب کے ساتھ نہیں اس لیے کہ وہ اُن سے جُدا ہو چکا اور غنی آدمی اسباب جمع کر کے پریشان ہے۔ اس لیے اس میں شبہات آئے اور اس کا درجہ کم ہو گیا۔

حضرت خواصؒ نے ان سے اختلاف کیا اور صحیح فرمایا۔ معرفت میں یہ ان سے بلند درجہ کے مالک تھے۔ فرمایا: کتاب میں فقر کی فضیلت ہے اور فقر صفتِ حق ہے یعنی اس تعالیٰ سے صفت ہے کہ اس کے ساتھ

فقراء کی توصیف فرماتا ہے۔ چنانچہ ہمیں تاویل و توضیح میں موافقت حاصل ہوگئی۔ یعنی اللہ تعالٰے اشیاء سے خالی اور ان سے علیحدہ ہے۔

جس غلط فہمی کا یہ شکار ہوئے اگر یہی انداز رکھا جائے اور اسی طرح فقر پر غناء کو فوقیت دی جائے اور کہا جائے کہ یہ صفتِ حق تعالیٰ ہے تو پھر یوں ہونا چاہیئے کہ متکبر و جبار آدمی بھی افضل ہو اور جو آدمی مدح و حمد پسند کرے وُہ بھی افضل ہو۔ اس لیے کہ یہ سب صفاتِ حق ہیں۔ حالانکہ تمام اہلِ قبلہ اس آدمی کی مذمت پر اجماع کر چکے جس کا یہ وصف ہو۔ اب اس کا وصفِ غنا اس معنی میں ہوگا۔ اس لیے کہ وصفِ غناء، صفتِ حق ہے اور عزت و کبر کے ساتھ اتصال رکھتا ہے۔

غناءطلبی کا نقصان

مناسب یہی ہے کہ حق تعالٰے کی صفات کو حق تعالیٰ کے لیے ہی تسلیم کیا جائے اور ان میں نزاع کھڑا نہ کیا جائے۔ اس طرح ابن عطاء کا قول باطل ہُوا۔ اس لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان صحیح ہے۔ فرمایا:

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ عزت میری ازار ہے اور کبریائی میری چادر ہے جس نے ان دو کے بارے میں میرے ساتھ نزاع کیا میں اسے کاٹ کر آگ میں ڈال دوں گا۔"

انھوں نے اس سے بھی اختلاف کیا اور ہر خاص و عام کے مسلمہ عارف ابو محمد سہل بن عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

"جس نے غناء، بقاء اور عزت کو محبوب رکھا اس نے اللہ تعالیٰ کی صفات میں (اس سے) نزاع کیا۔ یہ صفاتِ ربانی ہیں۔ اس آدمی پر ہلاکت کا ڈر ہے۔"

جب یہ ثابت ہوگئی کہ فقر افضل ہے۔ اس لیے کہ یہ وصفِ عبودیت ہے۔ اب جس نے یہ وصف لیا اس کا بندہ ہونا ثابت ہو گیا اور اوصافِ عبودیت ہی اخلاقِ ایمان ہیں اور مومنوں سے اللہ تعالٰے کو یہی (اوصاف) محبوب ہیں۔

مثلاً خوف و انکساری اور تواضع و فقر انہی کی طرف منسوب ہیں اور اوصاف ربانی میں اعدائے الٰہی مبتلا ہُوئے کہ وُہ جبار و متکبرین بن گئے مثلاً عزت و کبر اور بقاء و غناء ان کی طرف منسوب ہیں۔

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"میں تو یہی سمجھا ہُوں کہ اللہ تعالیٰ نے بقاء صرف مبغوض ترین مخلوق یعنی ابلیس کے لیے ہی بنایا (یعنی اسے طویل تر عمر دی۔"

علماء صوفیاءؒ فرمایا کرتے تھے:

"اس دنیا میں (طویل مدت تک) باقی رہنے کی خواہش نہ کرو۔ اس لیے کہ بدترین مخلوق ہی طویل ترین عمر پاتی ہے اور وہ شیاطین ہیں اور غنا باقی رہنے کے لیے مانگا جاتا ہے۔"

غنا سے فقر بہتر ہے

بتاتے ہیں کہ شیخ جنید رحمۃ اللہ علیہ نے ابن عطاء سے اس مسئلہ میں مباہلہ کیا اور ان پر بددعا کی۔ اس لیے کہ انہوں نے ان کے قول کا سختی سے انکار کیا اور فرمایا کرتے تھے،

"شکرگزار غنی سے صبر کرنے والا فقیر افضل ہے۔ چاہے اپنے حال سے قیام حکم میں دونوں برابر کے (عبادت گزار) ہوں۔ اس لیے کہ پرہیزگار غنی آدمی اپنے نفس کو فائدہ دیتا ہے اور اس کی صفت پُر از نعمت ہے (سرمایہ و فراوانی ہے) اور صابر فقیر پر آلام و مصائب ڈال دی گئیں (اور پھر بھی عبادت کرتا ہے) اس وجہ سے وُہ بڑھ گیا اور معاملہ بھی ایسے ہی ہے۔"

حضرت احمد بن حنبلؒ فرمایا کرتے تھے،

"فقر کے برابر کوئی چیز نہیں وُہ حالتِ فقر کو افضل فرماتے اور صابر فقیر کا درجہ بلند ترین قرار دیتے۔"

مروزیؒ فرماتے ہیں، کہ

"بعض فقراء کا ذکر کیا گیا تو وُہ ان کی تعریف کرنے لگے اور ان کے بارے میں بہت ہی باتیں پوچھنے لگے۔"

بتاتے ہیں کہ میں نے عرض کیا،

"اسے علم کی ضرورت ہے۔"

انہوں نے فرمایا،

"خاموش رہ، اس کا فقر پر صبر کرنا اور اس میں دُکھ سہنا کثرتِ علم سے بہتر ہے۔"

پھر فرمایا:

"یہ لوگ ہم سے بہت بہتر ہیں۔" میں کہتا ہوں کہ جو آدمی غناء کو فقر پر ترجیح دیتا ہے۔ اس نے فقر کی تلخی اور اس کی شیرینی چکھی ہی نہیں۔ وہ اس کی شدت سے دھوکہ میں اور اس کی شیرینی سے محروم ہے۔ اس لئے کہ اگر اس کے دکھ و غم کی تلخی چکھتا تو اسے افضل مان لیتا۔ اور اگر زہد و رضا سے اس کی شیرینی کا مزہ چکھتا تو اس پر (غناء کو) افضل نہ سمجھتا۔

روایت میں ہے،

ابلیس کہتا ہے کہ غنی آدمی مجھ سے تین امور میں سے کسی ایک سے نہیں بچ سکتا،

۱۔ میں اس کو محبت دوں گا۔ چنانچہ وہ ناحق طریق سے (مال) کمائے گا۔

۲۔ یا اسے ناحق مقام پر خرچ کرے گا۔

۳۔ یا حقدار سے مال روکے گا۔"

اب اگر شیطان یہ نہ جانتا کہ فقر افضل ترین حال ہے تو وہ اس کی راہ پر نہ بیٹھتا۔ چنانچہ کہا (جیسے کہ کتاب اللہ میں ہے)

لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ [1] (میں ان کی تاک میں بیٹھوں گا، تیری راہ سیدھی پر)

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کے بارے میں بتا دیا:

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ۔ (شیطان تم سے محتاجی کا وعدہ کرتا ہے)

یعنی تمہیں فقر کے ذریعہ ڈراتا ہے۔ اب فقیرِ صادق کا کام یہ ہے کہ وہ آخرت کے سیدھے راہ پر چلے اور اللہ تعالیٰ کی قوت و توفیق کے ساتھ شیطان کے ڈراوے کو دھتکار دے۔ ایک قول یہ ہے کہ اغنیاء کا اپنی دولت میں مگن ہونا شیطان کا ڈراوا ہے۔ اب فقر و احتیاج میں مبتلا لوگ آئے اور ان پر بُرائی نے احاطہ کر لیا اس سے کتاب اللہ میں ہے:

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَ خَافُوْنِ [2] (سو شیطان ہے کہ ڈراتا ہے اپنے دوستوں سے اسو تم ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو)

چنانچہ ان لوگوں نے اس کا ڈراوا مان لیا اور رحمٰن کے حکم کی مخالفت کی۔ یہ ایسے ہیں جیسے کہ ان کے بارے میں کہا گیا:

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّعْبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرْفٍ

فَاِنْ اَصَابَهٗ۔ الآیۃ

اب اگر اہل زہد کا درجہ و فضیلت سے محروم ہی تھے تو کم از کم متوسط راہ ہی اختیار کر لیتے اور خدا تعالیٰ پر توکل کرتے۔ اس کی رضا چاہتے جس سے دنیادار ڈرتے ہیں تو بھی ان کے لیے کافی تھا۔

دنیا کی حقیقت اور زہد کی کیفیت

زاہد کے مختلف مقامات

مباحات سے پرہیز افضل ترین ہے	خواہشِ نفس اور شہوات سے ہر آدمی کو دنیا میں کچھ نہ کچھ حصہ ملتا ہے۔

---

[1] اعراف آیت ۱۶ [2] آل عمران - آیت ۱۷۵

اب جس نے مذموم خواہش اپنے حصہ میں زہد اختیار کیا تو یہ بات فرض زہد ہے اور جس نے مباح امور میں بھی زہد کیا۔ یعنی ہر چیز میں سے زاید و فضول حاجت سے بھی بے رغبتی اختیار کر لی تو یہ افضل زہد ہے۔ یہ اعضائے ظاہرہ کے حظوظ کی طرف جاتا ہے جو کہ دنیا کے دروازے اور اس کی راہیں ہیں۔ چنانچہ حرام چیزوں میں زہد اختیار کرنا مسلمانوں کا زہد ہے۔ اس سے ان کو حسنِ اسلام حاصل ہوتا ہے اور مشتبہ امور میں زہد اختیار کرنا اہل تقویٰ کا زہد ہے اور اس سے ان کا ایمان کامل ہوتا ہے اور ضروریاتِ نفس سے زاید حلال امور میں زہد اختیار کرنا، زاہدین کا زہد ہے۔ اور اس کی وجہ سے ان کا یقین صاف و پختہ تر ہوتا ہے۔

حضرت عمرو بن میمون کی حدیث میں ہے۔ انہوں نے حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں فرمایا:

"اے زبیر! شہوات و شبہات کے موقع پر اللہ تعالیٰ کے محارم سے اپنے نفس کو صحیح تقویٰ کا مجاہدہ کرا تو جنت میں بغیر حساب کے داخل ہو جائے گا۔"

زہد کے فضائل اور اس کے فائق ترین مقامات کے بارے میں حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے:

"جب تک بندہ ان تین میں زہد نہ کر لے اس کا زہد مکمل نہیں ہوتا:

۱۔ درہم میں۔ جس کو نیکی کے کاموں میں خرچ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور اس کے ذریعہ اللہ تعالےٰ کا قرب حاصل کرے۔

۲۔ کپڑوں میں زہد اختیار کرتا ہے جس کے ذریعہ وُہ عبادات میں مدد (و قوت) چاہتا ہے۔"

انہوں نے یہ بات اس لیے فرمائی کہ ان کے نزدیک حقیقتِ زہد تمام مقامات سے افضل ہے۔ اس لیے کہ وُہ فرمایا کرتے تھے کہ زاہد کو تمام علماء و عابدین کا ثواب ملے گا۔ پھر اس کے اعمال کا ثواب مومنوں پر تقسیم ہو گا۔

اور فرمایا:

"زاہد اور متقی عالم کے فضل و شرف کو قیامت کے روز کوئی دوسرا نہ پا سکے گا۔"

نیز فرمایا:

"خوف کے بغیر زہد حاصل نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ جو ڈرا اس نے ترک کیا۔ چنانچہ انہوں نے زہد کو خوف میں ایک مقام قرار دیا اور ان کے لیے باعثِ اضافہ ہونے کے طور پر اسے افضل کہا۔

حضرت مسروق نے ابن مسعودؓ سے روایت کیا:

"جس کا قلب زاہد ہے اس کی دو رکعتیں تبکلف عبادت کرنے والوں اور ریاضت کرنے والوں کی دائمی

اور ابدی عبادت سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ بہتر اور محبوب ہیں۔"

اور عارفین کے گروہ کے نزدیک زہد کی کوئی آخری انتہا نہیں۔ اس لیے کہ رقیق ابواب دنیا اور مخفی تریں خواہشات پر (زہد کرکے) معرفت کے انتہائی (مقامات) آتے ہیں اور (اس کا سلسلہ طویل تر ہے)

بعض مشائخ کا فرمان ہے:

"انتہائی زہد یہ ہے کہ تُو ہر چیز میں زہد اختیار کرے اور ہر اس چیز سے پرہیز کرے جس میں نفس کو فائدہ ملے اور اس کے ساتھ راحت ملے۔"

جیسے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مروی ہے:

انہوں نے اپنے سر کے نیچے ایک پتھر رکھا ہُوا تھا۔ اس لیے کہ جب سر زمین پر قدرے اونچا ہوگا تو آرام ملے گا تو ابلیس آیا اور کہنے لگا:

"اے ابنِ مریمؑ! کیا تو یہ نہیں سمجھتا کہ تو نے دنیا میں زہد اختیار کر رکھا ہے؟"

فرمایا: "ہاں۔"

اس نے کہا:

جو تُو نے اپنے سر کے نیچے رکھا ہُوا ہے۔ یہ کیا چیز ہے؟"

بتاتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پتھر پھینک دیا اور فرمایا:

"یہ تیرے لیے ہے بمع اس کے کہ جو میں نے اس جیسی (چیزیں، چھوڑ دیں۔"

حضرت یحییٰ بن ذکریا علیہم السلام کے بارے میں مروی ہے کہ انہوں نے بالوں کا جبّہ پہن رکھا تھا۔ حتّٰی کہ ان کی جلد میں سوراخ ہو گئے۔ ان کی ماں نے کہا: کہ

"یہ بالوں کا جبّہ اتار کر اُون کا جبّہ پہن لیں۔" انہوں نے ایسے ہی کیا۔ اللہ تعالیٰ نے وحی فرمائی:

"اے یحییٰ! تم نے مجھ پر دنیا کو ترجیح دی۔"

بتلاتے ہیں کہ وہ رو پڑے اور اُون کا جبّہ اتار کر وہی بالوں کا جبّہ بدن پر پہن لیا۔

حضرت حسن فرمایا کرتے تھے:

"میں نے ستّر بلند پایہ بزرگوں کو دیکھا۔ ہر ایک کے پاس ایک ہی کپڑا تھا اور کسی نے بھی اپنے اور زمین کے درمیان کبھی کپڑا نہیں ڈالا۔ جب وہ سونے کا ارادہ کرتے تو زمین سے بدن براہِ راست لگاتے اور کپڑا اوپر لے لیتے۔"

زہد جامع انعامات ہے

یاد رکھیں میں نے تمام نعمتیں تین ہی دیکھیں اور وُہ سب زہد کے ساتھ ہی ملتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تمام نعمتوں کی اصل اسلام ہے۔ اس لئے کہ اس سے ورے کئی ایسے مقام ہیں جن میں لوگوں نے حقیقتِ توحید میں غلطی کھائی۔ اور دوسری نعمت سنت ہے اس سے ورے کثرت سے بدعات ملتی ہیں اور تمام اہل بدعت سنت سے محروم ہوئے اور تیسرا انعام علم باللہ کا ہے۔ اس لیے کہ اس سے ورے عظمت و قدرت الٰہی سے بہت ہی جہالت پائی جاتی ہے۔ پھر دنیا میں زہد کا انعام ہے۔ اب جس کو یہ بمعہ تین انعاماتِ سابقہ کے ملا اس پر نعمتیں مکمل ہوئیں اور وُہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ ہے۔ یعنی ان پر اللہ تعالٰے کی نعمت کامل ہوئی۔ اس لیے کہ شبہات پر اس سے ورے کثرت سے طمع وحرص پایا جاتا ہے اور شہوات کی غلط رغبت پائی جاتی ہے۔

زہد کی اقسام

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ زہد میں سنت اور اتباع کو شرط قرار دیتے۔ اس لیے کہ فرمان خداوندی ہے کہ،

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ[1] (کہہ دو، اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری تابعداری کرو)

فرمایا: "سنت یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا جائے اور زاہد ہو۔ پھر اہل زہد میں بھی فرق ہے کہ وُہ کس چیز کے لیے زہد اختیار کر رہے ہیں؟ ان میں رفعتِ مشاہدات کے مطابق مختلف مقامات ہوتے ہیں۔

بعض کا زہد، اللہ تعالٰی کے اجلال واکرام کے باعث ہے۔

بعض کا زہد، اللہ تعالٰی سے حیاء کرتے ہُوئے ہے۔

بعض کا زہد، اللہ تعالٰی سے خوف کرتے ہُوئے ہے۔

بعض کا زہد، اللہ تعالٰی سے امید و رجا کے باعث ہے۔

بعض کا زہد، امرِ الٰہی میں تیزی سے آگے بڑھنے کے ہے۔ اور

بعض کا زہد، اللہ تعالٰی کی محبت کے باعث ہے اور یہ زہد کا اعلیٰ ترین مقام ہے۔

زہد کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان حساب کتاب کے لیے طویل مدت تک کھڑے رہنے سے ڈر کر زہد اختیار کرے جیسے کہ فرمایا گیا؛

"قیامت کے روز دو درہموں والا آدمی ایک درہم والے سے سخت تر محاسبہ میں ہوگا۔" اس لیے کہ

---

[1] آل عمران - آیت ۳۱۔

جو آدمی دنیا میں کسی چیز کے جوڑے کا مالک ہو وہ اہل تقویٰ کی راہ پر نہیں چلا اور دنیا میں جس کو بھی کچھ ملا ۔ ساتھ یہ بھی کہا گیا کہ یہ تین ثلث لے لو ۔ تہائی فکر، تہائی مصروفیت اور تہائی حساب' اور ایک غنی آدمی حساب کے لیے کھڑا کیا جائے گا کہ اگر اس کے پسینہ پر ایک سو پیاسے اُونٹ آئیں تو بھی سیر ہو جائیں ۔ حالانکہ جنت میں اپنے منازل کو دیکھ بھی رہا ہے ۔ جب اہلِ تقویٰ کے دِلوں میں یہ اس کی عظمت بیٹھ گئی تو وہ طویل محاسبہ سے ڈر گئے اور جمع کرنے اور مال روکنے میں زہد اختیار کیا اور فضول امیدوں سے جدا ہو گئے تاکہ پرسش میں کمی آجائے اور احوالِ قیامت میں جلدی سے یہ سلسلہ طے ہو جائے ۔

دنیا میں زہد یہ بھی ہے کہ فقر اور فقراُ سے محبت رکھے ۔ مساکین کی ہم نشینی رکھے ۔ ان کے سامنے تواضع اختیار کرے ۔ حضرت مطرف رحمۃ اللہ علیہ اپنے سادہ لباس میں مساکین کی ہم نشینی کرتے اور پروردگار تعالیٰ کا قرب چاہتے ۔

حضرت محمد بن یوسف اصفہانی ؒ ایک عالم زاہد تھے ۔ بعض مشائخ ان کو حضرت ثوریؒ پر افضلیت دیتے ہیں مگر یہ گمنامی کو ترجیح دیتے تھے ۔

چنانچہ انہیں صرف علماء ہی سمجھتے تھے ۔ ان کی حسنِ رعایت اور شدتِ بیدار مغزی کا یہ عالم تھا کہ ہر وقت میں اس وقت افضل ترین عمل کرتے ۔ جب ابن مبارکؒ نے انہیں مصیصہ میں انہیں طلب کیا تو ان کے حال سے آگاہ بعض لوگوں نے بتایا کہ وہ شہر میں بہتر مقام میں ہوں گے ۔ اس وقت وہ جامع مسجد میں ہوں گے ۔ چنانچہ انہیں وہیں سے طلب کیا ۔ بتایا گیا کہ وہ بہترین جگہ میں ہی بیٹھا کرتے ہیں ۔ چنانچہ انہیں فقراء کے پاس سے طلب کیا گیا تو وُہ فقراُ کے تواضع کے لیے بیٹھے تھے اور انہوں نے اپنا سر جھکا رکھا تھا اور مساکین کے پاس گمنامی کی حالت میں بیٹھے تھے ۔ چنانچہ ان کے نزدیک شہر میں افضل ترین مقام جامع مسجد تھا ۔ اس لیے کہ اس میں ایک نماز کا اجر پچاس نمازوں کے برابر ملتا ہے اور افضل ترین جگہ فقراء کی جگہ ہے اور افضل ترین حال گمنامی کا حال ہے اور ان کے نزدیک شہرت سے گمنامی زیادہ بہتر چیز ہے اور یہ بات ان کے پُرخلوص زاہد ہونے پر دلالت کرتی ہے ۔

یہ بھی زہد ہے کہ وُہ اپنے فقر پر شاداں و فرحاں ہُوا اور اسے اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت شمار کرتا ہو ۔ اور فقر چھن جانے اور زہد سے محروم ہو جانے سے ڈرتا ہو جیسے کہ غنی آدمی، فقر سے ڈرتا ہے اور حالتِ غناء پر خوش و خرم رہتا ہے ۔ پھر زہد کی حلاوت بھی پائے ۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس کے دل سے یہ بات دیکھ لے کہ اسے کثرت سے قلت زیادہ محبوب ہے ۔ عزت سے انکساری زیادہ پسندیدہ ہے ۔ جماعت سے زیادہ تنہائی زیادہ قابلِ ترجیح ہے اور شہرت سے زیادہ اسے گمنامی پسند ہے ۔ یہ بات ان کے زہد میں اخلاص کی علامت ہے ۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ چار باتیں تعجب کے ساتھ ہی ملتی ہیں،

۱۔ سکوت اور یہ آغازِ عبادت ہے۔

۲۔ تواضع ۔

۳۔ کثرتِ ذکر ۔

۴۔ اور قلتِ چیز۔"

حضرت ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"آدمی اس وقت ہی عالم ہوتا ہے جبکہ وُہ ابتلاء کو نعمت اور فراخی کو سزا سمجھے۔"

بعض سلفؒ کا فرمان ہے،

"انسان اسی وقت کامل فقیہ (سمجھدار) ہوتا ہے جبکہ وُہ غنا سے زیادہ فقر کو محبوب سمجھے اور عزت پر ذلت کو ترجیح دے۔"

ایک مقطوع روایت ہے:

"انسان اسی وقت ہی حقیقی ایمان تک رسائی حاصل کرتا ہے جبکہ اس کو لا یعرف (غیر معروف)، یعرف (معروف) سے زیادہ پسند ہو اور جبکہ اسے کثرتِ (چیز) سے زیادہ کمی چیز محبوب ہو جائے۔"

سلف صالحینؒ فرمایا کرتے تھے،

"جس حال میں دنیا ہم سے دُور کی گئی اس میں ہم خدا کی نعمت اس حال سے زیادہ ہے کہ جب دنیا ہماری طرف پھیری گئی۔"

حضرت ثوریؒ فرمایا کرتے تھے،

"دنیا دشواری کا گھر ہے، آسانی کا گھر نہیں۔ اور یہ دُکھ کا گھر ہے فرحت کا گھر نہیں۔ جس نے اس کو سمجھ لیا وُہ اس کی فراخی پر خوش نہ ہُوا اور اس کی شقاوت (دکھ) پر غمگین نہ ہُوا۔"

حضرت سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے،

"کسی کی عبادت اس وقت صحیح ہوتی ہے اور اس کا عمل اس وقت خالص ہوتا ہے جبکہ ان اشیاء سے پریشان نہ ہو اور نہ ان سے بھاگے،

۱۔ بھوک ۔

۲۔ برہنگی ۔

۳۔ فقر۔

۴۔ ذلّت۔"

چنانچہ مروی ہے کہ حضرت ابراہیم تیمی رحمۃ اللہ علیہ کو پچاس ہزار درہم پیش کیے گئے۔ آپ نے واپس کر دیے۔ پوچھا گیا،

"آپ نے واپس کیوں کیے؟"

فرمایا: "میں اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ پچاس ہزار کی وجہ سے فقراء کے کھاتہ سے اپنا نام مٹوا دوں"۔

اہل زہد کے نزدیک یہ بات بھی زہد میں داخل ہے کہ جو فضول دنیاوی علوم ہیں انہیں ترک کر دے۔ جو علوم دنیاداروں کے ہاں جاہ و مرتبہ کا باعث بنتے ہیں۔ جن میں آخرت کا کچھ فائدہ نہیں اور نہ ہی وُہ علوم قربِ الٰہی کا ذریعہ ہیں۔ ایسے علوم کو چھوڑ دے۔

یہ علوم گاہے اللہ تعالیٰ کی عبادت سے غافل کر دیتے ہیں۔ گاہے ایسا ہوتا ہے کہ ان کی نحوست کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے سامنے بیٹھنے میں دل جمعی نہیں ہوتی اور ذکر اللہ سے دل کو ہٹا کر سخت کر دیتے ہیں اور خدا تعالیٰ کے انعامات وعظمت میں تفکر میں حجاب بن جاتے ہیں۔

اس زمانہ میں کثرت سے ایسے علوم جاری کیے گئے جو سلف کے دور میں نہ تھے۔ اہلِ غفلت نے انہیں علم قرار دیا۔ بے کار لوگوں نے انہی میں مشغولیت کر لی۔ چنانچہ وُہ اللہ تعالیٰ سے کٹ گئے اور علمِ حقیقت کے مشاہدہ میں یہ آڑ بن گئے۔ ان علوم کی تعداد تو شمار سے باہر ہے۔ ہاں اگر تو یہ معلوم کرے کہ یہ علم ہے یا کلام ہے۔ حق ہے یا اس سے صرف مشابہ ہے۔ صداقت و حکمت۔ ہے یا فریب و غرور ہے۔ یہ پرانی سنت ہے یا بدعت ہے تو اس وقت ہم صائب بات عرض کر دیں گے۔

حکمرانی سے زہد

لوگوں پر حکمرانی کرنے میں زہد کرنا افضل ترین زہد ہے اور لوگوں میں (سیاسی یا غیر سیاسی) مرتبہ و اقتدار حاصل کرنے سے بے رغبت ہونا ان سے مدح وثنا کی چاہت نہ کرنا بہترین زہد ہے۔ اس لیے کہ علماء ربانیین کے نزدیک جاہ طلبی ابواب دنیا میں سے سب سے بڑا دروازہ ہے۔ چنانچہ اس میں زہد کرنا علماء کا زہد ہے۔

حضرت ثوری رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے،

دینار و درہم سے زیادہ سخت زہد لوگوں سے مدح وثناء کی خواہش نہ کرنا اور جاہ و اقتدار طلبی میں زہد کرنا ہے۔ فرمایا: اس کی وجہ یہ ہے کہ گاہے دینار و درہم اس کے حصول پہ لگا دیے جاتے ہیں اور فرمایا کرتے تھے،

"یہ ایک دقیق راہ ہے جس کو صرف ماہر علماءؒ ہی دیکھ سکتے ہیں۔"

حضرت فضیل رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"جاہل آدمی کے دل میں اقتدار طلبی جم جانے کے بعد اسے اکھاڑنے سے پہاڑوں کی چٹانیں ہٹا دینا زیادہ آسان ہے۔"

حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ مسلک ہے کہ:

"زہد کا مطلب یہ ہے کہ جس کی ضمانت دی گئی (عمر روزی وغیرہ) اس کی طلب چھوڑ دی جائے۔"

ھرم ابن حبانؒ نے فرمایا:

میں انہیں دریائے فرات کے کنارے ملا۔ وہ ایک روٹی کا ٹکڑا اور کپڑا (پرانا) دھو رہے تھے جو انہیں پڑا ملا تھا۔ یہ ان کا کھانا اور لباس تھا۔ بتاتے ہیں کہ میں نے پوچھا:

"زہد کیا چیز ہے؟"

فرمایا، "تم کس سلسلہ میں نکلے ہو؟"

میں نے کہا، "روزی کی تلاش میں۔"

فرمایا، "جب تلاش آئی تو زہد چلا گیا۔"

حضرت امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے،

"زہد صرف اویس (قرنیؒ) کا ہی ہے۔ انہیں (لباس نہ ہونے کے باعث) برہنگی آئی۔ آخر کار وہ جھونپڑے میں بیٹھ گئے۔"

نکاح میں زہد

حضرت ابو سلیمان دارانی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"عورتوں میں زہد یہ ہے کہ تو ایک حسین عورت اور بلند گھرانے کی عورت کی بجائے کسی یتیم یا معمولی گھرانے کی عورت سے نکاح کرے۔" حضرت مالک بن دینار کا بھی یہی فرمان ہے۔

حضرت سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا،

"عورتوں کے سلسلہ میں زہد صحیح نہیں۔ اس لیے کہ زاہدوں کے آقا (جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو محبوب کی گئی ہیں۔" ابن عیینہؒ نے بھی ان سے موافقت فرمائی اور کہا:

"بیویوں کی کثرت میں کچھ گناہ نہیں۔ اس لیے کہ حضرت علی بن ابی طالب زاہد ترین صحابی تھے اور پھر بھی ان کی چار بیویاں اور دس سے زیادہ لونڈیاں تھیں۔"

حضرت جنیدؒ فرمایا کرتے تھے:

"مبتدی سالک کو چاہیے کہ وہ ان تین میں دل کو مصروف نہ کرے ورنہ اس کا حال بگڑ جائے گا۔

۱۔ کمانا

۲۔ طلبِ حدیث

۳۔ نکاح کرنا۔"

زہد کیا ہے؟

اور فرمایا:

"صوفی کے لیے یہ بات پسندیدہ ہے کہ وہ نہ پڑھے اور نہ لکھے۔ اس لیے کہ ایسا کرنے سے اس کے عزم میں جمعیت رہے گی۔"

ایک روایت میں ہے:

"زہد یہ ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہے (اور ابھی بندے کو عطا نہیں ہوا) اس پر اس سے زیادہ وثوق ہو جو تیرے پاس ہے۔" چنانچہ یہ مقامِ توکل ہے۔

ایک جماعتِ صوفیاء کا یہ فرمان ہے کہ زہد کا مطلب ترکِ ذخیرہ اندوزی ہے اور ان کے نزدیک جمع کرنے کا نام دنیا ہے۔

بعض مشائخؒ کا فرمان ہے:

"دنیا وہ ہے جو تیرے دل کو (خدا سے) غافل کر دے اور اپنے اہتمام و مصروفیت میں ڈال دے۔" چنانچہ ان کے نزدیک ترکِ اہتمام اور نفس کو احکامِ الٰہی کے سپرد کرنا یعنی تفویض و رضا کی راہ پر چلنا زہد ہے۔

احمد بن ابی حواری بتاتے ہیں کہ میں نے ابو سلیمان دارانیؒ سے عرض کیا کہ مالک بن دینار نے حضرت مغیرہؒ کو فرمایا:

"مکان میں جاؤ اور جو تم نے مجھے زکوٰۃ دی تھی وہ لے لو۔ اس لیے کہ شیطان مجھے وسوسہ ڈال رہا ہے کہ کسی چور نے یہ مال اٹھا لیا ہے۔"

حضرت ابو سلیمانؒ نے فرمایا کہ

"یہ صوفیوں کی قلبی کمزوری کے باعث ہے۔ وہ دنیا میں زہد کر چکا۔ اب کیا رکھا ہے جو لے گا۔" چنانچہ حضرت ابو سلیمانؒ کی مراد یہ تھی کہ حقیقی رضا یہ ہے کہ احکام جاری ہونے پر راضی رہے اور مالکؒ (بن دینار) نے حقیقتِ زہد سے یہ مراد لیا کہ دل سے اہتمامِ (مال) ہٹا دیا جائے۔ اور حضرت حسنؒ نے فرمایا ہے:

"زاہد وہ ہے کہ جب وہ کسی کو دیکھے تو کہے کہ یہ مجھ سے افضل ہے۔" چنانچہ ان کے نزدیک زہد کا مفہوم تواضع ہے۔"

حضرت فضیلؒ فرمایا کرتے تھے:

"قناعت ہی زہد ہے۔"

حضرت ابو سلیمانؒ نے فرمایا:

"تقویٰ زہد کا آغاز ہے۔"

احمد بن ابی حواریؒ نے فرمایا کہ میں نے ابو ہشام مغازلی سے پوچھا:

"زہد کیا چیز ہے؟"

فرمایا: "امیدوں کو کاٹ دینا، مشقت اٹھانا اور راحت ختم کر دینا۔"

حضرت یوسف بن اسباطؒ فرمایا کرتے تھے:

"جس نے تکلیف پر صبر کیا اور شہوات کو چھوڑ دیا اور حلال کی روٹی کھائی اس نے اصل زہد حاصل کر لیا۔"

احمدؒ نے فرمایا کہ میں نے ابو صفوان رعینی سے پوچھا:

"جس دنیا کی اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مذمت فرمائی اور جس سے عقلمند آدمی کو بچنا چاہیے وہ دنیا کیا ہے؟"

فرمایا: "تو دنیا میں جو عمل کرے اور اس سے تیرا مقصود دنیا ہو تو یہ مذموم عمل ہے اور جو عمل ایسا کرے جس سے تمہیں آخرت مقصود ہو تو وہ دنیا میں سے نہیں۔"

میں نے مروانؒ کے سامنے یہ قول نقل کیا تو فرمایا:

"سمجھ کی بات یہی ہے جو صفوانؒ نے فرمائی۔"

انہوں نے یہ بات اس لیے فرمائی کہ دنیا ہر چیز ہے سوائے اخلاص کے۔ چنانچہ جو علم کے موافق ہو وہ مباح ہے اور جو اس کے خلاف ہو تو وہ اور خواہش، دراصل حصۂ نفس ہے اور اخلاص پروردگار تعالیٰ کا حصہ ہے۔ چنانچہ اہل اخلاص بندے، اللہ کی طرف سے امدادِ الٰہی پر حجت ہیں اور یہ (اہل اخلاص بندے) دنیا میں اہلِ آخرت بندے ہیں۔

ابن سماکؒ فرمایا کرتے تھے:

"زاہد وہ ہے کہ جس کے دل سے غم اور خوشیاں نکل جائیں۔ اب وہ کچھ دینار مل جانے پر خوش نہیں ہوتا اور دنیا چھن جانے پر غمگین نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اسے اس کی پروا ہی نہیں کہ اس نے خوشحالی میں صبح کی یا تنگ حالی میں۔"

ابو سعید بن اعرابی نے اپنے مشائخ صوفیا سے نقل کیا:

"ان کے نزدیک زہد کا مطلب یہ ہے کہ دل سے دنیا کی قدر نکل جائے۔ اس لیے کہ دنیا ہے ہی کچھ نہیں۔ اور وہ فی نفسہٖ زاہد نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ اس نے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔ کیونکہ (دنیا) ہے ہی کچھ نہ۔" اور قسم ہے کہ یہ در اصل زہد میں زہد ہے۔ اس لیے کہ اس نے زہد اختیار کیا۔ پھر اپنے زہد پر نگاہ بھی نہیں کی۔ اب جب اس نے کچھ نہ دیکھا تو اسے زاہد بنا دیا کیونکہ اس نے لاشئی میں زہد کیا۔ یہ بات اس قول کے مشابہ ہے کہ حقیقی زہد زہد فی النفس ہے۔ اس لیے کہ گاہے آدمی معاوضہ چاہتے ہوئے دنیا میں نفس کی خاطر زہد اختیار کرتا ہے اب یہ بھی ایک لحاظ سے رغبت بن گئی (اور زہد نہ رہا) یہ بات اس قول کے مشابہ ہے کہ "فناء میں حقیقتِ زہد ہی بقاء میں زہد ہے۔ اس لیے کہ بسا اوقات آدمی فناء میں زہد کرتا ہے تو بقاء میں زہد نہیں ہوتا۔ چنانچہ بقاء میں رغبت پائی جاتی ہے۔ اب جب وہ بقاء میں بھی زہد اختیار کرے گا تو یہ فناء میں بھی حقیقی زہد ہو جائیگا اس لیے کہ فناء در اصل بقاء کے لیے مقصود تھی۔

زہد کی مزید اقسام

رغبتِ ہویٰ حقیقت دنیا ہے۔ اگرچہ انسان پہلے مال میں زاہد ہوتا ہے اور اس کے علاوہ دوسری چیز میں اسے زہد میں سے حصہ نہیں ملا ہوتا۔ ایسے ہی گاہے مدح و ثناء میں انسان زہد کرتا ہے مگر مال میں زاہد نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی کھانوں میں زاہد ہوتا ہے۔ گاہے مال میں زہد رکھتا ہے مگر غلبۂ خواہش کی وجہ سے اپنے منصب میں زاہد نہیں ہوتا۔ اب جب اسے خواہش میں بھی زہد ملے گا۔ اس وقت وہ حقیقی زاہد ہوگا اور زہد فی النفس بھی ہے۔ اس لیے کہ نفس ہی ٹھیک رغبت و حرص کا نام ہے اور ہویٰ (خواہش) در اصل نفس کی رُوح ہے اسے خوب سمجھ لو۔

حضرت یونس بن ہبیرۃ جیلانی فرمایا کرتے تھے:

"دنیا میں زہد یہ نہیں کہ حلال کو حرام کرلے اور مال ضائع کرتا رہے بلکہ دنیا میں زہد یہ ہے کہ جو چیز بھی اللہ تعالیٰ کے پاس ہے اس پر تجھے اس سے زیادہ وثوق ہو، جو اس کے پاس ہے اور مصیبت میں اور جب مصیبت نہ آئے تو تیرا حال برابر ہو اور حق کے معاملہ میں تیری مدح و مذمت کرنے والا برابر ہو۔"

سلام بن ابی مطیع رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

"زہد کے تین طریقے ہیں:

۱۔ خالص اللہ تعالیٰ کے لیے عمل و قول ہو اور ان سے کچھ بھی دنیا مراد نہ ہو۔

۲۔ غیر مناسب چھوڑ دے اور مناسب عمل کرے۔

۳۔ حلال میں بھی زہد کرے تو یہ زیادہ فضیلت اور افضل ہے۔"

اسی علم میں ہمارے امام حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"زہد کی تین اقسام ہیں:

۱۔ فرض زہد۔

۲۔ فضیلت کا زہد۔

۳۔ سلامتی کا زہد۔"

چنانچہ حرام میں زہد اختیار کرنا فرض ہے۔ حلال میں زہد کرنا فضیلت ہے اور شبہات میں زہد اختیار کرنا باعثِ سلامتی ہے۔

حضرت ایوب سختیانی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے:

"زہد یہ ہے کہ تم سے ایک آدمی اپنے گھر میں بیٹھے۔ اب اگر اس کا بیٹھنا اللہ کی رضا کی خاطر ہو تو ٹھیک ورنہ باہر نکل جائے۔ اور اگر اس کا نکلنا اللہ کی رضا کی خاطر ہو تو ٹھیک ورنہ گھر کو لوٹ جائے اور اگر اس کا لوٹنا اللہ کی رضا کے لیے ہو تو ٹھیک ورنہ چل پڑے۔ اور درہم نکالے تو دیکھے کہ اگر اللہ کی رضا کے لیے نکال رہا ہے تو ٹھیک ورنہ روک لے۔ اور اگر ان کا روکنا اللہ کی رضا کے لیے ہے تو ٹھیک ورنہ انہیں پھینک دے اور کلام کرے تو دیکھے کہ اللہ کی رضا کے لیے ہے تو ٹھیک ورنہ خاموش رہے۔ اور اگر اس کی خاموشی اللہ کی رضا کے لیے ہے تو ٹھیک ورنہ کلام کرے"۔

عرض کیا گیا،

"یہ کام تو مشکل ہے"!

فرمایا: "اللہ تعالیٰ کی جانب یہ طریق ہے ورنہ کھیل نہ بنا لو"۔ یعنی ان کا مسلک یہ ہے کہ زہد سے مراد مراقبہ و محاسبہ کرتے رہنا ہے اور مراقبہ ہی اخلاص ہے"۔

حضرت شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ کے دوست حضرت حاتم اصم ؒ سے زہد کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا:

"اس کا آغاز وثوق کرنا، وسط صبر کرنا اور آخر اخلاص ہے"۔

اب جب صوفیاء کے نزدیک زہد کا آخر اخلاص ہوا تو بندے کے لیے آغاز حاصل کیے بغیر آخری حصہ حاصل کرنا کیونکر ممکن ہوگا؟ یا وہ اخلاص سے گزر کر مقاماتِ معرفت تک کیونکر رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اب ان کے نزدیک زہد کا آخری حصہ معرفت کا ابتداء ہے"۔

ایک گروہ کا مسلک یہ ہے کہ دنیا میں زہد کرنا مومنوں پر فرض ہے۔ اس لیے کہ ان کے نزدیک حقیقی اخلاص ہی زہد ہے۔ اس لیے انہوں نے مومنوں پر اخلاص واجب بتاتے ہوئے زہد کو بھی واجب قرار دیا۔

عبدالرحیم بن یحییٰ اسود کا بھی اسی طرف میلان ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے بھی یہی مفہوم مروی ہے:

امام احمدؒ سے پُوچھا گیا:

"جماعتِ صوفیاء نے کس کے ساتھ ذکر کیا اور وہ امام بن گئے؟"

فرمایا: "صدق کے ساتھ"

کہا: "صدق کیا ہے؟"

فرمایا: "اخلاص"۔

پوچھا گیا: "اخلاص کیا ہے؟"

فرمایا: "زہد کو کہتے ہیں"۔

کہا: "اے ابو عبداللہ! زہد کیا ہے؟"

انہوں نے سر نیچا کر لیا پھر سر اٹھا کر فرمایا:

"زاہدین سے پُوچھو، بشر بن حارثؒ سے پوچھو"۔

ایک جماعت کا فرمان ہے:

"طلبِ حلال کا نام دنیا میں زہد ہے"۔ اور یہ بات ہمارے اس دور میں فرض ہے۔ اس لیے کہ اشیاء میں اختلاط بڑھ گیا اور شبہات کا غلبہ ہو گیا۔

صوفیاء کا فرمان ہے:

"یہ متعین ہو چکا کہ زہد فرض ہے"۔ یہ ابراہیم بن ادھمؒ، وہیب بن وردؒ، سلیمان خواصؒ اور اہلِ شام کی ایک جماعتِ صوفیاء کا مذہب ہے۔

حضرت سہلؒ فرماتے ہیں:

"دنیا میں زاہد تر وہی ہے جس کا طعام صاف تر ہو"۔

اور فرمایا:

"تقویٰ کا بلند ترین مقام زہد میں ادنیٰ ترین مقام ہے"۔

حضرت یوسف بن اسباط اور حضرت وکیع رحمہما اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"اگر ہمارے اس دور میں کوئی آدمی ابو ذر اور ابو الدرداء رضی اللہ عنہما کی طرح کا پایا جائے تو بھی ہم اسے زاہد نہیں کہیں گے۔ اس لیے کہ ہمارے آج کے دور میں حلال میں زہد ہے"۔

امام الائمہ حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول بھی یہی ہے:

"دنیا کو مسترد کرنے سے زیادہ افضل چیز کچھ نہیں۔"

حضرت فضیلؒ بن ثورؒ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت حسنؒ سے پوچھا:

"اے ابوسعیدؒ! دو آدمی ہیں ان میں سے ایک حلال طریق پر دُنیا طلب کر رہا ہے۔ چنانچہ اس نے اسے پا لیا اور اس کے ساتھ صلہ رحمی کی اور اپنے لیے ذخیرہ آگے بڑھایا اور دوسرے آدمی نے دنیا کو ترک کر دیا۔ اب کیا حکم ہے؟"

فرمایا: "مجھے ان دونوں میں وہی زیادہ محبوب ہے جس نے دنیا کو مسترد کر دیا۔"

میں نے عرض کیا:

"اے ابوسعید! اس نے حلال طلبِ دنیا کی۔ اسے لے کر صلہ رحمی اور ذخیرۂ آخرت کیا؟"

فرمایا: "مجھے وہی زیادہ محبوب ہے جس نے دنیا کو برطرف کر دیا۔"

حضرت حسنؒ نے دنیا کو مسترد کرنے والے کو اس لیے پسند کیا کہ مقامِ زہد میں توکل و رضا دونوں پائے جاتے ہیں۔ دیکھیے حدیث میں آتا ہے،

"اور مصیبت کا ثواب زیادہ فرحت کا باعث ہوگا۔ (اور چاہے گا) کہ کاش! یہ تیرے لیے باقی رہتی۔"

اور یہی رضا ہے۔

پھر زہد کے بعد معرفت و محبت اس پر آتے ہیں۔ اب جو مقام ان چاروں (مقامات) کا جامع ہو اس سے بلند و فائق کون سا مقام ہو سکتا ہے اور یہی سالکین کا مقصود ہے؟

دنیا کی مثال

مجھے قسم ہے کہ یہ معاملہ بھی ایسے ہی ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حدیث مروی ہے جس میں بہت ہی شدت ہے۔ فرمایا:

"قیامت کے روز دنیا کو ادھیڑ عمر کی نیلی آنکھوں والی بڑھیا کی شکل دی جائے گی جس کی شکل سخت مکروہ ہوگی اور مخلوق کو دکھائی جائے گی۔ پھر کہا جائے گا:

"اسے جانتے ہو؟"

وہ کہیں گے:

"ہم اس کو جاننے سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔"

فرمایا جائے گا:

"یہ دنیا ہے، جس پر تم باہم فخر کیا کرتے تھے۔ اسی کی وجہ سے تم قطع رحمی کرتے تھے۔ اسی کی وجہ سے

تم باہم حسد کرتے تھے اور بغض و فریب میں مبتلا رہتے تھے۔"

پھر اس کو دوزخ میں ڈال دیا جائے گا اور وُہ آواز دے گی :

"اے پروردگار! میرے تابعین و میری جماعت کہاں ہے؟"

اللہ تعالیٰ حکم دے گا :

"اس کے تابعین اور اس کے گروہ بھی اس سے جا ملیں۔"

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سے شدید ترین روایت آتی ہے :

حضرت عبدالواحد بن زید نے حسنؒ سے، انہوں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

"قیامت کے روز ایسی اقوام لائی جائیں گی کہ جن کے اعمال تہامہ کے پہاڑوں کی طرح ہوں گے اور انہیں دوزخ میں جانے کا حکم دے دیا جائے گا۔"

(صحابہؓ) نے پوچھا :

"اے اللہ کے رسولؐ! کیا وہ نمازی ہوں گے؟"

فرمایا : "ہاں، وُہ نماز پڑھتے ہوں گے، روزے رکھتے ہوں گے اور شب کو آرام بھی کرتے ہوں گے مگر جب ان کے سامنے دنیا میں سے کچھ چیز جاتی ہے تو اس پر کُود پڑتے ہیں۔"

دنیا کی بے قدری زہد ہے

حضرت حارث بن اسد محاسبی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے :

"زہد یہ ہے کہ دل سے دنیا کی قیمت گرا دے اور کسی عاجل (دنیا میں ملنے والی) چیز کی اس کے دل میں کچھ بھی وقعت نہ ہو۔ جب اس کے دل میں تمام اشیاء کی قیمت گر جائیگی اور یہ سب برابر ہو گا۔ تو یہ زہد ہے۔"

ابُو یزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے :

"زاہد وُہ نہیں ہے جو کسی بھی چیز کا مالک نہ ہو بلکہ زاہد وُہ ہے کہ جس کی کوئی چیز مالک نہ بن سکے۔"

ایک عالمؒ نے اس مفہوم میں فرمایا :

"زاہد وُہ ہے جو اشیاء کا مالک نہ بنتا پھرے اور نہ ہی اسے ان کی طرف سکون حاصل ہو۔"

اور فرمایا کرتے :

"زاہد وُہ ہے جس کی خوراک بس آج کی ہو۔ اس کے پاس کپڑا ستر چھپانے تک کے بلیے ہو اور اس کا گھر صرف اس قدر ہو جس میں اسے پناہ مل جائے اور اس کا حال اس کا وقت ہے۔"

ایک عارفؒ فرماتے ہیں :

"ترکِ تدبر و اختیار کا نام زہد ہے۔ تنگی ہو یا فراخی ہو۔ ہر امتحان میں تسلیم و رضا کا مظاہرہ کرے۔"

یہ خواص، ثوری اور ذوالنون رحمہم اللہ تعالیٰ کا مسلک ہے۔ ایک بار حضرت ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا :

"زاہد وُہ ہے جو کسی چیز کا مالک نہ ہو اور نہ ہی اُس کی کوئی چیز مالک ہو۔"

اور فرمایا :

"حقیقی زہد تو ظہورِ قدرت کے موقع پر ہوتا ہے۔ اور عاجز کا تو زہد صحیح ہی نہیں اور ظہورِ قدرت یہ ہے کہ اُسے کُنْ کی کرامت عطا کی جائے اور اسے اسم (اعظم) بتا دیا جائے اور اظہارِ کون کے ساتھ وُہ اشیاء پر قدرت حاصل کرلے مگر پھر بھی اللہ تعالیٰ سے حیاء کرتے ہُوئے اور اس کی محبت کی وجہ سے اس میں زہد اختیار کرے۔"

اور وہ چوبیس مقامات سے اظہارِ قدرت سے خدا تعالیٰ کی پناہ مانگتے تھے اور ابو موسیٰ عبدالرحیم سے پوچھا :

"آپ کس چیز میں کلام کرتے ہیں ؟"

فرمایا : "زہد میں۔"

پُوچھا : "کس چیز میں ؟ (زہد ہو)"

فرمایا : "دنیا میں۔"

راوی بتاتے ہیں کہ انہوں نے ہاتھوں کو جھاڑ دیا اور فرمایا :

"میں سمجھتا تھا کہ کسی چیز میں زہد کرنے کے بارے میں کلام کر رہے ہیں۔ دنیا تو کچھ چیز ہی نہیں۔ اب اس میں کیا زہد کریں گے ؟"

حضرت سہل وغیرہ اس مفہوم کی طرف مائل ہیں۔ فرمایا :

"معرفت میں سترہ مقامات ہیں۔ ان میں ادنیٰ ترین یہ ہے کہ پانی پر اور ہوا میں چلے اور زمین کے خزانے ظاہر ہو جائیں اور یہ تمام باتیں دنیاوی آرائش و فریب کی ہیں۔"

حضرت جنیدؒ سے اس مفہوم کا ایک واقعہ آتا ہے ؛ فرمایا :

"شبِ عید کو جامع منصور میں چار ابدال جمع ہو گئے۔ جب سحری ہُوئی تو ان میں سے ایک نے کہا :

"میں نے تو نیت کرلی کہ بیت المقدس میں نمازِ عید ادا کروں گا۔"

دُوسرے نے کہا :

میں نے نیت کی ہے کہ طرطوس میں نمازِ عید ادا کروں گا۔"

تیسرے نے کہا:

"میں نے نیت کی ہے کہ مکّہ میں نمازِ عید ادا کروں گا"۔

چوتھے خاموش رہے۔ یہ بلند درجہ کے عارف تھے۔ ان سے پُوچھا گیا:

"آپ نے کیا نیت کی ہے؟"

فرمایا: "آج میں نے ترکِ شہوات کی نیت کی ہے اور میں تو اسی مسجد میں نمازِ (عید) ادا کروں گا، جس میں رات گزاری ہے"۔

سب نے کہا:

"آپ ہم میں سے زیادہ صاحبِ علم ہیں۔ چنانچہ وُہ اس کے پاس بیٹھ گئے جیسے ہم آغاز میں ذکر کر چکے ہیں"۔ ان کے نزدیک یہ باتیں شہوات سے ہُوئیں۔ اس لیے کہ حاجات اور دنیا میں سے شہوت کا نام مقامات نہیں ہے کیونکہ یہ چیز ہوائے (نفس) سے ہیں۔ مزید برآں ان میں تدبیر و ابتلاء بھی چل رہا ہے۔

اہلِ زہد عارفین و محبین کے نزدیک یہ مکروہ تدبیر ہے۔ اس کا ابتلاء ڈال کر دیکھا جاتا ہے کہ وُہ کیسے عمل کرتے ہیں؟ کیونکہ ہر بندے کا ابتلاء اس کے مرتبہ و حال کے مطابق ہوتا ہے۔ اس لیے اس میں اسے زہد لازم ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ معرفت کے سترھویں مقام میں آتا ہے۔ اب جو اس راہ پر چلا اس نے اُسے دیکھا اور اس سے اوپر ستّر سے زاید مقامات ہیں جو افضل تر ہیں۔

حضرت جنیدؒ سے زہد کے بارے میں پُوچھا گیا تو فرمایا:

"اس کے دو معنی ہیں، ایک ظاہری اور ایک باطنی۔ چنانچہ ظاہری مطلب یہ ہے کہ مقبوضہ مملوکہ اشیاء سے بغض رکھے، طلبِ مفقود ترک کر دے اور باطنی مفہوم یہ ہے کہ دل سے اس کی رغبت ہی ختم کر دے اور اس کی یاد سے بالکل الگ اور جُدا ہو جائے۔ جب یہ بات حاصل ہو جائے گی تو اسے اللہ تعالیٰ آخرت پر نظر کرنا اور قلب کے ساتھ اسے دیکھنا عطا فرمائے گا۔ اس صورت میں وُہ کم امیدی اور موت قریب ہونے کے تصوّر کے ساتھ تیزی سے نیک اعمال کرے گا کیونکہ اس کے قلب سے اسباب کٹ چکے ہوں گے اور اس کے دل کو تنہا آخرت کی فکر ہی رہ جائے گی اور خلوص کے ساتھ اس کے قلب میں حقیقی زہد آ جائے گا۔ چنانچہ اب وہ خالص پروردگار تعالیٰ کے ذکر سے بھرپور ہوگا۔ الغرض حقیقی ایمان اور مشاہدۂ آخرت سے پیدا ہونیوالا زہد، زہد اور تمام اشیاء کے برابر (بے قدر و قیمت) ہو جانے کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ اب دل ہموار ہو چکا۔ اس لیے مشاہدہ کے بعد وجود کی طرح اشیاء کا عدم اس کے نزدیک برابر ہوگا اور نفسانیت ختم ہونے اور ریاکاری کی خواہش چلے جانے کے باعث مدح و مذمت اس کے لیے برابر ہو گی۔ اب صفائیِ قلب کے

باعث اس کا اخلاص درست ہُوا اور سقوطِ نفس کے باعث اس کا زہد پختہ ہُوا۔ اس کی دلیل ایک روایت ہے جو حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ آپؐ نے ایک آدمی کو فرمایا:

"کیا تُو برابر ہوگیا؟ (درست و ہموار ہوگیا)۔"

اس نے عرض کیا:

"میں کیسے برابر ہو جاؤں؟"

فرمایا: "تیرے نزدیک مدح و مذمت برابر ہو جائے۔"

اور جب آپؐ نے حضرت حارثہؓ سے حقیقتِ ایمان پُوچھی تو انہوں نے عرض کیا:

"میں نے اپنے نفس کو دنیا سے جُدا کر دیا۔"

چنانچہ انہوں نے زہد سے آغازِ (کلام) کیا۔ پھر ذکر کیا کہ میرے نزدیک پتّھر اور سونا برابر ہو چکے اور اس کے بعد مشاہدہ کا ذکر کیا۔ یہ سب زہد کے مقامات ہیں اور جس نے اپنے عمل کے مطابق اور رفعتِ مشاہدہ کے مطابق دنیا کو کچھ چیز قرار دیا۔ انہوں نے اس کی ضد کو زہد کہا۔

زہد کی مزید تشریح

عارفین نے قلب میں ایمان کی تقسیم دو مقامات پر فرمائی اور دونوں کے لیے زہد بتایا۔ چنانچہ فرمایا:

"جب ظاہر قلب کے ساتھ ایمان کا تعلق ہوتا ہے تو بندہ دنیا کو پسند کرتا ہے اور آخرت کو بھی پسند کرتا ہے اور دونوں کے لیے عمل کرتا ہے اور جب قلب کے اندھیروں میں ایمان مخفی ہو جاتا ہے اور (باطنِ قلب) میں ایمان چلا جاتا ہے تو وہ دنیا سے بغض رکھتا ہے۔ نہ اس کی طرف دیکھتا ہے اور نہ ہی اس کے لیے عمل کرتا ہے۔"

حضرت ابو سلیمانؒ فرمایا کرتے تھے:

"جس نے اپنے نفس کے ساتھ مصروفیت اختیار کی۔ وہ لوگوں سے غافل ہوگیا اور یہ عاملین کا مقام ہے اور جس نے اپنے رب تعالےٰ میں مشغولیت اختیار کر لی وُہ اپنے نفس سے غافل ہوگیا۔ یہ عارفین کا مقام ہے اور سنت میں ان دونوں مقاموں کے لیے دلیل موجود ہے۔"

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا:

"لوگوں میں سے کون بہتر ہے؟"

فرمایا: "جو دنیا سے بغض رکھے اور آخرت سے محبّت رکھے۔" اب اس کے دل میں آخرت کی محبت کے باعث دنیا کا بغض ڈال دیا گیا۔ دلیل یہ ہے کہ:

"جس نے تمام فکروں کو ایک فکر میں ڈال لیا۔ اللہ تعالیٰ اس کی آخرت و دنیا کے معاملہ کے لیے کافی ہے

اور ایک فکر ایک ہی وجہ سے ہوتا ہے۔" یعنی ایک رب کو راضی کرنے کا فکر ڈال لے۔ یہ ایک موحد بنانے کا وصف ہے۔ اس کی ساری فریاد واحد تعالیٰ کے سامنے ہی ہوتی ہے۔ اسے اس کا خلق دیا گیا اب وہ اس کی صفتِ وحدانیت کے باعث احد (فرد) ہے اور بندہ مخلوق میں اسی کے وجد کے ساتھ متوحد ہے۔ اب اسکو ایک ہی فکر ہے۔ اس کو جمعیتِ خاطر حاصل ہے اور یک فکری صرف خواہشِ (نفس) مٹنے کے بعد حاصل ہوتی ہے اور تقویٰ کے لیے امتحانِ قلب کے بعد ہی مٹتا ہے اور جب نفس کو ایمان کے ساتھ اطمینان حاصل ہو جائے تو جمعیتِ خاطر حاصل ہوتی ہے یا تزکیہ و رضا کے ساتھ اس کو فلاح ملتی ہے جیسے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" فرحتِ نفس نعمت کے ساتھ ہوتی ہے۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا [1] (مراد کو پہنچا جس نے اس کو سنوارا)

اور فرمایا:

رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً [2] (تو اس سے راضی وہ تجھ سے راضی)

اب وہ موحد باروح، اخلاقِ ایمان کے ساتھ متصف اور مشاہدۂ یقین کے ساتھ قلب کی موافقت کرنے والا ہوگا۔

حضرت وہب بن منبہؒ نے فرمایا کہ میں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل شدہ (تعلیمات) میں پایا کہ:

"جس نے دنیا کو محبوب رکھا، اللہ تعالیٰ نے اس کو مبغوض سمجھا اور جس نے دنیا کو مبغوض رکھا، اللہ تعالیٰ نے اسے محبوب جانا اور جس نے دنیا کی عزت کی اللہ تعالیٰ نے اسے ذلیل کیا اور جس نے دنیا کو ذلیل کیا اللہ تعالیٰ نے اسے باعزت بنا دیا۔"

البتہ علمائے ظاہر کا بیان ہے:

" دنیا میں زہد کا مطلب یہ ہے کہ علم کی موافقت کرے اور احکامِ شرع کی پابندی کرے اور چیز کو اس کے (درست) طریق سے لے اور اس کو اس کے (جائز مقام) حق میں خرچ کرے اور جو علم کے خلاف ہو وہ سب ہوائے (نفس) ہے۔" چنانچہ انہوں نے فرض زہد کا ذکر کیا اور دقائق و بواطنِ (زہد) کو

---

[1] الشمس آیت ۹۔

[2] الفجر آیت ۲۸۔

نہ سمجھ سکے۔

حضرت سفیان بن عیینہؒ اور حضرت ثوریؒ سے یہی مفہوم مروی ہے۔ ان دونوں بزرگوں سے دریافت کیا گیا،

"کیا آدمی اس وقت بھی زاہد ہو سکتا ہے جبکہ اس کے پاس مال ہو؟"

فرمایا: "ہاں! جبکہ وہ ایسا ہو کر اگر ابتلاء آئے تو صبر کرے اور اگر نعمت ملے تو شکر کرے۔"

ابن ابی حواریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ان سے کہا:

"اے ابو محمد یعنی ابن عیینہ پر انعام ہوا تو اس نے شکر کیا اور ابتلاء آیا تو صبر کر لیا مگر نعمت روکے رکھنا کیونکر زہد بن گیا"

انہوں نے مجھے ہاتھ سے ٹھوکا دیا اور فرمایا:

"خاموش ہو جا، جس کو نعمتیں شکر سے باز نہ رکھیں اور ابتلاء صبر سے نہ روکے وہ زاہد ہی ہے۔"

امام زہریؒ نے بھی ان سے موافقت فرمائی اور اسی طرح فرمایا۔

حضرت ابو سلیمانؒ نے اس کی وضاحت کی۔ ابن ابی حواریؒ بتاتے ہیں کہ میں نے ان سے عرض کیا،

"کیا داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ زاہد تھے؟"

فرمایا: "ہاں۔"

میں نے عرض کیا،

"مجھے یہ (روایت) پہنچی ہے کہ انہیں وراثت میں اپنے والد کی طرف سے بیس دینار ملے اور انہوں نے بیس برس میں انہیں خرچ کیا۔ اب جو آدمی دیناروں کو (ذخیرہ کر کے) روکے ہوئے ہو وہ زاہد کیونکر ہو سکتا ہے؟"

فرمایا: "ان سے تیرا مطلب حقیقی زہد تک ان کا پہنچنا ہے۔ قسم ہے کہ ہمیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت پہنچی۔"

اور صالح مال وہ ہے جو حلال ہو اور صالح مرد وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اس کی راہ میں دن رات مال خرچ کرتا رہے جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی مدح و تعریف فرمائی۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے،

"اللہ تعالیٰ دنیا اس کو بھی دیتا ہے جس سے محبت رکھتا ہے اور جس سے محبت نہیں کرتا مگر دین صرف اسی کو دیتا ہے جس سے محبت رکھتا ہے۔" اب جس سے اللہ تعالیٰ محبت رکھتا ہے جب اس کو دنیا عطا ہوتی ہے تو وہ اپنی خواہش کی خاطر اپنے حبیب تعالیٰ کے خلاف نہیں کرتا اور اپنے مولائے کریم کی محبت پر اپنے نفس کو

ترجیح نہیں دیتا۔ اس لیے کہ جو اس نے عطا کیا اس میں وُہ اسے ہی اپنا کارساز و والی سمجھتا ہے۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے:

"کھانے والا شکر گزار بمنزلۂ صابر روزے دار کے ہے۔" اب شکر گزار کھانے والا وہی ہے جو کھانا کھا کر اپنے مولائے کریم کی عبادت کے لیے قوّت چاہتا ہے اور شکر کے طور پر اس کی عبادت کرتا ہے اس لیے کہ اس نے اس کی کارسازی فرمائی۔

مشائخ کا فرمان ہے کہ زہد میں احوالِ قلوب کے جامع دو اوصاف ہیں۔

مضاءُ بن عیسیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے سباع موصلیؒ سے عرض کیا:

"اے ابو محمد! زہد نے انہیں کس چیز تک پہنچا دیا؟"

فرمایا، "اللہ تعالیٰ کے ساتھ انس تک۔"

حضرت عثمان بن عمارۃ نے فرمایا:

کہا جاتا تھا کہ تقویٰ انسان کو زہد تک پہنچاتا ہے اور زہد اسے اللہ تعالیٰ کی محبّت تک پہنچاتا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں حال سالکین کا انتہائی مقصود ہیں۔ (یعنی) جلیل تعالیٰ سے محبّت اور لطیف سبحانہٗ سے انس۔ اب جو زہد حاصل نہ کر سکا وُہ مقامِ محبت تک نہ پہنچا اور نہ ہی اسے حالِ انس حاصل ہُوا۔

پھر مقامِ محبّت و خلوت میں اور حالِ انس و قرب میں پوشیدہ راز ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو اس کی توفیق دے جس کو محبوب رکھتا ہے اور اپنے فضل و کرم کے ساتھ ہماری امیدیں برلائے اور اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر کے بغیر نہ توفیق ہے اور نہ قوّت۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ اور یہ کتاب الزہد میں آخری کلمات ہیں۔

ختم شد — جزو اوّل

تفاسیر قرآن پاک

تفسیر قادری

از مولوی فخر الدین صاحب قادری

تقطیع ۱۰" × ۱۳" ضخامت ۱۲۰۰ صفحات

ہدیہ مکمل سیٹ کاغذ سفید رف — بلا جلد -/۱۰۰ روپے

تفاسیر میں بنیادی اور اساسی حیثیت رکھتی ہے۔ اسے دو جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔

تفسیر موضح القرآن

از حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلوی صاحبؒ

تقطیع ۱۰" × ۱۳" ضخامت ۶۳۲ صفحات

، گلیز کاغذ -/۱۵۰ روپے ، مجلد سنہری

حضرت شاہ عبد القادر محدث دہلوی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان ہی کی اس تفسیر کو وہ بلند مقام حاصل ہے کہ اس کی مدد کے بغیر کوئی تفسیر آج تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کی افادیت کے پیش نظر ہم نے اس مرتبہ فوٹو آفسٹ پر طبع کیا ہے۔ اس مستند تفسیر میں متن ترجمہ اردو حواشی کے ساتھ ساتھ حوالہ جات بھی تفصیل سے درج ہیں ۱۵۰/- روپے

ترجمان القرآن

از ابو الکلام آزاد

تقطیع ۷½" × ۱۱" ہدیہ جلد اول -/۱۰۰، جلد دوم -/۱۲۵ روپے

تفسیر قرآن پاک جسے مولانا ابو الکلام آزاد جیسی شخصیت نے ترتیب دیا ہو کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ ہم نے نہایت اہتمام اور عمدہ کاغذ و طباعت سے شائع کی ہے۔

باقیات ترجمان القرآن

از ابو الکلام آزاد

تقطیع ۷½" × ۱۱" مرتبہ غلام رسول مہر

صفحات ۱۹۲ ہدیہ -/۵۰ روپے

ترجمان القرآن جلد اول، دوم کی اشاعت کے بعد شدت سے جلد سوم کی ضرورت محسوس کی گئی لیکن جب مولانا مرحوم کے مسودات میں اس کا کہیں سراغ نہ مل سکا تو مولانا مہر نے موصوف کو جن کا تعلق تیسری جلد سے تھا کی تمام تحریرات و تصانیف اور مسودات کا بغور مطالعہ کیا اور ان تمام آیات کو جن کا تعلق تیسری جلد سے تھا مع ترجمہ و تشریح الگ الگ کر کے مرتب کر دیا۔

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز، ۱۹۹۔ سرکلر روڈ، چوک انارکلی، لاہور ۲ / ۵۴۰۰۰

اسلامیات

بہارِ شریعت

تقطیع ۶½ × ۱۰" مجلد/۳۵ روپے

بریلوی عقاید کے معتقدین کے لیے سرمایۂ افتخار ہے کہ اس میں مسائل آیات قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کے حوالوں سے بیان کیے گئے ہیں۔ علماء اور عوام کے لیے یکساں مفید اور مشعل راہ ہے۔

مولانا ابوالقاسم دلاوری

عماد الدین

تقطیع ۷½ × ۱۰" ضخامت ۴۹۶ صفحات قیمت /۸۰ روپے

فقہ امام ابو حنیفہ کے مطابق نماز کے جملہ مسائل جن کی روزمرہ ضرورت پیش آتی ہے اس کتاب میں وضاحت سے عام فہم انداز میں جمع کر دیے گئے ہیں۔ اس کتاب کے بعد کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہتی۔ ائمہ مساجد اور عام اشخاص کے لیے یکساں مفید ہے۔

نہج البلاغت

مرتبین: عبدالرزاق خاں ملیح آبادی، سید رئیس احمد جعفری (ندوی)، سید مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی، سید نائب حسین نقوی

تقطیع ۷½ × ۱۰" صفحات ۱۲۰۰ قیمت/۱۵۰ روپے

اس (تیسرے) ایڈیشن میں چند خطوط اور چند خطبات جو سابقہ ایڈیشنوں میں شامل ہونے سے رہ گئے تھے نیز وہ خطبات جو سید رضی کی تالیف میں نہیں ہیں شامل کر دیے گئے ہیں۔ آخر میں اشاریہ کا بھی اضافہ ہے جس کی افادیت سب پر روشن ہے۔

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز، ۱۹۹۔ سرکلر روڈ، چوک انارکلی، لاہور ۲/۵۴۰۰۰

مُسلم شخصیات کا اِنسائیکلوپیڈیا

تاریخ اسلام کے آئینے میں نامور شخصیتوں کا تعارف

حضرت آدمؑ سے لیکر حضور سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تک اور پھر اس کے بعد کے دَورِ خلافت سے حضرت امام حُسینؓ تک کے حالات پر مکمل انسائیکلو پیڈیا۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ شخصیتوں کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کو تاریخ کے پس منظر میں متعارف کرایا گیا ہے۔ گویا شخصیات کے عہد بہ عہد کی کہانی تاریخِ اسلام کے دَور کی زبانی!
اس موضوع پر آج تک کسی نے قلم نہیں اُٹھایا۔ یہ روشن کتابوں کے سلسلہ میں ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

مرتبہ: ایم۔ ایس ناز ○ قامت ۲/۱-۷×۱۰ ○ کاغذ سفید

① حضرت آدمؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک منصۂ شہود پر آنے والی عظیم شخصیات کا مکمل جائزہ
② زمانہ ماقبل اسلام سے موجودہ دَور تک کا تاریخی پس منظر تاریخ کی روشنی میں
③ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ اور سیرت مقدسہ کا اجمالی تذکرہ
④ غزوہ بدر کے صحابہ کی تعداد ۳۱۳ نہیں بلکہ ۳۳۳ تھی۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اصحابِ بدر کا تذکرہ
⑤ ۲ ہجری سے ۱۱ ہجری پر محیط ۲۴ غزوات وسرایا اور ۱۵۵ مسلم شخصیات کی ایک اہم دستاویز
⑥ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شخصیت، حالاتِ زندگی اور خلافت کا تفصیلی تذکرہ اور جائزہ
⑦ حضرت عمرؓ کی شخصیت، حالاتِ زندگی اور ان کے خلافت کے سنہری دَور کے تفصیلی واقعات
⑧ حضرت عثمان غنیؓ کی شخصیت، حالاتِ زندگی اور خلافت کے دَور کا تفصیلی تذکرہ تاریخ کی روشنی میں
⑨ حضرت علیؓ کی شخصیت، حالاتِ زندگی، ان کی شجاعت اور خلافت کے دَور کا تفصیلی تذکرہ
⑩ فضیلت صحابہ کرامؓ، انصار ومہاجرین کا تذکرہ اور ۳۰ صحابہؓ کرام کے حالاتِ زندگی اور روشن کارنامے
⑪ حضرت عمرو بن العاصؓ، ابوایوب انصاریؓ سے عمیر بن سعدؓ کے حالاتِ زندگی اور کارناموں کی سرگزشت
⑫ انسائیکلوپیڈیا کی ۱۲۔ اقساط میں پیش کی جانے والی شخصیات کا اشاریہ اور ۲۴ اہلِ کتاب اصحاب کے حالات
⑬ حضرت امام حسن علیہ السلام اور ان کے عہد کی پوری تفصیل، تاریخ اسلام کے حوالہ سے
⑭ خلافتِ راشدہ، دَورِ اُمیّہ سے امیر معاویہ تک کے تاریخی اور دستاویزی حالات
⑮ سیدنا امام حُسینؓ کے حالاتِ زندگی، واقعۂ میدانِ کربلا اور اس کے پس منظر پر اہم تاریخی دستاویز

اس تاریخی انسائیکلوپیڈیا کی اہمیت کے پیشِ نظر تمام اقساط کو نہایت عمدہ رنگین جلد میں یکجا کر دیا گیا ہے۔

شیخ غلام علی اینڈ سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پبلشرز، ۱۹۹۔ سرکلر روڈ، چوک انارکلی، لاہور ۲/۰۰۰/۵۰۰